مولانا مناظر احسن گیلانی

عالمِ بے بدل

(سیّد مناظر احسن گیلانی کے سوانح اور مقالات متعلقہ قرآن، حدیث اور فقہ)

مرتب: محمد اکرام چغتائی

Marfat.com

مولانا مناظر احسن گیلانی

عالمِ بے بدل

(سیّد مناظر احسن گیلانی کے سوانح اور مقالات متعلقہ قرآن، حدیث اور فقہ)

مرتب

محمد اکرام چغتائی

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

Marfat.com

297 Chaghatai, M. Ikram
Mowlana Manaazar Ahsan Gilani : A'lam-e Baybadal / ed. by M. Ikram Chaghatai.- Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2009.
752pp.
1. Religion - Islam.
I. Title.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ سنگ میل پبلی کیشنز/مصنف سے باقاعدہ تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اس قسم کی کوئی بھی صورتحال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے۔

2009
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2210-9
ISBN-13: 978-969-35-2210-5

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

فہرستِ مندرجات

دیباچہ	محمد اکرام چغتائی	05

سوانح و شخصیت

مولانا سید مناظر احسن گیلانی......نقوش و تاثرات	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی	07
مولانا مناظر احسن گیلانی......نقوش و تاثرات	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	26
مولانا سید مناظر احسن گیلانی...... بڑا نادر سنگم......دل و دماغ دونوں کا	مولانا عبدالباری ندوی	55
محقق گیلانی	مولانا عبدالماجد دریابادی	78
تذکرۂ احسن (یعنی حضرت مولانا گیلانی کی مختصر سوانح حیات)	غلام محمد	81
مولانا مناظر احسن گیلانی......حیات اور شخصیت	مظفر گیلانی	92
مولانا سید مناظر احسن گیلانی	عتیق الرحمٰن سنبھلی	113
حیاتِ مولانا گیلانی	مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی	126
مولانا سید مناظر احسن گیلانی، شخصیت و سوانح	ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری	327
مولانا گیلانی اور ''الفرقان''	محمد منظور نعمانی	390
سید مناظر احسن گیلانی اور ''امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی''	ڈاکٹر محمد حمید اللہ	396

مطالعۂ قرآن

تدوین قرآن یعنی قرآن کے تحفظ پر ایک تاریخی نظر		406

Marfat.com

سورۂ یوسف کے ایک واقعہ کی تفسیر 457
''تاریخ ارض القرآن'' کے متعلق میرے ذاتی احساسات و تجربات 464
دجّالی فتنہ اور سورۂ کہف 474
قرآن کے صابئین، کیا بدھ مذہب کے ماننے والے تھے؟ 481

حدیث

تدوینِ حدیث 600

فقہ

امام ابو حنیفہؒ کا سیاسی مسلک 648

ضمیمہ

صابئین......ایک عمومی تجزیہ محمد اکرام چغتائی 737

Marfat.com

دیباچہ

بھلے وقتوں میں علومِ دینیہ سے وابستہ اصحاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا، علمائے حق اور علمائے سوء۔ امتدادِ زمانہ کے سبب اوّل الذکر کی نسبت ثانی الذکر طبقہ زیادہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار رہا اور اس کی متعدد ذیلی شاخیں معرضِ وجود میں آتی چلی گئیں۔ تاریخِ اسلام کے تقریباً ہر دور میں علماء کے یہ دونوں گروہ باہم دست و گریباں رہے اور مختلف النوع نزاعی مسائل کی وجہ سے امتِ مُسلمہ دینی وفکری وحدت کی منزل سے کوسوں دور چلی گئی۔ اگر ہم اپنی تاریخ پر ایک اُچٹتی سی نظر ڈالیں تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ بالعموم علمائے سوء ہی کا طوطی بولتا رہا اور مقتدر مقامات پر وہی براجمان رہے۔ ان کے برعکس علمائے حق نے ہر طرح کی دنیاوی ترغیبات اور دامنِ حرص و ہوس کھینچنے والے محرکات کے باوجود خلوصِ نیت سے اپنی زندگیوں کو حقیقی علم کے لیے وقف کئے رکھا اور اپنی عددی قلت کا احساس کئے بغیر سچے دین کی حقانیت اور سربلندی کے لیے کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ وہ ہمیشہ نامساعد حالات سے برسرِ پیکار رہے اور دینِ حق کے علم کو مضبوطی سے تھامے رکھا۔ بادی النظر میں اُن کی مساعی بے ثمر معلوم ہوتی ہے، لیکن درحقیقت یہی وہ راہرو ہیں، جو بادِ مخالف کے طوفانی تھپیڑوں کا قدم جما کر عالی ہمتی سے مقابلہ کرتے رہے اور انہوں نے دین کی اصل روح کو قائم و دائم رکھنا ہی اپنی زندگی کی ترجیحِ اوّل قرار دیا۔

دیگر بلادِ اسلامیہ کی طرح برصغیر پاک و ہند میں بھی علمائے دین انہی دو طبقوں یعنی علمائے حق اور علمائے سوء میں بٹے رہے اور اُن کے مابین چپقلشوں اور آویزشوں کا لامتناہی سلسلہ چلتا رہا۔ مختلف تاریخی ادوار میں اِن دونوں طبقوں کے اثر و رسوخ میں اُتار چڑھاؤ آتے رہے، لیکن عمومی قدر و منزلت اور عزت و وقار کی مسندِ اعلیٰ پر علمائے حق ہی کو بٹھایا جاتا رہا۔ تعجب خیز امر یہ ہے کہ انیسویں صدی عیسوی بالخصوص اس کے نصف دوم میں اِس طبقے میں ایسے علمائے کا ورودِ مسعود ہوا، جنہوں نے چاردانگِ عالم میں دینِ اسلام کی حقانیت کا ڈنکا بجا دیا۔ اگر اُن کی زندگیوں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ انہوں نے نہ صرف اعلیٰ علمی اقدار کی پاسداری کی اور اپنے واحد مقصدِ حیات یعنی دین کی سربلندی کی خاطر کوشاں رہے، بلکہ درویشانہ اندازِ زیست ہی کو اپنائے رکھا۔ اس دور کے انہی درویش علمائے حق میں ایک نام مولانا سید مناظر احسن گیلانی (۱۸۹۲ء۔۱۹۵۶ء) کا بھی ہے، جن کی منتخب نگارشاتِ علمیہ زیرِ نظر کتاب کی زینت ہیں۔

مولانا پیدائشی عالم تھے اور تحصیلِ علم کا ذوق وشوق اُن کی گھٹی میں رچا بسا تھا۔ اُن کی ابتدائی اُٹھان میں بھی

عالمانہ رنگ کی جھلک نظر آتی ہے۔ قسامِ ازل نے انہیں جس 'فطری جوہر' سے نوازا تھا، مولانا کے گھریلو ماحول اور ابتدائی تعلیم و تربیت نے اس کو مزید جلا بخشی۔ انہیں جب دیوبند کی علمی و دینی فضا میسر آئی اور ٹونک کے جید علماء سے شرفِ تلمذ حاصل ہوا، تو اس گوہرِ تابدار کی علمی ضوفشانیاں ہر سُو پھیلتی چلی گئیں۔ بالآخر حیدرآباد دکن کی جامعہ عثمانیہ میں تقرری نے ایسے مواقع فراہم کر دیئے کہ وہ اپنی تصنیفی و تالیفی سرگرمیوں کو تیز سے تیز تر کرتے چلے گئے۔ قدرت کی عطا کردہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اور مساعد حالات سے حتی المقدور استفادہ کرتے ہوئے انہوں نے اس قدر گرانمایہ علمی ورثہ چھوڑا ہے کہ برس ہا برس ہماری آنے والی نسلیں اس کی روشنی میں مزید تحقیق و تفحص کی نئی راہیں متعین کر سکیں گی۔

مولانا مناظر احسن گیلانی کی فہرستِ تصنیفات خاصی طویل ہے۔ ان میں بعض خاصی مقبول ہیں اور وہ گاہے بگاہے شائع ہوتی رہتی ہیں۔ علاوہ ازیں اُن کے تحریر کردہ مجلّاتی مضامین کی تعداد بھی سینکڑوں سے متجاوز ہے۔ اُن کے اس تمام تصنیفی سرمائے پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہی اُن کے موضوعات کے تنوع کا پتا چل جاتا ہے۔ انہوں نے قرآنیات، سیرت، حدیث، فقہ، معاشیات، تصوف، تاریخ اور سوانح نگاری جیسے اہم موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ متعلقہ اساسی مصادر پر اُن کی گرفت کتنی مضبوط ہے۔ یوں لگتا ہے کہ معلومات کا ایک سیلاب ہے کہ اُمڈا چلا آتا ہے، جیسے کسی شوریدہ بحرِ بیکراں میں تلاطم کی سی کیفیت ہو اور اکثر یہ تند و تیز لہریں بے قابو ہو کر کناروں کو پھلانگ جاتی ہیں۔ مولانا سے معلومات کی یہ یورش سنبھالے نہیں سنبھلتی اور جملہ ہائے معترضہ کی بھرمار قارئین کو اصل موضوع سے ہٹا دیتی ہے۔ ناقدین کی طرح انہیں خود بھی اس بات کا احساس رہتا ہے، لیکن وہ اپنے وسیع مطالعہ کے ہاتھوں مجبور نظر آتے ہیں اور جو کچھ اُن کے قوی حافظہ میں محفوظ ہے، اُسے اپنے قارئین تک پہنچانے کی خواہش پر قابو پانا اُن کے بس میں نہیں۔

مولانا زندگی بھر تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے، چنانچہ اُن کا شمار اپنے دور کے کثیر التصانیف علماء میں ہوتا ہے۔ عامۃ الناس میں اُن کی جو کتب معروف ہیں، وہ تو چھپتی ہی رہتی ہیں، لیکن اُن کی رحلت کے بعد پاکستان اور بھارت سے اُن کے مقالات کے اِکا دُکا مجموعے بھی منظرِ عام پر آئے ہیں، لیکن اس کے باوجود اُن کے متعدد اہم مقالات برصغیر کے مختلف رسائل و جرائد میں بکھرے پڑے ہیں۔ چنانچہ زیرِ نظر کتاب بعنوان ''عالمِ بے بدل'' میں اُن کی بیشتر غیر مدون تحریروں کو یکجا کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اس مجموعہ میں اُن کے مطالعہ قرآن، مطالعہ حدیث اور مطالعہ فقہ کے بارے میں منتخب تحریروں کو جمع کیا گیا ہے۔ بقیہ موضوعات سے متعلق ان کے مقالات کو علیحدہ جلد مین شائع کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ۔ ''عالمِ بے بدل'' کا ابتدائی حصہ مولانا گیلانی کے سوانح سے تعلق رکھتا ہے اور اس میں اُن کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اُن کے حالاتِ زندگی بیان کرنے والوں میں اُن کے ہمعصر علماء، قریبی احباب اور ثقہ اربابِ علم و دانش شامل ہیں۔

محمد اکرام چغتائی

لاہور

۱۰ جولائی ۲۰۰۸ء

Marfat.com

سوانح و شخصیت

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مولانا سید مناظر احسن گیلانی

نقوش و تأثرات

اپنے زمانہ کی کسی مشہور و جلیل القدر ہستی کے متعلق یہ بتانا ہمیشہ مشکل ہوتا ہے کہ اس کا نام سب سے پہلے کب کان میں پڑا تھا۔ جب خیال کیجئے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام ہمیشہ سے مانوس اور یہ ہستی ہمیشہ سے معروف و محبوب ہے۔ میری طالب علمی کا زمانہ اور میرے لکھنے پڑھنے کی عمر کا بچپن تھا اور مولانا کے علم و تصنیف کی عمر کا سن کہولت۔ میرے برادر معظم ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبدالعلی صاحب ان کے دوست بھی تھے اور معالج بھی۔ مولانا اکثر حیدر آباد سے اپنے وطن گیلانی جاتے ہوئے اپنے رفیق کار اور مخلص دوست مولانا عبدالباری صاحب ندوی کی معیت میں لکھنؤ اُتر جاتے اور ایک دو روز قیام کر کے بہار کے سفر پر روانہ ہوتے۔ اس عرصہ میں کبھی ہمارے گھر کو بھی رونق بخشتے اور کبھی ہم مولانا عبدالباری صاحب کے دولت کدہ (شبستان سعادت) پر حاضر ہو کر ان کی زیارت وصحبت کی سعادت حاصل کرتے۔ اس ورود و زمانہ قیام کے صرف دو تأثرات باقی رہ گئے ہیں۔ ایک ان کی شیریں گفتاری، شگفتہ بیانی، دوسرے ان کی نورانی صورت، خندہ پیشانی۔ ان دونوں صفتوں نے مل کر ان کی شخصیت میں عجب دل آویزی اور دل کشی پیدا کر دی تھی اور کسی طرح ان کی موجودگی یا گفتگو طبیعت پر بار نہیں ہوتی تھی۔ قدیم مشرقی سوانح نگار اور ادیب اسی کو "سبک روحی" سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کی مقابل صفت کو "گراں جانی" کہتے ہیں۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا کو اس لطافت سے خوب نوازا تھا اور اسی وجہ سے وہ اپنے حلقہ احباب میں بڑے محبوب اور اپنے حلقہ تلامذہ و مستفیدین میں بڑے مقبول تھے اور جو ان کی صحبت میں ایک مرتبہ بیٹھ جاتا وہ یہ کہتا ہوا اُٹھتا

بہت لگتا ہے جی صحبت میں ان کی

اسی اثناء میں اگر نماز کا وقت آجاتا تو مولانا حاضرین یا صاحب خانہ کے اصرار سے مصلّے پر تشریف لے جاتے۔ ان کی قرأت میں بڑا سوز اور حلاوت تھی۔ قلب پر اس کا اثر پڑتا اور جی چاہتا کہ قرأت طویل ہو۔

Marfat.com

اس دوران قیام میں جو علمی مذاکرے ہوتے ان کی تو اس وقت کچھ زیادہ سمجھ نہ تھی اور نہ وہ محفوظ ہیں۔ صرف اتنا یاد ہے کہ ان کی باتوں سے یہ احساس نہیں ہونے پاتا تھا کہ کوئی شخص علم کے فلک چہارم سے اہل زمین کو خطاب کر رہا ہے یا کوئی عالم نشست گاہ کو درس گاہ تصور کر کے سامعین کو درس دے رہا ہے۔ ان سے مل کر ہم کو وہ نیستی اور پستی نہ محسوس ہوتی جو مبتدی طالب علموں کو بڑے علما و اساتذہ سے مل کر محسوس ہوا کرتی ہے۔ دیکھنے میں یہ بات معمولی ہے مگر بڑی غیر معمولی ہے جس طرح بعض (نو دولت) حکام کو یہ مرض لاحق ہو جاتا ہے کہ وہ ہر جگہ یہاں تک کہ اپنے گھر میں اور اپنے بے تکلف احباب کے حلقہ میں بھی اپنے کو حاکم سمجھتے رہتے ہیں، اسی طرح بعض علما و ادبا اس کمزوری کا شکار ہو جاتے ہیں کہ وہ ہر وقت اپنے کو معلم و مصلح یا ادیب و نقاد سمجھنے لگے ہیں اور درسگاہ اور مسند درس کا تصور ان سے کبھی جدا نہیں ہوتا۔ مولانا کی مجلس میں بڑا انبساط تھا اور علمی و درسی اصطلاح میں ''تنزل'' بھی تھا، لطائف بھی تھے، واقعات بھی تھے اور چیدہ و منتخب اشعار بھی، اور وہ بھی حلم کے ساتھ، دل نوازی و شفقت بھی تھی اور علمی و تحقیقی شان بھی اور یہ سب اسی لطافت روح اور سبک جانی کا نتیجہ تھا جو ان کو عطا ہوئی تھی اور اس بات کا ثبوت کہ علم ان کا ایسا جز و بدن ہو گیا تھا کہ ان کو اس کا احساس تک نہیں ہو رہا تھا اس لئے اس کے موقع بے موقع اظہار کی ضرورت نہ تھی۔

اسی عرصہ میں مجھے تفسیر کے تفصیلی مطالعہ کا شوق ہوا۔ بھائی صاحب نے ارادہ فرمایا کہ مجھے کچھ عرصہ کے لئے ان کے پاس حیدر آباد بھیج دیں۔ مولانا نے بھی اس پر مسرت کا اظہار فرمایا لیکن اب یاد نہیں کن اسباب و موانع کی بناء پر ایسا نہ ہو سکا لیکن مولانا نے مشفقانہ و مربیانہ اور میں نے شاگردانہ و نیاز مندانہ تعلق آخر تک قائم رکھا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے میری خط و کتابت ۱۹۴۱ء میں ہوئی، جب مجھے اپنی کسی علمی یا تصنیفی ضرورت سے مولانا کے اس مقالہ سے استفادہ کی ضرورت پیش آئی جو انہوں نے جمع و ترتیب قرآن پر تحریر فرمایا تھا۔ اس کی تاریخ یہ ہے کہ اجمل خاں صاحب نے قرآن مجید کی جمع و ترتیب کے متعلق ایسے مشککانہ خیالات کا اظہار کیا تھا جن سے قرآن مجید کی موجودہ جمع و ترتیب بلکہ اس کی محفوظیت مشتبہ ہو جاتی ہے۔ یہ چند عامیانہ و سطحی خیالات کا مجموعہ تھا جن کی کوئی علمی و تحقیقی اہمیت نہ تھی لیکن ایک بڑے فتنہ کا آغاز تھا۔ مولانا کے علم و حمیت میں اس سے حرکت و جنبش پیدا ہوئی اور انہوں نے نفس مسئلہ جمع و ترتیب قرآن پر ایک محققانہ و عالمانہ مضمون تحریر فرمایا جو اسی زمانہ میں ''مدینہ'' بجنور میں شائع ہوا۔ مولانا کے علمی مقالات کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں یکجا اتنا منتشر مواد جمع فرما دیتے ہیں جو آسانی سے کسی ایک کتاب میں نہیں مل سکتا، دوسرے منقولات کے ساتھ وہ بہت سی ایسی نئی باتیں لکھ دیتے ہیں جن کی طرف عام طور پر ذہن نہیں جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑا نکتہ بیں اور نکتہ آفریں ذہن عطا فرمایا تھا۔ قرآن مجید کی وہی آیات اور صحاح کی وہی احادیث اور تاریخ کے وہی بیانات جو ہم آپ بیسوں بار پڑھ چکے ہیں، مولانا ان سے ایسے حقائق ثابت کر دیتے اور ان سے ایسے عجیب لیکن صحیح نتائج نکالتے کہ حیرت ہوتی ہے۔ اس مضمون میں بھی یہی شان ہے۔ قرآن مجید کے من جانب اللہ محفوظ و مرتب ہونے کو اور عہد رسالت ہی میں اس کے مرتب و جمع ہو جانے کو انہوں نے قرآن مجید کے الفاظ و نصوص اور واقعات سے اس طرح ثابت کیا تھا کہ اس خیال کی بالکل بنیاد ہی منہدم ہو جاتی تھی کہ قرآن مجید بہت تاخیر کے ساتھ جمع و مرتب ہوا اور اس کی ترتیب حضرت ابو بکرؓ یا حضرت زید بن ثابتؓ کے اجتہاد کا نتیجہ ہے۔ اس مضمون کا محرک اور اس کی شان کیا تھی

Marfat.com

اپنے مکتوب گرامی میں تحریر فرماتے ہیں:

''آپ کو شاید میرے جنون کا حال معلوم نہیں۔ اجمل نامی پروفیسر کے نام سے ''مدینہ'' میں مضامین کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ غصہ آرہا تھا، دبا نہ سکا۔ رات کو قلم لیا۔ پراگندہ خیالات سمیٹے۔ لکھ کر بھیج دیا۔ مسودہ تیار ہی کب تھا۔ وہی مسودہ وہی مبیضہ تھا۔ طبع ہونے کے بعد ایک کاپی آئی تھی۔ یاروں نے اسے بھی ختم کر دیا۔ سن تو یاد نہیں لیکن جن سن میں شائع ہوا مارچ کا مہینہ غالباً سترہ مارچ تھا۔ ہو سکے تو جناب مجید حسن سے مانگیے۔[1] شیر محمد صاحب کے پاس ہوگا؟ اس کا کیسے یقین کروں، کیا آج کل اس سلسلہ میں کوئی کام ہو رہا ہے۔ کاش قرآن کے ساتھ دوسری کتابوں کی تاریخی حالت بھی تحقیق کے ساتھ لکھ دی جاتی تو لاریب فیہ کی تفسیر ہو جاتی۔''[2]

مولانا کی تصنیفات میں سے غالباً سب سے پہلے ''النبی الخاتم'' پڑھی۔ کتاب عجب البیلے انداز میں لکھی گئی ہے۔ صحف سماوی کا انداز بیان، خطیبوں کا جوش و برجستگی، عشاق کی مستی اور وارفتگی، عقل و جذب کی لطیف آمیزش، حسب معمول معمولی و مشہور واقعات سے لطیف نکتے اور عظیم نتیجے نکالتے چلے جاتے ہیں اور وہ اس سرعت و کثرت کے ساتھ کہ پڑھنے والا مصنف سے شکایت کرنے لگتا ہے کہ

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار

میں نے اپنی ساری عمر میں سیرت نبوی میں ''رحمتہ اللعالمین'' اور ''النبی الخاتم'' سے زیادہ مؤثر کتاب نہیں پڑھی۔ کتاب پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف علم وانشا پردازی کی کرشمہ سازی نہیں ہے۔ اس کے اندر ان کا سوز دروں اور خون جگر بھی شامل ہے اور واقعہ یہی ہے کہ

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت　　　معجزہ فن کی ہے خون جگر سے نمود

ان سے جب زیادہ ملنا ہوا اور کچھ دن ساتھ رہنا ہوا تو اس حقیقت کی تصدیق ہوئی اور حیدر آباد کے قیام میں خود انہوں نے اپنے بعض واقعات سنائے جن سے بارگاہ رسالت سے خصوصی تعلق و مناسبت اور اس کتاب کی مقبولیت و تاثر کا راز معلوم ہوا۔

ان کا دوسرا نقش قلم جو نظر سے گزرا اور نقش ہو گیا، وہ ان کا مضمون ''الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ'' ہے جو ''الفرقان'' کے مجدد نمبر میں شائع ہوا تھا اور وہ ان کی بہترین و مؤثر ترین تحریروں میں ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن اس مضمون سے بڑھ کر ان کی تجدیدی عظمت کو آشکارا کرنے والا کوئی مقالہ یا تصنیف اس وقت تک نظر سے نہیں گزری۔ اس مضمون میں بھی انہوں نے یہی کیا ہے کہ ملا عبد القادر بدایونی کی ''منتخب التواریخ'' سے لے کر ایسے اقتباسات جمع کر دیے ہیں کہ عہد اکبری کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے اور پڑھنے والے کو اس خطرہ کا اندازہ ہو جاتا ہے جو اس ملک میں اسلام کو درپیش تھا۔ پھر ان تاریک و مایوس کن حالات میں الف ثانی کے مجدد کا تجدیدی کام شروع ہوتا ہے جو بالآخر اکبر کے تخت پر محی الدین اورنگ زیب بادشاہ غازی (نور اللہ مرقدہ واعاد ایامہ) کو لے آتا

Marfat.com

ہے۔ اگر یہ مضمون اسی پرواز کے ساتھ جس سے وہ شروع ہوا تھا، مکمل ہو جاتا تو نہ صرف حضرت مجدد علیہ الرحمہ کی بہترین سیرت تیار ہو جاتی بلکہ ہندوستان کے اسلامی انقلاب کی ولولہ انگیز تاریخ مرتب ہو جاتی۔

اس وقت تک میرے ان کے تعلقات کی نوعیت یہ تھی کہ میں ان کے علم وتحریر کے ہزاروں مداحوں میں سے ایک مداح تھا۔ ان کے مضامین وتصنیفات کو شوق سے پڑھتا اور کبھی کبھی استفادۂ خط وکتابت بھی کر لیتا۔ ان کو بھی میرے حالات اور علمی مشاغل سے بزرگانہ دلچسپی تھی لیکن ایک ایسی تقریب پیش آئی جس نے مجھے ان سے زیادہ قریب ہونے کا موقع دیا اور وہ یہ کہ انہوں نے اپنی اہم تصنیف ''مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت'' کے زمانہ تصنیف میں والد مرحوم مولانا حکیم سید عبدالحیؒ کی تصنیف ''نزہتہ الخواطر'' کا دوسرا حصہ جو ''درر کامنہ'' کے ذیل کے طور پر دائرۃ العارف نے شائع کیا تھا پڑھا وہ اس کو پڑھ کر بڑے متاثر ہوئے اور ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''یہ واقعہ ہے کہ آپ کے والد مرحوم کی چیزوں سے یوں تو مجھے بچپن ہی سے خاص دلچسپی رہی ہے لیکن ''نزہتہ الخواطر'' کی قدر وقیمت مجھ پر اپنی اس کتاب کے لکھتے وقت جتنی ظاہر ہوئی اس سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔ اللہ کے اس مخلص بندے نے کمال کر دیا ہے۔ سمندروں کو کھنگال گئے لیکن پتہ بھی چلنے نہیں دیا۔ خدا کرے کہ ان کی محنت سے استفادہ کا موقع دنیا کو مل جائے۔ ایک انقلابی کام ہے جسے وہ کر کے چلے گئے ہیں۔ اب یہ ہم لوگوں کی توفیق کی بات ہے کہ اس سے خود مستفید ہوں اور دوسروں کے مستفید ہونے کے مواقع پیدا کریں گے۔'' (یکم نومبر ۱۹۴۵ء)

انہوں نے دائرۃ المعارف سے اس کتاب کے مکمل طبع ہونے کی تحریک کی۔ ایک محضر مرتب کیا جس پر ہندوستان کے اکثر اکابر علما کے دستخط کرائے۔ یہ غالباً حیدری صاحب کا زمانہ وزارت تھا اور وہ مولانا کی بڑی عزت کرتے تھے۔ بڑی کوششوں اور سلسلہ جنبانی سے اس کتاب کی طباعت کی منظوری ہوئی اور میں نے پہلا حصہ صاف کرا کے بھیج دیا۔ ریاست کے دوسرے کاموں کی طرح اس کتاب کی طباعت میں تاخیر پر تاخیر ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ مصلحت یہ معلوم ہوئی کہ میں خود حیدرآباد جاؤں اور اس کے آخری مراحل طے کرانے کی کوشش کروں۔ چنانچہ ۴۶ء میں غالباً جولائی کا مہینہ تھا کہ میں حیدرآباد حاضر ہوا۔ مولانا کے سوا کہاں ٹھہرتا؟ یہ وہ زمانہ تھا کہ مولانا عبدالباری صاحب وظیفہ پر سبکدوش ہو کر لکھنؤ تشریف لے آئے تھے۔ جامعہ عثمانیہ کے قریب سیتا پھل منڈی میں مولانا کا قیام تھا۔ قریب ہی ایک مسجد تھی جس کی تاریخ مولانا نے المسجد الاقصیٰ نکالی تھی اور وہ مسجد کے دروازے پر کندہ ہے اور اس لحاظ سے مناسب حال ہے کہ مسجد بلدہ کے بالکل ایک سرے اقصی البلد پر واقع ہے۔ اس قیام میں مولانا کے شب وروز دیکھنے اور گھنٹوں پاس بیٹھنا ہوا۔ وہاں ٹھہر کر مولانا کا تصنیفی انہماک اور علمی استغراق دیکھا۔ پہلے کا حال تو یہ تھا کہ بعض دن رات، رات بھر لکھتے رہتے۔ دوسرے کا حال یہ تھا کہ بعض اوقات سلسلہ گفتگو شروع فرماتے اور میں کسی ضرورت سے اٹھ جاتا مگر مولانا سلسلہ جاری رکھتے۔ پھر اچانک سر اٹھا کر دیکھتے اور اس وقت معلوم ہوتا کہ میں موجود نہیں ہوں۔ طبیعت کی شگفتگی کا وہی عالم تھا۔ ''مسجد اقصیٰ'' کے مؤذن ایک دلچسپ بزرگ تھے جن سے مولانا

Marfat.com

اکثر مطالبہ فرماتے اور ان کی سادگی سے لطف لیتے۔ مولانا نے ان کا نام "امام مفرح القلوب" رکھا تھا۔ اکثر مولانا کے ساتھ ہی جامعہ عثمانیہ اور دائرۃ المعارف جانا ہوتا اور بعض مرتبہ ان کے درجہ میں بھی (جو اپنی دینی عظمت کی وجہ سے جامعہ کی سب سے بالائی منزل میں تھا) بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوتی۔

مولانا سے ملنے میں دو باتوں کا ضرور احساس ہوتا۔ ایک اُن سے عزیزانہ قربت کا جو ایک خاندان کے افراد ہونے سے محسوس ہوتی ہے۔ اس کی وجہ خواہ نسبی اشتراک ہو (اشتراک بعید سہی) خواہ ان کی طبیعت کی افتاد جس کے خمیر میں محبت و شفقت تھی۔ دوسرے ذوقی و علمی مناسبت۔ مولانا عالموں میں عالم تھے، ادیبوں میں ادیب، مورخوں میں مورخ، فقیہوں میں فقیہ، محدثوں میں محدث، مفسروں میں مفسر، فارسی اردو کا ان کو یکساں مذاق تھا۔ شعر و شاعری کا ذوق اور سخن شناسی و سخن سنجی دونوں سے حصہ وافر ملا تھا۔ غرض وہ ہندوستان کی اس گزشتہ تہذیب و ثقافت کی یادگار تھے جب فقیہ و محدث کے لئے خشک ہونے اور عالم کے لئے شعر کو غیر موزوں پڑھنے کی شرط نہ تھی۔ وہ علماء کی اس صف کے آدمی تھے جس کے اولین کرسی نشینوں میں مولانا فضل حق خیر آبادی، مولانا صدر الدین خاں آزردہ اور مولانا امام بخش صہبائی اور متوسطین میں مولانا حالی، مولانا شبلی اور حکیم سید عبدالحئی (صاحب "گل رعنا") اور متاخرین میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوبکر جونپوری تھے۔ اپنی کم سوادی اور بے استعدادی کے باوجود میری نشوونما اسی ماحول میں ہوئی۔ اس لئے مولانا سے ایسی مناسبت محسوس ہوئی جو ان کے بہت سے معاصروں سے محسوس نہیں ہوتی تھی اور اس میں بہت کچھ دخل ان کی اس جامعیت، ادبی ذوق اور لطف مجلس کو تھا جس کی بنا پر کہنا پڑتا تھا کہ

وہ اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں

۱۹۴۷ء میں مولانا کا تعلق حیدرآباد سے ختم ہو گیا اور وہ وظیفہ لے کر گیلانی آ گئے جس کو وہ اپنی کہفی قیام گاہ کہتے تھے۔ حیدرآباد کے واقعات نے ان کے حساس دردمند دل کو بڑا صدمہ پہنچایا تھا۔ وہ لکھ پڑھ کر اپنا دل بہلاتے تھے۔ اسی زمانہ میں ان کی بعض اہم تصنیفات اور طویل سلسلہ مضامین شایع ہوئے۔

۴۷ء میں راقم الحروف اور رفیق مکرم مولانا عبدالسلام ندوی نے ادارہ تعلیمات اسلام کی طرف سے ایک پندرہ روزہ اخبار "تعمیر" جاری کیا، جس کا اصل مقصد مسلمانان ہند کی اس افسردگی اور احساس کمتری اور مایوسی کو دور کرنا تھا جو ۴۷ء کے انقلاب اور نئے حالات نے ان پر طاری کر دی تھی۔ مولانا نے اس اخبار سے پورا تعاون فرمایا اور اپنے بعض مضامین سے سرفراز کیا۔ مولانا کا ایک دیرینہ خیال یہ تھا کہ اسلامیہ کالجوں اور اسکولوں کے بجائے جن کا ایک زمانہ میں ہندوستان میں عام مذاق پیدا ہو گیا تھا اور مسلمانوں کی بہترین تنظیمی و عملی و مالی صلاحیتیں ان پر صرف ہوئیں اس وقت اسلامی اقامت خانوں کی ضرورت ہے جن میں وہ مسلمان طلباء قیام کریں جو مختلف سرکاری و غیر سرکاری، مسلمانان اور غیر مسلم درسگاہوں سے وابستہ ہوں اور ان کے اندر اسلامی و دینی فضا اور غذا مہیا کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ وہ اپنی درسگاہوں کے لادینی ماحول اور تعلیم کے اثرات سے امکانی حد تک محفوظ اور اسلامی افکار و اخلاق سے متاثر ہوں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ تجویز "کم خرچ بالانشیں" کے مترادف اور اسلامیہ کالجوں اور اسکولوں سے (جن کی افادیت اب بہت مشتبہ ہو گئی ہے اور جو اب انقلاب حکومت سے اپنی خصوصیات کھوتے چلے جا رہے ہیں) کہیں بہتر

Marfat.com

نتائج و ثمرات پیدا کر سکتی ہے اور جدید تعلیم کے غیر اسلامی اثرات سے بچانے اور نئی اسلامی نسل کو (جس کا جدید تعلیم حاصل کرنا ایک طے شدہ حقیقت اور ایک ناگزیر ضرورت ہے۔) مسلمان باقی رکھنے کی واحد شکل ہے۔ اس وقت عالم اسلام کا سب سے بڑا فتنہ اسی نوخیز نسل کا غیر اسلامی بلکہ معاند اسلام ذہن اور نفاق ہے جس نے تمام اسلامی ممالک کو (جن کی زمام اختیار قدرتی طور پر اسی طبقہ کے ہاتھ میں ہے) الحاد و زندقہ کے دوراہے پر کھڑا کر دیا ہے اور ایک سخت ذہنی انتشار و کشمکش بلکہ اسلام کے خلاف بغاوت کا علمبردار بنا دیا ہے۔ مولانا کی یہ بڑی دینی بصیرت تھی کہ انہوں نے اسلامی اقامت خانوں کی تجویز پیش کی جو کم سے کم ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس مسئلہ کا ایک عملی اور معقول حل ہے۔ مولانا نے ''تعمیر'' کو اس دعوت کا ترجمان بنانا چاہا اور اس سلسلہ میں ان کے متعدد مکاتیب و مضامین شائع ہوئے۔ افسوس ہے کہ ان کی اس تحریک کو کسی بڑے ادارے یا انجمن نے نہیں اپنایا اور اس کو تحریک و دعوت نہیں بنایا گیا، ورنہ وہ نہ صرف کالجوں اور اسکولوں کے مقابلہ میں بلکہ ان یونیورسٹیوں کے مقابلہ میں بھی زیادہ مفید اور انقلاب انگیز ثابت ہوتی، جن پر مسلمانوں کی بہترین طاقتیں اور عظیم قومی سرمائے صرف ہوئے۔ مولانا کے انتقال کے بعد ان کے شریک کار اور یار غار مخدومی مولانا عبدالباری صاحب ندوی نے ''صدق'' کے ذریعہ اقامت خانوں کے قیام کی دعوت پیش کی اور اس کے لئے عملی قدم بھی اٹھایا۔ خدا کرے مستقبل قریب میں وہ تخیل عالم وجود میں آ جائے اور ہندوستان و پاکستان میں اس کا تجربہ شروع کیا جائے۔

وہ اگرچہ اپنے نزدیک ایک ''کہف'' میں گوشہ نشین و پناہ گزیں تھے مگر باہر کی دنیا سے باخبر رہتے تھے اور باخبر رہنا چاہتے تھے۔ مطالعہ و تصنیف و تحریر کا سلسلہ قوت کے ساتھ جاری تھا۔ راقم سطور کا معمول تھا کہ اس کی کوئی چیز شائع ہوتی تو خصوصی مناسبت و تعلق کی بناء پر مولانا کی خدمت میں ضرور بھیجتا اور مولانا اس پر اپنے تاثرات و جذبات کا اظہار فرماتے۔ ان تاثرات سے ان کے دردمند دل کا پورا اظہار ہوتا اور معلوم ہوتا کہ ''امت'' کے حالات سے ان کو کیسا تعلق ہے۔ ۵۱ء میں یہ ناچیز حجاز و مشرق وسطیٰ کی سیاحت سے واپس آیا تو بعض دوستوں نے ان ریڈیائی تقریروں کا جو دہلی کے ریڈیو سٹیشن سے نشر ہوئی تھیں ترجمہ شائع کر دیا میں نے وہ کتابچہ مولانا کی خدمت میں بھی بھیجا۔ مولانا نے ان الفاظ میں اس کی رسید عنایت فرمائی:

> ''کتنے ذوق و شوق کے ساتھ آپ کی کتاب مشرق وسطیٰ والی اپنے ہاتھ میں لی، لینے کے ساتھ پڑھ گیا، لیکن آپ نے پیاس بھڑکا دی، امیدوار بنا کر چھوڑ دیا، کاش! آپ کا روزنامچہ شائع ہو جاتا، تاہم جو کچھ بھی اس میں آ گیا غنیمت ہے۔ فلسطین کے اس پیر مرد کی بات دل کو بہت بھائی کہ سمندر کی مچھلیوں میں اگر جنگ ہو تو انگریز کی شرارت سمجھو۔ اپنا خیال بھی یہی ہے، اسی لئے اس دور کو ''کہفی دور'' سمجھے ہوئے ہوں، تا اینکہ تلامیذ الشیطان کا دور ختم ہو۔
>
> آپ نے اس سفر میں زیادہ تر ندوی الطبع حضرات سے ملاقات کی۔ دیوبندی الفطرت بمشکل دو ایک سے زیادہ نہ ملے۔ میری آرزو یہ تھی کہ حضرت شہید کے کچھ نمونوں کی تلاش کرنے میں بھی

Marfat.com

آپ کامیاب ہوئے ہوں گے مگر شاید پیداوار کا سلسلہ اس راہ میں غالباً بند ہو چکا ہے۔"
(۳۰ فروری ۱۹۵۴ء)

بالآخر عربی روزنامچہ "مذكرات سائح في الشرق العربي" بھی شائع ہوگیا اور حسب معمول مولانا کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ مولانا عربی ممالک کے دینی زوال اور جذبہ اسلامی کے ضعف کے واقعات سے بڑے متاثر و غمگین ہوئے اور کتاب پڑھتے ہی یہ مکتوب گرامی ارسال فرمایا جو درد واثر میں ڈوبا ہوا ہے:

"آپ کا ہدیہ سنیہ یعنی عربی سفرنامہ کئی دن ہوئے موجب سرفرازی ہوا۔ چونکہ "الفرقان" میں اس سفرنامہ کی متعدد قسطیں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکی تھیں، خیال گزرا کہ وہی مضامین عربی زبان میں ہوں گے تاہم پڑھنا شروع کیا، اب خدا جانے میرے حافظہ کی کمزوری کا نتیجہ تھا یا کیا تھا کہ مجھے تو اب آپ کی اس کتاب کی ہر ہر سطر نئی معلوم ہوتی چلی جاتی تھی۔ پڑھتا جاتا تھا اور استغراق وانہاک بڑھتا جاتا تھا۔ شاید دو دن میں ختم ہوا، ختم کیا ہوا، ایسا معلوم ہوا کہ میں خود ختم ہوگیا۔ پرانے ناسور جو دل میں پڑے ہوئے تھے تر و تازہ ہوتے چلے جاتے تھے۔ چند دن ایسے حال میں گزرے کہ گویا ایک قسم کا جنون مسلط ہوگیا ہے۔ عرب، مصر، سوریہ، سوڈان کے مسلمانوں کا حال جب اس حد تک خراب ہو چکا ہے تو پھر اب غریب اسلام کہاں پناہ لے گا؟ مرحوم ڈاکٹر اقبال کا شعر بار بار زبان پر جاری تھا۔

اس راز کو اب فاش کر اے روح محمدؐ
اس عہد میں اب تیرا مسلمان کدھر جائے

زیادہ سے زیادہ امید کی کچھ کرنوں کا سراغ آپ کے بیان کے مطابق الاخـــوان میں ملتا تھا لیکن آپ ہی نے ان کے لئے جو ہدایتی راستہ متعین فرما دیا تھا[4] اس راہ پر وہ بھی تو نہ چلے۔ حال کے واقعات سے[5] اس کی تصدیق ہی ہوگئی، گویا "مادہ برآمد" کے مصداق درحقیقت وہ بھی تھے۔ بس تڑپ رہا ہوں، کراہ رہا ہوں، کیا ہوگا اور ورطہ سے دین کا سفینہ کیسے نکلے گا، بھلا جب اپنے ہاتھوں سے مسجدوں میں مسلمان تصویریں لٹکانے لگے[7] اور دنیائے اسلام کے سب سے بڑے دینی مرکز[8] کے علماء نے اعفاء[8] اللحی کا ترجمہ عفت الديار محلها و مقامها کی روشنی میں کر کے اسی پر اجماع منعقد فرما لیا ہے تو دین کو اب ہم کہاں ڈھونڈیں؟ کیا عرض کروں منہ لپیٹے آپ کی کتاب پڑھنے کے بعد پڑا ہوا ہوں۔ ام حسبتم ان اصحاب الكهف والرقيم كانوا من آيتنا عجباً معلوم ہوتا ہے کہ دل کے اندر کوئی پڑھ رہا ہے۔ فلعلک باخع نفسک علی آثارهم ان لم يومنوا بهذا الحديث اسفاء کا مطلب اب سمجھ میں آتا ہے۔ عقیدہ ولدیت کے آثار[9] آخر بڑھتے ہوئے کہاں تک پہنچ چکے ہیں؟ بھروسہ اسی

Marfat.com

پر ہے کہ قرآن کے بعد نہ کوئی کتاب ہی نازل ہونے والی ہے اور نہ محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد کوئی رسول آنے والا ہے۔ مسلمانوں کا حشر جو کچھ بھی ہو لیکن "الاسلام" کو خدا کی پیدا کی ہوئی دنیا سے کون نکال سکتا ہے؟" (۱۰ نومبر ۱۹۵۴ء)

نومبر ۵۳ء میں مولانا سید سلیمان ندوی کا حادثہ ارتحال پیش آیا۔ ہم لوگوں نے ارادہ کیا کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی طرف سے ایک ایسا سنجیدہ وعلمی اجتماع منعقد کیا جائے جس مین سید صاحب کے مختلف علمی کمالات اور دینی و تصنیفی خدمات پر علمی مقالات پڑھے جائیں۔ ہم لوگوں کو سید صاحب مرحوم اور مولانا مناظر صاحب کا باہمی تعلق و ارتباط معلوم تھا۔ عرصہ سے مولانا لکھنؤ بھی تشریف نہیں لائے تھے اور ان کے احباب وعلمی تلامذہ ان کی تشریف آوری اور لطف صحبت کے آرزومند تھے۔ میں نے آپ کی خدمت میں عریضہ لکھا اور یہ عرض کیا کہ خواہ مجھے خود حاضر ہونا پڑے لیکن یہ زحمت آپ کو نیازمندوں کی خاطر برداشت کرنی پڑے گی۔ مولانا کی صحت عرصہ سے کمزور تھی۔ وہ پہلے سے سفر کے بارے میں بڑے کمزور اور ضعیف الارادہ واقع ہوئے تھے۔ قلبی شکایت نے ان کو اور بھی محتاط بنا دیا تھا اور وہ سفروں کے سلسلہ کو بالکل بند کر چکے تھے۔ اندیشہ تھا اور ان کے دوستوں نے پیش گوئی کی تھی کہ وہ سفر پر آمادہ نہ ہو سکیں گے مگر خلاف توقع انہوں نے یہ دعوت قبول فرمالی۔ اس کا سبب صرف ایک تھا اور وہ یہ کہ اس جلسہ کی نسبت ان کے ایک محبوب دوست اور فاضل معاصر سے تھی جو اس وقت دنیا میں نہیں ہے۔ زحمت اٹھا کر اور صحت کو خطرہ میں ڈال کر بھی اس میں شرکت کرنا ان کے نزدیک شرافت اور حق کے اعتراف کی دلیل تھی اور ان کی فطری سیادت اس کی متقاضی تھی۔ حقیقت میں شرافت، علونفس اور مکارم اخلاق کے ظہور کے یہی مواقع ہوتے ہیں۔ بہت سے اکابر ومشاہیر تو ایسے دیکھے گئے ہیں جو اپنے نامور معاصر اور دیرینہ رفیق کے انتقال کے بعد زبان پر ان کا ذکر لانا بھی اپنی عظمت وخودداری کے خلاف سمجھتے ہیں۔ مولانا کا یہ مکتوب (جس میں انہوں نے سفر کی آمادگی ظاہر کی ہے) لفظ بلفظ پڑھنے کے قابل ہے اور ان کی شرافت نفس، علوفطرت اور لطیف جذبات واحساسات کی ایک تاریخی دستاویز ہے جس کو ان کا سوانح نگار کبھی نظرانداز نہیں کر سکتا۔

۸ دسمبر ۱۹۵۳ء

گیلانی (بہار)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سلیل الکرام البررہ، برادر عزیز محترم مولانا سید ابوالحسن علی صاحب وفقکم اللہ لما یحب ویرضیٰ۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ جی ہاں! نوازش نامہ کے جواب ہی کی فکر میں تھا کہ اچانک اس دینی وعلمی حادثہ کی خبر نے دل ودماغ میں ہلچل ڈال دی۔ مرحوم نور اللہ ضریحہٗ کے ساتھ دل کے تعلق کی صحیح کیفیت کا علم اب ہوا ہے۔ کافی مدت گزر چکی ہے لیکن شاید ہی کوئی گھنٹہ بیداری تک کا ایسا گزرتا ہو جس میں ان کا خیال سامنے نہ آ جاتا ہو، اور خیال کیا، کہنے کو

Marfat.com

کہہ سکتا ہوں کہ ان کا طیف نہیں بلکہ شاید وہی سامنے آجاتے ہیں۔ اس واقعہ کی توجیہ اب سمجھ میں آئی ہے۔ آخری حج سے واپس ہونے کے بعد اپنے ایک مکتوب میں سید صاحب مرحوم نے ارقام فرمایا تھا کہ ''میں مطاف کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک میری نظر پڑی کہ ''تو طواف کر رہا ہے'' خیال آیا کہ وہ آتا تو مجھ سے ضرور ملتا۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ میں خود ملنے کے لئے تیری طرف لپکا، لیکن دیکھا کہ تم غائب ہو گئے، پوچھا تھا کہ آخر صوفیوں میں جو مشہور ہے کہ کعبہ میں نماز پڑھتے ہیں۔ کیا اسی کے ظہور کی یہ شکل تھی؟ ان کا شاید یہی آخری گرامی نامہ تھا۔ جواب میں عرض کیا گیا تھا کہ محبت کے یہ سارے کرشمے ہیں ورنہ کہاں یہ سیاہ رو اور کہاں کعبہ کی نماز و طواف۔ پہلے تو ان کے اس رقیمہ وداد کو محفوظ کر دیا لیکن خیال گزرا کہ بعد کو کسی کی نظر اس پر نہ پڑ جائے اور خواہ مخواہ کے وہم میں مبتلا ہو۔ دل کا فیصلہ یہی ہوا کہ اس کو ضائع کر دیا جائے۔ جب تک وہ زندہ رہے۔ اس راز کو دل ہی میں دبائے رہا۔ آج پہلی دفعہ آپ کے سامنے صرف اس لئے اس واقعہ کا اظہار کر رہا ہوں کہ اپنے حال سے سید صاحب مرحوم کے حال کی توجیہ سمجھ میں آئی ہے۔ ان ہی کے قلب انور کا یہ عکس ہے کہ غائب ہونے کے بعد حضوری کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ جو کچھ مجھ پر گزر رہی ہے سمجھتا ہوں کہ کچھ اسی قسم کا حال ان پر بھی گزرا تھا۔ لیکن ''الفضل للمتقدم'' اور اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی محبت غالب تھی کہ میرے مرنے سے پیشتر اس حال کا تجربہ ان کو ہوا۔ میرے اندر جو کچھ پوشیدہ تھا اس کا بروز ان کی وفات کے بعد ہوا۔ فغفر اللہ لہ ورحمہ۔

اب اس کے سوا دل کی تسلی کے لئے چارہ کار ہی کیا ہے۔ کہنے والے نے کہا تھا

جمال ذی الارض کانوا فی حیاتهم

بعد الممات جمال الکتب والسیر

وفات کی خبر بھی عجب طرح سے ملی۔ گوشہ خمول سے نکلنے کا سلسلہ قطعی طور پر منقطع ہے لیکن جس رات کو ان کا وقت موعود ان کے سر پر پہنچا اس کی صبح کو استھانواں جو دیسنہ کے قریب ایک گاؤں ہے، میلاد کی مجلس تھی۔ وہاں کے لوگوں کے شدید اصرار سے اسی مجلس مبارک کی شرکت کے لئے حاضر ہوا۔ راستہ ہی میں تھا کہ ایک صاحب دسنہ کے ملے اور ہوش وحواس پر بجلی اس خبر کو سنا کر گرائی۔ بولے کہ رات ریڈیو سے دسنہ میں یہ خبر کراچی سے سُنی گئی ہے۔ وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر استھانوان جانا نہ ہوتا تو علی الصباح غالباً ان کے دفن ہونے سے پیشتر اس سانحہ فاجعہ سے آگاہ ہونے کی کوئی شکل میرے لئے نہ تھی۔ اسی وقت جنون میں ایک مرثیہ بھی ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں خود بخود دل میں تموج پذیر ہوا۔ کچھ اشعار تو اس کے اسی وقت کی مجلس میں سنائے گئے۔ بعد کو اخباروں میں بھیج دیا۔

Marfat.com

بہر حال آپ نے ایک ایسی مجلس میں شرکت کی دعوت دی ہے کہ انکار کی گنجائش نہیں پاتا اور گنجائش آپ نے باقی ہی کب چھوڑی ہے۔ اس کے سوا اور کیا عرض کروں کہ صحت کے جس حال میں اس وقت ہوں اگر یہی حال باقی رہا کوئی خاص غیر معمولی بے ترتیبی اس میں پیدا نہ ہوئی تو حق سبحانہ وتعالیٰ کی توفیق کے بھروسہ پر یہ ارادہ کر چکا ہوں کہ جس طرح بھی ممکن ہو اس بابرکت مجلس میں شریک ہونے کی سعادت حاصل کروں۔ آپ خود یا کسی صاحب کو بھیجنے کی ہرگز ہرگز تکلیف گوارا نہ فرمائیں۔ فقیر خود حاضر ہو جائے گا اور ایک آدمی کو اپنے ساتھ رکھ لے گا۔ ہاں اگر ممکن ہو تو اس سے مطلع فرمائیں کہ آخر یہ جلسہ عام پبلک کی طرف سے ہو رہا ہے یا ذاتی طور پر آپ نے اس بار کو اپنے سر پر اٹھایا ہے۔

آپ نے اپنے اس نوازش نامہ میں اس فقیر کے متعلق جن غیر استحقاقی الفاظ کا استعمال فرمایا ہے ان کو پڑھ کر بے ساختہ آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی زندگی میں بھی اس کا اعتراف کرتا رہا اور اب تو مجسم اعتراف ہوں کہ ان کے فضائل وکمالات سے دور کی بھی نسبت میرے ہفواتی مزورات کو نہ تھی۔ قلم کے دائرے میں ان کی قلم کاریاں صدیوں تک ان شاء اللہ کام آئیں گی۔ دنیا ان کی قدر و قیمت کا اب اندازہ کرے گی۔ بہر حال اب چلئے سعید قلوب کے حسن ظن کو اپنی مغفرت کا ذریعہ سمجھتا ہوں۔ بل الانسان علی نفسه بصیرة۔

اس فقیر کے متعلق جو عنوان مقرر کیا گیا ہے، مناسب ہے۔ کہہ نہیں سکتا کہ اب کچھ لکھا بھی جائے گا یا نہیں۔ اپنے مرثیہ میں ایک شعر بھی لکھا تھا کہ

اپنی تحریروں میں خود میری نظر تجھ پہ رہی
رائے کا تیری رہا دل کو ہمیشہ انتظار

یہ عجیب بات ہے کہ اس نفسیاتی کیفیت کا انکشاف اب مجھ پر ہوا۔ قلم ہاتھ میں لیتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ سید صاحب مرحوم ہی کی نظر سے جب یہ بات نہ گزرے گی تو لکھنے کا فائدہ ہی کیا۔ وہ کہیں ہوں کسی حال میں ہوں، گوشہ خاطر عموماً ان ہی کی طرف رہتا تھا۔ ان کی پاک اور آزاد روح کو خطاب کر کے دعوت دی ہے کہ آپ آیئے اپنے دارالمصنفین کی بہاروں کا تماشا کیجئے۔ اسی سلسلے میں ایک شعر یہ بھی تھا۔

راہ میں آئے گا لکھنؤ اور دریا آباد بھی
ہیں جہاں تھامے کلیجے تیرے کچھ یاران غار

آخری شعر یہ تھا

اور ہو دسنہ جو آتا تو رہے اس کا خیال
ایک گیلانی میں بھی ہے آرزوؤں کا مزار

Marfat.com

اپنے برادر اکبر محسنی و محترمی ڈاکٹر صاحب مدظلہ العالی کی خدمت میں فقیر کا سلام عرض کر دیجئے۔ مولانا عبدالباری اور مولانا نعمانی صاحبان کی خدمت میں بھی سلام عرض ہے۔ آخر اس ''کہفی'' کو کہف سے گھسیٹنے کی ایک صورت نکل ہی آئی۔ فقط

والسلام

مناظر احسن گیلانی

مولانا اپنے برادر عزیز مولوی مکارم احسن صاحب کی معیت میں تشریف لائے اور نہایت ذوق وشوق اور محبت وخلوص کے ساتھ دو روزہ اجتماع میں شرکت فرمائی۔ ایک روز کے اجتماع کی صدارت بھی فرمائی۔ اپنا مقالہ (جو حسب معمول طویل، دلچسپ اور پُر مغز تھا) سنایا۔ مقالہ ''سیرت النبیؐ'' کے حصہ ششم پر ایک مفصل تبصرہ تھا۔ اس میں دکھایا گیا تھا کہ سید صاحب نے اسلام کی اخلاقی تعلیمات اور اخلاق نبوی پر جو کچھ لکھا ہے وہ اس موضوع پر منفرد چیز ہے اور سید صاحب کے علمی کارناموں میں اس کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے جس فراخ دلی، فیاضی اور مسرت کے ساتھ اپنے نامور معاصر کے علمی وتصنیفی مقام اور اس کی عظمت کا اعتراف کیا تھا وہ خود مولانا کی عظمت کی دلیل اور ان کی بے نفسی وخلوص کا روشن ثبوت تھا اور علمائے سلف کی یاد تازہ کرتا تھا۔ مولانا نے میری فرمائش پر اپنی وہ نظم بھی سنائی جو انہوں نے واقعہ کی اطلاع سن کر لکھی تھی اور بعض اخبارات میں چھپ چکی تھی۔ جس وقت مولانا نے اپنی پُر اثر آواز میں اپنے مخصوص ترنم کے ساتھ وہ نظم سنائی تو سماں بندھ گیا اور بہت سی آنکھیں نم تھیں۔

اجتماع کے علاوہ جو اوقات ملتے تھے وہ مولانا کی پُر بہار مجلس کے لئے وقف تھے۔ اساتذہ وطلباء کا ایک مجمع ہر وقت ان کے گرد رہتا اور حالت یہ تھی کہ

وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی

اجتماع سے فارغ ہوکر اور مولانا عبدالباری صاحب کے یہاں کچھ وقت گزار کر وہ ہمارے مرکز میں تشریف لے آئے۔ میں نے ایک روز ان سے ان نعتوں کے سنانے کی فرمائش کی جو انہوں نے بہاری ہندی میں لکھی ہیں اور جو سوامی دھرمی جی گیلانی والے کی طرف سے بعض اخبارات و رسائل میں چھپی ہیں۔ ان نعتوں میں ان کی محبت سوز اور بارگاہ نبوی سے عاشقانہ تعلق بغیر کسی تکلف کے ظاہر ہوگیا ہے۔ ہندی کے میٹھے بول، مولانا کا ترنم اور نعت کا موضوع، اس سب نے مل کر اس میں عجیب دلکشی اور دل آویزی پیدا کردی ہے۔ مولانا خود بھی اپنی آنکھوں کو قابو میں نہ رکھ سکتے اور سننے والے بھی متاثر اور آبدیدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکتے۔ مجھے یہ نعتیں بے حد عزیز ہیں۔ مجھ پر ان کا ایک احسان بھی تھا، انہوں نے مجھے مدینہ طیبہ میں بھی کیف و ذوق بخشا ہے۔ کبھی جی چاہتا کہ صرف ان نعتوں کے سننے کے لئے گیلانی کا سفر کروں۔ ایک پاک قطرہ اشک اس سفر کو وصول کرانے کے لئے بہت کافی ہے بلکہ

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز!

Marfat.com

اب یہ دولت گھر بیٹھے مل گئی تھی اس لئے کیوں نہ اس کی قدر کی جاتی۔ بار بار فرمائش کی اور مولانا نے بلا کسی تکلف کے فرمائش پوری کی اور "اجلس بنا نئومن ساعة" کا لطف بخشا۔ افسوس ہے کہ خرابی صحت کی بنا پر مولانا کا قیام طویل نہ ہوسکا اور مولانا نے وطن کی طرف مراجعت فرمائی اور ہم سب کہتے رہ گئے کہ

خوش درخشید ہ و لے دولت مستعجل بود

مولانا کا تعلق خاطر اس ناچیز و بے ہنر سے بڑھتا گیا اور واقعہ یہ ہے کہ مجھے بھی ان سے جو فکری مناسبت اور قلبی تعلق محسوس ہوتا وہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے اپنے ایک شفیق استاد اور عزیز بزرگ سے ہوتا ہے۔ ۵۴ء میں مولانا پر پہلی بار قلبی دورہ پڑا اور وہ گیلانی سے پٹنہ لے جائے گئے جہاں عرصہ تک علاج ہوتا رہا۔ گیلانی واپسی اور طبیعت کے سنبھلنے پر اس ناچیز نے بھی مزاج پرسی کا عریضہ لکھا۔ اس میں شاید اس شبہ کا اظہار تھا کہ مولانا اپنے اس نیاز مند سے کچھ ناراض یا کبیدہ خاطر تو نہیں ہیں۔ مولانا نے اس پر ایک نہایت پُر محبت و پُر شفقت مکتوب لکھا جس سے ان کے تعلق کا پورا اظہار ہوتا ہے اور اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کیسا محبت سے لبریز دل عطا فرمایا تھا۔

"ابھی ابھی آپ کا نوازش نامہ کیا آیا کہ دیر تک بکائی کیفیت میں الٹ پلٹ ہوتا رہا۔ اللہ اللہ آپ کے قلب مبارک میں خواہ بشکل وسوسہ ہی سہی یہ خیال کیسے اور کیوں آیا کہ

'اس مخلص نیاز مند کے دل میں آپ کی طرف سے کسی قسم کا تغیر پیدا ہو گیا'۔

واللہ جن ہستیوں کی محبت و اخلاص کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتا ہوں ان کی طرف سے تغیر پیدا ہونے کی شکل ہی کیا ہے۔ وانشد کم باللہ

حقہ مہر بداں مہر و نشان ست کہ بود

اپنی علالت کے ایام میں جب یہ محسوس ہوتا تھا کہ شاید اپنی یہ آخری علالت ہے تو من جملہ دوسرے خیالات کے ایک خیال آتا تھا جسے شیخ شناوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف لوگوں نے منسوب کیا ہے یعنی وفات کے وقت زبان مبارک پر جاری تھا۔

اهيم بليلى ما حييت و ان امت
أوكل بليلى من يهيم بها بعدى

پہلے مصرعہ کا مصداق تو کسی حیثیت سے اپنے آپ کو قرار دینے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا لیکن دوسرے مصرعہ میں جس آرزو کا اظہار کیا گیا ہے، یہ آرزو اپنے ساتھ بھی آتی اور معاً اسی کے ساتھ آپ کا وجود متمثل ہو کر سامنے کھڑا ہو جاتا۔ بیماری کے ان طویل دنوں میں کچھ دن بے ہوشی نیم بے ہوشی میں بھی گزرے لیکن بااینہمہ آپ کی نقل و حرکت کی خبریں کسی نہ کسی ذریعہ سے ملتی رہتی تھیں۔ رشک ضرور آتا تھا جب کوہ مری میں مولانا عبدالقادر مدظلہ العالی کی مجلس ذکر میں شرکت کا موقع حق تعالیٰ کی طرف سے آپ کے لئے مہیا کیا گیا، بڑے مبارک دن تھے جو آپ کے گزرے۔

(۲۹ ستمبر ۵۴ء)

مولانا کی علالت کا سلسلہ چلتا رہا اور ایسے وقفے بھی آتے رہے کہ مولانا بالکل صاحب فراش رہے اور کبھی کبھی تو زندگی خطرہ میں نظر آتی، بایں ہمہ مولانا کا علمی ذوق اپنا کام کرتا رہتا، ذرا طبیعت سنبھلتی تو لکھنے پڑھنے کا کام شروع کر دیتے، اپنے دوستوں اور نیاز مندوں کی کسی تحریر یا تصنیف سے متاثر ہوتے تو اپنے تاثر کی اطلاع دیتے۔ اگر کوئی اہم تصنیف شائع ہوتی اور مولانا کو نہ بھیجی جاتی تو شکایت فرماتے۔ اس خط سے ان کے علمی و ادبی ذوق و شغف کا اندازہ ہوگا جو گویا بستر علالت ہی سے لکھا ہے۔

''اگر یہ خیال فرمالیا گیا تھا کہ جو بیمار آخر بیم و امید کی کشمکش سے نجات پا کر وہاں پہنچ گیا یا پہنچا دیا گیا جہاں سے پہنچنے والوں نے یہ نعرہ بھی لگایا ہے کہ

تعالی اللہ ازیں بہتر چہ باشد
کہ ازننگ وجود خویش رستم

''سید احمد شہید'' غلام رسول مہر کے تقریظی مضمون [۹-۱] کو پڑھ کر خصوصاً مہر صاحب کے حسن انتخاب کی داد فارسی اشعار کے متعلق جو دی گئی ہے واقعہ یہ ہے کہ اکثر شعروں نے اس کو بھی زندوں کی طرح تڑپا دیا جسے مردہ تصور فرمالیا گیا ہے۔ بہرحال بیماری نے تو پیچھا نہیں چھوڑا ہے لیکن کش مکش سے ابھی نجات بھی نہیں ملی ہے۔ بلکہ ادھر کچھ مہینہ ڈیڑھ مہینہ سے کہہ سکتا ہوں کہ شکایات بے شمار کے بعض پہلوؤں میں گونہ تخفیف کی کیفیت محسوس کرتا ہوں۔

''البعث الاسلامی'' [۱۱] کا دوسرا شمار بھی باصرہ نواز ہوا، بڑے حوصلہ اور بڑی ہمت کا کام ہے، خدا کرے کہ ہمارے مدارس کے خوابیدہ بزرگوں کو جھنجھوڑنے میں یہ آواز کامیاب ہو۔''

کچھ تو مولانا کی افتاد طبع اور شاید خاندانی لینت و ورفق اور کچھ جامعہ عثمانیہ کے طویل تعلق اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور نئی نسل کے مسلسل سابقہ نے مولانا کی تحریر و تعبیر میں جدید ذہن کی رعایت اور دینی حقائق کے بیان کرنے میں حکمت و ترویج کا پہلو غالب کر دیا تھا اور وہ گویا کلموا الناس علی قد عقولھم کے مشورہ پر عمل فرماتے تھے اور اس کوادع الیٰ سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ کی تعمیل خیال فرماتے تھے۔ وہ اپنے عقائد و خیالات اور علم میں پورے راسخ و متصلب تھے، لیکن اپنے طرز بحث اور طرز تحقیق و استدلال میں بالکل عصری اور بقول مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ وہ دیوبندی العلم مگر ندوی الفکر یا ندوی القلم تھے اور شاید یہ بھی ہم لوگوں سے اور بالخصوص اس راقم سطور سے مناسبت کی وجہ تھی۔ ہمارے محترم و مخدوم مولانا عبدالباری صاحب ندوی العلم اور ندوی القلم ہونے کے باوجود اور برسوں یونیورسٹی میں فلسفہ کا درس دینے کے بعد بھی تحریر و تعبیر میں بھی کسی قسم کا لوچ اور جدید اسلوب بیان یا اسلوب استدلال پسند نہیں فرماتے۔ مولانا گیلانی کی کتاب ''اسلامی معاشیات'' پہلے طرز فکر اور طرز تحریر کا نمونہ ہے اور مولانا عبدالباری صاحب کی کتاب ''تجدید معاشیات'' دوسرے طرز فکر اور طرز تحریر کا۔ جب وہ شائع ہوئی تو شاید

Marfat.com

مولانا گیلانی کومحسوس ہوا کہ وہ ان کی کتاب کا جواب ہے۔ شاید اسی سلسلہ میں دونوں مخلص دوستوں اور دیرینہ رفیقوں میں کچھ مراسلت بھی ہوئی اور ہر ایک نے اپنا نقطہ نظر پیش کیا۔ مجھے اس کی اطلاع نہیں لیکن مجھے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

> (تھانوی المذاق ندوی القلم) بزرگ کا معتوب بنا ہوا ہوں کہ ان کی تازہ کتاب ''تجدید معاشیات'' کو اپنی کتاب ''اسلامی معاشیات'' کا تعریضی جواب خاکسار نے خیال کرلیا۔ خاکسار نے بھی اور ان کے دوست صاحب ''صدق'' نے بھی، مقصد میں ہم دونوں متحد ہیں لیکن پانی مانگنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ پن بھرن سے کہا جائے ماں! ذرا پانی پلا دے لیکن ماں کی جگہ کچھ دوسرے الفاظ والہ علی الامومت کا ذکر کیا جائے تو یقیناً اثر بدل جائے گا۔ حضرت تھانوی ہی سے یہ ظروفہ سنا کرتا تھا۔ بہرحال حکم فاصدع بما تؤمر کا بھی ہے اور ادع الی سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة کا بھی۔ مکلفین کے اختیار تمیزی کی یہ بات ہے کہ وقت کس کا ہے؟
> (۲۷ دسمبر ۱۹۵۵ء)

لیکن مولانا گیلانی رحمتہ اللہ علیہ کا یہ توسع اور ان کی تمام عصریت وحکمت تحریر وتعبیر اور استدلال ہی میں تھی۔ عقائد ونصوص اور حدود دین کے بارے میں وہ اتنے ہی متصلب ومتشدد اور ویسے ہی غیور وحساس واقع ہوئے تھے جیسے ان کے اساتذہ وشیوخ کرام اور علمائے حق۔ جب کبھی وہ تحریف دین کی کوئی کوشش یا دین کی کوئی ترجمانی میں کوئی بے اعتدالی یا آزادی یا غلط اجتہاد دیکھتے تو برداشت نہ کرسکتے۔ مولانا سندھی مرحوم جب ہندوستان واپس آئے تو ان مرحوم نے بعض ایسے خیالات اور افکار کا اظہار کرنا شروع کیا جن میں توازن کی بڑی کمی تھی اور جو بڑی غلط فہمیوں اور مغالطوں کا باعث ہوسکتے تھے۔ ان کے کسی مضمون میں قرآن وحدیث وفقہ سے متعلق بعض ایسے نظریات و ''تحقیقات'' تھے جو جمہور اہل اسلام کے عقیدہ سے مختلف تھے یا ان کی تعبیر میں کوتاہی تھی۔ مولانا نے مدرسی وجماعتی عصبیت سے بالکل بے نیاز وبالاتر ہوکر اس مقالہ کی تردید میں ایک پُرزور مقالہ لکھا، بعض اہل علم معاصرین مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم سے ذاتی واقفیت کی بناء پر ان کو اس شدید مخالفت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے مولانا کی طرف سے کچھ صفائی پیش کی اور اپنی ذاتی معلومات کی بناء پر ان کے ساتھ نرمی اور حسن ظن کی تلقین کی، مولانا نے اس موقع پر اپنے موقف کی حمایت کی اور مولانا سندھی مرحوم سے اظہار اختلاف اور ان کے افکار وآراء کی کھلی ہوئی تنقید وتردید کو دین کی حمایت کا تقاضا سمجھا۔ مندرجہ ذیل اقتباس سے ان کے دینی جذبہ اور تصلب فی الدین کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

> ''میرا تو مقصود ہی اس سے ع ''حدی را تیز ترمی خواں چو ذوق نغمہ کم یابی'' تھا۔ یہی بتانا چاہتا تھا کہ خواہ وہ ہماری جماعت ہی کا آدمی کیوں نہ ہو، لوگوں میں اس کی بڑائی جس حد تک بھی مسلم ہولیکن حق کا قدم جب درمیان میں آئے گا تو پھر کسی کا کچھ لحاظ نہیں کیا جائے گا۔ خواہ وہ کوئی ہو ولو ان فاطمة بنت محمد اعاذها الله تعالیٰ سرقت لقطعت یدها ہمارے دین کا

Marfat.com

امتیازی نشان ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا مرنے سے پہلے العیاذ باللہ میں بھی اس کا قائل ہو جاؤں گا کہ ابو حنیفہؒ کی فقہ عجمیوں کے قانون سے متاثر ہے اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیم سرزمین عرب کے ایک خاص تاریخی دور کی اصلاح کی حد تک محدود ہے۔ قرآنی قوانین کی حیثیت صرف مثالی باتوں کی ہے، بخاری و مسلم انجیل و تورات جیسی محرف کتابوں کے ہموزن ہیں۔ العیاذ باللہ کیا میں اپنی خودی کے اعتماد کو خدا اعتمادی سمجھنے لگوں گا، قبل اس کے کہ میرے اندر خدانخواستہ اس قسم کے خیالات کی صداقت واضح ہو اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اس دنیا سے اُٹھالے۔'' (یکم نومبر ۱۹۴۵ء)

اس اقتباس سے جو اپنی حمیت اور حفاظت دین کے جذبہ میں ڈوبا ہوا ہے، اندازہ ہوسکتا ہے کہ عقائد و نصوص اور دین کی ہیئت و حقیقت کی حفاظت میں مولانا کا قدم اور قلم کسی بڑے سے بڑے عالم راسخ سے پیچھے نہیں۔ دراصل ان کا سارا توسع طرز تحریر و طریقہ تفہیم میں تھا۔ ان کی کتابیں اور مضامین نئے اسلوب میں لکھے گئے ہیں اور کہیں کہیں تو وہ اپنی کتابوں میں تاریخی مواد اس سلیقہ اور ترتیب سے پیش کرتے ہیں اور اپنے دعوے کو ایسے علمی و تحقیقی انداز میں ثابت کرتے ہیں کہ وہ ایک قدیم مدرسہ کے فاضل اور ایک فقیہ و محدث ظاہر ہونے کے بجائے عصر حاضر کے مصنف اور اجتماعیات و علوم عمرانیہ کے فاضل معلوم ہوتے ہیں۔ نمونہ کے طور پر مولانا کا مضمون[۱۲] حضرت شاہ ولی اللہ صاحب پر اور مولانا کی محققانہ کتاب ''مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت'' نیز ''اسلامی معاشیات'' اور ''امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی'' ملاحظہ ہوں۔ مولانا کی اسی جامعیت نے ان کو اپنے معاصر علماء میں ایک امتیاز بخشا تھا اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو ان کی تصنیفات کا گرویدہ بنا دیا تھا۔

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق

جامعہ عثمانیہ اور حیدرآباد کے قیام نے مولانا کے اندر ایک تبدیلی اور پیدا کر دی تھی، یا یوں کہیے کہ ان کے اندر کی ایک دبی ہوئی صلاحیت کو اُبھار دیا تھا۔ وہ یہ کہ نئے تعلیم یافتہ طبقہ کے بہت سے افراد کے مشاہدہ و تجربہ نے ان کو اس نتیجہ پر پہنچا دیا تھا کہ صرف ظاہری شکل و صورت پر کسی شخص کے قبح باطن یا اس کے بے دین ہونے کا فیصلہ نہ کیا جائے۔ نیز یہ کہ اس کے قلب و اندرون کی اسلامیت کی قدر کرتے ہوئے اس کے ظاہر کی اصلاح کی کوشش کی جائے۔ اس طرز فکر اور اس طرز عمل کے بغیر کوئی شخص جدید حلقہ میں کوئی اصلاحی و دینی خدمت انجام نہیں دے سکتا۔ یہ راقم حروف جب ۵۶ء میں دمشق گیا تو وہاں اس نے مسلمان نوجوانوں اور خاص طور پر جماعت اخوان سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں میں یہی دو متضاد پہلو پائے۔ ایک طرف ان کی ظاہری شکل و صورت ہم جیسے مدرسی اشخاص کے لئے انقباض و اعتراض کا موجب تھی۔ دوسری طرف ان کی ایمانی کیفیات، ان کا جذبہ اسلامی، ان کی حمیت دینی، ذوق جہاد، نمازوں کی پابندی، عرب قوم پرستی سے بیزاری اور رشتہ اسلامی پر کامل یقین، الحاد اور اہل الحاد سے عداوت موجب مسرت و انبساط تھی اور بالآخر یہ دوسرا تاثر پہلے تاثر پر غالب آ جاتا۔ میں نے مولانا کی خدمت میں دمشق سے جو پہلا خط لکھا اس میں اپنی اسی ذہنی کش مکش اور تاثر کا اظہار تھا۔ مولانا نے اس کا جو جواب دیا وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

Marfat.com

''بڑی مسرت اس بات سے بھی ہوئی کہ مسلمانوں کو نئی پود کے متعلق آپ پہلے آدمی ہیں جن کے قلم سے میری آنکھوں نے وہی لکھا ہوا پایا جس کا برسوں سے انتظار کرتا رہا۔ ممکن ہے کہ یہی نقطہ نظر دوسرے ارباب فکر و بصیرت کا بھی ہو لیکن جن جچے تلے الفاظ میں اپنے احساسات کا اس سلسلہ میں آپ نے اظہار فرمایا ہے، خاکسار تو نکتہ چینیوں سے اتنی جرأت بھی نہیں کر سکتا۔ قالب و قلب میں اختلاف کی یہ صورت جب پیش آ جاتی ہے تو قلب ہی پر زیادہ نظر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرے خیال میں تو قالب و قلب یا ظاہر و باطن کے اختلاف کی یہ شکل اسلامی تاریخ میں نئی نہیں ہے۔ آغاز تو عہد صحابہ ہی میں معلوم ہوتا ہے کہ ہو چکا تھا۔ عمامہ پر ''پرعقاب'' لگا کر مدینہ میں داخل ہونے کا واقعہ کیا آج کا ہے؟ اور ''پرعقاب'' ہی کیا خز کے استعمال کی کثرت کے ساتھ ساتھ خود مدینہ منورہ کے باشندوں میں، تابعین و تبع تابعین ہی کے عہد سے جو تبدیلیاں لباس میں وضع میں قطع میں رہنے سہنے کے طریقوں میں مسلسل ہوتی ہیں۔ تاریخ ان کی شہادتوں سے معمور ہے، لیکن قلب اگر درست ہے تو قالب کی ان تبدیلیوں کو اکابر برداشت ہی کرتے چلے آرہے ہیں۔ اخوان شام کے دینی جوش و خروش، اخلاص و صداقت النصح للہ و لرسولہ للمؤمنین کی جن قلبی خصوصیتوں کا آپ نے ذکر فرمایا ہے اس کو جانتے ہوئے صرف قالب کے مطالبات میں ان کی کوتاہیاں اپنا خیال تو یہی ہے کہ درگزر کے قابل نہ بھی ہوں لیکن قول لیّن کا مستحق ان کو ضرور بنا دیتی ہیں۔ ہمارے علماء اگر فظاظت و غلظت ہی سے اس سلسلہ میں کام لینا ضروری قرار دیں گے تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کا نص محکم (لا نفضوا من حولک) کی شکل میں ان کے سامنے نہ آئے۔'' (۲۸ مئی ۱۹۵۶ء)

یہاں اس بات کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا کہ مولانا کو تاریخ اسلام سے فطری ذوق اور اس سرزمین سے جہاں اس تاریخ کی بنیاد پڑی ہے، ایک فطری لگاؤ تھا۔ شاید اسی راستہ سے ان کو عالم اسلام بالخصوص بلاد عربیہ کی سیاحت کا بڑا ارمان اور دیرینہ تمنا تھی۔ رسالہ ''صبح صادق'' لکھنؤ میں میرے خواہرزادہ عزیز مولوی محمد ثانی سلمہ کا سلسلہ مضامین ''جہاں مسلمان بستے ہیں'' کے عنوان سے نکلتا رہتا ہے جس میں مختلف ممالک اسلامیہ کا تعارف ہوتا ہے۔ مولانا نے لکھنؤ آمد کے موقع پر بتلایا کہ وہ اس کو بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔ اس تقریب سے انہوں نے اپنے شوق سیاحت کا تذکرہ اور اس کے بعض ابتدائی اقدامات کا ذکر فرمایا۔ راقم سطور نے دمشق پہنچ کر جس ہوٹل میں قیام کیا تھا حسن اتفاق سے اس کا نام ''الیرموک'' تھا۔ میں نے مولانا کی خدمت میں وہیں سے خط لکھا۔ دمشق پھر یرموک کے نام نے مولانا پر ایک وجد کی کیفیت طاری کر دی اور باوجود آخری علالت اور نقاہت کے ان کے قلم میں جوانی کی توانائی اور رعنائی پیدا ہوگئی اور میرے خط کے جواب میں انہوں نے یہ وجد انگیز خط لکھا جو ان کی ممتاز ادبی تحریروں میں شامل کیے جانے کا مستحق ہے۔

Marfat.com

''کس نے کہاں کن حالات میں اس زار و نزار، بیمار دور افتادہ دہقانی کو یاد فرمایا۔ سوچتا ہوں اور گو کھڑا ہونا بھی میرے لئے آسان نہیں ہے مگر بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ سجدہ شکر یاد دلانے والے کے قدموں پر ادا کر کے رقص کروں۔ خدا ہی جانتا ہے کہ الیرموک کی موجوں نے کن دبے دبائے تاریخی محفوظات اور ان سے پیدا ہونے والے جذبات میں طوفانی ہلچل برپا کردی ہوگی۔ جب اپنے آپ کو اس حال میں پا رہا ہوں کہ مکتوبہ شکل میں صرف الیرموک کے لفظ پر نظر پڑتے ہی تخیل کو آپ کے مشاہدے سے جو تھوڑا بہت سہارا ملا تو گھنٹوں یرموک اور جو کچھ اس کے ساحل پر گزرا اسی میں غرق ہو گیا الواقوصہ کی وادی میں پہاڑوں کے کھڈ میں ٹپک ٹپک کر کافر گر رہے ہیں اور ان کی بڑی تعداد یرموک برد ہو رہی ہے۔ ہم آگے بڑھ رہے تھے دنیا پیچھے ہٹتی جاتی تھی۔ پھر بازی پلٹی۔ ہوا جو کچھ ہوا۔ یہی کیا غنیمت نہیں ہے کہ الیرموک کے کنارے مسلمانوں کا پھریرا لہرا رہا ہے۔ فندق الیرموک شہر سے چاہیے تو یہی تھا کہ کافی فاصلہ پر ہو، گو اس عہد میں مسافت و فاصلہ کا سوال باقی نہیں رہا ہے یا آبادی دمشق کی پھیل کر الیرموک تک پہنچ گئی ہے۔[13]

بہر حال آپ نے بڑا احسان کیا جس سرزمین برکتوں سے بھری ہوئی کا تصور سالہا سال تک پالتا رہا ہوں اس کی چشم دید جھلک آپ کے موئے خامہ کے ذریعہ اس کوردہ گاؤں میں پہنچ گئی۔

فجزاکم اللہ عنا خیر الجزاء۔''

دمشق کے نام سے مولانا کے تاریخی اور علمی ذوق میں حرکت پیدا ہوئی اور ان کے تصور نے ان کو ایک گاؤں کے گوشہ عزلت اور بستر علالت سے اٹھا کر شام کے قدرتی مناظر، تاریخی مآثر اور علمی مراکز میں پہنچا دیا اور وہ یہ بالکل بھول گئے کہ وہ قلب کے مریض اور بقول خود ایک کہف کے گوشہ نشین ہیں۔ فرماتے ہیں:

''واقعی آپ کا وجود مسعود اس وقت کم از کم میرے لئے سراسر رشک و غبطہ بنا ہوا ہے۔ خیال شام کے ان مناظر کا ایک طرف ستاتا ہے جن کی تفصیل کرد علی صاحب کے ''خطط الشام'' میں پڑھ چکا ہوں اور دھیان ان اسلامی تعمیرات کی طرف منتقل ہوتا ہے جنہیں عمر بن عبدالعزیز جیسے بزرگوں نے اس لئے باقی رکھا کہ وہ غیظاً لقلوب الکفار نظر آتے ہیں۔ سب سے زیادہ تڑپ دل میں ان کتابوں کی پیدا ہو رہی ہے جن سے شام کے کتب خانے پٹے پڑے ہوں گے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ و ابن قیم، علامہ ذہبی السبکی و آلہ کے وطن میں جو کچھ مل رہا ہوا سے ملنا ہی چاہیے۔ یوم المحاظرہ کے بعد تو ہفتہ بھر آپ کا ان ہی چیزوں کی سیر و تماشے میں بسر ہوتا ہوگا۔ معلوم نہیں کہ ''دُوَل الاسلام'' ذہبی کا مکمل نسخہ اور ''مرآۃ الزمان'' ابن الجوزی السبط کی طباعت کا انتظام کیا گیا ہے۔ جی چاہتا تھا کہ مرنے سے پہلے کم از کم دونوں کتابوں کے مطالعہ کا موقع مل

Marfat.com

جاتا۔ ابن عساکر کی "تاریخ دمشق" خدا جانے مکمل ہو کر بازار میں آ گئی یا نہیں۔ میرے پاس تو صرف ابن بدران کی تلخیص کی ساتویں جلد تک ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ دو مختلف وادیوں کے شیخ یعنی شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور الشیخ الاکبر ابن عربی دونوں کے لئے دمشق کے آغوش میں جگہ نکل آئی۔ اس زمانہ میں شیخ الاسلام کے عقیدت مندوں کی تو کافی جماعت ہوگی۔ کیا بے چارے الشیخ الاکبر کی اکبریت کو باقی رکھنے کے لئے بھی کوئی کھڑا کر دیا گیا ہے۔ ابن تیمیہ اور ان کے تلامذہ راشدین کی کوئی غیر مطبوعہ نادر کتاب آپ کی پسند کی کیا ملی؟ ان بزرگوں کے لئے تو یورپ کے عصری مذاق کی رو سے چاہیے تھا کہ الگ الگ سوسائٹیاں شام میں بن جائیں جو ان کی اصل کتابوں کو بھی شائع کرتیں اور ان کے علمی و نظری اختراعات و تخلیقات پر کام کرتیں۔ یہ اور اسی قسم کے وساوس و اوہام میں اپنے بستر علالت پر دو ڈھائی سال سے کروٹیں بدل رہا ہوں۔" (۲۶ مئی ۱۹۵۶ء)

اس مکتوب گرامی کا جواب دینے کی نوبت نہ آئی تھی کہ ترکی کا سفر پیش آ گیا۔ قسطنطنیہ سے تو کسی خط کے لکھنے کی نوبت نہ آئی کہ سارا دن وہاں کے تاریخی آثار کے دیکھنے میں گزر جاتا مگر قونیہ پہنچ کر اور مولانا روم کے مزار کی زیارت کر کے بے اختیار مولانا یاد آئے اور ان کو اور مخدومی مولانا عبدالماجد دریابادی کو اپنے تاثرات لکھنے کا جی چاہا۔ وہیں قونیہ کے ایک روزہ قیام میں خط لکھا اور ڈاک کے سپرد کیا۔ دمشق پہنچ کر اس کے جواب کی توقع تھی۔ معلوم نہیں دمشق و یرموک کی طرح مولانا اور ان کے محبوب شہر کا نام سن کر مولانا کے قلب پر کیا اثر ہوتا اور ان کے قلم سے کیا تاثرات ظاہر ہوتے۔ دمشق واپس ہوا تو برادر معظم ڈاکٹر عبدالعلی صاحب مدظلہ کا گرامی نامہ ملا جس نے یہ خبر سنائی کہ مولانا سفر آخرت پر روانہ ہو گئے اور اپنے خالق سے جا ملے۔ یہ ایک دینی، علمی، ادبی حادثہ تھا اور میرے لئے ایک ذاتی حادثہ بھی۔ میرا تعلق مولانا سے صرف ذہنی و علمی ہی نہ تھا شخصی اور قلبی بھی تھا۔ مسافرت میں ایسا معلوم ہوا کہ ایک بزرگ خاندان کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ جہاں تک علم و دین اور فضیلت و تحقیق کا تعلق ہے مولانا ہماری گزشتہ دینی تعلیم کے بہترین نمونوں میں تھے اور مدارس کے دور انحطاط کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ

ترکش مارا خدنگ آخریں

بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے وسعت نظر، وسعت مطالعہ، رسوخ فی العلم اور ذکاوت میں ان کی نظیر اس وقت ممالک اسلامیہ میں ملنی مشکل ہے۔ والغیب عند اللہ۔ تصنیف و تالیف کے لحاظ سے وہ عصر حاضر کے عظیم مصنفین میں شمار کئے جانے کے مستحق ہیں۔ انہوں نے اپنی کتابوں میں جو مواد جمع کر دیا ہے وہ بیسیوں آدمیوں کو مصنف اور محقق بنا سکتا ہے۔ اس ایک آدمی نے تن تنہا وہ کام کیا ہے جو یورپ میں پورے پورے ادارے اور منظم جماعتیں کرتی ہیں۔ ان جیسا آدمی برسوں میں پیدا ہوا تھا اور اب ان جیسا آدمی شاید برسوں میں بھی پیدا نہ ہو۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

Marfat.com

اللہ تعالیٰ جانے والے پر اپنی بے شمار رحمتیں نازل فرمائے اور اپنے انعامات سے مالا مال کرے کہ وہ بڑا درد مند، بڑا پُر محبت دل رکھتا تھا اور اس کے قلب و دماغ کی ساری صلاحیتیں کسی نہ کسی طرح اسی ''الاسلام'' کی خدمت میں (جس کے سوا کوئی دین اس کے یہاں قبول نہیں) اور اسی النبی الخاتم کی ابدی نبوت و سیادت کے ثبوت میں اور اسی کے علوم کی نشر و اشاعت میں جس کے بعد کوئی رسول آنے والا نہیں، صرف ہوئیں۔ وہ جب تک زندہ رہا اسی کے گن گا تا رہا اور اپنے دیس کی بے تکلف بولی میں اس کو خطاب کر کر کے سنا تا رہا۔

تجھ سے توڑوں تو کس سے جوڑوں — تیری گلی کی دھول بٹوروں

یقین کامل ہے کہ خدا کی رحمت کاملہ نے اس کو اسی محبوب کے عشاق اور اس کے دین کے مخصوص خدام میں شامل فرمایا ہوگا جس کا کام کرتا ہوا وہ زندہ رہا اور جس کا نام لیتا ہوا وہ دنیا سے رخصت ہوا۔

مرگ مجنوں پہ عقل گم ہے میرؔ — کیا دیوانے نے موت پائی ہے

حواشی

۱۔ اس کا بہترین نمونہ ان کی تصنیف ''تدوین حدیث'' ہے۔

۲۔ مولانا ابو اللیث ندوی امیر جماعت اسلامی ہند

۳۔ خط پر تاریخ نہیں ہے۔ ڈاکخانہ کی مہر ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۱ء کی ہے۔

۴۔ اشارہ ہے راقم سطور کے رسالہ ارید ان اتحدث الی الاخوان کی طرف۔

۵۔ اخوان کی عملی سیاست میں شرکت۔

۶۔ سوڈان میں بعض مسجدوں میں وہاں کے مشہور شیخ طریقت السید علی میرغنی باشا کی تصویریں آویزاں ہیں۔

۷۔ جامعہ ازہر مصر

۸۔ اعفاء کے معنی چھوڑنے اور بڑھانے کے ہیں۔ عفا یعفو کے معنی مٹنے کے ہیں۔ یہ مصرعہ لبید کے معلقہ کا ہے۔

۹۔ مولانا کا مستقل خیال تھا کہ موجودہ مغربی تمدن مسیحیوں کے عقیدہ ولدیت کا نتیجہ ہے۔ ملاحظہ ہو سلسلہ مضامین ''دجالی فتنہ'' ''الفرقان''

۱۰۔ سید احمد شہید'' مصنفہ مولانا غلام رسول مہر پر مفصل تبصرہ۔ شائع شدہ ''الفرقان''

۱۱۔ عربی ماہوار رسالہ

۱۲۔ شائع شدہ ''الفرقان''۔ شاہ ولی اللہ نمبر

۱۳۔ دراصل ہوٹل کا نام صرف تبرکاً ''الیرموک'' رکھا گیا ہے ورنہ الیرموک کے نام کا دریا اور اس کے ساحل کا میدان جنگ دمشق سے بہت فاصلہ پر شرق اردن کے حدود میں واقع ہے۔

(در: ماہنامہ ''الفرقان'' (لکھنؤ)، افادات گیلانی نمبر، ص ۱۷۔ ۳۸)

☆......☆......☆

Marfat.com

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

مولانا مناظر احسن گیلانی......نقوش و تاثرات

مولانا مناظر احسن ضلع پٹنہ کے ایک گاؤں گیلانی کے رہنے والے تھے۔ یہ گاؤں راقم کے وطن دیسنہ سے دو کوس کے فاصلہ پر ہے اور ضلع پٹنہ کی مشرقی سرحد کا آخری گاؤں ہے۔ اس کے بعد مونگیر کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ اس کا ڈاک خانہ بر بگھہ ہے جو گیلانی سے ایک میل پر مونگیر میں ہے۔ اس لئے مولانا مرحوم سے خط و کتابت کرنے والے ان کو ضلع مونگیر کے ضلع کا باشندہ سمجھتے تھے لیکن وہ دراصل پٹنہ ضلع ہی کے رہنے والے تھے۔

یہ سطور لکھتے وقت ۱۹۲۰ء کا زمانہ یاد آ رہا ہے جبکہ راقم کے وطن دیسنہ کی آب و ہوا وبائی امراض کی وجہ سے خراب ہوگئی تھی۔ اس لئے گھر کے تمام لوگ گیلانی منتقل ہوئے تھے جہاں ہمارے بعض خاص اعزہ بھی رہتے تھے۔ ہم جس عزیز کے گھر میں مقیم تھے اسی کے سامنے ایک بڑا مکان تھا جس سے مکینوں کی خوشحالی اور فارغ البالی کا اندازہ ہوتا تھا۔ راقم اس زمانہ میں سن شعور کو بھی نہ پہنچا تھا لیکن کانوں میں یہ آواز پڑی کہ یہ مکان مولانا مناظر احسن صاحب کا ہے اور گھر میں ان کے متعلق احترام و عقیدت کی جو باتیں سنیں ان سے یہ اندازہ ہوا کہ کوئی بڑے اچھے مولانا صاحب ہیں اور شوق پیدا ہوا کہ کاش ان کو دیکھتا۔

غالباً ۱۹۲۱ء کا زمانہ تھا، ترک موالات کی تحریک زور پر تھی۔ اس وقت راقم اس تحریک کی نوعیت کو سمجھنے سے قاصر تھا لیکن گھر کے بعض بزرگوں کو مولانا مناظر احسن کی ایک نظم پڑھتے سنا، جس کے معنوی تو نہیں لیکن صوتی اثرات دل پر ایسے قائم ہوئے کہ مولانا کی ذات گرامی سے دلچسپی کچھ اور بڑھی۔ گھر میں ان کا ذکر برابر ہوتا رہتا تھا۔ وہ اس وقت جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں لیکچرار ہو چکے تھے اور ان کی علمی قابلیت و استعداد کے چرچے سے کان آشنا ہونے لگے تھے۔ گھر میں اعزہ ان سے زیادہ ان کے دادا، چچا اور والد کے فضائل کا ذکر کرتے جنہیں سن کر دل میں یہ اثر ہوا کہ مولانا ایک بڑے اہل علم خاندان کے فرزند ہیں۔ ان کے دادا مولانا سید محمد احسن اپنے زمانہ کے جید عالم تھے۔ یہ معلوم کر کے اور تعجب ہوا کہ انہوں نے شادی اور صاحب اولاد ہونے کے بعد تعلیم شروع کی تھی۔ اس کا واقعہ یہ ہے کہ جب ان کے پہلی اولاد ہوئی تو کسی نے ان کے ان پڑھ ہونے پر طنز کیا۔ اس کا ان کے دل پر اتنا اثر ہوا کہ وہ چپکے سے تعلیم کے لئے گیلانی سے نکل کھڑے ہوئے اور بنارس، لکھنؤ اور رام پور میں تعلیم حاصل کر کے چودہ سال کے بعد وطن لوٹے

Marfat.com

اور جب ان کے علم کی شہرت پھیلی تو نہ صرف اطراف و جوانب بلکہ مختلف صوبوں سے طلبہ آ کر ان سے فیض حاصل کرنے لگے۔ ان کے شاگردوں میں ملا عبداللہ ہزارہ صوبہ سرحد کے تھے، وہ مولانا کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ گیلانی ہی میں متوطن ہو گئے۔ ملا عبداللہ کے زہد و تورع کے قصے اطراف و جوانب میں اب بھی شوق سے کہے اور سنے جاتے ہیں۔ مولانا احسن کے شاگردوں میں مولوی محمد رفیع صاحب (شکرانواں ضلع پٹنہ) مولوی عبدالغفور صاحب (کوئند ضلع پٹنہ) اور مولوی محمد اسماعیل صاحب (رمضان پور ضلع پٹنہ) بھی تھے۔ یہ تینوں اپنے اطراف کے بڑے رئیس بھی تھے۔

مولانا احسن کے دو صاحبزادے تھے۔ مولانا حاجی ابونصر اور مولانا حافظ ابوالخیر جو مولانا مناظر احسن کے والد تھے۔ مولانا ابونصر اپنے علم و فضل اور شعر و شاعری کے ذوق کی وجہ سے اپنے ہم چشموں میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ انہوں نے بھی رام پور اور لکھنؤ میں تعلیم پائی تھی۔ مولانا مناظر احسن نے ان ہی سے ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ ان کے والد حافظ ابوالخیر صاحب زیادہ تر زمینداری اور کاشتکاری کے کاموں میں لگے رہے۔ ان کو آموں کے باغ لگانے کا بڑا شوق تھا اور ان کے باغ کے آم دور دور تک مشہور تھے۔ بڑے مخیر اور فیاض تھے۔ ان کی سخاوت و فیاضی کے واقعات سن کر دل پر یہ اثر تھا کہ مولانا مناظر احسن ایسے گھر کے چشم و چراغ ہیں جہاں علم و فضل کے علاوہ خوشحالی اور فارغ البالی بھی ہے اس لئے ان کی زیارت کی خواہش دل میں روز بروز بڑھتی گئی۔

دسمبر ۱۹۲۳ء کے آخری ہفتہ میں دیسنہ میں ایک تقریب تھی جس میں شرکت کے لئے حضرت مولانا سید سلیمان ندوی بھی اعظم گڑھ سے وطن تشریف لائے تھے۔ ایک رات وہ صاحب تقریب کے گھر میں بیٹھے تھے کہ معلوم ہوا کہ مولانا مناظر احسن، گیلانی سے تشریف لائے ہیں اور حضرت سید صاحب سے ملنے کے لئے آ رہے ہیں۔ دل میں ان کی زیارت کا اشتیاق عرصہ سے تھا اس لئے اس خبر سے بڑی مسرت ہوئی اور تھوڑی دیر میں میانہ قد، گندمی رنگ کا ایک خوش وضع اور دلکش انسان میری نگاہ کے سامنے تھا اور دل نے محسوس کیا کہ اس دلکش جسم میں ایک لطیف روح بھی ہے۔ ان کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک اور چہرہ پر بزرگی اور تمکنت کے آثار نظر آئے۔ حضرت سید صاحبؒ نے اٹھ کر ان سے معانقہ کیا اور جب دونوں میں باتیں شروع ہوئیں تو مجلس کے اور شرکاء خاموشی سے سننے لگے۔ میں بھی ایک گوشہ میں بیٹھ کر اپنی آنکھوں سے اپنی جنت آرزو کی سیر کرنے لگا۔ دونوں بزرگ مختلف علمی، مذہبی اور سیاسی مسائل پر گفتگو کر رہے تھے جس کو میں اچھی طرح سمجھنے سے قاصر تھا لیکن اس صحبت کی لذت آج تک یاد ہے اور جب کبھی اس کو یاد کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ایک برج میں دو قمر کو دیکھ رہا تھا۔ اس مجلس میں ان بزرگوں کا جو احترام ہو رہا تھا اس سے یہ خیال پیدا ہوا کہ اہل علم ہونا کتنی قابل قدر چیز ہے اور معاً یہ خواہش بھی ہوئی کہ کاش میں بھی ان بزرگوں کی خاک پا ہوتا۔

اس ملاقات کے ایک طویل عرصہ کے بعد جب میں سکول کی تعلیم ختم کر کے کالج میں پڑھ رہا تھا ایک دن خبر ملی کہ مولانا حیدر آباد سے آئے ہیں اور علاج کے لئے پٹنہ کے ہسپتال میں داخل ہیں اور ایسا معلوم ہوا کہ وہ مجھ کو اپنی طرف کھینچ کر ہسپتال بلا رہے ہیں۔ گو اب تک میرا تعارف ان سے نہیں ہوا تھا لیکن میں ان کی زیارت کے لئے ہسپتال پہنچ گیا۔ ان کی عیادت کے لئے اور لوگ بھی آئے ہوئے تھے۔ میں ان کے کمرہ میں جا کر ایک گوشہ میں کھڑا ہو گیا اور

Marfat.com

ان کو دیکھتا رہا۔ ان کا کوئی آپریشن ہوا تھا جس کی تکلیف سے نڈھال تھے لیکن مجھ کو ان کے شرف دیدار سے بڑی تسکین ہوئی مگر ان سے مخاطب ہونے کی جرأت نہ کر سکا اور تھوڑی دیر ٹھہر کر خاموشی سے باہر چلا آیا۔ اس طرح کئی دن برابر ہسپتال گیا اور صرف ان کو دیکھ کر لوٹ آتا اور اسی میں اپنی سعادت سمجھتا رہا اور ان کے لئے دل سے دعائیں نکلتی رہیں اور جب وہ شفایاب ہو کر ہسپتال سے چلے گئے تو مجھ کو بھی بڑی مسرت ہوئی۔

طالب علمی ہی کے زمانہ میں ایک روز سننے میں آیا کہ مولانا نے اپنے ننہال استھانواں میں ایک پُر زور تقریر کی ہے اور اس میں حضرت مولانا سید سلیمان ندوی سے محض معاصرانہ چشمک کی بنا پر ان کی بعض تصانیف پر اعتراضات اور ان کے بعض اشعار پر نکتہ چینی کی ہے مگر میرا دل اس کو قبول کرنے کے لئے کسی طرح تیار نہیں تھا لیکن کچھ لوگ اس واقعہ کو ہوا دیتے رہے اور اس کی خبر حضرت سید صاحب تک بھی پہنچائی اور اس کا ذکر نجی صحبتوں میں بھی برابر جاری رہا۔ اتفاق سے اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد مارچ ۱۹۲۹ء میں مولانا کا ایک مضمون حضرت حکیم مولانا سید برکات احمد ٹونکی رحمتہ اللہ علیہ کے عنوان سے ''معارف'' میں چھپا اور اس کو حضرت سید صاحب نے سر مقالہ شائع کیا۔ اس کو دیکھ کر معاً یہ خیال آیا کہ دونوں بزرگوں کے دل ایک دوسرے سے بالکل صاف ہیں۔ ان میں خواہ مخواہ بدگمانی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔

اس مقالہ میں مولانا نے اپنے دادا مولانا محمد احسن کا ذکر مولانا برکات احمد کے والد حکیم دائم علی کے استاد کی حیثیت سے کیا تھا۔ ''معارف'' کے ناظرین کی یاد تازہ کرنے کے لئے وہ سطریں یہاں نقل کی جاتی ہیں جن سے مولانا کے خاندان سے متعلق کچھ مفید معلومات بھی حاصل ہو جائیں گے۔

> ''......سیدوں کی ایک بستی گیلانی ہے۔ اس زمانہ میں وہاں سرخ و سفید عمارت میں نہیں، ہزاروں روپے کے فرنیچر کے درمیان نہیں بلکہ ایک عام مسجد کے کنارے برگد کے درخت کے نیچے کھلے ہوئے تخت پر خاک نشینوں کی ایک یادگار صرف حاضری کے رجسٹروں کی تکمیل نہیں کر رہا تھا بلکہ ایک طرف ہدایہ اور تلویح، دوسری طرف چغمنی اور افق المبین جیسی سنگلاخ کتابوں سے لطیف حقائق اور دقیق نکات و مسائل کے جھرنے جاری کر رہا تھا۔ وہ کسی وقت اگر منطق و مابعد الطبیعیات کے رموز اور پیچیدہ غوامض پر شستہ تقریر کرتا تھا تو دوسرے وقت قاضی بیضاوی کے تفسیری اسرار اور تفتازانی کے بیان و بدیعی نظرات کو مفت بانٹ رہا تھا۔ ان کا نام مولانا محمد احسن گیلانی تھا، جو اپنے وقت میں صوبہ کے سرآمد روزگار فضلا میں شمار کیے جاتے تھے اور جن کی تہذیب و تدوین تحشیہ و تصحیح سے طوسی کے اقلیدس کا پہلا مقالہ عربی مدارس میں اس وقت تک پڑھایا جاتا ہے۔''

میرے دل پر مولانا کی خاندانی عظمت کا نقش پہلے ہی سے تھا۔ مندرجہ بالا سطور پڑھ کر اور بھی گہرا ہو گیا۔ اب مولانا کی علمی شہرت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی اور ان کا ذکر ایک شیریں بیاں مقرر، جید عالم، لائق معلم

Marfat.com

اور زود نویس اہل قلم کی حیثیت سے برابر سنتا رہا۔
اس کے بعد ۱۹۳۱ء میں مولانا محمد علی کی وفات پر ان کا مرثیہ پڑھ کر میرا دل اُن کی طرف اور مائل ہو گیا۔ مولانا محمد علی مرحوم سے مجھ کو بڑی عقیدت تھی۔ ان کو محبت و اخلاص، ہمت و جرأت، جوش و عمل، ایثار و قربانی، جانبازی و سرفروشی، رواداری اور حب الوطنی کا بہت بلند نمونہ سمجھتا تھا۔ ان کی قدر اس لئے بھی زیادہ دل میں تھی کہ اگر ایک طرف وہ اعلیٰ کردار کے محبِّ وطن تھے تو دوسری طرف شیر دل مسلمان بھی۔ اگر غلامی کی زنجیر توڑنے کے لئے سیاسی تحریک میں پیش پیش رہے تو ساری عمر توحید کے فدائی اور شمع رسالت کے پروانہ بھی رہے۔ ان کی موت پر سارا ہندوستان سوگوار تھا۔ دنیا کے گوشہ گوشہ سے ان کے ماتم و شیون کی صدائیں بلند ہوئیں۔ مشہور انگریز مصنف ایچ۔ جی۔ ویلز نے ان کی رحلت سے متاثر ہو کر یہ کہا تھا کہ ان کا دل نپولین کا تھا، ان کی زبان برک کی تھی اور ان کا قلم میکالے کا تھا اور اس وقت کے وزیر ہند مسٹر بن نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ وہ ایک جلیل القدر مسلمان، ایک زبردست محبِّ وطن اور عام انسانیت کے ایک عظیم المرتبت پیغمبر تھے لیکن ان بیانات کو پڑھ کر مولانا محمد علی کے فدائی کی حیثیت سے پندار تو ضرور محسوس ہوتا لیکن غمناک جذبات کی تسکین نہ ہوئی مگر ان پر جب مولانا مناظر احسن کا مرثیہ شائع ہوا تو ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے جراحت دل پر مرہم رکھ دیا ہے۔ اس کو بار بار پڑھ کر دل کو تسکین دیتا۔ ناظرین بھی اس سے محظوظ ہولیں۔

به دین مصطفیٰ دیوانه بودی — فدائے ملت جانانه بودی
به بزم ما رئیس عشقیازاں — به رزم دشمناں فرزانه بودی
به دل بودی فقیرے بے نوائے — به قالب پیکر شاہانه بودی
سیاست رانقاب چہرہ کردی — وگرنہ عاشق مستانه بودی
سیاست تہمتے بر عشق پاکت — ز آئین خردبیگانه بودی
بایمانہاز . تو زورے وشورے — بجانہا ہمت مردانه بودی
چه دانستی کجا سوزم نه سوزم — تو . شمع دین را پروانه بودی
رسیدی ازراہ اغیار تا یار — عجب مستے عجب دیوانه بودی
چه آمد برسرِ رنداں که آں را — خم و خمخانه و پیمانه بودی

ان ہی دنوں یہ روایت ملی تھی کہ مولانا جب حیدر آباد کے ایک تعزیتی جلسہ میں یہ مرثیہ پڑھنے لگے تو خود دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ حالانکہ ان کا خود بیان تھا کہ وہ نہ کبھی مولانا محمد علی سے ملے تھے اور نہ ان کو دیکھا تھا لیکن ان سے غیر معمولی محبت رکھتے تھے جو ان کے درد منداور حساس دل کے مالک ہونے کی دلیل تھی۔
تعلیم ختم کرنے کے بعد جب میں دارالمصنفین آیا تو ایک روز حضرت سید صاحب کی ڈاک میں مولانا کا رسالہ ''النبی الخاتم'' دیکھ کر بڑے شوق سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کے دیباچہ میں حسب ذیل سطروں پر نظر پڑی۔

''علامہ شبلی مرحوم اور ان کے جانشین برحق مولانا سید سلیمان ندوی نے سیرۃ النبیؐ کے ذریعہ سے

Marfat.com

اردو زبان کو مضامین سیرت طیبہ سے مالا مال کر دیا ہے تا اینکہ دوسری اسلامی زبانوں کو بھی اردو کی اس جامع شگفتہ اور مستند کتابوں کا ترجمہ کرنا پڑا۔"

اس کو پڑھ کر یہ خلش بالکل جاتی رہی کہ مولانا کو حضرت سید صاحب سے معاصرانہ چشمک ہے اور اس پر سید صاحبؒ نے "معارف" میں ایک بہت اچھا ریویو شائع کرایا جو حسب ذیل ہے:

"النبی الخاتم ......ایک گلدستہ عقیدت ہے جسے مولانا مناظر احسن کے عقیدت مند قلم نے سجایا ہے۔ اس میں مولانا نے اپنے خاص والہانہ رنگ میں سیرت پاک کے واقعات کو ایک خاص انداز اور ترتیب کے ساتھ پیش کر کے نہایت لطیف نتائج پیدا کئے ہیں۔ اس حیثیت سے یہ اپنے طرز میں منفرد ہے کہ تاریخی واقعات کو وارفتگی بیان کے ساتھ اس طرح نبھایا گیا ہے کہ ناقد مورخین اور ارباب وجد و حال دونوں اپنے اپنے ذوق کے مطابق لطف اٹھا سکتے ہیں۔ زبان صاف و سادہ لیکن صنائع لفظی سے مالا مال ہے۔"

خود مولانا اپنی تمام تصانیف میں اسی کو سب سے زیادہ پسند کرتے تھے۔ حضرت سید صاحب نے نجی صحبتوں میں بھی اس رسالہ کی تعریف کی اور جب مولانا کا ذکر آتا تو ان کے شیریں اخلاق، میٹھی میٹھی باتوں اور لطائف و ظرائف کو بڑے لطف سے بیان کرتے جس سے ثابت ہوتا تھا کہ دونوں کے درمیان معاصرانہ چشمک کی روایت سراسر غلط ہے بلکہ دونوں کے درمیان اخلاص و محبت کی نہریں رواں ہیں۔ دونوں میں خط و کتابت بھی رہتی تھی۔ مولانا سید صاحب کو کبھی "سید الامام" کبھی "سیدی" اور "سید المرسلین" لکھ کر مخاطب فرماتے اور اس طرح خط لکھتے جیسے کوئی چھوٹا عزیز اپنے کسی بہت ہی شفیق بزرگ کو لکھتا ہے۔ کسی میں ان کی علمی کمال اور ادبی فضیلت کا اعتراف کرتے۔ کسی میں ان کی کسی تصنیف یا مضمون کی داد دیتے۔ کسی میں ان کے ذاتی اوصاف مثلاً روحانیت، حلم، بردباری، لینت، شرافت کا ذکر کرتے اور غایت انکسار میں اپنے کو محض مور ضعیف ہی ثابت کرنے کی کوشش کرتے۔ حضرت سید صاحب بھی ان کو "محب اعز و اعز" لکھ کر اپنا مکتوب شروع کرتے اور دونوں اپنے خطوط میں علمی مسائل کے علاوہ خانگی و نجی باتوں سے متعلق بھی ایک دوسرے سے مشورے کرتے رہتے ہیں اور مجھ کو اندرونی طور پر خوشی ہوتی کہ دونوں ایک دوسرے سے بہت قریب تر ہیں۔

۱۹۳۷ء سے پہلے مولانا نے تین رسالے لکھے تھے۔ "روحانی کائنات"، "حضرت ابوذر غفاریؓ" اور "النبی الخاتم"۔ یہ راقم اپنی علمی بے مایگی کی وجہ سے ان سے اتنا لطف اندوز نہ ہو سکا جتنا کہ ہونا چاہیے تھا لیکن ۱۹۳۸ء میں جب "الفرقان" کا مجدد الف ثانی نمبر شائع ہوا اور اس میں مولانا کا مضمون "الف ثانی (یا ہزارہ دوم) کا تجدیدی کارنامہ" پڑھا تو ایسا معلوم ہوا کہ ہندوستان کے مغلیہ عہد کی تاریخ کی تمام گرہیں کھل گئیں۔ راقم کا خاص موضوع ہندوستان میں اسلامی عہد کی تاریخ رہا ہے۔ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد تیموری دور کی تاریخ سمجھنے میں ایک خاص زاویہ نظر ملا۔ دین الٰہی پر مضامین برابر پڑھتا رہا تھا۔ ملا عبدالقادر بدایونی کی "منتخب التواریخ" (جلد سوم) میں تو اس کی

Marfat.com

تفصیل ملتی ہے جو چار سو صفحوں میں انتہائی بے ترتیبی کے ساتھ منتشر ہے۔ مولانا نے پہلی دفعہ ترتیب و تنظیم کے ساتھ اکبر کی اس بدعت سیئہ کا احاطہ کیا اس لئے مجھ پر ان کی عالمانہ تحقیق و تنقیح کا بڑا گہرا اثر پڑا۔ ان مباحث کی تعلیل و توجیہ کے سلسلہ میں جو موشگافیاں انہوں نے کی ہیں ان سے ان کی غیر معمولی ذہانت اور ذکاوت کا اندازہ ہوا۔ اس مضمون نے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ آخر کیا بات تھی کہ اکبر نے دین الٰہی تو قائم کیا لیکن جہانگیری عہد سے پہلے یہ آپ اپنی موت مر گیا اور پھر شاہجہانی عہد میں اسلام اور اسلامی روایات کی جو تجدید شروع ہوئی تو عالمگیر کے عہد میں انتہا کو پہنچ گئی اور گو غیر مسلموں کے نزدیک آج عالمگیر اور تعصب مترادف الفاظ بن گئے ہیں، لیکن اسی مضمون کو پڑھ کر اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر اکبر نے دین الٰہی کے ذریعے اسلام اور شعائر اسلام کی توہین و تحقیر بلکہ بیخ کنی نہ کی ہوتی تو شاید ہندوستان کی تاریخ میں کوئی عالمگیر نہ پیدا ہوتا اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آئندہ بھی جب کوئی اکبر پیدا ہوگا تو کچھ عرصہ کے بعد عالمگیر بھی ضرور افق پر نمودار ہوگا۔ مولانا نے اپنے مقالہ میں یہ پوری طرح واضح کیا ہے کہ رواداری کے نام پر اکبر نے جو پالیسی اختیار کی تھی، وہ دراصل ارتداد، الحاد اور بے دینی تھی جو اکبر کے بعد بھی مختلف شکلوں میں ابھرتی رہی۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ اور ان کے پیرو اس کو مٹانے کی کوشش میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ ملک ذہنی حیثیت سے دو جماعتوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک نے اکبر کے روحانی جانشین دارا کی تائید کی اور دوسری نے عالمگیر کی حمایت کی۔ داراشکوہ اکبر کی روایت کو زندہ کرنا چاہتا تھا اور عالمگیر حضرت مجدد الف ثانیؒ کے تجدیدی کارناموں کو روشن رکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے دارا اور اورنگ زیب کی جنگ گو بظاہر تخت و تاج کی لڑائی تھی لیکن دراصل دو نظریوں اور دو تحریکوں کا تصادم تھا۔ ایک کا سلسلہ اکبر سے ملتا تھا اور دوسرے کا حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تعلیمات سے شروع ہوتا تھا کیونکہ عالمگیر حضرت مجددؒ کے صاحبزادے حضرت میر معصوم کے حلقہ ارادت میں بھی داخل تھا اور اس کے سیاسی کاموں میں حضرت معصوم کے مشوروں کو بڑا دخل رہا ہے جیسا کہ ان کے مکاتیب سے پتہ چلتا ہے اور بقول مولانا مناظر احسن گیلانی جس تجدیدی عمل کی ابتدا جہانگیر سے ہوئی اس کا انتہائی کمال عالمگیر کی ذات پر ہوا۔ ایک بار حضرت سید صاحب نے راقم سے فرمایا تھا کہ داراشکوہ تخت پر بیٹھتا تو مسلمانوں کی سلطنت تو باقی رہتی لیکن اسلام ختم ہو گیا ہوتا۔ عالمگیر کے تخت پر بیٹھنے سے اس کے بعد مسلمانوں کی سلطنت تو باقی نہیں رہی لیکن اسلام باقی رہا۔ اس اجمال کی تفصیل سمجھنے میں مولانا کے مضمون سے بڑی مدد ملی اور سچ تو یہ ہے کہ تیموری دور کی تاریخ کا صحیح جائزہ اس وقت تک نہیں لیا جا سکتا جب تک کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ اور ان کے مقلدین کے کاموں کا گہرا مطالعہ نہ کیا جائے۔ مولانا نے اپنے مضمون میں ان ہی تاریخی رموز و نکات کی موشگافی کی ہے۔

کچھ ہی عرصہ کے بعد ان کا ایک طویل مضمون حضرت شاہ ولی اللہ پر ''الفرقان'' کے ولی اللہ نمبر میں شائع ہوا۔ اس کو پڑھ کر ایک بار پھر تاریخ ہند پر ان کی گہری نظر کا اندازہ ہوا اور اس میں انہوں نے مورخانہ بصیرت کے ساتھ یہ دکھایا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے عہد میں کس طرح اسلام پر تاریک بادل چھایا ہوا تھا۔ ہندوستان کے شمالی علاقوں میں سکھوں کی قوت ابھر رہی تھی۔ جنوبی ہند میں مرہٹوں کی طاقت کا سیلاب بڑھتا جا رہا تھا۔ خلیج بنگال کے ساحلی علاقوں سے یورپین ممالک کی طاقتیں ہندوستان پر للچائی ہوئی نظریں ڈال رہی تھیں اور خود مسلمانوں کے اندر ایرانیوں، تورانیوں اور روہیلوں کے باہمی تصادم سے اسلامی حکومت کی قبا تار تار ہو رہی تھی۔ بعض صوفیہ کے غلط تصوف اور فقہا

Marfat.com

کے غلط تفقہ سے امت کے شیرازے میں انتشار پھیلا ہوا تھا۔ خود ہندوستانی علماء کا طبقہ قرآن و حدیث کی اصلی تعلیم، اصول و فقہ اور عقائد و کلام سے ہٹ کر لاطائل ذہنی اور لفظی مباحث میں اُلجھا ہوا تھا۔ اس تجزیہ میں بھی مولانا کی غیر معمولی مورخانہ ذہانت و ذکاوت کا رنگ نمایاں تھا اور بعض مواقع پر اس لئے بھی حیرت ہوتی کہ ایک ایسے اہل قلم کی نگاہ جس کی تعلیم صرف عربی مدارس میں محدود رہی، کیسے ان باریک گوشوں تک پہنچی۔ اس لئے اکثر یہ خیال آیا کہ اگر ان کی تعلیم خالص انگریزی طرز کی ہوتی اور وہ اپنا موضوع تاریخ ہند ہی بنا لیتے تو شاید ان کے پایہ کا کوئی مورخ ہندوستان میں نہ ہوتا۔ مولانا کی نظر ہندوستان کے سیاسی واقعات کے ساتھ مذہبی رجحانات، تحریکات اور انقلابات پر بھی تھی۔ اس لئے ان کے نقد و تبصرہ میں بڑی جامعیت ہوتی تھی جو تاریخ ہند پر دوسرے لکھنے والوں کو میسر نہیں۔ اسی مضمون میں انہوں نے شاہ ولی اللہ کی سیاسی، دینی اور علمی خدمات کی جو تفصیل بتائی ہے اس کا اندازہ اہل نظر اور اہل فکر ہی کر سکتے ہیں۔ پھر اس کے لکھنے میں ان پر جو ایک ''حال'' اور ''وجد'' طاری ہے وہ لائق مطالعہ ہے۔ ان کا سینہ دینی و ملّی احساسات سے معمور نظر آتا ہے اور مسلمانوں کی کھوئی ہوئی عظمت کے لکھنے میں ان کے قلم سے جو تحریر نکلی ہے وہ دراصل ان کے سینہ کے آبلے ہیں جو کاغذ کے صفحات پر پھوٹ پھوٹ کر بہہ نکلے ہیں۔ یہ مضمون ایک علیحدہ کتاب ''آغوش موج کا ایک دُرِّ تابندہ'' کے نام سے بھی شائع ہو گیا ہے۔

۱۹۳۹ء کے دسمبر میں میرے وطن میں بعض اعزۂ خاص کے یہاں تقریبات تھیں جن میں شرکت کے لئے میں بھی اعظم گڑھ سے گیا تھا۔ مولانا بھی گیلانی سے تشریف لائے تھے اور قبل اس کے کہ میں ان کی قدم بوسی کروں، ایک موقع پر میں نے محسوس کیا کہ میرے کاندھے پر کسی کا ہاتھ ہے اور اسی کے ساتھ ہی آواز بلند ہوئی ''السلام علیکم عزیزم۔'' میں نے پلٹ کر دیکھا تو مولانا تھے۔ حیدر آبادی شیروانی میں ملبوس تھے۔ سر پر حیدر آبادی رومال تھا۔ میں کچھ گھبرا سا گیا۔ انہوں نے از راہ لطف و کرم معانقہ فرمایا اور پھر میرا ہاتھ پکڑ کر الگ لے گئے۔ میرے سامنے اس وقت ایک منور چہرہ تھا جس پر نرمی، شگفتگی، پاکیزگی اور برگزیدگی برس رہی تھی۔ ان کا نورانی چہرہ دیکھ کر دل کہتا تھا کہ ان کے قلب میں شاید معصیت کا وسوسہ بھی کبھی پیدا نہ ہوتا ہوگا۔ داڑھی سفید ہو چکی تھی لیکن چہرہ پر اس طرح زیب دیتی تھی جیسے اس کے لئے بنائی گئی ہے۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں لیکن ان میں ذہانت، مہر اور محبت کی تابانی تھی۔ دارالمصنفین کے حالات پوچھتے رہے اور یہاں تک کہ ایک ایک فرد کے متعلق سوالات کئے۔ ان ہی دنوں ہندوستان کی تاریخ سے متعلق میرے کچھ مضامین ''معارف'' میں شائع ہوئے تھے۔ ان کا ذکر کر کے ہندوستان کی تاریخ پر ایسی عالمانہ اور دلکش گفتگو شروع کر دی کہ مجھ کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ شربت کے گھونٹ میرے حلق سے اتر رہے ہیں۔ مہا بھارت، رامائن، گیتا، البیرونی، ابن بطوطہ، ضیاء الدین برنی پر ایسی مبصرانہ گفتگو سنی کہ مجھ کو حیرت ہو رہی تھی کہ میں کسی عالم دین یا دینیات کے معلم کے سامنے ہوں یا تاریخ کے کسی ماہر کے پاس بیٹھا ہوں۔ وہ بات کرنے میں ہاتھوں کو تیزی سے حرکت دیتے تھے جو ان کے لطف بیان پر مہمیز کا کام دیتے تھے۔ کبھی کبھی وہ آنکھوں کو بند کر لیتے۔ اس وقت شاید وہ اپنی دور رس نگاہوں کو اس مقام پر پہنچا دیتے جہاں ایک عام اہل علم کی نگاہ کا پہنچنا ممکن نہ تھا۔ ان کی آواز میں اتار چڑھاؤ تو مطلق نہ تھا لیکن بڑی شیرینی اور حلاوت تھی۔ تنہائی کی یہ صحبت دیر تک نہیں رہی کیونکہ ان کی باتیں سننے کے لئے کچھ اور

Marfat.com

ہم وطن بھی آ گئے اور ان کو موضوع سخن بدلنا پڑا مگر وہ جب تک علمی گفتگو کرتے رہے میں ان کے فکر ونظر کی گہرائی میں کھویا ہوا محو حیرت بنا رہا اور ان کی نکتہ رسی اور مجتہدانہ طریقہ فکر کے بوجھ سے دبتا چلا گیا۔ اس صحبت میں ان کے کچھ ایسے رشتہ دار بھی شریک تھے جن سے سالے بہنوئی کا رشتہ تھا۔ اس وقت مولانا خالص بہاری بن گئے اور یہ مجلس بے تکلفانہ فقرہ بازیوں، غیر ثقہ جملوں، قہقہوں اور چہچہوں سے گونجتی رہی اور مولانا نے اس وقت کسی کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ اہل علم بھی ہیں۔

ان کا قیام اس تقریب میں دو دن رہا۔ دونوں دن برابر ان سے ملنے کی سعادت حاصل رہی۔ ایک موقع پر ان کی خدمت میں تفریحاً عرض کیا کہ آپ کے نام کے ساتھ گیلانی دیکھ کر لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا مولانا حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ سن کر ہنسنے لگے اور فرمایا ''گیلانی کی نسبت سے مجھ کو گیلانوی لکھنا چاہیے تھا لیکن شافعی امام شافعی کے ساتھ نسبت ہے۔ شافعی اپنے کو شافعوی نہیں لکھتے پھر اگر میں گیلانی لکھتا ہوں تو اس میں کیا ہرج ہے۔'' یہ بھی فرمایا کہ اکبر کے عہد میں صدر پہانی ایک بزرگ گزرے ہیں۔ ان کا ذکر ملا عبدالقادر بدایونی نے ''منتخب التواریخ'' میں کیا ہے۔ وہ ایک گاؤں پہانی کے رہنے والے تھے اور پہانوی کے بجائے پہانی کہلاتے تھے۔ یہ نکتہ آفرینی سن کر مجھ کو ہنسی آ گئی۔ اتفاق سے ان کی رحلت کے بعد ان کے کاغذات میں بھی اسی قسم کی ایک تحریر دیکھی۔ وہ اپنی ذہانت سے روزمرہ کی معمولی سی معمولی باتوں میں بڑے بڑے علمی نکتے پیدا کرتے رہتے تھے۔

اسی قیام کے دوران میں حضرت سید صاحبؒ کا ذکر بار بار آیا اور مولانا ان سے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کرتے رہے۔ ایک موقع پر فرمایا کہ میں سید صاحب کی تصانیف کو اس لئے پسند کرتا ہوں کہ ان سے نئی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ جو علمی باتیں پہلے مجمل شکل میں تھیں سید صاحب کی تحقیق و تدقیق نے ان کو زیادہ مفصل بنا دیا اور پھر اپنے دائیں ہاتھ کو زور سے حرکت دیتے ہوئے کہا کہ ان کی علمی کاوش اور محنت کی داد دینے میں بخل کرنا نہ صرف تعصب و تنگدلی بلکہ ایک قسم کی عقلی و طبعی دناءت ہے۔ یہ سن کر مجھ کو اور زیادہ انشراح ہوا کہ وہ لوگ کیسے تنگ نظر تھے جو ان پر سید صاحب سے معاصرانہ چشمک کا الزام رکھتے تھے۔ مولانا نے جب جب سید صاحب پر کوئی مضمون لکھا ان کے علمی کمالات کی داد دل کھول کر دی اور جو گفتگو میں نے ان کی زبان سے سنی تھی اس کی تفصیل مولانا کے ایک طویل مقالہ ''مولانا سید سلیمان ندوی کا پہلا کارنامہ'' کے عنوان سے ۱۹۴۰ء کے ''معارف'' کے پانچ نمبروں میں پڑھی۔ اس کی ابتداء ہی میں ارقام فرماتے ہیں:

> ''نئے حالات نے جدید ذہنیتوں میں جن نئی نئی الجھنوں کو پیدا کر دیا تھا خدا ہی جانتا ہے کہ اعظم گڈھ کے اس زاویہ نشین درویش کے قلم نے ان کی گرہ کشائیوں میں کتنی جلیل و عظیم خدمتیں دی ہیں۔''

اسی مضمون میں انہوں نے حضرت سید صاحب کی علمی و تحقیقی کاوشوں کی جس قدر تعریف کی ہے وہ کسی عالم نے اپنے کسی معاصر عالم کے لئے شاید ہی کی ہو۔

Marfat.com

۱۹۴۰ء کے بعد وہ علمی دنیا کی فضا میں ہر طرف چھائے ہوئے تھے۔ ''معارف''، ''برہان''، ''الفرقان''، ''مجلّہ عثمانیہ''، عثمانیہ یونیورسٹی کے سٹاف کے میگزین، ''ندیم''، ''صدق'' وغیرہ ان کے قلم کی بارش سے سیراب ہو رہے تھے اور ان کے مضامین کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ وہ کبھی عالم، کبھی متکلم، کبھی فقیہ، کبھی محدث، کبھی مفسر اور کبھی مورخ کے رنگا رنگ جلوؤں میں نظر آتے تھے۔

۱۹۴۱ء میں ادارہ تحقیقات علمیہ جامعہ عثمانیہ کی طرف سے ان کا ایک طویل مضمون کتاب کی صورت میں ''تدوین فقہ'' کے نام سے شائع ہوا۔ پھر اسی ادارہ کی طرف سے ان کی کتاب ''تدوین حدیث'' کی اشاعت ہوئی۔ میں نے جب جب ان دونوں کتابوں کے پڑھنے کی کوشش کی تو اپنے کو ان کی فکر و تحقیق کے دریا میں غرق پایا، البتہ ان کی اہمیت حضرت سید صاحب کی گفتگوؤں اور تحریروں سے معلوم ہوئی کہ ہر زمانہ میں کچھ لوگ ایسے بھی پیدا ہوتے رہے ہیں جو عقائد میں کتر بیونت کر کے نئے اسلام کی دعوت دیتے رہے ہیں لیکن خدا کے کچھ ایسے بندے بھی افق پر نمودار ہوتے رہے ہیں جنہوں نے اپنی اہلیت و استعداد سے ان بدعات کے گرد و غبار کو ہٹا کر اسلام کے منور آئینہ کو روشن رکھا۔ مولانا کی مذکورہ بالا کتابیں دراصل ایسے ہی بدعتیوں کے مقابلہ کے لئے لکھی گئیں۔ ان کی ''تدوین حدیث'' پر سید صاحب نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ اللہ کے مخصوص بندوں نے ایسے بدعتیوں کے ہر تیر کو اپنے سپر سے روکا اور ان کے ہر اعتراض کو دور کیا اور ان کے ہر شبہ کو رفع کیا اور پھر اسی سلسلہ میں حضرت سید صاحب نے تحریر فرمایا کہ

> ''اس زمانہ میں اس فرض کو ادا کرنے کے لئے جو دستہ آگے بڑھا اس کے ہراول میں ہمارے دوست مناظر اسلام، متکلم ملت، سلطان القلم مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی (متع اللہ المسلمین بطول بقائہ) کا نام ہے جن کے قلم کی روانی اسلام کی محافظت میں تیغ رانی کا کام دیتی ہے۔ وہ ہر سال اور سال کے مختلف حصوں میں اپنی تحقیقات علمیہ کے بلند نمونے پیش کرتے رہتے ہیں اور خصوصاً اپنے توسیعی خطبات اور اپنے تلامذہ کے امتحانی مقالات کے پردے میں علم اور دین کی ایسی خدمتیں انجام دے رہے ہیں جو سارے مسلمانوں کی تحسین اور شکریہ کی مستحق ہیں۔''

ان سطروں میں نہ صرف حقیقت و اصلیت کا اظہار ہے بلکہ مولانا کی علمی فضیلت و عظمت جو حضرت سید صاحب کے دل میں تھی، اس کا بھی پورے اخلاص کے ساتھ اعتراف ہے۔

۴۴ء میں دفتر ''الفرقان'' بریلی سے ان کا ایک رسالہ ''الدین القیم'' شائع ہوا جس میں مولانا نے صوفی اور متکلم بن کر ''صوفیانہ علم کلام'' پیش کیا تھا اور وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے مباحث کے ذریعہ کائنات کے اس معمہ کو حل کرنے کی کوشش کی تھی جس کو عقل اور فلسفہ حل کرنے سے عاجز رہا۔

اسی سال ان کی ایک ضخیم کتاب ''ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت'' حصہ اول (ضخامت ۶۸۳ صفحے) ندوۃ المصنفین سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب بھی عجیب و غریب ہے۔ اس کا موضوع نام سے ظاہر ہے لیکن اگر کوئی

Marfat.com

شخص اس میں ابواب یا بغلی سرخی قائم کرنے کی کوشش کرے تو اس کے بس کی بات نہ ہوگی بلکہ مولانا عتیق الرحمٰن صاحب ناظم ندوۃ المصنفین اس کو شائع کرتے وقت اس کے مضامین کی فہرست بھی ترتیب دینے سے قاصر رہے اور ان کو شروع میں محض چند عنوانات کی فہرست ہی دینے پر اکتفا کرنا پڑا۔ اس کتاب میں مولانا مسلمانوں کے نظام تعلیم، نصاب تعلیم، طریقہء درس، طلبہ کے قیام و طعام اور اخلاق وغیرہ پر لکھنا چاہتے تھے لیکن ان کا قلم بقول حضرت سید صاحب ''منطقی ترتیب'' اور ''مصطلحہ تصنیفی رسوم'' کے بجائے افادیت کا خوگر تھا۔ اس لئے کتاب میں ایسے ضمنی مباحث بھی بکثرت آ گئے ہیں جن کا تعلق موضوع سے تو نہیں ہے لیکن وہ بجائے خود مفید ہیں۔ مولانا خود اس کتاب کے دیباچہ میں ارقام فرماتے ہیں۔

> ''دارالعلوم دیوبند کے مجلّہ شہریہ ''دارالعلوم'' کے مدیر کا عنایت نامہ آیا کہ مضمون لکھ کر بھیج دو دارالعلوم ایک تعلیمی ادارہ ہے۔ اسی مناسبت کا خیال کر کے چار پانچ صفحوں کے مختصر مضمون کا ارادہ کر کے میں نے غلام علی آزاد بلگرامی مرحوم کی کتاب ''مآثر الکرام'' کو الٹنا پلٹنا شروع کیا۔ بعض کارآمد اور دلچسپ باتیں ہاتھ آئیں۔ قلم اٹھایا لکھنا شروع کیا۔ اب میں نہیں جانتا کہ پھر کیا ہوا۔ قلم رواں ہوا، چلا، چلتا گیا، بات میں بات کا خیال آتا جاتا تھا اور لکھتا جاتا تھا۔ پانچ صفحوں کے لکھنے کے لئے بیٹھا تھا وہی اس وقت ۷۵۰ صفحات کی شکل میں آپ کے سامنے موجود ہے۔''

اور پھر یہ پڑھ کر اور بھی حیرت ہوئی کہ یہ سات سو پچاس صفحے کل بیس دن کی مدت میں لکھے گئے۔ فرماتے ہیں:

> ''بچوں کو مسلم الثبوت، ہدایہ، بخاری اور ترمذی جیسی درسی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے والے سے کسی تاریخی مضمون کی توقع بھی نہ کرنی چاہیے۔ وہ بھی کل بیس دن کی یہ محنت ہے۔ طلبہ امتحان کی تیاریوں میں مصروف ہیں، اسی میں کچھ فرصت ہمدست ہوئی۔ لکھتا چلا گیا اور اسی مسودہ کو پریس میں بھیج رہا ہوں۔''

قلم کی اس برق رفتاری اور علم کی اس صاعقہ پاشی کی مثال کم ملے گی۔ عہد ماضی کے تعلیمی نظام کے لکھنے میں ان کے ذاتی خیالات بھی بے چین ہو ہو کر قلم سے ٹپکتے چلے گئے ہیں اور یہ ذاتی خیالات زیادہ تر اس ناوک فگنی کا ردعمل ہے جس کا ہدف مسلمانوں کا مذہبی تعلیمی نظام رہا ہے جیسا کہ خود مولانا کا بیان ہے کہ ان ٹیسوں اور ہوکوں کی بے چینیاں ہیں جو ان تیروں کے زخموں نے ان کے دل میں پیدا کر دی تھیں۔ اس کے دیباچہ کے حسب ذیل فقروں کے پڑھنے کے بعد اس کے مطالعہ کی نوعیت ہی بدل جاتی ہے اور اس کے پڑھنے میں ایک کیف محسوس ہونے لگتا ہے۔

> ''مجھے رلایا گیا ہے تب رویا ہوں۔ ستایا گیا ہوں تب کراہا ہوں۔ ممکن ہے کہ اس سلسلہ میں بعض

Marfat.com

مواقع پر میرے نالے ذرا زیادہ بلند ہو گئے ہیں۔ قابو سے قلم کہیں باہر ہو گیا ہو۔ اس میں مجھے معاف رکھا جائے۔''

جس سوز و درد کے ساتھ یہ کتاب لکھی گئی تھی اس کے لحاظ سے اس کا مقبول ہونا لازمی تھا۔ حضرت سید صاحب نے اس پر تبصرہ لکھتے ہوئے تحریر فرمایا تھا ''ہمارے قدیم طریقہ تعلیم اور اصول تعلیم پر اس سے زیادہ جامع کتاب نہیں۔'' افسوس ہے کہ اس کی دوسری جلد شائع نہ ہو سکی۔

اس کتاب کے دیباچہ میں مولانا نے خود اپنے سے شکایت کی ہے کہ وہ عمل کی قوت سے تقریباً محروم ہو چکے ہیں اور اب ان میں علمی کام کا نہ عزم ہے اور نہ ارادہ لیکن ان کی طبیعت میں عجز و انکسار کچھ ایسا تھا کہ وہ اپنی نجی اور معاشرتی زندگی میں بھی اپنی جانب کسی وصف کا انتساب پسند نہ فرماتے تھے مگر فقدان عزم کے اس اعتراف کے باوجود ان کے مضامین ملک کے علمی رسالوں میں برابر شائع ہوتے رہتے تھے۔ ۴۴ء میں ان کا ایک طویل مضمون ''ندیم'' (گیا) میں ''شاد متکلم اسلام کی شان میں'' نظر سے گزرا تو اردو شعر و شاعری میں بھی اُن کے پاکیزہ ذوق اور ناقدانہ نظر کا اندازہ ہوا۔

۱۹۴۷ء میں ان کی ایک ضخیم کتاب ''اسلامی معاشیات'' حیدر آباد سے شائع ہوئی جو بڑی تقطیع کے ۴۵۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ اب تک اس موضوع پر اردو میں کوئی کتاب نہ تھی اور غالباً عربی زبان میں بھی اس نوعیت کی کوئی تصنیف نہیں ہے۔ یہ مولانا کے اجتہاد اور ان کی وسعت نظر کی دلیل ہے کہ انہوں نے اسلامی معاشیات پر ایک کتاب لکھ کر معاشیات کے دوسرے نظاموں کے مقابلہ میں اسلام کا ایک مستقل نظام پیش کر دیا۔ ممکن ہے کہ ان کی اسلامی معاشیات فنی حیثیت سے ماہرین کی نگاہوں میں اہم نہ ہو لیکن اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ مولانا ہی نے اردو میں اسلامی معاشیات کے لٹریچر کی داغ بیل ڈالی۔ آگے چل کر اس موضوع پر بہت سی کتابیں شائع ہوں گی اور اسلامی معاشی نظام کا ایک واضح اور روشن نقشہ لوگوں کے سامنے آئے گا لیکن اس فن کی تعمیر کا معمار اول مولانا ہی کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ کلام پاک کی ایسی آیتوں سے جن کی تلاوت ہم روزانہ کرتے ہیں انہوں نے ایسے حقائق پیش کئے ہیں کہ ان کو پڑھنے کے بعد ان کی غیر معمولی بصیرت اور ذہانت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

ابھی اس کتاب کا چرچہ اہل علم کے حلقہ میں ہو ہی رہا تھا کہ کراچی سے ان کی ایک دوسری کتاب ''حضرت امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی'' شائع ہوئی۔ یہ بھی بڑی تقطیع کے ۳۹۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ راقم اپنی نااہلی کی وجہ سے ان کی کسی کتاب پر علمی تبصرہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ان کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ وہی ارباب علم و نظر کر سکتے ہیں جو خود بھی مولانا کی طرح علوم و فنون کے بحر بیکراں کے شناور ہوں، لیکن ان کی کتابوں پر سرسری نظر ڈالنے سے بھی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کے قلم سے علم کا دریا بہہ رہا ہے اور دریا کی موجوں کی طرح ان کی تحریر میں اضطراب و تلاطم ہے اور جس طرح دریا کی پُرشور لہروں میں ہمواری نہیں ہو سکتی اسی طرح ان کی پُرزور تحریروں میں موضوع کے لحاظ سے ترتیب و تنظیم نہیں ہوتی۔ وہ خود ایک مکتوب میں حضرت سید صاحب کو لکھتے ہیں۔

Marfat.com

''ایک دفعہ جھونک میں لکھنے بیٹھتا ہوں تو لکھتا چلا جاتا ہوں۔ پھر اس کی نظر ثانی، حک و اصلاح میرے لئے مشکل ہوتی ہے۔ میں چھاپنے والے پر چھوڑ دیتا ہوں کہ خرافات کو حذف کر کے کارآمد اجزاء کا انتخاب کر لیں۔''

لیکن جن چیزوں کو وہ خرافات سمجھتے تھے وہ اب بیش بہا معلومات کا خزانہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے مضامین اور تصانیف میں موضوع سے غیر متعلق باتیں بکثرت ہوتی ہیں جن سے ان کی تحریر میں بڑی طوالت پیدا ہو جاتی ہے لیکن ان غیر متعلق باتوں میں بھی اتنی کارآمد معلومات ہوتی ہیں جو بہت سی کتابوں کے مطالعہ سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔ پھر تحریر کے آرٹ کے نقطہ نظر سے یہ کہنا پڑے گا کہ وہ اطناب کے بادشاہ تھے۔ وہ کوزہ کے چند قطروں کو اپنے سیال قلم سے سیلاب بنا دیتے تھے اور ایسا کرنے میں ان کو کوئی غیر معمولی محنت و مشقت نہ کرنی پڑتی۔ وہ جیسے بولتے تھے ویسے ہی لکھتے تھے اسی لئے ان کی تحریر میں تکلف اور تصنع نہیں پایا جاتا۔ اگر ان سے ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی بھی گفتگو کرتا تو اس میں بھی اپنی ذہانت سے کوئی نہ کوئی عالمانہ یا معلمانہ نکتہ ضرور پیدا کر دیتے۔ یہی حال ان کی تحریر کا تھا کہ بات میں بات پیدا کرتے چلے جاتے تھے۔ حافظہ بڑا قوی تھا۔ جو چیز کہیں ایک بار پڑھ لیتے وہ ذہن میں محفوظ ہو جاتی تھی اور جب لکھنے بیٹھتے تھے تو حافظہ اپنی پوری تحویل ان کے حوالے کر دیتا اور وہ ان سب کو اپنی تحریر میں سمیٹنے کی کوشش کرتے اور ان کے سمیٹنے میں ان کا قلم بالکل نہ تھکتا اور جب ایک بار چل جاتا تو پھر نہ رُکتا۔ افسوس ہے کہ ان کی صحت نے ان کے قلم کا ساتھ نہیں دیا۔ ورنہ کمیت کے لحاظ سے کوئی معاصر اہل قلم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ پھر بھی انہوں نے جس قدر لکھ دیا ہے اس کی کیفیت سے وہی لطف اندوز ہو سکتے ہیں جو خود بھی اہل نظر اور دیدہ ور ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان کے مضامین میں تہذیب و تنظیم کے بجائے ایک قسم کا انتشار ہے جو دراصل ان کی علمی شوریدگی کا نتیجہ ہے۔ اس کے باوجود ان کی کوئی تحریر ایسی نہیں جو فکر و نظر کی گہرائی اور وسعت سے خالی ہو یا جس میں ان کی غیر معمولی ذہانت اور بصیرت نمایاں نہ ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خالی اوقات میں سوچا کرتے تھے اور جب لکھنے بیٹھتے تو سفینہ ان کے علم سینہ کا متحمل نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنے غور و فکر کے سارے نتائج کسی نہ کسی شکل میں ان لوگوں تک پہنچا دینے کی کوشش کرتے تھے جو فائدہ اُٹھا سکتے تھے۔ علم کے ایک معلم سے یہی توقع کی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے وہ اپنے مضامین اور تصانیف میں عالم اور معلم دونوں نظر آتے ہیں لیکن وہ ہمیشہ علم کی عظمت و برگزیدگی کے قائل رہے اس لئے اس کا کبھی بیوپار نہیں کیا۔ وہ کتاب لکھ کر ناشر کو دے دیتے۔ وہ چھپ کر دوسروں کے ہاتھوں میں پہنچ بھی جاتی اور ان کو خبر تک نہ ہوتی۔ ان کو جب معلوم ہوتا تو کبھی ناشر کو لکھ کر منگواتے یا کوئی لا کر دے دیتا تو دیکھ کر خوش ہو جاتے کہ چھپ گئی اور یہی ان کی ساری محنت کا صلہ ہوتا۔ معاوضہ یا رائلٹی قبول کرنا مطلق پسند نہ کرتے تھے اور پھر اپنے علمی کارناموں کے رد و قبول اور داد و تحسین سے بھی بے نیاز تھے۔ ایک موقع پر راقم کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا:

''غریب مضمون نگاروں اور کتب سازوں کی محنت و زحمت کا اندازہ وہ طبقہ کیا کر سکتا ہے جو صرف پڑھ کر کتاب کو چھوڑ دیتا ہے۔ دس منٹ میں جو مضمون پڑھ لیا جاتا ہے بسا اوقات اس کی

Marfat.com

تیاری میں دس مہینے صرف ہوتے ہیں۔ اپنی کاریگری سے کاریگر کو جو خوشی ہوتی ہے وہی کام کا کافی صلہ ہے۔''

اور غالباً وہ اردو کے تنہا مصنف ہیں جن پر کسی اہلِ قلم نے حریفانہ یا معاصرانہ تنقید یا خردہ گیری کی جرأت نہیں کی جو ان کے علمی اخلاص کی ایک بڑی دلیل ہے۔

وہ بڑے شیریں بیان مقرر بھی تھے۔ یہ برابر خبر ملتی تھی کہ حیدرآباد میں عید میلادالنبیؐ کے موقع پر حضور نظام خاص طور پر ان کی تقریر سننے کے لئے شریک ہوتے ہیں۔ وہ اپنی تقریروں میں بڑے دلچسپ قصّے اور لطیفے بیان کرتے جن سے سامعین بہت محظوظ ہوتے۔ ان کو واعظانہ رنگ کے علاوہ تبلیغی، علمی اور کبھی کبھی سیاسی تقریر کرنے میں بڑی قدرت حاصل تھی۔ وہ اپنی تقریر کی ''متین شوخی'' سے لوگوں کو ہنساتے تو اپنے عالمانہ استدلال اور عارفانہ نکتہ وری سے ان کو متاثر بھی کرتے تھے۔

دسمبر ۱۹۴۵ء میں وطن جاتے ہوئے بہار شریف پہنچا تو میرے پہنچنے سے ایک روز پہلے وہاں مسلمانوں کا ایک بہت بڑا سیاسی جلسہ تھا۔ اس میں مولانا کو تقریر کرنے کے لئے خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ میں تقریر سننے کی سعادت سے تو محروم رہا لیکن ہر شخص کی زبانی ان کی پُرجوش تقریر کا ذکر سنا اور پھر جب میں مولانا سے ملنے کے لئے حاضر ہوا تو ان کے اردگرد بہت سے لوگوں کو پایا جو ان کی تقریر کی تعریف کر رہے تھے مگر وہ اپنے مزاحیہ انداز میں اس مدح سرائی کا موضوع بدل دینے کی کوشش کرتے۔ ان میں کبھی بھی تشخص پسندی نہیں آئی اسی لئے وہ اپنی فضیلت اور برگزیدگی کی داد لینے یا سننے میں ہمیشہ مستغنی اور بے نیاز رہے حالانکہ وہ خود ہم عصروں کے کمال کی داد دینے میں بڑے فیاض تھے بلکہ بعض دوستوں کے اوصاف بیان کرنے میں تو قصیدہ خواں ہو جاتے۔ ان کے ہم چشموں میں شاید ہی کسی کو ان کی تحریر سے کوئی تکلیف پہنچی ہو۔ ان کی طبیعت میں بڑی مٹھاس تھی، اس لئے نجی گفتگو میں بھی ان کی زبان سے کبھی کوئی ایسی بات نہ نکلتی جس سے کسی کی دل آزاری ہو۔ بعض اوقات تو اسی شفقت و محبت میں نو آموز اہلِ قلم کے لئے ایسے تعریفی کلمات لکھ جاتے جن کا وہ مستحق نہ ہوتا لیکن ان کی تعریف یا داد دل بڑھانے اور کام کا حوصلہ پیدا کرنے کی خاطر ہوتی اور ان کی اس مخلصانہ فراخدلی نے ان کے بہت سے شاگردوں کو اہلِ قلم اور مصنف بنا دیا اور ان کے احباب تو ان کے علم و فضل کے علاوہ ان کی سیر چشمی، رواداری، جوہر شناسی، قدردانی، مرنجاں مرنج طبیعت اور مزاج کی شگفتگی سے ہمیشہ ان کے گرویدہ رہے۔

(۲)

مولانا کی زندگی علمی کاموں سے معمور ہے لیکن ہنگامے کے کاموں سے بالکل پاک رہی۔ ان کی داستان حیات بس اتنی ہے کہ پڑھتے رہے پڑھاتے رہے، لکھتے رہے لکھاتے رہے۔ ابتدائی تعلیم آپ نے وطن گیلانی میں

Marfat.com

پائی۔ وہاں سے ٹونک گئے، جہاں مولانا برکات احمد ٹونکی کے حلقہ درس میں نو سال تک رہے۔ پھر دیوبند گئے اور مولانا محمود حسن، علامہ انور کشمیری، مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا اصغر حسین سے فیضیاب ہوئے۔ طالب علمی ہی کے زمانہ میں دیوبند کی مجلس شوریٰ میں طلبہ کی طرف سے نمائندہ منتخب ہوئے جو اس زمانہ میں بڑا اعزاز تھا۔ دارالعلوم کے ماہوار رسالوں ''القاسم'' اور ''الرشید'' کی ادارت ان کے سپرد ہوئی جس کے معاوضہ میں تیس روپے ماہانہ مقرر ہوئے۔ جب ان کے مضامین ''القاسم'' میں شائع ہوئے تو اکبرالہ آبادی نے ان کو بہت حوصلہ افزا خطوط لکھے۔ دیوبند سے آ کر کچھ دنوں مونگیر میں ندوۃ العلماء کے بانی مولانا محمد علی کی خانقاہ میں بھی رہے۔ ان کا خود بیان ہے کہ یہاں کی ''خانقاہی زندگی میں ندوۃ العلمائی رنگ جاری وساری'' تھا جس کا اثر ان پر بھی پڑا۔ حضرت سید صاحب ان کے متعلق فرماتے کہ وہ کسبی ندوی نہیں، وہبی ندوی ہیں۔ یعنی تعلیم کے لحاظ سے تو ندوی نہیں لیکن اپنے فطری ذوق کی بنا پر ندوی ہیں۔ مونگیر میں مولانا محمد علی نے ان کو تبلیغی کاموں میں لگایا۔ وہ چونکہ شروع ہی سے اچھے واعظ اور مقرر تھے اس لئے اس کام کو اچھی طرح انجام دیا۔ مولانا محمد علی کے خاندان سے ان کا رشتہ بھی ہو گیا تھا۔ ان کی ایک بہن مولانا محمد علی کے بڑے صاحبزادے مولانا لطف اللہ مرحوم سے منسوب تھیں۔

کچھ دنوں کے بعد وہ مونگیر سے پھر دیوبند بلا لئے گئے اور پچاس روپے ماہانہ پر ''القاسم'' کی ادارت پر مامور ہوئے۔ اسی زمانہ میں کلکتہ کے ایک انگریزی اخبار ''انڈین ڈیلی نیوز'' نے رسول اللہ ﷺ کی شان مبارک میں کوئی گستاخانہ تحریر شائع کی تو علماء کی ایک جماعت کلکتہ پہنچی جن میں مولانا مناظر احسن بھی تھے۔ ان کی دینی حمیت اور ایمانی غیرت اس قدر جوش میں آئی کہ شاتم رسولؐ اور اس کے ہم مذہبوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دے دیا۔ کلکتہ کے ایک دوسرے اخبار ''اسٹیٹس مین'' نے ایک افتتاحیہ لکھ کر حکومت کو ان کے خلاف ابھارا اور گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ مولانا کے دوستوں اور ہموطنوں نے ان کو کلکتہ چھوڑنے پر مجبور کیا اور وہ زبردستی بمبئی اور مدراس کے راستے سے دیوبند روانہ کر دیئے گئے مگر راستے میں عید کا چاند دیکھ کر حیدرآباد اُتر پڑے۔ وہاں مولانا حمید الدین فراہیؒ سے ملاقات ہوئی۔ اس زمانہ میں عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہونے والی تھی۔ مولانا حمید الدین نے ان کو یونیورسٹی میں درخواست دینے کا مشورہ دیا۔ وہ دیوبند چھوڑنا نہیں چاہتے تھے لیکن خود دیوبند والوں نے ان کو یہ رائے دی کہ دکن میں دیوبند کے ایک عالم کا قیام دینی حیثیت سے مفید ہوگا۔ اس لئے انہوں نے درخواست دے دی۔ ان کا تقرر ایک سال تک یونیورسٹی میں نہ ہو سکا۔ اس درمیان میں وہ مولانا حمید الدین فراہیؒ سے درس لیتے رہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اس زمانہ میں حیدرآباد کے صدر الصدور تھے اور وہاں کے دینی وعلمی سرگرمیوں کا مرکز تھے۔ اسی لئے مولانا فراہیؒ مولانا گیلانی کو ان کے پاس لے گئے اور یہ کہا ''ان کو بطور امانت آپ کے سپرد کرتا ہوں۔'' مولانا گیلانی ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ ''ان کے لطف وکرم کی موسلا دھار بارشوں کا سلسلہ اس ملاقات کے بعد شروع ہوا۔ وہ زندگی کے آخری دنوں تک برستا رہا۔ امانت کا پورا حق ادا کرنے والے نے ادا کر دیا۔'' عثمانیہ یونیورسٹی میں تقرر سے پہلے حیدرآباد کے قیام کے زمانہ میں مولانا علیل ہو گئے اور مستقل کھانسی اور بخار رہنے لگا۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی ان کو اپنے ساتھ علی گڑھ لے گئے اور وہاں علاج کرایا۔ اس کے بعد وہ اپنے وطن گیلانی چلے گئے۔ یہاں آنے کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی سے تقرر کا خط ملا اور وہ

Marfat.com

۱۹۲۰ء میں شعبہ دینیات کے استاد مقرر ہو گئے اور ۱۹۴۹ء میں اس شعبہ کے صدر کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے ۔ پانچ سو پنشن ملی لیکن اس گرانقدر تنخواہ اور پنشن کے باوجود اپنی پرانی سادگی کسی حال میں نہیں چھوڑی۔ حیدرآباد کے قیام میں زیادہ تر ایک مسجد کے حجرہ میں رہے۔

جب بوڑھے ہو کر ریٹائر ہوئے اور گیلانی میں آ کر قیام کیا تو ان کا قلم اور بھی جوان ہو گیا اور آخر تک وہ علمی کام کرتے رہے۔ وہ حضرت شیخ محی الدین بن عربیؒ سے بہت متاثر تھے اور ان کے کارناموں کو تفصیل کے ساتھ لکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

> ''سچی بات تو یہ ہے کہ ان کے کلام کے سمجھنے اور اس سے استفادہ کے لئے ایمان قوی اور نظر سلیم کے ساتھ ضرورت ہے کہ علم میں وسعت ہو۔ محدود معلومات والے تنگ نظر لوگوں کے لئے بسا اوقات ان کی باتیں نقصان رساں ہو جاتی ہیں لیکن یہ ان کے کلام کا نہیں بلکہ پڑھنے والوں کا نقصان ہے۔''

ان میں یہ تمام شرائط موجود تھیں، اس لئے شیخ اکبر کو ان سے زیادہ اور کون سمجھ سکتا تھا، لیکن اس کام کو شروع کرنے سے پہلے ان کا قلم مختلف سمتوں میں چلتا رہا اور مختلف قسم کے مضامین کے ساتھ ساتھ ان کا قلم مولانا محمد قاسمؒ بانی دارالعلوم دیوبند کے سوانح پر چل پڑا تو ایک ہزار صفحے لکھ کر رکا۔ جب اس کا مسودہ دیوبند پہنچا تو وہاں کے اہل علم نے اس کو تین جلدوں میں تقسیم کیا۔ دو جلدیں تو چھپ گئی ہیں۔ ایک جلد ابھی باقی ہے۔

وہ دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے رکن تو عرصہ سے تھے، پنشن کے بعد مجلس عاملہ کے بھی رکن بنائے گئے۔ مارچ ۱۹۵۰ء میں دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کا ایک اہم جلسہ ہوا۔ اس میں شرکت کے لئے وہ گیلانی سے اعظم گڈھ تشریف لائے۔ میری مسرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے میرے ہی قیام گاہ میں قیام فرمایا۔ اس جلسہ میں مولانا کے علاوہ جناب ڈاکٹر سید محمود (جو اس وقت بہار میں وزیر ترقیات تھے) مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا محمد عمران خاں مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء بھی تشریف لائے تھے۔ جب ہم لوگ ان حضرات کی پیشوائی کے لئے سٹیشن گئے تو مولانا کی سادگی دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ ان کے ساتھ صرف ایک دری، ایک چادر، ایک تکیہ، المونیم کا ایک لوٹا اور ایک کپڑے میں لپیٹے ہوئے ایک دو جوڑے کپڑے تھے۔ خود ان کی ذات بھی نمود و نمائش کی آلائشوں سے پاک تھی۔ یہ دارالمصنفین میں ان کی پہلی تشریف آوری تھی، اس لئے یہاں کے ایک ایک فرد سے بڑی گرمجوشی اور محبت سے ملے۔

ان بزرگوں کی آمد سے دو تین دن تک درالمصنفین میں بڑی چہل پہل رہی۔ دارالمصنفین کے لوگوں کے علاوہ شہر کے معززین کا بھی اجتماع رہتا لیکن ہر محفل میں مولانا ہی بلبل ہزار داستان کی طرح چہکتے تھے۔ مذہبی، علمی، تاریخی، سیاسی جو موضوع بھی زیر بحث ہوتا مولانا اپنی طباعی اور ذہانت سے کوئی نہ کوئی ایسا نکتہ پیدا کر دیتے کہ حاضرین ان ہی کی طرف مائل ہو جاتے۔ ان کی گفتگو میں ایسی رنگین سنجیدگی اور متین شوخی ہوتی کہ پوری مجلس زعفران زار بن جاتی اور ان قہقہوں میں بھی لوگ یہ محسوس کرتے کہ ان پر حکمت و دانش کی بارش ہو رہی ہے۔

سقوط حیدر آباد کا ذکر آیا تو فرمایا کہ ایک روز قاسم رضوی اپنے رضاروں کے دستہ کے ساتھ ان کے مکان کے احاطے میں چلے آئے اور دیر تک فوجی قواعد کرتے رہے۔ اسی احاطے میں مسجد بھی تھی لیکن جب مغرب کی اذان ہوئی تو قاسم رضوی کے سوا ان مجاہدوں میں سے کسی نے بھی خانہ خدا میں آنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ نماز کے بعد مولانا نے قاسم رضوی سے فرمایا کہ تمہارے مجاہدوں کی قوت ایمانی تو آج دیکھ لی۔ تمہاری جو فوجی وحربی قوت ہے اس کا حال تم کو مجھ سے زیادہ معلوم ہے، پھر ایک بڑی طاقت کے خلاف کس بوتے پر لڑنے چلے ہو۔ قاسم رضوی نے کہا چیختا ہوں، چلاّتا ہوں شاید کارگر ہو جائے۔ مولانا نے یہ واقعہ بیان کر کے فرمایا ''یہ کتنی بڑی نادانی تھی۔''

اسی قیام میں جماعت اسلامی کے ایک پُر جوش کارکن نے ان کو اپنی جماعت کا مخالف سمجھ کر ان سے مناظرانہ رنگ میں بحث شروع کر دی لیکن مولانا کی صلح پسند اور شاداں و فرحاں طبیعت میں کسی کی دل آزاری کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اس لئے بحث کرنے کے بجائے زیرلب تبسم کے ساتھ فرمایا کہ بھائی یہ بتاؤ کہ ''مولانا مودودی رسول اللہ ﷺ کے سگے بیٹے ہیں اور ہم سب ان کے سوتیلے بیٹے ہیں کہ وراثت میں مولانا مودودی ہی تنہا اسلام کو صحیح سمجھنے کا حق رکھتے ہیں اور ہم کو کوئی حق نہیں۔'' مولانا کے کہنے کے انداز میں کچھ ایسی دل آویزی تھی کہ اسی پر بحث قہقہوں میں گونج کر ختم ہو گئی۔

ایک دوسرے موقع پر کسی سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ بہار شریف میں ایک عربی مدرسہ ہے۔ وہاں کے طلبہ کو ایک مدرس سے شکایت تھی کہ وہ اچھا نہیں پڑھاتے۔ میں ایک بار عثمانیہ یونیورسٹی کی چھٹیوں میں حیدر آباد سے اس قصبہ میں پہنچا تو مدرسہ کے متولی صاحب نے اصرار کیا کہ میں اس مدرسہ میں ایک سبق پڑھا دوں۔ میں نے ان کی خواہش کی تعمیل کر دی۔ درس سے طلبہ بہت خوش اور مطمئن ہوئے۔ متولی صاحب نے مدرس سے مخاطب ہو کر کہا کہ ''آپ بھی ایسا ہی کیوں نہیں پڑھاتے؟'' مدرس نے جزبز ہو کر کہا ''مولانا بارہ سو پاتے ہیں، پلاؤ قورمہ کھا کر پڑھاتے ہیں۔ جیسا کھاتے ہیں ویسا پڑھاتے ہیں۔ میں تیس روپے پاتا ہوں۔ دال بھات کھاتا ہوں۔ جیسا کھاتا ہوں ویسا پڑھاتا ہوں۔'' یہ جواب سن کر متولی صاحب خاموش ہو گئے۔ مولانا جب یہ واقعہ سنا رہے تھے تو جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب بھی تشریف فرما تھے جو اس وقت حکومت بہار کے وزیر تھے اور پہلے وزیر تعلیم بھی رہ چکے تھے۔ مولانا نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ ملک میں زیادہ تر دال روٹی پر گزارہ کرنے والے ہی تعلیمی اور علمی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔

اور پھر اسی سلسلہ میں فرمایا کہ ''نانِ شعیر'' ہی پر ''قوت حیدری'' اور ''قوت ایمانی'' کا مدار رہا ہے۔ ہندوستان کے بزرگانِ دین اور خصوصاً صوفیہ کرام نے فاقے کر کے یہاں کے لوگوں کے اخلاق و کردار کو سنوارا ہے اور یہ واقعہ بیان کیا کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے خلفاء میں ایک بزرگ حضرت شیخ قطب الدین منور گزرے ہیں جو ہانسی میں رہتے تھے۔ سلطان محمد تغلق وہاں گیا تو شہزادہ فیروز کو ایک لاکھ تنکے دے کر ان کی خدمت میں بھیجا۔ شیخ نے اتنی بڑی رقم دیکھ کر فرمایا یہ درویش ایک لاکھ تنکے لے کر کیا کرے گا۔ درویش کے لئے تو دو سیر کھچڑی اور ایک سیر روغن کافی ہے۔ جب ان سے زیادہ اصرار کیا گیا تو صرف دو ہزار رکھ لئے۔ اس میں سے بھی کچھ تو اپنے مرشد کے مزار کے لئے اور بقیہ فقراء میں تقسیم کر دیئے۔

Marfat.com

دارالمصنفین کی یادگار مجلسوں میں ایک مجلس یہ بھی تھی اور جب یہ مجلس یاد آتی ہے تو خیال ہوتا ہے کہ زندگی کے جو دن اس میں گذرے وہ بہترین دنوں میں سے تھے۔ مولانا جب رخصت ہونے لگے تو ان کی خدمت میں دارالمصنفین کی طرف سے مصارف سفر پیش کئے گئے۔ انہوں نے یہ کہہ کر لینے سے انکار فرمایا کہ میں تو اپنے گھر آیا ہوں۔ گھر والوں سے اخراجات لینا کیا معنے۔ ان کے اس اخلاص سے دارالمصنفین کا ہر فرد متاثر ہوا۔

مئی ۱۹۵۱ء میں جب راقم الحروف گھر گیا تو قدم بوسی کے لئے گیلانی جانے کا قصد کیا لیکن اہل وطن نے مولانا کو میلادالنبیؐ کی ایک مجلس میں تقریر کرنے کے لئے اصرار سے مدعو کیا تھا۔ وہ اس وقت قلب کے مریض ہو چکے تھے۔ ڈاکٹروں نے تقریر کرنے کی ممانعت کردی تھی مگر وہ اپنی خلقی مروت میں عزیزوں کی فرمائش رد نہ کر سکے اور دیسنہ تشریف لائے۔ یہ ان کی تقریر سننے کا پہلا اتفاق تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی سیرت مبارک سورہ والضحیٰ کی تفسیر کی روشنی میں بیان کی۔ اس بیان کا طرز تو سیدھا سادہ تھا لیکن اس قدر مؤثر تھا کہ پوری مجلس رسول اکرم ﷺ کے جام محبت سے سرشار اور مخمور ہو رہی تھی۔ اسی زمانہ میں گاؤں والے تقسیم ہند کے نتائج سے متاثر تھے۔ ان پر بڑی یاس و ناامیدی چھائی ہوئی تھی۔ مولانا نے ان کی تسکین و تسلی کے لئے بڑی وضاحت سے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کے دو حصے ہیں، ایک مکی اور ایک مدنی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو آپؐ ہی کے اسوہ حسنہ پر چل کر اب مکی زندگی بسر کرنی ہے۔ انہوں نے اس کو کچھ ایسے دلنشین انداز میں بیان کیا کہ گاؤں والوں کو بڑی ڈھارس ہوئی۔ تقریر کے آخر میں مگہی زبان میں ایک نعت پڑھی جو ان ہی کی فکر سخن کا نتیجہ ہے۔ ان کے پڑھنے کے انداز میں کچھ ایسا درد و اثر تھا کہ ان کی مترنم آواز آج تک کانوں میں گونج رہی ہے۔ اس نعت کا ایک بند ذیل میں درج ہے۔ شاید ناظرین کو بھی لطف حاصل ہو۔

دنیا بھٹکی پھرتی ، چھا گلئے تھا اندھیالا رے   دکھی سکھی راجہ پرجا سگرو تھے متوالا رے
من کی سونی نگری پر پڑل تھے کئی تالا رے   جنے دیکھو چورے چور کوئی نہیں رکھوالا رے
پپتا کی ان گھڑیوں میں آئی گیو کملی والا رے

اس قسم کی نعت میں وہ اپنے کو ''سوامی دھرمی جی گیلانی والے'' کہتے تھے۔

جولائی ۱۹۵۳ء میں ان کی قدم بوسی کے لئے گیلانی حاضر ہوا۔ گو یہ گاؤں راقم کے گاؤں دیسنہ سے صرف دو کوس کے فاصلے پر ہے لیکن ایک عرصہ کے بعد وہاں جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ گیلانی پہنچا تو سواری کا یکہ آموں کے ایک بڑے باغ میں رکا۔ معلوم ہوا کہ یہ مولانا ہی کا باغ ہے۔ اس کے مقابل کئی بگھوں کا ایک اور بڑا سرسبز و شاداب باغ نظر آیا۔ یہ بھی مولانا ہی کا تھا۔ باغ کے بعد ایک چھوٹے سے چمن سے گذر کر مولانا کی مردانہ نشست میں پہنچا۔ یہ ایک دو منزلہ چھوٹی سی عمارت تھی جو مولانا نے خاص اپنے لئے بنوائی تھی۔ اسی سے متصل ایک بہت بڑا دو منزلہ زنان خانہ تھا۔ مردانہ نشست کے سامنے ایک تالاب تھا۔ اس سے ذرا کچھ فاصلہ پر ایک چھوٹا سا آم کا ایک اور باغ تھا۔ یہ بھی مولانا ہی کا تھا۔ ان کو آموں سے بڑا ذوق تھا۔ بہار، حیدرآباد، بمبئی، لکھنؤ اور ملیح آباد کے مشہور آموں کے درخت انہوں نے منگوا کر لگائے تھے اور جس طرف ان کی نظر اٹھتی ان کو اپنے لگائے ہوئے باغ نظر آتے تھے۔ ان کے مکان اور باغات

Marfat.com

کو دیکھ کر ان کی فارغ البالی اور خوشحالی کا اندازہ ہوتا تھا مگر خود ان کی سادگی دیکھ کر ان کے علم کی گہرائی کا یقین نہ آتا تھا۔ اس گہرائی کو دیکھ کر ان کی سادگی پر تعجب ہوتا۔ ان کی کل کائنات ایک چارپائی تھی۔ اسی پر قلم اور دوات رکھ لیتے اور علم وفن کا خزانہ لٹاتے رہتے۔ چارپائی کے بغل میں دو تخت تھے۔ ان پر معمولی سا فرش اور اس کے اوپر ایک قالین تھا۔ قالین اور فرش کے درمیان ان کا دفتر تھا۔ ان کے سارے کاغذات اور خطوط قالین کے نیچے پڑے رہتے تھے۔ کمرے میں چار بڑی بڑی الماریوں میں منتخب کتابیں تھیں۔ یہی ان کا آفس اور کتب خانہ سب کچھ تھا۔ لکھتے لکھتے جب تکان محسوس کرتے تو چارپائی کے نیچے ہاتھ بڑھا کر ٹین کا ایک معمولی سا ڈبہ گھسیٹتے۔ اس میں مٹی کے تین کلھڑوں میں کتھا چونا اور ڈلی تھی اور کپڑے کے ایک ٹکڑہ میں کچھ پان لپٹے ہوتے۔ یہ پاندان ان کی ساری زمینداری، کھیتی، باغ اور گرانقدر تنخواہ کا حاصل تھا جس کے وہ بلا شرکت غیرے مالک تھے۔ بقیہ کسی اور چیز سے ان کو کوئی سروکار نہ تھا۔ اس ڈبہ سے پان کی گلوری بناتے اور اس کو کھا کر پھر تروتازہ ہو جاتے اور ان کا نہ تھکنے والا قلم پوری تیزی سے رواں ہو جاتا۔ جب ان کی نظر اپنے باغوں کی طرف اٹھ جاتی تو قلم اور تیز ہو جاتا۔ شاید ان کے سب سے اچھے مضامین اس زمانہ میں لکھے گئے جب درختوں کے خوش رنگ آم ان کے کیف وسرور میں اضافہ کرتے رہتے تھے۔

ان کے صرف ایک لڑکا اور لڑکی ہے۔ لڑکا اس وقت پاکستان میں ایڈمنسٹریٹو سروس میں ہے اور لڑکی ان کے منجھلے بھائی مکارم احسن صاحب کے صاحبزادہ سے بیاہی ہوئی ہے۔ مولانا کی ساری دلچسپی ومحبت مکارم صاحب ہی کے ساتھ تھی۔ وہی ان کے ذہنی اور قلبی سکون کے سرچشمہ تھے۔ اگر مولانا کو کسی ایسی جگہ پہنچا دیا جاتا جہاں آموں کا ایک باغ ہوتا اور ان کے سامنے مکارم احسن صاحب ہوتے اور ان کو قلم، دوات اور کاغذ دے دیا جاتا تو وہ یہی سمجھتے کہ ان کو جنت نعیم کی ساری نعمتیں مل گئی ہیں۔ گیلانی میں ان کو یہ ساری چیزیں میسر تھیں اس لئے وہاں سے ہٹنا کسی حال میں پسند نہ کرتے تھے۔ صاحبزادے نے بار بار اپنے یہاں بلایا۔ پنجاب یونیورسٹی میں ان کو ڈیڑھ ہزار ماہانہ کی جگہ پیش کی گئی۔ کراچی یونیورسٹی نے اصرار کے ساتھ بلایا لیکن انہوں نے اپنی جنت کسی حال میں چھوڑنا پسند نہیں کی۔ ان کو اپنے کمرہ کی کُھری چارپائی پر دنیا کی ساری لذتیں حاصل تھیں۔ اسی پر بیٹھ کر وہ لکھتے رہتے تھے اور مکارم صاحب اپنے دیہی کاموں میں مشغول رہتے تھے اور جب وہ کھیت اور باغ کو دیکھ کر واپس آتے تو مولانا قلم چھوڑ دیتے۔ پھر ان کی زبانی باغ کی کیاریوں، کھیتوں، مینڈوں اور کاشتکاروں کے جھگڑوں کی باتیں ایسی دلچسپی سے سنتے کہ معلوم ہوتا کہ ان کے لئے اس سے زیادہ لذیذ تر حکایت اور کوئی نہیں۔ جب کوئی اہل علم کہیں سے ان سے ملنے کے لئے آجاتا اور مکارم صاحب موجود ہوتے تو مولانا خود خاموش ہو جاتے اور مکارم صاحب ہی علمی گفتگو شروع کر دیتے جو مولانا کی کہی ہوئی باتوں کی صدائے بازگشت ہوتی لیکن خود مولانا اس کو بڑے غور وانہماک سے سنتے اور شاید وہ غایت محبت میں مکارم صاحب کو اپنے سے زیادہ علم کا اداشناس اور نکتہ ور سمجھنے لگتے تھے۔ جب مکارم صاحب اٹھ کر چلے جاتے تو مولانا کے منہ سے پھر موتی جھڑنے لگتے۔ ان کے اس وصف کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔

اس ملاقات میں ان کی حکیمانہ ظرافت سے دن بھر محظوظ ہوتا رہا۔ ایک موقع پر جب ہندوستان و پاکستان کے مسلمانوں کا ذکر آیا تو بڑے اذعان واعتماد کے ساتھ فرمایا کہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کا مستقبل روشن پاتا ہوں

Marfat.com

اور اس کی وضاحت میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا کہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ایک مرید کا لڑکا اسلامیہ سکول میں تعلیم پاتا تھا۔ اس کے باوجود اس کے عقائد خراب تھے۔ مرید نے حضرت مولانا سے اس کی شکایت کی۔ انہوں نے فرمایا لڑکے کو اسلامیہ سکول سے نکال کر کسی غیر مسلم سکول میں داخل کردو۔ مرید نے ایسا ہی کیا۔ کچھ دنوں کے بعد مرید نے اطلاع دی کہ لڑکا اب پھر اسلام کی طرف مائل ہو رہا ہے اور کچھ دنوں کے بعد بالکل صحیح راستہ پر آ گیا۔ مرید نے مولانا تھانویؒ سے پوچھا کہ یہ طریقہ علاج سمجھ میں نہیں آیا۔ مولانا نے فرمایا کہ لڑکا جس ماحول میں تھا اس کے خلاف جانا پسند کرتا تھا، اس لئے جب وہ غیر مسلم سکول میں چلا آیا تو وہاں کے ماحول کے خلاف اسلامی شعار کی طرف مائل ہوگیا۔ مولانا گیلانیؒ نے یہ واقعہ بیان کرکے فرمایا کہ پاکستان کے مسلمان اپنے نئے ماحول میں کیا ہو جائیں گے اللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن ہندوستان کے مسلمانوں پر نئے ماحول کا جو ردعمل ہوگا وہ میری نظر میں امید افزا ہے۔ ان میں مذہبی احساسات اور ملّی جذبات کی بنا پر غیر شعوری طور سے پوری قوت مدافعت موجود ہے جو ہر زمانہ میں برقرار رہے گی جیسا کہ صدیوں سے رہی ہے۔ ہندوستان میں باہر سے جو قومیں آئیں وہ سب یہاں کی قوموں میں ضم ہوگئیں لیکن مسلمانوں نے اپنی انفرادیت باقی رکھی۔ ان کی مذہبی غیرت وحمیت میں بڑا استحکام ہے جو کمزور ہوسکتا ہے لیکن ختم نہیں ہوسکتا۔ اس پر ضرب کاری پڑسکتی ہے لیکن اس کا کوئی استحصال کرنا چاہے تو ممکن نہیں۔ مولانا کچھ اس یقین کے ساتھ یہ گفتگو فرمارہے تھے کہ مجھ کو بھی ہندوستان کے مسلمانوں کا مستقبل تاریک نظر نہیں آرہا تھا۔

اس ملاقات کے چار مہینے بعد جب نومبر ۱۹۵۳ء میں مولانا نے حضرت سید صاحب کے انتقال کی خبر کراچی ریڈیو سے سنی تو کلیجہ تھام کر زمین پر بیٹھ گئے اور ان کو محسوس ہوا کہ ان پر قلب کا شدید حملہ ہوا ہے جس سے وہ جانبر نہ ہو سکیں گے۔ اسی پریشانی میں ان کی زبان سے نکلا

آج محفل علم کی افسوس سونی ہوگئی — دین و دانش کے چمن کی لٹ گئی گویا بہار
اب کرے گا کون ہم میں دین کے اسرار کو — کاوش تحقیق کی صیقل گری سے آشکار

پھر اس میں کچھ اور اشعار بڑھا کر پورا ایک مرثیہ لکھ دیا، جس کی ایک نقل دارالمصنفین کو بھی بھیجی۔ حضرت سید صاحب کی رحلت پر پورا دارالمصنفین سوگوار تھا۔ ان کے اس مرثیہ نے اور بھی سوگوار بنا دیا اور جب مولانا ابوالحسن علی ندوی نے حضرت سید صاحب کی تعزیت میں ندوۃ العلماء لکھنؤ میں جلسہ کیا تو مولانا نے اپنی ناسازی طبع کے باوجود اس میں شرکت کے لئے گیلانی سے لکھنؤ سفر کرنے کی زحمت گوارا کی۔ اس جلسہ کے ایک اجلاس کی صدارت بھی انہوں نے کی تھی اور حضرت سید صاحب پر ایک طویل مقالہ بھی پڑھا تھا۔ وہ اندرونی طور پر تو بہت مغموم اور ملول تھے اور مقالہ پڑھنے میں ان کے آنسو رواں ہو جاتے تھے لیکن ان کی سدا بہار طبیعت کی شگفتگی اور سنجیدہ ظرافت کا اظہار بھی موقع بموقع ہوتا رہا۔ حضرت سید صاحب پر مقالہ پڑھ رہے تھے تو سیرۃ النبی کے سلسلہ میں ایک ایسا مقام آیا جس کی وضاحت ایک زبانی لطیفہ کے ذریعہ سے کی۔ فرمایا کہ والد صاحب کو اپنی کسی جائداد کے سلسلہ میں عدالتی کارروائی کرنی پڑی۔ اس مقدمہ کی تحقیقات کے سلسلہ میں ایک ہندو مجسٹریٹ ان کے یہاں آیا اور ہمدردانہ پوچھا کہ اگر آپ کے خاندان میں کوئی ولی گزرا ہے تو میں کاغذ میں ذکر کردوں۔ والد صاحب نے فرمایا کوئی ولی تو نہیں گزرا ہے لیکن نبی گزرا ہے۔ [1]

Marfat.com

مجسٹریٹ نے کہا نبی سے کام نہیں چلے گا ولی کی ضرورت ہے۔اس کی نظر میں نبی سے زیادہ ولی کی اہمیت تھی۔

اس موقع پر ندوۃ العلماء میں بڑا شاندار اجتماع ہوا تھا۔لکھنؤ کے علاوہ بھوپال، پھلواری شریف، دریا باد اور اعظم گڈھ کے بہت سے علماء وفضلاء جمع ہوئے تھے لیکن عام اجلاس اور نجی مجلسوں میں مولانا ہی بڑے چھوٹے سب کا مرجع بنے ہوئے تھے اور ہر شخص ان کی باتوں کی مٹھاس اور نرمی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔موضوع سخن زیادہ تر حضرت سید صاحبؒ ہی کی ذات گرامی تھی۔ایک موقع پر فرمایا کہ سید صاحب کا سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ اپنے علم وفضل کے باوجود حضرت تھانویؒ کے آستانے پر جا کر جھک گئے۔پھر کہنے لگے کہ اگر دل کی تربیت نہ ہو تو صرف دماغ کو روشن کر کے آدمی نہ خود کوئی نفع حاصل کر سکتا ہے نہ دوسروں کو پہنچا سکتا ہے۔جب مجھ کو خبر ملی کہ سید صاحب تھانہ بھون سے منسلک ہو گئے ہیں تو میں بے حد مسرور تھا اور ان کو مبارک باد کے کئی خط لکھے۔

لکھنؤ سے واپسی کے بعد میں نے حضرت سید صاحب کے نام مشاہیر کے جو خطوط دارالمصنفین میں محفوظ ہیں ان کو دیکھنا شروع کیا تو ان کے بیعت ہونے کے سلسلے میں مولانا گیلانی کے بہت سے عجیب وغریب خطوط نظر آئے مثلاً ایک مکتوب مورخہ ۲۵ اپریل ۱۹۴۲ء میں کس والہانہ انداز سے تحریر فرماتے ہیں۔

> ''الحمد اللہ علم کی دولت کے ساتھ معرفت وعمل کی نعمت بھی آخر میں آپ کے لئے مقدر تھی۔ آستانہ تھانہ بھون کی حاضری کا حال مولانا عبدالباری صاحب سے معلوم ہوتا رہتا تھا۔ هنيالكم ثم هنينا لكم الصادقين کی معیت آپ کو مبارک ہو۔انعمت عليهم کے صراط کی ہدایت اصل ہدایت ہے۔غضب اور ضلالت سے نجات کی واحد راہ یہی ہے ''حسن اولئک رفیقا'' کی سند کے ساتھ الرفیق الاعلیٰ کی مجلس انس کی شرکت ہر قسم کی مجلسوں سے گذرنے کے بعد ان شاء اللہ رسوخ تام کی بشارت وضمانت کی حامل ہے۔عجیب راہ ہے۔نہ یہاں محاسدہ ہے نہ مباغضہ، نہ منافسہ، نہ مقابلہ بلکہ ہر ایک دوسرے کے لئے داعی۔گو مدت ہوئی اس راہ سے دور ہو چکا ہوں لیکن اب تک وہ حلاوتیں دل ناکام کو یاد ہیں جو کسی زمانہ میں میسر آئی تھیں۔آپ لوگوں کی انقلابی زندگی خیر کی طرف اور میرا انقلاب شر کی طرف باعث عبرت ہے۔''

اس خط میں مولانا کے آئینہء دل کا جوہر نظر آ رہا ہے۔وہ حضرت سید صاحب سے عمر میں بہت چھوٹے تھے لیکن ان کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ وہ راہ سلوک پر ان سے بہت پہلے گامزن ہوئے اور جس زمانہ میں حضرت سید صاحب یہ کہہ رہے تھے کہ

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ

تو مولانا یہ کہنے میں حق بجانب تھے کہ

سکھائی عشق نے مجھ کو حدیث رندانہ

Marfat.com

ان پر یہ حقیقت بہت پہلے آشکارا ہو چکی تھی کہ

ہے ابد کے نسخہ دیرینہ کی تمہید عشق
عقل انسانی ہے فانی ، زندہ جاوید عشق

مکتوب بالا میں ان کے ''دل ناکام'' کی صدا دراصل ان کے ''دل کامگار'' کی غمازی کر رہی ہے۔ مگر اس کے اظہار میں کیسی حلاوت ہے، وہ اپنی ''صحت نفس'' کی خاطر جو ''مخالفت نفس'' کر رہے ہیں وہ لائق غور ہے اور یہ درجہ سلوک کی کٹھن منزلوں کے طے کرنے کے بعد ہی حاصل ہوسکتا ہے۔ جب حضرت سید صاحبؒ کو مولانا تھانوی کے یہاں سے خلافت ملی تو مولانا ''محاسدہ'' تنافسہ'' اور ''مقابلہ'' سے پاک ہوکر ''تجرید'' کی حالت میں ۳ فروری ۱۹۴۳ء کو لکھتے ہیں:

سیدی الامام! بشری لکم وطوبی۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

ایں قالب فرسودہ گرازکوئے تو دورست
الکلب علی بابک لیلا ونہارا

کچھ عجب حال ہے۔ جب آپ کی زیارت موجب اجر وثواب بنی تو جسے ثواب واجر کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہی اس سعادت سے محروم ہے۔ آپ کہاں سے کہاں پہنچے اور پہنچا دیئے گئے اور ہم جرس کارواں کی صرف آواز ہی سنتے رہے۔ مولانا عبدالباری صاحب سے والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا کی جو تفسیر آپ کے ساتھ ہو رہی ہے اس کی خبر میں سنتا رہتا ہوں۔ کتنی مسرتیں ان خبروں میں اپنے لئے پاتا ہوں۔ آپ کو اس کا شاید اندازہ نہ ہوگا۔ خبر ملی تھی کہ آستانہ حکیم الامت مدظلہ العالی سے سند خلافت بھی حاصل ہو چکی ہے۔ ''معارف'' کے شذرات میں جو کچھ جس قلم سے شائع ہوئے اب اس کی عبدیت اور بندگی میں کون شک کرسکتا ہے۔ بندے نے بندے کے بندے ہونے کی توثیق کی۔ میرے نزدیک تو خلافت کا حاصل ترجمہ یہی ہے جب سب کچھ گناہوں سے مٹ جائے اور

از خدا خواہم و زغیر نخواہم بخدا کہ نیم بندہ غیر و نہ خدائے دگراست

اسی ایک حقیقت واقعیہ کا تحقق تام، بس سب کچھ صرف یہی ہے۔ ایاک نعبد وایاک نستعین کے مقام پر سرفرازی نصیب ہوئی۔ ان شاء اللہ فردوس میں اس کے منزل کی تیاری ہے۔ ایسی مہمان وازی کو لا یبغون عنھا حولا اس سے کہ لو کان البحر مداد الکلمات ربی لنفد البحر۔ طلب لامحدود کے لئے مطلوب کو بھی لامحدود ہونا چاہیے بلکہ مطلوب کی لامحدودیت ہی نے اس طالب کو پیدا کیا جس کی ''ہلوعیت'' کسی نقطہ پر ختم نہیں ہوئی۔ کسی راہ میں ہو، خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنی فطرت کے اس جذبہ کو اسی راہ پر لگا دیا جس کے پیدا کرنے والے نے اسے پیدا کیا تھا کہ آدمی نے اس ہلوعیت کو خود نہیں پیدا کیا ورنہ خلف

کے فاعل کا مجہول کیوں کیا جاتا۔ دیکھئے قدم بوسی کی تمنا کب پوری ہوتی ہے اور حالات کیا عرض کروں

ہمیں نالہ ماند مسکیں حسن را ازاں روز ترسم کہ ایں ہم نہ ماند

واللہ اعلم نسل انسانی کی دیوار کس کروٹ کرنے والی ہے۔ خیر ہم تو بہت جی چکے۔ اتنا کہ حساب سے عہدہ برآ ہونا صرف فضل ہی کے محول ہے۔ اب تو سامنے زیادہ یہی حال تنہا ہے

عنقریب ست کہ از ما اثرے باقی نیست شیشہ بشکستہ وے ریختہ و ساقی نیست

یہ مکتوب چھپنے کے لئے نہیں لکھا گیا تھا محض ایک نجی خط ہے جو قلم برداشتہ لکھا گیا ہے لیکن اس کے پڑھنے کے بعد دل پر یہ اثر پڑتا ہے کہ یہ تحریر ایک پاک دل اور ایک پاک طینت انسان ہی کے قلم سے نکل سکتی ہے۔ اس میں ایسا سالکانہ ذوق وشوق اور عارفانہ کیف و بے خودی ہے جو لکھنے والے کے تزکیہ نفس، تصفیہ قلب اور تحلیہ روح کا پتہ دیتی ہے اور ''گوہر عشق'' گوہر روح'' اور ''گوہر معرفت'' کے پرکھنے والے جوہری نے حضرت سید صاحبؒ کو ۳ مارچ ۱۹۴۳ء کو پھر ایک نجی مکتوب میں تحریر فرمایا۔

سیدی الکریم، زادکم اللہ عرفاناً وقرباً۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یقیناً ہم امینوں کے حدود سے آپ بہت بلند ہو چکے ہیں۔ یونہی بلندی کیا کم تھی اور اب تو ماشاء اللہ حکیم الامت مدظلہ العالی کی نیابت وخلافت کی دولت سے سرفراز ہیں۔ چالیس سال تک مولانا شبلی کی اور عمر عزیز کے چہل سالہ کے بعد مولانا تھانوی کی نیابت کی۔ رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔ عمر بن عبدالعزیزؒ کا واقعہ یاد آیا۔ خلافت کے زمانہ میں لباس کی قیمت چند درہم سے آگے نہ بڑھی۔ پوچھنے والے نے ولید اور عبدالملک کی گدی پر بیٹھنے والے سے پوچھا۔ مشہور جواب ہے کہ تمنا کی مدینہ کی ولایت کی، پوری ہوئی، فاطمہ بنت عبدالملک سے شادی کی، پوری ہوئی، خلافت کی، پوری ہوئی اب جنت کی تمنا کی باری ہے۔ صرف اس کا سامان ہے۔ آپ نے بھی وہی کیا اور خوب کیا۔ ومثل هذا فليعمل العاملون بارک الله فيكم وعليكم''

مولانا کے خطوط سے کیسی وضاحت ہو جاتی ہے کہ حضرت سید صاحب نے کیوں تھانہ بھون کے آستانہ پر جا کر اپنی جبین نیاز رکھ دی تھی۔

مقام عقل سے آساں گذر گیا اقبالؔ مقام شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ

جب راقم کا دل مولانا کی روحانی عظمت سے متاثر ہو رہا تھا ان ہی دنوں ان کا ایک مضمون ''مسلمانوں کا اندلس مسلمانوں کی نگاہ میں'' ''معارف'' میں شائع ہوا جس کی سطر سطر سے اسلام کے لئے ایک بے چینی اور تڑپ ظاہر ہوتی ہے اور ایک عارفانہ بصیرت سے دکھایا گیا ہے کہ اگر مروانی حکومت اسلام کی تمکین اور استقرار کے لئے

Marfat.com

قرآنی نصب العین سامنے رکھتی تو وہ ختم نہ ہوتی لیکن ان کی حکومت کے زمانے میں قرآن سے چشم پوشی اختیار کی گئی ۔قرآنی دعوت کے پیش کرنے والے نمونوں سے اعراض کیا گیا اور ان لوگوں کو جو اسلام اور پیغمبر اسلام کو ساری انسانیت کا مشترکہ ورثہ قرار دینے پر اصرار کرتے تھے، رسوا اور بدنام کیا اور ان کے مقابلہ میں مستقل محاذ بنا لیا گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی ہی بھڑکائی ہوئی آگ میں مروانیوں کی حکومت خود ہی جل بھن کر ختم ہوگئی۔ آخر میں مولانا نے ایک بہت ہی حکیمانہ بات لکھی ہے کہ مسلمانوں کے لئے وہ اندلس زیادہ پائدار ہوتا جس میں خواہ الحمراء، الزہرا، قرطبہ اور غرناطہ نہ ہوتے مگر مسلمانوں پر جو فرض آخرالامم ہونے کی حیثیت سے عائد کیا گیا ہے اگر اس کو وہاں کا حکمراں طبقہ پیش نظر رکھتا تو وہ سیاسی مصائب و آفات کے جن گراویوں میں تہ و بالا ہوکر رہ گئے شاید یہ صورت پیش نہ آتی۔ مولانا کا یہ پیام آج بھی تمام اسلامی ممالک کے حکمرانوں کے لئے ہے یعنی اگر وہ مادی اور نمائشی کاموں کو انجام دینے کے بجائے مسلمانوں کے اخلاق، کردار اور سیرت کا الحمراء اور قرطبہ بنانے میں مشغول ہو جائیں تو کوئی قوت ان کو نہیں مٹا سکتی۔

اس مضمون کے پڑھنے کے کچھ ہی دنوں کے بعد مجھ کو آگرہ جانے کا اتفاق ہوا اور تاج محل دیکھنے گیا تو اس کی غیر معمولی صناعی، بے مثل کاریگری اور دلکشی و رعنائی دیکھنے کی ساری لذت مولانا کے مضمون کو یاد کر کے جاتی رہی اور یہی خیال آیا کہ اگر ہندوستان کے مسلمان حکمراں شاندار عمارتیں بنانے کے بجائے یہاں کے مسلمانوں کے کردار کا تاج محل اور اخلاق کا لال قلعہ بنا گئے ہوتے تو آج ان کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔

نومبر ۵۳ء میں مولانا کے قلب پر جو حملہ ہوا تھا اس نے مستقل مرض کی شکل اختیار کر لی۔ مارچ ۵۴ء میں ان پر اس کا ایسا سخت حملہ ہوا کہ امید زیست جاتی رہی لیکن ان کے جانثار بھائی مکارم صاحب نے علاج میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ ان کو گیلانی سے پٹنہ ہسپتال لے آئے اور معالجہ میں روپے پانی کی طرح بہائے۔ وہ پٹنہ ہی میں مقیم تھے کہ میں ان کی عیادت کے لئے حاضر ہوا۔ ڈاکٹروں نے ان کو بہت ہی کم بولنے کی اجازت دی تھی اور مکارم صاحب نے اور بھی زیادہ پابندی عائد کر رکھی تھی لیکن مولانا نے اس ناچیز کو دیکھ کر ساری پابندیاں توڑ دیں۔ مکارم صاحب روکتے رہے مگر ان کی باتیں چل نکلیں تو پھر کسی کے روکے نہیں رکیں۔ زیادہ تر تفریحی باتیں رہیں لیکن ان میں بھی ان کی دقت نظر دکھائی دیتی تھی۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ذکر آیا تو فرمانے لگے کہ ان کی طبیعت میں بچپن ہی سے بڑی نکتہ رسی تھی۔ وہ دیوبند میں تعلیم پا رہے تھے تو ان کے کسی ہم درس کی کتاب غائب ہوگئی۔ اس نے درس کے وقت مدرس سے شکایت کی کہ کسی لڑکے نے اس کی کتاب چرا لی ہے۔ مدرس صاحب جھلا کر بولے افسوس ہے کہ دیندار لوگ بھی چور ہوتے ہیں۔ مولانا اشرف علیؒ اسی وقت بول اٹھے کہ ایسا نہ فرمائیں بلکہ یہ کہیں کہ ''کوئی چور دیندار لوگوں کے ساتھ پڑھنے آ گیا ہے۔'' مولانا گیلانی کو ارادت تو مولانا محمود الحسنؒ سے تھی لیکن ان کو مولانا تھانویؒ سے بھی بڑی عقیدت تھی اور ان کا ذکر ہمیشہ بہت ہی محبت اور احترام سے کرتے۔ وہ اسی وسیع المشربی کی وجہ سے ہر طبقہ میں محبوب رہے۔ پٹنہ میں ان کے معالج ڈاکٹر عبدالحئی تھے جو وہاں کے مشہور و مقبول ہونے کے علاوہ بڑے مشغول طبیب ہیں لیکن وہ مولانا کا علاج بڑی محبت اور تندہی سے کر رہے تھے اور اس کو بڑی سعادت سمجھتے تھے۔

کچھ دنوں کے بعد وہ پٹنہ سے گیلانی واپس چلے گئے اور مکارم صاحب کی نگرانی میں بڑی احتیاط سے زندگی بسر کرنے لگے۔ ان کو لکھنے پڑھنے سے بالکل منع کر دیا گیا تھا لیکن وہ حریصانہ نظروں سے اپنی کتابوں کی الماریوں کی طرف دیکھا کرتے تھے۔ شیخ ابن عربی پر لکھنے کے لئے دارالمصنفین سے بہت سی کتابیں منگائی تھیں ان کو کبھی کبھی الٹ پلٹ کر دیکھ لیتے تھے مگر مکارم صاحب کی تیکھی نظروں کو دیکھ کر بند کر دیتے گو ہم لوگوں کو جب خطوط لکھتے تو اپنی زندگی کو مایوسی کے باوجود علمی دنیا میں مراجعت کی امیدیں بھی دلاتے۔ ان کو دنیا میں اگر کوئی حسرت باقی رہ گئی تھی تو یہی کہ بعض چیزیں جوان کے سینہ میں ہیں، ان کو سفینہ میں منتقل کرنے سے معذور ہو رہے تھے۔

راقم مئی ۵۶ء میں اعظم گڈھ سے وطن پہنچا تو ان کی قدم بوسی کے لئے گیلانی پہنچنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ایک روز ڈاک سے ان کا حسب ذیل محبت نامہ ملا۔

''عزیز محترم......! السلام علیکم ورحمتہ اللہ برکاتہ

اتنے طویل المدت مریض کے متعلق یہ واقعہ ہے کہ مر جانے یا تندرست ہو جانے کا فیصلہ قدرتی ہے لیکن کیا کیجئے آپ کا یہ مریض المسمی بہ مناظر احسن گیلانی نہ اب تک مرا ہے اور نہ اچھے ہونے کی بشارت سنا سکتا ہے۔ اسی حال میں مگن ہے جس میں رکھا گیا۔ کل شاہ صاحب قبلہ کا نوازش نامہ ملا جس میں آپ کے دیسنہ پہنچنے کی خبر درج تھی۔ دارالمصنفین کی جو امانت ہمارے پاس محفوظ ہے اس کو آپ کے حوالے کر دینا چاہتا ہوں کیونکہ اب شیخ ابن عربی پر کچھ لکھوں تو ضرورت ہے کہ دوسری دفعہ پیدا کیا جاؤں۔ اب فرمائیے کہ اس کے لئے کیا کروں کیا۔ دیسنہ ان کتابوں کو کسی کے معرفت بھیج دوں مگر آپ کی ملاقات سے محرومی معمولی محرومی نہ ہوگی۔ بہر حال جو رائے عالی ہو اس سے مطلع فرمائیں۔ ڈاک سے اس لئے خط بھیج رہا ہوں کہ زمینداری ختم ہونے کے بعد اب چھٹی چپاتی کی کوئی راہ ڈاک کے سوا باقی نہیں رہی......''

اس خط کے فوراً ہی بعد میں گیلانی حاضر ہوا تو ان کے چہرہ کو تو منور لیکن جسم کو نحیف، لاغر اور کمزور پایا اور ان کے دونوں پاوں پر آماس دیکھ کر عجیب کیفیت گذری۔ مجھ کو دیکھ کر چارپائی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بڑی محبت اور گرم جوشی سے بغل گیر ہو کر فرمایا ''خوب آ گئے۔ اب چل چلاؤ ہے۔'' یہ سن کر دل پر ایک چوٹ لگی۔ مکارم صاحب موجود تھے اس لئے وہ رُک رُک کر باتیں کرتے رہے مگر جب مکارم صاحب اٹھ کر چلے گئے تو گفتگو کا سرچشمہ بہہ نکلا۔ فرمانے لگے گیلانی بہت عزیز ہے اس لئے یہیں پڑا ہوں۔ پھر گیلانی پر اپنی ایک مطبوعہ مثنوی پڑھنے کو دی جس کے بعض اشعار یہ ہیں:

مسقط الراس وہ وطن پیارا   عہد طفلی کا اپنے گہوارا
منظر اس کا ہے کیسا دیدہ زیب   اف وہ مینو سواد زہد فریب

Marfat.com

وہ دخترتوں کی اس کے رعنائی اور باغوں کی حسن و زیبائی

پھر بڑی احتیاط سے ایک ملفوف خط دے کر کہا ''اس کو پڑھو، میں نے اسی خط کی بنا پر گیلانی نہیں چھوڑا۔''
میں نے وہ خط لیا تو اس کے اوپر ان ہی کے ہاتھ سے لکھے ہوئے یہ فقرے تھے:

''ایک تاریخی مکتوب یعنی نامہ سلیمانی جس میں گیلانی میں قیام پر اصرار کیا گیا ہے۔''

میں نے خط کھول کر پڑھا تو معلوم ہوا کہ حضرت سیدؒ صاحب نے ان کو ۱۱ فروری ۱۹۴۷ء میں بھوپال سے حیدر آباد دکن تحریر فرمایا تھا۔

''محبِّ اعز و اغر، متعنا ببر کاتکم
السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ میں لوگوں کی اس حرکت کو پسند نہیں کرتا کہ بہار کے مقتولین و شہداء کا ایسا نقشہ کھینچیں کہ باقی ماندوں پر رعب اور ہراس چھا جائے۔ ورنہ ایک دن پورا ہندوستان خالی کرنا پڑے گا۔ آپ اب بھی گیلانی میں ہیں اور آئندہ بھی یہیں رہیں گے۔''

ابھی خط پڑھ ہی رہا تھا کہ انہوں نے فرمایا کہ حضرت سیدؒ صاحب نے میرے لئے پیشین گوئی کی تھی بلکہ ان کا حکم تھا اسی لئے میں یہاں پڑا ہوں۔

حضرت سید صاحب سے ان کی یہ عقیدت کتنی قابل قدر ہے۔ پھر وہ ان ہی کے متعلق دیر تک گفتگو کرتے رہے اور فرمانے لگے۔ میں نے پہلی بار غالباً ۱۹۳۰ء میں ہی ان کو مولانا تھانویؒ کے پاس بھیجا تھا اور جب وہ مولانا سے مل کر واپس آئے تو کچھ خوش نہ تھے۔ ملاقات کی تفصیل سے اندازہ ہوا کہ اس موقع پر انہوں نے مولانا تھانویؒ سے پورے عالمانہ انداز میں گفتگو کی تھی۔ میں نے سید صاحب سے عرض کیا آپ کی ناخوشی بے جا نہیں۔ مولانا تھانویؒ کو آپ تو پسند آئے لیکن آپ جس مقام سے بول رہے تھے وہ ان کو پسند نہیں آیا۔ سید صاحب یہ سن کر پھڑک اٹھے۔ اسی سلسلہ میں مولانا نے فرمایا کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ جب حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کے پاس پہنچے تو ایک روز حضرت گنج شکرؒ نے ان سے کہا ''آؤ آج تم کو ''عوارف المعارف'' پڑھائیں۔'' حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اس کتاب کو پہلے پڑھ چکے تھے اور اس پر پوری طرح حاوی تھے، اس لئے ان کو خیال ہوا کہ درس سے ان کے علم میں کوئی اضافہ نہ ہوگا مگر مرشد کا حکم تھا اس لئے کتاب لے کر پہنچے۔ درس میں کسی مسئلہ پر حضرت نظام الدینؒ نے بحث کرنے کی کوشش کی۔ حضرت فرید الدینؒ کتاب بند کر کے اٹھ کھڑے ہوئے اور کئی روز تک حضرت نظام الدینؒ سے مخاطب نہیں ہوئے۔ مرشد کی یہ آزردگی دیکھ کر حضرت نظام الدینؒ نے ان سے پوچھا کیا میں نے درس میں کوئی غلط بات کہی تھی۔ حضرت گنج شکرؒ نے فرمایا نہیں جو بات کہی تھی وہ صحیح تھی لیکن جس مقام سے تم کہہ رہے تھے وہ صحیح نہ تھا۔

مولانا نے اس واقعہ کو کچھ ایسے مؤثر انداز میں بیان کیا کہ اس کو سن کر مجھ کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میری آنکھوں کے سامنے سے تاریکی کے پردے اٹھ گئے۔ زندگی کو سمجھنے اور سلجھانے میں یہ کتنا اہم نکتہ ہے۔ راقم خاموشی کے

Marfat.com

ساتھ ان کی گفتگو کی روانی اور شیرینی سے لذت لیتا رہا لیکن اسی زمانہ میں اپنے ایک عزیز ڈاکٹر محمد امام سپرنٹنڈنٹ پٹنہ میڈیکل کالج ہسپتال سے وہاں کا ایک واقعہ سنا تھا جو ان کی خدمت میں عرض کیا۔ وہ یہ تھا کہ ہسپتال کے جنرل وارڈ میں ایک فوجی کپتان کا بچہ داخل ہوا۔ اس کی ماں تیمارداری میں تھی جو آس پاس کے مریضوں کو بہت تنگ کرتی تھی اور اس سے سب ہی پریشان تھے۔ بغل ہی میں ایک بوڑھا لیکن ظریف مریض بھی تھا۔ ایک روز فوجی کپتان وہاں آیا۔ بوڑھے مریض نے اشارے سے اس کو اور اس کی بیوی کو اپنے پاس بلایا اور اس کی بیوی کو مخاطب کر کے کہا ''بیٹی ایک قصہ سنو۔ ایک شخص کہیں جا رہا تھا کہ راستے میں اس کو اللہ میاں مل گئے۔ اس نے اللہ میاں سے پوچھا ''آپ نے انسانوں کے کھانے کے لئے تو طرح طرح کی نعمتیں پیدا کیں لیکن آپ خود کیا کھاتے ہیں؟'' اللہ میاں بتانے پر راضی نہیں ہوئے لیکن جب وہ بضد ہوا تو فرمایا ہم بس ایک ہی چیز کھاتے ہیں اور وہ انسان کا غرور ہے۔ یہ قصہ سنا کر بوڑھے مریض نے اس عورت سے کہا کہ بیٹی کہیں ایسا نہ ہو کہ تو بھی اللہ میاں کی غذا نہ بن جائے۔''

یہ قصہ سن کر مولانا جو لیٹے ہوئے تھے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ فرمایا کہ کیا خوب قصہ سنایا۔ پھر کلام پاک کی آیتیں پڑھ کر سنانے لگے اور ان کی تفسیر میں فرمایا کہ اللہ میاں نے کہا ہے کہ میں نے سب کچھ اپنے بندوں کو دے دیا ہے۔ اپنے پاس کچھ نہیں رکھا البتہ کبریائی کی ایک چادر ہے جس کو اوڑھے رہتا ہوں۔ اب اگر کوئی بندہ اس کو بھی مجھ سے لینا چاہتا ہے تو میں برہم ہو جاتا ہوں کہ اس کو یہ بھی گوارا نہیں کہ میرے پاس یہ چادر ہی رہے۔ اس مزاحیہ تفسیر میں گوش شنوا کے لئے کیا کچھ نہیں ہے۔

ان ہی دنوں ''معارف'' میں چندر پرکاش جوہر کی ایک غزل شائع ہوئی تھی۔ سلسلہ کلام میں مولانا نے پوچھا یہ کون اہل دل ہیں؟ عرض کیا کہ ابھی بالکل ہی نوجوان ہیں۔ فرمایا کہ یہ تو کوئی دل ہی والا کہہ سکتا ہے۔

یہ کمال ضبطِ غم ہے کہ سلیقہ محبت
مرا دل تو رو رہا ہے مگر آنکھ تر نہیں ہے

پھر کہا کہ ظالم نے کیا کہہ دیا ہے:

وہ تمامتر توجہ بایں سازش تغافل
وہ یوں باخبر ہیں جیسے انہیں کچھ خبر نہیں ہے

اور پھر بڑی حسرت سے یہ شعر پڑھا:

غم جستجو کے صدقے وہ مقام دل بھی آیا
کہ بجز خیال جاناں کوئی ہم سفر نہیں ہے

شاید وہ اپنے ''مقام دل'' میں اپنے ''ہم سفر'' کو دیکھ رہے تھے۔

سلسلہ کلام جاری تھا کہ مکارم صاحب آ گئے، اس لئے وہ خاموش ہو گئے۔ پھر جب مکارم صاحب گاؤں کے قصے سنانے لگے تو مولانا ان کی گفتگو سننے میں محو ہو گئے۔

میرا قیام دن بھر رہا، آموں کا موسم تھا، اس لئے دسترخوان پر آموں کا ڈھیر تھا۔ خود مولانا نے صرف چند قاشیں کھائیں لیکن آموں کی رعنائی دیکھ کر اور ان کی تعریف سن کر بہت مسرور نظر آ رہے تھے۔ مکارم صاحب کی گفتگو سننے کے بعد جب کبھی ان کو خود باتیں کرنے کا موقع ملتا تو وہ زیادہ تر اپنی موت ہی کا ذکر کرتے اور ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا کہ اب ان کے دل میں کوئی خواہش باقی نہیں رہ گئی ہے۔ ہاں دکھ تھا تو یہ کہ وہ اپنی نظروں کے سامنے

Marfat.com

چاروں طرف کتابیں دیکھتے تھے لیکن پڑھ نہیں سکتے تھے اور پڑھنے سے زیادہ لکھنے سے معذور ہو چکے تھے۔ وہ گویا اپنے آپ کو آبِ حیات کے پاس کھڑا دیکھتے لیکن اس کے پینے پر پابندی عائد تھی۔ ان کے لئے یہ تکلیف نا قابل برداشت تھی جس کو دور کرنے کے لئے کبھی اپنے چھوٹے نواسے انس، کبھی پالتو تیتر اور مور سے دلچسپی لے کر وقت گزارنے کی کوشش کرتے۔

جب میں ان سے رخصت ہونے لگا تو عجب پُر درد منظر تھا۔ میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا میں تو اب برابر یہی پڑھتا ہوں۔

دل نہیں لگتا تو کیوں گھبراؤ شادؔ — جی چکے، بس تا بکے، مر جاؤ شادؔ
منہ نہ پھیرو اس نگاہ مست سے — برچھیاں سینہ پر تن کر کھاؤ شادؔ

اور یہ شعر تو گویا ان کی موت کی پیشین گوئی تھی

میں نے مانا بخشوا لو گے گناہ — اور جو اس کی بھی نہ مہلت پاؤ شادؔ

اس کو پڑھ کر فرمایا کن کن آرزوؤں کے لئے آدمی زندہ رہے اور یہ اشعار سن کر تو میں بھی آبدیدہ ہو گیا۔

خط شوق اپنا لفاذ میں رکھو — آرزوؤں کو کفن پہناؤ شادؔ
دے چکی اک عمر تک دنیا فریب — اب نہ اس دھوکے کے اندر آؤ شادؔ

لیکن وہ خود اس طرح مسرور اور شاداں ہو کر ان اشعار کو پڑھ رہے تھے جیسے اس دار المحن کو چھوڑ کر ایک ابدی دار المسرت کی طرف کوچ کے لئے بے چین ہوں۔

جب میں ان سے رخصت ہوا تو یہ خیال کر کے دل بیٹھا جاتا تھا کہ اب شاید ملاقات کی نوبت نہ آئے اور بار بار یہ خیال آتا تھا کہ حضرت سید صاحبؒ کی رحلت کے بعد کبھی کبھی مولانا کی صحبت میں جو ذہنی سکون اور روحانی لذت مل جاتی تھی، کہیں اس سے بھی محروم نہ ہو جاؤں۔

دیسنہ واپس آنے کے پانچویں ہی روز یعنی ۵ جون ۱۹۵۶ء کو یکا یک خبر ملی کہ مولانا جنت کو سدھار گئے۔ یہ خبر اتنی دیر میں ملی کہ شرکت جنازہ کی سعادت سے محروم رہا۔ دوسرے دن علی الصباح گیلانی پہنچا۔ جب مکارم صاحب نظر آئے تو مجھ کو دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ وہ مولانا سے صرف چار سال چھوٹے تھے لیکن اس طرح رو رہے تھے جیسے کوئی بچہ اپنے شفیق باپ کی موت پر روتا ہو۔ بڑے بھائی نے اپنے چھوٹے بھائی سے جیسی محبت کی اس کی مثال بہت ہی کم ملے گی۔ وہ رو رو کر بیان کرنے لگے کہ بھائی مرحوم ادھر کئی روز سے بہت اچھے تھے۔ گذشتہ رات کو اور بھی زیادہ خوش تھے۔ رات کے گیارہ بجے تک قوالی کی دھن میں کچھ غزلیں پڑھوا کر سنتے اور ہر شخص سے لطف و محبت کی باتیں کرتے رہے۔ بارہ بجے ان کو آرام کرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ ان کو دیر تک نیند نہیں آئی مگر پھر سو گئے۔ صبح سویرے اُٹھے، وضو کیا، کھڑے ہو کر فجر کی نماز ادا کی۔ وظیفہ پڑھا، پھر پلنگ پر آ کر لیٹ گئے۔ ملازم سے کہا رات نیند کم آئی تھی، اس لئے چادر اڑھا دو سوؤں گا، سوئے تو ابدی نیند سو گئے اور جب ہم لوگوں نے سانس رکتے ہوئے دیکھا تو ان کا چہرہ جوانوں کی طرح شگفتہ اور شاداب ہو گیا تھا۔

Marfat.com

کیسی اچھی موت پائی۔ ایک پاکیزہ روح اسی طرح عالم بالا میں منتقل ہوتی ہے۔ معلوم ہوا کہ جنازے میں آس پاس کے گاؤں کے ہندو مسلمان بکثرت شریک ہوئے تھے اور اس چھوٹے سے گاؤں میں ہر طرف آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ اسی آمد میں مولانا مرحوم کے کچھ کاغذات اور کتابیں دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کو مولانا عبدالماجد دریابادی مدظلہ العالی سے بڑا قلبی لگاؤ تھا۔ ان کی ترجمہ کردہ ''مناجات مقبول'' کی تلاوت روزانہ کرتے۔ اسی کے ایک ورق پر حسب ذیل تحریر پڑھ کر مسترت ہوئی۔

''۱۰ اپریل ۱۹۵۲ء۔ یکا یک سونے کے وقت رات کو قرآنی آیت: اللّٰہ یتوفی الا نفس حین موتھا والتی لم تمت فی منامھا فیمسک التی قضٰی علیھا الموت ویرسل الاخریٰ الیٰ اجل مسمّٰی کا خیال آیا۔ عجیب بات ہے کہ آخر میں فرما ہی دیا گیا ان فی ذالک لایات لقوم یتفکرون۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ مسلمانوں میں سکرات موت کے متعلق طرح طرح کی روایتیں مشہور ہوگئی ہیں۔ حالانکہ اس نص قطعی میں صاف طور پر اعلان کر دیا گیا ہے کہ نیند جیسے آتی ہے موت بھی اسی طرح آتی ہے۔ نیند آنے میں سونے والوں کو تکلیف کب ہوتی ہے پھر موت میں تکلیف کا تصور عجیب ہے۔ ہمارے استاد مولانا فراہیؒ سکرۃ الموت کے لفظ سے نتیجہ نکالا کرتے تھے کہ عندالموت مرنے والے پر نشہ کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ حضرت تھانویؒ نے امام غزالی کی ان روایتوں کی تنقید کرائی تھی جن سے موت کے شدائد پر امام نے ''احیاء العلوم'' میں استدلال کیا ہے۔''

مولانا نے آیت مذکورہ سے جو استنباط کیا تھا اسی کے مطابق ان کی موت ہوئی، جو بلاشبہ ایک مومن اور ایک عارف کی موت کہی جا سکتی ہے۔ انہوں نے شاید چشم بینا سے اپنی موت کا منظر پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔

مزار پر حاضری سے پہلے بعض اعزہ کے زنان خانے میں چلا گیا تو وہاں عورتوں کو سوگوار اور اشک بار پایا اور وہ کہہ رہی تھیں کہ جو بیوائیں ان کے مقرر کئے ماہانہ وظیفے پر زندگی بسر کر رہی تھیں اب ان کے دن کیسے گزریں گے۔ پھر اس کی تفصیل معلوم ہوئی کہ وہ کس طرح خاموشی سے ناداروں اور غریبوں کی مدد کیا کرتے تھے۔

جب ان کے مزار کی طرف چلا تو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ فضل و کمال کے خاتمہ پر آنسو بہانے، عالمانہ موشگافی اور نکتہ وری پر ماتم کرنے اور بہار کی علمی عظمت وفضیلت پر فاتحہ پڑھنے جا رہا ہوں اور جب تربت نظر آئی تو بے اختیار آنسو نکل پڑے کہ آہ ایک منور چہرہ، ایک لطیف جسم، ایک روشن ضمیر، ایک صاف طینت، ایک پاک دل، ایک پیکر محبت اور ایک مخزن علم اس تودہ خاک میں دفن ہے مگر دل یہ کہہ رہا تھا کہ قبول و مغفرت کا تاج ان کے سر پر رکھا جا چکا ہوگا۔ ان کے محبوب آم کے درختوں کی ہری ہری ڈالیاں ان کی تربت پر سایہ فگن تھیں۔ میں نقش حرماں بنا ہوا تھا اور وہ اپنی زندگی کی ساری رعنائیوں سے نقش حیرت بنا رہے تھے اور اقبال کا یہ شعر اچھی طرح ذہن نشین ہو رہا تھا۔

Marfat.com

جوہر انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں   آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

اور اقبالؔ نے یہ شعر بھی شاید ان ہی جیسے بزرگوں کے لئے کہا ہے

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ   عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام

اور وہ یقیناً اپنے ''دل الفت نسب''، ''سینۂ توحید فضا''، ''نگہہ جلوہ پرست'' اور ''نفس صدق گزیں'' کی وجہ سے ''صاحب عشق'' تھے اور ان کو حیات ابدی حاصل ہے۔

اور جب گیلانی چھوڑ کر واپس جارہا تھا تو ان کے یہ اشعار یاد آرہے تھے۔

یاد آتی ہے مجھ کو گیلانی   مظہر لطف غوث سبحانی

مصدر راز ہائے عرفانی   مطلع جلوہ ہائے روحانی

منبع علم مخزن حکمت   مرکز جاہ و عظمت و شوکت

گیلانی کی سرزمین میں ان کے آسودہ خاک ہونے سے یہ اشعار کس قدر بامعنی اور صحیح ہوگئے ہیں۔

(در: معارف (اعظم گڈھ)، مارچ ۱۹۵۷ء، ص ۱۶۵۔۱۸۷، اپریل ۱۹۵۷ء، ص ۲۴۵۔۲۷۱)

☆......☆......☆

Marfat.com

مولانا عبدالباری ندوی

مولانا سید مناظر احسن گیلانی

بڑا نادر سنگم......دل و دماغ دونوں کا

مقصود اوراق ذیل کا نہ صاحب مکتوبات کی عمری سوانح و واقعات ہیں نہ علمی وفکری، قلمی و تصنیفی کمالات و کارناموں کی کوئی تفصیل و تحقیق، نہ خود مکتوبات پر کوئی ادبی وانشائی تبصرہ وتنقید۔ان سب کے لئے اس نااہل مکتوب الیہ کے سوا صاحب مکتوبات کے دوسرے دوستوں، شاگردوں اور معتقدوں میں ماشاءاللہ ایک سے ایک بڑھ کر اہل موجود ہیں۔راقم عاجز کو مرتب مکتوبات حضرت مخدوم ابن مخدوم مولانا شاہ منت اللہ صاحب مدظلہ کے امتثال امر میں صرف یہ خیال آگیا کہ قریباً چوتھائی صدی کے قریب تعلقات کے علم و واقفیت پر مبنی صاحب مکتوبات کے قلب و باطن کی زندگی کے بعض ایسے گوشوں کو خصوصاً اجاگر کر دیا جائے جن پر دوسروں کی نظر کم پڑی ہوگی۔واللہ اعلم بالصواب۔

دماغ و ذہن کے چھوٹے بڑے کمالات کی دولت رکھنے والے تھوڑے بہت ہر جگہ ہر زمانہ میں مل جاتے ہیں لیکن دل کی دولت والے یا قلب و روح کے باطنی فضائل کے مالک ڈھونڈے بھی ہمیشہ کم ہی ملتے ہیں اور دونوں کی جامعیت تو کمیاب کیا نادر و نایاب ہوتی ہے۔ بلکہ دیکھا یہاں تک جاتا ہے کہ ذہن و دماغ کی غیر معمولی صلاحیت و عبقریت والے اسی نسبت سے بالعموم قلب و باطن یا دین و دل کے محاسن سے محروم ہوتے ہیں۔خالص دینی علوم وتعلیم کے علمی و قلمی نمایاں جوہر رکھنے والوں تک کو ایمان و یقین، صدق و اخلاص، ایثار و بے نفسی، تواضع و مسکنت، فنائیت و عبدیت وغیرہ کے باطنی وروحانی صفات میں اکثر خام یا ان سے خالی ہی پایا جاتا ہے۔

بھولنا نہ چاہیے کہ دین و دل کا ساتھ چولی دامن کا ہے۔قلب سلیم کے بغیر ''یوم دین'' کی حاضری میں نہ کوئی چیز کام آسکے گی نہ وہاں کی رسوائی سے بچا سکے گی۔ لا تحزنی یوم یبعثون. یوم لا ینفع مال ولا بنون ۔ الا من اتی اللہ بقلب سلیم۔

مشہور حدیث ہے ''دل بنا تو سب بنا یہ بگڑا تو سب بگڑا۔''

حضرت گیلانی (جعل اللہ فی تبرہ نورا کما جعل فی قلبہ نورا) ذہنی و دماغی علمی و قلمی گوناگوں

کمالات کسی تعریف وتعارف کے محتاج نہیں۔ خصوصاً اس بے علم کے قلم سے البتہ اس سلسلہ میں ایک بڑے خاص کمال کا علم و اندازہ جتنا اور جیسا کہ چاہیے لوگوں کو کم ہے۔ وہ ان کی بہت خاص الخاص قرآن مجید کی فہم وتفہیم تھی۔ ان کی انفرادی وفکری بڑائیوں میں راقم ہٰذا کی نظر میں یہی سب سے بڑی بڑائی تھی۔ بقول خود ''بیچارے مولوی نے سمجھا ہی نہیں'' کے نہ سمجھنے کے ڈر سے چھپاتے بہت تھے۔ سورہ کہف کی تفسیر شائع بھی ہونے دی تو اپنے خاص رنگ وذوق کی چیزوں کو دبا کر ہی زبان قلم تک آنے دیا۔ کچھ شک نہیں کہ بارہا ان کے ذہن کی تیزی اس راہ میں جتنی دور نکل جاتی وہ خلاف احتیاط ہی نہیں، ایمان وعمل کے لئے خطرناک بھی ہو جاتی تھی۔ خصوصاً عوام کے حق میں تاہم ان کی ژرف نگاہی اور دوررس ذہن ایسے بہتیرے حقائق کو پالیتا جن پر سلف سے خلف تک شاید ہی کسی مفسر قرآن کی نگاہ پڑی ہو اور یہ ''لا تنقضی عجائبه'' والی کتاب کے اعجاز کی عین شہادت ہے۔

اس زندہ کتاب کو حضرت مرحوم تفسیری کتابوں سے زیادہ زندگی کی زندہ کتاب اور زندہ واقعات ومشاہدات سے سمجھنے سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ ایک مثال یاد آئی۔ سورہ واللیل کی یہ آیتیں پڑھیے۔ ان سعیکم لشتی. فاما من اعطیٰ واتقیٰ. وصدق بالحسنیٰ..فسنیسره للیسریٰ. واما من بخل واستغنیٰ. وکذب بالحسنیٰ. فسنیسره للعسریٰ

انسان اپنے انفرادی واجتماعی حوائج وضروریات، مقاصد واغراض پورے کرنے کے لئے مختلف مساعی وتدابیر اختیار کرتا ہے۔ (ان سعیکم لشتی) لیکن ان کی راہیں اصولی طور پر دو ہی ہوتی ہیں۔ ایک خداپرستی کی ایک دنیاپرستی یا خدا گریزی کی۔ بس جو عطا وانفاق، داد ودہش اور خدا سے خوف وتقویٰ یا عملاً نیکی کی راہ اختیار کرتا ہے (صدق الحسنیٰ) اس سے خدا کا وعدہ ہے کہ ہم اس کی ذہنیت کو آسان پسند بنادیں گے۔ تاکہ وہ اپنی ان مساعی وتدابیر میں آسانی کی راہیں اختیار کرے۔ بخلاف اس کے جو بخل وامساک اور خدا سے روگردانی یا عملاً نیکی کی تکذیب (کذب بالحسنیٰ) یا اس سے گریز کی راہ اختیار کرتا ہے اس کی ذہنیت ہم دشوار پسند بنادیں گے تاکہ وہ اپنی ان مساعی وتدابیر کی راہیں اختیار کرلے۔

آسان کو آسان کردینے کا مطلب تو خیر یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ اس میں مزید آسانی پیدا کردی جائے گی۔ لیکن دشوار کو آسان کردینا بظاہر خدا ونیکی سے روگردانی کرنے والوں کی سزا کیا، اُلٹے انعام ہوا۔

تفسیروں یا ترجموں میں جی کو لگتی ہوئی بات نہیں ملتی۔ مفسر گیلانی کے نزدیک صاف سیدھا مطلب ہی تھا کہ کسی معاملہ میں سعی وتدبیر کی جو راہ فی نفسہٖ آسان ہے، خداپرستوں اور نیکوکاروں پر خدا وہی آسان کردیتا ہے۔ اس کے برعکس جو خدا ونیکی سے بغاوت وروگردانی کرتے ہیں اس کی سزا دنیا ہی میں یہ دی جاتی ہے کہ سعی وتدبیر کا فی الواقع ونفس الامر میں جو راستہ دشوار گذار ہے، ان کی کج نگاہی کو وہی آسان نظر آنے لگتا ہے اور اس پر چل کر کج روی کا خوب مزہ چکھایا جاتا ہے۔

اس زمانہ میں روزافزوں خدا فراموشی بلکہ خدا گریزی کی ترقی کا ایک بڑا رول زندگی کے ہر شعبہ میں مشکل پسندی یا طوالت وپیچیدگی والے طریقوں اور تدبیروں کی بھرمار ہے۔ سیاست ہو کہ حکومت، قانون ہو کہ عدالت،

معیشت ہو کہ معاشرت ہر چیز شیطان کی آنت اور ہفتخوان! کسی دفتر میں ذرا کوئی کام پڑ جائے ''دفتریت''[1] کا مزہ چکھ لیجئے۔ عدالتی چکر مشہور ہی ہیں۔ معمولی معمولی مقدموں میں برسوں لگ جانا کوئی بات نہیں۔[2] وقت وقوت کی کوئی قیمت نہیں رہ جاتی۔ جان و مال ضمیر و ایمان ہر چیز کو داؤ پر لگا دینا پڑتا ہے۔ جس قدر محکموں پر محکمے اور دفتروں پر دفتر بڑھتے جاتے ہیں اسی قدر معمولی معمولی آسان سے آسان کام دشوار سے دشوار ہوتے جاتے ہیں۔ گویا ہر معاملہ میں دشواریوں کو بڑھاتے جانا ہی آسان بن گیا ہے۔ پس یہ کچھ ویسی ہی آسانی ہے کہ

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

''اعطی واتقی'' والی (خداپرستی) کی زندگی کی آسانیوں اور ''بخل و استغنی'' والی (خدا چھوڑی) زندگی کی خود پیدا کردہ دشواریوں کا ایک بڑا عذاب آئے دن کے معاملات میں باہمی بے اعتمادی ہے۔ مثلاً حدیث کی رو سے قرض دینے کا ثواب صدقہ سے بھی زیادہ ہے۔ اگر کسی معاشرہ میں قرض کا لین دین بے تکلف اس طرح جاری ہو کہ خدا اور آخرت کے تعلق وخوف کی بنا پر ایک طرف اہل وسعت کو ''من بخل'' والے بخل وامساک کے بجائے اجر وثواب کے لئے ''من اعطی'' والے اعطاء وانفاق کی فکر وحرص لگی ہو اور دوسری طرف خدا ہی کے خوف ''من اتقی'' کی بنا پر لینے والوں کو خود ہی جلد از جلد عطا کرنے کی فکر رہتی ہو۔ اس طرح کہ دینے والوں کو قانونی تحفظات اور چارہ جوئیوں وغیرہ کیا تقاضوں پر تقاضوں تک پریشانیوں میں مبتلا ہونا نہ پڑے تو اہل حاجت کے وقت پر کتنے کام آسانی سے نکلتے رہ سکتے ہیں۔ خود راقم احقر کو اللہ تعالیٰ نے ہزاروں تک قرض دینے کی وسعت وتوفیق بخشی لیکن آخر میں تنگ آ کر بس اتنی ہی ہمت رہ گئی کہ اتنا ہی دیا جائے کہ وصول نہ ہونے پر بے تکلف معاف کر دیا جائے۔ باقی تقاضوں وغیرہ کی پریشانی و بے لطفی میں ڈالے بغیر ادا کرنے والی مثال صرف ایک ہی آدھ یاد ہے۔ ورنہ عام عادت ونیت، تجربہ ہوا کہ لوگوں کو ٹالتے رہنے یا نہ دینے ہی کی رہ گئی ہے۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ دینی واسلامی زندگی کی ایک کتنی بڑی آسانی (یسریٰ) کو ہم نے اپنے ہی ہاتھوں دشواری (عسریٰ) بنالیا ہے۔ حتیٰ کہ اب ہم کو یہی آسان نظر آتا ہے کہ قرض لینے دینے میں سود بھی بے تکلف لیں دیں اور قانونی تحفظات کی پیچیدگیوں اور بارہا مقدمات تک کی مصیبتوں کو بھی خریدیں۔ فسنیسرہ للعسریٰ کے سوا یہ کیا ہے۔

گیلانی تفسیر کی ایک اور مثال خود ''مکتوباتِ گیلانی'' میں پڑھیں۔ پیش نظر اسی زمانہ کی دنیا ہے۔ ارشاد ہے کہ ''دنیا اس طرح کانپ رہی ہے لرز رہی ہے کہ بڑے بڑوں کے پاؤں ڈگمگا رہے ہیں۔ پھر ہم جیسے ناکسوں گیاہ ضعیف کا جو حال بھی نہ ہو۔''

ادھر سورہ یونس کی تلاوت میں کچھ استغراق ہوا، کچھ ایسا واضح ہوا کہ ''آیات'' کے بعد ''انذار'' سے کام لیا جاتا ہے اور جب ''انذار'' کو غیر مؤثر بنا کر چھوڑ دیا جاتا ہے تب فیصلہ کا وقت آجاتا ہے۔ وما تغنی الایات والنذر عن قوم لا یومنون اس میں ''الایات'' اور ''النذر'' کا ذکر فرما کر آگے ارشاد ہے۔ فھل ینظرون الامثل ایام الذین خلو من قبلھم (الایہ)۔

کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جن حالات سے دنیا گذر رہی ہے یہ نذر کے حالات ہیں۔ ''قوم لا یومنون''

Marfat.com

پر نذر کا کوئی اثر مرتب نہ ہوا بلکہ اسی سورہ میں مکر فی الایات کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ (یعنی) ذہانت کے زور سے ہر واقعہ کی ایسی توجیہ کہ اصل کارفرما طاقت (خدا) پر پردہ پڑ جائے اور جو واقعی اسباب نہیں ہیں ان ہی کی طرف حوادث کو منسوب کرنے کی مشق شاید یہی مکر فی الایات ہے۔

"""شاید" کیا "مکر فی الایات سے بہتر "ماڈرن مکر" کی اور کوئی تعبیر ہی کیا ہو سکتی ہے۔ البتہ ہر زمانہ کے مکر کی نوعیت وصورت ایک ہی ہونا ضروری نہیں۔ تاہم اس زمانہ کی ترقیوں کا یہ مکر ایک بڑا دجالی نمونہ ہے۔ آگے ہی بالکل بجا ارشاد ہے کہ

"اس زمانہ میں جتنا زور اس مکر کا ہوا ہے شاید کبھی نہیں ہوا ہے۔ بہر حال فیصلہ شاید زیادہ دور نہیں بس اتنا اطمینان ہے کہ منتظر بنا دینے کے بعد ارشاد ہوا ینجی رسلنا والذین آمنوا کذالک حقا علینا ننج المومنین۔ اس تہلکہ عظیم سے ایمان والوں کو نکال لینے کا تماشہ عجیب ہوگا۔ کیسے ہوگا سمجھ میں نہیں آتا مگر ہوگا ضرور۔"

بشرطیکہ "حقا علینا ننج المومنین" کے سے اٹل وعدہ بشارت والے "المومنین" ہم بھی ثابت ہوں۔ ورنہ اب تو ہم بھی ان "مکر فی الآیات" کی راہوں کو ہی عین ترقی جان کر ان ہی پر دوڑنے میں ترقی کر رہے ہیں۔

اسی سلسلہ میں نظم قرآن کے متعلق فرماتے ہیں کہ "اور کیا عرض کروں، سورہ یونس کی ان آیتوں میں پہلے جتنی بے ربطی محسوس ہوتی تھی۔ اب اس قدر بلکہ اس سے زیادہ منطقی ترتیب کی یافت ہوتی جا رہی ہے۔" اس راقم کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب سے جو شد بد کچھ مناسبت عطا فرما دی ہے، بارہا اس کی بدولت بظاہر بے ربط سے بے ربط آیتوں میں ایسے ربط وتربیت کی یافت ہو جاتی ہے جس کے لئے منطقی کیا "خدائی" نظم وتربیت کے سوا کوئی نام ہی سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر میں ہم مسلمانوں کے لئے زیادہ کان لگا کر سننے کی بات یہ ہے کہ

"ہاں آخر میں جو فرمایا گیا فلولا کانت قریۃ آمنت فنفعھا ایمانھا الا قوم یونس لما امنوا کشفنا عنھم عذاب الخزی فی الحیٰوۃ الدنیا ومتعنٰھم مگر مغرور انسانی آبادیوں کو شاید اس کی توفیق پہلے بھی کم ہوئی ہے اور اب تو اس کی راہ بند ہی معلوم ہوتی ہے۔"

(مکتوبات گیلانی۔ صفحہ ۱۴۳ امبیضہ) ؎

عام "مغرور انسانی آبادیوں" کا نام کس منہ سے لیا جائے جب خود اسلام کا نام لے کر قوم محمد (ﷺ) ہی کو "قوم یونس" والے "ایمانی نفع" کی فکر کیسی۔ اس پر ایمان ہی جیسا کچھ ہے ظاہر ہے۔ پھر اس کے ساتھ رسوائی کا عذاب (عذاب الخزی) بھی جس طرح ہر طرف سے محیط ومسلط روز بروز ہوتا جا رہا ہے خصوصاً آنکھوں کے سامنے خود ہندوستان میں...... وہ ظاہر سے بڑھ کر ظاہر ہے۔ ستم ظریفی یہ کہ اس عذاب سے نجات کی راہ کا سوال ہوتا ہے کہ مسلمان کیا کریں؟ تو اس کے جواب میں "کشفنا عنھم عذاب الخزی" والے ایمان واسلام کی طرف متوجہ کرنے کرانے کے بجائے مسلمان لال بجھکوا لیڈر بھی "مکر فی الآیات" والوں ہی کی راہیں زیادہ دکھلاتے ہیں۔

غضب پر غضب کہ علماء تک کی جماعت ان ہی ائمہ کی مقتدی بن رہی ہے۔

میں مولانا سے ہمیشہ اور ہمیشہ سے زیادہ وظیفہ پر سبکدوشی کی فرصت و فراغت کے دنوں میں بارہا درخواست کرتا رہا کہ اب ہر طرف سے یکسو ہوکر اپنی ان خاص قرآنی ''یافتوں'' ہی کو جمع و مرتب فرمادیں مگر کتراتے ہی رہے۔ بڑی وجہ بظاہر وہی ''بیچارے مولویوں'' کی ناراضی کا ڈر کہ تفسیری دفتروں کے خلاف بعض باتوں پر خدا جانے کتنا شور و شغب اٹھ کھڑا ہو۔ ایک مکتوب ہی میں کہتے ہیں ''مگر جب ان آیتوں کی تفسیر کسی کتاب میں پڑھتا ہوں تو ساری شیرینی جو قلب میں پیدا ہوئی تھی معلوم ہوتا ہے کہ واپس ہوگئی۔'' (صفحہ ۱۳۵ امبیضہ۔۱۴ ستمبر ۵۰ء)

بات یہ ہے کہ قرآن مجید کوئی علمی و فنی قسم کی کتاب بالکل نہیں۔ اصلاً زندگی کا عملی ہدایت نامہ (بک آف گائیڈنس) ہے۔ اس لئے جس قدر زیادہ اپنے پرائے انفرادی و اجتماعی آئے دن پیش آتے رہنے والے زندگی کے معاملات و مشکلات پر پیش کرنے اور ان کی روشنی میں اس کو پڑھنے پڑھانے سمجھنے سمجھانے اور اس سے راہ یابی کی کوشش کی جائے، اسی قدر یہ کتاب قدرۃً سرچ لائٹ کی طرح دور دور تک راستہ دکھلاتی چلی جائے گی بلکہ میں تو کہا کرتا ہوں کہ شروع شروع میں تفسیر ہرگز نہ دیکھی جائے۔ ''ترجمان حقیقت'' کی زبان سے بڑی حقیقت ادا کردی گئی ہے کہ

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

اپنی عادت تو بتوفیق اللہ یہ ہوگئی ہے کہ عام علمی و عملی مسائل و مشکلات ہی میں نہیں، نجی سے معاملات میں بھی جب کوئی لاینحل الجھن گھیر لیتی ہے تو جس تلاوت میں اس کا حل ڈھونڈنے لگتا ہوں اور عموماً ایک آدھ دورہ ہی میں ایسی آیات مل جاتی ہیں کہ گویا خاص اس مسئلہ و معاملہ ہی میں اور اسی موقع پر ان کا نزول ہوا ہے۔ پھر ملتے جلتے معنی و مفہوم کی دوسری آیات کو ملا کر تفکر و تدبر سے شرح تام ہو جاتا ہے۔ آگے کا کام صرف ہمت و عمل کا رہ جاتا ہے البتہ کسی لفظ و لغت میں کوئی دشواری ہوتی ہے تو لغت کی کتابوں کی طرف رجوع کرنے سے اکثر مزید فوائد کے ساتھ مزید اطمینان ہوتا ہے۔ باقی تفسیروں کا درجہ اگر کچھ ضرورت رہ گئی...... جو کم ہی رہ جاتی ہے......سب سے آخر میں آتا ہے اور تب ہی تفسیروں میں کبھی کبھی کوئی پتہ کی بات ہاتھ آجاتی ہے۔

اس بے علم کی نظر میں مولانا کے فکری و علمی کمالات کا وقت کے لئے سب سے کارآمد و یادگار کارنامہ...... خصوصاً جدید ذہنوں یا نئی تعلیم والوں کے حق میں......ان کی قرآنی ''یافتوں'' کا ذخیرہ ہی ہوتا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ سورہ کہف کے سوا قصداً انہوں نے اہتمام فرمایا کہ اس سلسلہ کی کوئی اور مستقل چیز منظر عام پر نہ آنے پائے۔ پارہ عم کا مسلسل مکرر سالہا سال تک حیدر آباد میں اپنے مختلف قیام گاہوں کی قریبی مسجدوں میں درس دیتے رہے۔ اس میں شریک ہونے والے زیادہ تر نئی روشنی و تعلیم والے ہی ہوتے۔ اس کی یادداشتوں کی بیاض یاد آتا ہے کہ میں نے خود ان کے پاس دیکھی بلکہ شاید ایک آدھ مرتبہ کچھ مستفید ہونے کی بھی کوشش۔ غالباً کچھ نامحرم ہی پاکر مجھ کو بھی زیادہ موقع ملنے نہ دیا۔ زبانی البتہ کبھی کبھی مستفید فرماتے رہے۔ وفات کے بعد بعضوں کو کچھ لکھا لکھایا بھی کہ کم از کم پارہ عم کی یادداشتیں بھی دستیاب ہوجائیں مگر کسی سے کچھ پتہ نہیں ملا۔ ان سطروں کے کسی پڑھنے والے کو کوئی سراغ مل جائے تو ان شاء اللہ

حضرت مرحوم کی بڑی گراں مایہ یادگار کی حفاظت ہو جائے گی۔

یوں مولانا کے علمی و ذہنی کمالات پر ایک بالکل اچٹتی یا غلط انداز منظر کا عالم بھی یہ تھا کہ دس بیس منٹ میں جو پاس بیٹھ جائے ان کے تفوق سے مسحور ہوئے بغیر نہ اٹھتا۔ ہر طرح کے علمی و دینی معلومات کی بہتات، ان سے عجیب عجیب نتائج واستنباطات، پھر حسن تعبیر کی ندرت و برجستگی۔ ہر چیز بجائے خود ''دامن دل'' کے لئے ''کرشمہ دل کش'' ہوتی۔ نجی و مجلسی گفتگو یا خطاب خاص سے اوپر عام خطاب یا خطابت سنیئے تو یہ کمالات اور زیادہ مبہوت کر دیتے۔ تقریر سے آگے تحریر و تصنیف کو دیکھئے تو گیلانی اشہب قلم اس میدان میں بھی بڑے سے بڑے ہم چشموں سے پیچھے نہیں، نہ کما نہ کیفاً۔ ایک متبحر عالم دین کی میزان پر کھیے تو معقول و منقول، تفسیر و حدیث، فقہ و کلام، سیرت و سوانح، تعلیم و تصوف وغیرہ وغیرہ جس شعبہ میں جو کارنامہ چھوڑا ہے۔ کیا اس کو صف اول کی ممتاز جگہ سے بھی کم کسی جگہ پر رکھا جاسکتا ہے۔ خالص عصری مطالبات یا نئے چلن کی چیزوں میں اسلامی پہلو سے جو بیسیوں مضامین و مقالات اور کتابیں ان کے قلم کی مرہون ہیں۔ ان میں مثلاً ایک ''اسلامی معاشیات'' کیا اپنے موضوع کے خاص نقطہ نظر سے کسی ہم پلہ کتاب کے مقابلہ میں کم وزن ہے۔ یوں بھی بالعموم ان کے نوشتوں میں جدید مواد و معلومات پر جتنی اطلاع ملتی ہے خود جدید تعلیم کے دعویداروں میں بھی کتنے مقابلہ کر سکتے ہیں۔[۵] پھر تحقیق و تنقید کے جدید معیار پر بھی ان کی کتنی چیزیں ایسی ملیں گی جن کے اخذ واستفادہ کے بل پر یورپ وامریکہ کی یونیورسٹیوں سے ڈاکٹریٹ نہ حاصل کر لی جاسکتی ہو۔ خود اپنے شاگردوں سے آخر خود ہی ریسرچ کا کام لے اور کرا کے کتنوں کو ڈاکٹر بنا ہی دیا۔

ایسا نہیں کہ مولانا کو اپنے ان بے شمار وہبی و کسبی کمالات کا کوئی احساس و شعور نہ تھا۔ اتنے ذہین و ذکی، اتنے بے حس و بے شعور کیسے ہوتے، ذہنی و علمی اپنی برتری کا بھی شعور تھا۔ اپنی کتابوں، مضمونوں وغیرہ پر اعتراض و نکتہ چینی کو بھی محسوس فرماتے، گراں خاطر بھی ہوتے، جواب بھی دیتے لیکن تمام کمالوں سے بڑھا ہوا کمال ان کا یہی تھا کہ وقتی و طبعی تاثر کے سوا قلب کی سلامتی میں کوئی مستقل فرق نہ آنے پاتا۔ یعنی کسی کی طرف سے کسی ظلم و زیادتی کے باوجود دل میں کوئی گرہ دو چار دن کے لئے بھی نہ پڑتی نہ وہ ''غل'' کیفیت پیدا ہوتی جس سے بچتے رہنے کی قرآن نے خاص طور پر دعا کی تعلیم فرمائی...... ربنا لا تجعل فی قلوبنا غل الذین امنوا ...... نہ ملنے جلنے، خط و کتابت وغیرہ کسی چیز میں اپنی دینی و دنیوی علمی و ذہنی برتری یا دوسروں کو ان کی کمتری محسوس کراتے، بلکہ خوردوں شاگردوں تک کو اتنا بڑھاتے کہ بزرگوں بڑوں کے لئے زبان ولغت جواب دے جاتے۔ حضرت حالی کی طرح حضرت گیلانی نے بھی کہنا چاہیے ''اپنی خاکساری'' کا مستقل کام ہی یہ بنا رکھا تھا کہ ہر حال و قال سے ''ہر ادنیٰ کو اعلیٰ'' بناتے رہیں۔[۶]

خاکساری اپنی کام آئی بہت ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا

سالہا سال روز مرہ ہر طرح کے نجی سے نجی اور قریبی سے قریبی تعلقات و معاملات کا سابقہ رہا۔ ایک بات بھی یاد نہیں جس میں بات کی پچ یا نفس و نفسیات کی ضد اور ہٹ کا کوئی نام و نشان ملا ہو بلکہ دوسروں کی سخن پروری و

خودرائی کے سامنے خود ہی سپر ڈال دیتے۔ مزاحمت و مقابلہ طبیعت میں تھا ہی نہیں، فنا ہی فنا کا غلبہ رہتا، اس فنائیت کی قدر پوری طرح جب ہوتی ہے کہ علم وقلم دین و دنیا کی کوئی بڑائی رکھنے والے خصوصاً ان کے ہم عصروں کے رنگ وروش کا اس پہلو سے مقابلہ پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے مولانا کو اپنے ہم چشموں میں فرد فرید ہی پایا۔ یاد رہے کہ دنیوی جاہ و مال میں بھی ان کا سر اللہ تعالیٰ نے اونچے اونچے ہم سروں سے نیچا نہیں رکھا تھا لیکن نمونہ وہ دنیا کی پوری زندگی میں۔ اللھم احینا مسکینا والی مسکنت ہی کا بنے رہے۔ طالب علمی سے عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ دینیات کی صدارت تک اس مسکنت میں ذرہ برابر فرق کسی دیکھنے والے نے نہ دیکھا ہوگا۔ بنگلہ میں رہ اور موٹر میں چل کر بھی وہ دیوبند کے حجرہ میں رہنے والے اور اس کی گلیوں میں چلنے والے ''مسکین'' طالب علم ہی معلوم ہوتے رہے۔

یہ سارے مظاہر و شیون اس کے تھے کہ کفر کے بعد قلب کے سب سے بڑے شیطانی مرض کبر کا حضرت مرحوم کے قلب میں کوئی شائبہ جگہ نہ پا سکا تھا۔ کبر و ماحا کا یہ ایمان لیوا مرض ہوتا ہی ایسا ہے کہ ایمان بچ بھی جائے بلکہ انسان صدیقیت کے درجے کو بھی پہنچ جائے تب بھی مشہور ہے کہ صدیق کے قلب سے بھی یہ مرض سب سے آخر ہی میں نکلتا ہے۔ ۳۳۔۳۴ سال اس دنیا میں ان سے دور و نزدیک کے تعلقات کی سعادت حاصل رہی۔ ان میں بھی قریباً چوتھائی صدی کی طویل و مسلسل قیام وطعام، خلوت وجلوت، سفر وحضر، صحت ومرض وغیرہ کے ہر حال میں شب وروز کی یکجائی و رفاقت کی بدولت جس طرح جتنا موقع ان کے علمی وعملی، دینی و دنیوی، ظاہری و باطنی احوال کو قریب سے دیکھنے کا نصیب رہا یقیناً اس خوش نصیبی میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ آج ان سطروں کو سپردِ قلم کرتے اور از سرِ نو اس طویل و مدید معیت و رفاقت کا پوری احتیاط کے ساتھ جائزہ لیتے ہوئے ذمہ داری کے پورے احساس کے ساتھ شہادت ادا کر رہا ہوں کہ مولانا مرحوم میں جو بھی کمزوریاں رہی ہوں ......اور معصوم کون بشر ہوتا ہے ......لیکن جہاں تک دل کا تعلق ہے کہنا چاہیے کہ اس کی تمام بیماریوں سے ان کو پاک ہی پاک پایا۔ بغض وحسد، انتقام وعداوت، ریا ونفاق، نمود ونمائش، حرص وہوس، طول امل وغیرہ کے نفسانی جذبات کا کوئی داغ دھبہ یاد پر زور ڈالنے سے بھی، ان کے آئینہ دل پر پڑتا خصوصاً ٹھہرتا قطعاً یاد نہیں پڑتا۔ ہمارے علم وقلم کے نیچے اونچے نام والے صلحا بھی ذرا ٹھنڈے دل سے خود اپنے دلوں کا محاسبہ فرما دیکھیں۔ تب ہی دل کی ان بیماریوں کی ہمہ گیری اور گیلانی جیسے صاحب علم وقلم کی ان سے اتنی استثنائی وکرامتی دوری کی قدر و قیمت معلوم ہوگی۔

سارے اخلاقی رذائل یا باطنی وقلبی امراض سچ پوچھئے تو کبر ونخوت، خود بینی وخود پرستی ہی کی شیطانی ذریت یا انڈے بچے ہوتے ہیں مگر مولانا کی ہر شان پر غالب خود فراموشی یا فنائیت تھی۔ کچھ تو پیدا ہی مست وفانی ہوئے تھے، کچھ ذہانت وذکاوت کی افراط کا لازمہ بھی عموماً کچھ نہ کچھ مستی وربودگی ہی دیکھی جاتی ہے۔ پھر وجودی توحید جو مولانا کا خاص مذاق تھا یہ نام ہی صحیح معنی میں ''خودی'' سے گذر جانے یا اس کے فنا ہو جانے کا ہے۔ سونے میں سہاگہ حیدر آباد میں ان کو ایک مرشد بھی اس رنگ میں شرابور ملے حال وقال سب کے مست ہی مست، بیداری کا ہر لحہ سرور ومستی کا دیکھا۔ جس کی آنکھوں میں خدا کی عظمت وکبریائی، کیا اس کی ہستی اتنی سما گئی ہو کہ اپنی پرائی کوئی دوسری ہستی، ہستی ہی نہ دکھائی دیتی ہو۔ اس کو من وتو یا اپنی کبریائی اور بڑائی دوسروں پر جتانے جمانے کا ہوش کیا رہ سکتا ہے۔ خود فراموشی کا عالم

Marfat.com

مولانا کی ظاہری زندگی پر بھی اتنا چھایا رہتا کہ کھانا پینا، سونا جاگنا ہر چیز کسی نظم و انتظام سے قطعاً آزاد رہتی۔ خود تو کیا تہہ فرماتے نوکر بھی آزاد رہتا، اگر وہ بھی تہہ نہ کرتا تو دن رات بستر تک الجھا ہی پڑا رہتا۔ بس ہر شے کا وہی حال جوان کی تصانیف کا کہ تصنیفی موضوع تک کے قید و بند سے آزاد! لکھنے کا بھی یہی حال کہ نہ لکھتے تو مہینوں سالوں کچھ نہ لکھتے اور لکھنے پر آجاتے تو دن رات ایک کر دیتے۔ رات رات بھر پلک نہ جھپکاتے۔ پہلو میں تکیہ دبائے نیم دراز پلنگ ہی پر لیٹے لیٹے اور اکثر پنسل ہی سے ہفتوں کیا دنوں میں سیکڑوں صفحات کی کتاب پوری کر ڈالتے۔

اس خود فراموشی میں خود فروشی و خود پرستی کی سمائی تو کہاں سے ہوتی، معمولی خودداری تک سے بے نیازی کا ہمارے مولانا کا ایک بالکل خاص بہت ہی عجیب نادیدہ و ناشنیدہ استثنائی حال پایا۔ کسی بڑے چھوٹے بلکہ ادنیٰ سے ادنیٰ نوکر چاکر تک کی ادنیٰ سے ادنیٰ ناخوشی کا تحمل مطلق نہ فرما سکتے۔ راقم گستاخ نے تو حیدرآبادی رنگ کا ایک مستقل خطاب ہی ''خوش کرن'' دے رکھا تھا۔ اپنی معذوری و معذرت کا ایک دلچسپ عنوان پا کر خود بھی اس سے فائدے اٹھاتے، بعض مکتوبات میں بھی ناظرین کو ''بہ خوش کرنی'' کے دامن میں پناہ لیتے ملیں گے۔ ایک مرتبہ کسی معاملہ میں خود راقم نالائق کو شاید کچھ زیادہ ناخوش محسوس فرما کر تو غضب ہی فرما دیا کہ دھڑ سے پیروں پر گر پڑے۔ گھبرا کر ان کے سر کو اٹھا کر سینہ سے لگا لیا اور دونوں لپٹ کر خوب روئے۔ خیر میرا شمار تو پھر بھی بظاہر برابر والوں میں تھا۔ بارہا ہر کس و ناکس کے ساتھ اپنے دینی و دنیوی اور علمی مرتبہ و مقام سے کیا معمولی انسانی خودداری تک سے اتنا اتر آتے کہ ان کی اس خاص افتادِ طبع سے ناواقفوں کو خوشامد کا شبہ ہونے لگتا۔ کبھی کبھی مجھ سے دیکھا نہ جاتا اور ناگواری سے کہتا کہ آخر ساری خدائی کو خوش رکھنا آپ نے کیوں اور کیسے اپنے اوپر فرض ٹھہرا رکھا ہے اور اس میں کیسے کامیاب ہو سکتے ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ کراماتی حد تک کامیاب ہی کامیاب تھے اور سب سے بڑی کرامت اس سلسلہ کی بالکل متضاد فطرت والے دن رات کے ساتھ راقم احقر کے ساتھ سالہا سال تک نہایت کامیاب ہی نہیں بڑا خوشگوار و دلنواز نباہ رہا۔ شاید دو چار بار سے زائد کسی ایسی کشیدگی و شکر رنجی کی نوبت نہ آئی ہو جس کا اثر دو چار دن کیا دو چار گھنٹے بھی رہا ہو۔ یا ایک آدھ خط سے آگے بڑھا ہو۔ باقی مولانا کا دائرہ تعلقات صرف یونیورسٹی تک محدود تھا۔ پورے حیدرآباد کے عوام و خواص، علماء و مشائخ، امراء و وزراء، افسروں، ماتحتوں، بڑے چھوٹے تاجروں، دکانداروں، ہر طبقہ تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے باوجود شاید ایک مثال بھی کوئی بتا سکے کہ کسی طبقہ کا کوئی ایک فرد بھی مولانا سے ناراض رہا ہو۔ ناراض کیا سب ہی بڑی عزت و محبت کرتے تھے۔

لیکن قیمت بھی اس کی جان و مال، وقت و صحت سب کی صورت میں بے حساب ادا فرمانی پڑتی۔ ایک مستقل ڈیپارٹمنٹ سفارشوں کا تھا۔ ایک طرف مولانا کی یہ محبوبیت و مقبولیت کہ ان کی سفارش کو بہ مجبوری ہی کوئی رد کرتا۔ دوسری طرف خود کسی سے انکار فرما کر اس کی ناخوشی کیسے پسند فرماتے۔ چھوٹا بڑا جو آتا جس چھوٹے بڑے کے ہاں چاہتا پکڑ لے جاتا۔ مملکت آصفیہ کے صدر الصدور نواب صدر یار جنگ بہادر (مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانیؒ) خصوصیت سے مولانا کے بڑے قدر شناس تھے۔ بڑی بزرگانہ و مربیانہ شفقت فرماتے۔ غایت محبت و بے تکلفی سے اکثر صرف ''مولوی'' ہے یاد فرماتے۔ بڑے عہدیداروں میں مولانا کا آنا جانا سب سے زیادہ ان ہی کے ہاں رہتا۔ کبھی کبھی

صورت دیکھتے ہی فرمادیتے کس کی خدمت (سفارش) کا حکم لائے ہیں۔

ایک اور بڑا ڈیپارٹمنٹ مولانا کی حیدرآبادی زندگی کا عرصہ تک خصوصاً میلادی وعظوں اور تقریروں کا رہا اور شاید اسی نے دمہ کے اس پرانے مریض کے مرض میں بھی مولانا کو شریک کر کے لفظاً ومعناً ''ہم دم'' بنادیا تھا۔ ورنہ شدت مرض میں تو ان تقریری بھرماروں کا بھرپور حصہ تھا ہی، یوں سلسلہ کم وبیش سال بھر چلتا رہا۔ لیکن میلادی موسم کے دو تین مہینوں میں اتفاقاً ہی کسی دن دم لینے کا موقع ملتا ہوگا۔ عموماً یہ جلسے رات کو ہوتے اور رات بھر تک بھی چلتے رہتے۔ جلسہ بازوں کو اپنی مجلس آرائی سے مطلب، عارض کی کچھ تکلیف ہوتے بھی نہ وہ مولانا پر رحم فرماتے نہ ان کی خوشی کے مقابلہ میں خود مولانا اپنے اوپر لے جانے والے کبھی کبھی واپسی میں سواری سے بھی بے فکر ہو جاتے۔ ایک مرتبہ پاپوش مبارک تک کا پتہ نہ رہا اور مولانا کچھ دور ننگے پاؤں چل کر کرایہ کی سواری پر آدھی رات کے بعد گھر پہنچے، نتیجہ بارہا ہوتا کہ واپسی پر پورا دورہ پڑ جاتا جو کئی کئی دن کی خبر لیتا۔ پھر بھی ایک دورہ سے پوری طرح سنبھل نہ پاتے کہ کسی نہ کسی نئے جلسے کا دورہ پڑ جاتا۔ کالج کے فرائض منصبی کے روزانہ کئی کئی لیکچروں کے ساتھ وعظوں اور تقریروں کے اس تسلسل سے مولانا کی صحت پر آخر ایسی بن آئی کہ شب وروز کے اس نیازمند کے لئے دیکھتے رہنا برداشت سے باہر ہوگیا۔

حیدرآباد میں میلادی جلسوں کا یہ زور اس کے شروانی صدر الصدور کے ذوق وزور سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔ ہر نمایاں جلسہ میں خود شریک ہوتے۔ اکثر صدر بھی ہوتے اور مولانا کے بغیر اپنے کو بے شبہ بالا پاتے۔ مولانا جب ماوشما کی ناراضی گوارا نہ فرماتے تو ممدوح تو ان کے بڑے شفیق محسن ومربی تھے۔ ان کی خاطر شکنی پر کیسے راضی ہوتے۔ اس لئے میں نے خود ممدوح کو مولانا کی گرتی ہوئی صحت کی طرف توجہ دلائی۔ بالآخران ہی کے مشورہ بلکہ حکم سے کچھ ایسی صورت طے پائی کہ مولانا اس باب میں اقرار صالح کے ساتھ اپنے کو دن ورات کے اسی ''ہمزاد'' کی ''اتالیقی'' میں دے دیں۔ یعنی بلا اس کی وساطت واجازت کے وعظ وتقریر کی کوئی دعوت قبول نہ فرمائیں گے۔ جب وہ دوسروں کی خاطر بیماری تک خرید لیتے تھے تو پھر صحت کے لئے اس ''ہمدم'' اور اس سے بڑھ کر شروانی صاحب جیسے اپنے محسن عظیم کی دل شکنی وحکم عدولی کیسے خرید فرماتے۔ غالباً اس معاہدہ کا کوئی اعلان بھی باہر برآمدہ میں آویزاں کردیا گیا تھا کہ وعظ وتقریر کی کسی درخواست کو مولانا اب براہ راست خود قبول نہ فرمائیں گے۔

اس طرح الحمدللہ مولانا کو غالباً ۵، ۶ مہینے آرام کا مسلسل موقع مل گیا۔ مرض میں نمایاں خفت سے خود ان کو قدر عافیت معلوم ہوئی اور اب مہینہ میں ایک دو بار کسی خاص جلسہ یا خاص تعلق کی صورت میں ہی نوبت آتی۔ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ جلسوں کا زور بھی کہاں تک رہتا۔ ان میں بھی کمی آتی گئی۔ کچھ اتحاد المسلمین کے سیاسی ونیم سیاسی جلسوں اور سرگرمیوں نے ان کی جگہ گھیر لی تھی۔ نیز حسن بیان وخطابت میں نواب بہادر یار جنگ مولانا کی جانشینی کا حق پورا ادا کرنے لگے تھے بلکہ اپنے کو مولانا ہی کا شاگرد جانتے اور کہتے تھے۔

مالی جرمانہ اپنی ''خوش کرنی'' کی مد میں البتہ مولانا کو زیادہ نہ ادا فرمانا پڑتا۔ بڑی وجہ یہ کہ بڑے تنخواہ دار ہونے پر بھی عملاً مالدار کبھی نہ ہونے پاتے۔ خدا بھلا کرے ان کے چھوٹے بھائی اور بڑے منظم وکارگذار میاں سید مکارم احسن سلمہ، کا کہ وہ گیلانی شریف میں کاشتکاری باغبانی وغیرہ کے سلسلہ میں منصوبے پر منصوبے برابر پیش ہی

Marfat.com

کرتے رہتے اور مولانا کے معمولی مصارف سے جو کچھ بچتا اور اچھا خاصا بچتا، جمع نہ رہنے دیتے بلکہ بارہا قرض تک کی نوبت آ جاتی۔ ان منصوبوں میں کچھ اس طرح کے بھی ہوتے کہ وہ ہماری فلاں زمین کے پاس فلاں زمین بک رہی ہے یا مل سکتی ہے بڑے موقع کی ہے۔ مولانا نے ان کا غالباً ایسا ہی کوئی خط دکھایا۔ مشورہ سنا کر فرمایا کہ ''اس طرح تو پورا کرہ ارض ہی ہماری زمین کے پاس آتے آتے گیلانی میں سما جائے گا۔'' پھر بھی ساری دنیا کو خوش رکھنے والے مولانا خود اپنے بھائی کو کیسے ناخوش فرماتے تاہم اگر کبھی اتفاق سے کچھ بچ جاتا تو تھوڑا بہت اپنے پر اسے قرض ورض کے نام سے وصول کر لیتے۔ پھر دینے کا نام لینے والا شاذ و نادر ہی کوئی اللہ کا بندہ ہوتا ہوگا۔ خصوصاً جب مولانا کی طرف سے کوئی تقاضا تو کیا یاد دہانی کا معمولی اشارہ تک دشوار تھا۔ ایک مرتبہ کوئی بڑی رقم غالباً ہزار پانچ سو کی اپنی ضمانت پر کسی کو دلوا دی جو فرماتے تھے کہ بالآخر خود ہی ادا فرمانا پڑی۔

مولانا کی زندگی کا ایک اور گوشہ خوش طبعی و مزاح پسندی کا تھا، جو کبھی کبھی مزاح کے حدود سے بہت آگے بڑھ جاتی۔ بلکہ اگر کوئی اس ڈھب کا بزاخفش ہاتھ لگ جاتا تو اس کو کھلا پلا کر مستقلاً تفریح طبع کا تختہ مشق بنائے رکھتے۔ حیدرآباد کے آخر زمانہ میں ''بزاخفش'' کا یہ منصب سالہا سال تک خود اپنی مسجد الحی کے امام کو عطا رہا۔ یوں بھی کوئی موقع پا جاتے چوکتے ہرگز نہ۔ ہم دونوں کے ایک اچھے دوست نے کسی تعلیم یافتہ مطلقہ خاتون سے شادی کر لی جو ساتھ کچھ اولاد بھی لائیں۔ وظیفہ یاب ہو کر مولانا وطن میں تھے تاہم یہ خبر پا کر ضبط نہ فرما سکے۔ کچھ اشعار دوسرے کے نام سے موزوں فرما کر تفریحی مبارک باد پہنچا کر رہے اور ایک نقل بطور نقل مجھ کو بھی بھیج دی۔ دو شعر یہاں بھی ملاحظہ ہوں۔

فقط کھیتی نہیں ہے فصل بھی ساتھ
تمہیں اس فصل کی لیوی مبارک
''دہن بستہ'' کا قصہ تھا نہ آساں
''کھلے منہ'' کی ہو یہ ''شی شی'' مبارک

''دہن بستہ'' کے بعد ''شی شی'' کی دہری تلمیح غضب کی ہے۔

خیال کرنے کی بات یہ ہے کہ اس سے بھی بڑھ بڑھ کر مولانا کھل کھیلتے۔ دوسروں کی ایسی تفریح اور دل لگی پر لوگ لڑ پڑتے مگر مولانا کی اس حد سے گذری خوش طبعی کا بھی بُرا نہ مانتے۔ اسی طرح کبھی کبھی کسی پر غصہ زور وشور سے آتا جو ہوتا کچھ مصنوعی سا، اور جس پر آتا وہ اس سے ایک محبوبانہ ادا کا سا لطف ہی اٹھاتا۔

ان کو آتا ہے پیار پر غصہ
ہم کو غصہ پہ پیار آتا ہے

شاعری نہیں واقعہ ہے کہ مولانا کے غصہ پر بھی لوگوں کو ہنستے یا پیار آتے ہی دیکھا۔ وجہ ایک ہی سمجھ میں آئی کہ نفس و نیت کی کوئی خرابی دور دور تک کسی کو نظر نہ آتی۔

زندگی کے ایسے گوشوں کو منظر عام پر لانے میں طبیعت جھجک سی رہی تھی مگر خدا بھلا کرے خود مولانا ہی کے قلم نے اس کی بڑی سند عطا فرما دی۔ وفات کے بعد ''مقالات احسانی'' کے نام سے ان کا جو مجموعہ[8] شائع ہوا ہے اس

میں بڑے جلیل القدر تابعی اور تاریخ اسلام کے مسلم اولیائے کاملین میں محمد بن سیرینؒ کے بعض شان بے تکلفی کے حالات میں فرماتے ہیں کہ

> ''مزاح وطبیعت میں کہاں تک بڑھ جاتے تھے۔ جویریہ نامی ایک صاحب اپنا قصہ اس سلسلہ میں خود یہ سناتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ ابن سیرین سے ذکر کیا کہ جو چھوکری (جاریہ) میں نے خریدی ہے اس کے ہونٹ بہت بڑے اور موٹے ہیں۔
>
> کہتے ہیں کہ سننے کے ساتھ ان کی زبان سے نکلا کہ بوسہ لینے میں زیادہ سہولت ہوگی۔
>
> ان (ابن سیرین) کے دیکھنے والوں اور ان کی مجلس میں شریک ہونے والوں نے اس سلسلہ میں ایک بڑی داستان چھوڑی ہے۔ بے تکلفی کی حد یہ تھی کہ ایسے اشعار جن میں شراب، محبوب، ساقی وغیرہ ساری چیزوں کا ذکر ہوتا لوگوں کو سناتے ہوئے مصلے پر پہنچ جاتے اور عربی کا ایک شعر جس کا ترجمہ ہے کہ مجھے اطلاع ملی ہے جس لڑکی کے ساتھ میری منگنی ہوئی ہے اس کی ایڑیاں اتنی لمبی ہیں جیسے رمضان کے دن۔ ادھر شعر ختم ہوا۔ راوی کا بیان ہے کہ ثم قال الله اکبر۔ یعنی اس کے بعد اللہ اکبر کہتے ہوئے نماز کی نیت باندھ لیتے۔''

ہو بہو ہمارے مولانا بھی اسی طرح عین ہنسی و دل لگی کی باتیں کرتے کرتے نماز کی نیت باندھ لیا کرتے۔ بالکل اپنا ہی نقشہ کھینچ دیا ہے۔ کتابوں پر نظر ان کی ایسی وسیع تھی کہ خاص اپنے مزاج و مذاق کی باتیں بھی ان کو مل ہی جاتیں اور ''گفتہ آید در حدیث دیگراں'' کے پردہ میں خود اپنی بھی خوب خوب ترجمانی فرما جاتے۔ حضرات صحابہؓ میں حضرت مرحوم کی اپنی جذباتی کیفیت ہی نے غالباً ان کے قلم کو پہلے پہل حضرت ''ابوذر غفاریؓ'' کی شان جذب کی طرف کھینچا اور اس زندگی کی ایسی دلکش مؤثر تصویر کھینچی ہے کہ اس کی کشش سے کوئی پڑھنے والا غیر متاثر نہیں رہ سکتا۔

غالباً خود ہی ذکر فرماتے تھے کہ حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ نے بھی حضرت ابوذر غفاریؓ کی اس ترجمانی پر بہت داد دی تھی اور خصوصیت کے ساتھ فرمایا تھا کہ ایسے جلیل القدر صحابہ میں اہل جذب حضرات اہل اللہ کی ایک بڑی سند مل گئی۔

جو حضرات حضرت گیلانی کو صرف ان کے قلمی کارناموں سے پہچانتے ہیں یا ان کی نجی زندگی کے رنگ و بو سے زیادہ آشنا ہونے کا موقع نہیں پایا، وہ اس کا عکس ان ہی کے قلم کے تیار کئے ہوئے ''ابوذری و ابن سیرینی'' دونوں آئینوں کو سامنے رکھ کر دیکھ سکتے ہیں۔

مجھ کو تو خاص طور پر زیادہ تر دکھانا یہ ہے کہ باوجود ہنسی مذاق، دل لگی و خوش طبعی کی بظاہر ثقاہت و سنجیدگی سے گذری ہوئی ان باتوں کے۔ تھیں ایسی باتیں بس ظاہر ہی ظاہر تک بلکہ نفسیاتی نظر سے دیکھا جائے تو تکلف و تصنع سے پاک یہ شان ان کے باطن یا قلب کے ہر فساد اور نفس کی ہر نفسانیت سے پاک ہی پاک ہونے کی بجائے خود ایک

Marfat.com

مستقل شہادت تھی ورنہ یہ سراپا نفس نفسانیت راقم خود اپنے ۳۳،۳۴ سال کے ہر طرح کے تعلقات و معاملات پر مبنی ان کے تجربات کو سامنے رکھ کر مکرر پوری ذمہ داری و ایمانداری سے شہادت دیتا ہے کہ ایک مرتبہ بھی کبھی ان کی کسی بات سے دل کی کسی کھوٹ یا اندر کے کسی دنی و خسیس جذبہ کا اثر پڑا نہ خود اپنے اوپر قطعاً یاد ہے نہ کسی دوسرے پر۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ بس کچھ وقتی طبعی اثر ہو گیا۔

اوپر کی سطریں ختم ہوتے ہی اتفاقاً ۲۶ نومبر ۱۹۵۰ء کے ایک مکتوب پر نظر پڑ کر ایک اور گوشہ مولانا کی زندگی کا سامنے آ گیا۔ ''یک گونہ بے خودی'' یا جذب و مستی کا رنگ تو ان میں اتنا نمایاں تھا کہ تھوڑا واقف کار بھی اس سے ناواقف نہ رہتا لیکن بہتوں کو مغالطہ ''جذباتیت'' کا رہتا۔ انسان کی نفسیات ہے بڑی پیچیدہ۔ ایک عام و عالمگیر جذبہ محبت و نفرت کا لازمہ بشریت ہے۔ ہر کسی کو کسی نہ کسی شخص یا شے سے نفرت بھی ہوتی ہے اور کسی سے محبت بھی۔ مولانا کو کسی شے سے رہی ہو تو رہی ہو لیکن کسی شخص کی طرف سے ان کے سینہ میں کبھی کسی نفرت کا سراغ نہ ملا۔ اسی طرح کسی کی محبت سے بھی ان کا دل خالی ہی پایا۔ ایک ہی گھر میں سال سال بھر ایسی رفاقت بھی حاصل رہی کہ ان کے گھر والے بھی ساتھ تھے مگر کسی بچے کو گود میں اٹھانا کیا معنی، محبت سے پاس بٹھاتے یا پیار کرتے تک نہیں دیکھا۔ ایسے بے تعلق رہتے کہ گویا یہ ان کا بچہ ہی نہیں۔ اور تو اور اہلیہ محترمہ ماں ہو کر اس کمال میں باپ سے بھی آگے تھیں۔ خود بھی ان کے جو اوصاف بیان فرماتے راوی وہ خود نہ ہوتے تو یقین کرنا مشکل ہوتا کہ کسی عورت کا دل بھی اس درجہ جذبات سے خالی ہو سکتا ہے۔ اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے دونوں کا جوڑ خوب ہی ملایا تھا۔ جب بال بچوں ہی سے مولانا کو کوئی جذباتی وابستگی نہ تھی تو مخلوق میں اور کس سے ہوتی۔ کھل کر کبھی پوچھنے کا موقع و خیال نہ آیا لیکن اغلب یہی ہے کہ ''درجوانی چنانچہ افتد دانی'' والے جذبات جوانی کی ''افتاد'' سے بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو بالکل بچائے ہی رکھا ہوگا۔

خاکسار نے اپنے ایک عریضہ میں کچھ ایسی شکایت کی تھی کہ حیدر آباد سے جدائی و دوری کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ دل سے بھی اس نالائق کو بالکل دور ہی فرما دیا گیا ہے۔ جواب میں فرماتے ہیں۔

> ''اس میں شک نہیں کہ سب سے زیادہ ان فقیری نفسیات کا صحیح علم آپ کو بخشا گیا ہے۔ پھر بھی ''عقلیت'' کے سوا اور ''جذباتیت'' کا اس شخص کے وجود میں قطعاً کوئی حصہ نہیں۔ جسے دنیا صرف جذباتی اور کرتی ہے۔ پھر بھی آپ کا یہ فیصلہ شاید ظلم کے حدود سے باہر نہیں۔ کیا آپ جیسے بزرگوں کی یاد بھی دل سے نکل جاتی ہے۔ اتنا بے توفیق تو نہیں ہوں۔''

یقیناً طویل و مدید اور طرح طرح کے ذاتی و صفاتی روابط و علائق کے طفیل میں اس نیاز مند کو کچھ نہ کچھ خدمات کی توفیق میسر آتی رہی اور مختلف قسم کے حسن ظن بھی مولانا کو پیدا ہو گئے تھے جن کی بنا پر وہ کسی معاملہ میں اس سے بے نیازی و بے رخی تو بلاشبہ نہ فرماتے تھے اور اس کی یاد بھی یقیناً بقول ان کے دل...... یا زیادہ صحیح معنی میں دماغ...... سے نکلی ہوگی۔ ساتھ ہی یہ بھی بالکل یقینی ہے کہ جس کو طبعی و ''جذباتی'' یا قلبی تعلق انس و محبت کا کہا جاتا ہے وہ جب اپنے بال بچوں ہی سے مولانا کو نہ تھا تو مجھ سے یا کسی اور سے کیا ہوتا اور اس حیثیت سے حرف حرف یہ درست ہے

Marfat.com

کہ ''عقلیت'' کے سوا جذباتیت کا ان کے وجود میں کوئی حصہ نہ تھا۔ راقم سطور بھی طبعی محبت سے خالی ہی اپنے کو پاتا ہے تاہم مولانا کے مقام ''عقلیت'' سے اپنے کو ہمیشہ بہت نیچے ہی پاتا رہا۔

مولانا کی زندگی کا سب سے کمزور پہلو عمل کا تھا۔ کمالات علم کے جتنے بڑے دھنی تھے عمل میں اتنے ہی درجہ صفر تک کے کمال کو پہنچے ہوئے۔ انتہا یہ کہ علم وعمل دونوں کے اس نالائق و عاجز کو بڑا عملی خیال فرماتے رہے جو کسی حد تک ان کے صفری درجہ کے مقابلہ میں بجا بھی تھا۔ باقی مولانا کا حال تو یہ تھا کہ اگر کھانے پینے کا بھی پورا بندوبست باورچی سے لے کر دستر خوان تک کوئی دوسرا نہ کر کرا دیتا تو فاقہ ہی فرماتے۔ یا مضطر ہوتے تو بازار کے چنوں پر دنوں تک پر قناعت فرما لیتے۔ سفر حج میں لفظ لفظ یہی آنکھوں کے سامنے آیا۔ عرفات کے میدان میں اپنی مستی و بے خودی کے عالم میں جو کھوئے گئے تو دوسرے دن میں رمی حجاز کے کسی مقام پر بھنے چنے ہی کھاتے پائے گئے۔ کھانے کی کسی دکان یا ہوٹل تک جانے کے اہتمام سے یہی آسان جانا۔ سفر تنہا بمشکل اور شاید ہی کبھی فرماتے۔ سامان تو سامان خود اپنے وجود کی دیکھ بھال دشوار تھی۔

پھر بھی ذہن و دماغ کی رسائیوں کے تو ماشاء اللہ بادشاہ تھے ہی۔ خالی عملی منصوبوں یا سکیموں تک ذہن خوب پہنچتا۔ وفات کے بعد جب ان کی یادگار کا بعض ''صدق'' زبانوں پر نام آیا تو میں نے ان کی وقت کی ایک ایسی ہی بڑی اہم عملی تجویز کی طرف ''صدق'' ہی کے ذریعہ توجہ دلائی۔ مگر اولاً تو زبان وقلم سے آگے...... جس میں شعوری غیر شعوری طور پر نام ونفس کی کبھی کچھ غذا انفذا انفذ مل جاتی ہو...... ہم مسلمانوں کے قدم شاذ و نادر ہی آگے بڑھتے ہیں۔ خصوصاً کسی ایسے ٹھوس عملی کام کے لئے جس میں کم از کم ابتداء میں کام ہی کام زیادہ ہو اور نام کا چٹخارا برائے نام۔

مولانا پڑھے تو ''دیوبند'' میں تھے لیکن پیدا ''ندوی'' ہوئے تھے۔ اور اس کو دیوبند میں قدم رکھنے سے بہت پہلے ٹونک میں ان کے استاد مولانا برکات احمد نے ایسا بھانپ لیا تھا کہ خود مولانا ہی مزہ لے کر ان کا یہ فقرہ نقل فرمایا کرتے کہ ''شبلی کا یہ انڈا میرے ہاں کہاں سے آ گیا''۔ ندوہ سے باہر خالص دینی تعلیم و تربیت والوں میں شاذ و نادر ہی ایسے افراد ملیں گے جن کو حضرت اکبر کی زبان میں ندویوں کی سی ''زبان ہوشمند'' ملی ہو یا جن کی زبان سے دین کی وکالت وحمایت کی بات جدید تعلیم کے دنیادار کان لگا کر سننا کچھ پسند کرتے ہوں۔ مولانا ان شاذ و نادر افراد میں فرد فرد کا درجہ رکھتے تھے بلکہ مولانا دریا آبادی سلمہ کے بقول ''ہر بڑے سے بڑے ندوی سے بڑھ کر ندوی تھے۔''

حضرت مرحوم کی اس موہوب ''ندویت'' کے لئے واہب العطایا جل مجدہ نے عثمانیہ یونیورسٹی کا میدان بھی خوب ہی خوب عطا فرما دیا تھا۔ اس سٹیج پر ان کے خصوصی کمالات کا پہلا نظارہ سالہا سال تک دینیات لازم کی کرسی سے ہوتا رہا۔ اس میں ایک طرف انٹر سے لے کر بی اے و بی ایس سی آرٹ و سائنس کے سیکڑوں ہزاروں طالب علموں کے جدید ذہنی سانچہ اور اس میں ابھرنے والے دینی شکوک و شبہات کے جاننے پہچاننے کا بھرپور موقع ملا۔ دوسری طرف ان

Marfat.com

کے ازالہ امالہ کا جدید تعبیرات واصطلاحات ہی کے ذریعہ اپنی وہبی قابلیتوں سے خوب خوب کام لینے کا۔

نہ جاننے والے اندازہ ہی نہیں کر سکتے کہ جدید علوم وفنون کے معلمین، ان کی تعلیم گاہیں اور ان میں تعلیم و تربیت کا ماحول سب مل ملا کر دین حق میں ایسے سمّ قاتل کا حکم رکھتے ہیں کہ کوئی بہت بڑا ''بطنی سعید'' ہی عمل تو عمل ایمان کو بھی صحیح سلامت لے کر ان سے باہر آپاتا ہوگا لیکن جاننے والے یہ بھی جانتے ہیں کہ حضرت گیلانی کے زیر درس دینیات لازم کے ان سیکڑوں طالب علموں میں کوئی بہت بڑا ''بطنی شقی'' ہی ہوتا ہوگا جو ہر روز ان کے تازہ بتازہ درسوں سے تازہ بتازہ ایمان لے کر نہ باہر آتا ہو۔ خود مجھ کو فلسفہ کے ۴۰۔۵۰ طالب علموں کی بی اے کی جو جماعت پہلے پہلے وہاں ملی تھی، اس کا پہلا تجربہ یہی ہوا تھا کہ ان میں شاید ہی کوئی رہا ہوگا جس کے ایمان کی کوئی نہ کوئی چول ہل نہ رہی ہو لیکن پھر الحمدللہ ۲۳ سال میں اس نام کے ''بدنام'' ندوی کو بھی کوئی ایسا طالب علم معلوم نہیں جو ایمان دشمنی کے لئے ''بدنام فلسفہ'' خصوصاً مغربی فلسفہ...... سے ایمان ہی کا کوئی نہ کوئی سبق لے کر نہ نکلا ہو۔ بعض غیر مسلمان طلباء کی زبان سے تو یہاں تک سنا گیا کہ اسلام کی حقانیت میں ہم کو کوئی خلش باقی نہیں رہی البتہ دنیوی مجبوریوں اور مصلحتوں سے اعلان کی ہمت نہیں۔ مغربی واسلامی فلسفہ کے علاوہ سال دو سال مولانا کی جانشینی میں دینیات لازم کے لیکچروں کا بھی تجربہ ہوا۔ اس سے اور بھی اندازہ ہوا کہ دین اسلام کی اس ایک نصرت وخدمت کی بدولت آج وہ اسلام کے خدا اور رسولؐ دونوں کے حضور کیسے سرخرو ہورہے ہیں اور کیسی رضا اور رحمتوں سے ان شاء اللہ نوازے جارہے ہوں گے۔

ملنا جلنا اور ربط وضبط بھی مولانا کا جدید علوم وفنون کے اساتذہ سے زیادہ رہتا اور سب ہی کو ان کی ذہنی وعلمی برتری کا لوہا ماننا پڑتا۔ یونیورسٹی کے باہر بھی مولانا کے افادات کا تعلق زیادہ تر نئی تعلیم وروشنی والوں ہی سے رہتا۔ مختلف قیام گاہوں کی قریبی مساجد میں درس قرآن کا جو سلسلہ وقتاً فوقتاً چلتا رہتا اس سے مستفید ہونے والے تو قریباً سارے کے سارے نئے تعلیم یافتہ ہی ہوتے اور ان کے مجمع میں مولانا کی طبیعت وزبان دونوں خوب کھلتی۔ بخلاف اس کے بقول خود ''ہم پیشہ مولویوں'' سے ڈرتے رہتے اور اپنے خصوصی افکار وخیالات کا عام تقریروں، تحریروں اور مجلسوں میں بہت بند بند ہی اظہار ہوتا۔

مضامین ومقالات اور تصانیف میں تدوین حدیث وتدوین فقہ جیسی خالص دینی چیزوں تک کا خاص ہدف دین کے باب میں نئے نئے وساوس وخطرات والوں ہی کو پائیں گے۔ ہر پھر کر مطلب ومدعا یہی ہوتا کہ معنی وعبارت عنوان ومعنون ہر راہ سے گھیر گھار کر نام نہاد اپنے روشن خیال بھائیوں کو ''ظلمات بعضها فوق بعض'' کی تہہ بہ تہہ تاریکیوں سے کسی نہ کسی طرح گھسیٹ کر عمل نہ سہی کم از کم ایمان کی روشنی میں تو لا کھڑا کردیں۔ غرض یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ مولانا گیلانی نے اپنی تحریری وتقریری پوری زندگی کا سب سے بڑا مشن اپنے نئے بہکے ہوئے بھائیوں کی دستگیری کو بنا رکھا تھا۔

البتہ زبان وقلم کی بے پناہ طاقت کے ساتھ دست وبازو کے کمزور ہونے کی معذوری سے اس مشن اور جذبہ کی کوئی عملی یادگار نہ چھوڑ سکے۔ بایں ہمہ ایک عملی تجویز یا سکیم ایسی چھوڑی ہے جو جدید تعلیم کے زہر کا نسبتاً سب سے آسان ارزاں ساتھ ہی کارگر تریاق ہے۔

جس طرح نئی تعلیم اور اس کی تعلیم گاہوں، اسکولوں، کالجوں وغیرہ کے سیلاب کو روکنا ناممکنات سے ہے، اسی طرح عملاً یہ بھی قطعاً ناممکن ہے کہ ان کے مقابلہ میں مسلمانوں کے لئے ہر جگہ ایسے کالج و اسکول قائم کئے جا سکیں جن میں جدید علوم و فنون کے ساتھ دینی تعلیم و تربیت کا کوئی معتد بہ و مؤثر انتظام ہو سکے۔ اس کے بجائے بدر جہا آسان و ارزاں مولانا کی یہ تجویز تھی کہ نفس اس تعلیم کے لئے تو مسلمان طلبہ کو جہاں تک ہو سکے سرکاری اور غیر سرکاری تعلیم گاہوں ہی میں گھسنا چاہیے۔ باقی نام کے مسلم اسکول و کالج یا ''مسلم یونیورسٹی'' پر مسلمانوں کا لاکھوں کروڑوں روپیہ برباد ہونے کے مقابلہ میں انفرادی و اجتماعی زور ہر جگہ چھوٹے بڑے اور ممکن حد تک ارزاں سے ارزاں اسلامی اقامت خانے (ہاسٹل) قائم کرنے کرانے پر لگانا چاہیے۔ یہ نئی تعلیم اب نہ گنے چنے چند اغنیاء و امراء کی اولاد تک محدود ہے نہ رہ سکتی ہے۔ لہٰذا کم استطاعت اور غیر مستطیع طلبہ کی قریب قریب ساری بھیڑ چار و ناچار ان اقامت خانوں میں پناہ پانے پر مجبور ہوگی۔ ان میں ممکن حد تک بقدر ضرورت دینی تعلیم اور اس سے بڑھ کر بہتر حتی المقدور دینی تربیت کی فضا و ماحول کا انتظام کرنا چاہیے۔ خود ہاسٹل میں مقیم ان کے نگراں کے علاوہ بھی ان کا ملنا جلنا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا جہاں تک ہو سکے کچھ نہ کچھ ایسے افراد اور جماعتوں کے ساتھ ہوتا رہے جو ایمان اور عمل صالح کی زندگی کا خود ذرا اچھا زندہ نمونہ ہوں اور بات چیت بھی ان سے ان کے ذہنی میلانات و رجحانات کو جان پہچان کر کرا سکتے ہوں۔ کتابی تعلیم کا بار زیادہ نہ ہو۔ روزہ اور نماز باجماعت کی پابندی تو لازم ہونا ہی چاہیے۔ اس کے ساتھ زیادہ زور معاملات اور اخلاق کی اصلاح پر رہے۔ کتابی تعلیم میں بس آدھ گھنٹہ نماز فجر کے بعد ہی قرآن مجید کا ترجمہ و تفسیر۔ اس کے علاوہ حدیث کا ایک ایسا انتخاب جس میں ایمانیات کے ساتھ اعمال صالحہ اور ان میں خصوصاً حقوق عباد......معاملات اخلاق اور معاشرت...... پر زیادہ توجہ دلائی گئی ہو اور ایک روز مرہ پیش آنے والے ضروری ضروری فقہی مسائل کا مجموعہ۔ کوئی مناسب وقت ان دونوں کے لئے ملا کر کم و بیش ایک گھنٹہ سے زیادہ نہ ہو۔ باقی عام مطالعہ کے لئے سیرت کی کتابوں خود مولانا گیلانی، مولانا دریابادی (خصوصاً ''صدق'' کی فائلوں) مولانا نعمانی، مولانا علی میاں سلمہم کی کتابوں اور جماعت اسلامی کے لٹریچر کے ساتھ حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ کے ملفوظات و مواعظ، اسی طرح دوسروں کی جو بالخصوص جدید ذہنوں کے لئے مفید و مناسب کتابیں ہوں ان کا ذخیرہ اقامت خانہ کے عام دار المطالعہ میں موجود رہے اور کچھ ماہنامے وغیرہ بھی ایسے ہی فراہم کئے جاتے رہیں۔ نیز تعطیلوں میں ذرا ایسے نمایاں حضرات سے جو نئی ذہنیت والوں میں معروف و مقبول ہوں ان کے خطاب عام و خاص سے مستفید ہونے اور اپنے شکوک و شبہات دور کرنے کے مواقع بھی وقتاً فوقتاً جو حاصل ہو سکیں حاصل کئے جاتے رہیں۔

ابتدا ان اقامت خانوں کی ایسے طالب علموں سے ہو جو اپنے دین و ایمان، عادات و اخلاق میں زیادہ بگڑے نہ ہوں اور نسبتاً زیادہ تربیت پذیر ہوں۔ تعدادی غلبہ ہمیشہ ایسوں ہی کا رہے۔ بہت بگڑے ہوؤں خصوصاً تربیت ناپذیر غیر مطیع و سرکش طبیعت والوں کو ایک بھی جگہ نہ دی جائے۔ گو ایسی تہائی مثالیں استثنائی ہوں گی۔ تاہم احتیاط اسی میں ہوگی کہ ابتدائی داخلہ مہینہ دو مہینہ کی مدت کا عارضی و امتحانی ہر طالب علم کا رکھا جائے۔

خیر یہ جزئیات تو اس جزئیاتی فطرت والے راقم کے ہیں جو اور بھی بہت سے دماغ میں بھرے ہوئے ہیں۔

Marfat.com

خیال تھا کہ کسی طرف عملی قدم اٹھایا گیا تو پیش کر دیئے جائیں گے لیکن بے عملوں کی عملی بات سنی جاسکتی تو خود حضرت مرحوم کی زندگی ہی میں کیوں ان سنی رہتی۔ ورنہ جدید تعلیم کی عالمگیر و باوکلّی مرض کا یہ اصلی کلّی و عملی علاج زبان و قلم سے بار بار سننے اور سمجھنے میں مرحوم ہی سے آ تا رہا۔

پوری دنیا کے پورے ادیان و مذاہب کی تاریخ میں شاید نہیں، یقیناً دین و مذہب کے حق میں کوئی شر و فساد اپنی شدت و وسعت کے اعتبار سے تعلیم جدید، اس کے علوم و فنون، اس کی لائی پھیلائی ہوئی معیشت و معاشرت، تہذیب و ثقافت، حکومت و سیاست سے بڑھ کر کیا اس کے لگ بھگ بھی قطعاً معلوم نہیں۔ وسعت کا یہ حال کہ جن ملکوں میں اس تعلیم کے افراد گنتی میں انگلیوں پر گنے جاتے یا دو چار فیصد سے زیادہ نہیں، سیاست و معاشرت سب پر عملاً حاوی و قابض رہی ہے۔ خالص مسلمان ملکوں اور حکومتوں تک میں دین اور دینی تحریکوں پر ظلم و زیادتی مخالفت و مزاحمت کی جو بلا آتی ہے بالواسطہ یا بلا واسطہ نازل ان ہی گنے چنے افراد یا ان کے جراثیم کا وبائی تعدیہ ہوتی ہے۔

اور کیوں نہ ہو کہ گھر کے یہ بھیدی تو ''مسلمان'' بن کر لنکا ڈھاتے اور اسلام کی جڑوں پر تیشہ چلاتے ہیں۔ اسلام کا کوئی کافر سے کافر کھلا دشمن بھی اتنا خطرناک نہیں ہوسکتا جتنا مسلمانوں میں گھسے رہنے والے یہ ماڈرن منافق و مرتد۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ عام مسلمانوں کی نظر ان کی نفاقی و ارتدادی چالوں اور چالاکیوں پر پڑتی ہی نہیں۔ عوام کیا دین کے خواص، ہمارے علماء تک ان کے ارتداد سے اتنے بے خبر ہیں کہ "یدخلون فی دین الله افواجا" کے بجائے فوج کی فوج دین سے ان خارج والوں پر ان کی اتنی نظر اور اتنی فکر بھی نہیں جتنی ابھی ایک آدھ نسل قبل کچھ عیسائی یا شدھی ہو جانے والے مسلمانوں کی پڑ گئی تھی۔

خدا بھلا کرے فرعون کے گھر میں پلے ہوئے ایک موسیٰؑ کا کہ نئی اعلیٰ تعلیم ہی کے ایک گھریلو بھیدی نے اپنے گھر والوں کے اس ارتدادی ''طوفان'' پر جس طرح کھل کر آگاہ کیا اس نے اس حقیقت کو اور بھی واضح کر دیا ہے کہ اس کے مقابلہ کے لئے صرف زبان و قلم کی کوئی تقریری و تحریری جدوجہد ہرگز کافی نہیں۔ جب تک اس کا توڑ اس کی پیدائش کے گھروں ہی سے نہ ہوتا رہے۔ یعنی ایک طرف جس طرح کالجوں یونیورسٹیوں کے دوران تعلیم میں یہ زہر طالب علموں کے ذہن کو آہستہ آہستہ متاثر کرتا ہے اسی طرح دوسری طرف ساتھ ساتھ ہی گیلانی اقامت خانوں کی تعلیم و تربیت سے اس کا مداوا و ازالہ ہوتا رہے۔ ''سرچشمہ باید گرفتن بہ میل'' بہرحال گھر والے (شهد شاهد من اهله) کی یہ شہادت یا خطرہ کا الارم خود اس کی زبان سے ہے۔ بڑے عبرت کے کانوں سننے کے لائق۔

> ''نہایت وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس نوعیت اور اس پیمانہ کا فتنہ ارتداد اسلام کی ساری تاریخ میں کبھی رونما نہیں ہوا لیکن اس کے باوجود شاید مسلمان کبھی کسی قوی خطرہ سے اتنے بے پرواہ بھی نہیں ہوئے جس قدر اس سے......

> اب کفر و ارتداد ایک اور لباس میں اسلام کے مقابلہ پر آیا ہے۔ اس دفعہ اس کا لباس (آریہ یا عیسائی) مذہب کا نہیں بلکہ فلسفہ (یا علم و عقل) کا لباس ہے۔ اس لباس میں وہ اسلام ہی کو نہیں

سارے مذاہب کو ملیا میٹ کر دینا چاہتا ہے......اس نے (عیسائیت وغیرہ باطل) مذاہب کی طرح صرف چند نہیں لاکھوں مسلمانوں کو مرتد بنایا ہے اور اس کی فاتحانہ یلغار برابر چل رہی ہے......''

بڑے پتہ کی بات کہ باطل مذہب عیسائیت وغیرہ۔

''براہ راست اور بلاواسطہ اسلام کے مقابلہ پر آتا تھا......(بخلاف اس کے) باطل فلسفہ علم و عقل کے نام سے اس کا مقابلہ کرتا ہے۔ وہ جب اسلام کی تردید کرتا ہے تو اسلام کا نہیں بلکہ اسلام سے اس طرح قطع نظر کرتا ہے گویا اس کو معلوم ہی نہیں کہ اسلام اس کے حریف کی حیثیت سے دنیا میں موجود ہے...... بلکہ وہ علمی تحقیق و عقلی استدلال کے بل بوتے پر انسان اور کائنات کی ایسی تشریح کرتا ہے جس میں خدا اور رسالت اور دین کے لئے کوئی گنجائش نہیں رہتی......

ماشاء اللہ وجزاہ اللہ خوب خوب چور پکڑے ہیں۔ پتہ ہی پتہ کی اور سنیئے:

''باطل مذہب جب اسلام کی مخالفت کرتا تھا تو ہماری غیرت دینی جوش میں آتی تھی۔ ہمارا جائز غصہ بھڑکتا تھا......ہمیں ذرہ بھر شک نہیں ہوتا تھا کہ اس کا ماننا اسلام کا انکار ہے......لیکن باطل فلسفہ جب اسلام کی مخالفت کرتا ہے تو ہماری غیرت دینی کا جوش کم ہوتا ہے...... جب ہم اس (باطل فلسفہ) کے فریب میں پھنستے ہیں تو بے علمی و جہالت قبول کرتے ہیں لیکن نام اس کو علم کا دیتے ہیں...... ہم اس کی باتوں کو (اس طرح) جانتے ہیں کہ ہمارے دل میں یہ بات کھٹکتی (تک) نہیں کہ ان کے اثبات سے اسلام کی نفی ہوتی ہے......ہم اس کو دشمن نہیں دوست سمجھتے ہیں، اور اس سے تعاون کرتے ہیں۔''

''باطل مذہب کے اثر سے جب کوئی مسلمان اسلام کو ترک کرتا تھا تو وہ مجبور ہوتا تھا کہ کسی گرجا یا مندر میں جا کر شدھی یا بپتسمہ کی رسمی کارروائی سے گذرے۔ اس کے بعد وہ مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہو پاتا تھا اور اس کا کفر الم نشرح ہو جاتا تھا۔ اسلام سے اس کی دشمنی آشکارا ہو جاتی تھی اور مسلمان اس کی طرف سے ہوشیار اور بیدار ہو جاتا تھا۔''

اور بھی بڑا فتنہ یہ ہے کہ

''اسلام کے اس نئے دشمن نے اپنے پرستاروں کو اجازت دے رکھی ہے کہ تم مذہب سے بے پروا ہو کر خدا اور رسولؐ کے دشمن بن کر رہو تو......بھی اسلام کے دائرہ کے اندر ہو، چنانچہ ایسے دشمن دین اسلام سے رشتہ جوڑنے والے آج نصف سے بھی زیادہ مسلمان ایسے ہیں جو یا تو خدا کے منکر ہیں یا وحی کے، یا رسالت کے یا حیات بعد الموت کے یا جزا و سزا کے یا ان سب کے۔

Marfat.com

ان مسلمانوں میں بعض ایسے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ اسلام اس زمانہ میں نا قابل عمل ہے اور بعض کا خیال ہے کہ سارا مذہب ایک ڈھکوسلہ ہے...... پھر ان میں کوئی اسلام کے معاشی نظام کو فرسودہ و بے کار سمجھتا ہے۔کوئی اسلامی ریاست کو مضحک قرار دیتا ہے۔کوئی جنسی تعلقات پر اسلام کی عاید کی ہوئی پابندیوں کو ایک فطری حیاتیاتی عمل کی ناجائز، مضر صحت اور خارج از وقت رکاوٹ سمجھ کر انکار و استخفاف کرتا ہے، کوئی اسلام کی عبادت کے طریقوں کو بے معنی سمجھتا ہے۔ کوئی زکوٰۃ کو موقوف کرنا چاہتا ہے۔کوئی حج کو، کوئی قربانی کو، کوئی نماز کو، کوئی روزہ کو۔ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو اسلام ہی کے نام سے اسلام کی اساسیات تک کا انکار کرتے ہیں۔ اس کے بنیادی اصول کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ وہ اپنے غیر اسلامی تصورات کو اسلام کا نام دیتے ہیں اور اکثر انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ وہ اسلام سے الگ ہو چکے ہیں بلکہ ایسی راہ اختیار کر چکے ہیں جو اسلام سے بالکل برعکس سمت میں جاتی ہے۔''

سب سے خطرناک پہلو اسلام سے ان نئے پھرے ہوؤں یا ارتداد پسندوں کا یہ ہے کہ:

''ان ساری باتوں کے باوجود یہ لوگ مسلمانوں کی جماعت میں مسلمان بن کر رہتے ہیں۔ ان سے شادی بیاہ کرتے ہیں۔ دوستی رشتہ داری، میل ملاپ اور کھانے پینے کے تعلقات قائم کرتے ہیں بلکہ ان کے جنازے پڑھتے ہیں۔ ان کی عبادتوں میں شریک ہوتے ہیں۔''

بلکہ بہتیرے خود نماز روزہ تک کے پابند ہوتے ہیں۔ مگر عقائد و ایمانیات میں خدا و آخرت وحی و نبوت تک کے تصورات بالکل من مانے اور اسلام کے مسلمات سے قطعاً بیگانے رکھتے ہیں۔ غرض یہ حرف حرف صحیح ہے کہ ''اس نوعیت اور اس پیمانہ کا فتنہ ارتداد اسلام کی ساری تاریخ میں کبھی رونما نہیں ہوا۔''

خود کہا ہی کرتا ہوں کہ آج کی دنیا میں اس طبقہ کے ایک فرد کی بھی اصلاح جتنی اور جس درجہ میں بھی ہو جائے وہ اہل و عیال، خاندان و برادری، گھر باہر، کچہری دفتر، سیاست و حکومت جہاں کہیں، جس چھوٹے بڑے منصب پر ہو گا اس سے پھیلنے والے وبائی جراثیم کا مار دینا یا کم کر دینا دین کی خدمت ہرگز نہیں، سیف و قلم یا کسی قوت کا کوئی دوسرا جہاد شاید ہی وقت کا اس سے بڑا اور ماجور جہادی عمل ہو سکے۔

''قرآن اور علم جدید'' کے مصنف سلمہ سے اس ارتدادی فتنہ کا صرف ایک مگر بڑا متعدی اور خطرناک رخ شاید اتفاقاً و تسامحاً نظر انداز ہو گیا۔ ''اسلام کے یہ ''ماڈرن مرتد'' فقط اپنی ذات ہی تک ایسی راہ نہیں اختیار کر چکے ہیں۔ ''جو اسلام سے بالکل برعکس سمت میں جاتی ہے۔'' بلکہ اندھیر یہ مچا رکھا ہے کہ ماڈرن سیاست و حکومت اس کی کونسلوں، اسمبلیوں، وزارتوں وغیرہ کی اونچی سے اونچی کرسیوں اور منصبوں تک پہنچ کر اسلام کے یہ نادان دوست یا چھپے دشمن اسلام کی علانیہ نمائندگی کے نہ صرف خود دعویدار بن جاتے ہیں بلکہ اسلام کے کھلے دشمن ان کو اپنی اسلام دشمنی کا بہترین نمائندہ پا کر بڑے جوش و خروش سے ان کا استقبال کرتے ہیں۔

اس اتفاقی تسامح کے سوا حق یہ ہے کہ مصنف کے قلم سے اللہ تعالیٰ نے اس ہولناک ارتدادی فتنہ کے ایک ایک خط و خال کو چند سطروں میں نمایاں کرا کے پوری امت، خصوصاً علمائے امت کی آنکھیں کھولنے کے لئے اتمام حجت کا پورا حق ادا کر دیا (جزاہ اللہ عن الاسلام وامتہ) اسی سے زیادہ متاثر ہو کر ہمارے مولانا علی میاں سلمہ...... بارک اللہ فی برکاتہم ......اس ''نئے طوفان کے مقابلہ''[12] میں بے تابانہ اٹھ کھڑے ہوئے لیکن اس طوفان کے زور کو روکنے اور توڑنے کے لئے نرے ''تحقیقاتی ونشریاتی'' لٹریچر کا طوفان اٹھا دیا جائے تو بھی ہرگز کافی نہیں۔ نہ کماً نہ کیفاً۔ بلاشبہ فرض کفایہ کے درجہ میں ضرورت اس کی بھی ہے لیکن کفایت کے درجہ میں کارگر قطعاً نہیں۔ اولاً تو اس سے مستفید و متاثر ہونے والے سو میں دو چار ہی ہوتے ہوں گے۔ دوسرے اس کی نوعیت زیادہ تر کلامیاتی ہے یعنی وقت کے ذہنی و عقلی رجحانات و تصورات کی زبان اس دینی و اسلامی تعلیمات کی لسانی و قلمی تفہیم و ترجمانی یا جیسا کہ ندوہ کا روزِ اوّل سے ایک بڑا نصب العین وقت کے لسانی و قلمی رازی و غزالی پیدا کرتا رہا ہے اور کچھ نہ کچھ پیدا کئے بھی۔ لیکن مولانا دریا آبادی سلمہ جیسا کہ بارہا دفتروں کا فیصلہ فقروں میں فرمایا کرتے ہیں، ایک مراسلہ کے سلسلہ میں عین ان سطروں کے دوران تحریر میں ان کا جواب یہ ملا کہ ''اگر الفاظ کے زور سے سب کو قائل کر دینا ممکن ہوتا تو امام رازیؒ کے عہد کے بعد دنیا میں کوئی ملحد یا دہریہ باقی ہی کیوں رہ جاتا۔''[13]

پھر ندوہ نے جتنے ''رازی'' قریباً پون صدی میں پیدا کئے ہوں گے ان سے بہت زیادہ اور زیادہ کامیاب مولانا مودودی یا جماعت اسلامی نے چوتھائی صدی ہی میں پیدا کر دیئے بلکہ سچ یہ ہے کہ عصری کلامیات کے لئے جیسا سینہ حق تعالیٰ نے اس جماعت کے اہل قلم کا کھول دیا ہے اور ''تحقیقاتی ونشریاتی'' لٹریچر کی حد تک ہندوستان و پاکستان کی جماعت اسلامی کے رازیوں نے اس فرض کفایہ کا جیسا حق ادا کر دیا اور کر رہے ہیں، اس کی مثال کسی دوسری جماعت کیا شاید ہی کسی دوسرے مسلمان ملک میں ملے۔

اب اگر زیادہ ضرورت ہے تو ندوی و مودودی وغیرہ رازیوں نے جو لٹریچر پیدا کر دیا ہے اس کو انگریزی، ہندی بلکہ عربی وغیرہ دوسری زبانوں میں منتقل کرانے کی باقی جان سخن وہی ہے کہ نہ خالی الفاظ کا زور پرانے ''رازیوں'' کا کافی تھا، نہ نئے ''رازیوں'' کا ہوگا۔

کیونکہ دین اپنی حقیقت میں نام ہے ظاہر سے بہت زیادہ باطن یا قلب کے انقلابات کا۔ بلکہ معتبر اس کا ظاہر بھی صرف وہی ہے جو جس قدر باطن کا پرتو ہو۔ زبان و قلم کی متکلمانہ سخن سازیوں سے کچھ زبانوں کو تو خاموش کر دیا جاسکتا ہے۔ گو نہ خاموش ہونے والی زبانیں اس راہ سے بھی خاموش نہیں کی جاسکیں۔ عقل ہے ہی ایسا وکیلانہ حربہ یا دو دھاری تلوار جو دونوں طرف چلتی ہے۔ اس سے دینی حقائق کو جس طرح ثابت کیا جاسکتا ہے اسی طرح باطل بھی کیا جاسکتا ہے۔ یہ موقوف وکیل کی وکالت و ذہانت پر ہے کہ وہ مقدمہ کے کس پہلو کی تائید و تردید کرنا چاہتا ہے۔ کہا ہی کرتا ہوں کہ عقل جج نہیں وکیل ہے۔ جیسا مقدمہ اس کو دے دو گے اس کے مطابق وکالت کر دے گی۔ رہا راسخ و پائدار قلبی انقلاب اس کی صحیح راہ چھوٹے بڑے کسی پیمانہ پر بھی ''تحقیقاتی ونشریاتی'' نہیں انبیائی یا اہل قلوب کی راہ ہے۔ ورنہ نفس ہدایت تو انبیاء کے بس میں بھی نہیں۔ نبی الانبیاءؐ تک کو تنبیہ رہے کہ ''انک لا تھدی من احببت ولکن اللہ

Marfat.com

یھدی من یشاء" اور ہماری بندگی کا فریضہ دین و دنیا کے سارے معاملات میں ایمان و عمل صالح کے اسباب کو اختیار کرنا اور نتائج کو مسبب الاسباب کے حوالے کرنا۔

اس لئے ظاہری اسباب و تدابیر کی حد تک بھی کلامیاتی لٹریچر کے فرض کفایہ کے ساتھ زیادہ ٹھوس تدبیر گیلانی اقامت خانوں ہی کی ہے۔[۱۴] ان کے نظام کو اعلیٰ تعلیم کے ارتدادی فتنہ یا "نئے طوفان" کے مقابلہ میں شہر شہر اس طرح پھیلایا جائے جس طرح آج نام کی نانذہبی (سیکولر) تعلیم کے فتنہ کے مقابلہ میں (یو۔پی میں خصوصاً) گاؤں گاؤں ابتدائی اسلامی مکاتیب پھیلانے کی ضرورت شدت سے محسوس ہو کر کچھ عملی کام بھی چل نکلا ہے۔ وفقنا الله لما یحب ویرضیٰ۔

تاہم ظاہر ہے کہ گیلانی اقامت خانوں کی تجویز بھی ایک ظاہری تدبیر ہی ہے اور بذات خود کوئی ٹھوس قلبی انقلاب رونما کرنے کے لئے ناکافی۔ لہٰذا اس قلب و قالب دونوں کے نابکار راقم کے نزدیک ان اقامت خانوں کے لئے بھی کسی نہ کسی معتد بہ درجہ تک کچھ نہ کچھ اہل قلوب کا تعلق اور ان کی ہمت و توجہ کو حاصل کرتے رہنا ضروری ہے۔ خواہ وہ بجائے خود زبان و قلم کے الکن یا کتابی و ظاہری علم کے اعتبار سے بالکل امی ہوں۔ ایسی ایک غیر معروف لیکن بڑی عجیب و نادر زندہ مثال آپ "الفرقان"[۱۵] کے صفحات میں "اللہ کا ایک بندہ" کے عنوان سے پا سکتے ہیں۔ قرآن کا مطالبہ ہی علم و قلم یا "الفاظ کے زور سے" قرآن کی داد دینے سے بھی پہلے "اللہ کا بندہ ہی بندہ" بننے بنانے کا ہے۔ وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون اللہ کے اس جیسے بندہ قلبی کی توجہ و دعا کیا اس کو محض آنکھوں سے دیکھتے رہنا ہی ان شاء اللہ وہ کام کرے گا جو زبان و قلم کے دفتر کے دفتر نہیں کر سکتے۔

بات میں بات نکلتی اور دراز نفسی بڑھتی چلی جا رہی ہے لیکن موقع پا کر عرض کئے بغیر نہ رہا گیا کہ صاحب مکتوبات حضرت گیلانی کی زبان و قلم کے زبانی و قلمی ہزاروں عقیدتمندوں میں شاید کوئی صاحب عمل بھی ایسا نکل آئے جس کو حضرت مرحوم کی اس ٹھوس عملی تجویز کو عمل میں لانے کی توفیق مل جائے۔ کسی پیمانہ پر بھی اگر ایک عملی نمونہ سامنے آ گیا تو ان شاء اللہ آگے کا راستہ کھل جائے گا۔ ورنہ بظاہر مرحوم کے ساتھ ان کی یہ تمنا بھی مرحوم ہی ہو چکی ہے!

آخر ۱۹۵۱ء (۱۰ نومبر) کے ایک مکتوب گرامی میں بھی اس تمنا کے بار بار اظہار کو اس طرح ظاہر فرما گئے ہیں کہ:

> "اپنے بزرگوں اور کام کرنے والے ارباب ہمم سے عرض کرتا رہتا ہوں کہ اسلامی اقامت خانوں کے قیام سے یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ جہاں کہیں سرکاری اسکول و کالج ہیں کوشش کی جائے کہ وہاں مسلمانوں کے اقامت خانے قائم کئے جائیں جن میں اسلامی زندگی کی عملاً اور قرآنی ادب کی تعلیماً۔ بس ان دو باتوں کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ سادہ کھانا، سادہ قیام گاہ، کم از کم مصارف و مکاتب کے مقابلہ میں جہاں تک میرا خیال ہے، اقامت خانوں کا نظام موجودہ حالات کے لحاظ سے غالباً زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہو۔
>
> لیکن تجویز کے سراہنے والے تو مل جاتے ہیں لیکن عملی جدوجہد میں جو مشغول ہیں ان کو بھی نمونہ

Marfat.com

کی حد تک اس تجویز کو عملی قالب میں لانے کی توفیق نہیں ہوتی۔''[61]

راقم عاجز کو حرف حرف یہی تجربات ہوئے، دل کو لگ یہ تجویز ایسی گئی تھی کہ نوکری سے رہائی پاتے ہی چاہا تھا کہ ابتدائی تجربہ ونمونہ کے طور پر کسی نہ کسی طرح آغاز ہو جائے لیکن خود کسی ایسی عملی خدمت کیا عملی تعلقات ہی کے سرے سے نالائق ہوں۔ ایک جوان صالح جوان ہمت صاحب علم وعمل آمادہ بھی ہوئے۔ پھر یاد نہیں کیا صورت یا کیا معذوری ان کو پیش آئی کہ خیال خواب ہو کر رہ گیا۔ مولانا کی وفات پر خصوصاً جب بعض ان کے عقیدتمندوں نے ان کی یادگار کا ذکر چھیڑا تو یہ خواب از سرنو یاد آ گیا۔ ظاہری اسباب بھی فراہم نظر آئے۔ بڑا مسئلہ مکان کا ہو سکتا تھا۔ خاکسار خود اپنا خاصا بڑا مکان کامل تخلیہ کے ساتھ پیش کرنے کو تیار تھا۔ تائید وتقویت فرمانے والے مولانا دریا آبادی، مولانا نعمانی، مولانا علی میاں اور (ناظم ندوہ) ڈاکٹر مولانا سید عبدالعلی سلمہم جیسے حضرات تھے۔

مگر کمند ٹوٹی کہاں جا کر کہ ایسے اقامت خانہ میں قیام وانتظام کے لئے موزوں نگراں دستیاب یا تیار نہ ہوا۔ حالانکہ ضرورت نہ اس کے لئے قدیم وجدید علوم وفنون کے کسی فاضل کی ہے نہ کسی بڑے خطیب ومقرر، مصنف وانشاء پرداز کی۔ احکام دین کے بقدر ضرورت علم کے ساتھ ایمان وعمل صالح کی معتدبہ عملی زندگی کافی ہو سکتی ہے۔ البتہ جدید تعلیم والوں کے ذہنی رجحانات سے اتنا ضرور مانوس ہو کہ ان کی رعایت کے ساتھ ان کی نگرانی کی خدمت انجام دے سکے۔ بلکہ خود جدید تعلیم والوں ہی میں سے ہو تو کیا کہنا اور بڑے شہروں خصوصاً ان کے اسکول وکالج کے اساتذہ میں بعض افراد ایسے نظر بھی آتے رہتے ہیں ان کے لئے اگر قیام وغیرہ کی کچھ سہولتیں فراہم ہو جائیں تو غالباً کوئی نہ کوئی آسانی سے تیار ہو جائے۔

یوں تو کچھ نہ کچھ مشکلات سے چھوٹا بڑا کون سا کام خالی ہوگا لیکن اس جدید ہولناک ارتدادی فتنہ وطوفان کے مقابلہ کے لئے اسلامی اقامت خانوں کی گیلانی تجویز ہی سب سے زیادہ کارگر ہونے کے ساتھ عملی وآسان بھی ہے۔ تاہم تجربہ ہندوستان سے لے کر پاکستان تک مولانا گیلانی والا ہی ہوتا رہا کہ تجویز کے سراہنے والے تو مل (کیا بہت مل) جاتے ہیں۔ لیکن عملی جدوجہد میں جو جو مشغول ہیں (مثلاً جماعت اسلامی، جماعت تبلیغی اور جمعیتہ العلماء) ان کو بھی نمونہ کی حد تک اس تجویز کو عملی قالب میں ڈھالنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ بات وہی ہے کہ یہ کام زیادہ تر خالص ٹھوس عمل اور پتہ ماری کا اور ہمارے اندر بے نام کے کام کی عملی صلاحیت بالعموم اور بھی روز بروز زوال پذیر ہے۔ دیوبند، علی گڑھ، حمایت الاسلام، جامعہ ملیہ وغیرہ جو ایک صدی کے اندر کی عملی یادگاریں ہیں اب وہ بھی الا ماشاء اللہ اپنی رہی سہی اصل روح ومقصد سے بڑی حد تک دور ہو چکی ہیں۔ اگر کہیں کچھ ہو بھی رہا ہے تو زیادہ تر ظاہری ونمائشی یا کمی وعددی طور پر۔ اندر کی جب کچھ خبر ملتی ہے تو عموماً دردناک ودل شکن ہی ملتی ہے۔ اس ''ہر روز تیری بیتم'' کے دیکھتے جہاں کہیں کچھ صحیح کام ہو رہا ہے غنیمت ہی غنیمت معلوم ہوتا ہے اور اہل اخلاص کا اجر ان شاءاللہ بہرحال یقینی ہے۔

صاحب مکتوبات کی اقامت خانوں کی تجویز کچھ تفصیل سے اس لالچ میں شریک مکتوبات کر دی کہ شاید کسی صاحب اخلاص وعمل کو نمونہ کی حد تک ہی عمل میں لانے کی توفیق مل جائے اور مرحوم صاحب مکتوبات کی یہ ''مرحوم'' آرزو عملی زندگی پا کر ان کے اور ''صاحب توفیق'' دونوں کے لئے بہت بڑے خیر جاری کا سرچشمہ بن جائے ورنہ اس سراپا

Marfat.com

فضیحت نابکار وتباہ کار کے لئے زبان نصیحت ہلانا بھی شرمناک ہے۔ کبر عقتا عند الله ان تقولوا مالا تفعلون

زشت باشد روئے نازیبا و ناز

والسلام علی من اتبع الھدی

حواشی

۱۔ یہ ترجمہ کرتے وقت طبیعت ذرا جھجک رہی تھی، مگر ''روح المعانی'' میں ''خصلت'' کا ایسا لفظ نکل آیا جس کا لفظی ترجمہ آج کل کے محاوروں میں ''ذہنیت'' ہی ہوسکتا ہے۔ ''فسنھیہ للخصلة التی تودی الی یسر وراحة'' یعنی ہم اس کی خصلت ایسی بنادیں گے جو اس کو آسانی وراحت کے طریقوں کی طرف لے جائے گی۔'' اسی طرح مکذبین کی ذہنیت ایسی بنادیں گے جو ان کی دشواری وسختی (الی العسر والشدة) کے طریقوں سے ڈھکیلے گی۔

۲۔ اس دفتریت کا لال فیتہ (Red Tape) اپنی طوالت وطوماریت کے لیے خود ان دفتریت والوں ہی میں کیا کم نیک نام ہے۔ اس شیطانی آنت کی پیائش کا تازہ بتازہ ریکارڈ خود اپنے ملک کا بزبانِ ''صدق'' سن لیں کہ ۱۹۵۸ء تا ۱۹۵۹ء صرف ایک سال کی مدت میں یہ لال فیتہ جو حکومت کے صرف مرکزی دفتروں میں استعمال ہوا ہے، اس کی مقدار پچپن لاکھ گز تھی۔ پھر جمہوریہ ہند کی ساری ریاستوں کے لاکھوں دفتروں کو ملا کر اس دفتری طومار کی طوالت کروڑوں کروڑ گز تک کی خبر تو لیتی ہی ہوگی۔ بقول صاحبِ ''صدق'' ہی کے آج سے قبل اتنی جکڑ بندیاں، زندگی کے لیے ہر ہر قدم پر اتنی پابندیوں، اتنے فارمولوں کی خانہ پُری اتنے کاغذات پر دستخط، مکان کی تعمیر کے لیے سیمنٹ کی ضرورت ہو تو درخواست دیجئے، سفارشیں اُٹھوایئے، باقاعدہ پیروی کیجئے، فلاں چیز پر کنٹرول، فلاں چیز کے لیے لائسنس زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے۔ ''ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے'' اکبر الہ آبادی کو دل لگی مقصود نہ تھی (حقیقت کی ہلکی سے ہلکی ترجمانی تھی کہ) ''ہر گام پہ چند آنکھیں نگراں، ہر موڑ پہ ایک لائسنس طلب'' (صدق جدید۔ ۱۵ جولائی ۱۹۶۰ء)۔

ابھی لکھنؤ (۱۰ جولائی ۱۹۶۰ء کو) ایسی طوفانی ہولناک بارش سے گذرا جس کی نظیر ماضی میں قطعاً کسی کو معلوم نہیں۔ کسی مکان کی تعمیر کے لیے نہیں، اس عظیم مصیبت میں صرف معمولی مرمت کے لیے بوری دو بوری سیمنٹ خود اپنے بڑے مکان کے لیے آج تک مہینوں میں دستیاب نہ ہوئی۔ اعلان ہوا کہ ہاؤس ٹیکس کی رسید پیش کرنے پر ملے گی۔ وہ پیش کی گئی تو کہا گیا اس پر کسی اُوورسیر کے دستخط ہوں، اُوورسیر نے کہا انجینئر کے ہوں۔ ہنوز دو مہینوں پر بھی روز اوّل۔ اور تو اور کسی اور نے نہیں خود ہندوستان کے جواہر لال نہرو جیسے وزیراعظم نے اسی سیلاب کے مصیبت زدوں کی مدد کے لیے دس ہزار کا چک بھجوادیا تھا۔ وہ بھی کارپوریشن کے میئر اور ڈپٹی میئر کی باہمی لاگ ڈاٹ اور نفسا نفسی کی بدولت آج سیلاب کے دو مہینوں بعد تک ان مصیبت زدوں کے کام نہ آسکی اور دفتری حیلوں ہی کا نام لے لگا کر ٹالی جارہی ہے' خدا پرستی یا صدق بالحسنٰی کے بجائے خود پرستی یا (کذب بالحسنی) کا زور لازماً لال فیتہ والی دفتری حیلہ جویوں کے کڑوے کریلے کو اور نیم چڑھا دیتا ہے۔

۳۔ خود شامت زدہ راقم کو تو کسٹوڈین کی طرف سے ایک دعویٰ میں پھنسے ہوئے بارہ سال ہو چکے ہیں اور اب ایک سال سے زیادہ ہو چکا ہے ہائی کورٹ میں پڑا ہے۔

۴۔ وہ مبیضہ مراد ہے جو راقم ہذا کے مکتوبات کا حضرت مرتبہ سلمہ نے صاف کرا کے بھیج دیا ہے۔ آگے بھی اسی کے بعض اور حوالے ہیں۔

۵۔ حتیٰ کہ خود ان کے ایک انگریزی دان رشید شاگرد (مولوی غلام محمد حیدرآبادی ثم کراچوی سلمہ) کو مغالطہ ہو گیا کہ ''مولانا انگریزی کتابوں کا بے تکلف مطالعہ فرمالیتے تھے۔ اس لیے ان کی جدید معلومات اور ان پر تنقید معتبر تھی۔'' مقالات احسانی، ص ۱۱) حالانکہ بے تکلف کیا بہ تکلف بھی اور کتابوں کیا دو چار سطروں کا بھی مطالعہ نہیں فرما سکتے تھے۔

Marfat.com

۶۔ طالب علمی کے زمانہ کی ایک زیارت میں حضرت حالیؔ کا خود اس طالب علم کو یہ تجربہ ہوا کہ گویا وہ معمولی طالب علم ہیں اور یہ طالب علم کوئی بڑا عالم یا ان کا استاد و بزرگ ہے۔

۷۔ حضرت مولانا محمد حسین رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر خیر اس مکتوب الیہ کے نام کے مکتوبات میں جا بجا ملے گا۔

۸۔ مرتبہ مولوی غلام محمد صاحب سلمہ وشائع کردہ مجلس علمی کراچی، ص ۵۷۔۲۵۶

۹۔ ہفت روزہ ''صدق جدید'' لکھنؤ، ۲۴ اگست ۱۹۵۶ء

۱۰۔ ایک عجیب تجربہ مولانا خود بیان فرماتے ہیں کہ ''میں ایسا عقیم ہوں کہ ایک فرد مجھ کو نہیں معلوم جس نے میرے کہنے سے نماز پڑھی، حق تعالیٰ سبحانہ کی اس خاص شان کے سوا اس کو کیا کہا جائے کہ بعض حضرات انبیاء (علیہم السلام) کا ایک اُمتی بھی نہ تھا۔ ہدایت وضلالت کے باب میں مشیت الٰہی (انک لا تھدی من تشاء ولا کن اللہ یھدی من یشاء) کے قانون کی گرفت و یافت آسان نہیں۔

۱۱۔ مصنف ''قرآن اور علم جدید'' (ڈاکٹر رفیع الدین زادہ اللہ علما وفہما) جدید علوم کے وسیع وعمیق مطالعہ کے ساتھ ساتھ کتاب شاہد ہے کہ ماشاءاللہ دل و دماغ دونوں کے پُر جوش مومن بھی ہیں۔ البتہ جوش ایمان ہی نے شاید اس غلط فہمی تک پہنچا دیا کہ کھینچ تان کر مغربی رنگ ہی کا کوئی فلسفہ خود قرآن سے تیار کر کے اپنوں کو اسی ارتداد سے بچایا اور غیروں کو مسلمان بنا لیا جا سکتا ہے۔ اس فلسفہ سازی کی دھن میں نیک نیتی کے باوجود قرآن کی غیر محتاط تاویلات سے بچنا بھی ممکن نہ تھا۔ کاش طبع ثانی میں کسی مستند مشورہ سے نظر ثانی کی توفیق پائیں۔

۱۲۔ ''نیا طوفان اور اس کا مقابلہ'' نام کے رسالہ میں مولانا سلمہ کے زور قلم نے ''قرآن اور علم جدید'' کے مصنف کی بروقت تنبیہات کو اور زیادہ پُر زور و موثر بنا دیا ہے لیکن موصوف سے بڑھ کر کسی سے ایسی حقیقت کو سمجھنے کی توقع کی جانی چاہیے کہ ایمانی حقیقت وبصیرت کی رو سے یہ طوفان اُٹھا بھی بداہتہً خود ہم مسلمانوں کی شامت اعمال یا خدا کی نافرمانیوں سے اور اس کا مقابلہ از سرِ نو انابت واستغفار یا ایمان وعمل صالح۔ بالفاظ دیگر خدا اور رسولؐ کی اطاعت واتباع کی انفرادی واجتماعی زندگی سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ از سرِ نو راضی ہوں گے اور تب ہی ان کی نصرت لٹریچر وغیرہ کی ظاہری تدابیر میں بھی شریک ہوگی۔ ورنہ خالی لٹریچر کے پروپیگنڈے یا طوفان میں اہلِ باطل نہ آج اہلِ حق سے پیچھے ہیں نہ آئندہ رہیں گے۔

۱۳۔ صدق، ۲۹ جولائی ۱۹۶۰ء

۱۴۔ اور اب تو سفر یورپ سے واپسی پر ماشاءاللہ خود ہمارے علی میاں اس کفرستان تک تعلیم پانے والے مسلمان طلبہ کے لیے یہ تاثر و پیام لے کر آئے ہیں کہ ''جہاں تک مسلمان طلبہ اور نوجوانوں کا تعلق ہے، جو یہاں لاکھوں کی تعداد میں انگلستان، فرانس، جرمنی اور اسپین میں زیرِ تعلیم ہیں ان کی اصلاح وتربیت اور ان کی اسلامیات کی حفاظت کے لیے سب سے بہتر نسخہ وہ ہے جو ہندوستان کے لیے مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے تجویز کیا تھا اور اب ہمارے مولانا عبدالباری ندوی اس کے علمبردار اور داعی ہیں یعنی طلبہ کے لیے اقامت خانوں کی تاسیس اور ان میں اچھے نگراں اور مربی کا انتظام، پھر بھی چراغ تلے اندھیرا!'' (صدق جدید، ۱۷ جنوری، ۶۴ء)

۱۵۔ الفرقان، ماہ جولائی ۱۹۶۰ء

۱۶۔ مکاتیبِ گیلانی

(در: مکاتیبِ گیلانی، مقدمہ، ص ۲۶۔۷۸)

☆......☆......☆

Marfat.com

مولانا عبدالماجد دریابادی

محقق گیلانی

جو کل تک ہر غمزدہ کے لیے مجسم تسکین وتشفی تھا، آج خود اس کے غم میں کون اور کس کس کو تسلی دے؟ جو کل تک ہمہ تازگی وزندگی، ہمہ جودت وذہانت تھا، کس طرح یقین آئے کہ آج اس کا جسم خاکی زیر زمین پہنچ چکا ہے؟

فاضل گرامی حضرت مولانا سیّد مناظر احسن گیلانی (آہ! ان کے نام کے ساتھ بجائے مدظلہ العالی کے آج کس طرح مرحوم یا نوراللہ مرقدہٗ یا رحمۃ اللہ علیہ لکھا جائے۔ گویا زبان وقلم کچھ روز بعد اسی کے عادی ہو جائیں گے) دورِ حاضر کے طبقہء علماء کے خواص میں نہیں...... اخص الخواص میں تھے، بلکہ کہنا چاہیے تھا کہ اپنی دقتِ نظر ونکتہ رسی کے لحاظ سے فرد فرید اور اپنی نظیر بس آپ ہی تھے۔ جامعہ عثمانیہ میں صدر شعبہء دینیات وشیخ الحدیث سالہا سال رہے اور نظر جیسی حدیث پر تھی ویسی ہی قرآن مجید، فقہ، اصولِ فقہ، کلام تصوف اور معقولات پر بھی تھی۔ پھر جامعہ عثمانیہ میں بہ حیثیت استاد کے برسوں جو انگریزی خواں طلبہ اور اعلا ڈگریاں رکھنے والے استادوں سے یکجائی رہی، اس نے علوم جدیدہ اور مسائلِ حاضرہ سے بھی انہیں پوری طرح باخبر کر دیا تھا اور خیالات میں وسعت اور رواداری اس کا قدرتی نتیجہ تھی۔ خوش عقیدگی اور روشن خیالی، رسوخ فی الدین اور رواداری کی ایسی جامعیت کی نظیر کہیں اور شاید ہی مل سکے۔

مولانا بیک وقت مفسر، محدث، فقیہ، متکلم، معقولی اور صوفی صافی تھے۔ تاریخی مطالعہ کی وسعت وکثرت نے انہیں مؤرخ بھی بنا دیا تھا۔ طلبہ اور اُونچے یونیورسٹی طلبہ کے حق میں بہترین معلم تھے اور ایک بہترین مقرر وخوش بیان خطیب بھی تھے۔ انبالہ کے ایک اجلاس ندوہ ۱۹۳۶ء میں مَیں نے دیکھا کہ گو بولنے والے اور بھی اچھے اچھے علماء موجود تھے لیکن پبلک کی طرف سے بار بار مطالبہ جن بزرگ کی تقریر کے لیے ہوتا، وہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کے بعد یہی مولانا گیلانی تھے...... قوتِ تحریر کا جو ملکہ مولانا کو حاصل تھا، اس سے ناظرین ''صدق'' ناآشنا نہیں۔ ایک خاص طرزِ انشاء کے مالک تھے اور اس میں کسی کے مقلد نہیں خود اس کے موجد تھے۔ تحریر کا سب سے بڑا وصف بے ساختگی وبرجستگی تھی۔ جب اور جس موضوع پر قلم اُٹھایا بس لکھتے ہی چلے گئے۔ جو عنوان دوسروں کو پامال نظر آتے تھے ان میں بھی وہ نئے نئے نکتوں کے انبار لگاتے جاتے۔ خشکی ان کا قلم جانتا ہی نہ تھا۔ تحریر کی سطر سطر جاندار ہوتی۔

مسلک میں دیوبندی ہونے کے باوجود بڑے بڑے ندویوں سے بڑھ کر روشن خیال تھے اور ''جدت و

Marfat.com

جدیدیت'' سے بیزار و متنفر نہیں بلکہ اس کے منشا سے واقف تھے اور ہر تازہ فتنہ کی گہری جڑوں پر پوری نظر رکھنے والے تھے۔ حمایت و نصرتِ اسلام میں ہزار ہا ہزار صفحہ لکھ ڈالے۔ اسلامی معاشیات، امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی، النبی الخاتم، تدوین قرآن، تدوین حدیث، تدوین فقہ، ظہور نور، ابوذر غفاری، سوانح قاسمی وغیرہا کے علاوہ محض مضامین و مقالات ہی کی ضخامت ہزار ہا صفحات تک پہنچے گی۔ کاش! مولانا کے کوئی سعید شاگرد وقت نکال کر ان متفرق و مُنتشر اجزا کو یکجا و مرتب کرنے کی زحمت گوارا فرماتے۔ شاگردوں کا ذکر آ گیا تو یہ بھی سُن رکھنے اور خوش ہونے کی بات ہے کہ مولانا اپنے ایک نہیں متعدد شاگردوں میں دینی و علمی ذوق کی روح پوری طرح پھونک گئے ہیں اور ان لوگوں نے جو اہم دینی خدمات علمی رنگ میں کی ہیں ان کے اجر کے بھی بڑے حقدار خود مولانا ہی ہیں۔

بعض کتابوں کے ناتمام رہ جانے کا افسوس خصوصیت کے ساتھ ہے مثلاً تدوین حدیث جو تاریخ حدیث پر تھی، وہ اگر مکمل ہو جاتی تو منکرین حدیث کے شبہات کا بہترین مدلل و شافی جواب تھی۔ متعدد اور عنوانات بھی مولانا کے ذہن میں تھے۔ سب کے سب اہم اور ضروری۔ حضرت آخر وقت تک طالب علم ہی رہے۔ آخری خطوط جو وفات سے چند ہی روز قبل موصول ہوئے، علمی سوالات، علمی مسائل اور بعض اشکالات کے علمی جوابات سے بھرے ہوئے ہیں۔

مزاج میں انتہائی سادگی اور بے تکلفی تھی۔ اپنی بڑائی اور اپنے کمالات کا شاید انہیں وسوسہ بھی کہیں نہیں پیدا ہوا۔ اپنے سے چھوٹوں اور کہیں چھوٹوں کی بات کو اس التفات سے سنتے کہ وہ گویا ان کے ہمسر ہیں بلکہ بعض وقت تو اپنے چھوٹوں کو اتنا بڑھاتے کہ وہ بیچارے خود اپنے متعلق بڑی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتے...... بے تکلف و بے ساختہ طرزِ انشاء اور بے تصنع و پُر جوش رنگ تقریر دونوں اس سرشت و طینت کے پرتو تھے۔ تحریر و تقریر دونوں میں بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دریا اُبلا پڑ رہا ہے۔

طبیعت کے لحاظ سے اتنے وارستہ تھے کہ کھانے کو جو کچھ مل گیا بس اسی کو نعمت سمجھے۔ پہننے کو جو کچھ ملا، خوش ہو کر پہن لیا۔ رہنے سہنے کا جو ادنیٰ سا ادنیٰ معیار بھی وقت کے ساتھ نصیب ہو گیا، اسی میں مگن زندگی گزار دی۔ ایک زمانہ میں موٹر بھی رکھا لیکن اُن کے لیے موٹر اور اِکہ اور جھٹکا اور پیدل سب برابر ہی تھے...... بڑے رقیق القلب، بڑے رحم دل، بڑے نرم مزاج تھے۔ دوسرے سے اپنی بات منوانے کے فن سے واقف ہی نہ تھے۔ کسی ادنیٰ شخص کی بھی ناخوشی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اسے آزردہ دیکھ کر بلاوجہ اور خواہ مخواہ بھی اپنی غلطی تسلیم کرنے اور اسے منانے میں لگ جاتے۔

دوسروں کی امداد کا حوالہ دینے میں ذرا بھی بخیل اور تنگ نظر نہ تھے۔ ہر ادنیٰ امداد کا حوالہ بھی بڑی فیاضی اور خوش دلی سے دیتے اور اس کی تو میں شہادت آج اس دنیا میں بھی دیتا ہوں اور کل ان شاء اللہ حشر میں بھی دوں گا کہ اپنی ۳۶۔۳۷ سال کے تعلق و ارتباط کی لمبی مدّت میں ایک بار بھی اپنی بڑائی کا کوئی کلمہ ان کی زبان سے سننے میں نہ آیا۔ یہ سارے اوصاف معمولی نہیں غیر معمولی ہیں۔"[۱]

تصوف کے بڑے جاننے والوں میں سے تھے۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی سے عقیدت خصوصی بھی رکھتے تھے اور مناسبت طبعی و روحانی بھی، باوجود اس کے رسوم خانقاہی اور بدعات مشائخ کے ذرا بھی قائل نہ تھے اور وہم پرستوں اور ضعیف الاعتقادیوں کے نزدیک بھی نہیں گئے تھے۔ اکبر کی زبان میں۔

قائل میں تصوف کا ہوں اکبر لیکن
اُروح پرستی کو تصوف نہیں کہتے

ضابطہ سے بیعت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی سے تھی اور طبیعت پر مذاق توحید تمام تر غالب تھا۔ نماز میں قرآن مجید اس خوش الحانی اور درد و تاثر سے پڑھتے کہ جی چاہتا گھنٹوں اسے سنتے رہیے۔

میرے ہم سن تھے اور حضرت تھانویؒ اور مولانا محمد علی کی وفات کے بعد اب ملت کی زندہ ہستیوں میں انہیں کی ذات میرے لیے محبوب ترین تھی۔ ہم سن کی وفات میرے لیے بھی قریب موت کی ایک اور گھنٹی بجا دیتی ہے اور محبوب کے سفر آخرت نے میرے لیے بھی اس منزلِ مقصود میں ایک اور کشش و دلکشی پیدا کر دی ہے۔

صحت ادھر عرصہ سے بہت گر گئی تھی پھر بھی اتنی جلدی وقت موعود آ جانے کا ہم اہلِ غفلت کو خیال بھی نہ تھا۔ شوق لقاء رب پوری طرح رکھتے تھے جیسا کہ ایک درویشِ عارف کو رکھنا ہی چاہیے تھا اور جہاں تک دماغی قوت کے بس میں ہے خدا جانے کتنے اسرار غیب حل بھی کر چکے تھے۔ اصل حقائق کا انکشاف اب ہوا اور اس وقت ان شاء اللہ پوری طرح ابدی لذتوں اور سرمدی راحتوں کی آغوش میں ہوں گے۔ ابھی چند ہی سال کی بات ہے کہ جب گیلانی مولانا سے ملنے جانا ہوا تھا اور ایک بار دفعتہً زور سا چکرا سا گیا تھا۔ اِضطراراً میں نے مولانا کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور دل نے آناً فاناً خوشی اس کی محسوس کی تھی کہ اب نمازِ جنازہ مولانا ہی پڑھائیں گے۔ مشیت کو یہ منظور نہ ہوا اور اب لَو اس کی لگی ہوئی ہے کہ جس وقت اپنا وقتِ موعود آئے گا (جو یقیناً اب دور نہیں) تو اپنے مالک مولا سے اپنے ایک قدیم تباہ کار رفیق و نیاز مند کی شفاعت میں اصرار و مبالغہ کرنے والوں میں ایک نمایاں و ممتاز شخصیت مولانا ہی کی ہوگی۔ رخصت اے امام المسلمین! عارضی طور پر رخصت۔ ان شاء اللہ لنا ولکم العافیۃ وان شاء اللہ بکم لاحقون۔

☆......☆......☆

مضمون ختم ہو چکا تھا کہ مرحوم کے چھوٹے بھائی کا خط موصول ہوا کہ آج صبح بعد نماز بھائی صاحب بستر پر لیٹے ہی تھے اور میں بھی بغل کے پلنگ پر تھا کہ اچانک روح پرواز کر گئی۔ رات اس قدر خوش اور بشاش تھے کہ میں نے زندگی بھر اتنا خوش نہیں دیکھا تھا۔ خوب خوب گایا اور گویا رقص کیا جب ہی میرا ماتھا ٹھنکا تھا کہ بعد نمازِ فجر یہ حادثہ پیش آ گیا۔

جو دوسروں کو جنت و رحمت کی بشارتیں سناتا رہتا اور بقول شخصے مغفرت کے پروانے تقسیم کرتا رہتا تھا دنیا نے دیکھ لیا کہ خود اس کا انجام کتنا طرب آمیز ہوا! ناسوت کی آخری رات اس کے لیے ''شب برات'' تھی۔ وعدہ وصال کے قرب نے اسے رات بھر بیخود رکھا اور نمازِ فجر کے بعد بلاوا آیا تو پاس ہی لیٹے ہوئے بھائی کو ''سکرات'' کا پتہ چلنے نہ پایا۔ وَالنّاشطات نشطاً کے وعدہ کا تحقق اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا!

(در: صدقِ جدید (لکھنؤ) ۱۹۵۶ء، منقول از وفیاتِ ماجدی
مرتب عبدالقوی دریابادی، لکھنؤ ۱۹۷۸ء، ص ۷۶۔۸۰)

☆......☆......☆

Marfat.com

غلام محمد

تذکرۂ احسن

(یعنی حضرت مولانا گیلانی کی مختصر سوانح حیات)

سادات کا ایک کنبہ آج سے تقریباً دو صدی قبل عرب سے نکل کر ایران اور ایران سے گذر کر ہندوستان پہنچا اور صوبہ بہار کی زمین کو ان کے قدوم نے پُر بہار کر دیا۔[1] اسی قبیلہ کی ایک شاخ نے ضلع پٹنہ میں ایک مختصر سی بستی گیلانی کے نام سے بسائی۔ یہ حضرت سید مناظر احسن کے اجداد تھے۔[2]

وطن

مولانا رحمتہ اللہ علیہ ۱۸۹۲ء میں بمقام گیلانی پیدا ہوئے۔ وہ گیلانی جو برسہا برس گم نام رہی اور آج بھی وہاں ڈاکخانہ تک موجود نہیں مولانا کا مولد و مدفن بن کر اب شہرت اور تاریخی حیثیت حاصل کر گئی ہے۔ مولانا اپنے نام کے ساتھ اس وطنی نسبت کا اظہار فرماتے رہے جس پر بہت سوں کو نسبت باطنی (یعنی شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ سے نسبت) کے اظہار کا گمان ہوتا رہا جو صحیح نہ تھا۔

ابتدائی ماحول

مولانا نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں اس میں فارغ البالی اور علم پروری ہی ہم آغوش تھی۔ آپ کے والد ماجد ابوالخیر صاحب تو زیادہ تر زمینداری میں مشغول رہے مگر مولانا ابو نصر جو حقیقی چچا تھے علم و فضل اور شعر و سخن میں ایک مقام رکھتے تھے اور جد امجد مولانا سید محمد احسن تو اس اطراف کے جید عالم مشہور تھے۔

تعلیم

مولانا کی ابتدائی تعلیم اپنے چچا ہی کے زیر نگرانی ہوئی۔ پھر وہ ٹونک بھیج دیئے گئے جہاں تقریباً نو برس تک

Marfat.com

امام معقولات مولانا حکیم برکات احمد صاحب ٹونکیؒ کے حلقہ درس میں شامل رہے اور استاذ کی نظر میں امتیازی مقام حاصل کرلیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ اجمیر میں قیام فرمایا جہاں حکیم صاحب موصوف ہی کے شاگرد خاص مولانا معین الدین اجمیریؒ سے بھی مذاکراتی استفادہ فرمایا اور ان کے کمال کے اس قدر معترف ہوئے کہ ان کو بھی اپنا استاذ ہی سمجھتے رہے۔

اس کے بعد منقولات کی تکمیل کے لئے مولانا دارالعلوم دیوبند پہنچے اور دو سال میں سند فراغ حاصل فرمائی۔[۳] یہاں مولانا کو ان اساتذہ سے شرف تلمذ حاصل رہا جن پر مدرسہ کی عظمت ختم تھی یعنی شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ، علامہ انورشاہ کشمیریؒ وغیرہ۔

قیام دیوبند

ٹونک کی طرح دارالعلوم دیوبند میں بھی مولانا اپنی ذہانت اور شوق مطالعہ کی وجہ سے اساتذہ کے منظور نظر بن گئے تھے اور جوں ہی فارغ التحصیل ہوئے مسند درس ان کو عطا کی گئی اور دارالعلوم کے رسالہ ''القاسم'' کی ادارت بھی ان کے سپرد کردی گئی جو وہاں کا بڑا اعزاز تھا۔ مولانا ان دونوں حیثیتوں میں کامیاب رہے اور اہل نظر سے داد حاصل کی۔

جامعہ عثمانیہ سے تعلق

دیوبند میں شاید دو برس رہنے پائے تھے کہ جامعہ عثمانیہ نے ان کو اپنی طرف کھینچا جہاں پہنچ کر مولانا کے امتیازی جوہر خوب کھلے۔

بات یہ ہوئی کہ ان دنوں جامعہ عثمانیہ کی روز افزوں وسعت و ترقی کے ساتھ شعبہ دینیات میں ایک ٹھوس عالم کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ اتفاقاً ۱۹۱۹ء میں مولانا گیلانی کا حیدرآباد آنا ہوا اور یہاں علامہ حمیدالدین فراہی رحمتہ اللہ علیہ سے ان کی ملاقات ہوگئی۔ علامہ فراہیؒ اس جوہر قابل کو پہچان گئے۔ مولانا سے خواہش کی کہ وہ جامعہ میں لیکچرری کے لئے درخواست دیں مگر دیوبند سے مولانا کو اس قدر انس ہوگیا تھا کہ اس مشورہ کی تکمیل میں ان کو تامل ہی رہا۔ لیکن جب خود حضرات دیوبند نے اس مشورہ کی تائید فرمائی تو مولانا کو اس کی تعمیل کرنی پڑی اور ۱۹۲۰ء میں بحیثیت لیکچرر دینیات جامعہ عثمانیہ سے متعلق ہوگئے۔ پھر ریڈر بنے پروفیسر ہوئے اور بالآخر اس شعبہ کی صدارت کو کئی سال تک زینت بخش کر ۱۹۴۹ء میں ریٹائر ہوگئے۔ وہ شعبہ دینیات کی جان تھے اور شعبہ دینیات ان کا مجسم ارمان۔

مولانا گیلانی کی دقت فکر، وسعت نظر، علوم دینی میں ان کا تبحر اور مسائل حاضرہ پر ان کی دسترس ان کی علمی دیانت اور مجتہدانہ جرأت، ان کی بے لوث خدمت اور جامعہ سے ان کی شیفتگی نے ان کی شخصیت کو ہر دور کے طلباء اور ہر شعبہ کے اساتذہ میں وہ عظمت و محبوبیت عطا کردی تھی جو ان سے پہلے یا بعد کسی کو نہ مل سکی۔ ''یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا۔''

Marfat.com

واپسی وطن

مولانا رحمتہ اللہ علیہ کی وقعت یونیورسٹی سینٹ کی نظروں میں ایسی تھی کہ وہ ضابطہ کی میعاد ختم کرنے پر بھی اپنی خدمت سے سبکدوش نہ ہو سکتے تھے اور خود مولانا کو بھی جامعہ اور حیدر آباد سے گونا گوں وجوہ کی بنا پر اس درجہ الفت ہو گئی تھی کہ سرکاری تعلق ختم ہونے پر بھی وہ حیدر آباد سے مفارقت کا ارادہ نہ رکھتے تھے لیکن سقوط حیدر آباد نے دنیا ہی بدل ڈالی۔ نیا اقتدار اپنی اندھی عصبیت میں شعبہ دینیات کو برداشت نہ کر سکا۔ اس شعبہ کو فوراً ختم کر دیا گیا اور دنیا کی آنکھ میں خاک جھونکنے کے لیے نئے غیر دینی نصاب کے ساتھ ایک ''شعبہ اسلامیات'' قائم کیا گیا۔ اس صورتحال سے حضرت الاستاذ رحمتہ اللہ علیہ کے دل پر جو گذری ہوگی اس کا اندازہ کسی غیر کو کیا ہو سکتا ہے۔ لاچار ملازمت کے دن پورے ہوتے ہی افسردہ وشکستہ اپنے مولد گیلانی لوٹ گئے مگر جو زخم دل نے کھایا تھا وہ ناسور بنتا چلا گیا۔ اس کا اندازہ مولانا کے ان گرامی ناموں سے ہوتا ہے جو انہوں نے اپنے شاگردوں اور معتقدوں کو لکھے ہیں مثلاً خود مجھ ہی کو کس دردانگیز پیرایہ میں زمانہ سابق کی یاد دلائی ہے۔ لفظ لفظ سے مولانا کا قلبی تاثر اور جامعہ اور حیدر آباد سے جدائی کا رنج عیاں ہے۔

> ''حیدر آباد! آہ حیدر آباد! اسی سرزمین میں آپ بھی پلے پوسے گئے، لکھائے گئے، پڑھائے گئے اور یہ کورنصیب گو حیدر آباد میں پیدا تو نہیں ہوا لیکن میرے جسم میں بھی جو کچھ ہے حیدر آباد ہی کا ہے۔ اب بھی حیدر آباد ہی میرے سدرمق کا ذریعہ ہے۔ پھر اپنی محبوب تعلیم گاہ ہماری جامعہ عثمانیہ جس میں میرے دماغ نے دل نے آنکھیں کھولیں، اسی کے ماحول میں میری پرورش بھی ہوئی اور آپ کی بھی۔''

سفر آخرت

وطن کی قصباتی غیر علمی زندگی مولانا کے لئے سوہان روح بنی ہوئی تھی۔ بارہا تحریر فرمایا اور جگہ جگہ اس کا اظہار کیا ہے کہ:

> ''آج کل ایک گاؤں اور وہ بھی ایسے گاؤں میں آکر مقیم ہو گیا ہوں کہ جہاں شریف مسلمانوں کے صرف دو خاندان باقی رہ گئے ہیں۔ ان کے سوا عام ہنود اور عام طبقہ کے کچھ مسلمان ہیں۔ ان سے کسی قسم کی ایمانی گفتگو کا موقع ہی نہیں ملتا۔ نہ سننے کا نہ سنانے کا۔''

غرض دل کا سکون یوں ہی رخصت تھا کہ ایسے میں ایک روز گھر بھی لٹ گیا۔ ادھر مولانا کے اکلوتے فرزند پاکستان میں مقیم تھے اور ان کی طرف سے بھی ان کو کچھ اطمینان حاصل نہ تھا۔ غرض ضعیفی میں طرح طرح کے مصائب جھیلنے پڑے اور اس یقین سے جھیل لئے گئے کہ یہ اخروی راحتوں اور دائمی مسرتوں کا پیش خیمہ ہیں مگر صبر کے گھونٹ کی

تلخی کا طبعی اثر بہر حال ہو کر رہا۔ ۱۹۵۳ء کے اواخر سے قلبی دورے پڑنے لگے۔ تنفس کی شکایت پہلے ہی سے چلی آ رہی تھی۔ اب ڈاکٹروں نے لکھنے پڑھنے کی قطعی ممانعت کر دی اور یہی پرہیز مولانا کے لئے سخت ترین امتحان تھا چنانچہ وہ اس میں پورے نہ اُتر سکے۔ جتنا کچھ موقع مل گیا اور طاقت و ہمت ساتھ دے گئی اس میں ایک طول طویل تصنیف ''سوانح قاسمی'' مرتب فرما دی۔ کچھ مضامین تصوف کے مختلف موضوعات پر تحریر فرمائے اور تقریباً تین سالہ علالت کے بعد ۵ جون ۱۹۵۶ء والی شب کو ہشاش بشاش بستر خواب پر لیٹ کر چپ چاپ ''دارالسرور'' کو سدھار گئے اور اس خاموشی سے رخصت ہو گئے کہ پاس ہی چارپائی لگائے مولانا کے چہیتے بھائی مکارم احسن صاحب لیٹے تھے مگر وہ بھی اس کوچ کی آہٹ تک نہ پا سکے اور صبح جب انہوں نے اپنے محبوب بھائی کو جگانا چاہا تو خود اپنی غفلت پر کف افسوس مل کر رہ گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

کرامتِ مرگ

حضرت گیلانی کی حسّی کرامات زندگی میں خواہ نہ دیکھی گئی ہوں مگر اس عالم ناسوت سے جاتے ہوئے انہوں نے عقلیت کے ماروں اور روحانیت کے بے خبروں کے لئے عجیب کرشمہ دکھایا۔ مکارم احسن کا بیان[۴] ہے کہ مرض الموت میں اکثر یہ فرماتے تھے کہ جنت میں کوئی بوڑھا نہ جائے گا۔ ہر شخص جوان ہو کر جائے گا چنانچہ جیسے جیسے وہ اپنے وقت موعود سے قریب ہوتے جا رہے تھے ان میں جوش و مسرت بڑھتا جا رہا تھا یہاں تک کہ جس رات سفر آخرت طے تھا اس میں تو فرط و انبساط سے بے قابو ہوئے جا رہے تھے اور اسی عالم فرح میں بظاہر سو بھی گئے۔ صبح جب ان کی روح پرواز کر چکی تھی تو چہرہ پر گوشت تر و تازہ تھا۔ سفید داڑھی بالکل سیاہ تھی اور لاغر و نزار جسم گداز ہو گیا تھا۔ دیکھنے والوں کو یوں نظر آ رہا تھا جیسا کہ کوئی ۲۵ سالہ جوان لیٹا ہے۔ اس منظر کو مکارم احسن صاحب ہی نے نہیں دیکھا بلکہ ہر شریک جنازہ نے حیرت کی آنکھ سے دیکھا اور اس میں لذت روحانی محسوس کی۔ مولانا کے جنتی ہونے کی اس سے زیادہ واضح نشانی اور کیا ہو سکتی ہے، قدس سرہ۔

مرگ مجنوں پہ عقل گم ہے میرؔ
کیا دوانے نے موت پائی ہے

حلیہ

قد میانہ، نہ چھریرا نہ زیادہ گداز، رنگ سرخ و سفید، گول ماہتابی چہرہ، گرداگرد سفید داڑھی، نہ زیادہ گھنی نہ چھدری، فراخ پیشانی، روشن آنکھیں، شخصیت میں سادگی اور سادگی میں دلفریبی کا اثر تھا۔

بیٹھتے تو آنکھیں بند کئے اور سر کو جھکائے رکھتے تھے۔ مگر جب بولتے تو ان کی زبان سے پھول جھڑتے تھے

Marfat.com

اور ان کی شگفتگی اور ذکاوت مخاطب کو مسخر کر لیتی تھی۔ چلنے میں چھوٹے چھوٹے قدم تیز تیز اٹھاتے تھے ایسے کہ ایڑی برائے نام ٹکنے پاتی۔ زور پنجوں ہی پر پڑتا تھا اور گردن جھکائے تواضع کا متحرک پیکر نظر آتے تھے۔ ان کی ہر ادا میں سادگی کا حسن تھا۔

لباس

لباس کے معاملہ میں مولانا کسی خاص وضع کے پابند نہ تھے۔ سر پر سفید پنجگوشہ ٹوپی یا ترکی ٹوپی ہوتی تھی۔ کبھی کبھی صافہ بھی باندھ لیتے تھے۔ سیاہ عمامہ سب سے زیادہ زیب دیتا تھا۔ شیروانی کے اندر کبھی کرتہ ہوتا اور کبھی قمیص، پاجامہ البتہ ہمیشہ تنگ مہری کا پہنتے تھے جو ٹخنوں سے علانیہ اونچا ہوتا تھا۔ پاؤں میں سلیم شاہی جوتہ یا پمپ شوز جو بھی بے تکلف میسر آتا پہن لیتے تھے۔ کبھی کبھی شانہ پر چھوٹا سا مدنی رومال بھی ڈال لیتے تھے۔ عام طور پر لباس نہ زیادہ قیمتی ہوتا نہ بہت ہی معمولی بلکہ اوسط درجہ کا ہوتا تھا۔

ذہنی بناوٹ

مولانا قدس سرہ جیسا کہ عرض کیا جا چکا خیرآباد و دیوبند کے اکابر اساتذہ کے فیض یافتہ تھے۔ پھر جب حیدر آباد آئے تو یہاں علامہ حمید الدین فراہیؒ سے استفادہ فرمایا جو ایک خاص فکر قرآنی کے مالک تھے۔ ادھر جامعہ عثمانیہ کے تعلق سے مغربی افکار اور مغربی ذہن سے واقفیت ہی نہیں بلکہ اس سے گہرا ربط قائم ہو گیا تھا۔ ان گوناگوں موثرات میں مولانا کی جو ذہنی تشکیل ہوئی اور وہ واقعتہ ''ندوۃ العلمائی'' ؎ نہج کی تھی، چنانچہ جامد مولویت کو (جو مسائل حاضرہ سے بے خبر ہو) خود مولانا ئے مرحوم ناقص تصور فرماتے تھے اور لکچر اور گفتگو کے دوران میں جب مسائل حاضرہ پر مجتہدانہ روشنی ڈالتے تو ''بیچارے مولوی نے سمجھا ہی نہیں'' کا جملہ اکثر مسکراہٹ کے ساتھ ان کی زبان سے نکل جاتا تھا۔

مولانا کا حافظہ مثالی، ذہن بہت اخاذ، فکر بہت دور رس اور نظر بڑی مجتہدانہ تھی ان کی پہلی کتاب ''ابو ذر غفاریؓ'' کو دیکھ کر جو طالبعلمانہ دور کی یادگار ہے، عارف تھانویؒ (مولانا اشرف علی قدس سرہ) نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ اس کتاب کا مؤلف آئندہ چل کر محقق ہوگا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ قرآنی، حدیثی، فقہی، معاشی، سیاسی علوم میں مولانا نے تحقیق کے وہ جوہر دکھائے کہ خود ان کے استاد عالی مقام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ بھی ان کے کمال کے معترف ہو گئے تھے۔

تصنیف و تحریر

مگر ان سارے کمالات کے ساتھ طبیعت پر جذب کا اثر کچھ اس درجہ غالب تھا کہ مولانا کی کوئی تحریر کامل طور پر مرتب و مربوط نہیں ملتی۔ علوم کا ورود اس قدر زیادہ ہوتا تھا کہ متعلق و غیر متعلق کا انتخاب ان کے لئے محال ہو جاتا تھا۔

Marfat.com

وہ تیزی سے قلمرانی فرماتے۔ فقروں کی تقسیم اور عنوانات کے قیام کا ان کو مطلق شعور نہ رہتا تھا اور قلم روکنے سے پہلے ان کو خود اندازہ نہ ہوتا تھا کہ جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ مضمون ہوگا یا کتاب بن جائے گی اور اس سب کے باوجود وہ اپنے مسودات پر دوبارہ نظر کرنے کی زحمت بھی گوارہ نہ فرماتے تھے۔ ان مسودوں کی ترتیب تدوین ان کے معتمد علیہ شاگردوں اور عقیدت مندوں کے سپرد ہوتی تھی یا ناشروں کے رحم و کرم پر منحصر رہتی۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ''النبی الخاتم'' اور ''الدین القیم'' کو مولانا کے شاگرد رشید ڈاکٹر غلام دستگیر رشید (پروفیسر فارسی نظام کالج حیدر آباد دکن) نے مرتب فرمایا ہے۔ ''سورۂ کہف''، ''تدوین حدیث'' اور ''مقالات احسانی'' کی ترتیب کا شرف مجھے ملا ہے۔ ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی اور بعض کتابوں کی تنظیم ناشر کتب نے اپنے طور پر کروائی ہے البتہ مولانا کے ہزار ہا ہزار صفحات کے مسودوں کی تبییض ان کے ایک عزیز اور خاص شاگرد جناب مخدوم محی الدین صاحب بی اے (عثمانیہ) کیا کرتے تھے، جن کی زود نویسی اور خوشنویسی حیرت انگیز ہے۔

مولانا خود فرماتے تھے کہ ان کی کوئی تصنیف بھی باضابطہ ''تصنیفی پروگرام'' کے ماتحت انجام نہیں پائی۔ یہی ہوتا رہا کہ کسی نے کسی مضمون کی فرمائش کی۔ مولانا لکھنے بیٹھ گئے۔ جب لکھ چکے تو وہ مضمون، مضمون نہ رہا بلکہ کتاب تیار ہوگئی۔ چنانچہ ''نظام تعلیم و تربیت'' اور خود ''النبی الخاتم'' وغیرہ اسی قبیل کی تصنیفات ہیں۔ اس قسم کی کتابوں کے علاوہ دوسری صورت یہ ہوتی رہی کہ کالج کے لکچرز کی تیاری یا ایم اے اور پی ایچ۔ ڈی کے طلباء کے مقالات کی رہبری کے سلسلہ میں مختلف موضوعات پر جو معلومات فراہم کرنا پڑیں۔ وہ اتنی زیادہ اور قیمتی تھیں کہ ہر موضوع کی ایک مستقل کتاب خود بخود تیار ہوگئی۔ ''الدین القیم''، ''اسلامی معاشیات''، ''تدوین حدیث'' اور ''تدوین قرآن'' وغیرہ سب اسی نوعیت کی تالیفات ہیں۔

مذکورہ صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مولانا کی تصنیفات جدید طرز تصنیف کے معیار حسن کو نہیں پہنچتیں مگر بقول عہد حاضر کے مشہور محقق محترم ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے ان تصانیف کو اسلوب نگارش اور ربط تحریر کے لحاظ سے نہیں بلکہ نقطہ نظر کے لحاظ سے دیکھنا چاہیے کہ ان میں علوم و حقائق اور استنباط استخراج مسائل کا کس قدر گراں بہا ذخیرہ جمع ہوگیا ہے۔

علاوہ ازیں مولانا کی تحریر میں جہاں ربط و ترتیب کے حسن کی کمی ہے وہاں بعض خوبیاں ایسی بھی ہیں جو اس کمی کی تلافی کر جاتی ہیں مثلاً ہر تحریر میں بے ساختگی، زور استدلال اور سوز و گداز کچھ ایسا موجود ہے کہ اس کی وجہ سے ربط کلام ٹوٹنے پر بھی کتاب چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔

مولانا کی تصانیف میں سے یوں تو ہر تصنیف گراں بہا ہے مگر مندرجہ ذیل تصانیف کو امتیازی اہمیت حاصل ہے۔

☆......النبی الخاتم۔ الدین القیم۔ تدوین قرآن۔ تدوین حدیث۔ تدوین فقہ (غیر مطبوعہ)

☆......اسلامی معاشیات۔ امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی۔ تفسیر سورۂ کہف (غیر مطبوعہ)

مولانا کی کتابوں کے علاوہ ان کے بیسیوں مضامین ہیں جو اہمیت و افادیت کے اعتبار سے ان کتابوں سے

کسی طرح کم نہیں مثلاً ''الفرقان'' (لکھنؤ) کے مجدد الف ثانی نمبر اور شاہ ولی اللہ نمبر ہی ہیں جو مضامین آ گئے ہیں وہ مولانا کی جامعیت علمی اور ذہانت کی انمٹ یادگاریں ہیں۔ کاش! مولانا کے کل مضامین فنی تقسیم کے ساتھ مرتب ہوجائیں۔

تقریر

یوں تو مولانا کی تحریر میں بھی بڑا زور واثر ہے لیکن ان کی تقریر تو اس سے بھی کہیں زیادہ پُرسوز و جان گداز ہوتی تھی۔ تقریر کا رنگ واعظانہ نہیں بلکہ خطیبانہ ہوتا تھا۔ درمیان درمیان میں لطائف وظرائف اور منتخب اشعار اس موزونیت سے آ جاتے تھے کہ تقریر عوام کے لئے نہایت دلچسپ و دلنشین بن جاتی تھی ۔ حالانکہ نکتہ آفرینی اور علمی معلومات کا سیلاب تھا جو اُمڈا چلا آ تا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ تقریر میں وہ خود بیخود ہوجاتے تھے جس کے اثر سے سامعین پر بھی ایک کیف طاری ہوجاتا تھا۔

مولانا گیلانی اپنے دور میں حیدر آباد کے چار پانچ چوٹی کے مقررین میں شمار کیے جاتے تھے جب کہ حیدر آباد کا معیار خطابت ہندوستان کے عام معیار پر فوقیت رکھتا تھا۔

مولانا یوں تو تھے ہی ایک کامیاب خطیب مگر جب وہ اپنے مخاطبین میں غیرت ایمانی کو اُبھارنا چاہتے تو اُن کی خطابت بے مثل بن جاتی تھی۔ ایک واقعہ سے مولانا کے اس کمال کا اندازہ ہوگا۔

حیدر آباد ہی کا ذکر ہے کہ ایک مرتبہ ''میلاد النبیؐ'' کے جلسہ میں ہزاروں کے مجمع کو خطاب فرما رہے تھے۔ صدر نشین جلسہ لسان الامت قائد ملت نواب بہادر یار جنگ مرحوم تھے۔ مولانا کا عنوان جہاں تک یاد پڑتا ہے، ''والذین امنوا اشد حباً للہ'' تھا۔ وہ عوام کی غیرت ایمانی کو جگانا چاہتے تھے اس کے لئے انہوں نے عام مسلمانوں کے ضعف ایمانی پر اظہار افسوس کیا اور اس صورتحال کی تفصیل بیان فرمائی کہ کس طرح آج کا مسلمان ہر ادنیٰ سے ادنیٰ دنیوی فائدہ کی خاطر دین کے بڑے سے بڑے مطالبہ کو بلا تامل قربان کر دیتا ہے۔ اس کے بعد حق تعالیٰ کے انعام واحسان کی گراں باری اور اس کے حق محبت کا تذکرہ نہایت مؤثر انداز میں شروع کیا۔ یہاں تک کہ مولانا کی بند آنکھیں کھل کر پھٹی جا رہی تھیں، چہرہ سرخ ہوگیا تھا اور خشیت وجلال میں ڈوب کر مولانا نے ہاتھ اُٹھائے ہوئے فرمایا ''ایسے محسن کی یہ نا احسان شناسی؟'' اور اس کے ساتھ ہی غالبؔ کا یہ شعر استفہامیہ لہجہ میں ان کی زبان سے ادا ہوا۔

موج خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے
آستان یار سے اٹھ جائیں کیا؟

یوں محسوس ہورہا تھا گویا یہ شعر آج اسی موقع کے لئے لکھا گیا تھا۔ سارا مجمع غرق ندامت ہوگیا اور سب کی غیرت ایمانی دفعتہً چمک اٹھی۔

Marfat.com

شاعری

مولانا کی ذات میں شاعری کے سارے لوازم، وہبی ہوں یا کسبی، پوری طرح جمع تھے۔ شگفتگی بلکہ رنگینی ان کی طبیعت پر غالب تھی۔ ان کا احساس قوی، مشاہدہ عمیق اور قوت تخیل بلند تھی۔ عربی، اردو، فارسی اور ہندی زبان کے کلاسیکی کلام تک ان کی پوری طرح رسائی تھی۔ اس کا اندازہ اس وقت ہوتا تھا جب وہ مختلف زبانوں کے کلام کا موازنہ فرماتے اور ان کی باریکیوں کو اُجاگر کرتے تھے۔ ان چاروں زبانوں کے سینکڑوں منتخب اشعار ان کے نوک زبان تھے۔

مذکورہ جامعیت کی وجہ سے مولانا خود ایک اچھے شاعر بن گئے تھے۔ جوانی ہی سے سخن سنجی میں بھی داد حاصل کرتے رہے تھے۔ وہ بے تکلف فارسی، اردو، ہندی میں اپنے جذبات کو شاعری کے قالب موزوں میں ڈھال لیتے تھے۔ عربی میں بھی ممکن ہے کہ کچھ کہہ لیتے ہوں مگر میں اس سے واقف نہیں۔

شعر پڑھنے کا انداز بھی مولانا کا نہایت آفریں تھا۔ وہ ڈوب کر پڑھتے تھے اور سننے والوں کو محو کیفیت بنا جاتے تھے۔

خُلق

مولانا کے فضائل اخلاق میں ''بے نفسی'' کو سب سے نمایاں مقام حاصل تھا۔ دوسرے کی غلطی پر خود معافی خواہ ہو جانا، کوئی کھچنا چاہے تو خود بڑھ کر اس سے قریب ہو جانا، اپنے تسامح کا علم ہونے پر علی الاعلان سراپا معذرت بن جانا، اپنے دامن کو ہمیشہ طبقاتی ادارتی تعصب سے پاک وصاف رکھنا اور راہ حق میں تحسین و ملامت کی قطعاً پروانہ کرنا مولانا کا شعار تھا۔

اپنے معاصرین کی قدر کرنا اور ان کے کمال کا اعتراف کرنا وہ وصف عالی ہے جو ہر زمانہ میں نادر رہا ہے مگر مولانا میں یہ نادر وصف بدرجہ اتم موجود تھا۔

مولانا اپنے سارے علمی انہماک اور خشیت باطنی کے باوجود نہایت ظریف اور بذلہ سنج انسان تھے اور اسی لئے ہر محفل کو بآسانی اپنا لیتے اور سب کی نظروں میں محبوب بن جاتے تھے۔

مولانا کے قلب اطہر میں امت محمدیہ کی محبت اور اس پر شفقت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ مسلمانوں کی فلاح سے ایسے مسرور ہوتے تھے جیسے خود ان کو کوئی ذاتی فائدہ پہنچ گیا ہو۔ وہ مشرباً پکے حنفی تھے مگر یہ ان کے جذبہ شفقت کا اثر تھا کہ وہ زبانی بھی اور تحریراً بھی اس بات پر بہت زور دیتے تھے کہ موجودہ حالات میں علمائے کرام کو عام مسلمانوں کے لیے سہولت ہی کا پہلو اختیار کرنا چاہئے خواہ اس میں مسلک حنفیہ کو چھوڑ کر کسی اور مسلک کی اقتدا کیوں نہ کرنی پڑے؟ کیونکہ فقہاء کے اجتہاد کو بہر حال منصوصات کا درجہ حاصل نہیں ہے۔

طلباء پر مولانا کی شفقت، عہد قدیم کے اساتذہ کے لطف و کرم کی ایک زندہ یادگار تھی۔ ان کی شفقت افادہ

Marfat.com

علم ہی تک محدود نہ تھی بلکہ اپنے شاگردوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے وہ جامعہ کے اندر اور باہر ہمیشہ پوری قوت صرف فرماتے رہے بلکہ بعض صورتوں میں ان کے نجی معاملات مثلاً شادی بیاہ میں بھی مولانا کے پدرانہ الطاف برابر شامل رہتے تھے۔

مولانا کی تنخواہ معقول تھی۔ آخر زمانہ میں ہزار، بارہ سو تک پہنچ گئی تھی لیکن اس کا خاصہ حصہ اعزا و اقربا کی امداد اور عام دینی امور کی معاونت میں صرف فرماتے رہے۔ خود اپنی ذات کے لیے سادگی ہی پسند فرمائی تھی۔ ایک عاشقِ نبوی کا طرز اس کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔

عالمانہ امتیاز

تفصیل کا یہاں موقع نہیں، اشارتاً اتنا کہا جا سکتا ہے کہ مولانا گیلانی کو اپنے معاصر علماء دیو بند پر مندرجہ ذیل وجوہ سے تفوق حاصل تھا۔

۱۔ وہ درسیات کے ماہر معلم ہی نہیں بلکہ ایک ''صاحب نظر'' عالم تھے۔

۲۔ وہ تاریخ اور علوم عصریہ سے بھی راست واقفیت رکھتے تھے (مولانا نے زبان انگریزی کی استعداد اتنی فراہم کر لی تھی کہ بلا تکلف انگریزی کتب کا مطالعہ فرما لیتے تھے اسی لئے ان کی جدید معلومات اور ان پر تنقید معتبر بھی تھی)۔

۳۔ تحقیقات علمی میں ان کی نگاہ دیو بندی اور غیر دیو بندی نقطہ نظر کی پابندیوں سے آزاد تھی۔

۴۔ انہوں نے خدمت دینی کی جدید راہیں اختیار کیں اور مردانہ وار نکل گئے۔ اس سلسلہ میں وہ سلف کے اقوال یا طرز عمل کو رفیق طریق بنا کر پھر متاخرین کے اختلاف یا معاصرین کے ایراد و اعتراض کی پروانہ کرتے تھے۔

۵۔ انہوں نے قدیم لٹریچر کو جدید ضروریات کے لئے اس حسن و خوبی سے برتا کہ اس کی وجہ سے اسلامی محققین اور مجتہدین کی دھاک متجددین پر قائم ہوگئی اور یہ ذہنی مرعوبیت کا ایک مؤثر علاج ثابت ہوا۔

۶۔ وہ ادب کا ستھرا ذوق رکھتے تھے اس لئے وہ جدید زبان اور اسلوب بیان میں عالمانہ مضامین بخوبی پیش کرتے رہے۔

سیاست کے خار زار سے انہوں نے اپنا دامن بچائے رکھا۔ مگر ملت کی علمی اور دینی ضرورتوں سے بھی غافل نہیں رہے اور فی زمانہ جس جس محاذ پر علمی مورچوں کے قیام کی ضرورت تھی انہوں نے اپنی ساری جماعت کی طرف سے تن تنہا یہ خدمت انجام دی۔ چنانچہ ''تدوین حدیث''، ''تدوین قرآن'' اور ''تدوین فقہ'' ان کی باخبری اور علمی جہاد کی پائندہ یادگاریں ہیں۔

ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

عارفانہ منزلت

حضرت گیلانی جذب کی دولت اپنے ساتھ ہی لے آئے تھے۔ ان کے لڑکپن اور نوجوانی کے دیکھنے والوں کا

بیان ہے کہ ان پر ابتداء ہی سے وارفتگی کی شان طاری تھی جو بیساختہ ہونے کی وجہ سے نہایت دلفریب تھی۔ علمی اور فکری مقامات میں حضرت رحمتہ اللہ علیہ جس قدر ہوشیار تھے، عام امور میں اسی قدر بھولے بھالے اور معصومیت کا پیکر تھے۔ اپنے اس بھولے پن کیوجہ سے مالی نقصانات بھی اٹھائے مگر کھو کر بھی ہمیشہ بے فکر ہی رہے کیونکہ آنی و فانی چیزیں کبھی ان کی توجہ کا مرکز نہ بن سکی تھیں۔

حضرت گیلانی ''مجذوب سالک'' تھے[۴] یعنی جذب الٰہی کی دولت پہلے ملی تھی پھر مقامات سلوک طے فرمائے تھے اور اس غرض کے لئے دوران طالب علمی ہی میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ کے دست گرفتہ ہو گئے تھے مگر علمی مشاغل کی وجہ سے اس وقت روحانی استفادہ کا موقع نہ مل سکا اور حضرت شیخ الہند نے وفات پائی۔

حیدر آباد پہنچ کر اپنی اندرونی پیاس بجھانے کے لئے مولانا ایک بغدادی بزرگ نزیل حیدر آباد حضرت حبیب العیدروس رحمتہ اللہ علیہ سے تعلق جوڑا جو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ سے نسبی اور باطنی نسبت کے حامل تھے۔ یہاں مولانا نے قادریہ طریقہ میں تربیت پائی اور سلسلہ قادریہ میں خلافت سے سرفراز کیے گئے۔ راقم ہیچ مدان حضرت حبیب العیدروس کے احوال عالیہ سے واقف نہیں۔

حضرت گیلانی کو نسبت قادریہ میں رسوخ حاصل ہونے[۵] کے باوجود اطمینان کامل میسر نہ تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ وہ خالص چشتی لون کے حامل تھے۔ ''افروختن و سوختن و جامہ دریدن'' والی کیفیت ان کی ایک ایک بات سے عیاں اور بچپن ہی سے نمایاں تھی۔ چنانچہ بالآخر ہادی مطلق جل شانہ نے ان کو ایک چشتی بزرگ حضرت مولانا محمد حسین صاحبؒ حیدر آبادی[۶] کی خدمت میں پہنچایا جو شیخ محی الدین ابن عربی کے حالاً و قالاً ترجمان تھے اور شیخ اکبر ہی کی طرح حضرت ممدوح کا قال بھی دراصل 'نبود بر سر آتش میسرم کہ بخوشم' والے حال ہی کا ایک اثر تھا اسی لئے ان کی صحبت میں بیٹھ کر اٹھنے والا ایمان وایقان اور رحمت حق کی امید سے مالا مال ہو جاتا تھا۔[۷]

حضرت گیلانی کو یہاں مناسبت تامہ مل گئی اور شیخ عالی مقام کی توجہات خصوصی ان کے شامل حال رہیں یہاں تک کہ وہ اس بارگاہ فیض سے بھی خلافت کا شرف پا گئے اور تادم آخر اسی رنگ میں مسرور و مطمئن رہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ حضرت مولانا محمد حسین صاحبؒ اور حضرت گیلانی پر اس دارفانی سے رخصت ہوتے وقت مسرت اور شوق الٰہی کا ایک ہی حال طاری رہا جو شیخ و مرید کی یک رنگی کی کھلی دلیل ہے۔ اعلیٰ اللہ مقامھما۔[۸]

حضرت گیلانی دوہری خلافت رکھنے اور خود صاحب معرفت ہونے کے باوجود مسند ارشاد کی ذمہ داریوں سے ہمیشہ گریزاں ہی رہے اور جہاں تک میرے علم میں ہے کبھی کسی کو مرید نہیں کیا۔ ورنہ وہ اگر اس طرف توجہ فرماتے تو فیوض علمی کی طرح فیضان روحانی کا بھی دریا بہہ نکلتا مگر جو مقدر نہ تھا وہ ہو کیسے جاتا۔ حضرت گیلانی نے طالب علمانہ حیثیت ہی اپنے لئے تجویز فرمائی تھی۔ اسی نقاب میں وہ کمالات باطنی کو چھپائے رہے اور اسی اخفا کے ساتھ اس دنیا سے پردہ کر گئے مگر

''در سینہ ہائے مردم عارف مزار اوست''

Marfat.com

حواشی

۱۔ یہ روایت میں نے حضرت علامہ سید سلیمان ندوی سے سنی ہے۔

۲۔ حضرت گیلانی مجھ سے فرماتے تھے کہ ''ہمارا خاندان اور سید صاحب کا خاندان ایک ہی سلسلہ کی دو شاخیں ہیں۔''

۳۔ اس کی کچھ تفصیل خود مولانا کے قلم سے ''سوانح قاسمی'' کی جلد اول میں آ گئی ہے۔

۴۔ صدق جدید۔ مورخہ ۲۱ ستمبر ۱۹۵۶ء

۵۔ مولانا کی کتاب ''نظام تعلیم و تربیت'' پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندوی نے ''معارف'' میں یہ لکھا تھا کہ مولانا کی تعلیم گو دیوبند میں ہوئی مگر ان کا ذہن ندوۃ العلمائی ہے۔ اس پر مدیر ''برہان'' (دہلی) نے ایک اختلافی شذرہ لکھا تھا۔ ایک روز جب میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا تو ''برہان'' کا یہ شمارہ لیے ہوئے مولانا باہر نکل آئے۔ فرمانے لگے۔ ''آپ نے اس مہینے کا ''برہان'' دیکھا؟''

عرض کیا کہ ''جی ہاں۔'' مولانا سعید احمد نے حضرت والا (سید سلیمان ندوی) کے اس جملے پر تنقید کی ہے کہ مولانا کا ذہن ندوۃ العلمائی ہے۔''

مسکراتے ہوئے فرمانے لگے۔ ''جی ہاں میں یہی دکھانا چاہتا ہوں۔ بیچارے سعید احمد صاحب نے سید صاحب کے مطلب کو سمجھا ہی نہیں خواہ مخواہ ان کے جملے پر تنقید کر دی۔ ہمارے سید صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہی ٹھیک ہے۔'' (غ۔م)

۶۔ جو دکن کے مشہور عصر بزرگ شاہ کمال اللہ صاحب المعروف بہ ''مچھلی والے شاہ صاحب'' قدس سرہٗ کے خلیفہ تھے۔

۷۔ یہ اہلِ دل حضرات کا تاثر ہے۔ ویسے بحمد اللہ دو چار حاضریوں کی سعادت مجھ کو بھی ملی ہے اور جو سنا تھا اس کو محسوس پایا۔

۸۔ حضرت مولانا محمد حسین صاحب کا آخری حال جو وثوق سے سنا ہے وہ یہ ہے کہ بیمار تھے اور صاحبِ فراش۔ دوا پینے کا وقت آیا تو دوا حاضر کر دی گئی۔ فوراً اُٹھ بیٹھے۔ فرمایا کہ:

''تدبیر امر شرعی ہے، اس کا احترام ضروری ہے۔''

یہ کہتے ہوئے دوا پی لی اور ہنستے ہوئے غلبہ شوق میں ارشاد ہوا۔

''مگر بھائی اب تو ہم چلے''

اس جملہ کے ساتھ منہ پر چادر کھینچتے ہوئے بس لیٹے ہی تھے کہ زبانِ شوق سے ایک مرتبہ

"اشھدان لا الہ الا اللہ"

کا نعرۂ عاشقانہ بلند ہوا اور جانِ مشتاق محبوب ازل کے حضور پہنچ چکی تھی۔ رحمۃ اللہ علیہ

حضرت ممدوح ہمیشہ نشہ توحید میں چُور رہتے تھے۔ مولانا گیلانیؒ ازراہ مبالغہ مزاحاً فرمایا کرتے تھے کہ حضرت ہفتہ بھر لا الہ الا اللہ کی رٹ لگاتے ہیں تب کہیں ایک مرتبہ محمدؐ رسول اللہ کہنے کی نوبت آتی ہے۔

حالت یہ تھی کہ بیت الخلاء میں جاتے ہوئے حضرت ممدوح اپنی زبان کو دانتوں میں دبا لیتے تھے۔ پھر بھی کبھی کبھی بے ساختہ ''اللہ'' کی صدا بلند ہو ہی جاتی تھی۔ سچ کہا ایک شاعر عارف نے۔

کوشش ضبط محبت میں ہیں کتنے مجبور
کوئی دل چیر کے دیکھے ترے دیوانوں کے

(غ۔م)

(در: مقالات احسانی از مولانا مناظر احسن گیلانی، کراچی ۱۹۵۹ء، مقدمہ، ص ا۔۱۴)

☆......☆......☆

Marfat.com

مظفر گیلانی

مولانا مناظر احسن گیلانی......حیات اور شخصیت

مولانا مناظر احسن گیلانی کے آباؤ اجداد موضع ''مانے'' علاقہ شیخ پورہ ضلع مونگیر کے سادات میں سے تھے۔ یہاں سادات کی بارہ بستیاں ہیں جن کو بارہ گانواں کہا جاتا ہے۔ یہ سادات حضرت سید احمد جاجنیریؒ کی اولاد ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بزرگ بغداد سے ہندوستان آئے اور حکومت دہلی نے ان کی برگزیدہ شخصیت کے پیش نظر علاقہ لکھی سرائے کے ضلع مونگیر کے ایک گاؤں ندیانواں میں خانقاہ کے لئے انہیں جگہ دی اور اردگرد چند مواضعات بھی جاگیر کے طور پر عطا کیے۔ حضرت کی تبلیغی مہم اس علاقہ میں نہایت کامیاب رہی۔ اللہ نے آپ کو کافی اولاد بھی دی اور اور بارہ گانواں میں ان کی نسل کے لوگ تاہنوز آباد ہیں۔ اسی بارہ گانواں میں موضع ''مانے'' بھی واقع ہے۔

مولانا گیلانی کا نسب نامہ جس قدر معلوم ہوسکا، یہ ہے:

مناظر احسن ولد حافظ ابوالخیر ولد محمد احسن ولد میر شجاعت علی ولد میر شفاعت علی۔

میر شجاعت علی اور میر شفاعت علی تک یہ خاندان ''مانے'' میں مقیم رہا۔ پیشہ کاشت کاری اور زمین داری تھا۔ میر شجاعت علی کی پہلی شادی موضع چواڑہ (نزد شیخ پورہ ضلع مونگیر) میں ہوئی تھی۔ اہلیہ کی وفات کے بعد ان کی دوسری شادی موضع گیلانی ضلع پٹنہ (موجود ضلع نالندہ) میں بی بی حیاتن سے ہوئی جو گیلانی کے ایک زمیندار کی دختر تھیں۔ میر شجاعت علی محل اُولی کی اولاد کو اپنی ساری جائداد چواڑہ میں دے کر خود گیلانی باشی ہو گئے۔ جہاں ان کی اہلیہ کی کافی جائداد اور زمین داری تھی۔ بی بی حیاتن کا نسب نامہ جہاں تک معلوم ہوسکا، یہ ہے:

مسماۃ حیاتن بنت بی بی مُنا بنت بی بی قبولن ولد محمد عبداللہ ولد میر مقیم۔

بقرینہ غالب سینکڑوں سال قبل اس قصبہ (گیلانی) میں بودھ مذہب والے آباد تھے، جس کی ایک بہت بڑی علامت گاؤں سے پورب ایک عظیم تالاب ہے۔ اس کا رقبہ ۱۲۸ ایکڑ ۶۵ ڈسمل ہے۔ بودھ مذہب والوں کی آبادی میں تالاب کا ہونا ضروری تھا۔ اب اس کی جگہ پر بجلی گھر، مچھلی پالنے کا تالاب، چیڑاری اور قبرستان ہے۔ اس کے علاوہ بستی کے شمال میں ایک چھوٹی سی پختہ عمارت ہے جو بودھ منڈف کے نام سے مشہور ہے۔ پرانے کاغذات سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت اس قصبہ کا نام گوند پور تھا۔ ۱۲۵۶ء/۶۷۶ھ سے یہاں مسلمانوں کی آبادی کے نشانات ملتے ہیں۔ ایران کے خطہ گیلان سے ایک بزرگ سید ندیم الدین گیلانی اپنے صاحبزادہ سید شہاب الدین گیلانی اور فرزندزادہ سید منہاج

Marfat.com

الدین گیلانی کے ہمراہ دہلی تشریف لائے۔ سید ندیم الدین دہلی میں مدفون ہیں۔ سید شہاب الدین دہلی میں مخدوم شرف الدین یحییٰ منیریؒ کی عظمت کا چرچا سن کر اپنے صاحبزادہ منہاج الدین کے ہمراہ بہار شریف تشریف لائے اور وہیں مدفون ہیں۔ بہار شریف جو ضلع نالندہ کا ہیڈ کوارٹر ہے موضع گیلانی سے ۱۳ میل پچھم واقع ہے۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد سید منہاج الدین کا دل وہاں سے اچاٹ ہو گیا۔ اکثر قرب و جوار میں سیر و سیاحت کے لئے نکل جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جب وہ گوند پور پہنچے تو یہ جگہ ان کو بہت پسند آئی۔ اس لئے اپنے اہل و عیال کے ساتھ یہیں منتقل ہو گئے اور اس بستی کا نام انہوں نے حضرت سیدنا شیخ عبد القادر گیلانی کے نام نامی سے سعادت اور برکت حاصل کرنے کے لئے محی الدین پور گیلانی رکھا۔ ۱۲۵۶ء/ ۶۷۶ھ سے آج تک قدیم سرکاری کاغذات میں اس گاؤں کا یہی نام درج ہے۔ اسی انتساب گرامی کا اثر و فیض ہے کہ یہ بستی واسطی زیدی سادات کرام کا وطن مالوف بنی رہی اور اسی وقت سے یہاں مختلف علماء، حفاظ، ادباء، شعرا و اطبا برابر پیدا ہوتے رہے۔ سید منہاج الدین کی شادی موضع ڈمرانواں ضلع نالندہ کے زمین دار خواجہ اعلیٰ (برادر خورد خواجہ لاہوری لاولد) کی اکلوتی لڑکی بی بی خدیجہ سے ہوئی تھی۔ خواجہ اعلیٰ اور خواجہ لاوری دونوں بھائیوں کا مزار لاہوری بگہہ (ڈمرانواں) کے قریب واقع ہے۔ یہ دونوں اپنے زمانہ کے مشہور بزرگ تھے۔ اب بھی لوگ ان کے مزار پر چراغاں کرتے ہیں۔ سید منہاج الدین شادی کے کچھ دنوں بعد گیلانی سے ڈمرانواں منتقل ہو گئے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد ان کے خاندان کے ایک فرد محمد عمر (ولد سید مصاحب علی ولد سید کرم علی ولد سید محب اللہ ولد سید مقیم ولد سید محمد شریف ولد سید محمد شاہ ولد سید بدیع الدین ولد سید منہاج الدین) پھر گیلانی لوٹ آئے۔ سادات گیلانی کی ایک شاخ آپ ہی کی اولاد سے تعلق رکھتی ہے۔

پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ سید احمد جاجنیریؒ کی نسل سے بارہ گانواں آباد ہوا۔ انہیں خانوادوں میں سے ایک بزرگ میر مقیم (سید مقیم نہیں) جو اکساری ضلع مونگیر کے رہنے والے تھے، ملازمت کے سلسلے میں گیلان تشریف لائے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ سادات گیلانی کی دوسری شاخ میر مقیم صاحب کی اولاد سے آباد ہے۔ جیسا پہلے کہا جاچکا ہے شفاعت علی تک یہ خاندان مانے میں رہا۔ ان کے صاحب زادے شجاعت علی کی دوسری شادی محل اُولیٰ کی وفات کے بعد گیلانی ہیں، بی بی حیاتن سے ہوئی۔ اور اس کے بعد میر شجاعت علی مانے سے گیلانی منتقل ہو گئے۔ ان کی دوسری محل سے دو لڑکے تولد ہوئے۔ مولانا محمد احسن اور مولوی محمد محسن (وکیل)۔ مولانا محمد احسن کی شادی گیلانی ہی میں بی بی آمنہ بنت امام بخش ولد یتیم اللہ ولد میر مقیم سے ہوئی تھی۔ مولانا احسن کے تین لڑکے ہوئے۔ سید ابوظفر، سید ابونصر اور سید ابو الخیر۔ سید ابوظفر کی جوانی میں موت ہو گئی۔ سید ابونصر جو حافظ، عالم اور حکیم تھے لاولد مرے۔ راقم نے ان دونوں بھائیوں کو دیکھا تھا۔ حافظ ابو الخیر کے تین لڑکے جن میں ایک مولانا گیلانی اور دو ان سے چھوٹے جن میں ایک کا نام مکارم احسن اور دوسرے کا مظہر احسن تھا۔ ان دونوں کا بھی اب انتقال ہو چکا ہے۔ ان کے علاوہ ابو الخیر صاحب کی تین لڑکیاں بھی تھیں۔ بی بی ام ہانی، بی بی صفیہ اور بی بی ہاجرہ۔ بی بی ام ہانی کی شادی مظاہر حسین ساکن موضع کٹنی کول سے ہوئی۔ بی بی صفیہ کی شادی مولانا لطف اللہ ولد مولانا محمد علی مونگیریؒ سے ہوئی، جو مولانا منت اللہ صاحب کے بڑے بھائی تھے اور تیسری لڑکی کی شادی گیلانی ہی میں مولانا عبد العزیز سے ہوئی، جو اپنے وقت کے ایک برگزیدہ شاعر اور

Marfat.com

قاری تھے۔ انہیں خان بہادر کا بھی خطاب ملا اور آنریری مجسٹریٹ کا بھی عہدہ حاصل ہوا۔ گیلانی سے ہجرت کر کے صاحب گنج چلے گئے تھے، جہاں وہ قریب چالیس سال مسجد ہی میں عزلت نشیں رہے اور وہیں انتقال بھی کیا۔

مولانا گیلانی ۱۸۹۲ء میں اپنے ننیہال موضع استھانواں ضلع نالندہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا تاریخی نام ''مناظر احسن'' ہے (۱۳۱۰ھ)۔ ان کا انتقال گیلانی ہی میں ۵ جون ۱۹۵۶ء کو ہوا۔ ان کے چچا مولوی ابونصر صاحب نے مولانا گیلانی کی تعلیم و تربیت صغرسنی سے ہی اپنے ذمہ لے لی تھی۔ اگرچہ اس وقت انگریزی تعلیم کا چرچا عام ہو چکا تھا لیکن چچا نے خاندانی روایت کے مطابق انہیں اسکول اور کالج کی تعلیم سے مبرا رکھا۔ مولوی ابونصر خود بھی حکیم اور عالم تھے اور منطق و فلسفہ میں اپنے والد مولانا محمد احسن کے نقش قدم پر گامزن تھے۔ اس وقت گیلانی میں مولانا احسن کا مدرسہ ہندوستان میں کافی مشہور تھا۔ مولانا ابوالحسنات ندوی نے جو کتاب ہندوستان کے مدرسوں پر لکھی ہے، اس میں مدرسے کا بھی ذکر ہے۔ خود مولانا گیلانی نے اپنی کتاب ''نظام تعلیم و تربیت'' میں لکھا ہے:

> ''چونکہ یہ میرے گھر کی بات ہے اس لئے ...... میں بتا سکتا ہوں کہ (اس مدرسے) کی اصل حقیقت کیا تھی۔ یہ صحیح ہے کہ مولانا احسن گیلانی مرحوم نے اس گاؤں میں تقریباً تیس چالیس سال تک درس و تدریس کا بازار گرم رکھا۔ نہ صرف بہار بلکہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں حتیٰ کہ سرحد و کابل تک کے طلبہ کی ایک اچھی خاصی تعداد مولانا سے پڑھنے کے لئے اس گاؤں میں آئی۔ ہزارہ ضلع کے ایک بزرگ مولانا عبداللہ پنجابی وطناً گیلانی نزیلاً، تو پڑھنے کے لئے آئے اور اسی گاؤں میں متوطن ہو کر اپنے وعظ و تلقین، ارشاد و ہدایت، درس و تدریس، افتاء و تصنیف کا سلسلہ نصف صدی کے قریب جاری رکھا۔ وہیں کی خاک میں آسودہ ہوئے اور ایک وہی کیا بہار کے بعض جلیل القدر علماء مثلاً مولانا رفیع الدین مرحوم رئیس شکرانواں، مولانا عبد السلام بھاگلپوری، مولانا حکیم دائم علی ٹونکی، مولانا اسماعیل رمضان پوری وغیرہم بیسوں مشاہیر گیلانی کی اس درس گاہ سے اٹھے...... مولانا عبداللہ نے اضلاع پٹنہ اور مونگیر خصوصاً ضلع مونگیر میں جو کام انجام دیا، وہ یادگار رہے گا۔ خدا جانے کتنے مسلمانوں کے گھر سے بت نکلوائے اور شراب و تاڑی سے لوگوں کو تائب کیا۔ آخر میں تو آپ کے دست حق پر ضلع مونگیر کے ایک راجا (آف مرجا) مسلمان بھی ہو گئے جن کا خاندانی جموئی سب ڈویژن کے مسلمان رئیسوں میں بحمد للہ اس وقت امتیاز رکھتا ہے۔ ''عقیدہ محمدیہ'' عربی میں آپ کی اچھی کتاب ہے۔ اس کے سوا اردو میں بھی چند رسالے ہیں۔''

راقم نے مولانا عبداللہ صاحب کو جو ''ملا صاحب'' کے نام سے مشہور تھے، دیکھا نہیں تھا۔ لیکن انہوں ہی نے خاکسار کا تاریخی نام ''سید ابوالمظفر'' رکھا تھا۔ مولانا گیلانی۔ اپنی مثنوی ''خواب وطن'' میں جس کا ذکر آگے آ رہا ہے، ''ملا صاحب'' کے متعلق فرماتے ہیں۔

Marfat.com

ملا صاحب کا اف وہ دارالعلم
جہاں باطل کے ٹوٹتے تھے طلسم

جو درختوں کے جھنڈ میں ہے کھڑا
آہ کیا نقشہ اس کا ہے بگڑا

نہ کتابیں نہ درس و افتا ہے
صرف عبد العلی کا پنجڑا ہے

یہ عبدالعلی ملا صاحب کے سب سے چھوٹے لڑکے تھے۔ہم سے عمر میں دس بارہ سال بڑے ہوں گے۔ان کے اور بھائی (دو یا تین) مولانا عبدالرحمٰن، مولانا عبدالحنان تو سسرال باشی ہوگئے تھے لیکن عبدالعلی گیلانی ہی میں رہے۔پاکستان بننے کے بعد مشرقی پاکستان ہجرت کر گئے تھے اور پھر بنگلہ دیشی ہنگاموں میں مع اپنے اہل وعیال شہید کردیئے گئے۔جب تک گیلانی میں رہے پرندوں خاص کر بٹیر بازی سے کافی دلچسپی لیتے تھے۔ پڑھے لکھے بھی کچھ ایسے نہ تھے۔مولانا گیلانی نے اپنے آخری شعر میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ایک عجیب وغریب واقعہ لکھا ہے، جس کا نقل کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے:

''مولانا محمد احسن گیلانی جن کے مدرسہ گیلانی کا ذکر کسی موقع پر کیا گیا ہے، ایسے معتبر ذرائع سے یہ خبر مجھ تک پہنچی ہے جس کا انکار مشکل ہے، قیام فرماتے تھے۔واقعہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ مولانا گیلانی (مولانا احسن گیلانی) جب لکھنؤ کی ایک مسجد میں جو دبیر الدولہ کی مسجد کے نام سے موسوم ہے، قیام فرماتے تھے۔اتفاقاً ان ہی دنوں میں بادشاہ وقت غالباً واجد علی شاہ کا عتاب کسی وجہ سے دبیر الدولہ پر نازل ہوا۔قید کردیئے گئے۔خاندان پر مصیبت ٹوٹ پڑی۔اس موقع پر مولانا نے قدیم آشنائی کا خیال کر کے دبیر الدولہ کے اہل خاندان کے لئے ممکنہ امداد بہم پہنچائی۔ چند ہی دن کے بعد عتاب شاہی کا ازالہ ہوا۔دبیر الدولہ جیل سے رہا ہو کر گھر آیا تو مولانا کی ہمدردی کی خبر ہوئی۔ بہت متاثر ہوا اور ڈیڑھ لاکھ کی رقم جو اس وقت اس کے پاس موجود تھی اس کو لے کر مولانا کے پاس حاضر ہوا۔ پہلے تو مولانا نے رسمی لیت ولعل سے کام لیا لیکن وہ بضد تھا کہ اس کی حقیر رقم کو قبول کیا جائے۔آخر جان چھڑانے کے لئے مولانا نے فرمایا''آج شام ہوگئی ہے کل صبح لینے دینے کا نظم کروں گا۔'' شب درمیان تھی۔اسی سے نفع اُٹھا کر لکھنؤ کو ہمیشہ کے لئے خیر باد فرمادیا گیا کہ دبیر الدولہ کے اس روپیہ سے نجات حاصل ہو۔اپنی کتابیں جن کے سوا ان کے پاس کوئی دوسرا سرمایہ نہ تھا، مولوی جان علی صاحب گیلانی جو بعد میں مراد آباد میں متوطن ہوکر وہیں متوفی ہوئے، ان کے حوالے کر کے سیدھے رام پور تشریف لے گئے اور دبیر الدولہ کو

اس کا پتہ چلنے نہ دیا کہ بہار کا وہ مولوی کہاں غائب ہوگیا۔ ساری عمر گیلانی ایسے کوردہ گاؤں میں گذاردی۔''

مولوی ابونصر نے بھی اپنے بھتیجے کو گیلانی ہی میں رکھ کر عربی، فارسی، منطق، فلسفہ اور حدیث کی تعلیم دلوائی۔ مولانا گیلانی چوں کہ لڑکپن ہی سے نہایت ذہین تھے اس لئے مولوی ابونصر کی آرزو تھی کہ ان کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلوائی جائے۔ خوش قسمتی سے اس وقت مولانا احسن کے ایک شاگرد حکیم دائم علی صاحب ریاست ٹونک میں سرکاری طبیب تھے اور انہوں نے منطق اور فلسفہ کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔ ان کے فرزند ارجمند حکیم برکات احمد صاحب نے مدرسہ کو چار چاند لگایا۔ شاید اس وقت فلسفہ اور منطق میں کوئی ہندوستان میں ان کا ثانی نہیں تھا۔ مولانا گیلانی کی تعلیم کے سلسلہ میں مولوی ابونصر صاحب کی نظر مولانا برکات احمد پر پڑی اور اپنے بھتیجے کو مولانا برکات احمد صاحب کے پاس راجپوتانہ کی دور دراز ریاست ٹونک میں چھوڑ آئے۔ اس وقت مولانا گیلانی کی عمر تیرہ سال کی تھی۔ وہ تقریباً سات سال تک ٹونک میں تعلیم پاتے رہے۔ قیام ٹونک کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ 1911ء میں اٹلی نے طرابلس پر اچانک حملہ کردیا اور ساری دنیائے اسلام چیخ اٹھی۔ گو مولانا گیلانی اس وقت طالب علم تھے لیکن بڑے جوش و خروش کے ساتھ اس تحریک میں کود پڑے اور اسی جوش میں پیدل ٹونک سے اجمیر چلے گئے اور ڈاکٹر اقبال کے ''شکوہ'' کے بالمثل ایک نظم ''شکوہ خواجہ'' خواجہ صاحب کے مزار پر پڑھ کر سنائی، جس کو ان کے احباب نے بدایوں پریس میں چھپوا کر ہزاروں کی تعداد میں تقسیم کرایا۔ چونکہ ''شکوہ خواجہ'' میں انگریزی حکومت کے خلاف بھی کئی شعر تھے اس لئے حکومت نے اس کی سب کاپیاں ضبط کرلیں اور مولانا کے نام وارنٹ گرفتاری جاری کردیا۔ چونکہ انگریزی حکومت کے اندر گرفتاری کا خطرہ ہمیشہ لگا ہوا تھا اس لئے مولانا کسی طرح حیدرآباد پہنچے اور ایک عزیز کے یہاں روپوش ہوگئے اور تعلیم کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ کون جانتا تھا کہ مولانا کا یہ قیام حیدرآباد ان کے آئندہ قریب تیس سال کی مستقل سکونت کا پیشہ خیمہ ثابت ہوگا۔ اسی دوران میں مولانا کی حیدرآباد کے ارباب علم سے رسم وراہ پیدا ہوگئی اور ان کے علم کی شہرت پھیلنے لگی۔ اسی طرح مولانا کی باریابی مہاراجہ کشن پرشاد وزیر اعظم سرکار نظام کے یہاں بھی ہوگئی۔ مہاراجہ نے ان کو حیدرآباد میں روکنا چاہا لیکن یہ راضی نہ ہوئے اور یہ عذر پیش کیا کہ انہیں دیوبند جاکر علم حدیث کی تکمیل کرنی تھی جسے سن کر مہاراجہ نے بھی حیدرآباد چھوڑنے کی اجازت دے دی اور راہ خرچ وغیرہ کا انتظام بھی کردیا۔

حیدرآباد سے مولانا پہلے اپنے وطن گیلانی آئے اور چچا سے دیوبند جانے کی اجازت مانگی۔ وہ راضی تو ہوگئے لیکن مشکل یہ تھی کہ ٹونک اور دیوبند کے مدرسوں میں زمانے سے رقابت چلی آرہی تھی۔ پھر بھی مولانا بلا تامل دیوبند چلے گئے اور وہاں پہنچ کر صاف صاف کہہ دیا کہ وہ مولانا برکات احمد منطقی اور فلسفی کے شاگرد ہیں۔ علم حدیث حاصل کرنے کی غرض سے دیوبند آئے ہیں۔ دیوبند کا مدرسہ وہاں کے اساتذہ خصوصاً مولانا انور شاہ کاشمیری اور حضرت مولانا محمود الحسن صاحب شیخ الہند کی وجہ سے تمام دنیائے اسلام میں مشہور تھا۔ مولانا گیلانی ان دونوں بزرگوں کے درس حدیث میں شامل ہوگئے۔

کچھ دنوں کے بعد ان کے اساتذہ نے محسوس کیا کہ ان کا یہ شاگرد غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ مضمون نگار اور انشا پرداز ہونے کے علاوہ اچھا مقرر اور شاعر بھی ہے۔ اس لئے تعلیم کے ساتھ ان کے لائق ان سے کوئی کام بھی لینے کا فیصلہ کیا۔

چنانچہ شیخ الہند نے پہلے تو مولانا گیلانی کو مرید کیا اور دو رسالے ''القاسم'' اور ''الرشید'' اس وقت دیوبند سے نکلتے تھے، ان کی ادارت سپرد کی۔ اس کے لئے مبلغ تیس روپیہ ماہوار تنخواہ بھی مقرر کر دی گئی۔

ایک سال تک مولانا گیلانی دونوں رسالوں کی ادارت سنبھالے رہے۔ اسی زمانے میں انہوں نے اپنی پہلی کتاب ''ابوذر غفاریؓ'' تصنیف کی جس کو دیکھ کر مولانا اشرف علی تھانویؒ نے پیشین گوئی کی تھی کہ اس کتاب کا مصنف آگے چل کر محقق ہوگا۔ اس کے بعد مولانا نے اپنی دوسری کتاب ''کائنات روحانی'' لکھی جو باوجود تلاش کے راقم کو نہ مل سکی۔

مولانا کا قیام دیوبند میں قریب ایک سال رہا اور تکمیل علم حدیث کے بعد دیوبند کو خیر باد کہہ کر اپنے وطن لوٹ آئے۔ یہاں آکر مولانا کو حضرت مولانا محمد علی مونگیری کے زیر سایہ اپنا ایک رسالہ مونگیر سے جاری کرنے کا خیال آیا۔ ایک سال اس کوشش میں لگے رہے۔ لیکن سرمایہ کی کمی کی وجہ سے اس کا کوئی نظم نہ ہو سکا اور مولانا کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ لیکن اس مدت میں بھی وہ بیکار نہیں رہے۔ بلکہ حضرت مولانا محمد علی کی صحبت میں روحانی فیض حاصل کرتے رہے اور مولانا کے ارشاد سے اکثر بھاگلپور اور دربھنگہ جا کر پند و وعظ اور تبلیغ کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔

ایک روز دربھنگہ میں وہ وعظ کہہ رہے تھے۔ مجمع بہت کثیر تھا جس میں کچھ غیر مسلم بھی شریک تھے۔ مولانا کے وعظ سے ایک غیر مسلم اتنا متاثر ہوا کہ مجمع کے سامنے اس نے قبول اسلام کا اعلان کر دیا۔

جب مونگیر میں ایک سال کے قیام کے بعد بھی پرچہ جاری کرنے کا کوئی نظم نہ ہو سکا تو مولانا نے اپنے حالات دیکھ کر دیوبند بھیجے۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے جو اس وقت مدرسہ دیوبند کے ناظم تھے، فوراً جواب دیا اور فی الفور دیوبند واپس جانے کا مشورہ دیا۔ ''القاسم'' اور ''الرشید'' میں ادارت پھر انہیں سپرد کی، جس کے لئے پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ کی پیش کش بھی کی۔ چنانچہ یہ مونگیر سے پھر دیوبند چلے گئے۔ ابھی اس ملازمت کو چند ماہ بھی نہ ہوئے تھے کہ کلکتہ میں ایک عجیب شورش نے سر اٹھایا۔ کلکتہ کے اخبار ''انڈین ڈیلی نیوز'' نے رسول اکرمؐ کی شان میں ایک گستاخانہ مضمون شائع کیا تھا جس سے مسلمانان کلکتہ سخت برہم ہوگئے۔ پورے شہر میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ حکومت نے بھی سخت رویہ اختیار کر لیا اور مسلمان دھڑا دھڑ گرفتار ہونے لگے۔ حکومت نے جو سوچا تھا نتیجہ اس کے بالکل برعکس ہوا اور یہ تحریک دوسرے شہروں میں بھی پھیلنے لگی۔ کلکتہ کے مسلمانوں نے بذریعہ تار علمائے دیوبند کو اس طرف متوجہ کیا۔ اور متعدد علماء دیوبند سے کلکتہ کے لئے چل پڑے۔ اس مہم میں مولانا گیلانی بھی ان کے ساتھ تھے۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کا رویہ اور بھی سخت ہو گیا۔ ایک مسجد کے نزدیک مجمع پر گولی چلا دی گئی جس سے کئی مسلمان شہید ہو گئے۔

ان حالات کے مدنظر کلکتہ کے مسلمانوں نے آنے والے علمائے دیوبند کو تار دے کر آنے سے روک دیا۔ چونکہ اس وقت کلکتہ کے حالات کافی مخدوش ہو رہے تھے۔ یہ تار ان کو ٹرین ہی میں بمقام الہ آباد ملا۔ کچھ علماء تو واپس

ہو گئے لیکن مولانا گیلانی جوانی کے جوش میں اڑ گئے کہ اب تو جہاد کے لئے کلکتہ جانا ضروری ہے۔

مولانا کے عزیزوں کو معلوم ہوگیا تھا کہ علمائے دیو بند کس ٹرین سے کلکتہ جانے والے تھے۔ پٹنہ جنکشن پر ان لوگوں نے مولانا گیلانی کو کلکتہ جانے سے بہت روکا لیکن مولانا کسی طرح راضی نہ ہوئے۔

کلکتہ پہنچ کر جیسے ہی مولانا نے جہاد کا فتویٰ دیا۔ حکومت نے ان کی گرفتاری کا وارنٹ جاری کر دیا۔ لیکن چند مخلصوں نے ان کو ایک مکان کے اندر روپوش کر دیا۔ چونکہ پٹنہ ہو کر دیو بند جانے میں گرفتار ہونا یقینی تھا۔ اس لئے مولانا کے دوستوں نے ان کو دو ہفتہ کے بعد یہ رائے دی کہ وہ مدراس سے حیدر آباد ہوتے ہوئے پونا اور بمبئی کی راہ سے دیو بند واپس ہو جائیں۔ جس روز مولانا کی گاڑی حیدر آباد سے گذر رہی تھی وہ عید کا دن تھا۔ اس لئے مولانا حیدر آباد ہی میں اُتر پڑے اور اپنے ایک عزیز سید محی الدین صاحب بیرسٹر استھانوی کے یہاں مقیم ہوئے۔ محی الدین صاحب کے یہاں ہندوستان کے مشہور و معروف مفسر قرآن مولانا حمید الدین صاحب فراہی پرنسپل مدرسہ نظامیہ کی آمد و رفت تھی۔ اس طرح مولانا گیلانی کی ملاقات علامہ فراہی سے ہوئی، جنہوں نے چند ہی ملاقاتوں میں ان کی غیر معمولی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر یہ فیصلہ کر لیا کہ انہیں حیدر آباد ہی میں روک لیا جائے۔ اس زمانے میں مولانا فراہی عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے لئے ایک عظیم منصوبہ تیار کر رہے تھے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ مدرسہ نظامیہ کو عثمانیہ یونیورسٹی میں ضم کر دیا جائے اور علماء مدرسہ نظامیہ کی ملازمت اسی یونیورسٹی سے وابستہ کر دی جائے۔ علامہ فراہی یہ منصوبہ نواب حبیب الرحمٰن شروانی، سر اکبر حیدری فنانس منسٹر اور سر راس مسعود ڈائریکٹر تعلیمات کے مشورہ سے تیار کر رہے تھے۔ مولانا فراہی نے مولانا گیلانی کو یہ کہہ کر روک لینا چاہا کہ یونیورسٹی جلد کھلنے والی ہے اور وہ انہیں اسی یونیورسٹی میں کسی معقول عہدے پر تعلیم دینیات کے لئے ملازمت دلوا دیں گے۔ مولانا گیلانی نے جواب دیا کہ وہ دیو بند کے ملازم ہیں اور سر راہے وہاں آ گئے ہیں۔ بغیر دیو بند کی اجازت کے وہ وہاں کی ملازمت کس طرح قبول کر سکتے ہیں۔ البتہ دیو بند سے بذریعہ خط اس کی اجازت مانگ سکتے ہیں، چنانچہ مولانا نے دیو بند خط لکھا۔ وہاں سے فوراً جواب ملا کہ انہیں ضرور رک جانا چاہئے۔ اس وقت اس کی سخت ضرورت تھی کہ مدرسہ دیو بند کا کوئی نمائندہ اس نئی یونیورسٹی سے منسلک ہو جائے۔ اس خط کو پا کر مولانا گیلانی نے قیام حیدر آباد کا فیصلہ کر لیا۔

چونکہ یونیورسٹی کھلنے میں ابھی دیر تھی۔ اس لئے مولانا گیلانی، سید محی الدین صاحب کو درس قرآن دیتے رہے اور خود علامہ فراہی سے تفسیر قرآن پڑھتے رہے۔ اس طرح پورا ایک سال گذر گیا۔ لیکن یونیورسٹی کے قیام میں ہنوز دیر تھی۔ مجبوراً مولانا گیلانی ملازمت کی درخواست وہاں چھوڑ کر اپنے وطن گیلانی لوٹ آئے۔ کچھ دنوں کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوگئی تو گیلانی ہی میں مولانا کو تقرر نامہ ملا اور اس طرح مولانا گیلانی عثمانیہ یونیورسٹی میں دینیات کے لکچرر مقرر ہوئے۔ یہ واقعہ ۱۹۲۰ء کا ہے۔

مولانا گیلانی کا قریب اٹھائیس سال تک عثمانیہ یونیورسٹی سے تعلق رہا اور جب صدیقی صاحب جو اس وقت شعبہ دینیات کے صدر تھے، سبکدوش ہوگئے تو مولانا گیلانی ہی ان کی جگہ پر صدر شعبہ مقرر کئے گئے۔ مولانا کو ملازمت سے ۱۹۵۰ء میں سبکدوش ہونا تھا۔ لیکن ۴۷ء میں ان کو دل کا دورہ پڑا۔ حملہ شدید تھا۔ کسی طرح جانبر ہوگئے لیکن اس

Marfat.com

قابل نہ رہے کہ اپنی ملازمت کی ذمہ داریوں کو نباہ سکیں۔ اس لئے سبکدوش ہو کر ۱۵ اپریل ۱۹۴۹ء ہی میں مرض قلب کے شکار بن کر اپنے گاؤں چلے آئے لیکن مرض کا دورہ متواتر ہوتا رہا۔ تا آنکہ ۶ جون ۱۹۵۶ء کو رحلت فرما گئے۔

مولانا نے اپنی ڈائری میں جس کا ذکر آگے آرہا ہے، لکھا ہے کہ

''۱۵ اپریل ۱۹۴۰ء کو بالآخر حیدر آباد دکن سے آخری دفعہ خروج بالصدق کی نعمت میسر آئی۔ آج سے تیس سال پہلے اسی مالک کے حکم سے اسی شہر میں خروج بالصدق میسر آیا تھا اور اسی کے حکم سے خروج بالصدق بھی آسان کیا گیا۔''

مولانا کا سفر آخرت بھی قابل رشک تھا۔ ۵ جون ۱۹۵۶ء کی شب کو ''سوانح قاسمی'' کی تیسری جلد کے آخری باب کو مکمل کر کے بستر خواب پر دراز ہوئے۔ اپنے بھانجے روح اللہ سے فانی کی مشہور غزل

کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

ترنم سے پڑھ کر سنانے کی فرمائش کی۔ پھر مولانا کو نیند آ گئی۔ صبح جب ان کے چھوٹے بھائی مکارم احسن جو پاس ہی لیٹے تھے، اپنے محبوب بھائی کو جگانا چاہا تو خود اپنی غفلت پر کف افسوس مل کر رہ گئے۔ مولانا اکثر یہ فرماتے تھے کہ کسی جنت میں جانے والے پر بڑھاپا طاری نہ ہوگا۔ ہر شخص جوان صورت بن کر جائے گا۔ صبح میں جب ان کی روح پرواز کر چکی تھی تو چہرہ تروتازہ تھا۔ دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی پچیس سالہ جوان بستر پر دراز تھا۔ اس منظر نے ہر شریک جنازہ کو محو حیرت بنا دیا تھا۔ بقول غلام محمد صاحب ''حضرت گیلانی کی حسی کرامات خواہ نہ دیکھی گئی ہوں مگر اس عالم ناسوت سے جاتے ہوئے انہوں نے غفلت کے ماروں اور روحانیت کے بے خبروں کے لئے عجیب کرشمہ دکھایا۔''

مولانا گیلانی کو مولانا فصیح احمد مرحوم (ساکن موضع استھانواں) سے بڑی عقیدت تھی اور شاید ان کی یہ خواہش بھی تھی کہ مولانا فصیح ہی ان کے جنازہ کی نماز پڑھاتے۔ ۵ جون ۱۹۵۶ء کو مولانا فصیح دربھنگہ میں تھے۔ وہ بیان کرتے تھے کہ اس روز ان کو مولانا گیلانی سے ملنے کی اتنی شدید خواہش ہوئی کہ وہ بغیر کسی پروگرام کے دربھنگہ سے گیلانی روانہ ہو گئے اور دوسرے روز گیلانی پہنچے تو مولانا مرحوم کے تجہیز و تکفین کے انتظامات ہو رہے تھے۔ اس طرح نماز جنازہ مولانا فصیح احمد نے ہی پڑھائی۔

مولانا گیلانی کی شادی اپنی بستی ہی کے ایک بزرگ داروغہ سید محمد نظیر صاحب کی صاحبزادی آمنہ خاتون سے ۱۹۱۴ء میں ہوئی تھی۔ مولانا کو متعدد اولاد ہوتی گئیں لیکن سبھوں نے صغر سنی ہی میں داغ مفارقت دیا۔ صرف ایک لڑکا اور ایک لڑکی موت کے آہنی چنگل سے آزاد رہے۔ لڑکے کا نام سید محی الدین تھا۔ یہ ایم اے کرنے کے بعد بہار ہی میں سب ڈپٹی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان چلے گئے اور وہاں پی۔ اے ایس میں ان کا انتخاب ہو گیا۔ مولانا کی بالکل خواہش نہ تھی کہ میاں محی الدین جوان کے اکلوتے بیٹے تھے، پاکستان چلے جائیں لیکن محی الدین بضد ہوئے اور مجبوراً مولانا کو اجازت دینی پڑی۔ اس وقت کے حالات کچھ ایسے تھے کہ بہتوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ لیکن بوقت رخصت جو الوداعی جملے مولانا کی زبان سے نکلے تھے، مجھ کو ہمیشہ یاد رہیں گے۔

مولانا نے بہ چشم تر اپنے اکلوتے بیٹے کو یہ کہا تھا کہ:

''تم جانے کو تو پاکستان جا رہے ہو لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد تم لوگوں کو لٹ لٹا کر ہندوستان ہی واپس آنا ہوگا۔''

اور پھر مشرقی پاکستان کے انقلاب عظیم کے بعد جو کچھ ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔
خدا نہ کرے ایسے ہی واقعات موجودہ پاکستان میں بھی دہرائے جائیں۔
محی الدین سلمہ، پاکستان چلے تو گئے لیکن عمر نے وفا نہ کی۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد جب وہ مغربی پاکستان میں منتقل ہو گئے تو ان پر دل کا دورہ پڑا اور ۱۹۷۰ء میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ مولانا کی لڑکی کی شادی ان کے چھوٹے بھائی مکارم احسن صاحب گیلانی مرحوم کے بڑے لڑکے صلاح الدین سلمہ، سے ہوئی۔ خدا کے فضل سے دونوں بقید حیات ہیں۔

مولانا گیلانی ایک جامع شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک کامیاب مدیر، ممتاز پروفیسر رہے۔ بیس پچیس ضخیم کتابوں کے مصنف اور ایک بے مثال انشاء پرداز بھی۔ مقرر ایسے کہ تقریر کے لیے کھڑے ہوتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ خیالات اور افکار کا دریا ابل رہا ہے۔ ساری اسلامی دنیا میں فقہ اور حدیث کے استاد کامل تسلیم کیے جاتے تھے۔ خصوصاً اپنی زندگی کے آخری دور میں انہیں تصوف سے بھی خاص لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ زمانہ طالب علمی ہی میں اپنے استاد حضرت شیخ الہند سے مرید ہو چکے تھے۔ شاید شیخ الہند اور مولانا کے دوسرے اساتذہ انور شاہ کاشمیری اور مولانا برکات احمد ٹونکی کی دعاؤں کا فیض ہو۔

مولانا کی ذاتی زندگی بے مثال تھی۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں قریب اٹھائیس سال تک دینیات کے پروفیسر رہے اور اس حیثیت سے معقول تنخواہ پاتے رہے۔ لیکن مولانا کی زندگی ہمیشہ فقیرانہ رہی اور اس فقیری نے ان میں ایک ایسا افتخار اور شان امارت پیدا کر دی تھی جو آپ اپنی مثال تھی۔ یہ بہت عجیب بات تھی کہ مولانا کو پیسوں کا کبھی لالچ نہ ہوا۔ شاید آپ یقین نہ کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ مولانا نے اپنے پاس روزمرہ خرچ کے لیے بھی کبھی ایک پیسہ نہیں رکھا۔ قیام حیدر آباد میں بال بچوں کو اتفاقاً ہی اپنے ساتھ کبھی رکھتے۔ ان کا محبوب ملازم لکھواہی وہاں زیادہ تر ان کے ساتھ رہا۔ بیوی، بچوں، رشتہ داروں اور عزیزوں پر خرچ کرنے کے بعد جو کچھ بچتا لکھوا کے حوالہ کر دیتے۔ وہ جو کچھ حاضر کر دیتا مولانا خاموشی کے ساتھ اسے کھا لیتے۔ بہ نسبت ان کے دوسرے عزیزوں کے میں مولانا سے زیادہ شوخ تھا۔ ایک مرتبہ میں نے پوچھا کہ آپ اپنے پاس خود پیسے کیوں نہیں رکھتے کہ آپ کو روزمرہ کے خرچ کے لیے تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔ مولانا کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر اکبر الہ آبادی کا یہ شعر پڑھ کر مسکرانے لگے۔

دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گذرا ہوں خریدار نہیں ہوں

گرمی کی تعطیل میں اپنے وطن ضرور آیا کرتے اور اپنا وقت اس انہماک کے ساتھ گذارتے کہ فرصت کا ایک

دن بھی ضائع نہ ہونے دیتے۔ مولانا کی زندگی کی یہ بھی ایک لازمی خصوصیت تھی کہ وہ ٹرین کے سفر میں کچھ نہ کچھ گم ضرور کردیا کرتے۔ ایک مرتبہ تو شیخ پورہ اسٹیشن پر اس حال میں اترے کہ نہ بدن پر شیروانی تھی، نہ سر پر ٹوپی اور نہ پیر میں جوتا۔ دریافت حال پر معلوم ہوا کہ یہ ساری چیزیں چوری چلی گئیں۔ اس قسم کے واقعات مولانا کی زندگی کے معمولات بن گئے تھے اور میرا تو خیال ہے کہ مولانا کو اس میں ایک خاص قسم کی لذت بھی محسوس ہوتی تھی۔ نہ خود کبھی پریشان ہوئے اور نہ کسی کو اس سلسلے میں پریشان کیا۔ بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ ہنس ہنس کر ان اوصاف کو بیان کرتے۔ ایک روز کہنے لگے کہ بھائی ہم لوگ تو طرح طرح کا ٹیکس ادا کرتے ہی ہیں۔ میں نے اپنے اوپر ایک اور ٹیکس واجب کرلیا ہے جس کو میں احمقانہ کہتا ہوں۔ شاید ان کی زندگی کے اس انداز میں بھی کوئی صوفیانہ راز مضمر ہو۔ یہی رویہ ان کی زندگی کے ہر شعبے میں برابر کارفرما رہا۔ بیوی بچے ہوں یا عزیز و اقارب، دوست ہوں یا دشمن، ہر ایک کے حقوق بڑی دیانتداری سے ادا کرنے کے باوجود ایک خاص قسم کی بے تعلقی ان کی شخصیت کا طرہ امتیاز بن گئی تھی۔

گرمی کی تعطیل میں اپنے وطن گیلانی میں بھی ان کا وقت زیادہ تر باہر ہی ''کمرے'' پر گذرتا۔ اندر حویلی صبح کے ناشتے کے بعد ایک آدھ گھنٹے کے لیے جاتے۔ پھر ایک بجے دن تک علمی اور ادبی گفتگو کا سلسلہ جاری رہتا۔ اگر کوئی ایسا اسلامی یا تاریخی سلسلہ چھڑ جاتا جس کو کسی مصنف یا مورخ نے غیر اسلامی لہجے میں پیش کیا ہوتا تو پھر دیکھئے۔

تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز

مولانا کی یادداشت بھی عجیب تھی۔ مستند تاریخی، علمی اور ادبی کتابوں کا صرف حوالہ ہی نہیں دیتے بلکہ صفحہ پہ صفحہ اس طرح دہراتے جیسے وہ ان کتابوں کے حافظ ہوں۔

اپنے ہم عصروں میں مولانا محمد علی، اقبال، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد اور مولانا منظور نعمانی صاحب ''الفرقان'' سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ مولانا محمد علی کی وفات کے بعد جب ان کا تخلیق کردہ مرثیہ شائع ہوا تو سارے ہندوستان کے علمی حلقہ میں ایک دھوم مچ گئی۔ انہوں نے مولانا محمد علی کو کبھی دیکھا بھی نہ تھا۔ لیکن محمد علی کی سچی اور صحیح سیرت نگاری مولانا ہی کے لیے وقف کردی گئی تھی۔ اس مرثیہ کی شان نزول کے لیے مولانا عبدالماجد دریابادی کی مشہور کتاب ''محمد علی۔ ذاتی ڈائری'' ملاحظہ فرمائی جائے۔ یہاں پر دو چار اشعار ہدیہ ناظرین ہیں:

بدین مصطفیٰ دیوانہ بودی فدائے ملت جانانہ بودی
سیاست رانقاب چہرہ کردی دگرنہ عاشق مستانہ بودی
رسیدی از رہے اغیار تا یار عجب مستے عجب دیوانہ بودی

مولانا کو شاعری سے کبھی تعلق نہیں رہا۔ لیکن جب بھی جذبات سے مغلوب ہوجاتے تو شعر کہنے سے باز نہیں رہتے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے انتقال کا ان پر جو اثر ہوا اس کو بیان کرنا دشوار ہے۔ جس وقت مولانا کو سید صاحب کی وفات کی خبر ملی، چہرہ فق ہوگیا۔ صرف اقبال کا مصرعہ زبان سے نکل سکا۔

... ترکش مارا خدنگ آخریں

پھر خاموش ہوگئے اور آہستہ آہستہ چہل قدمی کرنے لگے۔ اس کے بعد ایک ایسی نظم وارد ہوئی جو ہمیشہ یادگار رہے

Marfat.com

گی۔ ''تذکرہ سلیمان'' میں مولانا سید سلیمان ندوی کے سوانح نگار غلام محمد صاحب نے اس کو شائع کر دیا ہے۔اس طویل نظم کو یہاں شائع کرنے کا تو موقع نہیں لیکن دو چار اشعار سے بھی آپ کو محروم رکھنا ناانصافی ہوگی:

اے سلیماں آہ پیغمبر کا وہ سیرت نگار
جس پہ نازاں ہند تھا اور فخر کرتا تھا بہار

آج محفل علم کی افسوس سونی ہوگئی
دین و دانش کے چمن کی لٹ گئی گویا بہار

اپنی تحریروں میں خود میری نظر تجھ پر رہی
رائے کا تیری رہا دل کو ہمیشہ انتظار

اقبال کے متعلق تو اپنا ذاتی مشاہدہ ہے کہ مولانا کوئی مسئلہ بیان کر رہے ہوں یا کلام پاک کی کوئی تفسیر بتا رہے ہوں، اقبال کے موزوں اشعار ضرور پڑھا کرتے تھے۔اکثر ایسا بھی ہوتا کہ جب مولانا ''پیام مشرق''، یا ''بال جبریل'' یا ''زبور عجم'' کی کوئی نظم سمجھا رہے ہوں تو کسی خاص شعر پر جذبات سے مغلوب ہو کر کھڑے ہو جاتے تھے۔پھر حافظ صاحب کو مخاطب کر کے فرماتے۔ ''حافظ صاحب! فلاں سورہ کی یہ آیت آپ کو یاد ہے نا۔'' پھر فرماتے ''آج برسوں سے معلّمی کر رہا ہوں۔قرآن اور حدیث پڑھنے اور پڑھانے میں زندگی گذری لیکن ان آیت کا یہ نیا مفہوم ڈاکٹر کے اس شعر سے واضح ہوا۔'' مولانا گیلانی اقبال کو صرف ڈاکٹر کے نام سے یاد کرتے تھے۔مولانا جب کبھی اپنی علمی صحبتوں میں ڈاکٹر کا لفظ استعمال کرتے تو اشارہ ہمیشہ ڈاکٹر اقبال ہی کی طرف ہوتا تھا۔

مولانا مرحوم کے تعلقات مولانا عبدالماجد دریابادی سے دوستی اور عقیدت سے بڑھ کر شاید پیری مریدی تک پہنچ گئے تھے۔لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ پیر کون تھا اور مرید کون۔یوں تو دنیا مولانا دریابادی کی علمی اور ادبی صلاحیتوں کا لوہا مان چکی ہے۔لیکن مولانا گیلانی اس سے زیادہ مولانا دریابادی کے خلوص اور ایمان کی پختگی کے قائل تھے۔اپنی شدید بیماری میں بھی جب پڑھنا لکھنا بالکل ترک کر چکے تھے، انہیں ''صدق'' کا بڑی بے چینی سے انتظار رہتا تھا۔نوجوانوں کو ہمیشہ تاکید فرماتے کہ ''صدق'' کا ضرور مطالعہ کیا کریں۔

مولانا منظور نعمانی سے ان کو بڑی عقیدت تھی۔ان کے علم اور زہد کے معترف تھے۔اکثر اپنی نجی صحبتوں میں ان کا ذکر کیا کرتے۔مولانا گیلانی کے بہت سارے مقالے ''الفرقان'' ہی میں شائع ہوئے۔ان کا شاہکار مقالہ ''حضرت مجدد الف ثانی'' بھی اسی رسالہ میں شائع ہوا۔میرا خیال ہے کہ مولانا نعمانی کو بھی مولانا گیلانی سے بڑی محبت تھی۔مولانا گیلانی کی کئی کتابیں بھی مولانا نعمانی نے شائع کرائیں۔جن میں ان کی مشہور کتاب ''النبی الخاتم'' بھی شامل ہے۔اس کا تعارف بھی مولانا نعمانی ہی کے قلم سے ہوا ہے، جس میں مولانا گیلانی کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

''مجھ سے ایک نہایت ثقہ بزرگ نے بیان کیا کہ جن دنوں یہ کتاب ''النبی الخاتم'' تصنیف ہو رہی تھی ایک صاحب دل بزرگ نے ایک رات عالم واقعہ میں دیکھا کہ حضرت خاتم النبیین رحمتہ العالمین (ﷺ) اپنے جمال کو پوری تابشوں کے ساتھ رونق افروز ہیں اور مولانا گیلانی ان

Marfat.com

> کے قدموں پر تڑپ رہے ہیں۔مگران سے نظر بچائی جارہی ہے۔صاحب واقعہ بزرگ نے یہ دیکھ کر حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے (جو وہیں موجود تھے) عرض کیا کہ اس بیچارے کو ایک نظر کیوں نہیں دیکھ لیا جاتا۔حضرت بلالؓ نے فرمایا ''اگر اس کو دیکھ لیا جائے گا تو تُو مرجائے گا۔
>
> میرے نزدیک یہ مقدس صحبت اور یہ تڑپ اس مبارک تالیف کی صورت مثالیہ اور اس کے مصنف کے پُرنور جذبات کی تصویر تھی۔''

مولانا گیلانی خاص خاص موقعوں پر جذبات سے بہت زیادہ مغلوب ہوجایا کرتے تھے۔سید تقی الدین صاحب مرحوم جو اس وقت حکومت حیدر آباد کے سیکرٹری کے عہدہ پر فائز تھے،کہتے تھے کہ ۴۶ء میں بہار کے فرقہ وارانہ فساد کی خبر جب مولانا کو حیدرآباد میں ہوئی تو بہت پریشان رہنے لگے۔تقی صاحب اور دوسرے بہاریوں کا جو حیدرآباد میں تھے، یہی حال تھا۔ چنانچہ ایک روز مولانا اور تقی صاحب بذریعہ ہوائی جہاز بہار کے لیے روانہ ہوئے۔کلکتہ میں گرینڈ ہوٹل میں مجبوراً قیام کیا۔اس لیے کہ تقی صاحب اس سے کم درجے کے ہوٹل میں قیام کرہی نہیں سکتے تھے۔تقی صاحب کا بیان ہے کہ دوسرے روز صبح کی ٹرین سے ان لوگوں کو پٹنہ کے لیے روانہ ہونا تھا۔اس زمانہ میں شاید کلکتہ سے پٹنہ کے لیے کوئی ہوائی سروس نہ تھی۔مولانا صبح کی نماز سے فارغ ہوکر نیچے ہوٹل کے لانج میں آئے تو دیکھا کہ تین انگریز نوجوان صبح کی نماز پڑھ رہے ہیں۔مولانا کو بڑا تعجب ہوا۔فوراً تقی صاحب کو کمرے سے کھینچ کر باہر لائے اور کہا کہ ان سے پوچھو کہ کہاں کے رہنے والے ہیں،کیا نام ہے وغیرہ وغیرہ۔جب وہ نماز سے فارغ ہوچکے تو تقی صاحب نے انگریزی میں ان سے چند سوالات کیے۔وہ انگریزی جانتے ہی نہ تھے۔لیکن ان میں سے ایک نے کہا ''زبان فارسی می دانم''۔بس مولانا کی گویا باچھیں کھل گئیں۔بڑھ کر ان کو گلے سے لگالیا اور اقبالؔ کی مشہور مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' ایک خاص والہانہ انداز میں پڑھنے لگے۔مولانا رو رو کر مثنوی پڑھتے جارہے تھے اور ادھر لوگ پریشان کہ آخر معاملہ کیا ہے۔اس زمانہ میں گرینڈ ہوٹل میں زیادہ تر انگریز ٹھہرتے تھے۔ان کا ایک مجمع ہوگیا۔بیچارہ ہوٹل کا منیجر اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔اس کی سمجھ ہی میں نہیں آرہا تھا کہ آخر کیا ماجرا ہے۔لیکن مولانا اپنی دھن میں مثنوی پڑھتے ہی جارہے تھے۔

بات یہ تھی کہ وہ نوجوان روس کے علاقہ آذربائیجان اور بخارا کے رہنے والے تھے۔کلکتہ میں اس زمانہ میں کوئی بین الاقوامی کانفرنس ہورہی تھی۔وہ اسی میں شرکت کرنے آئے تھے۔روس میں کیمونسٹ اقتدار نے مولانا کو بہت مایوس کردیا تھا۔وہ سمجھ رہے تھے کہ آذربائیجان، بخارا اور سمرقند کے مسلمانوں کا نام ونشان مٹ چکا ہے یا کم سے کم وہ مسلمان تو یقینی باقی نہیں رہے۔لیکن اس وقت کا نظارہ مولانا کے لیے نہایت خوش کن تھا۔وہ جذبات سے ایسے مغلوب ہوئے کہ برسرعام وہ سب کچھ کرگذرے جو اپنی نارمل حالت میں شاید کبھی نہ کرتے۔

مولانا کو میں نے صرف ایک ہی مرتبہ غصے کی حالت میں دیکھا اور وہ بھی اپنے چھوٹے بھائی مکارم احسن صاحب پر، جو شاید دنیا میں ان کو سب سے زیادہ عزیز تھے۔یوں تو مولانا کے ایک اور چھوٹے بھائی بھی تھے،مظہر احسن

Marfat.com

گیلانی جو ایک عرصہ تک عثمانیہ یونیورسٹی میں معاشیات کے ریڈر رہے ہیں۔ مولانا سے وہ بہت چھوٹے تھے اور وہ ان کو اپنے لڑکے محی الدین سلمہ، ہی کی طرح سمجھتے تھے لیکن مکارم صاحب سے ان کے تعلقات کچھ اور تھے۔ وہ عمر میں مولانا سے دو ہی سال چھوٹے تھے۔ اس لیے مکارم صاحب مولانا کے بھائی کے علاوہ ہمراز، ہم درد، ہم نوا اور ہم نشین بھی تھے۔ انہوں نے مولانا کی طویل بیماریوں کے سلسلے میں جس بے نفسی اور بے جگری سے اپنے بھائی کی خدمت کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ لیکن اسی بھائی پر مولانا ایک مرتبہ بری طرح خفا ہوئے۔ بات یہ ہوئی کہ بعد نماز عصر گیلانی کی مسجد میں کسی شرعی مسئلہ پر گفتگو چھڑ گئی۔ مولانا اپنے مخصوص انداز میں بیان فرما رہے تھے کہ امام ابو حنیفہ کے یہاں یہ مسئلہ اس طرح ہے اور امام حنبل کے یہاں اس طرح، امام شافعی نے اس کو یوں لکھا ہے اور امام مالک کا یہ خیال ہے۔ اسی درمیان مکارم احسن صاحب بول اٹھے کہ بھیا! آپ مولویوں کا کیا کہنا۔ گرفت میں آنے سے رہے۔ چار دروازہ بنا رکھا ہے۔ جب چاہا جس دروازہ سے نکل گئے۔ مولانا یک بیک بپھر گئے۔ ڈانٹ کر کہا۔ تم کو ان باتوں سے کیا واسطہ۔ شرعی مسئلوں میں بغیر جانے بوجھے رخنہ اندازی نہ کیا کرو۔ بہت بُری بات ہے لیکن فوراً ہی خاموش بھی ہو گئے اور دو چار منٹوں کے بعد فضا ایسی خوش آگیں ہو گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

مولانا عاجزی اور انکسار کے پتلا تھے۔ اپنی غلطی تسلیم کرنے میں کبھی نہیں گھبراتے۔ ایک عزیز کی برات میں مولانا اور برادری کے چند حضرات پورینی ضلع بھاگلپور تشریف لے گئے۔ مولانا سہول صاحب (سابق پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ) کا اس وقت پورینی ہی میں قیام تھا۔ وہ مولانا کے دوستوں میں تھے۔ جب برات باجے گاجے کے ساتھ چلی تو مولانا سہول بگڑ گئے۔ باجا بند کرنے کا حکم دیا۔ لیکن اس ماحول میں ان کی سنتا کون تھا۔ مولانا سہول نے ستیہ گرہ شروع کر دی اور سڑک پر لیٹ گئے کہ اگر باجا بجے گا تو برات میری لاش پر ہو کر گذرے گی۔ مولانا گیلانی چپ چاپ ایک طرف کھڑے تھے۔ پھر یک بیک خود بھی سڑک پر لیٹ گئے۔ لیکن اس کے بعد کچھ ایسی باتیں ہوئیں کہ مولانا فرداً فرداً سب سے معافی مانگنے لگے اور جب تک ہر شخص سے معافی نہ مانگ لی، ان کی تسکین نہ ہوئی۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ مولانا زاہد خشک تھے۔ یہ واقعہ مولانا کی عہد جوانی کا ہے۔ اس وقت ان کی عمر شاید ۳۵ یا ۴۰ کے درمیان ہو گی۔

مولانا اپنی زندگی کے آخری دور میں تو کچھ سے کچھ ہو گئے تھے۔ ان کے لڑکے محی الدین سلمہ کی شادی اپنے گاؤں ہی میں میری پھوپھیری بہن سے ہوئی تھی۔ اس تقریب میں باجا خوب بجا لیکن مولانا نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ مولانا کا کیا مسلک تھا مجھ کو معلوم نہیں۔ نہ اس کو پرکھنے کی مجھ میں صلاحیت تھی۔ لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ان میں مذہبی کٹرپن بالکل نہ تھا۔ جب بھی اپنے گاؤں آتے تو گھر گھر میلاد کی مجلسیں منعقد ہوا کرتیں اور مولانا کا ہر مجلس میں تقریر کرنا لازمی ہوتا تھا۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ کسی مجلس میں تو مولانا اور لوگوں کے ساتھ خود بھی کھڑے ہو کر بڑے والہانہ انداز میں سلام پڑھا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ پوچھنے پر کہنے لگے کہ میں جان کر ایسا کرتا ہوں۔ یہ ایک بالکل جزوی مسئلہ ہے۔ اس میں بحث و مباحثہ کرنا فضول ہے۔

مولانا اپنے عزیزوں میں مولوی عمر دراز صاحب اور مولوی حنیف سے بہت بے تکلف تھے۔ دونوں ان سے عمر میں بڑے تھے اور رشتے میں نسبتی بھائی، اس لیے مولانا ان سے بڑی بے تکلفی برتتے تھے۔ عمر دراز صاحب کی بھی

Marfat.com

عجیب شخصیت تھی۔ تھے تو پولیس کے داروغہ لیکن علمی اور ادبی ذوق بھی رکھتے تھے۔ وہ لڑکوں میں لڑکے اور بوڑھوں میں بوڑھے تھے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد گیلانی ہی میں ان کا قیام رہا۔ گو میرے والد مرحوم کے ہم عمر تھے، لیکن زیادہ ان کا اٹھنا بیٹھنا گاؤں کے نوجوانوں ہی کے ساتھ رہتا تھا۔ دن میں جب کبھی تاش اور شطرنج کی مجلس جمتی اس میں ان کی صدر کی حیثیت ہوتی تھی۔ ان کا فیصلہ قانون ہوا کرتا۔ شام ہوئی اور کبڈی شروع ہوگئی۔ شادی شدہ ٹیم کے وہ کپتان رہا کرتے اور دوسری طرف ہم لوگوں کی غیر شادی شدہ ٹیم۔ وہ تاحیات ینگ کلب گیلانی کے صدر بھی رہے۔ اکثر اپنی شاعری مولانا کو سنایا کرتے تھے۔ ایک دن ایک لمبی چوڑی مثنوی ''خواب وطن'' لکھ کر لائے اور حکم دیا کہ ''تم اس کو درست کردو۔'' مولانا سخت پریشان ہوئے لیکن عمر دراز صاحب کے حکم کو ٹالنا آسان نہ تھا۔ مولانا نے قریب قریب ایک دوسری مثنوی ''خواب وطن'' کے نام سے لکھ ڈالی۔ گرچہ عمر دراز صاحب کے اصرار پر کچھ اشعار ان کے بھی اس میں رہنے دیئے۔ یہ مولانا کے وطن کی گویا تاریخ و جغرافیہ ہے۔ لیکن مولانا نے اس کو اپنے نام سے شائع ہونے نہیں دیا۔ بلکہ جیسا کہ اس مثنوی کے صفحہ اول پر درج ہے:

''مثنوی خواب وطن جس کو حسب تجویز سید عمر دراز صاحب سب انسپکٹر پولیس مجلس صفائی و آرائش گیلانی نے مطبع قاسمی دیوبند میں طبع کرا کے فرزندان وطن کے لیے شائع کیا۔''

یہ مثنوی اب تک نایاب تھی۔ لیکن ابھی کچھ دن پہلے اس کا ایک نسخہ پرانے کاغذات میں مجھ کو مل گیا ہے۔ مولانا نے اس میں اپنے قلم کا پورا زور دکھلایا ہے اور اس کو ایک عجیب والہانہ انداز میں شروع کیا ہے:

یاد آتی ہے مجھ کو گیلانی ‏ ‏ ‏ مظہر لطف غوث سبحانی
مصدر راز ہائے عرفانی ‏ ‏ ‏ مطلع جلوہ ہائے روحانی
منبع علم، مخزن حکمت ‏ ‏ ‏ مرکز جاہ و عظمت و شوکت
مسقط الراس وہ وطن پیارا ‏ ‏ ‏ عہد طفلی کا اپنے گہوارہ

اپنے گاؤں کے مغربی حصہ کی ویرانی کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں:

مغربی ٹولے کا وہ جاہ و جلال ‏ ‏ ‏ اوج پر جس کا تھا کبھی اقبال
آج دیکھو مقام حسرت ہے ‏ ‏ ‏ بلکہ سوچو تو جائے عبرت ہے
حاجی سید ظہور بھائی مرے ‏ ‏ ‏ بستی والوں کی آنکھوں کے تارے
وہ کبیر اور منظر و احسن ‏ ‏ ‏ ان کے رہ بنگلے اور ان کے
ان عزیزوں کے نام سے رولو ‏ ‏ ‏ فاتحہ کے لیے بھی منہ کھولو

اور گاؤں کے قبرستان کے متعلق فرماتے ہیں:

دار آخر کی شاہ راہ ہے وہ ‏ ‏ ‏ اپنے آبا کی خواب گاہ ہے وہ
سوتے ہی اس میں نازوں کے پالے ‏ ‏ ‏ رُخ پہ مٹی کی چادریں ڈالے

علم و فن کے یہاں خزانے ہیں | امراء کے یہاں ٹھکانے ہیں
چھپی ان مٹیوں میں عظمت ہے | علم ہے فضل ہے شرافت ہے
زہد ہے ورع ہے عبادت ہے | ہاشمی سیدوں کی حشمت ہے
حسن ہے عشق ہے محبت ہے | رحم ہے جور ہے مروت ہے
یعنی وہ مسجد مقدس پاک | سر جھکائے جہاں پہ ہیں افلاک

اب دو چار شعر اس سلسلے میں عمر دراز صاحب کے بھی سن لیجئے۔اس سے آپ سمجھ جائیں گے کہ مولانا نے اس مثنوی کو اپنے نام سے کیوں شائع نہیں ہونے دیا:

یاد آتی ہے مجھ کو بچلی گلی | کھیلتا جس میں تھا کبھی کتی
وہ کبڈی کی اپنے بازی گاہ | جہاں ملتی تھی مکتبوں سے پناہ
وہ جنوب و شمال کے بگہے | جہاں بہتے ہیں دودھ کے چشمے
نہ پھیلندوں پہ ڈھیلے چلتے ہیں | اب نہ بیروں پہ ہم مچلتے ہیں
اب نہ ڈنڈی ہے اور نہ جھنگڑی ہے | میں ہوں اور مری اک پلنگڑی ہے
نہ پرم ہی ہے اب نہ آنٹھی ہے | میں ہوں اور افسروں کی لاٹھی ہے
اب نہ لگی ہے اور نہ مچھلی ہے | بندہ صاحب کا اب طفیلی ہے

ان شاء اللہ اس مثنوی کو خدا بخش لائبریری کے حوالہ کردوں گا، تاکہ وہاں محفوظ ہوجائے اور مولانا پر ریسرچ کرنے والوں کے کام آئے۔

بقول غلام محمد صاحب:

''مولانا کی ذات میں شاعری کے سارے لوازم وہبی ہوں یا کسبی، پوری طرح جمع تھے۔شگفتگی بلکہ رنگینی ان کی طبیعت پر غالب تھی۔عربی، اردو، فارسی اور ہندی زبان کے کلاسیکی کلام تک ان کی پوری رسائی تھی۔ان چاروں زبانوں کے سینکڑوں اشعار ان کے نوک زبان پر تھے۔مذکورہ جامعیت کی وجہ سے مولانا خود ایک اچھے شاعر بن گئے تھے۔وہ بے تکلف فارسی اردو و ہندی میں اپنے جذبات کو شاعری کے قالب موزوں میں ڈھال لیتے تھے۔عربی میں بھی ممکن ہے کچھ کہہ لیتے ہوں مگر میں اس سے واقف نہیں۔''

مولانا کی پہلی نظم شاید ''شکوۂ خواجہ'' تھی جس کا میں ذکر کر چکا ہوں۔لیکن باوجود کوشش کے وہ نظم مجھ کو نہیں مل سکی۔ممکن ہے ''بدایوں پریس'' میں جہاں سے یہ نظم شائع ہوئی تھی، ایک دو کاپی مل جائے۔جہاں تک مجھ کو معلوم ہے مولانا نے کبھی کوئی غزل نہیں لکھی۔نظم کبھی کبھار کہہ لیا کرتے تھے۔لیکن اسی وقت جب جذبات سے بالکل مغلوب ہوجاتے۔

ایک سال اپنے جوار میں بالکل بارش نہیں ہوئی۔ سخت پریشانی تھی۔ کھیتی کا کام بالکل ٹھپ پڑ گیا تھا۔ مولانا جذباتی تو تھے ہی۔ ایک طویل نظم ''دہقان اور ابر'' لکھ کر اپنے جذبات کو سکون پہنچایا۔ اس نظم کو میں نے ان سے لے لیا تھا اور مجھ سے انجم مان پوری اڈیٹر ''ندیم'' (گیا) نے لے لیا کہ وہ اس کو اپنے رسالے میں شائع کریں گے۔ افسوس کہ یہ نظم ان سے گم ہوگئی اور شائع نہ ہوسکی۔

مولانا کی ایک اور مشہور نظم ''اسلام کی روانی'' ہے جو اکبر الہ آبادی کی مشہور نظم ''پانی کی روانی'' کے انداز پر لکھی گئی تھی اور کافی مقبول ہوئی۔ شاید یہ نظم ''القاسم'' دیو بند میں شائع ہوئی تھی۔ انتقال سے دو چار دن قبل مولانا نے ایک مزاحیہ نظم ''مرغی نامہ'' لکھی تھی، جو راقم سے کہیں گم ہوگئی۔ اس کا بہت افسوس ہے۔ بڑی پُر لطف نظم تھی۔ مولانا نے ''مگہی'' زبان میں بھی کئی دوہے اور دو تین مناجات لکھی تھی، جواب بہت کم یاب ہیں۔ مجھ کو کچھ دن قبل مولانا کی دو تین مگہی نظمیں مل گئی تھیں، جن کو میں نے بڑی حفاظت سے رکھ چھوڑا تھا، لیکن جس چیز کو میں حفاظت سے رکھتا ہوں وہ ہمیشہ گم ہوجایا کرتی ہے۔ مولانا اپنی ہندی نظمیں ''سوامی دھری جی گیلانی والے'' کے نام سے لکھا کرتے تھے۔

یہ بات بڑی حیرت سے پڑھی جائے گی کہ شاعری میں مولانا کا تنہا شاگرد ہوں۔ گرچہ مولانا شاعر نہیں تھے اور میں تو خیر کچھ بھی نہیں ہوں۔ میں اپنی ساری زندگی میں صرف دو نظمیں لکھ سکا۔ اس کے بعد میں نے سمجھ لیا کہ شاعری میرے بس کا روگ نہیں اور پھر یہ ''گناہ'' مجھ سے سرزد نہیں ہوا۔ پہلی نظم تو ایک ''حمد'' تھی جس کو ''ندیم'' (گیا) نے بطور ''ہمت افزائی'' شائع کردیا تھا۔ اس لیے کہ اس وقت میں کالج میں پہلے یا دوسرے سال کا طالب علم تھا۔ یہ ۳۲ء یا ۳۳ء کا واقعہ ہے۔ ۳۷ء میں جب میں ایم اے کا طالب علم تھا تو پٹنہ کالج میگزین کے لیے کسی طرح ایک نظم لکھی، جس کا عنوان تھا ''چھوٹا ناگ پور کی لڑکیاں'' لیکن ہمت نہیں ہوئی کہ اس کو بغیر اصلاح کے شائع کردوں۔ اس لیے میں نے اس نظم کو ڈرتے ڈرتے مولانا کے پاس حیدر آباد بھیج دیا اور گزارش کی کہ اس کی اصلاح فرمادیں۔ دس پندرہ دنوں کے بعد مولانا کا جواب ملا۔ شاعری کرنے سے سختی سے منع کیا گیا تھا۔ لیکن میری دل جوئی کے لیے اس ''لچر پوچ'' نظم کی اصلاح بھی کردی گئی تھی۔ بلکہ مولانا نے دو چار شعر اپنی طرف سے بڑھا بھی دیئے تھے جس کا ایک شعر آج تک مجھ کو یاد ہے۔ سنیے گا؟ مولانا بھی تو آخر کبھی جوان تھے:

یہ ابلتی لڑکیاں اس چلچلاتی دھوپ میں
سنگ اسود کی چٹانیں آدمی کے روپ میں

جن لوگوں نے چھوٹا ناگ پور کے پہاڑی علاقوں میں وہاں کی کالی کالی سنتھال لڑکیوں کو دھوپ میں کام کرتے دیکھا ہے، وہی کچھ اس شعر کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔

جیسا کہ عرض کرچکا ہوں حنیف صاحب مرحوم سے بھی مولانا بہت بے تکلف تھے۔ ان کی وضع قطع بھی نرالی تھی۔ گرمیوں میں صرف کھڑاؤں اور تہبند کے علاوہ بدن پر کچھ بھی نہ ہوتا تھا۔ لیکن جاڑوں میں دن ہو یا رات، اس پر ایک پورے لحاف کا اضافہ کرلیا کرتے تھے۔ گرچہ پریذیڈنسی کالج کلکتہ کے تعلیم یافتہ تھے۔ لیکن اسی انداز سے حج بھی کر آئے تھے۔ ہمیشہ ناس لیتے رہتے۔ نماز کے عادی تو تھے مگر بغیر ٹوپی اور وضو کے نماز پڑھا کرتے۔ اِدھر اذان ہوئی اور

Marfat.com

اُدھر حنیف صاحب کھڑ پڑ کرتے ہوئے مسجد میں آموجود ہوئے۔ میں نے مولانا سے ایک دن ان کی اس حرکت پر تعجب کا اظہار کیا تو کہنے لگے "یہ اپنے جوار کے مجذوب ہیں۔ ان کو انہیں کے حال پر چھوڑ دو۔" حنیف صاحب مرحوم کی یہ بھی ایک عادت تھی کہ وہ جس راہ سے گذرتے، اینٹوں اور پتھروں کو صاف کرتے جاتے۔ اس لیے مولانا ان کو مذاقاً "مولانا خشتی" کہا کرتے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی بھی ان سے نہایت بے تکلف تھے۔ ان سے ان کی عزیز داری بھی تھی۔ دونوں ہم عمر اور ہم مکتب بھی تھے۔ حنیف صاحب سید صاحب کے وطن دیسنہ ہی کے رہنے والے تھے۔ شادی گیلانی میں ہوئی اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اس لیے ہر خاص و عام میں "دلہا بابو" کے نام سے پکارے جاتے تھے اور جب تک زندہ رہے کوئی دوسرا "دلہا بابو" کے لقب سے مشہور نہ ہو سکا۔ ایک دن سید صاحب مولانا سے ملنے کے لیے گیلانی تشریف لائے۔ اثنائے گفتگو میں کہنے لگے کہ آپ کے مولانا خشتی آج کہاں ہیں۔ ابھی یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ حنیف صاحب مع اپنے کھڑاؤں اور تہبند کے ننگے بدن، ناس لیتے ہوئے سامنے نظر آئے۔ سید صاحب کی جو نظر ان پر پڑی تو مولانا سے مخاطب ہو کر کہا کہ ان کو مولانا خشتی کے بجائے کھڑاوالناس کہا جائے تو کیسا رہے۔

اگر ایک طرف علم اور زہد و تقویٰ کا زور تھا تو دوسری طرف مولانا کے مزاج میں ظرافت بھی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ان کے درجنوں لطیفے آج بھی مشہور ہیں۔ خود مولانا فرماتے تھے کہ جب انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی کے سینٹ میں یہ تجویز پیش کی کہ دینیات میں بھی پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری دی جائے تو وائس چانسلر اور دوسرے ممبروں نے سخت مخالفت کی۔ ان کا کہنا تھا کہ چونکہ ڈیپارٹمنٹ میں خود کوئی پی۔ ایچ ڈی نہیں تھا۔ اس صورت میں کسی طالب علم کو یہ ڈگری کس طرح دی جا سکتی تھی۔ لیکن مولانا نے اپنے جواب سے سب کو لاجواب کر دیا۔ مولانا نے کہا "جناب عالی! آخر جس شخص کو دنیا میں پہلی بار پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری ملی اس کو یہ ڈگری دینے والا کون تھا۔ اس سوال کے بعد مولانا کی تجویز اتفاق رائے سے منظور ہو گئی۔ اسی سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ اور یاد آ گیا۔ جب مولانا اپنے وطن تشریف لائے تو نماز جماعت کی امامت خود ہی کیا کرتے تھے۔ ایک دن حنیف صاحب عشاء کی نماز کے بعد مولانا سے کہنے لگے۔ "تم مولویوں کے پیچھے نماز پڑھنے میں کوئی لطف نہیں آتا۔ نماز کیا پڑھتے ہو "ڈھیل پھیکی" کرتے ہو (بہار کا ایک دیہاتی محاورہ، جس کے معنی ہیں کسی فرض کام کو بے دلی سے کرنا) کسی طرح قُل ھو اللہ اور انا اعطینا پڑھ کر دو ٹکر لگا لیا اور بس۔" مولانا اس وقت تو کچھ نہ بولے صرف مسکرا کر رہ گئے۔ لیکن دوسرے دن عشاء کی نماز جو شروع ہوئی تو مولانا نے سورہ بقرہ کی تلاوت شروع کر دی۔ آدھے پارے تک تو حنیف صاحب خاموش کھڑے سنتے رہے لیکن جب اس کے بعد بھی مولانا تلاوت کرتے ہی رہے تو حنیف صاحب ڈول گئے۔ لیکن مولانا نے جیسے ہی دوسرا پارہ شروع کیا تو حنیف صاحب "ہوں ہاں" کرنے لگے۔ لیکن پھر بھی مولانا آگے ہی بڑھتے گئے۔ آخر حنیف صاحب پریشان ہو کر زور زور سے کھانسنے لگے۔ لیکن مولانا اپنی ہنسی کو بہ مشکل ضبط کرتے ہوئے آگے ہی پڑھتے چلے گئے۔ اب حنیف صاحب سے برداشت نہ ہو سکا۔ نماز توڑ کر مسجد کے ایک کونے میں جا بیٹھے۔ جماعت میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ مولانا نے بھی نماز توڑ دی اور ہنستے ہوئے حنیف صاحب کے پاس آئے۔ حنیف صاحب ان کو دیکھ کر بھر ہی تو گئے۔ "نماز پڑھاتے ہو یا جان مارتے ہو۔ اس کا بھی خیال نہیں کیا کہ جماعت میں کئی ضعیف لوگ بھی ہیں۔" حنیف صاحب نے بگڑ کر کہا۔ مولانا نے

Marfat.com

نہایت متانت سے جواب دیا۔ ''حنیف بھائی! اسی لیے تو چھوٹی چھوٹی سورہ پڑھا کرتا تھا۔ لیکن آپ نے تو اس میں بھی چین لینے نہیں دیا۔'' حنیف صاحب یہ سن کر خاموش ہو گئے اور نماز پھر سے پڑھی گئی۔

مولانا نے ایک بار پاکستان کا بھی سفر کیا تھا۔ خود اپنی خواہش سے نہیں بلکہ حکومت کی دعوت پر۔ حکومت پاکستان نے مولانا اور کئی دوسرے علمائے ہند کو کراچی آنے کی دعوت دی تھی کہ وہاں کے علماء سے مشورہ کر کے ایک مفصل تجویز پیش کریں کہ پاکستان میں اسلامی حکومت کا کیا نقشہ ہو۔

مولانا نے اس سفر کی مفصل روئداد اپنی ڈائری میں لکھی ہے جو بہت دلچسپ ہے۔ یہ ڈائری میرے پاس محفوظ ہے۔ اس ڈائری میں مولانا کے بہت سے اردو، فارسی اور عربی کے علمی اور ادبی شہ پارے بھرے پڑے ہیں جو اب تک غیر مطبوعہ ہیں۔ جیسے:

۱۔ حقوق العباد

۲۔ نور اور روح۔ دو قرآنی الفاظ

۳۔ ہجرت

۴۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم کیا تھے اور ان کا پیغام کیا تھا؟

۵۔ ترانہ حمد (نظم)

۶۔ مولانا سید سلیمان ندوی (نظم)

۷۔ مسئلہ قتل المرتد

۸۔ حیوانی شکل کے دیوتا۔

۹۔ تالیف و تصنیف کی صوفیانہ توجیہ۔

۱۰۔ جمہوریت اور اشتراکیت کی حقیقت۔

۱۱۔ اولاد قابیل

۱۲۔ یوحنا باب ۱۹

۱۳۔ سورہ جن کے متعلق بعض خطرات

۱۴۔ نسل آشوب (نظم) وغیرہ

ان کے علاوہ مولانا نے عربی میں بھی بہت کچھ اس ڈائری میں لکھا جس کو سمجھ نہیں سکا۔

۱۹۴۷ء ہی سے مولانا پر قلبی دورے پڑنے لگے تھے اور آخر اس بیماری دل نے اپنا کام تمام کیا۔ غالباً ۱۹۵۳ء کی بات ہے کہ مولانا پٹنہ کے ''کالج'' ہسپتال میں زیر علاج تھے۔ جب میں مولانا سے ملنے گیا تو قدرے اچھے تھے۔ اس وقت ایک نوجوان پریشان حال مولانا کے پاس حاضر ہوا اور رو رو کر کہنے لگا کہ میرے لیے دعا کیجیے۔ میں ٹی بی جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ مولانا نے پوچھا، کتنے دنوں سے؟ اس نے عرض کیا، قریب چھ مہینوں سے۔ مولانا نے فرمایا۔ بس اسی سے اتنے پریشان ہو۔ آج قریب پچپن سال سے اسی مرض میں مبتلا ہوں۔ پچپن سال سے؟

Marfat.com

اس نے حیرت سے کہا۔ پھر مولانا نے بڑی محبت سے فرمایا۔ عزیزم! جس وقت آدمی پیدا ہوتا ہے اسی وقت سے اس کو ٹی بی کا مرض لگ جاتا ہے۔ موت اپنے وقت پر ہی آئے گی لیکن ضرور آئے گی۔ علاج کراؤ اور خدا پر بھروسا رکھو۔ گھبرانے اور پریشان ہونے سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہ بات نوجوان کے دل میں اتر گئی۔ بڑے اطمینان قلب کے ساتھ واپس گیا۔ کچھ سال پہلے تک تو وہ زندہ اور سلامت تھا۔ اس طرف کی کوئی خبر نہیں۔

مولانا کی تصنیف میں تو ہر تصنیف گراں مایہ ہے مگر ''النبی الخاتم'' ''ابوذرؓ غفاری''، ''الدین القیم''، ''تدوین قرآن''، ''تدوین حدیث''، ''مقالات احسانی''، ''اسلامی معاشیات''، ''حضرت امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی''، ''نظام تعلیم و تربیت'' (دو جلد)، ''سوانح قاسمی'' (۳ جلد)، ''تفسیر سورہ کہف''، ''ظہور نور'' کو امتیازی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ مولانا کی بہت سی کتابیں ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں یا چھپنے کے بعد میری نظر سے نہیں گذریں۔ افسوس ہے کہ ان کتابوں میں سے کسی ایک کا بھی مسودہ ان کے کسی عزیز کے پاس نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ ان کے کسی دوست یا شاگرد کے پاس ہو۔ ان شائع شدہ کتابوں میں مولانا نے اپنی جن غیر مطبوعہ کتابوں کا ذکر کیا ہے، ان کے چند نام حسب ذیل ہیں:

ا۔ الکتاب

۲۔ الحرب الجہاد

۳۔ صابئون

۴۔ ازواج مطہرات

۵۔ اسلام اور سلاطین اسلام

۶۔ اسلام اور علمائے اسلام

۷۔ فقرائے اسلام، وغیرہ

مولانا کی کتابوں کے علاوہ ان کے سینکڑوں مضامین اپنی اہمیت اور افادیت کے اعتبار سے قابل قدر ہیں۔ کاش کوئی ادارہ ان کے مضامین اور مقالات کو کتابی صورت میں جمع کر کے شائع کر دیتا۔ مجھ میں اتنا علم اور صلاحیت کہاں کہ ان کتابوں پر کوئی تبصرہ کر سکوں۔ اس کام کو ان کے لیے چھوڑ دیتا ہوں جو اس کے اہل ہیں۔ یہاں پر صرف چند مشہور بزرگان دین اور علمائے کرام کی رائے نقل کر دینا مناسب سمجھتا ہوں، جو انہوں نے مولانا کی اس چھوٹی سی سیرت کی کتاب ''النبی الخاتم'' پر ظاہر کیا تھا۔

مولانا اشرف علی تھانوی: مناظر احسن کے سارے مناظر احسن ہیں۔

علامہ شبیر احمد عثمانی: ''النبی الخاتم'' کے مطالعہ سے سیرت نبوی کے کئی نئے پہلو سامنے آئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد: اس اعجاز اور اختصار کے ساتھ سیرت پر اتنی جامع اور عمدہ کتاب میری نظر سے نہیں گذری۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری: ''النبی الخاتم'' کے ساڑھے چار سو عنوانات میں سے ہر عنوان پر ہفتہ تک تقریر کر سکتا ہوں۔

Marfat.com

مولانا سید سلیمان ندوی: مناظر اسلام، متکلم ملت، سلطان القلم کی روانی، اسلام کی محافظت میں تیغ رانی کا کام دیتی ہے۔

مولانا عبد المجید قریشی: سیرت کی لائبریری میں اس قسم کی کوئی کتاب موجود نہیں۔

مولانا سید ابو الحسن ندوی: میں نے اپنی ساری عمر میں سیرت نبوی میں ''رحمتہ للعالمین'' اور ''النبی الخاتم'' سے زیادہ مؤثر کتاب نہیں پڑھی۔ کتاب عجیب البیلے انداز میں لکھی گئی۔

مولانا منظور نعمانی: ''دریا بکوزہ'' کی مثال دنیا کی کسی کتاب پر اس سے بہتر طور پر صادق نہیں آتی۔

مولانا ابو الحسنات قادری: ''النبی الخاتم'' عشق ومحبت اور واردات و کیفیات پیدا کرنے میں عجب اثر رکھتی ہے۔

مولانا عبد الماجد دریا بادی: ان کی ہر تحقیق میں قدامت کا استناد ہے اور ہر تعبیر میں جدت کی تازگی، یہ عجیب حکیمانہ امتزاج ہے اور ان کی فضیلت کا طرہ امتیاز۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مولانا نے نہ کبھی اپنی کسی کتاب پر کوئی رائلٹی لی اور نہ کسی مضمون کے بدلے کوئی معاوضہ قبول کیا۔

ایک اور بات تو لکھنا بھول ہی گیا۔ مولانا نے مولانا عبد الماجد دریا بادی کے ساتھ ۱۹۲۸ء میں سفر حج بھی کیا تھا، لیکن یہاں پر اس کی تفصیل لکھنے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ مولانا دریا بادی نے جو اپنا سفر نامہ لکھا ہے، اس میں مولانا کے قلبی واردات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ میں صرف یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ مولانا خود اپنی کتاب ''ظہور نور'' میں رقم طراز ہیں کہ:

''آج سے پچیس سال قبل ۱۹۲۸ء میں حج وزیارت کی سعادت سے سرفرازی ہوئی تھی۔ روضہ طیبہ پر اس معروضہ نیاز کے پیش کرنے کا موقع ملا تھا'' اس نعت کو مولانا نے شروع تو اردو میں کیا ہے۔ پھر طبیعت جو جوش پر آئی تو فارسی اور آخر میں عربی میں اسے مکمل کیا ہے۔ یہ نعت کافی طویل ہے۔ اس لیے اس کے صرف چند ہی اشعار لکھ رہا ہوں:

ہر ایک سے ٹکرا کر ہر شغل سے گھبرا کر
ہر فعل سے شرما کر ہر کام سے پچھتا کر
آمد بدرت بنگر
اے خاتم پیغمبر
یا قاسم للکوثر اے سرور ہر سرور
اے رحم جہاں پرور آقائے کرم گستر
آمد بدرت بنگر

Marfat.com

امروز چہ مہمانے ناکارہ و نادانے
آلودہ عصیانے آشفتہ دامانے
آمد بدرت بنگر
نے مونس و نے یاور
تو جوشش رحمانی تو سایہ یزدانی
تو شاہد ربانی تو جلوہ سبحانی
ہر رنج و پریشانی بنگر کہ مسلمانی
در ورطہ ظلمانی درفتنہ و طغیانی"

مولانا کے انتقال کے بعد تاریخ وفات کے سلسلے میں یوں تو بہت لوگوں نے طبع آزمائی کی، لیکن مصطفیٰ خاں مالک اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ مقیم مدینہ منورہ جو تاریخی مصرع کہا، وہی خاندان والوں کو پسند آیا اور یہی لوح پر کندہ ہے۔

"لحد پاک مناظر احسن"

مناظر احسن تاریخ پیدائش ہے۔ تاریخ رحلت کے لیے "لحد پاک" کا اضافہ کر دیا۔

مولانا زندگی بھر ذاکر و شاغل رہے۔ تلاوت قرآن روز کا معمول تھا۔ آخر زندگی تک تو قرآن پاک بھی حفظ کر ڈالا تھا۔ شب بیداری اور تہجد تو ان کے معمولات میں تھے۔ روپیہ پیسہ سے کبھی کوئی رغبت نہ تھی۔ حیدر آباد میں اپنی زندگی بہت عسرت سے بسر کرتے تھے۔ کبھی کوئی خاص مکان کرایہ پر نہیں لیا۔ بلکہ زیادہ تر اپنے دوست پروفیسر عبد الباری صاحب کے شریک مکان رہے۔

مولانا گورے چٹے اور خوبرو تھے۔ ٹونک تک تو مولانا کا لباس شروانی اور ترکی ٹوپی تھا۔ دیوبند جا کر لباس بدل گیا۔ بڑا کرتہ، شرعی پائجامہ، سفید ٹوپی اور حج کے بعد تادم مرگ تین گوشیہ عربی ٹوپی، ململ کا سفید کرتہ، سفید شرعی پائجامہ، سلیم شاہی جوتا۔ اسی لباس میں یونیورسٹی بھی جاتے تھے۔

مولانا گیلانی گرچہ دوران طالب علمی ہی میں حضرت شیخ الہند کے مرید ہو چکے تھے۔ لیکن علمی مشاغل کی وجہ سے اس وقت روحانی استفادہ کا موقع نہ مل سکا اور حضرت شیخ الہند کا انتقال ہو گیا۔

حیدر آباد جب آئے تو ان کی ملاقات حضرت حبیب العیدروس سے ہوئی اور مولانا کو ان سے بڑی عقیدت پیدا ہو گئی۔ یہ بزرگ رہنے والے تو بغداد کے تھے لیکن حیدر آباد ہی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ عمر اس وقت کافی ہو چکی تھی۔ نابینا تھے اور اردو مشکل ہی سے سمجھتے اور بولتے تھے۔ مولانا ان کی قدم بوسی کے لیے اکثر جانے لگے اور جب کبھی ضرورت پڑی تو مولانا مترجم کا بھی کام کرتے تھے۔ یہاں مولانا نے قادریہ سلسلہ میں تعلیم پائی اور خلافت سے سرفراز کیے گئے، لیکن پھر بھی شاید مولانا کو اطمینان کامل میسر نہ ہوا۔ آخر اللہ نے ان کو ایک چشتی بزرگ حضرت مولانا محمد حسین صاحب حیدر آبادی کی خدمت میں پہنچایا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو یہاں سے اطمینان قلب نصیب ہوا اور اس بارگاہ سے بھی خلافت کے شرف سے سرفراز کیے گئے۔

(مضامینِ گیلانی: پٹنہ ۱۹۸۶ء، ص ۱۲۔۵۱)

☆......☆......☆

Marfat.com

عتیق الرحمٰن سنبھلی

مولانا سید مناظر احسن گیلانی

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی گیلانی (ضلع پٹنہ، صوبہ بہار) کے ایک متمول اور ذی علم خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد کافی عرصہ ٹونک رہے اور پھر اس سلسلہ کی تکمیل دار العلوم دیو بند پہنچ کر کی۔ دار العلوم میں ان کا جوہر استعداد کافی نمایاں ہو چکا تھا، جس کی وہاں کے اہل نظر ارباب اختیار نے مختلف طریقوں سے قدر شناسی کی۔ ۱۹۲۰ء میں مولانا کا تقرر عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد میں دینیات کے استاد کی حیثیت سے ہو گیا، جس سے ترقی کر کے وہ شعبہ کی صدارت تک پہنچے۔ بالآخر ۴۹ء میں پنشن پا کر گیلانی تشریف لے آئے۔ پنشن کے بعد کے دور میں جو فرصت میسر آئی تو وہ ہمہ تن تحریر و تصنیف کی طرف متوجہ ہو گئے اور ۵۳ء تک (تقریباً پانچ سال) ان کا دریائے علم و تحقیق مجلاتی مقالات اور بعض ضخیم تصنیفات کی شکلوں میں خوب خوب روانی اور جولانی دکھاتا رہا۔ ۵۳ء کے اخیر میں مولانا پر قلبی شکایت کا حملہ ہوا...... افاقہ ہو گیا۔ مگر ۵۴ء میں چند ماہ بعد پھر شکایات نے عود کیا اور اب کی کا حملہ بڑا سخت بھی تھا اور طویل بھی۔ مولانا کا قلم جو پہلے حملے سے صحت پا کر پھر چل کھڑا ہوا تھا، اب بالکل رک گیا۔ کئی مہینے علاج معالجہ کے سخت اور اعلیٰ ترین اہتمامات کے بعد (جو ان کے محب و محبوب بھائی سید مکارم احسن صاحب کی بلند ہمتی کا نتیجہ تھے) شکایات کی شدت میں گو تخفیف ہو گئی مگر گزری ہوئی شدت نے اب انہیں کام کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ معالجین کی طرف سے بھی قطعی ممانعت تھی۔

تعطل کا یہ دور تقریباً دو سال کھنچا، جس میں صحت اور مرض میں برابر کشمکش ہوتی رہی۔ اس دور کے لئے انہوں نے اس زمانہ کے بعض خطوط میں ''برزخی دور'' کی تعبیر استعمال کی ہے اور اس کے طول پر ایک مرتبہ ایک گرامی نامہ میں اکبر الہ آبادی کا یہ شعر بھی ارقام فرمایا۔

کمزور ہی میری صحت بھی کمزور ہی مری بیماری
اچھا جو رہا کچھ کر نہ سکا بیمار پڑا تو مر نہ سکا

آخر کار وہ جس گھڑی کے لئے بے چین تھے، ۵ جون ۱۹۵۶ء کو وہ آ پہنچی اور انہوں نے اس جذب و مستی اور اس شوق بقا کے ساتھ دار البقاء کی طرف رحلت فرمائی جو خاصان خدا کی علامت اور عشاق ایزدی کی پرانی رسم ہے۔

برد الله مضجعه ونور ضريحه وقدس سيره ...... ويرحم الله عبداً قال آمينا

مرحوم اپنے وقت کے فردِ فرید اور اپنی بعض خصوصیات کے تو بظاہر خاتم تھے۔ ان کا علم ہمہ جہت تھا اور قلم ہر دم رواں دواں، چنانچہ ان کے قلم سے اسلامی لٹریچر میں جو گرانقدر اضافہ ہوا ہے ممکن نہیں ہے کہ اسے نظر انداز کیا جاسکے۔ ابوذر غفاری، النبی الخاتم، الدین القیم، اسلامی معاشیات، مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی اور تدوین حدیث۔ ان کی ایسی تصنیفات ہیں جن سے مدتوں علم وتحقیق کے چراغ روشن ہوتے رہیں گے......ان مستقل تصنیفات کے علاوہ ہندوستان کا کوئی مشہور علمی و دینی مجلہ ایسا نہیں ہے جس کے صفحات پر ان کے نقوش قلم ثبت نہ ہوں اور جس کا دامن مولانا کے نتائج فکر سے خالی رہا ہو ''الفرقان'' بھی کوئی سترہ سال تک اس ذات گرامی سے فیض یاب ہوتا رہا اور اس درجہ خصوصیت رہی کہ درمیان میں ایک سال مولانا نے اپنی اعزازی ادارت کا فخر بھی ''الفرقان'' کو بخشا۔

ایسی عظیم المرتبت اور ناقابل فراموش ہستی کی یاد میں ایک خاص نمبر کی اشاعت دل کا ایک قدرتی تقاضہ تھا۔ خیال ہوا کہ اگر یادگاری نمبروں کے عام طریقہ سے ہٹ کر اس نمبر کی نوعیت یہ رکھی جائے کہ مولانا کے مضامین و مقالات میں سے جو چیزیں کتابی شکل میں نہیں آسکی ہیں، ان میں سے اہم چیزوں کا انتخاب کر کے صرف انہیں سے یہ نمبر ترتیب دے دیا جائے تو اس بہانے ان منتخبات کو بھی کتابی شکل مل جائے گی۔ چنانچہ اس نمبر کی نوعیت یہی ہے کہ ''الفرقان'' میں شائع شدہ مولانا کے مضامین ومقالات میں سے چند کو منتخب کر کے یہ نمبر ترتیب دیا گیا ہے۔

قبل اس کے کہ ان منتخبات کا تعارف کرایا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ''الفرقان'' میں شائع شدہ مولانا کے مضامین ومقالات کی پوری فہرست کا ایک اجمالی جائزہ لے لیا جائے تاکہ مولانا کے افادات کا جو خزانہ ''الفرقان'' میں محفوظ ہے اس کی ایک فہرست لوگوں کے ہاتھ میں آجائے اور کسی وقت کوئی فائدہ اٹھانا چاہے تو اٹھا سکے۔

۱۔ مولانا کا سب سے پہلا مقالہ حضرت مجدد الف ثانیؒ پر ''الف ثانی (یا ہزارہ دوم) کا تجدیدی کارنامہ'' ''الفرقان'' کے مجدد الف ثانی نمبر ۱۳۵۷ھ میں شائع ہوا۔ اس کا تعارف آگے اس نمبر کے مشتملات کے ذیل میں آئے گا۔

۲۔ اس مقالہ کے بعد اسی سنہ کے آخری شمارہ (بابت ماہ ذی قعدہ و ذی الحجہ) سے مولانا کا دوسرا مضمون ''دارالعلوم دیوبند'' پر شروع ہوا جو صفر ۵۸ھ کے شمارہ میں تیسری قسط پر تمام ہوا۔ یہ مضمون دراصل دارالعلوم دیوبند کے متعلق ایک استفسار کا جواب ہے جو حکومت آصفیہ (حیدرآباد) کے ایک تعلیمی افسر کی جانب سے کیا گیا تھا۔ اس میں مولانا نے اپنے خاص تحریزی اسلوب کے بجائے نہایت سادہ اور معروف انداز بیان اختیار کیا ہے...... یہ مضمون ۳۳ صفحات پر ہے اور اسے ہم دارالعلوم، اس کے مقاصد اور منافع کا بہترین تعارف قرار دے سکتے ہیں......اور کیوں نہیں جبکہ یہ دارالعلوم کے مولانا گیلانی جیسے بالغ نظر، دقیقہ رس فرزند جلیل کی کاوش کا نتیجہ ہے۔

۳۔ مجدد الف ثانی نمبر میں مولانا کا جو مقالہ شائع ہوا تھا وہ نا تمام رہ گیا تھا۔ ربیع الثانی ۵۸ھ کے شمارہ میں اس مقالہ کی دوسری قسط شائع ہوئی۔ مگر افسوس کہ اس پر بھی یہ مقالہ ناتمام ہی رہا۔

۴۔ ۵۸ھ ہی میں شوال وذیقعدہ کے مشترک شمارہ سے مولانا کا نہایت اہم علمی مقالہ ''امام ابوحنیفہ'' کی سیاسی زندگی'' شروع ہوا۔ ذی الحجہ ۵۸ھ میں اس کی دوسری قسط شائع ہوئی اور صفر و ربیع الاول ۵۹ھ کے مشترک شمارہ میں تیسری قسط۔ یہ کل ۴۵ صفحات ہیں۔ ''الفرقان'' میں تو یہ سلسلہ نہ معلوم کیوں اتنے صفحات پر رک گیا لیکن بعد میں یہ چند قطرے بڑھ کر دریا بنے اور چار سو صفحے کی ایک ضخیم کتاب تیار ہوگئی جو اسی نام (امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی) سے کراچی سے شائع ہوئی اور اسے ان کی تصانیف میں ایک اہم حیثیت حاصل ہے۔

۵۔ مجدد نمبر کے بعد ۵۹ھ میں الفرقان کا دوسرا عظیم الشان خاص نمبر ''شاہ ولی اللہ نمبر'' شائع ہوا۔ اس میں مولانا گیلانی کا مجدد صاحب کے بعد حضرت شاہ ولی اللہؒ پر دوسرا معرکتہ الآرا مقالہ آیا۔ یہ مقالہ ایک پورا رسالہ ہے جو باریک قلم کے ۱۲۶ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور کتب خانہ الفرقان نے اسے نمبر کے بعد علیحدہ بھی شائع کیا تھا۔ یہ بھی مولانا کی وسعت نظر اور دقت فکر کا شاہکار ہے اور جیسا کہ ان کے مقالات کا عموماً انداز ہوتا ہے، معلومات کا ایک بحر مواج ہے جو قلم کو قابو میں نہیں رہنے دیتا اور ہر ہر ضمنی بات پر بھی بہتا ہوا وہ بار بار اتنی دور نکل جاتا ہے کہ اصل موضوع کی طرف واپسی تک ضمنی معلومات کا ڈھیر لگ جاتا ہے۔ اس میں بھی مولانا نے مجدد صاحب والے مقالہ کی طرح پہلے بڑی تفصیل کے ساتھ اس تاریک ماحول اور طوفانی عہد کا نقشہ کھینچا ہے جس میں حضرت شاہ ولی اللہ کی ولادت ہوئی اور جس میں آپ کی ابتدائی زندگی گزری کہ......اجمالاً خود مولانا ہی کے الفاظ میں......

''اس وقت ہر چہار طرف سے اسلام نرغہ میں گھرا چلا جاتا تھا شمالی مغربی علاقوں میں سکھوں کی آتشیں قوت سر اٹھا رہی تھی۔ جنوبی ہند سے مرہٹوں کا سیلاب ٹھاٹھیں مارتا ہوا ''اعزۃ'' کو ''اذلۃ'' بنانے میں بیدردی سے سرگرم تھا۔ دونوں قوتوں میں باہم جو کچھ بھی اختلاف ہو لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کے مآثر ونشانات ان کے نام لیواؤں اور وابستوں کا بالکل ہی قلع قمع کرنے پر دونوں ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ تیسری طرف خلیج بنگال کے ساحلی علاقوں سے مغربی قوتیں بتدریج اپنا پنجہ ملک پر جماتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھیں ...... اور یہ تو بیرونی فتنے تھے، اندر ایرانیوں اور تورانیوں، پھر ان کے ساتھ روہیلوں کے باہمی تصادم، اور مختلف اغراض ومقاصد کی کشمکش سے ''اسلامی حکومت ہند'' کی قبا تار تار ہو رہی تھی۔ ان سیاسی مقاصد کے ساتھ ساتھ صوفیا کے غلط تصوف اور فقہاء کے غلط تفقہ، حد سے گزری ہوئی عصبیت اور جاہلی حمیت نے امت کے شیرازوں میں الگ انتشار پیدا کر رکھا تھا...... اسی کے ساتھ ساتھ ایرانی علماء اور شعراء کا جو دباؤ مختلف وجوہ سے ہندوستانی علماء، ارباب فکر ونظر اور تعلیم وتدریس وتصنیف وتالیف

Marfat.com

کے نظام پر پڑ رہا تھا اس کی وجہ سے آہستہ آہستہ یہاں کے اہل علم کا تعلق، قرآن و حدیث، تحقیقی فقہ و اصول فقہ اور عقائد و کلام سے ہٹ کر بے معنی لاطائل ذہنی اور لفظی مباحث کے گورکھ دھندوں میں اُلجھ اُلجھ کر "خسر الدنیا والآخرہ" کی صورت کو پیدا کر رہا تھا کہ ان لاحاصل مساعی کا کوئی نتیجہ نہ ان کو دنیا میں مل سکتا تھا نہ آخرت میں......"

اسی اجمال کی تفصیل ہے جو اس مقالہ کے تقریباً ۵۷ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے جس میں مولانا کی باریک بینی اور دقیقہ رسی کا بصیرت افروز منظر دیکھ کر اسلامی ہند کی تاریخ کا طالب علم حیران رہ جاتا ہے کہ "ایک ایسے اہل قلم کی نگاہ جس کی تعلیم صرف عربی مدارس میں محدود رہی، کیسے ان باریک گوشوں تک پہنچی" اور خیال کرنے لگتا ہے کہ "اگر ان کی تعلیم خالص انگریزی طرز کی ہوتی اور وہ اپنا موضوع صرف تاریخ ہند ہی بنا لیتے تو شاید ان کے پایہ کا کوئی مؤرخ ہندوستان میں نہ ہوتا۔"

اس تفصیل کے بعد ولی اللٰہی کارناموں کی تفصیل پیش کی گئی ہے کہ اللہ نے اسلام کی کشتی کو اس منجدار سے نکالنے کے لئے حضرت شاہ صاحبؒ سے کیا کیا کام کس طریقہ سے انجام دلائے۔

۶۔ شاہ ولی اللہ نمبر کے بعد ۶۰ھ کے فائل میں مولانا گیلانی کا کوئی مضمون نہیں ہے۔ ۶۱ھ کی جلد میں البتہ چار چھوٹے چھوٹے مضامین ہیں جن میں سے دو تو مولانا کی مشہور تصنیف "الدین القیم" کے دو حصے ہیں جو کتاب کی اشاعت سے قبل مولانا نے "الفرقان" کے لئے عنایت فرما دیئے تھے۔ باقی دو میں سے ایک عیدالاضحیٰ پر ہے۔ "بقرعید یا عملی اسلام کا "پہلا دن" کے عنوان سے۔ دوسرا معراج پر ہے جس کا عنوان ہے "عالم غیب کا طویل سفر"۔ یہ درحقیقت ایک ریڈیائی تقریر ہے۔ دونوں مضمون مختصر ہونے کے باوجود نہایت جامع اور مولانا کی خاص علمی شان کے مظہر ہیں۔

۷۔ مولانا کی ایک اہم کتاب "اسلامی معاشیات" ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کا بار تو ادارہ الفرقان اپنے وسائل کی قلت کی وجہ سے نہ اُٹھا سکا مگر اس کے مضامین کی نقاب کشائی کا فخر اولاً "الفرقان" ہی کے حصہ میں آیا۔ "الفرقان" صفر و ربیع الاول ۶۲ھ میں اس کا ایک پورا باب ۴۴ صفحہ پر شائع ہوا اور کوئی سال بھر تک اس کے مختلف حصے "الفرقان" میں مسلسل نکلتے رہے۔ اس طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کا بڑا حصہ پہلے "الفرقان" میں شائع ہوا۔

۸۔ ۴۷ء میں تقسیم ہند کا واقعہ پیش آیا اور جان و مال کی تباہی کا طوفانی عہد گذر جانے کے بعد مستقبل میں دین کی حفاظت اور باعزت زندگی کے دو اہم سوال مسلمانوں کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ ہر حساس اور صاحب فکر مسلمان نے وقت کے ان اہم مسائل سے تعرض کیا۔ مولانا بھی کیسے بے تعلق رہ سکتے تھے چنانچہ شوال ۶۶ھ کے "الفرقان" میں "چند تجاویز" کے عنوان سے مولانا کا ایک مختصر مضمون شائع ہوا جس کا خاص تعلق پہلے مسئلہ سے ہے اور اگلے ہی شمارہ میں دوسرا مضمون "ان دیکھی قوت کا ایک پوشیدہ خزانہ" آیا جس کا رخ "باعزت زندگی" کے سوال کی طرف تھا۔ افسوس ہے کہ یہ مضمون ادھورا رہ گیا۔ ورنہ اگر

Marfat.com

پورا ہو جاتا تو بڑی مفید اور پُراز معلومات چیز ہوتی۔ اس میں مولانا نے تمہیدی باتوں کے بعد مسلمانوں کی تاریخ سے مثالیں پیش کر کے یہ بتانا چاہا تھا کہ اخلاق اور سیرت کی مضبوطی ایسی مؤثر قوت ہے کہ ظاہری قوت سے محرومی کے باوجود اس قوت کے حاملین ہر جگہ جگہ بنا لیتے ہیں۔ اس پہلی قسط میں صرف ہندوستان اور چین کی مثالیں آئی تھیں۔ پتہ نہیں آگے مولانا ہی نہ لکھ سکے یا کیا ہوا۔ بہر حال ''الفرقان'' میں اس مضمون کو نامکمل پا کر افسوس ہوا۔

۹۔ ۶۸ھ میں ادارہ ''الفرقان'' کو حج کے موقع پر ''الفرقان'' کا حج نمبر نکالنے کا خیال ہوا۔ مضمون کے لئے مولانا سے بھی عرض کیا گیا۔ چنانچہ مولانا کا ایک ۳۴ صفحے کا مقالہ حج کی حقیقت پر آیا۔ عنوان تھا ''حج کیا ہے؟'' یہ اس نمبر کا خاص مقالہ تھا۔ یہ چونکہ پیش نظر نمبر میں بھی شامل ہے اس لئے اس کا تعارف آگے ذرا تفصیل سے آئے گا۔

۱۰۔ ۶۸ھ مطابق ۴۹ء میں مولانا چونکہ حیدر آباد سے پنشن لے کر مستقل طور پر اپنی ''کہفی قیام گاہ'' گیلانی میں قیام فرما ہو گئے تھے اور تصنیف و تالیف کے لئے کمل فرصت میسر آ گئی تھی۔ لہٰذا ذی الحجہ ۶۸ھ کے شمارہ سے مولانا کا سب سے زیادہ طویل مضمون ''دجّالی فتنہ اور سورہ کہف'' شروع ہوا جو ۲۱ قسطوں میں ۲۶۰ صفحات پر جمادی الاخریٰ ۷۱ھ کے ''الفرقان'' میں پورا ہوا۔ یہ مضمون بھی اس نمبر میں شامل ہے بلکہ نمبر کا سہرا در اصل اسی مضمون کے سر ہے اس لئے اس کا تعارف بھی آگے مندرجات کے ذیل میں کرایا جائے گا۔

۱۱۔ ۶۸ھ کے بعد ۶۹ھ ۷۰ھ میں بھی ''الفرقان'' کا حج نمبر نکلا۔ ۶۹ھ کے حج نمبر میں مولانا کا مضمون دربار نبوت کی حاضری شائع ہوا جو مولانا کے سفر مدینہ کی سرگذشت تھی۔ ۷۰ھ کے حج نمبر میں مدینہ سے مکہ تک کا سفرنامہ آیا جس کا عنوان تھا ''راہ کعبہ کے احساسات و واردات'' ۷۰ھ کے بعد حج نمبر کے عنوان سے ''الفرقان'' کا خاص نمبر تو نہیں نکلا البتہ قیام مکہ اور حج کے جو حوال مولانا کی روداد سفر میں سے باقی رہ گئے تھے، رمضان شوال ۷۱ھ کے شمارہ میں ''اللہ کے گھر پہنچ کر'' کے عنوان سے مولانا نے وہ بھی سپرد قلم فرما دیئے اور اس طرح تین قسطوں میں مولانا کا سفرنامہ حجاز شائع ہو گیا۔

۱۲۔ رمضان شوال ۷۱ھ کے شمارہ سے پہلے شعبان کے شمارہ میں رمضان کی مناسبت سے مولانا کا ایک مضمون ''روزہ اور قرآن'' بھی شائع ہوا تھا جس میں خالص قرآنی نقطہ نظر سے روزہ کی حقیقت اور اس کے رموز و اسرار پر روشنی ڈالی گئی تھی اور روزہ کی حکمتوں کے بارے میں متجددانہ نقطہ نظر پر تنقید کی گئی تھی۔

۱۳۔ ذی الحجہ ۷۱ھ سے مولانا نے ایک نیا سلسلہ شروع کیا جس کا عنوان تھا۔ ''ہادم اللذات'' (یعنی موت) اس عنوان کے تحت، مولانا کا ارادہ (خود مولانا ہی کے الفاظ میں) یہ تھا کہ

> ''ایسے واقعات جن کا موت سے تعلق ہے ان ہی کا ذکر اس عنوان کے تحت ان شاء اللہ کیا جائے گا......
>
> ابتداء میں تو چند خاص استثنائی حوادث کا تذکرہ کیا جائے گا، بعد کو ارادہ یہی ہے۔ اللہ اسے پورا

کرے کہ مرتے ہوئے مرنے والوں پر جو کچھ گذری اور اتفاقاً کتابوں میں اس کا تذکرہ کر دیا گیا ہے، حتی الوسع اسی کو جمع کر دیا جائے۔ ممکن ہے کہ آئندہ وہ کوئی کتاب ہی بن جائے۔''

(الفرقان، ذی الحجہ ۱۷ھ)

چنانچہ اس سلسلہ کی پہلی اور دوسری قسط (صفر ۷۲ھ) میں تو مولانا نے چند ایسے استثنائی واقعات پیش فرمائے تھے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی مرنے والوں کی روح زندوں کے ساتھ تعلق قائم کر سکتی ہے۔ بعد کے مضامین میں اچھی اور بری زندگی گذار کر مرنے والوں کی موت کے وقت کی تصویر کشی کا سلسلہ شروع کیا اور اس کے لئے انداز ایسا اختیار کیا جس سے ان واقعات کے بیان پر ''ہادم اللذات'' کا عنوان بالکل راست آ گیا۔ اچھی زندگی گزار کر مرنے والوں کی موت کے وقت کا تذکرہ تو مولانا نے کہیں کہیں صرف مقابلتاً کیا اصل مقصود صرف غفلت وطغیان اور لذت کوشی کی زندگی گزارنے والوں کی موت کا تذکرہ تھا کہ موت کے پنجہ نے کس طرح چشم زدن میں انہیں ساری شوخی اور لذت کوشی بھلا دی اور خود انہیں کی زبان سے اعتراف کرا دیا کہ وہ بڑے خسارے میں رہے۔ اس سلسلہ میں پہلا تذکرہ عضد الدولہ دیلمی کا ہے کہ وہ کیا تھا قدرت کی عنایت سے کیا بنا۔ افلاس کی گود میں پلا تھا۔ بڑے ہو کر مسند حکومت پر پہنچا۔ خوب خوب گلچھرے اڑائے۔ ہر بام کبریائی پر کمندیں ڈالیں مگر کتنے دن؟ صرف چند سال یہ قصہ رہ سکا۔ یکا یک موت کے پنجے نے آ دبایا اور اس کی زبان سے اعتراف کرایا کہ ''آج مجھ سے زیادہ بدبخت اور کون ہوگا جس کی دنیا بھی برباد ہوئی اور اپنی ابلہی کا شکار ہو کر اپنے دین کو بھی وہ کھو بیٹھا۔''

اسی طرح مولانا نے بنوامیہ کے تین گورنروں زیاد، حجاج اور خالد تینوں کی زندگیوں کو اسی سلسلہ کے الگ الگ مضامین میں بڑی تفصیل کے ساتھ پیش کیا اور ان کے ظلم وطغیان اور اقتدار کی مستی کی مکمل تصویر دکھانے کے بعد دکھایا کہ انہیں کیسی موت سے واسطہ پڑا اور موت کے وقت ان پر کیا گزری اور کیا کہتے ہوئے وہ مرے...... یہ دنیا کی بے ثباتی کے بڑے عبرت انگیز مرقعے ہیں۔ ان میں سے ایک مضمون جس کا تعلق حجاج کی موت سے ہے، سلسلہ ''ہادم اللذات'' کے نمونہ کے طور پر اس نمبر میں بھی شامل کیا گیا ہے اس کا عنوان ہے ''وفا شعاری کے دو نادر نمونے۔'' اس میں مولانا نے حجاج کے بالمقابل ایک اور صالح شخصیت کی موت کا تذکرہ بھی کیا ہے جنہوں نے فقہ حنفی کے بانی حضرت امام ابراہیم نخعیؒ کی زندگی بچانے کے لئے اپنی جان حجاج کے ظلم کی نذر کر دی۔

۱۴۔ اس سلسلہ کے بعد مولانا کے دو مضمون اور شائع ہوئے (جنہیں چاہا جائے تو اس سلسلہ میں بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔) ایک شیر شاہ سوری کے عہد حکومت سے متعلق تھا دوسرا حضرت مولانا قاری عبدالرحمٰن پانی پتیؒ کی زندگی کے بعض پہلوؤں پر۔ شیر شاہ سوری سے متعلق مضمون مولانا کی خاص تحقیقی شان اور ذہانت کا مظہر ہے۔ مولانا نے شیر شاہ کے پنج سالہ عہد حکومت کے کارناموں کو ایک ''پنج سالہ سکیم'' کی صورت میں پیش کیا ہے اور دکھایا ہے کہ مرحوم بادشاہ نے اس تھوڑی سی مدت میں رفاہ عامہ اور امن وامان کے سلسلہ میں کیسے پائیدار اور وسیع وعریض کام کئے کہ ان سے آج ''پنج سالہ سکیموں'' کے دور میں بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا

ہے......ساتھ ہی شیر شاہ کے دینی مقام کو بھی آشکارا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ ہے''الفرقان'' میں شائع ہونے والے مولانا کے مضامین کی مختصر فہرست اور اس میں وہ مضامین درج نہیں کئے گئے ہیں جو دوسری جگہ اشاعت کے بعد مولانا کی فرمائش پر یا بغیر فرمائش کے''الفرقان'' میں نقل کئے گئے۔

اب آیئے مولانا کے ان افادات کے متعلق خصوصی طور پر کچھ عرض کر دیا جائے جو اس نمبر میں شامل کئے گئے ہیں۔

یہ چار مضامین ہیں (۱) الف ثانی (یا ہزارہ دوم) کا تجدیدی کارنامہ (۲) حج کیا ہے؟ (۳) دجّالی فتنہ اور سورہ کہف (۴) وفا شعاری کے دو نادر نمونے

الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ

مولانا کا یہ مقالہ حضرت مجدد الف ثانیؒ پر ہے۔''الفرقان'' کے مجدد الف ثانی نمبر (۵۷ھ) میں شائع ہوا تھا۔ یہ مقالہ مولانا کے یادگار مقالات میں سے ہے۔اس کی اشاعت ہوئی تو علمی حلقوں میں ایک دھوم مچ گئی اور آج تک اس کی آواز بازگشت سنائی دیتی ہے۔مولانا کے انتقال کے بعد جہاں کہیں ان پر کچھ تفصیل سے لکھا گیا اور ان کے علمی کارنامہ گنائے گئے، اس مقالہ کو سرفہرست جگہ ملی۔اس کے بارے میں ہمیں کچھ زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت اس لئے نہیں کہ چونکہ یہ مقالہ بالکل نامکمل حالت میں ہے اور پھر بھی پچاس صفحات سے زائد کا ہے اس لئے اسے من و عن درج نہیں کیا گیا ہے بلکہ جناب مولانا نسیم احمد صاحب فریدی امروہوی کو تکلیف دے کر اس کی تلخیص کرائی گئی ہے۔یہی تلخیص اس نمبر میں شامل ہے۔فریدی صاحب نے تمہید میں اس مقالہ کا اچھا تعارف بھی کر دیا ہے اسی لئے اس کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ یہاں مزید کچھ عرض کیا جائے۔

حج کیا ہے؟

یہ مقالہ''الفرقان'' کے حج نمبر (۶۸ھ) میں شائع ہوا تھا۔ جو لوگ اس کو غور سے پڑھیں گے امید ہے کہ وہ اس کی قدر و قیمت کے ہماری طرح قائل ہوں گے اور انہیں بڑے نوادر اس کے مطالعہ سے ہاتھ آئیں گے۔اس میں مولانا نے پہلے یہ دکھایا ہے کہ کعبہ، جو اعمال حج کا محور ہے، اس کا تعلق عالم ارضی سے کیا ہے۔اس سلسلہ میں نباتی اور انسانی وحیوانی حقائق پر نظر ڈال کر انہوں نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ جس طرح نباتات کا قیام و بقا، ان کا نشو ونما اور ان کا سلسلہ برگ و بار، بیج اور گٹھلیوں کے اندر کے ایک انکھوے سے وابستہ نظر آتا ہے جسے نباتات اور ان کی تمام پیداواروں کا مرکزی نقطہ کہا جا سکتا ہے یا انسان وحیوانی اجسام کے قیام و بقا اور ان کے نشو ونما کا دار و مدار دل پر ہے۔کیا اسی طرح مٹی کا یہ تودہ جسے زمین یا دھرتی کہتے ہیں اور جس سے علاوہ عناصر اور معدنی مرکبات کے نباتی، حیوانی اور انسانی ہستیوں کی بے پناہ موجیں ابل رہی ہیں۔یہ (زمین) بھی اپنے اندر کیا کوئی ایسی چیز نہیں رکھتی جسے اس کی ان تمام پیداواروں کا

مرکزی نقطہ ٹھہرایا جائے؟ کیا اس کا کوئی دل نہیں ہے جس سے ان پیداواروں کی رگوں میں نشو و نما اور ارتقاء و بقاء کا خون دوڑ رہا ہو؟ یہ سوال اٹھا کر مولانا نے قرآن کی آیتوں سے اس کا جواب دیا ہے کہ بے شک زمین کا بھی دل اور ایک مرکزی نقطہ ہے اور وہ ہے "کعبہ"۔

اس موقع پر آیات کے الفاظ سے مولانا کا استشہاد بس دیکھنے اور یاد رکھنے کے قابل ہے۔ انہیں آیات سے سینکڑوں بار ہم گزرتے ہیں اور ان الفاظ کے وہی معنی ہم بھی جانتے ہیں جو مولانا نے بیان فرمائے ہیں مگر مولانا انہیں مشہور معانی سے وہ بات پیدا کر دیتے ہیں جو کبھی حاشیہ خیال میں بھی نہ آئی تھی۔ اور لطف یہ کہ بات بالکل دل کو لگتی۔ یہ مولانا کے انتقال ذہن کا کمال ہے جو ان کا خاص امتیاز ہے۔

اسی ذیل میں مولانا نے کعبے کی قدامت اور اس کے وسط ارض میں واقع ہونے کو بھی تاریخی بیانات اور صحف قدیمہ اور جغرافیائی حقائق سے ثابت کیا ہے، جو اس کی مرکزیت کا اقتضاء ہے اور نتیجہ یہ نکالا ہے کہ خالق کائنات نے جب انسان کو خلیفہ بنا کر زمین پر آباد کرنے کا فیصلہ فرمایا تو اس کے قیام و بقا، نشو و نما اور امن و ارتقاء کے لئے کعبہ کو مرکز قرار دیا اور جیسے سارے عالم میں اپنی رحمتوں کو تقسیم کرنے کے لئے الرحمن عرش پر مستوی ہوا اسی طرح کرہ زمین کی رحمتوں کی تقسیم کے لئے کعبہ کو اس نے اپنی تجلی کی فرودگاہ خاص ٹھہرایا...... پس ذات حق کی تجلی گاہ خاص ہونے کی وجہ سے وہ "بیت اللہ" ہے اور یہی بنیاد ہی کعبہ کے ساتھ انسانوں کے ان روحانی تعلقات کی جو اسلام قائم کراتا ہے جن میں سے ایک تعلق کی عملی شکل نماز ہے اور دوسرے کی حج۔

یہاں پہنچ کر مولانا یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ تعلقات کی ان دو شکلوں میں اس قدر اختلاف کیوں ہے کہ ایک میں انتہائی صفائی، ستھرائی، وقار و سنجیدگی اور متانت و مسکنت ہے کہ ہر بار منہ، ہاتھ، پاؤں دھوؤ، معقول لباس پہنو، دوڑ کر مت آؤ اور خاموش رہو اور دوسرے میں جتنا زیادہ میلے کچیلے، دیوانہ وش اور پراگندہ حال رہو۔ جتنا زیادہ دوڑو بھاگو اور شور مچاؤ اتنی ہی سرخروئی حاصل کرو......؟

مولانا فرماتے ہیں۔ فطرت انسانی کے دو پہلو ہیں۔ ایک طرف انسان قدرت کے حاکمانہ اقتدار کے آثار کو اپنے اوپر طاری کرنا چاہتا ہے اور ساری کائنات کو قدرتی قوانین کی پابندی ہی کے ذریعے ترقی اور کامیابی کے مراحل طے کرتا ہوا دیکھتا ہے تو وہ اپنی کامیابی کا راز بھی انہیں پابندیوں میں پوشیدہ سمجھتا ہے۔ انسانی فطرت کے اس اندرونی تقاضہ کی تکمیل نماز کے ذریعے کی گئی ہے مگر اسی کے ساتھ انسان کی فطرت میں جمال پرستی اور حسن پسندی بھی ہے اور اسی پر اس کے نوعی امتیاز کی بنیاد قائم ہے۔ تلاش حسن اور جستجوئے جمال کے جذبہ کے ساتھ وہ پیدا بھی ہوتا ہے اور اسی جذبہ کو ساتھ لئے وہ مرتا ہے۔ بہتی ہوئی نہروں، لہلہاتے ہوئے مرغزاروں، سرسبز وادیوں کے نشیب و فراز اور شگفتہ و نیم شگفتہ پھولوں، الغرض جمادی اور نباتی سانچوں میں حسن و جمال کی تجلیاں جب ڈھل کر سامنے آتی ہیں تو ان کو دیکھ کر گدھے گھوڑے اور بکرے نہیں صرف آدم کے بچے اور حوا کی بچیاں ہی کیف و سرور اور وجد و نشاط میں سرمست ہوتے ہیں۔

بہر حال یہ واقعہ ہے کہ انسان کی فطرت میں حسن پرستی اور تلاش جمال کا ایک غیر معمولی جذبہ موجود ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ کائنات کے اندر حسن و جمال کی جو لہریں مختلف مظاہر میں پائی جاتی ہیں، ان کا آخری

سرچشمہ وہی ہے جو ہر خوبی وکمال کا مبداء ومنتہیٰ ہے یعنی اللہ حج اسی جمال مطلق اور حسن ازل کی جستجو کی عملی شکل ہے جو اس کے سارے عملی ڈھانچہ میں جھلکتی ہے اور اسے نماز کے ڈھانچہ سے بالکل مختلف نوعیت بخشتی ہے۔

انہیں حقائق کو مولانا نے اپنے خاص انداز میں ۲۰۔۲۱ صفحے میں بیان فرمایا ہے۔اصل مضمون میں تو آگے اور بھی کچھ چیزیں تھیں مگر ہم نے آگے کے وہ صفحات اس انتخاب میں حذف کردیئے ہیں اور صرف اتنا ہی حصہ یہاں لیا ہے جس کا تعلق موضوع سے ہے۔ہمیں اس کا احساس ہے کہ اختتام پر کچھ تشنگی سی محسوس ہوتی ہے مگر آگے کے چند جملے جو آخری پیراگراف کی تکمیل کرتے ہیں ایسا معلوم ہوا کہ ان کی کتابت میں کچھ غلطی ہوگئی ہے جس سے ناظرین کو الجھن پیش آتی اس لئے یہی مناسب سمجھا گیا کہ پیراگراف چند جملے پیشتر ہی ختم کردیا جائے کیونکہ بات بہرحال پوری ہو جاتی ہے۔

دجالی فتنہ اور سورۂ کہف

سچ پوچھئے تو یہی مضمون اس خیال کا محرک بنا کہ بجائے مولانا کے متعلق مضامین کا مجموعہ شائع کرنے کے خود ان کے مضامین کا مجموعہ (یعنی بجائے گیلانی نمبر کے افادات گیلانی نمبر) شائع کیا جائے۔مولانا نے اس مضمون میں سورہ کہف کی تفسیر ایک نئے انداز سے کی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت پر انہوں نے ایک خاص نقطہ نظر سے مدتوں غور کیا تھا اور اسی غور وفکر کے سرمایہ کو اس مضمون میں پیش کیا مگر غلطی یہ ہوئی کہ اتنی طویل چیز جو ایک کتاب کی شکل میں شائع کی جانی چاہیے تھی، ایک ماہنامہ کے صفحات میں شائع ہوئی۔''الفرقان'' کی ضخامت ہی کیا ہے۔پھر بھی کافی لمبی لمبی قسطیں کرنے کے باوجود یہ مضمون اکیس قسطوں میں پورا ہوسکا اور درمیانی ناغوں کی وجہ سے ڈھائی سال میں یہ قسطیں شائع ہوسکیں۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے ناظرین کے سامنے تو یہ سلسلہ کہیں درمیان سے آیا اور شروع کی کڑیاں سامنے نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس سے کوئی دلچسپی نہ لے سکے اور جن کے سامنے یہ مضمون ابتداء سے آیا وہ بھی ماہناموں کے عام ناظرین کی عادت کے مطابق عام طور پر اس کی طوالت سے اکتانے سے لگے۔الغرض بہت کم لوگ نکلے جو دلجمعی کے ساتھ اس مختلف قسم کے مواد سے بھرپور مضمون سے فائدہ اٹھا کر اس کی قدر شناسی کا ثبوت دیتے رہے۔اس کا مولانا کو بھی قلق تھا اور ادارہ الفرقان کو بھی افسوس رہا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ مضمون تدبر قرآن کی ایک نئی راہ کھولتا ہے اور چاہے مولانا کے نتائج فکر سے پورا اتفاق نہ کیا جائے مگر زمانہ کے نت نئے حالات و مسائل میں قرآن سے ایک زندہ کتاب کی طرح استفادہ کرنے کا ایک ڈھنگ ضرور ان کے مطالعہ سے ہاتھ آتا ہے۔اسی لئے خود مولانا کی جتنی خواہش ہوگی وہ تو ظاہر ہے خود ہماری خواہش تھی کہ لوگوں کے لئے اس کے مطالعہ کی کوئی بہتر صورت نکالی جاتی۔مولانا کے سانحہ ارتحال کے بعد جب ان کی یاد میں ''الفرقان'' کا ایک خاص نمبر نکالنے کا خیال پیدا ہوا اسی قت یہ ذہن میں آیا کہ یہی موقع اس خواہش کو پورا کرنے کے

Marfat.com

لئے غالباً سب سے زیادہ مناسب ہے اور مرحوم کی روح کو شاد کرنے کا شاید یہی سب سے اچھا ذریعہ ہوگا۔

اس مقصد کے لئے ضروری معلوم ہوا کہ اس مضمون کی کچھ خدمت کی جائے اور اپنی جیسی پوری کوشش کر کے ایسی صورت کر دی جائے کہ لوگ آسانی سے اس مضمون سے مستفید ہو سکیں کیونکہ مولانا کے لکھنے کا انداز تو یہ تھا جیسا کہ انہوں نے خود مولانا سید سلیمان ندوی کو اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا ہے کہ

> ''ایک بار جھونک میں لکھنے بیٹھتا ہوں تو لکھتا چلا جاتا ہوں، پھر اس کی نظر ثانی، حک و اصلاح میرے لئے مشکل ہوتی ہے۔ میں چھاپنے والے پر چھوڑ دیتا ہوں کہ خرافات کو حذف کر کے کارآمد اجزاء کا انتخاب کر لیں۔'' (معارف۔ مارچ ۵۷ء۔ ص ۱۸۴)

''خرافات'' کا لفظ تو خیر مولانا کی کسر نفسی ہے۔ البتہ مولانا کے یہاں بات میں بات بہت نکلتی ہے۔ یہ ضمنی باتیں اگرچہ بذات خود سب نہایت کارآمد اور پُراز معلومات ہوتی ہیں مگر عام ناظرین کے لئے بعض وقت یہ بھول بھلیاں بن جاتی ہیں جس سے انہیں موضوع سے تعلق قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے اور ذہن میں ایک انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ مولانا نے شاید اسی قسم کی چیزوں کو خرافات سے تعبیر کر دیا ہے۔

بہر حال عام ناظرین کی سہولت کے خیال سے ضروری معلوم ہوا کہ اولاً غیر متعلق باتوں سے پیدا ہونے والی مضمون کی طوالت اور اس کے پیچ و خم کو ممکن حد تک کم کر دیا جائے۔ دوسرے جتنے حصے سے مضمون کا مقصد پورا ہو جاتا ہے بس اتنے ہی حصہ پر اکتفاء کیا جائے اور باقی حصہ میں سے بغیر کسی تسلسل کے صرف خاص خاص افادات لے لئے جائیں۔ چنانچہ اس نقطہ نظر سے جب مضمون پر کام کیا گیا تو ۲۶۰ صفحات میں سے کوئی ۱۵۰ صفحے رہ گئے جو اس نمبر کے مسطر کی تبدیلی (یعنی سطروں کی تعداد اور لمبائی میں اضافہ) اور کتابت کے گٹھاؤ کی وجہ سے صرف ۱۱۲ صفحے میں آ گئے۔

حذف کے علاوہ کہیں لفظی ترمیم بھی کی گئی۔ عبارت کو سہل الفہم بنانے کے لئے ضرورت محسوس ہوئی تو کہیں کوئی لفظ یا جملہ بڑھا بھی دیا گیا اور اس کے علاوہ بعض حواشی بھی لکھے گئے ہیں۔

مزید برآں دو کام اور کئے گئے ہیں (۱) ایک تو یہ کہ مضمون کو مختلف مناسبتوں سے چھ حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور ہر حصہ پر مناسب عنوان قائم کر دیا گیا ہے کہ یہ چیز خود نفسیاتی طور پر ایک طویل مضمون کے مطالعہ کا بار ذہن سے ہلکا کرتی ہے۔ (۲) دوسرے یہ کہ مضمون بغلی سرخیوں سے بھی یکسر خالی تھا جو کہ فہم میں بڑی آسانی پیدا کرتی ہیں اور قاری کے ذہن میں مباحث کے انضباط کا ذریعہ بنتی ہیں۔ راقم مرتب نے جہاں جہاں ممکن ہوا یہ بغلی سرخیاں قائم کر دی ہیں جن کی تعداد غالباً کئی سو ہو گی۔

بہر حال یہ محنت صرف اس لئے کی گئی ہے کہ عام ناظرین سہولت کے ساتھ اس مضمون سے مستفید ہو سکیں اور مولانا مرحوم کی یہ محنت کم از کم ان کے بعد ہی ٹھکانہ لگ جائے۔

اس مضمون میں کیا کچھ ہے؟ اب اس پہلو پر روشنی ڈالنے کی تو ان صفحات میں زیادہ گنجائش رہی نہیں۔ مختصراً اتنا ضرور عرض کر دینا چاہئے کہ اس کے بعض مباحث مثلاً عیسائیوں کا عقیدہ ولدیت اور اس کے آثار بڑے نادر اور اچھوتے مباحث ہیں۔ مولانا کی وسعت معلومات اور ان کی ممتاز ذکاوت و ذہانت اور دقیقہ رسی کی غیر معمولی صلاحیت

Marfat.com

نے قطروں کو لے کر سمندر کر دیا ہے۔ جو لوگ توجہ سے اس کا مطالعہ کر لیں گے وہ کتنے ہی موضوعات پر اپنا دامن بیش بہا معلومات سے بھر لیں گے۔

وفا شعاری کے دو نادر نمونے

یہ اس مجموعہ کا آخری مضمون ہے۔ اس کا تعلق چونکہ بعض تاریخی واقعات سے ہے اس لئے اس کے تعارف میں کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ ایک سادہ سا تذکیری مضمون ہے جو واقعات سے ترتیب دیا گیا ہے۔ مولانا کے آخری سلسلہ مضمون کی ایک کڑی ہونے کی بناء پر مناسب معلوم ہوا کہ اسی کو افادات مندرجہ کی آخری کڑی بنا دیا جائے۔

مولانا کے افادات کے علاوہ اس نمبر میں دو مضمون اور ہیں۔ ایک سب سے پہلا مضمون مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے ہے جو مولانا مرحوم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا ایک جامع تعارف اور ان کی خصوصیات اور فضائل و کمالات پر ایک بصیرت افروز تبصرہ ہے۔ دوسرا مختصر مضمون مدیر ''الفرقان'' مدظلہ کا ہے جس سے مولانا گیلانی اور ''الفرقان'' کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔

کچھ مولانا کے اسلوبِ نگارش کے متعلق

راقم مرتب نے چاہا تھا کہ اس نمبر میں ایک مضمون مولانا کی انشائی خصوصیات اور ان کے اسلوب پر ہو جائے مگر افسوس ہے کہ خیال دیر سے آیا۔ چنانچہ جن حضرات سے اس کے لئے عرض کیا گیا ان کا جواب معذرت میں ملا۔ افسوس ہے کہ یہ بڑی کمی رہ گئی۔ ورنہ مولانا کے افادات سے استفادہ میں ناظرین کو اور زیادہ سہولت ہو جاتی۔ میں خود کو اس موضوع پر لکھنے کا اہل تو نہیں پاتا مگر ضرورت کے احساس کے تحت چند اشارات یہاں کئے جاتے ہیں۔ شاید کچھ مفید ہو سکیں۔ واضح رہے کہ یہاں مولانا کے صرف انہیں مضامین کو سامنے رکھ کر کچھ لکھا جا رہا ہے جو اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ نیز مولانا کے طرز انشاء پر کوئی تبصرہ اور ان کی تمام خصوصیات کا احصاء مقصود نہیں ہے بلکہ صرف تسہیل کے نقطہ نظر سے چند باتوں کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

۱۔ مولانا کے اسلوب کی سب سے پہلی خصوصیت کا آئینہ دار ان کی تحریر کا شروع ہوتا ہے۔ بعض مرتبہ تو وہ مضمون اسی طرح شروع کرتے ہیں جس طرح لکھنے کا عام اور مانوس طرز ہے مگر بعض مرتبہ وہ اس انوکھے ڈھنگ سے بات شروع کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو معلوم ہوتا ہے وہ شروع سے نہیں بلکہ بیچ سے کہیں مضمون پڑھنے لگا ہے۔ مثلاً ''وفا شعاری کے دو نادر نمونے'' میں انہیں مضمون اس بات سے شروع کرنا تھا

Marfat.com

کہ حجاج مروانی حکومت سے منسلک ہونے سے پہلے طائف کے ایک مکتب میں پڑھایا کرتا تھا۔ اس پیشہ کی آمدنی اس کی ضروریات کے لئے ناکافی ہوتی تھی۔ چنانچہ دمشق پہنچا اور عبدالملک کے وزیر کے باڈی گارڈ میں بھرتی ہوگیا اور یہاں سے اس پر ترقیوں کا دروازہ کھلا۔ اس بات کو دیکھئے وہ کس ڈھنگ سے کہتے ہیں۔

''طائف کے مکتب خانے میں بچوں کو پڑھاتا تھا لیکن معلم الصبیانی کے اس پیشہ سے اتنی آمدنی جو ضروریات کو کافی ہوتی، نہیں ہوتی تھی۔ پھر کیا کیا جائے۔ طائف سے اُٹھا، دمشق پہنچا۔ وقت کے حکمراں کا جو وزیر باتدبیر تھا، اس کے باڈی گارڈ کے سپاہیوں میں بھرتی ہوگیا۔ وزیر کا نام روح بن زنباع تھا۔ مروانی حکومت کے پہلے حکمران عبدالملک ابن مروان نے روح کو اپنا وزیر بنالیا تھا۔ بھرتی ہونے والا یوسف ثقفی باشندہ طائف کا لڑکا تھا۔ نام اس کا حجاج تھا۔''

۲۔ دوسری خصوصیت مولانا کی تحریر کی بات میں بات کی ہے۔ وہ ایک بات سے دوسری بات کی طرف اس طرح نکل جاتے ہیں کہ جیسے پہلی بات ہو ہی نہیں رہی تھی۔ اسی مضمون میں دیکھئے اوپر جو اقتباس دیا گیا ہے اس کے بعد اگر مولانا دوسری بات کی طرف منتقل نہ ہوجاتے تو یہ بتلاتے کہ حجاج کس طرح آگے بڑھا کہ اسے بدنام زمانہ چیرہ دستیوں کا موقع ملا مگر حجاج کا نام آنے پر مولانا کے قلم کا رخ اس طرف مڑ گیا کہ کون حجاج؟ وہی

''جس کی یاد کو مسلمان اپنے حافظہ سے مٹانا چاہتے ہیں لیکن بجائے مٹنے کے وہ تازہ ہی ہوتی رہتی ہے......''

اور پھر اسی ذیل میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا یہ قول نقل کرکے کہ ''دنیا کی ہر قوم اپنے اپنے فرعونوں کو لے کر کھڑی ہو تو مقابلہ میں مسلمانوں کا یہ فرعون سب پر بھاری ہوجائے گا۔'' مولانا نے اسی سے یہ گفتگو شروع کردی کہ حجاج ظلم وستم آئینی طور پر کرتا تھا یا غیر آئینی طور پر اور پورا ایک صفحہ اس پر صرف کرنے کے بعد پھر اس اصل بات پر آئے کہ وزیر کے باڈی گارڈ سے بڑھ کر وہ گورنری تک کیسے پہنچا۔

جی چاہتا تھا کہ اس کی اور چند مثالیں پیش کردی جائیں تاکہ ناظرین اس اسلوب سے اچھی طرح واقف ہوجاتے مگر جگہ کی تنگی اجازت نہیں دیتی۔

۳۔ مولانا کے اسلوب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ مختلف مباحث کو اس طرح باہم پیوست کردیتے ہیں کہ عموماً کسی متعین لفظ پر ان باہم مختلف قسم کی باتوں کے درمیان کوئی خط فاصل نہیں کھینچا جاسکتا۔ اس کی مثالیں ان کے مضامین میں قدم قدم پر ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر حج پر جوان کا مضمون ہے اس میں دیکھئے کہ وہ کعبہ کی مرکزیت اور اس کی وسطیت پر گفتگو کررہے تھے کہ یکایک اس کی قدامت کی طرف متوجہ ہوگئے اور اس دعوے پر دلائل وشواہد پیش کرنے لگے اور اس طرح متوجہ ہوئے کہ کافی دور تک آدمی کو اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ کوئی دوسری بات کہنے جارہے ہیں۔ حضرت علیؓ کا ایک قول نقل کرکے یہ لکھنے کے بعد کہ یہ اشارہ کعبہ

Marfat.com

کی اسی برکاتی مرکزیت کی طرف ہے جسے قرآن میں ''مبارکا'' کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے۔ معاً آگے عبارت یوں شروع ہو جاتی ہے۔

''بلکہ بجائے ''مکہ'' کے اسی آبادی کے دوسرے نام یا تلفظ یعنی ''بکۃ'' کے لفظ کو قرآن نے یہاں جو اختیار کیا ہے۔''

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مرکزیت ہی کے سلسلہ میں مولانا کوئی نکتہ لا رہے ہیں مگر تھوڑی دور چل کر پتہ چلتا ہے کہ نہیں یہاں سے ایک نئی بات شروع ہوگئی۔

۴۔ مولانا کے طرز انشاء کی ایک سب سے بڑی اور سب سے نمایاں خصوصیت ان کے جملوں کی بے ساختگی و برجستگی اور ان کی البیلی ترکیب ہے۔ ان کے جملوں کی ترکیب کی خصوصیت ظاہر کرنے کے لئے ''البیلے پن'' سے زیادہ مناسب شاید کوئی اور لفظ نہ ہو۔ جملوں کے اجزاء کی ترتیب میں وہ کسی قاعدہ اور ضابطہ کے پابند نہیں ہیں۔ بس جو جزو بے ساختہ قلم سے پہلے نکل گیا وہ پہلے ہو گیا جو بعد میں نکلا وہ بعد میں ہو گیا۔ پھر اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جملہ پورا نہیں ہونے پاتا کہ ایک جملہ معترضہ شروع ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی ناتمام جملہ کے بقیہ اجزاء بھی اسی میں گم ہو جاتے ہیں۔ جن لوگوں کو مولانا کے مضامین سے نیا نیا سابقہ پڑتا ہے وہ تو کچھ گھبرا سے جاتے ہیں مگر جو لوگ مولانا کے اسلوب سے آشنا ہو چکے ہیں انہیں اس انداز میں بڑا مزا آتا ہے اور خشک موضوع بھی دلچسپ بن جاتا ہے۔

مولانا کے طرز انشاء کی ان چند خصوصیات کو اگر پہلے سے ذہن میں رکھ لیا جائے گا تو امید ہے کہ عام ناظرین بھی خاطر خواہ استفادہ کر سکیں گے۔

(در: الفرقان (لکھنؤ)، افاداتِ گیلانی نمبر، ص ۴-۱۶)

☆......☆......☆

Marfat.com

مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی

حیاتِ مولانا گیلانی

مولانا گیلانی کا خاندانی سلسلہ

مولانا مرحوم نے اپنی ایک تصنیف میں لکھا ہے:

''ابو الفرح واسطی کی جو اولاد جگت نیر میں آباد ہوئی اور بعد کو جاجنیری سادات کے نام سے مشہور ہوئی، ان کا ایک سلسلہ بہار ضلع مونگیر میں پایا جاتا ہے اور چونکہ بارہ گاواں میں یہ آباد ہے، اس لئے سادات بارہ گاواں کہلاتے ہیں، خاک سار مناظر احسن گیلانی کا تعلق بھی اسی جاجنیری سادات سے ہے'' (تذکرہ شاہ ولی اللہ۔ص ۱۴۵)

اب اس کی تھوڑی تشریح ملاحظہ فرمائیں۔ مولانا مرحوم کے پہلے مورث اعلیٰ جو ہندوستان تشریف لائے، وہ سید احمد جاجنیری ہیں۔ سید صاحب کے متعلق جو یادداشت محافظ خانہ میں محفوظ ہے، اس میں درج ہے:

''سید احمد جاجنیری مدینہ منورہ سے مقام واسط میں تشریف لائے۔ چندے مقیم رہے جو کہ مدینہ منورہ کے قریب ایک دیہات بنام مقام واسط ملقب ہے، اسی وجہ سے ان کا لقب ''واسطی'' ہے۔ (ترجمہ فارسی آل خاندان سید احمد جاجنیری۔ محافظ خانہ نمبر ۳)

مگر یہاں بھی مستقل طور پر نہ رہ سکے، وہاں سے بھی آپ کو منتقل ہونا پڑا۔ لکھا ہے کہ

''مقام واسط میں باعث ظلم وشدت قوم عباسی کے مقام واسط سے کوچ کر کے مقام مشہد مقدس میں تشریف لائے اور چند روز سکونت پذیر ہوئے، بعدہ وہاں سے کوچ کر کے بمقام بغداد شریف بحلہ جاجنیر تشریف لا کر سکونت پذیر ہوئے۔'' (ایضاً)

ہندوستان میں آمد

یہیں سے ''جاجنیری'' آپ کے نام کا جزو بنا، پھر بغداد سے چل کر ہندوسان آئے...... کیسے آئے؟......

Marfat.com

اس کی تفصیل یہ دی ہے:

''ابتدائے ۵۸۸ھ لغایت ۶۰۳ھ ہنگام تکرار مہاراجہ رائے پتھورا یعنی پرتھوی راج مالک تخت دہلی کے' کہ سلطان شہاب الدین محمد غوری ساتھ راجہ مرقوم کے جنگ جہاد میں مصروف تھا اور راجہ رائے پتھورا نے سہ بار سلطان شہاب الدین محمد غوری کو شکست دی تھی' اس لئے شہاب الدین ممدوح نے بتلاش قوم سادات بامید شرکت جہاد کے متلاشی ہوا اور جن جن مقاموں میں قوم سادات روشن ضمیر پائے گئے بغرض جہاد شامل لایا اور جناب سید احمد جاجنیری قدس سرہ کو بھی ہمراہ لے کر مقام دہلی پر بغرض جہاد چڑھائی کی' اس لڑائی میں جدامجد سادات بارہاں بھی شریک تھے چنانچہ بفضل خداوند کریم باعث قوم اولاد رسول اللہ ﷺ راجہ پتھورا مغلوب ہوا اور سلطان کو فتح حاصل ہوئی۔'' (ایضاً)

حضرت سید احمد جاجنیری کانپور میں

حاصل یہ ہوا کہ سید احمد جاجنیری سلطان محمد غوری کے ساتھ ہندوستان تشریف لائے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے' اس کی صورت یہ ہوئی کہ اس کامیابی کی خوشی میں سلطان نے جہاں دوسرے شرکاء جہاد سادات کو جاگیریں عطا کیں اور ان کو ملک کے مختلف حصوں میں آباد کیا وہیں اس نے اس موقع سے حضرت سید احمد جاجنیری کو بھی کانپور کے پاس ایک جاگیر دی' جس کو سید صاحب نے ''ہاجنیر'' کے نام سے موسوم کیا جو اب صرف جاج کے نام سے مشہور ہے۔ چنانچہ اسی کتاب میں صراحت ہے:

''علیٰ ہذا القیاس سید احمد جاجنیری کو بھی ایک جگہ ملی تھی کہ وہ ملقب بنام قدیم جاجنیر کے ہوا اور وہ اب ملقب بنام جاج ہوگئی ہے بعلاقہ کانپور واقع ہے۔'' (ایضاً۔ نمبر۴)

کانپور سے مونگیر

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سید صاحبؒ کا کسی وجہ سے جی نہیں لگا تو وہ سلطان محمد غوری کے مشورہ سے علاقہ مونگیر میں تشریف لائے اور پھر سلطان نے یہاں موصوف کو معقول جاگیر عطا کی' چنانچہ اسی تاریخی دستاویز میں مذکور ہے۔

''سید احمد جاجنیری قدس سرہ کا نسب حسنی و حسینی ہے' ہنگام حیات سید صاحبؒ کے موالات جاگیر موضع حسین آباد' دمانہ مدام پور' و فیروز پور مانندہ' محمد پور یکساری و پیغمبر پور' و چوارہ' وندیانواں' و کمل گڈھ' و بچھ بیگہ' و دیگر مواضعات پرگنہ امرتھ ضلع مونگیر منجانب سلطان شہاب الدین محمد غوری غازی عطا ہوئی تھی لیکن من بعد ہنگام دخل و قبضہ اولاد ان کی' باعث ظلم راجہ کامگار خان' و نامدار خان تعدیا لے لیا گیا۔'' (ایضاً۔ ص ۱۲)

Marfat.com

مزار سید احمد جاجنیری

یہ بھی صراحت موجود ہے:

''مزار سید احمد جاجنیری قدس سرہ مع اہلیہ ان کی موضع ندیانواں پرگنہ امرتھ ضلع مونگیر میں واقع ہے۔'' (ایضاً۔ص۱۲)

اولاد سید احمد جاجنیری

البتہ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ کس تاریخ اور کس سن میں انتقال ہوا' لیکن سید صاحب کی اولاد کے متعلق تفصیل ملتی ہے کہ ان کی وفات اور جاگیر چھن جانے کے بعد یہ لوگ منتشر ہوگئے اور مختلف اطراف میں پھیل گئے۔ اسی یادداشت میں مذکور ہے۔

''سید احمد جاجنیری کی چار اولاد تھی' بڑے صاحب زادے کا نام سید خضر معروف بہ سید حیدر باگھ' مزاران کا بموضع بجوبینڈ' جو مقام بہار بفاصلہ تین کوس جانب دکھن واقع ہے اور منجھلے صاحبزادے کا نام مبارک سید شاہ جمال الدین' مزاران کا بموضع جموارہ پرگنہ امرتھ ضلع مونگیر بالائے کوہ سطح جانب شمال' نزد کوہ مسطح واقع ہے اور سنجھلے صاحب زادے کا اسم شریف سید شاہ برہان الدین مزاران کا بموضع سانحہ پرگنہ بلیا ضلع مونگیر عبور دریائے گنگ واقع ہے اور چھوٹے صاحب زادے کا اسم اقدس سید شاہ یوسف ہے' مزاران کا بموضع چونڑ پرگنہ سیمائے ضلع گیا واقع ہے۔''
(ایضاً۔ص۱۳)

اولاد کی اولاد

سید احمد جاجنیری کے پوتوں اور اگلی نسل کے متعلق وضاحت ہے۔

''اور اولاد ابنان سید احمد جاجنیری قدس سرہ کی موضع مدام پور' چواڑہ' فیروز پور' موضع نندہ و موضع مروئی' کٹنی کول و جموارہ وکندہ وحسین آباد پرگنہ امرتھ' پزہنہ' وچندھار' ومحلہ یحییٰ پور منجملات شیخ پورہ پرگنہ نالوہ ضلع مونگیر میں مسکن پذیر تھے' وہیں باعث ظلم وتعدی راجہ کامگار خان و نامدار خان کے اکثر اولاد ابناء سید احمد جاجنیری قدس سرہ کی' بموضع اورین' وبیلتھوا' وموضع غوث آباد و من بعد بمقام سورج گڑھا' وعبور دریائے گنگ بموضع سانحہ پرگنہ بلیا و بمحلہ مخصوص پور باڑہ من محلات شہر مونگیر سکونت پذیر ہوئے۔'' (ایضاً۔ص۱۳'۱۴)

یہ بھی لکھا ہے کہ سید صاحب کی اولاد کی اولاد در اولاد بادشاہ اکبر کے دور میں پھر فوج میں داخل ہوئی اور فوج

Marfat.com

کی افسری کا فریضہ ادا کیا۔ بعض عہدہ قضاء پر بھی مامور ہوئے' گویا بعد میں بھی باوقار زندگی گزاری اور مسلم سلاطین سے وابستہ رہے۔

جاگیر کا حال

باقی راجہ کامگار خان وناموار خان جو شاہی عملداری میں صوبہ بہار کا افسر تھا اور جس نے ظلماً سید احمد کی اولاد کی جاگیرات پر قبضہ کرلیا تھا اور انہیں بے دخل کردیا تھا' ایسٹ انڈیا کمپنی کا جب زمانہ آیا تو اس راجہ کو کمپنی کے مقابلے میں شکست ہوئی اور انگریز ان راجوں کی تمام جائیداد پر قابض ہو گئے۔

اولاد سید احمد جاجنیری گیلانی میں

''تاریخ بارہ گانواں ومضافات'' کے مصنف لکھتے ہیں:

''سید احمد جاجنیری عراق سے ہندوستان آئے تھے' لکھی سرائے کے نزدیک چند گاؤں ان کو جاگیر میں ملے تھے۔ شیخ پورہ کے اردگرد بارہ گانواں آپ ہی کی اولاد سے آباد ہے' ان کی اولاد میں میر دھوم اور میر مقیم دو بھائی موضع یکساری سے گیلانی آئے تھے اور بعد میں مستقلاً گیلانی مع اہل وعیال وبرادر منتقل ہو گئے۔'' (ص ۶۸)

ایک روایت

جاجنیری خاندان کی تاریخ میں درج ہے کہ سلطان محمد غوری کے مرشد مولانا شاہ نور قدس سرہ بغرض سیاحت بہار تشریف لائے' اس زمانہ میں لکھی سرائے میں راجہ اندردون رہتا تھا اور پورے علاقے پر قابض تھا۔ راجہ نے شاہ نور قدس سرہ کے ساتھ بدسلوکی کی اور مولانا کے میزبان اور مولانا کو زندہ زمین کے اندر دفن کرادیا مگر مولانا نور کی یہ کرامت تھی کہ وہ باہر نکل آئے جس کو دیکھ کر راجہ تھرا گیا۔ واللہ اعلم۔ اور ادھر جب سلطان محمود غوری کو اس کارروائی کی اطلاع ہوئی' ساٹھ سادات غازیوں کو روانہ کیا کہ وہ راجہ کو اس کے ظلم کا بدلہ چکھائے۔ ان میں سید ابراہیم بھی تھے' نتیجہ یہ ہوا کہ غازیوں کو رب العزت نے کامیابی سے سرفراز کیا اور راجہ کو فرار ہونا پڑا۔

خود مولانا گیلانی کا بیان

اس میں شبہ نہیں کہ سید احمد جاجنیری کی اولاد میں سے کوئی گیلانی بھی ضرور آیا' اور اس کی رشتہ داری یہاں قائم ہوئی۔ خود مولانا مرحوم نے خاکسار سے یہ بات بیان فرمائی تھی۔

مصنف ''تاریخ بارہ گانواں ومضافات'' نے لکھا ہے کہ سید احمد جاجنیری کے خاندان کے جو افراد گیلانی آئے ان کی رشتہ داری مندرجہ ذیل حضرات سے قائم ہوئی۔

Marfat.com

''شفاعت علی ساکن مانے چواڑہ اور شجاعت علی گیلانی'' (ص ۶۸)

خود حضرت گیلانی نے ایک جگہ لکھا ہے:

''یہ گیلانی وہی گیلانی ہے جس کی طرف خاک سار اپنے نام کی اضافت کرتا ہے، فقیر کا مولد و منشاء بہار کا یہی گاؤں ہے، جس کی آبادی بمشکل پانچ چھ سو سے زیادہ ہوگی، ممتاز آبادی واسطی زیدی، سادات کی ہے، جو چند صدیوں سے اس گاؤں میں آباد ہے۔'' (نظام تعلیم و تربیت)

مولانا کے پڑدادا

گیلانی کے شجاعت علی حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی کے پردادا ہیں اور شجاعت علی کے فرزند ارجمند مولانا محمد احسن گیلانی مولانا مرحوم کے جد امجد ہیں۔

گیلانی کا جائے وقوع

گیلانی جیسا کہ گزرا مختصر آبادی ہے، اس کا پورا نام ''محی الدین پور گیلانی'' ہے۔ چنانچہ قدیم سرکاری کاغذات میں یہ نام موجود ہے۔ بعد میں محی الدین پور حذف ہو کر صرف گیلانی رہ گیا۔ آبادی اسی نام سے مشہور ہے۔ اس گاؤں میں کچھ مسلمان اور کچھ غیر مسلم آباد ہیں، مسلمانوں کا پڑھا لکھا طبقہ عام طور پر ملازمت کے سلسلے میں باہر رہتا ہے۔ تہوار کے موقع سے عام طور پر یا پھر شادی بیاہ کے موقع سے ان کا کبھی کبھی اجتماع ہوتا ہے۔

بربیگھہ سے ایک پختہ سڑک بہار شریف کو جاتی ہے۔ اسی سڑک پر بربیگھہ سے میل دو میل کی دوری پر گیلانی واقع ہے اور مولانا مرحوم کی بیٹھک اسی سڑک کے کنارے واقع ہے۔ مسجد اس گاؤں میں صرف ایک ہے۔

مولانا مرحوم کے دادا

حضرت مولانا محمد احسن اپنے وقت کے جید و ممتاز عالم دین اور مشہور استاذ گزرے ہیں۔ انہوں نے تعلیم، شادی اور اولاد ہو جانے کے بعد حاصل کی تھی چونکہ پرانے مسلمان زمینداروں میں پڑھنے پڑھانے کا رواج بہت کم رہ گیا تھا۔ دینیات اور معمولی فارسی اور اردو پڑھ لینا کافی سمجھتے تھے۔ مولانا احسن کو کسی نے طنزاً کچھ ایسے جملے کہے تھے کہ وہ تیر کی طرح لگا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تحصیل علم کے لئے گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور اس طرح یہ گمنام خاندان آفتاب بن کر روشن اور شہرت پذیر ہوا۔

مولانا احسن کی تعلیم

دادا کی کہانی پوتے کی زبان قلم سے پڑھیں، خود مولانا گیلانی مرحوم لکھتے ہیں:

''مولانا (محمد احسن) کے والد میر شجاعت علی مرحوم انگریزی پولیس میں سرکل انسپکٹر کے عہدے

Marfat.com

پر ممتاز تھے' بزرگوں سے خاکسار نے سنا ہے کہ میر شجاعت علی کی بڑی آرزو تھی کہ ان کے بچوں میں کوئی لڑکا عالم ہوتا مگر خدا کی شان جب تک زندہ رہے' یہ آرزو پوری نہیں ہوئی' مولانا محمد احسن کی شادی ہو چکی تھی بلکہ ایک لڑکا بھی ہو چکا تھا' جو فقیر کے بڑے چچا مرحوم تھے اس عمر اور ان حالات میں تحصیل علم کا سودا سر پر سوار ہوا۔ بیوی' بچے' گھر بار سب کو ایک دفعہ سلام کر کے گیلانی سے روانہ ہوئے اور کامل چودہ سال کے بعد اس وقت واپس ہوئے جب بیٹا جوان ہو چکا تھا' چودہ سال کی یہ مدت روپوشی میں نہیں گزری' خط و کتابت اور آدمی تک وطن سے ان کے پاس آتا جاتا رہتا تھا لیکن اس عرصہ میں خود ایک دفعہ بھی گھر نہ آئے' مختلف علوم کے اہل کمال جن جن شہروں میں تھے ان کی خدمتوں میں پہنچے۔ علوم رسمیہ کی کتابیں زیادہ تر بنارس کے ایک عالم مولانا واجد علی صدر اعلیٰ سرکار انگریزی سے پڑھی۔ ریاضی' ہیئت' حساب مولانا نعمت اللہ فرنگی محلی سے اور حدیث کی سند مولانا عالم نگینوی تلمیذ حضرت شاہ اسحاق دہلوی سے حاصل کی' اس زمانہ میں درس و تدریس کا مشغلہ بھی جاری رکھا' مختلف مسائل پر رسائل تصنیف کئے۔ وجود رابطی اور مثناۃ بالتکریر والا رسالہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ شرح سلم العلوم پر معرکتہ الآراء حاشیہ لکھا۔ اقلیدس کا مقالہ اولیٰ عربی جو عام مدارس عربی کے نصاب میں شریک ہے پہلی دفعہ' تصحیح اشکال اور تحشیہ کے ساتھ آپ ہی نے لکھنؤ سے شائع کرایا' اسی نسخہ کی نقل مطابع میں چھپ رہی ہے۔ جب کامل اطمینان ہو گیا تب گھر لوٹے اور بجائے علم فروشی کے علم پاشی اور معارف بخشی میں ساری زندگی گزار دی۔'' (نظام تعلیم و تربیت' ج ا ص ۲۹۔۳۰)

مولانا احسن کی خودداری

چونکہ مولانا احسن اپنے دور کے پولیس سرکل انسپکٹر کے صاحبزادے اور زمیندار گھرانے کے چشم و چراغ تھے' اس لئے جہاں رہے بڑے وقار کے ساتھ رہے' حرص اور لالچ سے دامن پاک رکھا' ان کی طالب علمی کے زمانے کا حضرت مولانا مرحوم نے ایک عبرت آموز واقعہ لکھا ہے۔ اسے مولانا کی ہی زبان قلم سے سنیں۔

''مولانا احسن جب لکھنؤ کی ایک مسجد میں جو دبیر الدولہ کے نام سے موسوم ہے قیام فرما تھے' اتفاقاً انہی دنوں میں بادشاہ وقت واجد علی شاہ کا عتاب کسی وجہ سے دبیر الدولہ پر نازل ہوا۔ قید کر دیئے گئے' خاندان پر مصیبت ٹوٹ پڑی' اس موقع پر مولانا نے قدیم آشنائی کا خیال کر کے دبیر الدولہ کے اہل خاندان کے لئے ممکنہ امداد بہم پہنچائی تھی' چند ہی دن کے بعد عتاب شاہی کا ازالہ ہوا۔ دبیر الدولہ جیل سے رہا ہو کر گھر آئے' تو مولانا کی مواساۃ و ہمدردی کی خبر ہوئی' بہت متاثر ہوا اور ڈیڑھ لاکھ روپے کی رقم جو اس وقت اس کے پاس موجود تھی اس کا حکم لے کر مولانا کے پاس حاضر ہوا۔ پہلے تو مولانا نے رسمی لیت و لعل سے کام لیا لیکن وہ بضد تھا کہ اس کی حقیر رقم

Marfat.com

کو قبول کیا جائے' آخر جان چھڑانے کے لئے مولانا نے فرمایا آج شام ہوگئی ہے کل صبح لینے دینے کا نظم کروں گا۔ شب درمیان میں تھی اس سے نفع اُٹھا کر لکھنؤ کو ہمیشہ کے لئے خیر باد فرما دیا گیا...... کہ دبیر الدولہ کے اس رویے سے نجات حاصل ہو' اپنی کتابیں جن کے سوا ان کے پاس کوئی سرمایہ نہ تھا' مولوی جان علی صاحب گیلانی جو بعد کو مراد آباد میں متوطن ہو کر وہیں متوفی ہوئے' ان کے حوالے کر کے سیدھے رامپور تشریف لے گئے اور پھر دبیر الدولہ کو اس کا پتہ چلنے نہیں دیا کہ بہار کا وہ مولوی کہاں غائب ہوگیا۔ ساری عمر گیلانی جیسے کوردہ گاؤں میں گزاری۔''

(نظام تعلیم وتربیت، ج ا ص ۴۵۲)

33

تحصیل علم کے بعد وطن واپسی اور درس وتدریس میں انہماک

مولانا احسن پڑھنے کے سلسلے میں گھر سے نکلے اور چودہ سال مسلسل غریب الوطنی کی زندگی گزاری' اس طویل عرصہ میں خود کبھی وطن نہیں آئے' البتہ خط وکتابت جاری رکھی اور گھر سے آدمی بھی حالات معلوم کرنے جاتا رہا' مختلف علماء کی خدمت میں رہنا ہوا۔ بنارس' لکھنؤ' رامپور علم کی طلب میں پہنچے۔

جب تمام علوم وفنون میں استعداد کامل حاصل کرلی تو پھر وطن واپس ہوئے اور درس وتدریس کا سلسلہ اپنے گاؤں میں مکان پر ہی شروع کردیا اور کافی عرصہ تک یہ خدمت تن تنہا انجام دیتے رہے۔ اس زمانہ میں طریقہ بھی عام طور پر یہی ہوتا تھا۔ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی نے خود لکھا ہے:

''مولانا محمد احسن گیلانی خاکسار کے جد امجد ہیں' یہ میرے گھر کی بات ہے اس لئے ''صاحب البیت ادریٰ بمافیہ'' کے رو سے میں بتا سکتا ہوں کہ اس کی حقیقت کیا تھی' یہ صحیح ہے کہ مولانا محمد احسن گیلانی مرحوم نے اس گاؤں میں تقریباً تیس چالیس سال درس وتدریس کا بازار گرم رکھا' نہ صرف بہار بلکہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں حتیٰ کہ سرحد کابل تک سے طلبہ کی ایک اچھی خاصی تعداد مولانا سے پڑھنے کے لئے آئی اور کامیابی سے ہمکنار ہو کر واپس ہوئی۔''

(ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، ج ا ص ۴۳۲)

34

مولانا احسن کے مشہور تلامذہ

مولانا محمد احسن کی خدمت میں بہت سارے طلبہ آئے اور انہوں نے وہاں رہ کر علوم وفنون کی تکمیل کی اور اپنے زمانہ کے مشاہیر علماء واساتذہ میں ان کا شمار ہوا' مولانا گیلانی نے ایک جگہ ان میں سے چند نام بھی لکھے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔ لکھتے ہیں:

''ہزارہ ضلع کے ایک بزرگ مولانا عبداللہ ہزاروی وطناً گیلانی نزیلاً پڑھنے کے لئے آئے اور

Marfat.com

اس گاؤں میں متوطن ہو کر اپنے وعظ و تلقین' ارشاد و ہدایت' درس و تدریس' افتاء و تصنیف کا سلسلہ نصف صدی کے قریب برابر جاری رکھا' وہیں کی خاک میں آسودہ ہوئے اور ایک وہی کیا بہار کے بعض جلیل القدر علماء مثلاً مولانا رفیع الدین مرحوم رئیس شکرانواں' مولانا عبدالغفور رمضانپوری' مولانا حکیم عبدالسلام بھاگلپوری' مولانا حکیم دائم علی مونگیری ثم ٹونکی اور مولانا محمد اسماعیل وغیرہم بیسیوں مشاہیر گیلانی کی اس درسگاہ سے اٹھے۔'' (ایضاً)

دارالعلوم گیلانی

گویا گیلانی اس وقت دارالعلم ہو رہا تھا اور شائقین کھنچے چلے آ رہے تھے' تن تنہا ساری کتابیں پڑھاتے تھے' تفسیر' حدیث' فقہ اور معقولات کی اونچی کتابوں کا درس ہوا کرتا تھا' جیسے ہدایہ' توضیح وتلویح' بیضاوی' مسلم شریف' شمس بازغہ' شرح چغمنی' الافق المبین' اشارات اور کتاب الشفاوغیرہ۔

دارالعلوم گیلانی کی عمارت

مدرسہ کا حال بھی یہی تھا کہ اس کے لئے کوئی وسیع و عریض عمارت نہیں تھی' بلکہ بقول مولانا مرحوم:

''لیکن تعلیم و تدریس کا یہ سارا کاروبار جہاں انجام دیا گیا وہ صرف برگد کا ایک طویل وعریض درخت تھا جسے ایک طرف متوسط درجہ کی ایک جھونپڑی اور ایک طرف مولانا مرحوم کا ایک خام چھوٹا سا چند حجروں کا مکان تھا۔ اسی مکان کے سامنے کوملو کا ایک چھپرا اینٹ کے دو پایوں پر پڑا ہوا تھا' برگد کے درخت کے نیچے چند تخت وہ بھی کھلے ہوئے' بغیر کسی فرش و فروش کے پڑے رہتے تھے۔ مولانا درخت کی چھاؤں میں طلبہ کو پڑھایا کرتے تھے' برسات یا سردی کے موسم میں یہ مدرسہ کوملوں کے اسی......سائبان میں منتقل ہو جاتا تھا جس کا کل فرنیچر لے دے کر دو چوکیاں تھیں۔ طلبہ کچھ تو اسی خام مکان کے حجروں میں رہتے یا مسجد میں اور زیادہ تر گاؤں کے ارباب ثروت کے مکانوں میں ان کو جگہ مل جاتی تھی اور کھانے کا نظم بھی ہو جاتا تھا' بس اس مدرسہ کی کل کائنات برگد کی چھاؤں اور مولانا کا وہی خام مکان تھا' اسی کو مدرسہ خیال کیجئے' یا مولانا کا مطب' اس کو دفتر قرار دیجئے یا دیوان خانہ یا طلبہ کا اقامت خانہ کیونکہ وہی سب کچھ تھا۔

برگد کے اسی سایہ میں اگر کوئی دیکھنا چاہے تو مرچا کے اسلامی اسٹیٹ' صغریٰ وقف اسٹیٹ اس کے مدرسہ عزیزیہ اور شکرانواں کے اس قیمتی کتب خانہ کو بھی دیکھ سکتا ہے جس کی بعض نادر کتابوں کی نظیر اس وقت بھی سارے ہندوستان میں نہیں مل سکتی بلکہ یہ ہو سکتا ہے کہ خدا بخش خان کی مشہور عالم مشرقی لائبریری کی ترتیب میں بھی دیکھنے والوں کو اس دماغ کی رہنمائی محسوس ہو سکتی

Marfat.com

ہے جو برگد کے اس درخت کے نیچے سنوارا گیا تھا۔'' (نظام تعلیم و تربیت، ج ا ص ۴۳۰)

تصانیف مولانا احسن

مولانا محمد احسن نے جہاں درس و تدریس کی خدمت انجام دی اور ان کی درس گاہ سے علماء روزگار پیدا ہوئے وہیں آپ نے بعض کتابوں پر حواشی بھی لکھے' چنانچہ منطق میں بعض رسائل اور متعدد کتابوں پر آپ کے حواشی ہیں' ان میں سے بعض شائع ہو چکے ہیں اور بعض کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔

مولانا احسن کی اولاد

جیسا کہ گزرا مولانا نے شادی کے بعد علم حاصل کیا تھا' مولانا کے تین صاحبزادے تھے' بڑے صاحب زادے کا نام ابوظفر محمد سلیمان تھا جن کی وفات مولانا کی زندگی میں ہی ہو چکی تھی' دوسرے صاحبزادے کا نام حافظ ابونصر تھا۔ انہوں نے پٹنہ اور لکھنؤ جا کر مروجہ نصاب عربی کی تکمیل کی تھی اور تیسرے صاحب زادے کا نام حافظ ابوالخیر تھا۔ ان کی عمر کا چودھواں سال تھا کہ ان کے والد بزرگوار یعنی مولانا احسن اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔ ابوالخیر صاحب نے پہلے حفظ قرآن کیا پھر فارسی کی تکمیل کی۔ ابھی عربی کی نوبت نہیں آئی تھی کہ والد محترم کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور غالباً اسی وجہ سے آگے تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ گھر کے کام کاج میں مشغول ہو گئے۔

مولانا کے والد محترم

مولانا مناظر احسن گیلانی کے والد محترم کا نام حافظ ابوالخیر تھا جو مولانا احسن کے چھوٹے صاحب زادے تھے۔ انہوں نے اپنے والد کی زندگی میں حفظ قرآن کیا اور فارسی کی تکمیل کی اور ابھی عمر کی چودھویں سال میں تھے کہ آپ کے والد (حضرت مولانا محمد احسن) جنت سدھار گئے اور انہوں نے تعلیم سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور گھر کے کاروبار میں لگ گئے' زمین داری اور کاشت کاری کا انتظام اپنے ذمہ لے لیا' ان کے متعلق لوگوں کا بیان ہے کہ سادہ مزاج تھے' گاؤں والوں کی سی ہی زندگی گزارتے تھے لیکن ان کی سخاوت و فیاضی گیلانی میں مشہور تھی' غریبوں کے بہت کام آتے تھے' کبوتروں کا شوق تھا' مردانہ بیٹھک کے سامنے کبوتر خانہ بنوا رکھا تھا' ۱۹۲۹ء میں حافظ ابوالخیر کی وفات ہوئی۔

37

حافظ ابوالخیر کی اولاد

حافظ ابوالخیر کی شادی استھانواں میں فدا حسین کی صاحبزادی سے ہوئی۔ حافظ صاحب مرحوم کو تین لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں' مناظر احسن' مکارم احسن اور مظہر احسن یہ تین لڑکے تھے۔

صاحب زادیوں میں ایک کی شادی خان بہادر مولانا عبدالعزیز مرحوم مقیم صاحب گنج سے تھی' دوسری کی

شادی موضع کٹنی کول میں مولوی مظاہر حسن پیش کار سے تھی اور تیسری صاحب زادی قطب العالم مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا لطف اللہ صاحب رحمانی المتوفی ۱۹۴۲ء سے منسوب تھیں۔

ولادت اور تعلیم وتربیت

مولانا سید مناظر احسن گیلانی اپنی ننھیال موضع استھانواں ضلع پٹنہ میں ۹ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ کو پیدا ہوئے' پرورش و پرداخت کا بڑا حصہ دادھیال گیلانی میں گزرا' جہاں مولانا اس وقت ابدی نیند سو رہے ہیں اور جس سے آپ کو بے انتہا انس ومحبت تھی۔

آپ کی پیدائش سے پہلے آپ کے دادا کا انتقال ہو چکا تھا' چچا مولانا حکیم ابونصر صاحب اور والد بزرگوار حافظ ابوالخیر کے زیر سایہ آپ کی پرورش ہوئی' آپ کی والدہ بھی ایک اونچے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور دیندار تھیں۔

گھر کا ماحول مولوی خاندان ہونے کی وجہ سے دیندارانہ' مومنانہ ومخلصانہ تھا۔ اسی ماحول میں آپ کی پرورش و پرداخت ہوئی' آپ کے چچا مولانا حکیم ابونصر کے کوئی اولاد نہیں تھی' اس لئے آپ کی ساری توجہ اپنے اس ہونہار بھتیجے (مناظر احسن) پر مرکوز تھی کہ کسی طرح یہ خاندان کی عظمت وعزت کا نشان بن جائے اور دادا کی خالی مسند اس سے رونق پذیر ہو۔

تعلیم وتربیت

پانچ چھ سال کی عمر ہوئی تو چچا مرحوم نے بڑی محبت وشفقت کے ساتھ بسم اللہ کرائی' ابتدائی تعلیم قرآن' اردو' فارسی اور عربی صرف ونحو کی کتابیں گیلانی میں ہی ہوئیں اور اس کا بڑا حصہ خود چچا محترم نے پڑھایا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ گیلانی اور اطراف میں عام طور پر انگریزی تعلیم کا چرچا پھیل رہا تھا' عربی تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ سرد پڑ چکا تھا' انگریزی دور حکومت کی یہی دین تھی' علماء کی کوئی قدر و قیمت حکومت اور عوام کی نظر میں باقی نہ رہ گئی تھی' زمیندار خاندان اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم دلانا فخر سمجھتے تھے۔

دینی تعلیم کا فیصلہ

مگر آپ کے چچا کا شوق سارے خاندان والوں سے الگ تھا۔ وہ اپنے خاندانی علم کو زندہ رکھنا چاہتے تھے کیونکہ خود بھی عالم تھے اور آپ کے والد بزرگوار بھی جید عالم دین اور مشہور ومقبول استاذ العلماء تھے' لہٰذا آپ نے اپنے بھتیجے کے لئے عربی اور دینی تعلیم کا فیصلہ کیا اور اس کی تمام تر ذمہ داری اپنے سر لی۔

جہاں تک معلوم ہے آپ کے چچا کی وفات کے بعد گیلانی میں کوئی دوسرا عالم مولانا کے زمانے میں اور اس

Marfat.com

کے بعد بھی پیدا نہیں ہوا۔ خود مولانا گیلانی مرحوم کے دونوں چھوٹے بھائیوں کو بھی انگریزی تعلیم دلائی گئی اور مولانا کے صاحب زادہ اور بھتیجوں کی تعلیم بھی سکول و کالج اور یونیورسٹی میں ہوئی۔

ان میں سے کسی نے کبھی کسی مدرسہ میں نہ تعلیم حاصل کی اور نہ اس طرف رُخ کیا۔

یہ مولانا گیلانی کی خوش قسمتی تھی کہ آپ کے چچا نے علم دین میں لگایا اور اس پر پوری توجہ دی اور اچھی سے اچھی تعلیم کے لئے جو کچھ اس دور میں وہ کر سکتے تھے کیا اور اپنے مقصد میں کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔

گیلانی سے ٹونک

ابتدائی عربی (نحو وصرف اور ادب) کی کتابیں جب ہو چکیں تو چچا اور گھر والوں کو خیال ہوا کہ آپ کو کسی اچھے علمی ماحول میں پہنچایا جائے تا کہ ذہن کھلے اور پڑھنے لکھنے کا ذوق پختہ ہو اور ساتھ ہی تعلیم و تربیت بھی اچھی ہو۔

اوپر گزر چکا ہے کہ آپ کے دادا مولانا احسن کے تلامذہ میں میر نگر (مونگیر) کے مولانا دائم علی بھی تھے جنہوں نے درسیات عربی کی تکمیل کے بعد طب بھی پڑھ لی تھی اور ترقی کر کے ریاست ٹونک کے دربار خصوصی کے طبیب خاص ہو گئے تھے۔ انہی حکیم صاحب کے فرزند ارجمند مولانا حکیم سید برکات احمد (م ۱۳۴۷ھ) کا اس زمانہ میں بحیثیت استاذ معقولات بڑا شہرہ اور نام تھا۔ مختلف خطوں سے طلبہ وہاں تعلیم کے لئے آ رہے تھے، حکیم صاحب مشہور معقولی عالم مولانا عبدالحق خیر آبادی (م ۱۳۱۶ھ) کے تلمیذ رشید تھے جن کی خدمت میں سولہ سال رہ کر انہوں نے ایساغوجی اور میزان منطق سے لے کر شفاء ابن سینا اور شرح اشارات علامہ طوسی تک کی تعلیم حاصل کی تھی اور حدیث مولانا قاضی محمد ایوب پھلپھتی قاضی ریاست بھوپال سے پڑھی تھی۔

مولانا مناظر احسن کو آپ کے چچا مولانا ابو نصر صاحب نے اسی تعلق سے جو مولانا برکات احمد صاحب کے والد محترم مولانا محمد احسن سے تھا، ٹونک مولانا کو بھیجنے کا سامان کر لیا تا کہ آپ مولانا برکات احمد کی خدمت میں رہ کر درسیات کی تکمیل کر لیں۔

مولانا ٹونک میں

بالآخر ۱۳۲۴ھ میں مولانا گیلانی بہار سے راجپوتانہ کے ریگستانی علاقہ ٹونک پہنچا دیئے گئے۔ اس وقت آپ اپنی عمر کے چودھویں سال میں تھے۔ وہاں آپ کو آپ کے استاذ مولانا برکات احمد نے پھر ایساغوجی سے خود پڑھانا شروع کیا۔ ۱۳۲۴ھ سے لے کر مسلسل ۱۳۳۱ھ تک سات سال تعلیمی سلسلہ وہیں جاری رکھا......مولانا گیلانی نے ایک جگہ خود لکھا ہے:

> "دیوبند کی حاضری سے پہلے سات آٹھ سال تک خود اس فقیر کو جس مدرسہ میں پڑھنے کا ذاتی تجربہ ہوا ہے، علم حدیث کے سوا شد بد کی جو کیفیت بھی اپنے اندر پاتا ہوں وہ زیادہ تر اسی مدرسہ کی تعلیم کا نتیجہ ہے، میری مراد سیدی الاستاذ حضرت مولانا برکات احمد ٹونکی نزیلاً و بہاری وطناً

رحمتہ اللہ علیہ کی تعلیم گاہ سے ہے جس سے صرف ہندوستان اور اس کے مختلف صوبوں' پنجاب' یوپی' بہار' بنگال' دکن وغیرہ ہی کے طلبہ کی ایک معقول تعداد فارغ ہو کر ملک کے مختلف گوشوں میں علم دین کی خدمت میں مصروف نہیں ہیں بلکہ ہر زمانہ میں بیرون ہند مثلاً افغانستان' بخارا' تاشقند' سمرقند' ہرات' ترمذ کے طلبہ بھی تحصیل علم میں مصروف رہتے تھے اور فاتحہ فراغ پڑھ کر اپنے اپنے ملکوں کو واپس ہوتے' کم وبیش چالیس سال تک تعلیم و تعلم کا یہ سلسلہ ان ہی خصوصیتوں کے ساتھ جاری رہا۔'' (نظام تعلیم وتربیت، ج ا ص ۴۲۰)

ٹونک

ٹونک جہاں مولانا گیلانی وطن سے نکل کر پہلے پہل پہنچے تھے' راجپوتانہ کا ریگستانی علاقہ ہے۔ انگریزوں کے تسلط ہو جانے کے بعد یہ ریاست وجود میں آئی۔ مہاراجہ اندور نے سنبھل کے ایک پٹھان کو بطور جاگیر یہ خطہ دے دیا تھا۔ بہت قصے قضیوں کے بعد انگریزی حکومت نے اس کو مسلمانی اسٹیٹ تسلیم کیا۔

ٹونک میں اس وقت تک نہ ریلوے لائن پہنچی تھی نہ بس کی سواری چلتی تھی بلکہ نوائی نامی سٹیشن سے اُتر کر اونٹ کی سواری پر لوگ جایا کرتے تھے۔ ریلوے سٹیشن سے اس کی دوری کوئی تیس چالیس میل تھی۔ مولانا گیلانی نے اپنے ''بیتے ہوئے دن'' میں لکھا ہے:

''گاؤں سے جب پڑھنے کے لئے باہر نکلا تو بہار و یوپی جیسے علمی صوبوں کے شہروں اور بڑے بڑے علمی مراکز سے ریل سے گزرتے ہوئے راجپوتانے کی ایک ایسی دور افتادہ آبادی میں پہنچا دیا گیا جو ریلوے سٹیشن سے اس وقت تک تیس چالیس میل دور ہے' اب تو وہاں پہنچنے کے لئے لاری بھی مل جاتی ہے لیکن فقیر نے راجپوتانے کے سنگستانی خطے میں جس زمانہ میں قدم رکھا تھا تو نوائی نامی سٹیشن سے اونٹوں کی دومنزلہ عجیب وغریب شکل کی گاڑی پر' آہستہ خرام بلکہ مخرام'' کی شترخرامیوں کا تجربہ کرتے ہوئے صبح سے چل کر شام کو غالباً ٹونک پہنچنے کی مسرت حاصل کر سکا تھا۔'' (رسالہ دارالعلوم دیوبند)

ٹونک کی تعلیم

یہ واقعہ ہے کہ مولانا کی علمی' فنی اور ذہنی وفکری استعداد وصلاحیت کی نشوونما اسی ماحول میں ہوئی کیونکہ بقول مولانا مرحوم ٹونک میں معقولات کی تمام کتابیں پوری بصیرت کے ساتھ پڑھائی جاتی تھیں جن کے پڑھنے پڑھانے کا وہاں کے سوا اس وقت کہیں اور رواج باقی نہ رہ گیا تھا۔ جس طرح بخاری' ترمذی' ہدایہ اور توضیح وتلویح کے اسباق ہوتے تھے' اسی اہتمام کے ساتھ حمد اللہ...... قاضی مبارک' شمس بازغہ' صدرا' شرح تجرید' قوشجی مع حواشی' دوانی وصدر الدین

شیرازی، شفاء، اشارات اور الافق المبین جیسی کتابیں بھی ہوتی تھیں۔ وہاں کی اصطلاح میں یہ قدما کی کتابیں کہی جاتی تھیں، اوران کتابوں کا درس اس خصوصیت کے ساتھ ہوتا تھا کہ پڑھنے والے اس علمی خاندان کے سوا کہیں اور اس طرح نہیں پڑھ سکتے تھے۔

استاد کا حال

پھر مولانا سید برکات احمد صاحبؒ ٹونکی کی یہ خدمتِ تعلیم بلا معاوضہ حسبۃً للہ تھی، مدرسہ یا کسی سے کوئی معاوضہ قبول نہیں کرتے تھے، بلکہ خود اپنے گھر سے بیس پچیس طلبہ کو روزانہ دونوں وقت کھانا دیتے تھے، پوری زندگی یہی معمول رہا، مولانا گیلانی ہی نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ گھر میں کسی وجہ سے تنگی پیش آ گئی تو مولانا کی اہلیہ محترمہ نے اپنے سونے کے کنگن بیچ دینا پسند کیا مگر طلبہ کا کھانا بند کرنا گوارا نہیں کیا۔

یہ الگ بات ہے کہ مولانا ٹونکی کی ماشاء اللہ بڑی اچھی آمدنی تھی...... والیٔ ٹونکی کے آپ طبیب خاص تھے اس کے علاوہ جاگیر بھی تھی اور دواؤں کی بکری اور فیس الگ تھی، آپ کا مطب جاری رہتا تھا۔

مولانا گیلانی نے لکھا ہے:

''مولانا برکات احمد کا شمار یوں تو ٹونک کے امراء میں تھا، والی ملک کے طبیب خاص...... تھے معقول تنخواہ کے علاوہ گاؤں بھی جاگیر میں تھا، فیس اور دوا کی بھی آمدنیاں تھیں، بڑے صاحب ثروت باپ حکیم دائم علی خاں کے صاحبزادے تھے اس لئے ان کا ذاتی مکان، مکان کیا ایک محلہ تھا جس میں ان کے کنبے کے لوگ بھرے ہوئے تھے لیکن بایں ہمہ اللہ کا یہ بندہ علم کے اس دریا کو جس جگہ بیٹھ کر ہند بیرون ہند میں جاری کئے ہوئے تھا میں اس کا چشم دید گواہ ہوں، وہ صرف خام دیواروں اور کوملو کے چھپڑ کا ایک سہ درہ دالان تھا جس کا طول شاید بارہ ہاتھ اور عرض غالباً پانچ ہاتھ سے زیادہ نہ تھا۔ (نظام تعلیم وتربیت، ج ا ص ۴۳۱)

مدرسہ خلیلیہ ٹونک میں تعلیمی سلسلہ

مولانا گیلانی نے ٹونک کے اسی مدرسہ خلیلیہ میں جم کر تعلیم حاصل کی اور خصوصیت سے معقولات کی کتابیں کافی انہماک اور شوق کے ساتھ پڑھیں۔ ''بیتے ہوئے دن'' میں ایک جگہ خود لکھا ہے:

''منطق کی کچھ کتابیں گو پڑھ چکا تھا لیکن مولانا برکات احمد صاحب نے غیر معمولی شفقت اور توجہ کی وجہ سے اس فن کے ابتدائی رسالہ ایساغوجی سے پڑھانا شروع کیا''۔

(رسالہ دارالعلوم دیو بند۔ ذی الحجہ ۱۳۷۰ھ)

واقعہ یہ ہے کہ اسی معقولات کی تعلیم کے لئے مولانا گیلانی کو ٹونک پہنچایا گیا تھا، کیونکہ مولانا کے خاندان

Marfat.com

میں معقولات کا زیادہ چرچا تھا اور ہندوستان کے مختلف گوشوں میں بھی معقولات کو ہی اصل علم شمار کیا جاتا تھا۔

مولانا نے ایک جگہ ''بیتے ہوئے دن'' میں لکھا ہے:

''علوم عربیہ کا ذوق گو ہمارے خاندان کا موروثی ترکہ تھا لیکن اس ذوق پر معقولیت کا رنگ چونکہ مستولی تھا اس لئے ہمارے مرحوم عم محترم مولانا الحاج الحکیم السید ابوالنصر نور اللہ مرقدہ جن سے عربی کی ابتدائی تعلیم فقیر حاصل کر رہا تھا' انہوں نے آئندہ تعلیمی مراحل کی تکمیل کے لئے مجھے ریاست ٹونک پہنچا دیا' جہاں خیر آباد کے معقولی سکول کے امام مولانا سید برکات احمدؒ اپنے درس کی مسند بچھائے زیادہ تر عقلی علوم (منطق و فلسفہ) کی تدریس و تعلیم میں بصد ذوق وشوق مشغول ومنہمک تھے۔'' (ایضاً۔ص ۴۵)

معقولات سے دلچسپی

مولانا گیلانی میں معقولات کا ذوق استاد محترم نے اس طرح پیدا کر دیا تھا کہ جب پہلی کتاب ایساغوجی شروع کی تو محنت وشوق کا عالم یہ تھا کہ

''تمام اسباق میں قدرتاً اسی سبق کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی' فن کا ذوق اتنا مستقل کر دیا تھا کہ اس چند ورقی رسالہ کے مطبوعہ نسخے بکثرت ملتے تھے لیکن فقیر (مناظر) نے ایساغوجی کا قلمی نسخہ اپنے ہاتھ سے تیار کیا' روز کا سبق قلم سے لکھ لیا کرتا تھا اور استاذ محترم سے جو تقریر اس سبق کے متعلق سنتا اسے حاشیہ پر بزبان اردو چڑھا لیا کرتا تھا' خیال بھی تھا کہ معقولات کی ایک ایک کتاب کو اسی التزام کے ساتھ پڑھوں گا۔'' (ایضاً)

آگے یہ بھی مولانا نے لکھا ہے:

''پھر دوسری کتابوں کا سلسلہ شروع ہوا اور تقریباً سات سال تک ٹونک میں اپنی زندگی خیر آبادی سکول کے خصوصی مذاق کے زیر اثر گزرتی رہی...... استاذ مرحوم کی درسی تقریروں کے نوٹ کرنے زمانہ کا سلسلہ تک جاری رہا...... اسی کے ساتھ معقولات ہی کے سلسلے کے بعض نادر مخطوطات کے نقل کرنے میں جس خاص طریقہ سے کامیاب ہوا تھا زندگی کے بڑے کارناموں میں......شمار کرتا تھا۔'' (ایضاً۔ص ۴۶)

ذہانت کا ایک واقعہ

حضرت مولانا عبدالرشید رانی ساگری مجاز حضرت قطب عالم مولانا مونگیری نے دارالعلوم معینیہ سانحہ میں ایک قیام کے موقع سے اپنی طالب علمی کا تذکرہ کرتے ہوئے بیان کیا کہ مولانا گیلانی ٹونک میں میرے ہم سبق تھے'

Marfat.com

کوئی شبہ نہیں کہ وہ بڑے ذکی، ذہین اور ساتھ ہی محنتی بھی تھے' ایک دفعہ استاذ محترم مولانا سید برکات احمد صاحبؒ نے تمام ساتھیوں سے کہا کہ منطق کی اصطلاحات عام فہم زبان میں لکھ کر لاؤ' چنانچہ ہم سب نے الگ الگ لکھ کر پیش کیا لیکن مولانا گیلانی نے اس کو ایک ڈرامہ کی صورت دے دی اور علم کو بادشاہ قرار دے کر اس کا دربار سجایا اور تمام منطقی اصطلاحات کو رعایا کی صورت میں ایک ایک کر کے پیش کیا اور سب نے یکے بعد دیگرے حاضر دربار ہو کر خود اپنا تعارف کرایا اور اپنی حیثیت ظاہر کی۔ حضرت الاستاذ اسے پڑھ کر ہنس پڑے اور فرمانے لگے "یہ شبلی کا انڈا ہے۔"

مولانا رانی ساگری اپنی طالب علمی کا یہ قصہ سنا کر بہت مسکرائے' میں نے ان سے بتایا کہ مولانا اپنے گاؤں گیلانی میں ہی آجکل رہتے ہیں چنانچہ موقع نکال کر مولانا رانی ساگری اپنے ساتھی سے ملنے گیلانی پہنچے اور اپنے ساتھی مولانا گیلانی سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ جب اس کے بعد میری حاضری گیلانی ہوئی تو حضرت مولانا گیلانی نے تذکرہ کیا کہ میرے ایک پرانے ساتھی ملنے آئے تھے غالباً تم نے نشاندہی کی تھی؟ یہ بھی فرمایا کہ عبدالرشید پر اب جذب و استغراق کا عالم طاری رہنے لگا ہے' صاحب دل ہے۔

مولانا کا ذاتی بیان

حضرت مولانا گیلانی نے "بیتے ہوئے دن" میں اس واقعہ کو دوسرے انداز میں تحریر فرمایا ہے' مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے بھی نقل کر دیا جائے۔ لکھتے ہیں:

> "معقولیت کے ساتھ اردو ادب کا ذوق بھی فقیر پر اسی قدیم ماحول میں بعض بیرونی مؤثرات کے تحت غالب تو نہ تھا لیکن گونہ اس سے بھی تعلق ضرور قائم ہو گیا تھا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ منطق میں قضایا موجہات کی جو بحث ہے اور ان کی مختلف پیچیدہ قسمیں بتائی گئی ہیں' میں نے ہر قضیہ کو ایک زندہ شخص کا وجود قرار دیا اور ہر قضیہ کا رشتہ دوسرے قضیہ سے قائم کر کے ایک مقالہ ہی لکھ ڈالا' خدا جانے کس طرح اس مقالہ کے چند اوراق استاذ مرحوم کی نظر سے گزر گئے' ہمیشہ اس کا ذکر فرماتے اور کہتے کہ اس شخص کی حماقت ملاحظہ فرمایئے۔ آپ نے ہر قضیہ کو گویا ایک مجسم انسانی وجود فرض کر لیا اور باہمی ان قضایا میں رشتے قائم کیے۔ ہر ایک کی زبان سے تقریر کرائی گئی ہے۔ (ایضاً۔ ص ۴۶)

دوسرے فنون کی تعلیم

ٹونک میں مولانا برکات احمد صاحب سے مولانا گیلانی نے ابتدا سے لے کر انتہا تک یعنی شرح اشارات تک معقولات کی تمام کتابیں بڑے اہتمام کے ساتھ پڑھیں' بقیہ دوسرے فنون کی کتابیں دوسرے استاذ کی خدمت میں اسی مدرسہ میں رہ کر پڑھیں۔

مدرسہ خلیلیہ میں ایک دوسرے استاد مولانا محمد اشرف مرحوم تھے' ان کی تعلیم لاہور کی شاہی مسجد کے مدرسہ

Marfat.com

میں ہوئی تھی' انہوں نے مولانا غلام علی پنجابی سے درسیات کی تکمیل کی تھی' جو مشہور استاد مانے جاتے تھے' عربی ادب اور ریاضی سے ان کو خاصی مناسبت تھی۔ کئی سال درس دینے کے بعد معقولات کا جب شوق ہوا تو مدرسہ چھوڑ کر مولانا برکات احمد کی خدمت میں آ کر معقولات کا درس لینا شروع کر دیا۔ بعد میں ان کو مدرسہ خلیلیہ میں استاد بنالیا گیا تھا...... مولانا گیلانی نے لکھا ہے کہ فقیر کو عربی ادب' ریاضی اور ہیئت و ہندسہ کی کتابیں ان سے ہی پڑھنے کا موقع ملا......مولانا کے الفاظ یہ ہیں:

''ہدایہ اولین کا کچھ حصہ سمینہ (ملتان) کے رہنے والے مولانا محمد اشرف مرحوم سے خصوصی طور پر فقیر نے پڑھا تھا۔''

آگے یہ بھی لکھا ہے:

''خاکسار نے مولانا مرحوم سے بہت فائدہ اٹھایا' عربی ادب کی نصابی کتابیں' حریری' متنبی' حماسہ' معلقہ' سب انہی (مولانا اشرف) سے پڑھیں اور ریاضی' ہیئت اور ہندسہ کی کتابیں بھی انہی سے پوری کیں۔'' (رسالہ دار العلوم دیو بند۔ ربیع الثانی ۱۳۷۱ھ)

طلبہ پر پابندی

مولانا گیلانی کی ذہانت ومحنت سے مولانا برکات احمد صاحب بہت متاثر تھے اور ان کی دلی خواہش تھی کہ یہ اپنے وقت کا سب سے بڑا معقولی استاد بنے اس لئے اخبارات ورسائل اور اردو کتابوں کے پڑھنے کی سخت ممانعت کر رکھی تھی' طلبہ کے لئے اس طرح کی چیزوں کو وہ سخت ناپسند کرتے تھے۔

مولانا گیلانی نے اپنے استاذ کے سلسلے میں لکھا ہے:

''حضرت حکیم (مولانا برکات احمد) صاحب پر جہاں منطق وفلسفہ کا ذوق غیر معمولی مسلط تھا' وہیں جدید اخباری ادبیات سے سخت کارہ تھے' وہ ان چیزوں کو سطحیت قرار دیتے تھے۔ قدغن تھا کہ ان کا کوئی طالب علم اخبار نہ دیکھے' ناول نہ پڑھے اور جدید اردو ادب کے مصنفین کی سطحی کتابیں مطالعہ نہ کرے۔'' (ایضاً۔ ذی الحجہ ۱۳۷۰ھ ص ۴۶)

طب پڑھنے کی ممانعت

ٹونک کے زمانہ قیام میں مولانا گیلانی نے چاہا کہ طب کی کتابیں پڑھ لیں تا کہ آئندہ ذریعہ معاش بن سکے مگر استاذ محترم نے آپ کے لئے اس کو بھی پسند نہیں کیا اور کسی طرح اجازت نہیں دی' مولانا نے ''ایام عمر گذشتہ'' میں ایک جگہ تذکرہ کیا ہے کہ

''ایک ذریعہ معاش غریب مولویوں کے لئے طب کا رہ گیا تھا۔ میرا خاندانی پیشہ چند پشت سے طب کا تھا' فرمانروائے ٹونک کے طبیب خاص مولانا حکیم برکات احمد صاحب قدس سرہ العزیز میرے استاذ تھے لیکن انہوں نے طب پڑھانے سے انکار ہی نہیں کیا بلکہ ان کے بھائی سے جب طب کی کتاب شروع کی تو جداً حکیم صاحب مرحوم نے ان کو پڑھانے سے منع کر دیا۔''

(رسالہ دارالعلوم دیوبند۔ شعبان ۱۳۷۴ھ ص ۳۵)

طب سے ممانعت کی وجہ

استاذ مرحوم نے طب پڑھانے سے خود انکار اور دوسروں کو منع اس لئے کیا تھا کہ ذی استعداد ذہین مولوی ہے' استاذ بنے گا تو ملک وملت کو عظیم فائدہ ہوگا' طبیب ہو کر کیا کرے گا؟ علاج معالجہ کے راستے سے اچھا پیسہ کما لے گا مگر اس کام کے لئے بہت سارے اطباء موجود ہیں' اس جوہر گرانمایہ کا برباد ہونا بڑا علمی خسارہ ہوگا۔

مختصر یہ کہ استاد محترم نے بڑی تمناؤں کے ساتھ مولانا گیلانی کو پڑھایا تھا اور ان سے ان کی بہت ساری امیدیں وابستہ رہی ہوں گی جیسا کہ عام طور پر مخلص اساتذہ کو اپنے ذہین وہونہار تلامذہ سے رہتی ہیں اور انہوں نے تو سات آٹھ سال خصوصی توجہ سے مولانا گیلانی کو پڑھایا تھا' پھر ایسا کیوں نہ سوچتے۔ ان کا یہ سوچنا بجا تھا۔

انقلاب طبع کا اثر استاذ پر

مولانا کی زندگی میں جب وعظ گوئی کے راستہ سے نیا انقلاب آیا جس کی تفصیل آپ اپنی جگہ پڑھیں گے تو مولانا کے استاد اقدس پر کیا گزری ہوگی' نا قابل بیان ہے' اس سلسلے میں خود مولانا گیلانی ہی کے چند جملے ملاحظہ فرمائیں' لکھتے ہیں۔

''حکیم (مولانا برکات احمد) صاحب قبلہ کی غیوبت سے خود مدد ملی' جب واپس ہوئے نہ پوچھئے کہ اپنے اس شاگرد کے متعلق جسے وہ حمد اللہ اور قاضی مبارک کا کامیاب مدرس بنانا چاہتے تھے اسی کے متعلق یہ سن کر کہ وہ تو واعظ شہر بن گیا ہے' ان پر کیا گزری' خود اس پر جس حد تک برس سکتے تھے برسے ہی اور جن لوگوں نے واعظ شہر بنانے کے جرم میں حصہ لیا' ان کی جو درگت بنی وہی بے چارے جانتے ہوں گے۔ غفر اللہ لھم ولنا اجمعین''

(رسالہ دارالعلوم دیوبند۔ ذی الحجہ ۱۳۷۰ھ ص ۴۰)

وعظ گوئی کی جرأت ٹونک کی زندگی میں اس وقت اس لئے ہوئی تھی کہ مولانا کو استاذ محترم نواب صاحب ٹونک کے ساتھ ایک ماہ کے لئے ٹونک سے باہر گئے ہوئے تھے۔ حضرت مولانا حکیم برکات احمد صاحب وعظ گوئی کو بھی طلبہ کے لئے پسند نہیں کرتے تھے اور سطحیت قرار دیتے تھے' مولانا گیلانی نے اپنی اس تقریر کا جہاں قصہ سنایا ہے وہاں

صراحت کی ہے۔

''اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ استاذ مرحوم نواب صاحب ٹونک کے ساتھ ایک مہینہ کے لئے باہر چلے گئے تھے۔ میدان خالی تھا' ورنہ جیسے ان کے یہاں اخبار بینی وغیرہ سطحیت کے الزام مطعون تھی' اسی طرح وعظ گوئی بھی حکیم صاحب قبلہ کے نزدیک سطحی مولویوں کا پیشہ سمجھی جاتی تھی۔'' (ایضاً۔ص ۴۷)

علمی استعداد

اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ پہلے زمانہ میں طلبہ ذی استعداد کیسے ہوتے تھے اور ان پر اساتذہ کتنی محنت کرتے تھے اور اپنے تلامذہ سے ان کا کتنا گہرا اور مخلصانہ لگاؤ ہوتا تھا' ان کی کیسی نگرانی فرماتے تھے اور ان کی ہر حرکت وسکون پر کس طرح نظر رکھتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ہر ہر طالب العلم جب مدرسہ سے نکلتا تھا تو اپنے وقت کا جید استاذ اور صاحب فن ہوا کرتا تھا' مولانا گیلانی بلاشبہ خوش قسمت تھے کہ مولانا برکات احمد جیسا شفیق استاذ ملا' جنہوں نے ان کے چھپے ہوئے جوہر کو نکھار دیا جس سے وہ اپنے زمانہ کے نیر تاباں بنے اور آگے چل کر اپنے ہم عصروں میں ممتاز شمار ہوئے۔

ایک نئے انقلاب سے دوچار

مولانا گیلانی اب تک دنیا ومافیہا سے الگ تھلگ صرف لکھنے پڑھنے اور مطالعہ میں منہمک تھے کہ ہندوستان میں خلافت کی تحریک شروع ہوئی۔ یہ ۱۳۳۰ھ کا ابتدائی مہینہ تھا۔ ٹونک کا علاقہ اس سے بڑی حد تک دور دراز ہونے کی وجہ سے الگ تھلگ رہا' مگر انہی دنوں میں ایک مولوی صاحب چندہ کے نام پر وہاں بھی پہنچ گئے اور جمعہ میں ان کی تقریریں شروع ہو گئیں۔ ان کی تقریر میں زور بیان نہیں تھا اس لئے کئی ہفتے گزر گئے مگر انہیں قطعاً کامیابی حاصل نہیں ہوئی' مشکل سے چار یا پانچ روپے جمعہ میں چندہ ہو پاتا تھا۔

تقریر سننے والوں میں مولانا گیلانی بھی بحیثیت طالب العلم شریک ہوتے تھے۔ جمعہ کی نماز پڑھنے جانا جامع مسجد ہی میں ہوتا تھا۔ یہ مولانا کی نوجوانی کا زمانہ تھا۔ مولانا محسوس کرتے تھے کہ خود واعظ میں جان نہیں ہے۔ ایک جمعہ میں ایسا ہوا کہ وہی مولوی مقرر صاحب اپنی تقریر میں کہنے لگے۔

''اس شہر میں عربی مدرسہ بھی ہے' علماء بھی ہیں اور طلبہ بھی ہیں لیکن جمود و بے حسی کی یہ انتہا ہے کہ ہفتوں سے چلا رہا ہوں کوئی میری پشت پناہی کے لئے تو کیا اٹھتا بات بھی نہیں پوچھتا۔'' (رسالہ دارالعلوم دیوبند۔ ذی الحجہ ۱۳۷۰ھ ص ۴۷)

Marfat.com

مولانا پر تقریر کا ردِ عمل

تقریر کرنے والے مولوی صاحب کے یہ جملے مولانا گیلانی کے لئے چیلنج بن گئے اور وہاں سے جب اٹھے تو سوچنے لگے کیوں نہیں ایک جمعہ میں تقریر کر دوں کہ مولوی صاحب کو اندازہ ہو جائے کہ اس مدرسہ کے طلبہ کیسے ہوتے ہیں اور یہ لوگوں پر کیسے اثر انداز ہوا جاتا ہے۔

اس زمانہ میں اتفاق سے مولانا گیلانی کے استاذ محترم ایک ماہ کے لئے ٹونک سے باہر جا چکے تھے۔ میدان خالی تھا' ان کی موجودگی میں ہمت نہیں ہو سکتی تھی مگر جب اطمینان تھا کہ استاذ کی واپسی کہیں ایک ماہ بعد ہوگی' اس وقت تک میرے وعظ کی بات بھول بھلا جائے گی اور حضرت الاستاذ کو خبر نہ ہوگی۔

یہ ذہن کے کسی گوشتے میں نہیں تھا کہ ان کا یہ وعظ انہیں واعظ شہر بنا دے گا اور یہاں سے ان کی علمی لائن بدل جائے گی۔ نوجوانی کا جوش اور شوق تھا جس نے مولانا کو وعظ گوئی یا نمازیوں سے خطاب کے لئے آمادہ کر دیا۔

پہلا وعظ ٹونک میں

مولانا لکھتے ہیں کہ اس سوچ میں جمعہ کا دن آ گیا' نماز بھی ہوگئی' اپنے اس تقریری ارادہ سے صرف اپنے چند ساتھیوں کو مطلع کیا تھا' سنتوں کے بعد تقریر کے لئے دفعتاً کھڑا ہو گیا' اسے خود مولانا کے قلم سے ہی سننے میں مزہ آئے گا کہ انداز کیا تھا۔ فرماتے ہیں:

> ''بیچ مسجد میں کئی ہزار نمازیوں کو بلند آواز میں کڑکتے ہوئے وامتازوا الیوم ایھا المجرمون (اور جدا ہو جاؤ آج کے دن اے جور کرنے والے لوگ) کی قرآنی آیت سے کچھ اس طرح خطاب کیا کہ جو جہاں تھا وہاں سے ہلنا بھی محسوس کر رہا تھا کہ ناممکن ہے۔''

وعظ کے اثرات

مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ حمد و نعت کے بعد قرآن پاک کی یہی ایک آیت تلاوت کی اور پھر جو کچھ کہنے والا تھا کہنے لگا' پندرہ منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ معلوم ہوا

> ''ساری مسجد میں کہرام مچا ہوا ہے' جو کہہ رہا تھا وہ بھی بے ہوش تھا' رو رہا تھا' اور جو سن رہے تھے وہ بھی ڈھاریں مار رہے تھے' جس کے پاس جو کچھ تھا پھینکتا جا رہا تھا' اس میں روپے بھی تھے پیسے بھی' گھڑیاں بھی تھیں' انگوٹھیاں بھی' شیروانیاں بھی تھیں' اور چھڑیاں بھی' سب سمیٹی گئیں۔ اندازہ کیا گیا کہ جس مسجد میں چند ہفتوں تک تقریروں سے سو روپے بھی وصول نہ ہو پائے تھے اس مسجد میں دیکھا گیا کہ تقریباً پانچ سو روپیہ کا سرمایہ جمع ہو گیا تھا۔''
>
> (رسالہ دارالعلوم۔ ذی الحجہ ۱۳۷۰ھ)

Marfat.com

یہ مولانا کی نوجوانی کے جوش وخروش میں دل سے نکلی ہوئی باتیں تھیں جو دلوں کو چیرتی ہوئی سینوں میں اترتی جارہی تھیں اور سننے والے تڑپ رہے تھے۔

واعظ شہر

اس کے بعد پھر کیا تھا مولانا طالب العلم سے واعظ شہر ہو گئے' لوگوں نے دعوتیں شروع کر دیں۔ محلے محلے خوب جلسے ہونے لگے اور اسی ٹونک نامی شہر سے کوئی بیس ہزار کی رقم امدادی فنڈ میں بھیجی گئی جس میں کل تک ایک پردیسی مولوی کے وعظ کا کوئی اثر دیکھنے میں نہیں آ رہا تھا' مولانا بھی خوش' ساتھی سارے خوش اور اہل شہر کو بھی فخر کہ ان کے شہر کا ایک طالب العلم ایسا پُر جوش وخوش بیان مقرر ہے۔

اب چندہ کرنے والے مولوی صاحب کی بھی آنکھیں کھل گئیں کہ مسلمانوں سے چندہ کی اپیل کس طرح کی جاتی ہے اور مسلمان چندہ دینے میں کس قدر سخی ہوتے ہیں اور اسلام کے نام پر کیا کچھ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ایک نوجوان طالب علم کی بس ایک تقریر سے کایا پلٹ ہوگئی' ان میں جوش وخروش پیدا ہو گیا اور عام مسلمانوں کی رگوں میں زندگی کا خون جسے منجمد سمجھ لیا گیا تھا' دوڑنے لگا۔

تقریری سرمایہ کی فراہمی

طالب علمی کا زمانہ تھا۔ دس بیس تقریروں میں وہ سارا سرمایہ ختم ہو گیا' جو مطالعہ یا اساتذہ کی درسی تقریروں سے ذہن میں جمع کر رکھا تھا' مولانا گیلانی فرماتے ہیں کہ واعظ ہونے سے حوصلے بڑھ گئے' جوش عمل میں اضافہ ہو گیا مگر محسوس ہوا کہ وعظ میں کہنے کی کوئی نئی بات ذہن میں باقی نہیں رہی۔ چنانچہ امام غزالیؒ کی ''احیاء العلوم'' کی طرف متوجہ ہوا۔ خود لکھتے ہیں......

> ''ہوا یہ کہ اس عرصے میں چند دنوں تک تو دماغی سرمایہ سے اپنی تقریروں میں کام لیتا رہا لیکن نوعمری کا زمانہ' سرمایہ بہت جلد ختم ہو گیا' ضرورت اضافہ کی ہوئی' اتنی سمجھ پیدا ہو چکی تھی کہ ''احیاء العلوم'' غزالی کا مطالعہ عربی زبان میں کر کے مطالب کو اخذ کر سکتا تھا' ''احیاء العلوم'' کا مطالعہ شروع ہوا' مطالعہ کلیتًا دوسرے کے لئے کیا جاتا تھا۔ (ایضاً۔ ص ۴۸)

امام غزالی کی گرفت میں

گویا ''احیاء العلوم'' کے ذریعہ وعظ کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ مگر مولانا کو کیا خبر تھی کہ امام غزالیؒ ان کو اپنا مرید باصفا بنالیں گے اور ان کے دل ودماغ پر قابض ہو جائیں گے لیکن ہوا یہی کہ پڑھنے والا خود شکار ہو گیا' خود لکھتے ہیں۔

> ''لیکن بجائے دوسروں کے سب سے پہلے غزالی کی گرفت میں خود مطالعہ کرنے والا پھنس گیا اور ایسا پھنسا کہ شاید آخری سانس تک یہ گرفت ڈھیلی ہوتی ہوئی نظر نہیں آئی۔'' (ایضاً)

Marfat.com

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام غزالیؒ کی ''احیاء العلوم'' نے پہلے جملہ میں ہی معقولات کے وہ سارے تانے بانے بکھیر دیئے جو برسوں سے اس نے ذہن وفکر کے دریچوں پر بُن رکھے تھے۔ حیرت ہے کہ سات سال کا کمایا ہوا اثاثہ چند دنوں میں لٹنے لگا اور ذہن وفکر کا ڈھانچہ بدلنے لگا' یہ ایسا انقلاب تھا جس نے خود مولانا حیرت زدہ تھے۔ لکھتے ہیں کہ

''دماغ الٹ گیا' طبیعت پلٹ گئی' دل بدل گیا' جو کچھ اب تک تھا وہ باقی نہ رہا' نتیجہ یہ ہوا کہ اب نہ منطق کی کتابوں میں جی لگتا ہے اور نہ فلسفہ میں لذت ملتی ہے' سب سے دل اُچاٹ ہوگیا۔ اسی اضطراب میں کچھ دنوں کے لئے ٹونک سے غائب بھی ہوگیا۔ قرب مکانی کی وجہ سے خواجہ ہند (اجمیریؒ) کے آستانہ پر جاگرا۔'' (ایضاً)

امام غزالی کے اثرات

حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ کے مزار مقدس کی کشش مولانا گیلانی کو اجمیر لے آئی' سوچا ہوگا وہاں پہنچ کر بے چین طبیعت کو چین آئے گا' جس ذہنی وفکری انقلاب سے اس وقت دو چار ہیں شاید اس میں کچھ کمی آجائے گی اور اس طرح آب وہوا کی تبدیلی بھی ہوجائے گی۔

یہاں آکر قیام کا بھی ایک مسئلہ سامنے تھا' چنانچہ ٹھہرے اپنے ہم ذوق مولانا معین الدین اجمیریؒ کے پاس' جو مولانا مرحوم کے استاذ بھائی تھے کیونکہ مولانا اجمیری بھی حضرت مولانا برکات احمد کے ارشد تلامذہ میں ہی تھے۔ خود مولانا مرحوم نے لکھا ہے:

''اجمیر شریف میں خاکسار کا قیام مولانا معین الدین مرحوم کے دولت خانہ پر تھا' مولانا مرحوم ہمارے استاذ مولانا برکات احمد کے ارشد تلامذہ میں تھے' اسی تعلق سے خاکسار کو اپنا مہمان بنایا تھا' میں نے ان سے پڑھا تو نہیں تھا لیکن ان کی عنایت ونوازش سے ہمیشہ مستفید ہوتا رہا۔''

(رسالہ دارالعلوم دیوبند۔ محرم ۱۳۷۱ھ ص ۴۲)

شکوۂ خواجہ

ابھی خلافت سے متعلق وعظ کا جنون اترا نہیں تھا' یہاں پہنچ کر ایک لمبی نظم لکھی۔ پہلے اجمیر کی شاہجہانی مسجد میں جوشیلی وجذباتی تقریر کی۔ بیس پچیس ہزار کا مجمع تھا اور پھر خواجہ کے قبہ کے سامنے اس عظیم مجمع میں اپنی وہ نظم سنائی جس کا عنوان ''شکوہ خواجہ'' تجویز ہوا تھا۔ مولانا نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ ۲۲ صفر ۱۳۳۰ھ کا ہے۔

مولانا نے اپنی جوانی میں جب یہ نظم پڑھی ہوگی یقیناً مجمع بے تاب ہوگیا ہوگا اور جو حال ٹونک میں نمازیوں کا ہوا تھا اس سے کچھ زیادہ آہ وزاری یہاں بھی ہوئی ہوگی' کیونکہ مولانا کی آواز میں درد تھا' جاذبیت تھی اور محویت کا عجب عالم ہوتا تھا۔

Marfat.com

مولانا کے پڑھنے کا اثر

خاکسار کو تجربہ ہے کہ مولانا گیلانی کی آواز میں بلا کی کشش تھی۔ جب جہری نماز میں قرآن پڑھتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دل سینے سے باہر ہوا جاتا ہے اور نظم پڑھتے ہوئے بچشم خود دیکھا اور سنا ہے کہ اس بڑھاپے میں بھی مولانا کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتا تھا اور سننے والا کھو جاتا تھا اور وہ بھی روتا جاتا تھا۔

ایک حاضری کے موقع سے مولانا مرحوم نے دوپہر کے سناٹے میں یہ ''شکوۂ خواجہ'' اور مدینہ منورہ کی حاضری کے موقع سے جو نعت کہی تھی' خود لے سے پڑھ کر بندہ کو سنائی' جہاں خاکسار اور مولانا کے سوا کوئی تیسرا نہیں تھا۔ خود بھی خوب روئے اور سننے والا بھی تڑپ تڑپ کر رہ گیا' یہ ریٹائر ہونے کے بعد کا واقعہ ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دور نوجوانی اور طالب علمی میں مولانا کی نظم نے کیا آفت ڈھائی ہوگی۔ پورے اجمیر میں اس کا خوب خوب چرچا پھیلا۔

ٹونک سے واپسی

مولانا معین الدین اجمیری کو جب اطلاع پہنچی کہ اس جوان مولوی کا اس وقت یہ حال ہو رہا ہے تو مولانا اجمیریؒ نے ان کو ٹھنڈا کرنے کی تدبیر کی۔ خود لکھتے ہیں:

> ''مولانا معین الدین نے سمجھا بجھا کر مجھے پھر ٹونک لوٹا دیا' لوٹنے کی حد تک تو لوٹ گیا مگر اجمیر شریف ہی کے قیام میں مبہم مبہم سا ایک فیصلہ دل میں جلوہ گر ہونے لگا کہ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لئے بجائے ٹونک کے کہیں اور مجھے چلنا چاہیے۔''
>
> (رسالہ دارالعلوم دیوبند۔ محرم ۱۳۷۱ھ ص ۴۳)

پاسبان عقل کی پسپائی

یہ نیا انقلاب مولانا گیلانی کی زندگی میں بہت مؤثر ثابت ہوا اور ان کا رخ اس نے معقولات سے منقولات کی طرف موڑ دیا۔ قاعدہ ہے کہ جب قلب متاثر ہوتا ہے تو پھر عقل کی کچھ نہیں چلا کرتی ہے' جن لوگوں کو عقل و دل کی لڑائی کا تجربہ ہے وہ بہت آسانی سے سمجھ سکتے ہیں' عقل ہزار دلائل پیش کرے اور دل کو قائل بھی کر دے مگر پھر بھی دل قابو میں آنے کا نام نہیں لیتا۔ کسی شاعر نے کہا ہے:

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ کبھی کبھی ''پاسبان عقل'' بھی بے دست و پا نظر آتا ہے اور جو نہ ہونا چاہیے دل اس کے کرنے پر بضد ہو جاتا ہے اور آدمی سب کچھ جانتے ہوئے مجبور ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

ہیضہ کا ابتلاء

اجمیر سے مولانا لوٹ کر جب ٹونک آئے تو قدرت کی طرف سے ایک نیا حادثہ یہ پیش آیا کہ چند ہفتے کے بعد ہی ٹونک میں ہیضہ جیسی وبائی بیماری پھیل گئی اور ایک ایک دن میں بیسوں آدمی مرنے لگے۔ مولانا کا بیان ہے کہ

> ''اس مختصری آبادی (ٹونک شہر) میں مرنے والوں کی تعداد اسّی اسّی پچاسی پچاسی تک کسی دن پہنچ جاتی تھی۔'' (ایضاً)

یہ معاملہ اس حد تک نہیں رہا بلکہ اس مرض مہلک میں خود مولانا گیلانی بھی مبتلا ہو گئے۔ ہیضہ کا بڑا زبردست حملہ ہوا ایسا کہ شفا پانے کے بعد بھی پندرہ دن تک آنکھوں کی بینائی غائب رہی' بیماری کے زمانہ میں مدرسہ کے طلبہ نے بہت خدمت کی' مولانا کے شفیق استاد برابر دردمندی کے ساتھ علاج میں مشغول رہے اور ایک مرحلہ تو ایسا آیا کہ طبیب بھی قطعاً مایوس ہو گئے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور کسی طرح جان بچی۔ مولانا نے ''بیتے ہوئے دن'' میں اس بیماری کا تذکرہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''دوسروں کے ساتھ خاکسار بھی اس وبائی مرض (ہیضہ) میں مبتلا ہوا' حملہ اتنا سخت تھا کہ شفا یاب ہونے کے بعد بھی دس پندرہ دن تک مجھے کچھ سجھائی نہ دیتا تھا' بینائی گویا مفقود ہو چکی تھی' دس بارہ طالب علم نوبت بہ نوبت میرے اردگرد شب و روز جاگتے رہتے تھے اور تیمارداری کے فرائض انجام دیتے تھے۔ چند مہینے پہلے بجائے ایک معمولی طالب علم کے واعظ شہر بھی بن چکا تھا' اس لئے سارا شہر میرے بیمار پڑ جانے کی خبر سے متاثر تھا۔ شہر کے ایک معمر بزرگ جنہیں حضرت سید احمد صاحب بریلوی رحمتہ اللہ علیہ کی رفاقت کا شرف نوعمری میں حاصل ہوا تھا۔ عیادت کے لئے تشریف لائے اور اپنی نیم بے ہوشی کی حالت میں ان کی زبان سے میں نے کچھ سنا' کیا سنا؟ جسے بھی سناؤں گا سننے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا' بس میں نے سن لیا اور جو سنایا گیا تھا اسے دیکھ بھی لیا...... ہیضہ کا وہی مریض جس کی نبض پر ہاتھ رکھنے کے ساتھ ہی طبیب (حکیم مولانا برکات احمد صاحب) آبدیدہ ہو کر سرہانے سے اٹھ چکا تھا' وہی زندہ کیا گیا۔ جو آنکھیں نابینا ہو چکی تھیں ان میں رفتہ رفتہ روشنی واپس آئی۔'' (ایضاً۔ ص ۴۳ و ۴۴)

صحت یابی کے لئے ایک بزرگ کی دعا

مولانا گیلانی کے بیان سے ظاہر ہے صحت یابی میں حضرت سید احمد بریلوی شہیدؒ کے اس رفیق کی دعا کا بڑا اثر تھا' جو عیادت کے لئے تشریف لائے تھے اور جنہوں نے مولانا کی صحت یابی کے لئے خصوصی دعا کی تھی' مولانا نے اسے یہ کہہ کر ظاہر نہیں فرمایا کہ ''جسے بھی سناؤں گا سننے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا''۔ بعض اللہ والوں کی دعا میں بڑی

Marfat.com

ثیر ہوتی ہے۔

جن لوگوں نے "سیرت شہید" کا مطالعہ کیا ہے ان کو اندازہ ہوگا کہ اس جماعت کے ایک ایک فرد کا کیا حال تھا' جہاد کے جذبہ نے ان سب کو سراپا حال بنا رکھا تھا۔ جہاں جہاں یہ قافلہ پہنچتا وہ جگہ پُرنور معلوم ہوتی تھی۔

مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا کو صحت بخشی' آنکھوں کی بینائی جو مرض کی شدت سے ختم ہو چکی تھی' عود کر آئی اور بعد صحت گھر والوں کے تقاضا پر ٹونک سے وطن آ گئے کہ آب و ہوا کی تبدیلی سے پورے طور پر توانائی پھر آ جائے اور تعلیم کا جو حصہ باقی رہ گیا ہے وہ پورا ہو سکے۔

مولانا گیلانی دارالعلوم دیوبند میں

ہیضہ کی بیماری سے جب جان بچ گئی اور وطن آ گئے تو سوچنے لگے آئندہ سال کیا کیا جائے' یہ تو تقریباً طے کر چکے تھے کہ ٹونک نہیں جانا ہے' ادھر یہ بات بھی طے تھی کہ معقولات کی ساری کتابیں پڑھ چکے' نصاب کی تکمیل ہو چکی تھی' صرف حدیث پڑھنے کا مسئلہ باقی رہ گیا تھا۔

دیوبند کا تذکرہ

اجمیر شریف جن دنوں مولانا معین الدین اجمیری کے یہاں آپ کا قیام تھا' ان کی زبان سے حدیث پڑھانے کی تعریف شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن کے متعلق سن چکے تھے اس لئے ذہن میں بار بار دیوبند کا ہی نام آتا تھا' شیخ الہندؒ کے متعلق اپنی ہی جماعت کے مولانا اجمیری سے ان کے بزرگ ہونے کا واقعہ بھی سن رکھا تھا اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ مولانا کو امام غزالیؒ کی "احیاء العلوم" نے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

شیخ الہند کا ذکر

جہاں اجمیر کا قصہ بیان کیا گیا ہے وہاں مولانا اجمیری کے حوالے سے مولانا گیلانی نے لکھا ہے:

> "اثنائے گفتگو میں پہلی مرتبہ ان ہی (مولانا اجمیری) سے مجھے معلوم ہوا کہ حضرت مولانا محمود الحسنؒ نرے مولوی اور مدرس ہی نہیں ہیں بلکہ ایک خدا رسیدہ عارف ہونے کے ساتھ ساتھ ان میں وہ تڑپ بھی پائی جاتی ہے جس نے آج کل تجھے بے چین کر رکھا ہے۔"
>
> (رسالہ دارالعلوم۔ محرم ۱۳۷۱ھ ص ۴۳)

یہ حقیقت بھی ہے کہ اس زمانہ میں علم حدیث کا شیخ الہند سے بڑھ کر کوئی دوسرا استاذ ہندوستان میں نہیں تھا' اور نہ دارالعلوم دیوبند کا سا کوئی مدرسہ تھا' جہاں ملک کے کونے کونے سے طلبہ تو آتے ہی تھے بیرون ملک سے بھی

Marfat.com

حدیث پڑھنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا' علوم دینیہ کی درس و تدریس کے اعتبار سے دارالعلوم کا دور شباب تھا۔

دل کی بات زبان پر

رمضان میں دل کی بات زبان پر آئی اور مولانا نے اپنے مربی مولانا ابوالنصر سے عرض کیا کہ اب حدیث پڑھنے کے لئے مجھے دیوبند کی اجازت مرحمت فرمادیں' مولانا کے مربی پہلے اس کے لئے راضی نہیں ہوئے' چچا بھتیجے میں بحث ہوتی رہی' چچا کا رجحان اب بھی ٹونک ہی کی طرف تھا اور بھتیجا بضد تھا کہ اب اسے وہاں نہیں جانا ہے' دل کا رجحان دیوبند کی طرف ہے۔ بھتیجا اب بچے سے جوان ہو چکا تھا' علم و فضل کے آثار پورے طور پر ظاہر ہو چکے تھے۔

مبشرات

اس کا فیصلہ قدرت نے اس طرح کیا کہ چچا کے خواب میں کچھ ایسے مبشرات آئے کہ ان کو اپنی رائے بدلنی پڑی اور بھتیجے کی رائے کی درستی سمجھ میں آنے لگی۔ مولانا نے لکھا ہے کہ

> ''اپنے بزرگوں کو دل کے اس فیصلے سے مطلع کیا' فیصلہ یہی تھا کہ دارالعلوم دیوبند پہنچ کر حضرت مولانا محمود حسنؒ سے حدیث پڑھنا چاہتا ہوں' ردوقدح کا سلسلہ جاری تھا کہ بعض مبشرات اور رویائے صالحہ نے میرے تعلیمی سرپرست عم مغفور و مرحوم مولوی حکیم سید ابوالنصر کے قلب کو...... بھی اس فیصلہ کے لئے راضی کر دیا اور طے ہو گیا کہ رمضان بعد بجائے ٹونک خاکسار دارالعلوم دیوبند ہی کا احرام باندھے گا۔'' (ایضاً۔ ص ۴۴)

دیوبند سے خط و کتابت

اب مولانا گیلانی اس فکر میں پڑے کہ دیوبند پہنچنے کا سلسلہ کیا ہو؟ دیوبند کے کسی عالم سے شناسائی نہیں تھی اور نہ کسی دیوبندی عالم سے ملاقات کی نوبت آئی تھی لیکن جوئندہ یابندہ' مولانا گیلانی سوچتے رہے۔ پھر خود ہی خیال آیا کہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم صاحب کو ایک خط لکھ دیا جائے تاکہ داخلہ میں آگے چل کر کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ چنانچہ یہی کیا' حافظ محمد احمد صاحب خلف ارشد بانی دارالعلوم حضرت نانوتویؒ اس زمانہ میں مسند اہتمام پر فائز تھے۔ ان کے نام ایک درخواست لکھی کہ آپ کے مدرسہ میں داخل ہو کر دورہ حدیث پڑھنا چاہتا ہوں۔ اپنی استعداد کے ثبوت میں ''الجواہر الغالیہ فی الحکمۃ المتعالیہ'' کی چند فصلوں کا اُردو ترجمہ کر کے درخواست کے ساتھ روانہ کیا۔

درخواست کی منظوری

قدرت کو دارالعلوم دیوبند پہنچانا تھا' مولانا لکھتے ہیں کہ واپسی ڈاک سے جواب ملا کہ ''تم فوراً دیوبند پہنچ جاؤ' ہر چیز کا نظم کر دیا جائے گا۔''

Marfat.com

اس پر دستخط حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے تھے' جو اس وقت دارالعلوم کے مہتمم تھے اور یہ بانی دارالعلوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ کے خلف الرشید تھے۔

اس جواب سے قدرتاً مولانا گیلانی کو مسرت ہوئی۔ چچا کو دکھایا کہ داخلہ کی منظوری آ گئی' اب اس کے بعد دیوبند روانگی کی تیاری شروع کر دی۔

دیوبند کے لئے روانگی

یہ خط و کتابت ماہ مبارک رمضان میں ہوئی تھی' عید بعد سفر کا انتظام شروع ہو گیا اور پھر بقول مولانا مرحوم:

> ''رمضان بعد حسب طلبی خاکسار گھر سے تن تنہا روانہ ہوا' کچھ نہیں جانتا تھا جس ماحول میں شریک ہونے جا رہا ہوں وہاں کی خصوصیات کیا ہیں؟ اس ماحول سے مناسبت پیدا ہو گی یا نہیں' تنہا ہی گھر سے نکلا۔''

اس زمانہ میں آج کی سی سہولت نہیں تھی' گیلانی سے اپنے سٹیشن شیخ پورہ پیدل چل کر آنا پڑا ہو گا' جو دس پندرہ میل سے کم نہیں یہاں سے گیا۔ گیا سے سہارنپور اور سہارنپور سے دیوبند پہنچے خود مولانا لکھتے ہیں:

> ''دیوبند کے سٹیشن پر ٹھیک اس وقت جب اپنی عمر کے بیسویں سال میں خاکسار نے قدم رکھا تھا' تنہا ہی اترا' مدرسہ میں واقفیت اور وہ بھی صرف رسمی واقفیت ایک طالب علم سے تھی' ان کا نام منظر حسن تھا' جواب بوڑھے ہو کر بہار ہی کے ایک گاؤں میں مولانا حکیم منظر حسن کے نام سے مشہور ہیں۔ ایک خط ان کے بڑے بھائی صاحب کا ان کے نام لے لیا تھا۔ سٹیشن سے تانگے پر بیٹھ کر قصبہ کی سڑکوں اور گلی کوچوں سے گزرتے ہوئے اچانک ایک شاہی دروازے کے سامنے تانگے کو دیکھا۔ ٹھہر گیا کہ یہی دارالعلوم دیوبند ہے...... پیشانی پر جس کے انتہائی سادگی کے ساتھ ''مدرسہ اسلامی عربی دیوبند'' لکھا ہوا تھا۔'' (رسالہ دارالعلوم دیوبند)

مولانا دارالعلوم میں

سامان اتار کر آنے جانے والے طلبہ سے منظر حسن بہاری طالب العلم کا کمرہ معلوم کیا' کسی نے رہنمائی کی۔ احاطہ مسجد کے کمرہ نمبر ایک میں پہنچ گئے جو مسجد کے جنوبی پہلو میں پچھم طرف سے پہلا کمرہ ہے۔ مولانا نے لکھا ہے کہ اس کمرہ کے اندر کمرہ ہے جس کو وہ ''حجرہ قبریہ'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جس کمرہ میں دارالعلوم کی پوری طالب العلمی آپ نے گزاری اس کمرہ میں سامان رکھ کر جونہی ذرا اطمینان ہوا' دفتر اہتمام میں حضرت مہتمم صاحب سے ملاقات کے لئے حاضر ہو گئے' وہاں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی سے شرف نیاز حاصل ہوا۔ آپ نے بتایا کہ میں نے خط لکھا تھا خط کا جواب گیا تھا' جواب میں یہاں پہنچنے کو لکھا گیا تھا' چنانچہ آج بندہ یہاں اسی غرض سے حاضر ہوا ہے'

Marfat.com

مولانا عثمانی نے فرمایا تم آ گئے ہو تو ان شاء اللہ داخلہ ضابطہ میں بھی ہو جائے گا۔ سردست مولانا گیلانی کو مولوی منظر حسن بہاری کے سپرد کیا کہ مولوی صاحب نئے ہیں ان کو اپنے حجرہ میں رکھو' مولانا گیلانی نے آپ بیتی میں مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کے سلسلے میں......لکھا ہے:

''میں نہیں جانتا تھا کہ میری دینی و دنیوی راہوں کی ہمواری جس کی کریمانہ نوازشوں اور پدرانہ شفقتوں کے ساتھ ازل ہی سے مقدر ہو چکی تھی اس کی قدم بوسی کی ابتدا کی سعادت اس صورت میں پیش آئے گی......اللہ اللہ کیا ٹھکانہ ہے اس سچائی اور بے ریا زندگی کا کہ سارا کام جو انجام دے رہا تھا...... پہلے اس کے نام سے بھی ناواقف تھا۔'' (دارالعلوم۔محرم ۱۳۷۱ھ ص ۴۶)

شیخ الہند اور حافظ احمد صاحب کے زمانہ کا دارالعلوم

مولانا گیلانی کا تاثر دارالعلوم کے سلسلے میں جو ۱۳۳۱ھ میں انہوں نے ظاہر کیا ہے' وہ اس لائق ہے کہ اسے پڑھا جائے اور تاریخ میں وہ محفوظ بھی کر دیا جائے۔ لکھتے ہیں:

''الغرض دارالعلوم کے گوشہ گوشہ میں زندگی کی ہلچل اور سرگرمیوں کا یہ نظارہ میرے لئے ایک نظارہ تھا......اب اچانک دارالعلوم کے احاطہ میں پہنچ کر بارہ سو طلبہ کے مجمع میں شریک ہو جانا اور طلبہ بھی کسی ایک صوبہ' بلکہ ایک ملک کے بھی نہیں' ان میں جہاں' یوپی' بہار کے طلبہ تھے جن سے فقیر مانوس تھا یا مانوس ہو سکتا تھا' وہیں بڑی تعداد بنگال اور پنجاب و سرحد کے طلبہ کی بھی تھی' انہیں میں اچھی خاصی تعداد کابل' بخارا' سمرقند' کاشغر' سمرقند' وسط ایشیا کے باشندوں کی بھی تھی اور کبھی کبھی اس جھمیلے میں عرب اور حبش اور عراق سے آئے ہوئے طالب علموں پر بھی نظر پڑ جاتی تھی' یہی نہیں بلکہ پہلی دفعہ دارالعلوم کی مسجد کی اذان کان میں آئی تو مؤذن کی آواز کی غیر معمولی بلندی اور کرختگی کو محسوس کر کے پوچھا کہ یہ اذان کس نے دی۔ معلوم ہوا کہ یہ مشرقی یورپ قاذان (روس) کے رہنے والے مولوی محمد جان ہیں اور نماز بھی جن امام صاحب نے پڑھائی پتہ چلا کہ یہ صاحب مولوی حرمت اللہ اسی قاذان کے باشندے ہیں' دیر تک سوچتا رہا کہ یورپ ہم پر چھا گیا اور چھاتا چلا ہی جا رہا ہے کہ دیوبند کی مسجد کی اذان و امامت پر بھی یورپ والوں کا ہی قبضہ ہے' ان میں مولوی محمد جان بڑے دیو ہیکل' ڈیل ڈول کے آدمی تھے۔ سینہ غیر معمولی طور پر چوڑا تھا......ان کی اذان کی بلندی کی توجیہ بھی سمجھ میں آ گئی کہ اس شخص کے پھیپھڑے میں ہوا کا غیر معمولی ذخیرہ بھرا رہتا ہے......الغرض میرے دل و دماغ کے لئے کالے' پیلے' سرخ و سفید' رنگ رنگ کے طلبہ کی یہ بھیڑ بھی حیرت انگیز تھی' دیر تک کسی مرکزی مقام پر کھڑے ہو کر میں ان طالب علموں کو آتے جاتے' دوڑتے' بھاگتے ہوئے دیکھتا رہتا اور دل

میں کہتا کہ بارالہا! میں کہاں آ گیا ہوں' زیادہ سے زیادہ اب تک دس بیس تیس طالب علموں کے حلقوں میں اُٹھنے بیٹھنے' پڑھنے لکھنے کا موقع ملتا تھا' ان میں اپنی حیثیت کے مطابق امتیاز کی صورت بھی نکل آئی تھی لیکن اس طوفان میں معلوم ہوتا تھا کہ میں ڈوب جاؤں گا۔ پتہ بھی نہ چلے گا کہ کون ہوں کہاں ہوں۔'' (رسالہ دارالعلوم۔ ربیع الاول۔ ۱۳۷۱ھ ص ۴۳)

دلکش منظر

یہ پہلا ہفتہ مولانا گیلانی کے لئے حیرت واستعجاب کا موجب بنا ہوا تھا' بھیڑ سے تو متاثر تھے ہی مگر جب مطبخ سے کھانا تقسیم ہوتے ہوئے دیکھا اور نماز میں طلبہ کو شریک دیکھا تو ان کی حیرت میں اور بھی اضافہ ہوا' اس وقت کی نماز باجماعت کا نقشہ مولانا نے اس طرح کھینچا ہے۔

''پھر یہ ہلچل پانچوں وقت کی نمازوں میں مسجد کی طرف میرے لئے حیرت انگیز عجوبہ روزگار بنے ہوئے تھے۔ میں نے اب تک کسی مسجد میں اتنی طویل طویل صفوں کی پنج وقتہ نماز نہیں دیکھی تھی۔ لمبے لمبے کرتوں اور سیدھے سادے لباس میں پانچوں وقت خالق کے سامنے ایک دفعہ سجدہ ریز سروں کا یہ منظر میرے لئے بالکل نیا تھا۔'' (ایضاً۔ ربیع الاول ۱۳۷۱ھ ص ۴۴)

اکابر واسلاف دارالعلوم

مولانا چونکہ ٹونک سے پڑھ کر آئے تھے جہاں دارالعلوم کے اکابر واسلاف کے ناموں کا چرچا تقریباً نہ ہونے کے درجے میں تھا' یہاں اس ماحول میں سارے نام ایسے کانوں میں پڑ رہے تھے جن سے آپ کے کان قطعاً ناآشنا تھے' چنانچہ مولانا نے اس کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ رقمطراز ہیں:

''دوسری طرف کان میں نئے نئے ناموں کا ایک سلسلہ تھا' جو یکے بعد دیگرے مسلسل ٹکراتا چلا جاتا تھا' میرے کان اب تک اہل علم کے جن تذکروں سے بھرے تھے اور دل کو جن کی عظمتوں سے لبریز کردیا گیا تھا وہ دارالعلوم کے احاطہ کی ان نئی آوازوں سے کلیتاً مختلف تھا جہاں بیٹھتے' جدھر جاتے' ہر مجلس' ہر حجرے اور حجروں کے در و دیوار سے حضرت نانوتوی مولانا محمد قاسم رحمتہ اللہ علیہ' حضرت گنگوہی مولانا رشید احمدؒ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ مولانا اشرف علی تھانویؒ مولانا عبدالرحیم رائے پوریؒ کے چرچوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ان چرچوں کو تو صرف سنتا تھا اور انہی کے ساتھ کچھ گرامی اسماء ایسے بھی پتہ چلا کہ اسماء کے ساتھ خود ان کے مسمیٰ پر بھی دور سے نظر پڑ جاتی تھی۔ یہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن' حضرت مولانا انور شاہ کشمیری' مولانا حافظ محمد احمد صاحب' مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی' حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب' مولانا شبیر احمد صاحب

رحمہم اللہ اجمعین کی مبارک اور قدسی ہستیاں تھیں۔ ان کے رہنے سہنے، بولنے چالنے ان کی عادتوں، ان کی نیکیوں، ان کی ظرافتوں، ان کی قربانیوں، ان کی للّٰہیت، اخلاص وصداقت، ان کی کرامتوں اور سب سے زیادہ ان میں ہر ایک کی علمی خصوصیتوں کے سوا...... سچ پوچھئے تو اس پہلے ہفتہ میں میرے کانوں نے شاید ہی کوئی اور بات سنی ہو۔" (رسالہ دارالعلوم دیوبند۔ ربیع الاول ۱۳۷۱ھ ص ۴۵)

دارالعلوم کا انتظام

دارالعلوم کے نظم وانتظام کا بھی مولانا نے تذکرہ کیا ہے کہ ستر سال پہلے کیا انداز تھا، ان میں کھانا، روشنی کا انتظام، کتابوں کی لین دین ساری چیزیں آتی ہیں۔ لکھتے ہیں:

"سب سے پہلی چیز جس سے میرا دل متاثر ہو رہا تھا وہ دارالعلوم کا عجیب وغریب نظم تھا، ہزار بارہ سو طلبہ کے لئے دونوں وقت کے پکے پکائے کھانے کا انتظام اور زیادہ تر بغیر کسی معاوضہ کے اس کھانے کی تقسیم، پھر دیکھا کہ ہر طالب علم خالص سرسوں کا تیل کافی مقدار میں اپنے ساتھ لا رہا ہے۔ یہ کیا ہے؟ جواب دیا گیا کہ اصولاً مٹی کے تیل کی روشنی میں مطالعہ کو دارالعلوم کے ارباب بست وکشاد پسند نہیں کرتے اور روشنی کے لئے ہر مہینہ میں ہر طالب علم کو سرسوں کا یہ تیل ملتا ہے...... الغرض ہر روز ایک نئی بات کا علم اور نیا نظارہ نگاہوں کے سامنے پیش ہوتا...... کھانا بھی مفت، مکان بھی مفت، مکان کا فرش بھی مفت، روشنی بھی مفت، یہ سب کچھ انہی ٹوٹے پھوٹے مسلمانوں کے پیسے سے انجام دیا جا رہا ہے، جن کی بلند ہمتوں کی شہادت دارالعلوم کے احاطہ کی فلک نما سپہر ہما عمارتیں ادا کر رہی تھیں۔" (رسالہ دارالعلوم۔ ربیع الاول ۱۳۷۱ھ ص ۴۶)

طلبہ میں کتابوں کی تقسیم

مولانا گیلانی رحمتہ اللہ علیہ کو یہاں آنے کے بعد ایک فکر یہ دامن گیر ہوئی کہ دورہ حدیث میں دس موٹی ضخیم کتابیں کس طرح خریدوں گا اور نہ خریدوں تو پھر اسباق کی شرکت کی کیا صورت ہوگی؟ پہلے دل ہی دل میں سوچتے رہے پھر اپنے رفیق کمرہ سے معلوم کیا کہ بھئی کچھ کتابیں کہیں سے عاریتاً ملیں گی بھی یا ساری خریدنا ہی ہوں گی؟ سوال کے بعد جواب۔

"معلوم یہ ہوا کہ ان سارے طالب علموں کے لئے نیچے سے اوپر تک ہر کلاس کے لئے مدرسہ ہی نصابی کتابوں کا بھی نظم کرتا ہے، ہر وہ کتاب جو مدرسہ میں پڑھائی جاتی ہے اس کا ایک مستقل الگ کتب خانہ ہے۔ چھوٹی ہو یا بڑی، الغرض کافیہ سے لے کر بخاری تک ہر کتاب کے بے شمار نسخے ہیں، مدرسہ جب کھلتا ہے تو نصابی کتابوں کے اسی کتب خانہ سے پڑھنے کے لئے طالب

Marfat.com

علموں کو عاریۃً کتابیں تقسیم کردی جاتی ہیں اور اختتام سال پر پھر طلبہ ان کتابوں کو واپس کر دیتے ہیں......اس پر معلوم ہوا کہ ہر سال ہزار ہا روپے صرف ہوتے ہیں' جس حال میں طلباء کتابوں کو لیتے ہیں باوجود شدید تاکید کے اسی حال میں واپس نہیں کرتے' جلدیں ٹوٹ جاتی ہیں اوراق پھٹ جاتے ہیں' ان کی درستگی اور اصلاح کے لئے ہر سال کافی رقم جلد بندوں اور داغ دوزوں کو مدرسہ ادا کرتا ہے۔ اسی کے ساتھ ہر سال بہت ساری کتابیں خستہ ہو کر دریدہ ہوتی ہیں اور ناقابل استفادہ ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا سالانہ ایک اچھا خاصا بجٹ خریداری کتب کا بنتا ہے اور خریداری پر صرف ہوتا ہے۔'' (ایضاً۔ص ۴۶'۴۷)

جاڑے کے سامان

چند مہینوں کے بعد مولانا لکھتے ہیں کہ جاڑا آ گیا' دیکھا طلبہ کو اس کا سامان بھی ملنے لگا' مولانا کے الفاظ اس سلسلے میں یہ ہیں۔

''چند دنوں کے بعد سرما کا موسم آ گیا' طالب علموں کے بدن پر خاص قسم کی روئی بھری ہوئی اچکنیں نظر آنے لگیں جس کی نوعیت ایک ہی جیسی تھی' یہ کیا ہے؟ معلوم ہوا کہ اس سے پہلے بھی طلبہ جو لباس پہنے ہوئے تھے ان میں عموماً دار العلوم کے ہی عطا کئے ہوئے جوڑے تھے اور اب موسم سرما میں جو چاہتے ہیں ان کو یہ روئی بھری اچکن اور ایک لحاف' شاید توشک بھی مدرسہ عطا کرتا ہے۔ میرے لئے مدرسہ کا یہ نظام ذہنی انقلاب کا پیغام بنتا جا رہا تھا۔'' (ایضاً۔ص ۴۷)

بیمار طلبہ کے لئے دوائیں

مولانا کا بیان ہے کہ ہر تھوڑے تھوڑے وقفہ سے کوئی نہ کوئی نیا انکشاف ہوتا تھا' چنانچہ لکھتے ہیں۔

''کسی بیمار طالب علم پر نظر پڑی معلوم ہوا دوا بھی مدرسہ ہی کی طرف سے مفت ملے گی' بغیر کسی فیس مدرسہ کے طبیب اس کا معائنہ بھی کرتے ہیں نسخہ بھی لکھتے ہیں...... بلکہ ہر مریض طالب علم کو طبیب کی ہدایت کے مطابق جس قسم کے پرہیزی کھانے کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی مدرسہ ہی کی طرف سے مہیا کیا جاتا ہے۔ جو چیز سنائی جاتی تھی مشاہدہ سے اس کی تصدیق بھی ہوتی چلی جاتی تھی۔'' (ایضاً۔ ربیع الثانی ۱۳۷۱ھ ص ۴۱)

مولانا نے ''بیتے ہوئے دن'' میں لکھا ہے کہ ''دار العلوم کے نظم و ضبط اور اس کی ہمہ گیریوں کا ایک دلچسپ نمونہ سامنے آ گیا ہے۔''

Marfat.com

دارالعلوم کی عمارتیں

عمارتوں کے سلسلے میں مولانا نے لکھا ہے:

''میری نظر پھر مدرسہ کی عمارتوں پر پڑتی۔ ایک احاطہ کے بعد دوسرا احاطہ' دوسرے کے بعد تیسرا احاطہ' شمال وجنوب میں پھیلا ہوا تھا' ہر احاطہ کے بیچ وسیع صحن اور چاروں طرف برآمدے کے ساتھ کمرے اور حجرے' جن میں طلبہ بھرے ہوئے تھے' تعمیرات کا سلسلہ جاری تھا۔'' (ایضاً ص ۴۲)

دارالعلوم کا یہ سارا مستحکم نظام دیکھ کر مولانا حیرت زدہ تھے کہ وہ کیا دیکھ رہے ہیں اور علماء کے ہاتھوں اس قدر ٹھوس نظام کتنا عمدہ چل رہا ہے۔

ایک لطیفہ

یہاں مولانا کا ایک لطیفہ بھی قابل ذکر ہے' لکھا ہے کہ سردی کے موسم میں لحاف کی تقسیم میں طلبہ کے ذوق کے مطابق کچھ تاخیر محسوس ہوئی' مولانا نے اس کے لئے ایک اشتہار کا مضمون تیار کر دیا کہ بلا نام رات میں جب سو جائیں اسے موٹے حروف میں لکھ کر صدر دروازہ پر کوئی چپکا دے' تھوڑی تفریح رہے گی' اشتہار کا مضمون ملاحظہ ہو۔

شب سرما' وبیم موت' افلا سے چنیں طاری
کجا دانند حال ما' خداوندان تو شکہا

'' جاء البرد مع الجبات'' مشہور عربی کی مثل تھی لیکن ہمارے لئے جاء البرد مع الاموات کی مثال صادق آ رہی ہے۔''

بس کیا تھا اس کا چرچا عام ہو گیا۔ طلبہ نے خوب مزے لے لے کر پڑھا اور ایک دوسرے کو سناتے رہے۔
یہ تو ایک نو وارد طالب علم کے تاثرات تھے' جو اس نے ۱۳۳۱ھ کے شوال میں دیکھ کر ظاہر کئے مگر اب اللہ اللہ کر کے داخلہ کے امتحان کا وقت آ گیا اور سب سے ہٹ کر ساری توجہ اسی طرف ہو گئی کہ دیکھئے مقدر کیا دکھاتا ہے۔ عزت رہتی ہے یا جاتی ہے۔

ضابطہ کا داخلہ

مولانا گیلانی نے اب تک جو کچھ دیکھا ایک اجنبی طالب العلم کی حیثیت سے دیکھا اور دارالعلوم کے ایک ایک انتظام کو دیکھ کر ان پر حیرت واستعجاب کی کیفیت طاری ہوئی مگر اصل مقصد تو یہاں باضابطہ داخل ہو کر حدیث پڑھنا تھا' مدرسہ کے ضابطے کے اعتبار سے تمام ضابطوں کی خانہ پری کرنی تھی' امتحان داخلہ دینا تھا اور ممتحن جو فیصلہ کرے اس کے مطابق عمل پیرا ہونا فرائض میں داخل تھا۔

Marfat.com

امتحان داخلہ

جب تک ان مراحل سے طالب العلم نہیں گزر جاتا...... دارالعلوم کا باضابطہ طالب العلم شمار نہیں ہوتا' خواہ کتنے ہی سال گزار دے! مولانا گیلانی کو بھی یہ مراحل طے کرنے تھے' فارم کی خانہ پری کر چکے تھے' اب انتظار تھا کہ امتحان کس استاذ کے پاس جاتا ہے' اتفاق دیکھئے' صدر المدرسین شیخ الہند کے بعد جن کے علم وفضل کا زیادہ چرچا تھا' مولانا کا امتحان ان کے یہاں گیا' یعنی محدث العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیری کے پاس امتحان دینا تھا۔ اگر انہوں نے کامیاب کر دیا تو دورہ حدیث میں داخلہ ہو سکے گا ورنہ نہیں۔ یہ وقت ہر نئے آنے والے کے لئے بڑا ہی صبر آزما اور نازک ہوتا ہے۔ اچھے اچھے طلبہ امید وبیم کی کشمکش سے دوچار ہوتے ہیں۔

حضرت کشمیری کی خدمت میں

حضرت شاہ صاحب کشمیری داخلہ امتحان کتب خانہ میں بیٹھ کر لیا کرتے تھے' چپڑاسی طالب العلم کا نام لے کر پکارتا تھا۔ مولانا گیلانی بھی آ کر کھڑے ہو گئے' چنانچہ جب ان کی باری آئی چپڑاسی نے مناظر احسن گیلانی نام لے کر آواز دی' جیسا کہ قاعدہ ہے' نیا طالب العلم ہزار قابل سہی مگر امتحان کے نام سے خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ امتحان کا نام ہی کچھ ایسا ہے کہ قابل سے قابل طالب علم ایک مرتبہ کانپ جاتا ہے۔ مولانا بھی بہر حال طالب العلم تھے ہانپتے کانپتے کتب خانہ پہنچے' وہاں کیا دیکھا اور کیا پیش آیا خود مولانا ہی کی زبان قلم سے سنیئے' لکھتے ہیں:

> ''غالباً چھوٹی سی دستی میز پر کتاب تھی' یہ میر زاہد رسالہ تھا' شاہ صاحب نے کتاب کھولی' وہ کتاب کھول رہے تھے اور میرے جسم پر رعشہ طاری تھا' پیشانی پسینہ سے شرابور کانپ رہا تھا' دیکھئے کہاں سے پوچھتے ہیں؟ کیا پوچھتے ہیں؟...... خیال آتا ہے کہ یتحقق کل فرد منه بعد تحقق الموصوف کے الفاظ سے العلم متجدد کی تعریف میر زاہد نے جو کی ہے' دریافت فرمایا گیا کہ اس عبارت کا مطلب بیان کرو...... یہ وہی مقام تھا جس کے مالہ وما علیہ کے پڑھنے میں تقریباً ایک مہینہ ٹونک کی درس گاہ میں صرف ہو چکا تھا۔ میر زاہد کا منہیہ' غلام یحییٰ کے حواشی' عبدالعلی بحر العلوم العلامہ کے اضافے' مولوی عبدالحق خیر آبادی نے اپنے حاشیہ میں ان سب پر جو کچھ لکھا تھا اور خود استاذ مرحوم کا ذاتی حاشیہ اس مقام پر جو تھا' سب ہی گھونٹے ہوئے پیے ہوئے تھا لیکن جواب تو وہ دے جو اپنے آپ میں موجود بھی ہو' ایک ہفتہ دارالعلوم کے احاطہ میں جو گزرا تھا حضرت شاہ صاحبؒ کے فضائل وکمالات' علمی تبحر اور غیر معمولی معلومات ومخزونات کے ذکر سے دل اس حد تک مرعوب ہو چکا تھا کہ جس وقت پوچھا گیا ''مطلب بیان کرو' ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کبوتر شاہین کے پنجہ میں آ گیا ہے' نہ ہوش ہی باقی تھا اور نہ حواس' کچھ یاد نہیں کہ بدحواسی کے عالم میں منہ سے کیا اول فول' بے تکی باتیں بے ساختہ نکلیں' ایک دوسوال ہی کے

Marfat.com

بعد کتاب بند ہوگئی اور اجازت اُٹھ جانے کی فرمائی گئی' جس وقت اُٹھا اس یقین کے ساتھ اٹھا کہ دارالعلوم سے روانگی کا انتظام کر لینا چاہیے۔'' (رسالہ دارالعلوم۔ ربیع الثانی ۱۳۷۱ھ)

داخلہ امتحان میں کامیابی

یہ ایک واقعہ ہے کہ بوقت امتحان آدمی کھوسا جاتا ہے۔ اسے خبر نہیں ہوتی کہ کیا کہہ رہا ہے' کہتا چلا جاتا ہے' پھر یہ بھی ذہن میں آتا ہے کہ غالباً میں نے جواب جیسا دینا چاہیے نہ دے سکا اور اس تصور کے بعد کہ اگر فیل ہوگیا تو کیا ہوگا؟ طرح طرح کے خیالات ستانے لگتے ہیں' مولانا گیلانی پر بھی یہی کیفیت طاری رہی' اور اس وقت تک چین نہیں آیا۔ جب تک اپنے وطنی بھائی منظر حسن سے یہ خبر نہیں سن لی کہ تم کامیاب ہو' اور تمہارے جواب کی تعریف ہو رہی ہے۔

امتحان میں کامیابی کے بعد دورہ حدیث میں نام درج ہوگیا۔ ۲۰' ۲۱ شوال ۱۳۳۱ھ سے درس شروع ہونے کا اعلان ہوگیا' کتابیں جہاں اور طالب العلموں کو کتب خانہ سے ملیں' مولانا گیلانی کو بھی مل گئیں' اس سال دورہ حدیث میں طلبہ کی تعداد باسٹھ تھی۔ جیسا کہ اس سال کی روداد سے معلوم ہوتا ہے اور اس جماعت میں ہر صوبہ کے طلبہ تھے' بلکہ بہت سے غیر ملکی طلبہ بھی تھے' جیسے کابل' قندھار' بخارا' چینی ترکستان' کاشغر اور دوسرے ممالک کے۔

دورہ کا پہلا سبق

مولانا کی یاد کے مطابق دورہ کا پہلا سبق ۲۱ شوال ۱۳۳۱ھ کو حضرت علامہ کشمیری کے یہاں مسلم شریف کا شروع ہوا۔ پہلے دن حضرت کشمیری نے کتاب پڑھانے کے بجائے علم حدیث کی اہمیت اور اس کی اصطلاحات پر تقریر فرمائی' تقریر اردو زبان میں کی' مسلم شریف کا جو کتب حدیث میں مقام ہے اس پر روشنی ڈالی' مولانا کا بیان ہے کہ حضرت الاستاذ کی تقریر بڑی ہی دلآویز مگر دلچسپ اور معلومات سے لبریز تھی' سبق سے فارغ ہو کر جب کمرہ پہنچا تو اس کو قلمبند کرنے کا عزم ہوا اور جو کچھ فرمایا تھا بجائے اردو کے عربی میں لکھا لیا اور اس وقت آپ کو احساس ہوا کہ عربی میں اردو سے ڈھالنے کی صلاحیت ان میں پائی جاتی ہے۔ پہلے بھی وہ اپنے استاذ کی تقریر ٹونک میں نقل کرنے کے عادی تھے مگر عموماً اردو میں نقل کرنے کے عادی تھے یہاں عربی میں نقل کرنا شروع کیا۔

حضرت کشمیری کی درسی تقریر

مولانا گیلانی کی تحریر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دارالعلوم میں اس زمانہ تک حضرت کشمیریؒ کی تقریر قلمبند کرنے کا ابھی رواج شروع نہیں ہوا تھا کیونکہ انہوں نے لکھا ہے:

> '' جہاں تک جانتا ہوں حضرت الامام الکشمیریؒ کی تقریروں کے قلمبند کرنے کا ارادہ شاید اس فقیر سے پہلے کسی صاحب نے نہیں کیا تھا۔'' (رسالہ دارالعلوم۔ جمادی الثانی ۱۳۷۱ھ ص ۳۱)

مولانا نے دوسرے دن سے باضابطہ درس گاہ میں تقریر نقل کرنے کا انتظام کیا اور التزام کے ساتھ سال بھر شاہ صاحب کی تقریر قلمبند کرتے رہے' بعد میں تو پھر بہت سارے تلامذہ نے حضرت شاہ صاحب کی درسی تقریریں قلمبند کیں اور مرتب کر کے کتابی شکل میں شائع بھی کیں۔ جیسے العرف الشذی' فیض الباری' انوار المحمود وغیرہ۔

حضرت کشمیری کے درس کی اہمیت

شاہ صاحب کی درسی تقریر کے سلسلہ میں مولانا نے لکھا ہے کہ

''واقعہ یہ ہے کہ باتوں باتوں میں صرف حدیث ہی نہیں بلکہ دوسرے علوم کے ایسے اہم کلیات ان کے درس میں ہاتھ آ جاتے تھے کہ اپنے ذاتی مطالعہ سے شاید ساری عمر ان تک ہم جیسے نارساؤں کی رسائی آسان نہ تھی۔'' (رسالہ دار العلوم۔ جمادی الثانی ۱۳۷۱ھ ص ۳۶)

حضرت شاہ صاحب کی درسی تقریر پر مولانا گیلانی اپنے مشاہدات تفصیل سے لکھ چکے ہیں اور وہ تقریر ''حیات انور'' نامی مجموعہ میں شائع بھی ہو چکی ہے۔ اسے ضرور دیکھنا چاہیے' تاکہ اندازہ ہو کہ حضرت شاہ صاحب کا درس کس مرتبہ کا ہوا کرتا تھا۔ یہاں طوالت کے خوف سے اس کا اقتباس نہیں دیا جا رہا ہے۔

خاص امور کا تذکرہ

اس سلسلہ میں ایک خاص بات یہ بھی لکھی ہے:

''وہ اپنے عہد کے طلبہ کی علمی بے بضاعتیوں کا اندازہ کر کے تکلیف اٹھا کر علاوہ موضوع درس کے چند خاص امور کا تذکرہ التزاماً اپنے درس میں ضرور فرمایا کرتے تھے مثلاً جن مصنفین کی کتابوں کا حوالہ دیتے تھے' ان کی ولادت' وفات کی سنین کے ساتھ مختصر حالات اور ان کی علمی خصوصیت' علم میں ان کا خاص مقام کیا ہے' ان امور پر ضرور تنبیہ کرتے چلے جاتے۔''
(ایضاً۔ جمادی الثانی ۱۳۷۱ھ ص ۴)

طلبہ میں علمی ذوق

حضرت کشمیری کی اس طرح کی تقریر کا بڑا فائدہ یہ تھا کہ شاگردوں میں علمی ذوق پیدا ہو جاتا تھا اور وہ اثنائے درس میں ساری کتابوں اور ان کے مصنفین کے نام اور ان کی خصوصیتوں سے واقف ہو جاتے تھے' ساتھ ہی شوق ہوتا تھا کہ فلاں کتاب کی یہ اہمیت ہے کہیں سے حاصل کر کے دیکھی جائے' اس طرح ان میں مطالعہ کتب کا ذوق وشوق' نشوونما پاتا تھا اور تحقیق کی شان پیدا ہونے لگتی تھی۔

مولانا گیلانی کو ابتدائے طالب العلمی سے مطالعہ کتب کا شوق تھا۔ پہلے معقولات کی کتابیں پڑھا کرتے تھے

Marfat.com

اور کبھی ہاتھ آ گئی تو چھپ چھپا کر اردو کتابیں بھی پڑھ لیتے تھے اب سارا ذوق اور تمام تر محنت دینیات اور حدیث وتفسیر پر صرف کرتے تھے اور کوئی شبہ نہیں کہ حضرت شاہ صاحب کی تقریروں نے علمی جذبات کو جلا بخش دی تھی جو قدرت نے آپ کی فطرت میں ودیعت کر رکھی تھی اس سلسلہ میں مولانا مرحوم نے خود لکھا ہے۔

''یہ ان کا ایسا اچھا طریقہ تھا کہ جس کی بدولت شوقین اور محنتی طلبہ ان کے حلقہ درس میں شریک ہو کر علم کے ذیلی ساز وسامان سے مسلح ہو جاتے تھے۔'' (ایضاً)

معقولات اور منقولات کا مقابلہ

دارالعلوم آنے سے پہلے مولانا گیلانی کا خاص موضوع منطق وفلسفہ تھا مگر حضرت کشمیری کے درس میں کبھی کبھی ایسی تقریر بھی ہو جاتی تھی کہ فلسفہ ومنطق کا وزن ذہن سے ختم ہونے لگتا تھا بقول مولانا گیلانی:

''ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نادان بچوں سے زیادہ ان کے سامنے بڑے بڑے فلاسفہ کی وقعت نہیں۔'' (ایضاً)

اعقل الناس

مولانا لکھتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب فرماتے تھے:

''میرے نزدیک اعقل الناس فی الناس اہل لغت یا زبانوں کے بنانے والے ہیں جو کائنات کے ایک ایک ذرہ کی خصوصیت پر نظر جما کر الگ الگ الفاظ بناتے ہیں۔ زبان ولغت والوں کے بعد فقہاء کی تعریف کرتے اور ان کے علمی رسوخ کی داد دیتے۔'' (ایضاً)

اساتذہ دارالعلوم کی درسی تقریریں مولانا گیلانی کے مستقبل کو سنوارنے والی تھیں چنانچہ اسی زمانہ درس حدیث میں ایک ایسا وقت بھی آیا کہ مولانا مرحوم بڑی کشمکش ذہنی میں مبتلا ہو گئے مگر حضرت شیخ الہند کی توجہ خاص نے اس کشمکش سے نکالا اور جان بچی اور ہمیشہ کے لئے ایسی شاہ راہ سامنے آ گئی جس پر تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھتے چلے گئے اور بالآخر منزل مقصود پالی۔ یہی وجہ تھی کہ مولانا گیلانی کو اپنے استاذ مکرم حضرت شیخ الہند سے بے حد عقیدت ومحبت تھی بعد فراغت سب سے پہلے آپ نے شیخ الہند کے دست مبارک پر بیعت کی اور آپ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے۔

دورۂ حدیث کے سال شکوک وشبہات کا حملہ

دیوبند آنے سے پہلے مولانا سات آٹھ سال مدرسہ خلیلیہ ٹونک میں پڑھ چکے تھے اور یہ پوری زندگی یونانی

Marfat.com

منطق وفلسفہ کے پڑھنے میں صرف کی تھی جس کی تفصیل گزر چکی' یونانی فلسفہ ومنطق اور کتاب وسنت میں جو بُعد ہے وہ کسی اہل علم سے مخفی نہیں' کیونکہ فلسفہ ومنطق کا تعلق معقولات سے ہے اور کتاب وسنت کا منقولات سے' اس لئے مولانا گیلانی جب دورہ حدیث میں داخل ہوئے تو اس کے ساتھ معقولات نے ذہن وفکر کے سامنے وساوس اور اعتراضات کا ایک انبار لگانا شروع کر دیا اور اس نے قدرتی طور پر آپ کو ایک ایسی کشمکش میں مبتلا کر دیا جس سے ایک نوجوان طالب علم کا گھبرا جانا قرین قیاس تھا۔

چنانچہ دارالعلوم دیوبند آ کر جب دورہ حدیث میں مولانا شریک ہو چکے تو ابتداء میں ایک بڑا ہی نازک' صبر آزما اور کٹھن وقت آیا' ذہنی وفکری ایک ایسی کشمکش میں مبتلا ہوئے کہ مولانا گیلانی کے ہوش وحواس گم ہونے لگے۔

گندے وساوس کی آمد

اس کی تفصیل خود مولانا کے قلم سے سنئے' لکھتے ہیں:

''ہونے یہ لگا کہ جوں ہی حدیث شروع ہوتی اپنے ذہن میں' الجھنوں کے طوفان کو پاتا' طرح طرح کے شبہات ہر حدیث میں ہوتے' یہ شبہات طالب علمانہ اور مولویانہ نہ تھے' بلکہ مصیبت یہ تھی کہ عموماً ذات رسالت مآب ﷺ ہی سے العیاذ باللہ' ان خبیث اور گندے وساوس اور خیالات کا عموماً تعلق ہوتا..... بدگمانیوں کی ایک آگ تھی جو معلوم ہوا تھا میرے باطن میں بھڑک اُٹھی ہے۔ دو گھنٹے تک عموماً ترمذی شریف کا یہ درس ہوتا تھا اور ایک سیاہ سینہ ان دونوں گھنٹوں کے اندر انہی شکوک وشبہات کے آتشیں لہروں میں جلتا بھنتا رہتا' حدیث میرے لئے گویا بدگمانی وسوءظن کا چقماق بنتی چلی جاتی تھی' دماغ صرف ہرزہ اندیشیوں اور یاوہ بافیوں کا کارخانہ بنا ہوا تھا۔'' (رسالہ دارالعلوم۔ ربیع الاول ۱۳۷۲ھ ص ۳۰)

مولانا کا اندرونی حال

مولانا لکھتے ہیں کہ ان فاسد خیالات سے اس طرح پریشان تھا کہ ہر نماز میں دعا کرتا۔

''پروردگار! یہ کیا حال ہے۔ میں دین کو درست کرنے کے لئے دارالعلوم حاضر ہوا تھا لیکن بچا کھچا جو سرمایہ بھی دین وایمان کا تھا میرا لٹا جا رہا ہے' میں تو کہیں کا نہ تھا۔'' (ایضاً۔ ص ۳۱)

مولانا لکھتے ہیں کہ کبھی کبھی یہ بھی سوچتا کہ دارالعلوم کو چھوڑ دوں تاکہ ان خیالات فاسدہ سے نجات ملے' مگر ایسا کرنا بھی آسان نہ تھا۔ حال یہ ہو گیا تھا کہ

''گھبرا گھبرا کر کبھی تن تنہا جنگلوں اور کھیتوں کی طرف نکل جاتا' غلطاں وپیچاں انہی خیالات و وساوس میں ٹہلتا رہتا' باتیں ایسی تھیں کہ کسی سے ذکر کر کے دل کی بھڑاس بھی نہیں نکال سکتا گویا

Marfat.com

ایک اندرونی آگ لگی ہوئی تھی جس میں کروٹیں لیتا رہتا' خفقان اور دورے کی شدت روز بروز بڑھتی ہی چلی جاتی تھی۔'' (ایضاً)

اسی حال میں بقرعید آ گئی' ان وساوس کے علاج کی ہی غرض سے مولانا نے کلیر' منگلور' وغیرہ کا سفر کیا اور بزرگوں کے مزار پر پہنچ کر دعائیں کیں کہ ان گندے خیالات کی آمد بند ہو مگر کوئی فائدہ نظر نہیں آیا۔

شیخ الہند کی خدمت میں حاضری

اتفاق سے مناظرہ کے راستہ سے میر شاہ خان صاحب کو مولانا گیلانی سے انس ہو گیا تھا' ایک دن وہ مولانا سے پوچھنے لگے کہ تم نے کہاں کہاں کہاں پڑھا ہے؟ مولانا کہتے ہیں کہ میں نے تفصیل بتائی۔ پھر ایک دن انہی سے میں نے کہا کہ خیالات فاسدہ اس اس طرح کے ذہن میں رہتے ہیں کہ جن سے بہت پریشان رہتا ہوں' انہوں نے مشورہ دیا کہ شیخ الہند سے مل کر عرض کرو' پھر وہی شیخ الہند تک جانے اور پہنچنے کے وسیلہ بھی بنے۔

پہلی ملاقات میں حضرت شیخ الہند نے مولانا گیلانی سے فرمایا کہ تم تو درس حدیث میں رہتے ہو' جس کا مطلب یہ تھا کہ شیخ الہند کی نظر اپنے اس شاگرد پر تھی۔ تنہائی میں اپنا درد دل عرض کرنے اور سنانے کی درخواست کی' حضرت شیخ الہند اندر کمرہ میں اُٹھ کر تشریف لے گئے' وہاں مولانا گیلانی نے اپنے ان خیالات فاسدہ اور وساوس کی تفصیل سنائی' دیر تک سناتے رہے' حضرت نے سن کر ارشاد فرمایا:

''مولوی صاحب! اتنے پریشان کیوں ہیں' اپنا یہ حال جب آپ کے لئے اتنا ناگوار ہے تو یہ بے ایمانی کی نہیں' آپ کے ایمان کی دلیل ہے' ایمان نہ ہوتا تو ان خیالات سے اتنے پریشان ہی کیوں ہوتے؟'' (ایضاً۔ص ۲۳)

شیخ الہند کے ارشاد کی تاثیر

شیخ الہند کے ان چند جملوں نے مرہم کا کام کیا' ایسا محسوس ہوا کہ زخم کی ٹیس میں دفعتہً بہت کمی آ گئی' درد و کرب اور بے چینی جاتی رہی' یہ گفتگو چل ہی رہی تھی کہ سوال فرمایا کہ آپ نے کہاں کہاں اور کیا پڑھا ہے؟ مولانا مرحوم نے روداد تعلیم کہہ سنائی۔ یہ سن کر ارشاد ہوا۔

''جو کچھ آپ کچا پکا نگلتے چلے گئے ہیں' وہی سب کچھ باہر نکل رہے ہیں۔ پریشان ہونے کی بات نہیں' مولوی صاحب جاؤ اب کوئی شبہ اور کسی قسم کا شک تم کو نہ ہوگا۔'' (ایضاً۔ص ۳۳)

حضرت الاستاذ کی طرف سے تسکین وتسلی کے یہ جملے مولانا کی زندگی کے لئے اکسیر ثابت ہوئے' ذہن وفکر کا معاملہ دگرگوں ہو گیا' اب نہ وہ وسوسے تھے اور نہ شکوک وشبہات' جو جھنجھوڑ دیا کرتے تھے' حدیث کے اسباق میں جی لگنے لگا' بشاشت اور توجہ کے ساتھ بیٹھتے' جہاں کچھ علمی اشکال ہوتا' پوچھتے اور استاذ محترم جواب دیتے۔

Marfat.com

حالات میں تبدیلی

مولانا کا بیان ہے کہ حضرت شیخ الہند کی اس ملاقات اور ارشادات کے بعد ایسا محسوس ہونے لگا کہ سات سال تک ہم نے منطق وفلسفہ جو کچھ پڑھا تھا اس سے وحشت ہوتی جارہی ہے اور معقولات کا پیدا کردہ کبروغرور پامال ہورہا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''یہ تبدیلیاں اتنی سرعت اور تیزی کے ساتھ اثرانداز ہورہی تھیں کہ چند ہی دنوں کے بعد تجربہ نے ثابت کیا کہ میرے پاس جو کچھ تھا شاید وہ سب کچھ چھن گیا' جن شخصی خصوصیتوں کے ساتھ دارالعلوم کے احاطہ میں داخل ہوا تھا نہ وہی باقی تھیں اور نہ وہ شخصیت۔''
>
> (ایضاً۔ ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ)

معقولات سے وحشت کا تجربہ

اس کا تجربہ مولانا کو اس طرح ہوا کہ اس کے تھوڑے دنوں بعد مولانا کے ساتھیوں میں سے چند ذہین معقولات کے ساتھ مناسبت رکھنے والوں نے کہا کہ وہ ان کو میر زاہد رسالہ پڑھادیں اور اس انداز سے جس طرح وہ ٹونک سے پڑھ کر آئے ہیں' مولانا تیار ہوگئے' مگر جونہی اس کے مطالعہ کا ارادہ کیا' لرزہ سا طاری ہونے لگا۔ دل دھڑکنے لگا مگر آن کی بات تھی' دل مضبوط کرکے کتاب ہاتھ میں لی اور دیکھنے لگے کہ چند منٹ کے اندر نیند غالب آ گئی۔ خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ جنگلی سوروں نے گھیر رکھا ہے اور حملہ آور ہیں' خوف جب بڑھ گیا تو ایک درخت پر چڑھ گئے کہ جان بچے' مگر ان جنگلی سوروں نے اس درخت کو گھیرے میں لے لیا اور منہ اٹھا اٹھا کر آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں' اتنے میں دیکھا کہ کہیں سے ایک آدمی آ گیا' اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی بندوق ہے اور وہ ان سوروں پر فائرنگ کرنے لگا۔ کچھ سور مرے' گرے' پھر سب بھاگنے لگے۔ درخت ہی پر دل میں یہ خیال ڈالا گیا کہ بندوق چلانے والے حضرت مدنی ہیں۔ اتنے میں آنکھیں کھل گئیں' خوف طاری تھا ہی' کہ یہ کیا پیش آیا۔ اب عزم کرلیا کہ ساتھیوں سے معذرت کردینا ہے کہ پڑھانا میرے بس میں نہیں ہے' معاف کردیں۔

شیخ الہند کی کرامت

مولانا گیلانی فرماتے ہیں کہ شیخ الہند کی کرامت تھی جس نے میری دستگیری کی' وہ جو فرمایا تھا ''جاؤ مولوی صاحب اب کوئی شک پیدا نہیں ہوگا۔''

> ''یہ یا اسی کے ہم معنی الفاظ تھے جو آج سے تقریباً چالیس سال پہلے (دورہ حدیث کے سال) اللہ کے ایک برگزیدہ دوست کی زبان مبارک سے یہ بات نکلی' خاکسار' اس کا دماغ' اس کا دل' اس کی زندہ شہادت ہے کہ اس طویل عرصہ میں بحمداللہ! پھر کسی قرآنی آیت یا کسی نص نبوی میں

Marfat.com

کسی قسم کا کوئی شبہ اب تک تو پیدا نہیں ہوا...... اس لئے سیدنا شیخ الہند کی ایک زندہ کرامت خود اپنے آپ کو، دل و دماغ کو، اپنے ذہنی رجحانات اور میلانات کو سمجھتا ہوں، میں کیا تھا اور کیا ہوگیا۔" (رسالہ دارالعلوم۔ ربیع الاول ۱۳۷۲ھ ص ۳۳)

مولانا یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس کے بعد اگر کوئی ایسی ویسی چیز سامنے آتی ہے تو ساتھ ہی اس کا حل اور اس کے متعدد جوابات بھی ذہن میں مچلنے لگتے ہیں اور یقین ہوتا ہے کہ اس اشکال کے جوابات میرے پاس موجود ہیں۔

"گویا کہ کوئی کیل ٹھونک دی گئی کہ وہی دل جو لرزاں اور تپاں رہتا تھا، کچھ ایسا بیٹھ گیا کہ خواہ کچھ بھی گزرے وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلتا۔" (ایضاً)

شیخ الہند کی عظمت

شیخ الہند استاذ الکل کی حیثیت رکھتے تھے۔ درس گاہ...... میں مختصر اور جامع تقریر فرماتے تھے مگر عظمت کا حال یہ تھا کہ جس دن بخاری شریف کا پہلا سبق اس سال پڑھایا، دارالعلوم کے تمام اساتذہ بھی طلبہ کے ساتھ شریک ہوئے، خود مولانا کشمیری بھی شریک درس ہوئے، ان اساتذہ نے درس میں سوالات بھی کئے اور شیخ الہند نے ان کے جوابات بھی دیئے۔

جہاں درس اس شان کا ہو سمجھا جاسکتا ہے کہ اس کے درس سے کیسے کیسے باکمال پیدا ہوتے ہوں گے اور دنیا کو علم و عمل سے اس ادارہ نے کس طرح بھر دیا ہوگا، مولانا گیلانی اسی دولت بے بہا کے ایک نمونہ تھے، نور اللہ مرقدہ۔

تحریری ذوق کی حوصلہ افزائی

اس کے بعد شیخ الہند مولانا گیلانی پر بڑے مہربان ہوگئے تھے، اور برابر خبر گیری کرنے لگے اور حتی الوسع حوصلہ افزائی بھی فرماتے تھے۔ ایک دن بلا کر فرمایا:

"مولوی صاحب! میں نے سنا ہے کہ لکھنے پڑھنے کا تم خاص ذوق رکھتے ہو، مدرسہ کی طرف سے "القاسم" رسالہ نکلتا ہے، اس میں مضمون کیوں نہیں لکھتے؟" (دارالعلوم۔ جمادی الاول ۱۳۷۲ھ)

جس تلمیذ رشید کے وساوس و اوہام کو اپنی توجہ خاص سے دور فرمایا تھا اور حدیث نبویؐ سے مناسبت پیدا کرادی تھی، اب استاذ محترم نے چاہا کہ وہ آگے چل کر مصنف و مولف بھی بنے، علم و فن کی قلمی خدمت بھی اس کے حصہ میں آئے، اور آئندہ جس ماحول سے دوچار ہونے والا ہے ابھی سے وہ اس کی تیاری بھی شروع کردے تاکہ روشن خیالوں کو اپنی تحریر و تقریر دونوں سے اسلام کا شیدائی بنانے میں کسی سے پیچھے نہ رہنے پائے۔

مولانا گیلانی کا بیان ہے کہ حضرت الاستاذ کے ان جملوں کو سن کر حیرت زدہ رہ گیا کہ اب تک نہ میرا کوئی مضمون کسی اخبار یا رسالہ میں چھپا، نہ کوئی کتاب شائع ہوئی، نہ کوئی مقالہ پڑھ کر میں نے حضرت کو سنایا، آخر حضرت کو

میرے اس پوشیدہ ذوق کی اطلاع کیسے ہوئی' نور معرفت کے سوا اس کو دوسرا نام کیا دیا جا سکتا ہے۔

مضمون لکھنے کا عزم

مولانا کو ان حوصلہ افزاء کلمات سے بڑی دلی مسرت ہوئی۔ اُمنگ و ولولہ نے کروٹ لی اور طے کر لیا کہ کوئی مضمون شروع کرنا ہے اور القاسم کو اشاعت کے لئے دینا ہے۔

مولانا نے ہمت کر کے قلم اٹھا لیا اور دورہ کے سال اپنا پہلا مضمون لکھنا شروع کر دیا اور اس کا عنوان تھا ''خیر الامم کا طغرائے امتیاز'' جو رسالہ ''القاسم'' دیوبند میں کئی قسطوں میں شائع ہوا اور یہی مضمون مستقبل کے لئے روشنی کا مینار ثابت ہوا۔

قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی ہونہار' ذی استعداد اور ذہین و ذکی طالب علم ہوتا ہے تو سارے اساتذہ کو اس سے محبت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ یہ جوہر ضائع نہ ہونے پائے' مولانا گیلانی میں یہ بات پائی جاتی تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ اساتذہ آپ سے محبت و شفقت کا معاملہ کرتے تھے۔

مولانا گیلانی کے اساتذہ حدیث

اس سے پہلے گزر چکا کہ دارالعلوم دیوبند میں داخلہ کا امتحان محدث العصر حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری (م ۱۳۵۲ھ) نے لیا اور کامیابی کے نمبرات دیئے' سب سے پہلا سبق اس سال دورہ حدیث کا حضرت شاہ صاحب کے یہاں ہوا' آپ کے پاس مسلم شریف کا سبق تھا اور وہ پوری کتاب آپ کے یہاں ہوتی رہی۔

بخاری شریف کا سبق صدر المدرسین حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن عثمانی (م ۱۳۳۹ھ) نے شروع کرایا اور سال بھر وہ کتاب آپ ہی پڑھاتے رہے۔ اس طرح حدیث کی یہ دو اہم کتابیں ان دونوں بزرگوں کے یہاں ہوئیں' اس زمانہ میں ترمذی شریف بھی حضرت شیخ الہند کے پاس ہوتی تھی اور آپ ہی اسے پڑھاتے تھے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی

حدیث کی چوتھی اہم کتاب ابوداؤد شریف تھی' اس سال یہ کتاب دارالعلوم دیوبند کے مشہور استاذ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی (م ۱۳۶۹ھ) نے شروع فرمائی' مولانا گیلانی نے آپ بیتی میں لکھا ہے کہ ان کا درس بھی معرکتہ الآراء ہوتا تھا اور انداز بیان بڑا ہی دلکش اور معلومات افزاء ہوتا تھا۔ یہ بھی لکھا ہے کہ آپ کے اساتذہ میں سب سے کم عمر حضرت مولانا عثمانی ہی تھے۔

> ''زندگی میں جن بزرگوں کے تلمذ کا شرف حاصل ہوتا رہا ہے' سب سے زیادہ نوعمر اساتذہ مولانا عثمانی قدس سرہ تھے...... حدیث کی اہم ترین کتاب ابوداؤد کا درس ان سے متعلق تھا۔''
>
> (رسالہ دارالعلوم۔ رجب ۱۳۷۲ھ)

حضرت مولانا عثمانی کے درس کے سلسلہ میں مولانا گیلانی کا تاثر یہ ہے:

''ان کے بولنے کا طرز حد سے زیادہ سنجیدہ' خطاب کا طریقہ غیر معمولی طور پر دل آویز تھا' چند کلمات کے بعد محسوس ہونے لگتا کہ کچھ نئی باتیں کان میں پڑ رہی ہیں جو حضرت عثمانی سے پہلے میں نے نہ کسی سے سنی تھیں نہ کتاب یا مضمون میں ان کا سراغ لگا تھا' درس کا یہ حصہ میرے لئے حد سے زیادہ دلچسپ اور لذیذ ثابت ہوا۔ مولانا جس طریقے سے ان چیزوں کو ادا کرتے تھے ان میں بڑی حلاوت اور شیرینی تھی۔'' (ایضاً۔ رجب ۱۳۷۲ھ ص ۳۹)

قاسمی علوم سے مولانا عثمانی کی مناسبت

حضرت مولانا عثمانی کو بانی دارالعلوم حضرت نانوتویؒ کی تصنیفات سے بڑی مناسبت تھی اور جب وہ ان تصنیفات کے مضامین کو اپنے انداز میں ڈھالتے تھے تو سننے والے پر ایک خاص کیف طاری ہوتا تھا' اس میں شبہ نہیں کہ قاسمی علوم و معارف پر مولانا عثمانی کو عبور حاصل تھا۔ تعبیر و تفہیم کے اندر مولانا عثمانی اپنے دور میں علماء کے طبقہ میں بادشاہ کی حیثیت رکھتے تھے۔

اس کے اثرات تلامذہ پر بھی ہوتے تھے۔ دیدہ ریزی اور عقلی دلائل کا ان کی تقریر سے طلبہ میں عمدہ سلیقہ پیدا ہوتا تھا اور اس کے اثرات بلاشبہ حضرت مولانا گیلانیؒ میں بھی آئے' بقول مولانا گیلانی مرحوم حضرت عثمانی کی باتیں۔

''ایسی دلنشیں تھیں اور کچھ ایسے منطقی تسلسل کے ساتھ مولانا بیان کرتے تھے کہ ان کو نوٹ کرنے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی تھی۔ وہ فرماتے جاتے تھے اور حافظہ میں خود بخود ان کی جگہ بنتی جاتی تھی۔'' (ایضاً)

مولانا عثمانی کی توجہ خاص

مولانا گیلانی کی محنت اور ذکاوت سے جہاں آپ کے دوسرے اساتذہ کرام متاثر تھے' وہاں مولانا عثمانی بھی دورہ حدیث کے طلبہ میں آپ کو ممتاز شمار کرتے تھے اور جن چند مخصوص طلبہ کو آپ نے ہونہار ہونے کی حیثیت سے منتخب کیا تھا ان میں ایک آپ کا بھی نام تھا۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک دن مولانا احسان اللہ تاجور نے آ کر اطلاع دی کہ حضرت مولانا عثمانی نے تم کو یاد فرمایا ہے' چنانچہ میں صبح کے وقت حضرت الاستاذ کی خدمت میں حاضر ہو گیا' مولانا گیلانی لکھتے ہیں:

''میں حیران تھا کہ کسی قسم کا کوئی تعارف نہیں' پھر انہوں نے اتنی خصوصیت کے ساتھ خاکسار کو کیوں یاد فرمایا ہے؟...... دوسرے دن تاجور مرحوم سے مولانا کے در دولت کا پتہ دریافت کر کے غالباً کسی ملنے والے طالب العلم کی رہنمائی میں خدمت والا میں حاضر ہوا' سلام کر کے بیٹھ گیا'

Marfat.com

خود ہی فرمانے لگے کہ دورہ کے سبق میں آتے ہو پھر فرمایا۔

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ کسی سے آدمی کو محبت ہو تو اس کو مطلع کردے' اس لئے میں نے آپ کو طلب کیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کے مطابق آپ کو مطلع کردوں کہ اپنے دل میں آپ کی محبت پاتا ہوں۔'' (ایضاً)

مولانا عثمانی کا نظریہ

مولانا گیلانی کا بیان ہے کہ مولانا عثمانی کی درسی تقریریں مہینوں چلتی رہیں۔ کبھی کبھی مکان پر دو تین ذہین طلبہ جو محنتی سمجھے جاتے تھے خصوص طور پر مولانا کے یہاں جاتے رہتے تھے' ایک دفعہ حضرت مولانا عثمانی کی طبیعت ناساز چل رہی تھی۔ مولانا گیلانی لکھتے ہیں کہ میں اور ایک دوسرے دورہ ہی کے طالب علم جب مولانا کی خدمت میں عیادت کے لئے پہنچے تو دیکھا لیٹے ہوئے ہیں' ان دونوں شاگردوں کو دیکھ کر اٹھ بیٹھے اور فرمانے لگے:

''یہ کیا طریقہ ہے کہ پست و بلند کس و ناکس ہر قسم کے طالب علموں کو دورہ میں شرکت کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ صرف ذہین دو چار طالب العلموں کو ہی پڑھاؤں گا' تاکہ کیفاً کچھ ذی استعداد علماء تیار ہوسکیں' حضرت نانوتویؒ کا نظریہ بھی یہی تھا کہ تعلیم کی اشاعت' کماً اور کیفاً دونوں طرح ہونی چاہیے۔ کماً کا طریقہ تو وہی ہے جو ہمارے مدارس میں رائج ہے' علماء بڑی تعداد میں تیار ہوں اور ملک و بیرون ملک میں پھیلیں لیکن کیفاً یعنی اچھے علماء پیدا کرنے کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں کہ ذہین و ذکی اور محنتی طلبہ کو الگ لے کر بیٹھا جائے' یہ بھی فرمایا کہ خود حضرت نانوتویؒ مدرسہ میں بیٹھ کر نہیں پڑھایا کرتے تھے' بلکہ اپنے چند اچھے طلبہ منتخب کر کے اس کی تربیت و تعلیم پر توجہ فرمایا کرتے تھے۔' حضرت شیخ الہند' مولانا احمد حسن امروہی اور مولانا فخر الحسن گنگوہی وغیرہ اسی طرح پیدا ہوئے۔'' (رسالہ دارالعلوم۔ رجب ۱۳۷۲ھ)

مولانا گیلانی کا امتیاز

مجھے یہ بتانا ہے کہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نے دورہ حدیث کے طلبہ میں جن دو تین کا انتخاب فرمایا تھا ان میں ایک مولانا گیلانی بھی تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا گیلانی اپنی طالب علمی میں دارالعلوم کے اندر بھی اپنے تمام اساتذہ کی نظروں میں کتنے ممتاز شمار ہوتے تھے' اور ان سے کیسی امیدیں وابستہ تھیں۔ اس زمانہ میں ''فتح الملہم'' کا ابتدائی کام مولانا عثمانی نے شروع کردیا تھا' اس میں بحیثیت شاگرد مولانا گیلانی سے بھی کبھی کبھی کام لیا کرتے تھے۔

Marfat.com

حکمت قاسمی

حکمت قاسمی سے مناسبت کے سلسلے میں مولانا گیلانی نے صراحت کی ہے۔

''حکمت قاسمی سے صرف روشناس ہونے کا ہی موقع مولانا کے کے ذریعے نہیں ملا' بلکہ کہہ سکتا ہوں کہ باضابطہ علم کے اس شعبہ کی تعلیم مولانا ہی سے فقیر کو میسر آئی۔ اس باب میں میرے بلا شرکت غیرے واحد معلم اور استاذ وہی ہیں۔'' (ایضاً۔ص ۱۴۱)

مفتی اعظم عزیز الرحمٰن عثمانی

دارالعلوم کے اساتذہ حدیث میں عارف باللہ مفتی اعظم حضرت مولانا عزیز الرحمٰن عثمانی (م ۱۳۴۷ھ) بھی تھے' آپ کے یہاں اس سال دورہ حدیث میں موطا امام محمد اور موطا امام مالک کے اسباق تھے' ان کتابوں کے اسباق ہفتہ میں صرف ایک دن ہوا کرتے تھے' مولانا گیلانیؒ لکھتے ہیں کہ چونکہ حدیث کے ہی اسباق ہفتہ بھر ہوتے رہتے تھے' اس لئے مفتی صاحب کے اسباق میں جانا کم ہوتا تھا' خود تحریر فرماتے ہیں:

''اس کا تعلق مفتی صاحب سے تھا۔ ہفتہ میں ایک دن بطور دورہ کے ان کتابوں کا سبق ہوتا تھا' یہ تو نہیں ہوسکتا کہ ان کے درس میں حاضری کی سعادت سے کلیتہً محروم رہا لیکن جس قسم کے فوائد ان کے انفاس طیبہ سے حاصل ہو سکتے تھے' عمر بھر افسوس رہے گا کہ اس کی طرف توجہ کیوں نہیں ہوئی؟'' (رسالہ دارالعلوم۔ رمضان ۱۳۷۲ھ ص ۴۵)

مولانا غلام رسول صاحب

ابن ماجہ حضرت مولانا غلام رسول صاحب (م ۱۳۴۷ھ) پڑھاتے تھے' یہ کتاب بھی مستقل پڑھائی نہیں جاتی تھی' خارج اوقات میں تبرکاً کچھ حصہ پڑھا دیا جاتا تھا' یہ معقولی مشہور تھے' مولانا گیلانی لکھتے ہیں۔

''اسی وجہ سے ان کے اسباق میں بھی حاضری کے مواقع کم ہی میسر آتے تھے۔'' (ایضاً)

حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب

جس سال مولانا گیلانی کا دورہ تھا' حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کچھ مہینوں کے بعد تدریسی خدمت سے دستکش ہو کر گھر بیٹھ گئے تھے' کچھ دنوں تو ان کے گھر جا کر طلبہ ابو داؤد پڑھتے رہے' پھر یہ سبق حضرت مولانا میاں صاحب اصغر حسین (م ۱۳۶۴ھ) کے یہاں منتقل ہو گیا اور ابو داؤد کے اسباق ان کے یہاں ہونے لگے' میاں صاحب عام طور پر طویل تقریر نہیں فرماتے تھے' بلکہ بقدر ضرورت بولتے تھے' البتہ جہاں ضرورت ہوتی تھی مفصل تقریر فرماتے۔

تھے۔ دورہ کے سال دو مزید کتابیں آپ نے اور پڑھیں...... سراجی مولانا گل محمد خان (۱۳۵۵ھ) سے پڑھی اور ہدایہ آخرین مولانا حکیم محمد حسن صاحب (م ۱۳۴۵ھ) سے۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی

نسائی شریف اس سال حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نے پڑھائی' آپ کا قیام اس زمانہ میں مدینہ منورہ میں تھا' اتفاق سے تشریف لے آئے' نسائی ان کے یہاں کردی گئی تھی' ایک طرف طلبہ کو نسائی پڑھاتے تھے اور دوسری طرف بخاری شریف کے درس میں باضابطہ شیخ الہند کے یہاں شریک ہوتے تھے اور عبارت خوانی کی ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی۔ استاذ شاگرد میں سوال و جواب بھی ہوتا تھا' مولانا گیلانی نے نسائی حضرت مدنی سے ہی پڑھی' خود لکھتے ہیں:

''گویا بخاری کے سبق میں رفاقت کا اور نسائی میں تلمذ کا' ان دوگونہ نسبتوں کا شرف حضرت مدنی کی ذات گرامی سے بحمد للہ اس ذرہ ناچیز کو حاصل ہوا۔'' (دارالعلوم۔ جمادی الاول ۱۳۷۲ھ)

یہ بھی لکھا ہے:

زندگی میں یہی پہلا موقع تھا اور آخری موقع بھی کہ براہ راست عربی زبان میں مطالب کی تقریریں اپنے استاد سے سنیں۔ حضرت مدنی مدینہ کی مسجد میں بزبان عربی درس دینے کے عادی تھے' یہاں بھی حسب عادت جو کچھ فرماتے فصیح عربی زبان میں فرماتے۔'' (ایضاً)

طالب علمی کے تین دور

ماحصل یہ ہے کہ مولانا گیلانی کی طالب علمانہ زندگی کے تین دور ہوئے۔ پہلا دور گیلانی میں گزرا' جہاں آپ نے ناظرہ قرآن' اردو' فارسی اور ابتدائی عربی کی کتابیں پڑھیں۔ وہاں کے اساتذہ میں صرف مولانا کے محترم چچا مولانا حکیم سید ابوالنصر کا نام بحیثیت استاد آیا ہے۔ ممکن ہے کوئی اور بھی رہا ہو مگر ان کا نام کہیں نہیں مل سکا۔

دوسرا دور طالب علمی کا ٹونک میں گزرا اور یہ سب سے لمبا زمانہ تھا۔ وہاں آپ نے معقولات میں ایساغوجی سے لے کر شرح اشارات اور شفا تک پڑھی' اور اسی کے ساتھ فقہ اور اصول فقہ' عربی ادب' ریاضی' فلسفہ' ہیئت کا پورا نصاب ختم کیا' وہاں کے اساتذہ میں معقولات کے استاد حضرت مولانا حکیم سید برکات احمد صاحب تھے اور فنون کے استاد حضرت مولانا محمد اشرف صاحب تھے۔

تیسرا دور طالب علمی کا دارالعلوم دیوبند میں گزرا' یہاں آپ نے صرف ایک سال رہ کر علم حدیث کی تکمیل کی' اس دور کے اساتذہ میں استاد العلماء شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن عثمانی' محدث العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیری' شیخ التفسیر والحدیث حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی' عارف باللہ حضرت مولانا میاں سید اصغر حسین صاحب' عارف باللہ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی' شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی' حضرت مولانا غلام رسول صاحب' حضرت

Marfat.com

مولانا گل محمد خان صاحب اور مولانا حکیم احمد حسن صاحب برادر شیخ الہند۔

شوال ۱۳۳۱ھ میں دیو بند آ کر دارالعلوم میں داخل ہوئے اور شعبان ۱۳۳۲ھ میں سالانہ امتحان دے کر فراغت حاصل کی' یہاں پہنچ کر طالب العلمی کا رسمی دور ختم ہو گیا۔

سالانہ نتیجہ

۱۳۳۲ھ کی روداد میں جہاں دورہ حدیث کے کامیاب طلبہ کے نام درج ہیں' آپ کا نام تیسرے نمبر پر درج ہے' دورہ حدیث میں دس کتابوں کا امتحان ہوا کرتا ہے' ان کتابوں میں صرف موطا امام محمد میں آپ کا نمبر کم آیا ہے جس کے متعلق مولانا گیلانی نے لکھا ہے کہ جب حضرت الاستاذ مولانا غلام رسول سے تذکرہ آیا تو فرمایا' اسباق میں نہ آنے کا نتیجہ ہے' مولانا کے الفاظ یہ ہیں:

> ''خدمت میں حاضر ہو کر عرض رسا ہوا...... اس وقت برہم ہو کر فرمانے لگے کہ سبق سے اور غائب رہا کرو۔''

اس سنہ کی روداد سے یہاں ہر کتاب کا نمبر درج کیا جاتا ہے۔ دارالعلوم دیو بند میں اعلیٰ نمبر پچاس ہے۔ گویا جو حیثیت سرکاری مدارس میں سو نمبر کو حاصل ہے وہی دیو بند میں پچاس نمبر کو دیا گیا ہے' آپ کے سالانہ امتحان کے نمبرات یہ ہیں۔

بخاری شریف ۵۱	مسلم شریف ۵۱	ابوداؤد شریف ۵۰
ترمذی شریف ۴۹	موطا امام مالک ۴۸	طحاوی ۴۵ موطا امام محمد ۳۹
ابن ماجہ شریف ۵۰	نسائی شریف ۵۰	شمائل ترمذی ۵۰

اس طرح آپ اعلیٰ نمبرات سے کامیاب ہوئے اور فرسٹ ڈویژن میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔ مجموعی نمبر (۵۰۰) میں آپ نے (۴۸۳) نمبرات حاصل کئے۔

اساتذہ و اکابر کی کرم فرمائیاں

مولانا گیلانی محنتی بھی تھے اور ذہین بھی اور اسی کے ساتھ ذی استعداد اور باادب بھی' پھر آپ کی تربیت ایسے گھرانہ میں ہوئی تھی جو صرف تعلیم یافتہ ہی نہیں تھا بلکہ مہذب' متمدن اور ساتھ ہی عالموں کا خاندان تھا' اس لئے قدرتاً اس کے اثرات پورے طور پر آپ میں پائے جاتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ دور طالب علمی میں جہاں رہے اساتذہ و اکابر کے لئے وجہ افتخار بن کر رہے اور اساتذہ نے عزت بخشی۔

Marfat.com

مقبولیت

دارالعلوم دیوبند میں جب آئے تو حضرت علامہ کشمیری نے آپ کا امتحان داخلہ لیا' اچھی استعداد پاکر چند جملے فرما دیئے' بس اسی وقت سے آپ کی استعداد کی تعریف ہونے لگی۔ پھر جب فاسد خیالات اور شکوک و شبہات کا زور ہوا اور آپ کو اپنے دین و ایمان کی فکر دامن گیر ہوئی تو شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن عثمانی نے باطنی توجہ ڈالی اور آپ کے دل کی دنیا بدل ڈالی' اس کے بعد بھی شیخ الہند نے برابر آپ پر نظر کرم رکھی' جس کی قدرے تفصیل گزر چکی۔

اہتمام کی طرف سے قدردانی

فراغت کے بعد ٹونک اور حیدرآباد قسمت آزمائی کے لئے پہنچے کہ مسلمانی ریاستوں میں شاید کوئی مناسب حال جگہ مل جائے اور تمام سے گھوم پھر کر پھر دارالعلوم کا قصد کیا جس کی تفصیل آگے آرہی ہے' اس وقت حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نے خوش آمدید کہا اور بغیر کسی سفارش کے دارالعلوم کے علمی کاموں میں لگا لیا اور آپ نے تدریس' تبلیغ اور تحریر تینوں خدمات یہاں انجام دیں۔

مولانا شبیر احمد عثمانی کی توجہ

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نے آپ کی طالب علمی کے زمانہ میں جب دارالعلوم سے علیحدگی اختیار کرلی تو دوسرے ذہین طلبہ کے ساتھ آپ کو بھی اپنے گھر بلا کر ابوداؤد کا سبق خصوصی طور پر پڑھاتے رہے اور آپ کی ذات سے اپنی محبت واخلاص کا اظہار فرمایا اور آپ کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

حضرت کشمیری کی سفارش

جس زمانہ میں دارالعلوم میں آپ کو معین المدرسین کی صف میں رکھا گیا اور ''القاسم'' و''الرشید'' کے مضامین کی ترتیب و تزئین آپ کے سپرد ہوئی تو اس وقت کے صدر المدرسین حضرت کشمیری نے ان لفظوں میں مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نائب مہتمم سے آپ کی سفارش فرمائی۔

> ''آپ کے یہاں جو درس کا کام کرتے ہیں' وہ تحریر کا کام نہیں کرتے' یا نہیں کر سکتے' جو تحریری سلیقہ رکھتے ہیں' ان سے آپ تقریر و وعظ کا کام نہیں لے سکتے' الغرض ان تینوں شعبوں میں یعنی درس' تحریر و تقریر کے لئے اسی وجہ سے آپ کو الگ الگ آدمی رکھنے پڑتے ہیں لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ اس غریب (مناظر احسن) سے رسالہ کی ادارت اور تحریر کا کام بھی آپ لیتے ہیں' درس و تدریس کا کام بھی اس کے سپرد کرتے رہے۔ جہاں کہیں سے طلبی آئی وعظ تقریر کے لئے بھی

Marfat.com

بھیجتے رہے۔ گویا تینوں شعبوں کا کام حسب دلخواہ وہ تنہا انجام دیتا رہا۔ اب اگر ان تینوں مدوں کے سلسلہ میں ایک ایک آدمی کی تنخواہ اسے دی جائے تو شاید اس کا یہ ناجائز مطالبہ نہ ہوگا۔"

(رسالہ دارالعلوم۔ محرم ۱۳۷۲ھ)

نائب مہتمم حضرت مولانا عثمانی نے اعتراف کیا اور مولانا گیلانی سے فرمایا "بھائی! مولانا انور شاہ صاحب تم (مناظر احسن) سے تو غیر معمولی طور پر متاثر نظر آتے ہیں۔" (ایضاً)

حضرت کشمیری کی محبت

جس زمانہ میں حیدرآباد مولانا گیلانی کو خبر پہنچائی گئی کہ حضرت شاہ صاحب تم سے ناراض ہیں، ٹھیک اسی زمانہ میں حضرت کشمیری نے اپنے دستخط خاص سے ایک رجسٹرڈ خط لکھا جس کے متعلق مولانا کا بیان ہے:

"پڑھتا جاتا تھا اور روتا جاتا تھا، اللہ اللہ سنانے والے مجھے کیا کیا سناتے رہے اور آنکھیں آج کیا دیکھ رہی ہیں، مودت و محبت سرفرازی اور محبت بے کراں کے سوا اور کچھ نہ تھا، ایک خاص خدمت کے لئے اس ذرہ ناچیز کا انتخاب فرمایا گیا تھا۔" (رسالہ دارالعلوم۔ محرم ۱۳۷۳ھ ص ۳۹)

حضرت مفتی صاحب سے تاثر

بلا اختلاف حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب ولی کامل سمجھے جاتے تھے، بہت سادہ مزاج تھے، مولانا گیلانی لکھتے ہیں کہ نماز پڑھنے کبھی کبھی ان کی مسجد میں بھی چلا جایا کرتا تھا تا کہ ان کے پیچھے نماز پڑھنے کی سعادت حصہ میں آئے، اس زمانہ میں حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی صاحب پر صوفیانہ مشاغل کا غلبہ تھا، وہ اس زمانہ میں حضرت مفتی صاحب کی مسجد میں چلہ کش تھے۔ حضرت مفتی صاحب حافظ قرآن بھی تھے، تراویح اس (چھوٹی مسجد) میں خود سناتے تھے۔ مولانا گیلانی مرحوم بھی ایک دن تراویح پڑھنے وہاں چلے گئے۔ نماز میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا جس سے مولانا مرحوم بہت متاثر ہوئے، اس کی تفصیل خود مولانا کے قلم سے سنئے:

"مفتی صاحب قبلہ حسب دستور وہی اپنی نرم سبک رو آواز میں قرآن پڑھتے چلے جاتے تھے، اسی سلسلہ میں قرآنی آیت وبرزوا للّٰہ الواحد القھار پر پہنچے، نہیں کہہ سکتا کہ خود مفتی صاحب کس حال میں تھے، کان میں قرآن کے یہ الفاظ پہنچے اور کچھ ایسا معلوم ہوا کہ کائنات کا سارا حجاب سامنے سے اچانک ہٹ گیا اور انسانیت کھل کر اپنے وجود کے آخری سرچشمے کے سامنے کھڑی ہے، گویا جو کچھ قرآن میں کہا گیا، محسوس ہوا کہ وہی آنکھوں کے سامنے ہے، مولانا شبیر احمد سے تو بے ساختہ چیخ نکل پڑی، سب پر یہی کیفیت طاری تھی، چیخ و پکار کا ہنگامہ برپا تھا لیکن مفتی صاحب کوہ وقار بنے ہوئے امام کی جگہ کھڑے تھے، جدید کیفیت جو ان پر تھی وہ

Marfat.com

صرف یہی تھی کہ خلاف دستور بار بار اسی آیت کو مسلسل دہراتے چلے جاتے تھے' صفیں درہم برہم ہوگئیں' کوئی اِدھر گراتھا کوئی اُدھر پڑا تھا' آہ' آہ کی آواز مولانا شبیر احمد کی زبان سے نکل رہی تھی' صف میں ایک طرف وہ بھی پڑے تھے۔ کچھ دیر بعد لوگ اپنے آپ میں واپس ہوئے' مفتی صاحب اپنی جگہ کھڑے اسی آیت کو پڑھتے رہے' جب دوبارہ صف بندی ہوئی تب پھر آگے بڑھے۔ (رسالہ دارالعلوم۔ شوال ۱۳۷۳ھ ص ۴۷)

مولانا گیلانی نے درست لکھا ہے کہ "کتابی و درسی تعلیم کے سوا دارالعلوم کا سارا ماحول اس زمانہ میں اسباق ہی اسباق تھا۔" حضرت مفتی صاحب عارف باللہ تھے۔ روزانہ اوابین میں آٹھ پارے قرآن پڑھتے تھے اور آپ کی بہت ساری کرامتیں مشہور تھیں۔ اس واقعہ خاص سے مولانا گیلانی کے قلب پر گہرا اثر پڑا' کہنا چاہیے مولانا گیلانی میں دل کی صفائی' جاذبیت اور تعلق مع اللہ میں دیوبند کے اساتذہ و اکابر کی توجہ کا بڑا دخل تھا' مواد خاندانی تھا' اساتذہ دارالعلوم کی نگاہوں نے اسے کندن بنادیا۔

مولانا حافظ احمد صاحب سے تاثر

اسی طرح جس زمانہ میں مولانا دارالعلوم میں معین المدرسین کی حیثیت سے رہتے تھے' حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے ایک نجی واقعہ سے مولانا گیلانی کافی متاثر ہوئے اور خاندان قاسمی کی عظمت دل میں پیوست ہوگئی۔ یہ واقعہ بھی مولانا کے قلم سے سنئے' لکھتے ہیں:

"اللہ' اللہ' وہ کتنی کڑی اور سخت گھڑی تھی جب حکومت قائمہ کی طرف سے حضرت مفتی محمد احمد صاحب خلف صالح حضرت نانوتویؒ کے نام یہ فرمان مدرسہ آیا کہ نہری علاقہ میں زمین کا ایک بڑا سرسبز و شاداب رقبہ آپ کی خدمت میں حکومت پیش کرتی ہے۔ شاید سیکڑوں ہی ایکڑ یا بیگھے پر حکومت کا یہ موہوبہ رقبہ مشتمل تھا' مشورے کی اس مجلس میں جس میں حکومت کا یہ فرمان غور و خوض کے لئے پیش ہوا' اس فقیر کو بھی بلا کر شریک کرلیا تھا' قبول کیا جائے یا نہ قبول کیا جائے؟ اس پر دیر تک بحث ہوتی رہی...... پشتہا پشت کی فراخ حالی کی ضمانت حکومت کے جس جاگیری عطیہ میں پوشیدہ تھی' ایک ٹھوکر میں وہ قدموں کے نیچے ڈال دی گئی۔ اور سیدنا الامام الکبیر مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ کے خلف صالح سے جس کی توقع کی جاسکتی تھی وہی توقع پوری ہوئی ادھر ہی ادھر سے حکومت کو جواب دے دیا گیا۔" (رسالہ دارالعلوم۔ شوال ۱۳۷۲ھ)

مولانا لکھتے ہیں کہ مخصوص لوگوں کے سوا اس کی کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہونے پائی' اپنے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"فقیر اگر شوریٰ کی اس مجلس میں شریک نہ ہوتا' تو وہ بھی قطعاً اس سے ناواقف ہی رہتا...... اس

Marfat.com

محدود حلقہ کے سوا کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔'' (رسالہ دارالعلوم۔ شوال ۱۳۷۳ھ)

مولانا خاندان قاسمی کے اس ایثار سے کافی متاثر ہوئے اور اس سے بھی کہ اس کا چرچا قطعاً عوام میں نہ پھیلنے دیا اور نہ ہونے دیا کہ مہتمم صاحبؒ نے دارالعلوم کی خاطر یہ ایثار کیا ہے' مولانا کے الفاظ ہیں:

''ایثار و قربانی کا اگر یہ واقعہ ان لوگوں میں پیش آتا جو خالق سے زیادہ مخلوق کی ستائشوں کے پیاسے ہیں تو خدا ہی جانتا ہے کہ کس کس طرح سے اس کا چرچا نہ پھیلایا جاتا لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں اس محدود حلقہ کے سوا جس میں اس مسئلہ کو پیش کر کے فیصلہ کیا گیا تھا کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی کہ پیش کرنے والوں کی طرف سے کیا پیش ہوا تھا اور واپس کرنے والوں نے کس چیز کو واپس کیا۔ تغمدھم اللہ لغفرانہ وطاب ثراھم۔'' (ایضاً)

دارالعلوم کے اکابر اور ذمہ داروں کی اس پاک وصاف زندگی کا مولانا پر بڑا اثر پڑا اور خود مولانا گیلانی نے اپنی زندگی میں دولت کو کبھی کوئی وقعت نہیں دی اور جہاں رہے مادر علمی دارالعلوم دیوبند کے نام کو بلند و بالا کیا اور روشن و تابناک رکھا۔

اکابر کی نوازش

اس زمانہ میں ایک واقعہ حضرات مولانا سید میاں اصغر حسین صاحب کا پیش آیا' مولانا گیلانی ملازم اور دارالعلوم کے مدرس ہو جانے کے بعد بھی طالب العلموں کی ہی طرح رہتے سہتے تھے' ایک دن ادھر سے حضرت میاں صاحبؒ کا گزر ہوا۔ دیکھا کمرہ میں کوئی چارپائی اور اچھا بستر نہیں ہے' پوچھا کس چیز پر سوتے ہو؟ مولانا نے عرض کیا انہی چٹائیوں پر سو جاتا ہوں' اس قدر گفتگو کے بعد حضرت میاں صاحب تشریف لے گئے' دوسرے وقت ایک آدمی پلنگ لے کر پہنچ گیا کہ مولوی مناظر احسن کے لئے یہ میاں صاحبؒ نے پلنگ بھیجا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں' اس کا مجھ پر بے انتہا اثر پڑا' حالانکہ حضرت میاں صاحب خود سادہ مزاج تھے اور آپ کا رہن سہن بہت معمولی تھا' ان کے مکان پر دیکھا گیا کہ

''مٹی کے ایک چبوترے پر بوریئے کا ایک مصلیٰ پڑا ہوا ہے' سامنے مٹی کا ایک لوٹا ہے اور بان کی بنی ہوئی چند چارپائیوں کے سوا اور کچھ نہ ہوتا جن پر آنے والے آ کر بیٹھتے۔''

(رسالہ دارالعلوم۔ شوال ۱۳۷۳ھ' ص ۴۵)

مگر اپنے ایک عزیز شاگرد کے لئے جو دارالعلوم ہی میں مدرس ہو چکا تھا یہ پسند نہیں فرمایا کہ چٹائیوں پر پوری رات گزارے' بطور خود اپنے مکان سے اپنے آدمی کے ہاتھ پلنگ بھیجا تاکہ وہ لکھ پڑھ کر جب تھک جائے تو پلنگ پر آرام کرے اور عام طلبہ محسوس کریں کہ یہ طالب علم نہیں' استاذ ہے۔ واقعہ ہے کہ پہلے کے اساتذہ کیا تھے۔ اپنے ہونہار شاگردوں کو حقیقی اولاد سے کسی طرح کم نہیں چاہتے تھے' اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔

Marfat.com

۱۰۰ قیامِ دارالعلوم کے زمانہ میں سیر و تفریح

دارالعلوم کے طلبہ کے لئے سیر و تفریح کی جگہیں عام طور پر اطراف کے کچھ مزارات اور قصبے ہیں' نیا طالب العلم ان کی شہرت سن کر وہاں جانے کی خواہش ظاہر کرتا ہے اور جب کبھی کوئی چھٹی ہوتی ہے ساتھیوں کی ٹولی بنا کر طلبہ نکل جاتے ہیں' آج کل تو ساری سہولتیں فراہم ہیں۔ سڑکیں بھی پختہ بن گئیں' بسوں' ٹیکسیوں کا نظام بھی قائم ہو گیا' کرایہ پر سائیکلیں بھی مل جاتی ہیں مگر مولانا گیلانی کی طالب علمی کے زمانہ میں یہ سہولتیں حاصل نہ تھیں کیونکہ پچھتر سال پہلے ان ترقیوں کا تصور بھی نہ تھا' انگریزوں کی حکومت تھی۔ ملک غلام تھا' نئی ایجادوں کی فراوانی آج جیسی نہیں تھی البتہ اس زمانہ میں امن و امان اور سکون و اطمینان آج سے زیادہ ضرور تھا' جان و مال کا کہیں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ لوگوں میں دھوکہ دہی جھوٹ' سازش وغیرہ کا عام رواج نہیں ہوا تھا۔

دیوبند میں قیام کی مدت

مولانا گیلانی نے شوال ۱۳۳۱ھ میں دیوبند میں آ کر دورہ حدیث میں داخلہ لیا تھا' سال بھر اس سلسلہ میں رہنا پڑا۔ فراغت کے بعد اِدھر اُدھر فکر معاش میں پھرتے رہے جس کی تفصیل اپنی جگہ آئے گی' پھر چھ سات مہینے کے بعد دیوبند آ گئے اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی نگاہ دوربیں نے آپ کا انتخاب کر لیا اور معین المدرسین اور رسالہ ''القاسم'' و ''الرشید'' کے مرتب کی حیثیت سے کام پر لگا لیا۔ سال ڈیڑھ سال کم و بیش اس طرح بھی رہنا ہوا' اس طرح قیام کی کل مدت ڈھائی سال سے زیادہ نہیں ہوتی ہے' خود مولانا نے بھی لکھا ہے:

> ''دارالعلوم میں خاکسار کے قیام کی مدت دو ڈھائی سال سے زیادہ نہیں ہے۔''
> (رسالہ دارالعلوم۔ صفر ۱۳۷۳ھ' ص ۳۹)

کلیر کی حاضری

جس سال دورہ حدیث میں داخل ہوئے اسی سال بقر عید کی چھٹی میں ۸/۷ ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ کو کلیر حاضری کا ارادہ فرما لیا اور وہاں پہنچ گئے۔ یہاں حضرت علی احمد صابرؒ کا مزار ہے' جو سلسلہ چشتیہ کے ایک مشہور و مقبول بزرگ ہیں' یہ مزار بڑی نہر کے کنارے رڑکی سے کوئی پانچ چھ کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے' یہاں ہر زمانہ میں خواص و عوام دونوں فیوض و برکات حاصل کرنے کی غرض سے پہنچتے رہے ہیں۔ اب تو ماشاء اللہ کافی رونق آ چکی ہے' وہاں بازار سا بن گیا ہے مگر آج سے ستر سال پہلے ویران سا رہا ہو گا' مزار اور مسجد کے سوا شاید ہی دو چار مکان وہاں ہوں گے۔

مولانا نے خود اپنا واقعہ ''بیتے ہوئے دن'' میں اس طرح لکھا ہے:

Marfat.com

''خوب یاد ہے عیدالاضحیٰ کی تعطیل مدرسہ (دارالعلوم) میں ہوئی۔ اچانک خیال آیا' اس تعطیل سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ کلیر شریف آستانہ صابریؒ کی زیارت کے لئے روانہ ہوا' رڑکی سٹیشن سے اتر کر گٹھڑی بغل میں دبائے نہر کے کنارے کنارے بہتے ہوئے صاف وشفاف پانی کی دید سے لذت اندوز ہوتے کلیر شریف پہنچ گیا۔ روضہ میں داخل ہوگیا' روضہ پر پہنچ کر حسب دستور فاتحہ خواں ہوا۔

(رسالہ دارالعلوم۔ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ' ص ۳۹)

سفر برائے اصلاح حال

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کا یہ سفر بالکل یکہ وتنہا تھا' کوئی دوسرا ساتھی ساتھ نہ تھا' اور یہ بھی کہ رڑکی سے کلیر تک پیدل گئے اور اس زمانہ میں اس کے سوا دوسرا چارہ کار بھی نہ رہا ہوگا' یہ وہی زمانہ تھا جس میں مولانا پر ایک خاص حال طاری تھا اور شکوک وشبہات نے گھیرے میں لے رکھا تھا' جو حضرت شیخ الہند کی توجہ خاص سے بعد میں ختم ہوا۔ کلیر بھی اسی خاص حال کی اصلاح کی غرض سے جانا ہوا تھا' فاتحہ خوانی سے فارغ ہو کر مسجد پہنچے اور وہاں تلاوت کلام اللہ میں مشغول ہوگئے' رخ قبلہ کی طرف تھا' ایک آدمی آیا اور ڈانٹ پلانے لگا کہ پشت روضہ کی طرف ہے۔ کیا اس کا خیال نہیں؟ حالانکہ مسجد سے روضہ مشرق وجنوب کی جانب واقع ہے۔ آمنے سامنے نہیں ہے۔

مولانا لکھتے ہیں:

''میں نے عرض کیا بھائی! مسجد میں بیٹھنے کی طبعی صورت یہی ہوسکتی ہے جس طرح بیٹھا ہوا ہوں۔ پھر میں نے کہا کہ آپ تو صوفی ہیں صوفیوں کا مشہور نظریہ ہے'' ہر جا کہ نظر کردم سیمائے تو می بینم۔'' سمجھ گئے کہ کوئی وہابی المزاج آدمی ہے۔ بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔'' (ایضاً)

کھانا منجانب خانقاہ

کھانے کا وقت ہوا اور کھانے کا تقاضا پیدا ہوا کہاں کھانا کھایا جائے' اس زمانہ میں وہاں کوئی ہوٹل نہیں تھا لیکن آپ نے دیکھا ایک صاحب چند چپاتیاں اور مسور کی دال کا پیالہ لئے آرہے ہیں' انہوں نے کہا جب تک یہاں قیام ہے' ان شاء اللہ کھانا یہاں پہنچتا رہے گا۔ پانی بھی لاکر دیا' کھانا کھا لیا۔ جب تک ٹھہرے یہ کھانا ملتا رہا' کام تلاوت اور ایصال ثواب کے سوا دوسرا کوئی نہ تھا' لکھتے ہیں:

''عید کا دن اسی مسافرت کی حالت میں آگیا' خانقاہ کے علاقے میں نماز ہوئی۔ اس میں شریک ہوگیا۔'' (ایضاً۔ ص ۴۰)

قبر کو سجدہ کرتے دیکھ کر

بقر عید کی نماز بعد سجادہ نشیں کو دیکھا جبہ و عمامہ کے ساتھ \

''روضہ کے سامنے وہی پہنچے اور ان کی وہی پیشانی جو ابھی کچھ دیر پہلے آسمان و زمین کے خالق کے سامنے سے اُٹھی تھی' روضہ کے سامنے رکھتے ہوئے سر بسجود تھے۔'' (ایضاً)

مولانا لکھتے ہیں یہ ایمان سوز منظر دیکھ کر کانپ گیا اور حیرت ہوئی کہ جس بزرگ نے زندگی بھر تلقین کی تھی کہ خدا کے سوا کسی غیر کو سجدہ نہ کیا جائے' اس کے ماننے والے اسی کو سجدہ کر رہے ہیں' مولانا لکھتے ہیں:

''میرا خون کھول رہا تھا' کاش سجدہ کرنے والے صاحب کو یہ دکھانے کی قوت مجھ میں ہوتی کہ نفرت و ملامت بلکہ لعنت کا کتنا بڑا طوفان تھا' جو صاحب مزار کی روح مبارک سے نکل کر سجدہ کرنے والے اور ان کے سجدہ کا احاطہ کئے ہوئے تھا۔'' (ایضاً)

کلیر سے منگلور کا پیادہ پا سفر

نماز عید کے بعد ایک صاحب آپ سے آ کر ملے اور مولانا کو زبردستی اپنے مکان لے گئے۔ وہاں انہوں نے کھانا اور سویاں وغیرہ کھلائیں' اس طرح عید کا مزہ بالکل کرکرا نہیں ہوا' کام و دہن نے لذت پائی' انہی صاحب سے منگلور کا راستہ معلوم کر کے وہیں سے منگلور کے لئے پیدل روانہ ہو گئے۔ کہانی خود مولانا سے سنئے۔

''ان سے ہی پوچھا منگلور نامی قصبہ اس علاقہ میں کس طرف ہے' راستہ انہوں نے بتا دیا' کچھ دور رخصت کرنے کے لئے ساتھ رہے' جب وہ پلٹ گئے تو خوب یاد ہے بندے نے جوتے بھی پاؤں سے نکال لئے اور اپنی گٹھڑی میں ان کو بھی باندھ لیا اور چل پڑا' آفتاب جب غروب ہو چکا تھا' افتاں و خیزاں کسی نہ کسی طرح منگلور تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔'' \

گویا پورے دن پیادہ پا رواں دواں رہے اور منزل پا لینے کے بعد دم لیا مگر جس مسجد میں پہلے گئے تھے اس کے ایک ذمہ دار نے مولانا کی گٹھڑی لے کر مسجد سے باہر پھینک دی اور کچھ صلواتیں بھی سنائیں' ایک طرف تکان سے چُور چُور دوسری طرف یہ میزبانی' اس مسجد سے نکل کر جامع مسجد کا راستہ پوچھتے ہوئے وہاں پہنچے اور اب ذرا عمامہ وغیرہ باندھ لیا کہ مولوی معلوم ہونے لگیں۔ یہاں نمازیوں کو جب معلوم ہوا کہ یہ دارالعلوم دیوبند کے طالب علم ہیں تو اچھی مدارات ہوئی' ماحضر حاضر کیا' قیام کی جگہ بتا دی' جس مقصد سے وہاں گئے تھے معلوم ہوا کہ وہ مقصد پورا نہ ہو سکے گا' مقصد مولانا نے ظاہر نہیں کیا ہے کہ وہ کیا تھا۔ غالباً وہاں بھی کسی بزرگ سے ملاقات کا ارادہ ہوگا۔

رات منگلور کی مسجد کے کمرہ میں گزاری' نیند خوب آئی کہ تھکے ماندے تھے۔ ہمت جواب دے رہی تھی مگر صبح کو آنکھیں کھلیں تو ایسا محسوس ہوا کہ تکان دور ہو چکی ہے' کچھ وقت گزار کر دیوبند کا راستہ لیا اور پیدل چل کر دیوبند پہنچے۔

Marfat.com

اس طرح عیدالاضحیٰ کے ایام تعطیل سفروں میں گزر گئے اور واپس آ کر پھر اپنے پڑھنے لکھنے میں مشغول ہو گئے۔ ایام طالب علمی میں دیوبند رہتے ہوئے اول و آخر بس اسی سفر کا تجربہ ہوا۔

بعد فراغت دیوبند میں

فراغت کے بعد چھ سات ماہ یا سال سوا سال بعد مولانا گیلانی جب دیوبند دوبارہ آئے تو حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے آپ کو دارالعلوم میں رکھ لیا' مولانا عثمانی کا قاعدہ تھا کہ ذہین و ہونہار طلبہ کو نظر میں رکھتے تھے اور بعد فراغت اس کی تربیت کا انتظام کرتے تھے۔

اس زمانہ میں آپ سے متعلق چند کام تھے' کوئی مدرس چھٹی پر گیا تو ان دنوں میں ان کے اسباق پڑھا دینا' رسالہ ''القاسم'' اور ''الرشید'' کی ترتیب و تزئین کی خدمات انجام دینا اور اگر کہیں سے واعظ و مقرر کی طلبی آ گئی تو بحکم اہتمام وہاں پہنچ کر تقریر و وعظ کہنا اور عوام و خواص کو نصیحت کرنا۔

گروکل کانگڑی کا سفر

ایک سفر کا اس زمانہ میں بھی مولانا گیلانی کو اتفاق ہوا' پنڈت دیانند سرسوتی بانی آریہ سماج کے ماننے والوں نے ایک خاص طرح کی تعلیم گاہ گروکل کانگڑی میں جاری کر رکھی تھی جہاں ہندو طلبہ کو مذہبی تعلیم دی جاتی تھی۔ مولانا گیلانی کو اس کالج کے دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ ایک مرتبہ رڑکی تقریری پروگرام میں مدرسہ کی طرف سے جانا ہوا۔ وہاں تقریر سے فارغ ہو کر سوچا موقع غنیمت ہے' گروکل کانگڑی سے ہو آئیں اور دیکھ کر آئیں کیا نظام ہے اور تعلیم کس طرح کی ہوتی ہے۔

کانگڑی کا عزم

اس ارادہ کو وہاں کے لوگوں سے ذکر کیا۔ لوگوں نے سمجھایا کہ موسم برسات میں جنگلی علاقہ میں جانا کسی طرح مناسب نہیں مگر مولانا جانے پر بضد ہوئے۔ کسی کی نہیں سنی' جوانی کے عالم میں یہی ہوتا ہے' جب لوگوں نے اندازہ لگایا کہ یہ ماننے کے نہیں تو ایک سن رسیدہ شخص نے راستہ کے لئے کھانا پکوا کر ساتھ کیا اور بتایا کہ وہاں کس طرح جائیں گے' ایک لوٹا بھی ساتھ کر دیا' مولانا رڑکی میں ٹرین میں بیٹھ کر نو بجے رات میں ''ہردوار'' سٹیشن پہنچے' وہاں سرائے تھی مگر مسلمانوں کو قیام کی اجازت نہیں تھی۔ مولانا سٹیشن سے سرائے گئے اور سعی کی کہ رات میں قیام کی اجازت مل جائے' مگر سرائے کے ذمہ دار راضی نہیں ہوئے کہ ایک مولوی مسلمان کو قیام کی اجازت دے دی جائے۔ واپس آ کر سٹیشن کے پلیٹ فارم پر ایک درخت کے زیر سایہ رات گزاری۔ صبح کو معمولی سا جو بستر ساتھ تھا خوشامد کر کے کرایہ پر سرائے میں جمع کرا دیا اور راستہ معلوم کرنے لگے کہ گروکل کانگڑی کا راستہ کہاں سے ہے' کوئی بات پوچھنے والا تک نہیں تھا' ایک بوڑھا سادھو (ملا) اس کو ترس آیا' اس نے بتایا کہ اس طرح فلاں جگہ جا کر کشتی سے اس پار ہو جائیں اور وہاں سے کانگڑی جائیں۔

Marfat.com

کانگڑی کا راستہ

مولانا نے یہی کیا' اس گھاٹ پر پہنچے' کشتی سے اس پار ہوئے مگر وہاں سے کانگڑی کی طرف جانے والا کوئی آدمی نظر نہیں آیا۔ سنسان جنگل ہو کر پیدل کا راستہ تھا' مرتا کیا نہ کرتا' ناچار تنہا جانے پر آمادہ ہوگئے۔

مولانا کا بیان ہے:

''اللہ کا نام لے کر تن تنہا اس جنگل میں گھسا' زادِ راہ اور کتاب والی گٹھڑی بغل میں تھی۔ جنگل کی پگڈنڈی پر چل پڑا' راستہ بہت جلد مل گیا' وقت صبح سات آٹھ کا تھا۔ سر جھکائے پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ (رسالہ دارالعلوم دیوبند۔ رجب ۱۳۷۳ھ)

راستہ کی کٹھنائیاں

راستہ میں کئی نالے آئے' جن کی پگھلی ہوئی برف بہہ رہی تھی' نیچے برف کے چکنے ٹکڑے پھیلے ہوئے تھے' پاؤں ڈالنا پانی میں آسان نہ تھا مگر چارہ کار کیا تھا۔ پانی میں داخل ہوئے تو اب پاؤں جمانا بڑا مشکل ہو رہا تھا مگر جیسے تیسے پار کیا۔ کچھ آگے چل کر ایک مرد پیر ملا' جس کی لمبی داڑھی بھی تھی۔ مولانا کو دیکھ کر اسے رحم آیا اور اس نے کہا' چلئے میں آپ کو پہنچا کر آؤں' مولانا نے اس کو تائید غیبی سمجھا' اس بڈھے کو مولانا کے اس سفر کے اختیار کرنے پر حیرت تھی کہ تن تنہا اس جنگل سے گزرنے کی کیسے ہمت کی۔

کانگڑی کالج میں

چنانچہ وہ آپ کے ساتھ ساتھ وہاں تک آیا جہاں سے عمارت صاف نظر آنے لگی تھی۔ یہاں پہنچ کر اس بڈھے نے کہا لیجئے آپ منزل پر پہنچ گئے' میں چلا اور وہ واپس ہوگیا' یہ گیارہ بجے دن کا وقت ہوگا۔ مولانا کانگڑی کی عمارت میں داخل ہوئے تو آدمیوں سے ملاقات ہوئی' مولانا نے بتایا کہ مجھے اس کالج کے پرنسپل سے ملنا ہے۔ کسی نے وہاں پہنچا دیا۔ پرنسپل گرم جوشی کے ساتھ ملا' درس بند کر دیا اور دیر تک باتیں کرتا رہا' اس نے یہ بھی بتایا کہ اس ادارے کی وہی حیثیت ہے جو آپ کے یہاں ندوہ کی ہے۔ یعنی قدیم وجدید کو باہم قریب لانا اور دوری کو ختم کرنا۔

باقی یہ سنسان جنگل والی جگہ اس کے لئے اس غرض سے منتخب کی گئی ہے کہ شہری تمدن کے زہریلے اثرات سے طلبہ محفوظ رہ سکیں اور یکسو ہو کر اپنی تعلیم میں منہمک رہیں' یہاں جگہ وافر ہے۔ اساتذہ وطلبہ یہاں سبزی کی کاشت کرتے ہیں کہ کھانے میں کام آئے' دودھ دہی کے لئے مویشی بھی پالتے ہیں۔

کالج کی سیر

اپنے کالج کے مقاصد سمجھا کر پرنسپل نے ایک آدمی کو مولانا کے ساتھ کر دیا کہ وہ مولانا گیلانی کو ہر کلاس میں لے جائے اور دکھلائے کہ تعلیم کس طرح ہو رہی ہے اور پھر کتب خانہ کی بھی سیر کرائے' وہ آدمی ملنسار تھا۔ بڑی محبت سے

Marfat.com

تمام کالج میں پھرایا، جب سب کچھ دکھایا جاچکا تو اس نے مہمان خانہ میں لاکر کہا کہ آپ اب یہاں آرام کریں، بارہ بج چکے تھے، مہمان خانہ صاف ستھرا عمدہ تھا، مہمان خانہ کی طرف سے دن کا کھانا پیش ہوا۔ مولانا نے تناول کیا، آرام کیا، ظہر کا وقت آیا تو ہلکی آواز سے اذان دے کر اسی میں نماز ادا کی، عصر کے وقت تک پھر آرام کرتے رہے، عصر پڑھ کر واپسی کا ارادہ کرلیا، پرنسپل کو خبر ہوئی تو آ کر ملا، بہت کچھ سمجھایا کہ اب واپسی کا وقت نہیں رہا، رات یہیں گزاریں کوئی تکلیف نہیں ہوگی، مگر موہوم خیالات اور جوش جوانی نے مل کر ایک بات نہیں سننے دی، آمادہ سفر ہو ہی گئے، حالانکہ معلوم تھا کہ تین چار گھنٹے پیدل کا راستہ ہے کیونکہ ابھی صبح ہی آئے تھے۔

کانگڑی سے واپسی

پرنسپل نے مجبوراً مولانا کو رخصت کردیا۔ دن کا آخری وقت جنگل کا سنسان راستہ جہاں کسی آدم زاد کا پتہ نہیں، برسات کے دن، تن تنہا پگڈنڈی پکڑے گردن جھکائے چلتے رہے، کنارے آئے تو آفتاب غروب ہو چکا تھا، اندھیرا چھانے لگا تھا۔ خود تحریر کرتے ہیں۔

''تاریکی گویا پھیل رہی تھی، میں نے سر پکڑ لیا کہ اب کیا ہوگا۔ میں نے خدا کی نعمت کا انکار کیا تھا۔ گروکل کے مہمان خانہ میں شب گزاری کے ارادہ کو خواہ مخواہ ترک کیا تھا۔ اب اس کی سزا یہ تھی کہ گنگا کے ایک جنگلی نالے کے کنارے جس کے ایک طرف گھنا جنگل اور دوسری طرف اُونچے اُونچے خوفناک پہاڑ اور تیسری طرف دریا کا نالہ رات اس ٹاپو میں یا اللہ کیسے گزاروں گا۔''

(رسالہ دارالعلوم۔ رجب ۱۳۷۳ھ)

یہ بھی لکھا ہے کہ:

''ساحل پر جہاں تک نظر جاتی تھی دور دور تک کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا، اب تاریکی پھیل چکی تھی، اب سر پکڑ لیا۔ کیا ہوگا گھبرانے لگا، مغرب کی نماز کا آخری وقت ہو رہا تھا، سوچا جو ہونا ہوگا ہوگا، مغرب کی نماز تو پڑھ لی جائے، نیت باندھ کر نماز ادا کی، دعا کے لئے ہاتھ اٹھایا تھا کہ کچھ آہٹ محسوس کی، کچھ لوگ بیل ہنکاتے آرہے ہیں، دوڑ کر وہاں پہنچا کہ میں بھی اس پار جانا چاہتا ہوں، میری گھبراہٹ دیکھ کر کہنے لگے پریشانی کی کوئی بات نہیں ہم لوگوں کے ساتھ پار اتر جانا، اب جان میں جان آئی چنانچہ ان بیچاروں نے ملاح کو آواز دی، اس پار سے کشتی ان کو لینے آ گئی، اس میں بیٹھ کر میں بھی اللہ اللہ کر کے اس پار پہنچا، اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا، سرائے سے بستر واپس لیا اور ہردوار اسٹیشن پہنچا۔'' (ایضاً)

''جان بچی لاکھوں پایا'' اسی کو کہتے ہیں، اب ٹرین کا سفر تھا، گھبرانے کی بات تھی نہیں۔ ٹرین میں بیٹھ کر رڑکی ہوتے ہوئے دیوبند واپس پہنچے اللہ کا شکر ادا کیا کہ مسافر اپنی قیام گاہ بخیر آ گیا۔

Marfat.com

اندرون دیوبند تفریح

دیوبند سے باہر سیر و سیاحت میں ان دو واقعات کے سوا اور کچھ نہیں مل سکا البتہ اندرون دیوبند جن طلبہ کے ساتھ زمانہ طالب علمی میں رہتے تھے' وہ کبوتروں اور خرگوشوں کا شکار عام طور پر کیا کرتے تھے اور کبھی کبھی مچھلیوں کا بھی' یہ سب صوبہ بہار کے رہنے والے تھے' مولانا لکھتے ہیں۔

''کبھی کبھی فقیر بھی ''شب شکاری'' کی اس مہم میں اس ٹولی کے ساتھ رات رات بھر کھیتوں اور میدانوں میں بھٹکتا پھرتا تھا مگر اس ٹولی کا سب سے زیادہ عضو ضعیف شمار کیا گیا۔''

(رسالہ دارالعلوم۔محرم ۱۳۷۳ھ ص ۳۵)

کبوتروں کا شکار

کبوتروں کا شکار عام طور پر رات میں ہوا کرتا تھا' اس زمانہ میں کسانوں نے کھیتوں کو پانی دینے کے لئے اپنے اپنے کھیتوں میں کچے کنوئیں کھود رکھے تھے' ان کنوؤں میں طاق نما گڈھے ہوتے تھے' رات میں کبوتروں کا ملجاو ماویٰ یہی ہوتے تھے' شکاری انہیں کنوؤں پر جال ڈال کر کبوتروں کو پکڑا کرتے تھے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''خدا جانے کس طرح پتہ چلا لیتے کہ اس کنوئیں میں کبوتروں کی کافی تعداد ہے' یہ فیصلہ کر کے جال پہلے کنوئیں پر پھیلا دیا جاتا اور ایک رسہ جو ساتھ رہتا تھا اس کو ہاتھ میں پکڑ کر حکیم منظر حسن صاحب اپنے خاص رفقاء کے ساتھ کنوئیں میں اتر جاتے' ان لوگوں کے اترنے کے ساتھ ہی کبوتر اڑنے لگتے' کنوئیں سے باہر نکلنا چاہتے ہیں لیکن جال میں گرفتار ہو جاتے......ایک ایک مہم میں بسا اوقات تین تین سو چار سو تک کبوتر ہاتھ آ جاتے تھے۔ پو پھٹنے کے ساتھ ہی ہم لوگ مدرسہ میں داخل ہو جاتے' صبح کو ذبح کیے ہوئے کبوتروں کی پکائی دیگوں میں ہوتی۔''

(رسالہ دارالعلوم۔محرم ۱۳۷۳ھ' ص ۳۵)

مچھلیوں اور خرگوشوں کا شکار

اسی طرح مچھلیوں کا بھی شکار ہوتا تھا اور خرگوشوں کا بھی۔ مولانا نے لکھا ہے:

''مچھلیوں اور کبوتروں کے ساتھ ساتھ خرگوشوں کی بھی کافی تعداد ہر دوسرے تیسرے دن شکار ہوتی تھی' گیہوں کے کھیتوں میں بکثرت خرگوش رہا کرتے تھے اور یہ طلبہ کبھی کبھی لاٹھیوں سے ہی مار لیتے تھے۔'' (ایضاً)

مولانا لکھتے ہیں ''میں خرگوش کے کھانے میں شریک نہیں ہوتا تھا۔''

Marfat.com

''لیکن خدا جانے میرا دل اس کھانے پر آخر وقت تک کیوں راضی نہ ہوا' زیادہ سے زیادہ کبھی کبھی مصالحہ تو روٹی میں لگا لیتا لیکن بوٹی شاید ہی کبھی استعمال کی ہو۔'' (ایضاً۔ص ۳۶)

گنّے کا رس

اس تفریح میں کبھی کبھی گنّے کے رس کا بھی استعمال ہوتا تھا' مولانا نے لکھا ہے:

''ایک دفعہ بدقسمتی سے شب گردی کی اس مہم میں فقیر بھی ساتھ ہو گیا تھا' گنّے کی کافی تعداد حاصل ہوئی' خیال کیا گیا کہ ان کا رس نکالا جائے' لیکن بیل طالب علم کہاں سے لائیں' بالآخر طے کیا گیا کہ بجائے بیلوں کے طلبہ ہی کولہو کو چلائیں۔ اس موقع پر حصہ رسدی کے مطابق تھوڑی دیر کے لئے اس نچوڑنے کے اس کولہو میں خاکسار کو بھی جوتا گیا۔'' (ایضاً)

آموں اور بیروں کی دعوت

مولانا نے لکھا ہے کہ آپ کی طالب علمی کے زمانہ میں دیوبند کے باشندے طلبہ کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا کرتے تھے اور اپنے کھیتوں اور باغوں میں عمدہ مہمانی کرتے تھے اور حق مہمانی ادا کر کے خوش ہوتے تھے۔

''اپنی اپنی بیڑیوں میں بلا کر طلبہ کی بیروں سے ضیافت یا آموں کے زمانہ میں مدعو کر کے آموں کی سخاوت ایک عام بات تھی۔'' (ایضاً۔ص ۳۷)

امن و عافیت کی زندگی

دیوبند کی طالب علمی کے متعلق مولانا کا احساس ہے کہ

''الغرض دارالعلوم دیوبند کا ماحول کم از کم اس زمانہ (۱۳۳۲ھ) میں جب فقیر کو اس احاطہ میں زندگی گزارنے کا موقع ملا امن و عافیت راحت و آرام کے اسباب سے معمور تھا۔''

(ایضاً۔ص ۳۶)

کوئی شبہ نہیں کہ آج سے ستر پچھتر سال پہلے جب اس ملک میں انگریزوں کی حکمرانی تھی' مسلمان خوشحال بھی تھے اور اطمینان و سکون کی دولت سے مالا مال بھی۔ ملک میں اس قدر مدارس قائم نہیں ہو سکے تھے جو تعداد اب پائی جاتی ہے' گنے چنے مدارس تھے' ان مدارس میں اس وقت بھی دارالعلوم دیوبند سب سے بڑا اور مرکزی مدرسہ تھا اور قصبہ دیوبند کے باشندے طلبہ کے ساتھ بڑی محبت اور حسن سلوک سے پیش آتے تھے۔

حضرت نانوتویؒ کا احسان عظیم

حجتہ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کی قبر کو اللہ تعالیٰ اپنے نور سے منور رکھے اور ان کا خاندان پھلتا پھولتا رہے۔ دارالعلوم اور دوسرے مدارس قائم کر کے دین اور اسلام کی اشاعت کی بڑی عظیم خدمت انجام دے گئے۔ آج جو بھی مدعی ہو مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ سب صدقہ ہے حضرت نانوتویؒ اور آپ کے مرشد و رفقاء اور احباب کا اور ساتھ ہی باشندگان دیوبند کی ملی ہمدردی کا بالخصوص ان اسلاف کی دعا نیم شبی اور آہ سحر گاہی کا کہ ملک بلکہ عرب و عجم کا گوشہ گوشہ علماء و مشائخ سے بھرا ہوا نظر آتا ہے اور دین کا چرچا عام ہے۔ اپنا خیال ہے کہ علمائے دیوبند میں جو لوگ حضرت نانوتوی کے لئے دعا گو نہیں وہ کفران نعمت کے مرتکب ہیں، وہ یہ نہیں سوچتے کہ یہ دولت علم و فضل ان کے گھرانے اور خاندان میں اور ان کے حصہ میں کس راستہ سے آئی اور یہ عزت و مکرمت کس راہ سے حاصل ہوئی۔ من لم یشکر الناس لم یشکر الله کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔

شاد باش و شاد زی اے سرزمین دیوبند
ہند میں تو نے کیا اسلام کا جھنڈا بلند

بعد فراغت......معاش کی تلاش میں

شعبان ۱۳۳۳ھ میں مولانا گیلانی نے دارالعلوم دیوبند میں دورہ حدیث کا سالانہ امتحان دیا اور اس میں نمایاں کامیابی حاصل کی، طالب العلمی کا زمانہ جیسا کچھ خوش گوار اور بے فکری کا ہوتا ہے ظاہر ہے بچپن سے فراغت تک ایک دائرہ بنا ہوتا ہے، طالب علم اس کے اندر چکر کاٹتا رہتا ہے۔ اگر علمی مناسبت حاصل ہوتی ہے تو تھوڑی بہت فکر پڑھنے اور مطالعہ کی ہوتی ہے...... ورنہ اس کی فکر یا گھر والے کرتے ہیں یا پھر مدرسہ کے ذمہ دار، ذہنی کشمکش سے واسطہ عموماً نہیں پڑتا۔

بعد فراغت احساس ذمہ داری

لیکن جونہی فراغت کا وقت قریب آتا ہے خیالات ہجوم در ہجوم آنے شروع ہو جاتے ہیں کہ بعد فراغت کیا ہوگا؟ زندگی کس لائن پر گزاری جائے گی؟ وہ ذمہ داری محسوس کرنے لگتا ہے کہ گھر والے کہیں گے کہ کچھ کرو، خود اپنا احساس بھی یہی ہوتا ہے کہ کچھ کرنا چاہئے مگر کرے کیا؟ اور کیا لائن اختیار کرے؟ اہم سوال سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔

مدرسہ کی زندگی جب ختم ہو جاتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان ایک ایسے چوراہے پر کھڑا ہے جہاں سے ہر طرف راستے جاتے ہیں مگر تفصیل کسی کی معلوم نہیں ہے کہ وہاں منزل پر پہنچ کر کیا کرنا ہوگا اور یہ کہ خود اس راستہ کی منزل کیسی ہے کیونکہ دنیا کے سرد و گرم اور نشیب و فراز سے وہ غریب قطعاً ناواقف ہوتا ہے، مختلف کاموں کا خیال آتا ہے

اور جاتا ہے مگر دل کسی پر نہیں جمتا ہے۔

ایسے وقت میں اگر کوئی استاد گھر کا مربی یا کوئی مہربان ہاتھ پکڑ کر ایک راستہ پر لگا دیتا ہے تو وہ بہت ساری مصیبتوں سے بچ جاتا ہے اور جس راہ پر لگا دیا جاتا ہے چلتا رہتا ہے لیکن اگر خود اپنی رائے پر اس کو چھوڑ دیا جاتا ہے تو اس کی ذہنی کشمکش کا حال نہ پوچھئے کیا ہوتا ہے اور کن مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

ذریعہ معاش کی فکر

مولانا گیلانی کی طالب العلمی جب ختم ہو چکی تو وہ بھی اس فکر میں پڑ گئے کہ کون سی راہ اختیار کی جائے اور مستقبل کے لئے ذریعہ معاش کیا ہو؟ ساتھ یہ بھی پیش نظر تھا کہ جو کچھ پڑھا ہے بس اسی دائرہ میں کچھ کام کرنے کی صلاحیت ہے اس کے سوا کسی اور کام کا قطعاً نہیں ہوں' خود آپ نے لکھا ہے:

''معاوضہ جس کام کا دنیا میں مل سکتا ہے ایسے کام کی صلاحیت نہیں۔''

(رسالہ دار العلوم۔ رجب ۱۳۷۴ھ)

آپ پڑھ چکے ہیں کہ ابتدائی تعلیم کے بعد مولاناؒ کی پہلی منزل ٹونک قرار پائی تھی' سات آٹھ سال وہاں طالب العلمی کے نام پر گزرے تھے اور وعظ و تقریر کی راہ سے کچھ ماننے والے بھی پیدا ہو گئے تھے' دیوبند صرف ایک سال رہنا ہوا تھا۔ جاننے اور ماننے والوں کا کچھ اندازہ نہیں تھا' تیسری جگہ اپنا وطن تھا جو ایک مختصر آبادی کا گاؤں تھا' جہاں کاشت کاری کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں ہوتا تھا۔

ٹونک کا سفر

اس لئے مولانا گیلانی نے سمجھا اور درست سمجھا کہ ان کے لئے اگر کوئی صورت نکل سکتی ہے تو وہ ٹونک میں ہی اور ان کے لئے سب سے مناسب جگہ وہی ہے۔ پھر وہاں ابھی ان کے اساتذہ زندہ تھے' دوسرے جاننے والے بھی تھے اور ساتھ ہی وہ مسلمانی ریاست بھی تھی' جہاں ریاست کا سکہ چلتا تھا گو وہ بہت مختصر علاقہ تھا۔

پہلی ملازمت پانچ روپے ماہوار پر

چنانچہ گھر سے نکل کر سیدھے ٹونک پہنچے۔ اساتذہ کرام سے ملے اور بتایا کہ اب ان کو کسی کام پر لگایا جائے جو آپ کے مستقبل کو روشنی بخش سکے' اتفاق سے اس وقت مدرسہ خلیلیہ ٹونک میں تدریس کی کوئی جگہ خالی نہیں تھی اس لئے وہاں کے لوگوں نے سر دست مولانا کو کتب خانہ میں رکھ دیا کہ وہ فہرست سازی کی خدمت انجام دیں۔ یہ وہی مولانا گیلانی ہیں جو اپنی طالب العلمی میں اساتذہ کرام کے نور نظر تھے' ساتھیوں میں ممتاز تھے اور پڑھنے لکھنے میں کافی محنت کرتے تھے اور ذکی و با استعداد شمار ہوتے تھے۔ یہ بھی کہا گیا کہ پھر جونہی مدرسہ میں جگہ نکلے گی تم کو لے لیا جائے گا۔ حق المحنت کتب خانہ سے صرف پانچ روپے طے پایا اور وہ بھی نواب شاہی سکہ سے' گویا انگریزی روپے سے پونے چار روپے۔

Marfat.com

پانچ سے بیس ماہوار

مرتا کیا نہ کرتا اس مجبوری میں اسی کو غنیمت جانا اور یہ خدمت قبول کرلی اور فہرست سازی کا کام کرنے لگے۔ دو ماہ بعد مدرسہ میں ایک مزید مدرس کی ضرورت ہوئی اور ارباب مدرسہ نے اس جگہ پر مولانا گیلانی کا تقرر کردیا' استعداد پر سبھی کو پہلے ہی سے اعتماد تھا' مشاہرہ مدرسہ سے پندرہ روپے طے کیا گیا' اس طرح مدرسہ سے ماہانہ بیس روپے ملنے لگے جس کو مولانا نے شروع میں اپنے لئے غنیمت جانا' پانچ دس روپے کا ایک ٹیوشن کرلیا' نواب صاحب کے توشک خانے کے داروغہ میرٹھ کے رہنے والے سید محمد یعقوب صاحب کے بچہ محمد یوسف نامی کو ابتدائی اردو وغیرہ پڑھانا ہوتا تھا۔

ترقی کی فکر

اس زمانہ میں پچیس تیس روپے ماہانہ آمدنی مولوی کے لئے کم نہیں تھی' عام طور پر چھوٹے مدارس میں علماء کی یہی تنخواہ ہوتی تھی اور اتنے میں ایک مولوی اوسط طریقہ پر بآسانی زندگی گزار لیا کرتا تھا مگر بقول مولانا گیلانی۔

"اور یہ ساری منزلیں تین چار مہینے میں طے ہوئیں' دنیا طلبی کے امکانات کے اس متوقع تجربے نے وساوس پیدا کرنے شروع کئے۔" (رسالہ دارالعلوم۔ رجب ۱۳۷۴ھ' ص ۱۹)

مولانا ذہین تھے' آپ کو اپنی استعداد پر بھروسہ بھی تھا اور جوش جوانی کا جنون بھی' سوچا ہوگا ذرا چل پھر کر اور تجربہ کیا جائے کہ مولوی کی سطح سے کوئی اونچی یا ممتاز جگہ مل سکے اور مستقبل ذرا اطمینان بخش ہو' یہ مولانا کے بلند حوصلہ ہونے کی بات تھی اور ایک انسان کو ایسا سوچنا چاہیے بھی تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی ہے

ایک ریاست سے دوسری ریاست میں

چونکہ آپ کی زندگی کا اس وقت بڑا حصہ مسلمانی خودسر ریاست میں گزارا تھا اس لئے برطانوی قلمرو کو اپنے لئے مفید نہیں سمجھتے تھے اور سوچتے ہوں گے انگریزی حکومت میں جب علماء کے لئے کسی محکمہ میں کوئی جگہ سرے سے نہیں رکھی گئی ہے تو توقع کس چیز کی رکھی جائے۔ ہائی سکول میں مولوی رکھے جاتے تھے مگر اس کا مشاہرہ بھی تیس پینتیس روپے ماہانہ سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔

حیدرآباد کا سفر

اس لئے مولانا کے ذہن میں ٹونک کے بعد حیدرآباد ریاست کا نام آیا' جہاں میر عثمان علی خاں کی حکومت تھی اور وہ بھی آزاد ریاست تھی' اور ٹونک سے بہت بڑی' وہاں علماء اور علم نوازی دونوں تھی' اس خیال نے رفتہ رفتہ فیصلہ کی صورت اختیار کرلی اور طے کرلیا کہ ٹونک سے رخصت ہوکر حیدرآباد پہنچنا ہے اور وہاں قسمت آزمائی کرنی ہے لیکن

Marfat.com

بقول مولانا:

"یہ جانتا تھا کہ بخوشی ٹونک سے مجھے لوگ جانے نہ دیں گے۔ آخر اپنے ایک مخلص دوست کو دل کے فیصلے سے آگاہ کر کے ان سے یہ چاہا کہ ٹونک جہاں سے سٹیشن دس پندرہ کوس کے فاصلہ پر تھا' وہاں تک پہنچانے کے لئے کسی ایسی سواری کا بندوبست فرما دیں کہ رات کی تاریکی میں ٹونک سے نکل جاؤں' انہوں نے بندوبست کر دیا۔" (ایضاً)

اب فکر ایک ساتھی کی ہوئی کہ تنہا اس قدر لمبا سفر مناسب نہ ہوگا' کوئی نہ کوئی ساتھی بھی ہو' ایک طالب علم جس کا نام انوار الہ آبادی تھا' مولانا سے وہ پڑھتا بھی تھا اور مولانا کے ہی ساتھ رہتا بھی تھا' گویا شاگرد اور خادم دونوں تھا' ساتھ ہی مخلص' راست باز اور وفادار بھی تھا۔ اس کو رفیق سفر بنایا' وہ غریب مولانا کی محبت میں تیار ہو گیا' مولانا لکھتے ہیں:

"شبا شب ٹونک سے روانہ ہو کر سٹیشن پہنچا اور سیدھے حیدر آباد کا ٹکٹ لے' راہی دکن ہوا۔ حیدر آباد کے سٹیشن "نام پلی" پہنچا' وہ دن آج تک یاد ہے' میرے رفیق نے پوچھا کہ شہر میں کہاں ٹھہرنے کا ارادہ ہے' حیدر آباد میرے لئے قطعاً اجنبی شہر تھا کہاں جاؤں؟ چند لمحے بعد خیال آیا کہ یہاں مشہور عربی مدرسہ نظامیہ نامی ایسی جگہ ہے جہاں مولویت کو پاؤں ٹیکنے کی شاید گنجائش مل جائے۔" (ایضاً)

مدرسہ نظامیہ میں

مولانا نے جھٹکہ نامی سواری کی اور دونوں استاد شاگرد مدرسہ نظامیہ پہنچ گئے' دروازے پر سامان اتارا۔ اندر سے کوئی طالب علم نکلا۔ علیک سلیک کے بعد وہ اپنے کمرہ میں ان دونوں اجنبی کو لے گیا اور طالب علم ہی سمجھ کر لے گیا' پھر تھوڑی دیر میں دوسرے طلبہ بھی آ آ کر ملنے لگے' تین چار دنوں میں طلبہ میں گھل مل گئے' اس طالب العلم نے میزبانی کا بھی شرف حاصل کیا۔ اتفاق سے ٹونک کے پڑھے ہوئے ایک ساتھی مولوی شاہ سید مقبول احمد صاحب مل گئے جو صوبہ مہاراشٹر کے رہنے والے تھے اور پیر خاندان سے تعلق رکھتے تھے' پیری مریدی خاندانی پیشہ تھا' وہ بڑی بے تکلفی اور محبت سے ملے' ملنے جلنے کے بعد انہوں نے کہا کہ اچھا ہے میں تم کو حضرت مولانا انوار اللہ خاں سے ملاؤں گا' جو اس زمانہ میں امور مذہبی کے معین المہام (وزیر) تھے اور مدرسہ نظامیہ کے سرپرست بھی تھے۔

مولانا انوار اللہ سے ملاقات

مولانا انوار اللہ صاحب کی ڈیوڑھی (کوٹھی) مدرسہ کے قریب ہی محلہ شکر کوٹے میں تھی' ایک دن مقبول صاحب مولانا کو ساتھ کر کے ان کے مکان پر پہنچے تاکہ مولانا گیلانی کو وزیر امور مذہبی سے ملا دیں۔ کوٹھی شاندار' لمبی چوڑی تھی' اس احاطہ میں داخل ہوئے تو ایک دوسرے ملنے والے اجمیر درگاہ کے متولی مولوی نثار احمد نظر پڑے' وہ اس

Marfat.com

وقت وزیر صاحب کے یہاں مہمان تھے۔ وہ بھی آ کر مولانا گیلانی سے ملے اور آپ کے ساتھ مولانا انوار اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کا تعارف بہت ہی مخلصانہ اور وقیع انداز میں اور بہت ہی اچھے جملوں کے ساتھ کرایا' آپ کی تقریری اور علمی صلاحیتوں کا تذکرہ بھی کیا۔

تعارف کے بعد جب ذرا اطمینان ہوا تو وزیر صاحب نے مولانا گیلانی سے دریافت کیا کہ آپ کا قیام اس وقت کہاں ہے؟ بتایا کہ مدرسہ نظامیہ میں' اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ جب وہاں سے مل کر مولانا واپس ہوئے اور مدرسہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ سرپرست صاحب نے لکھ بھیجا ہے کہ ٹونک سے جو طالب العلم آئے ہیں انہیں مطبخ سے نمبر اول کا کھانا دیا جائے' تین چار دنوں تک مدرسہ ہی میں قیام رہا اور برابر وزیر امور مذہبی کے یہاں آمدورفت جاری رہی۔ یہ ایک درویش صفت عالم دین تھے' اور وزیر ہونے کے باوجود اہل علم کے بہت قدر دان تھے۔

مولانا انوار اللہ کے یہاں

کچھ دنوں کے بعد جب راہ و رسم بڑھی تو وزیر صاحب نے فرمایا کہ مدرسہ میں آپ کو تکلیف ہوتی ہوگی' میرے مکان میں بہت گنجائش ہے یہاں آ جائیں' ان شاء اللہ کوئی تکلیف نہ ہوگی' مولانا گیلانی مسافر تو تھے ہی اور کچھ دنوں حیدرآباد میں قیام کرنا تھا' لہٰذا ان کی یہ فرمائش غنیمت معلوم ہوئی اور غور وفکر کے بعد مدرسہ سے وزیر مذہبی امور مولانا انوار اللہ صاحب کی کوٹھی میں آ گئے' انہیں ایک کمرہ دے دیا گیا' خدام کو ہدایت کر دی گئی کہ کوئی تکلیف نہ ہونے پائے' استاد شاگرد دونوں یہیں رہنے لگے۔

''فتوحات مکیہ'' کے درس میں شرکت

مولانا انوار اللہ خان ایک ذی علم' ذی استعداد اور وسیع النظر عالم دین تھے' رات میں شیخ اکبر ابن عربیؒ کی مشہور کتاب ''فتوحات مکیہ'' کا علماء کو درس دیا کرتے تھے' حیدرآباد میں رہنے والے بڑے بڑے جبہ ودستار والے علماء اس درس میں شریک ہوا کرتے تھے اور مولانا گیلانی بھی اس درس میں شریک ہونے لگے اور درس دینے والے ان سوالات کے جوابات بھی دیا کرتے تھے۔

مولانا گیلانی کی تقریر

کچھ دنوں کے بعد وزیر صاحب کو مولانا گیلانی کے ذوق تصوف اور استعداد کا اندازہ ہوا تو ایک دن مولانا سے فرمانے لگے' میری روز روز سنتے ہو لیکن کبھی اپنی بھی سناؤ گے' مولانا نے عذر پیش کیا کہ حضرت کے سامنے میری زبان کیسے کھلے گی' پھر درس میں شریک ہونے والے سارے پرانے قسم کے ہی علماء ہوتے ہیں' ان کے موجود ہوتے میری حیثیت کیا ہے؟ وزیر صاحب کہتے رہے اور مولانا ٹالتے رہے' جب کئی ہفتے اسی طرح گزر گئے اور دیکھا کہ وزیر صاحب مانتے ہی نہیں' ان کا اصرار اپنی جگہ جاری ہے' تو مولانا گیلانی لکھتے ہیں کہ ہمت کر کے تقریر کا میں نے ارادہ کر لیا لیکن خود لکھتے ہیں کہ

Marfat.com

''اب یاد نہیں کہ کس موضوع پر تقریر کی گئی' لیکن اتنا خیال ہے کہ مولانا انوار اللہ خان مرحوم نے اس زمانہ میں چند خاص کتابیں لکھی تھیں' جن میں مقاصد الاسلام' کتاب العقل' حقیقۃ الفقہ' افادۃ الافہام خاص طور پر پُر مغز کتابیں ہیں' میرے مطالعے سے یہ کتابیں گزر چکی تھیں' بیچ بیچ میں ان کتابوں کے خاص خاص اہم مضامین کا تذکرہ اس تقریر میں کچھ اس طریقہ سے کیا جا رہا تھا جس سے مولانا (انوار اللہ) اس لئے متاثر ہو رہے تھے کہ ان کی محنت سے استفادہ کرنے والے بھی پائے جاتے ہیں' تقریر جب ختم ہوئی تو مولانا کی شفقت و مہربانی اس غریب مسافر (مناظر احسن) کے ساتھ قدرتاً بڑھ گئی' دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ حلقہ درس میں شریک ہونے والوں سے شناسائی کا موقع ملا۔'' (ایضاً۔ص ۲۱)

ملا مراد کابلی کی کرم فرمائی

انہی میں ایک ملا مراد نامی بزرگ تھے جو کتابوں کے خرید و فروخت کا کاروبار کرتے تھے' یہ کابل کے رہنے والے تھے' عرصہ سے حیدر آباد میں ہی رہ گئے تھے' ان کی توجہ مولانا گیلانی کی طرف بہت بڑھ گئی' انہوں نے دوسرے دن کے لئے مولانا کو اپنے یہاں کھانے پر مدعو کیا اور خود آ کر مولانا کو ساتھ اپنے یہاں لے گئے' ان کی شہر حیدر آباد میں بہت سارے اہل علم سے شناسائی تھی اور ہر طبقہ سے ان کا ملنا جلنا تھا' مولانا گیلانی سے کہنے لگے میں آپ کو یہاں کے اہل علم طبقہ سے ملاؤں گا۔ مولانا اب ملا مراد سے بھی ملنے جلنے لگے۔ اس طرح ایک اور قدرداں کا اضافہ ہوا جو ماشاء اللہ مخلص بھی تھے اور اہل علم کے قدرداں بھی۔

مہاراجہ کشن پرشاد

ملا مراد کابلی نے سب سے پہلے مولانا کو مہاراجہ کشن پرشاد سے ملانے کا پروگرام بنایا' مہاراجہ علم دوست' علماء نواز اور علمی گفتگو کا بڑا عمدہ ذوق رکھتے تھے' تصوف کا بھی بہت ہی ستھرا ذوق تھا۔ مسئلہ وحدت الوجود سے خاصی دلچسپی رکھتے تھے اور حیدر آباد کے بڑے رؤسا میں سے تھے' ایک دن ملا مراد کابلی کے ساتھ مہاراجہ کشن پرشاد کی مجلس میں حاضری ہوئی' ملا صاحب نے فارسی زبان میں مولانا کا تعارف وقیع انداز میں کرایا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا:

''اس شخص کی کم عمری پر نہ جایئے۔ ہندوستان سے آنے والوں میں اس قسم کی تقریر کرنے والا میری نظر سے کوئی نہیں گزرا۔'' (رسالہ دار العلوم۔ ''یاد ایام عمر گزشتہ'' ص ا)

مہاراجہ کی توجہ

مہاراجہ ایسے ذی علم کی تلاش میں ہی رہتے تھے' مل کر خوش ہوئے اور بقول مولانا گیلانی:

''مہاراجہ بہادر اچھی طرح ملے' باتیں ہونے لگیں۔ ان کو وحدت الوجود کے مسئلہ سے خاصی

Marfat.com

دلچسپی تھی، چھیڑ کر اسی مسئلہ پر آ گئے۔ جب اس پر بولنے لگا تو دیکھا مہاراجہ چند ہی فقروں کے بعد کچھ سنبھل سے گئے اور میری گفتگو کو بغور سننے لگے...... کہنے لگے، جس طریقہ سے تم نے اس مسئلہ کو میرے سامنے بیان کیا ہے کیا چند مولوی جو کچھ وہابی خیال کے ہیں ان کو جمع کر کے سننا چاہوں تو ان کے سامنے تقریر کرو گے؟'' (ایضاً۔ص ۲۱)

علماء کے سامنے تقریر

مولانا نے فرمایا، کوئی مضائقہ نہیں جو کچھ میں نے سمجھا ہے اس کو انہیں سمجھانے کی سعی کروں گا، چنانچہ اس کے لئے تاریخ طے ہوگئی کہ مہاراجہ کی کوٹھی میں ان مولویوں کو تاریخ مقررہ پر جمع کیا جائے، ان کی کوٹھی ''شاہ علی بنڈے'' نامی محلہ میں تھی، چنانچہ تاریخ مقررہ پر یہ اجتماع ہوا، مولانا لکھتے ہیں:

''مہاراجہ نے حکم دیا میں کھڑا ہوگیا، جو کچھ عرض کرنا چاہا تھا ان علماء کے سامنے بھی اسی طرح بیان کرتا رہا۔ سبھوں نے تعریف کی۔'' (ایضاً)

اب اس کے بعد مہاراجہ مولانا کا اور گرویدہ ہو گیا، ایک دن کہنے لگا کہ اس میں کیا مضائقہ ہے کہ آپ مولانا انوار اللہ صاحب کے کافی دنوں مہمان رہ چکے، اب کچھ دنوں میرے مہمان بن جائیں، مولانا نے اس پر معذرت کی اور اسے اپنے لئے مناسب نہیں سمجھا۔ اخیر میں مہاراجہ صاحب کہنے لگے کہ آتے جاتے رہیں، مولانا نے کہا اس میں حرج نہیں، ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔

مولانا حسبِ وعدہ مہاراجہ کے یہاں بھی آتے جاتے رہے اور علمی مسائل پر گفتگو بھی ہوتی رہی، مہاراجہ اپنی تصنیفات کی ایک ایک کاپی مولانا کو دیتے رہے اور اس کے متعلق رائے بھی معلوم کرتے رہے۔

حیدر آباد کی دو ممتاز شخصیتیں

حیدر آباد میں دو شخصیتیں بہت ممتاز شمار ہوتی تھیں۔ مسلمانوں میں نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خان صاحب مرحوم اور ہندوؤں میں مہاراجہ کشن پرشاد، ایک امور مذہبی کے مدار المہام تھے اور دوسرے وزیر اعظم حیدر آباد کے پیش کار جن کی ذاتی آمدنی دس گیارہ لاکھ سالانہ تھی۔ پانچ ہزار ماہوار تنخواہ پشتینی خدمت کی تھی یعنی کام کریں یا نہ کریں خزانہ عامرہ سے پانچ ہزار کی رقم ماہانہ ملتی رہے گی۔

ذریعہ معاش کا جائزہ

مولانا کو اب خیال آیا کہ جس مقصد سے حیدر آباد آنا ہوا تھا، اس پر توجہ دی جائے۔ مولانا کے الفاظ ہیں:

''اس کے بعد میرا وہی وسوسہ جس نے ٹونک میں فیصلہ کا قالب اختیار کیا تھا، سامنے آیا۔ معاشی

Marfat.com

ذرائع کے امکانات کا جائزہ لینے لگا لیکن خلاف توقع کافی مایوسیوں کا تجربہ ہونے لگا' حیدرآباد اس زمانہ میں وہ حیدرآباد نہ تھا جس میں جامعہ عثمانیہ جیسا طویل و عریض تعلیمی ادارہ قائم ہوا' تعلیمات کے سکولوں کی تعداد بھی حد سے زیادہ ناکافی تھی' ان کی تنخواہیں بھی چالیس پچاس روپے سے زیادہ عموماً نہیں ہوا کرتی تھیں' مدرسہ نظامیہ جو میرے لئے سب سے زیادہ مناسب ہوسکتا تھا وہاں بھی غریب مولوی کو تقریباً معاشی لحاظ سے اسی حال میں پا رہا تھا جس میں ہندوستان کے عربی مدارس کے معلمین مبتلا تھے' البتہ ایک دارالعلوم کالج تھا جس میں تنخواہوں کا معیار عام عربی مدارس سے قدرے بلند تھا لیکن جہاں تک اندازہ ہوا اس کی حالت بھی ''یک انار صد بیمار'' سے زیادہ نہ تھی...... بعض بہی خواہوں نے مشورہ دیا کہ حکومت حیدرآباد کے کسی انتظامی محکمہ میں داخل ہونے کی کوشش کیوں نہیں کرتے' انتہا ان مشوروں کی یہ تھی کہ ایک صاحب نے محکمہ پولیس کی طرف بھی توجہ دلائی' اس وقت تک حیدرآباد میں وکالت کے لئے انگریزی یونیورسٹیوں کے سند یافتہ ہونے کی ضرورت نہ تھی۔ ایک راہ یہ بھی تھی' دوسری راہوں کے ساتھ یہ بھی پیش ہوتی رہی۔'' (ایضاً۔ ص ۲۲)

بعدِ جائزہ دل کا حال

اس جائزہ اور مشوروں کے بعد مولانا کے ذہن و فکر کو چوٹ لگی۔ وہ تو آئے تھے کہ کام تو درس و تدریس کا ہی ہو مگر مشاہرہ ایسا ہو کہ آرام و عافیت کے ساتھ زندگی بسر ہو سکے' یا خاندان میں جیسے انگریزی پڑھنے والے ذرا صاف ستھرے اور نوکر چاکر کے ساتھ رہتے ہیں' ان کے لئے بھی کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے تاکہ وہ اپنے ہم چشموں میں حقیر نہ شمار ہوں۔

مگر یہاں تو مسئلہ ہی الگ سامنے آیا کہ جب تک لائن نہیں بدلتی بڑی تنخواہ حیدرآباد میں بھی گو مسلمان ریاست ہے' نہیں مل سکتی ہے۔ مولانا گیلانی اپنے مزاج کے اعتبار سے دین اور علم دین کی خدمت سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں تھے کیونکہ آخر بچپن سے اس وقت تک جس علم کے حاصل کرنے میں عمر کھپائی تھی اس کا حاصل کیا ہوا اور کیا حصہ میں آیا؟

پھر ذہنی کشمکش

اس تجربہ کے بعد حیدرآباد کے قیام کے فیصلہ کو بدلنے کا ارادہ ہونے لگا' یہاں پہنچ کر مولانا پھر ذہنی کشمکش کے شکار ہو گئے اور بڑی الجھن میں پھنس گئے' مولانا نے اپنے اس ارادہ کا تذکرہ ایک دن کسی موقع سے مہاراجہ کے سامنے بھی کیا' مولانا لکھتے ہیں:

Marfat.com

''یہ سننے کے ساتھ ہی کہ میں حیدرآباد سے جانا چاہتا ہوں' دیکھا کہ مہاراجہ نے عجیب طرح سے مجھے دیکھا' واپس ہونے کا فیصلہ شاید ان کے لئے کچھ عجیب تھا۔ مجھ سے کہنے لگے آخر کیوں کیا بات ہے؟ اور اس کے ساتھ یہ بھی کہنے لگے کہ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ مولانا فضیلت جنگ کے یہاں سے اٹھ کر ہمارے یہاں چلے آؤ' پھر اصرار کرنے لگے کہ میں تم کو جانے نہ دوں گا' گردوپیش کے مصاحبوں سے کہنے لگے ان کے رہنے سہنے کا نظم فلاں مکان میں کردیا جائے۔ آخر میں یہاں تک بول اٹھے مولوی صاحب آپ اندازہ نہیں کررہے ہیں کہ کون یہاں پر آپ کو اپنے یہاں ٹھہرنے پر مجبور کررہا ہے۔'' (رسالہ دارالعلوم۔ شعبان ۱۳۷۴ھ' ص ۳۳)

مگر مولانا برابر معذرت کرتے رہے' اخیر میں کہا کہ اپنے اساتذہ سے کچھ اور پڑھنا سیکھنا ہے جس کا نظم حیدرآباد میں نہیں ہوسکتا' اس پر مہاراجہ نے کہا۔

''حیدرآباد میں ارباب کمال کی کمی نہیں ہے' جس عالم سے جو کچھ پڑھنا چاہو گے میں اس کا بندوبست کردوں گا' سواری پر تم ان کے یہاں چلے جانا جو کچھ پڑھنا چاہتے ہو پڑھنا۔'' (ایضاً)

مہاراجہ کا ذہن

مصاحبوں سے مہاراجہ نے مخاطب ہوکر مسکراتے ہوئے کہا کہ مولوی صاحب پہلی مرتبہ وطن سے دور نکل آئے ہیں' ایسا معلوم ہوتا ہے ان کا جی گھبرا گیا ہے' مولانا یہ سب سنتے رہے' مہاراجہ نے جو حصہ اپنی حویلی کا مولانا کے لئے منتخب کیا تھا مولانا نے اس کو بھی چل پھر کر دیکھا' بڑے ٹھاٹھ کے سامان اور راحت و عافیت کی چیزیں فراہم تھیں' سواری کا بھی انتظام تھا۔ جس وقت جہاں جی چاہے بآسانی جا سکتے ہیں۔

عقل و دل کی جنگ

مہاراجہ کے یہاں سے اپنی قیام گاہ آکر مولانا سوچ میں پڑ گئے کیا کریں؟ خود لکھتے ہیں:

''مہاراجہ کی باتوں کو سوچنے لگا' کشمکش کا عجیب حال تھا۔ بے کسی کے اس عالم میں مہاراجہ جیسے آدمی کا مہربان ہوجانا جو کچھ وہ کرسکتے تھے میری فلاح و بہبود کے لئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس میں کمی نہ کریں گے......ایک طرف یہ ساری باتیں تھیں اور دوسری طرف خیال آتا کہ دین کی تعلیم میں عمر کا اتنا بڑا حصہ جو صرف ہوا سیدنا شیخ الہند اور حضرت الاستاذ الکشمیری کے حلقہ ہائے درس میں رسول اللہ ﷺ کی حدیثوں کے سننے اور پڑھنے کا آخرانجام میرے لئے کیا یہی تھا کہ ایک غیرمسلم امیر کی مصاحبت اور ندیمی میں اپنی زندگی گزاروں گا' یہ خیال سامنے آتا اور معلوم ہوتا دنیا مجھ پر تاریک ہوگئی' مہاراجہ کی سرپرستی میں کسی محکمہ میں اچھی ملازمت بھی مل سکتی

تھی' وکالت کا امتحان بھی دے سکتا تھا...... نفس حیلے حوالوں کے حربے کے ساتھ سامنے کھڑا ہوجاتا لیکن دل کہتا کہ پھر اس کا جواب کیا ہوگا' جب پوچھا جائے گا کہ کیا اسی لئے قرآن و حدیث کی تعلیم تجھے دی گئی تھی' مولانا انوار اللہ خان کی حویلی کے مغربی سمت کا وہ کمرہ اور اس کی زمین شہادت دے سکتی ہے کہ شاید رات بھر کروٹیں بدلتا رہا...... ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت مجھے اس راہ سے ہٹانا چاہتی ہے' قبول کرنے والے نے مجھے ٹھکرا دیا...... اس وقت ایک عجیب حال طاری تھا' انوار غریب آنکھوں میں آنسو بھر لاتا' مجھے روتا دیکھ کر وہ بھی روتا' میں کہتا انوار' کسی امیر کی گرمی بزم میں اپنی ساری صلاحیتوں کی حرارت جھونک دوں' کیا یہ زندگی کی کوئی قیمت ہوئی' اس سے کہیں بہتر تھا کہ میں کچھ نہ پڑھتا' کسی گاؤں میں ہل جوتتا' کسی سڑک پر بیٹھ کر جوتیاں گانٹھتا۔'' (ایضاً۔ص ۳۴)

ذہنی کشمکش کا خاتمہ

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا اس وقت جس دوراہے پر کھڑے تھے اور جس امتحان سے دوچار تھے کس قدر سخت تھا' پوری رات کس بے چینی' تڑپ اور ذہنی کشمکش میں گزری' واقعہ ہے سونا آگ کی بھٹی میں تپ کر ہی خالص ہوتا اور نکھرتا ہے' جب تک اس منزل سے نہیں گزرتا قلب میں اخلاص' دماغ میں صفائی و بلندی اور مزاج میں حمیت و غیرت ابھر کر نہیں آتی۔

مولانا لکھتے ہیں:

''صبح ہونے تک میری ذہنی کشمکش ختم ہوگئی' مولانا انوار اللہ خان کی خدمت میں حاضر ہو کر روانگی کی اجازت حاصل کرلی۔'' (ایضاً۔ص ۳۵)

پیچھے کی طرف واپسی

حیدر آباد جس دنیا کی طلب میں گئے تھے خود دل و دماغ نے اس کے خلاف فیصلہ کیا' دنیا مل رہی تھی' مہاراجہ خوشامد کر رہا تھا' تمام توقعات کی تکمیل کا ایما ہو رہا تھا مگر اس پر ذہن مطمئن نہ ہوسکا اور پھر اسی تاریک مستقبل کے جنگلوں میں واپسی کا عزم کرلیا جہاں سے نکل کر تابناک مستقبل کی تلاش میں حیدر آباد کی خاک چھانی تھی' اپنا خیال ہے یہ شیخ الہند کی کرامت تھی اور دوسرے اساتذہ کی توجہات کا اثر کہ دنیا کو لات مارنے پر آمادہ ہوگئے۔

مہاراجہ کی قدر افزائی

حیدر آباد سے جس دن واپسی ہونے والی تھی' مہاراجہ کشن پرشاد نے پہلوان سخن ثاقب بدایونی کی معرفت

اخراجات سفر کے لئے ایک معقول رقم مولانا گیلانی کی خدمت میں بھجوائی اور یہ پیغام بھی بھیجا۔

''مہاراجہ نے سلام کہا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے' مولوی صاحب سے کہہ دیجیو کہ ان کا سفر خرچ ہے' نوعمری کی وجہ سے وہ گھبرا گئے ہیں۔ کہہ دیجیو گھر پہنچنے کے بعد دل و دماغ ٹھکانے ہو جائے تو بغیر کسی مخمصہ کے وہ میرے پاس چلے آئیں۔'' (ایضاً)

مالی تنگی کے باوجود مہاراجہ کی رقم لینے سے انکار کر دیا' ثاقب نے سمجھایا کہ سفر میں آپ نکل رہے ہیں' پتہ نہیں کیا صورت پیش آئے۔ یہ رقم آپ کی طلب اور خواہش کے بغیر آئی ہے' لینے میں تامل نہ ہونا چاہیے' مہاراجہ سے جو تعلقات رہے ہیں' اس کا بھی تقاضا ہے کہ ان کی دل شکنی نہ ہو' بہر حال اس تجربہ کار کی باتوں میں آ کر وہ رقم قبول کر لی اور شکریہ کا خط لکھ کر ثاقب صاحب کے حوالے کیا۔

حیدر آباد سے واپسی

وہی حیدر آباد جہاں ٹونک کی مدرسی چھوڑ کر آئے تھے' آج وہاں سے واپسی ہو رہی ہے۔ اب غالباً ۱۳۳۴ھ شروع ہو چکا تھا' بلکہ کچھ مہینے بھی گزر گئے تھے۔

حیدر آباد سٹیشن پہنچ کر سوال پیدا ہوا' کہاں کا ٹکٹ لیا جائے' ذہن میں مولوی شاہ مقبول احمد کا نام آیا جن سے حیدر آباد آنے کے وقت ملاقات ہو چکی تھی' وہ منماڑ کے پاس ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ مولانا نے اپنے شاگرد انوار سے کہا کہ منماڑ کا ٹکٹ لے لو' آگے دیکھیں گے۔

منماڑ میں نزول

اتفاق دیکھئے مولانا کی ٹرین جب منماڑ سٹیشن پہنچی اور پلیٹ فارم پر اترے تو دفعتاً مولوی مقبول احمد نظر آئے' قدرت نے انہیں مولانا کے استقبال کے لئے پہلے سے غیر شعوری طور پر بھیج دیا تھا' دونوں ساتھیوں میں مصافحہ معانقہ ہوا' پوچھنے اور گفتگو کرنے سے معلوم ہوا کہ مولوی مقبول احمد صاحب اپنے مریدوں میں جا رہے ہیں اور اسی ارادے سے گھر سے نکل کر یہاں آئے ہیں۔

مولوی شاہ مقبول احمد صاحب نے عرض کیا کہ مناظر احسن صاحب! بڑا اچھا ہوا آپ میرے ساتھ میرے حلقے میں کچھ دنوں کے لئے تشریف لے چلیں' تفریح بھی ہو گی اور آپ کی تقریری صلاحیتوں سے مجھے فائدہ بھی ہو گا اور اس فائدے میں ان شاء اللہ آپ کو یاد رکھا جائے گا۔ ہزار دو ہزار رقم کی امید بھی دلائی۔

ساتھی کے مرید آباد میں

دنیا چھوڑ کر ہی حیدر آباد سے بھاگے تھے' اس لئے اس کا لالچ تو کیا رام کرتا' ہاں ساتھی کا خیال اور ساتھ ہی تفریح کے ارادہ نے مولانا کو تیار کر دیا کہ کچھ وقت نکل جائے گا' ممکن ہے غم ہلکا ہو جائے' مولانا کے خادم و شاگرد مولوی

Marfat.com

انوار احمد بھی ساتھ تھے۔

مولانا لکھتے ہیں:

''اپنی پوری مولویانہ زندگی میں پندرہ بیس دن کا یہ سفر اور اس کے تجربات و مشاہدات میرے لئے عجیب تھے۔ گجرات کے علاقہ میں سید مقبول کے آبائی مریدوں کی بستیاں تھیں' نواپورہ اور بردولی ان دو بستیوں کے نام یاد رہ گئے۔'' (رمضان ۱۳۷۴ھ' ص ۳۸)

یہ سفر بڑا دلچسپ رہا۔ بڑی آؤ بھگت رہی' معتقدوں کا ہجوم بھی تھا اور پیر صاحب کے نذرانے بھی بہت اچھے رہے۔ مریدین وعظ کے لئے بڑا اہتمام کرتے' شامیانہ لگاتے' پھولوں سے اس کو سجایا جاتا' بردولی کے بعد راندیر بھی جانا ہوا۔ وہاں بھی ان کے مریدوں کا اچھا خاصا حلقہ تھا' مختصر یہ کہ احترام و اکرام' خوش آمدید کہنے والوں اور استقبال کرنے والوں کی کمی نہیں تھی' گرما گرم مولانا کی تقریریں بھی ہر ہر آبادی میں خوب خوب ہوتیں۔

غیرت وحمیت کا بخار

پندرہ بیس دنوں تک بڑے اطمینان وسکون کے ساتھ پیر مقبول صاحب کے مریدوں میں چکر لگاتے رہے کہ دفعتاً پھر جی گھبرا گیا اور وہی دنیا گرفتی کا خیال آیا کہ دنیا نے اب تک نہیں چھوڑا بلکہ وہ جکڑ لینے پر آمادہ ہے۔

خود لکھتے ہیں:

''غیرت وحمیت کا بخار سا معلوم ہوا کہ مجھ پر چڑھا چلا جاتا ہے' اپنے آپ سے دل میں نفرت پیدا ہونے لگی' یہ اور اسی قسم کے خیالات کا ہجوم اس شدت کے ساتھ ہوا کہ اپنے گشتی سفر کو قطعی طور پر ختم کر دینے کا ارادہ کر لیا گیا' مولوی مقبول احمد صاحب کہیں باہر گئے ہوئے تھے' رات کا وقت تھا' شدت کے ساتھ ان کا انتظار کرتا رہا' جونہی وہ کمرہ میں داخل ہوئے بغیر کسی تمہید کے میں نے ان کو مطلع کیا کہ بھائی! کل میں یہاں سے چلا جاؤں گا' اب آپ جانیں اور آپ کا کام' ان کا چہرہ فق ہو گیا...... میرے اصرار کو دیکھ کر وہ خاموش ہو گئے...... انہوں نے اپنی رخصتانہ آمدنی سے کچھ دینا بھی چاہا لیکن اس کی ضرورت نہیں تھی' مہاراجہ نے جو کچھ دے دیا تھا وہی کافی تھا' اور اپنی زندگی کی یہ دوسری لغزش گاہ تھی جس پر پھسلنے کے بعد توفیق الٰہی نے ہاتھ پکڑ لیا۔'' (ایضاً۔ ص ۲۹)

مادر علمی کی کشش

وہاں سے روانہ ہو کر مولانا احمد آباد ایک دن کے لئے اترے تاکہ سلاطین کی یادگاریں چل پھر کر دیکھ سکیں' جن کے دیکھنے کا مدت سے شوق تھا۔ وہاں مسجدوں' مقبروں کو دیکھ کر واپسی اس طرح ہوئی کہ بقول مولانا:

''اس وقت تک اپنے مستقبل کی تلاش میں خود نکلا تھا لیکن اب اپنی یہ واپسی اس فیصلہ کے ساتھ تھی کہ مستقبل ہی میرے سامنے جس شکل میں بھی آئے گا اسی کے ساتھ اپنے کو راضی...... رکھنے کی کوشش کروں گا اور ان ربی سیھدین کہتا ہوا احمد آباد سے ریل پر سوار ہو کر چلا...... احمد آباد سے اِدھر اُدھر رُخ کئے بغیر یکسوئی کے ساتھ میں سیدھا دیوبند کی طرف رواں ہوا' دیوبند میں کن حالات سے سابقہ ہوگا؟ ان سے قطعاً خالی الذہن ہو کر دارالعلوم کی طرف اس لئے بھاگا چلا آ رہا تھا کہ وہ دیوبند کا دارالعلوم ہے جہاں اپنی متعلمی کے چند دن گزارے ہیں...... میں نے حیدرآباد کو دل سے نکال دیا تھا' سرمایہ دار تاجروں کے اس علاقہ کو بھلا چکا تھا جہاں تقریباً پندرہ دن تک ایک خاص قسم کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوا تھا' اب دل میں بھی صرف دیوبند تھا اور دماغ میں بھی دیوبند تھا۔'' (ایضاً۔ص ۴۰)

دارالعلوم دیوبند میں

آپ کو یاد ہوگا دورہ حدیث کے سال شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن عثمانی نے مولانا گیلانی سے ان کے وساوس کا تذکرہ سن کر فرمایا تھا جاؤ اب کبھی شکوک وشبہات نہ ہوں گے اور کچھ پیشین گوئی بھی فرمائی تھی' مولانا کو دراصل اپنے استادِ محترم کی دعاؤں ہی نے ٹونک' حیدرآباد اور گجرات کہیں چین لینے نہیں دیا' دنیا آئی اور ساز وسامان کے ساتھ آئی مگر غیبی مدد ہوتی رہی' اور سب سے متنفر ہو کر استاد کے قدموں میں کشاں کشاں آ رہے تھے اور اس مادر علمی کی گود بے تاب تھی جہاں درس حدیث میں کایا پلٹ ہوئی تھی ورنہ یہ واپسی کسی اور توقع پر نہیں تھی' مولانا نے مہاراجہ حیدرآباد کا تذکرہ کرتے ہوئے بہت درست لکھا ہے:

''ان (مہاراجہ) کا دربار میری حرص وہوس کی بھوک بجھانے کے لئے کافی تھا' ان کی طرف سے ایسے اشارے بھی مل چکے تھے...... بغیر کسی تگ ودو اور جدوجہد کے میرے لئے کم از کم اس قسم کی زندگی کی گنجائش نکل چکی تھی' ایک طرف یہ حال تھا' دوسری طرف خیال آتا کہ حیدرآباد سے واپسی کے بعد برطانوی ہند کے اسی علاقہ میں بھٹکنا پڑے گا جہاں کے باشندوں کے لئے ملا کا وجود ناقابل برداشت بن چکا ہے' معاشی نقطہ نظر سے اندھیرا اور صرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا...... اس تاریک مستقبل کے جنگل میں گھس پڑنے کا ارادہ کر ہی لیا گیا۔'' (ایضاً۔ص ۴۰)

اسے دارالعلوم کی کرامت کے سوا کیا کہا جائے گا کہ اس کا ایک فرزند دنیاوی معاشی زندگی کی روشنی سے نکل کر تاریک مستقبل کی طرف کشاں کشاں بھاگا آ رہا ہے' کسی منزل پر اس کا جی نہیں لگتا' یا پھر مولانا گیلانی کے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ

Marfat.com

"لیکن عالم اسباب کے لحاظ سے جہاں تک میرا اپنا احساس ہے دارالعلوم دیوبند کے ماحول اور تھوڑی بہت اس کی تربیت کا یہ قدرتی اثر تھا کہ ان دونوں لغزش گاہوں پر پھسلتے پھسلتے سنبھل گیا......اور یکسوئی کے ساتھ سیدھا دیوبند کی طرف روانہ ہوا۔"

(رسالہ دارالعلوم۔ رمضان ۱۳۷۴ھ ص ۴۰)

حکیم منظر حسن بہاری مولانا کے رفیق قدیم اب تک دارالعلوم میں ہی تھے' فارغ نہیں ہوئے تھے۔ مولانا دارالعلوم پہنچ کر ان کے مہمان بن گئے۔

قدرت کی کرشمہ سازی

دیکھ رہے ہیں قدرت کی کرشمہ سازی' ایک مولوی اپنی عقل کی رہنمائی میں اتنا لمبا سفر کرتا ہے' اس کی قابلیت سے اچھے اچھے دولت مند متاثر ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ایسا عالم دین اس کی علمی مجلس کی رونق بن کر رہے۔ وہ اس کو تمام اخراجات اور سامان راحت بھی پیش کرتا ہے' جس کی اس کو ضرورت ہے' دنیا پوری دلربائی کے ساتھ اس کا ساتھ دینے پر دست بستہ کھڑی ہے مگر علم الٰہی کا شعور جونہی بیدار ہوتا ہے ماضی کی آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگتی ہے' قال اللہ اور قال الرسول کی صدائے بازگشت اس کو جھنجھوڑ ڈالتی ہے۔ دفعتاً اس کا دل' اس کی عقل کے خلاف آمادہ پیکار ہو جاتا ہے اور وہ اپنے کو مجبور پاتا ہے کہ خدمت دین مبین کی طرف بے سوچے سمجھے چل پڑے۔

رب العالمین کا منشا تھا کہ مولانا گیلانی دنیا کے بجائے دینی ماحول اختیار کریں اور اپنے کو تقدیر الٰہی کے حوالے کر دیں۔ بالآخر یہی ہوا' حیدرآباد کی راحت کو چھوڑ دیا اور مادر علمی دارالعلوم دیوبند کی بہت معمولی زندگی اختیار کرنے کے لئے دوڑ پڑے۔

پہلے سے نہ کوئی توقع ہے نہ کوئی پیشکش' موہوم مستقبل کے نام پر واپسی ہوئی ہے۔ ظاہراً یہ بے عقلی کی بات کہی جائے گی مگر مولانا کے سامنے جو مستقبل آیا جیسا کہ آپ پڑھیں گے' یقین کرنا ہوگا' من کان اللہ کان اللہ لہ۔ جو اپنے کو خدا کے سپرد کر دیتا ہے اللہ اس کا ولی وحامی بن جاتا ہے اور اس انسان کے مستقبل کو روشن کر دیتا ہے' دین و دنیا دونوں کی نعمتوں سے نوازتا ہے اور اسے خواص وعوام میں مقبول بنا دیتا ہے۔

تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں' مولانا گیلانی کے متعلق آپ پڑھیں گے کہ رب العالمین نے انہیں تدریجاً کس طرح بڑھایا' علم وعمل کے اعتبار سے بھی' شہرت و ناموری کے لحاظ سے بھی اور دنیاوی وجاہت کی راہ سے بھی دارالعلوم دیوبند ہی بظاہر ان کی ساری علمی عملی ترقیوں کا زینہ بنا' یہاں سے چل کر دوبارہ حیدرآباد پہنچے اور جامعہ عثمانیہ کے استاذ دینیات بنے اور پھر وہاں رہ کر دین اور دینی علوم کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔

Marfat.com

دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت مدرّس

مولانا گیلانی معاش کی فکر میں ٹونک گئے' مدرس ہوئے' پھر ترقی کے رجحانات نے ان کو حیدرآباد پہنچایا' تقدیر نے یاوری کی' معاشی ترقی کی راہیں سامنے آئیں' اس نے آواز دی' بلکہ خوشامد کی' مگر قدرت کو کچھ اور بنانا تھا۔ سب سے دست کش ہو کر دیوبند آ گئے۔ تفصیل آپ پڑھ چکے۔

یہاں آ کر نائب مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی خدمت میں حاضر ہوئے' مزاج پرسی کے بعد مولانا عثمانی نے پوچھا' اتنے عرصہ کہاں رہے۔ مولانا گیلانی نے اجمالاً وہ سارا قصہ سنایا جو آپ پہلے پڑھ چکے۔

دارالعلوم نے خوش آمدید کہا

مولانا عثمانی بڑے مردم شناس' مردم ساز اور علم نواز تھے۔ پہلے ہی ملاقات میں اپنے ادارہ کے اس ہونہار فرزند کو تسلی دی اور بقول مولانا گیلانی:

> ''اسی وقت اپنے اختیارِ خاص سے اتنا خود ہی کر دیا کہ طعام و قیام کے بار سے سبکدوش ہو گیا' یعنی دس روپے ماہ وار میرے نام جاری فرمانے کا حکم یہ فرماتے ہوئے انہوں نے دیا کہ سردست کچھ درس و تدریس کا کام مدرسہ میں کرو۔ اور ''القاسم'' اور ''الرشید'' مدرسہ سے نکلنے والے ان دونوں رسالوں میں لکھتے رہو' آگے میں کوئی مستقل نظم تمہارے لئے کروں گا۔'' (ایضاً)

ماہانہ دس روپے

یہ وہی مناظر احسن گیلانی ہیں جو ٹونک مدرسہ خلیلیہ میں مستقل مدرس ہو چکے تھے جہاں ان کو بیس تیس روپے ماہانہ مل رہے تھے۔ پھر وہاں کی مدرسی چھوڑ کر حیدرآباد گئے جہاں بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ دنیا بن سنور کر سامنے آئی مگر حیدرآباد سے مہاراجہ کشن پرشاد کی سی شخصیت کی پیشکش رد کر کے دیوبند آئے ہوئے ہیں اور بس دس روپے پر مگن اور خوش ہیں۔

مولانا گیلانی بغرض ملازمت دیوبند میں کب آئے کہیں کوئی وضاحت وصراحت نہیں ملتی' مگر ''القاسم'' دیوبند میں مولانا کے مضامین کا جائزہ لینے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ۱۳۳۴ھ کے ماہ ربیع الاول میں تشریف لائے' کیوں کہ پہلا مضمون ربیع الثانی ۱۳۳۴ھ میں ملتا ہے اور اس کے بعد مسلسل مضامین کا سلسلہ ذی الحجہ ۱۳۳۵ھ تک چلا جاتا ہے۔

یہ طے ہے کہ ۱۳۳۲ھ کے ماہ شعبان میں سالانہ امتحان ہوا۔ رمضان کی چھٹی میں وطن گئے' تین چار ماہ وطن

Marfat.com

میں گزرا، محرم ۱۳۳۳ھ یا اسی کے آس پاس ٹونک تشریف لے گئے۔ چار پانچ مہینے وہاں مدرسہ خلیلیہ میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ وہاں سے نکل کر حیدر آباد پہنچے اور یہ پورا سال اسی سفر و سیاحت میں گزر گیا۔ ۱۳۳۴ھ کے ابتدائی مہینوں میں دیو بند واپس آئے۔

۱۳۳۴ھ کی روداد دارالعلوم دیو بند میں بحیثیت معین المدرسین آپ کا نام ملتا ہے۔ مشاہرہ دس روپے ماہانہ درج ہے مگر ساتھ ہی کیفیت کے خانہ میں یہ بھی درج ہے کہ صرف ایک ماہ کی تنخواہ پائی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں معین المدرسین کے نام سے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے باختیار خصوصی تقرر کر دیا۔ پھر مشورہ کے بعد دس کے بجائے تیس روپے تنخواہ ہوئی جیسا کہ مولانا نے آپ بیتی میں لکھا ہے۔ چونکہ بحیثیت مدرس ایک نئے آدمی کو اتنی تنخواہ نہیں دی جاسکتی تھی اس لئے کسی اور مد سے مولانا کو یہ تنخواہ ملتی رہی کیونکہ روداد دارالعلوم ۱۳۳۵ھ میں ملازمین کے خانے میں مولانا مناظر احسن گیلانی کا نام نہیں ملتا......ذی قعدہ ۱۳۳۴ھ کے ''القاسم'' میں مولانا کے نام کے ساتھ ''مدون'' کا لفظ ملتا ہے جو مرتب کے قائم مقام ہے اور ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ کے ''القاسم'' سے اداریہ بعنوان ''نبذات'' بھی کئی ماہ تک مولانا کے قلم سے لکھا ہوا موجود ہے۔

دس سے تیس روپے ماہانہ

یہ ایک ضمنی بات تھی۔ عرض یہ کیا جا رہا تھا کہ مولانا گیلانی گھوم پھر کر دارالعلوم دیو بند آ گئے اور مولانا عثمانی نے انہیں خوش آمدید کہا اور بلا تاخیر دس روپے ماہانہ جاری کر دیا اور کام بھی حوالہ کر دیا اور مولانا مفوضہ خدمات بخوشی انجام دینے لگے۔ پڑھاتے بھی تھے اور ''القاسم'' و ''الرشید'' کی ترتیب و تزئین کی خدمت بھی انجام دیتے تھے۔ گو ٹائٹل پر اس حیثیت سے نام کسی اور کا ہوتا تھا، مولانا لکھتے ہیں:

> ''بس اتنا یاد رہ گیا ہے کہ دس روپے ماہ وار کی یہ تنخواہ صرف ایک ماہ مجھے ملی، اس کے بعد مدرسہ میں باضابطہ ملازمت کا آغاز تیس روپے ماہ وار سے شروع ہوا جو دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے طے کیا تھا۔'' (رسالہ دارالعلوم۔ رمضان ۱۳۷۴ھ، ص ۴۱)

اس تنخواہ کے سلسلے میں مولانا رقم طراز ہیں:

> ''دارالعلوم کے باہر تیس کا وزن کچھ ہی ہو لیکن دارالعلوم کے احاطہ میں مجھ جیسے نو آموز کے لئے شاید یہ کافی امتیاز تھا۔ اس تنخواہ سے کامل طور پر اگر مطمئن نہیں تو چنداں غیر مطمئن بھی نہ تھا۔'' (ایضاً)

حضرت کشمیری کی نظر میں

تیس روپے ماہ وار تنخواہ غالباً محدث العصر حضرت کشمیری کی سفارش پر ہوئی جیسا کہ خود مولانا گیلانی نے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مولانا عثمانی ایک دن فرمانے لگے:

Marfat.com

''بھائی! مولانا انور شاہ صاحب تم سے تو غیر معمولی طور پر متاثر نظر آتے ہیں۔ تمہاری درخواست جب پہنچی تو میں نے شاہ صاحب سے اس مسئلہ میں مشورہ کیا۔ جواب میں انہوں نے کہا کہ آپ کے یہاں جتنے کام کرنے والے ہیں ان کو دیکھتا ہوں کہ جو درس دیتے ہیں وہ تحریر کا کام نہیں کرتے' یا نہیں کرسکتے۔ جو تحریری سلیقہ رکھتے ہیں ان سے آپ تقریر و وعظ کا کام نہیں لے سکتے' الغرض ان تینوں شعبوں' یعنی درس اور تحریر و تقریر کے لئے اسی وجہ سے آپ کو الگ الگ آدمی رکھنے پڑتے ہیں' لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ اس غریب سے رسالہ کی ادارت و تحریر کا کام بھی آپ لیتے رہے' درس و تدریس کا کام بھی اس کے سپرد کرتے رہے' جہاں سے طلبی آئی وعظ و تقریر کے لئے بھی بھیجتے رہے گویا تینوں شعبوں کا کام حسب دل خواہ وہ تنہا انجام دیتا رہا۔ اب اگر ان تینوں مدوں کے سلسلے میں ایک ایک آدمی کی تنخواہ اسے دی جائے تو شاید اس کا یہ ناجائز مطالبہ نہ ہوگا۔ (دارالعلوم۔ محرم ۱۳۷۲ھ)

استاذ کی توجہ سے خود اعتمادی

استاذ کو اپنے ہونہار شاگرد کا بہت خیال ہوتا ہے' چونکہ حضرت شاہ صاحب نے داخلہ کا امتحان لیا تھا اور اپنے شاگرد کے جوابات سے خوش ہوئے تھے۔ پھر سال بھر دورہ حدیث میں شاگرد حاضر رہا' درمیان درمیان میں جہاں سوالات کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی سوال بھی اثنائے درس میں کرتا تھا۔ ان سب سے اندازہ ہوگیا تھا کہ آگے چل کر اُبھرے گا۔ خود مولانا گیلانی کو علمی لائن سے جو عقیدت حضرت کشمیری سے تھی اس کا اندازہ ''احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن'' کے پڑھنے سے ہوتا ہے اس لئے حضرت کشمیریؒ کا مشورہ بہت مناسب تھا اور سچ پوچھئے تو یہیں سے مولانا گیلانی میں خود اعتمادی پیدا ہوئی۔

تیس روپے مشاہرہ ہوجانے کے بعد مولانا گیلانی اپنی مفوضہ خدمات محنت سے انجام دینے لگے۔ درس و تدریس کی خدمات بھی انجام دیتے' دونوں رسائل ''القاسم'' و ''الرشید'' کے مضامین کی ترتیب اور مضامین کی کمی کی تکمیل کا فریضہ بھی انجام دیتے' کہیں دیہات یا آس پاس سے واعظ کی طلبی آتی تو وہاں بھی بھیج دیئے جاتے تھے' اور جا کر تقریر کرتے' گویا مدرس بھی تھے مبلغ بھی اور رسالہ کے مدیر بھی۔

دیوبند سے بہار

کچھ مہینوں کے بعد وطن جانے کی ضرورت پیش آئی۔ رخصت لے کر گیلانی پہنچے' گیلانی میں کچھ دنوں رہے۔ وہیں دارالعلوم کے ایک قدیم فارغ مولوی سید علی عظیم سے ملاقات ہوئی' وہ ایک اسکیم ساز بلکہ بقول مولانا اسکیم باز تھے' علمی و دینی خدمات کے لمبے لمبے پروگرام بنا رکھے تھے۔ انہوں نے بہکایا کہ وہ بہار میں رہ کر علم دین کی خدمات انجام دیں۔ دارالعلوم کے لئے آدمیوں کی کمی نہیں ہے مگر بہار کو آدمی نہیں ملتا ہے۔ مولانا اس کے چکر میں آگئے اور غالباً

Marfat.com

قرب وطن کی وجہ سے آئے۔

مونگیر میں

مولانا گیلانی اس سلسلہ میں سب سے پہلے خانقاہ رحمانی مونگیر حاضر ہوئے جہاں قطب العالم بانی ندوۃ العلماء لکھنؤ، حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری بقید حیات تھے۔ ان کی گفتگو اور مشوروں سے اندازہ ہوا کہ آپ بھی سید علی عظیم کی رائے کی تائید میں ہیں، گو کھل کر کچھ نہیں فرمایا البتہ ضرورت کا اظہار فرمایا۔

مولانا نے اس کا تذکرہ ایک مضمون میں خود کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''اب میں دارالعلوم دیوبند سے حدیث کی صرف سند لے کر نہیں بلکہ دیوبند میں درس و وعظ کے ساتھ ساتھ ''القاسم'' و''الرشید'' مدرسہ کے دو پرچوں کی ادارت کی خدمت کرنے کے بعد بہار واپس لوٹا۔ حضرت مولانا محمد علی صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ مونگیر میرا مرکز قرار پایا، اس وقت دلّی کی جمعیۃ العلماء کا خواب بھی نہ دیکھا گیا تھا۔ طے ہوا کہ صوبہ بہار کے علماء کو پہلے ایک نقطہ پر متحد کیا جائے۔ صوبہ کی جمعیۃ کے پہلے اجلاس کے لئے قصبہ بہار شریف کا انتخاب عمل میں آیا۔ مونگیر کی خانقاہ کی طرف سے جمعیۃ کی شرکت کے لئے خاک سار بھیجا گیا۔''

(حیات سجاد۔ص ۵۱)

مولانا دیوبند سے ایک ماہ کی رخصت پر آئے تھے، مونگیر میں تین مہینے رہ گئے............

دیوبند سے طلبی

مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نے دیر کی وجہ دریافت فرمائی تو پہلے لیت ولعل سے کام لیتے رہے پھر مجبور ہو کر لکھا کہ کچھ لوگوں کا ایسا مشورہ ہے کہ بہار ہی میں رہ کر خدمت دین کروں لہٰذا اگر آں محترم کی اجازت ہو تو یہاں رہ جاؤں، ساتھ ہی بعض کاموں کا پروگرام بھی لکھ کر بھیجا۔

مولانا عثمانی نے جواب میں تحریر فرمایا یہ سب قصے تمہاری نا تجربہ کاری اور جوش جوانی کے ہیں، تمہارے لئے مناسب یہی ہے کہ دارالعلوم آجاؤ جن کاموں کا تم نے ذکر کیا ہے ان کے لئے دارالعلوم سے زیادہ بہتر کوئی جگہ نہیں ہوسکتی۔ یہاں دارالعلوم کا وسیع کتب خانہ ہے۔ اس کا رسالہ ''القاسم'' اور ''الرشید'' ہے، پریس ہے، تم چاہو گے تو یہ تمہارے حوالہ کر دیا جائے گا، آدمیوں کی ضرورت ہوگی تو یہاں کے فضلاء میں سے ان کا انتخاب کر کے رکھ لیا جائے گا۔

رہا مشاہرہ، تو یہاں جو معیار ہے وہ زمانہ کے اعتبار سے پست ہے، مگر تمہارے لئے طے کر دیا گیا ہے کہ تم کو تیس کے بجائے اب دارالعلوم پچاس دے گا۔

بہار سے دیو بند

ادھر تین چار مہینے بہار میں رہ کر کاموں کا تھوڑا بہت تجربہ بھی ہو چکا تھا کہ یہ صوبہ اپنے یہاں کے علماء کے حق میں کتنا بخیل اور قدر ناشناس ہے۔ باتیں بنانے والوں کی کمی نہیں' مگر وقت پر کوئی ساتھ دینے کے لئے آمادہ نظر نہیں آتا ہے۔ حوصلہ افزائی کرنے والوں کی بہت کمی ہے' تنقید کرنے والے البتہ بہت زیادہ ہیں۔ مولانا عثمانی کے خط نے قیام بہار کے پہلے ارادہ کو مضمحل کر ڈالا۔ بہار میں رہنے کا عزم کمزور پڑ گیا اور فیصلہ کرنا پڑا کہ بہار چھوڑ کر پھر دیو بند کا ہی قصد کرنا بہتر رہے گا' پھر مولانا عثمانی ایک تجربہ کار عالم دین ہیں' انہوں نے جو کچھ لکھا ہے۔ بجا ہے ہوا بھی یہی کہ بہار سے بستر باندھ کر پھر دارالعلوم پہنچ گئے اور مولانا عثمانی کی خدمت میں حاضر ہو گئے' مولانا عثمانی نے سارا انتظام حسب وعدہ کر دیا اور مولانا گیلانی نے اپنا کام شروع کر دیا۔

کلکتہ میں توہین رسول کا حادثہ

لیکن قدرت کو دارالعلوم میں آپ کا قیام شاید اب منظور نہ تھا۔ ابھی ایک مہینہ ہی گزرا تھا کہ بقول مولانا گیلانی:

> ''اچانک کلکتہ میں ہنگامہ شروع ہوا' مختصر یہ ہے کہ ''ڈیلی نیوز'' نامی غالباً کوئی انگریزی اخبار تھا' جس میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بعض نا سزا الفاظ......شائع ہوئے' کلکتہ کے مسلمانوں میں غم اور غصہ کی لہر دوڑ گئی' بات بڑھتی ہی چلی گئی' تا آنکہ کل ہند پیمانے پر فیصلہ کیا گیا کہ باضابطہ ایک مجلس ہی بنائی جائے جس کا مقصد ہی یہ ہو کہ اس قسم کی بے ادبیوں کی راہ ہمیشہ کے لیے مسدود ہو جائے۔ کلکتہ میں ارادہ کیا گیا کہ سارے ہندوستان سے علماء کو طلب کر کے ایک اجتماع عظیم کیا جائے اور حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ آئندہ اس قسم کی ناہمواریوں کے انسداد کی وہ ضمانت لے۔'' (رسالہ دارالعلوم دیو بند۔ اگست ۱۹۵۵ء)

دیو بند سے کلکتہ

یہ برطانوی حکومت کا دور تھا اور اس وقت ملک میں سیاسی طوفان کا زور ہو رہا تھا' کہ یہ نئی آندھی اُٹھی۔ کلکتہ مسلمان تاجروں کا اچھا خاصا مرکز تھا' وہاں سے مہتمم دارالعلوم کے نام مسلمانان کلکتہ کی درخواست پہنچی کہ دارالعلوم سے کافی علماء تشریف لائیں اور سارے ذمہ دار حضرات بھی زحمت سفر برداشت کریں' دارالعلوم نے اس درخواست پر غور کر کے فیصلہ کیا کہ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم' حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نائب مہتمم' حضرت العلامہ انور شاہ کشمیری صدر المدرسین چند دیگر علماء اور ان کے ساتھ مولانا گیلانی پر مشتمل ایک وفد کلکتہ جائے۔ اس کی تاریخ وغیرہ طے کر دی گئی' اور کلکتہ اطلاع بھیج دی کہ وفد فلاں تاریخ میں ان شاء اللہ پہنچے گا۔ اس کے مطابق دیو بند سے کلکتہ کے لئے علماء دیو بند کا وفد روانہ ہوا' الہ آباد ٹرین پہنچی تو دیکھا گیا کہ اسٹیشن ماسٹر مولانا حافظ احمد صاحب

Marfat.com

کا نام لے لے کر ہر ڈبے میں پوچھ رہا ہے کہ کیا وہ تشریف رکھتے ہیں؟ ان کے نام کلکتہ سے ایک تار میرے پتہ سے آیا ہوا ہے۔ جب وہ اس ڈبے کے پاس پہنچا جس میں یہ سارے بزرگ بیٹھے ہوئے تھے، تو اسٹیشن ماسٹر نے معلوم کر کے وہ تار مہتمم صاحب کے حوالہ کیا اور تار کا ترجمہ بھی سنا دیا کہ اس میں لکھا ہوا ہے کہ آپ لوگ واپس ہو جائیں، کلکتہ کی حالت حد سے زیادہ نازک ہوتی چلی جا رہی ہے، تفصیل خط سے معلوم ہو گی۔

یہ سننا تھا کہ سارے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے، سامان اُتارا جانے لگا، مولانا عثمانی نے فرمایا کہ سب اتر جائیں مگر مولوی مناظر احسن اسی ٹرین سے کلکتہ جائیں، اور وہاں جلسہ میں تقریر کی ضرورت ہو تو شریک ہو کر تقریر کریں اور حالات سے مطلع کریں۔

پٹنہ میں چھوٹے بھائی کا اصرار

چنانچہ سب اُتر گئے، مولانا گیلانی تنہا رہ گئے۔ بالکل جوان العمر، لمبا کُرتا اور دوپلّی ٹوپی سر پر، ٹرین سے نہیں اُترے، انہوں نے دیوبند سے روانہ ہوتے ہوئے اپنے چھوٹے بھائی مکارم احسن کو تار کے ذریعہ اطلاع کر دی تھی کہ فلاں ٹرین سے پٹنہ ہوتے ہوئے کلکتہ وفد جا رہا ہے۔ میں بھی شریک ہوں، پٹنہ اسٹیشن پر ملنے کی کوشش کرنا۔

ٹرین جب پٹنہ پہنچی تو دیکھا کہ مکارم میاں موجود ہیں، وہ مولانا سے مُصر ہوئے کہ بھائی جان! آپ بھی یہیں اتر جائیں، کلکتہ کا حال اچھا نہیں ہے بڑا نازک ہے، مولانا گیلانی مُصر تھے کہ بہر حال جانا ہے، بھائی نے دامن پکڑ کر چاہا کہ مولانا کو نیچے اُتار لیں مگر ان کے ہاتھ کو جھٹک دیا، ٹرین نے سیٹی دی اور روانہ ہو گئی، وہ حسرت و افسوس سے دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

اس وقت کا حال مولانا لکھتے ہیں:

"اب بھی اپنے اس ایمانی حال کو جب یاد کرتا ہوں...... سمجھ میں نہیں آتا میں کیا تھا اور کیا ہو گیا، حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا مشہور شعر

فان ابی ووالدتی وعرضی
لعرض محمد منکم فداء

اسی ڈبہ میں جس میں میرے سوا کوئی نہ تھا پڑھتا جاتا تھا اور روتا جاتا تھا، سرمستی و وارفتگی کے انہی خیالات میں ہوڑہ اسٹیشن پر میل مجھے لے کر پہنچ گیا، اسٹیشن استقبال کرنے والے مسلمانوں سے بھرا ہوا تھا، یقین تھا کہ آج دارالعلوم دیوبند مسلم کلکتہ منتقل ہو کر چلا آ رہا ہے...... ہر طرح کے لوگ موجود تھے۔ ٹھہرنے کے ساتھ ہی لوگ پنجاب میل پر ٹوٹ پڑے، لیکن علماء کا کسی ڈبہ میں پتہ نہ چلا، شور برپا ہو گیا، فقیر تنہا کس مپرسی کے عالم میں پلیٹ فارم پر اترا، اور اطلاع دی کہ دیوبند کے علماء آپ لوگوں کا تار پا کر الہ آباد سے واپس ہو گئے، صرف اس فقیر کو اجازت دی گئی ہے وہ حاضر ہو گیا ہے۔" (ایضاً۔ ص ۴۳)

کلکتہ کے مسلمانوں کا حال

ہر شخص کو حیرت تھی کہ ایسا تار کس نے دیا اور کس کے مشورے سے دیا' مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ مولانا گیلانی کو آنریبل مولوی عبدالرحیم اپنی کار پر بٹھا کر اپنی کوٹھی میں لے گئے' جہاں تمام علماء کے قیام کا انتظام تھا۔ عام لوگوں پر مایوسی طاری تھی کہ علماء کا وفد نہیں آیا' راستہ سے تار کی وجہ سے واپس ہوا۔

مولانا کا بیان ہے کہ میں جب وہاں تنہا رہ گیا' ایک صاحب تشریف لائے جن کا نام عبدالصمد تھا۔ وہ اِدھراُدھر دیکھ کر بولے' تار میں نے دیا تھا مگر میرے نام کا تذکرہ کسی سے آپ ہرگز نہ کریں' ورنہ عوام میری دھجیاں اُڑا دیں گے۔ حالات کی نزاکت کا تقاضا یہی تھا جو کیا گیا۔ یہ بھی مولانا سے عرض کیا کہ آپ میرے یہاں آ جائیں۔ انہوں نے صاحب خانہ سے اس کی اجازت بھی لے لی۔ مولانا وہاں چلے گئے' مولانا کا بیان ہے:

> ''حکومت اور مسلمانوں کے درمیان کش مکش آخری نقطہ تک پہنچ چکی تھی' مسلمانوں کی جماعت جلسہ کرنے پر اصرار کر رہی تھی' حکومت بزور اس کو روکنا چاہتی تھی' بات بڑھتی جا رہی تھی' اسی دن یا دوسرے دن زکریا کی مشہور مسجد میں مسلمانوں پر گولیاں بھی چلا دی گئیں' کافی مسلمان شہید بھی ہوئے......اور زخمیوں کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا' میرا حال یہ تھا کہ حاجی عبدالصمد سے بار بار کہتا کہ مجھے چھوڑ دیجئے۔ مسلمانوں کے ساتھ ہنگامہ میں شریک ہو جاتا ہوں' محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت پر مسلمان اپنا خون بہا رہے ہیں' میرا خون آخر کہاں کا قیمتی ہے؟ حاجی صاحب کو اندیشہ ہوا کہ اپنا دماغی توازن میں کھو چکا ہوں......مخالفت نہیں کرتے بلکہ کہتے ہاں مولانا میں بھی چلتا ہوں' بعض باتوں کا انتظار ہے۔'' (ایضاً ص ۴۴)

بہاری فقہاء کی قید میں

انہی حالات سے مولانا دوچار تھے کہ بہار کے بعض انگریزی خواں طلبہ مولانا کو ڈھونڈتے ہوئے حاجی عبدالصمد صاحب کے یہاں پہنچے' دیکھا تو واقعی ان کا حال دگرگوں ہے۔ انہوں نے کہا اچھا چلئے جلسہ گاہ تک پہنچاتا ہوں' موٹر پر بٹھایا اور چل پڑے اور کلکتہ کے ایک کنارے والے محلہ میں پہنچے' اور ایک مکان میں مولانا کو داخل کر کے کہنے لگے' اب آپ اس احاطے سے باہر نہیں جا سکتے' گویا انہوں نے اپنا قیدی بنا لیا اور پوری نگرانی کرنے لگے۔ یہاں صباح الدین عبدالرحمان صاحب نے تھوڑی تفصیل دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اس زمانہ میں کلکتہ کے ایک انگریزی اخبار ''انڈین ڈیلی نیوز'' نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مبارک میں کوئی گستاخانہ تحریر شائع کی تو علماء کی ایک جماعت کلکتہ پہنچی جس میں مولانا گیلانی بھی تھے۔ ان کی دینی حمیت اور ایمانی غیرت اس قدر جوش میں آئی کہ شاتم رسولؐ اور

Marfat.com

اس کے ہم مذہبوں کے خلاف فتویٰ دیدیا۔ کلکتہ کے ایک دوسرے اخبار "اسٹیٹس مین" نے ایک افتتاحیہ لکھ کر حکومت کو ان کے خلاف ابھارا اور گرفتاریاں شروع ہوگئیں، مولانا کے دوستوں اور ہم وطنوں نے ان کو کلکتہ چھوڑنے پر مجبور کیا اور وہ زبردستی بمبئی اور مدراس کے راستہ سے دیوبند روانہ کردیئے گئے، مگر راستہ میں بقرعید کا چاند دیکھ کر حیدرآباد میں اُتر پڑے۔"

(معارف (اعظم گڑھ) ماہ اپریل ۱۹۵۷ء)

مولانا گیلانی لکھتے ہیں کہ کئی دن دوستوں کی قید میں رہا، وہ سب اخبار پڑھ کر حالات بتاتے تھے کہ ہندو مسلم فساد چھڑ گیا ہے۔ جہاں کسی کو تنہا پاتے ہیں ایک دوسرے کو قتل کر ڈالتے ہیں، ٹرینوں میں بھی اس طرح کے خون ریز واقعات پیش آرہے ہیں۔ دوسرے پٹنہ اور گیا جانے والی ٹرین کے راستہ میں کوئی پل ٹوٹ گیا ہے اس لیے ٹرین کی آمد ورفت بند ہے۔

کلکتہ سے دیوبند کے لئے روانگی

مولانا سے وعدہ لیا گیا کہ اگر وہ کلکتہ شہر میں داخل نہ ہوں تو ان کو دیوبند بھیجنے کا انتظام کیا جاسکتا ہے، مولانا نے وعدہ کرلیا، طے ہوا کہ ناگپور میل سے روانگی ہو، اور حیدرآباد جاکر دوسری ٹرین لیں اور وہاں سے دہلی ہوکر دیوبند پہنچیں، مولانا لکھتے ہیں:

"بہاری طالب العلموں نے اسٹیشن پہنچا کر ٹکٹ لیا اور ناگپور میل میں بٹھا دیا اور سمجھا دیا کہ راستہ میں جنکشن آئے گا وہاں ٹرین بدل جائے گی۔ وہاں سکندرآباد، حیدرآباد والی گاڑی پر بیٹھ جانا، وہاں سے منماڑ ہوکر...... دیوبند پہنچ جاؤ گے، سوچا راہ میں حیدرآباد آئے گا، گزر جاؤں گا لیکن جب گاڑی سکندرآباد پہنچی، تب معلوم ہوا کہ کل اضحیٰ والی عید کا دن ہے، آپس میں لوگ اس کا چرچا کررہے تھے۔ کیا عید میری اس سال کی ریل میں گزر جائے گی، جواب اس کا یہ ملا کہ اپنے ایک خاص عزیز مولوی سید محی الدین حیدرآبادی ہیں ...... اس لئے عید کی نماز پڑھنے کی نیت کرکے حیدرآباد میں اُتر گیا اور اسی عجیب وغریب وحشیانہ شکل وصورت کے ساتھ لنگی باندھے سید محی الدین کی قیام گاہ تک پہنچا، دیکھ کر پریشان ہوئے۔ میں نے قصہ سنایا کہ بھاگا ہوا کلکتہ سے دیوبند جارہا ہوں، کل عید ہے اس لئے اُتر گیا ہوں۔"

(رسالہ دارالعلوم۔ اگست ۱۹۵۵ء، ص ۴۵)

حیدرآباد میں بقرعید اور پھر قیام

یہ عید اضحی ۱۳۳۵ھ کی تھی، جیسا کہ پہلے کے واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے، یہاں اتر کر پھر مولانا حیدرآباد کے ہی

Marfat.com

ہو کر رہ گئے۔ دیو بند نہیں لوٹ سکے۔ خود مولانا نے لکھا ہے:

''ایک دن کی جگہ تیس سال سے زیادہ مدت اسی حیدر آباد میں مجھے گزارنی پڑی' اور یہ تقدیر کا کرشمہ تھا کہ پانچ اور دس روپے کی تنخواہ سے جس کی معاشی زندگی شروع ہوئی وہی ہزار روپے ماہوار کی تنخواہ سے وظیفہ یاب ہو کر اب پھر اسی مستقر الٰی حین کی طرف واپس ہو گیا' جہاں کی مٹی سے اس نے سر نکالا تھا۔ دارالعلوم کے احاطہ سے حسی جدائی' اس منزل پر ختم ہو جاتی ہے۔'' (ایضاً)

قیام حیدر آباد

حیدر آباد میں کیوں رہے؟ کیسے رہے؟ دیو بند واپسی کیوں نہ ہوئی؟ اس کی تھوڑی تفصیل صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب کے مضمون میں ملتی ہے' وہ لکھتے ہیں:

''راستے میں عید اضحیٰ کا چاند دیکھ کر حیدر آباد اتر پڑے' وہاں مولانا حمید الدین فراہی سے ملاقات ہوئی۔ اس زمانہ میں عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہونے والی تھی' مولانا فراہی نے ان کو یونیورسٹی میں درخواست دینے کا مشورہ دیا۔ وہ دیو بند چھوڑنا نہیں چاہتے تھے لیکن خود دیو بند والوں نے ان کو یہ رائے دی کہ دکن میں دیو بند کے ایک عالم کا قیام دینی حیثیت سے مفید ہوگا۔ اس لئے انہوں نے درخواست دے دی۔ ان کا تقرر ایک سال تک یونیورسٹی میں نہ ہو سکا' اس درمیان میں وہ مولانا فراہی سے درس لیتے رہے' مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی صاحب اس زمانہ میں حیدر آباد کے صدر الصدور تھے اور وہاں کے دینی و علمی سرگرمیوں کے مرکز تھے۔ مولانا فراہی' مولانا گیلانی کو ان کے پاس لے گئے اور کہا' ان کو بطور امانت آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ شروانی صاحب نے فرمایا ''یہ امانت میرے پاس محفوظ رہے گی۔'' ......مولانا گیلانی اپنی ایک تحریر میں فرماتے ہیں......''ان کے لطف و کرم کی موسلا دھار بارشوں کا سلسلہ اس ملاقات کے بعد شروع ہوا' وہ زندگی کے آخری دنوں تک برستا رہا' امانت کا پورا حق ادا کرنے والے نے ادا کر دیا۔''......حیدر آباد کے قیام کے زمانے میں یہ بیمار ہو گئے' شروانی صاحب ان کو اپنے ساتھ علی گڑھ لے گئے اور وہاں علاج کرایا' اس کے بعد وہ اپنے وطن گیلانی چلے گئے' یہاں آنے کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی سے تقرر کا خط ملا اور وہ ۱۹۲۰ء میں شعبہ دینیات میں استاذ مقرر ہو گئے اور ۱۹۴۹ء میں اس شعبہ کے صدر کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے' پانچ سو پنشن ملی۔'' (معارف (اعظم گڑھ) اپریل ۱۹۵۷ء)

Marfat.com

مولانا فراہی کے درس میں

مولانا گیلانی استاذ مقرر ہونے سے پہلے مہینوں مولانا حمید الدین فراہی کے درس قرآن میں شریک ہوکر استفادہ کرتے رہے۔

علامہ سید سلیمان ندوی (م ۱۹۵۳ھ) نے مولانا فراہی کے قیام حیدر آباد کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اسی کے ساتھ درس قرآن کا ایک حلقہ قائم کیا' مغرب کے بعد یہ مجلس جمع ہوتی تھی' مولانا تقریر فرماتے تھے' لوگ شکوک پیش کرتے تھے وہ جواب دیتے تھے' تھوڑی دیر کے بعد یہ مجلس ختم ہوجاتی تھی' ہمارے فاضل دوست مولانا......مناظر احسن گیلانی جو اس وقت جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر ہیں وہ اس مجلس کے خاص لوگوں میں تھے' ایک دو دفعہ مجھے بھی شرکت کا اتفاق ہوا۔'' (حیات حمید۔ص ۱۵۸)

حکیم الامت تھانویؒ کی نظر میں

علمی خدمات کے نام پر دارالعلوم دیو بند میں مولانا کا کوئی ڈیڑھ سال قیام رہا' اس عرصہ میں اسباق بھی پڑھانے پڑے' وعظ وتقریر کے لئے باہر بھی جانا پڑا' اور ''القاسم'' و''الرشید'' میں مضامین بھی لکھتے رہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ ایک ذی استعداد مدرس بھی تھے' عمدہ مقرر بھی اور اچھے انشا پرداز اور مقالہ نگار بھی۔ مولانا جس زمانہ میں مشہور صحابی حضرت ابوذر غفاریؓ پر مقالہ لکھ رہے تھے' تو حکیم الامتہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نوّر اللہ مرقدہ' (م ۱۹۴۳ء) سرپرست دارالعلوم نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ یہ مضمون نگار یا تو محقق ہے اور اگر ابھی محقق نہیں ہے تو ان شاءاللہ آئندہ محقق بنے گا' مولانا گیلانی نے اسے خود بھی ایک جگہ نقل کیا ہے' لکھتے ہیں:

''حکیم الامت مولانا اشرف علی التھانوی قدس سرہ' گو فقیر کی شخصیت سے اس وقت تک ناواقف تھے' اپنے ایک خاص گرامی نامہ سے سرفراز فرمایا' یہ بھی ارقام فرمایا تھا کہ مقالہ نگار سے میں ذاتی طور پر واقف نہیں ہوں' لیکن اس مضمون کو دیکھ کر یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ محقق نہیں ہو چکے ہیں تو محققیت متوقعہ کی دلیل ان کا یہ مضمون ضرور ہے۔'' (مقالات احسانی۔ص ۲۸۲)

مولانا کے مضامین کی ابتداء

مولانا گیلانی نے اپنا پہلا مضمون ''القاسم'' میں شیخ الہندؒ کی فرمائش پر ''خیر الامم کا طغرائے امتیاز'' کے عنوان سے زمانہ طالب العلمی میں جو لکھا تھا' وہ چھ قسطوں میں شائع ہوا۔ ذی قعدہ' ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ......ربیع الاول' جمادی الثانی' شوال اور ذی قعدہ ۱۳۳۲ھ کے ''القاسم'' میں پڑھا اور دیکھا جا سکتا ہے۔

مولانا گیلانی نے لکھا ہے:

"کیا جانتا تھا کہ آئندہ اس "القاسم" کی ادارت سے اپنی علمی زندگی کی بسم اللہ ہوگی۔ "خیر الامم کا طغرائے امتیاز" یہی پہلا مقالہ تھا جو ارشاد گرامی (حضرت شیخ الہندؒ) کی تعمیل میں لکھا گیا تھا' چند شمارے اس مضمون کے مسلسل "القاسم" میں شائع ہوتے رہے۔"

(رسالہ دارالعلوم۔ جمادی الاول ۱۳۷۲ھ)

لیکن جب ایک ڈیڑھ سال بعد دارالعلوم میں تقرر ہوگیا اور "القاسم" و "الرشید" حوالہ کیا گیا' تو پھر بہت سارے مضامین آپ نے لکھے اور وہ شائع بھی ہوتے رہے......خود لکھتے ہیں:

"پھر تو "القاسم" اور "الرشید" دارالعلوم سے شائع ہونے والے دونوں مجلوں کے ساتھ ایک ایسا رشتہ قائم ہوا کہ بسا اوقات دونوں رسالوں میں فقیر کے ہفوات کے سوا کچھ اور ہوتا ہی نہ تھا"...........(ایضاً)

رسائل میں مضمون نویسی

مولانا نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس زمانہ تک رسالوں میں مضامین لکھنا علماء علمی وقار کے کچھ مناسب نہیں سمجھتے تھے حالانکہ اس کو ختم کرنے کے لئے "القاسم" و "الرشید" میں حکیم الامت حضرت تھانویؒ عارف باللہ مفتی عزیز الرحمٰن شیخ التفسیر مولانا شبیر احمد عثمانی' حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب دیوبندی کے مضامین شائع ہوتے رہتے تھے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ جب مضامین فراہم نہ ہوتے' تو تنہا مولانا گیلانی تمام مضامین مختلف ناموں سے لکھ کر خانہ پری کرتے اور اس کی ایک نئی ترکیب خود نکالی تھی...........خود لکھتے ہیں:

زندہ مضمون نگاروں سے مایوس ہوکر ان لوگوں کے مضامین شائع کرنے لگا' جو دنیا میں موجود نہ تھے' پرانے فائل اٹھا کر ان رسالوں کو اٹھا کر دیکھئے مضمون نگاروں کی فہرست میں آپ کو امام غزالیؒ، امام رازیؒ، شیخ ابن عربیؒ، علامہ محمود آلوسیؒ جیسے بزرگوں کے نام ملیں گے۔" (ایضاً)

رسالہ "القاسم" اور "الرشید" میں

اوپر گزر چکا ہے کہ مولانا گیلانی حیدر آباد سے ۱۳۳۴ھ میں دارالعلوم دیوبند واپس آگئے' اور معین المدرسین کی صف میں آپ کا حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نے تقرر کردیا' درس و تدریس کا کام انجام دیتے رہے' پھر "القاسم" و "الرشید" سپرد کیا کہ ان دونوں میں ترتیب مضامین کی خدمت بھی انجام دیا کرو اور مضامین کی جب کمی رہ جائے تو خود لکھ کر پورا کرو۔

Marfat.com

ترتیب رسائل

''القاسم'' و ''الرشید'' کے فائل دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مولانا گیلانی نے ذی قعدہ ۱۳۳۴ھ سے ان دونوں رسالوں میں پابندی سے اپنے مضامین دینا شروع کر دیا تھا' بلکہ ''القاسم'' میں فہرست مضامین کے اندر اپنے نام کے ساتھ انہوں نے ''مدون'' کا لفظ بھی لکھنا شروع کر دیا تھا اور ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ سے ''القاسم'' میں اداریہ کے لیے ''نبذات'' کا عنوان بھی قائم کر دیا تھا گو یہ عنوان دو چار ماہ سے زیادہ باقی نہ رہا جیسا کہ رسالہ کی جلدوں سے معلوم ہوتا ہے۔

مضامین کی ابتداء

دوبارہ واپسی کے بعد پہلا مضمون ''القاسم'' میں......''امغات الاغلوطات'' (مغالطوں کا سرشکن) متعدد قسطوں میں لکھا اور شائع ہوا۔ یہ سلسلہ مضامین ربیع الثانی ۱۳۳۴ھ سے شروع ہو کر صفر ۱۳۳۶ھ پر ختم ہو جاتا ہے' آخری مضمون آپ کا ''یہودیوں کی سازش'' کے عنوان سے ملتا ہے۔ ''الرشید'' میں پہلا مضمون ''السائل و عواقبہ'' (بھیک مانگنے والوں کا انجام) کے عنوان سے شروع ہوا ہے اور یہ بھی ذی قعدہ ۱۳۳۴ھ کے پرچہ سے شروع کیا گیا۔ اور رمضان ۱۳۳۵ھ میں آخری مضمون بعنوان ''بابارتن ہندی'' پر ختم ہوا۔ بعض مضامین کی سات سات قسطیں شائع ہوئیں۔ حضرت ابوذر غفاریؓ صحابی پر متعدد قسطوں میں لمبا مضمون آیا' جو بعد میں کتابی شکل میں شائع ہو کر مقبول عام و خاص ہوا۔ اسی طرح ''بابارتن ہندی'' بھی لمبا مضمون ہے۔ یہ بھی کتابی شکل میں چھپا۔

عنوانات مضامین

مولانا کا کوئی مضمون دو چار قسطوں سے کم میں غالباً شائع......نہیں ہوا ہے' الا ماشاء اللہ! مضامین سب عالمانہ اور کہنا چاہیے تحقیقی انداز میں' جس سے مولانا کی وسعت نظری اور وسیع مطالعہ کا یقین کرنا پڑتا ہے۔ ان میں سے چند مقالات و مضامین کے عنوانات یہ ہیں:

(۱) دامغات الاغلوطات (۲) شیخ ابن عربی اور مسئلہ اتحاد وصول (۳) قرآن کے طرز استدلال پر ایک سرسری نظر (۴) الشہب والقرآن (۵) واقعہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا (۶) توحید القرآن (۷) مسئلہ جذب و کشش پر ایک تنقیدی نظر (۸) اعجاز قرآنی (۹) مذہب کی ضرورت (۱۰) خوارق عادات کے وقوع پر یورپ کی بعض شہادتیں (۱۱) حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ (۱۲) جدید اصول فقہ (۱۳) یہودیوں کی سازش (۱۴) السائل و عواقبہ (۱۵) جبر السیئات بالحسنات (۱۶) عمر الدنیا (۱۷) الریاضۃ الجسمانیہ (۱۸) تاثیر الکواکب (۱۹) حسن المعاملہ۔ (۲۰) طیب الهند (۲۱) تاثیر الادویہ (۲۲) خصال الفطرۃ (۲۳) اہل دنیا کی اصلاح (۲۴) کرامات اولیاء (۲۵) میرے خواب (۲۶) دیوان العرب یا حماسہ قاسمی (۲۷) نام و نسب اور کنیت پر اسلامی تعلیمات کا اثر (۲۸) اخلاف سے فائدہ حاصل کرنے کا جدید طریقہ (۲۹) عورتوں کی بیعت (۳۰) بابارتن ہندی (۳۱) فیصلہ آسمانی در فتنہ قادیانی۔

سوا سال ڈیڑھ سال کی مدت میں درس و تدریس اور تبلیغ کے ساتھ آپ نے اتنے متنوع مضامین ان دونوں رسالوں میں لکھے اور ان کے علاوہ بھی بعض مضامین لکھنے کی نوبت آئی۔ مضامین پر بحث علوم و معارف کے تحت ہوگی اور اس وقت صحیح اندازہ ہوگا کہ مولانا نے کس قدر محنت کی اور کس قدر ذہن رسا آپ کو قدرت کی طرف سے عطا کیا گیا تھا۔

بعض مضامین کتابی صورت میں

ان مضامین سے دو لمبے مضمون ایک ''حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ'' اور دوسرا ''بابا رتن ہندی'' کتابی صورت میں بہت پہلے شائع ہو چکے ہیں اور ان دونوں کتابوں کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔

اس وقت کا ماحول یہ اچھی طرح یاد رکھیں کہ جس زمانہ میں یہ مضامین لکھے جا رہے تھے ملک آزاد نہیں ہوا تھا' یہاں انگریزوں کی حکومت تھی اور کہنا چاہیے اس کا دورِ شباب تھا' اسلامیات پر خود مسلمان کی طرف سے طرح طرح کے اعتراضات ہو رہے تھے' اور عیسائیت کا جو پروپیگنڈہ اسلام کے خلاف ہو رہا تھا' اس سے غیر شعوری طور پر باشندگان ہند کافی متاثر نظر آتے تھے۔

لیکن دارالعلوم دیوبند اس وقت بھی ایک آزاد ادارہ تھا اور اپنے خاص نہج پر کام میں مشغول تھا۔ حکومت وقت سے اس کو کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی مخالفت پر آتا تھا تو حکومت وقت کو یہ کہہ کر برانگیختہ کرنے کی سعی کرتا تھا کہ یہ ادارہ انگریز دشمنی کا قلعہ ہے' یہاں سے جو نکلتا ہے' انگریزی حکومت کی جڑوں پر کلہاڑا چلاتا ہے۔ جس طرح آزادی کے کچھ دنوں کے بعد بعض لوگوں نے یہ کہہ کر بدنام کرنے کی ناپاک سعی کی کہ یہ پاکستان نواز ہے چنانچہ ابتدائے آزادی میں خانہ تلاشی بھی ہوئی۔

حکومت وقت بھی کبھی دھمکی سے اور کبھی لالچ سے رام کرنے کی کوشش کرتی۔ دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین شیخ الہندؒ جب حج کے لئے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے' انگریزوں نے وہیں گرفتار کرا کے مالٹا روانہ کر دیا تھا' جہاں انہوں نے سوا تین سال کے لگ بھگ مصائب اور جلاوطنی کی زندگی گزاری' مگر آپ کے صبر و استقامت میں ذرا فرق نہیں آیا۔ وہاں آپ کے ساتھ شیخ الاسلام حضرت مدنی اور حکیم نصرت حسین بھی نظر بند تھے۔

دارالعلوم کی خدمت

مگر بایں ہمہ دارالعلوم دیوبند اس وقت عملاً سیاسی ہنگاموں سے بڑی حد تک الگ تھلگ تھا اور قرآن و حدیث اور فقہ و کلام کی تعلیم اور اس کی اشاعت میں خاموشی کے ساتھ مشغول تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس کے فرزند دنیا بھر میں پھیل گئے گو یہ بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ فرزندان دارالعلوم کی ایک جماعت انگریزی حکومت کے خلاف سینہ سپر تھی اور وہ آزادی کے لئے جدوجہد میں مصروف تھی۔ بلکہ دارالعلوم کے ممتاز افراد و اشخاص بھی انگریزی حکومت کے خلاف سرگرم عمل تھے مگر اس طرح کہ ان کی وجہ سے دارالعلوم زیر عتاب نہ آسکے اور تعلیم و اشاعت دین کی خدمت زد میں نہ آنے پائے' علمی محاذ اپنا کام کر رہا تھا اور سیاسی محاذ اپنا کام الگ کر رہا تھا' علمی محاذ سے درس و تدریس' تصنیف و تالیف'

Marfat.com

تبلیغ ومناظرہ، تقریر وتحریر اور تعمیر سیرت کا کام جاری تھا اور سیاسی محاذ سے برطانوی مظالم کی روک تھام اور ملکی آزادی کی سرفروشانہ جدوجہد ہو رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ''القاسم'' و''الرشید'' میں کبھی کوئی سیاسی مضمون نہیں چھپتا تھا بلکہ صرف دینی، علمی، اصلاحی اور معاشرتی مضامین ہوا کرتے تھے، تاکہ مخالفین کو کوئی موقع دارالعلوم پر ہاتھ ڈالنے کا نہ مل سکے۔

مولانا گیلانی کی مدت ملازمت میں شیخ الہند مولانا محمود حسن عثمانیؒ حجاز مقدس جاچکے تھے اور پھر وہیں سے گرفتار کر کے مالٹا پہنچادیئے گئے تھے۔ صدارت تدریس پر محدث العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیری فائز تھے، جو براہ راست شیخ الہند کے ارشد تلامذہ میں تھے اور ہندوستان میں ممتاز علمی حیثیت رکھتے تھے۔

مجلس شوریٰ دارالعلوم کی رُکنیت

مولانا گیلانی عثمانیہ یونیورسٹی میں جب استاذ ہوگئے تو دارالعلوم دیوبند کی آمد ورفت تقریباً بند سی ہوگئی، مگر دکن میں مسلک دارالعلوم کی اشاعت وتبلیغ اور اس کی حفاظت کے ذمہ دار کی حیثیت سے پھر بھی باقی رہے اور ارباب دارالعلوم نے اسی وجہ سے آپ کو مشورہ دیا تھا کہ اپنے ایک فاضل کا وہاں رہنا مناسب ہوگا گو خود شہر حیدرآباد میں بھی دارالعلوم کے بعض فضلاء ہر زمانہ میں موجود رہے اور انہوں نے بھی مسلک دارالعلوم کی اشاعت کا فریضہ ادا کیا۔ مگر مولانا گیلانی کی حیثیت ایک نمائندہ کی تھی، جس کی ذات پر پورا اعتماد تھا۔

مسلک دارالعلوم کے مبلغ

مگر یہ حقیقت ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں دارالعلوم، اس کے اکابر واسلاف کو روشناس کرانے والی شخصیت اس دور میں تنہا مولانا کی ذات تھی۔ مولانا کے اثرات اہل شہر میں بھی تھے، اور حلقہء یونیورسٹی میں بھی، اس طرح خود حضور نظام والی دکن بھی مولانا کے علم وفضل سے کافی متاثر تھے۔ مولانا کے شاگرد بتاتے ہیں کہ حضور نظام مولانا گیلانی کی تقریر چھپ کر سنا کرتے تھے اور خوش ہوتے تھے، جس کی طرف اوپر اشارہ گزر چکا ہے۔

ارباب دارالعلوم دیوبند نے بھی مولانا گیلانی کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ خط وکتابت ہوتی رہتی تھی، آپ کے اساتذہ میں سے جب کوئی حیدرآباد شہر میں پہنچتا تو آپ آگے آکر استقبال کرتے اور اس کے تعارف میں جتنا کچھ کر سکتے تھے اس میں کمی نہیں کرتے تھے۔

مجلس شوریٰ اور اس کی رکنیت

دارالعلوم کی سب سے ذمہ دار باڈی مجلس شوریٰ ہے اور اس کے اراکین ہر دور میں ملک کے مشہور ترین صاحب فضل وکمال ہوئے، چونکہ دارالعلوم ایک بین الاقوامی مذہبی تعلیمی ادارہ ہے، اس لئے جو بھی ممبر شوریٰ منتخب ہوا، اس کی شہرت ومقبولیت میں اس سے اضافہ ہی ہوا، کوئی شبہ نہیں اس مجلس کی ممبری اس ملک کے دیندار طبقہ میں ایک بڑا اعزاز ہے۔

Marfat.com

مولانا رکن شوریٰ کی حیثیت میں

ایک وقت آیا کہ ارباب دارالعلوم مولانا گیلانی کو اس مجلس کا رکن بنا لینا مناسب سمجھا' چنانچہ ۱۸ شوال ۱۳۴۰ھ مطابق ۲۰ مارچ ۱۹۳۰ء کو جب کچھ جگہیں خالی ہوئیں تو مولانا حبیب الرحمٰن شروانی' مولانا عبدالوہاب دربھنگوی کے ساتھ مولانا سید مناظر احسن گیلانی کو بھی مجلس شوریٰ کا باضابطہ رکن منتخب کیا گیا (دیکھئے رجسٹر کارروائی مجلس شوریٰ)

اس رکنیت کے بعد مولانا گیلانی کے لئے دارالعلوم اپنی مادر علمی میں حاضری کی ایک نئی صورت پیدا ہوگئی۔ سال میں شوریٰ کے عام طور پر دو اجلاس ہوا کرتے ہیں۔ مولانا برابر ان اجلاسوں میں شریک ہوتے رہے اور اپنے گرانقدر مشوروں سے دارالعلوم کی خدمت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔

اخیر میں جب صحت خراب ہوئی تو لمبے سفر سے گھبرانے لگے' ۱۸ محرم ۱۳۶۵ھ کی مجلس شوریٰ میں مولانا کا خط آیا کہ بیمار ہوں تو مجلس میں ان کے لئے دعائیں کی گئیں جو درج رجسٹر ہے۔ اس کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے مجلس میں آنا بند کر دیا۔

مجلس شوریٰ سے علیحدگی

مولانا گیلانی فرماتے ہیں کہ جب میں نے محسوس کیا شوریٰ میں چند مخصوص حضرات کی رائے پر ہی فیصلہ ہونے لگا ہے دوسروں کے مشوروں کی اہمیت ختم ہوگئی ہے' تو سوچا کہ آنے جانے کا کوئی فائدہ نہیں' کام چلنا چاہئے چل رہا ہے' لہٰذا میں نے آنا جانا بند کر دیا' دارالعلوم کی طرف سے خطوط لکھے گئے کہ کیوں تشریف نہیں لاتے' تو مولانا گیلانی نے کچھ لکھنا بھی مناسب نہیں جانا' خاموشی اختیار فرمالی۔

مجلس شوریٰ منعقدہ ۲۰ شوال ۱۳۶۷ھ کی کارروائی میں درج ہے کہ پانچ ممبران سے خط و کتابت ہوئی' تین نے معذرت کا خط لکھا' کہ آنے سے معذور سمجھا جائے اور دو نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ان دو میں ایک مولانا سید مناظر احسن گیلانی کا بھی نام ہے' لہٰذا مجلس نے ان پانچ ممبران کی جگہ دوسرے پانچ علماء کا نام تجویز کیا' اس طرح اس تاریخ سے ضابطہ کے تحت مولانا گیلانی مجلس شوریٰ کی رکنیت سے علیحدہ قرار دیے گئے' اور ممبری کا رشتہ ختم ہوگیا' گویا مولانا کم و بیش بیس سال دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے باضابطہ ممبر رہے۔ مولانا گیلانی کے خطوط میں ہے۔

> "سمجھ میں نہیں آتا کہ دیوبند علمی ادارہ نہیں ہے؟ یا فقیر نمائندہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا' بہر حال سوال و جواب میں تو "تو بمن رسی من بخدا رسم" خیال تھا کہ اگر دیوبند جانا ہوا لیکن اب آں خیال بشکست و آں ارادہ نماند۔" (مکاتیب گیلانی۔ ص ۲۴۳)

۱۶ رجب ۱۳۶۲ھ کی شوریٰ آخری تھی جس میں مولانا گیلانی شریک ہوئے۔ اس کے بعد پھر کبھی مجلس میں شرکت کی نوبت نہیں آئی۔ وجہ وہی ہے جو اوپر نقل ہو چکی۔ پانچ سال بعد مجبوراً مولانا کا نام مجلس کی رکنیت سے ختم کیا گیا۔

Marfat.com

حکیم الامت کی وفات کا اثر

اسی شوریٰ میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کی وفات کی المناک خبر دارالعلوم پہنچی تھی، ۲۱ اگست ۱۹۴۳ء کے خط بنام حضرت العلامہ سید سلیمان ندوی میں مولانا لکھتے ہیں:

"دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ میں شریک ہونے کے لئے دیوبند گیا تھا، کیا معلوم تھا کہ دیوبند کی مجلس ماتم میں شریک ہونا میرے لئے مقدر ہو چکا ہے۔ جس وقت مجلس شوریٰ کا اجلاس شروع ہوا دارالعلوم میں جماعت دیوبند کے اس ستون اعظم کے انہدام کی خبر پہنچی۔"

یہ بھی تحریر فرمایا:

"خدا جانے آپ کہاں ہیں دلی کی گلیوں میں آپ کو ڈھونڈا، اس لئے ڈھونڈتا تھا کہ مل کر روؤں گا اس یتیمی پر جو باپ کے مرنے کے بعد پھر دہرا گئی۔"

تعزیتی جلسہ میں تقریر

اس موقعہ سے دارالعلوم میں تعزیتی جلسہ ہوا تو مولانا گیلانی نے بھی اس میں تقریر فرمائی تھی۔ اپنے خط میں اس کا تذکرہ بھی انہوں نے کیا ہے۔

"حضرت والا (تھانوی) رحمۃ اللہ علیہ.......... کے متعلق دارالعلوم دیوبند میں عندالتعزیت جو ارتجالی تقریر خاکسار نے کی تھی "صدق" میں نظر سے گزری۔"

(پورا خط ملاحظہ فرمائیں۔ معارف (اعظم گڈھ) مارچ ۱۹۶۳ء)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت تھانویؒ کی وفات کے بعد دیوبند آنے میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی تھی چنانچہ اس کے بعد آنا جانا بند ہو گیا تھا۔ خاکسار کی ایک حاضری کے موقع سے مولانا گیلانی نے حضرت تھانویؒ کا ایک گرامی نامہ اپنے نام دکھلایا تھا جس کو ایک کتاب میں چپکائے ہوئے تھے۔ فرمایا کہ کیا عجب ہے کہ یہ خط میری مغفرت کا وسیلہ بن جائے۔ ان شاء اللہ حضرت کا حسن ظن خالی نہ جائے گا۔ طاب اللہ ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ۔

حضرت تھانویؒ سے عقیدت

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا گیلانی کو حضرت تھانویؒ سے بے حد عقیدت تھی۔ ان کے علم وفضل زہد و تقویٰ کے بڑے قائل تھے اور ان کی حیات کو ملک وملت کے لئے غنیمت جانتے تھے۔ اسی مجلس میں مولانا نے یہ بھی فرمایا تھا کہ "جامع المجددین" پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا اکبر آبادی نے "برہان" میں حضرت تھانویؒ پر تنقید کی تو اس کو پڑھ کر میں نے ان کو لکھا کہ اسے بند کریں اور اس کی تلافی کریں چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا جس پر بڑی خوشی ہوئی۔

Marfat.com

اس واقعہ کو بیان کر کے فرمایا بزرگوں پر تنقید عموماً مضر ہوتی ہے۔ اس سے بچنا ضروری ہے۔ سمجھ میں آئے قبول کرو نہ سمجھ میں آئے خاموش رہو۔

مولانا گیلانی کی اولیاء اللہ کی تاریخ پر بھی بڑی عمیق و وسیع نظر تھی اور ان...... اہل اللہ سے ملک و ملت کو جو فائدے پہنچے اس کے دل سے معترف تھے۔ وہ پسند نہیں کرتے تھے کہ کوئی ذی علم ان پر بے جا تنقید کر کے اپنی آخرت برباد کرے۔

حدیث میں آیا ہے کہ اللہ والوں کو چھیڑنا رب العالمین کو پسند نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لئے وعید آئی ہے۔ یہ مولانا کی خوبی تھی کہ اگر وہ اپنے کسی جاننے والے سے کوئی لغزش محسوس کرتے فوراً اس کو مطلع کرتے۔

حضرت گیلانی کو دارالعلوم دیوبند سے بڑی عقیدت و محبت تھی۔ ایک دفعہ فرمانے لگے میرا جی چاہتا ہے کہ تم دیوبند میں رہ کر کام کرتے۔ اس وقت میں دارالعلوم معینیہ سانحہ ضلع مونگیر میں صدر مدرس کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ میرے وہم میں بھی نہ تھا ایسا کبھی ہوگا مگر جب میں ۳ صفر ۱۳۷۶ھ کو ملازم ہو کر دیوبند آیا اور اس وقت کے مہتمم حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب نے میرے مرشد شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کے مشورہ سے میرا از خود تقرر فرمایا تو مولانا کا وہ جملہ کانوں میں گونجنے لگا۔

حیدر آباد عثمانیہ یونیورسٹی میں علمی اور دینی خدمات

مولانا گیلانی ۱۳۳۴ھ کے ابتدائی مہینوں میں دیوبند پہنچے تھے کہ اپنی زندگی قال اللہ وقال الرسول کے غلغلوں میں گزاریں گے۔ یہاں دارالعلوم دیوبند میں مدرس اور ملازم بھی ہو گئے تھے اور ذی الحجہ ۱۳۳۵ھ تک بحیثیت خادم تدریس و تبلیغ خدمت بھی انجام دی۔

مگر قسمت ان کو علوم جدیدہ کے ماحول میں خادم اسلام بنا کر پیش کرنا چاہتی تھی۔ کلکتہ کا ہنگامہ اس کا ذریعہ بنا اور وہاں سے براستہ حیدر آباد دیوبند کے لئے ہی روانہ ہوئے تھے...... کہ تقدیر الٰہی نے حیدر آباد اترنے پر مجبور کر دیا۔ وہی حیدر آباد جس سے ڈیڑھ سال پہلے دامن جھٹک کر دیوبند آ گئے تھے۔

دیوبند سے پھر حیدر آباد

اس کی اجمالی روداد پہلے گزر چکی ہے کہ دیوبند سے حیدر آباد منتقل ہونے کی کیا صورت پیش آئی۔ یہاں مولانا کے شاگرد رشید غلام محمد بی اے کے قلم سے مزید وضاحت ملاحظہ فرمائیں' وہ لکھتے ہیں:

> ''بات یہ ہوئی کہ ان دنوں جامعہ عثمانیہ کی روز افزوں وسعت و ترقی کے ساتھ شعبہ دینیات میں ایک ٹھوس عالم کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ اتفاقاً ۱۹۱۹ء میں مولانا گیلانی کا حیدر آباد آنا ہوا اور یہاں علامہ حمید الدین فراہی سے ان کی ملاقات ہوگئی۔ علامہ فراہی اہل جوہر قابل کو

Marfat.com

پہچان گئے۔ مولانا نے خواہش کی وہ لکچری کے لئے جامعہ میں درخواست دیں مگر مولانا کو دیو بند سے اس قدر انس ہوگیا تھا کہ اس مشورہ کی تکمیل میں تامل ہی رہا لیکن جب خود حضرات دیو بند نے اس مشورہ کی تائید فرمائی تو مولانا کو اس کی تعمیل کرنا پڑی اور ۱۹۲۰ء میں بحیثیت لکچرر ''دینیات لازم'' جامعہ عثمانیہ سے متعلق ہوگئے۔ پھر عرصہ کے بعد شعبہ دینیات میں منتقل کئے گئے۔ پھر ریڈر رہے اور پروفیسر ہوئے اور بالآخر اس شعبہ کی صدارت کو کئی سال تک زینت بخش کر ۱۹۴۹ء میں ریٹائر ہوگئے۔ وہ شعبہ کی جان تھے اور شعبہ دینیات ان کا مجسم ارمان۔'' (مقدمہ مقالات احسانی۔ص ۷)

قیام عثمانیہ یونیورسٹی

اوپر گزر چکا ہے کہ حیدر آباد میں سب سے نمایاں سرکاری مدرسہ دارالعلوم کے نام سے قائم تھا جو ریاست کے مختلف شعبوں میں کام کرنے کے لیے آدمی تیار کرتا تھا اور جس کے مدرسین کی تنخواہوں کا معیار بلند تھا۔ اخیر میں اس کے پرنسپل حضرت مولانا حمید الدین فراہی (م ۱۹۴۹ء) تھے۔ یہی دارالعلوم مولانا حمید الدین فراہی کی تحریک و تخیل اور بابائے اردو مولانا عبدالحق اور دوسرے لوگوں کی کوششوں سے عثمانیہ یونیورسٹی میں تبدیل ہوا۔ اگست ۱۹۱۹ء میں اس کی داغ بیل ڈالی گئی تھی۔ نواب عثمان علی خان والی حیدر آباد کے نام پر اس کا نام تجویز ہوا۔ اس کے قیام اور حالات پر ''یادوں کی دنیا'' نامی کتاب میں یوسف حسین خان نے روشنی ڈالی ہے۔ ''حیات حمید'' میں بھی اس کا تذکرہ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا امین احسن اصلاحی کے قلم سے موجود ہے۔ (ص ۱۰)

اس یونیورسٹی میں شعبہ دینیات کو خصوصی حیثیت دی گئی تھی مگر جب اساتذہ کے تقرر اور گریڈ کے تعین کا وقت آیا تو چونکہ یہ برطانوی حکومت کا زمانہ تھا کچھ لوگوں نے چاہا کہ دینیات کا شعبہ بے وزن رہے اور اس شعبہ کے اساتذہ کا مشاہرہ بھی دوسرے شعبوں کے اساتذہ کے برابر نہ ہو۔ حضرت مولانا گیلانی فرماتے تھے کہ اس شعبہ کو اہمیت دینے اس کے اساتذہ کے لئے دوسرے اساتذہ کے برابر مشاہرہ طے کرانے میں بڑی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی ص ۱۱ (م ۱۹۵۰ء) کی توجہ اور حمایت حاصل نہ ہوتی تو اس میں کامیابی دشوار تھی۔ مولانا گیلانی نے اس طرف اشارہ فرمایا ہے۔

لکھتے ہیں:

''اس کے بعد پھر کیا کیا ہوا' ربع صدی سے زیادہ مدت کے اس عرصہ میں کیا کیا دیکھا' کیا کیا سنا' کن حالات سے گزرا' عثمانیہ یونیورسٹی میرے سامنے حیدر آباد میں کس طرح قائم ہوئی...... استاذوں کی پہلی کھیپ میں شریک ہوکر اس عجیب وغریب تعلیم گاہ میں ہم کیسے داخل ہوئے' یونیورسٹی کے اندر اور یونیورسٹی کے باہر جو کچھ پیش آیا تھا اس کو دکھانے والا کیا کچھ بنا بنا کر دکھاتا رہا اب یہ داستان ماضی ہو چکی...... ورنہ یہ سینہ روزگار کے جن اسرار کا گنجینہ بنا ہوا

ہے اب اس کو کرید کر کیا کیجئے گا۔ روشنی بھی دیکھی اور تاریکی بھی' فراز بھی سامنے آیا اور نشیب بھی' چڑھا بھی اور گرا بھی۔'' (رسالہ دارالعلوم دیوبند۔ اگست ۱۹۵۵ء' ص ۴۵)

اس سے اتنی بات تو ظاہر ہی ہے کہ حضرت مولانا گیلانی اساتذہ کی پہلی کھیپ میں یونیورسٹی کے استاذ مقرر ہوئے اور یونیورسٹی آپ کی آنکھوں کے سامنے قائم ہوئی اور ابتدائی اتار اور چڑھاؤ سب مولانا کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔

عثمانیہ یونیورسٹی میں مولانا کی حیثیت

چونکہ مولانا کی شہرت پہلے کافی ہو چکی تھی' حیدر آباد میں جو اہل علم کی دو اہم مجلسیں تھیں ایک فضیلت جنگ حضرت مولانا انوار اللہ خانصاحب مدارالمہام کی اور دوسری یمین السلطنت مہاراجہ کشن پرشاد پیش کار وزیراعظم کی۔ دونوں میں وہاں کے علماء کے سامنے مولانا کی تقریریں یونیورسٹی کے قیام سے دو سال پہلے ہو چکی تھیں۔ پھر دیوبند میں ڈیڑھ سال رہ کر ''القاسم'' اور ''الرشید'' میں مولانا کے قلم سے علمی اور تاریخی مقالات کافی تعداد میں شائع ہو چکے تھے۔ تقریر اور درس و تدریس کی بھی مشق ہو چکی تھی اور عوام و خواص میں کافی مقبول بھی تھے اس لئے عثمانیہ یونیورسٹی میں کسی استاذ سے کسی اعتبار سے اپنے فن میں نیچے نہیں تھے اور نہ نیچے سمجھے جاتے تھے۔ بحیثیت استاذ جب لکچر دینے لگے تو طلبہ کی بھیڑ جمع ہو جاتی تھی حتیٰ کہ ہندو طلبہ بھی کھنچ کر آ جاتے تھے۔ مولانا کا لکچر علم و فن اور اثر کے اعتبار سے ممتاز ہوا کرتا تھا اور جامعہ کے ہونہار طلبہ لکچرز سننے کے لئے ٹوٹ پڑتے تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے ایک شاگرد نے بہت درست لکھا ہے:

> حضرت مولانا گیلانی پر مولیٰ کے کرم کی خاص نشانی پیدائش کے اعتبار سے قصباتی' مگر شہرت کے اعتبار سے عالمی قد و قامت کے مختصر مگر فکر و نظر کے ناپیدا کنار سمندر' علم و بصیرت کے یگانہ مگر عام امور زندگی سے بے گانہ' دماغ کے زیرک' مگر دل کے دیوانے' ہوشیاری و مستی کا سنگم' میدان تقریر کے شہسوار اور تحریر کے سید القلم۔'' (تذکرہ شاہ ولی اللہ۔ ص ۳)

استاذی اوصاف

درس و تدریس میں کامیابی کے لئے جو چیزیں ضروری ہیں مولانا میں وہ سب بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں۔ اخلاص' طلبہ سے ہمدردی و شفقت' مطالعہ کی وسعت و گہرائی' انداز بیان کی ندرت اور اثر اندازی' علمی وقار' ماحول اور تقاضائے زمانہ پر نظر' جب بولنے پر آتے مسلسل بولتے چلے جاتے۔ معلوم ہوتا تھا علم و تحقیق کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ مولانا بہت جلد یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ پر چھا گئے' مولانا کے ایک شاگرد لکھتے ہیں:

> ''مولانا گیلانی کی دقت نظر' وسعت فکر' علوم دینی میں ان کا تبحر اور مسائل حاضرہ پر ان کی علمی دیانت اور مجتہدانہ جرأت' ان کی بے لوث خدمت اور جامعہ سے ان کی شیفتگی نے ان کی شخصیت کو ہر دور کے طلباء اور ہر شعبہ کے اساتذہ میں وہ عظمت اور محبوبیت عطا کر دی تھی جو ان سے

Marfat.com

پہلے یا بعد کسی کو نہ مل سکی ہے۔ ع۔ یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا۔" (مقدمہ مقالات احسانی۔ ص ۸)

واقعہ ہے کہ مولانا نے اپنی بے پناہ محنت اور اخلاص سے تھوڑے ہی دنوں میں حیدر آباد شہر میں بھی اور یونیورسٹی کے حلقہ میں بھی ایک امتیازی مقام پیدا کر لیا تھا۔ اسی کے ساتھ طلبہ میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی تھی چنانچہ علم کے ساتھ دین قیم سے ان کی وارفتگی کی شان کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں ہے۔

مولانا میں اساتذہ کے اوصاف

مولانا نے جن اساتذہ سے پڑھا تھا وہ سب اپنے دور کے بے نظیر علماء ربانیین تھے۔ علم و عمل میں ممتاز مجتہدانہ شان کے مالک اور ذہن ساز تھے۔ خود سوچیے حضرت مولانا برکات احمد صاحب میر نگری ثم ٹونکی جیسے فاضل روزگار استاذ' عالمی شہرت کے مالک جو اپنے وقت میں خیر آبادی مکتب فکر کے امام کی حیثیت رکھتے تھے' دوسری طرف دیوبندی مکتب فکر کے امام شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن عثمانی (م ۱۳۳۹ھ) محدث العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیری (م ۱۳۵۲) مفسر قرآن حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی جیسے عبقری الذہن اور آفاقی الفکر اساتذہ کرام' تیسری طرف خود مولانا گیلانی کا سا مثالی حافظہ' ذہن اخاذ' فکر دور رس اور نظر عمیق پھر مطالعہ اور کتب بینی کا ذوق اور اس سے شغف!

جامعہ عثمانیہ میں استاذ ہوئے تو نئے علوم و افکار سے واسطہ پڑا' جدید علوم کے تعلیم یافتہ اور ماہرین سے مقابلہ کرنے میں ذہن و فکر نے کسب کمال میں تیز رفتاری دکھائی۔ پھر ماحول ایسا علمی ہاتھ آیا کہ اس میں رہی سہی کسر پوری ہوگئی اور تھوڑے تجربات کے بعد ذہنی و فکری اپج نے مولانا کو جدید و قدیم علوم کا سنگم بنا دیا۔

طلبائے یونیورسٹی میں بیداری کی سعی

جن طلبہ کو آپ نے پڑھایا تھا آپ کے وکیل اور مخلص بن گئے اور یہ ذہن نشین ہو گیا کہ تحصیل علم کا اصل مقصد ذہنی غلامی سے آزاد ہونا ہے اور اس میں کوتاہی جرم ہے۔ ان کی یہی عمر بننے' سنورنے اور اُبھرنے کی ہے۔ اس غنیمت اوقات کا ضائع کرنا کسی طرح جائز نہیں' یونیورسٹی کا یہ ڈھانچہ ان کی ذہنی صلاحیت کو کارآمد بنانے کے لئے ہی عمل میں آیا ہے۔ ریاست کی اس ساری تعلیمی سرگرمی کا ماحصل نوجوانوں کی ذہنی و فکری اصلاح ہے اور اس کے بعد جو کچھ ہے وہ ضمنی طور پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے منتخب اہل علم کو اساتذہ کی صف میں لانے کی سعی کی گئی ہے' نظام حیدر آباد کے اخلاص کا بھی اعتراف کرنا ہوگا جس کے ثمرات سامنے آ رہے تھے۔

مولانا گیلانی طلبہ پر قابو یافتہ تھے' طلبہ کو آپ سے انس پیدا ہو گیا اور انہوں نے اپنی تمام تر توجہ طلب علم پر لگا دی۔ آپ کے ایک شاگرد کا ہی بیان ہے:

> طلباء پر مولانا کی شفقت قدیم اساتذہ کے لطف و کرم کی ایک زندہ یادگار تھی۔ ان کی شفقت افادۂ علم ہی تک محدود نہ تھی بلکہ اپنے شاگردوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے وہ جامعہ کے اندر اور باہر ہمیشہ پوری قوت صرف فرماتے رہے بلکہ بعض صورتوں میں ان کے نجی معاملات مثلاً

Marfat.com

شادی بیاہ میں بھی مولانا کے الطاف برابر شامل رہتے تھے۔" (مقدمہ مقالات احسانی۔ص ۱۶)

ذوق مطالعہ کا کرشمہ

مولانا گیلانی کا ذہن رسا تھا۔ مطالعہ سے قلبی شغف تھا۔ حافظہ قوی رکھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وقت کا کوئی حصہ ضائع نہ ہوتا تھا اور ہر وقت علم وفن میں غرق رہا کرتے تھے۔ کتب بینی کے ذوق وشوق نے بہت سارا مواد آپ کے ذہن میں فراہم کر رکھا تھا۔ تفسیر' حدیث' فقہ' علم کلام اور تاریخ اسلام مولانا کا خاص موضوع تھا مگر اسی کے ساتھ نئے علوم کی کتابیں جو سامنے آ جائیں مولانا بڑے شوق سے ان سے بھی استفادہ جاری رکھتے۔ قلم بھی رواں دواں رہتا اور زبان بھی اپنا کام کرتی رہتی۔ افادہ اور استفادہ سے کوئی لمحہ حتی الوسع خالی نہ ہوتا تھا۔

کسی ذہین وذکی استاذ کا جب یہ حال ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ اپنے زمانہ میں مجتہدانہ انداز میں کام کرنے پر قادر ہو جائے گا۔

کمالات علمی

مولانا عبدالباری ندوی (م ۱۹۷۶ھ) نے لکھا ہے جو خود جامعہ عثمانیہ میں استاذ تھے:

"تاہم ان کی ژرف نگاہی اور دوررس ذہن ایسے بہتر حقائق کو پالیتا ہے جن پر سلف سے خلف تک شاید کسی مفسر قرآن کی نگاہ پڑی ہو۔" (مقدمہ مکاتیب گیلانی)

یہی بزرگ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

"یوں مولانا کے علمی وذہنی کمالات پر ایک اچٹتی غلط انداز نظر کا عالم بھی یہ تھا کہ دس بیس منٹ بھی جو پاس بیٹھ جاتا' ان کے تفوق سے مسحور ہوئے بغیر نہ اُٹھتا۔ ہر طرح کے علمی و دینی معلومات کی بہتات ان سے عجیب عجیب نتائج استنباطات' پھر حسن تعبیر کی ندرت و برجستگی ہر چیز بجائے خود "دامن دل" کے لئے "کرشمہ دل کش" ہوتی۔ نجی ومجلسی گفتگو یا خطاب خاص سے اوپر عام خطاب یا خطابت سنئے تو یہ کمالات اور زیادہ مبہوت کر دیتے۔" (ایضاً)

مولانا کی صاف دلی

عرض یہ کرنا ہے کہ مولانا گیلانی کے ذہن وفکر کی دوررسی اور مطالعہ ومعلومات کی وسعت...... اور اسی کے ساتھ نتائج اخذ کرنے کی جو مجتہدانہ صلاحیت تھی' آپ کے ہم عصر علماء اور تلامذہ دونوں ہی اس کے قائل ہیں۔

اس کے ساتھ مولانا کا دل اس قدر صاف اور بے غش تھا کہ کبھی اپنی بڑائی اور استعداد پر کبر وغرور کا شائبہ بھی نہیں پایا گیا بلکہ سراپا تواضع بنے رہتے۔ اپنے چھوٹوں کو خوب ابھارتے' ان کی حوصلہ افزائی کرتے حتیٰ کہ کبھی کبھی اگر وہ

Marfat.com

ناسمجھ ہوتا تو بے جا تعلّی میں مبتلا ہو جاتا۔

مولانا ندوی نے لکھا ہے:

''ملنے جلنے' خط و کتابت وغیرہ کسی چیز میں اپنی دینی و دنیوی علمی و ذہنی برتری یا دوسروں کو ان کی کم تری محسوس نہیں کراتے بلکہ خردوں' شاگردوں کو اتنا بڑھاتے کہ بزرگوں' بڑوں کے لیے زبان ولغت جواب دے جاتے۔ حضرت حالی کی طرح حضرت گیلانی نے بھی کہنا چاہئے اپنی ''خاکساری'' کا مستقل کام ہی یہ بنا رکھا تھا کہ ہر حال و قال سے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ بناتے رہیں۔''

168

خاکساری اپنی کام آئی بہت

ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا'' (ایضاً)

احساس و شعور

اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ حضرت گیلانی کو اپنے علم و فن اور ذہن و فکر پر اعتماد نہیں تھا یا وہ اپنے وسعت مطالعہ اور دقتِ نظر پر بھروسہ نہیں کرتے تھے۔ یقیناً کرتے تھے' اور کیوں نہ کرتے کہ ذہین بھی تھے' طباع بھی تھے اور قوی الحافظہ بھی تھے۔ ان کے ساتھ ان کا ذہن و فکر برق رفتاری سے کام کرتا رہتا تھا۔ مولانا ندوی لکھتے ہیں:

''ایسا نہیں کہ مولانا کو اپنے ان بیشمار وہبی و کسبی کمالات کا کوئی احساس و شعور نہیں تھا۔ اتنے ذہین و ذکی اتنے بے حس و بے شعور کیسے ہوتے' ذہنی و علمی برتری کا بھی شعور تھا' اپنی کتابوں' مضمون وغیرہ پر اعتراض و نکتہ چینی کو بھی محسوس فرماتے۔ گراں خاطر بھی ہوتے۔ جواب بھی دیتے لیکن تمام کمالوں سے بڑھا ہوا کمال ان کا یہی تھا کہ وقتی و طبعی تاثر کے سوا قلب کی سلامتی میں کوئی فرق نہ آنے پاتا' یعنی کسی کی طرف سے کسی ظلم و زیادتی کے باوجود دل میں کوئی گرہ دو چار دن کے لئے بھی نہ پڑتی' نہ وہ غلی کیفیت پیدا ہوتی جس سے بچتے رہنے کی قرآن نے خاص طور پر دعا کی تعلیم فرمائی ہے۔ ربنا لاتجعل فی قلوبنا غلاً للذین امنوا'

(مقدمہ مکاتیب گیلانی، ج ا ص ۴۰)

تلامذہ کی تربیت

169

آخر میں مولانا نے اپنے بہت سے شاگردوں کو مختلف مضامین میں پی ایچ۔ ڈی کرایا تھا۔ بی اے اور ایم اے کلاسوں میں لیکچر دیتے تھے۔ ان میں بڑے بڑے ذہین' محنتی اور مطالعہ کرنے والے بھی ہوتے تھے۔ پھر یہ کیوں کہ ممکن ہے کہ مولانا کو اپنے علم و فضل اور کمالات کا شعور نہ ہوتا۔ اہل علم کی سوسائٹی میں دن رات رہتے تھے۔ گفتگو کرتے تھے۔ مضامین لکھنے بیٹھتے تو قلم رکنا جانتا ہی نہ تھا۔ تین چار صفحات کے مضمون کے لئے کسی ایڈیٹر صاحب کی فرمائش پر قلم اٹھاتے تو وہ سینکڑوں صفحات پر جا کر رُکتا۔

Marfat.com

نفس پر قابو

مولانا گیلانی کا نفس مسلمان ہو چکا تھا۔ وہ تابع رہتا۔ کبھی اپنے اوپر اس کو غلبہ کا قطعاً موقع نہیں دیتے۔ طبیعت میں نہ ضد تھی اور نہ تعلّی و ترفع۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن عثمانی قدس سرہ سے جب شکوک و شبہات کی شکایت کی تھی اور شیخ الہند نے فرمادیا تھا جاؤ اب کوئی اس طرح کی بات نہیں ہوگی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اسی دن سے مولانا کا قلب اور دماغ مومن کامل ہو گیا تھا جس کا مولانا نے خود اعتراف بھی کیا ہے اور جو پہلے نقل بھی کیا جا چکا ہے۔ مولانا عبدالباری ندویؒ جو حکیم الامت تھانویؒ کے مرشد تھے اور بہت سلجھی ہوئی طبیعت کے مالک اور کتاب و سنت کے باب میں شدت رکھتے تھے اور برسہا برس حضرت گیلانی کے ساتھ حیدر آباد میں ان کا رہنا سہنا ہوا۔ انہوں نے لکھا ہے:

> ''سالہا سال روز مرہ ہر طرح کے نجی سے نجی اور قریبی سے قریبی تعلقات و معاملات کا سابقہ رہا' ایک بات بھی یاد نہیں جس میں بات کی پیچ یا نفس و نفسیات کی ضد اور ہٹ کا کوئی نام و نشان ملا ہو' بلکہ......دوسروں کی سخن پروری و خود رائی کے سامنے خود ہی سپر ڈال دیتے۔ مزاحمت و مقابلہ طبیعت میں تھا ہی نہیں' فنا ہی فنا کا غلبہ رہتا۔ اس فنائیت کی قدر پوری طرح جب ہوتی ہے کہ علم و قلم' دین و دنیا کی کوئی بڑائی رکھنے والا خصوصاً ان کے ہمعصروں کے رنگ و روش کا اس پہلو سے مقابلہ پڑتا ہے' اس لحاظ سے مولانا کو اپنے ہم چشموں میں فرد فرید ہی پایا۔'' (ایضاً۔ ص ۱۴۱ ج ۱)

رذائل اخلاق سے پاک وصاف

مولانا کی صاف دلی کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا ندوی لکھتے ہیں:

> ''مولانا میں جو بھی کمزوریاں رہی ہوں اور معصوم کون بشر ہے لیکن جہاں تک دل کا تعلق ہے کہنا چاہئے کہ اس کی تمام بیماریوں سے ان کو پاک ہی پایا۔ بغض و حسد' انتقام و عداوت' ریا و نفاق' نمود و نمائش' حرص و ہوس' طول امل وغیرہ کے نفسانی جذبات کا کوئی داغ دھبہ یاد پر زور ڈالنے سے بھی' ان کے آئینہ دل پر پڑنا خصوصاً ٹھہرنا قطعاً یاد نہیں پڑتا۔'' (ایضاً۔ ص ۴۲)

خود سوچئے' جو عالم دین اتنا صاف دل' پاک باطن اور علم و عمل سے آراستہ ہو اس کی تعلیم اور درس و تدریس سے اس کے تلامذہ کیسے متاثر نہ ہوتے ہوں گے اور مولانا کی تربیت سے تلامذہ کے علم و عمل میں برکت کیسے نہیں ہوتی ہوگی۔ ایسے اساتذہ اب کہاں ملتے ہیں' کمیاب ہی نہیں نایاب ہیں۔ جب استاذ باکمال ہوتا ہے شاگردوں پر اس کا اثر پڑنا ضروری ہے اور شاگردوں میں بھی صرف ان کے علم ہی میں جلا پیدا نہیں ہوتا ہے بلکہ اپنا تجربہ یہ ہے کہ قلب بھی روشن ہوتا چلا جاتا ہے اور دماغ بھی محروم نہیں رہتا......مولانا گیلانی کے دو چار تلامذہ کی......تصنیفات نظر سے گزری ہیں' ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے بڑا کام کیا ہے اور بڑی اچھی نسل تیار کی ہے۔ ان کے علم و فضل سے دنیا سیراب

Marfat.com

ہورہی ہے اور ان شاء اللہ ہوتی رہے گی۔

اثر اندازی

مولانا گیلانی نے اپنے تلامذہ کو تیار کرنے اور ان میں اسلامیات کا ذوق پیدا کرنے میں اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف کیں اور بہت کافی محنت کی اور اس راستہ سے بڑی اہم علمی خدمات انجام پائیں۔

حضرت العلامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"اس زمانہ میں اس فرض کو ادا کرنے کے لئے جو دستہ آگے بڑھا، اس کے ہراول دستہ میں ہمارے دوست مناظر اسلام، متکلم ملت، سلطان القلم مولانا سید مناظر احسن گیلانی متع اللہ المسلمین بطول بقائہ کا نام نامی ہے جن کے قلم کی روانی، اسلام کی محافظت میں تیغ رانی کا کام دیتی ہے، وہ ہر سال اور سال کے مختلف حصوں میں اپنی تحقیقات علمیہ کے بلند نمونے پیش کرتے رہتے ہیں اور خصوصاً اپنے توسیعی خطبات، اپنے تلامذہ کے امتحانی مقالات کے پردے میں علم اور دین کی ایسی خدمتیں انجام دے رہے ہیں جو سارے مسلمانوں کی تحسین اور شکریہ کے مستحق ہیں۔" (مقدمہ تدوین حدیث۔ ص ۸)

جدید تعلیم یافتہ سے شکوک وشبہات کا ازالہ

حضرت مولانا عبدالباری ندوی نے لکھا ہے:

"حضرت (مولانا مناظر احسن گیلانی) مرحوم کی اس موہوب ندویت کے لئے واہب العطایا جل مجدہ نے عثمانیہ یونیورسٹی کا میدان بھی خوب ہی عطا فرما دیا تھا۔ اس اسٹیج پر ان کے خصوصی کمالات کا پہلا نظارہ سالہا سال تک "دینیات لازم" کی کرسی سے ہوتا رہا، اس میں ایک طرف انٹر سے لے کر بی اے و بی ایس سی، آرٹ، سائنس کے سینکڑوں، ہزاروں طالب علموں کے جدید ذہنی سانچہ اور اس میں ابھرنے والے دینی شکوک وشبہات کے جاننے پہچاننے کا بھرپور موقع ملا۔ دوسری طرف ان کے ازالہ و امالہ کا جدید تعبیرات و اصطلاحات ہی کے ذریعہ اپنی وہبی قابلیتوں سے خوب خوب کام لینے کا۔" (مقدمہ مکاتیب گیلانی، ص ۵۷)

الحاد کی ظلمت میں ایمان کا نور

انگریزی دور حکومت میں حکومت کے ہی ایماء سے مسلمانی اذہان و افکار میں شکوک وشبہات کا ایک سیلاب تھا جو چاہتا تھا کہ مسلمانوں کو دائرہ اسلام سے دور بہالے جائے اور الحاد و دہریت کے غار میں ڈال دے

Marfat.com

اور اس وقت کے کالج، سکول اور یونیورسٹیوں کا تو حال مت پوچھئے کہ وہاں پڑھنے والے مسلمان نوجوانوں کا ذہن انگریزی پروپیگنڈے سے کس طرح مسحور تھا اور اپنے یہاں کے دینی احکامات کو وہ کس نظر سے دیکھتے تھے اور اگر مسلمان نوجوان علی گڑھ مسلم یونیورسٹی یا حیدرآباد عثمانیہ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے تو ان دونوں اشکالات کا ناپنا آسان نہیں ہوتا تھا۔

مولانا عبدالباری ندوی نے درست لکھا ہے:

''نہ جاننے والے اندازہ ہی نہیں کر سکتے کہ جدید علوم وفنون کے معلمین، ان کی تعلیم گاہیں اور ان میں تعلیم تربیت کا ماحول، سب مل ملا کر دین حق کے لئے ایسے سم قاتل کا حکم رکھتے ہیں کہ کوئی بڑا ''بطنی سعید'' ہی عمل تو عمل ایمان کو بھی صحیح سلامت لے کر ان سے باہر آپاتا ہوگا لیکن جاننے والے یہ بھی جانتے ہیں کہ حضرت گیلانی کے زیر درس ''دینیات لازم'' کے سیکڑوں طالب علموں میں کوئی بہت بڑا ''بطنی شقی'' ہی ہوتا ہوگا، جو ہر روز تازہ بتازہ درسوں سے تازہ بتازہ ایمان لے کر نہ باہر آتا ہو'' (ایضاً ص۵۰)

جامعہ عثمانیہ میں اہم خدمات

یہ واقعہ ہے کہ حضرت گیلانی نے حیدرآباد یونیورسٹی میں درس وتدریس کی خدمت پر مامور رہ کر بڑی اہم دینی خدمات انجام دی ہیں۔اس سے علیحدہ رہ کر یہ خدمات انجام نہیں دے سکتے تھے، جزاہ اللہ خیر الجزاء۔

آج کل کی بات نہیں ہے بلکہ یہ انگریزی دور حکومت کے دور شباب کی باتیں ہیں جب انگریزی نصاب تعلیم سکول، کالج اور یونیورسٹیوں میں اسی مقصد سے پڑھایا جاتا تھا کہ بقول لارڈ میکالے صورت وشکل کے اعتبار سے تو ہندوستانی معلوم ہوں لیکن فکر وذہن کے اعتبار سے انگریز بن جائیں اور اپنے مذہب سے یا تو بیزار ہوں یا پھر اس قدر شکوک وشبہات میں گرفتار ہو جائیں کہ اپنے مذہب کی حمایت معیوب سمجھنے لگیں اور کوئی شبہ نہیں کہ اس دور غلامی میں انگریز اپنے اس مقصد میں پچاس پچھتر فیصدی کامیاب تھے۔

ذہنی وفکری اصلاح

حضرت مولانا گیلانی نے ایسے ماحول میں مسلمان نوجوانوں کی ''دینیات لازم'' کے شعبہ میں میٹرک سے لے کر بی ایس سی اور آرٹ وسائنس کے ہزاروں طلبہ کی ذہنی وفکری تربیت کا فریضہ ادا کیا اور اپنے رسوخ فی العلم صاف باطنی اور اخلاص کے باعث سو فیصدی کامیاب رہے۔ ایسے افراد تیار کیے جو وہاں سے نکل کر مختلف ممالک اور خود اپنے ملک کے مختلف حصوں میں مسلمان نوجوانوں اور اسلام کی خدمت انجام دینے کا فریضہ ادا کر سکیں اور ماشاءاللہ کتنے ہی آج یہ خدمات انجام دے رہے ہیں۔

Marfat.com

چونکہ مولانا پر دارالعلوم دیوبند کے قدیم علماء کی گہری چھاپ تھی' اخلاص وللّٰہیت میں ڈوبے ہوئے تھے اور مقصد پیٹ کی خدمت سے زیادہ روحانی اور دینی خدمت تھی اور یہ سب حضرت شیخ الہندؒ کی دعاؤں کی برکت تھی۔ مولانا ندویؒ نے اپنے تجربہ کے بعد بجا طور پر تحریر کیا ہے۔

''مغربی و اسلامی فلسفہ کے علاوہ سال دو سال مولانا کی جانشینی میں دینیات لازم لکچروں کا بھی تجربہ ہوا۔ اس سے اور بھی اندازہ ہوا کہ اسلام کی ایک اس نصرت و خدمت کی بدولت آج وہ اسلام کے خدا و رسول دونوں کے حضور کیسے سرخرو ہو رہے ہیں اور کیسی رضا اور رحمتوں سے ان شاء اللہ نوازے جا رہے ہوں گے۔'' (مقدمہ مکاتیب گیلانی، ص ۵۸)

الحادی ذہن کی یورش

انگریزی دور حکومت میں الحاد و ارتداد کو ایک نئے لباس میں عوام و خواص کے اندر پھیلانے کی جدوجہد جاری تھی اور کہا جا سکتا ہے کہ...... آزاد ہندوستان میں بھی یہ سلسلہ آج جاری ہے۔ یہ فلسفہ اور عقلی سازشوں کا لباس ہے جس سے وہ تعلیم یافتہ کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ مذہب خواہ کوئی بھی ہو' معاشی ملکی ترقی میں آہنی دیوار کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب تک اس آہنی دیوار کو گرایا نہیں جاتا اور تعلیم یافتہ اس کے مسمار کرنے میں تعاون نہیں کرتے نہ قوم وملت سربلندی حاصل کر سکتی ہے اور نہ ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔ یہ فلسفہ اس تیز رفتاری کے ساتھ رواں دواں ہے کہ جدید تعلیم یافتہ بڑی آسانی سے اس فلسفہ کے جال میں پھنس جاتے ہیں اور انہیں احساس تک نہیں ہو پاتا کہ وہ اپنے دین سے کس قدر دور جا پڑے۔ دوسری قوموں کے افراد کی طرح مسلمان تعلیم یافتہ بھی اس کے شکار ہو جاتے ہیں اور اپنے اسلام سے بدظن اور دور ہوتے چل جاتے ہیں اور جس طبقہ میں یہ فلسفہ جاری وساری ہے عام علماء کرام کی وہاں تک پہنچ نہیں ہو پاتی ہے اور نہ ان کا ان سے کوئی میل ملاپ ہوتا ہے بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ عام علماء کو اس الحادی اور ارتدادی فلسفہ کی خبر تک نہیں ہوتی۔ جب بیگانگی کا یہ عالم ہو تو خود سوچا جا سکتا ہے کہ عام علماء کس طرح تبلیغ کا وہ فریضہ ادا کر سکتے ہیں جو ان پر عائد ہوتا ہے' انگریزی دور حکومت میں یہ بات اور بھی پائی جاتی تھی کہ مسلمان نوجوانوں کو ان کے مذہب سے متنفر کیا جائے۔

اس ماحول میں مولانا گیلانی کی خدمت

حضرت گیلانی چونکہ اسی ماحول میں رہتے تھے' اس فلسفہ کے تانے بانے کی اچھی واقفیت رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ کہاں سے شروع ہوتا ہے' کس رفتار سے چلتا ہے اور اس کے حملہ آور ہونے کی کیا تدبیریں ہیں۔ مولانا بلا کے ذہین تھے' معقولی ذہن تھا' ٹونک میں سات سال انہوں نے ضائع نہیں کیے تھے' پھر رنگ ان پر شیخ الہندؒ علامہ کشمیریؒ اور حضرت عثمانی کا تھا۔ ذہن آفاقی' علم وہبی و کسبی اور زبان و بیان موجودہ حالات کے مطابق' شیریں اور دل نشیں' اس لئے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں پر کنٹرول کرنے میں نہ ان کو زیادہ دیر ہوتی تھی نہ قلبی اذیت۔

Marfat.com

جذب و مستی اور اس کا اثر

میں نے خود دیکھا ہے کہ جب مولانا آنکھیں بند کر کے بولنے پر آتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ کی باتیں کانوں کے راستے سے براہ راست دلوں میں اُتر رہی ہیں۔ عقل و دماغ دونوں کو اطمینان حاصل ہوتا تھا اور کہنا چاہئے کہ ایک طرح کی فرحت و بشاشت بھی حصہ میں آتی تھی۔

مولانا ندوی نے بھی لکھا ہے:

> ''یک گونہ بے خودی اور جذب و مستی کا رنگ تو ان میں اتنا نمایاں کہ تھوڑا واقف کار بھی اس سے ناواقف نہ رہتا' ہر کسی کو کسی نہ کسی شخص یا شے سے نفرت بھی ہوتی ہے اور کسی سے محبت بھی' مولانا (گیلانی) کو کسی شے سے رہی ہو تو رہی ہو لیکن کسی شخص کی طرف سے ان کے سینہ میں کبھی کسی نفرت کا سراغ نہ ملا۔'' (ایضاً۔ ص ۵۳)

نفسانیت سے پاک

اپنا تجربہ لکھتے ہیں:

> ''یہ سراپا نفس و نفسانیت سے پاک تھے۔ راقم اپنے ۳۳۔۳۴ سال کے ہر طرح تعلقات و معاملات پر مبنی ان کے تجربات کو سامنے رکھ کر پوری ذمہ داری و ایمان داری سے شہادت دیتا ہے کہ ایک مرتبہ بھی کبھی...... ان کی کسی بات سے دل کی کسی کھوٹ یا اندر کے کسی دنی یا خسیس جذبہ کا اثر پڑا نہ خود اپنے اوپر قطعاً یاد ہے' نہ کسی دوسرے پر' زیادہ سے زیادہ یہ کہ بس کچھ وقتی طبعی اثر ہو گیا۔'' (ایضاً)

مجموعہ کمالات

حاصل یہ ہے کہ مولانا گیلانی اپنے تلامذہ پر مؤثر اپنی ان بے انتہا خوبیوں کی وجہ سے تھے جو قدرت کی طرف سے انہیں عطا کی گئی تھیں۔ بے نفس آدمی کو دیکھا گیا ہے کہ اثر انداز لازماً ہوتا ہے' دوسری طرف علم و معلومات کی بھی کمی نہیں تھی۔ آپ کے ایک تلمیذ نے لکھا ہے:

> ''مولانا (گیلانی) قدس سرہ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے خیر آباد و دیوبند کے اکابر اساتذہ کے فیض یافتہ تھے' پھر جب حیدر آباد آئے تو یہاں علامہ حمید الدین فراہی سے استفادہ فرمایا جو ایک خاص فکر قرآنی کے مالک تھے۔ ادھر جامعہ عثمانیہ کے تعلق سے مغربی افکار و مغربی ذہن سے واقفیت ہی نہیں بلکہ اس سے گہرا ربط قائم ہو گیا تھا۔ ان گونا گوں مؤثرات میں مولانا کی ذہنی

Marfat.com

تشکیل ہوئی' چنانچہ جامد مولویت کو (جو مسائل حاضرہ سے بے خبر ہو) خود مولانائے مرحوم ناقص تصور فرماتے تھے اور لیکچر اور گفتگو کے دوران میں جب مسائل حاضرہ پر مجتہدانہ روشنی ڈالتے تو ''بے چارے مولوی نے سمجھا نہیں'' کا جملہ اکثر مسکراہٹ کے ساتھ ان کی زبان سے نکل جاتا' مولانا کا حافظہ مثالی' ذہن بہت اخاذ' فکر دوررس اور بڑی مجتہدانہ تھی۔''

(مقدمہ مقالات احسانی)

177

انداز بیان

انداز بیان بھی بڑا دل نشین اور پیارا ہوتا تھا۔غلام محمد صاحب جو مولانا کے تلمیذ ہیں' انہوں نے لکھا ہے:

''بیٹھتے تو آنکھیں بند کیے اور سر جھکائے رکھتے تھے مگر جب بولتے تو ان کی زبان سے پھول جھڑتے تھے اور اس کی شیفتگی اور ذکاوت مخاطب کو مسخر کر لیتی تھی۔''

(مقالات احسانی)

مولانا علی میاں کی شہادت

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے لکھا ہے کہ جب کبھی مولانا لکھنؤ تشریف لاتے تو ان کی مجلس میں حاضر ہوتا تھا' اس وقت کے دو تاثرات باقی رہ گئے ہیں۔

''ایک ان کی شیریں گفتاری' شگفتہ بیانی' دوسرے ان کی نورانی صورت' خندہ پیشانی۔ ان دونوں صفتوں نے مل کر ان کی شخصیت میں عجیب دلآویزی اور دلکشی پیدا کر دی تھی اور کسی طرح ان کی موجودگی یا گفتگو طبیعت پر بار نہیں ہوتی تھی......اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا کو اس لطافت سے خوب نوازا تھا اور اسی وجہ سے وہ اپنے حلقہ احباب میں بڑے محبوب اور اپنے حلقہ تلامذہ و مستفیدین میں بڑے مقبول تھے اور جو ان کی صحبت میں ایک مرتبہ بیٹھ جاتا وہ یہ کہتا ہوا اُٹھتا کہ

بہت لگتا ہے جی صحبت میں ان کی''

(پرانے چراغ، ص ۶۳ و ۶۴)

مولانا کی مجلس کا حال

مولانا علی میاں مدظلہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا گیلانی اپنے کو کبھی بڑا بنا کر نہیں پیش کرتے تھے' بلکہ ملنے والوں سے ایک ساتھی کے انداز میں گفتگو کرتے تھے' اس کا بھی مخاطب پر گہرا اثر پڑتا تھا'

''مولانا کی مجلس میں بڑا انبساط تھا' علمی و درسی اصطلاح میں تنزل بھی تھا' لطائف بھی تھے' واقعات بھی تھے اور چیدہ ومنتخب اشعار بھی' اور وہ بھی ترنم کے ساتھ' دلنوازی اور شفقت بھی تھی اور علمی و تحقیقی شان بھی' اور اس بات کا ثبوت کہ علم ان کا ایسا جزو بدن ہوگیا تھا کہ ان کو اس کا احساس باقی نہیں رہا تھا' اس لئے اس کے موقع بے موقع اظہار کی ضرورت نہ تھی۔'' (ایضاً)

تاریخِ ہند پر نظر

سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے اپنی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا کے متعلق لکھا ہے:

''انہوں نے از راہ لطف و کرم معانقہ فرمایا اور پھر میرا ہاتھ پکڑ کر الگ لے گئے' میرے سامنے اس وقت ایک منور چہرہ تھا' جس پر نرمی' شگفتگی' پاکیزگی اور برگزیدگی برس رہی تھی۔ ان کا نورانی چہرہ دیکھ کر دل کہتا تھا کہ ان کے قلب میں شاید معصیت کا وسوسہ بھی کبھی پیدا نہ ہوتا ہوگا' داڑھی سفید ہو چکی تھی لیکن چہرے پر اس طرح زیب دیتی تھی جیسے اسی کے لئے بنائی گئی ہو۔ ہندوستان کی تاریخ پر ایسی عالمانہ اور دلکش گفتگو شروع کردی کہ مجھ کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ شربت کے گھونٹ میرے حلق میں اُتر رہے ہیں۔ مہابھارت' رامائن' گیتا' البیرونی' ابن بطوطہ...... ضیاء الدین برنی پر ایسی مبصرانہ گفتگو سنی کہ مجھ کو حیرت ہو رہی تھی کہ میں کسی عالم دین یا دینیات کے معلم کے سامنے ہوں' یا تاریخ کے کسی ماہر کے پاس بیٹھا ہوں...... جب تک علمی گفتگو کرتے رہے میں ان کے فکر و نظر میں کھویا ہوا محو حیرت بنا رہا اور ان کی نکتہ رسی اور مجتہدانہ طریقہ فکر کے بوجھ سے دبتا چلا گیا۔'' (معارف' مارچ ۱۹۵۷ء)

اچھے تلامذہ کی ایک جماعت

مختصر یہ کہ مولانا گیلانی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے ذریعہ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں میں دینداروں کی ایک اچھی مضبوط ٹیم تیار کر گئے جن کے دل و دماغ اور ذہن و فکر سب مسلمان ہیں۔ لکھنے پڑھنے اور تصنیف و تالیف میں یہ مخلص ہیں اور یہ ٹیم برابر علمی لائن سے دین و ملت کی خدمت میں مشغول ہے اور اس کے خاطر خواہ فوائد برابر سامنے آتے رہتے ہیں۔ اس موقع سے مولانا......سعید احمد اکبر آبادی کی وہ باتیں یاد آ رہی ہیں جو انہوں نے مولانا کی وفات پر نظرات میں تحریر فرمائی تھیں۔

مولانا اکبر آبادی کی تصدیق

مولانا نے بہت درست اور بجا لکھا تھا:

''یوں تو مولانا کیا نہیں تھے' ایک نامور محقق اور مبصر اسلامیات' بلند پایہ مصنف' شعلہ بیان

Marfat.com

خطیب، صاحب وجد و حال صوفی، سب کچھ تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ جس میں ان کا کوئی حریف نہیں ہوسکتا یہ ہے کہ انہوں نے اپنے فیضان تعلیم و تربیت سے انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ میں ایک دو نہیں کثرت سے ایسے افراد پیدا کردیئے جو...... مغربی علوم و فنون کی اعلیٰ اسناد رکھنے کے باوجود...... آج اسلامی علوم و فنون کی بڑی قابل قدر خدمات انجام دے رہے ہیں اور جن کی اسلامی تحقیقات کی گونج یورپ اور امریکہ تک کے علمی حلقوں میں ہے۔ جو کام خالص علماء کے کرنے کا تھا وہ یہ حضرات کررہے ہیں اور اس خوبی و عمدگی سے کررہے ہیں کہ خود علماء کے طبقے میں اس کی مثالیں کم ملیں گی۔ پھر ان کی زندگیاں بھی اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہیں۔'' (نظرات' برہان (دہلی) جولائی ۱۹۵۶ء)

ایک استاد کا کمال یہی ہے کہ وہ اپنے پیچھے اپنے شاگردوں کی ایسی جماعت چھوڑ جائے جو اس کے مسلک و مشرب کی محافظ اور اشاعت کرنے والی ہو اور اس کے تعلیمی جذبات کو آئندہ نسل تک پہنچانے والی ہو۔ کوئی شبہ نہیں کہ مولانا گیلانی اس اعتبار سے بڑے خوش قسمت استاذ تھے' اللہ درجات بلند فرمائے۔

مولانا دریابادی کا بیان

مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا ہے:

''شاگردوں کا ذکر آ گیا ہے' تو یہ بھی سن رکھنے اور خوش ہونے کی بات ہے کہ مولانا گیلانی اپنے ایک نہیں متعدد شاگردوں میں دینی و علمی ذوق کی روح پوری طرح پھونک گئے ہیں اور ان لوگوں نے جو اہم دینی خدمات علمی رنگ میں کی ہیں' ان کے اجر کے بھی حقدار خود مولانا ہی ہیں۔'' (وفیات ماجدی۔ص ۷۷)

جو کچھ عرض کیا گیا' اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مولانا گیلانی نے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں بڑا اہم کام کیا اور اس خدمت سے سیرت سازی کا فریضہ خوب ادا ہوا جس کی ہر دور میں کمی رہی ہے۔ اپنا تجربہ یہ ہے کہ اگر اساتذہ مخلص و دین دار اور خدا ترس ہوں تو وہ اپنے شاگردوں کے لئے بڑے ہی مؤثر ثابت ہوتے ہیں۔

افسوس یہ ہے کہ اساتذہ میں وہ تڑپ باقی نہیں رہی جو آنے والی نسل کے ذہن و فکر اور دل و دماغ میں انقلاب برپا کرتی ہے اور کسی ملت کے نوجوانوں میں زندگی انگڑائی لینے پر مجبور ہوتی ہے۔ مولانا گیلانی کی زندگی ہمیں سبق دیتی ہے کہ اخلاص کے ساتھ ہم آنے والی نسل کی تربیت اور سیرت سازی کا فریضہ ادا کریں۔

آزادی کے بعد مولانا کی مخالفت

مولانا گیلانی جب شعبہ دینیات کے صدر ہوئے تو اس شعبہ کو کافی ترقی ہوئی۔ مولانا کی خواہش تھی کہ دینیات کی تعلیم تمام مسلمان طلباء کے لئے لازم کردی جائے اور قدیم علوم کی جگہ جدید علوم کو دی جائے تاکہ یہ شعبہ زیادہ

Marfat.com

کارآمد ثابت ہو۔ ملک کی آزادی کے بعد زمین و آسمان بدل چکے تھے' وہ مسلمان جو کل تک اس لڑائی میں مولانا کو شکست نہیں دے سکے تھے۔ وہ انتقام پر اُتر آئے اور نہیں چاہتے تھے کہ آزاد ہندوستان میں پہلے کی طرح دینیات ضروری طور پر پڑھائی جائے یا اس کو زیادہ اہمیت دی جائے اس لئے ایسے لوگ مولانا کی درپردہ مخالفت کرتے اور موقع پاکر نقصان پہنچانے کی سعی کرتے تھے۔

تخصیصی درجے کے قیام کی سعی

ایک خط میں علامہ سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:

''شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ کے سینے کا بوجھ بنا ہوا ہوں۔ حالانکہ اس کے سوا اور میں کیا چاہتا ہوں کہ السلام کے اساسی علوم (قرآن' حدیث وفقہ) کی تعلیم لازم قرار دے کر قدیم علوم کی جگہ جدید علوم وفنون کو قبول کرلیا جائے اور اسلامی علوم کے کسی خاص فن میں کمال پیدا کرنے کے لئے تخصیصی درجے قائم کردیئے جائیں......''

(مکتوب ۷ دسمبر ۱۹۴۴ء شائع شدہ در: معارف۔ ماہ اپریل ۱۹۶۳ء)

آزادی کے بعد مولانا کسی نہ کسی طرح لڑتے رہے اور شعبہ کے مطالبات منواتے رہے مگر جب ملک آزاد ہوا تو حالات بالکل ہی دگرگوں ہوگئے اور مولانا گیلانی پر مخالفین نے حملے شروع کردیئے تاکہ آپ کی کوئی بات نہ چل سکے۔

شعبہ دینیات پر حملے

ایک دوسرے خط میں سید سلیمان ندوی کو تحریر فرماتے ہیں:

''ڈاکٹر ولی محمد نے خاک سار اور ڈاکٹر حمید اللہ کا نام دائرۃ المعارف کی انتظامی وعلمی کمیٹی سے خارج فرمادیا تھا' انہی ولی محمد نے شعبہ دینیات کے رعایتی وظائف ختم فرمادیئے تھے' پی ایچ۔ ڈی کا درجہ شعبہ دینیات سے نکال دیا تھا' ان کی سب سے زیادہ عنایت اسی مرحوم شعبہ پر مبذول تھی۔'' (مکتوب ۲۵ دسمبر ۱۹۴۸ء شائع شدہ معارف۔ جولائی ۱۹۶۳ء)

حالات کی طرف ایماء کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''آپ سے زیادہ قرآنی آیت ''اذا دخلوا قریتہ'' کا رازداں کون ہوسکتا ہے' اسی دشت کی سیاحی میں ساری عمر گزری' فانا للہ وانا الیہ راجعون'' (ایضاً)

مدت ملازمت میں توسیع

۱۸ فروری ۱۹۴۷ء کے خط میں سید صاحب کو لکھا:

''میری مدت ملازمت ستمبر میں ختم ہورہی ہے۔'' (معارف۔مئی ۱۹۶۳ء)

پھر سید صاحب کے خط کے جواب میں لکھا:

''آپ کا جو خیال ہے کہ حیدر آباد میں مجھے توسیع مل جائے گی جہاں تک میرا خیال ہے صحیح نہیں ہے' اس کا امکان تو ہے کہ کچھ کوشش و پیروی کروں تو سال دو سال اور حیدر آباد میں ٹک جاؤں لیکن یہ قطعی طے کئے ہوئے ہوں کہ اس معاملہ میں کسی سے کچھ نہ کہوں گا۔ خود میرا دل حیدر آباد سے اُچاٹ ہوگیا ہے۔ حالات بد سے بدتر ہوتے جارہے ہیں۔'' (ایضاً)

ایک دوسرے خط میں لکھا جو سید صاحب کے ہی نام ہے:

''میری مدت ملازمت ستمبر کے مہینے میں پوری ہو رہی ہے' اس وقت تک کچھ نہیں معلوم کہ ارباب اقتدار کا کیا ارادہ ہے۔ بہاول پور سے وزیر تعلیم کا تار آیا تھا کہ چند ہی دن کے لئے ایک دفعہ بہاول پور آ کر دیکھ جاؤ' معذرت لکھ کر بھیج دی ہے۔

(مکتوب ۲۳' رجب ۱۳۶۶ھ شائع شدہ در: معارف۔اگست ۱۹۶۳ء)

توسیع کی توقع کا اظہار

یہ بھی لکھا کہ

''اب میری مدت ملازمت ایک ماہ باقی ہے۔ یہاں کے جیسے حالات تھے اس کو دیکھتے ہوئے تو یہی خیال تھا کہ میرا خیال نہ کیا جائے گا لیکن تین چار روز سے کچھ خبریں ایسی مل رہی ہیں کہ ارباب حل و عقد کو چونکہ کوئی دوسرا آدمی نہیں مل رہا ہے اس لئے کچھ دنوں کی توسیع کر دینے کا خیال کیا گیا ہے۔'' (ایضاً)

مولانا کو اس کی فکر دامن گیر تھی کہ توسیع ہوگی یا نہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ساتھ رہا اور اکتوبر ۱۹۴۷ء سے مارچ ۱۹۴۹ء تک ڈیڑھ سال کی توسیع منظور ہوئی اور اس طرح ادھر سے ایک گونہ اطمینان ہوا۔

ختم ملازمت کے بعد کی فکر

مگر اسی کے ساتھ بہار کے حالات' ملک کی تقسیم اور اس کے آزاد ہونے کے بعد دفعتاً نازک ہوگئے' بہت سی مسلمان بستیاں ویران ہوگئیں اور بہت سے گاؤں مسلمانوں کو حالات کی نزاکت کے پیش نظر خالی کر دینے پڑے گیلانی کا حال بھی اچھا نہیں تھا' خطوط برابر بہار سے ایسے آرہے تھے جن سے مایوسی بڑھتی جارہی تھی۔

مولانا گیلانی نے اپنے ایک خط میں جو سید سلیمان ندوی کے نام ہے' لکھا ہے:

Marfat.com

''میں عجیب کشمکش میں ہوں' سارا خواب پریشان ہو کر رہ گیا ہے' سوچے ہوئے تھا کہ وظیفہ لے کر گیلانی چلا آؤں گا۔ پھر وہیں سے دوسری خدمات کا سلسلہ اگر میسر آئے گا' شروع کروں گا۔ پھر وہیں اپنے آباؤ اجداد کے ساتھ سو جاؤں گا لیکن اب کہاں جاؤں؟...... پھر اچانک حکومت کے اس طرزِ عمل کی خبریں مل رہی ہیں کہ کسی قسم کا حادثہ ہو' حکومت نے طے کر دیا ہے کہ اس میں مسلمانوں کو ہی مجرم بنا کر ان کی آبروریزی کی جائے۔ واقعات کا علم ہوا ہو گا' بڑے بڑوں کے سر کی پگڑی اتاری جا رہی ہے۔ ایسی حالت میں بہار کے تو خیال سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں' پھر کہاں قیام کیا جائے' دکن کا حال کیا بیان کروں' بس اللہ ہی اللہ ہے' کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کل کیا ہو گا' پنجاب کے حالات سن کر کلیجہ منہ کو چلا آتا ہے۔'' (ایضاً)

دوسروں کی طرف سے طلبی

توسیع کے بعد مولانا برابر حیدر آباد ہی میں مقیم رہے۔ خدا خدا کر کے یہ ڈیڑھ سال توسیع کے بھی گزر گئے۔ جس جس طرح ریٹائرمنٹ کے دن قریب آ رہے تھے' مختلف دوسری یونیورسٹیوں سے طلبی آ رہی تھی کہ وہاں سے پنشن لے کر یہاں آ جائیں' بہاولپور سے جو تار آیا تھا وہ آپ پڑھ چکے۔

علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کا رجحان تھا کہ وہاں سے پنشن لے کر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں آ جائیں۔ توسیع سے پہلے مولانا گیلانی کا خیال تھا کہ گیلانی کے بجائے کسی تعلیمی ادارے میں رہنا مناسب ہو گا جیسا کہ بعض خط سے معلوم ہوتا ہے مگر اس توسیع کی مدت پوری ہونے کے بعد رائے میں تبدیلی آ گئی۔ اپنے ایک خط میں پہلے یہ لکھا تھا۔

''میری ملازمت مارچ میں ختم ہو جاتی ہے' اس کے بعد بہر حال کہیں جانا پڑے گا' اگر راستہ اس عرصہ میں عالم آخرت کا پیش نہ آ گیا۔''

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تاریخ اسلام کی کوئی جگہ خالی تھی' اس کے متعلق جب مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا تو مولانا نے جواب میں تحریر فرمایا:

''باقی آپ نے یہ عجیب سفارش فرمائی' تاریخ اسلام کی تدریس کیا فقیر کے بس کی بات ہے...... بہر حال فقیر کی حد تک تو جناب والا کی یہ سفارش اور کچھ نہ ہو تو ایک سند کی حیثیت رکھتی ہے' میں نے تو آپ کے گرامی نامہ کو محفوظ کر لیا ہے کہ امام المورخین فی عصرہ کی طرف سے یہ سرفرازی ہے۔ یوں بھی امراض کے ہجوم' پیرانہ سالی' تشتت بال نے کیا اس کا موقع باقی چھوڑا ہے کہ کسی

نئے تدریسی مضمون کے لئے اپنے آپ کو تیار کروں۔"

(مکتوب ۲۵ دسمبر ۱۹۴۸ء در: معارف۔ جولائی ۱۹۶۳ء)

طبیعت کا حال

ایک گرامی نامہ میں حضرت سید صاحبؒ کو لکھتے ہیں:

"آپ نے ارقام فرمایا تھا کہ علی گڑھ پہنچ کر لوگوں سے مل لوں، لیکن دل اس قسم کے امور میں ملنے ملانے پر آمادہ نہیں اور سچی بات یہ ہے کہ نہ عمر ہی ملازمت کی رہ گئی ہے اور نہ بحمد اللہ کچھ ایسی تنگی ہے۔ اس قسم کے کسی مقام کی طرف تھوڑا بہت میلان اگر باقی ہے تو صرف مشغلہ اور دل بستگی کے لئے۔"

اخیر میں معذرت فرمادی اور صفائی سے لکھا:

"علی گڑھ کے لئے آپ دونوں حضرات فقیر کے لئے کوشش کیوں کر رہے ہیں؟ میری صحت اس قابل نہیں کہ ملازمت کی ذمہ داری قبول کروں اور بحمد اللہ بظاہر معاشی حیثیت سے بھی کوئی ضرورت ملازمت کی معلوم نہیں ہوتی۔"

186

ریٹائر ہونے کے بعد

توسیع کی مدت بتدریج ختم ہو رہی تھی اور یہ خط و کتابت چل رہی تھی۔ آدمی جہاں رہتا ہے اس جگہ اور ماحول سے طبعی انس پیدا ہو ہی جاتا ہے اور بار بار سوچتا ہے جب یہ جگہ چھوڑنا پڑے گی تو پھر کیا صورت اختیار کی جائے گی۔ مولانا گیلانی اسی دور سے گزر رہے تھے۔

ملازمت کا جب اخیر زمانہ آ گیا تو سید صاحب کی خدمت میں لکھا:

"میری ملازمت کا یہ آخری مہینہ ہے، اس وقت تک تو دل مطمئن نہ تھا لیکن ایک جگہ پڑا ہوا تھا، اب کہاں جاؤں۔ سر دست اس کے سوا کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ گیلانی چلا جاؤں۔ یہ بھی اپنا خیال ہے، مگر عالم کی باگ جس کے ہاتھ میں ہے اس کی مشیت کیا ہے کچھ نہیں معلوم۔"

(مکتوب یکم مارچ ۱۹۴۹ء)

ریٹائرمنٹ

اللہ اللہ کر کے مارچ کا مہینہ بھی ختم ہوا اور مولانا نے یہ اطلاع دی:

''آخر وہ گھڑی آ ہی گئی جس کا تیس سال پہلے انتظار شروع ہوا تھا۔ درمیان میں سبکدوشی یا گلو خلاصی کی کوشش بھی کی گئی تھی لیکن مصلحت الٰہی نے کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ ۳۱ مارچ ۱۹۴۹ء بعد ظہر جامعہ عثمانیہ کے شعبہ دینیات کی صدارت کا جائزہ دے دیا۔ دو تین دن بعد اسی گاؤں کی طرف واپسی کا ارادہ ہے جس سے تقریباً نصف صدی پہلے روانہ ہوا تھا۔''

(مکتوب ۱۴ اپریل ۱۹۴۹ء)

حیدرآباد سے گیلانی

بالآخر حیدرآباد چھوڑنے کا فیصلہ کرنا پڑا اور ریٹائر ہونے کے بعد مولانا اپنے وطن گیلانی ضلع پٹنہ تشریف لے گئے۔ اس عرصہ میں بہار کے حالات بھی بڑی حد تک ٹھیک ہو چکے تھے۔ گھر پہنچ کر مولانا نے سید صاحب کو اطلاع دی:

''یکم اپریل ۱۹۴۹ء کو رقیت کی زنجیر پاؤں سے نکلی۔ گیلانی' اہل وعیال کے ساتھ بخیر وعافیت پہنچ گیا' بظاہر امن وامان بھی معلوم ہوتا ہے۔''

اگست ۱۹۴۷ء کے بعد حالات جب خطرناک ہو گئے تھے تو گیلانی کو وہاں کے مسلمانوں نے قطعی طور پر خالی کر دیا تھا۔ جب امن وامان ہوا تو پھر لوگ لوٹ لوٹ کر اپنے گھروں میں آباد ہو گئے۔

قیام وطن کے زمانہ میں دعوتیں

قیام وطن کے زمانہ میں مختلف یونیورسٹیوں نے پیشکش کی' اصرار سے بلایا مگر کہیں جانا پسند نہیں کیا۔ پنجاب یونیورسٹی نے ڈیڑھ ہزار ماہانہ کی جگہ پیش کی' کراچی یونیورسٹی نے بطور خاص دعوت اور اصرار کے ساتھ بلایا۔

مولانا کا اکلوتا لڑکا محی الدین پاکستان میں کسی بڑے عہدے پر فائز تھا۔ اس نے چاہا کہ مولانا ان کے پاس آ جائیں مگر مولانا نے گیلانی چھوڑنا پسند نہیں کیا۔ یہ درست ہے کہ صحت کچھ زیادہ موافق نہیں تھی لیکن دراصل یہ سب دنیا سے بے نیازی اور بے رغبتی کا نتیجہ تھا۔

مولانا گیلانی ایک کھاتے پیتے اور صاحب جائداد عالم دین تھے۔ آم کے کئی باغات تھے' کاشت کی زمین بھی کافی تھی جس میں مختلف فصلیں ہوتی تھیں مگر مولانا کا ان سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ یہ سب ان کے منجھلے بھائی مولوی مکارم احسن کی تحویل میں تھا۔

مولانا کی زندگی کا نقشہ

صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے درست لکھا ہے:

''ان کی سادگی دیکھ کر ان کے علم کی گہرائی کا یقین نہ آتا تھا اور اس گہرائی کو دیکھ کر ان کی سادگی

Marfat.com

پر تعجب ہوتا تھا۔ ان کی کل کائنات ایک چارپائی تھی۔ اسی پر قلم دوات رکھ لیتے اور علم و فن کا خزانہ لٹاتے رہتے۔ چارپائی کے بغل میں دو تخت تھے' ان پر معمولی فرش اور اس کے اوپر ایک قالین تھا۔ قالین اور فرش کے درمیان ان کا دفتر تھا' ان کے سارے کاغذات اور خطوط قالین کے نیچے پڑے رہتے تھے۔ کمرے میں چار بڑی الماریاں تھیں جن میں منتخب کتابیں تھیں۔ یہی ان کا آفس اور کتب خانہ سب کچھ تھا۔ لکھتے لکھتے جب تکان محسوس کرتے تو چارپائی کے نیچے ہاتھ بڑھا کر ٹین کا ایک معمولی سا ڈبہ گھسیٹتے' اس میں مٹی کے تین کلھڑوں میں کتھا' چونا اور ڈلی تھی اور کپڑے کے ایک ٹکڑے میں کچھ پان لپٹے ہوتے' یہ پاندان ان کی ساری زمین داری' کھیتی باغ اور گراں قدر تنخواہ کا حاصل تھا جس کے وہ بلاشرکت غیرے مالک تھے' بقیہ کسی چیز سے ان کو کوئی سروکار نہ تھا۔ اس ڈبہ سے پان کی گلوری بناتے اور اس کو کھا کر تازہ دم ہو جاتے اور ان کا نہ تھکنے والا قلم پوری تیزی کے ساتھ رواں ہو جاتا۔'' (معارف۔ اپریل ۱۹۵۷ء)

ایک حاضری کے موقع سے مولانا کے پاس جو کاغذات اور کتابیں تھیں' ان کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ مولانا کے قلم کی لکھی ہوئی چند چیزیں ملیں۔

مختلف یونیورسٹیوں کے ایگزامینر

مولانا گیلانی جب تک عثمانیہ یونیورسٹی میں رہے بہت سی دوسری یونیورسٹیوں کے ایگزامینر بھی رہے' سالانہ امتحانات کے پرچے آپ کے پاس آتے تھے اور آپ انہیں جانچ کر واپس کرتے تھے' مولانا نے اپنی یادداشت میں اپنے قلم سے لکھ رکھا تھا:

''سابق پروفیسر و شیخ الحدیث و چیئرمین شعبہ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن' واکزامینر مسلم یونیورسٹی' ڈھاکہ یونیورسٹی' لکھنؤ یونیورسٹی اور نگل یونیورسٹی لاہور' پنجاب و بہار یونیورسٹی۔''

موجودہ اپنا حال

اس کے بعد یہ بھی لکھ رکھا تھا:

''وحال مریضے وعلیلے کہ از جائے خویش ہم تلامذہ معالجین افرنگ اجازت جنبش نہ دہند' گویند کہ قضائے حاجت ہم بر بستر علالت خود کند' والا سیموت ولعل اجلہ المسمیٰ لیس ببعید۔''

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیماری کے ان دنوں میں جب دنیاوی زندگی سے بڑی حد تک مایوس ہو چکے تھے' بے ساختہ یہ سطریں مولانا مرحوم کے قلم سے نکلی ہیں۔

Marfat.com

مولانا کی سوانح اپنے قلم سے

اسی پر بس نہیں کیا بلکہ چند سطروں میں اپنی زندگی کا خلاصہ بھی لکھ دیا تھا.....تحریر فرمایا:

"تعلم فی المدرسة الخليلة عند رئيس الفلاسفه والناطقة مولانا بركات احمد البهاری' التونكی والحديث عند شيخ الهند والامام الكشميری وغيرهما."

پھر یہ بھی لکھ ڈالا:

"صنف كتباً وحرر مسائل فی مقالاته العلمية فمن مصنفاته النبی الخاتم' احسن كتب واحلاها' والدين القيم واسلامی معاشيات و مسلمانان هند كی تعليمی تاريخ و امام ابو حنيفه كی سياسی زندگی وغير ذلك من الكتب والرسائل."

آدمی جب تنہائی میں گھبراتا ہے کوئی پاس نہیں ہوتا تو اس طرح کی باتیں یاد آ کر زخم لگاتی ہیں اور انسان اپنی بے بسی پر حیرت زدہ ہوتا ہے کہ کیا تھے کیا ہو گئے اور پھر رجوع الی اللہ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور اپنے کو رب العالمین کے سپرد کر دیتا ہے۔

دیکھ رہے ہیں اس وقت بھی مولانا کی جدت طبع۔ کچھ حالات اردو میں لکھے' کچھ فارسی زبان میں اور کچھ عربی زبان میں۔ مولانا کی اور بہت ساری یادداشتیں نوٹ کر کے لایا تھا مگر افسوس وہ سارے کاغذات ہی ایک حادثہ میں جاتے رہے جس کا غم ساری عمر رہے گا۔

مولانا گیلانی کی عادت تھی کہ کتاب پڑھتے ہوئے جو بات جہاں ذہن میں آتی' اس کتاب کے شروع میں سادے اوراق پر لکھ دیا کرتے تھے' ان کی بہت ساری کتابوں میں اس طرح کے لکھے ہوئے دلچسپ نوٹ ملتے ہیں اور کوئی شبہ نہیں کہ یہ نوٹ بڑے قیمتی اور کار آمد ہیں اور اہل علم کے لئے نشان راہ کا کام دیتے ہیں اور استخراج و استنباط مسائل میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کی سیرت سازی

مولانا گیلانی کی ابتدائی اور تعلیمی زندگی مدارس دینیہ میں گزری تھی' دن رات علمائے کرام کی ہی صحبت میں رہا کرتے تھے' اسی ماحول میں پرورش اور تعلیم و تربیت ہوئی تھی۔ ان نوجوانوں اور اساتذہ سے کوئی تعلق نہیں تھا جو سکولوں' کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھتے پڑھاتے ہیں' مگر قدرت نے جب آپ کو دیوبند سے حیدر آباد پہنچایا اور وہاں عثمانیہ یونیورسٹی میں استاد مقرر ہوئے تو دفعتاً آپ کا تعلق دن رات کا قدیم..... تعلیم یافتہ (علماء) سے کٹ کر جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے ہو گیا' انگریزی دور حکومت میں جن کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی کیونکہ انگریز ہی اس وقت ہندوستان کے حکمران تھے۔

قدیم و جدید طبقہ میں بُعد

یہ ظاہر ہے کہ انگریزی ڈپلومیسی کی وجہ سے ان دونوں طبقوں میں کافی بُعد تھا' اور کہنا چاہیے ایک طبقہ دوسرے طبقہ سے کٹا ہوا تھا۔ قدیم طبقہ عام طور پر انگریزی پڑھنے والوں کو راہ راست سے بھٹکا ہوا سمجھتا تھا بلکہ سخت قسم کے قدامت پسند انہیں گمراہ اور ملحد تک کہنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح جدید تعلیم یافتہ طبقہ علماء کو قدامت پسند' نئے تقاضوں سے بیگانہ' ترقی کی راہ میں حائل اور حالات زمانہ سے چشم پوشی کرنے والا سمجھتا تھا۔

یہ درست ہے کہ حیدر آباد ایک آزاد مسلمان ریاست تھی' وہاں کا نواب علم نواز اور علماء پسند تھا' پھر عثمانیہ پہلی یونیورسٹی تھی جو حیدر آباد ریاست میں قائم ہوئی تھی' بہت ساری ایسی چیزیں وہاں نہیں تھیں جو ملک کی دوسری یونیورسٹیوں میں پائی جاتی تھیں مگر بہرحال تھی انگریزی یونیورسٹی۔ اس کے اساتذہ جدید تعلیم یافتہ تھے۔ پھر یہ کہ یہ ریاست انگریزی حکومت کے ہی زیر سایہ قائم تھی' اس لئے وہ نئے اثرات سے پاک نہیں کہی جاسکتی ہے۔

مولانا جامعہ کے ماحول میں

مولانا گیلانی کے لئے اس جامعہ کا ماحول نیا تھا اور مدارس اسلامیہ کے اعتبار سے قطعاً بدلا ہوا اور پھر کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد یونیورسٹی کے ماحول میں بھی کافی جدت آ گئی تھی لیکن مولانا مرحوم نے اس ماحول میں رہ کر اپنے علم و فضل' وسیع مطالعہ اور کشادہ دلی سے ان سب کو متاثر کیا۔ خود متاثر نہیں ہوئے اور یونیورسٹی کے حلقہ میں دینی ماحول پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ گو ابتدا میں آپ کو بہت کافی اس ماحول سے لڑنا پڑا اور جدوجہد کرنا پڑی۔

جدید تعلیم حاصل کرنے والوں کی فکر

یونیورسٹی کے تعلق سے ان نوجوانوں کے ذہن و فکر سے بہت اچھی طرح واقف ہو چکے تھے جو ملک کے مختلف حصوں میں سرکاری تعلیم گاہوں میں پڑھ رہے تھے کہ ان کا انداز فکر کیا ہے۔ یہ مذہبی تعلیم سے علماً و عملاً کس قدر دور ہیں اور موجودہ دور کا سیلاب انہیں کس قدر پامال کرسکتا ہے

اقامت خانے کی تجویز

اس لئے مولانا گیلانی نے ''اقامت خانے'' والی تجویز اہل علم کے سامنے پیش کی کہ ہر شہر میں مسلم اقامت خانے قائم کئے جائیں جہاں اسکول' کالج اور یونیورسٹی میں پڑھنے والوں کے قیام و طعام کا قیمتاً نظم ہو' مگر یہ ارزاں سے ارزاں تر ہو اور ساتھ ہی بہت عمدہ' صاف ستھرا اور آرام دہ ہو تاکہ یہاں ان کی ذہنی نشو و نما اسلامی طرز سے ہوسکے۔ دل و دماغ میں دین قیم کا نفوذ اور علمی و عملی دونوں نہج سے دینی تربیت کا معقول انتظام ہو۔

Marfat.com

خلاصہء تجویز

اس کی جو تشریح مولانا عبد الباری ندوی نے کی ہے' اس کا ایک مختصر اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''انفرادی و اجتماعی زور ہر جگہ چھوٹے بڑے اور ممکن حد تک ارزاں سے ارزاں اسلامی اقامت خانے (ہاسٹل) قائم کرنے کرانے پر لگانا چاہئے۔ ان میں ممکن حد تک بقدر ضرورت دینی تعلیم اور درس سے بڑھ کر حتی المقدور بہتر دینی تربیت کی فضا ماحول کا انتظام کرنا چاہئے خود ہاسٹل میں ان کے نگراں کے علاوہ بھی ان کا ملنا جلنا' اُٹھنا بیٹھنا' کھانا پینا جہاں تک ہو سکے کچھ نہ کچھ ایسے افراد اور جماعت کے ساتھ ہوتا رہے جو ایمان اور عمل صالح کی زندگی میں خود ذرا اچھے زندہ نمونہ ثابت ہوں اور بات چیت بھی ان سے ان کے ذہنی میلانات و رجحانات کو جان پہچان کر کرسکتے ہوں۔ کتابی تعلیم کا بار زیادہ نہ ہو۔ روزہ اور نماز با جماعت کی پابندی تو لازم ہونا ہی چاہئے' اس کے ساتھ زیادہ زور معاملات اور اخلاق کی اصلاح پر رہے۔ کتابی تعلیم میں آدھ گھنٹہ نماز فجر کے بعد ہی قرآن مجید کا ترجمہ وتفسیر اس کے علاوہ حدیث کا ایسا انتخاب جس میں ایمانیات کے ساتھ اعمال صالحہ اور ان میں خصوصاً حقوق عباد' معاملات اخلاق اور معاشرت پر زیادہ توجہ دلائی گئی ہو اور روزمرہ پیش آنے والے ضروری فقہی مسائل کا مجموعہ۔'' (مکاتب گیلانی۔ ص ۶۱)

اوصاف نگران اقامت خانہ

اس تجویز میں ایک جز لازم یہ بھی ہے کہ اقامت خانے کے ذمہ دار نگراں ایسے اساتذہ یا علماء روشن ضمیر ہوں جو خود اپنے اخلاق و معاملات میں مضبوط ہوں اور حقوق العباد اور حقوق اللہ کی اہمیت سے واقف اور ان پر عمل پیرا ہوں تا کہ ان کے اخلاقی اثرات سے اقامت خانے کے مقیمین طلبہ پر خاطر خواہ عمدہ اثرات مرتب ہوں۔

اس تجویز کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ اس اقامت خانے میں اچھی دینی' علمی' تعلیمی اور منتخب کتابوں کی ایک لائبریری ہو جس میں بیٹھ کر اقامت خانے کے جدید تعلیم پانے والے طلبہ مطالعہ کر سکیں اور بتدریج ذوق مطالعہ میں اضافہ کی صورت پیدا ہوتی رہے۔ کتابیں ایسی ہوں جو ذہن وفکر کی نشو ونما میں مدد پہنچا سکیں اور سیرت سازی پر اثر انداز ہوں۔ اگر کسی مسئلہ میں خواہ اس کا تعلق اعتقادات سے ہو یا معاملات سے' کسی پڑھنے والے کو شک وشبہ ہو تو نگراں اس کی تشفی کرادے اور ذہن کی گرہ کھول دے۔ طلبہ کو اپنے شکوک وشبہات پیش کر کے تشفی بخش جواب حاصل کرنے کی آزادی ہو۔

مولانا دریابادی کی رائے

مولانا عبد الماجد دریا بادی مرحوم نے اس تجویز کے سلسلہ میں ایک دفعہ ''صدق جدید'' مورخہ

Marfat.com

۱۷ جنوری ۱۹۶۴ء میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا:

''اب تو سفر یورپ سے واپسی پر ماشاء اللہ خود ہمارے علی میاں اس کفرستان تک تعلیم پانے والے مسلمان طلبہ کے لئے یہ تاثر اور پیام لے کر آئے ہیں کہ جہاں تک مسلمان طلبہ اور نوجوانوں کا تعلق ہے جو یہاں لاکھوں کی تعداد میں انگلستان' فرانس' جرمنی' اسپین میں زیر تعلیم ہیں' ان کی اصلاح و تربیت اور ان کی اسلامیت کی حفاظت کے لئے سب سے بہتر نسخہ وہ ہے جو ہندوستان کے لئے مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمتہ اللہ علیہ نے تجویز کیا تھا اور اب ہمارے مولانا عبدالباری ندوی اس کے علمبردار اور داعی ہیں یعنی طلبہ کے لئے اقامت خانوں کی تاسیس اور ان میں اچھے نگراں اور مربی کا انتظام۔'' (مکاتیب گیلانی۔ ص ۳۷)

یہ واقعہ ہے کہ حضرت مولانا گیلانی کی تجویز ''اقامت خانوں'' کا قیام اور ان میں جدید تعلیم پانے والوں کی تربیت اور ذہنی نشو و نما کا انتظام بہت دوررس نتائج پر مشتمل تھا اور ذہن و فکر اور علم و عمل کی آبیاری کے لئے بے انتہا فائدہ بخش مگر جہاں تک میرے علم اور معلومات کا تعلق ہے' ہندوستان میں کہیں اس کا تجربہ نہیں کیا گیا۔

مولانا علی میاں ندوی کی رائے

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے لکھا ہے:

''اس وقت عالم اسلام کا سب سے بڑا فتنہ اسی نوخیز نسل کا غیر اسلامی بلکہ معاند اسلام ذہن اور نفاق ہے جس نے تمام اسلامی ممالک کو الحاد و زندقہ کے دوراہے پر کھڑا کر دیا ہے اور ایک سخت ذہنی انتشار اور کش مکش بلکہ اسلام کے خلاف بغاوت کا علمبردار بنادیا ہے۔ مولانا (سید مناظر احسن گیلانی) کی یہ بڑی دینی بصیرت تھی کہ انہوں نے اسلامی ''اقامت خانوں'' کی تجویز پیش کی جو کم از کم ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس مسئلہ کا ایک علمی اور معقول حل ہے۔''

عمل ندارد

بلاشبہ اس تجویز کو سراہا ہر ایک دور اندیش نے مگر افسوس یہ ہے اس کا تجربہ کسی بھی شہر میں نہیں کیا گیا اور مسلمانوں کا کوئی طبقہ اس تجویز پر عمل کرانے میں آگے نہیں آیا۔ مسلمان نوجوان یورپ کی تہذیب اور غلط نظریات سے متاثر ہوتے رہے' ان میں گمراہی آتی رہی اور ہم سب دیکھتے رہے اور آج بھی دیکھنے پر مجبور ہیں۔

مولانا گیلانی اس میدان کے عملی انسان نہیں تھے کہ اس کے لئے دورہ کرتے' عوام میں تقریر کرتے' خواص کو جھنجھوڑتے اور مسلمانوں میں صور پھونکنے کے لئے جدوجہد کرتے۔ مولانا مرحوم نہ لیڈر تھے اور نہ سیاسی میدان کے نشیب و فراز سے آشنا۔ وہ ایک استاذ تھے اور طلبہ یونیورسٹی کا تجربہ رکھتے تھے۔ اس تجربہ کی روشنی میں آپ نے اپنی یہ

تجویز اخبار کے ذریعہ عوام و خواص کے سامنے پیش کی۔ بعض باا ثر اہل علم کو متوجہ کیا تا کہ وہ اس اسکیم کو بروئے کار لانے کی تدبیریں عمل میں لائیں۔

اس تجویز پر عمل کی ضرورت

مختصر یہ کہ یہ تجویز آگے نہ بڑھ سکی اور مولانا اس کی حسرت لئے ہوئے دنیا سے رُخصت ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے درجات بلند فرمائے۔ اس کا اجر بہر حال آپ کے اعمال نامہ میں درج ہوا ہو گا اور بہت ممکن ہے آئندہ خدا کا کوئی وفادار بندہ اس اسکیم کو بروئے کار لانے کی عملی جدوجہد کرے کیونکہ حالات وہی ہیں جو انگریزوں کے دور حکومت میں تھے بلکہ بعض اعتبار سے حالات پہلے سے زیادہ سنگین ہیں اور مسلمان نوجوانوں کو مختلف راستوں سے گمراہ کرنے کی تدبیریں جاری ہیں بالخصوص مذہب بیزاری یا خدا بیزاری پر بڑی طاقتیں جو کچھ کر رہی ہیں وہ کسی باخبر سے مخفی نہیں ہے۔ الحاد کا ایک طوفان ہے جو مشرق سے مغرب تک اور جنوب سے شمال تک انسانی ذہنوں کو متاثر کرنے میں کام کر رہا ہے۔ بہت سے عرب ممالک اس کی لپیٹ میں آچکے ہیں۔ ہمارا ملک بھی اس طوفان سے دوچار ہے۔

آزاد ہندوستان کا حال

آزاد ہندوستان میں بڑی تیزی کے ساتھ مذہب بیزاری کا صور پھونکا جا رہا ہے اور اس کے پروپیگنڈے پر بڑی طاقتیں کافی سرمایہ خرچ کر رہی ہیں۔ نوجوانوں میں ایسا لٹریچر پھیل رہا ہے جو ان کو مذہب سے دور کر دے۔ مسلمانوں میں اس سیلاب پر آہنی دیوار دینی مدارس ہیں اور ۱۸۵۷ء کے بعد یہی اسلامی قلعے شمار ہو رہے تھے مگر یہ بھی اس نرغے میں آتے جا رہے ہیں۔ ایسی صورتیں سامنے لائی جا رہی ہیں کہ مدارس اسلامیہ خود مسلمانوں کی نظر میں بے وقعت ہو جائیں اور اسی کے ساتھ علماء سے مسلمانوں کا اعتماد اٹھتا چلا جائے۔

بیدار دماغی کی ضرورت

کہنا چاہئے اگر ہمارے ذمہ دار علماء نے دور اندیشی سے کام نہیں لیا تو یہ آہنی دیوار جو ہمارے اسلاف نے قائم کر دی تھی، مسمار ہو کر رہ جائے گی اور خدا بیزاری کا دیو ملک میں دندناتا پھرے گا اور مذہبی طبقہ کی زبانوں پر قفل چڑھ جائے گا۔ وہ بولنا چاہیں گے مگر نہیں بول سکیں گے یا کچھ بولنے کی سعی کریں گے تو کوئی سننے پر آمادہ نہ ہو گا بلکہ یہ بولنے والے مطعون کئے جائیں گے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج جن پر زیادہ ذمہ داریاں ہیں وہی خاموش ہیں یا ان کو اپنے عمل سے تقویت دے رہے ہیں۔ مصلحتوں یا نفع عاجل یا بے جا خوف سے ان کی زبانیں گنگ ہیں۔ غیر مذہبی لوگوں کا رویہ حد درجہ خطرناک ہے خواہ ان کا تعلق حکومت وقت سے ہو یا عوام سے۔ علامہ اقبالؒ نے سچ کہا ہے

جلال بادشاہی ہو یا جمہوری تماشہ ہو
جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

Marfat.com

مولانا میدان تحریر وتصنیف میں

۱۹۸

کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا گیلانی میں بہت ساری خوبیاں جمع کر دی تھیں۔ جہاں وہ درس و تدریس میں نمایاں مقام رکھتے تھے اور تقریر میں شہرت کے مالک تھے وہیں مولانا تحریر کے بھی بادشاہ تھے۔ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمتہ اللہ علیہ آپ کو ''سلطان القلم'' لکھا کرتے تھے۔ تحریر کا ذوق طالب العلمی کے زمانہ سے تھا۔ منطق کی اصطلاحات پر ٹونک میں ایک پورا ڈرامہ تیار کر دیا تھا جس کو دیکھ کر ان کے استاذ محترم حضرت مولانا سید برکات احمد صاحبؒ نے انہیں ''شبلی کا انڈا'' کہا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائے طالب العلمی سے لکھنے کا اچھا شعور تھا اور اپنے مافی الضمیر کو عمدہ' عام فہم اور سلیس انداز میں بیان کرنے پر قدرت تامہ رکھتے تھے۔ گو اس کے بعد ٹونک کے دور طالب العلمی میں کوئی مقالہ یا مضمون لکھنے کا پتہ نہیں ملتا کیوں کہ وہاں اس کا کوئی ماحول بھی نہیں تھا' قدامت ہی قدامت تھی اور خالص منطق و فلسفہ پڑھایا جاتا تھا۔ آپ کے استاذ محترم اردو کتابوں کے پڑھنے کے سخت مخالف تھے۔ مولانا چھپ کر کچھ مطالعہ کر لیا کرتے۔

دار العلوم میں ادبی ذوق

دار العلوم دیوبند میں قدم رکھا تو ذہن کھلا اور داخلہ کے پہلے ہی سال یہاں کے طلبہ کو اشتہار کا دلچسپ مضمون لکھ کر دیا جس میں لحاف ملنے کی تاخیر پر خاموش احتجاج تھا اور اس اشتہار کا عنوان حافظ شیرازیؒ کے شعر

شب تاریک و بیم موج' گردا بے چنیں حائل
کجا دانند حال ما' سبکساران ساحلہا

میں تصرف کر کے یہ لکھا تھا

شب سرما' و بیم موت' افلاسے چنیں حائل
کجا دانند حال ما' خداوندان توشکہا

۱۹۹

(دیکھئے دار العلوم ربیع الاول ۷۱ھ)

جس اشتہار کی یہاں کے ماحول میں دھوم مچ گئی تھی کہ کس نے اتنا عمدہ دلچسپ مضمون لکھا' جس کو سارے لیڈر طلبہ اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے فخر محسوس کر رہے تھے اور مولانا خاموش تھے۔

شیخ الہند کا حکم برائے مضمون نویسی

دار العلوم دیوبند میں قیام کا پہلا ہی سال تھا اور دورہ حدیث میں ابھی داخل ہی تھے کہ استاذ العلماء شیخ الہند حضرت مولانا.....محمود حسن عثمانی قدس سرہ نے ایک دن اپنے عزیز شاگرد سے فرمائش کی کہ جب تم لکھنے پڑھنے کا ذوق رکھتے ہو' تو دار العلوم کے رسالہ ''القاسم'' کے لئے مضمون کیوں نہیں لکھتے؟

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ طالب العلمی میں مولانا گیلانی کی تحریر کا شہرہ ہو چکا تھا اور جب بحیثیت دورہ حدیث کے ایک طالب العلم کے آپ کا پہلا مضمون ''خیر الامم کا طغرائے امتیاز'' ''القاسم'' میں شائع ہوا تو ایک دنیا آپ کی تحریری استعداد سے واقف ہوئی اور فراغت کے بعد آپ کو رسالہ ''القاسم'' ''والرشید'' میں لکھنے کے لئے منتخب کر لیا گیا اور ڈیڑھ سال دارالعلوم میں دوسرے کاموں کے ساتھ زیادہ تر تحریری مشغلہ جاری رکھا اور بہت سارے مضامین و مقالات تحریر فرمائے جس کی تفصیل گزر چکی۔

''القاسم'' و ''الرشید'' اور مولانا

پہلے لکھا جا چکا ہے کہ آپ کے قلم سے ''القاسم'' و ''الرشید'' میں کافی مضامین نکلے۔ کبھی کبھی مضامین کی کمی ہوتی تو پرانی کتابوں کے کسی قیمتی حصہ کا ترجمہ کر کے اس کو پورا کرتے۔

مولانا لکھتے ہیں کہ

> ''ادارت کا فرض فقیر کے سر ڈال دیا گیا۔ تنہا دو دو پرچوں کو اوّل سے آخر تک مضامین سے بھرنا یوں بھی مجھ جیسے نومشق طالب العلم کے لئے آسان نہ تھا۔'' (رسالہ دارالعلوم)

سلطان القلم

یہ واقعہ ہے کہ تحریری لائن پر مولانائے محترم کو اولاً آپ کے استاذ محترم استاذ العلماء حضرت شیخ الہند نے لگایا تھا اور ان کی ہی کرامت اور توجہ سے کچھ دنوں بعد مولانا گیلانی کو سلطان القلم اور رئیس التحریر لکھا جانے لگا۔ شروع میں ان رسالوں میں مقالات و مضامین شائع ہوتے رہے مگر بعد میں یہی مقالات کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے۔ یہ درست ہے کہ جو کچھ آپ نے لکھا بڑی جانکاہی کے ساتھ لکھا۔ وہ مضامین اور کتابیں بحمد اللہ آج بھی موجود ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کا اسلوب بیان، طرز نگارش اور جامعیت کی شان اول دن سے ہی پسندیدہ اور عمدہ تھی جو بعد میں نکھرتی چلی گئی اور لوگوں کے دلوں میں اس کی جگہ بنتی چلی گئی۔

تحریر کا حال

مولانا گیلانی دوسرے مصنفین کی طرح کسی خاص عنوان پر پوری تیاری اور مطالعہ کے بعد نہیں لکھا کرتے تھے اس لئے کہ آپ ترتیب و تزئین وغیرہ کے زیادہ قائل نہیں تھے۔ برجستہ جو قلم پر آتا گیا اور لکھتے چلے گئے۔ جب نہیں لکھتے تو ہفتوں بلکہ مہینوں قلم نہیں اٹھاتے اور جب لکھنے پر آتے تو دن رات ایک کر ڈالتے اور جب تک ذہن اور دماغ کا سارا مواد کاغذ پر نہیں آجاتا رکنے کا نام نہیں لیتے۔ مولانا عبدالباری ندوی جو ۳۵۔۳۶ سال مولانا کے ساتھ رہے ان کا ذمہ دارانہ بیان ہے:

Marfat.com

''لکھنے کا بھی یہی حال کہ نہ لکھتے تو مہینوں سالوں کچھ نہ لکھتے اور لکھنے پر آ جاتے تو دن رات ایک کر دیتے' رات رات بھر پلک نہ جھپکاتے' پہلو میں تکیہ دبائے نیم دراز پلنگ ہی پر لیٹے لیٹے اور اکثر پنسل ہی سے ہفتوں کیا دنوں میں سینکڑوں صفحات کی کتاب پوری کر ڈالتے۔'' (مکاتیب گیلانی۔ص ۴۳)

قلم کی روانی

مولانا ندوی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا پر خود فراموشی کا عالم اس طرح مسلط رہتا کہ کھانا' پینا سونا جاگنا' بستر' کپڑا' ہر چیز سے آزاد رہتے۔ جس نے جو کر کے دے دیا قبول فرمالیا۔

''بس ہر شئی کا وہی حال جو ان کی تصانیف کا کہ تصنیفی موضوع کے قید و بند سے آزاد ہے۔'' (ایضاً۔ص ۴۳)

خود ایک خط میں مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:

''ایک دفعہ جھونک میں لکھنے بیٹھا تو لکھتا چلا گیا' اب پھر اس پر نظر ثانی' حک و فک اور اصلاح میرے لئے مشکل ہے۔'' (معارف۔۱۹۶۳ء)

مگر قلم کی روانی اور ذہن و فکر کی بلند پروازی میں یگانہ روزگار تھے۔ جس موضوع اور عنوان پر قلم اٹھاتے' ایسا معلوم ہوتا کہ سمندر ہے جوش مار رہا ہے' جدید و قدیم دونوں مواد اور معلومات کا بڑا ذخیرہ مولانا کے ذہن و دماغ میں جمع رہتا تھا جو لکھتے وقت صفحات قرطاس پر پھیلتا جاتا تھا۔

مولانا عبدالباری ندوی ہی نے لکھا ہے:

''تقریر سے آگے تحریر و تصنیف کو دیکھئے تو گیلانی کا اشہب قلم اس میدان میں بھی بڑے بڑے ہم چشموں سے پیچھے نہیں' نہ کماً نہ کیفاً' ایک متبحر عالم دین کی میزان پر دیکھئے تو معقول و منقول' تفسیر و حدیث' فقہ و کلام' سیرت و سوانح' تعلیم و تصوف وغیرہ وغیرہ جس شعبہ میں جو کارنامہ چھوڑا ہے کیا اس کو صف اول کی ممتاز جگہ سے بھی کم کسی جگہ پر رکھا جا سکتا ہے۔'' (مکاتیب۔ص ۳۸)

عصری مطالبات پر تصنیف

آگے رقم طراز ہیں:

''خالص عصری مطالبات یا نئے چلن کی چیزوں میں اسلامی پہلو سے جو بیسیوں مضامین و مقالات اور کتابیں ان کے قلم کی مرہون منت ہیں' ان میں مثلاً ایک ''اسلامی معاشیات'' کیا

Marfat.com

اپنے موضوع کے خاص نقطہ نظر سے کسی ہم پلہ کتاب کے مقابلہ میں کم وزن ہے۔ یوں بھی بالعموم ان کے نوشتوں میں جدید معلومات اور مواد پر جتنی اطلاع ملتی ہے خود جدید تعلیم کے دعویداروں میں بھی کتنے مقابلہ کر سکتے ہیں؟ تحقیق وتنقید کے جدید معیار پر بھی ان کی کتنی چیزیں ایسی ملیں گی جن کے اخذ واستفادہ کے بل پر یورپ وامریکہ کی یونیورسٹیوں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی جا سکتی ہے۔ خود اپنے شاگردوں سے آخر خود ہی ریسرچ کا کام لے کر اور کرا کے کتنوں کو ڈاکٹر بنا ہی دیا۔'' ......(مکاتیب۔ص ۳۹)

ربط وترتیب

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ مولانا کی تحریر میں ترتیب وربط کی کمی ہے اور اسے جذب کا اثر بتایا گیا ہے' لیکن جہاں تک خاکسار کے مطالعہ کا تعلق ہے ربط بھی ہوتا ہے اور ترتیب بھی' زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ معمولی ربط کی وجہ سے اگر کوئی دوسری کارآمد چیز ہے تو مولانا اسے بھی سمیٹ لینے کی سعی کرتے ہیں جیسا کہ پرانے مصنفین کا طریقہ ہے۔ پھر یہ کہ مولانا کی تحریر میں آمد ہی آمد ہوتی ہے آورد کا نام ونشان نہیں ملتا' اس لئے پڑھنے والا ایک خاص قسم کی دلچسپی محسوس کرتا ہے اور شروع کرنے کے بعد چھوڑنے کا نام نہیں لیتا۔ اسی کے ساتھ مولانا کی تحریر میں بہت سارے ایسے نایاب مواد یکجا مل جاتے ہیں جو کہیں اور نہیں ملتے۔ مولانا کی دوربیں نگاہیں جہاں تک پہنچتی تھیں ہر مصنف کا ذہن وہاں تک نہیں پہنچ پاتا ہے۔

مولانا کا انداز تحریر

یہ ضرور ہے کہ مولانا اپنے مسودوں کو دوبارہ نہیں پڑھتے تھے اور دوسرے مصنفین کی طرح اس کی کاٹ چھانٹ کرنے کی زحمت سرے سے گوارا نہیں کرتے تھے اور نہ اس کی ضرورت محسوس کرتے تھے چنانچہ خود مولانا نے لکھا ہے:

''ایک بہت بڑے ماہر کا مشورہ یہ ہے کہ موجودہ ترتیب کو بدل کر مضامین کی ترتیب کی جو شکل اختیار کی جائے گی اس میں ''آورد'' کی بدمزگی کے ساتھ ''آمد'' کا لطف جاتا رہے گا' ان کا خیال ہے کہ اس قسم کی کتابوں کو جو محض کتاب بنانے کے لئے نہیں لکھی گئی ہیں بلکہ دوسرے مقاصد کے حصول کا ذریعہ ان کو بنایا گیا ہو ان کے لئے یہ قطعاً غیر مناسب ہے کہ آبپاشی کی رپورٹ یا بنیوں کا مدوار کھاتہ ان کو بنا دیا جائے۔ ان کی رائے ہے کہ جس حال میں کتاب قلم سے نکل پڑی ہے اسی حال میں چھوڑ دیا جائے۔'' (نظام تعلیم وتربیت، ج ۲ ص ۳)

وسعت ظرفی

اسی کے ساتھ حضرت مولانا کی یہ بھی خوبی تھی کہ مسودہ جس کے حوالہ کرتے اس کو پورا اختیار دے دیتے کہ

Marfat.com

جس طرح چاہے تصرف کرے، یعنی جو چاہے رکھے اور جتنا چاہے حذف کردے۔ بس شرط یہ ہے کہ تحریر کا جو منشاء مقصد ہے اس میں فرق نہ آنے پائے۔ الفاظ مولانا ہی کے رہیں۔ کم کرنے میں یا بعض حصہ کے اِدھر سے اُدھر کردینے میں کچھ مضائقہ محسوس نہیں کرتے تھے۔ مولانا کا ابتدائی مسودہ ان کے ایک شاگرد مخدوم محی الدین بی اے عثمانیہ صاف کیا کرتے تھے، جن کی زود نویسی اور خوش نویسی بہت مشہور تھی۔

ایسا بھی ہوتا تھا کہ کبھی اپنا پورا مسودہ کسی شاگرد کو دے دیا کرتے جس کی استعداد علمی پر اعتماد ہوتا تھا تاکہ وہ اسے مرتب کردے۔ مولوی غلام محمد صاحب بی اے جو مولانا کے تلمیذ رشید ہیں، لکھتے ہیں:

> ''قلم روکنے سے پہلے خود ان کو اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ جو کچھ لکھا جارہا ہے وہ مضمون ہوگا یا کتاب بن جائے گی اور اس سب کے باوجود اپنے مسودات پر دوبارہ نظر کرنے کی زحمت بھی گوارا نہ فرماتے تھے۔ ان سب مسودوں کی ترتیب و تدوین ان کے معتمد علیہ شاگردوں اور عقیدت مندوں کے سپرد ہوتی تھی۔'' (مقالات احسانی۔ ص۱۲)

قلم برداشتہ لکھنا

مولانا کی عادت تھی کہ وہ کسی خاص موضوع پر تیاری کر کے لکھا نہیں کرتے تھے۔ کسی نے مضمون یا مقالہ کا مطالبہ کیا۔ اگر جی میں آ گیا تو قلم لے کر بیٹھ گئے اور لکھنا شروع کردیا۔ جب تک آمد رہی لکھتے رہے خواہ وہ مضمون یا مقالہ کتاب ہی کیوں نہ بن جائے اور عام طور پر یہی ہوتا یا کسی شاگرد کے لئے کسی خاص موضوع پر معلومات فراہم کرنے کے لئے بیٹھے تو وہ مضمون اتنا ہوگیا کہ بآسانی کتاب میں تبدیل ہوسکتا ہے۔ مولانا کے شاگرد ہی کا بیان ہے:

> ''مولانا خود فرماتے تھے کہ ان کی کوئی تصنیف بھی باضابطہ تصنیفی پروگرام کے تحت انجام نہیں پائی۔ یہی ہوتا رہا کہ کسی نے کسی مضمون کی فرمائش کی۔ لکھنے بیٹھ گئے۔ جب لکھ چکے تو وہ مضمون مضمون نہ رہا، کتاب تیار ہوگئی......دوسری صورت یہ ہوتی رہی کہ کالج کے لکچرز کی تیاری یا ایم اے اور پی ایچ۔ ڈی کے طلبہ کے مقالات کی رہبری کے سلسلے میں مختلف موضوت پر جو معلومات فراہم کرنا پڑتا......وہ ہر موضوع کی ایک مستقل کتاب خود بخود تیار ہوگئی۔'' (ایضاً)

تحریر میں جاذبیت

مگر سب کچھ کے باوجود مولانا کی تحریر میں کوئی ایسا تیز جملہ نہیں ہوتا تھا کہ کوئی مخالف یا آزاد خیال دیکھ کر اسے الگ ڈال دے۔ تصانیف و مقالات میں تصلب و تقشّف کو مولانا بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ کچھ تو طبعاً نرم خو تھے اور کچھ جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں رہنے اور ان سے راہ و رسم کا یہ اثر تھا کہ ہر ایک طبقہ کے جذبات کی رعایت کرتے تھے۔ بات اپنی ہی کہتے اور مضبوطی سے کہتے مگر اس کا لباس بڑا خوشنما اور خوش گوار اور لب و لہجہ بہت شیریں تجویز کرتے تھے۔

Marfat.com

تصنیف و تالیف کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ موافق و مخالف‘ جذباتی اور غیر جذباتی دونوں مطالعہ کریں اور کتاب مطالعہ کرنے والوں کو اپنی طرف کھینچنے میں کامیاب ہوجائے۔ بات تو وہی ہوتی جو ہونی چاہئے مگر لب ولہجہ کی خوش گواری اور شیرینی کو جو درجہ حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ مولانا کا انداز بیان پرانے مولویوں اور مناظروں کی طرح خشک اور طنز آمیز ہرگز نہ ہوتا اور یہ واقعہ ہے کہ تصنیف وتحریر کا ان عیوب سے پاک رہنا ہی بہتر ہے بلکہ لازم ہے۔

خشک نگاری سے پرہیز

مولانا ابوالحسن ندوی مدظلہ نے لکھا ہے:

”کچھ تو مولانا (گیلانی) کی افتادِ طبع اور شاید خاندانی لینت ورفق اور کچھ جامعہ عثمانیہ کے طویل تعلق اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور نئی نسل کے مسلسل سابقہ نے مولانا کی تحریر وتعبیر میں جدید ذہن کی رعایت اور دینی حقائق کے بیان کرنے میں حکمت و تدریج کا پہلو غالب کردیا تھا.........اپنے عقائد وخیالات اور علم میں پورے راسخ اور متصلب تھے لیکن اپنے طرز بحث اور طرز تحقیق واستدلال میں بالکل عصری۔“......(پرانے چراغ، ص ۸۵)

خود مولانا گیلانی نے بھی اپنے ایک خط میں عقائد کے سلسلہ میں لکھا ہے:

”یہی بتانا چاہتا تھا کہ خواہ وہ ہماری جماعت کا ہی آدمی کیوں نہ ہو‘ لوگوں میں اس کی بڑائی جس حد تک بھی مسلم ہو لیکن حق کا قدم جب درمیان میں آئے گا تو پھر کسی کا کچھ لحاظ نہ کیا جائے گا خواہ وہ کوئی ہو“ وان فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت يدها“ ہمارے دین کی امتیازی شان ہے۔“ (ایضاً۔ ص ۸۷)

تصلب وتقشف سے اجتناب

مولانا گیلانی تحریر وتصنیف میں سخت لب ولہجہ کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے چنانچہ جب میں اپنی پہلی کتاب ”نظام مساجد“ کا مسودہ لے کر مولانا کی خدمت میں پہلی مرتبہ گیلانی حاضر ہوا تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ پوری کتاب ایک نشست میں پڑھ گئے۔ درمیان میں صرف ظہر کی نماز کے لئے اٹھے‘ پھر آکر مطالعہ شروع کردیا اور آخر میں ختم کر کے فرمایا ”ماشاء اللہ آپ نے محنت کی ہے اور سب سے بڑی بات جو نظر آئی ہے وہ یہ ہے کہ آپ کی کتاب میں لب ولہجہ کی مولویوں جیسی درشتی نہیں ہے آپ کی کتاب ان شاء اللہ ہر ایک شوق سے پڑھ سکے گا......“ پھر فرمایا۔ ”تصنیف میں لب ولہجہ کی شدت پسندیدہ نہیں ہے۔ اس سے کتاب کو محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ بات پرانی کہی جائے مگر لباس نیا ہو‘ یہ ہرگز پسندیدہ نہیں ہے کہ جو حق ہے اس میں کوئی لچک یا کمزوری آنے پائے مگر حق پیش کرنے کا انداز بہت ہی خوش گوار اور دل پذیر ہو اور بہت ہی دل نشیں اور دل چسپ بھی تاکہ عوام وخواص اس کو ذوق وشوق سے پڑھ سکیں اور فائدہ حاصل کرسکیں۔“

Marfat.com

عقائد و نصوص میں مضبوطی

مولانا علی میاں نے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے:

''مولانا گیلانی کا یہ توسع اور ان کی تمام عصریت و حکمت تحریر و تعبیر اور استدلال ہی میں تھی۔ عقائد و نصوص اور حدود دین کے بارے میں وہ اتنے ہی متصلب اور متشدد اور ویسے ہی غیور و حساس واقع ہوئے تھے جیسے ان کے اساتذہ و شیوخ کرام اور علماء حق۔ جب کبھی وہ تحریف دین کی کوئی کوشش یا دین کی ترجمانی میں کوئی بے اعتدالی یا آزادی یا غلط اجتہاد دیکھتے تو برداشت نہ کر سکتے۔'' (پرانے چراغ، ص ۸۶)

وسعت معلومات اور رسوخ فی العلم

مولانا کی جس کتاب کو اُٹھا کر دیکھئے' معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ معلوم ہوگی کہاں کہاں سے مولانا مواد یکجا کر لیتے تھے اور ان کے حافظہ میں یہ ساری چیزیں کس طرح محفوظ رہتی تھیں کہ لکھتے وقت خود بخود ساری چیزیں زبان قلم پر چلی آتی تھیں۔ کتاب پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مولانا میں استدلال و استخراج اور استنباط کی کیسی بے پناہ قوت تھی۔

مولانا علی میاں صاحب مدظلہ کا یہ لکھنا بہت درست اور بجا ہے:

''بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ وسعت نظر' وسعت مطالعہ' رسوخ فی العلم اور ذکاوت میں ان کی نظیر اس وقت ممالک اسلامیہ میں ملنی مشکل ہے والغیب عند اللہ' تصنیف و تالیف کے لحاظ سے وہ عصر حاضر کے عظیم مصنفین میں شمار کیے جانے کے مستحق ہیں۔ انہوں نے اپنی کتابوں میں جو مواد جمع کر دیا ہے وہ بیسیوں آدمیوں کو مصنف و محقق بنا سکتا ہے۔ اس ایک آدمی نے تن تنہا وہ کام کیا ہے جو یورپ میں پورے ادارے اور منظم جماعتیں کرتی ہیں۔ ان جیسا آدمی برسوں میں پیدا ہوتا ہے اور اب ان جیسا آدمی شاید برسوں میں بھی پیدا نہ ہو۔'' (ایضاً۔ص ۹۴)

لکھنے کی شان

ایک دفعہ علامہ سید سلیمان ندوی نے مولانا گیلانی کو لکھا کہ آپ خوب لکھ رہے ہیں گویا بارش ہو رہی ہے۔ اس کے جواب میں مولانا گیلانی نے لکھا:

''یہ آپ نے خوب لکھا ہے کہ میں مینہ برسا رہا ہوں۔ سچ عرض کرتا ہوں لکھنے کے لئے فقیر نے اب تک خود کچھ نہیں لکھا ہے۔ جو کچھ بھی ہو جاتا ہے کوئی سر پر سوار ہو کر لکھوا لیتا ہے یا اسی قسم کی کچھ مجبوریاں پیش آ جاتی ہیں۔'' (مکتوب ۷ دسمبر ۱۹۴۴ء در: معارف۔ اپریل ۱۹۶۳ء)

ایک رائے کی تردید

مولانا کے شاگرد غلام محمد صاحب کی اس رائے سے ہمیں اتفاق نہیں ہے کہ

''مولانا کی تصنیفات جدید طرز تصنیف کے معیار حسن کو نہیں پہنچتیں۔''

جدید طرز تصنیف سے کیا مقصد ہے۔ کاش وہ اسے کھول کر لکھتے۔ مولانا کی تمام تصنیفات موجود ہیں۔ ان کا بغور مطالعہ کر کے فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ کیا کمی ہے۔ جن اہل علم نے ان تصانیف کا مطالعہ کیا ہوگا وہ گواہی دیں گے کہ مولانا کی ہر ایک تصنیف اپنے موضوع پر جامع اور کامل ہے اور اس کی ترتیب اور طرز نگارش میں موجودہ معیار کے مطابق بھی کوئی کمی نہیں ہے۔

اپنا خیال ہے ربط و ترتیب کا دامن مولانا سے کہیں چھوٹتا ہی نہیں۔ چونکہ مولانا پر معقولات کا اثر تھا اس لئے اس کی ترتیب منطقی ضرور ہے اور یہ مسلم ہے کہ منطقی ترتیب سے اچھی اب تک کوئی دوسری ترتیب نہیں ہے۔

اسی طرح مولانا کے علمی مقالات و مضامین جو سینکڑوں کی تعداد میں مختلف علمی مجلات میں شائع ہوئے ان کا مطالعہ کر کے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا نے جس مسئلہ پر قلم اٹھایا ہے کتنا عمدہ مواد جمع کر دیا ہے۔ جو گوشے اوروں کے ذہن میں نہیں آ سکتے تھے مولانا نے ان پر کیسی روشنی ڈالنے کی سعی فرمائی ہے اور کس طرح ان تمام گوشوں کو اجاگر کر کے اپنے مضمون میں سمولیا ہے۔

وہ لوگ جن کا مطالعہ وسیع ہے وہ گواہی دیں گے کہ عوام و خواص کے ساتھ بہت سارے مصنفین نے بھی مولانا کے مہیا کردہ مواد اور معلومات سے براہ راست فائدہ اٹھایا ہے گو انہوں نے مولانا کے مقالات یا کتاب کا حوالہ نہیں دیا ہے۔

مولانا علی میاں مدظلہ کی شہادت

مولانا گیلانی کے طرز نگارش پر موجودہ دور کے مشہور مصنف اور مؤرخ مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی رائے بھی سن لی جائے۔

لکھتے ہیں:

''دراصل ان (مولانا گیلانی) کا سارا توسع طرز تحریر اور طریقہ تفہیم میں تھا۔ ان کی کتابیں اور مضامین نئے اسلوب میں لکھے گئے ہیں اور کہیں کہیں تو وہ اپنی کتابوں میں تاریخی مواد اس سلیقہ اور ترتیب سے پیش کرتے ہیں اور اپنے دعویٰ ایسے علمی و تحقیقی انداز میں ثابت کرتے ہیں کہ وہ ایک قدیم مدرسہ کے فاضل اور ایک فقیہ و محدث ظاہر ہونے کے بجائے عصر حاضر کے مصنف اور

Marfat.com

اجتماعیات و علوم عمرانیہ کے فاضل معلوم ہوتے ہیں۔ مولانا کی اسی جامعیت نے ان کو اپنے معاصر علماء میں ایک امتیاز بخشا تھا اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو ان کی تصنیفات کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ ع

بر کف جام شریعت بر کفے سندان عشق۔'' (پرانے چراغ، ص ۸۸)

مسلمانوں کی بے حسی کا اثر

حضرت مولانا گیلانی کی نظر جہاں قرآن و حدیث' فقہ اور تصوف پر تھی ایسی ہی آپ کو تاریخ اسلام سے بھی بڑی مناسبت تھی۔ عالم اسلام کے متعلق جب کبھی معلوم ہوتا کہ ان میں دین قیم کے احکام و مسائل سے وہ رغبت و تعلق نہیں ہے جو ہونا چاہئے تو تڑپ جاتے اور ماہی بے آب ہو جاتے۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کا مشرق وسطیٰ والا سفرنامہ جب شائع ہوا تو اسے آپ نے از اول تا آخر بہت شغف کے ساتھ پڑھا' مگر جہاں ان لوگوں کی دین سے بے توجہی کا ذکر آیا مولانا کا عجب عالم ہوا۔ ایک لمبا خط مولانا علی میاں کو لکھا۔ اس کے چند جملے ملاحظہ فرمائیں' تاکہ اندازہ ہو کہ مولانا کو مسلمانوں کے دینی حالات سے کتنا گہرا لگاؤ تھا۔

''بس تڑپ رہا ہوں' کراہ رہا ہوں' کیا ہوگا اور ورطہ سے دین کا سفینہ کیسے نکلے گا؟ بھلا جب اپنے ہاتھوں سے مسجدوں میں مسلمان تصویریں لٹکانے لگے اور دنیائے اسلام کے سب سے بڑے دینی مرکز کے علماء نے اعفا اللحیٰ کا ترجمہ ''عفت الدیا رمحلها و مقامها'' کی روشنی میں کر کے اس پر اجماع منعقد کر لیا ہے تو دین کو اب...... کہاں ڈھونڈیں؟ کیا عرض کروں منہ لپیٹے آپ کی کتاب کو پڑھنے کے بعد پڑا ہوا ہوں۔'' (پرانے چراغ، ص ۷۵)

مولانا کی نظر تاریخ ہند پر

ہندوستان کی اسلامی تاریخ پر بھی بڑی وسیع نظر رکھتے تھے۔ صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب رفیق دارالمصنفین و مدیر رسالہ ''معارف'' (اعظم گڈھ) نے اپنا تاثر لکھا ہے جن کا موضوع ہی ہندوستان کی تاریخ ہے اور کئی کتابیں بھی لکھ چکے ہیں:

''۱۹۴۳ء میں جب ''الفرقان'' کا مجدد الف ثانی نمبر شائع ہوا اور اس میں مولانا کا مضمون ''الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ'' پڑھا تو ایسا معلوم ہوا ہندوستان کے مغلیہ عہد کی تاریخ کی تمام گرہیں کھل گئی ہیں۔ راقم کا خاص موضوع ہندوستان میں اسلامی عہد کی تاریخ رہا ہے۔ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد تیموری دور کی تاریخ سمجھنے میں ایک خاص زاویہ نظر ملا۔ دین الٰہی پر مضامین برابر پڑھتا رہا ملا عبدالقادر بدایونی کی ''منتخب التواریخ'' جلد سوم میں تو اس کی تفصیل ملتی

ہے جو چار سو صفحوں میں انتہائی بے ترتیبی کے ساتھ منتشر ہے۔ مولانا نے پہلی دفعہ ترتیب و تنظیم کے ساتھ اکبر کی اس بدعت سیئہ کا احاطہ کیا ہے اس لئے مجھ پر ان کی عالمانہ تحقیق و تنقیح کا بڑا گہرا اثر پڑا......اس مضمون نے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ آخر کیا بات تھی کہ اکبر نے دین الٰہی قائم کیا لیکن جہاں گیری عہد سے پہلے یہ آپ اپنی موت مر گیا اور پھر شاہجہاں کے عہد میں اسلام اور اسلامی روایات کی جو تجدید شروع ہوئی تو عالم گیر کے عہد میں انتہا کو پہنچ گئی۔"

(معارف۔ مارچ ۱۹۵۷ء)

مؤرخانہ ذہن

اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ پر مولانا کا مضمون پڑھ کر انہوں نے لکھا ہے:

"اس تجزیہ میں بھی مولانا کی غیر معمولی مؤرخانہ ذہانت و ذکاوت کا رنگ نمایاں تھا اور بعض مواقع پر اس لئے بھی حیرت ہوئی کہ ایک ایسے اہل قلم کی نگاہ جس کی تعلیم صرف عربی مدارس میں محدود رہی کیسے ان باریک گوشوں تک پہنچی اس لئے اکثر یہ خیال آیا کہ ان کی تعلیم اگر خالص انگریزی طرز کی ہوتی اور وہ اپنا موضوع تاریخ ہند ہی کو بنا لیتے تو شاید ان کے پایہ کا کوئی مورخ ہندوستان میں نہ ہوتا۔" (ایضاً)

تصانیف وتالیفات

مولانا گیلانی نے بہت کچھ لکھا مگر بہت سارے مسودات شائع نہ ہو سکے۔ اب تک جو کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور میرے سامنے ہیں' ان کی فہرست یہ ہے:

(۱) حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۲) ایک ہندوستانی صحابیؓ (۳) اسلامی معاشیات (۴) ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت' جلد اول و دوم (۵) تدوین قرآن (۶) تدوین فقہ (۷) تدوین حدیث (۸) مقالات احسانی (۹) الدین القیم (۱۰) النبی الخاتمؐ (۱۱) ہزار سال پہلے (۱۲) مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ (۱۳) تذکرہ شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۴) کائنات روحانی (۱۵) سوانح قاسمی' اوّل۔ دوم۔ سوم (۱۶) امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی (۱۷) تذکیر بسورۃ الکہف۔

مولانا کا انداز تحریر

مولانا کی تحریر و تصنیف کے متعلق ان کے معاصرین' معتقدین اور تلامذہ کی بہم کردہ معلومات آپ کے سامنے آ چکی ہیں کہ مولانا کے لکھنے کا کیا انداز تھا اور کس تیزی کے ساتھ لکھا کرتے تھے اور موجودہ دور کے مطابق نہ تو وہ نظر ثانی کرتے نہ ان کے مسودات میں کاٹ چھانٹ ہوتی۔ قلم برداشتہ جو ذہن میں ہوتا کاغذ کے سپرد کرتے چلے

Marfat.com

جاتے۔ محض آمد ہی آمد ہوتا آورد کا مولانا کے یہاں نام ونشان نہیں ملتا۔

یہی وجہ ہے کہ مولانا کی تصنیف وتالیف بے ساختگی' زور بیان' مضبوط استدلال اور سوز وگداز سے لبریز ہوتی ہے۔ پڑھنے والا ایک خاص طرح کا لطف محسوس کرتا ہے اور مولانا کی باتیں ان کے ذہن و دماغ میں اترتی چلی جاتی ہیں بلکہ بسا اوقات آنکھیں بے ساختہ اشکبار ہوجاتی ہیں۔ پڑھنے والے کو اپنے اوپر قابو باقی نہیں رہتا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علوم ومعارف کا ایک اتھاہ سمندر ہے جس کی موجیں بل کھا رہی ہیں......مولانا اطناب و ایجاز دونوں پر پورے طور پر قادر تھے۔ ایجاز دیکھنا ہوتو ''النبی الخاتم'' کا مطالعہ کریں اور اطناب دیکھنا ہوتو ''سوانح قاسمی'' دیکھیں لیکن نہ ایجاز لذت سے خالی اور نہ اطناب دل چسپی سے عاری۔ ایجاز کا کمال یہ ہے کہ اختصار کے باوجود کوئی جزر ہنے نہیں پاتا۔ ساری چیزوں اور تمام پہلوؤں کو مختصر سے مختصر جملوں میں سمیٹ لیتے ہیں اور اطناب میں ایسی معلومات جمع کردیتے ہیں جو کبھی بہت تلاش کے باوجود بھی ہاتھ نہیں آتی ہیں۔ پھر نکتہ آفرینی ایسی دل آویز و دلچسپ جس سے دماغ کے دریچے کھلتے چلے جاتے ہیں اور ذہن وفکر کو نشوونما کا فائدہ پہنچتا ہے۔

چند شہادتیں

عہد حاضر کے مشہور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے بجا لکھا ہے کہ

''ان تصانیف کو اسلوب نگارش اور ربط تحریر کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس نقطہ نظر سے دیکھنا چاہئے کہ ان میں علوم وحقائق اور استنباط و استخراج مسائل کا کس قدر گراں بہا ذخیرہ جمع ہوگیا ہے۔'' (مقالات احسانی۔ص ۱۲)

مولانا کی تحریر کے سلسلہ میں محترم غلام محمد بی اے (عثمانیہ) لکھتے ہیں:

ہر تحریر میں بے ساختگی' زور استدلال اور سوز وگداز کچھ ایسا موجود ہے کہ اس کی وجہ سے ربط کلام ٹوٹنے پر بھی کتاب چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔'' (ایضاً۔ص ۱۳)

یہ تو ہر مصنف کو ماننا پڑے گا کہ مولانا کی تحریر میں زور بھی ہے اور اثر بھی اور اسلوب نگارش عام لوگوں سے ممتاز اور الگ ہے۔ مجھے غلام محمد صاحب بی' اے کی اس رائے سے پورا اتفاق ہے:

''مولانا ادب کا ستھرا ذوق رکھتے تھے اس لئے وہ جدید زبان اور اسلوب بیان میں عالمانہ مضامین بخوبی پیش کرتے رہے بلکہ ادبی حیثیت سے مولانا کی تحریروں پر غائرانہ نظر ڈالی جائے تو بیسیوں عمدہ اور اچھوتی اصطلاحات ملیں گی جو مولانا کے ہاتھوں زبان اردو کو ملی ہیں۔'' (مقالات احسانی' ص ۱۶۔۱۷)

آپ کو آگے معلوم ہوگا کہ مولانا شاعر بھی تھے۔ اردو' فارسی اور ہندی تینوں زبانوں میں بے ساختہ اشعار

Marfat.com

کہتے تھے بلکہ کبھی کبھی عربی میں بھی............ ہزاروں اشعار نوک زبان پر تھے۔ ایسے مصنف کا قلم یقیناً ادبی حیثیت سے خوش گوار و دل چسپ ہی ہوگا۔

میں کوشش کروں گا کہ مولانا کی بعض تصانیف کا اجمالی تعارف بھی پیش کردوں تا کہ ناظرین آسانی کے ساتھ یہ معلوم کرلیں کہ مولانا نے ملک وملت کو کیا دیا اور افرادامت فائدہ حاصل کرنا چاہیں تو ان تصانیف سے کس طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

نفس مواد پر نگاہ

مولانا کی نظر ظاہری ٹیپ ٹاپ سے زیادہ نفس مواد پر ہوتی تھی۔ مقالہ اور تصانیف میں توجہ اسی پر دینا ضروری سمجھتے تھے۔

خاکسار کے نام مولانا گیلانی اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''آپ کے مقالات ''برہان'' (دہلی) اور ''دارالعلوم'' (دیوبند) والے فقیر کی نظر سے گزرے آپ کے ہر مضمون کو غور سے پڑھتا ہوں۔ اگر توجہ کا مسئلہ آپ نے باقی رکھا تو ان شاءاللہ رسول اللہ ﷺ کے دین کی خدمت کا تحریری طور پر آپ کو آئندہ اچھا موقع ملے گا.....زبان کا بھی چنداں خیال نہ کیجئے' اصل چیز مواد ہے۔ صورت' مادہ کی قیمت کے بعد چنداں اہم باقی نہیں رہتی' اگرچہ مضمون کے ساتھ صورت کا خیال کرنا ہی پڑتا ہے۔'' (مکتوب ۱۲ جنوری ۱۹۵۲ء)

تاثیری پہلو کا دھیان

اسی طرح ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:۔

> ''واقعات کے ادا کرنے میں ان کے تاثیری پہلوؤں کا بھی مسلسل خیال رکھا جائے۔''
> (مکتوب ۸ مئی ۱۹۵۱ء)

اس طرح کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کی نظر زیادہ تر مواد اور تاثیری پہلو پر رہا کرتی تھی اور کوئی شبہ نہیں کہ مولانا کی تحریر میں تاثیر کا پہلو غالب ہے۔ جو لکھتے تھے ڈوب کر لکھتے تھے۔ چالیس سال تک مولانا کا قلم گوہر افشانی کرتا رہا اور اہل علم اس سے مستفید ہوتے رہے۔

آپ کے مقالات و مضامین ''معارف'' (اعظم گڈھ)، ''برہان'' (دہلی)، ''الفرقان'' (لکھنؤ) ''صدق جدید'' لکھنؤ اور رسالہ ''دارالعلوم'' (دیوبند) میں بکثرت شائع ہوتے رہے اور عوام وخواص نے مزہ لے لے کر پڑھا اور بہت سے مقالات کو اس طرح پڑھا کہ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہوتے اور دل میں ایک آہ ہوا کرتی ہے۔

Marfat.com

واقعات سے نتائج کا استخراج

آپ کو واقعات سے نئے نتائج نکال کر پیش کرنے کا خاص ملکہ تھا۔ بہت سارے تاریخی حقائق ہم لوگ پڑھ کر گزر جاتے ہیں اور احساس تک نہیں ہوتا کہ ہمارے لئے مسلمانوں کے لئے اور موجودہ دور کے انسانوں کے لئے عبرت و بصیرت کے کتنے خزینے پوشیدہ ہیں۔ مولانا گیلانی ان خزینوں کو خوب ہی اُجاگر کرنا جانتے تھے اور پڑھنے والے پڑھ کر چونکتے تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''قوت تحریر کا جو ملکہ مولانا گیلانی کو حاصل تھا اس سے ناظرین ''صدق'' نا آشنا نہیں۔ ایک خاص طرز انشاء کے مالک تھے اور اس میں کسی کے مقلد نہیں' خود اس کے موجد تھے۔ تحریر کا سب سے بڑا وصف بے ساختگی اور برجستگی تھی۔ جب اور جس موضوع پر قلم اُٹھایا' بس لکھتے ہی چلے گئے۔ جو عنوان دوسروں کو پامال نظر آتے تھے ان میں بھی وہ نئے نئے نکتوں کے انبار لگا دیتے۔ خشکی ان کا قلم جانتا ہی نہ تھا۔ تحریر کی سطر سطر جاندار ہوتی۔''(وفیات ماجدی۔ص ۷۷)

مولانا دریابادی نے یہ بھی لکھا ہے:

''ہر تازہ فتنہ کی گہری جڑوں پر پوری نظر رکھنے والے تھے' حمایت ونصرت اسلام میں ہزار ہا صفحات لکھ ڈالے۔''(ایضاً)

''اسفار اربعہ'' کا ترجمہ

حضرت مولانا گیلانی کو معقولات سے بڑی مناسبت تھی۔ حیدر آباد میں جب نظام کی توجہ سے دارالترجمہ قائم ہوا اور ہر علم وفن کی کتابوں کا اردو ترجمہ کرایا گیا' اس زمانہ میں صدرالدین شیرازی کی مشہور کتاب ''اسفار اربعہ'' کا ترجمہ مولانا گیلانی کے سپرد ہوا اور آپ نے یہ خدمت بحسن وخوبی انجام دی' چنانچہ وہ ترجمہ ۱۹۵۷ صفحات پر چھپا ہوا ہے۔ اردو مترجم کی حیثیت سے اس پر آپ کا نام درج ہے۔

خطابت......اور مولانا گیلانی

مولانا گیلانی رحمتہ اللہ علیہ جہاں سلطان القلم اور رئیس التحریر تھے......وہیں رب العالمین نے آپ میں تقریر و وعظ کا ملکہ بھی بدرجہءاتم ودیعت فرمادیا تھا بلکہ آپ کی تقریر اکثر وبیش تر تحریر سے کہیں زیادہ دل نشیں' ہلچل پیدا کرنے والی اور دلوں کو گرمانے والی ہوتی تھی۔ پُرسوز بھی ہوتی تھی اور جاں گداز بھی' پڑھا لکھا طبقہ بھی متاثر ہوتا تھا اور عوام کا جاہل طبقہ بھی۔ عام طور پر مجمع اشک بار ہوتا اور کبھی کبھی چیخ وپکار کی آوازیں بھی بلند ہوتی تھیں۔

مولانا چونکہ سراپا اخلاص تھے' جو کہتے دل کی گہرائی سے کہتے' اور دلی خواہش ہوتی کہ سامعین کے دلوں میں اتر جائے اس لئے جو سنتا سر دھنتا' ہزاروں ہزار کا مجمع آپ کی تقریر میں ہوتا تھا اور بصد ذوق و شوق بیٹھا سنتا رہتا تھا۔

تقریر کا انداز

تقریر کا انداز کیا ہوتا اس سلسلہ میں مولانا کے ایک حیدر آبادی شاگرد لکھتے ہیں:

''ان کی تقریر تو اس سے بھی کہیں زیادہ پُرسوز و جاں گداز ہوتی' تقریر کا رنگ واعظانہ نہیں بلکہ خطیبانہ ہوتا تھا' درمیان میں لطائف و ظرائف اور منتخب اشعار اس موزونیت سے آجاتے تھے کہ عالمانہ تقریر عوام کے لئے نہایت دلچسپ و دل نشیں بن جاتی تھی حالانکہ نکتہ آفرینی اور علمی معلومات کا سیلاب تھا جو امڈتا چلا آتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ تقریر میں خود مولانا بےخود ہوجاتے تھے جس کے اثر سے سامعین پر بھی ایک کیف طاری ہوجاتا تھا۔'' (مقالات احسانی، ص ۴)

جب کبھی اسلامی غیرت و حمیت کو جگانا چاہتے تو انداز بیان اور زیادہ موثر اور خطیبانہ ہوجاتا اور ایسا معلوم ہوتا کہ حالات کا نقشہ سامنے کھینچ کر لوگوں کو مشاہدہ کرارہے ہیں اور مجمع اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ مولانا کی آنکھیں سُرخ ہوجاتیں' چہرہ تمتما اُٹھتا' آواز بھرا جاتی اور جوش و خروش سے سینہ پھٹتا ہوا دکھائی دیتا۔

لوگوں کی دلچسپی

پورا حیدر آباد شہر مولانا کی تقریر کا عاشق و شیدا تھا۔ لوگوں سے جان بچانا مشکل ہوجاتا بلکہ اسی تقریری چکر میں مولانا کی صحت برباد ہوگئی اور مولانا کے دوستوں کو پابندی عائد کرنی پڑی اور اعلان کردیا گیا کہ مولانا اپنی رائے سے کسی جلسہ یا مجمع میں تقریر کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ فلاں صاحب اس کام کے ذمہ دار ہیں ان کی اجازت کے بغیر وہ قدم باہر نہیں نکال سکتے۔

تقریر کی ابتداء آپ نے ٹونک کی جامع مسجد سے کی تھی جس کا اجمالی تذکرہ گزر چکا' پھر مولانا فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند میں معین المدرسین بنائے گئے' تو ان کے ذمہ وعظ و تقریر کا کام بھی رکھا گیا کہ باہر سے طلبی آئے تو مولانا کو بھیجا جائے چنانچہ سال ڈیڑھ سال آپ نے دارالعلوم کی زندگی میں یہ خدمت بھی انجام دی۔

تقریر کی تاثیر

مولانا کی تقریر کافی موثر ہوتی تھی' نوجوانی کا جوش تھا۔ مستی و بیخودی شروع سے تھی۔ پھر کیا تھا' جب بولنے پر آتے' مجمع محو حیرت بنا دیکھتا اور مولانا روانی اور تیزی کے ساتھ بولتے چلے جاتے بلکہ کبھی پھول برساتے اور کبھی آگ کی بارش ہوتی۔ مجمع کبھی قہقہہ لگاتا اور کبھی دھاڑیں مار کر روتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مولانا کی بہت سی تقریروں میں کہرام سا مچ جاتا۔ آہ وزاری کی آوازیں بلند ہونے لگتیں اور سننے والوں کو خبر نہیں ہوتی کہ کتنے گھنٹے گزر گئے۔

Marfat.com

مولانا کی تقریر کا اعتراف

حیدر آباد کے مشہور و مقبول مقرر نواب بہادر یار جنگ کہا کرتے تھے کہ میں نے تقریر کرنا مولانا گیلانی سے سیکھی ہے۔ ایک صاحب نے مولانا کی تقریر کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے:

''مولانا مناظر احسن کی تقریر' لب ولہجہ کا مٹھاس' الفاظ کی صحیح نشست برخاست' مضامین کی آمد' معلومات کی وسعت' اسلوب وانداز کی جدت وندرت کی جامع ہے۔ جناب ماہر القادری مدیر ''فاران'' (کراچی) نے لکھا تھا کہ نواب بہادر یار جنگ نے (جن کی سیف زبانی اور شعلہ بیانی سے اب تک سینۂ باطل میں ایک تلاطم کی سی کیفیت طاری ہے) کہا تھا کہ میں نے تقریر مولانا مناظر احسن گیلانی سے سیکھی ہے۔ میلاد النبیؐ کے جلسوں میں جب مولانا حیدر آباد میں تقریر فرماتے تھے تو میں موٹر لئے ان کے پیچھے دوڑتا رہتا تھا۔'' (ہزار سال پہلے، ص ۱۹)

میلادی وعظوں کا سلسلہ

مولانا کے احباب نے بتایا کہ حیدر آباد میں کچھ لوگ مولانا کو تقریر کے لئے' لئے پھرتے تھے اور مولانا بھی اپنی صحت سے بے پرواہ ہو کر جہاں جہاں جاتے رہتے تھے' ربیع الاول کے مہینے میں خصوصیت کے ساتھ سیرۃ النبیؐ کی تقریروں کا بڑا زور رہا کرتا تھا۔ مولانا انکار کرنا جانتے ہی نہ تھے۔ مولانا عبد الباری ندوی کا بیان ہے:

''ایک اور بڑا ڈپارٹمنٹ مولانا کی حیدر آبادی زندگی کا عرصہ تک خصوصاً میلادی وعظوں اور تقریروں کا رہا اور شاید اسی نے دمہ کے اس پرانے مریض کو مرض میں بھی مولانا کو شریک کر کے لفظاً ومعناً ''ہمدم'' بنا دیا' ورنہ شدت مرض میں تو ان تقریری بھرماروں کا بھرپور حصہ تھا ہی۔ یوں تقریر کا سلسلہ سال بھر چلتا رہتا لیکن موسم کے دو تین مہینوں میں اتفاقاً ہی کسی دن دم لینے کا موقع ملتا ہوگا۔ عموماً یہ جلسے رات کو ہوتے اور رات رات بھر چلتے رہتے۔'' (مکاتیب گیلانی)

جلسہ کرانے والوں کا سلوک

جلسہ کرانے والوں کا عام قاعدہ ہے کہ وہ صرف اپنا کام نکالنا جانتے ہیں۔ نہ انہیں مقرر سے ہمدردی ہوتی ہے نہ محبت' نہ اس کی صحت کی فکر ہوتی ہے اور نہ اس کی راحت و آرام کا اہتمام ہوتا ہے۔ جب تک تقریر کے لئے ڈائس تک مقرر نہیں پہنچتا مقرر کی بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے' خوشامدیں ہوتی ہیں' سواری کا انتظام ہوتا ہے اور نہ معلوم کیا کیا سبز باغ دکھائے جاتے ہیں لیکن جونہی مقرر تقریر کر کے اسٹیج سے نیچے آتا ہے' بلانے والے چھپنے لگتے ہیں۔ تلاش وجستجو کے باوجود نہیں ملتے۔ جب تک بے حیا نہ بن جائے کوئی واپسی کا انتظام بھی کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔

مولانا کے ساتھ بھی بسا اوقات ایسے حادثے پیش آتے رہتے تھے۔ خود...... حیدرآباد میں ایسا ہوتا کہ واپسی میں سواری نہیں ملتی۔ پیدل قیام گاہ تک آنے کی زحمت گوارا کرتے۔ کبھی کوئی جاننے والا راستہ میں دیکھ لیتا تو اپنی گاڑی روک کر مولانا کو بٹھاتا اور قیام گاہ تک پہنچاتا۔ کبھی جلسہ میں جوتا غائب ہو جاتا تو ننگے پاؤں واپس ہونے کی بھی نوبت آتی تھی۔

تقریر کا اثر صحت پر

مولانا عبدالباری ندوی جو خود بھی جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر تھے انہوں نے لکھا ہے:

"کالج کے فرائض منصبی کے روزانہ کئی کئی لکچروں کے ساتھ وعظوں اور تقریروں کے اس تسلسل سے مولانا کی صحت پر آخر ایسی بن آئی کہ شب و روز اس نیاز مند کے لئے دیکھتے رہنا برداشت سے باہر ہو گیا۔" (ایضاً)

چنانچہ احباب سے مشورہ کے بعد مولانا ندویؒ آپ کی تقریروں کے انچارج قرار دیئے گئے کہ بغیر ان کے حکم کے مولانا گیلانی کہیں بھی وعظ و تقریر کے لئے نہیں جا سکتے۔ جس کو تقریر کرانی ہو وہ پہلے مولانا ندوی سے اجازت حاصل کرے۔

مولانا ندوی انتظام میں کافی مضبوط تھے۔ تھوڑے دنوں میں کنٹرول کر لیا اور مولانا گیلانی کی گرتی ہوئی صحت کو سنبھالا ملا اور اس طرح مولانا کو سکون و اطمینان میسر آیا۔ عرض یہ کرنا ہے کہ مولانا گیلانی صرف تحریر کے میدان ہی کے شہسوار نہیں تھے بلکہ آپ کی تقریر و وعظ کا میدان بھی بڑا وسیع تھا اور اپنی بامروت اور صلح جو طبیعت سے مجبور ہو کر اپنی صحت تک برباد کر لی تھی اور اس حد تک کہ ان کے ساتھیوں کو رحم آنے لگا اور وعظ کہلانے والوں کی خود غرضیوں سے تنگ آ گئے جو اپنا کام نکالنا تو جانتے ہیں واعظ کی صحت و راحت جسمانی کی کوئی فکر نہیں کرتے۔

مولانا دریابادی کی شہادت

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

"طلبہ اور یونیورسٹی کے طلبہ کے حق میں بہترین معلم تھے اور ایک بہترین مقرر و خوش بیان خطیب بھی تھے۔ انبالہ کے اجلاس ندوہ ۱۹۳۶ء میں میں نے دیکھا کہ گو بولنے والے اور بھی اچھے اچھے علماء موجود تھے لیکن پبلک کی طرف سے بار بار مطالبہ جن بزرگ کی تقریر کے لئے ہوتا وہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کے بعد یہی مولانا گیلانی تھے۔"

(وفیات ماجدی)

Marfat.com

عوام وخواص کا فائدہ

اس میں شبہ نہیں کہ اخیر عمر میں اس خطابت کے زور کی وجہ سے صحت متاثر ہوئی مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آپ کے وعظ وتقریر سے عوام وخواص کے ایک بڑے طبقہ کو ایمان کی لذت ملی' عمل کا جذبہ پیدا ہوا' دل ودماغ کی دنیا بدلی اور ان میں دین اور دینی علوم سے شغف پیدا ہوا۔ مردوں نے بھی آپ کی تقریروں سے اپنا مستقبل سنوارا اور عورتوں نے بھی' بوڑھوں نے بھی اور جوانوں نے بھی' تاجروں میں بھی خدا کا خوف پیدا ہوا اور مزدوروں میں بھی۔

حیدرآباد شہر کافی رقبہ میں پھیلا ہوا ہے' مولانا ہر ہر محلّہ میں بلائے جاتے اور لوگ بڑے شوق کے ساتھ آپ کے وعظ میں شریک ہوتے تھے۔

نظام حیدرآباد کی شرکت

نظام حیدرآباد جو وہاں کے نواب اور سربراہ مملکت تھے' وہ بھی مولانا کی تقریریں سنا کرتے تھے۔ اس کی صورت یہ ہوتی تھی' کسی رئیس کے یہاں آپ کی تقریر رکھی جاتی۔ مجمع سامنے ہوتا اور نظام حیدرآباد سبھوں کی نظروں سے اوجھل الگ بیٹھا کرتے تھے اور اس طرح واعظ کو خبر تک نہیں ہوتی تھی کہ یہاں حضور نظام حیدرآباد بھی تشریف فرما ہیں۔

یقیناً مولانا کے نامۂ اعمال میں اس راستہ سے بھی بہت سارا ثواب لکھا گیا ہوگا اور بہت سے لوگوں کے دلوں سے دعائیں نکلی ہوں گی' اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کے درجات بلند فرمائے۔ اپنی زندگی میں مخلوق خدا کی بڑی خدمت کر گئے۔

مولانا گیلانی کی تقریر کے سلسلے میں مولانا دریابادی کی شہادت ہے:

> ''موضوع کوئی سا بھی دیجئے بس یہ معلوم ہوتا کہ خیالات کا دریا ہے کہ اُبلتا اور اُمڈتا چلا آرہا ہے۔ کہاں کہاں سے مضمون پیدا کر لیتے اور نکتہ سنجی اور دقیقہ آفرینی' قرآنی عنوانات میں اور زیادہ نمایاں ہوتی اور قرآن کے بعد نمبر حدیث کا رہتا۔ ایسی نکتہ سنجیوں کو اب کان ترس گئے۔''
>
> (معاصرین۔ ص ۱۸۳)

مولانا مرحوم کی نکتہ سنجیوں کا اعتراف اپنوں نے بھی کیا ہے اور غیروں نے بھی۔ تقریر میں جہاں اخلاص ضروری ہے اور اس کے اثرات ہوتے ہیں وہاں اہل علم تقریر میں نئے نکتے بھی تلاش کرتے ہیں اور اس سے خوش ہوتے ہیں۔ نئی معلومات جب کتاب وسنت کی روشنی میں ہوتی ہے تو قدرتاً اہل علم خصوصاً اور عوام عموماً جھوم جاتے اور واعظ ومقرر کے لئے ان کے دلوں سے دعائیں نکلتی ہیں اور اس کی تقریر سننے کا شوق بڑھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مولانا کو یہ ساری خوبیاں عطا کر رکھی تھیں۔

Marfat.com

فہم قرآنی اور حضرت مولانا گیلانی

حضرت مولانا گیلانی رحمتہ اللہ علیہ ایک طرف جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں درس و تدریس کے ذریعہ نئی نسل' جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور اہل علم کو اسلام' اسلامی تعلیمات اور اسلامی احکام و مسائل سے روشناس کر رہے تھے اور آئندہ کے لئے ان جیسے لوگوں میں اشاعت اسلام کے خدام پیدا کرنے میں مشغول تھے' دوسری طرف حیدرآباد کے عام مسلمان باشندوں میں دین کا ذوق پیدا کرنے کے لئے ''درس قرآن'' اور مواعظ حسنہ کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔ شہر کی اس مسجد میں جو قیام گاہ سے قریب ہوتی تھی' قرآن کا درس بھی دیا کرتے تھے اور شہر کے جس حصہ میں مواعظ حسنہ کی ضرورت ہوتی' وہاں پہنچ کر وعظ فرماتے تھے۔ آپ کے درس اور وعظ میں ہزاروں مسلمان شوق و ذوق کے ساتھ شریک ہوا کرتے تھے۔

درس قرآن کا سلسلہ

مولانا عبدالباری ندوی استاذ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد نے لکھا ہے:

''مختلف قیام گاہوں کے قریبی مساجد میں درس قرآن کا جو سلسلہ وقتاً فوقتاً چلتا رہتا اس سے مستفید ہونے والے تو قریباً سارے کے سارے نئے تعلیم یافتہ ہی ہوتے اور ان کے مجمع میں مولانا کی طبیعت و زبان خوب کھلتی' بخلاف اس کے بقول خود ہم پیشہ مولویوں سے ڈرتے رہتے اور اپنے خصوصی افکار و خیالات کا عام تقریروں' تحریروں اور مجلسوں میں بہت کم بند بند ہی اظہار ہوتا۔'' (مکاتیب گیلانی۔ص ج ا)

مولانا گیلانی چونکہ ایک سال تک مولانا حمید الدین فراہی (م ۱۳۴۹ھ) کی...... مجلس قرآن میں شریک رہ چکے تھے اور ان کو قرآن سے بڑی خاص مناسبت تھی اس لئے مولانا گیلانی میں بھی قرآنی ذوق گھر کر گیا تھا اور اس کلام مقدس سے خاصی مناسبت پیدا ہوگئی تھی۔

مولانا فراہی کا تذکرہ

مولانا نے اپنی کتاب ''نظام تعلیم و تربیت'' میں جہاں ہندوستانی علماء کی خدمت قرآن کا تذکرہ کیا ہے اور قرآنی آیات اور سورتوں کے باہمی ربط کی خدمت کو بیان کیا ہے' وہاں مولانا فراہی کا ذکر بھی فرمایا ہے۔

لکھتے ہیں:

''میں نے جیسا کہ عرض کیا ولی اللہی تجدید کے بعد ہندوستان نے اپنی نشاۃ ثانیہ میں جو کام اس سلسلہ میں انجام دیا ہے میرا اشارہ حضرت الاستاذ مولانا حمید الدین الفراہی رحمتہ اللہ علیہ کی تفسیر ''نظام الفرقان'' کی طرف ہے جس میں علاوہ دوسری خوبیوں کے (یعنی قرآن اور بائبل کے

Marfat.com

تعلقات اور ادبی مباحث) کے سوا سب سے بڑی اور مشترک خصوصیت مولانا کی اس تفسیر کے تمام حصوں میں یہی ہے کہ انہوں نے آیات قرآنی میں ربط پیدا کرنے کی ایسی عدیم النظر کوشش فرمائی ہے کہ بسا اوقات صرف آیات کے یہی روابط اس کی دلیل بن جاتے ہیں کہ یہ کتاب خدا کے سوا اور کسی کی طرف سے نہیں ہوسکتی۔"

(مسلمانوں کا ہندوستان میں نظام تعلیم و تربیت، ص ۲۸۰)

قرآن فہمی اور اس کی تفہیم

قرآن سے مولانا کو ایک خاص شغف تھا۔ پہلے خود اس کتاب مقدس میں غور و فکر کرتے تھے اور منشاء خداوندی کو پا لینے کی جدوجہد کرتے تھے اور بڑی حد تک اس میں کامیاب تھے۔ حضرت مولانا عبدالباری ندوی جو مولانا سے بہت قریب تھے، انہوں نے لکھا ہے:

"البتہ اس سلسلہ میں ایک بڑے خاص کمال کا علم و اندازہ جتنا اور جیسا چاہئے لوگوں کو کم ہے وہ ان (مولانا گیلانی کی) بہت خاص الخاص قرآن مجید کی فہم و تفہیم تھی۔ ان کی انفرادی و فکری بڑائیوں میں مواقع ہذا کی نظر میں یہی سب سے بڑائی تھی۔"

مشاہدات کے ذریعہ تفہیم

مولانا ندوی نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ مولانا قرآن کو تفسیری ذخیروں کے بجائے مشاہدات سے ذہن نشین کرنے کی سعی فرماتے تھے:

"اس زندہ کتاب (قرآن مجید) کو حضرت (گیلانی) مرحوم تفسیری کتابوں سے زیادہ زندگی کی زندہ کتاب اور زندہ واقعات و مشاہدات سے سمجھنے سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔"

(مکاتیب گیلانی)

قرآن سے مناسبت کا ہی ثمرہ تھا کہ مولانا کا ذہن رسا نکتہ آفرینی اور قرآن پاک کے صحیح مفہوم و مطلب تک پہنچنے میں بڑی سرعت اختیار کرتا تھا اور ایسے معانی تک بہت جلد پہنچ جاتا تھا جہاں تک عام علماء کے ذہن جلد نہیں پہنچ پاتے تھے۔

قرآن فہمی کی ایک مثال

مولانا ندوی ہی نے لکھا ہے کہ سورہ واللیل میں جو یہ آیتیں آئی ہیں:

فاما من اعطیٰ واتقیٰ ۔ وصدق بالحسنیٰ۔ فسنیسرہ للیسریٰ۔ واما من بخل واستغنیٰ ۔وکذب بالحسنیٰ فسنیسرہ للعسریٰ

جس کا ماحصل یہ ہے کہ انسان اپنی اجتماعی وانفرادی ضروریات کے لئے مختلف تدبیریں اختیار کرتا ہے لیکن اصولی طور پر اس کے دو ہی رُخ ہوتے ہیں۔ایک' خدا پرستی کی دوسری دنیا درستی کی یا خدا گریزی کی' لہٰذا جو شخص عطا اور بخشش' خوف خدا اور تقویٰ کی راہ اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے آسانی کی راہ ہموار کر دیتا ہے اور جو اس کے خلاف خدا گریزی کے راستے پر ہوتا ہے تو اس کے لئے دشوار کو آسان کر دیتا ہے۔

مولانا ندوی لکھتے ہیں:

''آسان کو آسان کر دینے کا مطلب تو خیر یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اس میں مزید آسانی پیدا کر دی جائے گی لیکن دشوار کو آسان کر دینا بظاہر خدا و نیکی سے روگردانی کرنے والوں کی سزا کیا' اُلٹے انعام ہوا تفسیروں میں جی لگتی ہوئی بات نہیں ملتی' مفسر گیلانی کے نزدیک صاف وسیدھا مطلب یہ تھا کہ کسی معاملہ میں سعی وتدبیر کی جو راہ......فی نفسہٖ آسان ہے خدا پرستوں اور نیکوکاروں پر خدا وہی آسان کر دیتا ہے۔اس کے برعکس جو خدا و نیکی سے بغاوت و روگردانی کرتا ہے اس کی سزا دنیا ہی میں یہ دی جاتی ہے کہ سعی وتدبیر کا فی الواقع ونفس الامر میں جو راستہ دشوار گزار ہے ان کی کج نگاہی میں وہی آسان نظر آنے لگتا ہے اور اس پر چل کر کجروی کا خوب مزا چکھایا جاتا ہے۔''(مقدمہ مکاتیب گیلانی۔ص۲۹)

مولانا کی قرآنی یادداشت

مولانا نے قرآن سے متعلق اپنی یادداشتوں کے جمع کرنے کا کام شروع کر دیا تھا تاکہ آنے والی نسل اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائے۔

خاکسار نے ایک مرتبہ قرآن کے درس کے لئے خدمت اقدس میں حاضری کی اجازت طلب کی تھی تو اس خط کے جواب میں تحریر فرمایا:

''آپ نے قرآن کے درس کا تذکرہ بھی اپنے مکتوب میں کیا تھا۔ دیہاتوں میں قیام اختیار کرنے پر آج کل کوئی تیار نہیں ہوتا' اسلئے اب انتظام کر رہا ہوں کہ اپنے قرآنی وجدانات کو قلمبند کرلوں۔''(مکتوب ۲۶ جون ۱۹۵۱ء)

معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے یہ کام کیا تھا مگر وہ سب مسودات کی صورت میں ہی رہ گئے۔ کتابت وطباعت کی نوبت نہیں آئی' اس لئے کہ گیلانی میں رہ کر لکھ تو سکتے تھے مگر اسے صاف کرنے والا کوئی نہ تھا۔اس کے موجود ہونے کا

Marfat.com

اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ سال بھر بعد جب میں نے قرآنی استفادہ کے لئے لکھا تو اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

''زیادہ سے زیادہ آپ میری لکھی ہوئی تفسیری جزؤں کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔''

(مکتوب ۲۲ اپریل ۱۹۵۲ء)

قرآن سے لگاؤ کا ثمرہ

کتاب وسنت کے سلسلہ میں مولانا کبھی غلط تعبیر اور من مانی تفسیر کو برداشت نہیں کر پاتے تھے۔ آپ کا قلم فوراً جنبش میں آجاتا تھا۔

پروفیسر اجمل خان جو مولانا آزاد کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے' انہوں نے باضابطہ دینیات کا نصاب نہیں پڑھا تھا لیکن قرآن پر لکھنے کا شوق تھا اور کہنا چاہیے وہ قرآن میں تحریف کیا کرتے تھے۔ ان کی جب کوئی کتاب مولانا کے سامنے آتی تھی مولانا کا خون کھولنے لگتا تھا۔ پڑھ کر اس کتاب پر ہی جگہ جگہ اس کی تردید میں نوٹ لکھتے چلے جاتے تھے۔

ایک دفعہ اسی پروفیسر اجمل نے ترتیب قرآن پر کوئی مضمون لکھا' مولانا اسے پڑھ کر بے چین سے ہو گئے۔ بہت غصہ آیا کہ اس جاہل نے بے سمجھے گھسیٹ مارا اور گمراہی کے دروازے کھولنے پر آمادہ ہو گیا ہے۔

مولانا کا خط

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی جو خود بھی قرآن کا عمدہ ذوق رکھتے ہیں اور عرصہ تک دارالعلوم ندوہ میں طلبہ کو مضامین قرآن پڑھاتے تھے' مولانا نے ان کے نام تحریر بھیجی:

''آپ کو شاید میرے جنون کا حال معلوم نہیں' اجمل نامی پروفیسر کے نام ''مدینہ'' (اخبار بجنور) میں مضامین کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ غصہ آرہا تھا دبا نہ سکا' رات کو قلم لیا پراگندہ خیالات سمیٹے اور لکھ کر ''مدینہ'' اخبار کو بھیج دیا۔ مسودہ تیار ہی کب تھا وہی مسودہ وہی مبیضہ تھا۔''

(پرانے چراغ، ص ۶۶)

مولانا کا مقالہ

مولانا کے اس مقالہ سے اجمل خان کے تمام تر غلط خیالات اور باطل رجحانات کی خود قرآن پاک سے مضبوط تردید ہوگئی اور اس کے مضمون سے جتنے شکوک وشبہات پیدا ہو سکتے تھے سب کا قلع قمع ہو گیا۔ جب اہل علم کو اس مضمون کی خبر ہوئی تو بعضوں نے مولانا سے اس کی نقل چاہی لیکن مولانا کے پاس نقل کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا۔ وہ تو قلم برداشتہ لکھتے اور اسی کو اٹھا کر کسی اخبار یا رسالے یا ناشر کو بھیج دیا کرتے تھے۔

Marfat.com

مولانا علی میاں کا تاثر

اس قرآنی مقالہ کے متعلق جو اجمل خان کی تردید میں لکھا گیا تھا' حضرت الاستاذ مولانا علی میاں مدظلہ لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے ان (مولانا گیلانی) کو بڑا نکتہ رس ذہن عطا فرمایا تھا۔ قرآن مجید کی وہی آیات اور صحابہ کی وہی احادیث اور تاریخ کے وہی بیانات جو ہم آپ بیسیوں بار پڑھ چکے ہیں مولانا ان سے ایسے حقائق ثابت کر دیتے اور ان سے ایسے عجیب لیکن صحیح نتائج نکال لیتے کہ حیرت ہوتی۔ اس مضمون میں بھی وہی شان ہے۔ قرآن مجید کے من جانب اللہ محفوظ و مرتب ہونے کو اور عہد رسالت ہی میں اس کے مرتب و جمع ہو جانے کو انہوں نے قرآن مجید کے الفاظ و نصوص اور واقعات سے اس طرح ثابت کیا تھا کہ اس خیال کی بالکل بنیاد ہی منہدم ہو جاتی تھی کہ قرآن مجید بہت تاخیر کے ساتھ جمع و مرتب ہوا اور اس کی ترتیب حضرت ابو بکرؓ یا حضرت زید بن ثابتؓ کے اجتہاد کا نتیجہ ہے۔'' (پرانے چراغ، ص ۶۶ ج ۱)

تدوین قرآن پر مولانا کی کتاب

مولانا گیلانی نے تدوین قرآن پر مستقل کتاب لکھی ہے جو اب تک طبع نہیں ہو سکی ہے مگر اس کا جوہری خلاصہ ان کے شاگرد غلام ربانی نے ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع کرا دیا ہے۔ اس کے تعارف میں خود مولانا نے لکھا ہے:

''اگرچہ فقیر نے خود بھی اس عنوان پر مستقل کتاب لکھی ہے لیکن جہاں تک میرا خیال ہے میری کتاب کے اس جوہری خلاصہ کے شائع ہو جانے کے بعد اب اصل کتاب کی اشاعت کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔'' (تدوین قرآن، ص ۶)

اس کتاب میں قرآن کی اندرونی شہادت سے ثابت فرمایا ہے کہ یہ کلام اللہ کتاب کی صورت میں ہے' یعنی لکھی ہوئی ہے اور اس کی کتابت کو اہل عرب تسلیم کرتے تھے۔ قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ لکھنے والے اعلیٰ خصوصیات کے حامل تھے۔ ایک خاص طرح کی جھلی پر یہ کتاب لکھی گئی تھی جو لکھنے کے ہی کام آتی تھی۔ اس کو پاک لوگ ہاتھ لگا سکتے تھے' ناپاک کو چھونے کی اجازت نہیں تھی۔

مولانا نے لکھا ہے:

''تقریباً تیس چالیس سال کے مسلسل فکر و تامل' تلاش و جستجو کے بعد آخری تحقیقی نتائج اس کتاب میں درج ہیں۔'' (ایضاً)

Marfat.com

قرآن وحدیث اور فقہ کی تدوین

یہ واقعہ ہے کہ مولانا نے تدوین قرآن' تدوین حدیث اور تدوین فقہ پر جتنا مواد جمع فرمادیا ہے' وہ ان کا ہی حصہ ہے اور آئندہ اعتراض کرنے والے بد باطنوں کی زبان وقلم پر آپ نے مضبوط تالا ڈال دیا ہے۔ دوسری جانب مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت کو جو شکوک وشبہات کے دلدل میں پھنس سکتی تھی' ان سے نکال کر یقین واعتماد کی شاہ راہ تک پہنچنے کا انتظام فرمادیا ہے۔

مولانا کے قرآنی مسودات اگر کبھی کل کے کل چھپ گئے......تو اس وقت صحیح طور پر اندازہ لگانا آسان ہوگا کہ مولانا امت کے ہاتھ میں کتنا قیمتی خزانہ دے کر گئے۔

یہ واقعہ ہے کہ

> ''اس تقریباً چالیس سالہ عرصہ میں مولانا نے مختلف علوم وفنون پر متعدد کتابیں اور سینکڑوں مضامین لکھے اور ہر تحریر میں اپنے ذہن کی اپج' فہم وفراست کی بلندی' مطالعہ کی وسعت' نظر کے عمق اور قوت اجتہاد کے زور کے پائیدار نقوش چھوڑے۔'' (تذکرہ شاہ ولی اللہ،ص۴)

مولانا کا قرآن سے شغف

یہاں مولانا گیلانی کی ان سطروں کا نقل کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے جو آپ نے ''تدوین قرآن'' کے شروع میں تحریر فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''وقت پڑنے سے پہلے بعض کتابوں کی صحیح قدر وقیمت کا لوگوں کو اندازہ نہیں ہوتا لیکن ضرورت جب پیش آجاتی ہے تو دنیا بڑی بے کسی کے ساتھ اس وقت ان کتابوں کو ڈھونڈتی ہے۔ تقریباً یہی کچھ حال اس کتابچہ یا مقالہ کا بھی ہے۔ پیغمبروں کے خاتم محمد رسول اللہ ﷺ جس حال میں بنی نوع انسانی کے لئے آسمانی دستور اور الٰہی قانون کی آخری شکل یعنی قرآن مجید کو دنیا میں چھوڑ کر تشریف لے گئے من وعن' ہو بہو' سرمو تفاوت کے بغیر یہ خدائی صحیفہ آج بھی دنیا میں موجود ہے......دل تو یہی چاہتا ہے کہ بداندیشی کا جذبہ کبھی نہ ابھرے لیکن شیطان نے اگر اس سوال کو چھیڑ دیا تو ان شاء اللہ تعالیٰ اس وقت آپ کو ان چند اوراق میں وہ سب کچھ مل جائے گا جو شاید بڑے بڑے......کتب خانوں کے کتابی ذخیروں میں بھی نہیں مل سکتا......اور وقت پر وہ تریاق انہی اوراق سے میسر آئے گا...... اسلام پر نازک ترین وقت کا خطرہ سامنے آگیا ہے' اس نازک ترین گھڑی میں یہ مختصر رسالہ بھی ان شاء اللہ کافی کارآمد ثابت ہوگا۔ کم از کم اسلام کی اسی کتاب جس پر اس دین کی بنیاد قائم ہے اس پر تو شک وشبہ کی گرد اچھالنے میں ان شاء اللہ اب کوئی بداندیش کامیاب نہیں ہوسکتا۔'' (تدوین قرآن)

اس سے مولانا کے فکر' دوراندیشی اور قرآنی شغف کا اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے تدوین قرآن پھر تدوین حدیث وتدوین فقہ پر اس قدر محنت کیوں کی اور یہ کہ مولانا کو قرآن پاک سے کیسا تعلق تھا۔

بچپن میں مولانا گیلانی کو حافظ قرآن نہیں بنایا گیا تھا' مگر حیدرآباد کی زندگی میں آپ نے پورا قرآن پاک یاد کرلیا تھا اور حافظ قرآن ہوگئے تھے۔

مولانا عبدالباری ندوی نے لکھا ہے کہ ایک سال رمضان میں مولانا نے نصف قرآن نماز تہجد میں سنایا تھا۔

مولانا عبدالماجد کا بیان

مولانا عبدالماجد دریا آبادی لکھتے ہیں:

''فاضل گرامی حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی دور حاضر کے طبقہ علماء کے خواص میں نہیں اخص الخواص میں تھے بلکہ کہنا چاہئے اپنی وقت نظر ونکتہ رسی کے لحاظ سے فرد فرید اور اپنی نظیر بس آپ تھے۔ مولانا بیک وقت مفسر' محدث' فقیہ' متکلم......معقولی وصوفی وصافی تھے۔ تاریخی مطالعہ کی وسعت وکثرت نے انہیں مؤرخ بھی بنادیا تھا۔'' (وفیات ماجدی)

قرأت کی تاثیر

نماز میں جب قرآن پاک پڑھتے تھے تو آپ پر ایک خاص کیف ہوتا تھا اور سننے والا اس کی تاثیر میں کھوجاتا تھا۔ خاکسار کو بارہا اس کا گیلانی کی حاضری میں تجربہ ہوا ہے۔ یہاں مسجد میں خود مولانا ہی امامت کا فریضہ ادا کرتے تھے اور نماز باجماعت کے پابند تھے۔ نماز فجر میں سب سے زیادہ دل ودماغ متاثر ہوتا تھا اس لئے کہ اس نماز میں عموماً قرأت لمبی ہوا کرتی تھی۔

ہمارے مولانا دریا آبادی نے ایک جگہ لکھا ہے:

نماز عشاء کا وقت آیا تو آواز بھی سریلی اور مترنم' درد وگداز لئے ہوئے سننے میں آئی۔ قرأت شاید سورۃ الملک کے دوسرے رکوع کے نصف آخر کی تھی۔ جونہی انہوں نے افمن یمشی مکبا علی وجھه سے شروع کی معلوم ہوا کہ کسی نے دل مل دیا ہے حالانکہ میں ازسرنو اسلام لانے کے بعد بھی ابھی تک پختہ نہیں ہوا تھا۔ تعلقات یگانگت اسی وقت سے بڑھنے شروع ہوگئے۔'' (معاصرین، ص۱۸۰)

یہ سب کیا تھے' قرآن سے شغف کا نتیجہ تھا۔ جو قرآن پاک سمجھ کر پڑھتا ہے اس کا پڑھنا سننے والے پر بے حد اثر انداز ہوتا ہے اور اگر سننے والا عربی زبان سے ذرا بھی تعلق رکھتا ہے تو وہ ایسی قرأت سن کر دل ہی دل میں کہتا ہے یہ سلسلہ ذرا اور دراز ہوتا تو بہتر تھا۔

Marfat.com

جن علماء کو قرآن پاک سے خاص مناسبت ہوتی ہے ان کے پڑھنے کا انداز کچھ اور ہوتا ہے۔ وہ قرآن پاک کو اس کے خطاب میں ڈوب کر پڑھتے ہیں۔ پہلے خود پڑھنے والے پر اس کا اثر ہوتا ہے پھر وہ سامعین کو محظوظ کرتا ہے۔ ایک طرف عبادت کی تاثیر دوسری طرف پڑھنے والے کا انہماک اور پھر سننے والے کی یکسوئی سب مل کر ایک خاص کیف پیدا کرتے ہیں۔

مولانا گیلانی اور شعر و شاعری

مولانا گیلانی جہاں بڑے عالم دین، مشہور مصنف اور مایہ ناز مفسر قرآن تھے، وہیں مولانا ایک اچھے شاعر اور نعت گو بھی تھے اور مولانا میں شاعری کا یہ ذوق فطری تھا مگر دوسرے شاعروں کی طرح آورد کی سعی نہیں کرتے تھے بلکہ صرف آمد آمد پر ہی برجستہ اشعار کہا کرتے تھے۔

مختلف زبانوں میں شعر گوئی

اردو، ہندی، فارسی اور عربی ان چاروں زبانوں میں شعر کہنے پر قدرت رکھتے تھے۔ مولانا کی آواز میں غضب کا سوز و گداز تھا اور اشعار ترنم کے ساتھ سنایا کرتے تھے۔ آواز میں بڑی جاذبیت تھی بالخصوص جب نعت سناتے تو مولانا پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ خود بھی اشکبار ہوتے اور سننے والوں کو بھی رلاتے تھے۔

ابتدائے زندگی میں اشعار لکھتے تھے مگر مجمع عام میں سناتے نہیں تھے۔ اس کا ماحول بھی نہیں تھا۔ مدرسہ کی زندگی میں اس وقت وہ آزادی بھی نہیں تھی جو آج عام طور پر پائی جاتی ہے۔ طلبہ پر بڑی پابندی ہوا کرتی تھی اور طلبہ کی ایک ایک حرکت و سکون پر ذمہ دار نظر رکھتے تھے۔ مشاعرہ کرنے اور مشاعرہ میں جانے کی آزادی قطعاً نہیں تھی بلکہ تصور بھی نہیں تھا۔

مجمع عام میں شعر گوئی

مولانا کی شاعری منظر عام پر اس وقت آئی جب ہندوستان میں تحریک خلافت کا زور بڑھا اور جس زمانہ میں مولانا ٹونک میں پڑھتے تھے اور حالات کے تقاضے سے مجبور ہو کر یا متاثر ہو کر ٹونک سے......اجمیر پہنچے اور خواجہ اجمیریؒ کے مزار پر حاضری دی اور فی البدیہہ ایک لمبی نظم کہہ ڈالی اور وہاں کی جامع مسجد میں ہزاروں نمازیوں کے مجمع میں پڑھ کر اپنے خاص انداز میں سنائی جسے سن کر سارا مجمع بے خود اور بے تاب ہو گیا اور ایک ہلچل مچ گئی۔

اردو ادب سے تعلق

مولانا گیلانی نے ''بیتے ہوئے دن'' میں لکھا ہے:

''معقولیت کے ساتھ اردو ادب کا ذوق فقیر پر اسی قدیم ماحول (زمانہ طالب علمی ٹونک) میں

Marfat.com

بعض بیرونی موثرات کے تحت غالب تو نہ تھا لیکن گونہ اس سے بھی تعلق ضرور قائم ہو گیا تھا۔"

(رسالہ دار العلوم دیوبند۔ ذی الحجہ ۱۳۷۰ھ)

مولانا گیلانی نے جس زمانہ میں تقریر شروع کی تھی جس کی تفصیل اپنی جگہ گزر چکی اور تقریری مواد کے خاطر "احیاء علوم الدین" کا مطالعہ شروع فرمایا تھا' وہیں سے شاعری کی بھی ابتدا ہوئی۔ خود تحریر فرماتے ہیں:

"اس زمانہ میں وہ نظم حضرت خواجہ اجمیریؒ کے قبہ بیضا کے سامنے کھڑے ہو کر سنائی گئی جو متعدد بار شائع بھی ہوئی۔ سنا تھا کہ مقامی حکومت کی طرف سے ضبطی کا حکم بھی ہوا تھا۔ اس کا عنوان تھا "شکوۂ خواجہ" اور یہ نظم ۲۲ صفر ۱۳۳۰ھ میں سنائی تھی۔" (ایضاً)

مولانا کی شاعری کے سلسلے میں آپ کے ایک شاگرد نے لکھا ہے:

"مولانا کی ذات میں شاعری کے سارے لوازم بھی وہبی ہوں یا کسبی پوری طرح موجود تھے۔ شگفتگی بلکہ رنگینی ان کی طبیعت پر غالب تھی۔ ان کا احساس قوی' مشاہدہ عمیق اور قوت تخیل بلند تھی۔ عربی' اردو' فارسی اور ہندی زبان کلاسیکی کلام تک ان کی پوری طرح رسائی تھی۔ ان چاروں زبانوں کے سینکڑوں منتخب اشعار ان کے نوک زبان پر تھے۔ خود بھی اردو' فارسی' عربی اور ہندی میں معیاری اشعار کہہ لیتے تھے۔" (مقالات احسانی۔ ص ۱۵)

مولانا کی شاعری دراصل واردات قلب کی ترجمان تھی۔ ارادہ کر کے نظم کہنے کی عادت نہیں تھی اور نہ اسے اپنے لئے پسند کرتے تھے۔

مولانا گیلانی شاعر کی حیثیت سے مشہور نہیں تھے۔ خاص احباب کے سوا کوئی جانتا بھی نہیں تھا کہ آپ برجستہ اشعار کہتے ہیں اور جب کہتے ہیں تو خوب کہتے ہیں۔

شکوۂ خواجہ

"شکوۂ خواجہ" نامی نظم آپ نے ۱۳۳۰ھ میں کہی تھی جب آپ ٹونک مدرسہ خلیلیہ کے طالب علم تھے لیکن یہ نظم بتاتی ہے کہ آپ کی یہ پہلی نظم نہیں ہے۔ اس میں جو روانی' سلاست' زور بیان اور برجستگی ہے' وہ گواہ ہے کہ شاعر نے اس سے پہلے بھی اشعار کہے ہیں۔

"شکوۂ خواجہ" کے اشعار یہاں سے شروع ہوتے ہیں ۔

بے طرح درد سے دل آج بھر آتا ہے　　خون بن کر جگر آنکھوں میں چلا آتا ہے
حسرت و یاس کا سینے سے پرا آتا ہے　　شکوے چلے آتے ہیں' گلہ آتا ہے
جسم میں آج مری جان گھٹی جاتی ہے
میرے ارمانوں کی اقلیم لٹی جاتی ہے

یہ مسدس اس طرح کے بارہ بندوں پر مشتمل ہے اور جوش بیان مسلسل بڑھتا چلا گیا ہے۔ اس باب کے اخیر

Marfat.com

میں ان شاء اللہ یہ پوری نظم دے دی جائے گی تا کہ اندازہ ہو کہ پہلی نظم جو عوام و خواص کے سامنے آئی وہ کس انداز کی تھی اور اس وقت مولانا کے جذبات کیا تھے۔

ایک نعت کا پس منظر

جون ۱۹۲۷ء میں مولانا گیلانی تعطیل گزارنے وطن آئے ہوئے تھے۔ اچانک یہیں گیلانی میں ایک مہلک سخت بیماری کا آپ پر حملہ ہوا۔ اندرون جسم میں تمام پھوڑے ہو گئے' جسے اطباء کی اصطلاح میں نفیح الدم کہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوا کہ اندر سے سارا بدن پک گیا۔ مسلسل یکے بعد دیگرے سات آپریشن ہوئے اور اندر سے ریم نکالی گئی اور ہر بار کافی مقدار میں ریم نکلی۔ تیمار داروں کا کہنا ہے کہ ایک ایک آپریشن میں تین تین سیر ریم نکلی تھی۔ یہ سارے آپریشن پٹنہ ہسپتال میں ہوئے۔

آٹھویں آپریشن کی جس دن تیاری تھی' اس رات میں غالباً سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت حصہ میں آئی۔ مولانا نے خود اس واقعہ کو اس طرح لکھا ہے:

> ''صبح ہوئی عجیب صبح تھی' ڈاکٹر آئے......متحیر ہو کر پوچھ رہے تھے پھوڑا کہاں تھا' آخر اس فیصلہ پر مجبور ہوئے کہ اب آٹھویں آپریشن کی ضرورت نہیں رہی' کیوں باقی نہیں رہی؟ یہ ایک راز تھا' جس سے نہ اس وقت واقف ہوئے' سیہ کار پر نظر رحمت پڑ چکی تھی۔''

مگھی زبان کی نعت

اس بیماری کے دوران مولانا نے مگھی زبان میں یہ نعت کہی تھی۔ اس کے چند اشعار یہاں ملاحظہ فرمائیں:

پیارے محمدؐ جگ کے سجن — تم پر واروں تن من دھن
تمری صورتیا من موہن — کبھیو کراہو تو درشن
جیا کنھڑے دلوا اتر سے
کرپا کے بدرا کہیا برسے
تمری دوریا کیسے چھوڑوں — تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں
تمری گلی کی دھول بٹوروں — تمری نگر میں دم بھی توڑوں
جی کا اب ارمان یہی ہے
آٹھوں پہر اب دھیان یہی ہے

مولانا اس کے بعد صحت یاب ہونے لگے اور اللہ تعالیٰ نے بہت جلد صحت بخش دی' پھر اپنی ملازمت پر حیدر آباد تشریف لے گئے اور یونیورسٹی میں اپنے تعلیمی فرائض انجام دینے لگے۔

Marfat.com

زیارت حرمین شریفین

۱۹۲۸ء میں جب حضرت مولانا گیلانی اپنے...... دو رفیقوں مولانا عبدالماجد دریا بادی اور مولانا عبدالباری ندوی کے ساتھ زیارت حرمین کے لئے تشریف لے گئے تو جاتے ہوئے پانی کے جہاز میں مولانا کا بیان ہے کہ رات کے وقت جہاز کی بالائی منزل پر چلا جاتا تھا اور رات کے اس سناٹے میں بے ساختہ مدینہ منورہ کا دھیان آنکھوں میں پھرنے لگتا تھا۔

اس سفر میں نعت

اس وقت بھی مولانا نے ایک نعت کہی جو بہت مقبول ہوئی' اور ہے بھی اس لائق کہ بار بار پڑھی جائے۔ وہ نعت یہاں سے شروع ہوتی ہے ۔

ہر ایک سے ٹکرا کر، ہر شغل سے گھبرا کر ہر کام سے پچھتا کر، ہر فعل سے شرما کر
آمد بدرت بنگر، اے خاتم پیغمبرؐ
اے سرور ہر سرور، اے رہبر ہر رہبر اے آنکہ توئی افسر، ہر کہتر وہر مہتر
فی المبدا والمحشر، اے ہستی تو محور للاکبروالاصغر اے طلعت تو مظہر
للاول والآخرؐ اے رحم جہاں پرور
آقائے کرم گسترؐ آمد بدرت بنگر

یہ بھی ایک لمبی نعت ہے اور بہت مؤثر ہے۔ مولانا گیلانی نے یہ پوری نعت گرمی کی ایک دوپہر میں جب سب محوخواب تھے' مجھے بٹھا کر ترنم سے پڑھ کر سنائی تھی۔

جوہر مرحوم پر مرثیہ

مشہور سیاسی رہنما مولانا محمد علی جوہر ہندوستان کے مشہور لیڈر گزرے ہیں۔ خلافت کمیٹی کے زمانہ میں جن کے نام کی دھوم تھی جب ان کا انتقال ہوا' تو مولانا نے مرثیہ لکھا۔ اس کے بھی چند اشعار پڑھیں ۔

بدین مصطفیٰ دیوانہ بودی فدائے ملت جانانہ بودی
بہ بزم مارئیسِ عشقبازاں بہ رزم دشمناں فرزانہ بودی
بدل بودے فقیرے بے نوائے بہ قالب پیکر شاہانہ بودی
سیاست رانقاب چہرہ کردی وگرنہ عاشق مستانہ بودی
چہ دانستی کجا سوزم نہ بسوزم توشمع دین راپروانہ بودی
رسیدی ازراہ اغیار تایار عجب مستے عجب دیوانہ بودی

Marfat.com

گیلانی پر مثنوی

مولانا گیلانیؒ نے ایک پوری مثنوی اپنے وطن گیلانی پر لکھی تھی اور اسے کبھی کبھی خود پڑھ کر سنایا بھی کرتے تھے' اس کے چند اشعار بھی یہاں درج کر دینا مناسب ہے۔

مسقط الراس وہ وطن پیارا — عہد طفلی کا اپنے گہوارہ
منظر اس کا ہے کیسا دیدہ زیب — اف مینو سواد زہد فریب
وہ درختوں کی اس کے رعنائی — اور باغوں کی حسن و زیبائی
یاد آتی ہے مجھ کو گیلانی — مظہر لطف غوث سبحانی
مصدر راز ہائے عرفانی — مطلع جلوہ ہائے روحانی

منبع علم، مخزن حکمت
مرکز جاہ وعظمت و شوکت

دوسری نظمیں

ایک نظم مولانا گیلانی نے حضرت مولانا ابوالحاسن محمد سجاد پر بھی ان کی وفات کے بعد لکھی تھی۔ اسی طرح سید الملت علامہ سید سلیمان ندوی پر بھی ایک لمبی نظم کہی تھی جو سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ان دونوں بزرگوں سے مولانا گیلانی کو بے انتہا محبت تھی۔ جب کبھی مولانا کا مجموعہ اشعار شائع ہوگا......اس وقت آپ کی شاعری کا صحیح اندازہ ہوسکے گا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا ہے:

''مولانا کی ذہانت' ذکاوت' حافظے کے کرشمے بار بار دیکھے' نعتیہ نظمیں خوب خوب کہتے اور خوبتر انداز سے پڑھتے' ہر مصرع کے ساتھ دلکشی اور جاذبیت بڑھتی ہی جاتی' بہار کی ہندی (مگھی) زبان پر بھی قدرت انہیں حاصل تھی اور ایسی ہی قدرت بے تکلف فارسی مصرعوں پر بلکہ عربی مصرعوں پر بھی۔'' (معاصرین، ص۱۸۲)

مولانا کا تخلص

مولانا اشعار میں اپنا تخلص کیا لکھتے تھے' تلاش وجستجو سے معلوم ہوا کہ ابتدا میں ضیاء تخلص استعمال فرماتے تھے۔ رسالہ ''القاسم'' دیو بند میں مولانا کی ایک فارسی نظم ''خیر مقدم'' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ آپ نے اس میں اپنا مقطع اس طرح لکھا ہے۔

باہزاراں شوق' صدا میدہا
میں ضیا مدح خواں آید ہمیں

Marfat.com

رسالہ ''القاسم'' کے پرانے پرچوں میں مولانا کی متعدد فارسی اور اردو نظمیں شائع ہوئی ہیں۔ بعد میں کہیں کہیں احسنؔ بھی بطور تخلص استعمال فرمایا ہے۔

یوں عام طور پر مولانا نظموں میں تخلص کے استعمال کا اہتمام نہیں فرماتے تھے۔

مولانا گیلانی نے ایک نظم ''اشک حقیقت'' کے عنوان سے ۱۳۳۵ھ میں لکھی تھی۔

قمر غرب کو کل جس نے دی خلوت نور — آج اس نیر خاور کو ہو کیوں اس سے نیاز
مغربی عقل سے کیا واسطہ تجھ کو اے ناداں — ان کے دفتر کو ہٹا' دیکھ تو فرہنگ حجاز
مئے بطحا ہے یہ ظالم اسے پی لے پہلے — مستی و کیف کا پھر پوچھنا مجھ سے انداز
مغربی صومعے ہیجان دماغی کے سوا — رکھتے کیا ہیں' جو بڑھائیں گے دلی سوز وگداز
ڈھونڈتا کیا ہے کنیسوں میں بتوں کے اس کو — گھر میں غیروں کے بھلا کیوں ہو وہ جلوہ پرداز

پیکر عجز تو بن، شیشہ، حیرت بن کر
دیکھ پھر قوت و قدرت کا تو اپنے آغاز

(القاسم۔ دیوبند۔ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ)

سیاسیات اور مولانا گیلانی

زمانہ خلافت میں جب آپ ٹونک میں پڑھ رہے تھے' ٹونک کی جامع مسجد میں ایک تقریر کی تھی۔ وہ آپ کی پہلی تقریر تھی جو دینی ہونے کے ساتھ سیاسی بھی تھی۔ یہ زمانہ بھی خلافت تحریک کا تھا اور اسی جوش میں اجمیر پہنچ کر بھی آپ نے وہاں کی مسجد میں تقریر کی اور ''شکوہ خواجہ'' لکھ کر ہزاروں کے مجمع میں سنایا' یہ نظم جہاں دینی جذبات سے لبریز ہے وہیں اس کے سیاسی ہونے میں بھی شبہ نہیں' جیسا کہ اس کے پڑھنے سے اندازہ ہوگا۔

دیوبند آمد

کہنا چاہیے کہ پھر وہی جذبہ جو آپ کو ٹونک سے اجمیر لے گیا تھا......وہی بالآخر دیوبند کھینچ لایا' اور کون نہیں جانتا اس زمانہ میں دیوبند آزادی کی جنگ کا مرکز تھا۔ شیخ الہندؒ بقید حیات تھے اور ریشمی رومال کی تحریک شباب پر تھی۔

اسی جذبہ نے آپ کو شیخ الہندؒ سے قریب کیا اور اس وقت کے نائب مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نے آپ کو اپنا وکیل بنا کر شیخ الہند کی خدمت میں بھیجا۔ مولانا نے ''بیتے ہوئے دن'' میں اس واقعہ کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ایک دن مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نے فقیر کو یاد فرمایا اور کہا کہ تم شیخ الہند سے مل کر دریافت

Marfat.com

کرو کہ واقعی سیاسیات میں حضرت والا کا صحیح مسلک کیا ہے'' (رسالہ دار العلوم۔ جمادی الثانی' ۱۳۷۲ھ ص ۴۳) مولانا یہ سوال لے کر حضرت شیخ الہند کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور جو کہا گیا تھا' پوچھا تو شیخ الہندؒ نے جواب میں فرمایا دیوبند کا مدرسہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کے لئے قائم کیا گیا تھا اور آخر میں فرمایا۔

''تعلیم و تعلم' درس و تدریس جن کا مقصد اور نصب العین ہے میں ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہوں لیکن خود اپنے لئے تو اسی راہ کا انتخاب کیا ہے جس کے لئے یہ نظام میرے نزدیک حضرت الاستاذ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے قائم کیا تھا۔ فرائض الٰہیہ جس حد تک بن پڑا ادا کرتا رہا۔ اب آخری کام رہ گیا ہے جسے آخری حد تک کر گزروں گا۔'' (ایضاً)

چنانچہ اسی کے ڈیڑھ سال بعد حج کے ارادہ سے حجاز کا سفر کیا اور اسی سفر حجاز میں مکہ مکرمہ سے گرفتار کر کے مالٹا پہنچائے گئے اور وہاں سے ساڑھے تین سال بعد رہائی ملی واپسی کے بعد صحت جواب دے چکی تھی۔ بمشکل چھ ماہ بقید حیات رہے۔

مگر اس ایک دو واقعہ کے بعد کہیں سے بھی پتہ نہیں لگتا کہ آپ نے بطور خود سیاست میں کبھی عملاً یا مشورۃً کوئی حصہ لیا ہو۔ مولانا کے شاگرد نے بھی گواہی دی ہے کہ

''سیاسیات کی خارزار سے انہوں نے اپنا دامن بچائے رکھا۔'' (ایضاً)

خود مولانا نے اپنے ایک مضمون ''ارتسامات گیلانیہ'' میں لکھا ہے کہ جب جمعیۃ العلماء بہار کا اجلاس بہار شریف میں ۱۹۱۷ء میں ہوا تو وہاں خانقاہ رحمانی مونگیر کے ایک نمائندہ کی حیثیت سے ان کو بھیجا گیا۔ جب اس اجلاس میں شیخ الہندؒ کی رہائی کی تجویز آئی تو پہلے صدر جلسہ مولانا سید شاہ سلیمان پھلواروی راضی نہیں ہوئے کہ یہ تجویز آئے کیونکہ اس کی وجہ سے حکومت کا عتاب آ سکتا ہے مگر حضرت مولانا سجاد صاحب نائب امیر شریعت بہار و اڑیسہ اور مولانا گیلانی کی خوشامد اور سمجھانے سے صدر صاحب راضی ہو گئے۔ یہ وہ وقت تھا کہ بقول مولانا گیلانی:

''اس وقت تک دلّی کی جمعیت کا خواب بھی نہ دیکھا گیا تھا۔''

مولانا گیلانی لکھتے ہیں:

''خاک سار کے شباب کا زمانہ تھا' جوش و خروش میں خوب دھواں دھار تقریریں کی گئیں۔'' (حیات سجاد، ص ۵۲)

اس کے بعد صدر جلسہ حضرت شاہ سلیمان پھلواروی کی حکومت سے خوفزدگی کا واقعہ بیان کر کے لکھتے ہیں:

''کیا معلوم تھا کہ آج شاہ (سلیمان پھلواروی) صاحب کے جس فعل کو ہم کمزوری قرار دے

Marfat.com

رہے ہیں کل ان ہی کمزوریوں کا ارتکاب کرنا پڑے گا بلکہ پوری زندگی اسی کمزوری میں بسر ہوگی۔" (حیات سجاد، ص ۲۵)

اس کی وجہ بھی لکھی ہے:

"پھر میرے گلے میں ملازمت کا طوق ڈالا گیا جس کے بعد دیکھنے کے سوا زندگی کی ساری علامتیں مجھ سے مفقود ہوگئیں۔" (حیات سجاد، ص ۵۳)

اسی مضمون کے حاشیہ پر تحریر فرمایا ہے:

"میری سیاسی نا آشنائی کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ ہندی سیاست کے سب سے بڑے بازیگر مسٹر گاندھی کے دیکھنے کی نوبت اب تک نہیں آئی۔" (ایضاً)

یہ تحریر مولانا کی ۱۹۴۱ء کی ہے۔ اس سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ مولانا ابتدائے زندگی ۱۹۲۰ء میں سیاست سے کنارہ کش ہوئے تو تادفات الگ ہی رہے۔ کبھی اس دائرہ میں قدم نہیں رکھا۔

ایک اور جگہ آپ نے لکھا ہے:

"تقریباً بیس سال ہوئے کہ جمعیۃ علماء بہار کے پہلے اجلاس میں شریک ہونے کے بعد سیاست کے میدان سے باہر نکل گیا......سیاسیات کے سلسلہ میں جو انقلابی حوادث پیش آتے رہے ان سے نہ صرف عملاً بلکہ علماً بھی اگر سچ پوچھیے تو بے تعلق رہا۔" (حیات سجاد، ص ۲)

شیخ الہند کا حال ابواب جہاد پر

حضرت مولانا گیلانی نے خاکسار سے ایک حاضری کے موقع سے فرمایا کہ حضرت الاستاد (شیخ الہند) کا عجیب عالم ہوتا تھا۔ جب "کتاب الجہاد" کے ابواب سامنے آتے تھے' آنکھیں سرخ ہوجاتیں' چہرہ تمتما اٹھتا' آواز میں غضب کی تیزی آجاتی اور فرماتے "کتاب المغازی" اور "کتاب الجہاد" کے اتنے ابواب کتب حدیث میں کیوں آئے؟ ہمارے علماء کبھی نہیں سوچتے۔ اس پوری کتاب کو بے کار سمجھ رکھا ہے۔ غصہ میں فرماتے جاتے پڑھے چلو جب ان مقاصد کا پاس ہی نہیں جن کے لئے رسول اللہ ﷺ کے یہ اقوال نقل کیے گئے ہیں تو تقریرین کر کیا کرو گے؟

مولانا کا کہنا تھا کہ جتنے دنوں کتاب المغازی کی حدیثیں پڑھی جاتی تھیں۔ حضرت الاستاذ کی کیفیت خاص میں فرق نہیں آتا تھا' ہم سب اس طرز انداز کو دیکھ کر سہمے ہوئے رہتے تھے۔

مولانا کے اشعار

سیاست سے تعلق کا اظہار نوجوانی کے ان اشعار سے ہوتا ہے جو آپ نے زمانہ خلافت میں کہے تھے اور پڑھ

Marfat.com

کر سنائے بھی تھے' مثلاً ''شکوۂ خواجہ'' کے یہ اشعار۔

ہائے اسلام پہ کفار مظالم توڑیں
ہم ضعیفوں پہ جلے دل کے پھپھولے پھوڑیں
عورتوں تک کو نہ مردود شیاطیں چھوڑیں
تہمتیں سینکڑوں الٹے ہی وہ ہم پر جوڑیں
آہ دنیا سے مسلمان اٹھے جاتے ہیں
تیغ تثلیث سے مظلوم کٹے جاتے ہیں
نہ یہی' بلکہ وہاں گنبد اقدس ڈھایا
لوٹا غارت کیا جس چیز کو اس نے پایا
اس ستم نے فلک پیر کو بھی چکرایا
گویا ایران پہ' پھر چڑھ کے ہلاکو آیا
روضۂ پاک میں اور خون مسلمانوں کا
پھر بھی ٹھنڈا نہ کلیجہ ہوا شیطانوں کا
آہ ترپولی کے معصوم وہ ننھے بچے
ذبح ہوں خنجر بے داد سے بھوکے پیاسے

تزکیۂ باطن و تصفیۂ قلب

جیسا کہ عرض کیا گیا مولانا کو قدرت کی طرف سے جو دل عطا گیا تھا وہ بہت پاکیزہ' صاف ستھرا اور نفس و نفسانیت سے خالی تھا۔ پھر تربیت پائی مولانا نے مولویانہ ماحول اور عالم خاندان میں۔ اس نے اور بھی نکھار دیا۔ پھر جس دور میں آپ پیدا ہوئے وہ آج کے موجودہ دور سے بہت مختلف اور اخلاق و اخلاص سے بھرپور تھا' انسانوں میں عام طور پر خوف و خشیت الٰہی طبعاً پائی جاتی تھی' ابتدائی اور انتہائی تعلیم کے زمانہ میں ایسے اساتذہ حصہ میں آئے جو اخلاص عمل اور للّٰہیت میں بڑا اونچا اور امتیازی مقام رکھتے تھے۔ ان کی صحبت اور تعلیم و تربیت نے بھی مولانا کے باطن کو جلا بخشنے میں بخل سے کام نہیں لیا اور بقول خود مولانا مرحوم امام غزالی کی کتاب ''احیاء العلوم'' کے مطالعہ نے بڑا کام کیا اور قلب و دماغ اور ظاہر و باطن کو بدل کر رکھ دیا۔

بیعت کا ارادہ

لیکن بایں ہمہ ایک وقت آیا کہ مولانا نے توبہ و انابت کے لیے ایک ایسے عارف باللہ کے دامن سے وابستہ ہونا ضروری سمجھا' جس کی نگاہیں مس خام کو کندن بنا دیتی تھیں اور باطل کو کاٹنے میں تلوار کا کام کرتی تھیں۔ پھر مولانا نے محسوس کیا کہ کچھ باطنی روگ لگے ہوئے ہیں ان کا ازالہ ضروری ہے' کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارا ایمان جن شکوک و شبہات کا پامردی سے مقابلہ کر رہا ہے وہ کبھی ہمیں زیر کر دینے میں کامیابی حاصل کر لیں اور ہم مغلوب ہو جانے پر مجبور ہوں۔

اس سلسلہ میں مولانا کی نگاہ انتخاب اپنے بزرگ ترین استاذ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی قدس سرہ (م ۱۳۳۹ھ) پہ جا کر رکی جن کے تصرف باطنی کا تجربہ بھی پہلے ہو چکا تھا۔ خود تحریر فرماتے ہیں:

''سیدنا حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ تلمذ و بیعت کی سعادتیں اس کوتاہ بخت' سیاہ کار کے لئے جس حد تک بھی سرمایہ افتخار و ناز ہوں' کم ہیں۔'' (رسالہ دارالعلوم۔ جمادی الثانی ۱۳۷۲ھ' ص ۳۹)

بیعت کی نعمت

آگے لکھتے ہیں:

''حضرت والا کے حلقہء درس میں دوسروں کے ساتھ حاضری کا موقع میرے لئے بھی آسان کیا گیا اور صورت حال ایسی پیش آ گئی کہ بیعت کے لئے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے دست حق پرست تک پہنچا دیا گیا ورنہ اپنی سابقہ ولاحقہ زبوںحالیوں کو جب سوچتا ہوں کہ یہ کیسے ہوا؟ حضرت کے تلامذہ میں کہاں امام کشمیریؒ اور شیخ مدنیؒ اور انہی جیسے اجلہ اکابر شریک ہیں۔ اسی طرح روحانی تربیت یافتوں میں خدا ہی جانتا ہے کتنے بڑے بڑے مقبولان بارگاہ الٰہی ہوں گے۔'' (ایضاً)

وارفتگی کی شان

مولانا گیلانی کے ایک شاگرد نے لکھا ہے اور بہت درست لکھا ہے:

''حضرت گیلانی جذب کی دولت اپنے ساتھ ہی لیتے آئے تھے۔ ان کے لڑکپن اور نوجوانی کے دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ ان پر ابتدا ہی سے وارفتگی کی شان طاری تھی جو بے ساختہ ہونے کی وجہ سے نہایت دل فریب تھی۔ علمی اور فکری مقامات میں حضرت جس قدر ہوشیار تھے عام امور میں اسی قدر بھولے بھالے' مالی نقصانات بھی اٹھاتے' مگر کھو کر بھی ہمیشہ بے فکر ہی رہتے کیونکہ آنی فانی چیزیں کبھی ان کی توجہ کا مرکز نہ بن سکی تھیں۔'' (مقدمہ مقالات احسانی' ص ۱۷)

آگے لکھتے ہیں:

''حضرت گیلانی ''مجذوب سالک'' تھے یعنی جذب الٰہی کی دولت پہلے ملی تھی پھر مقامات سلوک طے فرمائے تھے اور اس غرض کے لئے دوران طالب علمی ہی میں شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ کے دست گرفتہ ہو گئے تھے۔ مگر علمی مشاغل کی وجہ سے اس وقت روحانی استفادہ کا موقع نہ مل سکا اور حضرت شیخ الہندؒ رحلت فرما گئے۔'' (مقدمہ مقالات احسانی' ص ۱۷)

یہ واقعہ ہے کہ آپ زمانہ طالب علمی مین ہی بیعت ہو گئے تھے اور آپ کے بیعت ہونے کے ایک سال بعد حضرت شیخ الہند حج کے نام پر ہندوستان سے حجاز تشریف لے گئے اور ابھی وہیں قیام پذیر تھے کہ شریف مکہ کے ذریعہ

Marfat.com

انگریزی حکومت نے آپ کو گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیا اور جب وہاں سے بڑی کوششوں کے بعد واپس تشریف لائے تو بیماریوں نے گھیر لیا اور اسی ماحول میں چھ ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ ۱۳۳۹ھ کو آپ کا وصال ہو گیا۔

ذوق سلوک

اس لئے مولانا گیلانی کو اپنے مرشد اول سے استفادہ کا جو موقع ملنا چاہئے تھا نہیں ملا مگر چوں کہ مولانا کا ذوق تصوف وہبی تھا اس لئے کسی آن راہ طریقت وسلوک سے غیر متعلق نہیں رہے۔ شیخ اکبر ابن عربی اور مولانا جلال الدین رومی اور ان دونوں کی کتابوں ''فتوحات مکیہ'' اور مثنوی مولوی معنوی سے گہرا لگاؤ اور تعلق تھا۔ اخیر زندگی میں ''مجالس الشیخین'' کے عنوان سے مولانا گیلانی نے مستقل مضمون کا سلسلہ ہی شروع کر رکھا تھا اور بڑی دلچسپی سے بیان فرماتے تھے کہ آج شیخ اکبر یا مولانا رومی کی مجلس میں حاضر ہوا وہ یہ فرما رہے تھے۔ ''مقالاتِ احسانی'' میں یہ پورا مقالہ چھپ گیا ہے۔

دوسرے مرشدین

مختصر یہ کہ حیدر آباد کے زمانہ قیام میں مولانا نے محسوس کیا کہ کسی ایسے بزرگ سے اب پھر رشتہ قائم کیا جائے جو راہ سلوک طے کر چکا ہو۔ مولانا نے غور و فکر کے بعد ایک بغدادی الاصل بزرگ کو منتخب کیا جن کا قیام حیدر آباد میں عرصہ سے تھا۔ وہ تھے حبیب العیدروس رحمتہ اللہ علیہ جو شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ سے نسبی اور باطنی نسبت رکھتے تھے۔

خلافت

ان سے اپنا رشتہ سلوک جوڑا اور سلسلہء قادریہ میں تربیت حاصل کی اور خلافت بیعت سے نوازے گئے مگر سلسلہ قادریہ میں رسوخ حاصل ہو جانے کے باوجود اپنے خاص مزاج کی وجہ سے اطمینان کامل محسوس نہیں کیا اور اس کی وجہ وہی تھی کہ چشتیت کا رنگ مولانا کی طبیعت پر غالب تھا جو عام دیوبندی علماء میں پایا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس کی صورت یہ پیدا کی کہ ایک حیدر آبادی بزرگ مولانا محمد حسین صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں ان کو پہنچا دیا گیا جو حضرت شیخ محی الدین ابن عربیؒ کے قالاً و حالاً ترجمان تھے اور جہاں پہنچ کر لوگ ایمان و ایقان کی دولت سے مالا مال ہوا کرتے تھے۔

مولانا گیلانی کو یہاں پہنچ کر مناسبت تامہ حاصل ہو گئی اور شیخ کی توجہات خصوصی کے مرکز بن گئے اور تھوڑے ہی عرصہ بعد یہاں سے بھی خلافت کی دولت سے نوازے گئے۔

جذب اور کشش

اس طرح حضرت مولانا گیلانی نے دوہری خلافت پا رکھی تھی اور خود صاحب معرفت ہو گئے تھے۔ میں نے

بارہا محسوس کیا کہ مولانا مرحوم میں بے پناہ کشش ہے۔ مولانا کی خدمت میں حاضر ہونے والا کھلے طور پر محسوس کرتا تھا کہ دل ان کی طرف کھچا چلا جا رہا ہے بالخصوص جب نماز فجر کی امامت میں مولانا قرأت کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا دل کھنچ کر مولانا کے پاس چلا گیا۔ دل کا تھامنا مشکل ہوتا تھا اور جی چاہتا تھا کہ مولانا لمبی سے لمبی قرأت فرماتے رہیں اور ہم مقتدی سنتے رہیں۔ جو لذت مولانا کے پیچھے فجر کی نمازوں میں ملتی تھی یاد نہیں پڑتا کہ وہ لذت و کیفیت کہیں اور اس طرح محسوس طور پر حصہ میں آتی ہو۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے بھی لکھا ہے:

''اس اثناء میں اگر نماز کا وقت آ جاتا' تو مولانا حاضرین یا صاحب خانہ کے اصرار سے مصلّے پر تشریف لے جاتے۔ ان کی قرأت میں بڑا سوز اور حلاوت تھی۔ قلب پر اس کا اثر پڑتا تھا اور جی چاہتا کہ قرأت طویل ہو۔'' (پرانے چراغ، ص ۶۴)

مرشد بننے سے گریز

گیلانی کی ایک حاضری کے موقع سے ایک دن بیٹھے ہوئے حیدر آباد کے کچھ واقعات سنانے لگے۔ اس موقع سے اور باتوں کے ساتھ یہ بھی سنایا کہ ایک زمانہ میں میری تقریر حیدر آباد میں بڑی مقبول تھی اور میری تقریر میں بڑا مجمع ہوا کرتا تھا مسجد میں جمعہ کے دن مجمع کی گرویدگی کا عالم عجیب ہوا کرتا تھا۔ لوگ عقیدت سے ٹوٹے پڑتے تھے۔ بہت سارے لوگ آئے اور خواہش کی بلکہ اصرار کیا کہ میں انہیں بیعت کر لوں' مگر انکار کر دیا کرتا تھا۔ مولانا نے ہنس کر یہ بھی فرمایا کہ کبھی کبھی دل میں آتا تھا کہ لاؤ ان اصرار کرنے والوں کو بیعت کر لوں اس میں عیب ہی کیا ہے مگر رات میں جب یکسوئی ہوتی تو سوچتا کہ پتہ نہیں کل قیامت میں اپنا معاملہ ہی کیسے طے پائے گا اور کیا پیش آئے گا۔ دوسروں کا بوجھ کیوں اپنی گردن پر ڈالنے کا ارادہ کروں' پھر بیعت کرنے کے خیال کو غلط وسوسہ قرار دے کر علیحدہ ہو جاتا چنانچہ آپ نے کبھی بیعت وارشاد کے رسمی طریقہ کو اختیار نہیں فرمایا۔ ہمیشہ اس پیری مریدی کے قصوں سے علیحدہ رہے۔

بیعت کرنے سے گریزاں

اور جہاں تک علم ہے مولانا کے یہاں بیعت وارشاد کا مروجہ سلسلہ کبھی بھی قائم نہیں ہو سکا۔ زبانی تبلیغ و تلقین ضرور فرمایا کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں ان کے شاگرد عزیز غلام محمد صاحب کا بیان معتبر ہوگا' وہ لکھتے ہیں:

''حضرت گیلانی دوہری خلافت رکھنے اور خود صاحب معرفت ہونے کے باوجود مسند ارشاد کی ذمہ داریوں سے ہمیشہ گریزاں ہی رہے اور جہاں تک میرے علم میں ہے کبھی کسی کو مرید نہیں کیا ورنہ وہ اگر اس طرف توجہ فرماتے تو فیوض علمی کی طرح فیضان روحانی کا بھی دریا بہہ نکلتا مگر جو مقدر نہ تھا وہ ہو کیسے جاتا' حضرت گیلانی نے طالب علمانہ حیثیت ہی اپنے لئے تجویز فرمائی

Marfat.com

تھی۔ اسی نقاب میں وہ کمالات باطنی کو چھپائے رہے اور اسی اخفا کے ساتھ اس دنیا سے پردہ فرما گئے۔'' (مقدمہ مقالات احسانی، ص ۱۹)

ایک عجیب واقعہ

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی جب آخری حج میں تشریف لے گئے تو آپ نے اپنا چشم دید واقعہ خود مولانا گیلانی کو لکھا کہ

''میں مطاف کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک میری نظر پڑی کہ تو (یعنی مولانا گیلانی) طواف کر رہا ہے۔ خیال آیا کہ وہ آتا تو مجھ سے ضرور ملتا' آخر یہ کیا ماجرا ہے۔ میں خود تیری طرف ملنے کو لپکا لیکن دیکھا تم غائب ہو گئے' صوفیوں میں جو مشہور ہے کہ کعبہ میں نماز پڑھتے ہیں۔ کیا اسی کے ظہور کی یہ شکل تھی؟'' (مکتوب بنام مولانا گیلانی، در: معارف۔ اعظم گڈھ)

محبت رسول ﷺ

ایک دفعہ گیلانی موسم گرما میں خاک سار کا جانا ہوا' مولانا کی بیٹھک دو منزلہ تھی۔ مولانا کا قاعدہ یہ تھا کہ گرمی کے دنوں میں ظہر کی نماز باجماعت اول وقت میں پڑھ لیا کرتے تھے۔ پھر آرام کرنے والوں کو آزادی مل جاتی تھی۔ خود مولانا کو تو دن میں سوتے ہوئے دیکھا نہیں۔ کتابیں دیکھتے رہتے۔ سب سو چکے تھے' مجھے استنجا کے لئے نیچے اترنا پڑا۔ اندر کمرہ سے گزر کر باہر گیا۔ واپس ہوا تو مولانا نے اپنے پاس بلا لیا۔ فرمانے لگے کہ شعر و شاعری سے بھی تھوڑی بہت مناسبت ہے۔ ابھی اپنی وہ کاپی یا ڈائری ہاتھ لگی ہے جس میں میرے اشعار لکھے ہوئے ہیں۔ پھر اپنی نعتوں کا تذکرہ فرمایا کہ فلاں موقع سے ایک نعت کہی تھی جو مجھے خود بہت پسند ہے۔ یہ کہہ کر ترنم کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔ مولانا کی آواز میں بڑا سوز اور درد تھا اور کوئی شبہ نہیں کہ ان کی آواز میں بڑی جاذبیت کی شان ہوا کرتی تھی۔ میری آنکھیں تو اشک آلود تھیں ہی لیکن میں نے دیکھا کہ حضرت مولانا کی آنکھوں سے سیل رواں جاری ہے۔ پڑھتے جا رہے ہیں اور روتے جا رہے ہیں۔ سسکیاں بندھ گئی ہیں اور ایک وجد کا عالم طاری ہے۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ کوئی آدھ گھنٹہ تک ذرا ذرا ٹھہر کر یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس وقت ہم دو کے سوا کوئی تیسرا نہیں تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اس کیفیت اور لذت کو میں زندگی بھر بھول نہیں سکتا۔ میں بہت دیر تک بیٹھا رہا۔ مجھے کچھ خبر نہیں رہی کہ کہاں ہوں اور کس حال میں ہوں۔ مولانا کا حال تو اور بھی عجیب و غریب تھا۔ تھوڑی دیر بعد مولانا نے ہی فرمایا مولوی صاحب! اب جاؤ اوپر آرام کرو۔

کوئی شبہ نہیں کہ مولانا کی نعتوں میں آج بھی وہی اثر ہے۔ کوئی بھی مسلمان اسے پڑھ کر اپنے آنسو نہیں روک سکتا ہے۔ مولانا نے اپنی ایک مجلس میں یہ بھی بیان فرمایا کہ حضرت مولانا ابو المحاسن سید محمد سجاد صاحب نائب امیر

Marfat.com

شریعت بہار واڑیسہ کو میں نے جب یہ نعت سنائی تو وہ بہت روئے۔ اس طرح بے تاب ہو کر رونا کسی اور کا یاد نہیں۔ پھر ارشاد فرمایا۔ مولانا سجاد صاحب صاحب نسبت بزرگ تھے۔

صاف باطنی اور اس کا اثر

یہ دراصل' مولانا گیلانی کی صاف باطنی اور اخلاص وللّٰہیت کا اثر تھا' سچ کہا علامہ اقبال مرحوم نے

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

مولانا علی میاں مدظلہ نے بھی لکھا ہے کہ جب مولانا گیلانی ندوۃ العلماء لکھنؤ کے اس اجلاس میں تشریف لائے جو حضرت سید سلیمان ندوی پر مقالات پڑھنے کے لئے دارالعلوم ندوہ میں بلایا گیا تھا تو اجلاس سے فراغت کے بعد ایک روز اس نعت کے سنانے کی درخواست کی جو انہوں نے بہار کی مگھی زبان میں لکھی ہے اور جو پہلے بعض اخبارات ورسائل میں چھپ بھی چکی تھی۔ مولانا تیار ہو گئے' مولانا علی میاں مدظلہ کا بیان ہے:

> ''ان نعتوں میں ان کی محبت' سوز' بارگاہ نبویؐ سے عاشقانہ تعلق' بغیر کسی تکلف کے ظاہر ہو گیا ہے۔ ہندی کے میٹھے بول مولانا کا ترنم اور نعت کا موضوع' ان سب نے مل کر اس میں عجیب دلکشی اور دلآویزی پیدا کر دی ہے' مولانا خود بھی اپنی آنکھوں کو قابو میں نہ رکھ سکے اور سننے والے بھی متاثر اور آبدیدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔'' (پرانے چراغ، ص۸۲)

تاریخ اسلام سے شیفتگی

ایسا معلوم ہوتا ہے حضرت مولانا گیلانی سراپا محبت اور عشق رسولؐ میں غرق تھے۔ جب کبھی عہد نبوی اور خلفائے راشدین کا کوئی واقعہ سامنے آتا بے چین ہو جاتے۔ دل میں ایک ہلچل مچ جاتی اور یاد نبویؐ سے بے قابو ہو جاتے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے (ایک دفعہ مشرق وسطیٰ کے سفر میں تھے) مولانا مرحوم کے نام ایک خط دمشق کے ایک ہوٹل ''یرموک'' نامی سے لکھا۔ پھر کیا تھا' یرموک کا نام آتے ہی مولانا پر ایک کیفیت طاری ہو گئی جیسا کہ مولانا کا خط گواہ ہے' مولانا ندوی مدظلہ نے جواب میں تحریر فرمایا۔

> ''کس نے کہاں اور کن حالات میں اس زار ونزار' بیمار' دور افتادہ دہقانی کو یاد فرمایا' سوچتا ہوں اور گو کھڑا ہونا میرے لئے آسان نہیں ہے مگر بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ سجدہ شکر یاد دلانے والے کے قدموں پر ادا کر کے رقص کروں' خدا ہی جانتا ہے کہ الیرموک کی موجوں نے کن دبے دبائے تاریخی محفوظات اور ان سے پیدا ہونے والے جذبات میں طوفانی ہلچل پیدا کر دی ہو گی' جب اپنے آپ کو اس حال میں پا رہا ہوں کہ مکتوبہ شکل میں صرف لفظ الیرموک پر نظر پڑتے ہی تخیل کو آپ کے مشاہدے سے جو تھوڑا بہت سہارا ملا تو گھنٹوں اور جو کچھ اس کے ساحل پر گزرا اسی میں غرق ہو گیا۔'' (پرانے چراغ، ص۹۱)

Marfat.com

النبی الخاتم

مولانا گیلانی کی تصنیفات میں ایک کتاب ''النبی الخاتم'' بھی ہے جو سیرت نبوی پر آپ نے لکھی ہے۔ پڑھنے والا جب پڑھتا ہے تو اس پر جذب و مستی کا ایک عالم چھا جاتا ہے۔ اس قدر مؤثر' دلآویز اور جامع سیرت شاید دوسری نہیں ہے۔ اختصار نویسی میں اپنی آپ مثال ہے مگر اسی کے ساتھ اثر اندازی میں بھی بے مثال۔ سیرت کا کوئی گوشہ مولانا نے چھوڑا نہیں ہے۔ اس کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسالت نبوی سے مولانا کو کیسا والہانہ تعلق تھا۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے درست لکھا ہے:

''مولانا کی تصنیفات میں سے غالباً سب سے پہلے ''النبی الخاتم'' پڑھی۔ کتاب عجیب البیلے انداز میں لکھی گئی ہے۔ صحف سماوی کا انداز بیان' خطیبوں کا جوش و برجستگی' عشاق کی مستی و وارفتگی' عقل و جذب کی لطیف آمیزش حسب عادت معمولی معمولی اور مشہور واقعات سے لطیف نکتے اور عظیم نتیجے نکالتے چلے جاتے ہیں اور اس سرعت و کثرت کے ساتھ کہ پڑھنے والا مصنف سے شکایت کرنے لگتا ہے: دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار۔ میں نے اپنی ساری عمر میں سیرت نبوی میں ''رحمت اللعالمین'' اور ''النبی الخاتم'' سے زیادہ مؤثر کتاب نہیں پڑھی۔ کتاب پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف علم و انشا پردازی کی کرشمہ سازی نہیں ہے' اس کے اندر ان کا سوز دروں اور خون جگر بھی شامل ہے۔'' (پرانے چراغ، ص ۶۷)

عشق نبوی

''النبی الخاتم'' کے تعارف میں مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ نے لکھا ہے:

''مجھ سے ایک ثقہ بزرگ نے بیان کیا تھا کہ جن دنوں یہ کتاب (النبی الخاتم) تصنیف ہو رہی تھی' ایک صاحب دل بزرگ نے ایک رات عالم واقعہ میں دیکھا کہ حضرت خاتم النبیین' رحمتہ اللعالمین ﷺ اپنے جمال کی پوری تابشوں کے ساتھ رونق افروز ہیں اور مولانا گیلانی قدموں میں تڑپ رہے ہیں لیکن ان سے نظر بچائی جا رہی ہے۔ صاحب واقعہ بزرگ نے یہ دیکھ کر حضرت بلالؓ سے جو وہیں موجود تھے عرض کیا اس بیچارے کو ایک نظر کیوں نہیں دیکھ لیا جاتا؟ حضرت بلالؓ نے فرمایا اس کو اگر دیکھ لیا تو مر جائے گا۔'' (النبی الخاتم، ص ۲۷)

سید صاحب کی نظر میں

رسالہ ''معارف'' (اعظم گڈھ) میں علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا:

''النبی الخاتم...... ایک گلدستہ عقیدت ہے جسے مولانا مناظر احسن کے عقیدت مند قلم نے سجایا

Marfat.com

ہے۔ اس میں مولانا نے اپنے خاص والہانہ رنگ میں سیرت پاک کے واقعات کو ایک خاص انداز و ترتیب کے ساتھ پیش کر کے نہایت لطیف نتائج پیدا کیے ہیں۔ اس حیثیت سے یہ اپنے طرز میں منفرد ہے کہ تاریخی واقعات کو وارفتگی بیان کے ساتھ اس طرح نبھایا گیا ہے کہ ناقد مورخین اور ارباب وجد و حال دونوں اپنے اپنے ذوق کے مطابق لطف اُٹھا سکتے ہیں۔ زبان صاف و سادہ لیکن صنائع لفظی سے مالا مال ہے۔" (معارف۔ اپریل ۱۹۵۷ء)

سید سلیمان ندوی کی خلافت بیعت پر

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی علامہ شبلی نعمانی کے ممتاز شاگرد اور دارالمصنفین اعظم گڑھ کے روح رواں تھے۔ اسی طرح ندوۃ العلماء کے معتمد خصوصی اور اپنی جماعت کے سربراہ' قدیم و جدید دونوں مکتب فکر کے اہل علم سید صاحب کے قدردان اور معتقد تھے اور اب بھی ہیں۔

لیکن ایک وقت آیا کہ خانقاہ تھانہ بھون تشریف لائے اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے مسترشدین میں شامل ہو گئے۔ قلب اور دماغ سیرت نبوی پر کام کرنے سے مجلّی مصفّٰی ہو چکا تھا' مصالحہ تیار تھا' صرف ماچس لگانی تھی۔ حکیم الامت نے توجہ ڈالی اور حضرت سید صاحب کہاں سے کہاں جا پہنچے۔ مسترشد کو اپنے مرشد پر فخر اور مرشد کو اپنے اس مسترشد پر ناز' تھوڑے دنوں کے بعد خلافت سے نواز دیئے گئے۔

جب مولانا گیلانی کو اس کی اطلاع ہوئی تو بے انتہا خوش ہوئے۔ مبارکبادی کا ایک لمبا خط لکھا اور اپنے انداز میں اخلاص و جذب میں ڈوبا ہوا۔ اس کا کچھ حصہ یہاں ملاحظہ فرمایا جائے۔

"الحمدللہ علم کی دولت کے ساتھ معرفت و عمل کی نعمت بھی آخر میں آپ کے لئے مقدر تھی۔ ھنیاً لکم ثم ھنیاً لکم الصادقین کی معیت آپ کو مبارک ہو...... عجب راہ ہے' نہ یہاں محاسدہ ہے نہ مباغضہ' نہ مناقشہ' نہ مقابلہ' بلکہ ہر ایک دوسرے کے لئے داعی۔" (مکتوب ۱۲ اپریل ۱۹۴۲ء)

مولانا کا اپنا حال

پھر اپنا حال اس طرح ذکر میں آیا جس میں تواضع ہی تواضع اور اخفاء حال ہے:

"گو مدت ہوئی اس راہ سے دور ہو چکا ہوں لیکن اب تک وہ حلاوتیں دل ناکام کو یاد ہیں جو کسی زمانہ میں میسر آئی تھیں۔ آپ لوگوں کی انقلابی زندگی خیر کی طرف اور میرا انقلاب شر کی طرف باعث عبرت ہے۔" (ایضاً)

آگے لکھا:

"یقیناً آپ بہت بلند ہو چکے ہیں۔ یوں ہی بلندی کیا کم تھی اور اب تو ماشاء اللہ حکیم الامت

Marfat.com

مدظلہ العالی کی نیابت وخلافت کی دولت سے سرفراز ہیں۔'' (ایضاً)

میں نے دیکھا کہ مولانا گیلانی کی چارپائی کے سرہانہ جو الماری رہتی تھی۔ اس میں سب سے نمایاں کتاب ''فتوحات مکیہ'' کی ضخیم جلدیں اور مثنوی مولانا روم کی جلدیں ہوتی تھیں۔ کبھی اس کو سرہانے سے علیحدہ نہیں دیکھا۔ اسی طرح تصوف کی دوچار دوسری عربی کتابیں بھی رہتی تھیں۔ تصوف سے مولانا کو خاصا شغف تھا۔

مولانا نے ایک جگہ خود لکھا ہے:

''مدت سے خاک سار کا دستور ہے کہ علاوہ قرآن مجید کے دل کبھی پریشان ہوتا ہے تو مثنوی معنوی یا ''فتوحاتِ مکیہ'' ابن عربی کا مطالعہ بغیر کسی ترتیب کے شروع کردیتا ہوں۔''

(مقالات احسانی، ص ۳۳۸)

مولانا گیلانی اپنے باطنی حالات پر خود پردہ ڈالنے کی سعی کرتے۔ ایک دفعہ سید صاحب کے خط کے جواب میں لکھا:

''ہم لوگوں نے دماغ سے اتنا کام لیا کہ دل بالکل مردہ ہو کر رہ گیا۔ اس عمر میں اگر دوسری راہ پر رہتا تو کیا کچھ حاصل نہ کرلیتا، لیکن آہ کہ روزگارم بسر شد بہ نادانی۔''

(مکتوب ۵ جنوری ۱۹۴۸ء در: معارف۔ جولائی ۶۳ء)

اپنے کو مٹانے کا جذبہ

مولانا میں اپنے کو چھپانے کا بڑا جذبہ تھا۔ لوگ اپنے کو اُبھارتے ہیں، مولانا اس کے برعکس اپنے کو مٹانے کی سعی کرتے تھے۔ اگر کوئی حسن عقیدت کا اظہار کرتا تو اس کو یقین دلاتے کہ میں ایسا نہیں ہوں، جیسا تمہارا حسن ظن ہے۔ میرے ایک خط کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آپ نے اپنے اس کارڈ میں جو اس سے پہلے آیا تھا اس فقیر کے ساتھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس کا قطعی استحقاق نہ تھا، اسی قسم کے حسن ظن کو اس جہول وظلوم کے ساتھ قائم فرمالیا ہے، اکبر مرحوم کا ایک شعر ہے۔

اکبر کی حقیقت اصلی کو پوچھو اس کے محلہ والوں سے
ہاں شعر تو اچھا کہتا ہے، دیوان تو ان کا دیکھا ہے

اچھا شعر اور صاحب دیوان ہونا دوسری بات ہے اور محلہ والوں کے سامنے آدمی کیا سمجھا جاتا ہے، اس کی اصلی حقیقت وہی ہوتی ہے۔ آپ جیسے صادق الایمان والدین کے حسن ظن کو دیکھ کر اس کی امید قائم کرلیتا ہوں کہ شاید معاملہ کرنے والا حسن ظن کی رعایت فرمائے۔ تجربہ سے زیادہ

Marfat.com

اس کی تائید ہوتی رہتی ہے۔'' (مکتوب ۲۵ اکتوبر ۱۹۵۲ء)

مولانا دریابادی کی نظر میں

مولانا عبدالماجد دریابادی نے مولانا کے ذوق تصوف کے سلسلہ میں لکھا ہے:

'' تصوف کے بڑے جاننے والوں میں سے تھے' شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ سے عقیدت خصوصی بھی رکھتے تھے اور مناسبت طبعی و روحانی بھی تھی' باوجود اس کے رسوم خانقاہی اور بدعات مشائخ کے ذرا بھی قائل نہ تھے۔ اور وہم پرستوں اور ضعیف الاعتقادیوں کے نزدیک بھی نہیں گئے تھے' اکبر کی زبان میں

قائل میں تصوف کا ہوں اکبر لیکن
ارواح پرستی کو تصوف نہیں کہتے''
(وفیات ماجدی)

قرآن پڑھنے کے سلسلہ میں مولانا دریابادی نے لکھا ہے:

''نماز میں قرآن مجید اس خوش الحانی اور درد و تاثر سے پڑھتے کہ جی چاہتا کہ گھنٹوں اسے سنتے رہیے' ہمارے ہم سن تھے اور حضرت تھانویؒ اور مولانا محمد علی جوہر کی وفات کے بعد اب ملت کی زندہ ہستیوں میں انہیں کی ذات میرے لئے محبوب ترین تھی۔'' (ایضاً)

دراصل یہ اثرات تزکیہ باطن کے تھے جو مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتے تھے۔ کبھی تلاوت کی شکل میں' کبھی تصنیف کی صورت میں' کبھی وعظ و تقریر کے انداز میں اور کبھی مجلسی گفتگو کے طرز بیان میں۔ دل مجلّی ہو اور ذکر اللہ اور محبت رسولؐ سے سرشار ہو تو اس میں ایک خاص دلکشی اور مقناطیسی اثر پیدا ہو ہی جاتا ہے اور '' دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔''

زیارتِ حرمین شریفین

حضرت مولانا گیلانی خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ پھر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے استاد دینیات ہونے کی حیثیت سے اچھی تنخواہ پاتے تھے۔ دارالترجمہ حیدرآباد میں بعض اہم کتابوں کا ترجمہ بھی آپ سے متعلق ہوا اور آپ نے ترجمہ کا فریضہ بھی ادا کیا تھا۔ اس کتاب کی ضخیم جلدوں کے ترجمہ پر بھی کافی معاوضہ ملا ہوگا۔ گھر پر جائداد بھی تھی' اس طرح حج کے فرض ہونے کے لئے جس استطاعت کی شریعت میں شرط ہے' مولانا میں وہ شرط پائی جاتی تھی مگر

Marfat.com

ابھی تک حج کے فریضہ کی ادائیگی کا موقع میسر نہیں آیا تھا۔

جون ۱۹۲۷ء میں جب حیدر آباد سے گیلانی اپنے وطن تعطیل گرما میں تشریف لائے تو اچانک سخت بیمار ہو گئے اور اس بیماری نے کافی طول کھینچا۔ پٹنہ ہاسپٹل میں کئی ماہ زیر علاج رہے۔ قدرت کو آپ سے ابھی کام لینا منظور تھا' اس لئے صحت ہوئی۔

حج کا فریضہ اور اس کی ادائیگی

اس سال کے ختم کے بعد جب دوسرا سال ۱۹۲۸ء شروع ہوا تو آپ نے سنا اور دیکھا کہ آپ کے رفیق مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی حج کی تیاری میں مشغول ہیں اور سارے انتظامات سفر مہیا کر رہے ہیں۔ دن رات مولانا عبدالباری صاحب سے حج کی باتیں سنتے بھی تھے اور ان کو دیکھتے بھی تھے کہ وہ اس سلسلے میں کیا کیا کر رہے ہیں۔

مولانا گیلانی کے دل میں بھی حج کا بار بار خیال آتا اور سوچتے کہ کیا اچھا ہوتا کہ ان دو ساتھیوں کے ساتھ وہ بھی حج کر آتے مگر ساتھ ہی خیال آتا کہ ابھی کچھ ماہ پہلے بیماری پر کافی رقم خرچ ہو چکی ہے۔ سفر حج کا انتظام کس طرح کیا جائے۔ دل اندر سے بے چین تھا اور سرور کائنات ﷺ سے جو شیفتگی تھی اس کا شدید تقاضا تھا کہ اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے ورنہ پتہ نہیں کب پھر ایسے ساتھی مل سکیں گے اور حج کی سعادت نصیب ہو سکے گی۔

زیارت حرمین کا عزم

ان حضرات کی روانگی میں صرف ڈیڑھ ہفتے باقی رہ گئے تھے کہ ایک رات دل سے مجبور ہو کر حج کا حتمی فیصلہ کر لیا کہ جس طرح بھی ہو اسی سال اپنے انہی دوستوں کے ساتھ حج کے لئے رخت سفر باندھنا ہے۔ مولانا نے خود لکھا ہے:

> ''شاید ہفتہ عشرہ سے زیادہ وقفہ نہیں رہ گیا تھا کہ اچانک عزم کی بجلی سی تھی جو سینے میں چمک اٹھی' شاید رات کی تاریکی میں اس عزم مقدس کا نور قلب میں پیدا کیا گیا تھا' دوسرے دن مولانا عبدالباری سے عرض کیا' فرمایئے اپنی ہمرکابی میں اس (بندہ) کو بھی شریک ہونے کی اجازت مل سکتی ہے؟ جس کی شرکت کا بظاہر کوئی ذریعہ سر دست پیش نظر نہیں۔''
>
> (الفرقان، شعبان و رمضان ۱۳۶۹ھ)

مولانا کے عزم سے خوشی

مولانا ہی کا بیان ہے کہ مولانا عبدالباری صاحب میرے اس ارادہ کو سن کر شگفتہ ہو گئے اور فرمایا کہ ضرور آپ تشریف لے چلیں۔ اس سے بڑھ کر اچھی بات اور کیا ہو گی۔ پھر اسی ہفتہ میں حج سے متعلق جو قانونی کارروائی تھی وہ سب انجام پا گئی اور اب صرف روانگی باقی رہ گئی۔ مولانا عبدالباری کے ساتھ ان کے والدین بھی حج کے لئے جانے

Marfat.com

والے تھے چنانچہ جس دن وہ حیدرآباد سے رخصت حاصل کر کے لکھنؤ کے لئے روانہ ہوئے تا کہ وہاں پہنچ کر والدین محترمین کو ساتھ لے کر بمبئی کے لئے روانہ ہوں' مولانا گیلانی بھی اپنے وطن روانہ ہوئے کہ اپنے گھر والوں' بستی والوں اور رشتہ داروں سے مل ملا کر معافی تلافی کرا کے وطن سے ہی بمبئی کے لئے روانگی ہو۔

وطن حاضری

مولانا اخیر رمضان المبارک میں حیدرآباد سے اپنے وطن گیلانی ضلع پٹنہ (بہار) پہنچے۔ سبھوں سے ملے' ظاہر کیا کہ دفعتاً حج کا ارادہ کر لیا ہے۔ جانے کی قانونی کارروائی بھی عمل آ چکی ہے' عید کی نماز آپ لوگوں کے ساتھ ادا کر کے ان شاء اللہ روانگی ہوگی' یہ معلوم کر کے تمام خویش و اقارب اور اپنے پرائے خوش ہوئے۔

وطن سے بمبئی کے لئے روانگی

مولانا گیلانی نے سفرِ حج کے لئے زیادہ سامان لینا مناسب نہیں جانا۔ مولانا کا بیان ہے کہ ایک کمبل' دو چادریں اور تین جوڑے کپڑے اور ایک ہلکا سا بستر' گھر والوں کے ساتھ سٹیشن آئے اور بمبئی کا ٹکٹ لے کر ٹرین پر بیٹھے اور روانہ ہو گئے۔

ٹرین جب بمبئی سٹیشن پہنچی اور مولانا پلیٹ فارم پر اترے تو دیکھا مولانا عبدالماجد دریابادی آپ کی طرف آ رہے ہیں۔ خوشی ہوئی' مولانا دریابادی بمبئی پہلے آ گئے تھے۔ اب مولانا گیلانی کو لینے سٹیشن تشریف لے آئے تھے۔ ان کے ہمراہ جائے قیام پر آئے۔

جدہ کو روانگی

بمبئی میں مولانا کا کوئی آٹھ دس دنوں کا قیام رہا اور روانگی کے قانونی مرحلے طے ہوتے رہے۔ تاریخ متعین پر بمبئی سے جدہ کے لئے پانی کا جہاز روانہ ہوا۔ اس جہاز پر حجاج کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ ہوگی' جہاز میں دوسرے شناسا لوگ بھی ملے بالخصوص حضرت مونگیری (مولانا سید محمد علی) کے صاحبزادے مولانا لطف اللہ' مولانا نور اللہ' مولانا منت اللہ' ان حضرات کی والدہ ماجدہ اور ہمشیرہ صاحبہ اور دوسرے افراد کل ملا کر یہ قافلہ اکیس آدمیوں پر مشتمل تھا۔ مولانا لطف اللہ' مولانا گیلانی کے بہنوئی تھے' گویا یہ پورا خاندان اپنا رشتہ دار تھا' ان میں بہت سے افراد کے ٹکٹ فرسٹ کلاس کے تھے اور کچھ ڈیک کے۔

مولانا گیلانی کا سفر بڑے اطمینان وسکون سے طے ہوا۔ مولانا نے لکھا ہے کہ جب ان کا جہاز یلملم کے سامنے پہنچا تو گھنٹی بجی۔ جہاز پر سوار مسافروں نے حج' عمرہ کا احرام باندھا' مگر مولانا اور آپ کے دو ساتھیوں نے یہاں احرام نہیں باندھا۔ طے یہ ہوا کہ رسول اکرم ﷺ نے جہاں پہنچ کر احرام باندھا تھا وہیں پہنچ کر احرام باندھا جائے گا۔

Marfat.com

جدہ سے مدینہ منورہ

جدہ پہنچ کر مولانا کا قافلہ مدینہ منورہ روانہ ہوگیا۔ چونکہ ابھی حج میں ایک ماہ باقی تھا اس لئے وہاں قیام رہا۔ جدہ سے مدینہ منورہ روانگی بذریعہ بس ہوئی تھی اور مختلف منزلوں پر ٹھہرتے ہوئے گئے تھے۔ مولانا نے لکھا ہے کہ جب رابغ پہنچا تو قلب کے احوال میں ایک انقلاب محسوس کیا تا آنکہ بس مدینہ منورہ شہر کے حدود میں داخل ہوئی۔ پھر کیا ہوا؟ مولانا کے قلم سے سنیں۔ لکھتے ہیں:

''ہم میں سے ہر ایک دوسرے کو شاید بھول گیا۔ مدینۃ النبیؐ سننے کے بعد اندر جذبات کا طوفان تھا، جو اُبل رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بلالؓ آ رہے ہیں، یہ حضرت ابوذرؓ جا رہے ہیں، یہ فاروق اعظمؓ ہیں، ادھر ابوبکر صدیقؓ ہیں۔'' (الفرقان۔ شعبان و رمضان ۱۳۶۹ھ)

جذب و مستی کا عالم

جوشِ دیوانگی کا عالم یہ تھا کہ بقول خود مولانا مرحوم:

''جو کچھ پڑھا لکھا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا سب فراموش ہوگئے۔ اب تو معلم سے جو ہدایتیں مل رہی تھیں ان پر عمل ہو رہا تھا۔ چوبیس گھنٹے تک مستی و جذب کا ناقابل ذکر عالم رہا۔ اپنے آپے میں تھا ہی نہیں۔ اس کے بعد ہوش و حواس نے کچھ انگڑائی لی اور تاریخ میں جو کچھ پڑھا تھا، ذہن میں آنے لگا۔'' (ایضاً)

حواس درست ہونے کے بعد مولانا کا حال یہ ہوا کہ جن مقامات اور احوال کے متعلق کتابوں میں پڑھا تھا، ایک ایک چیز اور ایک ایک مقام کو تلاش کرنے لگے اور وہاں پہنچ کر سنت کے مطابق زیارت کرنے کا جذبہ انگڑائی لیتا رہا تھا مثلاً قبا کی مسجد میں بار بار حاضری دی اور بار بار دوگانہ ادا کیا۔ مولانا نے لکھا ہے:

''ایک ہفتہ کے بعد دل کی کیفیت یہ ہوگئی کہ مدینہ کے سوا کچھ یاد نہ رہا۔ ہندوستان کے اعزہ، اقرباء، جامعہ عثمانیہ کی پروفیسری، ہر چیز دماغ سے نکل گئی۔ یہ قطعی فیصلہ دل کا ہوا، زبان کا ہوا، ذائقہ کا ہوا کہ جو پانی یہاں پینے کو مل رہا ہے نہ پہلے کبھی کسی ملک میں ملا تھا اور نہ آئندہ ملے گا...... سرور و نشاط سے دل جتنا لبریز ہوا، کبھی نہیں ہوا۔'' (ایضاً)

دیارِ حبیبؐ سے شیفتگی

مولانا مرحوم کی ان تحریروں سے اندازہ لگائیں کہ محبت رسولؐ اور دیار حبیبؐ کی محبت کا کیا عالم تھا۔ وارفتگی اور دیوانگی کیسی تھی کہ وہاں پہنچ کر روضہ مبارک دیکھ کر ساری دنیا کو بھول گئے۔ ساری باتیں ذہن سے نکل گئیں، محبوبؐ اور

Marfat.com

محبوبؐ کے دیار پاک کی ایک ایک چیز پر جان نچھاور کرنے کو جی چاہتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسے ہی لوگ لذت ایمان سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی کتاب ''سفر حجاز'' میں مولانا گیلانی کی شیفتگی کا بڑا ہی اچھا نقشہ کھینچا ہے اور کوئی شبہ نہیں مولانا مرحوم عشق نبویؐ سے سرشار تھے ہی۔

مولانا دریابادی لکھتے ہیں:

> ''مولانا گیلانی کا سوز و گداز' علم و فضل' ذوق و جوش' ہر موقع پر ایک نئے رنگ میں نمایاں ہوتا رہا۔ مولانا مناظر فرط گریہ سے بے تاب ضبط واحتیاط کے باوجود چیخ نکل جانے پر مجبور۔'' (ص ۱۱۲' ایضاً)

267

سلطان حجاز سے ملاقات

مولانا دریا آبادی چونکہ ایک اخبار کے ایڈیٹر بھی تھے' اس لئے ان کو سلطان حجاز سے ملنے اور ان سے انٹرویو لینے کا شوق ہوا۔ ترجمان مولانا گیلانی کو بنایا اور دربار سلطانی میں حاضر ہوئے۔ سلام اور مصافحہ ہوا۔ مولانا کے ذریعے بادشاہ سے عرض کیا بحیثیت ایڈیٹر کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ بادشاہ نے منظور کرلیا مگر فرمایا اس کے لئے دوسرا وقت موزوں ہوگا' ابھی نہیں۔ وقت اور تاریخ طے کرالی مگر صحت کی خرابی کی وجہ سے دوبارہ وہاں تک حاضری نہ ہوسکی۔

دعوتیں اور کھانے

مدینہ منورہ میں ان حضرات کی بڑی عمدہ دعوتیں بھی ہوئیں۔ عرب اپنے عام قاعدہ کی رو سے مسلم دنبوں کے پیٹ چاک کر کے پلاؤ پکاتے ہیں اور اس میں بھنے ہوئے کاغذی بادام اور تخم خیارین وغیرہ ڈالتے ہیں۔ دعوتوں میں اس طرح کے کھانے بھی سامنے آئے۔

ایک ماہ بلکہ زیادہ مدینہ منورہ میں قیام رہا۔ مسجد نبوی میں پابندی کے ساتھ باجماعت نمازیں ادا کرتے' راتوں میں زیادہ سے زیادہ وقت شب بیداری' ذکر و شغل اور دعاؤں میں گزارتے تھے۔ ۴ ذی الحجہ کو مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کے لئے روانگی ہوئی۔ تھوڑی تاخیر بھی ہوئی' جس کی وجہ سے پریشان بھی ہوگئے مگر قدرت نے مدد فرمائی اور وقت سے پہلے مکہ مکرمہ تشریف لے آئے۔

مولانا مرحوم نے لکھا ہے کہ مدینہ منورہ کے قیام میں بڑی برکتیں سامنے آئیں۔ ایک ماہ تین دن کے کھانے کا صرفہ کل آٹھ روپے حصہ میں آیا۔ اس میں دونوں وقت کھانا اور عمدہ کھانا' ناشتہ اور چائے شامل تھی۔

268

مکہ مکرمہ آمد

مدینہ منورہ سے آتے ہوئے جب قافلہ ذوالحلیفہ پہنچا' تو وہاں اتر کر سبھوں نے غسل کیا' کپڑے بدلے احرام باندھا اور دوگانہ ادا کر کے اللھم لبیک لا شریک لک لبیک کی صدا بلند کرنے لگے۔ مولانا گیلانی نے

Marfat.com

بھی ایسا ہی کیا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا عبدالباری ندوی نے تمتع کا احرام باندھا اور مولانا گیلانی نے قرآن کا۔ مولانا نے اس وقت کا اپنا حال لکھا ہے:

''لبیک اللھم لبیک کی صدا گونجنے لگی' ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سینے پھٹ جائیں گے' روحیں قفس عنصری کو توڑ کر نکل پڑیں گی۔ محسوس ہوتا تھا کہ گویا ہر احرام باندھنے والے کے ہر بُنِ مُو سے ہی نغمہ داؤدی ابل رہا ہے۔'' (الفرقان۔ رمضان وشوال ۱۳۷۰ھ)

مولانا کو اس کی مسرت تھی کہ اس مقام سے احرام وتلبیہ کا انہیں شرف حاصل ہوا' جہاں سے چودہ سو سال پہلے حجۃ الوداع کے احرام وتلبیہ کا تاریخی آغاز اس وقت ہوا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں مولانا پر ایک وجد و کیف کا عالم طاری تھا' جو دبائے نہیں دبتا تھا۔ اسی مستی و دیوانگی کے عالم میں احرام باندھے ہوئے مکہ مکرمہ میں داخل ہوا۔ میقات کے حدود سے نکل کر حرم پاک کے حدود میں تشریف لائے' سامان رکھ کر سارے حجاج حج کی تیاری میں لگ گئے۔

مولانا لکھتے ہیں کہ یہاں پہنچ کر انہوں نے اپنے ہم قافلہ لوگوں سے عرض کیا کہ قافلہ میں حاضری سے ان کو آزاد کر دیا جائے تاکہ مخلّی بالطبع ہو کر ارکانِ حج ادا کر سکیں اور دعا و مناجات میں ہمہ تن مشغول ہو سکیں۔ ساتھیوں نے مولانا کو اس کی اجازت دے دی' مولانا نے اپنے ساتھ صرف ایک چادر اور ایک ہلکا تکیہ رکھا اور بس۔

حرم شریف میں قیام اور طواف کا اہتمام

خود لکھتے ہیں:

''سب سے الگ ہو کر باب ابراہیم کی سمت میں حرم شریف کے ایک گوشہ میں اپنا بستر ڈال دیا......رات جب کافی بھیگ جاتی ڈھائی تین بجے رات تک نسبتاً طواف کرنے والوں کی تعداد گھٹ گھٹا کر اس نقطہ تک پہنچ جاتی کہ مجھ جیسے کمزور جسم و جان والے کے لئے براہ راست حجر اسود تک رسائی آسان ہو جاتی تھی' پہلی دفعہ رات کی پچھلی گھڑیوں میں جب حجر اسود کے چومنے کی سعادت سے سرفرازی میسر آئی تو اس وقت کچھ ایسا معلوم ہوا کہ کوند کر کوئی بجلی تھی جو کالے پتھروں سے میرے ظاہر و باطن میں جذب ہو گئی۔'' (ایضاً)

مولانا کا ہی بیان ہے:

''دیوار حرم کے نیچے کی چند دنوں کی یہ زندگی جو ساری زندگی کے اوقات میں سب سے زیادہ قیمتی تھی...... ہر چیز سے بے پرواہ ہو کر چند روز مجاور حرم بنا ہوا' چوبیس گھنٹے وہیں گزارتا تھا۔''

(ایضاً)

ارکانِ حج کی ادائیگی

جب یوم الترویہ قریب آیا تو بستر اٹھا کر مولانا قیام گاہ ''رباط محروق'' پہنچے اور اونٹ پر سوار ہو کر منیٰ روانہ ہوئے۔ رات منیٰ میں گزاری۔ صبح کے وقت عرفات کو روانہ ہوئے' اللہ اللہ کر کے عرفات میں حاضری کا وقت آیا۔ یہاں پہنچ کر مولانا پر پھر وارفتگی کا عالم طاری ہوا۔ ساتھیوں کے ساتھ رہنے' کھانے پینے اور ملاقات کی قید سے اپنے کو آزاد کر چکے تھے۔ عرفات بھی قبولیت دعا کا مقام ہے' اس لئے مولانا نے یہاں کا سارا وقت خدا تعالیٰ سے رو رو کر اور گڑگڑا کر دعاؤں و مناجات میں گزارا۔ خوب روئے' خوب دعائیں کیں' راز و نیاز کی باتیں کیں' تنہائی کی وجہ سے اور اجنبی جگہ ہونے کی وجہ سے بہت ساری تکلیفوں سے بھی دوچار ہونا پڑا مگر مستی و جذب کے عالم میں کوئی فرق نہیں آیا۔ گرمی کا موسم ہونے کی وجہ سے دھوپ کی تمازت اور لو کی لپٹ سے مقابلہ کرنا پڑا۔ لیموں ساتھ رکھتے تھے۔ وہی جان کا محافظ بظاہر تھا' مگر جو کچھ کرنا تھا اس میں ذرہ برابر فرق آنے نہیں دیا۔

یہاں کا حال خود مولانا کی زبان قلم سے ہی سنیں' لکھتے ہیں:

> ''اللہ اللہ خیموں کے اندر چیخ و پکار' گریہ و بکا' نالہ وزار' توبہ و استغفار۔ شاید زمین بھی کانپ رہی تھی' آسمان بھی تھرا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے بیگانہ ہوتے جا رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی مخلوق کو دوسری مخلوق کی خبر نہیں ہے' سامنے سب کے گویا صرف ان کا ارحم الراحمین' غافر الذنب قابل التوب' الغفور الرحیم خالق کے سوا کوئی دوسرا باقی نہ رہا تھا۔'' (ایضاً)

اس جگ بیتی میں مولانا مرحوم اپنی آپ بیتی بھی بیان فرما گئے' کسی کا یہ حال رہا ہوگا یا نہ رہا ہوگا لیکن مولانا کا یقیناً یہی حال ہوگا جو مولانا کا قلم سنا رہا ہے۔ سب سے بے خبر ہو کر آج گناہوں کے بخشنے والے آقا کے سامنے رو رہے تھے چیخ رہے تھے' دست سوال پھیلائے ہوئے اور کہہ رہے تھے الہٰ العالمین! تو گناہوں کا بخشنے والا ہے' توبہ کا قبول کرنے والا ہے' رحمت و رافت والا ہے' تیرے سوا دوسرا کوئی نہیں ہے' ایک ہندی نژاد دور دراز سے چل کر مقبولیت کے اس مقام پر خوش بختی سے حاضر ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ رحم و کرم اور فضل و احسان کا معاملہ فرما۔ یہ بھکاری جن جن چیزوں کا سوال کرتا ہے پورا فرما دے۔ بڑی اُمیدیں لے کر حاضر ہوا ہے۔

میدانِ عرفات میں حیرانی

عرفات میں جب ایک دفعہ راستہ بھول گئے تو اس وقت کا مولانا نے نقشہ کھینچتے ہوئے لکھا ہے:

> ''مسجد ابراہیم سے نکلنے کے بعد خدا ہی جانتا ہے' میلوں کا چکر ریگستان میں' دیتا رہا اور ہر طرف آدمی ہی آدمی تھے...... لو کی شدت الامان والحفیظ' تیز و تند گرم آتشیں جھونکے آتے اور ایک نیم جان غریب ہندی انہیں میں جھونک دیا جاتا' کلیجہ تک معلوم ہوتا تھا کہ لو کی حدت سرایت کر گئی۔ بسا اوقات زبان نکل پڑتی' چلتے چلتے کبھی کبھی یہ بھی تماشا پیش آتا کہ لو کی شدت سے بے جان

Marfat.com

غریب حاجی دیکھا مر گیا ہے۔اس کے رفقاء ریت ہٹا ہٹا کر دفن کر رہے ہیں......اس نظارے کو دیکھ دیکھ کر یقین ہو گیا کہ اسی وادی میں تڑپ کر اپنی جان تجھے بھی جاں آفرین کے سپرد کرنی پڑے گی۔'' (ایضاً)

حج کے سلسلے میں مولانا کو اس ابتلاء سے بھی گزرنا پڑا اور رحم و کرم والے مولا نے بالآخر دستگیری فرمائی اور اس آزمائش سے نکلے' جان بچی اور رب العالمین کا شکر ادا کیا۔

مولانا عبدالباری ندوی نے ایک جگہ لکھا ہے:

''عرفات کے میدان میں اپنی مستی و بے خودی کے عالم میں کھو گئے۔دوسرے دن رمی جمار کے کسی مقام پر بھنے چنے ہی کھاتے ہوئے پائے گئے تھے۔کھانے کی دکان یا ہوٹل تک جانے کے اہتمام سے یہی آسان جانا۔'' (مکاتیب گیلانی)

مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا ہے:

''مولانا مناظر صاحب ہر موقع کی طرح آج بھی ہمارے قافلہ میں سب سے زیادہ نصیب ور رہے۔نماز پڑھنے مسجد نمرہ گئے' واپسی میں خیمہ کا راستہ بھول کر کہاں کہاں بھٹک گئے اور ساتھیوں سے گم ہو کر یہاں کی تنہائیوں اور خلوتوں میں خدا معلوم کیا کیا پالیا۔ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء کی تصدیق ایک بار پھر ہو کر رہی' ہدایت شاید ایسے ہی کھوئے ہوؤں کے نصیب میں آتی ہے۔ووجدک ضالاً فھدیٰ'' (سفر حجاز۔ص ۳۶۰)

عرفات سے مزدلفہ

عرفات میں چونکہ ساتھیوں کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اس لئے کافی پریشان رہے۔عرفات سے مزدلفہ پہنچنے کی جب کوئی صورت نظر نہ آئی تو پیادہ پا روانہ ہوئے۔پھر مشکل سے اونٹ کی سواری ملی' اللہ اللہ کر کے مزدلفہ پہنچے' یہاں پہنچ کر سب سے پہلے مغرب و عشاء کی نمازیں ادا کیں۔رات مزدلفہ میں گزری' صبح کی نماز بھی وہیں مسجد میں ادا کی۔

حج سے فراغت اور واپسی

صبح کی نماز ادا کر کے حاجیوں کے ساتھ منٰی کے لئے پیدل ہی روانہ ہو گئے۔تنہا ہونے کیوجہ سے یہاں بھی بہت ساری پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا۔بہت دیر کے بعد ایک حیدر آبادی نظر آئے اور ان کی مدد سے اپنے ساتھیوں میں آئے۔قربانی کی' حلق کرایا اور پھر مکہ مکرمہ طواف زیارت کے لئے حاضر ہوئے اور طواف کر کے پھر منٰی آئے اور اس طرح حج کے تمام ارکان واحکام پورے ہوئے۔

Marfat.com

حج کے بعد قیام کا ارادہ تھا' مگر اتفاق سے واپسی کا انتظام بہت جلد ہوگیا اور دوسرے تیسرے ہی دن ساتھیوں کے ساتھ وطن کے لئے جہاز پر سوار ہوگئے اور خیریت کے ساتھ ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا۔ تفصیل کے لئے دیکھئے "الفرقان" (لکھنؤ) رمضان وشوال ۱۳۶۹ھ۔

شیخ احمد سنوسی سے ملاقات

اس سفر حج میں شیخ احمد سنوسی (م ۱۹۳۳ء) سے بھی آپ نے مولانا دریا آبادی کے ساتھ ملاقات کی۔ شیخ طرابلس کے رہنے والے تھے اور ہزار ہا لوگوں کے مرشد تھے اور فرنگیوں سے جہاد و قتال میں مصروف تھے۔ مولانا دریابادی نے لکھا ہے:

> "ملاقات کی گھڑی قریب آ گئی' فرش پر تکیہ سے متصل ایک پیکر نور جلوہ گر تھا۔ رنگ سرخ و سفید' گول چہرہ' نورانی داڑھی' عمر کوئی ۶۹۔۷۰ کی نظر آئی...... میں عربی میں گفتگو پر یوں بھی قادر نہیں ہوں...... مولانا مناظر احسن گیلانی ہر ایسے موقع کی طرح یہاں بھی کام آئے' ہم سب کی طرف سے ترجمانی شروع کردی۔ کتنی دیر رہی؟ وہ اب کہاں یاد۔ بہر حال خاصی دیر تک رہی......"
>
> (معاصرین، ص۲۳)

اخلاق وشمائل

حضرت مولانا گیلانی ایک علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ عالموں کے گھرانے میں ہی پیدا ہوئے' انہی کی گودوں میں پرورش پائی اور اسی ماحول میں نشوونما ہوئی۔ جب ذرا ہوش سنبھالا تو ازابتداء تا جوانی مدارس دینیہ اور تعلیمی درس گاہوں میں دن رات رہنا ہوا اور بعد فراغت تعلیم' معلم اخلاق بن کر نوجوانوں کے سامنے آئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اخلاق واعمال میں پاکیزگی و بلندی' عقائد و معاملات میں پختگی وصفائی اور نشست و برخاست میں متانت وسنجیدگی مولانا کے حصہ میں پورے طور پر آئی۔ ذہن وفکر اور حوصلہ و ولولہ کی بلندی قدرت نے پوری فیاضی سے عطا کر رکھی تھی۔ درشت مزاجی اور تندخوئی سے کوسوں دور تھے بلکہ اس کی جگہ رفق وملاطفت اور ہمدردی و رواداری فطرت میں داخل تھی۔

مولانا کے اخلاق

خود بھی ہشاش بشاش رہتے تھے اور دوسروں کو بھی ایسا ہی دیکھنا پسند کرتے تھے۔ مزاج میں ظرافت بھی تھی اور خوش طبعی بھی جو موقع موقع سے ابھر کر سامنے آتی رہتی تھی۔

مولانا کو کبر وغرور اور نخوت و بڑائی کہیں سے چھوتک نہیں گئی تھی۔ چھوٹے بڑے سبھوں سے خندہ پیشانی

Marfat.com

سے ملتے تھے اور ہر ایک سے بلا تصنع و تکلف پیش آتے تھے۔ اپنے ہمعصروں کا احترام بھی کرتے تھے اور ان سے محبت کا اظہار بھی فرماتے تھے۔ بڑوں کے ساتھ تعظیم و تکریم اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت و محبت آپ کا وظیفہ طبعی تھا۔ گلہ وشکوہ کی عادت قطعاً نہیں تھی۔ مختصر یہ کہ پاک وصاف دل تھے۔ مزاج خالص علمی اور دینی تھا۔ ملکی سیاست سے ذرہ برابر دلچسپی نہیں تھی۔

علماء کا احترام

متقدمین ومتاخرین علماء اور ائمہ اسلام کے مرتبہ شناس اور قدرداں تھے۔ عام طور سے ان میں باہم موازنہ کی بیماری سے پاک تھے۔ اپنے دور کے اہل علم اور علماء ومشائخ کے ساتھ بھی حسن وادب کا معاملہ رکھتے تھے۔ اپنے معاصرین کی جی بھر کر مدح وستائش کیا کرتے تھے۔ ان کے فضائل ومناقب کا تذکرہ زبان پر عموماً ہوتا۔ طبعاً ملن سار اور مرنجان مرنج تھے۔

مولانا کے ایک شاگرد نے لکھا ہے:

> ''اپنے معاصرین کی قدر کرنا اور ان کے کمال کا اعتراف کرنا وہ وصف عالی ہے جو ہر زمانہ میں نادر رہا ہے مگر مولانا میں یہ نادر وصف بدرجہء اتم موجود تھا۔ اس سے بڑھ کر وہ اپنے چھوٹوں کے کمالات کو بھی بڑی فراخ دلی سے تسلیم کرتے اور اعلانیہ اس کا اظہار فرماتے تھے۔''
>
> (مقالات احسانی، ص ۱۵)

ہونہاروں کی حوصلہ افزائی

اپنے ہونہار چھوٹوں کی کھل کر حوصلہ افزائی کرتے۔ کوئی علمی مشورہ کے لئے خط لکھتا تو ایسی حوصلہ افزائی کرتے کہ وہ کبھی کبھی دھوکہ میں مبتلا ہو جاتا' ورنہ عام طور پر اس کا شعور تو بہرحال بیدار ہو ہی جاتا اور وہ اپنے کو علمی طور پر بنانے سنوارنے میں لگ جاتا اور بسا اوقات...... وہ زندگی کے علمی میدان میں مولانا کی رہبری سے کامیابی وکامرانی کی دولت سے مالا مال بھی ہوتا تھا۔

احباب سے اخلاص

دوستوں میں سے کسی کے متعلق معلوم ہوتا کہ اس کو ان کی وجہ سے تکلیف پہنچی ہے تو اس کی شکایت سے پہلے خود ہی معافی کے لئے حاضر ہو جاتے اور اس وقت تک جدا نہیں ہوتے جب تک وہ خوش نہ ہو جاتا اور معاف نہ کر دیتا بلکہ بسا اوقات جس سے معافی کی التجا کرتے اس متواضعانہ انداز میں کرتے کہ شرم سے وہ پانی پانی ہو جاتا۔

Marfat.com

مولانا کے تعلقات

مولانا بیک وقت عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد کے مقبول ترین استاد بھی تھے اور واعظ شہر بھی۔ متعدد کتابوں کے مولف و مصنف بھی تھے اور بہت سارے اخبار و رسائل کے مقالہ نگار اور مضمون نگار بھی۔ شعر و شاعری کا ذوق بھی رکھتے تھے اور مجلسی گفتگو کا سلیقہ بھی۔ جامع مسجد میں جمعہ کی امامت بھی فرماتے تھے اور روزانہ درس قرآن کا مشغلہ بھی تھا' اس لئے مولانا کا ہر طبقہ کے لوگوں سے ملنا جلنا بھی تھا اور ان سے راہ و رسم اور تعلقات بھی تھے۔

حسن سلوک اور نرم خوئی

طبیعت میں غلظت و شدت قطعاً نہیں تھی۔ ہر ایک آنے والے کی باتیں سنتے اور ہر ایک کا کام کرنا اپنی وسعت بھر اپنا اخلاقی فریضہ جانتے' جبہ و دستار والے بھی مولانا کے پاس آتے اور ایسے سوٹ بوٹ والے بھی جن کے چہروں پر داڑھی تک نہیں ہوتی۔ کرتے پائجامہ والے بھی خدمت میں حاضری دیتے اور کوٹ و پتلون والے بھی۔ مولانا کے یہاں کسی کو حقیر جاننے کا سوال ہی نہیں تھا۔ سبھوں کے ساتھ محبت بلکہ محبت کا سلوک فرماتے تھے۔

لوگوں کی اصلاح کا جذبہ فطری تھا' مگر بڑی شرافت سے۔ جب تک کوئی مانوس نہیں ہو جاتا اس وقت تک اس پر کوئی گرفت نہیں کرتے۔ پہلے مانوس ہونے دیتے پھر بتدریج اس کے ذہن و فکر کی دھلائی کی سعی فرماتے۔ یہی وجہ ہے کہ جس کی آمد و رفت آپ کے پاس رہی وہ آپ کا معتقد ہو کر رہا اور اس کو آپ کے خلق و مروت کی تحسین کرنی پڑی۔ ساتھ ہی وہ اسلامی رنگ میں ڈوبا ہوا نظر آیا۔

ہم عصروں نے بھی سراہا اور شاگردوں نے بھی۔ آپ کے اساتذہ نے بھی آپ کی تعریف فرمائی اور اہل شہر اور ملنے جلنے والوں نے بھی۔ آپ کے ساتھی اور احباب بھی ہمیشہ خوش رہے اور پڑوسی اور علمی مباحثہ کرنے والے بھی۔

معاصرین کا اعتراف

مولانا عبدالباری ندوی ۳۲۔۳۳ سال تک حیدر آباد میں حضرت مولانا گیلانی کے ساتھ رہے سہے اور سب کو معلوم ہے مولانا ندوی معاملات میں بڑے جزرس تھے اور مزاج میں شدت بھی تھی۔ انہوں نے مولانا کی بہت ساری خوبیوں کا برملا اعتراف کیا ہے اور جی بھر کر مدح و ستائش کی ہے۔ مولانا ندوی خود اپنے متعلق لکھتے ہیں......

> ''اور سب سے بڑی کرامت اس سلسلہ کی بالکل متضاد فطرت والے دن رات کے ساتھی راقم (عبدالباری) کے ساتھ سالہا سال تک کامیاب ہی نہیں بڑا خوش گوار اور دل نواز نباہ رہا۔'' (مکاتیب گیلانی۔ص ۴۵)

انہوں نے اپنا ذاتی واقعہ لکھا ہے:

> ''ایک مرتبہ کسی معاملے میں خود راقم نالائق کو شاید کچھ زیادہ ناخوش محسوس فرما کر تو غضب ہی کر

دیا۔ دھڑ سے پیروں پر گر پڑے، گھبرا کر ان کے سر کو اٹھا کر سینہ سے لگالیا اور دونوں لپٹ کر خوب روئے۔" (ایضاً)

دائرہ تعلقات کی وسعت

مولانا گیلانی کے عوام و خواص سے تعلقات اور اہلِ شہر سے محبت اور حسن سلوک کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا ندوی نے تحریر فرمایا ہے۔

"مولانا کا دائرہ تعلقات صرف یونیورسٹی تک محدود نہ تھا پورے حیدر آباد کے عوام و خواص، علماء و مشائخ، امراء و وزراء، افسروں، ماتحتوں، بڑے چھوٹے، تاجروں دوکانداروں، ہر طبقہ تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے باوجود شاید ایک مثال بھی کوئی بتا سکے کہ کسی طبقہ کا ایک فرد بھی مولانا (گیلانی) سے ناراض رہا۔ ناراض کیا سب ہی بڑی عزت و محبت کرتے تھے۔" (ایضاً)

یہ سب مولانا کے اخلاص وللّٰہیت اور خیر خواہی کا نتیجہ تھا۔ مولانا کے قلب میں سبھوں کے لئے بڑی گنجائش تھی۔ سبھوں کا بھلا چاہتے، سبھوں کی سفارش فرماتے اور کسی سے ٹوٹ کر بات نہیں کرتے تھے۔ دل دہی و دل نوازی اور اخوت و محبت مولانا کا خاص شعار تھا۔

مولانا کا طریقہ اصلاح

مولانا کے ملنے والے کہتے ہیں کہ مولانا اکثر فرماتے تھے کہ جب کوئی داڑھی منڈا کر ان کی مجلس میں بیٹھتا اور مولانا اس کے ساتھ اخلاق کا برتاؤ کرتے تو مولانا عبدالباری بہت خفا ہوتے اور کہنا چاہئے کہ چڑتے اس لئے کہ ان کے مزاج میں سختی اور شدت تھی اور خلاف سنت برداشت کرنے پر قدرت نہیں رکھتے تھے مگر مولانا گیلانی فرماتے کہ میں سوچتا تھا کہ جب تک غریب ہم دین داروں سے قریب نہ ہوگا ہمارے اعمال و اخلاق کو نہ دیکھے گا، اس تک دین کا پیغام آخر پہنچانے کی کیا صورت ہوگی اور وہ ہمارا اثر کیسے قبول کرے گا۔

پھر صرف ظاہری شکل و صورت دیکھ کر کسی کے متعلق حتمی فیصلہ کر لینا یہ دین سے باغی ہے، کچھ زیادہ دانش مندی بھی نہیں اور فرض کر لیا جائے کہ کوئی گناہ گار ہی ہو تو اس سے اول مرحلہ میں اگر نفرت کا برتاؤ کیا جائے گا تو اسے گناہ کے کاموں سے روکنے کی کیا صورت ہوگی؟

ظاہری شکل و صورت پر حکم نہیں لگاتے

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے بہت درست لکھا ہے کہ

"نئے تعلیم یافتہ کے بہت سے افراد کے مشاہدہ و تجربہ نے ان (مولانا گیلانی) کو اس نتیجہ پر

پہنچایا تھا کہ صرف ظاہری شکل وصورت پر کسی شخص کے قبح باطن یا اس کے بے دین ہونے کا فیصلہ نہ کیا جائے۔''

آگے مولانا علی میاں زید مجدہ نے مولانا گیلانی کے ایک مکتوب گرامی کا اقتباس نقل کیا ہے' وہ لکھتے ہیں:

''قالب وقلب میں اختلاف کی یہ صورت جب پیش آجاتی ہے تو قلب ہی پر زیادہ نظر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرے خیال میں تو قالب وقلب یا ظاہر و باطن کے اختلاف کی یہ شکل اسلامی تاریخ میں نئی نہیں ہے۔ آغاز تو عہد صحابہ ہی میں معلوم ہوتا ہے کہ ہو چکا تھا' عمامہ پر عقاب لگا کر مدینہ میں داخل ہونے کا واقعہ کیا آج کا...... ہے؟۔'' (پرانے چراغ)

غلظت سے اجتناب

مولانا گیلانی اپنے اس خط کے اخیر میں رقم طراز ہیں:

''ہمارے علماء اگر فضاضت وغلظت ہی سے اس سلسلہ میں کام لینا ضروری قرار دیں گے تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ قرآن نص محکم ''لا نفضوا من حولک'' کی شکل میں ان کے سامنے نہیں آئیگا۔'' (پرانے چراغ)

یہ دراصل قرآن پاک کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے جس میں رسول اکرم ﷺ کی شفقت ومحبت اور نرم خوئی کی تعریف کی گئی ہے اور تند خوئی اور درشت مزاجی کے انجام سے آگاہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظاً غليظ القلب لا نفضوا من حولك.

ماحصل یہ تھا کہ نرم خوئی کی قرآن میں تعریف کی گئی ہے اور اس کا فائدہ یہ بتایا گیا ہے کہ دوسرے لوگ جو دور ہوتے ہیں' اس کی وجہ سے وہ قریب آجاتے ہیں اور درشت مزاجی اور سختی کا اُلٹا اثر ہوتا ہے۔ آنے والے رُک جاتے ہیں اور ایسے شخص سے آنے جانے والوں کو بُعد پیدا ہو جاتا ہے۔

غیر اقوام اور مولانا

مولانا کا نظریہ تھا کہ ہندوستان کے غیر مسلم کی بڑی تعداد اس لئے اسلام سے قریب نہیں ہوئی کہ ہم نے قریب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ قبل از وقت ان سے دوری اور نفرت کا فیصلہ کر لیا اور عملاً یہی معاملہ برتا۔

فرماتے تھے کہ اگر قیامت کے دن ہم سے سوال ہوا کہ تم جس ملک اور خطہ میں رہتے تھے وہاں کروڑوں کی آبادی خدا کے دین سے دُور رہی۔ وہ آگ میں تمہارے سامنے جلتی بھنتی اور گرتی رہی اور تم نے تماشا دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کیا حالانکہ تمہاری تعداد اچھی خاصی تھی۔ تم میں دین جاننے والے بھی تھے اور اللہ کے دین سے محبت کرنے والے بھی۔ سوچنا چاہیے کہ اس دن ہماری طرف سے کیا جواب ہوگا؟ یہ سب فرما کر مولانا آب دیدہ ہو جاتے اور کہتے

Marfat.com

افسوس ہم نے کبھی اس مسئلہ پر غور ہی نہیں۔ کیا واقعہ یہ ہے کہ اس دن ہم سے کوئی جواب نہیں بن پڑے گا اور پچھتانا ہوگا اور اعتراف کرنا ہوگا کہ ہم نے اپنا فریضہ ادا کرنے میں کوتاہی کی۔

مولانا کا کہنا تھا کہ چند صوفیاء اور اولیاء کے سوا ہندوستان کے دوسرے علماء نے اس مسئلہ کی اہمیت کو سمجھا ہی نہیں۔ غیر اقوام کے ساتھ نفرت و حقارت کا معاملہ کیا دنیا کے تمام معاملات میں ہم نے برادران وطن سے نرمی برتی محبت و حسن سلوک کا معاملہ کیا مگر دین کے بارے میں ہم پر جو فرائض عائد ہوتے تھے ان کو پورا کرنے میں کوتاہی کی اور جس اخلاق و مروت کا مظاہرہ ہونا چاہئے' وہ ہم نہ کر سکے۔

باہم اختلاف زیادہ نہیں

مولانا گیلانی یہ بھی فرماتے کہ ان سے ہمارا کوئی لمبا چوڑا جھگڑا بھی نہیں ہے۔ صرف ہمارے غلط ماحول نے دوری بڑھادی ہے ورنہ دنیا جانتی ہے کہ تمام انبیاء و رسل کو ہم مانتے ہیں خواہ کسی بھی ملک اور قوم میں وہ آئے ہوں' ساری آسمانی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں خواہ کسی پیغمبر پر نازل ہوئی ہوں۔

ان سے کہنا اور سمجھانا یہ تھا کہ تمام نبیوں کے ساتھ ایک نبی آخر الزماں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تم اور مان لو۔ تم آسمانی کتابوں کے ساتھ ایک آخری آسمانی کتاب قرآن مجید پر ایمان لے آؤ۔ یہ خدائی کتاب کا سب سے اکمل و کامل اور آخری ایڈیشن ہے؟ بس ہمارا تمہارا اختلاف ختم ہے۔

مولانا کا ایک خط

میرے نام ایک خط میں مولانا نے کھل کر لکھا ہے۔ خط ذرا غور سے پڑھا جائے' لکھتے ہیں:

''چالیس سال سے زیادہ زمانہ گزرا جب سے یہ سوال دماغ میں گردش کر رہا ہے کہ اس کفرستان میں قیام کی وجہ...... وجیہ کیا ہو سکتی ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے غلاموں کی اتنی بڑی آبادی اور اس پر بھی بیس بائیس کروڑ نفوس ایسے رہ گئے جنہوں نے اپنے پیغمبر کو نہیں پہچانا۔ نہ انہوں نے پہچانا اور نہ پہچان کے لیے جو بھیجے گئے تھے انہوں نے دھیان دیا۔ وہ حکومت و سیاست کے حقوق میں کچھ دن اُلجھے رہے۔ ان سے نجات ملی تو اب پیٹ اور روٹی کا جھگڑا ہے...... ہر روز حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کی اتنی بڑی تعداد مسلسل جہنم میں ٹپکتی اور گرتی جا رہی ہے لیکن ہم اس تانتے کو دیکھ رہے ہیں۔ دو ہی صورت ہے یا یہ واقعہ جہنم میں گرنے کا دھوکہ ہے یا دھوکہ نہیں واقعہ ہے تو پھر

اگر بینی کہ نابینا و چاہ است
اگر خاموش بنشینی گناہ است

خدا کرے یہ گرہ کھل جائے اور جس کے لئے ہم بہار آئے تھے وہ یاد آ جائے۔"

(مکتوب گیلانی بنام محمد ظفیر الدین، ۱۹ مئی ۱۹۵۲ء)

مولانا فرماتے تھے میری نوجوانی کی تقریر سے ایک غیر مسلم دربھنگہ میں مسلمان ہوا تھا۔ قیامت میں شاید وہی میری بخشائش کا بڑا ذریعہ بن جائے۔

علامہ سید سلیمان ندوی کے نام

اسی مضمون کا ایک خط حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے نام "معارف" (اعظم گڈھ) میں نظر سے گزرا۔ اس میں مولانا گیلانی نے لکھا ہے۔

"آپ سے دل کی بات عرض کرتا ہوں۔ دینی خدمت کا شعور دماغ میں جب سے پیدا ہوا ہے ذہنی طور پر میرا دماغ ہمیشہ اس پہلو کو سوچتا رہا ہے کہ ہندوستان کے غیر مسلم اقوام تک اسلام کو آگے بڑھانے کی کوئی صورت نکالی جائے۔ میرا خیال ہے کہ موجودہ مسلمانوں کو زندہ کرنے کی کوشش لاحاصل سی کوشش ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ کوئی تازہ خون اسلام کی رگوں میں کسی راہ سے اگر آ جائے تو ممکن ہے کہ یہ اس کی حرارت سے ان پرانے تھکے ہوئے۔ اکھائے ہوئے مسلمانوں میں زندگی پیدا ہو مگر براہ راست ان کے جگانے اور جھنجھوڑنے کے کام کو قریب مردوں کو جگانے اور جھنجوڑنے کے ہم معنی سمجھ رہا ہوں۔ جب حکیم الامت" (حضرت تھانوی) کی استی سال کی حکومت میں یہ سوئے ہوئے رہے اور کچھ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ان میں کون آیا اور کون ان کو چھوڑ کر چلا گیا' تو اب دوسروں سے متاثر ہوں گے؟ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ بہار ہی ممکن تھا کہ معیار ہو جاتا لیکن اس کا ماحول قطعاً بدل گیا اور اب تو اسلام سے یہ صوبہ بہت دور ہو گیا۔" (مکتوب ۱۸ فروری ۱۹۴۷ء در: "معارف" (اعظم گڈھ) مئی ۱۹۶۳ء)

مولانا کا درد

سوچئے کہ مولانا کے یہ خطوط کن جذبات کی شہادت دے رہے ہیں اور ان خطوط میں کتنا درد اور سوز و گداز ہے۔ مولانا چونکہ ایک سرکاری ملازم تھے عمل کے میدان میں اترنا ان کے لئے مشکل تھا اس لئے دوسروں کو جہاں تک ہوسکا متوجہ کرتے رہے اور یونیورسٹی میں بیٹھ کر اپنے شاگردوں کی ذہن سازی اور سیرت سازی میں ہمہ تن مشغول رہے چنانچہ مولانا کے بہت سے شاگرد غیر ممالک میں اشاعت اسلام کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

یہ سب جانتے ہیں کہ اسلام اخلاق و صداقت سے پھیلا' اگر عام مسلمان اسلامی اخلاق سے مزین ہو جاتے تو دوسری قوموں پر خود بخود ان کے اثرات پڑتے اور وہ اپنے مذہب کے سلسلہ میں سوچنے پر مجبور ہوتے۔ کسی معاشرہ کی

Marfat.com

خوبیاں ہی دوسروں پر اثر انداز ہوا کرتی ہیں اور ان کے ذہن وفکر میں انقلاب برپا کرتی ہیں۔

ملن ساری و مہمان نوازی

حضرت گیلانی میں ملن ساری بدرجہ اتم پائی جاتی تھی۔ اہل علم اور عوام دونوں سے بڑی محبت و شفقت سے ملتے' ان سے گفتگو کرتے اور پھر دین کا پیغام پہنچانے کی سعی کرتے۔

مہمان نوازی اور دل دہی بھی مولانا کا وصف خاص تھا۔ مولانا کی اخیر زندگی میں ان کے دولت کدہ پر خاکسار بارہا حاضر ہوا اور علمی استفادہ کیا۔ میں نے برابر دیکھا کہ مولانا اجنبی سے اجنبی اہل علم سے کشادہ جبینی سے ملا کرتے تھے اور مہمان نوازی کر کے خوش ہوا کرتے تھے اور تھوڑی ہی دیر میں ایسے مل جاتے اور بے تکلف ہو جاتے کہ معلوم ہوتا بہت پرانی جان پہچان ہے۔

بندہ کی پہلی ملاقات شعبان ۱۳۶۸ھ میں مولانا کے مکان پر ہوئی۔ چوں کہ یہ میری نوجوانی کا زمانہ تھا مولانا نے سمجھا کہ کوئی طالب علم ہے۔ پوچھا کہاں پڑھتے ہیں کیا پڑھتے ہیں۔ جب میرے ساتھی مولانا محمد یحییٰ ندوی سلمہٗ نے بتایا کہ یہ ہمارے دارالعلوم معینیہ سانحہ ضلع مونگیر کے صدر مدرس ہیں پھر مولانا نے علمی گفتگو شروع کر دی اور جب تھوڑی دیر بعد عرض کیا گیا کہ ایک کتاب کا مسودہ ساتھ لایا ہوں میری خواہش ہے کہ اس پر آپ نظر ثانی فرما دیں کہ اس میدان میں یہ میرا پہلا قدم ہے تو بڑی خوشی سے فرمایا لایئے مسودہ دیکھوں۔ میں نے ''نظام مساجد'' کا مسودہ نکال کر مولانا کے ہاتھوں میں دے دیا۔ مولانا نے اسی آن پڑھنا شروع کر دیا۔ ہم لوگ سامنے بیٹھے رہے۔ وہ اس طرح مشغول ہوئے کہ آٹھ بجے صبح سے لے کر ساڑھے چھ بجے سہ پہر تک پڑھتے رہے۔ درمیان میں صرف ظہر کی نماز پڑھنے کے لئے مسجد گئے اور واپس آئے۔ دورانِ مطالعہ فرماتے رہے کہ اس مسئلہ کو فلاں مصنف نے اس طرح لکھا ہے اور کتابیں کھول کھول کر دکھاتے بھی رہے مشورہ بھی دیتے رہے۔ جب عصر کی نماز پڑھ کر مسجد سے واپسی ہوئی تو فرمایا الحمد اللہ! آپ نے محنت کی ہے' پڑھ کر طبیعت خوش ہوئی۔ پسند کریں تو اپنی رائے لکھ دوں۔ میں نے عرض کیا یہ تو میری دلی خواہش ہے۔ مولانا گیلانی نے قلم اُٹھایا اور دو صفحے کا گرانقدر مقدمہ تحریر فرما دیا۔ (دیکھئے رسالہ دارالعلوم دیوبند۔ ستمبر ۱۹۵۶ء)

یہ واقعہ ہے کہ مولانا گیلانی ہر ہونہار نوجوان عالم دین سے مل کر خوش ہوتے' اس کی حوصلہ افزائی فرماتے اور بعد میں خط و کتابت کے ذریعہ علمی رہنمائی فرماتے۔

چھوٹوں کی حوصلہ افزائی

''نشان منزل'' قلمی جوان اکابر کے خطوط کا مجموعہ ہے......جنہوں نے خاکسار کے خطوط کے جواب میں اپنے گرامی ناموں کے ذریعہ ہمت افزائی' علمی رہنمائی اور کرنے کے کاموں کی نشان دہی فرمائی ہے' اس میں ایک حصہ مولانا گیلانی کے خطوط کا بھی ہے اور وہ سارے خطوط مولانا گیلانی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا اپنے چھوٹوں کے لئے نعمت عظمیٰ کی حیثیت رکھتے تھے۔

Marfat.com

میرا پہلا خط جب پہنچا تو مولانا نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

''ملنے کے بعد دل آپ سے مل گیا تھا اس لئے کبھی کبھی خیال آپ کا آتا رہا۔ ''برہان'' میں آپ کے مضمون کی متعدد قسطیں نظر سے گزریں۔ ماشاء اللہ آپ نے بڑی محنت کی ہے۔ ان شاء اللہ آئندہ آپ سے توقع ہے کہ زیادہ بہتر کام قدرت لے گی۔''

(مکتوب ۱۸ محرم ۱۳۶۹ھ)

پتہ اس طرح لکھا:

''الی بحرالصالح البار الراشد السعید مولانا......''

علمی رہنمائی

مولانا گیلانی کے ہی مشورہ سے میں نے تاریخ مساجد پر کام شروع کیا۔ اس سلسلہ میں رہنمائی فرماتے ہوئے لکھا:

''تاریخ المساجد کا کام آپ نے شروع کر دیا اس سے خوشی ہوئی خصوصاً مسلمان جغرافیہ نویسوں کی کتابیں یعنی ابن حوقل، خرداذبہ، مقدسی، ابن رستہ وغیرہ کی کتابیں اور سیاحوں کی سیاحت ناموں میں آپ کو بہت مواد ملے گا۔ خطط مصر و شام میں بھی مسجد کی خصوصیتوں سے زیادہ اس پر توجہ رکھئے کہ مسلمان اپنی مسجدوں سے کیا کیا کام لیتے تھے خصوصاً درس و تدریس کا کام، گویا آپ کی کتاب ''المساجد'' کے ساتھ ''المدارس'' کی بھی تاریخ ہو جائے گی، بلکہ ممکن ہے القضاء کی بھی۔ کام بڑا دلچسپ ہے...... مدارس کے ساتھ خانقاہوں یعنی تصفیہ باطنی کا کام بھی بعض مساجد سے لیا گیا ہے۔'' (ایضاً)

یہ خط کافی لمبا ہے اور علمی معلومات سے لبریز ہے۔ ایک دوسرے خط میں رہنمائی فرمائی:

''تاریخ المساجد کے سلسلہ میں عرض کرنا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ اس کے پیچھے پڑ کر دوسری چیزوں کو چھوڑ بیٹھیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کی تحریری دانشائی صلاحیتوں کو دیکھ کر میں توقع کرتا ہوں کہ جیسے جیسے مشق و تجربہ آپ کا بڑھتا جائے گا آپ ان شاء اللہ ایک پختہ کار مصنف بن کر اسلام کی خدمت کریں گے۔ پس مناسب یہ ہے کہ تاریخ المساجد کے ساتھ اور بھی جن عنوانوں پر لکھنے لکھانے کا ارادہ ہو اس کو بھی مسلسل جاری رکھئے۔'' (مکتوب گرامی۔ ۲۴ مارچ ۱۹۵۰ء)

ایک خط میں ان عنوانات کا تذکرہ ہے جن پر کتابیں اب تک نہیں لکھی گئی ہیں اور لکھنے کی ضرورت ہے۔

Marfat.com

مولانا گیلانی کے ان خطوط کو پڑھنے کے بعد یقین کرنا پڑتا ہے کہ مولانا میں چھوٹوں کو بنانے اور ابھارنے کی خاص صلاحیت تھی اور اس میں وہ پورے طور پر کامیاب تھے۔ یہ تو معاملہ اس شخص سے تھا جس سے نہ استاذی شاگردی کا تعلق تھا اور نہ نسبی و خاندانی۔ صرف علم دوستی کا تقاضا تھا۔ اس سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ مولانا سے کیسے کیسے لوگوں نے فائدہ اٹھایا ہوگا اور ان سب کے ساتھ مولانا نے اسی طرح کس علمی فیاضی کا سلوک کیا ہوگا۔

دنیا سے بے رغبتی

اس فنانی العلم شخصیت کا حال دنیا سے تقریباً بے تعلقی کا تھا۔ روپے پیسے سے کوئی خاص رغبت نہیں تھی۔ یہ شعبہ مولانا کے چھوٹے بھائی مکارم احسن سے متعلق تھا مولانا کو کھانا' کپڑا اور پان وغیرہ کے اخراجات ملنے چاہئے' پھر جو بچے بچائے اس کے مالک مولانا کے بھائی ہی ہوتے تھے اور جو چاہتے تھے کرتے تھے۔

حضرت مولانا عبدالباری ندوی نے لکھا ہے:

''خدا بھلا کرے ان (مولانا گیلانی) کے چھوٹے بھائی اور بڑے منظم و کارگزار میاں سید مکارم احسن سلمہ کا کہ وہ گیلانی شریف میں کاشت کاری یا باغبانی وغیرہ کے سلسلے میں منصوبے پر منصوبے برابر پیش ہی کرتے رہتے اور مولانا کے معمولی مصارف سے جو کچھ بچتا اور اچھا خاصا بچتا جمع نہ رہنے دیتے بلکہ بارہا قرض تک کی نوبت آجاتی۔ ان منصوبوں میں کچھ اس طرح کے جملے ہوتے ہیں کہ ہماری فلاں زمین کے پاس فلاں زمین بک رہی ہے...... یا مل سکتی ہے' یا بڑے موقع کی ہے۔ مولانا نے غالباً ان کا ایسا ہی کوئی خط دکھایا اور سنا کر فرمایا۔ ''اس سے تو پورا کرۂ ارض ہی ہماری زمین کے پاس آتے آتے گیلانی میں سما جائے گا۔'' (مکاتیب گیلانی، ص ۴۸)

یہ نقل کرنے کے بعد مولانا ندوی لکھتے ہیں:

''پھر بھی ساری دنیا کو خوش رکھنے والے مولانا خود اپنے بھائی کو کیسے ناخوش فرماتے۔'' (ایضاً)

دوسروں کی مالی مدد

مولانا گیلانی کی ایک عمدہ عادت یہ تھی کہ ضرورت مند جب کچھ مانگتا تو حتی الوسع اسے مایوس نہیں کرتے۔ جو کچھ ہوتا ضرور دیتے لیکن دینے کے بعد جو واپس نہیں کرتا اس سے منہ کھول کر طلب بھی نہیں کرتے کہ تم نے اتنی رقم قرض لی تھی اب تک واپس نہیں کی۔

حد یہ ہے کہ جب خود اپنے پاس رقم نہیں ہوتی اور ضرورت مند کہتا کہ فلاں سے لے کر دے دیجئے تو مولانا ایسا بھی کرتے کہ خود قرض لے کر دوسروں کو قرض کے نام پر دیتے اور لینے والے سے طلب کرتے ہوئے شرم محسوس کرتے۔ اگر خود کوئی دے گیا تب تو بہتر ورنہ خود برداشت کرتے۔

Marfat.com

مولانا عبدالباری ندوی نے لکھا ہے:

میرے علم میں ہے کہ مولانا نے کسی کو ہزار پانچسو کی رقم اپنی ضمانت پر کسی سے دلا دی' مگر لینے والے نے ادا نہیں کیا۔ بالآخر مولانا کو اپنی جیب خاص سے ادا کرنا پڑا۔'' (مکاتیب، ص ۴۹)

باوقار سادہ زندگی

حیدر آباد کے قیام کے دوران مولانا گیلانی نے احباب کے مشورہ سے مجبور ہو کر ایک دفعہ کار (موٹر) خرید لی تھی۔ کچھ دنوں اس سے کام لیتے رہے مگر اس زحمت کو نباہ نہیں سکے اور کار فروخت کر دی اور وہی مولویانہ طریقہ رکھا جو پہلے تھا۔

مولانا ندوی نے لکھا ہے:

''یاد رہے کہ دینی جاہ و جلال اور مال میں ان کا سر اللہ تعالیٰ نے اونچے اونچے ہمسروں سے نیچا نہیں رکھا تھا لیکن نمونہ دنیا کی زندگی میں اللھم احینا مسکیناً و امتنا مسلماً کا ہی بنے رہے۔ طالب علمی سے جامعہ عثمانیہ کے شعبہ دینیات کی صدارت تک اس مسکنت میں ذرہ برابر فرق کسی دیکھنے والے نے نہ دیکھا ہوگا۔ بنگلہ میں رہ کر اور موٹر میں چل کر بھی وہ دیو بند کے حجرہ میں رہنے والے اور اس کی گلیوں میں چلنے والے مسکین طالبعلم ہی معلوم ہوتے رہے۔''

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ خستہ حال لوگوں کی طرح رہن سہن تھا بلکہ منشاء یہ ہے کہ دل میں کبر و نخوت کا کبھی شائبہ تک نہیں آیا ورنہ لباس' وضع قطع اور رہن سہن کے اعتبار سے ایک بارعب وجیہ و شکیل پروفیسر اور علم و عمل کے لحاظ سے ایک عالم ربانی نظر آتے تھے۔

مکارم اخلاق

مولانا کے ایک شاگرد رشید نے لکھا ہے:

''مولانا کے فضائل اخلاق میں بے نفسی کو سب سے نمایاں مقام حاصل تھا۔ دوسرے کی غلطی پر خود معافی خواہ ہو جانا' کوئی کھنچنا چاہے تو خود بڑھ کر اس سے قریب ہو جانا' اپنے تسامح کے علم ہو جانے پر علی الاعلان سراپا معذرت بن جانا اپنے دامن کو ہمیشہ طبقاتی ادارتی تعصب سے پاک و صاف رکھنا اور راہ حق میں تحسین و ملامت کی قطعاً پرواہ نہ کرنا مولانا کا شعار تھا۔''

(مقالات احسانی)

مجموعی طور پر مولانا کے مکارم اخلاق بہت بلند تھے۔ اللہ تعالیٰ نے طبیعت بہت ہی مرنجان مرنج عطا کر رکھی

Marfat.com

تھی۔ نام ونمود، شہرت، دنیا طلبی اور دوسرے دنیاوی رذائل سے پاک وصاف تھے۔ نرم خوئی، ملن ساری، دوسرے کے درد اور دکھ میں غم گساری مولانا کے خاص اوصاف تھے۔

جب تک دوسرے آگے نہیں کرتے اس وقت تک خود آگے نہیں ہوتے تھے۔ دوسرے معاصرین کی مدح و ستائش جی بھر کر کرتے تھے۔ ہر اہل علم کے قدرداں تھے۔ غلو اور اظہار برتری مزاج میں قطعاً نہیں تھا۔ اپنے پرایوں کا دھیان بہت تھا۔ اہل خاندان اور رشتہ داروں کا بڑا لحاظ و پاس تھا اور سبھوں کو اچھے حال میں دیکھنا پسند کرتے تھے۔

ظرافت و بذلہ سنجی

مولانا گیلانی میں تمام علمی کمالات کے ساتھ طبیعت میں ظرافت اور بذلہ سنجی بھی تھی۔ ایسے موقع پر چوکتے نہیں تھے۔ حیدرآباد اور وطن دونوں جگہ ایک نہ ایک شخص ایسا رہتا تھا جس سے مولانا خوش طبعی کی باتیں کرتے تھے اور ان کی مالی خدمت بھی کرتے تھے اور آرام وراحت بھی پہنچاتے۔ وطن میں ایک بڑے میاں تھے جو مسجد میں اذان کی خدمت انجام دیتے تھے اور بقیہ وقتوں میں مولانا کی خدمت میں حاضر رہتے۔ تقریباً یہی حال حیدرآباد میں مسجد کے امام کا تھا۔ مولانا عبدالباری ندوی نے لکھا ہے:

> ''مولانا کی زندگی کا ایک اور گوشہ خوش طبعی اور مزاح پسندی کا تھا جو کبھی کبھی مزاح کے حدود سے بہت آگے بڑھ جاتی بلکہ اگر کوئی اس ڈھب کا بُزاخفش ہاتھ لگ جاتا تو اس کو کھلا پلا کر مستقلاً تفریح طبع کا مشق بنائے رکھتے۔ حیدرآباد کے اخیر زمانہ میں ''بُزاخفش'' کا یہ منصب سالہا سال تک خود اپنی مسجد الحی کے امام کو عطا رہا۔'' (مکاتیب گیلانی)

پھر مولانا ندوی نے تفریحی مبارک بادی کا ایک گوشہ بھی نقل کیا ہے جو مولانا نے اپنے ایک دوست کی نئی شادی پر نظم لکھ کر بھیجی تھی۔ اس کے کچھ اشعار وہاں بھی نقل کئے گئے ہیں۔

اپنا خیال ہے کہ دماغی کام کرنے والے کے لئے ایک گھنٹہ تفریح کا بہت ضروری ہے بھی تاکہ ذہنی تھکان دور ہو اور آدمی پھر لکھنے پڑھنے کے لئے تازہ دم ہو جائے۔ مولانا اسی تھکان کے دفع کرنے کے لئے ایک گھنٹہ دماغی تفریح رکھتے تھے۔

غیر علمی کاموں سے بُعد

لکھنے، پڑھنے، تحریر وتقریر اور درس وتدریس کے علاوہ دوسرے غیر علمی کاموں میں مولانا بہت پیچھے تھے۔ کھانے پینے میں جیسا کہ عرض ہوا دوسروں کے رحم وکرم پر رہتے تھے۔ چنا کھا لینا برداشت تھا بازار جانا اور ہوٹل میں گھسنا ان کے بس سے باہر کی بات تھی۔ سفر بھی کبھی تنہا نہیں کرتے تھے۔

مولانا ندوی نے لکھا ہے:

Marfat.com

''باقی مولانا (گیلانی) کا حال تو یہ تھا کہ اگر کھانے پینے کا بھی پورا بندوبست باورچی سے لے کر دستر خوان تک کوئی دوسرا نہ کر کرا دیتا تو فاقہ ہی فرماتے' یا مضطر ہوتے تو بازار کے چنوں دنوں تک قناعت فرمالیتے۔ سفر حج میں یہی سامنے آیا......کھانے کی کسی دوکان یا ہوٹل تک جانے کے اہتمام سے یہی آسان جانتے تھے۔ سفر تنہا بہ مشکل اور شاید ہی کبھی فرماتے۔ سامان تو سامان خود اپنے وجود کی دیکھ بھال دشوار تھی۔'' (مکاتیب، ص ۵۶)

سادگی کا ایک واقعہ

صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے مولانا گیلانی کا ایک واقعہ اپنے مضمون میں درج کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''مولانا دارالمصنفین اعظم گڈھ کی مجلس انتظامیہ کے رکن تو عرصہ سے تھے۔ پنشن پانے کے بعد مجلس عاملہ کے بھی رکن بنائے گئے۔ مارچ ۱۹۵۰ء میں دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کا ایک اہم جلسہ تھا۔ اس میں شرکت کے لئے وہ گیلانی سے اعظم گڈھ تشریف لائے۔ میری مسرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے میری قیام گاہ میں قیام فرمایا۔ اس جلسہ میں مولانا کے علاوہ ڈاکٹر سید محمود' مولانا دریا آبادی اور مولانا عمران خان بھی تشریف لائے تھے۔ جب ہم لوگ ان حضرات کی پیشوائی کے لئے اسٹیشن گئے تو مولانا کی سادگی دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ ان کے ساتھ صرف ایک دری' ایک چادر' ایک تکیہ المونیم کا' ایک لوٹا اور ایک کپڑے میں لپٹے ہوئے ایک دو جوڑے تھے۔ (معارف۔ اپریل ۱۹۵۷ء)

جب مولانا گیلانی کو دارالمصنفین کی رکنیت کی اطلاع پہنچی تو آپ نے سید صاحب کو لکھا:

''یہ دارالمصنفین کی رکنیت کا کیا قصہ ہے سمجھ میں نہیں آیا کہ کس خصوصیت کو میرے اس انتخاب میں دخل ہے' نظر عنایت نگاہ کرم کے سوا اور کس چیز کا تصور کروں۔''

(مکتوب ۳ مارچ ۱۹۴۳ء در: معارف۔ ۶۳ مارچ)

محبت وشفقت

مولانا جس طرح افراد واشخاص کے لئے اپنے دل میں بے پناہ محبت رکھتے تھے اور بوقت ضرورت نوازتے تھے کچھ یہی حال امت مسلمہ کے ساتھ بھی تھا۔ مولانا کے شاگرد غلام محمد صاحب نے لکھا ہے اور بجا لکھا ہے:

''مولانا کے قلب اطہر میں امت محمدیہ کی محبت اور اس پر شفقت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ مسلمانوں کے فلاح سے ایسے مسرور ہوتے تھے کہ جیسے خود ان کو کوئی ذاتی فائدہ پہنچ گیا ہو۔ وہ

Marfat.com

مشرباً پکے حنفی تھے مگر یہ ان کے جذبہ شفقت کا اثر تھا کہ وہ زبانی بھی اور تحریراً بھی اس بات پر بہت زور دیتے تھے کہ موجودہ حالات میں علماء کرام کو عام مسلمانوں کے لئے سہولت کا ہی پہلو اختیار کرنا چاہئے' خواہ اس میں مسلک حنفیہ کو چھوڑ کر کسی اور مسلک کی اقتداء کیوں نہ کرنی پڑے کیونکہ فقہاء کے اجتہاد کو بہر حال منصوصات کا درجہ حاصل نہیں ہے۔''

(مقدمہ مقالات احسانی)

مولانا کی نظر

مولانا نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

''مسلمانوں کے لئے وہ اندلس زیادہ پائیدار ہوتا جس میں خواہ الزہرۃ اور قرطبہ وغرناطہ نہ ہوتے مگر مسلمانوں پر جو فرض آخرالامم ہونے کی حیثیت سے عطا کیا گیا ہے' اگر اس کو وہاں کا حکمران طبقہ پیش نظر رکھتا تو وہ سیاسی مصائب و آفات کے جن گردابوں میں تہہ و بالا ہو کر رہ گئے شاید یہ صورت پیش نہ آتی۔'' (معارف۔ اپریل ۱۹۵۷ء)

مسلمانوں کے حالات سے مولانا کو خاص دلچسپی تھی۔ تقسیم ہند کے بعد جب یہاں مظالم کا کوہ آتش فشاں پھٹ پڑا تھا......اور لوگوں پر مایوسی طاری تھی' صباح الدین صاحب نے لکھا ہے کہ جب ان کا ذکر آیا تو مولانا نے بڑے اذعان و یقین کے ساتھ فرمایا:

''میں ہندوستان کے مسلمانوں کا مستقبل روشن پاتا ہوں...... پاکستان کے مسلمان اپنے نئے ماحول میں کیا ہو جائیں گے اللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن ہندوستان کے مسلمانوں پر نئے ماحول کا جو ردعمل ہوگا وہ نظر میں امید افزا ہے۔ ان میں مذہبی احساسات اور ملّی جذبات کی بناء پر غیر شعوری طور سے پوری قوت مدافعت موجود ہے جو ہر زمانہ میں برقرار رہے گی۔ مسلمانوں نے اپنی انفرادیت باقی رکھی۔ ان کی مذہبی غیرت وحمیت میں بڑا استحکام ہے جو کمزور تو ہو سکتا ہے ختم نہیں ہو سکتا۔'' (ایضاً)

خودداری

حیدر آباد میں مولانا عرصہ تک ملازم رہے۔ وہاں کے واعظ شہر بھی تھے۔ حضور نظام آپ کی تقریر بہت شوق سے چھپ کر سنتے تھے۔ مولانا کے علم میں یہ بات تھی مگر خصوصی ملاقات کی کبھی سعی نہیں کی خود اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

''حضور نظام سے ملازمت کی تیس سالہ مدت میں خصوصی ملاقات کا موقع کبھی نہیں پیدا کیا گیا البتہ سالگرہ وغیرہ بعض خاص جشن کے دنوں میں دوسرے نوکروں کے ساتھ پیش کشی نذر کے لئے حاضری ہو جاتی تھی۔'' (الفرقان۔شعبان رمضان ۱۳۶۹ھ)

یہ تھی مولانا کی خودداری اور عزت نفس کی پاسداری۔ اللہ تعالیٰ نے اس جذبہ کو پوری زندگی نباہ دیا' عالمانہ وقار میں کبھی فرق نہیں آنے پایا۔

اساتذہ کی اطاعت

مولانا گیلانی اپنے اساتذہ کا بڑا احترام فرماتے تھے اور سخت سے سخت وقت پر بھی ان کے حکم سے سرتابی کی جرأت نہیں کرتے اور نہ بہانے تلاش کرتے تھے بلکہ فوراً تعمیل حکم کے لئے حاضر ہو جاتے۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا اور اس کے صدقہ میں ایک نئی مسلم مملکت وجود میں آئی جو پاکستان کے نام سے موسوم ہوئی۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمتہ اللہ علیہ نے چاہا کہ یہاں اسلامی دستور نافذ ہو۔ اس اسلامی دستور کے مرتب کرنے کے لئے بہت سے علماء کو مولانا عثمانی نے کراچی میں جمع کرنے کی سعی فرمائی۔ ان میں حضرت مولانا گیلانی کا بھی نام تھا۔ اس وقت حالات سازگار نہ تھے مگر اساتذہ محترم کے حکم کے خلاف کسی بہانہ کی جرأت نہیں فرمائی بلکہ فوراً تشریف لے گئے۔

دستور اسلامی کی ترتیب میں شرکت

مولانا نے خود اپنے ایک خط میں جو علامہ سید سلیمان ندوی کے نام ہے...... لکھتے ہیں:

'' آپ کے ارادہ عدم شرکت سے مطلع ہونے کے بعد خاکسار نے بھی قطعی فیصلہ کراچی نہ جانے کا کر لیا تھا لیکن مولانا عثمانی کی طرف سے تار اور خطوط کے تسلسل نے فسخ عزم کو انسب خیال کیا۔ ان سے تلمذ کی نسبت رکھتے ہوئے دل نے آگے بڑھنے کی اجازت نہ دی۔ ڈاکٹر حمید اللہ کو ساتھ لے کر حیدر آباد سے اُڑے۔ پانچ ساڑھے پانچ گھنٹے میں کراچی کے مطار پر اتار دیا گیا۔ سولہ دن قیام رہا۔ باہر سے ان دو دکنی فقیروں کے سوا صرف مفتی شفیع صاحب تشریف لا سکے...... بحث و مباحثہ کے بعد آخری شکل میں اس کو قلم بند کر کے مجلس کے حوالہ کر کے ہم لوگ چلے آئے۔'' (مکتوب بنام سید سلیمان ندوی۔ ۲۳ جون ۱۹۴۸ء۔ معارف' ماہ جون ۱۹۶۳ء)

اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ پاکستان کے دستور اسلامی میں مولانا گیلانی کا خاصہ حصہ ہے اور دوسری بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ مولانا عثمانیؒ کو مولانا گیلانی کے علم و فضل پر اس باب میں بڑا اعتماد تھا اور اس میں تو شبہ نہیں کہ مولانا میں مختلف صلاحیتیں تھیں اور قرآن و حدیث اور فقہ پر کافی وسیع نظر رکھتے تھے اور ذہانت و ذکاوت کی دولت سے مالا مال تھے۔

Marfat.com

بیماری اور وفات

عرض کیا جا چکا ہے کہ ریٹائر ہونے کے بعد مولانا گیلانی حیدر آباد سے اپنے وطن گیلانی ضلع پٹنہ تشریف لے آئے اور مستقل طور پر یہیں قیام پذیر ہو گئے۔ یہاں اپنی بیٹھک میں لکھنے پڑھنے کا سامان فراہم کر لیا۔ بقدرِ ضرورت کتابیں یہاں الماریوں میں رکھوالیں۔ صبح سے عشاء کی نماز تک بیٹھک ہی میں قیام رہتا۔ دن کا ناشتہ اور رات کا کھانا یہیں تناول فرماتے۔ عشاء کی نماز با جماعت مسجد میں ادا کر کے اندر گھر میں تشریف لے جاتے ورنہ اکثر تنہا لکھنے پڑھنے میں منہمک رہتے۔

اس قیام میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ کے اصرار پر سوانح قاسمی کی تالیف کی ذمہ داری قبول فرمائی تھی۔ دوسرے علمی کاموں کے ساتھ جب طبیعت میں نشاط ہوتا، ''سوانح قاسمی'' کے لکھنے میں مشغول ہو جاتے۔ فرماتے تھے کہ درس سے فراغت کے بعد میری عملی زندگی رسالہ ''القاسم'' دیوبند سے شروع ہوئی تھی، خاتمہ ''سوانح قاسمی'' کی خدمت پر ہوگا۔

''سوانح قاسمی'' کی تالیف

خاکسار کے نام اپنے ایک گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی فرمائش اور اصرار سے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی سیرت طیبہ کی تدوین میں آج کل مشغول ہوں۔ طبیعت جب اچھی رہتی ہے۔ تھوڑا تھوڑا کر کے لکھ لیتا ہوں۔ کئی دن ہوئے مولانا موصوف تشریف لائے تھے۔ عزت افزائی فرمائی۔'' (۲۸ دسمبر ۱۹۴۹ء بنام محمد ظفیر الدین)

مولانا کی صحت بہت پہلے سے کمزور چل رہی تھی اور پھر پیری نے رہی سہی کسر پوری کر دی تھی لیکن ہمت ہارنا نہیں جانتے تھے۔ آپ کو علمی زندگی محبوب تھی۔ دل اسی سے بہلتا تھا۔ خود لکھتے ہیں:

> ''فقیر اپنا حال کیا لکھے۔ ''صورت بہ بیں حالت مپرس۔'' پیرانہ سری خود ایک مستقل مرض ہے تاہم تھوڑا بہت کام جو ہو سکتا ہے کرتا رہتا ہوں۔ سیدنا الامام الکبیر مولانا النانوتوی قدس سرہ کی تدوین حیات آج کل فقیر کا اہم مشغلہ ہے۔'' (۲۴ مارچ ۱۹۵۰ء بنام ظفیر الدین)

مختلف رسائل کے لیے مضامین بھی برابر لکھتے رہتے تھے۔ تدوین حدیث کا سلسلہ بھی جاری تھا اور ''مجالس الشیخین'' کا بھی مگر انہماک ''سوانح قاسمی'' کے ساتھ تھا اور اسے اپنے لئے ایک بڑی سعادت یقین فرماتے تھے۔ ایک مکتوب گرامی میں لکھا ہے:

''دعا فرمایئے کہ یہ آخری کام (سوانح قاسمی) کا اس بندہ ضعیف جہول وظلوم سے بن آئے اور اسی کو لے کر مغفرت کی سند کے ساتھ اصل وطن کے طرف واپسی بخیر و عافیت میسر آئے۔ زیادہ خیال اب اپنے اسی مرجع کا ہے جہاں سے کچھ دنوں پہلے اس خاک دان ارض پر ٹپکایا گیا تھا۔''
(مکتوب گرامی بنام ظفیر، ۱۱ستمبر ۱۹۵۱ء)

دمہ کا حملہ

اپنی صحت کے متعلق تحریر فرمایا:

''یکے بعد دیگرے صحت پر مختلف قسم کے حملے ہوتے رہے۔ کبھی سینے کا درد کبھی معدے کی خرابی تا آنکہ اب ادھر پندرہ بیس دنوں سے تنفس کا بھی قدیم مرض جس کے متعلق خیال تھا کہ ختم ہو چکا اچانک حملہ ہو گیا۔'' (۲۹ دسمبر ۱۹۵۲ء، بنام ظفیر الدین)

بڑھاپے کی کمزوری کیا کم تھی کہ اس پر تنفس کے مرض نے اپنے حملہ سے آپ کی رہی سہی قوت کھودی اور نشاط وانبساط جاتا رہا اور پوری سردی کے لئے صاحب فراش بنا دیا۔ اپنے دوسرے مکتوب گرامی میں تفصیل لکھی۔

''موسم سرما کی شدت نے میرے قدیم مرض تنفس اور دمہ کو پندرہ سولہ سال بعد زندہ کر دیا۔ ایک ماہ علاج و معالجہ انجکشن وغیرہ کے بعد کچھ افاقہ کی صورت ہوئی لیکن یہ افاقہ بھی دیرپا ثابت نہ ہوا۔ پندرہ سولہ روز کے بعد پھر حملہ ہوا اور شدید حملہ ہوا۔ حملہ کے دنوں میں ایک قدم چلنا بھی ناممکن ہو جاتا ہے۔ دو اڑھائی مہینے سے مسجد کی حاضری سے بھی محروم کر دیا گیا تھا۔''
(۲۸ مارچ ۱۹۵۳ء، بنام محمد ظفیر الدین)

وجع الفواد

اس مرض نے نڈھال کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں بعد دل کا دورہ پڑ گیا۔ کافی علاج کے بعد کچھ سنبھلے۔ اس کا تذکرہ بھی آپ نے اپنے ایک خط میں کیا ہے' لکھتے ہیں۔

''رمضان المبارک سے پہلے درد سینہ کہئے یا وجع الفواد کا ایک شدید حملہ پھر ہو گیا تھا لیکن الموت جُنة للموت وقت سے پہلے آنے سے رہی۔'' (۱۳ جون ۱۹۵۳ء بنام محمد ظفیر الدین)

اس طرح مولانا اخیر کے دو تین سالوں میں برابر بیمار ہی رہے مگر خطوط کے جواب لکھ دیا کرتے تھے ممانعت کے باوجود جی بہلانے کے لئے نئی کتابیں بھی پڑھ لیتے تھے اور اپنی رائے بھی لکھ دیا کرتے تھے۔ اصلاح و تصحیح کی خدمت سے بھی حتی الوسع گریز نہیں فرماتے تھے۔

مشاغل

ان حالات میں اگر کوئی اہل علم پہنچ جاتا تو پھر باغ و بہار بن جاتے اور علمی گفتگو چھیڑ دیا کرتے تھے۔ مولانا زندہ دل مولوی تھے' خشک نہیں تھے۔ تلاوت قرآن اور اذکار و اشغال کے پابند تھے۔ علمی رسائل کے ذمہ دار عام طور پر اصرار کرتے کہ کوئی مضمون بھیج دیا جائے تو ان کی یہ فرمائش بھی پوری کرتے۔

البتہ جب مرض بالکل صاحب فراش کر دیتا اور ڈاکٹروں کی طرف سے پہرا بٹھا دیا جاتا تو یقیناً مجبور ہو جاتے اور بدرجہ مجبوری لکھنا پڑھنا بند فرما دیتے تھے۔

اسی زمانہ میں ''سوانح قاسمی'' کی تین جلد آپ نے کئی سو صفحات میں لکھیں۔ تدوین حدیث کی تکمیل کی اور پھر اسے مرتب کر کے طباعت کے لئے دیا۔

''مقالات احسانی'' کے کئی مقالات اسی دور بیماری میں مختلف رسالوں میں لکھ کر شائع کرائے جسے بعد میں آپ کے شاگرد غلام محمد صاحب نے مرتب کر کے پاکستان سے شائع کیا۔

اس بیماری میں مختلف اہل علم کے خطوط کے جواب میں سینکڑوں خطوط لکھے اور اپنے خطوط سے ان کی علمی دینی رہنمائی کا فریضہ ادا کیا۔ خطوط عام طور پر مفصل اور لمبے لکھا کرتے تھے اور بہت ہی معلومات افزا جو دوسروں کے لئے نشان راہ کا کام کر دیا کرتے تھے۔

بغرض علاج پٹنہ

نومبر ۱۹۵۳ء میں حضرت گیلانی پر دل کا حملہ ہوا اور پھر اس نے مستقل مرض کی شکل اختیار کر لی۔ مارچ ۱۹۵۴ء میں دل کا دوبارہ سخت دورہ پڑا جس سے جینے کی امید جاتی رہی لیکن گھر والوں نے پوری جاں فشانی سے علاج کیا کرایا۔ گیلانی سے اٹھا کر پٹنہ ہسپتال میں لے گئے اور علاج میں بڑی جدوجہد کی گئی۔ پٹنہ میں مولانا کے معالج دل کے مشہور ڈاکٹر' ڈاکٹر احمد عبدالحئی صاحب مرحوم تھے۔

جب ذرا اطمینان ہوا تو پٹنہ سے پھر گیلانی تشریف لے آئے۔ لکھنے پڑھنے پر ڈاکٹروں کے مشورہ سے پابندی عائد ہو چکی تھی۔ اس کی قطعاً ممانعت تھی' کمرہ میں حسرت کے ساتھ کتابوں پر نظر ڈالتے جو سامنے الماریوں میں لگی ہوئی تھیں البتہ خطوط کبھی کبھی لکھ لیا کرتے تھے اس زمانہ میں صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب مدیر ''معارف'' دارالمصنفین اعظم گڈھ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''آپ کا یہ مریض المسمّی بہ مناظر احسن گیلانی نہ اب تک مرا ہے اور نہ اچھے ہونے کی بشارت سنا سکتا ہے۔ اسی حال میں مگن ہے جس حال میں رکھا گیا ہے۔'' (مکتوب مئی ۱۹۵۶ء)

موت کی تیاری

محترم صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے لکھا ہے کہ جب وہ مئی ۱۹۵۶ء میں مولانا گیلانی کی خدمت میں

گیلانی حاضر ہوئے تو دیکھا کہ مولانا کافی نحیف و کمزور ہو چکے ہیں۔ دونوں پاؤں پر سوجن کے آثار ہیں۔ پہلی ہی ملاقات میں مولانا نے فرمایا "خوب آ گئے" اب چل چلاؤ ہے" یہ بھی فرمایا" گیلانی بہت عزیز ہے" اس لئے یہیں پڑا ہوا ہوں۔"

صباح الدین صاحب لکھتے ہیں جب میں رخصت ہونے لگا تو میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر فرمایا کہ اب یہ پڑھتا رہتا ہوں۔

دل نہیں لگتا تو کیوں گھبراؤ شاؔد — جی چکے بس تا بکے مرجاؤ شاؔد
منہ نہ پھیرو اس نگاہ مست سے — برچھیاں سینے پہ تن کر کھاؤ شاؔد
میں نے مانا بخشوالوگے گناہ — اور نہ جو اس کی بھی مہلت پاؤ شاؔد
خط شوق اپنا لفافہ میں رکھو — آرزوؤں کو کفن پہناؤ شاؔد
دے چکی اک عمر تک دنیا فریب — اب نہ اس کے دھوکے کے اندر آؤ شاؔد

یہ اشعار مولانا نے بڑی مسرت اور شادمانی کے انداز میں سنائے۔

اتفاق سے ایسا ہوا کہ خاکسار (ظفیر) سانحہ سے (جہاں ان دنوں دارالعلوم معینیہ ضلع مونگیر میں صدر مدرس تھا) حضرت مولانا گیلانی کا حال سن کر مونگیر آیا اور پھر ۵ جون ۱۹۵۶ء کو بعجلت وہاں سے ٹرین پکڑ کر شیخ پورہ پہنچا اور وہاں سے بس کے ذریعہ بربیگھہ کوئی بارہ بجے دن میں آ گیا مگر ایک صاحب جان پہچان کے مل گئے۔ کہنے لگے بڑی تیز دھوپ ہے یہیں آرام کرو۔ عصر کے وقت ٹہلتے ہوئے گیلانی چلے جانا۔ تھکا ہوا تھا ہی' کھانا کھا کر لیٹ گیا۔ عصر کی نماز کے لئے جب مسجد میں داخل ہونے لگا تو ایک نمازی نے سنایا کہ آج صبح مولانا گیلانی کی وفات ہوگئی۔ یہ سننا تھا کہ آبدیدہ ہوگیا اور نماز پڑھ کر گیلانی بھاگا۔ دیکھا لوگ قبرستان سے واپس ہورہے ہیں۔ اپنی محرومی پر بہت پچھتایا' اگر دوپہر میں وہاں نہیں ٹھہرا ہوتا تو کم از کم زیارت تو ہو ہی جاتی اور جنازے میں بھی شریک رہتا مگر قسمت میں یہ نعمت لکھی نہیں تھی۔

سب سے پہلے قبر پر حاضر ہوکر سلام بجالایا۔ دیدہ نم کے ساتھ فاتحہ پڑھی۔ دیر تک غمزدہ وہاں کھڑا رہا۔ پرانی یادیں اور مولانا کی باتیں ذہن میں گونجنے لگیں۔ وہاں سے مولانا کی بیٹھک میں آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ساری فضا سوگوار ہے۔ گاؤں میں سناٹا چھایا ہوا ہے۔ مولانا جس حمائل شریف میں تلاوت کرتے تھے صبح اٹھا کر دیکھا تو اس میں بہت ساری نصیحتیں مولانا نے لکھ رکھی تھیں۔ جستہ جستہ اپنے حالات بھی لکھ رکھے تھے۔ اسے نقل کیا' جو کسی صاحب نے پڑھنے کے لیے لیا تو پھر واپس نہیں کیا۔

پھر مولانا کے گھر والوں نے وہ ساری کیفیت بتائی جو گزشتہ رات مولانا پر گزری تھی جس کی تھوڑی تفصیل صباح الدین صاحب نے اپنے مضمون میں دی ہے اور کچھ "صدق جدید" لکھنؤ میں شائع ہوئی ہے۔

صباح الدین صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ مولانا کے منجھلے بھائی مکارم میاں رو رو کر بیان کرنے لگے:

"بھائی صاحب مرحوم ادھر کئی دن سے بہت اچھے تھے' گزشتہ رات اور بھی زیادہ خوش تھے۔

رات کے گیارہ بجے تک قوالی کی دھن میں کچھ غزلیں پڑھوا کر سنتے اور ہر شخص سے لطف و محبت کی باتیں کرتے رہے۔ بارہ بجے ان کو آرام کرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ ان کو دیر تک نیند نہیں آئی مگر پھر سو گئے۔ صبح سویرے اٹھے' وضو کیا۔ کھڑے ہو کر فجر کی نماز ادا کی۔ وظیفہ پڑھا' پھر پلنگ پر آ کر لیٹ گئے۔ ملازم سے کہا رات نیند کم آئی تھی اس لئے چادر اڑھا دو' سوؤنگا۔ سوئے تو ابدی نیند سو گئے اور جب ہم لوگوں نے سانس رُکتے ہوئے دیکھا تو ان کا چہرہ جوانوں کی طرح شگفتہ اور شاداب تھا۔'' (معارف۔ اپریل ۱۹۵۷ء)

۵ جون ۱۹۵۶ء مطابق ۲۵ شوال ۱۳۷۵ھ بوقت سات بجے صبح داعی اجل کو لبیک کہا اور رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ بعد نماز ظہر نماز جنازہ ادا کی گئی جس میں آس پاس کے تمام مسلمانوں نے شرکت کی۔ نماز جنازہ اس علاقہ کے ممتاز عالم دین حضرت مولانا سید فصیح احمد استھانوی نے پڑھائی اور اپنے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کر دیئے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

صباح الدین صاحب نے اپنے مضمون میں مولانا کی تحریر نقل کی ہے' جو آپ نے ۱۰ اپریل ۱۹۵۲ء کو مناجات مقبول پر لکھ رکھی تھی۔ وہ تحریر یہ ہے:

''یکایک سونے کے وقت رات کو قرآنی آیت اللہ یتوفی الانفس حین موتھا والتی لم تمت فی منامھا فیمسک التی قضیٰ علیھا الموت ویرسل الاخریٰ الیٰ اجل مسمّٰی۔'' کا خیال آیا۔ عجیب بات ہے کہ آخر فرما ہی دیا گیا ان فی ذلک لآیات لقوم یتفکرون' مگر سمجھ میں نہیں آیا کہ مسلمان میں سکرات موت کے متعلق طرح طرح کی روایتیں کیوں مشہور ہوگئی ہیں حالانکہ اس نص قطعی میں صاف طور پر اعلان کر دیا گیا ہے کہ نیند جیسے آتی ہے موت بھی اسی طرح آتی ہے۔ نیند آنے میں سونے والوں کو تکلیف کب ہوتی ہے پھر موت میں تکلیف کا تصور عجیب ہے۔ ہمارے استاذ مولانا فراہی سکرۃ الموت کے لفظ سے نتیجہ نکالا کرتے تھے عند الموت مرنے والے پر نشہ کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ حضرت تھانویؒ نے امام غزالیؒ کی ان روایتوں کی تنقید کرائی تھی جس سے موت کے شدائد پر امام نے ''احیاء العلوم'' میں استدلال کیا ہے۔'' (معارف۔ اپریل ۱۹۵۷ء)

مولانا کے شاگرد غلام محمد صاحب نے ''صدق جدید'' (لکھنؤ مورخہ ۲۱ ستمبر ۱۹۵۶ء) کے حوالہ سے لکھا ہے:

''حضرت گیلانی کی حسی کرامات زندگی میں خواہ نہ دیکھی گئی ہو۔ مگر اس عالم ناسوت سے جاتے ہوئے انہوں نے عقلیت کے ماروں اور روحانیت کے بے خبروں کے لئے عجیب کرشمہ دکھایا۔ ......مکارم احسن (مولانا کے چھوٹے بھائی) کا بیان ہے کہ مرض الموت میں اکثر یہ فرماتے تھے کہ جنت میں کوئی بوڑھا نہ جائے گا۔ ہر شخص جوان ہو کر جائے گا چنانچہ جیسے جیسے وہ اپنے وقت

Marfat.com

موعود سے قریب جاتے جارہے تھے ان میں جوش و مسرت بڑھتا جارہا تھا یہاں تک کہ جس رات سفر آخرت طے تھا اس میں تو فرط انبساط سے بے قابو ہوتے جارہے تھے اور اسی عالم فرحت میں بظاہر سو بھی گئے۔ جب صبح ان کی روح پرواز کرچکی تھی تو چہرہ پر گوشت تروتازہ تھا۔ سفید داڑھی بالکل سیاہ تھی اور لاغر و نزار جسم بالکل گداز تھا۔ اس منظر کو مکارم احسن صاحب ہی نے نہیں دیکھا بلکہ ہر شریک جنازہ نے حیرت کی آنکھ سے دیکھا اور اس میں لذت روحانی محسوس کی۔ مولانا کے جنتی ہونے کی اس سے زیادہ واضح نشانی اور کیا ہوسکتی ہے۔

مرگ مجنوں پر عقل گم ہے میر
کیا دوانے نے موت پائی ہے''

(مقالات احسانی)

مولانا گیلانی کی وفات پر دنیائے علم میں کہرام مچ گیا۔ تمام اہل قلم نے تعزیتی نوٹ لکھے اور آپ کی خدمت دین کا بھرپور اعتراف کیا۔ مولانا اکبرآبادی نے رسالہ ''برہان'' (دہلی) کے نظرات میں لکھا:

''وادریغا! جو خامہ گوہر فشاں چالیس برس تک اسلامی علوم وفنون کے انمول موتی صفحہ قرطاس پر بکھیرتا لٹاتا رہا' گزشتہ ماہ جون کی ایک صبح کو یک بیک خاموش ہوگیا۔ وہ مسیحا نفس جو اپنے نفوس قدسیہ سے اسلامی احساس وفکر کے تن بے جان کے عروق مردہ میں زندگی کا نیا اور تازہ خون دوڑاتا رہا۔ ابن قیم کا وہ پیک خجستہ گو جولب اعجاز سے قال اللہ قال الرسول کا پیام حق التیام ایک عرصہ تک جھوم جھوم کر سناتا رہا' علم وفضل' عمل وکردار اور اخلاق وشمائل کا پیکر حسین جو اس عہد میں اسلام کی چہاردہ صد سالہ تاریخ کی آبرو تھا اور جس کا نفس نفس گلبن کی عطر آفرینیوں کا امین و راز داں تھا۔ اچانک خاک لحد کی امانت ہوگیا۔ ملت بیضا کی ایک متاع گراں مایہ لٹ گئی۔ بزم انس وقدس کا چراغ فروزاں بجھ گیا یعنی حبرامت مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے اس عالم آب وگل کو خیرباد کہہ کر عالم آخرت کی راہ لی' انا للہ وانا الیہ راجعون۔''

(برہان (دہلی) جنوری ۱۹۵۷ء)

''برہان'' دہلی کا یہ نظرات لمبا اور جامع ہے یہاں اس کا صرف ایک حصہ نقل کیا گیا ہے...... سدا رہے نام اللہ کا۔

مولانا گیلانی کی رحلت پر ہندو پاک کے تقریباً تمام ہی اخبارات ورسائل نے تعزیتی نوٹ لکھے اور سبھوں نے آپ کی جلالت علمی کا اعتراف کیا اور خراج عقیدت ومحبت پیش کیا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے اخبار ''صدق جدید'' میں لکھا ہے:

''جو کل تک کے ہر غم زدہ کے لئے مجسم تسکین وتشفی تھا خود اس کے غم میں کون اور کس کو تسلی

Marfat.com

دے؟ جو کل تک ہمہ تازگی و زندگی' ہمہ جودت و ذہانت تھا کس طرح یقین آئے کہ آج اس کا جسم خاکی زیرِ زمین پہنچ چکا ہے۔

فاضل گرامی حضرت مولانا سید مناصر احسن گیلانی' آہ کہ ان کے نام کے ساتھ بجائے مدظلہ العالی کے آج کس طرح مرحوم یا نوّر اللہ مرقدہ یا رحمۃ اللہ علیہ لکھا جائے' گو زبان و قلم کچھ روز بعد اسی کے عادی ہو جائیں گے دورِ حاضر کے طبقہ علماء کے خواص میں نہیں۔

اخص الخواص میں تھے......عقائد اہل سنت میں پختگی۔ دیوبندی تعلیم و تربیت کی کھلی ہوئی برکت تھی۔ پھر جامعہ عثمانیہ میں بحیثیت استاذ کے برسوں جو انگریزی خواں طلبہ اور اعلیٰ ڈگریاں رکھنے والے استاذوں سے یکجائی رہی اس نے علوم جدیدہ اور مسائل حاضرہ سے بھی انہیں پوری طرح باخبر کر دیا تھا اور خیالات میں وسعت اور رواداری اس کا قدرتی نتیجہ تھی۔ خوش عقیدگی اور روشن خیالی و رسوخ فی الدین اور رواداری کی ایسی جامعیت کی نظیر کہیں اور شاید ہی مل سکے؟''

(وفیات ماجدی، ص ۷۶)

حلیہ و لباس اور اولاد

مولانا گیلانی وجیہ و شکیل اور نورانی شکل و صورت کے مالک تھے۔ نہ زیادہ لمبے تھے نہ بہت چھوٹے قد کے۔ نہ موٹے تھے اور نہ بالکل دبلے پتلے۔ قد درمیانہ تھا۔ رنگ سپید و سرخ تھا۔ چہرہ گول ماہتابی' رخساروں پر ہلکی خوبصورت سپید داڑھی' نہ زیادہ گنجان تھی اور نہ بالکل چھدری' پیشانی کشادہ' آنکھیں روشن نہ زیادہ بڑی اور نہ چھوٹی' رہن سہن سادہ لیکن سادگی میں ایک دلفریب جاذبیت۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا ہے:

''بڑے ہنس مکھ' وجیہ' شکیل' نرم مزاج' نرم رو اور چہرے پر داڑھی تو خاص طور پر ملائم و خوشنما' بال ریشم کی طرح نرم اور چہرے پر خشونت و کرختگی کہیں نام کو نہیں۔ (معاصرین، ص ۱۸۲)

رفتار و گفتار

بیٹھتے وقت عام طور پر آنکھیں بند رکھتے اور سر کو جھکائے رہتے تھے مگر جب بولنے پر آتے تو بے تحاشا بولتے جاتے اور ایسا معلوم ہوتا کہ منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ گفتگو میں شگفتگی اور روانی ہوتی تھی۔ ہر ہر جملہ سے ذکاوت و ذہانت ٹپکتی معلوم ہوتی۔ مخاطب بہت جلد مولانا سے مرعوب ہو جاتا اور ہمہ تن متوجہ ہو کر ان کی باتوں سے لطف اندوز

Marfat.com

ہوتا۔ چلنے میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے' مگر تیز چلتے' سست رفتاری کبھی دیکھی نہ گئی۔ ایسے قدم اٹھتے تھے کہ ایڑی برائے نام ٹکنے پاتی۔ سارا زور پنجوں پر پڑتا تھا۔ چلتے ہوئے نظریں نیچی ہوتی تھیں مگر بڑے پُر وقار طور پر چلتے تھے۔ چہرہ مہرہ سے عالمانہ شان جھلکتی تھی۔

مولانا کا لباس

لباس مولانا کا عام طور پر سفید اور سادہ ہوا کرتا تھا۔ بدن پر کُرتا پائجامہ اور شیروانی ہوتی اور سر پر پنج گوشہ ٹوپی۔ کبھی ترکی ٹوپی اوڑھ لیا کرتے تھے کبھی کبھی عمامہ بھی باندھتے تھے۔ سیاہ عمامہ مولانا کو بہت زیب دیتا تھا۔ پائجامہ ہمیشہ تنگ مہری کا پہنا کرتے تھے جو اعلانیہ ٹخنوں سے اُونچا ہوتا تھا۔ پاؤں میں عام طور پر سلیم شاہی جوتا استعمال کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی پمپ شو بھی پہن لیا کرتے تھے۔ شانہ پر عربی رومال بھی کبھی کبھی ڈال لیا کرتے تھے۔

لباس نہ زیادہ قیمتی ہوا کرتا تھا اور نہ گھٹیا بلکہ درمیانہ قیمت کا ہوتا تھا۔ صفائی ستھرائی کا خاص خیال رکھا کرتے تھے۔ کرتا عام طور پر موٹے ململ یا اچھے پاپلین کا مگر عمدہ بناوٹ کا ہوتا تھا اور پائجامہ لٹھے کا۔

انداز گفتگو و تخاطب

بناؤ سنگھار کا کبھی شوق نہ ہوا۔ طبیعت فطری طور پر سادہ پائی تھی۔ غصہ تقریباً نہیں آتا تھا۔ خندہ جبیں رہا کرتے تھے اور بات کرتے ہوئے ہنستے ہنساتے رہتے۔ چٹکلے بڑے دلچسپ ہوتے تھے۔ اظہار حق میں تحسین و ملامت کی قطعاً پروا نہیں کرتے تھے بلکہ اس معاملہ میں بے نیازی کی شان رکھتے تھے۔ واقعہ بیان کرنے کا انداز بڑا دلچسپ اور شگفتہ ہوا کرتا تھا۔ زبان میں مٹھاس تھی۔ زبان پر کبھی کبر و غرور کے جملے بھولے سے بھی نہیں آتے تھے۔ سبھوں کا احترام کرتے' تنقید و تبصرہ کی عادت نہیں تھی۔ ادب و احترام اور شفقت و محبت کا بڑا پاس و لحاظ تھا۔

چھوٹوں کے ساتھ بڑی شفقت و محبت سے پیش آتے۔ معاصرین کا تذکرہ بڑی محبت سے کرتے اور ان کو ان کا حق دینے میں کبھی بخل نہیں کرتے تھے۔ طبیعت کینہ' بغض' حسد اور اس طرح کے دوسرے رذائل سے قطعاً پاک تھی۔ ایک دفعہ ملاقات کے بعد کوئی آپ کو فراموش نہیں کر سکتا تھا۔

دوسروں کو علمی فائدہ پہنچانے میں عام مولویوں کی طرح بخیل نہیں تھے بلکہ کہنا چاہیے ضرورت سے زیادہ سخی تھے اور تکلف و تصنع سے کوسوں دور تھے اگر کسی میں ذرا بھی صلاحیت پاتے۔ اس کی خوب حوصلہ افزائی فرماتے۔ کوئی کسی عنوان پر رہنمائی چاہتا تو بہت ساری کتابوں کے نام لکھ کر بھیجتے اور نشاندہی فرماتے کہ یہ مضمون فلاں فلاں کتابوں میں دیکھیں۔

مولانا گیلانی کی اولاد

مولانا گیلانی نے جب تعلیمی سلسلہ (درسیات) کی تکمیل کر لی تو گھر والوں کو آپ کی شادی کی فکر ہوئی۔ جیسا کہ ہر شریف خاندان کا رواج ہے آپ کا رشتہ اپنے گاؤں میں داروغہ نظیر کی صاحب زادی سے طے پایا اور سادہ طریقہ پر آپ کی شادی انجام پا گئی۔ کب ہوئی؟ کس سن میں ہوئی اب تک معلوم نہیں ہو سکا ہے۔

Marfat.com

مولانا کی کل دو اولاد زندہ رہی۔ ایک لڑکا جن کا نام سید محی الدین آپ نے تجویز کیا تھا اور ایک صاحب زادی جس کی شادی اپنے بھتیجے سید صلاح الدین سلمہ، سے کی۔ صلاح الدین صاحب کے کئی بچے اور بچیاں ہیں۔ اسی طرح محی الدین کی بھی کئی اولاد ہیں۔

محی الدین یہاں سے ایم اے کر کے پاکستان چلے گئے تھے۔ وہاں کسی بڑے عہدہ پر فائز ہوئے۔ یہ بھی صاحب اولاد ہوئے' مولانا کی زندگی میں ان کے بچے گیلانی آئے تھے۔ مولانا کو اپنے پوتوں سے بڑا قلبی لگاؤ تھا۔

مولانا کے انتقال کے کئی سال بعد مولانا کے صاحب زادے کا بھی پاکستان میں ہی انتقال ہو گیا البتہ مولانا کے پوتے پاکستان میں رہ رہے ہیں اور آپ کی صاحبزادی صاحبہ اپنے بچوں سمیت اپنے وطن گیلانی میں ہی قیام پذیر ہیں۔

بعض مسائل میں مولانا کے مخصوص رجحانات

حضرت مولانا گیلانی اپنے ذہن وفکر اور ذکاوت وفطانت میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ احکام ومسائل میں نظر وسیع بھی تھی اور عمیق بھی۔ معقول ومنقول دونوں علوم میں امتیاز رکھتے تھے اور قدیم وجدید دونوں مکتب فکر سے آپ کا تعلق تھا اس لئے مولانا کتاب وسنت سے جو نتائج اخذ کرتے تھے اور مسائل پر جس وسعت نظری سے غور فرماتے تھے وہ ان کا علمی حق تھا۔

دوسری بات یہ تھی کہ مولانا کا ذہن جامد' ضرورت سے زیادہ مقلد اور قانع نہیں تھا نہ مولانا نے اپنے ذہن پر کوئی آہنی دیوار کھینچ رکھی تھی کہ فلاں سرحد سے آگے سوچنے کا حق نہیں۔ علم وفہم کا بھی تقاضا تھا کہ اگر کسی باب میں ان کی رائے اپنے زمانہ کے علماء سے مختلف ہو تو وہ اسے سنجیدہ پیرایہ میں علماء کی خدمت میں پیش کر دیں تا کہ دوسروں کو بھی غور کرنے کا موقع ملے۔

چنانچہ مولانا نے چند مسائل میں اپنے ان رجحانات کو برملا ظاہر فرمایا جو عام مسلمانوں کے ذوق کے خلاف تھا گو ان کو اپنی رائے پر اصرار بھی نہ تھا۔ مخالف آراء کو بہت غور سے سنتے اور پڑھتے تھے اور جو اشکال پیدا ہوتا اسے دوبارہ حل کرنے کی سعی کرتے تھے۔

ان مسائل کی فہرست کچھ زیادہ لمبی نہیں ہے' گنے چنے چند مسائل ہیں جن کے متعلق کہا جائے گا کہ یہ ان کے تفردات ہیں۔

(۱) مسلمان کو جہنم کا عذاب نہیں ہوگا (۲) خطبہ جمعہ میں غیر عربی زبان کی گنجائش ہے (۳) دار الحرب میں بقول امام ابوحنیفہؒ غیر مسلم سے ربوٰ کے حکم میں ربو کا معاملہ نہیں ہے۔

پہلا مسئلہ

مومن ومسلم کو جہنم کا عذاب ہوگا یا نہیں' اس کی تمہید میں مولانا لکھتے ہیں:

''اس مضمونچہ کی حیثیت جواب کی نہیں بلکہ لکھنے والا کچھ پوچھنا چاہتا ہے۔ دین اور علم دین سے دلچسپی رکھنے والے میرے صحیح مخاطب ہیں۔''

اس سلسلہ میں سب سے پہلے مولانا سورۃ النساء کی یہ آیتیں پیش کرتے ہیں:

لیس باما نیکم ولا امانی اهل الکتاب من یعمل سوءً یجزبه۔(النساء۔۱۲۳)

نہ تمہاری آرزوؤں اور نہ کتاب والوں کی آرزوؤں کا تابع بلکہ قدرت کا فیصلہ ہے کہ جو بھی کرے گا۔ برائی' بدلہ اس کا اسے دیا جائے گا۔

استدلال قرآن سے

اس کے مقابل قرآن ہی میں ہے:

ومن یعمل سوءً اویظلم نفسه ثم یستغفر الله یجدالله غفوراً رحیماً۔(النساء۔۱۱۰)

اور جو کرے کوئی برائی' یا اپنے آپ پر کوئی ظلم کرے' پھر بھی بخشش ومغفرت چاہے اللہ سے' تو ہے اللہ بڑا بخشنے والا مہربان۔

تیسری آیت یہ نقل کی ہے

ان الله لایغفر ان یشرک به ویغفر مادون ذالک لمن یشاء۔(النساء۔۴۸)

قطعاً اللہ نہ بخشے گا اس بات کو کہ اس کے ساتھ شریک اور ساجھی ٹھہرایا جائے اور بخش دے گا اس کے سوا جس کے لئے چاہے۔

چوتھی آیت یہ ہے

فانذر تکم نارًا تلظیٰ۔ لایصلها الا الاشقی۔ الذی کذب وتولّی۔ (سورۃ اللیل)

میں نے دھمکایا تم کو آگ سے جو بھڑک رہی ہے نہ گھسے گا اس آگ میں مگر جو سب سے زیادہ بدبخت ہے وہی جس نے جھٹلایا اور پیٹھ پھیری۔

دلیل حدیث سے

اس کے بعد بخاری کی حدیث نقل فرمائی ہے جس کے راوی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ہیں کہ

مامن احد یشهد ان لااله الا الله وان محمد ارسول الله صدقامن قلبه الاحرمه الله علی النار متفق علیه

(مشکوٰۃ۔ کتاب الایمان ص۱۴)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ نہیں ہے ایسا کوئی آدمی جو گواہی دے اس بات کی کہ نہیں ہے الٰہ (معبود) مگر اللہ ہی اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یقیناً اللہ کے رسول ہیں۔ دل کی سچائی کے ساتھ جس نے ان دونوں باتوں کی گواہی دی اور اقرار کیا تو نہیں ہے۔ اس کے لئے بجز اس کے کہ حرام کردے اللہ اس پر آگ کو یعنی جہنم کو۔

دوسری روایت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ کی ہے کہ

Marfat.com

قال رسول الله علیه وسلم ان الله حرم علی النار من قال لا اله الله یبتغی بذالک وجه الله

(جمع الفوائد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قطعاً اللہ نے آگ یعنی جہنم پر حرام کر دیا ہے اس کو جس نے لا الہ الا اللہ کہا۔ اللہ کی خوشنودی کو اس کے ذریعہ تلاش کرتا ہے۔

اس کے بعد مولانا لکھتے ہیں:

''ظاہر ہے دونوں حدیثوں کا مفہوم بھی وہی ہے جو سورۂ واللیل والی آیت کا مفاد ہے' یعنی جہنم میں صرف وہی جائیں گے جنہوں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے پیغام کو جھٹلا دیا ہو اور جھٹلا کر پیغمبر سے رشتہ توڑ لیا ہو............ یعنی اشقی الذی کذب وتولی کا مصداق بن گیا ہو۔ ان صفات سے موصوف ہونے کے بعد چونکہ کوئی مسلمان باقی نہیں رہ سکتا ہے اس لئے آیت کا مفہوم اور کھلا ہوا مطلب یہی ہوا کہ جہنم میں وہی جائے گا جو مسلمان نہیں ہے اور اس کے سوا کوئی نہ جائے گا۔'' (برہان (دہلی) جنوری ۱۹۴۹ء)

مولانا ان دلائل کو سامنے رکھ کر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جہنم کا عذاب غیر مسلموں کے لئے مخصوص ہے۔ باقی جس کا خاتمہ ایمان پر ہوا ہے وہ جہنم کی آگ میں جلایا نہیں جائے گا کیونکہ حدیث میں صراحت موجود ہے کہ مومن پر جہنم کی آگ حرام کر دی گئی ہے۔

مسلمان کی سزا کے طریقے

اب سوال یہ ہے کہ گنہگار مسلمان کی سزا ہوگی یا نہیں؟ مولانا لکھتے ہیں کہ بلاشبہ سزا ہوگی۔ اپنے اعمال بد کا وہ بدلہ پائے گا مگر یہ سزا جہنم کی آگ کے سوا دوسرے طریقوں سے دی جائے گی۔

مسلمان کے سلسلہ میں مولانا کے الفاظ یہ ہیں:

''کسی قسم کا مسلمان ہو جہنم کی آگ اس کے لئے حرام ہے اور جہنم کی آگ کے لئے وہ حرام ہے گویا جہنم ہی مسلمانوں...... کے لئے ہے نہ مسلمان ہی جہنم کے لئے ہے' بتایا جائے اس عقیدہ کو غیر قرآنی عقیدہ قرار دینے کی کیا صورت ہے؟ خصوصاً جب بخاری شریف کی ''دو دو صحیح حدیثوں کا صریح دواضح مفاد بھی یہی ہے جو سورہ واللیل کی آیت سے سمجھا جا رہا ہے۔''

(برہان (دہلی) جنوری ۴۹ء)

آگے لکھتے ہیں کہ

''جو مسلمان ہے وہ اس عذاب جہنم سے تو بچ جائے گا مگر عذاب کی اور بھی تو قسمیں ہیں' یعنی جہنم میں داخل ہونے سے پہلے جسر (پل صراط) میدان حشر کی فوقانی وتحتانی' ظاہری و باطنی

Marfat.com

پریشانیاں نیز اس سے پہلے برزخی عذاب کا بھی ایک مستقل سلسلہ ہے......اور ان کے سوا موت سے پہلے خود اس دنیا میں مصائب و آلام کی گونا گوں شکلوں کا حصہ بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ جہنم کے عذاب سے بچ جانے کا مطلب یہ قطعاً نہیں ہے کہ سزاؤں کی دوسری شکلیں جو موت کے بعد یا موت سے پہلے اسی زندگی میں مجرموں کو پکڑتی ہیں ان سے بھی مسلمان ہو جانے سے آدمی محفوظ ہو جاتا ہے۔'' (ایضاً)

محمد ابن سیرینؒ اور مجدد صاحبؒ

مولانا نے یہ بھی لکھا ہے کہ

''محمد بن سیرینؒ سورۃ واللیل کی مذکورہ بالا آیت کا مطلب وہ بھی بیان کرتے تھے کہ مسلمان خواہ عملاً کسی حال میں ہو جہنم کی سزا سے بری ہو جاتا ہے اور اخیر زمانہ میں ہندوستان کے مشہور مجدد اسلام حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ بھی اپنے مکتوب ص۲۲۶ جلد اول میں فرماتے ہیں ''اہل کبائر کہ گناہاں ایشاں بمغفرت نہ آمدہ اند بہ توبہ یا شفاعت یا بمجرد عفو واحسان و نیز آں کبائر را بہ آلام و محن دنیوی یا شدائد موت مکفر نہ ساختہ امید کہ در عذاب آنہا جمع رابعذاب قبر کفایت کنند و جمع دیگر رابا وجود محنت ہائے قبر یا اہوال قیامت و شدائد آں روز اکتفا فرمایند......'' اخیر میں مجدد صاحب فرماتے ہیں۔ ''از گناہاں باقی نہ گذارند کہ محتاج بعذاب نار گردند۔'' ج ا، ص ۲۲۸ جس کا حاصل یہی ہوا کہ مسلمان ہونے کے بعد خواہ کسی قسم کے گناہوں میں کوئی مبتلا ہو پھر بھی سزا پانے کے لئے عذاب نار کی ضرورت اس مسلمان کے لئے باقی نہ رہے گی۔'' (ایضاً)

مولانا نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی ''حجتہ اللہ البالغہ'' کی عبارت بھی اسی مفہوم کی اپنے مضمون میں نقل فرمائی ہے اور دوسری مختلف حدیثیں بھی کہ مسلمانوں کے گناہوں کا ازالہ کس کس طرح دنیا میں ہوتا رہتا ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، وضو، مسجد کی حاضری، توبہ استغفار۔ پھر دنیاوی مصائب و آلام یہ ساری چیزیں مکفرات بنتی ہیں۔

ایک اشکال

کوئی شبہ نہیں کہ مولانا نے جن دلائل سے اپنی رائے پر استدلال کیا ہے وہ سب مضبوط ہیں اور دل اسے قبول کرتا ہے البتہ مولانا نے اپنے اس مضمون میں ان احادیث شفاعت کی طرف توجہ نہیں دی ہے جن میں آتا ہے کہ یوم حشر میں جب مومن شفاعت کے لئے تمام انبیاء کرام سے گزر کر سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوگا تو آپ سجدہ میں گر کر اللہ تعالیٰ سے التجا کریں گے۔ حکم ہوگا مانگو دیا جائے گا۔ آپ امتی امتی کہہ کر درخواست پیش کریں

گے۔ حکم ہوگا۔

من کان فی قلبہ ادنیٰ ' ادنی ' ادنیٰ مثقال حبة خردلة من ایمان فاخرجه من النار فانطلق ثم اعود الرابعة متفق علیه. (مشکٰوۃ۔ باب الحوض الشفاعہ)

جس کے دل میں رائی کے چھوٹے سے چھوٹے دانہ کے برابر بھی ایمان ہو اس کو آپ جہنم کی آگ سے نکال دیں۔

یہ ایک لمبی حدیث کا ایک حصہ ہے۔

خاکسار کا مقصد یہ ہے کہ اس طرح کی حدیثوں سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ کچھ مومن آگ میں داخل ہوں گے کیوں کہ اخرجه من النار کے جملہ سے یہی معلوم ہوتا ہے۔

اشکال کا جواب

مگر اس طرح کی حدیثوں کا محدثین نے جو مفہوم بیان کیا ہے کہ

''ایمان جس تصدیق قلبی یا اقرار لسانی کا نام ہے وہ ایک ایسا جوہر ہے جس کو اجزاء اور ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا ہے اور نہ اس پر کمی وزیادتی کا اطلاق ہوسکتا ہے اس لئے وہ اصل ایمان نہیں ہے۔''

واختلف العلماء فی تاویله حسب اختلافهم فی اصل الایمان والتاویل المستقیم هوان یراد بالامر المُقدر بالشعیر والذرة رالحبة والخردل غیر الشی الذی حوحقیقة الایمان من الخیرات وهو مایوجد فی القلوب من ثمرات الایمان ولمعات الیقین لان حقیقة الایمان الذی هوالتصدیق الخالص القلبی وکذ الاقرار المقرر اللسانی لا......یدخلها التجزی ولا الزیادةولا النقصان علی ماعلیه المحققون (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ۔ ج ۵' ص ۲۵۸)

پھر علامہ طیبیؒ نے لکھا ہے

قال الطیبی هذایوذن بان قال ماقدر قبل ذالک بمثقال شعیر ثم بمثقال حبة اوخر دل غیر الایمان الذی یعبربه عن التصدیق وهو مایوجد فی القلوب من ثمرةالایمان
(مرقاۃ شرح مشکوٰۃ۔ ج ۵' ص ۲۵۹)

طیبی کہتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے قبل ایمان کی تحدید ایک مثقال جو یا ایک مثقال رائی کے دانہ سے جو کی گئی ہے وہ اس ایمان سے الگ چیز ہے جس کو تصدیق کہا جاتا ہے......وہ تو دلوں میں پایا جانے والا کوئی ایمانی ثمرہ ہے۔

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس حدیث میں جو اور رائی کی مقدار کے برابر ایمان سے جس طرف اشارہ کیا گیا ہے اس سے وہ اصل ایمان مراد نہیں ہے جس کو تصدیق قلبی کہتے ہیں بلکہ یہ ثمرہ ایمان کا کوئی جلوہ ہوگا۔

Marfat.com

اس شرح کے بعد پھر مولانا گیلانی کے رجحان پر کوئی اعراض باقی نہیں رہتا۔ یوں مولانا نے اپنے مضمون کے شروع میں ہی لکھ دیا ہے کہ یہ ایک سوال ہے جسے اہل علم کے سامنے رکھا گیا ہے تاکہ وہ غور وفکر کر سکیں۔

خلاصہ کلام

اخیر میں مولانا لکھتے ہیں:

''واقعہ یہ ہے کہ جہنم سے پہلے سزاؤں کے مختلف منازل اور مختلف قالبوں میں ان کے ظہور کی خبریں جو دی گئی ہیں......ان سزاؤں کا قالب بھی اور ان کا محل و مقام بھی تخفیفاً بدلتا چلا جاتا ہے۔ جسر (پل صراط) سے ہٹ کر حشر میں' حشر سے ہٹ کر قبر میں' قبر سے ہٹ کر خود اسی دنیاوی زندگی میں مجازاۃ کا قانون اپنے قدرتی اقتضا کو پورا کرتا ہے...... یہاں تک کہ تحویل وتخفیف کا قانون اترتے ہوئے چلا جاتا ہے......اس طرح سزاؤں کی انہی منزلوں میں حق تعالیٰ کی رحمت بھی دستگیری فرماتی ہے اور رسول اللہ کی شفاعت بھی اپنا کام کرتی ہے بلکہ جرائم کے نتائج سے پاک ہونے کے بعد بہشتی زندگی سے استفادہ تو زیادہ تر فضل حق اور رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کبریٰ کے ساتھ وابستہ ہے بینوا توجروا و اعلی اللہ اجرکم۔

(برہان (دہلی) جنوری ۱۹۴۹ء)

دوسرا مسئلہ

دوسرا مسئلہ خطبہ جمعہ کی زبان کا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ یہ بھی ایک مجتہد فیہ مسئلہ ہے اور اس میں علماء احناف میں سے کچھ کا خیال ہے کہ نمازیوں کی مادری زبان میں جمعہ کا خطبہ دینا مکروہ نہیں ہے بلکہ بلا کراہت جائز ہے اور صحیح یہی ہے اور اس پر امام ابوحنیفہ' امام ابو یوسف اور امام محمد رحمھم اللہ کا اجماع ہے۔

جو لوگ خطبہ جمعہ کا عربی کے سوا دوسری زبان میں دینا مکروہ سمجھتے ہیں' ان کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''ایک زمانہ سے ہندوستان کے حنفی علماء میں یہ مسئلہ مابہ النزاع بنا ہوا ہے' عربی زبان کے سوا دوسری زبان میں خطبہ جمعہ کو غیر مسنون قرار دینے والے حضرات کے دلائل عام طور پر مشہور ہیں غالباً ان میں سب سے قوی تر دلیل وہی ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ نے پیش فرمائی ہے کہ غیر عربی ممالک میں حالانکہ جمعہ و جماعت کا عہد صحابہ میں ظاہر ہے کہ ہر مفتوحہ ملک میں انتظام تھا لیکن کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی جس سے ثابت ہوتا ہو کہ ان غیر عربی ممالک میں باشندوں کی رعایت سے سننے والوں کی زبان میں خطبہ کے ترجمہ کی اجازت دی گئی ہو۔''

(برہان (دہلی) مارچ ۱۹۴۷ء)

Marfat.com

مولانا کا استدلال

اس دلیل کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

''شہادت کا نہ ملنا اس کو وجود شہادت قرار دینا' یا کسی مباح فعل کو نہ کرنا فعل کے عدم اباحت کی دلیل کیا بن سکتی ہے؟ کتاب وسنت میں ترجمہ کی ممانعت نہیں ہے اس لئے اس کو مباح سمجھنا چاہئے۔ صحابہ نے اگر کسی فعل مباح پر عمل نہ کیا تو نہ کیا ان کا عمل نہ کرنا اس فعل کی اباحت کو کراہت سے بدل دے گا؟ نیز غیر عربی زبانوں سے عموماً صحابہ کی ناواقفیت بھی اس کی وجہ ہوسکتی ہے کہ ترجمہ کے فعل مباح پر وہ عمل نہ کر سکے۔'' (ایضاً)

جواب دینے کے بعد پھر ''مسلک حنفی'' کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''دوسرا مسئلہ قرآن کے سوا دوسرے اذکار مثلاً تکبیر' تسلیم تشہد درود' خطبہ وغیرہ کا ہے کہ بجائے عربی الفاظ کے اسی مفہوم کو جو عربی الفاظ سے سمجھے جاتے ہیں غیر عربی الفاظ میں ترجمہ کر کے نمازوں میں کوئی پڑھے تو اس کا کیا حکم ہے؟

متن ''کنز الدقائق'' میں لکھا ہے۔

''او بالفار سیته صح (یعنی بجائے عربی کے ان اذکار کو کوئی فارسی میں ترجمہ کر کے پڑھے تو یہ درست ہے۔'' (ایضاً)

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک شخص جو عربی پر قادر ہے دوسرا جو عربی پر قدرت نہیں رکھتا ہے کیا دونوں کا ایک ہی حکم ہے؟ فقہی کتابوں میں ہے کہ قدرت والے کے لئے دوسری زبان میں خطبہ وغیرہ مکروہ ہے اور جو قادر نہیں ہے اس کے لئے غیر عربی اختیار کرنا مکروہ نہیں ہے لیکن اس باب میں امام ابوحنیفہؒ اور صاحبین (امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ) کا اختلاف نقل کیا ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ تو عربی پر خواہ قادر ہو خواہ قادر نہ ہو' دونوں صورتوں میں غیر عربی کو جائز فرماتے ہیں اور صاحبین قدرت والے کے لئے مکروہ فرماتے ہیں۔

''شرح فتح المعین'' کا حوالہ

یہاں مولانا گیلانیؒ ''کنز'' کی ''شرح فتح المعین'' سے نقل کرتے ہیں:

محصله انه فی مسئلة الشر ع بالفارسية ولو مع القدرة على العربية رجعاالى قوله بخلاف القراة بها مع القدرةعلى العربية فانه رجع الیٰ قولهما۔(فتح المعین۔ص۱۸۲)

خلاصہ یہ ہے کہ باوجود عربی پر قادر ہونے کے فارسی زبان میں نماز کو شروع کرنا یعنی فارسی میں تکبیر کا ترجمہ کرنا اس مسئلہ میں ابو

Marfat.com

یوسف اور امام محمد نے امام ابوحنیفہ کے مسلک کو اختیار کر لیا ہے اور قرآن کی قرأت میں امام ابوحنیفہؒ نے ابو یوسف اور محمد کے قول کی طرف رجوع کیا ہے۔

جن کتابوں میں اس کے خلاف لکھا ہے وہ اشتباہ اور نہ سمجھنے کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس کی صاحب ''فتح المعین'' نے صراحت کی ہے۔

''ومن ھٰھنا حصل الاشتباہ (ایضاً) اس کے نہ سمجھنے سے دوسرے مصنفین کو اشتباہ ہوا ہے۔

مولانا لکھتے ہیں:

''اب میں سمجھتا ہوں کہ عربی زبان کی تعبیر پر قادر ہونے کے باوجود قرآن کے سوا دوسرے اذکار جس میں خطبہ جمعہ بھی الاتفاق داخل ہے ان کے متعلق ہمارے تینوں امام یعنی امام ابوحنیفہؒ، قاضی ابو یوسفؒ اور محمد بن حسنؒ سب ہی اس بات کے قائل ہیں کہ بغیر کراہت غیر عربی الفاظ میں ان کا ترجمہ جائز ہے۔ ''مبسوط'' کے حوالہ سے اس موقع پر ''فتح المعین'' ہی میں نقل کیا ہے من غیر کراھتہ علی الاصح علی ماذکرہ السرخسی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں صاحبین کا رجحان ان اذکار کے متعلق بھی کراہت کا تھا اور امام ابوحنیفہؒ جواز کے قائل تھے لیکن بعد میں دونوں صاحبان اپنے استاذ کے ہم نوا ہو گئے۔ اس لئے حنفی مذہب کا یہ اجماعی مسئلہ ہوا کہ سارے غیر قرآنی اذکار جن میں خطبہ جمعہ بھی شامل ہے' ان کا ترجمہ عربی پر قادر ہونے کے باوجود خطیب کر سکتا ہے اور کسی قسم کی کرامات اس میں نہیں۔''

''تاتارخانیہ'' کے حوالہ کے بعد صاحب ''فتح المعین'' نے صراحت کی ہے:

فظاھرہ کالمتن رجوعھما الیہ لاھوالیھما فاحفظہ فقد اشتبۃ علی کثیر حتی الشرنبلالی (ایضاً)
''تاتارخانیہ'' کا حاصل وہی ہے جو ''متن کنز'' کا ہے' غیر قرآنی اذکار میں صاحبین نے ہی ابوحنیفہ کے قول کی طرف رجوع کیا ہے نہ کہ ابوحنیفہ نے صاحبین کے قول کی طرف اس کو یاد رکھو اکثر کو اشتباہ ہو گیا حتیٰ کہ شرنبلالی کو بھی۔

بعض علماء کا قول

یہ ہے مولانا گیلانیؒ کے مضمون کا خلاصہ۔ آپ نے کتب حنفی کے ہی حوالہ سے اپنی اس رائے کا اظہار فرمایا ہے۔ ہندوستان میں بہت سارے علماء کرام اس رائے سے متفق پہلے بھی گزر چکے ہیں۔ مولانا فخر رحمتہ اللہ علیہ کا قول مولانا ہی نے اپنے مضمون میں نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے تھے:

''پس اگر خطبہ بہ لفظ ہندی دریں مملکت خواندہ شود برائے چیزے موضوع است حاصل شود''

Marfat.com

اگر خطبہ ہندی زبان مین اُس مملکت میں پڑھا جائے جس کے لئے اس کی وضع ہے تو وہ حاصل ہوگا۔

حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری بانی ندوۃ العلماء لکھنؤ نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے۔ وہ عرصہ ہوا چھپ بھی چکا ہے۔ اس رسالے میں حنفی مسلک کی فقہی کتابوں سے ثابت کیا ہے کہ غیر عربی میں جمعہ کا خطبہ دینا جائز ہے یہ رسالہ بھی مدلل ہے۔

البتہ علماء دیو بند وسہار نپور نے اس مسلک کو اب تک قبول نہیں کیا ہے۔ ''امداد الفتاویٰ'' وغیرہ میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ حضرت مونگیریؒ کے رسالہ میں حضرت تھانویؒ کی تصدیق دکھائی گئی ہے مگر بعد میں حضرت تھانویؒ نے اس سے رجوع فرمالیا۔

تیسرا مسئلہ

تیسرا مسئلہ ہندوستان میں غیر مسلم سے سود لینے کا تھا جس میں حضرت مولانا کی رائے علماء دیو بند سے مختلف تھی۔

انگریزی دورِ حکومت میں چوں کہ ہندوستان دار الحرب تھا اس لئے کچھ علماء اس کے قائل تھے کہ غیر مسلموں سے سود لینا جائز ہے مسلمانوں سے نہیں۔ مولانا ان کے ہمنوا تھے اور آپ نے ان کی حمایت مین یا یوں کہا جائے کہ آپ کی تحقیق یہی تھی۔ جون ۱۹۴۴ء کے رسالہ ''معارف'' (اعظم گڈھ) میں ایک مضمون لکھا جس میں اپنی اس رائے کا مدلل اظہار فرمایا۔ اس کے جواب میں مولانا ظفر احمد تھانوی نے مئی ۱۹۴۵ء کے ''معارف'' میں مضمون لکھا مگر اس سے مولانا گیلانی کی رائے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی بلکہ مولانا نے اس کے جواب الجواب میں دسمبر اور جنوری ۱۹۴۶ء کے ''معارف'' میں یعنی تین قسطوں میں اپنے مضمون کو مزید مدلل فرمایا اور مولانا ظفر احمد تھانوی کے اشکالات کے جوابات بھی دیئے۔

حضرت مولانا سے ایک ملاقات میں خاکسار نے اس کا تذکرہ کیا اور جو جوابات لکھے گئے تھے اس کا ذکر کیا۔ مولانا نے فرمایا امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بہت سارے اجتہادات کو ہم مانتے اور ان پر عمل کرتے ہیں۔ اس مسئلہ میں امام اعظمؒ کے مسلک پر میں نے زور دیا ہے کہ عمل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

صاحب ''ہدایہ'' وغیرہ نے امام صاحب سے نقل کیا ہے ولا ربا بین المسلم والحربی فی دار الحرب اور حضرت مکحولؒ سے یہ روایت نقل کی گئی ہے عن مکحول عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال لاربا بین اھل الحرب واھل الاسلام' اس کا حاصل یہ ہے کہ دار الحرب میں یہ معاملہ سود کے حکم میں نہیں ہے اگر ان کی رضامندی سے ہو۔

یہ بھی فرمایا کہ دنیا جانتی ہے کہ ہندوستان میں غیر مسلم ہم مسلمانوں سے سود لیتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی دولت کا بڑا حصہ سود در سود کے نام پر ان کی طرف منتقل ہوگیا اور ہوتا جا رہا ہے۔ اس یکطرفہ کاروبار نے مسلمانوں کو بے جان کرڈالا ہے۔

اگر ہم بھی غیر مسلموں سے اس ملک کے دارالحرب ہونے کی وجہ سے امام اعظمؒ کے قول کو بنیاد بنا کر سود لینے کو جائز قرار دے دیں تو کون سا بڑا جرم ہے۔ توازن تو یوں ہی قائم ہو سکتا ہے نہ کہ ایک طرف تو مسلمانوں سے لینے والے لیتے اور دوسری طرف سے اس مسئلہ میں شدت اختیار کی جائے۔

مولانا مرحوم نے مثال میں غلامی کے مسئلہ کا تذکرہ فرمایا کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج کے قطعاً یہ خلاف تھا کہ انسانوں کو غلام ولونڈی بنایا جائے مگر چونکہ عرب میں پشتہا پشت سے رائج تھا اور اہل جاہلیت مسلمانوں کو غلام ولونڈی بناتے تھے اس لیے انہوں نے بھی اس کو اسلام میں جائز رکھا گو ان کے بہت سارے حقوق کی نشاندہی ہوئی اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید فرمائی۔

اگر اس دور میں اس کو بنیاد بنا کر امام اعظم کے مسلک پر غیر مسلم سے سود لینے کو جائز کہتے ہیں تو اس میں ہمارا جرم کیا ہے؟ جو ہم سے سود لینے کو صرف جائز ہی نہیں کہتے بلکہ عملاً بھی لیتے ہیں۔ ہم بھی اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ مسلمان بھی غیر مسلموں سے لیں امام اعظمؒ کا قول ہمارے پاس سند ہے۔

خاکسار نے عرض کیا کہ کچھ لوگوں نے اس کی تردید میں کتابیں لکھی ہیں۔ فرمایا میں نے ساری کتابوں کا مطالعہ کیا ہے ہماری جو بنیاد ہے اس کو کسی نے نہیں توڑا۔ وعظ کہا ہے' میرا جو منشاء ہے اس پر کسی نے گہری نظر نہیں ڈالی...... یوں سب کو معلوم ہے کہ میں نے نہ کوئی ایسا کاروبار کیا ہے نہ میرے اہل خاندان نے' نہ کبھی اس کا ارادہ ہوا۔ میرا مقصد ہندوستان میں غیر معتدل نظام کو معتدل بنانا ہے۔ مجھے اس پر اصرار نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے البتہ جو مسئلہ میرے سامنے تھا میں نے مدلل طور پر بیان کر دینا اپنا فرض سمجھا۔ تاکہ علمائے کرام اس پر پوری سنجیدگی سے غور کر سکیں۔

تصانیف پر ایک نظر

مقالات احسانی

یہ مولانا مرحوم کے چھ مقالات کا مجموعہ ہے۔ یہ مقالات پہلے ہندوستان کے مختلف علمی رسالوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔ بعد میں مولانا کے تلمیذ رشید غلام محمد بی اے کی توجہ سے کتابی شکل میں ان کا مجموعہ ''مقالات احسانی'' کے نام سے سامنے آیا ہے۔ ان تمام مقالات میں تصوف کے مختلف پہلوؤں پر مولانا نے روشنی ڈالی ہے اور عمیق النظر عالم دین اور رمز شناس تصوف کی حیثیت سے بحث کی ہے۔ امام غزالیؒ کے عہد اور اس کے ماقبل و مابعد پر بحث کرتے ہوئے بڑا اچھا تاریخی ذخیرہ مولانا نے جمع فرما دیا ہے۔ ابن تیمیہؒ کے نظریہ مخدومیت پر بھی بہت دل پذیر بحث کی ہے اور کرامات اولیاء کو ثابت فرمایا ہے۔ امام احمد حنبل رحمتہ اللہ علیہ اور شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے سلوک و تصوف پر جو احسان فرمایا ہے اس کا تذکرہ بھی بہت موثر انداز میں آپ نے کیا ہے۔

بیعت کے جو اقسام علماء نے بیان کیے ہیں اس پر بھی اپنے بعض مقالہ میں بہت دلچسپ انداز میں مولانا نے

Marfat.com

روشنی ڈالی ہے۔ مولانا موصوف کو سلوک و تصوف سے جو قلبی اور ذہنی تعلق تھا وہ ان مقالات میں اُبھر کر سامنے آیا ہے۔ ان مقالات کے مطالعہ سے آدمی ظاہر کے ساتھ باطن کو سمجھنے اور اس کے فوائد کو سوچنے کے لئے مجبور ہوتا ہے اور بہت سارے لوگ عمل بھی کرتے ہیں...... مولانا مرحوم نے ان مقالات کی تحریر میں اپنی علمی و دینی بصارت و بصیرت دونوں سے کام لیا ہے۔ کہیں سے یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کسی باب میں "مقلد جامد" ہیں۔ جہاں جو بات کہنے کی ہے ضرور کہی ہے۔ نتائج پیدا کرنے میں مولانا کا ذہن عبقریت کی شان رکھتا تھا۔ حالات واقعات سے خود مولانا بھی متاثر نظر آتے ہیں اور اپنا خیال ہے کہ دوسرے پڑھنے والے بھی بغیر متاثر ہوئے آگے نہیں بڑھ سکتے ہیں۔

تاریخی حقائق سے جہاں بحث کی گئی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے تاریخ کا مطالعہ دینی نقطہ نظر سے کیا ہے اور اس سلسلہ میں آپ کا مطالعہ بہت گہرا اور وسیع ہے۔ امراء سلاطین' علماء' مشائخ اور دانشوروں کی زندگی کے جن پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے ان کو پڑھ کر ایک مسلمان کا دل کہیں تو لرزا اور کانپ جاتا ہے اور کہیں باغ باغ ہو جاتا ہے اور پڑھنے والے کو اپنا میدان حشر سامنے نظر آنے لگتا ہے۔ اگر دل پتھر اور سیاہ نہیں ہے تو نہیں...... ہوسکتا ہے کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے سہی ان نیکیوں کا عزم نہ کرلے۔

اسی کتاب میں وہ خط بھی درج ہے جو مولانا نے راہ سلوک کے ایک مسافر کو لکھا ہے۔ تصوف کا اس میں عطر کشید ہو کر آگیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"اوراد و وظائف کے سلسلہ کو آپ دراز سے دراز تر کرتے چلے جاتے ہیں۔ اللہ میاں اس سے آدمی کے قابو میں نہیں آتے۔ اپنے حول و قوت سے جو خالی ہو کر ان کے قدموں میں گر گیا' وہی اٹھایا جاتا ہے...... کاش جن اور بھوت سے آدمی جتنا ڈرتا ہے اللہ میاں کو اتنا بھی تو اپنے آگے پیچھے اوپر نیچے جانتا...... ذرا اس کی مشق اپنے پیغمبر ﷺ کی یافت کے تابع ہو کر کیجئے۔ سب کچھ آپ کو مل جائے گا' آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا ذکر کسی بادشاہ یا حاکم مجازی نہیں بلکہ حق تعالیٰ کی مجلس میں ہو' سنئے آپ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سنا رہے ہیں کہ خدا ان کو اطلاع دے رہا ہے کہ فاذکرونی اذکرکم' دل ہی دل میں اللہ میاں کو یاد کرنا شروع کیجئے آپ کا ذکر آپ کا مالک کرے گا ہم ان کو یاد کریں وہ ہمیں یاد نہ کریں؟ یہ ہو ہی نہیں سکتا' جو ایسا خیال کرے وہ مسلمان ہی نہیں...... الغرض ورد و وظیفہ سے زیادہ اپنے علم کی تصحیح کیجئے' یعنی رسول اللہ ﷺ کو جو علم بخشا ہے اسی علم کے مطابق اپنے علم کو کرلیجئے۔ آپ اس کے بعد خدا کے سامنے اور خدا آپ کے سامنے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن کو تھام لیجئے۔ جو کچھ انہوں نے سکھایا اس کے سوا طے کرلیجئے کہ اس راہ میں اور کسی سے کچھ سیکھنا نہیں ہے۔ آپ کا سلوک طے ہو گیا۔ خدا آپ کو مل گیا۔ آپ چین کیجئے آپ مانگتے چلے جائیں گے وہ دیتا چلا جائے گا۔" (ص ۳۰۹)

Marfat.com

پوری کتاب بڑے سائز کے (۴۲۸) صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ مقالات کے جلی عنوانات یہ ہیں:

کیا تصوف بدعت ہے؟ اختلاف سلاسل کی نوعیت' بیعت کی قسمیں' حقیقت تک رسائی بلا رہبر ممکن نہیں' طریقہ غزالیہ' امام غزالی کے دور کی سیاسی حالت' امام کے مخاطب خاص علماء ہیں' امام کی کتابوں کے انقلابی اثرات' خلفاء سلاطین وزراء' علماء دین اور طریقہ غزالیہ پر تنقید' کوئی اساسی اختلاف نہیں' اختلاف کا تعلق جبلی شاکلہ اور ماحول سے ہے۔ حسن بصریؒ اور ابن سیرینؒ، علماء دیوبند سے دردمندانہ اپیل' طریقہ اشغال مطلقہ' تعارف الیافعی' تعارف المرشدی' المرشدی کی خاص کرامت' ابن تیمیہؒ کا الزام مخدومیت' مخدوم کا اصطلاحی مفہوم' الزام مخدومیت' طریقہ غزالیہ پر ابن جوزی کی سخت تنقید' شیخ اکبر کی توضیحات' اطلاقی تصوف کا طریق' ابن تیمیہؒ کا نظریہ مخدومیت' جنوں کی تسخیر اور ابن تیمیہؒ' اس نظریہ کا کرامات صوفیہ پر استعمال' مجالس شیخ اکبر قدس سرہ' مجالس مولانا رومی قدس سرہ۔

تدوین حدیث

حضرت مولانا گیلانی رحمتہ اللہ کی زندگی سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پاک ﷺ سے شیفتگی اور تعلق غایت درجہ کا تھا۔

اسلام اور اسلامی تعلیمات پر جان و دل سے نثار تھے اور یہ خاندانی تعلیم و تربیت اور اساتذہ کرام کی خصوصی توجہات کا نتیجہ تھا۔ مولانا کو رب العالمین سے جو دل ملا تھا اس میں سوز و گداز' غیرت و حمیت اور تعلق مع اللہ پیوست ہو گیا تھا۔

دینی درس گاہوں سے نکل کر جب جدید تعلیم گاہ میں کام کرنے کا موقع ملا اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں سے خلا ملا ہوا تو دین اور دینی احکام و مسائل میں اور بھی پختگی آتی چلی گئی۔ پھر آپ ہی کے دور میں عبداللہ چکڑالوی (اہل قرآن) کا پیدا کردہ گروہ سامنے آ گیا تھا جو اپنے کو اہل قرآن کہتا ہے اور حدیث رسولؐ کی حجیت کا منکر ہے۔ اس فرقہ کی کتابوں نے آپ کو جھنجھوڑ دیا اور آپ نے محسوس کیا گمراہوں کا یہ گروہ اپنا فتنہ جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں میں پھیلانے کی سعی کرے گا اس لئے آپ کی سب سے زیادہ توجہ قرآن' حدیث اور فقہ پر رہی۔ آپ نے سعی کی کہ ایسی چیزیں مرتب کر دی جائیں جو آئندہ نسل کو کام آئے اور ان راہوں پر آہنی دیوار کھنچ جائے جن راہوں سے مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی سعی ہو سکتی ہے۔

چنانچہ تدوین قرآن' تدوین حدیث اور تدوین فقہ پر آپ بہت عمدہ کام کر گئے اور انہی ناموں سے کتاب بھی لکھ گئے جو ان شاء اللہ اہل علم کی رہبری و رہنمائی کے فرائض بہت خوبی سے انجام دے سکتی ہیں اور دے رہی ہیں اور خدا نے چاہا تو بہت دنوں تک دیتی رہیں گی۔

Marfat.com

ان میں زیر نظر کتاب ''تدوین حدیث'' سب سے اہم ہے اس لئے کہ قرآن کی تبیین وتشریح اور احکام و مسائل کی تفہیم اوران پرعمل کا دارومدار حدیث نبوی کی تفصیل پر ہے۔ حدیث کا دامن چھوڑ کر کسی مسلمان کا راہ راست پر جمے رہنا ناممکن ہے' مثلاً قرآن پاک میں یہ حکم تو ہے کہ نماز ادا کرو' زکوٰۃ دیا کرو' مگر دن رات کتنے وقت کی نماز فرض ہے' کن وقتوں میں کتنی سنتیں ہیں اور کس قدر فرض رکعتیں ہیں' نماز کن چیزوں سے فاسد و باطل ہوتی ہے ان کی ادائیگی کے لئے کیا شرائط ہیں اور کیا ارکان ہیں؟

جب تک حدیث نبوی سامنے نہ ہو کوئی جواب نہیں پاسکتا ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ نے عمل کر کے دکھایا ہے۔ حدیث میں سب کی پوری تفصیل موجود ہے اور اس وقت سے تا ایندم یہ اسی طرح ادا ہوتی آ رہی ہے۔

اہل قرآن کی طرف سے جو اشکالات سامنے آچکے تھے یا آسکتے ہیں حضرت مولانا گیلانی نے اپنی اس کتاب میں سب کا مدلل جواب دیا ہے اور ان تمام شکوک وشبہات کو بیخ وبُن سے اکھیڑ کر رکھ دیا ہے جن کی آبیاری اہل قرآن کرتے رہے اور آئندہ کرنا چاہیں گے۔

مولانا نے ثابت کیا ہے کہ حدیث نبوی عہد نبوی میں لکھی گئی اور اس کے بہت سارے مجموعے بہت سے صحابہ کرامؓ کے پاس لکھے ہوئے موجود تھے۔ پھر جس طرح ہمارے زمانہ میں قرآن کے بہت سارے حافظ پائے جاتے ہیں اور وہ قرآن یاد رکھتے ہیں عہد نبوی اور عہد صحابہ میں آنحضرت ﷺ کے صحابہ احادیث یاد کرتے اور یاد رکھتے تھے۔ سب کے لئے تحریری ثبوت فراہم کرنے کی سعی فرمائی ہے۔ عہد نبوی سے لے کر بعد تک کے محدثین کے حفظ واتقان کے بہت سے واقعات جمع کر دیئے ہیں......اور نام بنام بتایا ہے کہ اس معاملہ میں صحابہ کی شیفتگی کا کیا عالم تھا۔

پھر اس کی حفاظت پر علمائے اسلام نے جو کاوشیں کی ہیں ان کا اجمالی تذکرہ کیا ہے۔ حجیت حدیث کے خلاف جس قدر بھی اعتراضات کئے جاتے ہیں یا کئے جاسکتے ہیں مولانا نے اپنی اس کتاب میں سب کے دفع کرنے کی جدوجہد فرمائی ہے۔ کوئی شبہ نہیں کہ مولانا اپنی اس کاوش میں پورے طور پر کامیاب ہیں۔

اس کتاب کے جلی عنوانات ملاحظہ فرمائیں۔

حدیث کی حقیقت' تدوین حدیث کے قدرتی عوامل' حدیث کی کتابی تدوین' عہد صحابہ کی مدت' محدثین کا بے مثال حافظہ' محدثین کی قوت حافظہ کی چند مثالیں' تابعین کا طریقہ حفظ' تدوین حدیث کا ماحول' حدیث کے سلسلے میں تین ضروری مقدمات' عہد صحابہ اور مصنفین صحاح کے درمیانی دور میں حفاظت حدیث کی شکلیں' کتابت حدیث کے سلسلہ میں اعتراضات کے جوابات' تاریخ تدوین حدیث' عہد نبوی میں تدوین حدیث' عہد صدیقی اور تدوین حدیث...... حضرت ابوبکرؓ نے پانچ سو حدیثیں خود قلم بند کیں' عہد فاروقی اور تدوین حدیث' عہد عثمانی اور تدوین حدیث' عہد مرتضوی اور تدوین حدیث' صحابیت اور حدیث رسولؐ کے خلاف پہلا ناپاک اقدام فتنہ سبائی کے احتیاطی اصول۔

شروع کتاب میں تعارف کے عنوان سے حضرت العلامہ سید سلیمان ندوی کا ایک جامع' پُرمغز اور مدلل مقدمہ ہے۔ یہ پوری کتاب بڑے سائز کے (۴۸۰) صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

Marfat.com

حضرت العلامہ سید سلیمان ندوی نے درست لکھا ہے:

''اللہ تعالیٰ نے اسلام کی حفاظت کا جو وعدہ فرمایا اس کی کھلی شہادت اس سے ملتی ہے کہ صحابہ کے آخری زمانہ سے اس وقت تک سینکڑوں چھوٹے بڑے بدعتی فرقے پیدا ہوئے جنھوں نے اسلام کے چاند پر خاک ڈالنے کی کوشش کی اور اسلام کے منور آئینہ کو مکدر کر دینا چاہا مگر اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں ایسے لوگوں کو پیدا کیا جنھوں نے بتائید غیبی ان کی ساری آرزوؤں کو خاک میں ملا دیا اور ان کے بدعات کے گرد و غبار کو ہٹا کر اس آئینہ کو ہمیشہ روشن رکھا......اس زمانہ میں اس فرض کو ادا کرنے کے لئے جو دستہ آگے بڑھا اس کے ہراول میں ہمارے دوست' مناظر اسلام' متکلم ملت' سلطان القلم مولانا سید مناظر احسن گیلانی کا نام نامی ہے جن کے قلم کی روانی اسلام کی محافظت میں تیغ رانی کا کام دیتی ہے۔''

ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت

یہ کتاب دو ضخیم حصوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کتاب کا مقصد کیا ہے خود مولانا کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں۔ لکھتے ہیں:

''ان کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم کے جو دو مستقل نظام حکومت متسلطہ کے قیام کے بعد جاری ہو گئے ہیں اس کی دوئی اور اثنیت کو مٹا کر صرف ایک ہی نظام کو قبول کر لیا جائے اس لئے اپنی تعلیمی تجویز کا نام میں نے ''نظریہ وحدت نظام تعلیم'' رکھا ہے۔''

(نظام تعلیم و تربیت' ص ۵'۶)

مولانا نے اس خیال کی تردید فرمائی ہے کہ درس نظامیہ کا مقصد صرف دینی تعلیم کا نظام تھا بلکہ اس نصاب تعلیم میں اس دور کی دفتری زبان فارسی میں پوری استعداد حساب اور خطاطی کی مشق بھی داخل تھی اور صرف داخل ہی نہیں تھی بلکہ اس پندرہ سولہ سالہ نصاب میں خالص دینیات کی صرف تین کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ قرآن پاک سے متعلق جلالین شریف' حدیث نبوی سے متعلق مشکوٰۃ شریف اور فقہ سے متعلق ہدایہ۔ باقی ساری کتابیں منطق فلسفہ' ریاضی' عربی ادب' فارسی ادب اور علم کلام کی ہوتی تھیں جن کا خالص دین سے کوئی تعلق نہیں۔

مولانا فرماتے ہیں:

'' آج بھی کیا ممکن نہیں ہے کہ غیر دینی علوم کے اس حصہ کو نکال کر جس کے نظریات و مسائل مسترد ہو چکے ہیں' عصر جدید کے مقبولہ علوم اور عہد حاضر کی دفتری زبان کے نصاب کو قبول کر کے مذہب کی تعلیم کو ان تین کتابوں کے معیار کے مطابق باقی رکھتے ہوئے دینی اور دنیاوی

Marfat.com

تعلیم کے مدارس کی اس تفریق کو ختم کر دیا جائے۔'' (ایضاً، ص ۷ ج ۲)

پھر مولانا نے ان تمام شبہات کا تفصیل سے جواب دیا جو اس نصاب پر ہو سکتا ہے یا ذہنوں میں پیدا ہو سکتے ہیں مثلاً عربی کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''عربی زبان کے الفاظ کا ایک حصہ تو وہ ہے جس میں مسلمانوں کی دینی چیزیں قرآن وحدیث اور فقہ وغیرہ میں محفوظ ہیں۔ اس حصہ کے متعلق بتایا گیا ہے کہ اردو بولنے والی قوموں کے لئے عربی زبان کا یہ حصہ تقریباً مادری زبان کی حیثیت رکھتا ہے یعنی اسّی پچاسی فیصد الفاظ عربی زبان سیکھے بغیر یوں ہی معلوم ہیں۔'' (ایضاً، ص ۹ ج ۲)

پیدا ہونے والے دو چار شبہات کے جواب دینے کے بعد مولانا نے لکھا ہے:

''ہر تعلیم گاہ کے ساتھ ساتھ مسلمان طلبہ کے لئے خاص اسلامی اقامت خانے بھی قائم کئے جائیں اور ان اقامت خانوں کی نگرانی ارباب تقویٰ و دیانت کے سپرد کی جائے۔ ان کا ماحول بالکلیہ اسلامی ماحول رکھا جائے۔'' (ایضاً، ص ۹ ج ۲)

مولانا نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کے ساتھ حکومت وقت سے عربی تعلیم کے لزوم کا مطالعہ کیا جائے اور طریقہ ایسا اختیار کیا جائے کہ اردو بھی ساتھ ساتھ آ جائے اور ضرورت ہو تو بقدر ضرورت فارسی بھی۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ مسلمان نوجوانوں کو قرآن پڑھنے اور سمجھنے سے بتدریج مناسبت پیدا ہو جائے گی اور وہ خدا کے کلام سے بے بہرہ نہ رہیں گے۔

مولانا نے آگے چل کر سمجھایا ہے اور مثال دی ہے:

''پانی میں پانی ملاتے چلے جانے سے کوئی نئی کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح اردو کی ایک کتاب کے بعد دوسری کتاب اور دوسری کے بعد تیسری پڑھانے سے یہ زیادہ بہتر ہے......کہ اردو کے بعد فارسی اور فارسی کے بعد عربی سے طلبہ کا لگاؤ پیدا کیا جائے۔'' (ایضاً، ص ۱۳ ج ۲)

مولانا یہ نہیں کہتے ہیں کہ مدارس اسلامیہ کا نصاب بھی اسی طرح بدلا جائے اور وہاں سائنس وغیرہ کا انتظام کیا جائے کہ اس کے متحمل وہ نہیں ہو سکتے ہیں بلکہ مولانا کی تجویز یہ ہے کہ

''دینیات کی تعلیم کو......ان مدارس میں منتقل کر دیا جائے جہاں حکومت نے جدید علوم وفنون کی تعلیم کا انتظام کر رکھا ہے۔ چاہے تو کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی مدارس کو انگریزی مدارس نہیں بلکہ انگریزی مدارس کو چاہتا ہوں کہ مسلمان بنا لیا جائے.........رہے عربی مدارس سو عرض کر چکا ہوں کہ غیر مرکزی مدارس......کو قرآن کی بامعنی تعلیم کا مدرسہ قرار دے کر جدید علوم وفنون کا ہائی

Marfat.com

اسکول مسلمانوں کے لئے بنالیا جائے اور اسلامی علوم کی تکمیلی تعلیم کا مرکز عربی کے مختلف مرکزی مدارس کو قرار دیا جائے۔'' (ایضاً ص ۱۳۰ ج ۲)

یہ ہے اس کتاب کا مرکزی منشاء۔ یوں اس کتاب میں تعلیم و تعلم' اساتذہ طلبہ کا قدیم تعلق' اساتذہ کا ایثار' اسباق کی پابندی' تصوف سے استادہ اور اس طرح کی دوسری چیزوں کا تاریخی ثبوت فراہم کیا گیا ہے۔
قدیم نصاب کا تجزیہ بھی بہت خوبی سے کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب بڑی کار آمد' معلومات افزا' درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے لئے باعث ترغیب' اعمال و اخلاق کی تحریص کا عمدہ ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ یہ دونوں جلدیں چھ سات سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ پہلے ایڈیشن میں عنوانات نہیں تھے۔ اسی طرح فارسی عبارتوں کا ترجمہ بھی نہ تھا۔ حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کی فرمائش پر خاک سار نے دونوں جلدوں میں عنوانات اور ترجمہ کا اضافہ کیا ہے۔ اس سے کتاب نکھر گئی ہے دوسرا ایڈیشن اس اضافہ کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہؒ

مولانا گیلانی نے یہ مقالہ ''الفرقان'' کے شاہ ولی اللہ نمبر کے لئے لکھا تھا جو بعد میں کتابی صورت میں مرتب ہو کر شائع ہوا۔ یہ کتاب دراصل ہندوستان کی دردناک تاریخ کا خلاصہ ہے۔ شاہ ولی اللہؒ سے پہلے اور بعد ہندوستان کس حال میں رہا اس کا عروج و زوال دیکھنے والوں نے کیا کیا' بڑے ہی دل دوز انداز میں قلم بند فرمایا ہے۔ انگریز کب آئے اور کیسے آئے' عالم گیر کے بعد کتنے فتنے ابھرے اور باشندگان ملک بالخصوص مسلمانوں کو کیا اذیت پہنچی' مرہٹہ اور سکھ تحریک کا مقصد کیا اور انہوں نے کیسے مظالم ڈھائے جسے پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں' پھر غازی احمد شاہ ابدالی کی آمد' ان کا بے نظیر ایثار' مرہٹہ تحریک کی شکست' سراج الدولہ پر شب خون' میر جعفر وغیرہ کی غداری' جنگ پلاسی میں انگریزوں کی جیت' بنگال و بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کا بنام کمپنی بہادر منتقلی' نادر شاہ کا حملہ اور ایرانی علماء کا تفوق' شاہ جہاں کی پوتی کا نکاح نادر شاہ کے لڑکے سے' اس دور کے مختلف فتنوں کا تذکرہ' پھر شاہ ولی اللہؒ کی ولادت' ان کی خدمات' ان کی اولاد کی خدمات' شاہ ولی اللہؒ کی چیخ و پکار' مسلمانوں کو بیدار کرنے کی جدوجہد' علماء و مشائخ کی کمزوریاں' فقیہوں کی بے راہ روی' صوفیوں کی افسوسناک حالتیں' سادات بارہ کا فتنہ' خانہ جنگی' شیعہ سنی اختلاف' ولی اللہی دارالعلوم کی ۱۸۵۷ء میں بربادی' مولانا گیلانی نے اس مختصر مقالہ میں اس دور کے تمام پہلوؤں پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ معلومات کا ایک ایسا خزانہ ہے جو بہت ساری کتابوں کے مطالعہ سے بھی حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ مقالہ چھوٹے سائز کے ۲۸۸ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی

مولانا گیلانی کی تصنیفات میں یہ کتاب بھی ایک اہم تصنیف ہے اور کہنا چاہئے اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ ائمہ اربعہ میں سب سے بڑے تھے اور تابعی تھے۔ فقہ میں آپ کا جو مقام و مرتبہ ہے وہ کسی اہل

Marfat.com

علم سے پوشیدہ نہیں اور عام طور پر اہلِ علم اسی نقطہ نظر سے آپ کو جانتے پہچانتے بھی ہیں مگر مولانا مرحوم نے آپ کی سیاسی زندگی پر روشنی ڈالی ہے اور تاریخ کا تجزیہ کر کے ثابت کیا ہے کہ فقیہ ہونے کے ساتھ امامؒ صاحب بصیرت مفکر و رہنما بھی تھے۔ دستورِ اسلامی اور حکمرانی کے فرائض و اختیارات پر آپ کی بڑی گہری نگاہ تھی۔

اس کتاب میں امام صاحبؒ کے زمانہ کے سیاسی حالات اور نشیب و فراز پر اس وقت کی روشنی میں بڑی دلچسپ بحث کی گئی ہے جس کے پڑھنے سے حکمرانوں کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کی نظر حکمراں مسلمانوں کی تاریخ پر بھی کس قدر دور رس تھی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو نتائج اخذ کرنے کا کتنا عمدہ سلیقہ عطا کر رکھا تھا۔ کوئی شبہ نہیں اس طرح کی کتابوں کے مطالعہ سے انسانی ذہن و فکر کے دریچے کھلتے ہیں۔ اس کتاب کے جلی عنوانات یہ ہیں۔ (۱) خلافت و پادشاہی کا فرق (۲) خلفاء بنی امیہ کے دینی حالات (۳) اسلامی اموال و خلافت (۳) امام اعظمؒ کا سیاسی مسلک (۵) حجاز میں مختلف علماء سے آپ کا مکالمہ اور مناظرہ (۶) وضع قوانین اسلامی کی مجلس (۷) اس مجلس میں سوالات و اعتراضات کی آزادی (۸) خلافت عباسیہ سے تعلقات (۹) امام اعظمؒ کا آخری امتحان (۱۰) امام صاحبؒ کی ایک اہم تقریر، پھر ہر بڑے عنوان کے تحت متعدد ضمنی مسائل بیان کئے گئے ہیں۔

مولانا نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ ان کی پچیس سالہ محنت کا خلاصہ ہے۔ یہ سینکڑوں صفحات میں پھیلی ہوئی ہے۔

سوانح قاسمی۔ اول، دوم، سوم

آپ پڑھ آئے ہیں کہ مولانا گیلانی کی علمی زندگی رسالہ ''القاسم'' دیوبند کی ترتیب سے شروع ہوئی تھی۔ عجیب اتفاق ہے کہ زندگی کی آخری منزل ''سوانح قاسمی'' ثابت ہوئی۔ یہیں پہنچ کر قافلہ حیات لُٹ گیا۔ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد سے ریٹائر ہو کر جب وطن آ گئے تو اس وقت کے مہتمم دارالعلوم دیوبند حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے آپ سے گزارش کی کہ وہ بانی دارالعلوم کی سوانح مرتب فرمادیں۔ مولانا نے اسے اپنے لئے زادِ آخرت سمجھ کر بڑی خوشی سے قبول کیا اور تین ضخیم جلدوں میں مرتب فرمانے کی زحمت گوارہ فرمائی۔ آخری وقت آ جانے کی وجہ سے تیسری جلد تشنہ رہ گئی۔ بہت پہلے خاکسار سے کہا گیا تھا کہ ''سوانح قاسمی'' کی تلخیص کر دو۔ تعمیل حکم میں یہ خدمت بجالایا تھا۔ اُمید ہے کہ وہ خدمت کسی نہ کسی شکل میں دیر سویر آئے گی۔

یہ کتاب بھی ہر اس شخص کے پڑھنے کے لائق ہے جو مغلیہ دورِ حکومت کے زوال اور انگریزی حکومت کے دورِ جاہ و جلال میں اسلامی تعلقات کے بقا و تحفظ کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری

مولانا سیّد مناظر احسن گیلانیؒ ۔ شخصیت اور سوانح

پیش لفظ

دورِ حاضر کے علمائے کرام میں مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم علم وتہذیب کی ایک خاص شان کے بزرگ تھے۔ ان کے ذوق علمی کی تربیت میں خانوادہ خیر آباد کے بزرگوں کے نامور اخلاف۔ سید العلماء مولانا حکیم برکات احمد ٹونکی رحمہ اللہ اور ان کے شاگرد رشید علامہ معین الدین اجمیری نور اللہ مرقدہ نے اور دینی ذوق کی تربیت میں بزرگان دیوبند کے اخلاف سعید شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی اور ان کے نامور شاگرد علامہ محمد انور شاہ کشمیری نے خاص حصہ لیا تھا۔ اس طرح وہ دو خانوادہ ہائے علم و دین کے تربیت وفیض یافتہ، ان کے خصائص کے جامع اور مجمع البحرین کی مثال بن گئے تھے۔ ان کی زندگی اور علمی کاموں میں آخر تک دونوں خانوادوں کے امتیازات کی جھلک صاف نظر آتی تھی اور خصائص کو محسوس کرلیا جاسکتا تھا۔ علم ودین کے یہ دونوں خانوادے اس کے بعد بھی قائم رہے اور ان سے بڑی بڑی شخصیتیں پیدا ہوئیں لیکن حضرت گیلانی کے بعد اس شان کا کوئی اور عالم پیدا نہیں ہوا۔

حضرت گیلانی میں دونوں مذکورہ خانوادوں کی روایتی اور خود ان کی ذاتی خوبیوں نے مل کر انہیں خصائص و خصائل حسنہ کا ایک پیکر بنا دیا تھا جس میں علم وفکر کی صفات کو دیکھا اور پاکیزہ سیرت کی روح پرور خوشبو کو سونگھ لیا جاسکتا تھا۔ بلند نظری، وسیع الخیالی، علمی ذوق، جامعیت، اخلاق وسیرت کی پختگی، مقصد کی لگن، مسلمانوں کی تعلیم وتربیت اور اصلاح وخدمت کا جذبہ صادق اور کمال تقویٰ وتدین کی خوبیاں موجود تھیں اور یہ سب ان دونوں مکتبوں کی کرامات اور ان کے بزرگوں کا فیضان نظر اور ان کی کیمیا اثر صحبتوں کا نتیجہ تھا۔

دونوں مدارس کے بزرگ مجتہد الصفات اور کار فرمائے علم ونظر ہونے کے باوجود فقہ میں حنفی العقیدہ یا دوسرے لفظوں میں مذہباً مقلد تھے۔ مولانا گیلانی مرحوم فقہ میں ان کے ہم عقیدہ ہونے کے باوجود علم ونظر اور وسعت مسلک میں ان کے ذوق وروایت سے ذہن وفکر کی سطح زیادہ بلند رکھتے تھے۔

Marfat.com

مولانا مرحوم میں اخلاص، ایثار، تحمل، انکسار اور اعتدال، میانہ روی، وضع داری، مفاہمت، رواداری کی انسانی صفات بھی بہت تھیں۔ تعصب، تقشف، تنگ نظری سے دوری ان کا شیوہ اور صداقت شعاری، حقیقت شناسی اور حق پسندی ان کی سیرت کا خاص جوہر تھا۔

مولانائے گیلانی ایک جامع الصفات اور نادر روزگار شخصیت تھے۔ ان کا شمار نابغہ عصر اور ذہین ترین علماء میں ہوتا تھا۔ اہل علم اور اصحاب نظر نے ان کے ان اوصاف و کمالات کا اعتراف کیا ہے۔ لیکن ان کے شایان شان علمی کام ابھی تک سامنے نہیں آیا ہے۔ مولانا محمد ظفیر الدین مفتاحی نے حضرت علام پر ایک نہایت مفید کتاب تالیف فرمائی ہے لیکن وہ صرف کام کا آغاز تھا۔ افسوس کہ حضرت گیلانی کی وفات کے بیالیس برسوں میں وہ پہلا ہی نہیں آخری کام بھی ہے۔ اس میدان میں ابھی تک مفتاحی صاحب کا کوئی حریف پیدا نہیں ہوا اور اگرچہ ان کی زبان پر نہ سہی لیکن زمانے کی زبان پر وہی نعرہ رستاخیز ہے جو کبھی غالب مرحوم کی زبان پر آیا تھا۔

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق — ہے مکرر لب ساقی پہ صلہ میرے بعد

خاکسار حضرت گیلانی اور ان کے مصنف و محقق اول کا ادنیٰ نیاز مند اور انگلی کٹا کے شہیدوں میں شامل ہونے کا شائق و متمنی ہے اور دعا گو کہ

> ''خدایا، کسی صاحبِ ہمت کو پیدا کر جو ''حیاتِ جاوید'' (الطاف حسین حالی)، ''حیاتِ شبلی'' (سید سلیمان ندوی)، ''حیاتِ سلیمان'' (شاہ معین الدین ندوی) جیسی حیات گیلانی تالیف کر دے۔ جس کے ذریعے مرحوم مولانا گیلانی کے سوانح حیات، ان کی سیرت و خدمات کے اہم پہلو مرتب ہو جائیں اور حضرت مرحوم کے نادر آثار و افادات علمیہ و عالیہ تک شائقین کی رسائی ہو جائے یا ہندوستان پاکستان کی کسی یونیورسٹی میں کوئی ایسا سکالر پیدا ہو جو حیات ماجد (عبدالماجد دریا بادی۔ احوال و آثار، از ڈاکٹر تحسین فراقی۔ لاہور) اور حیات ابو الکلام آزاد (پروفیسر عبدالقوی دسنوی۔ بھوپال) جیسی تحقیق سے قوم پر احسان کر دے۔''

خاکسار کی یہ پیش کش حضرت گیلانی مرحوم کے حضور محض ایک اظہار عقیدت ہے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف! حضرت گیلانی کا مقام علم و معرفت اس سے بہت بلند ہے کہ مجھ جیسا طالب علم اور آلودہ معصیت ان پر کسی جامع علمی کام کا تصور بھی کرے۔

شخصیت

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ گذشتہ عہد تعلیم و تہذیب کی ایک نامور شخصیت تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں علم و فضل کی خوبیوں، اخلاق و سیرت کے محاسن اور ذہن و دماغ کی بہترین صلاحیتوں سے نوازا تھا اور زبان و قلم کے ذریعے

Marfat.com

مسلمانوں کی اصلاح و ہدایت اور علوم وفنون کی ترتیب و تدوین اور تصنیف و تالیف کی خدمت کی توفیق ارزانی فرمائی تھی۔کسی ممدوح کے بارے میں یہ کہہ دینا کہ وہ جامع جہات اور ہمہ صفت بزرگ اور صاحب علم وعمل تھے، بہت آسان ہے لیکن حضرت گیلانیؒ ایسے ہی بزرگ تھے۔علم وعمل اور فضل وکمالات کی جامعیت اور بلندی کے ساتھ وہ اپنے پہلو میں قلب گداز رکھتے تھے۔ان کی طبیعت میں حد درجہ انکسار تھا۔فروتنی کی مثال تھے۔انانیت سے نفور اور غرور وتکبر سے کوسوں دور تھے۔شرافت ان پر گویا ختم تھی۔حسد ورقابت سے ان کا سینہ بے کینہ محض نا آشنا تھا۔مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے انہیں سیرت کے فضائل اور عقل وفہم کے انہیں محاسن کی بناء پر خیر الامت کے لقب سے یاد کیا ہے۔

وہ ایک روشن خیال عالم دین اور عابد وزاہد شخص تھے۔فلسفے میں گہری نظر کے باوجود راسخ العقیدہ اور پرہیز گار بزرگ تھے۔فلسفہ وحکمت قدیمہ کی انہوں نے استاد کی خدمت میں تحصیل کی تھی اور جدید فلسفے کے مباحث ومسائل میں ان کے ذوق نے رہنمائی کی تھی۔وہ منطق وکلام کے نہ صرف صغریٰ کبریٰ سے واقف تھے بلکہ وہ ان علوم میں خاص بصیرت رکھتے تھے۔معقولات ومنقولات میں انہیں یکساں عبور تھا۔وہ صحافی بھی تھے اور ایک بلند پایہ اور صاحب طرز انشاء پرداز بھی اور کئی زبانوں کے قادر الکلام شاعر تھے۔زبان ونظم پر انہیں یکساں قدرت حاصل تھی۔وہ ایک کامیاب واعظ، شیریں بیان مقرر اور سوار خطابت کے شہسوار تھے۔درس وتدریس میں ان کی زندگی کی طویل مہلت بسر ہوئی تھی۔اس کے ساتھ وہ ایک کامیاب مصنف تھے۔تصنیف وتالیف کے ذوق، تعلیم وتعلم کے انہاک، عبادت وریاضت کے شوق اور اوراد ووظائف کے معمولات کی پابندی کے باوجود سیاسی مسائل میں ان کی خاص دلچسپی رہی تھی۔وہ اپنے استاد حضرت شیخ الہند اور مولانا ابو الکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی کی فکر کے حامل تھے۔مولانا عبید اللہ سندھی کی طرح صوفیانہ انداز فکر اور فلسفہ وحدت الوجود کو برعظیم پاک وہند میں اسلام کے روشن مستقبل کی ضمانت سمجھتے تھے۔

مولانا عبد الماجد دریا بادی (متوفی ٦ جنوری ۱۹۷۷ء) ان کے مقام بلند درجہ اختصاص، جامعیت علمی اور خصائص تحریر کے بارے میں فرماتے ہیں۔

> ''دور حاضر کے علماء کے خواص میں نہیں اخص الخواص تھے۔بلکہ کہنا چاہیے کہ اپنی دقت نظر یا نکتہ رسی کے لحاظ سے فرد فرید اور اپنی نظیر بس آپ ہی تھے'
>
> مولانا بیک وقت مفسر، محدث، فقیہ، متکلم، معقولی اور صوفی صافی تھے۔تاریخی مطالعے کی وسعت وکثرت نے انہیں مورخ بھی بنا دیا تھا۔طلبہ اور اونچے درجے کے یونیورسٹی طلبہ کے حق میں ایک بہترین معلم بھی تھے......
>
> قوت تحریر کا جو ملکہ مولانا کو حاصل تھا اس سے ناظرین ''صدق'' نا آشنا نہیں۔ایک خاص طرز انشاء کے مالک تھے اور اس میں کسی کے مقلد نہیں۔خود اس کے موجد تھے۔تحریر کا سب سے بڑا وصف بے ساختگی اور برجستگی تھی۔جب اور جس موضوع پر قلم اُٹھایا بس لکھتے ہی چلے گئے۔جو عنوان دوسروں کو پامال نظر آتے تھے ان میں بھی وہ نئے نئے نکتوں کا انبار لگاتے چلے جاتے۔

Marfat.com

خشکی ان کا قلم جانتا ہی نہ تھا۔ تحریر کی سطر سطر جاندار ہوتی۔
خیالات میں وسعت اور رواداری ...... تھی۔ خوش عقیدگی اور روشن خیالی، رسوخ فی الدین اور رواداری کی ایسی جامعیت کی نظیر شاید ہی مل سکے۔"

(تحقیق گیلانی، صدق جدید، لکھنؤ ۱۵، جون ۱۹۵۶ء، ص ۴)

قاری محمد طیب مرحوم (متوفی ۱۷ جولائی ۱۹۸۳ء) لکھتے ہیں:

"آپ کا جو والہانہ اسلوب تحریر میں پایا جاتا تھا وہی والہانہ رنگ میں بھی تھا۔ آپ اپنے علم و فضل، معلومات، کثرت مطالعہ، دقت نظر، نکتہ رسی، دقیقہ سنجی میں نادر روزگار تھے۔ ہندوستان کے مشاہیر علماء میں آپ کی ممتاز حیثیت مانی جاتی تھی۔"

(۵۰ مثالی شخصیات، ملتان، ۱۴۱۸ھ ص ۱۴۸۔۱۴۷)

حضرت مولانا گیلانی کی جامعیت علم وفن، خصائص فکر، ذہنی و دماغی کمالات اور محاسن تحریر و نگارش کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریا بادی اور قاری محمد طیب رحمۃ اللہ کے بیانات کے بعد کسی اور بیان کی ضرورت نہ تھی لیکن مولانا عبدالباری ندوی مرحوم (متوفی ۲۶ نومبر ۱۹۶۷ء) ان کے بلند پایہ معاصر اوران کی مجالس علمیہ کے ایسے رفیق اور صاحب نظر ناقد و مبصر ہیں جن کی رائے کا وزن معلوم ہے۔ اس لئے بحث کی طوالت پر قارئین کرام سے معذرت کے ساتھ مولانا مرحوم کی تحریر کا ایک اقتباس پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا۔

"یوں مولانا کے علمی و ذہنی کمالات پر ایک بالکل اچٹتی یا غلط انداز نظر کا عالم بھی یہ تھا کہ دس بیس منٹ میں جو پاس بیٹھ جائے ان کے تفوق سے مسحور ہوئے بغیر نہ اٹھتا۔ ہر طرح کی علمی و دینی معلومات کی بہتات، ان سے عجیب عجیب نتائج واستنباطات، پھر حسن تعبیر کی ندرت و برجستگی، ہر چیز بجائے خود "دامن دل" کے لئے "کرشمہ دل کش" ہوتی۔ نجی و مجلسی گفتگو یا خطاب خاص سے اوپر عام خطاب یا خطابت سنیئے تو یہ کمالات اور زیادہ مبہوت کر دیتے۔ تقریر سے آگے تحریر و تصنیف کو دیکھئے تو گیلانی اشہب قلم اس میدان میں بھی بڑے سے بڑے ہم چشموں سے پیچھے نہیں۔ نہ کماً نہ کیفاً۔ ایک معتبر عالم دین کی میزان پر رکھئے تو معقول ومنقول، تفسیر وحدیث، فقہ وکلام، سیرت وسوانح، تعلیم وتصوف وغیرہ وغیرہ جس شعبہ میں جو کارنامہ چھوڑا ہے کیا اس کو صف اول کی ممتاز جگہ سے بھی کم کسی جگہ پر رکھا جاسکتا ہے؟"

اب میں بحث کے اس پہلو پر وقت کے ایک بلند پایہ عالم دین، نامور مصنف، صاحب طرز انشاء پرداز اور مبصر کے افکار عالیہ اور رائے گرامی پر ختم کرتا ہوں جس کا وجود گرامی مغتنمات روزگار میں سے تھا جو بیسویں صدی کے آخری تیر قضا کا نشانہ بنا ہے جو گذشتہ دور علم وتہذیب کا خاتم اور اہل علم واصحاب فضل کی اس جماعت کا آخری فرد تھا

Marfat.com

میرا اشارہ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (متوفی ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء) کی طرف ہے۔فرماتے ہیں:

''بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے وسعت نظر، وسعت مطالعہ، رسوخ فی العلم اور ذکاوت میں ان کی نظیر اس وقت ممالک اسلامیہ میں ملنی مشکل ہے۔ والغیب عنداللہ۔تصنیف و تالیف کے لحاظ سے وہ عصر حاضر کے عظیم مصنفین میں شمار کیے جانے کے مستحق ہیں۔انہوں نے اپنی کتابوں میں جو مواد جمع کر دیا ہے وہ بیسیوں آدمیوں کو مصنف اور محقق بنا سکتا ہے۔اس ایک آدمی نے تن تنہا وہ کام کیا ہے جو یورپ میں پورے پورے ادارے اور منظم جماعتیں کرتی ہیں۔ان جیسا آدمی برسوں میں پیدا ہوا تھا اور اب ان جیسا آدمی شاید برسوں میں بھی پیدا نہ ہو۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا''

(پرانے چراغ، جلد اوّل، ص ۹۴)

اللہ تعالیٰ نے انہیں اخلاق کے بہترین خصائص اور سیرت کے اعلیٰ محاسن سے آراستہ کیا تھا اور مواعظ و خطبات کے ذریعے مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح، عقائد و رسوم کے خلاف جہاد اور تحریر و انشاء کے ذریعے بہترین علمی خدمات کی انجام دہی کی توفیق ارزانی فرمائی تھی۔وہ بلاشبہ ایک جامع جہات شخصیت کے مالک تھے۔

خاندان

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ حسنی و حسینی سادات کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ان کے مورث اعلیٰ سید احمد جاجنیری کا تعلق مدینہ منورہ کے قریب واسط سے تھا۔حالات کے جبر نے انہیں وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔وہ عراق تشریف لے گئے اور بغداد کے محلے جاجنیر میں مقیم ہو گئے۔سلطان نے ضلع مونگیر میں انہیں جاگیر عطا کی تھی۔ حضرت سید احمد جاجنیری کی اولاد میں میر شجاعت علی نامی ایک صاحب علم و عمل بزرگ گزرے ہیں جو ہمارے ممدوح مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے پردادا تھے۔ان کے بیٹے سید محمد احسن نامی جید اور ممتاز عالم دین اور اپنے وقت کے معروف صاحب درس و تدریس تھے۔انہوں نے بنارس، لکھنؤ، رام پور اور دہلی کے نامور اساتذہ سے تحصیل علمی کی تھی، جن میں مفتی واجد علی (بنارسی)، مولانا نعمت اللہ فرنگی محلی (لکھنؤ، ف ۷۴-۱۸۷۳ء) حضرت شاہ محمد اسحاق (دہلی، ف ۱۸۴۵ء) کے نام شامل ہیں۔مولانا گیلانی نے اپنی تالیف لطیف ''ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت'' (جلد دوم) میں مولانا سید محمد احسن اور گیلان میں ان کے مرکز درس و تدریس اور اس کے فیضان علمی کا ذکر کیا ہے۔

مولانا سید محمد احسن (ف ۱۳۰۱ھ / ۸۴-۱۸۸۳ء) مولانا گیلانی مرحوم کے دادا تھے۔ان کے تین بیٹے تھے۔ ابوظفر محمد سلیمان بڑے تھے۔ان کا انتقال جوانی میں ہو گیا تھا۔اس وقت ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔دوسرے بیٹے ابو

Marfat.com

نصر عالم دین تھے۔ ان کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ مولانا سید محمد احسن کے چھوٹے بیٹے حافظ سید ابوالخیر تھے اور یہی بزرگ ہمارے ممدوح مولانا گیلانی کے والد گرامی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اولاد ذکور وا ناث سے نوازا تھے۔ ان کے تین بیٹے تھے۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی اپنے دونوں بھائیوں ......سید مکارم احسن اور سید مظہر احسن سے بڑے تھے اور نہ صرف عمر میں بڑے تھے اللہ تعالیٰ نے انہیں علم وعمل اور شہرت ومقبولیت میں بھی فوقیت دی تھی۔ وہ نہ صرف اپنے خاندان کے لئے موجب افتخار تھے، اللہ تعالیٰ نے انؒ کے علم وعمل، درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں خدمات اور امتیازات کی بدولت ان کے بزرگ اساتذہ اور ٹونک اور دیوبند کے مراکز تعلیم وتدریس کے لئے بھی باعث نیک نامی بنایا تھا۔

پیدائش اور تعلیم

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ یکم اکتوبر ۱۸۹۲ء کو اپنے ننھیال موضع استھانواں میں پیدا ہوئے۔ خاندان کی دینی، اخلاقی، تعلیمی روایات ان کے حصے میں آئی تھیں۔ ان کی ابتدائی فارسی عربی کی تعلیم ان کے چچا کے زیر نگرانی گیلانی میں ہوئی تھی اور بیشتر کتابیں خود انہیں نے پڑھائی تھیں۔ تعلیم کا دوسرا دور جو تقریباً آٹھ برس کی مدت پر پھیلا ہوا تھا ٹونک کے مدرسہ خلیلیہ میں گزرا جہاں خیر آبادی سلسلے کے نامور عالم مولانا حکیم سید برکات احمد علیہ الرحمہ مسند نشیں صدارت تھے۔ مولانا گیلانی حضرت سید برکات احمد کے درس وصحبت میں خانوادہ خیر آبادی کے معارف حکیمیہ سے خوب خوب سیراب ہوئے۔ مدرسہ خلیلیہ میں فلسفہ وحکمت کے جام لنڈھا چکے تو بخت کی فیروز مندی نے انہیں وقت کے سب سے بڑے محدث وفقیہ اور عارف باللہ مولانا محمود الحسن کی خدمت میں پہنچا دیا جو ایشیا میں حدیث وفقہ کی سب سے بڑی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کی مسند صدارت اور شیخ الحدیث کے منصب پر فائز تھے۔ مولانا حکیم سید برکات احمد کی برکات درس وصحبت نے ان کی ذہنی وفکری صلاحیتوں کو بیدار کر کے انہیں جلا بخشی تھی اور طبع کو روشن کر دیا تھا۔ حضرت مولانا محمود حسنؒ کے فیضان تعلیم وتربیت، توجہات سامی اور صرف ہمت نے ان کی فطرت کو سعادت، طبع کو سلامتی، فکر کو جہت، سفر کو منزل، قلب کو گداز اور ایمان کو پختگی بخشی تھی۔ نیز فکر کی تیزی وبراقی کو سعادت سے، خیالات کی بے راہ روی کو سلامتی سے، قلب کی بے چینی اور بے یقینی کو اطمینان سے بدل کر فکر وعقیدہ اسلامی اور سیرت حسنہ واعمال صالحہ کا ایک قابل رشک پیکر بنا دیا تھا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ وہ زندگی میں جہاں بھی اور جس حال میں بھی رہے مسلمانوں کے روحانی درد کے درماں کی تلاش اور جسم ملت پر بے دینی کے زخموں کے لئے مرحوم کی جستجو ان کا وظیفہ حیات رہا اور اپنی زبان وقلم ......دونوں سے مسلمانوں کی تعلیم وتربیت اور اصلاح افکار واعمال کی خدمات کی انجام دہی میں مصروف رہے۔

اساتذۂ کرام

مولانا گیلانیؒ کو وقت کے بڑے بڑے اساتذہ سے تحصیل علمی کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ وہ خود جوہر قابل

Marfat.com

تھے اور قابل اساتذہ کے فیضان درس اور تربیت نے ان کی ذہنی وفکری صلاحیتوں کو مزید چمکا دیا تھا۔ وہ سعید ازلی تھے اور بزرگ اور عارفین کی صحبت نے سعادت کو ان کی فطرت ثانیہ بنا دیا تھا۔ وہ ٹونک اور دیوبند میں جہاں رہے ان کے علمی ذوق، ذہنی وفکری صلاحیتوں، ان کی سعادت مندیوں، راست فکری و نیک عملی، اطاعت شعاری اور خدمت گزاری نے انہیں اساتذہ کرام کا محبوب اور منظور نظر بنا دیا تھا۔ حلقہ درس و تدریس سے دائرہ اہتمام تک ان سے لطف وشفقت کا برتاؤ کیا جاتا تھا اور بعض معاملات میں انہیں شریک مشورہ بھی کیا جاتا تھا۔ وہ اپنے اساتذہ محترم کے واقعی شاگرد رشید تھے۔

ٹونک اور دیوبند میں انہیں جن اساتذہ سے استفادے کا موقع ملا تھا وہ سب وقت کے نامی گرامی اور میدان درس و تدریس کے شہسوار تھے۔ ان کے فضائل علمی اور کمالات درس اور اخلاق و سیرت کے تعارف اور تذکرے کی گنجائش نہیں۔ ان کے مقام و مرتبہ علمی اور کارنامہ درس و تدریس کے ثبوت کے لئے یہ کافی ہے کہ حضرت گیلانی ان کے شاگرد رشید ہیں۔ درخت کی سب سے بڑی پہچان تو اس کا پھل ہی ہوتا ہے۔

۱۔ مولانا حکیم سید برکات احمدؒ مدرسہ خلیلیہ ٹونک کے بانی مبانی، اپنے وقت کے نامور طبیب اور بلند پایہ معقولی تھے۔ انہوں نے ایک مدت دراز مولانا فضل حق خیر آبادی کے جانشین علم و فضل مولانا عبدالحق خیر آبادی (ف ۱۸۹۹ء) کی خدمت میں رہ کر فلسفہ و حکمت کی بہت بلند واعلیٰ پیمانے پر تحصیل کی تھی۔ ٹونک میں مولانا گیلانی کا زمانہ تعلیم ۱۳۲۴ھ سے ۱۳۳۱ھ (۱۹۰۶ء تا ۱۹۱۳ء) تک ہے۔

۲۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن:

اسی سال شوال ۱۳۳۱ھ (دسمبر ۱۹۱۳ء) میں وہ دیوبند کے مدرسہ اسلامیہ (دارالعلوم) میں داخل ہو گئے۔ اس سے واقعی تعارف تو وہیں پہنچ کر ہوا لیکن حضرت شیخ الہند کے تذکرے سے سامعہ شوق ٹونک ہی کے زمانہ قیام میں سفر اجمیر کے موقع پر مولانا معین الدین اجمیری (ف ۱۹۴۰ء) کی صحبت میں آشنا ہو گیا تھا۔ مولانا معین الدین اجمیری ٹونک کے خانوادہ علم و حکمت کے نامور فرزند اور مولانا حکیم سید برکات احمد کے تلمیذ رشید تھے۔ انہوں نے ایک روز اثنائے گفتگو فرمایا تھا۔

> ''مولانا محمود حسن نرے مولوی اور مدرس ہی نہیں ایک خدا رسیدہ عارف ہونے کے ساتھ ساتھ ان میں وہ تڑپ بھی پائی جاتی ہے جس نے آج کل تجھے بے چین کر رکھا ہے۔''
>
> (رسالہ دارالعلوم دیوبند، محرم ۱۳۷۱ھ ص ۴۳)

اگرچہ کسی کی بزرگی اور خدا رسیدگی کو کسی کے اعتراف کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن اہل علم اور اصحاب مجد و شرف کی روایت یہی ہے کہ وہ اپنے معاصر اور دیگر مکاتیب فکر کے اہل علم و فضل اور اصحاب تقویٰ و صلاح کے علو مرتبت کا اعتراف کرتے رہے ہیں۔

مولانا گیلانیؒ نے شریعت کے اسرار بھی حضرت شیخ الہند کے درس و صحبت میں سیکھے تھے اور طریقت کے ذوق و رموز سے حضرت ہی کی رشد و ہدایت میں آشنا ہوئے تھے۔ حضرت شیخ الہند سے نسبت تلمذ پر انہیں فخر تھا۔

Marfat.com

دیگر اساتذہ

دیو بند میں جن دوسرے اساتذہ کے سامنے مولانا گیلانی نے زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا، ان کا تذکرہ انہوں نے اپنی آپ بیتی ''احاطہ دار العلوم میں بیتے ہوئے دن'' ......سلسلہ مضمون میں کیا ہے۔ ان میں حضرت شیخ الہند کے علاوہ مولانا انور شاہ کشمیری (ف، ۱۹۳۳ء)، مولانا حافظ محمد احمد (ف، ۱۹۲۸ء)، مولانا شبیر احمد عثمانی (ف، ۱۹۴۹ء)، مولانا غلام رسول خان (ف، ۱۹۱۸ء)، وغیرہم (رحمہم اللہ اجمعین) کے اسمائے گرامی درج ہیں۔

مولانا گیلانیؒ نے عربی، فارسی اور صرف ونحو کی کتابیں اپنے وطن میں اپنے فاضل چچا سے اور ان کی نگرانی میں دوسرے اساتذہ سے پڑھی تھیں۔ ٹونک میں فلسفہ وحکمت ان کا خاص موضوع تھا۔ دیو بند میں وہ دورہ آخر میں داخل ہوئے تھے۔ شعبان ۱۳۳۲ (مطابق جون جولائی ۱۹۱۴ء) میں امتحان میں شریک ہوئے اور ۵۰۰ نمبروں میں سے ۴۸۳ نمبر حاصل کر کے درجہ اول میں کامیاب ہوئے۔

ان کے استاذہ میں مولانا حمید الدین فراہیؒ کا اسم گرامی بھی آتا ہے۔ حضرت فراہی کو اللہ تعالیٰ نے علوم قرآنی کے خاص ذوق سے بہرہ مند فرمایا تھا۔ مولانا گیلانیؒ نے ان سے حیدر آباد کے زمانہ قیام میں علوم قرآنی میں استفادہ کیا تھا۔

ذریعہ معاش کی فکر اور بعد کے حالات، ملازمت

مولانا گیلانی کی عمر تقریباً بائیس برس کی تھی جب وہ تعلیم سے فارغ ہوئے تھے۔ اس کے بعد انہیں معاش کی فکر ہوئی۔ اس مقصد کے حصول کے لئے سب سے پہلے انہوں نے ٹونک کا رخ کیا۔ استاد گرامی سے ملے۔ مدرسہ خلیلیہ میں مدرس کی کوئی جگہ خالی نہ تھی۔ کتب خانے میں فہرست سازی کا کام سپرد ہوا اور پانچ روپے تنخواہ قرار پائی۔ لیکن دو ماہ کے اندر ہی اندر مدرسہ میں مدرس کی جگہ خالی ہوگئی اور انہیں پندرہ روپے ماہانہ پر استاد مقرر کرلیا گیا۔ انہی دنوں ایک ٹیوشن کا انتظام ہوگیا۔ اس طرح تینوں ذرائع سے ۲۵، ۳۰ روپے ماہانہ آمدنی کی طرف سے اطمینان ہوگیا۔ لیکن مولانا کے عزائم کے مقابلے میں نہ تو یہ کام اطمینان بخش تھے اور نہ ان ذرائع سے حاصل ہونے والی آمدنی۔ اس شاہین بلند پرواز کے لئے ٹونک کے آسمان کی وسعت اور مدرسہ خلیلیہ کی فضا بہت تنگ تھی۔ انہیں اپنے بلند عزائم کی جولان گاہ کے لئے کسی اور جہان کی تلاش تھی۔ چند ماہ کے بعد ہی مولانا نے حیدر آباد دکن کے لئے رخصت سفر باندھا۔ مولانا حیدر آباد پہنچے۔ بعض اکابر سے شناسائی پیدا کی لیکن ملازمت کی کوئی صورت نہ نکل سکی۔ حالات کا جائزہ لیا اور وطن لوٹ آئے۔ مادر علمی کی کشش انہیں دیو بند لے گئی۔ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ نے ان کے حالات سن کر دس روپے ماہانہ مقرر کرتے ہوئے کہا سردست ''القاسم'' و ''الرشید'' میں کچھ مضمون نویسی کرو اور درس و تدریس کا کام کرو۔ انہوں نے کام شروع کر دیا۔ ایک ماہ بعد انہیں معین المدرسین مقرر کر دیا گیا اور مشاہرہ تیس روپے مقرر ہوا۔ مفتی ظفیر الدین

Marfat.com

مفتاحی نے لکھا ہے:

''محرم ۱۳۳۳ھ یا اس کے آس پاس (مولانا گیلانی) ٹونک تشریف لے گئے۔ چار پانچ مہینے مدرسہ خلیلیہ میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ وہاں سے نکل کر حیدر آباد پہنچے۔ یہ پورا سال اسی سیر و سیاحت میں گزر گیا۔ ۱۳۳۴ھ کے ابتدائی مہینوں میں دیوبند واپس ہوئے۔''

اس دوران میں مولانا گیلانی مرحوم نے ''القاسم'' اور ''الرشید'' میں مضمون نگاری ہی نہیں کی تھی۔ ان کی ترتیب و تدوین کی ذمہ داری بھی انہی پر تھی۔ مدون کی حیثیت سے القاسم پر ان کا نام چھپا ہوا ملتا ہے۔ مولانا نے خود اپنے تئیں دونوں پرچوں کا مدیر لکھا ہے اگرچہ خاص ضابطے کے مدیر کی حیثیت سے دوسرے حضرات کے نام چھپتے تھے۔ تعلیمی سال کے اختتام پر مولانا گیلانی وطن تشریف لے گئے لیکن نئے تعلیمی سال کے آغاز میں انہوں نے مونگیر میں ملازمت کا تعلق کرنے کی کوشش کی لیکن بات نہ بنی۔ ستمبر ۱۹۱۶ء میں مولانا نے کلکتہ کا سفر کیا۔ واپسی پر ایک دن کے لئے حیدر آباد میں ٹرین سے اُتر گئے۔ اُترنے کی وجہ یہ تھی کہ ۴ اکتوبر کو عیدالاضحیٰ (۱۳۳۵ھ) تھی۔ سوچا تھا کہ نماز پڑھ کر اگلے روز پھر سفر شروع کر دیں گے۔ مولانا نے خود لکھا ہے:

''ایک دن کی جگہ تیس سال سے زیادہ مدت حیدر آباد میں مجھے گزارنی پڑی اور یہ قدرت کا کرشمہ تھا کہ پانچ اور دس روپے کی تنخواہ سے جس کی معاشی زندگی شروع ہوئی تھی۔ وہ ہزار روپے کی تنخواہ سے وظیفہ یاب ہو کر پھر اسی مستقر الی حین کی طرف واپس ہو گیا جہاں کی مٹی سے اس نے سر نکالا تھا۔''

مولانا عبدالباری ندوی مرحوم نے اپنے مفصل مضمون میں مولانا کے معاشی حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس سے مولانا کے ذوق مزاح کا پتا بھی چلتا ہے۔ مولانا ندوی لکھتے ہیں:

''(مولانا) بڑے تنخواہ دار ہونے پر بھی عملاً مالدار کبھی نہ ہو پاتے۔ خدا بھلا کرے ان کے چھوٹے بھائی اور بڑے منتظم و کارگزار میاں سید مکارم احسن سلمہ کا کہ وہ گیلانی شریف میں کاشتکاری و باغبانی وغیرہ کے سلسلے میں منصوبے پر منصوبے برابر پیش ہی کرتے رہتے اور مولانا کے معمول مصارف سے جو کچھ بچتا اور اچھا خاصا بچتا، جمع نہ رہنے دیتے بلکہ بارہا قرض تک کی نوبت آ جاتی۔ ان منصوبوں میں کچھ اس طرح کے بھی ہوتے کہ ''ہماری فلاں زمین کے پاس فلاں زمین بک رہی ہے یا مل سکتی ہے بڑے موقع کی ہے۔'' مولانا نے ان کا غالباً ایسا ہی کوئی خط دکھایا۔ مشورہ سنا کر فرمایا کہ ''اس طرح تو پورا کرہ ارض ہی ہماری زمین کے پاس آتے آتے گیلانی میں سما جائے گا۔'' پھر بھی ساری دنیا کو خوش رکھنے والے مولانا خود اپنے بھائی کو کیسے ناخوش فرماتے۔ تاہم اگر کبھی اتفاق سے کچھ بچ جاتا تو تھوڑا بہت اپنے پرائے قرض ورض کے

نام سے وصول کر لیتے۔ پھر دینے کا نام لینے والا شاذ و نادر ہی کوئی اللہ کا بندہ ہوتا ہوگا۔ خصوصاً جب مولانا کی طرف سے کوئی تقاضا تو کیا یاد دہانی کا معمولی اشارہ تک دشوار تھا۔ ایک مرتبہ کوئی بڑی رقم غالباً ہزار پانچ سو کی اپنی ضمانت پر کسی کو دلوادی جو فرماتے تھے کہ بالآخر خود ہی ادا فرمانا پڑی۔"

ملازمت اور اس سے فراغت

حیدر آباد کی ملازمت کا سارا زمانہ مولانا نے عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ دینیات میں درس و تدریس میں گزارا تھا۔ لیکچرار سے پروفیسر ہوئے۔ آخر میں شعبہ دینیات کے صدر ہو گئے تھے اور اسی حیثیت سے ۳۱ مارچ ۱۹۴۹ء کو ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ بعد کا زمانہ مولانا نے اپنے وطن گیلانی میں بسر کیا۔ عبادت و ریاضت اور مطالعہ و تصنیف میں ان کی زندگی کے آخری ایام بسر ہوئے۔ آبائی زمین کی آمدنی اور پنشن کی رقم اتنی تھی کہ بہ اطمینان گزر بسر ہو جاتی تھی۔ اسی زمانے میں مولانا نے تصنیف و تالیف کے بعض اہم کام انجام دیئے۔ ۵ جون ۱۹۵۶ء کو مولانا نے داعی اجل کو لبیک کہا اور رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔

شادی

مولانا کی شادی تعلیم سے فراغت کے بعد داروغہ نظیر کی صاحب زادی سے ہوئی تھی۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی اپنے پیچھے یادگار چھوڑی۔ صاحبزادے کا نام سید محی الدین تھا۔ آزادی کے بعد پاکستان آ گئے تھے۔ پنجاب کی صوبائی انتظامیہ سے متعلق اور گوجرانوالہ میں کمشنر تھے۔ ۱۹۷۰ء میں گوجرانوالہ ہی میں انتقال ہوا۔ لاہور میں آسودہ خواب ابدی ہیں۔ بیٹی ان کے منجھلے بھائی مکارم احسن کے صاحبزادے سے بیاہی گئی تھیں۔ وہ ہندوستان میں رہیں۔

مولانا کے بھائی

اوپر گزر چکا ہے کہ مولانا مناظر احسن گیلانی تین بھائی تھے۔ ہمارے ممدوح مولانا گیلانی اپنے دونوں بھائیوں سے بڑے تھے۔ سید مکارم احسن منجھلے اور سید مظہر احسن چھوٹے تھے۔ ہمارے پاس ان دونوں کے بارے میں بہت کم معلومات ہیں۔

سید مکارم احسن

سید مکارم احسن نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کانپور میں ایک پرائیویٹ ملازمت سے کیا تھا۔ یہ تقریباً ۱۹۲۴ء کی بات ہے۔ ۱۹۲۵ء کے لگ بھگ انہوں نے حیدر آباد دکن کا سفر کیا۔ بعض دوستوں نے اصرار کیا کہ حیدر آباد میں

Marfat.com

ملازمت کا تعلق پیدا کرلیں۔ مولانا مناظر احسن نے ان کا یہ رجحان دیکھا تو انہیں مولانا حافظ محمد احمدؒ کے پاس لے گئے جو اس زمانے میں ریاست کے مفتی کے اعلیٰ منصب پر فائز تھے۔ مولانا مناظر احسن انہیں لے کر حضرت حافظ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وہ انہیں لے کر ریاست کے ایک صاحب رسوخ اور اعلیٰ منصب دار کے پاس گئے اور پُرزور الفاظ میں سفارش کی۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے مولانا قاری محمد طیب کے نام خط میں اس واقعے کا ذکر کیا ہے۔ حضرت حافظ صاحبؒ کی سفارش کے نتیجے میں انہیں دوسرے روز پروانہ تقرری تو مل گیا لیکن رات کی مہلت میں سید مکارم احسن کی رائے بدل چکی تھی۔ ممکن ہے اس میں برادر بزرگ کے ایما کا کوئی دخل ہو۔ اپائنٹمنٹ لیٹر ہاتھ میں ضرور آ گیا۔ کامیابی کی اس خوشی ہی نے انہیں ملازمت سے بے نیاز کردیا۔ سروس جوائن کیے بغیر ہی وطن لوٹ گئے۔ کچھ عرصہ میں کان پور کی پرائیویٹ ملازمت بھی ترک کردی۔ گیلانی کو اپنا مسکن اور گھر بار کی دیکھ بھال کی ذمہ داریوں کو سنبھال لیا اور زندگی بھر اسی میں مگن رہے۔

خاندان کی سرپرستی اور زمینوں کی دیکھ بھال ان ہی کے ذمے تھی۔ مولانا گیلانی سال کے سال گرمیوں کی تعطیلات میں وطن آتے تو ان کے دوست احباب اور عزیز واقارب کی گیلانی میں آمدورفت بڑھ جاتی اور گھر میں رونق آجاتی۔ حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ سید مکارم عزیزوں اور مولانا کے دوستوں کی تواضع میں کوتاہی نہ کرتے تھے۔ مولانا کے متعدد دوستوں نے اپنے مضامین میں ان کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا ہے۔ مولانا کے انتقال کی خبروں اور آخری حالات کی تفصیل میں بھی ان کا حوالہ آیا ہے۔

اگرچہ وہ ایک پڑھے لکھے شخص تھے لیکن عملی زندگی کے انہماک نے انہیں علمی اور فکری اثرات سے ہر طرح محفوظ رکھا۔ کسی علمی مسئلے میں ان کا تذکرہ کبھی سننے میں نہیں آیا۔ اگرچہ ان کے نام سے ''الرشید''، دیوبند بابت ماہ ذی قعدہ ۱۳۳۴ھ (ستمبر ۱۹۱۶ء) میں ''نوائے قدس'' (فارسی) اور ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ (اکتوبر ۱۹۱۶ء) میں ''طبیب الہند'' (اردو) کے عنوان سے دو نظمیں ان کے نام کی صراحت کے ساتھ چھپی ہیں اور ان کے ساتھ ''مسمار'' تخلص بھی دیکھا جاسکتا ہے لیکن اس کے سوا زندگی بھر ادب وشعر سے ان کے تعلق کا پتا نہیں چلتا۔ نہ کبھی مضمون نگاری کی طرف متوجہ نظر آتے ہیں، نہ کسی علمی بحث میں مصروف ملتے ہیں۔ مولانا (برادر بزرگ) رحمہ اللہ سے مراسلت کا تعلق زندگی بھر رہا لیکن اس مراسلت کا بھی ابھی تک کوئی نشان نہیں ملا۔ معلوم نہیں محفوظ بھی ہے یا نہیں۔ اگر یہ مراسلت محفوظ ہو تو بلاشبہ مولانا علیہ الرحمہ کے سوانح خصوصاً خاندان کے حالات کی بڑی قیمتی دستاویز ہوگی۔ ''الرشید'' میں ان کی جو دو نظمیں ملتی ہیں وہ اس زمانے کی ہیں جب مولانا گیلانی تعلیم سے فراغت کے بعد دیوبند گئے تھے اور ''الرشید'' اور ''القاسم'' کی ترتیب کی ذمہ داری ان پر آ گئی تھی۔ نظموں کا مضمون، ان کی زبان اسلوب وغیرہ اسی بات کے غماز ہیں کہ یہ کلام حضرت مولانا گیلانی مرحوم کے رشحات فکر وقلم کی یادگار ہے۔ اس لئے یہ دو نظمیں اس تالیف میں حضرت گیلانی کے کلام کے طور شامل کرلی ہیں۔ لیکن اگر کوئی محترم فاضل اس سے متفق نہ ہوں تو انہیں حق ہے کہ وہ اسے سید مکارم مرحوم کا کلام سمجھیں۔ اس صورت میں بھی ضروری تھا کہ ان کی علمی وادبی زندگی کی تنہا یادگار یہ نظمیں محفوظ ہوں۔ ممکن ہے آئندہ تحقیق کا قدم آگے بڑھے اور اس بارے میں قطعیت کے ساتھ کوئی بات کہی جاسکے۔

Marfat.com

حضرت مولانا گیلانی مرحوم سے انہیں بہت تعلق خاطر تھا۔ وہ بھائی کے بڑے خدمت گزار تھے۔ بھائی کے انتقال کا انہوں نے بڑا ماتم کیا تھا۔ ان کی پیدائش کی تاریخ کہیں نظر سے نہیں گزری۔ نہ انتقال کی خبر سے یہ پتہ چلا کہ اس وقت ان کی عمر کتنی تھی۔ دسمبر ۱۹۸۰ء یا جنوری ۱۹۸۱ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ''صدق جدید'' میں خبر شائع ہوئی کہ مولانا مناظر کے چھوٹے بھائی مکارم احسن کا انتقال ہوگیا۔

''حکیم عبدالاحد (پٹنہ) نے اطلاع دی ہے کہ مولانا مناظر احسن گیلانی کے چھوٹے بھائی مکارم احسن کا حال ہی میں انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم نے خاصی طویل عمر پائی۔ گھر اور جائیداد کا سارا کام مولانا مرحوم کی زندگی میں بھی یہی دیکھتے تھے۔

ایک بار مولانا مناظر احسن کے ہمراہ دریا بادبھی تشریف لائے تھے اور گھوم پھر کر قصبے کا چپہ چپہ دیکھا تھا اور جب مولانا دریا بادی مولانا گیلانی کے وطن ''گیلانی'' تشریف لے گئے تھے تو انہوں نے وہاں خیر مقدم کر کے وہاں کی ایک ایک چیز ان کو دکھائی تھی۔ مولانا دریا بادی کے انتقال پر ان کا بڑا ہی مؤثر تعزیت نامہ آیا تھا۔''

یہ شذرہ ۲۳ جنوری ۱۹۸۱ء کے ''صدق جدید'' میں شائع ہوا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سید مکارم احسن کا انتقال دسمبر ۱۹۸۰ء یا جنوری ۱۹۸۱ء کے پہلے ہفتے میں ہوا ہوگا۔

سید مظہر احسن

حضرت گیلانی کے سب سے چھوٹے بھائی سید مظہر احسن گیلانی تھے۔ ان کی تربیت انہیں حیدر آباد لے جانے اور ملازمت دلانے میں مولانا گیلانی رحمہ اللہ کا بڑا حصہ تھا۔ ۵ ستمبر ۱۹۷۷ء کو حیدر آباد میں انتقال ہوا۔ ''صدق جدید'' کے ایک ادارتی نوٹ سے معلوم ہوا:

''مولانا گیلانی کے خاندان کے ایک فرد جناب ایم مظفر گیلانی کے مکتوب سے جو ۲۶ ستمبر کو موصول ہوا، یہ افسوسناک خبر ملی کہ مولانا مناظر احسن گیلانی کے سب سے چھوٹے بھائی مظہر احسن صاحب گیلانی جو عثمانیہ یونیورسٹی میں معاشیات کے ریڈر اور بڑے مخلص صدق نواز تھے۔ ۵ ستمبر کو ماہ رمضان میں یکا یک ایک مختصر لیکن شدید علالت کے باعث روزہ کی حالت میں قبل اس کے کہ علاج معالجے کی کوئی ادنیٰ تدبیر بھی ہو سکے، راہی جناں ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مظفر گیلانی صاحب کا مکتوب پرچے میں درج کیا جارہا ہے۔

مظہر مرحوم ''صدق جدید'' کے عاشق زادوں میں تھے۔ مولانا دریا بادی ان سے اور وہ ان سے

خاص تعلق رکھتے تھے۔ان کی وفات پر ان کا بڑا ہی دردناک تعزیت نامہ آیا تھا۔عم محترم فرماتے تھے کہ ان کی آواز مولانا گیلانی مرحوم کی آواز سے بہت مشابہ تھی۔اس لئے جب وہ حیدرآباد گئے تھے تو نماز کی امامت ایک موقع پر انہیں سے کرائی تھی کہ اس طرح مولانا گیلانی کی سی آواز ان کی وفات کے بعد سننے کو ملے۔

''صدق جدید'' میں کبھی کبھی ان کے مراسلے بھی نکلے ہیں۔اللہ تعالیٰ مراتب بلند عطا کرے۔ مولانا دریابادی کی وفات کے بعد ایسا نظر آرہا ہے کہ ان کے خصوصی مخلصین اور عزیز بھی رفتہ رفتہ اس دنیا سے اٹھتے جارہے ہیں۔''

(صدق جدید لکھنؤ ۳۰ ستمبر، ۷ اکتوبر ۱۹۷۷ء ص ۲)

مرض الموت

حضرت گیلانی کی زندگی اور موت دونوں ''عاش حمیداً و مات حمیداً کی مثال تھیں۔دونوں قابل رشک تھیں۔ ہم ان کی سادہ و تکلفات سے پاک زندگی تو شاید اختیار نہ کرسکیں کہ یہ ہمارے بس کی بات نہیں لیکن ان کی جیسی موت کی ہم آرزو ضرور کرسکتے ہیں۔اسباب و وسائل معاش کے لحاظ سے ان کی زندگی میں فراغت ہی کی کیفیت رہی لیکن انہوں نے اپنے رہن سہن، لباس، خوراک کے انداز و معیار اسباب راحت میں قناعت پسندی، تکلفات سے بے نیازی سے اپنی زندگی کو اتنا سادہ اور آسان بنالیا تھا کہ اگر انہیں معاش کی وہ فراغت حاصل نہ ہوتی یا کسی وقت چھن جاتی، تب بھی انہیں کوئی تکلیف نہ ہوتی۔اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی ہی آسان اور دکھ تکلیف سے خالی موت عطا فرمائی۔ان کے چھوٹے بھائی مولوی مکارم احسن گیلانی نے مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام ایک تحریر میں ان کی بیماری اور رحلت کی پوری کیفیت بیان کردی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''قلب پر حملہ متواتر تین سال سے ہوتا رہا اور اکثر اتنا شدید حملہ ہوا کہ ہم لوگ تو یہی سمجھے کہ بس اب وقت آ گیا۔مگر ہر بار سکون ہو جاتا، ہفتہ دو ہفتہ قائم رہتا کہ پھر وہی حال ہو جاتا۔مرض قلب کا ہر ممکن ڈاکٹری علاج موجودہ زمانہ کے مطابق ہوتا رہا۔چنانچہ رمضان المبارک میں بھی دو شدید حملے ہوئے۔شوال میں سکون ہی سکون ایک حد تک رہا۔یہاں تک کہ ۴ جون (۲۴ شوال) کو کچھ عجب علامات نمودار ہوئیں۔دن میں بکثرت اشعار فنا کا مضمون لئے ہوئے وجد کے ساتھ پڑھتے اور گنگناتے رہے (مولانا کی خوش الحانی کا حال تو آپ کو معلوم ہی ہے) مثلاً فانی بدایونی کا یہ شعر

سنے جاتے نہ تھے تم سے، مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

Marfat.com

اور ہر چھوٹے بڑے سے گھر کے لڑکوں سے خوش کلامی کرتے رہے بلکہ کمرے کے اندر اور کچھ باہر ذرا چہل قدمی بھی کرلی۔ رات آئی تو وہی خوشی خرمی اور شعر و غزل کی تکرار۔ یقین کیجئے کہ بھائی صاحب کو اتنا مسرور برسوں سے میں نے نہیں دیکھا تھا اور یہ دیکھ کر میں خود اور گھر کے سب لوگ مسرور تھے۔ گیارہ بجے وہ سو گئے۔ میں بھی قریب ہی لیٹ گیا۔ نماز فجر کے وقت ہم دونوں جاگے۔ میں حسبِ معمول مسجد چلا گیا اور انہوں نے کمرے ہی میں نماز ادا کی۔

عام دستور ان کا نماز فجر کے بعد بھی کچھ سو رہنے کا تھا۔ میں نے تکیہ وغیرہ درست کر دیا اور وہ سو گئے۔ ایک گھنٹہ گزرا ہو گا کہ میرے منجھلے لڑکے نے محسوس کیا کہ سانس تیز چل رہی ہے۔ چند منٹ میں معتدل ہو گئی۔ لیکن دو ہی ایک منٹ بعد بالکل بند ہو گئی۔ اس کو شک ہوا۔ مجھ کو متوجہ کیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ روح پرواز کر چکی ہے۔ آنکھیں بند ہیں اور لبوں پر مسکراہٹ ہے۔ چند منٹ کے اندر خبر جوار بھر میں پھیل گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں مسلمان ہر طرف سے جوق در جوق آنے لگے۔ بہار شریف سے متعدد علماء بس پر آئے اور انہوں نے غسل و تجہیز و تکفین کا نظم اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بعد نماز ظہر جنازہ پڑھا گیا۔ نماز میں اس قدر ہجوم تھا کہ ایک بہت بڑے میدان کو تلاش کرنا پڑا۔ گیلانی کے لئے یہ ایک نئی بات تھی۔

ایک بات جو عام طور پر کہنے کے لائق نہیں۔ آپ کو لکھے دیتا ہوں۔ آپ کے یہ محبوب دوست تین سال سے مرض اور پرہیز کی سختیاں جھیل کر اب صرف چرم و استخوان ہو کر رہ گئے تھے۔ لیکن روح کے پرواز کرتے ہی چہرہ نوجوانوں کا سا ہو گیا تھا۔ فربہ، خوش رنگ، سرخ، داڑھی کے بال سیاہ ہو گئے۔ غسل کے وقت جسم پر گوشت تھا اور سینہ چوڑا پہلوانوں کا سا ہو گیا تھا۔ علماء نے یہ منظر دیکھا اور سب حیرت زدہ تھے۔ خاندانی قبرستان میں جو گھر کے قریب ہی ہے۔ مولانا ہی کے لگائے ہوئے باغ انبہ کے وسط میں جو آج کل پھلوں سے لدا ہوا ہے، جگہ ملی۔ عجب سماں پیدا تھا۔ (صدق جدید، لکھنؤ ۲۳ جون ۱۹۵۶ء۔ ص ۱۔۲)

وفات

ایک اور خط میں سید مکارم احسن گیلانی لکھتے ہیں:

''وصال سے ایک ماہ قبل طبی اعتبار سے حالت گرتی جاتی تھی لیکن شادمانی اور بشاشت بڑھتی جاتی تھی اور احباب سے دن رات کچھ نہ کچھ روحانی گفتگو کا سلسلہ حد سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ بیمار بھی ہیں۔ دو چار دس خط روزانہ لکھ لیا کرتے تھے۔ دو چار گھنٹے کتب

Marfat.com

بنی، پرچہ بنی بھی کر لیتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میرے منجھلے لڑکے میاں جمال احسن سلمہ کو......ایک گھنٹہ عربی بھی آخری ہفتہ زندگی میں پڑھانا شروع کیا۔ دیوان حافظ اور مثنوی مولانا روم کا درس بھی اس بچے کو دینا شروع کیا......آخری مہینے میں زیادہ تر وعظ دو باتوں پر ہوتا تھا:

......اوّل۔ یہ کہتے تھے کہ موت کے بارے میں عوام میں یہ غلط مشہور ہے کہ سکرات کی تکلیف موت میں ہوتی ہے بلکہ موت نام ہے ایک قسم کی نیند کا۔

......دوم۔ بار بار بلکہ ہزار بار کہا کہ جنت میں کوئی بوڑھا نہ جائے گا پہلے جوان کر دیا جائے گا......

یہ دونوں چیزیں تو ان آنکھوں نے بلکہ سینکڑوں آنکھوں نے دیکھیں۔ بوجہ سہ سالہ شدید مرض قلب کے لاغر ترین ہو گئے تھے۔ اول تو خاموش طریقے سے دوامی نیند آ ہی گئی۔ دوم روح پرواز ہوتے ہی جوان و توانا کر دیئے گئے۔ اچانک جوان دیکھ کر ہی میں نے جانا کہ اب یہ نہیں ہیں۔ فربہ سرخ چہرہ، سینہ چوڑا بھاری، گردن موٹی، داڑھی سیہ۔ علماء نے غسل دیا تو سب کو یہ سماں دیکھ کر حیرت تھی۔ بعد غسل میت کمرے سے حویلی گئی۔ چہرہ کھول کر بستی کی اور گھر کی عورتوں نے دیکھا تو سب ایک زبان بول اٹھیں کہ یہ تو پچیس برس کے جوان ہیں۔ داڑھی سیاہ ہو جانے کا چرچا ہر طرف تھا۔'' (صدق جدید لکھنؤ، ۲۱ ستمبر ۱۹۵۶ء، ص ۶)

قطعہ تاریخ وفات

مولانا گیلانی کی وفات پر متعدد شعرائے کرام نے منظومات میں اپنے رنج و غم کا اظہار کیا اور قطعات تاریخ وفات کہے۔ ان میں ایک مولانا مرحوم کے دوست، قدر دان نامور شاعر حاجی محمد اصطفا خان لکھنوی (ف، ۲۸ مارچ ۱۹۶۳ء) بھی تھے۔ یہ بزرگ ۱۹۴۷ء کے بعد ترک وطن کر کے پاکستان چلے گئے تھے۔ کراچی میں کاروبار کر لیا تھا اور وہیں مقیم ہو گئے تھے۔ مشرقی تہذیب کا نمونہ اور ایک مجلسی یادگار شخصیت تھے۔ انہوں نے جو تاریخی نظم کہی تھی اس میں نہ صرف تاریخ وفات ہے تاریخ ولادت بھی موجود ہے اور نہ صرف شاعرانہ محاسن اور فنی خوبی کی بنا پر یادگار رہے بلکہ اس میں انہوں نے مولانا گیلانی کی شخصیت، زندگی کے بعض خصائص اور ان کی پاکیزہ سیرت کی تصویر بھی کھینچ دی ہے۔ امید ہے قارئین کرام اسے ضرور پسند فرمائیں گے۔ نظم یہ ہے:

تاریخ رحلت پاکیزہ باطن	شمع انجمن مولوی مناظر احسن
۱۹۵۶ء	۱۹۵۶ء

(از حاجی محمد اصطفا خان صاحب لکھنوی ثم کراچوی)

Marfat.com

دارفانی سے سدھارے افسوس علم تاریخ کے اک ماہر فن
نام سے سال ولادت ہے عیاں دیکھو اعداد مناظر احسن

۱۳۱۰ھ

آپ مشہور ہوئے گیلانی آپ کا قصبہ گیلان ہے وطن
ہند میں شہر ہے پٹنہ مشہور اس میں قصبہ ہے یہ مشہور زمن
مائل باعمل و حامی دیں ماحی بدعت و اوہام شکن
سخت سے سخت علالت میں کبھی صبر کا ان سے نہ چھوٹا دامن
تھے سخن فہم بہت شاعر کم دل کے بہلانے کو تھا شغل سخن
حیدرآباد میں کی خدمت خلق یاد رکھیں گے انہیں اہل دکن
ایک مخزن ہے تصانیف ان کی رہنے والی ہے جو مثل معدن
مغفرت ان کی کر، اے رب کریم! تھی انہیں تیری محبت کی لگن
قرب خاص ان کو عطا کر یا رب قصر رحمت بنے ان کا مسکن
مہبط نور لحد بن جائے ازپئے روح مناظر احسن
بارش نور قیامت تک ہو مہبط رحمت حق ہو مدفن
شامیانہ تری رحمت کا رہے فرق پر حشر کے دن سایہ فگن
لکھئے تاریخ دعاؤں کے بعد کہ چلی آتی ہے یہ رسم کہن

اصطفا! سال وفات مرحوم
لحد پاک ...... مناظر احسن

۱۳۷۵ھ

(صدق جدید، لکھنؤ۔۱۵ اکتوبر ۱۹۵۶ء، ص ۷)

لوحِ مزار

یہ تو معلوم نہیں کہ مولانا کی قبر کی کیا حالت ہے، اس پر کوئی سائبان احاطہ ہے یا نہیں اور قبر پر کوئی کتبہ ہے یا نہیں؟ لیکن ان کے دوست اور مخلص اس سے غافل نہ تھے۔ ان کے ایک حیدرآبادی قدردان اور مخلص حکیم الشعراء سید احمد حسین امجد (ف ۱۹۶۱ء) نے لوح مزار وقطعہ تاریخ وفات لکھ دیا تھا اور حضرت مولانا کے ایک شاگرد مخدوم محی الدین (ف اگست ۱۹۶۹ء) نے ''صدق جدید''، لکھنؤ بابت ۴ اکتوبر ۱۹۵۷ء میں چھپوا دیا تھا۔ یہ قطعہ تاریخ رحلت اور لوح مزار ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون

قطعہ تاریخ رحلت

مولانا السید مناظر احسن الگیلانی۔ رئیس شعبہ الدینیات للجامعۃ العثمانیہ حیدر آباد دکن۔ الی دار البقاء
من خلیلہ وصفیہ حکیم الشعراء السید احمد حسین امجد حیدر آبادی

جان بحق داد مرد حق آگاہ   دفن شد گنج علم در مدفن
بسر آہ گفتم اے امجد   خواب گاہے مناظر احسن

۱۹۵۶ء

ولادت۔ مناظر احسن رضی عنہ اللہ الولی الوکیل ۹ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ
وفات۔ مناظر احسن رضی عنہ اللہ الولی الوکیل ۲۵ شوال ۱۳۷۵ھ

خانک لم تبعد علی متعھد   بلی! کل من تحت التراب بعید
من تلمیذہ وممنون برہ ومتشکر لاحسانہ محمد مخدوم محی الدین الحیدر آبادی۔

اخلاق وسیرت

اخلاق:

حضرت مولانا گیلانی میں اللہ تعالیٰ نے سیرت کے بہت سے محاسن اور اخلاقی کمالات کو جمع فرما دیا تھا، جس کی وجہ سے وہ اپنے اقران وامثال کی ایک محبوب ہستی بن گئے تھے۔ ان کے تمام مصنفین اور مضمون نگاروں نے ان کی سیرت اور اخلاق کی خوبیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ یہاں میں صرف مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے افکار ومعلومات سے قارئین محترم کی ضیافت طبع کا سروسامان کرتا ہوں۔ مولانا فرماتے ہیں:

> ''مزاج میں انتہائی سادگی اور بے تکلفی تھی۔ اپنی بڑائی اور اپنے کمالات کا شاید وسوسہ بھی کہیں نہیں پیدا ہوا۔ اپنے سے چھوٹوں اور کہیں چھوٹوں کی بات کو اس التفات سے سنتے کہ وہ گویا ان کے ہمسر ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو اپنے چھوٹوں کو اتنا بڑھاتے کہ وہ بے چارے خود اپنے متعلق بڑی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتے۔ بے تکلف و بے ساختہ طرز انشاء اور بے تصنع و پُر جوش رنگ تقریر دونوں اس سرشت وطینت کے پرتو تھے۔ تحریر وتقریر دونوں میں بس معلوم ہوتا تھا ایک دریا اُبلا پڑ رہا تھا۔

Marfat.com

طبیعت کے لحاظ سے اتنے وارستہ تھے کہ کھانے کو جو مل گیا بس اسی کو غنیمت سمجھتے۔ پہننے کو جو کچھ ملا خوش ہو کر پہن لیا۔ رہنے سہنے کا جو ادنیٰ سے ادنیٰ معیار بھی وقت کے ساتھ نصیب ہو گیا اسی میں مگن زندگی گذار دی۔ ایک زمانے میں موٹر بھی رکھی۔ لیکن ان کے لئے موٹر اور رکشہ اور جھٹکا اور پیدل سب برابر ہی تھے۔ بڑے رقیق القلب، بڑے رحم دل، بڑے نرم مزاج تھے۔ دوسرے سے اپنی بات منوانے کے فن سے واقف ہی نہ تھے۔ کسی ادنیٰ شخص کی بھی ناخوشی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اسے آزردہ دیکھ کر بلاوجہ اور خواہ مخواہ بھی اپنی غلطی تسلیم کرتے اور اسے منانے میں لگ جاتے۔

دوسروں کی امداد کا حوالہ دینے میں ذرا بھی بخیل اور تنگ دل نہ تھے۔ ہر ادنیٰ امداد کا حوالہ بھی بڑی فیاضی اور خوش دلی سے دیتے اور اس کی بشارت میں آج اس دنیا میں بھی دیتا ہوں اور کل ان شاء اللہ حشر میں بھی دوں گا کہ اپنی ۳۶۔ ۳۷ سال کے تعلق و ارتباط کی لمبی مدت میں ایک بار بھی اپنی بڑائی کا کوئی کلمہ ان کی زبان سے سننے میں نہ آیا۔
یہ سارے اوصاف معمولی نہیں غیر معمولی ہیں۔''

(صدق جدید، لکھنؤ ۱۵ جون ۱۹۵۶ء)

مولانا سید صباح الدین عبدالرحمٰن حضرت گیلانی کے عقیدت کیش اور مشہور اہل قلم اور نامور مصنف تھے۔ انہوں نے مولانا کو دور و نزدیک دیکھا تھا اور مولانا کے معاصرین سے ان کا قریبی تعلق تھا۔ وہ اپنا مشاہدہ و مطالعہ مولانا کے بارے میں یہ بیان کرتے ہیں:

''وہ اپنی فضیلت اور بزرگی کی داد لینے یا سننے میں ہمیشہ مستغنی اور بے نیاز رہے۔ حالانکہ وہ خود ہم عصروں کے کمال کی داد دینے میں بڑے فیاض تھے۔ بلکہ بعض دوستوں کے اوصاف بیان کرنے میں تو قصیدہ خواں ہو جاتے۔ ان کے ہم چشموں میں شاید ہی کسی کو ان کی تحریر سے کوئی تکلیف پہنچی ہو۔ ان کی طبیعت میں بڑی مٹھاس تھی۔ اس لئے نجی گفتگو میں بھی ان کی زبان سے کوئی ایسی بات نہ نکلتی جس سے کسی کی دل آزاری ہو۔ بعض اوقات تو اس شفقت و محبت میں نو آموز اہل قلم کے لئے ایسے تعریفی کلمات لکھ جاتے جن کا وہ مستحق نہ ہوتا۔ لیکن ان کی تعریف یا داد دل بڑھانے اور کام کا حوصلہ پیدا کرنے کی خاطر ہوتی اور ان کی اس مخلصانہ فراخ دلی نے ان کے بہت سے شاگردوں کو اہل قلم اور مصنف بنا دیا اور ان کے احباب تو ان کے علم و فضل کے علاوہ ان کی سیر چشمی، رواداری، جوہر شناسی، قدر دانی، مرنجاں مرنج طبیعت اور مزاج کی شگفتگی سے ہمیشہ ان کے گرویدہ رہے۔'' (بزم رفتگاں، ص ۲۹۴)

خاکساری و فروتنی

مولانا عبدالباری ندوی مرحوم نے ایک قرن ان کے قرب وصحبت میں گذارا تھا اور انہیں اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، خلوت وجلوت میں دیکھا تھا۔ ان کی زندگی میں سیرت کی جو بڑی خوبی انہیں نظر آئی وہ ان کی بے غرضی، پاک نفسی، کبر ونخوت سے دوری، خاکساری اور فروتنی اور عجز وانکسار تھا۔ انہوں نے اپنی ذات کی بالکل نفی کردی تھی اور انانیت کو مٹا دیا تھا۔ مولانا ندوی مرحوم نے ''مکاتیب گیلانی'' کے مقدمے میں ان کی شخصیت کے اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ فرماتے ہیں:

''۲۳۔۲۴ سال اس دنیا میں ان سے دور ونزدیک کے تعلقات کی سعادت حاصل رہی۔ ان میں بھی قریباً چوتھائی صدی کی طویل ومسلسل قیام وطعام، خلوت وجلوت، سفر وحضر، صحت ومرض وغیرہ کے ہر حال میں شب وروز کی یکجائی ورفاقت کی بدولت جس طرح جتنا موقع ان کے علمی وعملی، دینی ودنیوی، ظاہری وباطنی احوال کو قریب سے دیکھنے کا نصیب رہا یقیناً اس خوش نصیبی میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ آج ان سطروں کو سپرد قلم کرتے اور از سرنو اس طویل ومدید معیت ورفاقت کا پوری احتیاط کے ساتھ جائزہ لیتے ہوئے ذمہ داری کے پورے احساس کے ساتھ شہادت ادا کر رہا ہوں کہ مولانا مرحوم میں جو بھی کمزوریاں رہی ہوں اور معصوم کون بشر ہوتا ہے ......لیکن جہاں تک دل کا تعلق ہے کہنا چاہیے کہ اس کی تمام بیماریوں سے ان کو پاک ہی پاک پایا۔ بغض وحسد، انتقام وعداوت، ریا ونفاق، نمود ونمائش، حرص وہوس، طول امل وغیرہ کے نفسانی جذبات کا کوئی داغ دھبہ یاد پر زور ڈالنے سے بھی، ان کے آئینۂ دل پر پڑتا خصوصاً ٹھہرتا قطعاً یاد نہیں پڑتا۔ ہمارے علم وقلم کے نیچے اونچے نام والے صلحا بھی ذرا ٹھنڈے دل سے خود اپنے دلوں کا محاسبہ فرما دیکھیں، تب ہی دل کی ان بیماریوں کی ہمہ گیری اور گیلانی جیسے صاحب علم وقلم کی ان سے اتنی استثنائی وکرامتی دوری کی قدر وقیمت معلوم ہوگی۔

''سارے اخلاقی رذائل یا باطنی امراض سچ پوچھیے تو کبر ونخوت، خود بینی وخود پرستی ہی کی شیطانی ذریت یا انڈے بچے ہوتے ہیں مگر مولانا کی ہر شان پر غالب خود فراموشی یا فنائیت تھی۔ کچھ تو پیدا ہی مست وفانی ہوئے تھے۔ کچھ ذہانت وذکاوت کی افراط کا لازمہ بھی عموماً کچھ نہ کچھ مستی ورِبودگی ہی دیکھی جاتی ہے۔ پھر وجودی توحید جو مولانا کا خاص مذاق تھا یہ نام ہی صحیح معنی میں ''خودی'' سے گذر جانے یا اس کے فنا ہو جانے کا ہے۔ سونے میں سہاگہ حیدرآباد میں ان کو ایک مرشد بھی اس رنگ میں شرابور ملے۔ حال وقال سب کے مست ہی مست، بیداری کا ہر لمحہ سرور ومستی کا دیکھا، جس کی آنکھوں میں خدا کی عظمت وکبریائی، کیا اس کی ہستی اتنی سما گئی ہو کہ اپنی پرائی کوئی دوسری ہستی ''ہستی'' ہی نہ دکھائی دیتی ہو، اس کو من وتو یا اپنی کبریائی اور بڑائی

Marfat.com

دوسروں پر جتانے جمانے کا ہوش کیا رہ سکتا ہے۔ خود فراموشی کا عالم مولانا کی ظاہری زندگی پر بھی اتنا چھایا رہتا کہ کھانا پینا، سونا جاگنا ہر چیز کسی نظم و انتظام سے قطعاً آزاد رہتی، خود تو کیا تہہ فرماتے نوکر بھی آزاد رہتا۔ اگر وہ بھی تہہ نہ کرتا تو دن رات بستر تک اُلجھا ہی پڑا رہتا۔

''اس خود فراموشی میں خود فروشی و خود پرستی کی سمائی تو کہاں سے ہوتی، معمولی خودداری تک بے نیازی کا ہمارے مولانا کا ایک بالکل خاص بہت ہی عجیب نادیدہ و ناشنیدہ استثنائی حال پایا۔ کسی بڑے چھوٹے بلکہ ادنیٰ سے ادنیٰ نوکر چاکر تک کی ادنیٰ سے ادنیٰ خوشی کا تحمل مطلق نہ فرما سکتے۔ راقم گستاخ نے تو حیدرآبادی رنگ کا ایک مستقل خطاب ہی ''خوش کرن'' دے رکھا تھا۔

''اپنی معذوری و معذرت کا ایک دلچسپ عنوان پا کر خود بھی اس سے فائدہ اُٹھاتے، بعض مکتوبات میں بھی ناظرین کو ''بد خوش کرنی'' کے دامن میں پناہ لیتے ملیں گے۔ ایک مرتبہ کسی معاملے میں خود راقم نالائق کو شاید کچھ زیادہ ناخوش محسوس فرما کر تو غضب ہی فرما دیا کہ دھڑ سے پیروں پر گر پڑے۔ گھبرا کر ان کے سر کو اٹھا کر سینہ سے لگا لیا اور دونوں لپٹ کر خوب روئے۔ خیر میرا شمار تو پھر بھی بظاہر برابر والوں میں تھا۔ بارہا ہر کس و ناکس کے ساتھ اپنے دینی و دنیوی اور علمی مرتبہ و مقام سے کیا معمولی انسانی خودداری تک سے اتنا اتر آتے کہ ان کی اس خاص افتادِ طبع سے ناواقفوں کو خوشامد کا شبہ ہونے لگتا۔ کبھی کبھی مجھ سے دیکھا نہ جاتا اور ناگواری سے کہتا کہ آخر ساری خدائی کو خوش رکھنا آپ نے کیوں اور کیسے اپنے اوپر فرض ٹھہرا رکھا ہے اور اس میں کیسے کامیاب ہو سکتے ہیں۔'' (مقدمہ مکاتیب گیلانی، ص ۴۴۔۴۲)

ذہانت و طبّاعی

مولانا کے ذہن کی تیزی اور دراکی کا ان کے تمام مصنفین نے ذکر کیا ہے۔ مولانا عبدالباری ندوی مرحوم نے تو ان کے ساتھ زندگی کا ایک قرن گزارا تھا اور ایک مدت تک قرب و صحبت اور مذاکرہ و کلام کے بے شمار مواقع میسر آتے رہے تھے۔ ان کی نظر سے مولانا کی تحریریں بھی گزرتی تھیں۔ مولانا عبدالباری ندوی کے نزدیک وہ خطرناک حد تک ذہین تھے۔ لیکن ان کے طبع کی سلامتی انہیں ہمیشہ ہر خطرناک مقام سے بحفاظت نکال لے گئی لیکن ان کے قارئین کے لئے یہ خطرہ موجود ہوتا تھا۔ عوام اور سطحی معلومات کے پڑھے لکھے اور تشکیک کے شکار جدید تعلیم یافتہ ان کی علمی نکتہ آفرینیوں میں الجھ بھی سکتا تھا۔ حضرت گیلانی کو ان کے خطرات کا اندازہ تھا۔ اس لئے انہوں نے ایسے مواقع پر اپنے سمندِ فکر و طبع کی باگ کو کھینچے رکھا اور قارئین کی عام سطح فہم اور ان کے اوسط ظرف و تحمل کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی ذہانت و طباعی کا مظاہرہ برائے مظاہرہ نہیں کیا اور اصلاح فکر و عمل کے مقصد کو کبھی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ مولانا عبدالباری ندوی مرحوم نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

Marfat.com

''حضرت گیلانی (جعل الله فی قبره نورا کما جعل فی قلبه نورا) کے ذہنی و دماغی، علمی و قلمی گوناگوں کمالات کسی تعریف و تعارف کے محتاج نہیں۔ خصوصاً اس بے علم کے قلم سے البتہ اس سلسلہ میں ایک بڑے خاص کمال کا علم و اندازہ جتنا اور جیسا کہ چاہیے لوگوں کو کم ہے۔ وہ ان کی بہت خاص الخاص قرآن مجید کی فہم و تفہیم تھی۔ ان کی انفرادی و فکری بڑائیوں میں راقم ہذا کی نظر میں یہی سب سے بڑی بڑائی تھی۔ بقول خود ''بیچارے مولوی نے سمجھا ہی نہیں'' کے نہ سمجھنے کے ڈر سے چھپاتے بہت تھے۔ سورہ کہف کی تفسیر شائع بھی ہونے دی تو اپنے خاص رنگ و ذوق کی چیزوں کو دبا دبا کر ہی زبان قلم تک آنے دیا۔ کچھ شک نہیں کہ بار ہا ان کے ذہن کی تیزی اس راہ میں جتنی دور نکل جاتی وہ خلاف احتیاط ہی نہیں، ایمان و عمل کے لئے خطرناک بھی ہو جاتی تھی۔ خصوصاً عوام کے حق میں تاہم ان کی ژرف نگاہی اور دوررس ذہن ایسے بہتیرے حقائق کو پالیتا جن پر سلف سے خلف تک شاید ہی کسی مفسر قرآن کی نگاہ پڑی ہو اور یہ ''لا تنقضی عجائبه'' والی کتاب کے اعجاز کی عین شہادت ہے۔

اس زندہ کتاب کو حضرت مرحوم تفسیری کتابوں سے زیادہ زندگی کی زندہ کتاب اور زندہ واقعات و مشاہدات سے سمجھنے سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔'' (مقدمہ مکاتیب گیلانی، ص ۲۸۔۱۲۷)

خوش طبعی

حضرت مولانا گیلانی کی طبع لطیف نے خوش طبعی سے بھی حصہ پایا تھا۔ ذوق مزاح سے بہرہ اندوز ہوئے تھے۔ متعدد اہل قلم نے جنہیں ان کی تقاریر سننے اور ان کی مجالس میں بیٹھنے کا موقع ملا تھا ان کی خوش طبعی اور ذوق مزاح کا ذکر کیا ہے۔ مولانا عبدالباری مرحوم لکھتے ہیں:

''مولانا کی زندگی کا ایک اور گوشہ خوش طبعی و مزاح پسندی تھا جو کبھی کبھی مزاح کی حدود سے بہت آگے بڑھ جاتی۔ بلکہ اگر کوئی اس ڈھب کا بزاخفش ہاتھ لگ جاتا تو اس کو کھلا پلا کر مستقلاً تفریح طبع کا تختہ مشق بنائے رکھتے۔ حیدرآباد کے آخر زمانے میں ''بزاخفش'' کا یہ منصب سالہا سال تک خود اپنی مسجد الحی کے امام کو عطا رہا۔ یوں بھی کوئی موقع پا جاتے تو چوکتے ہرگز نہیں۔ ہم دونوں کے ایک اچھے دوست نے کسی تعلیم یافتہ مطلقہ خاتون سے شادی کر لی، جو ساتھ کچھ اولاد بھی لائیں۔ وظیفہ یاب ہو کر مولانا وطن میں تھے تاہم یہ خبر پا کر ضبط نہ فرما سکے۔ کچھ اشعار دوسرے کے نام سے موزوں فرما کر تفریحی مبارک باد پہنچا کر رہے۔'' (مقدمہ مکاتیب گیلانی، ص ۴۹)

مولانا عبدالباری مرحوم نے اس مقام پر مولانا مرحوم کے دو شعر بھی نقل کر دیے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ

Marfat.com

یہاں ان کا نقل کرنے سے نقل نہ کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ البتہ ان کی شاعری کے بیان میں نظر آ جائیں گے۔

فضائل وکمالات

خطابت

مولانا شیریں بیاں مقرر اور بلند پایہ خطیب بھی تھے۔ ان کی تقاریر کا سب سے اہم موضوع ''سیرت نبوی'' ہوتا تھا۔ سیرت نبوی کے جلسے اور مولود کی مجالس ان کا میدان تھا۔ یوں تو یہ جلسے ہمیشہ ہی ہوتے رہتے تھے۔ خوشی اور غمی کے ایام ان کے لئے مواقع بہم پہنچاتے تھے لیکن ربیع الاول کا مہینہ تو اس قسم کے جلسوں کا گویا موسم بہار ہوتا تھا۔ حیدرآباد میں نظام اور مسلمان امراء کے دینی ذوق نے ان مجالس کے فروغ میں خاص حصہ لیا تھا۔ ایک مقرر اور خطیب کی حیثیت سے مولانا اس ماحول کی ایک نامور اور مقبول شخصیت تھے۔ جامعہ عثمانیہ اور اس کے شعبہ دینیات کے تعلق نے ان کی شہرت کو گھر گھر پہنچا دیا تھا۔ ربیع الاول کے مہینے میں ان کی کوئی شب جلسے سے خالی نہیں جاتی تھی۔ ان کی شیریں بیانی اور انداز خطابت نے انہیں ان مجالس کا محبوب مقرر بنا دیا تھا۔ ان کی تقاریر اہل علم کی مجالس سے لے کر عوام کے جلسوں تک یکساں مقبول تھیں۔ پورا شہر ان کی تقاریر کا والہ وشیدا تھا۔ ان کی تقاریر نے مسلمانوں کے عقائد کو درست کیا۔ اعمال کی اصلاح کی، غلط رسوم ورواج سے تنفر پیدا کیا اور حیدرآباد میں اسلامی زندگی کی ایک لہر دوڑا دی تھی۔ ان کے دوستوں، مصنفوں اور تذکرہ نگاروں نے ان کی تقریر کی روانی، معلومات کی فراوانی اور خوش بیانی کی تعریف اور اس کے اثر ونفوذ کا اعتراف کیا ہے۔ مفتی ظفیر الدین مفتاحی نے اپنی تصنیف ''حیات گیلانی'' میں مولانا کی خطابت کے تذکرے کے لئے ایک مستقل باب باندھا ہے۔

انجمن اصلاح المسلمین دبیر پور حیدرآباد دکن کے مولوی خیر الدین نے حیدرآباد میں ان کی مقبولیت اور خدمات کے اس ذریعے کے بارے میں لکھا ہے:

> ''مسلمانان حیدرآباد کو ابتداءً ان کے مواعظ حسنہ نے ان کا گرویدہ بنالیا۔ پھر ان کی سادہ زندگی اور طلبہ پر شفقت اور بے لوث پُرخلوص خدمات نے کلیہ جامعہ اور عوام پر گہرا اثر قائم کیا۔ حیدرآباد کا کوئی بڑا علمی میلاد کا جلسہ ایسا نہیں ہوتا تھا جس میں مولانا مرحوم کی موجودگی ضروری اور لازمی نہ سمجھی جاتی ہو۔ حیدرآباد کے میلاد کے بڑے بڑے عظیم الشان جلسے خواہ وہ ربیعین میں ہوں یا رجب، شعبان، رمضان وغیرہ میں ہوں۔ ان میں ہمیشہ مواعظ ہی ہوتے ہیں اور ان جلسوں میں قرآن وحدیث وسیرت سے استدلال ہوتا ہے۔ مولانا مرحوم کے مواعظ کو حیدرآباد میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔'' (صدق جدید، لکھنؤ۔ ۱۷ اگست ۱۹۵۶ء، ص ۶)

Marfat.com

مولانا سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم لکھتے ہیں۔

''وہ بڑے شیریں بیان مقرر بھی تھے۔ یہ برابر خبر ملتی تھی کہ حیدرآباد میں عید میلاد النبیؐ کے موقع پر حضور نظام خاص طور پر ان کی تقریر سننے کے لئے شریک ہوتے ہیں۔ وہ اپنی تقریروں میں دلچسپ قصے اور لطیفے بیان کرتے، جن سے سامعین بہت محظوظ ہوتے۔ ان کو واعظانہ رنگ کے علاوہ تبلیغی، علمی اور کبھی کبھی سیاسی تقریر کرنے میں بڑی قدرت حاصل تھی۔ وہ اپنی تقریر کی ''متین شوخی'' سے لوگوں کو ہنساتے تو اپنے عالمانہ استدلال اور عارفانہ نکتہ دری سے ان کو متاثر بھی کرتے تھے۔''

(مولانا مناظر احسن گیلانی (نقوش وتاثرات)۔''معارف اعظم'' گڑھ، مارچ ۱۹۵۷ء، ص ۱۸۶)

صحافت

مولانا گیلانی ابھی تعلیم سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ مضمون نگاری کا شوق پیدا ہوگیا تھا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۳۳۴ھ (۱۹۱۶ء) میں ''القاسم'' و''الرشید'' ان کے ہاتھ میں آگئے تھے۔ ان کے ہر شمارے میں ایک مضمون کو لازماً اور بعض اوقات کئی کئی مضمون ہوتے تھے۔ ایک عرصے تک ان کی ترتیب وتدوین ان ہی کے ذمہ رہی اور قانون وضابطے کے مطابق نہ سہی عملاً وہی ان کے مدیر تھے۔ ادارتی صفحات تک ان کے سمند فکر کی جولان گاہ بنے رہے۔ اصلاح فکر واعمال اور تشریح وتوضیح مسائل میں انہوں نے جو طرز فکر اور اسلوب نگارش اپنایا تھا اس نے اساتذہ کے قلوب میں ان کے فکر وقلم پر اعتماد پیدا کردیا۔ اساتذہ ان کے ذہن وفکر اور مطالعہ ونظر کے قائل پہلے بھی تھے۔ اب ان کے گرویدہ بھی ہوگئے۔

''دارالعلوم'' نکلنا شروع ہوا تو اس کے اولین لکھنے والوں میں مولانا گیلانی کا نام سرفہرست تھا۔ ''برہان'' (دہلی)، ''الفرقان'' لکھنؤ اور ''معارف'' (اعظم گڑھ) کے صف اول کے لکھنے والوں میں تھے۔ ہفت روزہ ''صدق جدید'' (لکھنؤ) اور جامعہ عثمانیہ کے علمی وتعلیمی مجلات میں ان کے بیسیوں بلند پایہ مقالات شائع ہوئے۔ ملک کے دیگر رسائل وجرائد کے صفحات بھی ان کے افادات علمیہ ودینیہ سے خالی نہیں رہے۔ مولانا سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے لکھا ہے۔

''۱۹۴۰ء کے بعد علمی دنیا کی فضا میں ہر طرف چھائے ہوئے تھے۔ معارف، برہان، الفرقان، مجلہ عثمانیہ، عثمانیہ یونیورسٹی کے اسٹاف میگزین، ندیم، صدق وغیرہ ان کے قلم کی بارش سے سیراب ہورہے تھے۔ ان کے مضامین کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ وہ کبھی عالم، کبھی متکلم، کبھی فقیہ، کبھی محدث، کبھی مفسر اور کبھی مورخ کے رنگا رنگ جلووں میں نظر آتے تھے۔''

(مولانا مناظر احسن گیلانی (نقوش وتاثرات)۔ معارف اعظم گڑھ، محولہ بالا، ص ۱۷۹)

وہ طبقہ علماء میں چند زود نویس اہل قلم میں شمار ہوتے ہیں۔لیکن زود نویسی ہی مولانا کی خوبی نہ تھی۔ وہ لکھتے بھی بہت اچھا تھا۔معنی آفرینی، فکر انگیزی اور افکار و معلومات کی فراوانی بھی ان کی تحریروں کی صفات شمار ہوتی ہیں۔

تصوف سے خاص دلچسپی

تصوف کا ذوق ان کے علم وعمل پر چھایا ہوا تھا۔فلسفہ وکلام کے مطالعے نے ان کی طبیعت کے لئے تصوف کو مانوس اور دینی ذوق نے اسے ان کے معمولات کا ایک حصہ بنا دیا تھا۔ان کی تحریروں میں تصوف کا ذوق اس طرح جاری نظر آتا ہے جس طرح انسان کی رگوں میں خون گردش کرتا ہے۔ انہیں دیکھنے والے اور ان کی تحریروں کو پڑھنے والے اسے نہ صرف محسوس کرتے ہیں بلکہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔تصوف کے علمی وعملی ذوق نے ان کی زندگی میں گفتگو اور بیان وخطابت میں اور تحریروں میں ایک قوی اثر اور سوز وگداز پیدا کر دیا ہے اور خاص تصوف میں ان کی جو تحریریں یادگار ہیں ان کے اثرات وموثرات کا تو پوچھنا ہی کیا۔ان پر لکھنے والوں نے اور سب ہی نے ان کے ذوق اور زندگی میں اس کے اثرات کا ذکر کیا ہے۔مولانا دریابادی اپنے مضمون ''محقق گیلانی'' میں لکھتے ہیں:

''تصوف کے بڑے جاننے والوں میں سے تھے۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی سے عقیدت خصوصی بھی رکھتے تھے اور مناسبت طبعی و روحانی بھی، باوجود اس کے رسوم خانقاہی اور بدعات مشائخ کے ذرا بھی قائل نہ تھے اور وہم پرستیوں اور ضعیف الاعتقادیوں کے نزدیک بھی نہیں گئے تھے اکبر کی زبان میں۔

قائل میں تصوف کا ہوں اکبر لیکن　　　　ارواح پرستی کو تصوف نہیں کہتے

ضابطہ سے بیعت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیو بندیؒ سے تھی اور طبیعت پر مذاق توحید تمام تر غالب تھا۔نماز میں قرآن مجید اس خوش الحانی اور درد و تاثر سے پڑھتے کہ جی چاہتا گھنٹوں اسے سنتے رہیے۔(صدق جدید لکھنؤ۔۱۵ جون ۱۹۵۶ء، ص ۵)

تصوف کا ذوق مولانا گیلانی کی طبیعت ثانیہ بن گیا تھا۔انہوں نے تفسیر، حدیث، سیرت، فقہ اور تذکار و سوانح میں مرتب اور غیر مرتب جو ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے اس میں ضمناً تصوف کی نہایت مفید بحثیں آئی ہیں اور اشارات و کنایات سے تو ان کی کوئی تحریر خالی نہیں۔ ان کے ذوق تصوف سے ان کی ہر تحریر سیراب ہوئی ہے اور ''مقالاتِ احسانی'' کا تو پورا مجموعہ ہی تصوف کے زندہ جاوید افکار کا گلدستہ ہے۔

مولانا گیلانی کی وسعت مسلک

حضرت گیلانی کے اخلاق وسیرت کے مختلف پہلوؤں پر اس مضمون میں بہت سی باتیں آ گئی ہیں۔لیکن ان

Marfat.com

کے فکر و سیرت کے جس پہلو کی طرف میں قارئین محترم کی خاص طور پر توجہ دلاؤں گا وہ ہے ان کا وسعت مسلک "اگر کسی شخص کے ذوق اور مطالعہ و نظر نے اس کے دل میں کسی فکر و عقیدہ اور طریقہ عمل کے لئے جگہ بنادی ہے اور اخلاص نیت کے ساتھ کسی مسلک کو اس کے لئے پسندیدہ بنادیا ہے تو اس کی دیانت اور اخلاق کا تقاضا ہے کہ اس پر قائم رہے اور دوسرے لوگ اس کی رائے اور پسند کا احترام کریں۔ جو اختیار اور آزادی کوئی شخص اپنے لئے پسند کرتا ہے وہ اسے دوسرے کو بھی دینا چاہیے۔ اگر ایک شخص پسند نہیں کرتا کہ اس کے عقیدہ و مسلک میں کوئی دوسرا مداخلت کرے تو اسے بھی دوسرے کے عقیدے اور مسلک میں مداخلت سے باز رہنا چاہیے۔ جب یہ معلوم ہے کہ اصل سرچشمہ ہدایت اور منبع شریعت کتاب اللہ اور سنت رسول صلعم ہے، انسانی سعادت کی بنا اتباع احکام الٰہی اور اطاعت رسول صلعم ہے نہ کہ کسی غیر معصوم کی محض تقلید۔ اور فقہی اختلافات حالات گرد و پیش اور زمانے کی تبدیلیوں اور انسانی ضرورتوں اور ذوق و رجحان اور اجتہاد علم و فکر نے پیدا کردیئے ہیں تو کسی فقہی مسلک اور دائرہ فکر کا رد و انکار اور کسی صاحب مسلک کی توہین و تنقیص اور اس پر تنقید کیسی؟ لیکن ہم انسانی فطرت کی اس خوبی سے انکار نہیں کرسکتے کہ جب ایک انسان کوئی عقیدہ و مسلک ترک یا اختیار کرتا ہے تو اس کی دلی خواہش جدل و بحث کا ایک میدان ہموار کردیتی ہے جس کی وجہ سے انسانی زندگی کی بعض ناخوش گواریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور اگرچہ مقصد مسرت اور سکون کا حصول ہوتا ہے لیکن سب سے پہلے وہی غارت ہو جاتا ہے۔ قرآن حکیم نے اس انسانی خواہش کی تو نفی نہیں کی لیکن اس کا طریقہ یہ بتلایا ہے کہ یہ جدل و بحث احسن طریقے سے ہونی چاہیے۔ انسان کی یہ آرزو بری نہیں کہ وہ جس عقیدہ و مسلک کو حق سمجھتا ہے اس کی طرف لوگوں کو بلائے لیکن اسے سمجھ لینا چاہیے کہ وہ صرف دعوت کا مکلف ہے، جبر و اکراہ کا مجاز نہیں۔ کسی شخص کو بدل دینا اس کے اختیار کی بات نہیں۔ اگر لوگ اس نکتے کو سمجھ لیں تو ہماری زندگی کے بہت سے اختلافات دور ہو جائیں، ناخوش گواریاں مٹ جائیں اور جن خوشیوں اور مسرتوں سے ہم دور ہو گئے وہ ہمیں مل جائیں۔

حضرت مولانا گیلانی اس معاملے میں بہت وسیع القلب اور فراخ حوصلہ تھے۔ تقشف اور تنگ نظری سے دور و نفور۔ ڈاکٹر غلام محمد مرحوم نے "بینات" (کراچی) میں "تذکرہ احسن" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا۔ اس میں وہ فرماتے ہیں۔

> "مولانا کے قلب اطہر میں ملت محمدیہ کی محبت اور اس پر شفقت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ مسلمانوں کی فلاح سے ایسے مسرور ہوتے تھے کہ جیسے خود ان کو کوئی ذاتی فائدہ پہنچ گیا ہو۔ وہ مشرباً پکے حنفی تھے، مگر یہ ان کے جذبہ شفقت کا اثر تھا کہ وہ زبانی بھی اور تحریراً بھی اس بات پر بہت زور دیتے تھے کہ موجودہ حالات میں علمائے کرام کو عام مسلمانوں کے لئے سہولت ہی کا پہلو اختیار کرنا چاہیے۔ خواہ اس میں مسلک حنفیہ کو چھوڑ کر کسی اور مسلک کی اقتداء کیوں نہ کرنی پڑے۔"

اس بیان پر مولانا دریابادی مرحوم نے ان الفاظ میں تبصرہ فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں: "اور یہ بات حرف بحرف صحیح

Marfat.com

ہے۔ مولانا باوجود پورے حنفی بلکہ پورے دیوبندی ہونے کے بڑا ہی وسیع مسلک رکھتے تھے اور متقشف بھی نہ تھے۔ فقہا کے کمال احترام وکمال تسلیم کے باوجود ان کے اقوال کو کتاب وسنت کے درجے پر رکھنے کے قائل نہ تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ یہ احکام نہیں ہیں۔ حکم دینے کا حق تو بس اللہ اور اس کے رسول ہی کو ہے۔ باقی یہ دینی اور شرعی مشورے ہیں اور نہایت اہم مشورے! جیسے طب وغیرہ دوسرے فنون کے ماہرین کے ہوتے ہیں۔"

(صدق جدید (لکھنؤ)، ۲۵اکتوبر ۱۹۵۷ء، ص ۳)

حضرت مولانا گیلانی کی شاعری

مولانا سید مناظر احسن گیلانی کئی زبانوں میں گہری نظر وعبور رکھتے تھے۔ اردو تو ان کی مادری زبان تھی۔ فارسی اور عربی کی تحصیل مدارس میں کی تھی۔ انگریزی زبان سے بھی کسی قدر واقفیت پیدا کرلی تھی۔ وہ ہندی سے کسی حد تک آشنا تھے۔ البتہ مگدھی زبان یا جدید بہاری زبان سے بخوبی واقف تھے اور واقفیت محض شد بد کی حد تک نہ تھی۔ ان کی تحریرات میں اس کے الفاظ اور جملے بے تکلفانہ استعمال ہوئے ہیں اور ان کی نعت ان کی واقفیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ فارسی میں بھی ان کی منظومات یادگار ہیں۔ اردو شاعری سے انہیں ٹونک کے زمانہ طالب علمی میں دلچسپی پیدا ہوئی تھی جو زندگی بھر باقی رہی۔ نظم، نعت، مرثیہ، نوحہ، مثنوی وغیرہ اصناف میں ان کا کلام یادگار ہے۔ متعدد نظمیں اور نعتیں ان کے ذوق شاعری کا ثبوت ہیں۔ بعض نظمیں مگدھی زبان میں یا جیسا کہ انہوں نے خود لکھا ہے کہ دیہات میں بولی جانے والی بہاری زبان میں بھی ہیں لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ انہوں نے شاعری سے ایک حد تک ہی تعلق رکھا۔ اگر اس پر توجہ دیتے تو وہ ایک اچھے شاعر بن سکتے تھے اور وقت کے بڑے شاعروں میں ان کا شمار ہوتا۔ وہ اردو فارسی میں ضیاء اور ہندی یا مگدھی میں دھرمی تخلص کرتے تھے۔

شکوۂ خواجہ

یہ مولانا گیلانی مرحوم کی مشہور نظم ہے اور یہی ان کی دریافت شدہ مطبوعہ پہلی نظم ہے۔ یقین ہے کہ اس سے پہلے بھی انہوں نے کوئی نظم، غزل یا کچھ اشعار کہے ہوں گے لیکن ان کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ یہ نظم ٹونک کے زمانہ طالب علمی کی یادگار ہے۔ ۲۲ صفر ۱۳۳۱ھ (۲۱ جنوری ۱۹۱۳ء) کو خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزار پر شاہ جہانی مسجد میں پڑھی گئی تھی۔ نظامی پریس بدایوں میں اسی عنوان سے چھپی تھی اور ٹونک سے مولانا محمد محی الدین ٹونکی نے شائع کی تھی۔ مطبوعہ نظم پر طباعت یا اشاعت کی تاریخیں تو درج نہیں لیکن اس کی آمدنی کے مصرف کے بارے میں اس صراحت نے کہ اس کی آمدنی کی رقم جنگ بلقان کے مجروحین کی امداد کے لئے وقف تھی، اس کا فیصلہ کردیا کہ اس کی اشاعت ۱۹۱۳ء مین عمل میں آچکی تھی۔ نظم پر مولانا کا نام اس طرح درج ہے۔

Marfat.com

''مولانا سید ضیاء محمد مناظر احسن گیلانوی بہاری''

''شکوہ خواجہ'' علامہ اقبال کے ''شکوہ'' کے طرز پر اس بحر میں ۲۲ بند پر مشتمل ایک مسدس ہے، جس میں مسلمانوں کے نکبت وشکستہ سامانیوں کا اور ہندوستان میں انگریزوں اور ترکی و عالم اسلام پر دُوَل متحدہ کے مظالم کا خواجہ سے شکوہ کیا گیا ہے۔ خواجہ سے مراد خواجہ عالی مقام حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ ہیں۔ انہیں سے استدعا کی گئی ہے کہ وہ مسلمانوں کی امداد کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں۔

کشور ہند کے سلطان سے گذارش ہے مری — اس کی سرکار میں کچھ کہنے کی خواہش ہے مری
دل سے فریاد سنے وہ یہی کوشش ہے مری — ایک ہی چھینٹے کی محتاج یہ سوزش ہے مری
آج میں اپنی شکایت کا صلہ پاؤں گا
اپنی بگڑی ہوئی تقدیر بنا لاؤں گا

کیا غریبوں پہ مرے خواجہ نوازش ہے یہی؟ — ہم ستم دیدوں کا کیا پاس گذارش ہے یہی؟
چشت کے ابر کی دنیا میں تراوش ہے یہی؟ — کیا مسلمانوں پہ فیضان کی بارش ہے یہی؟
حیف باشد کہ دریں وقت نہ خیزی آقا!
لختے برحالت ما لطف ترحم فرما!

اختتام نظم کے قریب ایک بند یہ ہے:

ہم نے مانا کہ بہت عاصی و سرکش ہم ہیں — قدم لعبت مغرب پہ سر اپنے خم ہیں
سالک راہ خدا ہم میں بہت ہی کم ہیں — پر کھڑے در پہ تمہارے توبہ چشم نم ہیں
اپنے وابستوں سے یہ چیں بہ جبینی کب تک؟
مرقد پاک میں یہ گوشہ گزینی کب تک؟

نظم میں جوش روانی ہے۔ دل میں دردمند وغم زدہ کے پھپھولے ہیں، جو بہہ نکلے ہیں۔ لہجہ پُرسوز ہے، جو دل پر اثر کرتا ہے۔ یہ وقت تھا کہ استعمار دشمنی کے جذبات سے ملک کی فضا معمور تھی۔ خصوصاً مسلمانوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت کا لاوا پھوٹ پڑا تھا۔ انگریزوں سے دشمنی اور نفرت ودشمنی کے جذبات نظم کے حروف وسواد سے ظاہر ہیں۔ ''شکوہ خواجہ'' میں ہمیں عقیدہ مذہبی تلاش نہیں کرنا چاہیے۔ ممکن ہے اس وقت کے ماحول اور گردوپیش کے اثرات وافکار کی کوئی جھلک اس میں نظر آجائے لیکن ان کی خاندانی روایت میں اور ان کی بعد کی زندگی میں اس قسم کے افکار کی کوئی پرچھائیں بھی نظر نہیں آتی۔ یہ صرف ایک اسلوب بیان ہے۔ درحقیقت بغاوت کا اعلان اور انقلاب کا درس ہے۔ مولانا گیلانی کے ایک رفیق (دیوبند) مولانا عبدالرحمٰن نے لکھا ہے کہ یہ نظم ضبط ہوگئی تھی لیکن کسی اور ماخذ سے اس بیان کی تائید نہیں ہوسکی لیکن ایک دور افتادہ عہد کے خیال پر کسی ایسے بیان کو ترجیح وتوقف حاصل ہے، محتاج بیان نہیں۔

Marfat.com

چند وضاحتیں

اس نظم کے سلسلے میں مولانا حکیم سید محمود احمد برکاتی مدظلہ نے از راہ عنایت ہمیں چند وضاحتیں تحریر فرما دی ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔ ''یہ نظم مولانا گیلانی نے ۱۹۱۲ء میں اجمیر میں لکھی اور پڑھی تھی۔ مولانا ٹونک میں زیر تعلیم تھے۔ مولانا حکیم سید برکات احمد چند روز کے لئے نواب ٹونک کے ساتھ سفر پر گئے تھے۔ تعلیم کے اس تعطل کے دوران وہ اجمیر گئے تھے۔ وہاں مولانا معین الدین اجمیری کے یہاں قیام کیا۔ ان کے چھوٹے بھائی غازی محی الدین، مولانا گیلانی کے رفیق درس اور بے تکلف دوست تھے اور ابتداء ہی سے سیاسی مزاج رکھتے تھے اور ملکی وملّی سیاسیات میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ ٹونک کے ریاستی ماحول میں سیاست شجر ممنوعہ تھی۔ اس لئے وہ اجمیر منتقل ہو گئے تھے۔ وہی مولانا کی اس نظم کے محرک ہوئے اور انہی نے ایک جلسہ عام میں مولانا سے یہ نظم سنوائی، جس نے آگ لگا دی۔ مسلمان بہت متاثر ہوئے۔ مقامی پولیس نے اس جوشیلی اور باغیانہ نظم کا نوٹس لیا اور شاعر کی گرفتاری کے درپے ہوئی۔ احباب نے مولانا کو تو فوراً ٹونک واپس روانہ کر دیا اور اس نظم میں چند اشعار کا اضافہ کر کے اسے چھپوا دیا۔

ہاں! گورنمنٹ کے سائے میں تو اہل اسلام   چین سے بیٹھے ہیں دن رات بعیش و آرام
روز افزوں ہے شہ جارج کا لطف و اکرام   پھر بھی بے چین بہت ہے یہ ضیاء ناکام
کہ پریشان ہیں یورپ میں ہمارے بھائی
ہدف تیز ستم ہوتے ہیں پیارے بھائی

مزید اطمینان دلانے کے لئے ''جواب شکوہ'' کی اشاعت کا وعدہ اور اعلان بھی کیا گیا۔

غازی محی الدین صاحب نے متوسطات تک تعلیم حاصل کی تھی اور ذہانت و فطانت کی وجہ سے طلبہ میں نمایاں تھے۔ مگر ان کے سیاسی رجحان نے تکمیل کی نوبت نہیں آنے دی اور وہ میدان سیاست میں کود پڑے اور بڑھتے ہی چلے گئے۔ یہاں تک کہ مولانا شوکت علی انہیں بمبئی لے گئے جہاں بعد میں وہ آل انڈیا خلافت کمیٹی کے جنرل سیکرٹری ہو گئے۔ تقسیم کے بعد وہ پاکستان آ گئے اور یہاں سیاست سے ایک لخت کنارہ کش ہو کر خالص علمی مشاغل میں منہمک ہو گئے۔ کئی معرکہ آرا علمی مقالات لکھے جو ''اقبال ریویو'' وغیرہ میں شائع ہوئے۔ ''اصطلاحات علوم وفنون'' کے نام سے ایک عالمانہ کتاب لکھی جو انجمن ترقی اردو پاکستان (کراچی) نے شائع کی۔''

مرثیے

مولانا گیلانی مرحوم نے متعدد شخصیات کی وفات پر جن سے انہیں عقیدت تھی، مرثیے اور نوحے بھی لکھے ہیں۔ ان کے مرثیے سوزِ غم میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اپنے دل وجگر کے ٹکڑے انہوں نے صفحہ کاغذ پر بچھا دیئے ہیں۔ یہ مرحومین جن کے مرثیے انہوں نے لکھے ہیں مولانا محمد علی (۱۹۳۱ء)، علامہ اقبال (۱۹۳۸ء)، ابو

Marfat.com

المحاسن مولانا محمد سجاد (۱۹۴۰ء) اور علامہ سید سلیمان ندوی (۱۹۵۳ء) ہیں۔ ان مرثیوں میں مرحومین کے سانحات انتقال پر رنج وقلق کے اظہار کے ساتھ ان کے خصائص علم وفکر اور ان کے اخلاق وسیرت کی طرف پُر معنی اشارات اور کنایات بھی کئے ہیں اور خدمات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اپنے وطن گیلانی کی مدح میں مثنوی لکھی اور طبع ہوئی ہے۔

نظمیں

محمد عامر قمر سلمہ نے مجھے حضرت مرحوم کی کئی نظمیں دکھائی ہیں جو ''القاسم'' (دیوبند) میں شائع ہوئی تھیں۔ گیارہ اشعار کی ایک نظم ''اشک حقیقت'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں چار اشعار فارسی کے اسی بحر و وزن میں شامل ہیں۔ (القاسم۔ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ)۔ ا نظم ''مضراب'' کے عنوان سے جمادی الاولیٰ ۱۳۳۵ھ میں چھپی ہے۔ عنوان کے نیچے خود شاعر کے قلم سے بایں الفاظ صراحت ہے۔

''ایک طویل گنگا جمنی (یعنی اردو اور فارسی سے مخلوط) نظم کے چند اشعار۔''

بارہ اشعار کی اس نظم میں سات شعروں کے پہلے مصرعے فارسی کے ہیں اور تین شعروں کے آدھے مصرعے اور مکمل جملے فارسی کے ہیں اور خواہ مکمل مصرعے ہوں خواہ مکمل جملے، کمال کی پیوندکاری ہے۔

نعتیں

ان کی نظموں میں خیالات کی بلندی ہے۔ زبان کی صفائی ہے، بیان کا زور، اسلوب کی دلکشی ہے۔ لیکن ان کی شاعری میں خاصے کی چیز نعتیں ہیں۔ میرے سامنے ان کی صرف دو نعتیں ہیں۔ شاید انہوں نے اور بھی کہی ہوں۔

ابھی کسی نے مولانا کا کلام مرتب کر دینے کی طرف توجہ نہیں کی۔ مرتب کلام سامنے ہو تبھی ان کی شاعری کے بارے میں کوئی قطعی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ بہرحال جو کلام پیش نظر ہے خوب ہے اور نعتیں تو بہت ہی خوب ہیں۔ میرے سامنے وہی دو نعتیں ہیں جو ڈاکٹر غلام محمد مرحوم نے ''مقالات احسانی'' میں شامل کر لی ہیں۔

پہلی نعت: یہ نعت ۱۹۲۷ء کی یادگار ہے۔ ہوا یہ تھا کہ مولانا موسم گرما کی تعطیلات میں اپنے وطن ''گیلانی'' تشریف لے گئے اور وہاں پہنچ کر شدید بیمار پڑ گئے۔ مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی نے بیماری کی تفصیل بیان کی ہے۔ (حیات گیلانی، صفحہ ۲۳۷) خون پیپ بن کر بہنے لگا۔ کئی آپریشن ہوئے صحت نہ ملی۔ پھر ایک نئے آپریشن کی تیاری تھی۔ مولانا نے ''بارگاہ رسالت میں التجا والتماس'' کی۔ التجا قبول ہوئی۔ حضور ﷺ (فداہ ابی وامی) نے اپنے دیدار سے مشرف فرمایا۔ مرض جاتا رہا۔ آپریشن کی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔ خود مولانا فرماتے ہیں:

''صبح ہوئی عجیب صبح تھی! ڈاکٹر آئے ...... متحیر ہو کر پوچھ رہے تھے، پھوڑا کہاں تھا؟ آخر اس فیصلے پر مجبور ہوئے کہ اب آٹھویں آپریشن کی ضرورت نہیں رہی! کیوں باقی نہیں رہی؟ یہ ایک

Marfat.com

راز تھا۔ بس سیہ کار پر نظر رحمت پڑ چکی تھی۔''

صاحب ''حیات گیلانی'' نے اس راز سے پردہ ہٹا دیا ہے۔ ''راز یہ تھا کہ اس رات میں غالباً سرور کونین ﷺ کی زیارت حصے میں آئی۔'' صحت بحال ہوگئی۔ مولانا حیدر آباد روانہ ہوگئے۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس نعت میں ان کی التجا و التماس میں کتنا سوز دروں اور غم پنہاں اور جذب وشوق کا کیا عالم ہوگا، جو قبولیت کا یہ مقام پایا۔ اس کی زبان بہار کے دیہات کی بول چال کی زبان ہے۔ مولانا نے اسے مگدھی یا بہاری زبان لکھا ہے۔ بعض مصرعے صاف اردو میں ہیں۔

مولانا کی نعت ملاحظہ کیجئے۔ اس کی زبان سے لطف اندوز ہوجایئے، ایمان تازہ کیجئے اور ذوق لسانی وادبی کو تسکین اور جذبہ ایمان کی پرورش کیجئے۔ اللہ کی یہ بڑی نعمت ہے کہ انسان کو قلب کا اطمینان اور روح کی تسکین میسر آجائے۔ اس نعت کا عنوان اور اس پر نوٹ مولانا گیلانی مرحوم کے قلم سے ہے۔ مطالعہ فرمایئے۔

بارگاہ رسالت میں التجا والتماس

''ہر ہر عضو گرا ہوا تھا، چلنا پھرنا تو دور کی بات ہے، قسم ہے اس خدائے زندہ وتوانا کی، جو مردوں سے زندوں کو اور زندوں کو مردوں سے نکالتا ہے کہ ایک سیکنڈ دو سیکنڈ کے لئے بھی بیٹھنے کی آرزو جس سیاہ بخت کے لئے مہینوں سے صرف آرزو بنی ہوئی تھی، بخت کی بیداری کے بعد دیکھا جارہا تھا کہ اب وہ اٹھ رہا ہے، اٹھتا چلا جارہا ہے جس کی موت کا فیصلہ کیا جاچکا تھا۔ وہ دوبارہ گویا زندوں میں پھر شریک کردیا گیا۔ ہسپتال والوں نے چند ہی دنوں بعد حکم دے دیا کہ اب یہاں رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حکم کی تعمیل کی گئی۔ پھر آگے کیا قصے پیش آئے ان کی تفصیل غیر ضروری ہے۔ شعور اور احساس میں ایک خیال کے سوا دوسرا خیال یا ایک جذبہ کے سوا دوسرا کوئی جذبہ باقی نہ رہا تھا۔ اس زمانے میں بہار میں تھا۔ بہار کی دیسی آبادی جو دیہاتوں میں رہتی ہے ایک خاص قسم کی زبان بولتی ہے اس زبان میں اور کچھ ہو یا نہ ہو لیکن التجا والتماس کے لئے اس کا پیرایہ حد سے زیادہ موزوں اور مناسب ہے۔ بے ساختہ اسی زبان میں کچھ مصرعے اُبلنے لگے۔ سن کر تو اردو زبان کے سمجھنے والے بھی اس کو شاید سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن اردو زبان کے املا کے حدود میں مگدھی یا بہاری زبان مروجہ کے ان الفاظ کو لانا دشوار ہے۔ کتابی شکل میں صحیح طور پر جیسا کہ چاہیے شاید وہ سمجھے بھی نہیں جاسکتے لیکن عرض چونکہ اسی زبان میں کیا گیا تھا۔ بجنسہٖ ان ہی الفاظ کو (نیچے) نقل کردیتا ہوں۔ ''درشن'' کی آرزو اس عجیب وغریب اضطراری نظم کی روح تھی، بہار کے نائب امیر شریعت مولانا سجاد مرحوم اگرچہ بظاہر فقیہ النفس والصورت تھے مگر ذاتی تجربے کے بعد یہ ماننا پڑتا تھا کہ باطن ان کا فقیہ سے زیادہ فقیر تھا۔ قرابت کے

Marfat.com

تعلقات کی وجہ سے گیلانی بھی کبھی تشریف لائے تھے۔اسی زمانے میں اتفاقاً ان کی تشریف آوری ہوئی، اس نظم کے سننے کا موقع ان کو بھی ملا، سنتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے، خصوصیت کے ساتھ اس بند پر تڑپ تڑپ گئے، ہچکیاں ان کی بندھ گئیں، یعنی دوسرا بند!

تمری دواریا کیسے چھوڑوں   تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں
تمری گلی کی دھول بٹوروں   تم رے نگر میں دم بھی توڑوں
جی کا اب ارمان یہی ہے
اٹھوں پہر اب دھیان یہی ہے

''تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں'' اس استفہامی مصرعے کو بار بار دہراتے اور بے قرار ہو کر بلبلاتے اور ہے بھی یہ سوال کچھ اس قسم کا۔آج انسانیت زمین کے اس خاکی کرّے پر تڑپ رہی ہے۔زندگی کا مطلب کیا ہے؟ اس سوال کو حل کرنا چاہتی ہے۔ایک اس سوال کے جواب کی صحیح توقع کی جائے؟ اس تنہا واحد آستانے سے ٹوٹنے والا خود سوچے کہ کہاں جائے گا۔کن کے پاس جائے گا۔موسیٰ ہوں یا عیسیٰ، ابراہیم ہوں یا یعقوب علیہم السلام یا ان کے سوا کوئی اور، اس راہ کے ان سب راہبروں نے اپنے اپنے وقتوں میں جو راہ پیش کی تھی جب وہ ساری راہیں مسدود ہو چکی ہیں تاریخ جانتی ہے کہ ڈھونڈنے والوں کو ان بزرگوں کی بتائی ہوئی راہ نہیں مل سکتی تو اب دنیا کہاں جائے اور اس کے سوا کہ: جلوہ ات تعبیر خواب زندگی (قبالؔ) کا فیصلہ کرتے ہوئے ''تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں۔'' کہتا ہوا اسی چوکھٹ کے ساتھ چمٹ جائے، جس کے سوا شاہہات والوں کی غیب تک پہنچنے اور پہنچانے کا کوئی دوسرا ذریعہ باقی نہیں ہے۔

(مناظر احسن گیلانی)

پیارے محمدؐ جگ کے سجن   تم پر واروں تن من دھن
تمری صورتیا من موہن   کبھیو کرا ہوئے تو درشن
جیا کنھڑے دلوائے ترسے
کرپا کے بدرائے کہیائے برسے
تمری دواریا کیسے چھوڑوں   تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں
تمری گلی کی دھول بٹوروں   تمرے نگر میں دم بھی توڑوں
جی کا اب ارمان یہی ہے
اٹھوں پہر دھیان یہی ہے
صلی اللہ علیک نبیا   تمرے دوارے آیا دکھیا
بھنیاؑ اکی پکڑھو راجا   اپنے حسین و حسن کا صدقا
ڈھوائے گھریں ناؤ کو اس کے
اب نہیں ہم ہیں اپنے بس کے

Marfat.com

سیس پہ اکے پاواں[7] دھر ہو — پیت کی اگیا من میں بھر ہو
بھدر[8] ہوا پہ تنی[9] کرپا کر ہو[10] — سپنو میں ایسن[11] کر گجر ہو[12]

راجا تمری دیوڑھی بڑی ہے
رحمت تمرے نام پڑی ہے

اندھرا[13] کے تم رہیا بتا ہو[14] — ہر دے[15] کا اکے جوت جگا ہو
ڈگری[16] پہ اپنے اکو چلا ہو — بودھا[17] کے تم بدھی[18] بنا ہو

کھینچو اکو پاپ نرکھ سے
دھو دیہو کالیکھ[19] منہ کا اکے

تمرے پیا کی اونچی اٹریا — ہمری نے ہی واں پہ گجریا
بتلا بتلا رہی نجریا[20] — پکھلئی[21] ہے اک تمری دواریا

ان کھر[22] پتوا[23] تمرے سے چلی ہے
کھجوا[24] بھی ان کا تمرے سے ملی ہے

پی کی پتیا[25] تم ہی لے لہو — ان کھر بتیا[26] تم ہی سنی لہو
ہمنی کے ندیا سے تم جگے لہو[27] — مرل تھلبئی ہم جلے[28] لہو

دھرمی[29] بھے لوں تم ری[30] دیا سے
مکتی[31] بھی ہوائی ہی تمری دووا[32] سے

تمری دواریا کیسے چھوڑوں — تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں
تمری گلی کی دھول بٹوروں — تمرے نگر میں دم بھی توڑوں

جی کا اب ارمان یہی ہے
اٹھوں پہر اب دھیان یہی ہے

(۱) کبھی کرا دیجئے۔ (۲) کڑھتا ہے دل (۳) بادل۔ (۴) کب۔ (۵) بازو۔ (۶) موج عظیم۔ (۷) پاؤں۔ (۸) حد درجہ بدبخت۔ (۹) ذرا۔ (۱۰) مہربانی۔ (۱۱) کیجئے۔ (۱۲) کرگزریئے۔ (۱۴) قوی باطنی۔ (۱۵) راستہ۔ (۱۶) بے وقوف کو۔ (۱۷) دانش مند بنا دیجئے۔ (۱۸) سیاسی۔ (۱۹) بھٹک بھٹک۔ (۲۰) نظر۔ (۲۱) دیکھی ہوئی ہے۔ (۲۲) ان کا۔ (۲۳) پتہ۔ (۲۴) سراغ (۲۵) خط۔ (۲۶) باتیں۔ (۲۷) جگایا (۲۸) مرے ہوئے تھے۔ (۲۹) مومن ہوئے (۳۰) مہربانی سے۔ (۳۱) نجات بھی ہوئی۔ (۳۲) آپ کی دعا سے۔)

دوسری نعت: ۱۹۲۸ء میں مولانا گیلانی کو حج کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ دوسری نعت اس مبارک سفر کی یادگار ہے۔ اس کا عنوان ہے:

Marfat.com

''عرض احسن ...... بہ آستانہ نبوت کبریٰ، علی صاحبھا الصلوٰۃ والسلام۔'' یہ ایک طویل نعت ہے اور فارسی زبان میں ہے۔ کئی شعر عربی میں اور کئی عربی فارسی میں ملے جلے ہیں۔ یہ نعت نظم، غزل، مربع، مخمس، مسدس...... کس ہیئت میں ہے۔ اس کا فیصلہ قارئین کرام خود کر سکتے ہیں۔ مکمل نعت تو ضمیمہ کلام میں ملاحظہ ہو لیکن اس کے چند ٹکڑے یا بند نقل کئے جاتے ہیں:

ہر ایک سے ٹکرا کر ہر شغل سے گھبرا کر ہر فعل سے شرما کر ہر کام سے پچتا کر
آمد بدرت بنگر

اے خاتم پیغمبر یا قاسم الکوثر اے سرور ہر سرور اے رہبر ہر رہبر
اے آں کہ توئی افسر ہر کہتر و ہر مہتر فی المبداء والمحشر اے ہستی تو محور
للاکبر والاصغر اے طلعت تو مظہر للاول والآخر اے رحم جہاں پرور
آقائے کرم گستر آمد بدرت بنگر

نے ساز نہ سامانے ، نے علم نہ عرفانے نے دین نہ ایمانے ، نے فضل نہ احسانے
از خانہ ویرانے ، وز کلبہ احزانے وز محبس و زندانے ، ناشکری و کفرانے
آمد بدرت بنگر کالحائر والمضطر

ہاں دست دعا بکشااز زردہ او ادنیٰ وزقبہ ماااوحیٰ اے مرضی تو ترضیٰ
اے ملت تو بیضا فالیل لقد یغشیٰ والکفر قد استعلیٰ ذا امتک الضعفیٰ
فی سیطرۃ الاعداء ہاں سھمک لا یطفی
ورمیتک لا یخفیٰ
والله ھو الاعلیٰ والحق فلا یعلیٰ

تصنیفات وتالیفات

مولانا گیلانی نے اپنے پیچھے تصنیفات وتالیفات کا جو یادگار ذخیرہ چھوڑا ہے، وہ کیفیت و کمیت ہر دو اعتبار سے نہایت قیمتی ہے۔ انہوں نے معقولات، منقولات، تذکار و سوانح، تاریخ، اخلاق وغیرہ بے شمار موضوعات پر لکھا ہے اور اگر کسی علم وفن میں ان کا کوئی مستقل مختصر یا طویل مقالہ نہ ملے تب بھی کسی تصنیف یا تذکرے میں کوئی مختصر اور ضمنی بحث اس پر ضرور مل جائے گی۔ مذہب اور اسلامی علوم میں قرآن، تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ نیز الٰہیات، فلسفہ وحکمت، منطق، کلام، تصوف اور پھر اس میں ایرانی، ہندوستانی اور اسلامی یا اطلاقی تصوف جسے شاہ ولی اللہ نے ''احسان'' سے تعبیر کیا ہے فلسفہ اور اس کی مختلف شاخیں، ان کے اصول و فروع، تاریخ ہند و ایران، تاریخ اسلام، تعلیم، اس کی تاریخ و فلسفہ اور نظام و نصاب تعلیم، غرض کہاں تک کوئی ان کے موضوعات گنوائے۔ اگر تھوڑے

Marfat.com

تھوڑے فرق کا لحاظ کر کے شمار کیا جائے تو ان کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ جائے گی۔ مولانا کی تصنیفات و تالیفات اردو زبان و ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ انہوں نے اپنی کسی کتاب کو تصنیفی اصول و طریق اور منصوبہ بندی کے تحت نہیں لکھا۔ میرا منشا یہ ہے کہ انہوں نے اپنی کسی تصنیف کے لئے پہلے سے کوئی منصوبہ بندی کی، نہ اس کے لئے کوئی خاکہ بنایا اور نہ اس کا کوئی دائرہ بحث و نظر متعین کیا۔ ان کی اکثر تصانیف ان کے اپنے منتخب موضوع اور فیصلہ علمی کا نتیجہ بھی نہیں۔ عام طور پر ہمیشہ یہی ہوا کہ کسی نہ کسی موضوع پر مقالے کا تقاضا کیا یا کسی تحریک و فکر یا کسی بحث و نظر نے مولانا کے جذبات اور ذوق دینی کو انگیخت کیا اور مولانا نے قلم اٹھا کر لکھنا شروع کر دیا۔ مضمون پھیلتا گیا، موضوع کے مختلف علمی پہلو اور فکر و نظر کے گوشتے سامنے آتے گئے، مولانا اپنے افکار و معلومات کے موتی بکھیرتے رہے۔ تا آں کہ کسی واقعے نے ان کی توجہ کو اس طرف سے ہٹا نہ دیا ہو یا بیماری اور صحت کے کسی عذر نے قلم کو روک دینے پر مجبور نہ کر دیا ہو۔ مولانا کے بیشتر مقالات کی محرک تحریر کوئی ایسی ہی بات ہوئی اور اسی سلسلہ مضامین اور افکار و مباحث نے ایک نئی تصنیف کی شکل اختیار کر لی۔ مولانا کو اپنی تصنیفی کیفیت کا خود بھی احساس تھا۔ خود فرماتے ہیں:

> ''ایک دفعہ جھونک میں لکھنے بیٹھا تو لکھتا چلا گیا۔ اب پھر اس پر نظر ثانی حک و اصلاح میرے لئے مشکل ہے۔'' (معارف (اعظم گڑھ)، مارچ ۱۹۶۳ء، ص ۳۲۔۲۳۱)

مولانا سید سلیمان ندویؒ کے نام ایک خط میں اپنے طریقہ تحریر کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''......لکھنے کے لئے فقیر نے اب تک کچھ نہیں لکھا ہے۔ جو کچھ بھی ہو جاتا ہے کوئی سر پر سوار ہو کر لکھوا لیتا ہے یا اسی قسم کی کچھ مجبوریاں پیش آ جاتی ہیں۔'' (معارف، اعظم گڑھ، اپریل ۱۹۶۳ء، ص ۲۹۷)

مولانا کے شاگرد ڈاکٹر غلام محمد مرحوم لکھتے ہیں:

> ''مولانا فرماتے تھے کہ ان کی کوئی تصنیف بھی باضابطہ ''تصنیفی پروگرام'' کے تحت انجام نہیں پائی۔ یہی ہوتا رہا کہ کسی نہ کسی مضمون کی فرمائش کی۔ مولانا لکھنے بیٹھ گئے۔ جب لکھ چکے تو وہ مضمون نہ رہا بلکہ کتاب تیار ہوگئی...... دوسری صورت یہ ہوتی رہی کہ کالج کے لیکچر کی تیاری یا ایم اے اور پی۔ ایچ ڈی کے طلبہ کے مقالات کی رہبری کے سلسلہ میں مختلف موضوعات پر جو معلومات فراہم کرنا پڑتیں وہ اتنی زیادہ قیمتی تھیں کہ ہر موضوع کی ایک مستقل کتاب خود بخود تیار ہوگئی۔'' (مقالات احسانی، ص ۱۲)

حضرت مولانا گیلانی کی تحریرات و نگارشات کا جو ذخیرہ تصنیفات و تالیفات کی شکل میں مرتب ہو چکا ہے ان میں سے چند یہ ہیں، جن تک دست شوق کی رسائی ہوئی ہے یا کم از کم علم میں آ چکی ہیں:

ا۔ سیرت: النبی الخاتمؐ۔ ظہور نور یا نیا میلاد نامہ۔

Marfat.com

۲۔تذکار وسوانح: ابوذر غفاری، امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی، مجدد الف ثانی، تذکرہ شاہ ولی اللہ، سوانح قاسمی (سہ جلد)، سیرت بانی دارالعلوم، بابا رتن ہندی۔

۳۔تفسیر اور حدیث وفقہ: تدوین قرآن، تذکیر بسورۃ الکہف، تدوین حدیث، مقدمہ، تدوین فقہ۔

۴۔دین اور اخلاق وتصوف: الدین القیم، مقالات احسانی، مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ، کائنات روحانی۔

۵۔تعلیم: مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، میرا مجوزہ تعلیمی خاکہ۔

۶۔علوم وافکار اسلامی: اسلامی معاشیات، اسلام اور نظام جاگیرداری وزمینداری۔

۷۔خودنوشت: احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن۔

۸۔خطوط: مکاتیب گیلانی مرتبہ مولانا منت اللہ رحمانی ۱۹۷۲ء، مونگیر (بہار)

۹۔دیگر: ہزار سال پہلے، مضامین گیلانی، افادات گیلانی (''الفرقان'' کا خاص نمبر)

۱۰۔تراجم: صدر الدین شیرازی کی مشہور کتاب ''اسفار اربعہ'' کا ترجمہ۔ اس ترجمے کے صفحات کی تعداد ۱۷۵۷ ہے۔ مولانا اس کے شریک مترجم ہیں۔ پورا ترجمہ ان کی کاوش کا نتیجہ نہیں۔ دارالترجمہ حیدرآباد سے شائع ہوا ہے۔ مولانا نے شاہ اسماعیل شہید کی تصنیف ''عبقات'' کا اردو ترجمہ بھی کیا تھا جو حیدرآباد اور لاہور سے چھپ چکا ہے۔

ان کے علاوہ کئی مضامین کتابچوں کی شکل میں نظر سے گذرے ہیں۔ مولانا گیلانی اور ان کی تصنیفات کے بارے میں محترم عتیق الرحمٰن سنبھلی نے لکھا ہے۔

> ''مرحوم اپنے وقت کے فرد فرید اور اپنی بعض خصوصیات کے تو بظاہر خاتم تھے۔ ان کا علم ہمہ جہت تھا اور قلم ہر دم رواں دواں۔ چنانچہ ان کے قلم سے اسلامی لٹریچر میں جو گراں قدر اضافہ ہوا ہے ممکن نہیں کہ اسے نظر انداز کیا جاسکے۔ ابوذر غفاری، النبی الخاتم، الدین القیم، اسلامی معاشیات، مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی اور تدوین حدیث ان کی ایسی تصنیفات ہیں جن سے مدتوں علم وتحقیق کے چراغ روشن ہوتے رہیں گے۔''
>
> (الفرقان، افادات گیلانی نمبر، ص ۵)

میں نے کوشش کی ہے کہ مولانا کی تصنیفات وتالیفات، علوم وفنون کے چند دائروں میں مرتب کردی جائیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانا کی کوئی تصنیف اپنے موضوع اور فن کے دائرے میں کہاں رہی ہے۔ کسی ایک فن کی بحث چھیڑتے ہیں پھر بحث جوں جوں بڑھتی اور پھیلتی ہے، مختلف علوم وفنون کی بحثیں اس میں شامل ہوتی جاتی ہیں اور مولانا اصل اور ضمنی اور متعلق اور غیر متعلق افکار ومباحث کے ذخیرہ فراہم کردیتے ہیں۔ ان کی کوئی تصنیف تفسیر، حدیث، فقہ، تعلیم، سیرت، سوانح، جن کا موضوع اور فن قطعی واضح اور متعین ہو اٹھا کر دیکھ لیجیے، نہ صرف یہ تمام موضوعات اور

Marfat.com

فنون ایک دوسرے میں گڈ مڈ نظر آئیں گے بلکہ الٰہیات، فلسفہ، کلام ان کے اصول، اقسام، مکاتب فکر، ان کے خصائص، اختلافات کے مباحث اس طرح ایک دوسرے میں پیوستہ ملیں گے کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنا مشکل ہوگا۔

مولانا گیلانی کی وہ تحریرات جو کسی کتاب یا مجموعہ مضامین و مقالات کی شکل میں چھپ چکی ہیں۔ وہ بذاتہ کوئی معمولی ذخیرہ علمی نہیں۔ کسی شخصیت کی بیش قیمت علمی خدمات کے تذکرے میں بہت بڑا سرمایہ علوم و معارف ہے، جو اس کی عظمت اور حیات جاوید، نیم اسلامی علوم وفنون اور دعوت و اصلاح کی تاریخ کا یادگار سرمایہ ہے لیکن ایک بہت بڑا ذخیرہ وہ ہے جو جرائد و رسائل میں اب تک مدفون اور کسی صاحب ہمت محقق کے اقدام وسعی اور کسی علمی ادارے کے وسائل کے انتظار میں ہے اور مصنف ''حیات مولانا گیلانی'' کے مطابق متعدد مسودات موجود ہیں جو ابھی تک شائع نہیں ہوئے۔

قرآنیات

قرآن حکیم سے مولانا گیلانی کو خاص لگاؤ تھا۔ قرآن کی تلاوت، اس کی آیات وسورتوں پر غور وفکر وتدبر اور اپنی مجلسوں اور تقریروں میں افکار و معلومات کے موتی بکھیرتے تھے۔ قرآن حکیم کے جمع وتدوین سے لے کر اس کے افکار وتعلیمات اور مسائل و تفسیر تک مختلف پہلوؤں پر بہت مقالات لکھے۔ ان میں سے بعض تو مستقل کتابیں بن گئیں اور بہت سے مقالات رسائل کے استنباط میں ان کا ذہن خوب چلتا تھا۔ کئی اہل قلم نے ان کی اس خوبی کا ذکر کیا ہے۔ اگر وہ سنجیدگی کے ساتھ تفسیر پر توجہ فرماتے اور اپنے افکار و معلومات کو مرتب فرما دیتے تو ایک تفسیر میں وہ ایک خاص دبستان فکر کے بانی قرار پاتے۔ مولانا عبدالباری ندوی مرحوم کو ان کی اس خوبی ذہن، انداز فکر اور خاص اپروچ کا اندازہ تھا اس لئے انہوں نے بار بار توجہ دلائی لیکن مولانا اس پر بعض خاص وجہ سے ملتفت نہ ہوئے۔ مولانا عبدالباری ندوی لکھتے ہیں:

> ''میں مولانا سے ہمیشہ اور ہمیشہ سے زیادہ وظیفے پر سبکدوشی کی فرصت وفراغت کے دنوں میں بار بار درخواست کرتا رہا کہ اب ہر طرف سے یکسو ہو کر اپنی ان خاص ''قرآنی یافتوں'' ہی کو جمع وتدوین فرما دیں، مگر کتراتے ہی رہے۔ بڑی وجہ بظاہر وہی ''بے چارے مولویوں'' کی ناراضی کا ڈر کہ تفسیری دفتروں کے خلاف بعض باتوں پر خدا جانے کتنا شور وشغب اٹھ کھڑا ہو۔'' (مقدمہ مکاتیب گیلانی، ص ۳۶۔۳۵)

اس مقدمے میں اس مقام کے بعد لکھتے ہیں:

> ''اس بے علم کی نظر میں مولانا کے فکری اور علمی کمالات کا وقت کے لئے سب سے کارآمد یادگار کارنامہ خصوصاً جدید ذہنوں یا نئی تعلیم والوں کے حق میں ان کی ''قرآنی یافتوں'' کا ذخیرہ ہوتا

Marfat.com

ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ سورہ کہف کے سوا قصداً انہوں نے اہتمام فرمایا کہ اس سلسلے کی کوئی اور مستقل چیز منظر عام پر نہ آنے پائے۔'' (ص ۳۷)

تذکیر بسورۃ الکہف میں مولانا کی قرآنی خصوصیات یا بقول مولانا عبدالباری ندوی کے ان کی خاص ''قرآنی یافتوں'' کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ انہیں خود بھی اپنے طرز فکر اور تفسیر کی اس خصوصیت کا احساس تھا اور انہوں نے اپنی تحریروں میں جہاں کسی آیت کے مفہوم و اطلاق کی بحث آتی ہے اور بعض خطوط میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن انہوں نے نہ تو تفکر و تدبر کے مزید قدم اس راہ میں بڑھائے اور نہ ان کی تالیف و تدوین کی طرف توجہ فرمائی۔

قرآنیات میں مولانا کے متعدد مقالات ہیں۔ یہ مقالات تفسیر کی عام روایت اور اصول و انداز کے مطابق تالیف نہیں کئے گئے ہیں لیکن ہر مقالے یا سلسلہ مقالات کا ایک خاص پس منظر ہے۔ جب کسی واقعے، کسی مطالعے یا کسی غور و فکر یا مکالمہ و درس کے دوران میں کسی خاص نکتے نے خیالات کو تحریک دی مولانا کا قلم رواں ہوا اور معلومات و افکار اور علمی نکات کا ایک انبار جمع ہو گیا۔ قرآنیات کے خاص دائرے میں یا کسی حد تک تفسیری مباحث کا احاطہ کرنے والے مقالات جو میرے علم میں آئے ہیں اور ان میں سے بعض کتابی شکل میں بھی چھپ گئے ہیں، یہ ہیں:

۱۔ تذکیر بسورۃ الکہف: اولاً یہ مقالہ ''الفرقان'' (لکھنؤ) کی ذی الحجہ ۱۳۶۸ھ سے جمادی الآخری ۱۳۷۱ھ (اکتوبر ۱۹۴۹ء تا مارچ ۱۹۵۲ء) تک ''دجّالی فتنہ اور سورہ کہف'' کے عنوان سے اکیس قسطوں اور دو سو ساٹھ صفحوں میں پھیلا ہوا ہے۔ دوبارہ مولانا کے انتقال کے بعد کچھ ترمیمات و درستگی کے بعد اسی رسالے کے ''افادات گیلانی نمبر'' میں شامل کیا گیا۔ بعد میں حیدرآباد دکن سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔

مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی نے لکھا ہے کہ ''مولانا نے اس مضمون میں سورہ کہف کی تفسیر ایک نئے انداز سے کی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس سورہ پر انہوں نے ایک خاص نقطہ نظر سے مدتوں غور کیا تھا...... حقیقت یہ ہے کہ یہ مضمون تدبر قرآن کی ایک نئی راہ کھولتا ہے۔'' (الفرقان، افادات گیلانی نمبر، ص ۱۳)

۲۔ ادب قرآنی: یہ ایک مختصر سی کتاب ہے۔ اس کا مطالعہ قرآن مجید کا ترجمہ سمجھنے میں سہولت پیدا کر دیتا ہے۔ (مقالہ ڈاکٹر پروفیسر اختر راہی۔ مطبوعہ المعارف، لاہور ستمبر ۱۹۸۰ء۔ ص ۲۹۔۲۸)

۳۔ تدوین قرآن: پروفیسر محمد اجمل خاں کے بعض خیالات کے رد میں پہلی بار یہ کتاب ۱۹۷۶ء میں کراچی سے شائع ہوئی۔

متفرق و غیر مرتب قرآنی مقالات

(۱) قرآن کے صائبین کیا بدھ مذہب کے ماننے والے تھے؟ مولانا گیلانی کا یہ مقالہ ''معارف'' (اعظم گڑھ) کے فروری و مارچ ۱۹۵۳ء (جلد ۷۱، شمارہ ۲، ۳) میں شائع ہوا تھا۔

(۲) اسلام اور ہندو مذہب کی بعض مشترک تعلیمات۔ یہ مقالہ بھی اولاً ''معارف'' میں (اپریل ۱۹۵۲ء جلد ۶۹،

Marfat.com

شمارہ ۴) میں چھپا تھا۔ ۱۹۷۸ء میں خدا بخش لائبریری پٹنہ سے کتابچے کی صورت میں چھپ گیا ہے۔

(۳) تورات کے دس احکام اور قرآن کے دس احکام: یہ مقالہ ''برہان'' دہلی (مارچ تا جون ۱۹۵۱ء، جلد ۲۶، شمارہ ۳ تا ۶ اور ستمبر تا دسمبر ۱۹۵۱ء، جلد ۲۷، شمارہ ۳ تا ۶) میں آٹھ قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ میرے علم میں اس کی کتابی صورت میں اشاعت نہیں ہوئی۔

(۴) روزہ اور قرآن: یہ مقالہ ''الفرقان'' لکھنؤ میں (شعبان ۱۳۷۱ھ) میں شائع ہوا تھا۔

(۵) الجنتہ والنار اور نشاۃ روحانیہ (ضمیمہ الجنتہ والنار) کے عنوان سے ''القاسم'' دیوبند (ذی القعدہ ۱۳۴۴ھ تا محرم ۱۳۴۷ھ) میں چھ قسطوں میں چھپا تھا۔ اس کے بیشتر مباحث و استدلالات کا تعلق قرآن حکیم ہی سے ہے۔ ''جنت وجہنم'' کے عنوان سے ایک مضمون ''الفرقان'' لکھنؤ (بابت جمادی الآخر ۱۳۵۶ھ) میں ملتا ہے۔ اس کا تعلق بھی اسی دائرہ سے ہے۔

قرآنیات ہی کے ضمن میں ان مضامین کا ذکر بھی اس مقام پر کر دینا چاہیے۔

(۱) سورہ یوسف سے سبق	صدق جدید، لکھنؤ	۲۵ مئی ۱۹۵۱ء
(۲) تعلیم اشاعت قرآن	صدق، لکھنؤ	۱۶ نومبر ۱۹۴۲ء
(۳) قرآن اور قارون	صدق، لکھنؤ	۶۷ دسمبر ۱۹۴۳ء
(۴) توحید القرآن		
(۵) فصل لربک وانحر	القاسم، دیوبند	ذی الحجہ ۱۳۴۴ھ
(۶) الشہب القرآن	ایضاً	
(۷) ضرورۃ القرآن	ایضاً	
(۸) اعجاز القرآن	ایضاً	
(۹) قرآن کے طرز استدلال پر ایک سرسری نظر	ایضاً	
(۱۰) حج ابراہیمی اور نمرودی مغالطہ	برہان (دہلی)	مئی ۱۹۴۶ء
(۱۱) تاریخ ارض القرآن		
(از سید سلیمان ندوی) تبصرہ	معارف (اعظم گڑھ)	مئی ۱۹۵۵ء

سیرت نبوی

(۱) النبی الخاتم: ایک مضمون تھا جو ''ایمان'' (پٹی، ضلع امرتسر) کے لئے لکھا گیا تھا اور اولاً اسی میں چھپا تھا۔ بعد میں بعض ترامیم و اصلاحات کے بعد کتابی شکل میں چھپا۔ یہ سیرت النبی میں مولانا گیلانی کی مشہور مقبول تصنیف ہے۔ اب تک اس کے ان گنت ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ (اختر راہی۔ مقالہ، مطبوعہ المعارف (لاہور) ستمبر ۱۹۸۰ء ص ۳۱، ۳۲)

Marfat.com

ڈاکٹر غلام محمد مرحوم نے لکھا ہے:

''النبی الخاتم اور الدین القیم کو مولانا کے شاگرد رشید ڈاکٹر دستگیر رشید...... نے مرتب فرمایا ہے۔''

(مقالات احسانی، ص۱۲)

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ فرماتے ہیں:

''میں نے اپنی ساری عمر میں سیرت نبوی میں رحمتہ اللعالمین (قاضی محمد سلمان منصور پوری) اور النبی الخاتم سے زیادہ مؤثر کتاب نہیں پڑھی۔ کتاب پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف علم و انشا پردازی کی خوبی نہیں ہے۔ اس کے اندر ان کا سوز دروں اور خون جگر بھی شامل ہے اور واقعہ بھی یہی ہے۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزہ فن کی ہے خون جگر سے نمود

(پرانے چراغ، حصہ اول، کراچی ۱۹۸۴ء، ص ۶۷)

مولانا خود بھی اپنی اس تصنیف کو اپنی مصنفات میں احسن قرار دیتے تھے۔ مولانا سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے ان کی ایک تحریر نقل کی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:

"فمن مصنفاة ' النبى الخاتم ' وهى احسن كتب عنده واعلاها"

(۲) ظہور نور: یہ باون صفحہ کا ایک مختصر رسالہ ہے جو اولاً ماہنامہ ''الہند'' (دکن) میں شائع ہوا تھا۔ بعدہ ''سچ'' (لکھنؤ) میں بھی نقل ہوا تھا اور الہدیٰ بک ایجنسی، حیدرآباد دکن سے کتابچے کی صورت میں چھپا تھا۔ زبان اور اسلوب کے لحاظ سے بقول مولانا عبدالماجد دریابادی:

''ان خصوصیات کا حامل ہے جو مولانا کے قلم سے وابستہ ہو چکے ہیں۔''

اس کے مضمون اور اسلوب کے بارے میں مولانا دریابادی لکھتے ہیں:

''چلی ہوئی میلادی روایات عموماً میلادی مکاشفے ہیں اور مولانا نے ان کی اس حیثیت کو اپنے مخصوص رنگ میں نمایاں کر دیا ہے۔ ساری کتاب اول سے آخر تک علمی بصیرتوں کے ساتھ ساتھ والہانہ انداز بیان کی دلچسپیوں کا ایک رنگین گلدستہ ہے۔''

(۳) دربار نبوت کی حاضری: ایک مختصر کتابچہ۔ کراچی سے شائع ہوا ہے۔ اولاً یہ مقالہ الفرقان کے حج نمبر ۱۳۷۰ھ میں شائع ہوا تھا۔

(۴) خیر الامم کے طغرائے امتیاز: یہ سیرت نبوی کا خاص اور اہم مضمون ہے۔ مولانا گیلانی کا یہ پہلا مضمون ہے

Marfat.com

جوذی قعدہ ۱۳۳۱ھ سے ذی قعدہ ۱۳۳۲ھ تک ''القاسم'' کی پانچ قسطوں میں چھپا تھا۔اس مضمون کی قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ یہ زمانہ طالب علمی کی یادگار ہے اور حضرت شیخ الہند کے اس فرمانے پر لکھا گیا تھا کہ ''القاسم'' میں مضمون لکھا کرو۔

دو مضامین اور بھی نظر سے گزرے ہیں جن کا شمار سیرت کے اطراف سے ہے۔ان کا حوالہ بھی اس مقام پر دے دینا چاہیے کہ یہی مناسب ہے۔

(۱) امیۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم: القاسم، دیوبند

(۲) عالم غیب کا طویل سفرنامہ یا واقعہ اسراء و معراج: الفرقان، لکھنؤ، ذیقعدہ ذی الحجہ ۱۳۶۱ھ

سوانح

(۱) ابوذر غفاری: رسالہ ''القاسم'' (دیوبند) میں حضرت ابوذر غفاری کی شخصیت وسیرت میں ایک مقالہ متعدد اقساط میں لکھا تھا۔یہی مقالہ بعد میں کتاب بنا دیا گیا۔ہندوستان اور پاکستان سے اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

(۲) بابا رتن ہندی: ایک ہندوستانی صحابی کا تذکرہ بھی مولانا کے قلم سے یادگار ہے۔یہ مقالہ بھی ۱۹۷۸ء میں دیوبند سے کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔

(۳) امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی: امام اعظم پر اردو زبان میں بے شمار مواد موجود ہے لیکن یہ کتاب اپنے موضوع پر سب سے مختلف اور نادر ہے۔تاریخی، سیاسی، سوانحی معلومات اور علمی نکات سے بھری ہوئی ہے۔سب سے پہلے نفیس اکیڈمی نے ۱۹۴۹ء میں کراچی سے ڈاکٹر حمید اللہ کے تعارف کے ساتھ شائع کی تھی۔

(۴) الف ثانی (یا ہزارہ دوم) کا تجدیدی کارنامہ: مولانا کا یہ مقالہ ''الفرقان'' کے حضرت مجدد الف ثانی نمبر (۱۳۵۷ھ) میں شائع ہوا تھا۔مذکورہ نمبر کے علاوہ اس کی تلخیص ''افادات گیلانی نمبر'' میں شامل ہے۔اب مکمل مجدد الف ثانی نمبر دارالاشاعت کراچی نے کتابی صورت میں چھاپ دیا ہے۔مولانا گیلانی کا مقالہ اس کے ایک سو دس صفحوں میں آیا ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (ف ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء) نے اس مقالے کے بارے میں تحریر فرمایا ہے۔

''ان کا مضمون ''الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ''......ان کی بہترین و مؤثر ترین تحریروں میں ہے......اس مضمون سے بڑھ کر ان کی تجدیدی عظمت کو آشکار کرنے والا کوئی مقالہ نہیں۔''

(۵) تذکرہ شاہ ولی اللہ: یہ ایک مقالہ ہے جو مولانا نے رمضان ۱۳۵۹ھ (اکتوبر ۱۹۴۰ء) میں لکھا تھا اور پہلی بار محرم ۱۳۶۰ھ / فروری ۱۹۴۱ء میں ''الفرقان'' (بریلی) کے شاہ ولی اللہ نمبر میں بعنوان ''آغوش موج کا ایک درتابندہ یا اسلامی ہند کے طوفانی عہد میں خدا کا ایک وفادار بندہ'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔یہ مقالہ ''الفرقان'' کے ۱۳۳

Marfat.com

صفحوں میں پھیلا ہوا ہے۔

''الفرقان'' کا نمبر شائع ہوتے ہی ختم ہوگیا تھا۔ اس کے فوراً بعد دوسرے ایڈیشن کا انتظام کرنا پڑا، جو ایک ماہ کے وقفے سے ربیع الاول ۱۳۶۰ھ/ اپریل ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔ اس اشاعت میں اغلاط کی تصحیح و ترمیمات کے علاوہ نظم و نثر میں کئی مفید اور اہم اضافے بھی ہیں۔ یہ نمبر چونکہ بہت مقبول ہوا تھا اس لئے اس کے بعض مقالے بہت جلد کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ ان میں مولانا عبیداللہ سندھی اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے مقالات کے علاوہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی کا یہ مقالہ بھی تھا، جو سب سے پہلے کتب خانہ الفرقان نے شائع کیا تھا۔ پھر حیدرآباد سے اور ۱۹۴۷ء کے بعد نفیس اکیڈمی کراچی سے کئی بار شائع ہوا۔ میرے سامنے اس کی ۱۹۶۵ء کی چوتھی اشاعت اور الفرقان کے خصوصی نمبر کی دوسری اشاعت ہے۔

اس مقالے (تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ) کے بارے میں مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی نے لکھا ہے:

> ''یہ بھی مولانا کی وسعت نظر اور دقت فکر کا شاہکار ہے اور جیسا کہ ان کے مقالات کا عموماً اندازہ ہوتا ہے، معلومات کا ایک بحر مواج ہے......اس میں بھی مولانا نے...... بڑی تفصیل کے ساتھ اس تاریک ماحول اور طوفانی عہد کا نقشہ کھینچا ہے، جس میں حضرت شاہ ولی اللہ کی ولادت ہوئی اور جس میں آپ کی ابتدائی زندگی گزری......مولانا کی باریک بینی اور دقیقہ رسی کا بصیرت افروز منظر دیکھ کر اسلامی ہند کی تاریخ کا طالب علم حیران رہ جاتا ہے۔'' (الفرقان۔ افادات گیلانی نمبر ص ۶، ۷)

(۶) سیرت بانی دارالعلوم: ''مولانا محمد قاسم نانوتوی کی حیات و خدمات پر ایک سرسری نظر۔'' مولانا گیلانی کا ایک مضمون ''دارالعلوم'' (دیوبند) کے ابتدائی شماروں (۴۲۔۱۹۴۱ء) میں شائع ہوا تھا۔ محمد عامر قمر نے مجلس یادگار گیلانی کراچی سے شائع کیا۔ بطور ''تقدیم'' قاری محمد طیبؒ کا حضرت نانوتوی پر ایک مضمون شامل ہے۔ اس کا پیش لفظ خاکسار (ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری) کے قلم سے ہے۔ صفحات ۱۳۳، اشاعت ۱۹۹۹ء

(۷) سوانح قاسمی: تین حصوں میں مولانا محمد قاسم نانوتوی کے سوانح، سیرت اور خدمات، جلد اول صفحات ۶۱۲، تاریخ تصنیف، رجب ۱۳۵۴ھ، جلد دوم، صفحات ۵۱۲، تاریخ تصنیف ربیع الاول ۱۳۷۵ھ، جلد سوم: صفحات ۱۵۱+ ۲۴=۱۷۵، تاریخ تصنیف: رجب ۱۳۷۲ھ (۱)

جلد چہارم آغاز سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اس کے صرف ۱۷ صفحے داغ حسرت و ناکامی کی یادگار ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ تیسری جلد بھی حضرت گیلانی کے ذوق بادہ پیمائی و صحرا نوردی کے شایان شان نہیں۔ یوم الاثنین رجب ۱۳۷۲ھ/۱۶ اپریل ۱۹۵۳ء تک جو تیسری جلد کے اختتام کی تاریخ درج ہے۔ اس کے تقریباً دو سال بعد مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے نام ایک خط مورخہ ۲۷ فروری ۱۹۵۵ء میں مولانا گیلانیؒ لکھتے ہیں:

> ''تیسری دیکھیے لکھی بھی جاتی ہے یا نہیں؟ مگر زیادہ دھیمی رفتار سے کام ہو رہا ہے۔''

Marfat.com

''سوانح قاسمی'' حضرت گیلانی کے ذوق وخصائص تصنیف کے مطابق معلومات کا گنجینہ، افکار کا حسین گلدستہ ، جامعیت کا نادر مرقع ہے۔ اگر تالیف وتدوین کے اصول، مسائل کی ترتیب اور مباحث کی شیرازہ بندی جو حیات جاوید (حالی) اور حیات شبلی (سلیمان) میں نظر آتی ہے۔ اگر ان کی پابندی اس میں کی جاتی تو سوانح نگاری کے اصول اور فن کے لحاظ سے بھی سوانح قاسمی ایک شاہکار تسلیم کی جاتی۔ اس لئے کہ بعض فنی کمالات کے سوا حضرت مولانا قاسمؒ کا علمی مقامِ سرسید اور شبلی وغیرہ سے بہت بلند تھا اور ذہن وفکر کے محاسن میں وہ ایک نادر روزگار شخصیت تھے۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادی مرحوم نے ''سوانح قاسمی'' کی پہلی اور دوسری جلد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

> ''(سوانح قاسمی جلد اول): مولانا گیلانی کے قلم کی بے تحاشہ روانی اس قید و بند کی کب روادار ہے کہ متن یا حاشیے میں جو کچھ درج ہوا، سب حدود موضوع کے اندر ہی ہوا۔ فقہ، کلام، ادب، سیاست، تاریخ، تصوف خدا معلوم کہاں کہاں کے مسائل جیسے خود بخود چھڑتے چلے گئے ہیں اور یہ کتاب بھی مولانا کی دوسری کتابوں کی طرح ایک اچھی خاصی کشکول بن گئی ہے۔''
>
> (صدق جدید، ۴ مارچ ۱۹۵۵ء)

> ''سوانح قاسمی جلد دوم: کتاب محض ایک بزرگ و فاضل کی ذاتی سوانح عمری نہیں بلکہ تاریخ، تصوف، کلام وغیرہ کے بیسیوں مسائل کا ایک دلچسپ وبصیرت افروز مجموعہ ہے۔ حضرت قاسم کا بیان اور پھر مولانا گیلانی کی زبان، دلآویزی کو کیا کہیں سنتے جاتا ہے۔''
>
> (صدق جدید۔ ۲۴ فروری ۱۹۵۶ء، ص ۴)

حدیث وفقہ

(ا) تدوین حدیث: مولانا گیلانی کے یہ چار توسیعی لیکچر ہیں جو جامعہ عثمانیہ میں پڑھے گئے ہیں۔ اولاً یہ جامعہ عثمانیہ کے ریسرچ جرنل میں چھپے تھے۔ پھر یہ اپریل تا جون ۱۹۴۱ء میں ''معارف'' (اعظم گڑھ) کے تین نمبروں میں چھپے۔ پھر جنوری ۱۹۴۸ء تا اکتوبر ۱۹۵۱ء کے ''برہان'' (دہلی) میں اکتیس قسطوں میں بہت ترمیم واضافہ کے ساتھ شائع ہوئے تھے۔ ۱۹۵۶ء میں مجلس علمی کراچی نے اسے کتابی شکل میں شائع کیا۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

> ''مولانا گیلانی کا قلم جب چل پڑتا ہے تو پھر سرگشتہ خمار رسوم وقیود رہنا نہیں جانتا۔ چنانچہ اس کتاب میں بھی خاص موضوع بحث کے علاوہ فن حدیث وفقہ، تاریخ وسیرت سے متعلق سینکڑوں وثائق ولطائف ہیں جو علماء اور طلباء کے لئے بڑے کام کی چیز ہیں۔'' (''برہان'' دہلی)

مولانا گیلانی کی اس کتاب کی واقعی اہمیت مولانا عبدالماجد دریابادی کے تبصرے کے مطالعے کے بغیر واضح

Marfat.com

نہیں ہو سکتی۔ مولانا دریا بادی نے اس پر مفصل اور جامع تبصرہ کیا ہے۔ یہ تبصرہ بحیثیت تبصرہ بھی مولانا کے بہترین تبصروں میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ قارئین محترم کی ضیافت طبع کے لئے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''تدوین حدیث کی مفصل تاریخ یوں بھی اہم علمی ضروریات میں سے تھی اور امت کے اوپر یہ قرض مدت سے چلا آ رہا تھا کہ حال میں جو تحریک انکار حجیت حدیث زور پکڑ گئی ہے اس نے اس علمی ضرورت کو ایک اہم دینی ضرورت بھی بنا دیا ہے۔ الحمد للہ کہ اس موضوع پر قلم فاضل گیلانی نے اُٹھایا جن سے زیادہ اہل اور موزوں اس خدمت کے لئے کوئی دوسرا تھا بھی نہیں۔ موضوع ایسا کہ قدیم رنگ کے کوئی مولوی صاحب اس کا حق ادا ہی نہیں کر سکتے تھے۔ کارخانہ غیب سے اس کے لئے قرعہ انتخاب ایسے شخص کے نام پر پڑا جس کا دل و دماغ قدیم کے ساتھ ساتھ جدید بھی تھا اور جس کا قلم دیوبندی ہونے کے باوجود ندوی تھا۔

فاضل گرامی نے اس عنوان پر چار مفصل محاضرہ یا مقالے عرصے ہوا تحریر فرمائے تھے اور وہ کچھ تھوڑے بہت بعض رسالوں میں چھپ بھی گئے تھے۔ ادارہ مجلس علمی قابل صد تبریک و تہنیت ہے کہ اس نے اس علمی خزانہ کو برآمد کر کے اور اس کو مکمل صورت میں شائع کر دیا اور بہترین خیر اور داد کے مستحق مولوی شاہ غلام محمد بی اے حیدر آبادی ثم کراچوی ہیں جنہوں نے کتاب کی ترتیب و تہذیب کے جملہ فرائض انجام دیئے اور شروع میں ایک خوب مفصل جامع اور بصیرت افروز فہرست مضامین کا اضافہ کر دیا۔

مباحث و مضامین کے لحاظ سے کتاب کا تعارف سرورق پر کر دیا گیا ہے کہ اس میں حدیث کی شرعی حقیقت حدیث کی دینی اہمیت و ضرورت، اس کی تدوین و حفاظت اور اس کے معیار ردو قبول کے متعلق جملہ مباحث پر نہایت تحقیقی و تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز ان شکوک و شبہات کا نہایت اطمینان بخش جواب دیا گیا ہے جن کی وجہ سے بعض لوگ حجیت حدیث کا انکار کرنے لگتے ہیں۔ اور یہ تعارف اشتہاری قسم کا نہیں۔ شائبہ مبالغہ سے پاک اور تبصرہ کے نقطہ نظر سے بھی صحیح و جامع اور کافی ہے۔

بیسویں عنوانات کتاب میں سے صرف چند بطور نمونہ ملاحظہ ہوں (۱) حدیث کی حقیقت (۲) عام تاریخ اور فن حدیث، (۳) تدوین حدیث کے قدرتی عوامل (۴) حدیث کا بڑا حصہ متواتر ہے۔ (۵) قرآن کی طرح حدیث کے بھی حفظ کا اہتمام تھا۔ (۶) قرون اول میں ''علم'' کے معنی ہی حدیث کے تھے۔ (۷) تدوین حدیث کا ماحول۔ (۸) اجتہاد کا حال (۹) حفاظت اور کتابت (۱۰) خبر احاد کا درجہ (۱۱) حجیت حدیث کے متعلق چند قرآنی دلائل (۱۲) صحابیت اور حدیث رسول کے خلاف پہلا ناپاک اقدام۔

Marfat.com

شروع میں تعارف کے عنوان سے ۴ صفحہ سید الملت مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے ہیں۔اس کا پہلا پیراگراف بھی اپنی معنویت کے لحاظ سے قابل اخذ و نقل ہے۔

''علم القرآن اگر اسلامی علوم میں دل کی حیثیت رکھتا ہے تو علم حدیث شہ رگ کی ہے۔ یہ شہ رگ اسلامی علوم کے تمام اعضاء و جوارح تک خون پہنچا کر ہر آن ان کے لئے تازہ زندگی کا سامان پہنچاتا رہتا ہے۔ آیات کا شان نزول اور ان کی تفسیر، احکام القرآن کی تشریح و تعیین، اجمال کی تفصیل، عموم کی تخصیص، مبہم کی تعیین سب علم حدیث کے ذریعہ معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح عامل قرآن محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور حیات طیبہ اور اخلاق و عادات مبارک اور آپ کے اقوال و اعمال اور آپ کے سنن و مستحبات اور احکام و ارشادات اسی علم حدیث کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں۔''

حسن استنباط، نکتہ آفرینی، دقت نظر مولانا کی تحریروں کے خاص جوہر ہیں اور وہ اس کتاب میں بھی اول سے آخر تک نمایاں ہیں اور بعض جگہ تو ضمناً اور سلسلہ بیان میں ایسی حقیقتیں کہہ گزرتے ہیں جن کی طرف عوام کیا معنی، خواص کا ذہن بھی مشکل ہی سے منتقل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ص ۱۱۳ پر لکھتے ہیں:

''جہاں تک لوگوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے اس زمانہ میں مطلق ''علم'' کا لفظ جب بولا جاتا تو اس سے مقصود وہی علم جدید ہوتا تھا جو محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے مسلمانوں میں پہنچا تھا۔ ابن سعد نے عطاء بن ابی رباح کے حال میں لکھا ہے کہ ابن جریح کہتے تھے کہ عطاء جب کوئی روایت بیان کرتے تو میں پوچھتا کہ علم ہے یا رائے (ہے) اگر حدیث ہوتی تو کہتے کہ علم ہے اور رائے ہوتی (یعنی علماء کے پیدا کئے ہوئے استنباطی نتائج سے اس کا تعلق ہوتا) تو کہتے کہ رائے ہے۔'' (ابن سعد جلد ص ۵، ص ۳۴۵)

اور اس حقیقت کو کتاب کے آخری حصوں میں بھی بار بار بیان کیا گیا ہے۔

کتاب تاریخ حدیث پر تو ہے ہی۔ اس کے علاوہ عقائد و کلام پر بھی ایک اعلا کتاب کا کام دے سکتی ہے...... کتاب جہاں منکرین حدیث کے پیدا کئے ہوئے شبہات کے تسکین بخش جواب دیتی ہے اور دلوں میں تسلی پیدا کرتی ہیں۔ وہیں دوسری طرف حدیث کے ماننے والوں کے غلو اور خبر احاد کو اس کے مرتبہ سے بڑھ کر رکھنے والوں کی مبالغہ پسندی کی بھی اصلاح کرتی جاتی ہے۔ اپنے مختصر سے دیباچہ میں کتنی نپی تلی بات مولانا فرما گئے ہیں:

میرا تو خیال ہے کہ اس کتاب کے پڑھ لینے کے بعد شاید لوگ اسی نتیجہ تک پہنچیں گے کہ انکار و اقرار دونوں کے صحیح حدود سے باہر نکل کر لوگ باتیں کر رہے ہیں۔ ابتداء اسلام سے اس وقت تک حدیث کا ایک خاص مقام مسلمانوں کی دینی زندگی میں رہا ہے۔ یہ اُس کا طبعی مقام ہے۔

Marfat.com

خصوصاً حدیثوں کا وہ ذخیرہ جس کی اصطلاحی تعبیر خبر احاد سے محدثین کرام فرماتے ہیں۔ بہر حال قرآن اور قرآنی مطالبات کے عملی قوالب تشکیلات کے سوا مسلمانوں کی دینی زندگی کی تعبیر میں اول سے آخر تک حدیث بھی شریک ہے۔ یہ ایک ایسی ناقابل انکار حقیقت ہے جس کا انکار وہ بھی نہیں کر سکے جو مسلمان نہیں ہیں...... منکرین حدیث اگر اس واقعہ کے منکر ہیں تو وہ خود بھی جانتے ہیں کہ جھوٹ بول رہے ہیں...... لیکن انکار سے ان کا مطلب اگر یہ ہے کہ قرآن اور قرآنی مطالبات کو مسلمانوں کی دینی زندگی میں جو اہمیت حاصل ہے وہ اہمیت کسی زمانہ میں خبر احاد کو نہیں دی گئی جن پر حدیثوں کا عام ذخیرہ مشتمل ہے۔ اگر ان کے انکار کا حاصل یہی ہے تو پھر ان کا یہ انکار ایک ایسا انکار ہے جس کا اقرار ہر زمانہ میں مسلمان کرتے آئے ہیں اور آج بھی وہ اسی کے قائل ہیں۔'' (ص ۱۰۰۹)

خبر احاد (ص ۲۰۸۔۲۱۰) کے درجہ پر اور البینات (ص ۳۷۸) کے مرتبہ و مقام پر نیز اس حقیقت پر کہ قرون اولیٰ میں حدیث کی کتابت و اشاعت کا اہتمام خصوصی نہ ہونا ارادتاً اور اس مصلحت پر مبنی تھا کہ امت کے لئے وسعت اور آسانی زیادہ سے زیادہ رہے۔ (ص ۲۱۷ تا ۲۲۸) ان کے قلم نے جو داد تحقیق دی ہے یہ صرف وہی کر سکتے تھے۔ یہ انہیں کا حصہ تھا۔ اچھے اچھے علماء و فضلا بھی باوجود علامہ انور شاہ کاشمیری کی سند و توثیق موجود ہونے کے عجب نہیں جو اتنی جرأت نہ دکھا سکیں اور ان منزلوں پر پہنچ کر ان دونوں بزرگوں کا ساتھ چھوڑ دیں۔

بہر حال امت کے سامنے کم سے کم ایک مستند قلم سے ان حقائق کا انکشاف بھی ہو گیا۔

یہ حقیقت بھی کس درجہ دردناک ہے کہ علامہ اپنے اس شاہکار کو مکمل مطبوعہ صورت میں اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکے اور اس کے شائع ہونے سے قبل ہی سفر جنت پر روانہ ہو گئے۔ اللہ کی بے شمار رحمتیں ہوں۔ ایسی فاضلانہ اور گراں مایہ کتاب کے مصنف پر۔''

(صدق جدید لکھنؤ، ۱۹ اپریل ۱۹۵۷ء ص ۴۔۵)

انسان کی کوئی کوشش غلطیوں سے پاک نہیں ہو سکتی۔ ''تدوین حدیث'' میں مولانا گیلانیؒ کے قلم کے بعض تسامحات بھی در آئے تھے۔ ڈاکٹر حمید اللہ کی نظر سے کتاب گزری تو انہوں نے بعض تسامحات کو نوٹ کر لیا تھا اور ڈاکٹر غلام محمد صاحب (مرحوم) کو ایک خط میں لکھ دیئے تھے۔ ان کی نظر سے مولانا دریابادی کا تبصرہ گزرا تو انہوں نے مولانا کو مطلع کیا اور انہوں نے ''صدق جدید'' میں ان کی اشاعت ضروری سمجھی۔ مولانا نے یہ تفصیل ''صدق جدید'' میں چھاپ دی تھی۔ آج اس تصحیح کا شائع کرنا اس لئے نہایت ضروری ہے کہ اگر کسی صاحب کے پاس ''تدوین حدیث'' کا ایسا نسخہ ہو جس میں تصحیح نہ کی جا سکی ہو تو وہ تصحیح فرما لیں۔ مولانا کا نوٹ یہ ہے:

Marfat.com

تدوین حدیث

(از عبدالماجد)

فاضل گیلانی کی محققانہ تصنیف ''تدوین حدیث'' کا تعارف (صدق ۔۲۰) مورخہ ۱۹ اپریل ۵۷ ء میں کیا جاچکا ہے۔ بھول چوک سہونسیان لازمہ بشریت ہے جس سے کوئی بڑا سے بڑا فاضل و محقق بھی محفوظ نہیں، کتاب مذکور کے صفحہ ۴۷ سے ۷۷ تک جہاں طویل العمر صحابیوں کی عمریں درج ہیں خدا معلوم کس طرح خانہ عمر میں ۲۰۔۲۰ سال کا اضافہ ہوگیا ہے۔اس پر نظر بھی مولاناؒ ہی کے ایک محقق شاگرد ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آبادی ثم فرنساوی کی پڑی اور ان کی توجہ دہانی پر ایک دوسرے شاگرد غلام محمد صاحب عثمانیہ نے جو مکتوب صدق کو ارسال فرمایا ہے، وہ درج ذیل ہے:

''تدوین حدیث میں عہد صحابہ کی مدت عمر سے متعلق ایک فاش غلطی رہ گئی ہے۔صفحہ ۴۷ کے آغاز سے صفحہ ۷۷ تک جو اعداد و شمار دیئے گئے ہیں ان میں تقریباً ۲۰۔۲۰ برس کا اضافہ ہوا ہے۔ اس غلطی پر ترکی سے محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے متنبہ فرمایا ہے۔

اب اصل کتابوں سے مراجعت کے بعد اعداد و شمار کی تصحیح کردی گئی ہے اور سہولت کی خاطر پورا ایک جزو دوبارہ لکھوا کر ان تمام حضرات کی خدمت میں بھیجا جارہا ہے جن تک کتاب پہنچ چکی ہے اور جو نسخے موجود ہیں ان میں یہ مصحح جزو لگا دیا گیا ہے۔چونکہ ہر خریدار تک مصحح جزو کا پہنچنا شاید ناممکن ہو اس لئے اگر صرف مصحح عبارت ''صدق'' میں شائع فرمادیں تو اطلاع عام کا فائدہ حاصل ہوجائے گا۔مصحح عبارت نشان زد کردیا گیا ہے۔امید ہے کہ گنجائش نکلنے پر ''صدق'' میں شائع فرمادیا جائے گا۔

لیکن اگر اتنا ہی چھاپا جائے تو کتاب کے پورے تین صفحے نقل کرنے ہوں گے اور اتنی گنجائش نکالنا ''صدق'' کے لئے ایک بڑا بار ثابت ہوگی۔امید ہے کہ محض اتنی اطلاع کافی ہوجائے گی اور جو خریدار صاحب چاہیں گے یہ اوراق ناشر کے یہاں سے منگالیں گے۔پتا: ادارہ مجلس علمی میری ویدر ٹاور کراچی (پاکستان)۔''

(صدق جدید، (لکھنؤ) ۱۲ جولائی ۱۹۵۷ء، ص ۶)

منکرین حدیث کے رد اور ان کے اعتراضات کے دفاع میں یہ نہایت مفید کتاب ہے۔کتابی صورت میں اسے ڈاکٹر غلام محمد مرحوم نے مرتب کیا تھا۔

(۲) مقدمہ تدوین فقہ: ''تدوین فقہ'' کے عنوان سے مولانا کا ایک سلسلہ مضامین ''برہان'' (بابت جنوری تا ستمبر ۱۹۴۵ء) میں چھپنا شروع ہوا تھا لیکن یہ سلسلہ نو قسطوں تک پہنچا تھا اور بحث فقہ کے اصول و مبادی سے آگے نہ بڑھی تھی

کہ سلسلہ رک گیا اور تدوین فقہ کی تاریخ مکمل نہ ہو سکی۔ ''تدوین فقہ'' کے مقدمہ کے طور پر قیام پاکستان کے بعد ڈاکٹر رشید احمد جالندھری نے مدون کیا۔ مکتبہ رشیدیہ لاہور سے ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔

(۳) ایک فتویٰ: مسئلہ رویت ہلال (ایک استفتاء کے جواب میں) صدق جدید لکھنؤ۔ ۲۳ نومبر ۱۹۵۱ء

(۴) چاند کے بارے میں ریڈیو کی خبر: الفرقان، رمضان، شوال ۱۳۸۳ھ

تعلیم و تربیت

(ا) ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت: بڑے سائز پر مولانا کی یہ تصنیف دو حصوں پر مشتمل ہے: حصہ اول صفحات ۳۹۰، حصہ دوم صفحات ۳۶۰۔ یہ کتاب ندوۃ المصنفین دہلی نے شائع کی تھی۔ اب پاکستان میں مکتبہ رحمانیہ لاہور نے چھاپ دیا ہے۔

ہندوستان کو وطن بنانے کے بعد مسلمانوں نے اس ملک میں تعلیم و تربیت کا جو نظام قائم کیا تھا اس کتاب میں اس کی عجیب و غریب خصوصیات کو صحیح اور معتبر تاریخی شہادتوں کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ اساتذہ، طلبہ، طریقہ تعلیم، نصابی تغیرات، طلبہ کے قیام و طعام، کتابوں کی فراہمی کے انتظامات، ان کلّی مباحث کے ساتھ کتابت میں مسلمانوں کی حیرت انگیز چابک دستیاں، اشاعت کتب کے طریقے، مسلمانوں سے پہلے اس ملک میں کاغذ کا فقدان، کاغذ سازی کے کارخانے، کاغذ کے اقسام، سلاطین اور علماء کا تعلیم سے تعلق، ہندوستان میں تعلیمی نصاب کی ہر زمانہ میں افادے کے لحاظ سے برتری، بیرون ہند کے اسلامی ممالک میں ہندوستانی علماء کا امتیاز و تفوق، ان کے سوا بلا مبالغہ بیسیوں نکات و حقائق جن کا مختلف اہم مسائل سے تعلق ہے، اس کتاب میں پہلی دفعہ پیش کئے گئے ہیں۔ سید محبوب رضوی لکھتے ہیں:

> ''ان کی کتاب ''ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت'' اپنے موضوع پر معلومات کا بیش بہا خزانہ ہے۔ ہندوستان میں قطب الدین ایبک کے عہد سے موجودہ عہد تک......اس موضوع کا کوئی گوشہ نہیں جس پر سیر حاصل بحث نہ ہو۔ کتاب مؤثر اور دلچسپ ہے۔''
>
> (تاریخ دارالعلوم دیوبند، سید محبوب رضوی)

اس کتاب کے کم از کم تین ایڈیشن ضرور شائع ہوئے ہیں۔ دوسرا نظر ثانی شدہ ایڈیشن ۱۹۶۵ء یا ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا تھا۔ مولانا دریابادی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

> ''یہ ان کی دلچسپ کتاب کا تازہ ایڈیشن ہے جس کے مسودے کی نظر ثانی اضافہ و تصحیح چند مصنف کر چکے ہیں اور اب یہ ناپید ایڈیشن پہلے سے زیادہ مرتب ہو کر نہ صرف مفصل فہرست مضامین بلکہ بعض عنوانوں کے اضافے کے ساتھ آب و تاب سے نکلا ہے۔

Marfat.com

کتاب بظاہر ایک محدود موضوع پر ہے اور صرف اہل علم کے ایک مختصر سے گروہ کے پڑھنے کے قابل۔ لیکن فی الحقیقت ایسا نہیں ہے۔ کتاب بڑی ہی شگفتہ انداز میں لکھی گئی ہے۔ عالم عامی سب کے لئے دلچسپ اور کسی ایک محدود موضوع پر نہیں۔ مضامین کا ایک ابلتا ہوا سمندر ہے۔ تاریخ کے خدا معلوم کتنے نادر واقعات اور نکتے بے ساختہ اور بے تکلف آتے چلے گئے ہیں۔ کتاب کہنا چاہیے کہ بیش بہا معلومات کا ایک گنجینہ اور علمی نکتہ سنجیوں کا خزانہ ہے۔ افسوس ہے کہ بیان کے زور روانی میں کہیں کہیں ایسے فقرے بھی نکل گئے ہیں جو ایک خاص فرقے کے لئے کبیدگی کا باعث ہو سکتے ہیں لیکن ایسے فقرے خال ہی خال ہیں اور انہیں آسانی سے بدلا جا سکتا ہے۔"

مولانا دریابادی کا یہ تبصرہ "صدق جدید" (لکھنؤ)۔ بابت کا شمارہ مورخہ ۶ مئی ۱۹۶۶ء (صفحہ ۶) میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد دوسری اشاعت ۱۹۸۴ء میں اور تیسری اشاعت ۱۹۸۷ء میں منصۂ شہود پر آئی تھی۔ اس کی ایک نقل پاکستان میں بھی چھاپی گئی ہے۔

مسلمانوں کے نظام تعلیم و تربیت ہی کے سلسلہ میں مرحوم کے چند مضامین اور قابل ذکر ہیں۔ یہ مضامین اگرچہ ابھی کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئے ہیں لیکن ان کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ ان کا ذکر اسی مقام پر کر دیا جائے:

(۲) دارالعلوم دیو بند: (تین قسطیں) الفرقان (لکھنؤ) ذیقعدہ و ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ محرم و صفر ۱۳۵۸ھ (جنوری تا اپریل ۱۹۳۹ء)

(۳) میرا مجوزہ تعلیمی خاکہ: المعارف (اعظم گڑھ) جولائی ۱۹۴۵ء (یہ مضمون "مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" کی دوسری اشاعت کے آخر میں شامل کر لیا گیا ہے)

(۴) دارالعلوم کی بنیاد کے چند (غیر معروف گوشے): دارالعلوم (دیوبند) رمضان ۱۳۷۲ھ (جون ۱۹۵۳ء) (یہ مضمون ایک خط کی صورت میں ہے جو مولانا قاری محمد طیب مرحوم کے نام لکھا گیا تھا)

معاشیات

(۱) اسلام اور نظام جاگیرداری و زمینداری: مولانا گیلانی مرحوم کا یہ مقالہ اولاً رسالہ "معارف" (اعظم گڑھ) میں دسمبر ۱۹۵۲ء اور جنوری ۱۹۵۳ء کے دو شماروں میں چھپا تھا۔ مولانا نے اسے ترمیم اور اضافوں کے بعد اشاعت کے انتظام کے لئے مولانا سید ابوالخیر مودودی کو دے دیا تھا۔ مدت کے بعد ۱۹۷۵ء میں یہ مقالہ ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ کی تصحیح متن، تخریج حوالہ جات، صراحت مآخذ، تبویب مضامین اور ذیلی عنوانات کے اضافہ و تزئین کے بعد (محکمہ اوقاف پنجاب) لاہور سے شائع ہوا۔

Marfat.com

(۲) اسلامی معاشیات: مولانا گیلانی مرحوم کی یہ کتاب پہلے ''معارف'' (اعظم گڑھ) میں اپریل تا اکتوبر ۱۹۴۳ء اور اپریل تا دسمبر ۱۹۴۴ء سولہ قسطوں میں شائع ہوئی تھی۔ صفر ۱۳۶۳ھ (۱۹۴۴ء) سے تقریباً ایک سال تک اس کے مختلف حصے ''الفرقان'' (بریلی) میں بھی شائع ہوئے تھے۔ مئی ۱۹۴۷ء میں پہلی بار کتابی شکل میں حیدرآباد دکن سے اس کے بعد دارالاشاعت کراچی سے شائع ہوئی۔

تصوف

مقالاتِ احسانی: اس مجموعے میں مولانا گیلانی کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ چھ مقالے ہیں جنہیں ڈاکٹر غلام محمد مرحوم نے مرتب کیا ہے اور ادارہ مجلس علمی کراچی نے شائع کیا۔ مجموعے کے سرورق پر مشمولات کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے:

''تصوف و احسان کے موضوع پر چند ایمان افروز اور روح پرور مضامین کا نادر مجموعہ'' اس مجموعے میں یہ مقالات شامل ہیں۔

۱۔ تصوف کے دو طریقے
۲۔ طریقہ غزالیہ
۳۔ اختلافاتِ سلاسل کی حیثیت
۴۔ طریقہ اشغال مطلقہ یا اطلاقی تصوف
۵۔ ابن تیمیہ کا نظریہ مخدومیت
۶۔ محاسن الشیخین یا ''دل کا چین''

مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے ''مقالاتِ احسانی'' پر تبصرے میں لکھا تھا:

> ''مولانا گیلانی کا قلم کیا تھا، ایک ابر گہر بار تھا کہ جس موضوع کی طرف رخ کیا تحقیق و اکتشافات، اسرار و حقائق اور علم و فکر کے چمن کھلاتا چلا گیا۔ ایک مرتبہ تصوف کی طرف متوجہ ہوئے تو ''اطلاقی تصوف'' کے نام سے ایک نہایت بیش قیمت اور بصیرت افروز مقالہ سپرد قلم کیا جس میں سلوک و طریقت کے مختلف طریقوں، ان کی فنی اور شرعی حیثیت اور ان کے باہمی اختلافات کے وجوہ اسباب کے تجزیہ و تحلیل کے بعد یہ ثابت کیا کہ تصوف کی اصل غرض و غایت اس صفت احسان کا پیدا کرنا ہے جس کا ذکر قرآن میں ضمناً و اشارتاً اور حدیث میں بلا واسطہ اور صراحتاً ہے اور اس صفت کا حصول تصوف کے مروجہ طریقوں کے اوپر موقوف نہیں ہے...... صفت احسان کے حصول کا یہ طریقہ دل و جان سے احکام شریعت کی پابندی ہے۔ مولانا نے اس کا نام ''اطلاقی تصوف'' رکھا ہے۔ (برہان، دہلی، اپریل ۱۹۶۰ء ص ۵۶۔۲۵۵)۔
>
> میرے پیش نظر اس کی اشاعت ثانی ۱۳۹۹ھ (۱۹۷۹ء) ہے۔

Marfat.com

دیگر کتب اور مجموعہ مضامین

(۱) افادات گیلانی: یہ الفرقان کا خصوصی شمارہ ہے جو ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ ۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں مولانا گیلانی مرحوم کی شخصیت و خدمات کے تعارف میں ذیل کے تین مضمون ہیں:

(۱) نگاہ اوّلین — از مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی

(۲) مولانا سید مناظر احسن گیلانی — از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

(۳) مولانا گیلانی اور الفرقان — از مولانا محمد منظور نعمانی

دوسرا ''افادات مولانا سید مناظر احسن گیلانی'' کے عنوان سے صفحہ ۴۷ سے صفحہ ۲۱۵ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس حصے میں مولانا کے یہ چار مقالے ہیں:

۱۔ الف ثانی (یا ہزار دوم) کا تجدیدی کارنامہ

۲۔ حج کیا ہے؟

۳۔ دجّالی فتنہ اور سورہ کہف

۴۔ وفا شعاری کے دو نادر نمونے

یہ چاروں مضمون ''الفرقان'' ہی میں چھپے تھے۔ اس نمبر میں ان کی اشاعت ثانی ہے اور پہلے تین مضمون بہ حک و ترمیم اور ملخص ہیں۔ آخری مضمون اشاعت اول کے مطابق ہی معلوم ہوتا ہے۔ پہلے مضمون میں تحذیف و ترمیم کا عمل مولانا نسیم احمد فریدی امروہی نے انجام دیا اور دوسرے اور تیسرے مضمون کی تحذیف و تدوین مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی نے کی ہے۔

یہ نمبر ۲۱۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس نمبر پر تبصرے میں لکھا تھا۔

> ''ان مضامین کی تعداد چار ہے...... چاروں میں سے کوئی مضمون ایسا نہیں جو سطحی یا کم رتبہ ہو۔ ہر مضمون تاریخ، ادب، علوم قرآنی، حکمت ایمانی کے مختلف پہلوؤں سے قابل داد ہے اور ایک خاص رنگ کی انشا تو مولانا کے قلم کا حصہ ہے۔ تصوف و معرفت کے نکتے کہنا چاہیے کہ ہر جگہ پھیلے ہوئے ملیں گے اور یہ دیکھ کر بس اللہ کی قدرت نظر آتی ہے کہ جو آیتیں اور حدیثیں ہر پڑھے لکھے کے علم میں ہیں مولانا نے ان سے بھی کیسے کیسے لطیف و نادر نکتے پیدا کر دکھائے ہیں۔'' (صدق جدید، (لکھنؤ) ۱۶ اگست ۱۹۵۷ء، ص ۶)

(۲) علمائے دیوبند کی یادگار تحریریں: اس کے عنوان سے دو جلدوں میں (۴۲+۳۲=۷۴) مضامین ملتان کے ایک ادارے نے شائع کئے ہیں۔ اس کی پہلی جلد کے اکثر مضامین ''القاسم'' و ''الرشید'' (دیوبند) سے ماخوذ ہیں اور دوسری جلد کے بیشتر مضامین دارالعلوم (دیوبند) سے اخذ کئے گئے ہیں۔ اس سے زیادہ کسی مضمون کے بارے میں کوئی صراحت یا کوئی اشارہ موجود نہیں کہ کون سا مضمون کس رسالے سے اور اس کے کس شمارے سے لیا گیا ہے۔ ان دو جلدوں میں سب سے زیادہ مضمون (۲+۱۸=۲۰) حضرت مولانا گیلانیؒ کے قلم کے یادگار اور تحقیق کے شاہکار ہیں۔

Marfat.com

(۳) احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن: یہ سلسلہ مضمون مولانا گیلانی کی زندگی کے بارے میں ان کی اپنی یادداشتوں پر مشتمل ہے۔ دارالعلوم میں مولانا ۱۹۱۳ء کے آخر سے ۱۹۱۴ء کے آخر تک تقریباً ایک سال دورہ حدیث کے طالب علم کی حیثیت سے اور اس کے بعد کچھ عرصہ ''القاسم''، ''الرشید'' کے مدیر اور دارالعلوم کے مدرس کی حیثیت سے رہے تھے لیکن یہ یادداشتیں صرف اس زمانے کی نہیں بلکہ اس سے ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء (ٹونک کے زمانہ طالب علمی) سے ۱۹۱۷ء (حیدرآباد میں ملازمت) تک کے حالات قدرے مفصل اور ۱۹۱۷ء کے بعد سے ۱۹۴۹ء (ملازمت سے سبکدوش ہونے) تک کے مجمل حالات پر مشتمل ہیں۔

یہ سلسلہ مضمون ماہنامہ ''دارالعلوم'' (دیوبند) میں اکتوبر ۱۹۵۱ء سے اگست ۱۹۵۵ء تک تیس قسطوں میں چھپا تھا۔ یہ مولانا کی نہایت دلچسپ خودنوشت ہے اور ۱۹۹۸ء میں کراچی اور ملتان سے کتابی صورت میں شائع ہوگئی ہے۔

(۴) مجالس الشیخین: مولانا کا یہ سلسلہ مضمون ''دارالعلوم'' دیوبند (ماہنامہ) کی پہلی جلد (مارچ تا ستمبر ۱۹۵۱ء) کے چھ شماروں میں اور پانچ سال کے وقفے کے بعد جلد ۱۲، ۱۳ (دسمبر ۱۹۵۱ء تا مئی ۱۹۵۷ء) کے چھ شماروں میں شائع ہوا تھا۔

تصوف و طریقت کے باب میں حضرت محی الدین ابن عربیؒ اور مولانا رومؒ کے افادات و ارشادات کا لاجواب مجموعہ ہے۔ مولانا نے اسے ڈائری کی شکل میں مرتب کیا ہے۔ نہایت سبق آموز، فکر انگیز، ایمان افروز اور روح پرور سلسلہ مضمون ہے۔ معلوم نہیں ہوسکا کہ کسی نے کتابی شکل میں بھی چھاپ دیا ہے؟ البتہ ''مقالات احسانی'' میں اس کا کچھ حصہ شامل کرلیا گیا ہے۔

(۵) بہشتی پیداواروں کی ایک جھلک: مولانا گیلانی کا یہ مضمون ''دارالعلوم'' دیوبند کی پانچ قسطوں (دسمبر ۱۹۵۴ء تا جون ۱۹۵۵ء) میں چھپا تھا۔ بصیرت و موعظت سے معمور اور ایمان افروز یہ مضمون ۱۹۹۷ء میں دارالفکر کراچی سے کتابچے کی شکل میں چھپ گیا ہے۔ خاکسار ابوسلمان شاہجہاں پوری نے اس پر مختصر پیش لفظ تحریر کیا ہے۔

(۶) مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ: مولانا گیلانی مرحوم کا یہ مقالہ فروری ۱۹۵۲ء تا جنوری ۱۹۵۳ء برہان (دہلی) کی بارہ قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ تاریخی حقائق اور مذہبی معلومات سے بھرپور یہ سبق آموز سلسلہ مضمون ندوۃ المصنفین دہلی نے کتابی شکل میں بھی چھاپ دیا تھا۔ اس کی نقل ادارہ اسلامیات لاہور نے ۱۹۷۶ء میں شائع کردی ہے۔

(۷) مکاتیب گیلانی: وقت کے پچاسوں مشاہیر و معاصر سے مولانا گیلانی کے روابط اور مکاتبت کا تعلق تھا۔ اس کے علاوہ تلامذہ و اعزہ وغیرہ سے مکاتبت کا تعلق ہمیشہ رہا۔ ان کے ہزاروں خط ان حضرات یا ان کے خاندانوں میں اب تک ہوں گے جن کے جمع، تدوین اور اشاعت کی کوئی صورت ابھی تک نہیں ہوسکی۔ مولانا کے انتقال کے بعد مولانا منت اللہ رحمانی نے خطوط کے جمع و تدوین کے لئے قدم اٹھایا تھا اور ستاسی خطوط کا ایک مجموعہ شائع بھی کیا تھا لیکن یہ سعی مولانا کے تمام خطوط کی فراہمی اور ترتیب و اشاعت تک کامیاب نہ ہوسکی۔

مولانا رحمانی نے ''مکاتیب گیلانی'' کا جو مجموعہ ''جلد اول'' کے طور پر چھاپا تھا اس میں اہلیہ مولوی سید محمد

Marfat.com

یعقوب وکیل (ایک خط)، حکیم حافظ یوسف حسن خاں رحمانی (ایک خط)، مولانا محمد زکریا محمودی (ایک خط)، مولوی محمد یعقوب ڈپٹی کلکٹر (چار خط)، مولانا عبدالباری ندوی (انچاس خط) اور مولانا سید سلیمان ندوی (اکتیس خط) کل ستاسی خطوط ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندوی کے نام مولانا گیلانی کے خطوط ''معارف'' (اعظم گڑھ) میں فروری تا اگست ۱۹۲۳ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے مطالعہ و موازنہ سے پتا چلا کہ مجموعے کے خطوط نہایت ناقص ہیں اور تمام خطوط مجموعے میں شامل بھی نہیں۔

مولانا منت اللہ رحمانی نے ''عرض مرتب'' کے عنوان سے خطوط کی فراہمی اور ترتیب و اشاعت کی روداد بیان کی ہے اور ''مقدمہ'' مولانا عبدالباری ندوی مرحوم کے قلم سے ہے اور خاصے کی چیز ہے۔ اس میں حضرت گیلانی کے ذوق و سوانح اور افکار کے کئی گوشوں میں روشنی پڑتی ہے۔ ان کے تفسیری انداز اور خصائص پر طویل بحث ہے۔ خطوط نگاری کے محاسن، ذہنی و دماغی کمالات، سیرت کے محامد بھی اجاگر ہوئے ہیں۔ یہ مقدمہ کوئی ایسا شخص ہی لکھ سکتا تھا جس نے مولانا کو قریب سے دیکھا ہو اور ایک مدت کا قرب وصحبت اسے میسر آئی ہو۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے مولانا گیلانی کے خطوط کے بارے میں لکھا تھا:

> ''آپ کے خطوط میں برجستگی و بے ساختگی کے ساتھ ہلکی ہلکی ظرافت اور علمی نکتہ آفرینیوں کے ساتھ لطیف طنز بھی پایا جاتا تھا۔ وہ بسا اوقات طنز کے پیرائے میں علم و فن یا شریعت و تصوف کے ایسے عجیب و غریب نکات بیان کر جاتے تھے جو تلاش کے باوجود کسی کتاب میں نہیں ملیں گے۔''
>
> (برہان، دہلی، اگست ۱۹۵۶ء، ص ۶۸)

مکاتیب گیلانی کا یہ مجموعہ ۱۹۷۲ء میں مونگیر (بہار) سے شائع ہوا تھا۔ مولانا رحمانی مکاتیب کے جمع و تدوین کو اپنے منصوبے کے مطابق پایہ تکمیل کو نہیں پہنچا سکے۔ خدا کرے اب کوئی صاحب ہمت اس طرف متوجہ ہوں اور جس حد تک بھی اخبار و رسائل میں منتشر اور بعض خاندانوں میں محفوظ متوقع ذخیرہ خطوط فراہم ہو سکے شائع کر دیا جائے۔ مولانا کے انتقال کے بعد گذشتہ ۴۴، ۴۵ برس میں اگرچہ یہ کام مشکل ہو گیا ہے لیکن اگر اب بھی اس جانب توجہ نہ کی گئی تو فراہمی خطوط کی راہ مزید دشوار اور کامیابی کے امکانات اور معدوم ہو جائیں گے۔

(۸) ہزار سال پہلے: مسلمان سیاحوں کے سفرناموں سے ماخوذ معلومات و مشاہدات کا ایک جامع سلسلہ مضمون غالباً دارالعلوم دیوبند (ماہنامہ) میں نکلا تھا۔ دارالعلوم دیوبند کی انجمن ثمرۃ التربیت نے ۱۹۵۰ء میں کتابی شکل میں چھاپ دیا تھا۔ کراچی سے نفیس اکیڈمی نے اسے ۱۹۶۴ء، ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۵ء میں تین بار شائع کیا تھا۔ میرے سامنے اس کی تیسری اشاعت ہے (صفحات ۳۲۰)

شاہ معین الدین ندوی مرحوم (ف دسمبر ۱۹۷۴ء) نے اس پر تبصرے میں لکھا تھا:

''فاضل مصنف نے جن کا ہمہ گیر ذوق نئے نئے رنگ میں اپنا جلوہ دکھاتا رہتا ہے، قدیم سفر

Marfat.com

ناموں اور جغرافیے کی مدد سے آج سے ''ہزار سال پہلے'' کے عنوان سے ایک مسلسل مضمون لکھا تھا جو غالباً رسالہ ''دارالعلوم'' میں شائع ہوا تھا۔ اس کو کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا ہے۔ اس میں ہزار سال پہلے کے ہندوستان، چین، عراق، ایران، ترکستان اور شمالی افریقہ کے بعض علاقوں کے مذہبی، معاشرتی، تمدنی اور علمی حالات اور دوسرے عجائب ونوادر کی جھلک دکھائی گئی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب مفید بھی ہے اور دلچسپ بھی۔'' (معارف، اعظم گڑھ، ستمبر ۱۹۵۰ء، ص ۲۳۶)

(۹) کائنات روحانی: کئی حضرات نے مولانا کے اس نام کے ایک رسالے کا ذکر کیا ہے۔ ان کی نظر سے بھی گزرا ہے لیکن اس کا نفس مضمون اور اس کی تفصیل کسی نے بیان نہیں کی۔ میری نظر سے یہ رسالہ نہیں گزرا۔

(۱۰) السائل وعواقبہ (بھیک مانگنے والوں کا انجام): مولانا مرحوم کا یہ مضمون ''الرشید'' (دیوبند) میں ذی قعدہ وذی الحجہ ۱۳۳۴ھ اور صفر ۱۳۳۵ھ کی تین قسطوں میں چھپا تھا۔ ہندوستان سے اسے کتابچے کی شکل میں چھاپ دیا گیا ہے۔ اب کراچی کا ایک ادارہ دارالفکر اسے چھاپ رہا ہے۔

(۱۱) کائنات روحانی: اس ظاہری کائنات کی طرح ایک روحانی کائنات ہے اور اس کا ایک باقاعدہ نظام ہے۔ مولانا نے اس کی تشریح میں القاسم (دیوبند) میں ایک مضمون لکھا تھا۔ اسے کسی نے ہندوستان میں چھاپ دیا ہے۔ یہ رسالہ میری نظر سے نہیں گزرا ہے۔ پروفیسر اختر راہی نے اس رسالے کا ذکر کیا ہے۔ تفصیل نہیں لکھی (المعارف، لاہور، ستمبر ۱۹۸۰ء)۔

Marfat.com

غیر مرتب مقالات ومضامین

مولانا گیلانی علیہ الرحمہ کی تصنیفات وتالیفات کا ذکر ہو چکا ہے اور ان کے ضمن میں مولانا کے بہت سے مضامین ومقالات قارئین محترم کی نظروں سے گزر چکے ہیں لیکن جیسا کہ ذکر کیا گیا ان کے علمی مقالات ومضامین کا بہت بڑا ذخیرہ ہے جو رسائل وجرائد کے صفحات میں چھپا ہوا ہے۔ ابھی تک نہ کسی نے اس کی جستجو کی اور نہ اس کی ترتیب وتدوین کا کوئی قدم اٹھایا گیا۔

مولانا کی تصنیفات وتالیفات کے جو کام اب تک انجام پائے ہیں، ان میں علمی ذوق اور حضرت مولانا کے افادات وتحقیقات کی تدوین واشاعت کے بے لوث جذبے کے بجائے اداروں اور افراد کے اغراض ومقاصد اور کاروبار کی ضرورتوں کو زیادہ دخل رہا ہے۔ یہ بات میں طنزاً نہیں کہہ رہا ہوں۔ کاروبار کوئی بری چیز تو نہیں اور یہی کاروبار جو انسانی زندگی کے قیام وبقاء کے لئے ضروری ہے لیکن علم وتحقیق کی خدمت خالص علمی ذوق سے انجام دینا اور اپنی ضروریات زندگی کی فراہمی کا اسے وسیلہ بنانا، دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ علم وتحقیق کے کاموں کو علمی خدمت کے ذوق وجذبے سے انجام دیا جائے تب بھی اس سے دنیاوی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ پھر علمی خدمت کی پاکیزگی کو دنیاوی

اغراض سے کیوں داغدار کیا جائے؟ بہرحال ضرورت اس چیز کی ہے کہ حضرت گیلانی کے افادات کو فراہم کر کے انہیں مختلف مجلدات میں مرتب و مدون کر کے شائع کیا جائے اور خدا توفیق دے تو خالص علمی ذوق و جذبہ خدمت سے یہ کام انجام دیا جائے۔ دنیاوی فوائد جن کے لئے کتنے ہی نیک جذبات کو تباہ کر دیا جاتا ہے، وہ ہر حال میں اس سے حاصل ہوں گے۔

ذیل میں مولانا مرحوم کے افادات علمیہ جو مضامین و مقالات کے مجلدات کی صورت میں ابھی تک مرتب و مدون نہیں کئے جاسکے ہیں ضروری ہے کہ ان کی ایک فہرست مرتب کر دی جائے۔ اس سلسلے میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ انہیں مختلف موضوعات کے ذیل میں مرتب کیا جائے۔ لیکن یہ تقسیم و ترتیب قطعی نہیں ہے۔ مولانا کے بیشتر مضامین اپنی مختلف خصوصیات کی بناء پر کئی موضوعات کے تحت رکھے جاسکتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس کے بعد بھی مولانا کے بہت سے مضامین تک جستجو کے قدم پہنچ ہی نہیں سکے ہیں۔ اس لئے کہ مولانا کے رشحات علم و فکر پچاسوں اخبار اور رسائل میں چھپے اور مکمل فائلیں اہم جرائد و رسائل کی بھی دستیاب نہیں، لیکن پھر بھی بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ جہاں تک جستجو و تحقیق کے قدم پہنچ چکے ہیں یہ بھی کچھ کم کامیابی نہیں۔ اب آپ مولانا گیلانی مرحوم کے مضامین کی فہرست ملاحظہ فرمائیے۔

تاریخ و سیاسیات

ان دیکھی قوت ایک پوشیدہ خزانہ (ہندوستان میں مسلمانوں کی باعزت زندگی کا مسئلہ)	الفرقان (لکھنؤ) ذیقعدہ ۱۳۶۴ھ
☆ انسانی تاریخ کی ایک مثالی حکومت (عمر بن عبدالعزیز کی حکومت)	معارف (اعظم گڑھ) مارچ ۱۹۵۰ء
☆ پاکستان کا اسلامی دستور	صدق (لکھنؤ) ۱۹۴۸ء
☆ پاکستان اور ہندوستان ایک نئے نقطہ نظر سے	ایضاً
☆ تاتاریت اور فرنگیت میں مماثلت	ایضاً، نومبر تا دسمبر ۱۹۴۶ء
☆ ڈ تاریخ اندلس سے سبق	ایضاً، ۲۸ جولائی ۱۹۵۰ء
☆ مسلمانوں کا اندلس خود ان کی نگاہ میں (دو قسطوں میں)	معارف (اعظم گڑھ)، نومبر، دسمبر ۱۹۵۳ء
☆ تاریخ چین کا ایک ورق	برہان (دہلی)، اگست ۱۹۵۶ء
☆ جماعت مودودی اور جمہوریت	صدق (لکھنؤ)، ۱۸ اگست ۱۹۵۰ء
☆ دلی اور مابعد	ایضاً، ۲۱ نومبر ۱۹۴۷ء
☆ قیصریت اور کسرویت	ایضاً۔ جون ۱۹۴۸ء
☆ کرشن کے ساتھ آریوں کی عداوت پر ایک نظر	القاسم (دیوبند)، شعبان ۱۳۳۵ھ

☆ مسلمانوں کی حکومت میں غیر مسلم اقوام	''معارف'' (اعظم گڑھ) نومبر ۱۹۵۰ء
(چار قسطوں میں)	جنوری وفروری ۱۹۵۱ء
☆ مسلم عہد حکومت میں	صدق (لکھنؤ) ۱۶ جون ۱۹۵۱ء
☆ مسلم خروج حکومت میں	صدق جدید (لکھنؤ) فروری ۱۹۵۵ء
☆ اسلامی حکمرانوں سے مسلمانوں کی ایک بے جا شکایت	معارف (اعظم گڑھ) اگست تا دسمبر ۱۹۴۸ء
(پانچویں قسط)	
☆ مسئلہ ہجرت کا علمی جائزہ	
(۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان سے ترک وطن کا مسئلہ)	صدق (لکھنؤ)، مارچ تا اپریل ۱۹۴۹ء
☆ وقت کی اہم پکار	ایضاً، ۳ مارچ ۱۹۵۰ء
☆ ہندوستان کی ایک قدیم پنج سالہ سکیم	
(عہد شیر شاہ سوری میں رفاہ عامہ کے کام)	الفرقان (لکھنؤ)، جمادی الاخریٰ ۱۳۷۴ھ
☆ ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق چند مشورے اور تجویزیں	الفرقان، شوال ۱۳۶۴ھ

تراجم وادبیات

☆ جبر السیئات بالحسنات، از محمد بن علی الحاتمی بن عربی	الرشید (دیوبند) ذیقعدہ ۱۳۳۵ھ
☆ الریاضۃ الجسمانیہ	از حافظ ابن قیم، ایضاً
☆ عمر الدنیا	از علامہ شہاب محمود، ایضاً
☆ میرے خواب	از علامہ عبد الوہاب شعرانی، ایضاً
☆ عورتوں کی بیعت	از علامہ شہاب محمود
	ایضاً۔ جمادی الاخریٰ ۱۳۳۵ھ
☆ تذکرہ اعظم (تبصرہ)	القاسم (دیوبند)، رمضان، شوال ۱۳۳۵ھ
☆ دیوان العرب یا حماسہ	الرشید (دیوبند)، جمادی الاولی، ۱۳۳۵ھ
☆ مراقبات (از ڈاکٹر میر ولی الدین) (تبصرہ)	معارف (اعظم گڑھ)، جنوری ۱۹۴۹ء
☆ حکیم الامت (از مولانا عبد الماجد دریابادی) (تبصرہ)	ایضاً، اکتوبر ۱۹۵۲ء

سوانح وشخصیات

☆ اسلامی رواداری اور مساوات کا ایک دلآویز مرقع	الفرقان (لکھنؤ) رجب ۱۳۷۴ھ

Marfat.com

☆ایک اسماعیلی دیندار (احمد نواز جنگ)	صدق جدید (لکھنؤ) ۴ فروری ۱۹۵۵ء
☆ایک تعزیت نامہ	ایضاً، ۱۶ نومبر ۱۹۵۱ء
☆ایک درویش اپنے آخری وقت میں	الفرقان (لکھنؤ)، مئی جون ۱۹۷۵ء
☆ایک سیاسی قوال کا عبرتناک عروج وزوال (تیسری اور آخری قسط)	الفرقان (لکھنؤ) جمادی الاولیٰ ۱۳۷۴ھ
☆تقریر تعزیت (بروفات حضرت تھانوی)	صدق (لکھنؤ)، ۲۳، ۲۳ اگست ۱۹۴۳ء
☆تعزیت نامہ (بروفات مولانا محمد علی)	سچ (لکھنؤ) ۱۶ جنوری ۱۹۳۱ء
☆حبیب الرحمٰن خاں شروانی	معارف (اعظم گڑھ)، دسمبر ۱۹۵۰ء
☆دنیا کے دو بھائی اور دین کے دو بھائی	سچ (لکھنؤ)، مارچ ۱۹۳۱ء
☆سر علی امام	صدق جدید (لکھنؤ)، ۲۸ جولائی ۱۹۶۱ء
☆مرزا رحیم بیگ محمد درویش عظیم آبادی شہید	برہان (دہلی)، اگست ۱۹۵۸ء
☆شہادت حسنی	سچ (لکھنؤ)، اگست ۱۹۲۶ء
☆ایضاً	صدق (لکھنؤ) ۱۶، ۲۳ نومبر ۱۹۴۲ء
☆منصور حلاج	سچ (لکھنؤ) اپریل ۱۹۴۲ء
☆مولانا سید برکات احمد ٹونکیؒ	معارف (اعظم گڑھ)، مارچ، اپریل ۱۹۲۹ء
☆واقعہ حضرت زینب	القاسم (دیوبند) جمادی الاخریٰ و رجب ۱۳۳۵ھ
☆وفاداری کے دو نادر نمونے (حجاج بن یوسف کی عبدالملک اور ولید سے ابراہیم تیمی کی ابراہیم نخعی سے وفاداری کے حیرت انگیز واقعات)	الفرقان (لکھنؤ) ۱۳۷۲ھ
☆ہمارے سپہ سالار	سچ، لکھنؤ، ۲۳ مارچ ۱۹۴۳ء
☆ہندوستان کا ایک مظلوم مولوی (عہد اکبری کا شیخ قطب) (تین قسطیں)	معارف (اعظم گڑھ) اکتوبر نومبر ۱۹۵۱ء وجنوری ۱۹۵۲ء

مذہب واخلاقیات

☆اسلاف سے فائدہ اٹھانے کا جدید طریقہ	الرشید (دیوبند)، جمادی الاخریٰ رجب ۱۳۳۵ھ
☆اسلام اور سود (مقدمہ کتاب ڈاکٹر انور اقبال قریشی)	سچ (لکھنؤ)، اکتوبر ۱۹۴۵ء
☆اسلام کا جشن یوم تاسیس	صدق (لکھنؤ) ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۶ء

Marfat.com

مولانا مناظر احسن گیلانی......عالمِ بے بدل

☆اسلامی سزائیں	صدق جدید (لکھنؤ) ۴ دسمبر ۱۹۵۳ء
☆ایام جاہلیت کا جاہلیت حاضرہ سے موازنہ	سچ (لکھنؤ)، ۱۴، ۱۴، ۳۱ جولائی و ۴ اگست ۱۹۳۳ء
☆ماہ جنون پرور یا شہر رمضان	سچ (لکھنؤ)، جنوری ۱۹۴۶ء
☆بقرعید یا عملی اسلام کا پہلا دن	الفرقان (لکھنؤ) ، رمضان ، شوال ۱۳۶۱ھ
☆تقلید واقتدا	سچ (لکھنؤ)، ۷، ۱۴ و ۲۱، اگست ۱۹۳۱ء
☆تکفیر وتفریق پر ایک نظر	صدق (لکھنؤ)، جولائی ۱۹۴۳ء
☆جاہلیت قدیم وجدید	سچ (لکھنؤ)، ۱۸ نومبر ۱۹۲۷ء
☆جدید تمدن کا ماتم	القاسم (دیوبند) شوال ۱۳۳۴ھ
☆جدید علم کلام قدیم زبان میں	معارف (اعظم گڑھ)، جولائی و دسمبر ۱۹۳۵ء
☆تاریخ ارض القرآن (تبصرہ)	معارف (اعظم گڑھ)، مئی ۱۹۵۵ء
☆چاند کے بارے میں ریڈیو کی خبر	الفرقان (لکھنؤ) ، رمضان و شوال ۱۳۸۳ھ
☆حج کیا ہے؟	ایضاً۔ حج نمبر ۱۳۶۸ھ
☆راہ کعبہ کے احساسات وواردات	ایضاً۔ ۱۳۶۹ھ
☆دربار نبوت کی حاضری	ایضاً۔ ۱۳۷۰ھ
☆اللہ کے گھر پہنچ کر	ایضاً۔ ۱۳۷۰ھ

☆خصائل الفطرۃ	الرشید (دیوبند)۔ محرم ۱۳۳۵ھ
☆ایضاً	ایضاً۔ رجب ۱۳۳۵ھ
☆خطبہ جمعہ کی زبان	برہان (دہلی)، مارچ ۱۹۴۷ء
☆دامغات الاغلوطات کا سرشکن	القاسم (دیوبند، ربیع الثانی ۱۳۳۴ھ
☆ایضاً (متعدد قسطوں میں، آخری قسط)	
☆دور فتن	سچ (لکھنؤ) ۲۱ فروری ۱۴ اور ۲۱ مارچ ۱۹۲۷ء بعدہ

Marfat.com

☆روشن خیالی یا حماقت	الفرقان (لکھنؤ)، ۴، ۱۹۷۴ء
☆سکرۃ الموت	صدق جدید (لکھنؤ)، ۱۲، ۱۹ ستمبر ۱۹۵۲ء
☆قربانی کا فلسفہ	صدق (لکھنؤ)، دسمبر ۱۹۴۳ء
☆مذہب کی ضرورت	القاسم (دیوبند) ذی الحجہ ۱۳۳۵ھ
☆مسلمانوں کے دنیوی مصائب کے دینی اسباب	برہان (دہلی)، جنوری ۱۹۴۹ء
☆مسئلہ تناسخ پر ایک تاریخی نظر	القاسم (دیوبند)، ربیع الاول، جمادی الاولیٰ ۱۳۳۵ھ
☆مسئلہ رویت حلال	صدق جدید (لکھنؤ)، ۲۳ نومبر ۱۹۵۱ء
☆مسئلہ سود۔ مسلم وحربی میں (چار قسط)	معارف (اعظم گڑھ) نومبر ۴۵ ، تا دسمبر ۱۹۴۶ء
☆مسئلہ سود و قرد کی مزید تشریح	سچ (لکھنؤ)، جنوری ۱۹۴۵ء
☆مولانا عثمانی اور فضل اللہ کی خدمت میں	معارف (اعظم گڑھ)، ستمبر ۱۹۵۳ء
☆نام، کنیت، لقب پر اسلامی تعلیمات کا اثر	الرشید (دیوبند)، جمادی الاخریٰ و رجب ۱۳۳۵ھ
☆نصرانی تہمتیں	سچ (لکھنؤ) اکتوبر ۱۹۴۵ء
☆واہمہ کا شوشہ اور دولت کا نشہ	دارالعلوم (دیوبند) جولائی ۱۹۵۶ء
☆ہادم اللذات یعنی موت	الفرقان (لکھنؤ) ذی الحجہ ۷۱ھ وصفر ۱۳۷۲ھ
☆یادگار گیلانی	الفرقان (لکھنؤ) ذی الحجہ ۱۳۷۵ھ

متفرقات

☆حجازی عربی کا سامی زبانوں	برہان (دہلی) مئی ۱۹۴۲ء
☆آج کی مشکلات کا حل کل کے آئینے میں	صدق، (لکھنؤ) ۱۱، ۱۸ مئی ۱۹۴۲ء
☆اسلامی صحافت کی تنظیم	صدق (لکھنؤ) نومبر ۱۹۴۶ء
☆تاثیر الادویہ	الرشید (دیوبند) محرم ۱۳۳۵ھ
☆حل مشکلات کی زندہ تدبیریں	سچ (لکھنؤ)، اکتوبر ۱۹۳۱ء
☆خوارق عادت کے وقوع پر یورپ کی بعض شہادتیں	القاسم (دیوبند) ذی الحجہ ۲۳۳۵ھ

Marfat.com

☆ فلسفہ ارتقاء پر ایک نظر......ایک نئے پہلو سے	صدق (لکھنؤ)، ۱۹ اپریل ۱۹۴۳ء
☆ مسئلہ جذب وکشش پر ایک تنقیدی نظر	القاسم (دیو بند)، جمادی الاخریٰ ۱۳۳۵ھ
☆ قاسم العلوم اور اس کا لائحہ عمل	القاسم (دیو بند)، شعبان ۱۳۵۳ھ

طرزِ تحریر ونگارش

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کی متعدد تصانیف اور بہت سی تحریرات ہمارے سامنے ہیں جن کا دائرہ بحث ونظر مختلف علوم وفنون تک پھیلا ہوا ہے۔ ان کا علم وفن کی دنیا میں کیا مقام ہے؟ یہ بحث تو اہل علم اور اصحاب فن کی توجہ کی محتاج ہوگی۔ لیکن اس سے پہلے کہ کوئی محترم قاری ان کے علمی وفنی خصائص کی طرف توجہ فرمائیں، جو چیز تو جو کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور تحریر وکتاب کے خاتمے تک اسے اپنی گرفت سے آزاد نہیں کرتی، وہ ان کے قلب کا گداز اور جان کا سوز ہے، جو حروف والفاظ اور سواد تحریر میں روح تاثیر کی طرح جاری وساری ہوتا ہے۔

حضرت گیلانی کی تحریر کی دوسری خوبی ان کی بات سے بات پیدا کرنے کا سلیقہ ہے۔ وہ ایک بات شروع کرتے ہیں اور پھر بات سے بات پیدا کرتے ہوئے آغاز کلام کے مقام سے بہت دور نکل جاتے ہیں۔ لیکن وہ کتنے ہی دور چلے جائیں تحریر کا فکری ربط کہیں نہیں ٹوٹتا، معنویت کہیں مجروح نہیں ہوتی اور قاری کو نقطہ آغاز بحث سے بعد مسافت کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کی دلچسپی برقرار اور گل افشانی تحریر اور رنگینی بیان میں اس کی محویت قائم رہتی ہے۔ ان کے جملہ ہائے معترضہ جملوں کے حدود میں نہیں رہتے، مفصل عبارتوں تک اور ضمنی مباحث ضمنی نہیں رہتے، مستقل بحثوں، فصلوں اور ابواب تک پھیل جاتے ہیں۔ اس طرح ان کی ایک فن میں کتاب مختلف علوم وفنون کا خزینہ اور افکار کا گنجینہ بن جاتی ہے اور بعض اوقات فن کا سررشتہ قاری کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور اسے ٹھہر ٹھہر کر سوچنا پڑتا ہے کہ شاہ راہ فن سے الگ ہو کر معترضات اور ضمنیات کی پگڈنڈی پر کہاں سے پڑے تھے اور اب کس مقام پر ہیں۔ لیکن قاری کی حیرت دور نہیں ہونے پاتی کہ شاہ راہ فن اس کے سامنے پھر نمودار ہو جاتی ہے اور وہ اس راہ پر چل پڑتا ہے۔ خواہ وہ زیادہ دیر اور بہت دور تک اس پر نہ چل سکے اور پھر کسی ضمنی اور ذیلی بحث میں الجھ کر شاہ راہ فن سے دور جا پڑے اور سررشتہ فکر اس کے ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ لیکن ان کی تحریر کی اس خوبی کو کیا کہیے گا کہ قاری کی اس سے دلچسپی ایک لمحے کے لئے کم نہیں ہوتی۔ وہ پیراہن تحریر کی تراش خراش کے حسن وقبح کے بجائے اس کی رنگینیوں میں کھو جاتا ہے۔

مولانا کی تحریر پہلی نظر میں بڑی پیچیدہ اور مشکل نظر آتی ہے لیکن جوں جوں مطالعے کی نظر ٹھہرتی ہے اور ذوق موضوع سے آشنا ہوتا ہے، مشکلات کی دھند چھٹتی جاتی ہے اور تحریر کا حسن اور نگارش کی خوبیاں نمایاں ہونے لگتی ہیں۔ مولانا کی تحریروں سے لطف اندوز ہونے کے لئے ہمیں سب سے پہلے موضوع تحریر اور اس کے فن سے ذوق کو آشنا بنانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر ایسا ہو تو تحریر کی پیچیدگیاں خود بخود دور ہوتی چلی جاتی ہیں اور قاری کی دلچسپی اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ وہ ان کے طلسم زاد تحریر میں کھو جاتا ہے۔ ممکن ہے آغاز مطالعہ میں کسی محترم قاری کو ان کے جملہ

Marfat.com

ہائے معترضہ کی کثرت اور تحریر کی پیچیدگی سے پریشانی ہو اور قدرے بے کیفی محسوس ہو اور ایک دو صفحوں تک یہ کیفیت برقرار رہے لیکن جہاں دو چار جام چڑھائے اور حلق اشربہ تحریر کی تلخی سے آشنا ہوئی، دماغ پر ایسا سرور طاری ہوتا ہے کہ بے کیفی کا تمام احساس دور ہو جاتا ہے اور قاری اس کی رنگینیوں میں کھو جاتا ہے۔ تحریر کا حسن، اس کی روانی اور سواد حروف و تحریر سے اٹھنے والی سوز و گداز کی لہریں اور اس کی تاثیر قاری کے دل کو مسحور کر دیتی ہیں۔

ان کی تحریر و نگارش کی ایک خوبی ان کا فلسفیانہ طرز کلام اور طرز استدلال تھا۔ فلسفہ و حکمت کی تحصیل میں انہوں نے اپنی طالب علمانہ زندگی کے کئی برس صرف کئے تھے۔ اسے انہوں نے سبقاً سبقاً بطور علم پڑھا تھا۔ اس کے علم اصول و کلیات، تاریخ و ارتقاء اور اس کے انحراف پر ان کی نظر گہری ہو گئی تھی۔ اس کا ذوق ان کے ذہن میں رچ بس گیا تھا۔ اگرچہ انہوں نے بطور علم اسے اپنی کسی تصنیف کا موضوع نہیں بنایا البتہ اپنی تصنیفات اور مضامین میں اسلامی تعلیمات اور عقائد و مسائل کی تفہیم میں اس سے بہت کام لیا ہے۔ تعلیمی زندگی کے تو صرف چند برس انہوں نے فلسفہ و حکمت کے مطالعہ و تحصیل میں گزارے تھے لیکن اس کی چھاپ ہمیشہ کے لئے ان کے انداز فکر پر لگ گئی جو خاص مسائل و مباحث پر نگارشات ہی میں نہیں بلکہ ہمہ قسم کی تحریروں میں صاف محسوس کر لی جا سکتی ہے۔ اس سے انہوں نے مسائل و مطالب کی تفہیم میں طرز استدلال ہی کا کام نہیں لیا بلکہ طرز تحریر و نگارش میں تزئین کا کام بھی لیا ہے۔ اس طرح حکیمانہ طرز استدلال اور فلسفیانہ طرز کلام ان کی تحریر کی ایک بڑی خوبی بن گئی ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں ذہن رسا اور طبیعت بہت اخاذ و نکتہ آفریں عطا فرمائی تھی۔ جب وہ کسی موضوع پر قلم اٹھاتے تو ان کے سامنے معلومات کا انبار اور ذہن میں افکار و خیالات کا ہجوم ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ مقالہ و تصنیف کے مضامین و مطالب ابواب و فصول میں تقسیم و ترتیب سے بے نیاز ہو جاتے اور جیسا کہ ان کی عادت معلوم ہے کہ اپنی کسی تحریر پر نظر ثانی کی زحمت گوارا نہ فرماتے تھے۔ اس طرح ان کی تحریرات میں ایک طرح کی بے ترتیبی پائی جاتی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہتر ہی ہوتا تھا کہ وہ اپنی تحریروں پر اصلاح و ترمیم اور نظر ثانی کا قلم نہ اٹھاتے تھے یا تزئین و آرائش، تحریر کا انہیں موقع نہ ملتا تھا۔ اس لئے کہ ان کے علم اور مطالعے، افکار کے تنوع، خیالات کی بلندی، ذہن کی نکتہ آفرینی، دماغ کی زرخیزی اور طبیعت کے اخذ و اکتساب کی بے پناہ صلاحیتوں کا جو عالم تھا اگر اس میں وہ قریب و ترتیب جدید، ترمیم و اصلاح مضامین اور تزئین و آرائش تحریر کا قلم ہاتھ میں لیتے تو ترمیم و تنسیخ، حک و اضافہ، تزئین و آرائش، جمال کی کوشش میں تحریر کی پہلی شکل بھی بگڑ جاتی اور پہلی کی جگہ اسی مصنف کے قلم سے اسی قسم کی ایک نئی نگارش وجود میں آ جاتی۔ لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہوتی کہ نظر ثانی و اصلاح شدہ تحریر ہمارے ذوق کے مطابق بھی ہوتی اور پھر وہ تحریر بھی اصلاح و نظر ثانی کی مستحق کیوں نہ ٹھہرتی اور اس پر بھی تزئین و آرائش کا علم کیوں نہ کیا جاتا؟ لیکن کیا یہ ممکن ہوتا؟ میرا خیال ہے کہ ایسا ہرگز ممکن نہ ہوتا۔ پس ایسی صورت میں تو نظر ثانی کا ترک ہی اولیٰ تھا اور مولانا گیلانی کی تحریرات کا نقش اول ہی اس کا نقش جمیل قرار پاتا ہے۔

ان کے قلم سے مضامین اس طرح نکلتے تھے جیسے آسمان سے بارش ہوتی ہے یا کوئی چشمہ پھوٹ پڑتا ہے اور اس کا پانی روکے نہیں رکتا۔ جس طرف بہہ نکلتا ہے بہتا ہی چلا جاتا ہے۔ اس کا بہاؤ اور اس کی تیزی اپنی سمت خود متعین

کرتی ہے۔ وہ ہماری بنائی ہوئی مصنوعی نالیوں اور ہمارے بنائے ہوئے بہاؤ کے راستوں کی پابند نہیں ہوتی۔

بلا شبہ و مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے دماغ پر افکار کی موسلا دھار بارش اور قلب پر افکار کا نزول زبان کی حرکت اور قلم کی جنبش سے زیادہ تیزی سے ہوتا تھا۔ ان کی تحریر کا ہر جملہ فکر انگیز و خیال آفریں ہوتا ہے۔ ایک خیال دوسرے سے اور دوسرا تیسرے سے وابستہ و پیوستہ ہوتا تھا۔ یہ ربط بحث و نظر کی کسی خاص حد تک نہیں بلکہ پورے مقالے میں ہوتا تھا۔ ان کی تحریر افکار و خیالات کا تیز رو دریا ہوتا تھا جو امنڈتا چڑھتا، بڑھتا اور ہر خشک و تر سے گزرتا اور ہر نشیب و فراز پر چھاتا چلا جاتا تھا اور اتنی تیزی اور تندہی کے ساتھ کہ قاری کے خیالات و جذبات کو بھی خس و خاشاک کی طرح اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے اور اسے سوچنے اور سنبھلنے کا بھی موقع نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں ہمارے بنائے ہوئے اصول و قواعد کے مطابق ابواب و فصول میں تقسیم سے بے نیاز ہوتی ہیں اور کسی مرتب و مدون کے لئے سخت مشکل پیش آتی ہے کہ ان کی کسی تحریر کو ابواب و فصول کی قید میں لائے۔ زیادہ سے زیادہ جو اہتمام کیا جاسکتا ہے اور بعض حضرات نے کیا بھی ہے، یہ تھا کہ ان کی تحریر کے مباحث کے عنوانات مقرر کر دیئے جائیں۔

مولانا گیلانیؒ نے شذرات اور مختصر مقالات سے لے کر متوسط اور مطول تک ہر طرح کی تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کے مختصر مقالات بے شمار ہیں۔ ان کے بعض مقالات بھی سو سو صفحات یا اس سے بڑھ کر متوسط تصانیف کی حد تک پہنچ گئے ہیں۔ ان کی کئی متوسط تصانیف دراصل ان کے مقالے ہی تھے جو ان کی تصانیف میں شمار ہوئے۔ ان کے متوسطات میں ''الدین القیم'' ''النبی الخاتم'' ''تذکرہ شاہ ولی اللہ'' اور ''ہزار سال پہلے'' ہیں۔ مطولات میں ''سوانح قاسمی'' اور ''ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت'' ہیں۔ ''امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی'' متوسط اور مطول کے درمیان کی کڑی ہے۔ آپ چاہیں تو اسے متوسطات میں اور چاہیں تو مطولات میں شامل کرلیں۔

ان کی کسی متوسط اور مطول کے بارے میں یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ انہوں نے اس کا پہلے خاکہ بنا کر سامنے رکھ لیا تھا جب اس خاکے میں رنگ بھر گیا تو انہوں نے برش اٹھا کر الگ رکھ دیا کہ لو یہ تصنیف تیار ہوگئی۔ ایسا بھی نہیں ہوا کہ کسی مقام پر ان کے معلومات کا خزانہ ختم ہوگیا ہو۔ ان کے افکار و خیالات نے اپنی کم مائیگی و بے بضاعتی کا اعلان کر دیا ہو۔ ان کا قلم چلنے سے عاجز آ گیا ہو اور انہوں نے تحریر و نگارش سے ہاتھ کھینچ لیا ہو۔ ان کے معلومات کی فراوانی، افکار کی جولانی، خیالات کا جوش، قلم کی روانی ان کے ہر مختصر و مطول میں آغاز سے اختتام تک برقرار رہتی ہے۔ وہ قلم کو روکتے ہیں تو کسی رسالے کے صفحات میں گنجائش کی کمی کسی ناگزیر مصروفیت یا بعض اوقات بیماری یا کسی خاص عذر کی بناء پر روکتے ہیں اور کئی برس کے وقفے کے بعد جب مانع دور ہو جاتا ہے تو پھر وہی چل مرے خامہ بسم اللہ کہہ کر تگاپو شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن ان کے مختصرات ہوں، خواہ مطولات معلومات کا خزانہ، افکار کا گنجینہ، رنگارنگ خیالات کا آئینہ خانہ اور تحریر و نگارش کے حسن و دلربائی کا گلدستہ ہوتے ہیں۔

Marfat.com

حرفِ آخر

مولانا گیلانی اپنے علم وفضل کی جامعیت، تصنیفات وتالیفات اور مضامین ومقالات کی کثرت، موضوعات کے تنوع، تحریر ونگارش کے محاسن اور کارہائے ارشاد وتعلیم اور اصلاح وتبلیغ کی وسعت کے اعتبار سے ایک شخص کہاں تھے کہ ایک سوانحی مضمون میں ان کے تعارف کا حق ادا کیا جاسکے۔ وہ ایک ادارہ اور ایک انجمن تھے۔ وہ ایک جامع جہات، جامع صفات اور ایک قاموسی شخصیت تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ذہن ودماغ کی بہترین صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ علم وفضل کے محاسن سے ان کے وجود کو آراستہ وپیراستہ کیا تھا۔ اخلاق وسیرت کی خوبیوں سے ان کی شخصیت کو زینت دی تھی۔ نطق وبیان کے کمال اور خطابت کے جوہر سے انہیں محبوبیت کا مقام عطا فرمایا تھا۔ تحریر ونگارش اور تصنیف وتالیف کی بہترین صلاحیتیں انہیں ودیعت فرمائی تھیں اور ان کے ذریعے علوم وفنون اور مسلمانوں کی خدمت کی توفیق ارزانی فرمائی تھی۔ ان میں خیالات کو متاثر کرنے اور اپنی شیریں بیانی سے لوگوں کے دلوں میں اتر جانے کی خوبی ایک انعامِ خداوندی تھی۔ ان کی شخصیت انسانی خوبیوں کا حسین مرقع تھی۔ ان کے تذکرہ وتعارف کے لئے ایک مضمون اور ایک کتاب تو کیا ایک دفتر درکار ہوگا۔ اللہ تعالیٰ آخرت میں انہیں مقامات بلند عطا فرمائے۔

خراج عقیدت

صاحب ''کہف الایمان''

حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانیؒ کی وفات پر

از

(جناب کاشف راجوپوری)

اس عالم تصویر کا انداز غضب ہے — پُرجوش و بلا گیر و ہم آہنگ و پُراسرار
اس پھول کا انجام یہاں رنگ خزاں ہے — جس سے صفت مہر ہے پیشانی گل زار
وہ موج پٹکتی ہے ہر آن سر اپنا — جس موج سے اک بوند بنی گوہر شہوار
وہ باد صبا جس پہ بپا حشر گلستاں — وہ باد صبا گردش پیہم سے گراں بار
وہ قطرہ کہ سیرابی دہقان سراپا — ہے قطع مقامات منازل اسے دشوار

ہر آن ہر اک چیز یہاں گرم سفر ہے
ہے باعث تجدید یہاں لذت کردار

Marfat.com

اس انفس و آفاق میں اک جلوہ موجود ہر شے میں برابر کبھی پیدا کبھی پنہاں
یہ منزل کردار نہ پستی نہ بلندی ہے کاہش پیہم یہاں آسودگی جاں
اس منزل تجدید میں ''ہستی'' متغیر گاہے ہمہ بد مستی گاہے ہمہ عرفاں
شاہی قدم فقر پہ جھکتی ہے برابر ماضی کا اشارہ ہے ہر اک آیت امکاں
اس قید سے وہ نقش مبرا ہے کہ جس میں
نقاش نے مستور کیا ولولۂ جاں
آئین فنا عشق سے ہے لرزہ براندام وہ عشق کہ ہے عالم تدبیر سے بالا
موجوں کی کشاکش میں وہ گوہر ہے ضیا تاب جس کو نگہ خاور زرتاب نے تاکا
ہر چیز گزرتی ہے یہاں جہدِ بقا سے اک عشق کی دنیا ہے کہ امروز نہ فردا
جو عشق کہ مضراب سے پیدا ہو بصد ناز مٹ جانے سے بلبل کے وہ نغمہ نہیں بنتا
جس معجزہ عشق میں ہے دل کی نبوت وہ معجزہ عشق ابد تک خرد افزا
آنکھ اس کے نظارہ کا تحمل نہیں کرتی
جس جلوہ اعجاز پہ ہے عشق کا پردہ
وہ مرد مجاہد کہ جسے عشق ہے حاصل اس مرد مجاہد کا مکاں اور زماں اور
وہ سیل گراں گیر ٹھہرتا نہیں اک دم پستی سے گزرتا ہے تو ہوتا ہے رواں اور
وہ ذات کہ ہے عالم تعبیر سے اونچی اس کے لئے آئین بہار اور خزاں اور
وہ گوہر زرتاب کہ دریا جسے پالے درکار ہے اس کے لئے زینت کا جہاں اور
اس برق جہاں تاب و جہاں سوز کا عالم
چھپتا ہے نگاہوں سے تو ہوتا ہے عیاں اور

(در: خدا بخش لائبریری جرنل، نمبر ۱۲۸ (۲۰۰۲ء)، پٹنہ، ص ۱۔۸۲)

☆......☆......☆

Marfat.com

محمد منظور نعمانی

مولانا گیلانیؒ اور ''الفرقان''

۱۳۵۷ھ (م ۱۹۲۸ء) میں جو ''الفرقان'' کی عمر کا پانچواں سال تھا ''الفرقان'' کا مجدد الف ثانی نمبر نکالنا طے کیا گیا۔ اس کے لئے اپنے جن بزرگوں سے مضامین کی درخواست کی گئی ان میں حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مرحوم بھی تھے۔ ایک عریضہ اسی سلسلہ میں اس ناچیز نے مولانا گیلانی مرحوم کو بھی لکھا۔ مولانا موصوف سے اس عاجز کا اس وقت تک کوئی ایسا تعلق اور تعارف نہ تھا جس کی بناء پر درخواست کی پذیرائی کی کوئی خاص امید کی جا سکتی...... اور اس باب میں مولانا کی سخاوت اور فیاضی کا جو تجربہ بعد میں ہوا اس کا اس وقت وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا...... اس لئے خط تو اگرچہ لکھ دیا گیا تھا لیکن مولانا کے مقالہ کی کوئی خاص توقع نہ تھی...... لیکن اللہ کی شان، بالکل بلا قصد بلکہ بلاشعور، خود مجھ سے یا دفتر الفرقان کے اس وقت کے محرر سے یہ غلطی ہوگئی کہ مولانا گیلانی کے نام لکھا ہوا خط بھی حضرت مولانا عثمانی مرحوم والے عریضہ کے ساتھ ملفوف ہو کر ان ہی کے لفافے میں چلا گیا۔ چند روز بعد ڈابھیل سے حضرت مولانا ممدوح کا جواب آیا جس میں خود کچھ لکھنے سے معذرت کے ساتھ یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ ''آپ نے مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے نام کا خط میرے پاس غالباً اس لئے بھیجا ہوگا کہ میں اس پر اپنی طرف سے کچھ لکھ کر ان کو بھیج دوں۔ میں نے ایسا کر دیا ہے، مجھے امید ہے کہ وہ آپ کے نمبر کے لئے ان شاء اللہ ضرور کچھ لکھ دیں گے۔''

بہرحال مجھے حضرت مولانا کے اس خط ہی سے معلوم ہوا کہ مولانا گیلانی کے نام لکھا ہوا میرا خط بجائے حیدرآباد جانے کے حضرت مولانا عثمانی والے خط کے ساتھ ملفوف ہو کر ڈابھیل چلا گیا لیکن یہ معلوم کر کے کہ حضرت مولانا نے اپنی طرف سے اس پر کچھ لکھ کر حیدرآباد روانہ فرما دیا ہے، اس اتفاقی غلطی پر خوشی ہی ہوئی...... یاد آتا ہے کہ اس کے بعد میں نے مولانا گیلانی کو دوسرا خط لکھا اور اس میں اصل واقعہ لکھنے کے ساتھ اپنے اس خیال کا بھی اظہار کر دیا کہ اگرچہ یہ غلطی بالکل بلا قصد محض اتفاق سے ہوئی تھی لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ غلطی کرا کے میری بڑی مدد فرمائی۔ اگر یہ غلطی نہ ہوئی ہوتی تو صرف میرا عریضہ آپ کو لکھنے پر شاید آمادہ نہ کر سکتا...... مولانا نے اپنے جواب میں کسی حد تک میرے اس خیال سے اتفاق فرمایا اور لکھا کہ بہرحال آپ کے نمبر کے لئے مقالہ لکھنا شروع کر دیا ہے۔

پھر چند ہی دن بعد قریباً ۶۰ صفحے پر مولانا کا وہ تاریخی مقالہ آ گیا جو مجدد الف ثانی نمبر میں بعنوان...... ''الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ'' ...... شائع ہوا تھا اور جو اہل نظر کی نگاہ میں مولانا مرحوم کے چند منتخب شاہکار اور یادگار مضامین

Marfat.com

میں ہے اور جس نے حضرت مجدد الف ثانی کے مقام اور ان کے اصل تجدیدی کام کو سمجھنے کی ایک نئی راہ کھولی ہے۔

''الفرقان'' میں شائع ہونے والا مولانا مرحوم کا سب سے پہلا مقالہ یہی تھا اور اسی سے ''الفرقان'' اور ناچیز مدیر ''الفرقان'' پر مولانا کی عنایتوں کا آغاز ہوا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس مقالہ کا ایک تتمہ بھی قریباً ۳۰ صفحے کا مولانا نے لکھا۔ اس کے بعد ایک دو قسطوں میں پورے ہو جانے والے متعدد مقالات کے علاوہ ایک اہم اور مبسوط مقالہ مولانا نے امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی پر ''الفرقان'' کے لئے لکھا جو ۱۳۵۸ھ و ۱۳۵۹ء ھ میں باقساط ''الفرقان'' میں شائع ہوتا رہا اور بعد میں کچھ اضافہ اور تکمیل کے بعد وہ مستقل کتابی شکل میں بھی شائع ہوگیا۔ پھر ۱۳۵۹ھ میں ''الفرقان'' کا شاہ ولی اللہ نمبر نکلا۔ اس کے لئے مولانا نے میری گزارش پر اپنا وہ مبسوط مقالہ لکھا جس نے شاہ ولی اللہ نمبر کے قریباً سوا سو صفحات لئے۔ یہ مقالہ دراصل ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ پہلے کتب خانہ الفرقان کی طرف سے اس کے بعد بعض دوسرے اشاعتی اداروں کی طرف سے کتابی شکل میں بھی اس کو شائع کیا گیا۔

اس کے بعد سے ''الفرقان'' کے ساتھ مولانا مرحوم کا تعلق کچھ ایسا ہوگیا کہ گویا انہوں نے اس کو اپنا لیا اور اپنی خاص سرپرستی میں لے لیا۔ خود بھی مسلسل لکھتے رہتے اور جامعہ عثمانیہ کے صدر شعبہ دینیات کی حیثیت سے بی اے، ایم اے کے اپنے ہونہار شاگردوں کو خاص خاص موضوعات پر مواد دے کر اپنی رہنمائی اور نگرانی میں جو تحقیقی مقالات ان سے لکھاتے، ان میں سے بھی انتخاب کر کے ''الفرقان'' کے لئے بھیجتے رہتے......

اس زمانہ میں میری توجہ بعض دوسرے کاموں کی طرف ہوگئی تھی جس کی وجہ سے میں ''الفرقان'' کی طرف بہت کم توجہ کر سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ٹھیک اسی زمانہ میں مولانا مرحوم کو ''الفرقان'' کی خصوصی سرپرستی کی طرف متوجہ فرما کر اور اس کے ساتھ ایک خاص لگاؤ ان کے دل میں پیدا فرما کر اس کی زندگی کا ایک سامان پیدا کر دیا۔ اگر مولانا کی یہ عنایت لطیفہ غیبی کے طور پر اس وقت ''الفرقان'' کو حاصل نہ ہوتی تو شاید اسی زمانہ میں یعنی اب سے تقریباً ۱۵-۱۶ سال پہلے ''الفرقان'' بند ہوگیا ہوتا...... مولانا کی یہ نوازش اور عنایت محض للہ فی اللہ تھی۔ جزاهم الله تعالىٰ احسن ما يجزى به عباده المحسنين

پھر ۶۱ھ اور ۶۲ھ میں میری صحت بہت خراب رہی۔ دو دفعہ بیماری کا ایسا سخت حملہ ہوا کہ صحت و مرض کے عام تجربی قانون کے تحت زیست کی امید کے لئے بہت کم گنجائش رہ گئی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے صحت و حیات بخش دی۔ ان دنوں ''الفرقان'' کی اشاعت بہت ہی غیر منظم رہی۔ زیادہ پرچے دو دو تین تین مہینے کے مشترک ہی شائع ہوئے۔ شعبان ۱۳۶۲ھ کی آخری تاریخوں میں جبکہ میں بستر علالت سے اٹھا ہی تھا۔ مولانا نے ازراہ شفقت و دردمندی اپنے ایک کرم نامہ میں مجھے لکھا۔

> ''اس مہینے کے تمام پرچے نکل چکے...... بھی...... بھی، الفرقان بیچارہ ابھی نازل نہ ہوا۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ الفرقان کی ادارت اپنے ہاتھ میں لے لوں...... اگر وقت پر چھاپنے کے لئے آپ آمادہ ہوں تو مضامین شذرات وغیرہ ہر مہینے تیار کر کے بھیجنے پر فقیر اپنے کو تیار کر لے۔''

مولانا کا یہ خط مجھے رمضان المبارک کی تیسری یا چوتھی تاریخ کو ملا۔ اس کے ملنے سے دو ہی دن پہلے میری مرحومہ اہلیہ (مولوی عتیق الرحمٰن سلمہ کی والدہ) پر اچانک مرض کا سخت حملہ ہو چکا تھا۔ ان کے اس مرض اور اس تکلیف کا خاتمہ پانچویں دن ان کے انتقال پر ہوا اور وہ اس دنیا سے اٹھالی گئیں (اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ مغفرت ورحمت کا معاملہ فرمائے اور ان کی روح کو شاد رکھے)۔

جیسا کہ ابھی اوپر ذکر کیا گیا ہے میں خود چند ہی دن پہلے بستر علالت سے اٹھا تھا بلکہ درحقیقت ابھی نیم بیمار ہی تھا۔ اس حادثہ نے پھر صحت پر اثر ڈالا اور میں پھر بیمار پڑ گیا۔ میرے معالجین نے اصرار کے ساتھ مجھے مشورہ دیا کہ عرصہ تک اب کسی قسم کا کوئی کام مجھے نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے مولانا مرحوم کو گھر کے اس مفاجاتی حادثہ کی اور اپنی حالت اور معالجین کے مشورہ کی اطلاع دی اور ساتھ ہی عرض کیا کہ اب معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے خط میں آپ سے شفقت و دردمندی کے یہ انتہائی لفظ کیوں لکھائے تھے۔ بہر حال اب تو اللہ تعالیٰ نے حالات ہی ایسے کر دیئے ہیں کہ ''الفرقان'' کے زندہ اور جاری رہنے کی صورت صرف یہی ہے کہ آپ ہی اس کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالیں۔

مولانا نے یہ ذمہ داری قبول فرمالی اور اپنے افتتاحی شذرات کے لئے بجائے نگاہ اولیں کے ''فواتح'' کا عنوان پسند فرمایا۔ شوال ۱۳۶۲ھ کا پرچہ مولانا ہی کی ادارت میں نکلا۔ افتتاحیہ کی ابتدائی چند سطریں یہ تھیں:

''سبحان الله وبحمده والصلوٰة والسلام علیٰ رسوله و عبده واله وصَحبه''

مخدوم ومحترم مولانا محمد منظور نعمانی مدیر ''الفرقان'' صرف بیمار ہی نہیں ہیں بلکہ ان کی تیمارداری کرنے والی جنت نصیب بی بی کو بھی اللہ میاں نے بلا لیا۔ یہ وقت صرف ان ہی کے لئے نہیں ''الفرقان'' بیچارہ کے لئے بھی سخت تھا اور ہے۔ میرے ایک مجذوبانہ خط کو مولانا نے پکڑ لیا۔ ''المرء یئوخذ باقراره'' جو وعدہ کیا گیا یا کرایا گیا ہے بہر حال اس کی تکمیل کسی نہ کسی حد تک ''تحلة للقسم'' ہی کی حد تک اب تو میرے ذمہ عائد ہو ہی گئی۔ مشاغل کی کثرت، درس وتدریس، تحقیقاتی کاموں کی نگرانی کے ساتھ صدارت شعبہ کے فرائض بھی انجام دینا، کچھ ٹوٹے پھوٹے علمی مشغلوں میں بھی اُلجھے رہنا اور اسی کے ساتھ ایفائے عہد کا یہ بوجھ۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ کیسے اٹھاؤں گا۔ سر حاضر کر دیتا ہوں، گٹھڑی لاد دیجئے۔ اُٹھ سکے گی تو اٹھالوں گا ورنہ پٹک کر بھاگوں گا لیکن جس نے عہد کرا دیا ہے امید ہے کہ وہی قوت بھی عطا کرے گا۔ فعلی الله توکلت والیه انبت والیه المصیر ولا حول ولا قوة الا بالله العلی العظیم''

(الفرقان۔ بابت شوال ۱۳۶۲ھ، ص۲)

مولانا کی ادارت کا یہ شرف ''الفرقان'' کو قریباً ایک سال تک حاصل رہا اور افتتاحی شذرات بعنوان ''فواتح'' مولانا ہی لکھتے رہے۔ اس کے بعد جب میری صحت بحال ہوگئی تو اگرچہ یہ خاص نوعیت باقی نہیں رہی لیکن اپنے مسلسل مقالات کے ذریعے میری مدد اور ''الفرقان'' کی سرپرستی مولانا مرحوم برابر فرماتے رہے۔

پھر غالباً ۱۳۶۴ھ میں ایسا ہوا کہ میرے اور مولانا کے درمیان ایک مسئلے میں اختلاف رائے ہوگیا اور میں نے مولانا کو آزردہ کردیا۔ میری اور ان کی جو نسبت تھی اور ہمارے باہمی تعلقات کی جو نوعیت تھی اس کی بناء پر مجھے ہی چاہیے تھا کہ میں مولانا کو راضی کرنے کی کوشش کرتا لیکن مجھے اعتراف ہے کہ میں کم ظرف ثابت ہوا اور ممدوح کو راضی کرنے اور منانے کی میں نے کوئی کوشش نہیں کی یہاں تک کہ کچھ مدت کے بعد خود مولانا مرحوم ہی نے الٹا مجھے منایا۔ سچ ہے ''پھل دار درخت ہی جھکتا ہے۔''

اس کے بعد ''الفرقان'' کو انہوں نے پھر اسی طرح اپنایا اور اپنی خاص سرپرستی میں لیا...... بلاشبہ یہ ان کی بڑی عالی ظرفی تھی۔

قریباً ایک ہزار صفحات

''الفرقان'' کی پرانی جلدوں کی ورق گردانی سے معلوم ہوا کہ مولانا مرحوم کے اس پہلے مقالہ سے لے کر جو اواخر ۵۷ھ میں مجدد الف ثانی نمبر میں شائع ہوا تھا، سلسلہ ''ہادم اللذات'' کی اس آخری قسط تک جو رجب ۷۴ھ کے الفرقان میں شائع ہوئی اور جس کے بعد مرض کے تسلسل نے مولانا کو ''الفرقان'' کے لئے کچھ اور نہیں لکھنے دیا۔ یہاں تک کہ اپنے رب کے حضور میں پہنچ گئے۔ قریباً ایک ہزار صفحات خود مولانا مرحوم کے قلم کے لکھے ہوئے ''الفرقان'' میں شائع ہوئے ہیں اور اپنے بعض شاگردوں سے لکھوا کر خود تصحیح اور وہ ان نظر ثانی کر کے جو مضامین انہوں نے ''الفرقان'' کو عنایت فرمائے وہ ان کے علاوہ ہیں۔ ان کے صفحات کی مجموعی تعداد بھی دو سو سے زیادہ ہے۔

اللہ کی شان! ''الفرقان'' کے صفحات میں سب سے آخری سلسلہ انہوں نے ''ہادم اللذات'' کے عنوان سے شروع فرمایا۔ گویا موت کے یاد کرنے اور یاد دلانے کو اپنا موضوع بنایا...... اس سلسلہ کی پہلی قسط ذی الحجہ ۱۳۷۱ھ کے ''الفرقان'' میں شائع ہوئی۔ اس کا افتتاحی نوٹ یہ تھا۔

> ''مشہور حدیث ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اکثروا ذکر ھادم اللذات'' (لذتوں کو ڈھا کر رکھ دینے والی یعنی موت کو بہت زیادہ یاد کیا کرو) سچ پوچھیے تو اسی نبوی وصیت کی تعمیل اس مضمون سے مقصود ہے۔ ایسے واقعات جن کا موت سے تعلق ہے انہیں کا ذکر اس عنوان کے تحت ان شاء اللہ کیا جائے گا۔ موت کے یاد کرنے کی ایک شکل یہ بھی ہو سکتی ہے...... بڑے بڑے مواعظ اور لچھے دار تقریروں کے مقابلہ میں موت کا ہلکا سا خیال زیادہ نتیجہ خیز ہو سکتا

Marfat.com

ہے۔ سیدنا عمر فاروقؓ کی انگوٹھی میں کہتے ہیں کہ "کفی للمرء بالموت واعظا" (آدمی کے لئے موت کافی واعظ ہے) کے الفاظ کھدے ہوئے تھے......ان شاء اللہ تعالیٰ ہر مہینے میں "الفرقان" کے ناظرین کے سامنے یہی زندہ واعظ کھڑا ہوگا......سب سے زیادہ یاد رکھنے کی مستحق جو چیز ہے اسی کو یہ زندہ واعظ آپ کو یاد دلاتا رہے گا۔"

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا یہ سلسلہ ذی الحجہ ۱۳۷۱ھ (م ستمبر ۱۹۵۲ء) سے شروع ہو کر برابر جاری رہا۔ قریباً دو سال گزرنے پر ۱۳۷۳ھ کے اواخر سے مولانا پر سخت قلبی دوروں کا حملہ شروع ہوا جس کا سلسلہ قریباً ۶ مہینے جاری رہا۔ اس زمانہ میں "ہادم اللذات" کے ذکر و تذکیر کا یہ سلسلہ بھی قدرتی طور پر بند رہا۔ دسمبر ۵۴ء میں طبیعت کچھ سنبھلی تو مولانا نے اس سلسلہ کو پھر شروع کیا۔ اس افاقہ کے بعد جو پہلی قسط اس سلسلہ کی آئی اس کے ابتدائی نوٹ کی چند سطریں یہ تھیں......

"چھ مہینے سے زیادہ مدت گزر گئی "ہادم اللذات" کی کہانیاں سنانے والا اس عرصہ میں خود اسی ہادم اللذات کی پرچھائیوں کے نیچے آ گیا۔ لیکن بقولِ اکبر مرحوم

کمزور ہی میری صحت بھی کمزور ہی میری بیماری
اچھا جو رہا کچھ کر نہ سکا بیمار پڑا تو مر نہ سکا

کچھ نہیں معلوم کہ مہلت جو ملی ہے اس کی مدت بھی کتنی ہے۔ قل الموت الذی تفرون منه فانه ملاقیکم......مدیر "الفرقان" کا اصرار ہے کہ

جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

بحول ولا قوته ساغر کر پھر ہاتھ میں اٹھالیتا ہوں۔ جو پینا چاہتے ہیں ان کے لئے "صلائے عام" ہے۔ انسانی زندگی کے چند لازوال زندہ حقائق جن کا شعور عہدِ حاضر کے قلوب میں مردہ کہیئے یا پژمردہ ہو کر رہ گیا ہے، اسی شعور کا جگانا اس جھنجھوڑ سے مقصود ہے۔"

"ہادم اللذات" کی یہ قسط قریباً ۶۔۷ مہینے کے ناغہ کے بعد جمادی الاولیٰ ۱۳۷۴ھ (م جنوری ۱۹۵۵ء) میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد مولانا کو صرف دو قسطیں اس سلسلہ کی اور لکھنے کا موقع ملا۔ ایک ہندوستان کے مشہور مسلمان حکمران شیر شاہ سوری (م ۹۵۲ھ) کے کارنامہ اور اس کی وفات کے متعلق۔ یہ قسط جمادی الاخریٰ ۱۳۷۴ھ (م فروری ۱۹۵۵ء) میں شائع ہوئی، اس کا عنوان تھا۔ "ہندوستان کی ایک قدیم پنجسالہ سکیم جس نے موت کو بھی زندگی بنا دیا" ......دوسری قسط میں اس چودھویں صدی ہجری کے چودھویں سال میں وفات پانے والے ہندوستان کے ایک مشہور عالم اور محدث حضرت قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتیؒ کی زندگی کے بعض خاص سبق آموز پہلوؤں کا تذکرہ کر کے ان کی وفات کا حال لکھا گیا تھا...... یہ قسط رجب ۱۳۷۴ھ (م مارچ ۱۹۵۵ء) کے "الفرقان" میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا

Marfat.com

عنوان تھا ''اسلامی رواداری اور مساوات و بے نفسی کا ایک دل آویز مرقع۔''

یہی اس سلسلہ کی آخری قسط تھی۔ اس کے بعد خود مولانا پھر ''ہادم اللذات'' کی پرچھائیوں کے نیچے آ گئے۔ دل کے دوروں کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا اور جیسا کہ عرض کیا گیا اس کے بعد مرض نے ''الفرقان'' کے لئے کچھ اور لکھنے کا موقع نہ دیا یہاں تک کہ جون ۵۶ء میں ''ہادم اللذات'' نے آپ کو ہم دنیا والوں سے الگ کر کے ملاء اعلیٰ میں پہنچا دیا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ الابرار الصالحین۔

ان سطروں کے پڑھنے والے اور مولانا مرحوم کے اس مجموعۂ مضامین کا مطالعہ کرنے والے اپنے سب دوستوں سے اس عاجز کی عاجزانہ درخواست ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے مولانا مرحوم کی مغفرت اور رفع درجات کے لئے اہتمام کے ساتھ دعا کریں۔ یہ ان کا اس عاجز پر بھی بڑا احسان ہوگا۔ کسی مصنف اور مضمون نگار کی زندگی میں تو کسی کی داد و تحسین بھی تھوڑی دیر کے لئے اس کو خوش کر سکتی ہے اور وہ اس سے کچھ ذائقہ لے سکتا ہے لیکن مرنے کے بعد کام آنے والی چیز صرف دعا ہے اور اپنے کسی محسن کا سب سے بڑا حق اور احسان مندی و شکر گزاری کا صحیح ترین ایمانی طریقہ یہی ہے کہ اس کے لئے اہتمام سے دعائیں کی جائیں اور بار بار کی جائیں۔

(در: الفرقان (لکھنؤ)، افاداتِ گیلانی نمبر، ص ۳۹۔۴۴)

☆......☆......☆

Marfat.com

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

سید مناظر احسن گیلانی اور ''امام ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی''

استاذی المحترم مولانا الحاج الحافظ سید مناظر احسن گیلانیؒ مرحوم کی تالیف ''امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی'' ابھی ابھی کراچی میں طبع ہوئی ہے۔ عموماً مؤلف اپنے اساتذہ یا مشابہ اساتذہ علماء سے کوئی تعارف یا پیش لفظ حاصل کرتے ہیں۔ فاضل استاذ کی گراں مایہ تالیف ان کے سب سے ادنیٰ وحقیر تلمیذ کے پاس آئی ہے تو ایک پیش لفظ کے ذریعہ سے خود سعادت اندوز ہونے کے سوا اور تو کوئی سوال نہیں۔ اگر ناشر کا بیان نہ ہوتا کہ خود استاذ محترم نے مجھ سے ''کچھ لکھوا لینے'' کا حکم دیا ہے تو شاید اس طرح کی سعادت اندوزی کو بھی گستاخی سمجھتا۔ ''مشک آنست کہ خود ببوید'' نہ کہ ''شاگردی پراند۔''

مؤلف کی سوانح عمری

علماء کی بے نیازی اور کسر نفسی شہرہ آفاق ہے۔ اسی لئے باوجود ملک کے مؤلفین کی صف اول میں ہونے کے استاذ محترم کی سوانح عمری کہیں چھپی ہوئی نہیں ملتی۔ اپنی معلومات درج کرتا ہوں تاکہ بعد والے کے لئے کچھ کام دیں۔

مناظر احسن (۱۳۱۰ھ) آپ کا تاریخی نام ہے۔ (میم کے زبر کے ساتھ) اور ماشاء اللہ اسم بامسمّیٰ ہیں۔ خیال ہوگا کہ ابھی تو ''ساٹھا پاٹھا'' ہونے کو بھی ایک دو سال باقی ہوں گے......لیکن علم کی بدقسمتی ہے کہ مولانا کی صحت بہت کمزور ہے۔ قلب کے اور دیگر عارضوں سے بارہا طویل عرصوں تک علیل و فریش رہے ہیں۔ خدا آپ کی عمر و صحت میں برکت عطا فرمائے۔ آمین۔

آپ کی ولادت صوبہ بہار میں گیلانی نامی گاؤں میں ہوئی۔ یا نسبت کے مزید اضافے کی جگہ آپ اپنے کو گیلانی ہی لکھتے ہیں۔ قطب الاقطاب گیلان سے نسبت گویا مقصود تھی۔ آپ کا تعلق نہ صرف بلند مرتبت شرفائے

سادات سے ہے بلکہ علم و عمل بھی موروثی ہے۔ آپ کے بزرگوں کو غالباً علم ہیئت سے بھی خاص لگاؤ رہا ہوگا کیونکہ مکان میں ایک بہت پرانی اور عمدہ سنگ مرمر کی دھوپ گھڑی بھی دستیاب ہوئی تھی جو اوقات الصلاۃ کے لئے فرنگی گھڑیوں کی محتاجی سے بچاتی رہی ہوگی۔

آپ کی تعلیم متعدد دینی درسگاہوں میں ہوئی۔ بعض وقت ایسی صورتوں میں آدھی لاالیٰ ہٰؤلاء ولا الیٰ ہٰـؤلاء ہو جاتا ہے۔ مگر مولانا میں علم و سیرت کی بڑی شان نظر آتی ہے کہ دیوبندی آپ کو اپنا کہتے ہیں تو بریلوی اپنا۔ ان دونوں مکاتب خیال کی انگریزی دور میں ملک میں جو "مکافرت" اور کشمکش تھی اس میں یہ اپنایا جانا حیرت انگیز ہے۔ مگر مولانا حقیقت میں ان دونوں سے بھی بالا ہیں یعنی آپ صرف مسلمان ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کسی کو نہ سنّی شیعہ بنانے آئے تھے نہ حنفی وہابی۔ بلکہ ان الدین عنداللہ الاسلام کے ازلی پیغام کی تجدید کے لئے۔

جہاں حسن و جمال سے فائز سرخ و سپید، ہزاروں میں ممتاز و فائق تھے وہاں حسن باطنی

بالائے سرش ز ہوش مندی

می تافت ستارہ بلندی

نوعمری ہی سے خطابت، انشاء پردازی اور شاعری تینوں میں ہمسروں میں ممتاز رہے۔ کبھی گندی سیاسیات میں حصہ نہ لیا۔ اس لئے زور زبان و خطابت کے لئے محافل وعظ میں آپ کے لئے زیادہ کشش رہی تو زور قلم اور نظم و نثر ٹھوس علمی اور بلند پایہ جرائد کے سوا آپ کو کہیں اور نہ لے جا سکے۔

ایک مرتبہ فرما رہے تھے نوعمری میں میری ایک نظم کسی رسالے میں چھپی۔ برسوں گزر گئے میں خود اسے بھول بھلا گیا۔ پھر ایک مرتبہ ایک صاحب سے کہیں ملاقات ہوئی جو شاعر بھی تھے۔ انہوں نے اپنے جس کا کلام کو فخریہ سنانے کے لئے بیاض میں سے انتخاب کیا وہ وہی بھولی بسری نظم تھی۔ پہلی بیت ہی پر کھٹکا کہ یہ تو پہلے بھی کہیں پڑھی سنی ہوئی نظم ہے۔ دوران انشاء میں یاد آ گیا کہ "چہ دلاور است دزدی کہ بکف چراغ دارد" اس سے کیا کہتے۔ صرف یہ کہا کہ ہاں بھئی نظم بہت اچھی ہے۔

ایک اور دفعہ ارشاد ہوا۔ مجھے ابتداء علوم عقلیہ کا بڑا شغف تھا۔ حدیث وغیرہ سے دلچسپی نہ تھی۔ دیوبند میں شریک ہوا بھی تو ایک طرح سے غرور کے ساتھ کہ یہ بیچارے ہمیں کیا پڑھائیں گے۔ شیخ الحدیث کے درس میں پیچھے بیٹھتا تھا اور کچھ کھنچا کھنچا سا۔ چند دن گذرے تو استاذ نے خود توجہ کی۔ درس کے بعد ٹھہرایا اور پوچھا کہ کون ہو، تعلیم کا کیا حال ہے وغیرہ۔ میں نے عرض کی کہ علوم عقلیہ پڑھ کر آ رہا ہوں۔ طرح طرح کے وسوسے دل میں ہیں اور حدیث شریف سنتے وقت بھی یہی حال رہتا ہے اس لئے ذرا پیچھے بیٹھتا ہوں۔ کہا اب آئندہ وسوسے نہیں ہوں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ پھر اس دن کے بعد سے الحمدللہ وسوسوں کا نام و نشان نہ رہا اور میں روز افزوں دلچسپی سے علوم حدیث کی تحصیل میں مشغول ہو گیا۔

ملک کے مختلف مراکز علم میں تحصیل، چشم بددور قابل رشک حافظہ اور ان سب کے ساتھ مطالعہ کا ذوق اتنا کہ بیان سے باہر، اسی کا نتیجہ ہے کہ قلم برداشتہ لکھتے ہیں اور پھر بھی ایک بحر ذخار نظر آتا ہے کہ موجیں مارتا، ناظر کے قلب و

Marfat.com

دماغ کو غرقاب کرتا سب پر چھاتا نظر آتا ہے۔ جامعہ عثمانیہ میں درس کے علاوہ مجھے پانچ سات دفعہ آپ کی تقریریں پبلک میں سننے کا موقع ملا ہے۔ کبھی سیرت النبی کے مرغوب موضوع پر، کبھی اشتراکیت کی اسلامی نقطہ نظر سے چھان بین پر۔ جیسے جیسے تمہید کے بعد آگے بڑھتے ہیں زور بیان بڑھتا جاتا ہے اور جیسے جیسے زور بیان بڑھتا ہے جوش بیان بھی۔ سننے والے مسحور رہتے ہیں تو خود خطیب بھی خطابت کے کیف سے سرشار۔ آواز گونجنے لگتی ہے۔ خیالات کی مناسبت سے اعضاء میں تڑپ اور حرکت، گانے میں باجے، یا فوجی بینڈ میں ڈھول کی اثر انداز صداؤں کا آمیزہ کر دیتے ہیں۔ الفاظ ہیں کہ آبشار کی طرح بیش از بیش گرتے چلے جاتے ہیں بلکہ لغت، خیالات کا ساتھ نہیں دے سکتی اور ہر قدم پر نئے الفاظ کی ضرورت پیش آتی ہے اور وہ خود بخود ڈھل ڈھل کر زبان سخاوت نشان پر نثار ہوتے چلے جاتے ہیں اور نئے الفاظ ہونے کے باوجود نامانوس نہیں ہوتے۔ جیسے ایک دن ایسے ہی ایک موقع پر کہا ''ایک بڑا مچھلا ہے کہ چھوٹی مچھلیوں کو نگلتا جاتا ہے۔'' تقریر کی روانی کا یہ حال ہے کہ ملک کے تیز قلم سے تیز قلم ''مختصر نویس'' (اسٹینوگرافر) بارہا کوشش کرتے رہے مگر کبھی کامیاب نہ ہوئے کہ آپ کی رفتار بیان کا ساتھ دے سکیں۔

حیدر آباد میں آمد

پہلی عالمگیر جنگ کا زمانہ تھا، انگریز کے دور ستم میں ایک سیاسی پناہ گزیں کی طرح پایہ تخت آصفیہ حیدر آباد دکن میں تشریف لائے۔ بے کس و بے سہارا تھے۔ ذوق و عادت سے مجبور ہو کر حیدر آباد کی مشہور صد سالہ دینی درس گاہ جامعہ نظامیہ میں نام لکھا دیا۔ جہاں تعلیم، قیام، طعام بلکہ کتب و لباس تک سب کو مفت ملتے تھے لیکن حالات نے اس کا موقع نہ دیا کہ ان سہولتوں سے کچھ استفادہ کرتے۔ جلدی ہی جامعہ عثمانیہ قائم ہوگئی اور غالباً مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی (وزیر امور مذہبی) کی توجہ سے آپ کو فنون و سائنس کی جماعتوں میں سنی طلبہ کو ''دینیات لازم'' پڑھانے کے لئے بطور لیکچرار لے لیا گیا۔ اس کی ماہوار (۲۵۰ تا ۴۰۰) تھی۔

جامعہ عثمانیہ کوئی پھولوں کی سیج نہ تھی۔ ایک خود مختار دیسی ریاست ہونے کے باوجود انگریزی سفیر مقیم (ریذیڈنٹ) کی مرضی کے خلاف کوئی اہم کام مشکل سے ہوسکتا ہے۔ جدید وضع کی جامعہ اور ذریعہ تعلیم انگریزی نہ ہو بلکہ اردو، یہ گھریلو حیدر آبادی چیز نہ تھی اس کے اثرات سارے برطانوی ہند کے نظام تعلیم پر پڑتے۔ انگریز کیوں منظور کرتا کہ اس کی بات کے چلتے انگریزی زبان پر کوئی ٹیڑھی نظر بھی ڈال سکے۔ لیکن بہر حال انگریز نے اسے منظور بھی کیا تو اس تصور اور تیاری کے ساتھ کہ ''نظام کے خرچ پر یہ تجربہ کر لیا جائے اور اس کے ناکام ہونے پر برطانوی ہند کے سیاسی شورش کرنے والوں کو بتایا جائے کہ کسی ''کالی'' زبان میں جدید علوم کی تعلیم نہیں ہوسکتی۔

ملک کے اعلیٰ حکام میں جو رقابتیں ہر جگہ ہوتی ہیں اس کے تحت بعض نہایت باثر افسر ہمیشہ اس پر تلے رہے کہ یہ جامعہ چلے نہیں۔

قدامت پسندی اور نئی روشنی کی کشمکش نے نصاب ساز جماعتوں کو اس پر آمادہ نہ ہونے دیا کہ نصاب قومی ضروریات کے مطابق بنایا جائے بلکہ صرف اس پر کہ صرف زبان کی تبدیلی کے ساتھ برطانوی ہند کی جامعات ہی کا

Marfat.com

نصاب جاری ہو۔ طالب علم چاہے انگریزی میں کتابیں پڑھ کر دہریہ، غلامانہ ذہنیت والا اور اپج سے عاری بنے یا اردو میں پڑھ کر۔ فرق تو کچھ نہیں بلکہ خطرہ ہی بڑھ جاتا ہے کہ دہریت وغیرہ اب عوام کی دسترس میں بھی آجائے۔ صرف اتنا ہوا کہ جملہ طلبہ کو، چاہے فنون کے ہوں یا سائنس کے، مذہب واخلاق پر بھی ہفتے میں دو گھنٹے لازمی طور پر لیکچر ہوا کریں۔ سنیوں کے لئے دینیات لازم کے نام سے اور غیروں کے لئے اخلاقیات کے عنوان سے۔

دینیات لازم کے لیکچرار کا فریضہ بڑا کٹھن اور نازک تھا۔ فلسفہ اور سائنس کے طلبہ اس سے آئے دن اور ہر سال سوال کرتے۔ بعض دق کرنے کے لئے اور بعض نیک نیتی سے ازالہ شبہات کے لئے اور جو شخص خود ان جدید علوم سے بے بہرہ ہو وہ ان کی تشفی کیسے کر سکے۔ ابتداء میں صرف فطری ذہانت کام دیتی رہی ہوگی۔ پھر رفتہ رفتہ جدید علوم کی کتابیں ترجمہ ہو کر لیکچرر دینیات کی دسترس میں بھی آتی گئیں اور وہ روز افزوں علوم جدیدہ کے مختلف پہلوؤں سے واقف بھی ہوتے چلے گئے۔ ان کے کمزور پہلوؤں سے آگاہی جوابی اعتراض میں کام دیتی تو ان کے وسائل اور حربوں سے واقفیت کے باعث انہیں حربوں کو اسلام کی تائید میں استعمال کرنا ممکن ہوگیا۔ جو کام اپنے زمانے میں امام غزالی نے کیا وہی کام اس جماعت کے استاد کو کرنا پڑتا تھا اور کوئی ''احیاء العلوم'' ثانی چاہے ابھی تحریر میں نہ آئی ہو لیکن گزشتہ تیس سال سے سال بسال جامعہ عثمانیہ کے طلبہ اس جدید علم کلام سے مستفید ومتاثر ہوتے رہے ہیں اور نتیجہ یہ بتاتا ہے کہ ہمالیہ تلے کے براعظم کی ڈیڑھ دو درجن جامعات میں سب سے کم دہریت اگر کسی جگہ پھیل سکی تو وہ جامعہ عثمانیہ رہی ہے اور اس کا سہرا بہت بڑی حد تک صرف مولانا سید مناظر احسن گیلانی مدظلہ کے سر رہا ہے۔

آپ کچھ عرصہ شعبہ دینیات میں رہے اور حدیث کا درست دیتے رہے اور غالباً انٹرمیڈیٹ میں مجھے اسی مضمون کے سلسلے میں چند دن شرف تلمذ کا راست موقع رہا۔ پھر وہ فنون وسائنس کے شعبوں میں دینیات لازم پڑھانے کے لئے بالکلیہ منتقل ہوگئے تو راست تلمذ کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ بہت برسوں کے بعد مکرر مولانا جواب لیکچرار سے ترقی کر کے ریڈر بن چکے تھے (اور ۳۵۰ ماہوار پاتے تھے) دوبارہ شعبہ دینیات میں منتقل ہوئے مگر ایم اے میں میرا مضمون فقہ تھا۔ اس لئے راست تعلق پھر بھی پیدا نہ ہو سکا۔ مختلف درمیانی اساتذہ کی وفات، پیرانہ سالی کی بنا پر خدمت سے سبکدوشی وغیرہ کے باعث آخر الامر مولانا ہی سب سے سینئر ہونے کی بنا پر صدر شعبہ بنے۔ یہ دوسری جنگ عالمگیر سے کچھ ہی دن پہلے کا واقعہ ہے۔ اس وقت ان کی ماہوار (۵۰۰ تا ۱۰۰۰) ہوگئی اور وہ فرسٹ گریڈ پروفیسر ہوگئے۔ علوم دینیہ کا اعزاز جامعہ عثمانیہ میں کسی اور دنیوی علم سے کم نہ تھا۔

میں ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۵ء میں جامعہ عثمانیہ شعبہ دینیات کا لیکچرر فقہ بن کر مامور ہوا لیکن چند ماہ بعد ہی شعبہ قانون میں قانون بین الممالک وغیرہ پڑھانے کے لئے منتقل کر دیا گیا۔ اس طرح راست تلمذ کے بعد راست رفاقت بھی زیادہ دن نہ رہی لیکن ایک تو شخصی روابط، دوسرے ایک ہی عمارت میں ہم سب کا خدمت علم میں مشغول رہنا اور تیسرے نصابی وانتظامی مختلف کمیٹیوں میں آئے دن ملنے کا موقع اس دوری کو صرف نظری رکھتا ہے واقعی نہیں اور مولانا کی عملیت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملنے لگا۔

اس پندرہ سولہ سالہ خدمت جامعہ نے بڑا فرق پیدا کر دیا تھا۔ اب اس مولوی میں جو دیوبند وغیرہ سے دستار

Marfat.com

فضیلت باندھ کر آیا تھا اور اس پروفیسر میں جو ایک جدید وضع کی جامعہ میں درس دے رہا تھا کوئی نسبت تھی تو شاید یہی کہ وہ پہلے بھی پکے مسلمان تھے اور اب بھی.....لیکن جامعہ کے ماحول نے ان کو ایسی چیزوں کا موقع دیا جن کی کسی دینی درسگاہ میں نہ تو ضرورت ہوتی ہے اور نہ سہولت۔

اولاً جدید ذہنیت کے طلبہ کو پڑھانا تھا جس کا اوپر ذکر آیا۔ دوسرے ایک چھت کے اندر ڈیڑھ دو سو اساتذہ درس دیتے تھے جو بیسیوں ہی علوم وفنون پڑھاتے تھے۔ آئے دن بلکہ ہر روز ان سے علمی مباحث رہتے اور طلبہ سے کہیں زیادہ ان سے باہمی افادے استفادے اور تبادلہ خیال کا موقع ملتا۔ مثلاً کبھی کوئی پروفیسر تاریخ پوچھتا۔ مولانا مسلمانوں کی بحری زندگی پر میں ایک مضمون لکھ رہا ہوں اور قرآن نیز تاریخ سے میں مواد لے چکا ہوں۔ اگر حدیث کا کچھ مواد آپ مہیا فرما سکیں......کوئی پروفیسر فلسفہ، کوئی پروفیسر معاشیات، کوئی پروفیسر قانون آئے دن آپ سے ایسے مسائل پر مواد مانگتا جو کسی عام مولوی کو کبھی ڈھونڈنا ہی نہیں پڑتا۔ حیدرآباد کے بے نظیر کتب خانے قلمی بھی اور مطبوعہ بھی اسلامیات کے لئے شاید استنبول اور قاہرہ کے بعد ساری دنیا میں تیسرے نمبر پر تھے اور وہ ہر وقت دسترس میں تھے۔ کسی اور جگہ کے استاد کو یہ سہولت کہاں ملتی۔

اب ایک نیا واقعہ پیش آیا جس نے آپ کے فیضان کی رفتار ومقدار کو بہت بڑھا دیا۔ ۱۳۴۰ھ/۱۹۳۰ء میں بعض شعبوں میں مابعد ایم اے تحقیقات علمیہ کا ''ریسرچ ڈپلومہ'' قائم ہوا تھا اور پہلے ہی سال فقہ کے دو طلبہ اس میں لئے بھی گئے تھے لیکن پھر ایک طویل وقفہ رہا۔ مولانا کے صدر شعبہ بننے کے زمانے میں ایم اے کے طلبہ کے لئے بھی ریسرچ لازمی کر دیا گیا۔ ہر سال تفسیر حدیث، فقہ اور کلام کے دو چار طلبہ ضرور ہوتے تھے۔ ان کے لئے اچھوتے عنوان تلاش کرنے اور ان سے تحقیقاتی کام لینے اور مقالہ لکھوانے کا کام زیادہ تر مولانا اپنے ہی تعلق رکھنے کا ایثار گوارا فرماتے تھے۔ شعبہ دینیات سے بھی اس طرح کے ڈیڑھ دو درجن مقالے مرتب اور منظور ہو گئے۔ ان میں سے بعض مختلف علمی رسالوں میں بہ اقساط یا کتابی صورت میں چھپے بھی ہیں۔ چند ایک تو کہنا چاہیے کہ لاجواب ہیں۔ مثلاً اصول فقہ کی تدوین کی تاریخ، اسلامی اصول معاشیات وغیرہ۔ دوسری عالمگیر جنگ کا زمانہ تھا کہ پی۔ ایچ ڈی کی جماعتیں بھی کھل گئیں اور کئی سال شوقین طلبہ آتے رہے جن میں سے غالباً دو کے مقالے منظور بھی ہو گئے۔ ایک تو ''قانون جنایات بر بنائے غفلت کا تقابلی مطالعہ'' اور دوسری ''اسلامی اصول معاشیات۔'' یہ مقالے اصل معہ ترجمہ اردو اور انگریزی دو زبانوں میں تیار ہوتے تھے اور ممتحنوں میں سے ایک یورپ یا امریکہ کا بھی ہوتا تھا۔

طلبہ سے اس طرح کا کام لینے میں اساتذہ کو بھی محنت اور مطالعہ کرنا پڑتا ہے اور طلبہ کو ''تحفہ'' دیئے ہوئے مواد کے بعد بھی بہت کچھ استاد کے پاس بچ رہتا ہے۔ ایسی ہی چیزوں سے مولانا اپنی بعض تالیفات تیار کرتے گئے اور ان میں سے کئی ایک اہل علم کے لئے چھپ کر منظر عام پر بھی آ گئی ہیں۔

اس کے علاوہ جامعہ عثمانیہ میں متعدد علمی رسالے تھے نیز علمی انجمنیں اور ادارے یا دائرے بھی۔ خود شہر حیدرآباد میں مزید برآں رسالے اور ادارے تھے۔ ان سب میں مولانا کو حصہ لینا پڑتا اور ہر وقت کچھ نہ کچھ لکھتے رہنا پڑتا۔ برطانوی ہند کے علمی رسالے ان کے علاوہ تھے۔

Marfat.com

میں نے کئی بار مولانا سے عرض کیا کہ اپنے نشریات کا ایک مکمل ذخیرہ کسی کتب خانے میں فراہم کردیں۔ کم از کم ایسی ایک یادداشت تیار فرمائیں کہ کون سا مضمون کس رسالے کے کس نمبر میں کہاں اور کب شائع ہوا۔ مولانا ان چیزوں سے مستغنی ہیں اور خوف ہے کہ مولانا سے آج کل قریب رہنے والے اس پر فوری توجہ نہ کریں تو بہت سے جواہر ریزے ناپید نہ ہوجائیں۔

کتاب ہذا

قدیم زمانے کے اسلامی علماء کی طرح زیر نظر کتاب جامع ضرور ہے مگر مانع نہیں۔ یعنی اس میں اپنے موضوع پر جملہ متعلقہ مواد تو جمع کردیا گیا ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ دیگر معلومات کا بھی ضمناً آجانا ممنوع رہا ہو۔ اس میں معلومات کا انبار ہے، لطیف استنباطات کی بھرمار ہے اور صبر سے اور بار بار پڑھنے والے کو ہر قدم پر اور ہر دفعہ نئی نئی چیزیں ملتی ہیں۔

یوں تو کتاب اپنے موضوع پر مفید ترین معلومات کی حامل ہے لیکن اس کی اہمیت چودہویں ہجری کے اس ثلث ثالث میں خاص کر اس کے مقام اشاعت یعنی پاکستان کے لئے غیر معمولی ہے۔

کتاب میں اصل میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ خانوادہ بنی امیہ جب اپنی غلطیوں کو نباہنے کے لئے مزید غلطیوں کا حکومت میں عمداً اضافہ کرتا چلا گیا اور بالآخر اپنے خاتمے کے قریب اس کا پورا نظم ونسق پوری طرح ازسرتاپا سڑا ہوا جسم بن گیا تو انقلاب ناگزیر بھی تھا اور ضروری بھی۔ خلفاء عباسیہ قوم کی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز بن کر برسر اقتدار آئے لیکن قوم کو جلدی ہی مایوس ہونا پڑا۔ بات یہ تھی کہ پرانے عہدیداروں کی جگہ لینے کے لئے نعم البدل نوجوانوں کو منظم طور پر تربیت دینے اور تیار کرنے کی طرف توجہ نہیں کی گئی تھی اور نتیجہ ع ''گاؤ آمد وخر رفت'' تھا۔ عوام کی مصیبت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ نئے حکمراں بھی استبداد پسند تھے اور نئے افسر اور حکام عدالت بھی جاہل ورشوت خوار۔ عام حالتوں میں انقلاب اور جوابی انقلابوں کا ایک سلسلہ شروع ہوجاتا۔ بنی امیہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرنے کے لئے عوام میں جو شوریدہ سری پیدا کی گئی تھی وہ ہر نئے من چلے ہوشمند کو تیار رسائل خانہ جنگیوں کے لئے مہیا کرتی۔

امام ابوحنیفہ نے بنی امیہ کے خلاف تحریک کے آغاز ہی کے وقت اس ضرورت کو بھانپ لیا تھا اور گویا ایک خانقاہ بنا کر وہیں مستقبل کے افسروں کو پوری تندہی اور بے نفسی سے اپنی بساط بھر تیار کرنا شروع کیا۔ خلافت عباسیہ کے آغاز پر انہوں نے کئی سو افراد ایسے تیار کردیئے جو عالم باعمل تھے یعنی ان میں دینداری، دیانت داری اور ساتھ ہی فرائض نظم ونسق کی پنداری بھی تھی۔

جب یہ ہوگیا تو انہوں نے رائے عامہ کو ہمنوا بنایا کہ جاہل ورشوت خور افسروں کو بھی خدمت سے الگ کیا جائے اور استبداد پسند خلیفہ بھی روزمرہ کے نظم ونسق میں دخل نہ دے کر دستور وآئین کا پابند رہے۔ امام ابوحنیفہ نے یہ

Marfat.com

اہم امر بھی طے کرلیا تھا کہ خود کوئی عہدہ بڑے سے بڑا بھی قبول نہ کریں۔ اس چیز کے باعث ان کی آواز میں بھی قوت آ گئی اور ان کے مخالفین بھی بوکھلا گئے۔

امام ابو حنیفہ کو شہید ہونا پڑا لیکن ان کے خون سے اسلام کی سوکھی ہوئی کیاری سنچ گئی اور پیاسی زمین سیراب ہوتے ہی ہری بھری ہوگئی۔ چنانچہ ان کی وفات پر شاید دس سال بھی نہیں گزرے تھے کہ ان کے شاگرد نظم و نسق پر چھا گئے اور امام ابو یوسف کی سرکردگی میں ڈیڑھ سو سالہ اسلامی مملکت کو تباہی سے بچا کر مزید چند سو سال تک ایک نئی اور زیادہ صحت و رزندگی بخشنے کا سامان ہوگیا۔ اور جیسا کہ مولانا نے واضح فرمایا ہے (ص ۱۴ طبع جدید کا صفحہ، یہ بھی مجدد اول حضرت عمر بن عبدالعزیز کے فیض لامتناہی کی ایک اور برکت نظر آتی ہے۔ یہ دور امام ابو حنیفہ کی عمر کے تاثر پذیر دور کا ہم عصر ہے۔

ہوا یہ کہ خلفاء بنی امیہ نے بعض مرتبہ، غالباً نیک نیتی سے چند ایسے لوگوں کو قاضی مقرر کیا جو کردار تو عمدہ رکھتے تھے اور ہر طرح منصف مزاج اور بے لاگ قاضی بننے کے قابل تھے لیکن قانون سے واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ قدیم رومی روایات کے تحت (جو شام میں کچھ نہ کچھ باقی رہی ہوں گی) خلفاء نے یہ کیا کہ ان پڑھ قاضی کو پڑھے لکھے مشیر و مفتی مدد دینے کے لئے مہیا کر دیئے اور اس طرح مقصد حاصل ہوگیا تھا لیکن بعد میں اس نظیر سے بے جا کام لیا گیا اور جاہل قاضی روز افزوں ہوتے گئے۔ مزید برآں کوئی مجموعہ قانون و نظائر ملک میں نہ تھا۔ استبداد پسند مولوی خلفاء یہ چاہتے بھی نہ تھے۔ قاضیوں کے لئے ابتداءً پوری نیک نیتی سے اجتہاد کی صلاحیت رکھنے کی ضرورت سمجھی گئی تھی تا کہ قرآن و حدیث سے مسائل استنباط کرلیا کریں۔ بعد کے زمانے میں یہ لفظ تو رہ گیا اور معنوں کی طرف توجہ نہ رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شہر کی نظیریں الگ ہوگئیں۔ بلکہ بڑے قاضیوں کی صورت میں خود ان کے اپنے فیصلے مماثل صورت مقدمہ کے باوجود فریق مقدمہ کے بدلنے پر مختلف ہونے لگے۔ ابھی انگریزی دور میں کلکتہ، مدراس، بمبئی، لاہور وغیرہ کی عدالت ہائے عالیہ میں دہلی کی مرکزی کنیز لندن کی پریوی کونسل کی ترمیمی و اصلاحی شخصیت کی موجودگی کے باوجود جتنا اختلاف رائے تھا اس سے سب واقف ہیں اور اس سے ایک بہت ہی ہلکا تصور خلافت عباسیہ کے آغاز پر اسلامی قانون کے متعلق باہم متعارض نظائر کے متعلق کیا جاسکتا ہے۔

اس صورتحال کا (جس کا ذکر مولانا نے ایک جدید مصری تالیف کے واسطے سے کیا ہے لیکن جو ''رسائل البلغاء'' میں ابن المقفع کے اصل رسالے یعنی ''رسالہ فی الصحابہ'' کے شائع ہو جانے کے باعث راست و بلاواسطہ بھی کیا جاسکتا ہے) امام ابو حنیفہ نے علاج یہ سوچا تھا کہ سیاست باز تو فوجی انقلاب کی تیاریوں میں منہمک رہیں اور یہ اپنے شاگردوں کو لے کر دنیوی جاہ طلبی سے بے پرواہ ہو کر فقہ اسلامی کے انبار میں (جس میں بے لگام نظائر کے باہمی تعارض نیز علم حدیث کے کامل طور پر تا آں دم مدون و منقح نہ ہونے کے باعث متصادم؟ ایک مزید تعارض کے باعث مشکلیں بڑھ گئی تھیں) ایک نظام قائم کرنے کی کوشش کریں۔

انہوں نے اولاً حکومتی نقطہ نظر سے بے ضرر یعنی مسائل عبادات پر توجہ اور نماز، روزہ، حج، زکوۃ وغیرہ ایک ایک باب کو لے کر اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ جزئیات کو دلائل و شواہد کے ساتھ معین کرنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ حکومتی

مسائل مال گزاری وغیرہ کو بھی مدون کیا۔ یہ یقیناً نقش اول تھا لیکن ایک تو ایک کارکرد چیز (ترمیم واصلاح کے لئے تیار) موجود ہوگئی اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ایک جماعت مہیا ہوگئی جسے اس کام کے کرنے کی تربیت مل چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کی روایات نسلوں تک چلتی اور صدیوں تک کارفرما رہتی ہیں۔

مشکلات کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک خلیفہ کو ایک مرتبہ چالیس ''مولوی نما'' بدمعاشوں نے یہ ''فتویٰ'' دیا کہ خلیفہ قانون سے بالا ہے۔ (کیا انگلستان کا بدنام مقولہ King can do no wrong۔ بادشاہ سے قصور سرزد ہو ہی نہیں سکتا، یہ بھی کہیں اسی کی نقالی تو نہیں تھی؟) ایک اور مشکل یہ تھی کہ فقہ زندگی کے ہر شعبے سے متعلق ہے اور قانون کے ماخذوں میں قانون کے علاوہ لغت، صرف نحو، تاریخ وغیرہ ہی نہیں حیوانات، نباتات، بلکہ کیمیا وطبیعیات کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ قبلہ معلوم کرنا جغرافیہ طبیعی پر موقوف ہے۔ نماز اور افطار وسحری کے اوقات علم ہیئت وغیرہ کے دقیق مسائل پر مبنی ہیں۔ رمضان کے لئے رویت ہلال کو اہمیت ہے اور بادل وغیرہ کے باعث ایک جگہ چاند نظر نہ آئے تو کتنے فاصلے کی رویت اطراف پر مؤثر ہوگی، وغیرہ وغیرہ۔ مسائل کی طرف اشارے سے اندازہ ہوگا کہ نماز روزہ جیسے خالص عباداتی مسائل میں بھی علوم طبیعہ سے کس طرح قدم قدم پر مدد لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کاروبار تجارت، معاہدات، آبپاشی، صرافہ بنک کاری وغیرہ وغیرہ کے سلسلے میں قانون سازی میں کتنے علوم کے ماہروں کی نہ ضرورت ہوگی، امام ابوحنیفہ ہر علم وفن کے ماہروں کو ہم بزم کرنے اور اسلامی قانونی یعنی فقہ کو ان سب کے تعاون سے مرتب ومدون کرنے کی کوشش میں عمر بھر لگے رہے اور بہت کچھ کامیاب بھی ہوئے۔

کتاب میں قسم قسم کی معلومات یکجا ہوگئی ہیں۔ کسے یقین آئے گا کہ امام ابوحنیفہ (فوت ۱۵۰ھ) زمین کے کروی اور گول ہونے کے قائل تھے۔ صفحہ (۲۳۲) پر جو قصہ لکھا ہے اس سے اس کے سوا کیا نتیجہ نکالا جاسکتا ہے۔ خلیفہ منصور کی موجودگی میں امام ابوحنیفہ سے کسی نے پوچھا کہ ''دنیا کے ٹھیک بیچ میں کون سی جگہ ہے؟'' امام نے فرمایا کہ ''وہی جگہ جہاں تو بیٹھا ہے۔'' زمین کے ٹھیک کروی الشکل ہوئے بغیر نہ تو یہ جواب صحیح ہوسکتا ہے اور نہ سائل اس پر چپ اور قائل ہوسکتا۔ (قطبین پر پچکنے سے یہاں بحث نہیں)۔

''جرتج شاید جارج کے لفظ ہی کی کوئی صورت ہے'' اس کا تعلق گریگوری سے سمجھا جاتا ہے۔

''امام ابو یوسف سب سے پہلے قاضی القضات تھے۔'' بطور واقعہ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ ''اسی طرح کا کام اولاً امام ابوحنیفہ کو پیش کیا گیا تھا جسے انہوں نے قبول نہیں فرمایا'' اس کے ماننے سے بھی انکار نہیں لیکن اس سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا کہ اس عہدے کا تصور امام ابوحنیفہ کی (جو ایرانی النسل تھے) تجویز سے ہوا یا خود خلفاء عباسیہ کو اپنے ماحول کے ایرانی اثرات وروایات سے، قبل اسلام کے عہدہ موبذ موبذان کے باعث، اس کی تجویز سوجھی، بہرصورت قاضی القضات کا تصور (جو وزیر عدالت اور میر عدل دونوں کے اجتماع کی حیثیت ہے) ایرانی تھا یا نہیں۔ مولانا کی طویل بحث کے باوجود حل نہ ہوسکا۔ موبذ موبذان آیا خالص مذہبی افسر تھا یا خالص عدالتی یا دونوں کا جامع، جب تک اس کا مواد سامنے نہ آئے خالص عدالتی قاضی القضات کے تصور کا ماخذ معلوم نہیں ہوسکتا۔ میں پورے استناد کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا لیکن قدیم ترتمدنوں مثلاً یہودیوں وغیرہ کے ہاں مذہبی اور عباداتی اعلیٰ افسر ہی اعلیٰ ترین افسر عدالت ومرافعہ بھی ہوتا

تھا۔ موبذ موبذاں بھی ایسا ہی رہا ہو۔ قرین قیاس ہے۔ جاحظ نے موبذ موبذاں کا ترجمہ اگر قاضی القضاۃ کیا تھا، تو اس مذہبی افسر کے عدالتی شعبہ فرائض کے ذکر کے سلسلے ہی میں ہوگا۔ ایران میں خالص عدالتی موبذ موبذان کا پتہ نہیں چلتا کہ قاضی القضاۃ کو اس کی تتبع قرار دیں۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ خلافت راشدہ و خلافت بنی امیہ میں ایسی کوئی چیز مسلمانوں میں نہ تھی اور یہ امر معنی خیز ہے کہ اس طرح کا عہدہ بغداد اور قرطبہ میں ایک ہی وقت میں قائم ہوا گویا وہ ایک سماجی ضرورت تھی اور مسلمانوں کی عمرانی ضرورتوں نے اس کا قیام سمجھایا تھا اور بس......

کتاب کے بعض اور دلچسپ معلومات میں سے یہ ہے کہ ابو مسلم خراسانی کے زمانے میں بھی چینی کے برتن پائے جاتے تھے۔

وزراء کو نماز باجماعت نہ پڑھنے کی بناء پر عدالت میں مردود الشہادت قرار دیا جاتا تھا۔

ایک بڑی دلچسپ بات یہ کہ امام محمد شیبانی کو تدوین فقہ میں جو مددگار ملے ان میں ان کی اپنی بعض رومی لونڈیاں بھی تھیں۔ اس سے مراد یونانی ہوں گی۔ کیونکہ تاریخ اسلام میں رومی سے مراد عموماً بیزنطینی ہوتے ہیں یعنی قسطنطنیہ کی سلطنت والے اور ان میں یونانی سب سے ممتاز تھے۔ کیا یہ لونڈیاں صرف صاف نویس تھیں یا اس سے زیادہ کچھ اور بھی؟

بنی تغلب کے متعلق ایک معاہدے کا بعض مورخ ذکر کرتے ہیں کہ انہوں نے یہ وعدہ کیا کہ خود تو عیسائی رہیں گے لیکن اپنے بچوں کو بپتسمہ نہ دیں گے یعنی عیسائی نہ بنائیں گے۔ الوثائق السیاسیہ فی العہدا لنبوی واخلافتہ الراشدہ کی تدوین کے سلسلہ میں پتہ چلا کہ یہ اصل میں ''لاتقربوا الصلاۃ'' کا سا واقعہ ہے۔ مکمل معاہدے سے (طبری) خراج ابی یوسف سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نومسلم تغلبیوں کی اولاد کے متعلق پادریوں کے اختیار سماعت اور عمل دخل کو روکنا مقصود تھا۔ ورنہ عیسائیوں کو یہ حکم دینا کہ اپنی اولاد کو عیسائی نہ بنائیں لا اکراہ فی الدین کے قرآنی احکام کے مغائر ہو جائے گا۔

ہارون الرشید کے زمانے میں خاندانی ناموں کا رواج نہیں ہوا تھا اور مامون الرشید اور امین الرشید کا کوئی تاریخی وجود نہیں۔ ان میں الرشید کے لفظ کا اضافہ ٹھیک نہیں۔

طبع اول میں کتاب اچھی چھپی ہے لیکن مؤلف کو ہر وقت پڑھنے کا غالباً موقع نہیں ملا۔

ایک صفحہ پر کارہ کا لفظ یعنی کراہت کرنے والا۔ پروف خواں نے اسے نہ سمجھا اور ''ناکارہ'' بنا کر اپنے ناکافی علم کا ثبوت درج کتاب کر دیا۔

اسی طرح آزمائشوں کی بھٹیوں سے ''کھرا'' ہو کر کوئی نکل سکتا ہے ''کھڑا'' ہو کر نہیں جیسا کہ چھپا ہے۔ کم یا زیادہ اہم ایسی کچھ اور بھی طباعتی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ یہ قابل معافی سمجھی جا سکتی ہیں۔ لیکن کاش ناشر کتاب میں ایک اشاریہ لگوا دیں جس کا شاید اب بھی وقت ہے۔ موجودہ فہرست مضامین تک محض ناکافی ہے۔ طبع ثانی میں تو اس کی تیاری آسان ہے۔

Marfat.com

تمنا و دعا

مولانا کی اور تالیفوں کا کتاب میں مژدہ ہے مثلاً تدوین فقہ کی تاریخ وغیرہ دعا ہے کہ مولانا کا سایہ علم کے سر پر تادیر صحت و عافیت کے ساتھ باقی رہے کہ ان زیر تالیف کتابوں سے دنیا محروم نہ رہ جائے۔ براعظم ہند میں اسلامیات کے احیاء میں مولانا نے جو حصہ لیا ہے وہ کفر و جہالت کے منطقہ حارہ میں ٹھنڈی ہواؤں کے مصداق ہے۔ جزاء اللہ عنا احسن الجزاء۔

مولانا کی اہم تر تالیفیں

گمنام اور بانام مضامین تو بکثرت ہیں۔ مطبوعہ کتابوں میں سے قبل ذکر یہ ہیں:

۱۔ النبی الخاتم

۲۔ اسلامی معاشیات

۳۔ مسلمانوں کی تعلیم (دو جلدیں)

۴۔ تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ

۵۔ کتاب ہذا (امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی)

۶۔ تدوین حدیث

۷۔ الدین القیم

۸۔ حضرت ابوذر غفاریؓ

(در: حضرت امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی، طبع دوم، کراچی ۱۹۵۷ء، مقدمہ، ص ۱۵۔۲۷)

☆......☆......☆

Marfat.com

مطالعہء قرآن

تدوینِ قرآن

یعنی

قرآن کے تحفظ پر ایک تاریخی نظر

الحمدلله وکفیٰ والصلوٰۃ والسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔

امابعد' وقت پڑنے سے پہلے بعض کتابوں کی صحیح قدر و قیمت کا لوگوں کو اندازہ نہیں ہوتا لیکن ضرورت جب پیش آجاتی ہے تو دنیا بڑی بے کسی کے ساتھ اس وقت ان کتابوں کو ڈھونڈتی ہے۔

تقریباً کچھ یہی حال اس ''کتابچہ'' یا مقالہ کا بھی ہے۔ پیغمبروں کے خاتم رسول اللہ ﷺ جس حال میں بنی نوع انسانی کے آسمانی دستور اور الٰہی قانون کی آخری شکل یعنی قرآن مجید کو دنیا میں چھوڑ کر تشریف لے گئے' من وعن ہو بہو سرمو تفاوت کے بغیر یہ ''خدائی صحیفہ'' آج بھی دنیا میں موجود ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ مسلمانوں ہی کا یہ مسلمہ مسئلہ نہیں ہے بلکہ غیر اسلامی دائروں کی بھی یہ ایک جانی پہچانی' مانی ہوئی بات ہے۔ اسی لئے قرآنی آیات دستور کے جمع و ترتیب کی سرگذشت کی تلاش کی عام طور پر ضرورت سمجھی نہیں جاتی مگر خدانخواستہ بداندیشی سے کام لینے کی بدبختانہ جرأت اگر کبھی کی گئی تو مسلمانوں ہی کی کتابوں میں بعض ایسی چیزیں پائی جاتی ہیں جن سے بداندیشی کی اس مہم میں شاید یہ جائز نفع اٹھاتے ہوئے عوام کو مغالطوں کا شکار بنایا جاسکتا ہے۔ دل تو یہی چاہتا ہے کہ بداندیشی کا یہ جذبہ کبھی نہ ابھرے لیکن شیطان نے اس سوال کو اگر چھیڑ دیا تو ان شاء اللہ تعالیٰ اس وقت آپ کو ان چند اوراق میں وہ سب کچھ مل جائے گا جو شاید بڑے سے بڑے کتب خانوں کے کتابی ذخیروں میں بھی نہیں مل سکتا۔ اسی وقت اس چھوٹی موٹی مختصری

Marfat.com

کتاب کی وقعت و قیمت کے صحیح اندازہ کا لوگوں کو موقع ملے گا اور وقت پر وہ تریاق انہی اوراق سے میسر آئے گا جو شاید اس کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتا۔

تقریباً تیس چالیس سال کے مسلسل فکر و تامل' تلاش و جستجو کے آخری تحقیقی نتائج اس کتاب میں درج ہیں۔ جن لوگوں نے قرآن کے جمع و ترتیب کی متعلقہ روایتوں کا مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ کتنے فاحش اغلاط اور پیچ در پیچ ہمالیائی مغالطوں کے پہاڑوں کو کتنی آسانی کے ساتھ اڑا دیا گیا ہے۔شکوک وشبہات کے سارے بادل پھاڑ دیئے گئے ہیں اور ناجائز نفع اٹھانے والوں کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑی گئی ہے۔

حق تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ خاکسار کے رفیق محترم مولوی غلام ربانی ایم اے (عثمانیہ) نے اس فقیر سراپا تقصیر کی جگر کاویوں اور دماغ سوزیوں کے ان نتائج کو بڑے پاکیزہ اسلوب اور دل نشین تعبیر میں اس کتاب کے اندر جمع کر دیا ہے۔اگرچہ فقیر نے خود بھی اس عنوان پر مستقل کتاب لکھی ہے لیکن جہاں تک میرا خیال ہے میری کتاب کے اس ''جوہری خلاصہ'' کے شائع ہو جانے کے بعد اب اصل کتاب کی اشاعت کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہی ہے کیونکہ اس ضخیم و مبسوط کتاب کے اکثر جوہری حقائق اصولی مشتملات اس مختصر کتاب میں محفوظ ہو گئے ہیں۔حق تعالیٰ مولوی غلام ربانی کی اس محنت کا صلہ دین اور دنیا میں عطا کرے' اسلام پر نازک ترین وقت کا خطرہ سامنے آ گیا ہے۔دوسری چیزوں کے ساتھ مجھے امید ہے کہ اس نازک ترین گھڑی میں یہ مختصر رسالہ بھی ان شاءاللہ کافی کارآمد ثابت ہوگا۔کم از کم اسلام کی اساسی کتاب جس پر اس دین کی ''بنیاد'' قائم ہے اس پر تو شک وشبہ کی گرد اچھالنے میں ان شاءاللہ تعالیٰ اب کوئی بداندیش کامیاب نہیں ہوسکتا۔واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل

مناظر احسن گیلانی

(گیلان) بہار ۱۵ ستمبر ۱۹۵۰ء

(ایم اے تفسیر کے لئے امتحانی مقالہ خاکسار نے جو تیار کیا تھا یہ مضمون اسی مقالہ سے ماخوذ ہے۔علاوہ دوسری عام کتابوں کے علامہ جلال الدین سیوطی کی کتاب ''اتقان'' اور الجزائری کی ''تبیان'' سے بھی استفادہ کیا گیا ہے لیکن مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ حضرت الاستاذ مولانا مناظر احسن گیلانی کے درسی محاضرات وامالی سے تحقیق کی راہ میں مجھے غیر معمولی مدد ملی ہے عموماً اس مضمون میں جتنے جدید اور نئے نقاط نظر ملیں گے۔کلیتہً حضرت الاستاذ کے اثر فیض وکرم کی تراوش ہی کے وہ نتائج ہیں۔حضرت الاستاذ نے اس موضوع پر مستقل کتاب ہی لکھی ہے جو ابھی شائع نہیں ہوئی ہے۔گویا خاکسار کا یہ مقالہ اسی مبسوط وضخیم کتاب کا ''جوہری خلاصہ'' ہے۔جب تک آفتاب طلوع نہ ہو' چاند ہی کی روشنی سے فائدہ اٹھایئے......غلام ربانی)

Marfat.com

قرآن کا دوسری آسمانی کتابوں سے تعلق

تاریخی طور پر اس کا متعین کرنا دشوار کیا بلکہ ناممکن ہے کہ نسل انسانی کو پہلی کتاب خدا کی طرف سے کون سی کہاں اور کب ملی۔ قرآن کا اجمالی بیان یہ ہے کہ ہر امت میں نذیر اور خدا کے نمائندے آسمانی ہدایت کی تعلیم کے لئے آتے رہے اور جس طرح خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ پر قرآن کی وحی ہوئی اسی طرح ان سے پہلے نوح علیہ السلام اور ان کے بعد انبیاء علیہم السلام پر ہوتی رہی۔ ارشاد باری ہے۔

انا او حینا الیک کما او حینا الیٰ نوح والنبیین من بعدہ (۴:۱۶۳)

ہم نے تم پر وحی اسی طرح کی جیسے نوح پر اور نوح کے بعد پیغمبروں پر وحی کرتے رہے۔

اس سلسلہ میں چند پیغمبروں کے نام لینے کے بعد

ورسلاً قد قصصنٰھم علیک من قبل ورسلاً لم نقصصھم علیک (۴:۱۶۴)

ان پیغام لانے والوں میں سے بعضوں کا حال تم سے ہم نے بیان کیا اور بعضوں کا حال نہیں بیان کیا ہے۔

بھی فرمایا گیا ہے کہ جس سے معلوم ہوا کہ انسانی زندگی کے نیک اور بدانجام کو علم و عمل کے نظام پر مرتب کرنے کے لئے اور اس کی تشریح و تعلیم کے لئے پیغمبروں کا سلسلہ ہمیشہ قائم رہا۔ پھر دوسری جگہ اس کی بھی تصریح ہے کہ

شرع لکم من الدین ما وصیٰ بہ نوحاً والذی اوحینا الیک وما وصینا بہ ابراھیم وموسیٰ وعیسیٰ ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ (۴۲:۱۳)

الدین (یعنی ایسا آئینی دستور جس پر زندگی کے دوسرے دور میں بدلہ دیا جائے) اسی کو قانون بنا کر جو تمہیں دیا گیا (یہ وہی دین ہے) جس کی وصیت خدا نے نوح کو کی اور جس کی وحی ہم نے تم پر کی اور اسی کی وصیت ہم نے ابراہیم کو کی اور موسیٰ کو بھی اور عیسیٰ کو بھی (اسی کی وصیت کی گئی مقصد یہ تھا اور ہے) کہ اس الدین (اسی دستور کو) قائم کرو اور اس میں بکھر و مت۔

ایک اور مقام میں یہ فرمایا کہ

افلم یدبروا القول ام جاء ھم مالم یات اٰباء ھم الاولین (۲۳:۶۸)

کیا بات کو وہ سوچ نہیں رہے ہیں۔ یا ان کے پاس کوئی ایسی چیز آئی ہے جو ان کے آباء اولین (اگلے باپ دادوں کو) نہیں دی گئی تھی۔

اس امر کو واضح الفاظ میں صاف کر دیا گیا کہ انسانی زندگی کا قدرتی دستور العمل جس کی تعبیر دین و مذہب کیش اور دھرم وغیرہ الفاظ سے لوگ کرتے ہیں۔ یہ انسانیت کا ایک مشترکہ موروثی ترکہ ہے اور اصولاً ایک ہی دستور العمل ہے جس کی پابندی کا مطالبہ اس زمینی زندگی میں اول سے لے کر آخر تک بنی نوع انسانی کی تاریخ کے ہر دور میں کیا گیا اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا۔ آخر قانون کا بنانے والا جب ایک ہو اور جس کے لئے قانون بنایا گیا ہو وہ بھی ایک

Marfat.com

ہو تو شکل وصورت، چہرہ وبشرہ رنگ وروغن کے اختلاف سے یا زمین کے کسی خاص خطہ میں سکونت کی وجہ سے جو کسی دریا پہاڑ وغیرہ سے گھرا ہو یا کسی خاص خاندان میں پیدا ہونے کی وجہ سے یا زبان کے اختلاف کی وجہ سے یا انسان جن چیزوں کو استعمال کرتا ہے ان کے بدل جانے کی وجہ سے کیا آدمی کی فطرت بدل جاتی ہے؟

بہر حال جیسا کہ مولانا گیلانی کا خیال ہے کہ زندگی کا وہی دستور کہن جو ہمارے آباء اولین کو ملا تھا اصولاً اسی کا اعادہ اسی کی تجدید کا عمل پچھلی نسلوں میں بھی ہوتا رہا اسی لئے دین یا زندگی کا یہ دستور العمل ہمارا ایک مشترک موروثی ترکہ ہے، البتہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قدرت کے عطا کئے ہوئے اس آئین کی حفاظت ونگرانی میں بوجوہ مختلف قومیں غفلتوں اور لاپرواہیوں کی شکار ہوتی رہیں۔ خدا کی خالص تعلیم سے ہٹ ہٹ کر اپنے ہی جیسے انسانوں کے خود تراشیدہ رسوم اور دستوروں میں لوگ اُلجھتے رہے۔ مختلف زمانوں اور ملکوں میں زیادہ تر پیغمبروں کی ضرورت اسی عام تاریخی حادثہ نے پیدا کی یعنی جب خدا کی خالص تعلیم اور ہدایت نامہ سے لوگ ہٹ گئے تو پھر اسی موروثی آئین کہن کی طرف واپس کرنے کے لئے حق تعالیٰ قوموں اور راستوں میں رسولوں اور پیغمبروں کو پیدا کرتا اور اٹھاتا رہا۔

چاہیے تو یہی تھا کہ مقنن کی شخصی وحدت اور جن کے لئے قانون بنایا ان کی نوعی وحدت کی بنیاد پر لوگ اپنے اس موروثی قانون کو ایک ہی قانون کی حیثیت سے دیکھتے مگر تصدیق وتوثیق، تصحیح اور تکمیل وغیرہ اغراض کے لئے متعدد پیغمبروں کا ظہور مختلف زمانوں میں جو ہوتا رہا یہ عجیب بات ہے کہ اسی ایک دستور العمل کے پیش کرنے والوں کے اس تعدد وکثرت کو دیکھ کر غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ مذہب دنیا میں ایک نہیں بلکہ متعدد اور بہت سے ہیں۔

قرآن گذشتہ آسمانی کتابوں کا آخری ایڈیشن ہے

بقول حضرت الاستاذ ایک ہی کتاب کو چند آدمی اگر کتب خانہ سے نکالیں تو چند لانے والوں کی وجہ سے کیا وہی ایک کتاب بھی چند ہو جائے گی۔ یقیناً کسی مصنف کی کتاب کے چند ایڈیشن کو دیکھ کر یہ فیصلہ کتنا غلط فیصلہ ہوگا کہ مصنف کی یہ ایک کتاب نہیں بلکہ چند کتابیں بن گئیں۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن تمام آسمانی کتابوں کے ساتھ اپنی اسی نسبت کا مدعی ہے یعنی پچھلی ساری آسمانی کتابوں کا اپنے آپ کو وہ آخری اور مکمل ترین ایڈیشن قرار دیتا ہے اور قوموں کے پاس اس کتاب کے جو پرانے مشتبہ اور مشکوک یا ناقص وغیر مکمل نسخے رہ گئے ہیں ان کے متعلق اس کا صرف یہ مطالبہ ہے کہ اس جدید تازہ ترین اور کامل ایڈیشن سے مقابلہ کر کے قومیں اپنی موروثی کتابوں کی تصحیح کر لیں، یہی اور صرف یہی ایک مطالبہ قرآن نے دنیا کی قوموں کے سامنے پیش کیا ہے۔ ظاہر ہے اس مطالبہ کا مطلب کسی حیثیت اور کسی لحاظ سے بھی یہ نہیں ہے کہ دنیا کی قوموں کے پاس آسمانی دین اور مذہب اپنے آباء واجداد سے جو پہنچا ہے اس دین سے اور اس دین کا انتساب جن بزرگوں کی طرف ہے ان بزرگوں سے بے تعلق ہو کر قرآن کو بالکلیہ ایک جدید دین اور دھرم کی کتاب کی حیثیت سے مانا جائے۔ یقیناً نہ قرآن ہی کا یہ مطالبہ ہے اور نہ قرآن کے ماننے والوں کی طرف سے یہ دعوت دنیا کے سامنے کبھی پیش ہوئی ہے[1]

کیا قرآن کسی کو اس کے آبائی وموروثی دین سے جدا کرتا ہے؟

آج کروڑہا کروڑ کی تعداد میں مسلمان دنیا کے اکثر علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یقیناً ان میں عیسائی یہودی اور اسی قسم کی دوسری مذہبی امتوں کے لوگ بھی شریک ہیں۔ پھر کیا قرآن کو مان کر جو عیسائی تھے مسلمان ہونے کے بعد انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کی کتاب انجیل کی تکذیب کی' یا جو یہودی تھے مسلمان ہونے کے بعد موسیٰ علیہ السلام یا انبیاء بنی اسرائیل کی توہین کر رہے ہیں یا تورات اور تورأت کے ساتھ دوسرے پیغمبروں کی جو کتابیں ہیں' انہیں جھٹلا رہے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مسیح علیہ السلام کی تعلیم سے جو دور ہو گئے تھے قرآن شریف کو مان کر وہی عیسائی حضرت عیسیٰ اور ان کی صحیح تعلیم سے پھر قریب ہو گئے اور یہی حال ان ساری قوموں کے ساتھ پیش آیا ہے جو گذشتہ تیرہ ساڑھے تیرہ صدیوں میں قرآن کو مان مان کر اسلامی حلقہ میں داخل ہوتی رہی ہیں یعنی اپنے آبائی اور موروثی دین کے جن اجزاء وعناصر کو لوگ کھو بیٹھے تھے یا تاریخی حوادث و واقعات نے ان کے دین کے جن حقائق و مسائل کو مشتبہ و مشکوک بنا کر رکھ دیا تھا' قرآن شریف کی راہ سے ان کھوئی ہوئی چیزوں کو انہوں نے پالیا اور شک و ریب کی تاریکیوں میں جو باتیں رل مل گئی تھیں' قرآن کی روشنی میں اب یقین کی آنکھوں سے دیکھنے اور پالینے میں وہ کامیاب ہوئے ہیں۔ پس حقیقت یہی ہے کہ اپنے آباء اولین اور گذشتہ باپ دادوں کے دین سے قرآن پاک کو مان کر قطعاً کوئی الگ نہیں ہوا ہے بلکہ جو الگ ہوئے تھے بلاخوف تردید دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ ان کے آبائی دین ہی کی طرف خدا کی اس آخری کتاب نے ان سب کو واپس کر دیا ہے۔ اس نے توڑا نہیں ہے بلکہ جو ٹوٹے ہوئے تھے ان کو اپنے بزرگان سلف اور ان کی سچی تعلیم' صحیح زندگی کے ساتھ جوڑ دیا ہے' واقعہ یہی ہے خواہ دنیا اس کو مانے یا نہ مانے۔ قرآن کی دعوت وتبلیغ کا یہی محوری نصب العین ہے۔ بکھری ہوئی منتشر اور پراگندہ انسانیت کو اسی راہ سے وحدت و وفاق کے مرکزی نقطہ پر وہ ''سمیٹ'' کر لے آنا چاہتا ہے۔

بہرحال یہ تو ایک تمہیدی ذیلی گفتگو تھی۔ میں آپ کے سامنے اس موروثی دین کی الٰہی کتاب کے آخری ایڈیشن کے ان پہلوؤں کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جن کے متعلق بدبختی سے بداندیش دماغوں میں خواہ مخواہ بعض بے بنیاد وساوس واوہام مختلف راہوں سے گھس پڑے ہیں۔ یعنی قرآن مجید کی تدوین یا جمع وترتیب کی جو واقعی سرگذشت ہے اسی کے متعلق ایک مختصر جمالی بیان ان لوگوں کے سامنے پیش کر رہا ہوں جو ناواقفیت کی وجہ سے ان ہی ادہام سے پیدا ہونے والی غلط فہمیوں میں اس وقت مبتلا ہیں یا آئندہ مبتلا کیے جاسکتے ہیں۔

قرآن کی تدوین کی مصدقہ شہادتیں

قرآن کی تدوین یا جمع وترتیب کے متعلقہ سوالوں پر جن شہادتوں سے روشنی پڑ سکتی ہے' آسانی کے لئے ہم ان شہادتوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ یعنی شہادتوں کا ایک سلسلہ تو وہ ہے جو خود اس کتاب کے اندر پایا جاتا ہے'

Marfat.com

ہم اندرونی شہادتوں سے اس کی تعبیر کر سکتے ہیں اور دوسرا سلسلہ ان تاریخی روایات کا ہے جن سے اس کتاب کے تدوینی حالات کے جاننے اور سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ہم ان کو بیرونی شہادتوں سے موسوم کریں گے۔ پہلے ہم اندرونی شہادتوں کو پیش کرتے ہیں۔

اندرونی شہادتیں

واقعہ یہ ہے کہ اس لحاظ سے دنیا کی ان تمام کتابوں میں جنہیں قومیں خدا کی طرف منسوب کرتی ہیں، شاید قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جو اپنے متعلقہ سوالات کے جوابات کے لئے قطعاً خود مکتفی ہونے کی حیثیت رکھتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تاریخی روایات کا جو ذخیرہ قرآن کے جمع و ترتیب کے متعلق پایا جاتا ہے اگر یہ ذخیرہ نہ بھی پایا جاتا جب بھی اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں کے متعلقہ سوالات کے جوابوں کو ہم خود قرآن ہی میں پاسکتے ہیں۔

اس کتاب کا نازل کرنے والا کون ہے؟ کس پر نازل ہوئی؟ کس لئے نازل ہوئی؟ کیا صرف ان ہی بنیادی سوالوں کے جوابات جیسا کہ ہر قرآن پڑھنے والا جانتا ہے اس کتاب میں جگہ جگہ موجود نہیں ہیں حالانکہ اسی نوعیت کی دوسری کتابوں میں اگر کوئی جاننا چاہے تو انصاف سے بتایا جائے کہ ان سوالوں کا جواب خود ان کتابوں میں کوئی کیا پاسکتا ہے؟

چونکہ قرآن کی یہ عام باتیں ہیں اس لئے ان سوالوں پر بحث کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے قرآن کی اندرونی شہادتوں کی روشنی میں اس وقت صرف حسب ذیل سوالوں کے جوابوں کو پیش کرنا چاہتا ہوں:

ا۔ ابتدائی حالت اس کتاب کی کیا تھی؟ بالفاظ دیگر میرا مطلب یہ ہے کہ جیسے عموماً خدا کی طرف منسوب ہونے والی دوسری کتابوں کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً زبانی یادداشتوں اور گیتوں اور بھجنوں کی شکل میں وہ رہیں اور صدیوں بعد قلمبند ہوئیں[1] اس باب میں قرآن کا کیا حال ہے؟

بقول مولانا گیلانی اس سوال کے حل کے لئے اوراق الٹنے کی بھی ضرورت نہیں بلکہ سورہ فاتحہ کے بعد قرآن کی پہلی سورہ بقرہ ہی کی پہلی آیت ذٰلک الکتٰب لا ریب فیہ (یہ ایک نوشتہ ہے جس میں شک نہیں ہے) اسی فقرہ میں اس سوال کا جواب آپ کو مل جائے گا یعنی خود کتاب کا لفظ جس کے معنی نوشتہ اور لکھی ہوئی چیز کے ہیں۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ پیش کرنے والا ابتدا ہی سے اس کو نوشتہ اور مکتوبہ شکل ہی میں پیش کرنا چاہتا ہے اور کتاب یا نوشتہ کا یہ لفظ کچھ اسی ایک مقام پر استعمال نہیں ہوا ہے۔ قرآن پڑھیے تقریباً ہر بڑی سورہ میں کتاب یا نوشتہ ہونے کی اسی تعبیر کا مسلسل ذکر آپ کو ملتا چلا جائے گا۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ کفار عرب کا یہ فقرہ جو قرآن میں نقل کیا گیا یعنی وہ کہا کرتے تھے کہ

اکتتبھا فھی تملیٰ علیہ بکرۃ واصیلاً (۲۵:۵)

لکھ لیا ہے اس شخص نے (یعنی پیغمبر نے) اس کو (یعنی قرآن کو) پس وہی پڑھا جاتا ہے اس پر صبح و شام

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی کتابت اور نوشتگی ایک عام اور پھیلی ہوئی بات تھی جسے وہ بھی جانتے تھے جنہوں نے اب تک اس کو خدا کی کتاب بھی نہیں مانا تھا۔

Marfat.com

ماسوا اس کے اس کتاب یا نوشتے کے متعلق اس قسم کے ذیلی سوالات یعنی قرآن کس چیز پر لکھا جاتا تھا۔ پیغمبر تو خود اُمی تھے۔ لکھنے پڑھنے سے ناواقف تھے۔ پھر کن لوگوں سے اس کو لکھواتے تھے۔ آپ چاہیں تو ان سوالات کے جوابوں کو بھی قرآن ہی میں تلاش کر کے پاسکتے ہیں۔ مثلاً پہلا سوال یعنی قرآن کس چیز پر لکھا جاتا تھا' اس کے لئے قرآن ہی میں پڑھیے۔

والطور. و کتب مسطور. فی رق منشور (۵۲: ۱۔۳)

قسم ہے (کوہ) طور کی اور لکھی ہوئی کتاب کی جو باریک جھلی کھلی ہوئی پر لکھی ہوئی ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے رق ایک خاص قسم کی باریک جھلی کو کہتے ہیں جو لکھنے کے کام کے لئے تیار کی جاتی تھی۔ انگریزی میں جسے پارچمنٹ (Parchment) کہتے ہیں اور قدیم زمانہ کی تورات انجیل وغیرہ جیسی کتابیں اسی پر لکھی ہوئی اب بھی ملتی ہیں۔ قرآن یہ اطلاع دیتا ہے کہ اس کی کتابت بھی رق ہی پر ہے۔ اسی طرح اس کی خبر دیتے ہوئے کہ قرآن تو چونک پیدا کرنے والی ایک چیز ہے اسی کی صفت میں فرمایا گیا ہے کہ

فی صحف مکرمة مرفوعة مطهرة. بایدی سفرة. کرام بررة (۸۰: ۱۳۔۱۶)

صحیفوں میں لکھا ہوا ہے ایسے صحیفہ جو مکرم و محترم ہیں پاک ہیں لکھے ہوئے ہیں ہاتھوں سے ان لکھنے والوں کے جو بڑے بزرگ اور پاکباز لوگ ہیں۔

جس سے صرف یہی نہیں معلوم ہوا کہ قرآن صحیفوں میں لکھا جارہا تھا بلکہ اس کے لکھنے والوں کے ان اعلیٰ خصوصیات کا بھی اظہار کیا گیا ہے جن میں صحت نویسی کی ضمانت پوشیدہ ہے۔

حیرت ہوتی ہے کہ قرآن کے پڑھنے والے اس قسم کی آیتیں پڑھتے ہیں مثلاً

لا یمسه الا المطهرون (۵۶: ۷۹)

نہیں چھوئیں اس کو (یعنی قرآن کو) مگر وہی لوگ جو پاک ہوں۔

مگر نہیں سوچتے کہ زبانی یادداشت کی شکل میں جو چیز ہوگی کسی حیثیت سے بھی یہ حکم یعنی مس اور چھونے کی ممانعت کا تصور اس کے متعلق کیا جاسکتا ہے' جس کے صاف معنی یہی ہیں کہ خود قرآن نے اپنے آپ کو ایک ایسی نوشتہ اور مکتوبہ شکل میں پیش کیا ہے جس کے مس اور چھوئے جانے کا بھی امکان تھا ورنہ ممانعت یقیناً ایک بے معنی سی بات ہو جاتی ہے۔

علاوہ اس کے تدریجی نزول یعنی وقفہ وقفہ سے قرآنی آیتیں جو اتر رہی تھیں اور ''جملة واحدة'' یعنی ایک ہی دفعہ ان کو نازل نہیں کیا گیا اس کی وجہ جو یہ بیان کی گئی ہے کہ

لنثبت به فوادک

تاکہ ہم جمائیں اس کے ساتھ تیرے دل کو

ظاہر ہے کہ قرآن کو دل میں جمانے یعنی یاد کرنے میں خود پیغمبر کو نزول کے اسی تدریجی طریقہ سے بہ سہولت موقع مل سکتا

Marfat.com

تھا۔ پھر سورہ بنی اسرائیل میں

قرانا فرقناه لتقراه على الناس على مکث (۱۰۶:۱۷)

قرآن (جس کی آیتوں کو) جدا جدا کر کے ہم نے اتارا (یہ اس لئے کیا گیا) تاکہ لوگوں پر وقفہ کے ساتھ اس کتاب کو تم پڑھو۔

اس تدریجی نزول کی وجہ یہ تھی جو بیان کی گئی کہ لوگوں کے سامنے وقفہ وقفہ سے پڑھنے کا موقع اسی طرح مل سکتا ہے گویا علاوہ پیغمبر کے دوسرے لوگوں کو بھی قرآن شریف کے زبانی یاد کرانے کی بھی تدبیر ہوسکتی تھی۔ اس تدبیر میں جو کامیاب ہوئی اس کی خبر دیتے ہوئے قرآن ہی میں یہ اعلان کیا گیا ہے

بل هوا ايات بينات فی صدور الذين اوتوا العلم (عنکبوت)

بلکہ وہ (یعنی قرآن) تو کھلی ہوئی واضح آیتوں کا (مجموعہ ہے) جو ان لوگوں کے سینوں میں ہے جنہیں علم دیا گیا ہے۔

مطلب یہی ہوا کہ علاوہ کتابی قالب میں محفوظ ہونے کے صحابیوں میں اہل علم کا جو طبقہ تھا قرآن اطلاع دیتا ہے کہ ان کے سینوں میں بھی وہ محفوظ ہوتا چلا جارہا تھا۔ نیز سورہ مزمل کے آخری رکوع میں۔

فاقرء وا ما تيسر من القرآن (۲۰:۷۳)

پس پڑھو تم لوگ جتنا آسانی سے ہو سکے قرآن کو۔

کے حکم کو نافذ کرتے ہوئے اس واقعہ کا تذکرہ قرآن ہی میں کیا گیا ہے کہ پیغمبر ہی نہیں بلکہ پیغمبر کے صحابیوں کا ایک طائفہ اور گروہ بھی۔

ادنیٰ من ثلثی اليل ونصفه وثلثه (۲۰:۷۳)

رات کے دو تہائی یا آدھے یا دو تہائی حصہ میں۔

کھڑے ہوتے اور قرآن کو دہراتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے متعلق

يتلون ايات الله باليل والنهار

پڑھتے ہیں اللہ کی آیتوں کو رات میں بھی اور دن میں بھی۔

وغیرہ آیتوں میں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ صبح و شام ان کا مشغلہ اپنے یاد کیے ہوئے قرآن کا اعادہ اور تکرار تھا۔

قرآن کی ان اندرونی شہادتوں کے بعد کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس کتاب کی حفاظت کا سامان کتابتہً و حفظاً یعنی لکھ کر اور زبانی یاد کر کے جو کیا گیا تھا اس کے لئے کسی بیرونی شہادت کی ضرورت ہے۔ خود قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت خود اس کتاب کے محفوظ کرنے کا سامان اس حد تک کر چکی تھی کہ دوسری آسمانی کتابوں کے ساتھ مختلف حوادث و واقعات جو پیش آتے رہے ان کا قطعی طور پر شروع ہی میں انسداد کر دیا گیا تھا۔

سورہ البروج میں ہے

هل اتک حديث الجنود. فرعون وثمود (۸۶:۷-۱۸)

کیا تمہارے پاس جتھوں کی خبر پہنچی ہے یعنی فرعون اور ثمود کے جتھوں کی۔

Marfat.com

اس سوالیہ فقرے کے بعد قرآن ہی میں اس دعوے کا اعلان کیا گیا یعنی

بل هو قرآن مجيد۔ في لوح محفوظ

بلکہ وہ تو بلند و بالا برتر قرآن ہے لوح محفوظ میں۔

بقول مولانا گیلانی اس کا بظاہر یہی مطلب معلوم ہوتا ہے کہ فرعون وثمود جیسی قوموں کی سی جبار حکومتوں کی طاقت بھی قرآن کو غیر محفوظ کرنے کی کوشش کسی زمانہ میں بھی خدانخواستہ اگر کرے گی تو ان کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ تیرہ سو سال سے قرآن کے اس دعوے کی جو دوست نہیں ہیں وہ بھی تصدیق کر رہے ہیں۔

"ہم قرآن کو محمد کا کلام اسی طرح یقین کرتے ہیں جس طرح مسلمان اس کو خدا کا کلام یقین کرتے ہیں۔ (اعجاز التنزیل۔ص ۵۰۰)

یہ ایک غیر مذہب کے آدمی وان ہیم (جرمنی) کا ایسا منصفانہ اعتراف ہے کہ قرآن کی تاریخ سے تھوڑی بہت بھی جو واقفیت رکھتا ہے خدا کا کلام اس کو نہ بھی مانے لیکن وان ہیم نے جو بات کہی ہے اس کے اعتراف واقرار پر تو اپنے آپ کو وہ بہر حال مجبور پائے گا۔

ناقابل انکار تاریخی حقیقت

واقعہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے اس کتاب کو جن خصوصیتوں کے ساتھ دنیا کے حوالے کیا تھا ابتدا سے اس وقت تک بغیر ادنیٰ تغیر وتبدل اور سر مو تفاوت کے وہ اسی طرح نسلاً بعد نسلٍ کروڑہا کروڑ مسلمانوں میں اس طریقہ سے منتقل ہوتی ہوئی چلی آرہی ہے کہ سال دو سال تو خیر بڑی بات ہے ایک لمحہ کے لئے بھی نہ قرآن ہی مسلمانوں سے کبھی جدا ہوا اور نہ مسلمان قرآن سے جدا ہوئے اور اب تو طباعت واشاعت وغیرہ کے لامحدود ذرائع کی پیدائش کا نتیجہ یہ ہو چکا ہے کہ میر وسودا کی غزلوں یا اسی قسم کی دوسری معمولی چیزوں کو بھی کوئی اب دنیا سے مٹا نہیں سکتا تو قرآن کے مٹنے مٹانے کا بھلا اب امکان ہی کیا باقی رہا؟

اس وقت تک میں نے قرآن کی انہی اندرونی شہادتوں کا ذکر کیا ہے جن کے نتائج اور مفاد کو وہ بھی مانتے ہیں اور ان کو ماننا ہی چاہیے جنہوں نے اب تک اس کتاب کو خدا کی کتاب تسلیم نہیں کیا ہے۔ باقی قرآن جن کے نزدیک خدا کی کتاب ہے ان کے لئے تو اس سلسلہ میں بقول مولانا گیلانی ؒ خود قرآن ہی نے کسی قسم کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔

لایاتیه الباطل من بین یدیه ولا من خلفه (۴۱:۴۲)

قرآن میں نہ سامنے سے الباطل کے گھسنے کی گنجائش ہے اور نہ پیچھے سے۔

اس کا حاصل یہی تو ہے کہ الباطل (یعنی قرآن کا جو جز نہیں ہے) اس کے لئے خدا نے ذمہ داری لی ہے کہ چاہنے والے کسی راستہ سے بھی چاہیں کہ قرآن میں اس کو داخل کر دیں تو وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ ظاہر ہے کہ ان الفاظ کو خدا

کے الفاظ جو تسلیم کر چکا ہے کیا وہ اپنے آپ کو مسلمان باقی رکھ سکتا ہے۔ اگر کسی لفظ یا شوشہ تک کے اضافہ کا قرآن میں وہ تصور کرے؟

اور جو حال اضافہ کا ہے بجنسہٖ یہی کیفیت کمی کی بھی ہے۔ مولانا گیلانی نے اس سلسلہ میں سورہ القیامتہ کی آیت ان علینا جمعه و قرانه ثم ان علینا بیانه کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اگرچہ نئے مگر بالکل صحیح نتائج پیدا کئے ہیں' مولانا کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کا اتارنے والا خدائے ذوالجلال جب خود فرماتا ہے۔

ان علینا جمعه (القیامہ)

قطعاً ہم پر قرآن کے جمع رکھنے کی ذمہ داری ہے۔

تو اس کی صورت ہی کیا باقی رہتی ہے کہ قرآن میں جن چیزوں کو خدا جمع کر چکا ہے ان کو قرآن سے کوئی نکال دے یا اپنی جگہ سے ہٹا دے بلکہ اسی کے بعد اگر غور کیا جائے تو قران کے لفظ کا اضافہ 'جمعہ' کے بعد بلا وجہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ سمجھا جائے تو نظر آئے گا کہ بعض پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کے ازالہ کا اس میں سامان مل سکتا ہے۔ سوال ہو سکتا تھا کہ صرف جمع کرنے اور باقی رکھنے کی ذمہ داری ان علینا جمعه کے الفاظ سے لی گئی ہے جس کا مفاد یہی ہو سکتا ہے کہ قرآن کے کسی جزو کو خدا غائب نہ ہونے دے گا اور قرآن دنیا میں اپنے تمام اجزاء کے ساتھ رہتی دنیا تک موجود رہے گا لیکن اسی دنیا میں بیسیوں کتابیں ایسی ہیں جن کا پڑھنے والا اب کوئی باقی نہیں رہا' ایسی صورت میں کتاب کا دنیا میں رہنا نہ رہنا دونوں باتیں برابر ہیں۔ اب اگر سوچیے تو اس خطرے کا جواب ''قرانہ'' کے لفظ میں آپ پا سکتے ہیں یعنی اس کی بھی ذمہ داری ''قرانہ'' کے لفظ سے لی گئی کہ قیامت تک اس کتاب کے پڑھنے والوں کو خدا پیدا کرتا رہے گا اور اس وقت تک یہ ذمہ داری جیسا کہ دنیا دیکھ رہی ہے خدا پوری کر رہا ہے۔ آخر اس 'قرانہ' کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ جیسے قرآنی اجزاء کے جمع رکھنے کی ذمہ داری حق تعالیٰ نے لی ہے اسی طرح اس کتاب کے پڑھنے پڑھانے کا ذمہ دار بھی وہ خود ہی ہے۔ آگے سوال ہو سکتا تھا کہ پڑھنے والے بھی باقی رہیں لیکن سمجھنے اور سمجھانے والے اگر غائب ہو جائیں تو اس وقت بھی کتاب کا افادہ ختم ہو جائے گا جیسے آج مثلاً وید کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ اس کی زبان اتنی پرانی ہو چکی ہے کہ لغت کی مدد سے بھی اس کا سمجھنا مشکل ہے۔[5] اسی وسوسے کی ضمانت

ثم ان علینا بیانه

پھر ہم ہی پر ہے اس کا بیان بھی۔

کے الفاظ میں آپ پا سکتے ہیں۔ آخر جس کتاب کے معانی ومطالب کے بیان وتشریح کی ذمہ داری اس خدا نے لی ہو جس کا وجود ماضی وحال ومستقبل سب سے مساوی تعلق رکھتا ہے تو کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ اپنی اس ذمہ داری کو تاریخ کے ہر دور میں کیوں پوری نہ فرمائے گا؟ قرآن سے یہی سمجھ میں بھی آتا ہے اور یہی دیکھا بھی جا رہا ہے کہ ہر زمانہ کے اقتضاء کے مطابق قرآنی معانی ومطالب کی تشریح وتعبیر کرنے والے مسلسل چلے آ رہے ہیں۔ دراصل انہی تفصیلات کا اجمالاً ذکر قرآن کی مشہور آیت میں فرمایا گیا ہے جسے عموماً مولوی اپنے وعظوں میں لوگوں کو سناتے ہی رہتے ہیں یعنی

Marfat.com

انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون (الحجر)

ہم ہی نے اس ذکر (چونک پیدا کرنے والی کتاب) کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی قطعاً حفاظت کرنے والے ہیں۔

بہرحال بیرونی شہادتوں سے اگر قطع نظر بھی کر لیا جائے تو قرآن کی اندرونی شہادتوں ہی سے ان سارے سوالوں کے جوابوں کو ہم حاصل کر سکتے ہیں جو قرآن جیسی کسی کتاب کے متعلق دلوں میں پیدا ہو سکتے ہیں۔

قرآن میں نوشت وخواند سے متعلق الفاظ

انتہا یہ ہے کہ قرآن کے عہد نزول میں عرب کے ماحول کی جو نوعیت نوشت وخواند کے لحاظ سے تھی عرب کی صحیح تاریخ کا جنہوں نے مطالعہ نہیں کیا ہے نیز قرآن ہی کی ایک اصطلاح یعنی لفظ ''جاہلیت'' کے اصطلاحی معنی سے ناواقف ہونے کی وجہ سے بعض لوگ اس مغالطہ میں جو مبتلا ہو جاتے ہیں کہ جاہلیت کے اس دور میں قرآن کی کتابت کے امکان کی صورت ہی کیا تھی؟ انہوں نے باور کر لیا ہے کہ عرب میں نہ لکھنے والے پائے جاتے تھے اور نہ لکھنے پڑھنے کا سامان اس وقت اس ملک میں موجود تھا مگر کاش معترضین کا یہ گروہ صرف قرآن ہی کا مطالعہ کر لیتا تو اس کتاب میں بار بار رق، قرطاس، صحیفہ، صحف[۶]، قلم، زبر، الواح، مداد (روشنائی)، اسفار، کتب وغیرہ الغرض ایسی ساری چیزیں جن کا عموماً نوشت وخواند سے تعلق ہے، ان کے ذکر سے قرآن آپ کو لبریز نظر آئے گا۔ اور یہ تو لکھنے پڑھنے کے سامان کا حال ہے باقی رہا لکھنے والے سو حیرت ہوتی ہے کہ عرب کے اس زمانے کے باشندوں کی طرف قرآن ہی میں

یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللہ (البقرہ)

لکھتے ہیں وہ لوگ کتاب اپنے ہاتھوں سے اور کہتے ہیں کہ یہ خدا کے پاس سے آئی ہوئی کتاب ہے۔

پڑھتے ہیں۔ پھر لین دین کے جس قانون کا طویل بیان سورہ بقرہ کے آخر میں پایا جاتا ہے اور تاکید کے ساتھ قرضی معاملات کے لکھنے کا اصرار قرآن نے جو کیا ہے سوچنا چاہیے کہ ان امور کا انتساب ان لوگوں کی طرف کسی حیثیت سے بھی صحیح ہو سکتا ہے جو نوشت وخواند سے قطعاً بیگانہ اور ناآشنا ہوں۔

قرآن میں جاہلیت کے معنی

رہا جاہلیت کا لفظ سو میں بیان کر چکا ہوں کہ یہ قرآن کی بنائی ہوئی اصطلاح ہے۔ متعدد مقامات پر اس نے اپنی اس اصطلاح کو استعمال کیا ہے۔ مثلاً مردوں اور عورتوں کی مخلوط سوسائٹی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

ولا تبرجن تبرج الجاھلیة الاولیٰ (الاحزاب)

اور نہ بناؤ سنگار کرو جاہلیت اولیٰ والوں کے بناؤ سنگار کی طرح۔

یا عرب پر ''نسلی ولسانی'' اور وطنی حمیتوں کا جو بھوت سوار تھا۔[۷] اس کی تعبیر حمیة الجاھلیة سے کی گئی ہے یا خدا کے متعلق ارتیابی (ایگناسٹک) ذہنیت عام عربوں پر جو مسلط تھی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

Marfat.com

يظنون بالله غير الحق ظن الجاهلية (آل عمران)

اور خیال رکھتے ہیں اللہ کے ساتھ جاہلیت کے خیالات۔

فرمایا گیا۔ اب آپ ہی بتایئے کہ کسی جگہ پر بھی ''جاہلیت'' کے اس لفظ سے وہ مطلب سمجھا جاتا ہے جو اس زمانہ کے جاہلوں اور ناواقفوں نے سمجھ رکھا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام اور اسلامی تعلیمات کے مقابلہ میں عربوں کی غیر اسلامی زندگی اخلاقاً و اعتقاداً جو کچھ بھی تھی اور جن خصوصیتوں کی حامل تھی' دراصل اسی کی تعبیر قرآن جاہلیت سے کرتا ہے۔ بہرحال یہ بات کہ اسلام سے پہلے نوشت وخواند سے عرب کے لوگ چونکہ ناواقف تھے اس لئے ان کے زمانہ کو قرآن جاہلیت کا زمانہ قرار دیتا ہے۔ یہ وہی کہہ سکتا ہے جو قرآن سے بھی جاہل ہے اور ایام جاہلیت کی تاریخ سے بھی۔

بیرونی شہادتیں

قرآن کی ان اندرونی شہادتوں کے اجمالی بقدرِ ضرورت تذکرہ کے بعد اب میں بیرونی شہادتوں کی طرف پڑھنے والوں کی توجہ منعطف کرانا چاہتا ہوں۔ اس موقع پر سب سے پہلے شیعی فاضل علامہ طبرسی کے خیالات کا پیش کرنا مناسب ہوگا۔ انہوں نے اپنی تفسیر ''مجمع البیان'' میں لکھا ہے اور بالکل صحیح لکھا ہے۔

ان العلم بصحة نقل القران كالعلم بالبلدان والحوادث الكبار والوقائع العظام والكتب المشهوره

(مقدمہ روح المعانی، ص۳۲)

یعنی قرآن اپنی اصلی حالت کے ساتھ گذشتہ نسلوں سے منتقل ہوتے ہوئے پچھلی نسلوں تک پہنچا ہے اس واقعہ کے علم کی نوعیت وہی ہے جو بڑے بڑے شہروں یا مشہور حوادث اور اہم تاریخی واقعات یا مشہور کتابوں کے علم کی ہے۔

بلاشبہ واقعہ یہی ہے' آج نیویارک اور لندن کے وجود میں شبہ یا شک جیسے جنون ہے یا جنگ عظیم کے حادثہ کا منکر پاگل سمجھا جائے گا۔ یقیناً متواتر اور متوارث ہونے میں بجنسہٖ یہی حال قرآن مجید کا بھی ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ تیرہ ساڑھے تیرہ سو سال کی اس طویل مدت میں ایک لمحہ کے لئے نہ مسلمان ہی اس کتاب سے جدا ہوئے اور نہ یہ کتاب ہی مسلمانوں سے جدائی ہوئی جسے پیغمبر ﷺ ان کے سپرد کرکے دنیا سے تشریف لے گئے۔ پیغمبر ﷺ نے جن مسلمانوں کے سپرد اس کتاب کو کیا تھا ان کی تعداد لاکھوں سے متجاوز تھی۔ پھر ان ہی لوگوں نے اپنی بعد کی نسلوں تک اسے پہنچایا جن کی تعداد بلا مبالغہ کروڑوں سے بھی آگے بڑھ چکی تھی اور یونہی طبقۃً بعد طبقۃٍ نسلاً بعد نسل نوشتہ و مکتوبہ شکل میں یہ کتاب مسلمانوں میں منتقل ہوتی چلی آرہی ہے۔ پس سچی بات یہی ہے کہ قرآن تو قرآن ایسی کتابیں جیسے نحو میں سیبویہ کی یا اصول میں المزنی کی کتاب ہے بقول علامہ طبرسی۔

لو ان مدخلا ادخل فی کتاب سیبویه والمزنی بابا من النحو لیس من الکتاب یعرف (روح، ص۲۳)

اگر سیبویہ اور المزنی کی کتابوں میں کوئی شخص اپنی طرف سے کسی چیز کو داخل کردے تو فوراً یہ بات پہچان کی جائے گی۔

تو پھر قرآن میں اضافہ یا کمی کے امکان کی بھلا کیا صورت ہے۔ اسلامی ممالک کے کسی ابتدائی مکتب کا ایک بچہ بھی اس

شخص کوٹوک سکتا ہے جو فتحہ (زبر) کی جگہ کسی حرف کو رفع (پیش) کے ساتھ پڑھے گا۔ جس کا جی چاہے اس کا تجربہ ہر جگہ کر سکتا ہے۔

تواتر اور توارث کے اس عام قصہ کے سوا قرآن کے جمع و ترتیب کے سلسلہ میں بیرونی روایتوں کا جو ذخیرہ پایا جاتا ہے میرے نزدیک ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حصہ تو ان روایتوں یا شہادتوں کا ہے جن سے قرآن کے بعض اجمالی بیانات یا شہادتوں کی شرح ہوتی ہے۔ ہم پہلے انہی کا ذکر کرتے ہیں۔

تشریحی روایات

مطلب یہ ہے کہ قرآنی آیات کا نزول وقفہ وقفہ سے تدریجاً جو ہوتا رہا' آپ سن چکے ہیں کہ یہ خود قرآن کا دعویٰ ہے اور ایک سے زائد مقام پر اس دعوے کا ذکر خود قرآن ہی میں کیا گیا ہے۔ اسی دعوے کی تفصیل روایتوں میں یہ ملتی ہے کہ قرآن کی ایک سو چودہ سورتوں کی حیثیت دراصل مستقل کتابوں یا رسالوں کی قرار دی گئی تھی مثلاً اس کو یوں سمجھیے کہ تاریخ' فلسفہ' اقلیدس' طب اور جغرافیہ وغیرہ مختلف علوم وفنون کی کتابوں کو ایک ہی مصنف اگر تصنیف کرنا شروع کرے اور تصنیف میں یہ طریقہ اختیار کرے کہ جس کتاب کا جو مواد فراہم ہوتا جائے اس کو متعلقہ کتاب میں درج کرتا چلا جائے اور یوں آہستہ آہستہ دس بیس برس میں آگے پیچھے اس کی یہ ساری تصنیفیں ختم ہوں واقعہ یہ ہے کہ کچھ یہی کیفیت قرآنی سورتوں یا ان مستقل رسالوں یا کتابوں کی ہے،[8] جن کے مجموعہ کو ہم قرآن کہتے ہیں۔ بتدریج تیس سال میں ان سب کے نزول کا سلسلہ ختم ہوا۔ ان سورتوں میں کوئی سورہ اختتام تک پہلے پہنچی اور کوئی بعد۔ یہی مطلب حضرت عثمانؓ کے ان الفاظ کا ہے جو ابوداؤدؒ نسائی اور ترمذی وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم ينزل عليه السور ذوات العدد

(مختصر کنز العمال برحاشیہ مسند احمد۔ ج ۲ ص ۱۳۸)

رسول اللہ ﷺ پر متعدد سورتیں اترتی رہتی تھیں (یعنی ایک ہی زمانہ میں مختلف سورتوں کے نزول کا سلسلہ جاری رہتا تھا)۔

اسی روایت میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ ذوات العدد (متعدد) سورتیں تدریجی طور پر جو نازل ہو رہی تھیں ان کے لکھوانے اور قلم بند کرانے کا طریقہ یہ تھا۔

فكان اذا نزل عليه الشيء دعا بعض من كان يكتب فيقول ضعوا هذا في السورة التي يذكر فيها كذا و كذا (مختصر کنز، ص ۴۸)

جب رسول اللہؐ پر کوئی چیز نازل ہوتی تو جو لکھنا جانتے تھے ان میں سے کسی کو آپ طلب فرماتے اور کہتے کہ اس آیت کو اس سورہ میں لکھو جس میں فلاں باتیں یا آیتیں ہیں۔[9]

مطلب وہی کہ طب کے متعلقہ مضامین کو طب کی کتاب میں اور تاریخ کے مواد کو تاریخ کی کتاب میں مذکورہ بالا طریقہ تصنیف اختیار کرنے والا مصنف جیسے داخل کرتا چلا جاتا ہے' اسی طرح قرآنی آیات کو ان کی متعلقہ سورتوں میں

Marfat.com

آنحضرت ﷺ شریک کرنے کا حکم دیا کرتے تھے اور آنحضرت ﷺ کو یہ حکم جبرئیل علیہ السلام دیتے تھے۔

جیسا کہ معلوم ہے خود قرآن ہی نے

ولا تخطه بیمینک (عنکبوت)

اور نہ لکھا ہے اس کو تم نے اپنے داہنے ہاتھ سے۔

کی خبر دیتے ہوئے اس کا انکشاف کیا ہے کہ صاحب وحی ﷺ لکھنا نہیں جانتے تھے لیکن آپ نے ایک نہیں بلکہ اپنے صحابیوں میں سے چالیس سے اوپر حضرات کو اس کام کے لئے مقرر کر رکھا تھا کہ جس وقت قرآن کی جس سورت کی جن آیتوں کی وحی ہو فوراً پہنچ کر ان کو لکھ لیا کریں۔ العراقی نے منظومہ سیرت میں ان کاتبوں کے نام گناتے ہوئے نظم کی ابتدا اس مصرعہ سے کی ہے۔

وکتابه اثنان واربعون [ؒ]

رسول اللہ ﷺ کے کاتبوں کی تعداد (۴۲) تھی۔

کاتبوں کی اتنی بڑی تعداد مقرر کرنے کی وجہ یہی تھی کہ وقت پر ایک نہ ملے تو دوسرا اس کو انجام دے دے۔ ''عقد الفرید'' میں ابن عبد ربہ نے حضرت حنظلہ بن ربیع صحابی کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھا ہے:

ان حنظلة بن ربیع کان خلیفة کل کاتب من کتابه علیه اذا غاب (عقد الفرید، ج ۲ ص ۱۴۴)

حنظلہ بن ربیع رسول اللہ ﷺ کے تمام کاتبوں کے خلیفہ اور نائب تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت حنظلہ کو یہ حکم تھا کہ خواہ کوئی رہے یا نہ رہے وہ ضرور رہیں تا کہ کاتبوں میں سے اتفاقاً وقت پر اگر کوئی نہ ملے تو کتابت وحی کے کام میں کوئی رکاوٹ نہ واقع ہو۔ اسی انتظام کا یہ نتیجہ تھا کہ نزول کے ساتھ ہی ہر قرآنی آیت قید کتابت میں آ کر قلمبند ہو جاتی تھی۔ ام المومنین ام سلمہؓ سے طبرانی کے حوالہ سے ''مجمع الزوائد'' میں یہ روایت ہیثمی نے نقل کی ہے:

قالت کان جبریل علیه السلام یملی علی النبی ﷺ (رواہ الطبرانی فی الاوسط مجمع الزوائد، جلد ۷۔ ص ۱۵۷)

ام سلمہ فرماتی ہیں کہ جبریل علیہ السلام قرآن مجید رسول اللہ ﷺ کو لکھواتے تھے۔

بظاہر اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اترنے کے ساتھ ہی جبریل کے سامنے رسول اللہ ﷺ نازل شدہ آیتوں کو لکھوا دیا کرتے تھے کیونکہ آنحضرت ﷺ جیسا کہ معلوم ہے نہ لکھنا جانتے تھے اور نہ قرآنی آیتوں کو خود لکھا کرتے تھے۔ انتہا اس احتیاط کی یہ تھی کہ جب ''غیر اولی الضرر'' کے الفاظ بطور اضافہ کے لا یستوی القاعدون الآیته والی مشہور آیت کے متعلق نازل ہوئے۔ مگر یہی اضافہ جو بقول امام مالکؒ حرف واحد کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اس ایک حرفی اضافہ کو بھی اسی وقت آنحضرت ﷺ نے قلم بند کرنے کا حکم دیا جس وقت وہ نازل ہوا۔ (دیکھو بخاری وغیرہ) امام مالکؒ نے ''حرف واحد'' اس کو ہارون سے ملاقات کے وقت کہا تھا (دیکھئے درمنثور، ج ۲ ص ۲۰۳)۔ احتیاط کا اقتضا یہ بھی تھا کہ لکھوانے پر صرف رسول اللہ ﷺ قناعت نہیں فرماتے تھے بلکہ کاتب جب لکھ لیتے تو آپ پڑھوا کر سنتے۔ کاتب وحی

Marfat.com

حضرت زید بن ثابتؓ کا بیان ہے کہ

فان کان فیہ سقط اقامہ (مجمع الزوائد، ج ا ص ٦٠)

اگر کوئی حرف یا نقطہ لکھنے سے چھوٹ جاتا تو اس کو رسول اللہ ﷺ درست کراتے۔ جب یہ سب کام پورا ہو جاتا تب اشاعت عام کا حکم دے دیا جاتا تھا۔ پھر جو لکھنا جانتے تھے لکھ لیا کرتے تھے اور زبانی یاد کرنے والے زبانی یاد کرلیا کرتے تھے۔ یہی مطلب ہے حضرت زیدؓ کے ان الفاظ کا کہ ثم اخرج بہ الی الناس (یعنی جب کتابت و تصحیح وغیرہ کے سارے مراتب ختم ہو جاتے تب ہم لوگوں میں اس کو نکالتے یعنی شائع کرتے)۔

مگر ظاہر ہے کہ ایسی زیر تصنیف متعدد کتابیں جو قرآنی سورتوں کے طریقہ سے تدریجی طور پر مکمل ہو رہی ہوں تو ان کے متعلق یہ خیال کہ وہ مسلسل لکھی جاتیں صحیح نہ ہوگا بلکہ قرآنی سورتوں کی آیتوں کے نزول کا جو حال تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً ان آیتوں کی حیثیت اس قسم کی یادداشتوں کی تھی جنہیں مصنفین اپنی پیش نظر تصانیف کے لئے پہلے جمع کرتے رہتے ہیں اور آہستہ آہستہ ان یادداشتوں کو ان کی متعلقہ کتابوں میں ترتیب کے ساتھ درج کرتے چلے جاتے ہیں۔

''ازالۃ الخفاء'' میں شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں۔ ''مثل آں کہ منشی منشآت خودرا یا شاعر قصائد و قطعات خودرا در بیاضہا و سفینہا مندرج سازد'' [۱۱] اور اسی سے ان دونوں روایتوں کا مطلب سمجھ میں آتا ہے جو اس سلسلہ میں پائی جاتی ہیں یعنی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً قرآن اس قسم کی چیزوں سے مثلاً رقاع (چمڑا) لخاف (پتھر کی سفید پتلی پتلی تختیاں) کتف (اونٹ کے مونڈھے کی گول ہڈی) اور عسیب (کھجور کی شاخوں کی جڑ کا وہ کشادہ عریض حصہ جس میں کانٹے والے پتے نہیں ہوتے) یہ اور اسی قسم کی چیزوں میں لکھا جاتا تھا اور اسی کے ساتھ یہ روایت مستدرک حاکم میں پائی جاتی ہے یعنی بعض صحابہ فرماتے تھے کہ

کنا عندالنبی صلی اللہ علیہ وسلم نولف القران فی الرقاع

ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھ کر رقاع (چرمی قطعات) میں قرآن کی تالیف کرتے تھے۔

دونوں روایتوں سے قرآن کی کتابت کے دو طبعی مرحلوں کا پتہ چلتا ہے یعنی پہلی صورت کے متعلق تو یوں سمجھیے کہ شاعر اپنے مختلف اشعار کو جیسے جیسے وہ تیار ہوتے چلے جاتے ہوں چھوٹے چھوٹے پرزوں پر نوٹ کرتا چلا جاتا ہے۔ پھر جب اس کام سے فارغ ہو جاتا ہے تب ان ہی یادداشتوں سے اپنی غزلوں کو مرتب کرتا ہے۔ جس شعر کا جس غزل سے تعلق ہوتا ہے اسی میں اس کو داخل کر دیتا ہے۔ سمجھنا چاہیے کہ کچھ یہی صورت قرآن کے متعلق اختیار کی گئی تھی البتہ اتنا فرق معلوم ہوتا ہے کہ عام لوگ کاغذ وغیرہ معمولی چیزوں پر اپنے منتشر اشعار یا خیالات کو ابتداءً بطور یادداشت کے لکھ لیا کرتے ہیں۔ گویا شاہ ولی اللہ کے الفاظ میں یادداشت کے ان کاغذی پرزوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ ''اگر آں کاغذ را آب برسد یا در وآتش بگیرد یا حامل آں بمیرد کامس ذاہب نابود گردد'' (یعنی اگر پانی کاغذ کے ان ٹکڑوں میں پہنچ جائے یا آگ لگ جائے یا جس کے پاس کاغذی یادداشتیں ہوں وہ مرجائے تو اس طرح ناپید ہو جائیں جیسے گذشتہ کل

Marfat.com

نابود ہو جاتا ہے۔ مگر آں حضرت صلعم نے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غایت احتیاط سے کام لیتے ہوئے وحی کی ان ابتدائی مکتوبہ یادداشتوں کے لکھوانے کے لئے ایسی چیزوں [۱۲] کا انتخاب فرمایا تھا جن کے متعلق یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ عام حوادث و آفات کا نسبتاً زیادہ مقابلہ کر سکتی ہیں۔ اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ خلافت صدیقی میں حکومت کی طرف سے زید بن ثابت صحابیؓ نے قرآن کا ایک نسخہ جو تیار کیا جس کا تفصیلی ذکر آگے آرہا ہے تو آں حضرت صلعم کی لکھائی ہوئی یہ ساری یادداشتیں بالکلیہ جوں کی توں اپنی اصلی حالت میں ان کو مل گئی تھیں۔ مکتوبہ یادداشتوں کے اس انبار سے یہ عجیب بات ہے کہ دس پانچ نہیں بلکہ دو تین بھی نہیں صرف سورہ برأت کی آخری حصہ کی ایک یادداشت جس میں صرف دو آیتیں تھیں یہی اور فقط یہی ایک یادداشتؒ والا ٹکڑا اس پورے ذخیرے میں ان کو نہ مل سکا' لیکن ظاہر ہے کہ صحابہ کرام کے سینوں میں اور ان کے ذاتی مکتوبہ قرآنی نسخوں میں یہ آیتیں موجود تھیں بلکہ بطور وظیفہ کے ان کے پڑھنے کا معلوم ہوتا ہے کہ عام رواج بھی تھا۔ [۱۳]

بہر حال اس وقت تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسی ایک ٹکڑے کے سوا جس میں سورہ برأت کی دو مشہور وردی آیتیں تھیں رسول اللہ ﷺ کی لکھائی ہوئی تمام ابتدائی یادداشتوں کا خلافت صدیقی کے زمانہ میں مل جانا خود بھی ایک ایسا واقعہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی چیزوں پر ان کے لکھنے کا انتظام کیا گیا تھا جو اتنی طویل مدت یعنی چوبیس پچیس سال تک حوادث و آفات سے محفوظ رہ سکیں اس لئے کہ نزول وحی کی ابتداء سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کے اس عہد تک جس میں قرآن کے متعلق حکومت کے حکم سے حضرت زید بن ثابتؓ نے کام کیا' اتنی ہی مدت ہونی چاہیے۔

بہر حال ایام جاہلیت کی تاریخ سے جو جاہل ہیں ان کا یہ خیال قطعاً بے بنیاد ہے کہ لکھنے کے سامان کی کمیابی کی وجہ سے رسول اللہ قرآن کی ابتدائی یادداشتوں کو اس قسم کی چیزوں یعنی چمڑے یا لخاف (سنگی باریک تختیوں) عیبہ (شاخ خرما کی جڑ کا عریض حصہ) کتف (شانہ شتر) وغیرہ پر لکھوایا کرتے تھے۔ یقیناً یہ وہی کہہ سکتا ہے جسے جاہلی عرب کے صحیح حالات کا علم نہیں ہے۔ تفصیل تو آگے آرہی ہے۔ کچھ نہیں تو ابھی مستدرک حاکم کی جو روایت گذری جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی آیات کی کتابت کے پہلے مرحلے کے بعد آنحضرت ﷺ کے اردگرد بیٹھ کر رقاع میں صحابہ قرآن کو جمع کرتے تھے اور رقاع جیسا کہ معلوم ہے رقعہ کی جمع ہے۔ یہ چمڑے کے خاص قسم کے ٹکڑے ہوتے تھے جو لکھنے ہی کے لئے تیار کیے جاتے تھے۔ گویا پارچمنٹ جسے عربی میں رق کہتے ہیں' اسی کی تعبیر رقاع کے لفظ سے کی گئی ہے یا پارچمنٹ ہی کی کسی خاص قسم کا نام رقاع تھا۔

آخر اس وقت رقاع [۱۴] سے جیسے کام لیا جاتا تھا ابتدائی کتابت کے وقت بھی کیا یہی رقاع نہیں مل سکتا تھا؟ حیرت ہوتی ہے کہ قرآن ہی میں لوگ یہود کے متعلق

كمثل الحمار يحمل اسفاراً

ان کی مثال اس گدھے کی ہے جو کتابیں لادے ہو۔

اور ان جیسی دوسری آیتیں پڑھتے ہیں اور اسی کے ساتھ یہ بھی باور کیے جاتے ہیں کہ عرب کتابی ساز و سامان سے بالکل

Marfat.com

خالی تھا۔ یہودیوں کو تو لکھنے کے لئے اتنا سامان مل سکتا تھا کہ گدھے بن کر اس کا بوجھ اپنی پیٹھ پر لاد سکتے تھے لیکن پیغمبر کو قرآن کے چند اوراق کے لئے وہی چیزیں نہیں مل سکتی تھیں، جن پر بارِ خر کے برابر یہ کتابیں لکھا کرتے تھے۔ مالکم کیف تحکمون۔

واقعہ یہ ہے کہ عرب کے ایامِ جاہلیت کی تاریخ سے جو واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس ملک کے شمال و جنوب[۱۵] میں کتب خانوں کے مختلف مراکز پائے جاتے تھے جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔ بہر حال ان تاریخی روایات کی روشنی میں قرآن کے اجمالی بیان کی یہ تشریح پیدا ہوتی ہے کہ قرآن کی ہر آیت کو ایک تو اس وقت لکھ لیا جاتا تھا جس وقت وہ نازل ہوتی تھی پھر ہر ہر سورہ مرتب ہونے کے بعد جس حد تک پہنچ جاتی تھی، رسول اللہ ﷺ اپنے صحابیوں کو لکھوا دیتے تھے۔[۱۵]

آنحضرت ﷺ کے پاس بیٹھ کر قرآن کے لکھنے کے جس کام کا ذکر مستدرک حاکم والی روایت میں کیا گیا ہے اس میں کتابت قرآن کی اسی دوسری منزل کا پتہ ان الفاظ میں جو دیا گیا ہے کہ وہ ''ہم تالیف کرتے تھے'' صحابہ کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف سورتوں میں جدید اضافے وحی کے ذریعہ جو ہوتے رہتے تھے ان اضافوں کو متعلقہ سورتوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے حکم سے آپ کے سامنے بیٹھ کر جوڑتے تھے اور یوں تدریجاً قرآن کی ان سورتوں کے وہ نسخے جو صحابہ کے پاس جمع ہوتے چلے جاتے تھے، مکمل ہوتے رہے۔[۱۶]

پس یہی نہیں کہ قرآن کو رسول اللہ ﷺ سے سیکھ کر صحابہ صرف زبانی ہی یاد کر لیا کرتے تھے بلکہ جو لکھنا جانتے تھے وہ آنحضرت ﷺ کے پاس بیٹھ کر جیسے جیسے سورتیں مکمل ہوتی چلی جاتی تھیں، ان کی نقل بھی لیتے چلے جاتے تھے اور آنحضرت کے منشاء کے مطابق ان کو مرتب کرتے جاتے تھے اسی لئے رسول اللہ ﷺ دنیا سے جس وقت تشریف لے گئے تو صحابہ کے سینوں میں بھی اور ان کے سفینوں میں بھی قرآن محفوظ تھا۔ سینوں کی حفاظت کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ عہد نبوت ہی میں بیر معونہ کا واقعہ پیش آیا تو جیسا کہ بخاری میں ہے شہید ہونے والوں کی تعداد ستر کے قریب تھی۔ دھوکہ دے کر کفار نے ان کو قتل کر دیا تھا اور یہ سارے کے سارے اقراء یعنی حافظ قرآن تھے۔ پھر آنحضرت ﷺ کی وفات کے کل ایک سال بعد عرب کی ایک مقامی یورش کو دبانے کے لئے عہد صدیقی میں یمامہ (نجد) فوجی دستہ بھیجا گیا تھا لیکن اتفاقاً کثیر تعداد شہید ہوگئی۔ اس میں بھی یہی بیان کیا گیا ہے کہ قرآن کے حفاظ کی تعداد جیسا کہ بخاری کے حاشیہ میں ہے۔

كان عدة من القراء سبعمائة (ج ۲۔ ص ۷۴۵)

قرآن کے حفاظ اس جنگ میں جتنے شہید ہوئے تھے ان کی تعداد سات سو تھی۔[۱۷]

ایک معمولی مقامی مہم میں شہید ہونے والوں کے اندر خیال تو کیجئے کہ جب سات سات سو صحابی ہوتے تھے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ صحابہ میں کتنی زیادہ تعداد حفاظ کی پائی جاتی تھی اور یہی حال مکتوبہ نسخوں کی کثرت کا معلوم ہوتا ہے جو ان ہی صحابیوں کے پاس موجود تھے۔ مکہ کے ابتدائی زمانہ ہی میں کون نہیں جانتا کہ حضرت عمرؓ اسلام میں اسی وجہ سے داخل

ہوئے تھے کہ ان کی بہن قرآن پڑھ رہی تھیں' انہوں نے اس کو چھیننا چاہا تو بہن نے انکار کر دیا۔ یہ واقعہ مشہور ہے اور سب جانتے ہیں۔[18] کچھ نہیں تو ابتداء اسلام کا یہی ایک واقعہ اس عامیانہ خیال کی تردید کے لئے کافی ہے کہ ابتدائی یادداشتوں کے سوا قرآن رسول اللہ ﷺ کے زمانہ تک کتابی شکل حاصل نہ کر سکا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ مسلمان عورتوں تک کے پاس قرآن کی نقلیں مکہ معظمہ ہی میں جب پائی جاتی تھیں تو زمانہ جیسے جیسے آگے کی طرف بڑھا کوئی وجہ ہوسکتی تھی کہ صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ سے قرآن کی نقل نہ حاصل کرتے ہوں۔ ذرا خیال تو کیجئے کہ بخاری وغیرہ میں لوگ یہ بھی پڑھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ صحابیوں کو منع فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کو لے کر دشمن کے علاقہ میں نہ جایا کرو۔ اگر مکتوبہ شکل میں قرآن کے نسخے صحابہ کے پاس موجود ہی نہ تھے تو اس حکم کے معنی کیا ہوں گے۔ اسی طرح روایتوں میں ہے کہ ناظرہ[19] یعنی دیکھ کر قرآن کے پڑھنے کا ثواب رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے کہ زیادہ ہے۔ کیا اس حکم کی تعمیل مکتوبہ قرآن کے بغیر ممکن تھی؟ پس واقعہ یہی ہے جیسا کہ صحابہ خود ہی بیان کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھ کر وہ قرآن کی نقل حاصل کیا کرتے تھے اور یوں بکثرت قرآنی سورتوں کی نقلیں صحابہ کے پاس موجود تھیں لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ قرآن کی یہ سورتیں جن کی حیثیت مستقل رسالوں اور کتابوں کی تھی' ان سب کو ایک ہی تقطیع اور سائز کے اوراق پر لکھوا کر ایک ہی جلد میں مجلد کرانے کا طریقہ رسول اللہؐ کے عہد میں مروج نہیں ہوا تھا بلکہ ایک ہی مصنف کی مختلف کتابیں الگ الگ جلدوں کی شکل میں جیسے آج کل چھپی ہوئی ملتی ہیں سمجھنا چاہیے کہ یہی حال گویا عموماً قرآن کی ان سورتوں کا تھا' اگرچہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انفرادی طور پر ایک سے زائد صحابیوں نے یہ کام بھی کر لیا تھا یعنی ایک ہی سائز پر لکھ کر ایک جلد کی صورت میں قرآن کو جمع کر لیا تھا لیکن اس کا عام رواج نہیں ہوا تھا۔[20] آنحضرت ﷺ کے بعد عہد صدیقی میں قرآن کی جو مشہور خدمت انجام دی گئی ہے اس کا تعلق اسی واقعہ سے ہے۔ میرا اشارہ بخاری وغیرہ کی اسی مشہور روایت کی طرف ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ یمامہ میں حفاظ قرآن کے شہداء کی غیر معمولی کثرت کو دیکھ کر حضرت عمرؓ کی درخواست پر صدیق اکبرؓ نے آنحضرت ﷺ کے خصوصی کاتب وحی زید بن ثابتؓ کو حکم دیا کہ ایک نسخہ قرآن کا وہ تیار کریں۔

نہ سمجھنے والوں نے خدا جانے اس روایت سے کیا کچھ سمجھ لیا اور عجیب وغریب نتائج پیدا کر لئے۔ بعض اس روایت کو پیش کر کے مدعی ہوگئے کہ قرآن نے کتابی قالب عہد صدیقی ہی میں اختیار کیا' ورنہ اس سے پہلے قرآن کی حیثیت زبانی یادداشتوں کی سی تھی مگر جو کچھ اب تک عرض کیا جا چکا ہے اس سے واقف ہونے کے بعد کوئی صاحب فہم لحہ بھر کے لئے کیا اس مغالطہ میں مبتلا رہ سکتا ہے؟ لوگ اتنا بھی نہیں سوچتے کہ فقط لکھوانے ہی کا اگر قصہ ہوتا تو حضرت عمرؓ کو حضرت ابوبکرؓ سے کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ تو خود لکھنا جانتے تھے۔ طرفہ ماجرا یہ ہے کہ ابوبکر صدیقؓ نے اس فرمان کے نافذ کرنے میں کشمکش کا اظہار کیا مگر بعد کو راضی ہوگئے۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں اس کام کو کیسے کروں جسے رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا۔ بخاری میں حضرت صدیق اکبرؓ کی طرف یہ الفاظ منسوب کئے گئے ہیں۔ کیف افعل شیئاً لم یفعله رسول الله صلى الله علیه وسلم (میں اس کام کو کیسے کروں جسے رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا۔)

کیسی عجیب بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا تو قاعدہ تھا کہ اُترنے کے ساتھ ہی قرآن کی ہر آیت کو

Marfat.com

لکھوا دیتے تھے۔ پھر حضرت ابوبکر کا یہ کہنا کہ ''رسول اللہ نے جس کام کو نہیں کیا۔ اس کام کو میں کیسے کروں'' اس کا کیا مطلب ہوسکتا ہے۔ اگر اس قصہ کا تعلق قرآن اور قرآنی سورتوں کے صرف لکھوانے اور قلمبند کرانے سے جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے' ہوتا۔

عہدِ صدیقی میں قرآنی خدمت کی صحیح نوعیت

پس اصل واقعہ وہی ہے کہ قرآن کی تمام سورتوں کو ایک ہی تقطیع اور سائز پر لکھوا کر ایک ہی جلد میں مجلد کرانے کا کام اور وہ بھی حکومت کی طرف سے اس کام کو انجام دلانا یہی ایسا کام تھا جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں نہیں ہو پایا تھا۔ حضرت عمرؓ اسی خدمت کو حکومت کی طرف سے انجام دلانے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ چاہتے تھے کہ خلافت اور حکومت اس مہم کو اپنے ہاتھ میں لے اور اپنی نگرانی میں اس کی تکمیل کرائے۔ بلاشبہ یہ ایک نیا اقدام تھا اور ابوبکرؓ کو اس اقدام کے متعلق اگر تردد ہوا تو اس کی یقیناً گنجائش تھی لیکن بعد کو خود ان کا فیصلہ بھی یہی ہوا کہ بجائے متفرق رسالوں کی صورت میں رہنے کے یہ زیادہ مناسب ہے کہ تمام قرآنی سورتوں کو ایک ہی تقطیع کے اوراق پر لکھوا کر ایک ہی جلد میں سب کو مجلد کرا دیا جائے۔ پھر جیسا کہ سب جانتے ہیں بخاری کی اسی روایت میں ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ کا حکومت کی طرف سے اس خدمت کے انجام دینے کے لئے ابوبکر صدیقؓ نے انتخاب فرمایا اور زید بن ثابتؓ نے بڑی محنت اور جانفشانی سے اس کام کو پورا کیا۔[۲۱] کام کی رپورٹ کرتے ہوئے زید بن ثابتؓ نے وہی باتیں کہیں جو آج بھی کتابوں کے نقل کرنے والے خصوصاً قرآن جیسی اہم کتابوں کے لکھنے والے اور چھاپنے والے عموماً کہا کرتے ہیں یعنی مختلف نسخوں کو بھی انہوں نے لکھتے وقت پیش نظر رکھا۔ اسی سلسلہ میں آنحضرت ﷺ کی لکھوائی ہوئی ابتدائی یادداشتیں جو رقاع' عسیب' لخاف وغیرہ پر تھیں' ان کو بھی انہوں نے اپنے سامنے لکھتے وقت رکھ لیا تھا۔ نیز ہر آیت کی تصحیح دو دو حافظوں سے بھی کرتے چلے جاتے تھے۔ البتہ وہی سورہ برأت کی آخر کی دو آیتیں ان کے متعلق رپورٹ میں انہوں نے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ آنحضرت ﷺ کی لکھائی ہوئی یادداشتوں میں وہ یادداشت نہ ملی جس میں یہ آیتیں لکھی ہوئی تھیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی بیان کیا کہ دو حافظوں کی تصحیح کی جو شرط تھی' اس شرط کی پابندی بھی ان آیتوں کے متعلق میں نے نہیں کی کہ رسول اللہ ﷺ سے براہ راست ان کو میں سنتا رہا اور ایک ایسے صحابی جن کی شہادت کو رسول اللہ ﷺ نے دو شہادتوں کے متساوی قرار دیا[۲۲] تھا یعنی خزیمہ[۲۳] بن ثابت انصاری کی تصحیح کو کافی سمجھا جس کی وجہ غالباً وہی تھی کہ سورہ برأت کی ان آیتوں کو بطور وظیفہ کے رسول اللہ ﷺ نے صحابیوں کو پڑھنے کا عام حکم دے رکھا تھا' اسی لئے عام طور پر یہ دونوں آیتیں جانی پہچانی تھیں۔

بہر حال حکومت کی جانب سے ایک ہی تقطیع کے اوراق پر تمام قرآنی سورتوں کے لکھوانے اور سب کو ایک ہی جلد میں مجلد کرانے کا مرحلہ تو عہد صدیقی ہی میں یعنی رسول اللہ ﷺ کی وفات کے ایک سال بعد ہی پورا ہو چکا تھا' علامہ قسطلانی شارح بخاری کے حوالہ سے الکتانی نے نقل کیا ہے کہ

Marfat.com

قد کان القران کلہ مکتوبا فی عھدہ صلی اللہ علیہ وسلم لکن غیر مجموع فی موضع واحد
(ج ۲ ص ۳۸۴۔ الکتانی)

قرآن کل کا کل رسول اللہ ﷺ کے زمانہ ہی میں لکھا جا چکا تھا البتہ ایک جگہ ساری سورتوں کو جمع نہیں کیا گیا تھا (یعنی ایک جلد میں جلد سازی اور شیرازہ بندی ان سورتوں کی نہیں ہوئی تھی۔)

حارث محاسبی نے جو امام حنبلؒ کے معاصر ہیں اپنی کتاب ''فہم السنن'' میں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے گھر میں قرآن کی یادداشتوں کا جو مجموعہ تھا۔

وکان القران فیھا منتشرا فجمعھا جامع وربطھا بخیط. (اتقان، ج ۱ ص ۸۳)

اسی میں قرآنی سورتیں الگ الگ لکھی ہوئی تھیں (ابوبکر کے حکم سے) جامع (یعنی زید بن ثابتؓ) نے ایک جگہ سب سورتوں کو جمع کیا اور ایک دھاگے سے سب کی شیرازہ بندی کی۔

اور یہی کام یعنی ایک جلد میں مجلد کرانے کا کام عہد صدیقی میں انجام پایا لیکن دوسروں کو بھی اسی کی تقلید پر یعنی ساری سورتوں کو ایک ہی تقطیع پر لکھوا کر ایک ہی جلد میں مجلد کرائیں اور سورتوں کی جلد بندی میں جو ترتیب رکھی گئی تھی اس کی پابندی کریں اس پر لوگوں کو مجبور نہیں کیا گیا تھا بلکہ ایک ہی مصنف کی چند کتابوں کو مختلف سائز کے اوراق پر جیسے لوگ چھاپتے ہیں اور کسی خاص ترتیب کی پابندی کے بغیر جس کے جی میں جس طرح آتا ہے ان کی جلد بندھواتا ہے۔ انفرادی آزادیوں کی کچھ یہی صورتحال حضرت عثمان ﷺ کی خلافت تک قرآنی سورتوں کے متعلق رہی۔ اس انفرادی آزادی میں حکومت نے دخل دینا مناسب خیال نہ کیا۔

عہد عثمانی میں قرآنی خدمت کی نوعیت

لیکن مختلف ممالک وامصار کے لوگ جب اسلام میں داخل ہوئے جن میں عرب ہی نہیں بلکہ بیرون عرب کی بھی ایسی بڑی آبادیاں شریک تھیں جن کی مادری زبان عربی نہ تھی عربی الفاظ وحروف کے صحیح تلفظ کی قدرت عموماً ان میں نہیں پائی جاتی تھی۔

لب ولہجہ کا اختلاف قبائل عرب اور عربی وغیر عربی مسلمانوں میں

نیز خود عرب میں بھی قبائلی اختلاف لب ولہجہ میں بکثرت پایا جاتا تھا اور اختلاف کی یہ نوعیت دنیا کی تمام زبانوں میں عام ہے۔ ابن قتیبہ نے لب ولہجہ کے قبائلی اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ

فالھذلی یقرء عتی حین والاسدی یقرء تعلمون بکسر والتمیمی یھمل والقریشی لا یھمل۔ [۲۴]

ہذلی یعنی بنی ہذیل کے قبیلہ والے (حتی حین) کو عتی عین پڑھتے ہیں اسی طرح تعلمون کی (ت) کو زیر کے ساتھ اسدی یعنی اسد والے تلفظ کرتے ہیں۔ اسی طرح تمیمی اہمال سے کام لیتا ہے قریشی یہ نہیں کرتا۔ اسی طرح تابوت کا تلفظ خود مدینہ والے ''تابوہ'' کرتے تھے۔ اور بھی اس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں۔ قرآن کے پڑھنے میں عربی قبائل

Marfat.com

اور عجمی نومسلموں کی طرف سے ان اختلاف کا جب ظہور ہوا اور ہر ایک اپنے تلفظ کی صحت پر اصرار بے جا کرنے لگا تو اس وقت حضرت حذیفہ بن یمان صحابیؓ کے مشورہ سے حضرت عثمانؓ نے اس نسخہ کی نقل کرانے کے لئے جو عہد صدیقی میں تیار ہوا تھا' حکومت کی طرف سے ایک سررشتہ قائم کر دیا۔ اس سررشتہ کے افسر وہی حضرت زید بن ثابتؓ ہی مقرر کئے گئے جنہوں نے عہد صدیقی میں نسخہ تیار کیا[۲۵] تھا' اور مزید گیارہ ارکان کا ان کی امداد کے لئے اضافہ کیا گیا اور حکم دیا گیا کہ کتابت کی حد تک قرآن کو اسی لہجہ اور تلفظ میں لکھا جائے جو رسول اللہ ﷺ کا تلفظ اور لہجہ تھا۔ اسی سررشتہ نے صدیقی نسخہ کی چند نقلیں تیار کیں۔ پھر حضرت عثمانؓ نے ایک ایک نُسخہ سررشتہ کا تیار کیا ہوا مختلف صوبوں کے پایہ تخت اور چھاؤنیوں میں بھیج کر فرمان جاری کر دیا کہ اپنے اپنے قبائل یا انفرادی لہجوں یا تلفظ کے لحاظ سے لکھے ہوئے قرآنی نسخے لوگوں کے پاس جو موجود ہوں' وہ حکومت کے حوالے کر دیئے جائیں تا کہ ان نسخوں کو معدوم کر دیا جائے۔

حضرت عثمانؓ کے عہد میں قرآن شریف کی خدمت یہی اور صرف یہی ہوئی ہے جو بجائے خود بہت بڑی اور اہم خدمت ہے ورنہ مختلف عربی قبائل اور عجمیوں کے طریقہ ادا لب ولہجہ کے اختلاف کی بنیاد پر لکھے ہوئے قرآنی نسخے خدانخواستہ اگر دنیا میں پھیل جاتے تو خدا ہی جانتا ہے کہ دشمنان اسلام اس بات کو بتنگڑ بنا کر کہاں سے کہاں پہنچا دیتے۔ حضرت عثمانؓ کا مسلمانوں پر بہت بڑا احسان ہے کہ لکھاوٹ یعنی نوشت وکتابت کی حد تک انہوں نے قرآن میں وحدت کا رنگ پیدا کر دیا۔ رہا تلفظ تو ظاہر ہے کہ اس میں وحدت اور یکسانی کا مطالبہ ان کے بس کی بات تھی بھی نہیں اسی لئے اس مطالبہ کو نظر انداز کر دیا گیا اور آزادی بخشی گئی کہ جس کا جو تلفظ ہے یا تلفظ کی جس نوعیت پر جو قادر ہے اسی تلفظ اور لب ولہجہ میں قرآن شریف کو وہ پڑھ سکتا ہے۔ ایک حدیث بھی رسول اللہ ﷺ کی موجود تھی جس میں فیصلہ فرما دیا گیا تھا کہ قرآن مجید ایک ہی ''حرف'' یعنی تلفظ پر نازل نہیں ہوا ہے بلکہ ''سبعۃ احرف''[۲۶] یعنی متعدد تلفظ کی اس میں گنجائش ہے۔ اگرچہ کوشش تو اسی کی کرنی چاہیے کہ اسی لب ولہجہ میں قرآن کی تلاوت ہر مسلمان کو میسر ہو جو رسول اکرم صلعم کا لب ولہجہ تھا اسی لئے تجوید اور قرأت کا ایک مستقل فن ابتدا ہی سے مسلمانوں میں مروج ہو گیا اور عبرت کے لئے (یعنی یہ بتانے کے لئے کہ کوشش کی جائے تو غیر عربی آدمی بھی رسول اللہ ﷺ کے قریشی لب ولہجہ میں قرآن پڑھ سکتا ہے) قرأت وتجوید کے لئے اسی قسم کے لوگوں کا عہد صحابہ وتابعین ہی میں عموماً انتخاب کیا گیا جو نسلاً عرب نہ تھے۔ فن قرأت کے ائمہ بعد کو یہی عجمی نژاد قاریوں کی جماعت ہوئی۔[۲۷]

بہرحال حضرت عثمانؓ کے زمانہ کا کارنامہ قرآن کے متعلق جو کچھ بھی ہے وہ یہی ہے کہ کتابت اور لکھاوٹ کی حد تک تلفظ اور لب ولہجہ کے جھگڑوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا گیا اور یہ کام بھی رسول اللہ ﷺ کی وفات کے تقریباً کل چودہ پندرہ سال بعد انجام پایا۔ آج ممکن ہے کہ خلافت عثمانی کے عہد کی اس قرآنی خدمت کی قیمت واہمیت کا لوگوں کو صحیح اندازہ نہ ہو سکے لیکن ذرا سوچئے تو سہی کہ ابتداء ہی میں مسلمانوں کو کتابت کی اسی ایک شکل پر جمع نہ کر دیا جاتا تو نتیجہ کیا ہوتا؟

عجمی مسلمانوں کو تو ابھی جانے دیجئے خود عربی قبائل میں تلفظ اور لہجوں کے اختلافات کیا معمولی تھے؟ قرآنی آیت ''قد جعل ربک تحتک سریا'' کو قبیلہ قیس والے ''جوک'' تانیث کا تلفظ ''ش'' سے کرتے تھے۔ ظاہر

Marfat.com

ہے کہ اس بنیاد پر یہی آیت قیس کے قبیلہ والوں کے قرآن میں بایں شکل لکھی ہوئی ملتی یعنی قد جعل ربش تحتش سریا ۔ قیس کے اس طرز تلفظ کا اصطلاحی نام کشکشہ قیس تھا۔ اسی طرح تمیم والے ان کے لفظ کو ''عن'' کی شکل میں ادا کرتے تھے۔ اس کا نام عنعنہ تمیم تھا۔ مثلاً عسی اللہ ان یاتی بالفتح کو عسی اللہ عن یاتی بالفتح کی شکل میں وہ ادا کرتے تھے اور سب سے دلچسپ اس قبیلہ کا تلفظ تھا جو س کے حرف کو ''ت'' کی شکل میں ادا کیا کرتا تھا۔ اسی وجہ سے پوری سورہ والناس کی ہر آیت کے آخری لفظ میں بجائے ا''س'' کے ان کے قرآن میں ہم گویا ''ت'' کو پاتے' مثلاً قل اعوذ برب النات الخ۔ اس معاملہ میں لوگ اس درجہ مجبور تھے کہ ابن مسعودؓ جیسے جلیل القدر صحابی جو اصلاً ونسلاً ذہلی قبیلہ سے تھے ان تک کو حضرت عمرؓ نے اس لئے ٹوکا کہ وہ ''حتی حین'' کا تلفظ ''عتی صین'' کی شکل میں کر رہے تھے۔ [۲۸]

جب خالص عربی قبائل کا یہ حال تھا تو بیچارے عجمیوں میں پہنچ کر قرآنی نسخوں کی جو حالت ہوتی وہ ظاہر ہے۔ دور کیوں جایئے ہندوستان ہی کا نتیجہ کیا ہوتا۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ اس صورت میں جتنے قرآن پنجاب میں طبع ہوتے ان میں ہر جگہ بجائے ''ق'' کے ''ک'' ہی چھاپا جاتا اسی طرح دکن میں جو قرآن چھپتے ''ق'' کی جگہ ''خ'' اور ''خ'' کی جگہ ق لوگوں کو ہر جگہ نظر آتا اور اس قسم کے اختلافات کو کون گن سکتا ہے۔ ہر تھوڑے فاصلہ سے تلفظ اور لہجے کے یہ اختلافات زبانوں میں پیدا ہی ہو جاتے ہیں۔

جب حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ مدرسہ کے معلمین جو مختلف لہجوں میں قرآن پڑھاتے تھے انہی میں کفر بعضھم بعضاً [۲۹] کی نوبت تک آ گئی تھی تو سمجھا جا سکتا ہے کہ آگے بڑھ کر یہی اختلافات مسلمانوں کو خطرہ کے کس نقطہ تک پہنچا دیتے؟

حضرت عثمانؓ کیا جامع القرآن تھے؟

واقعہ یہ ہے کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر حضرت عثمانؓ کی حکومت کی اس عظیم و جلیل خدمت کے مسلمان بہت ممنون نظر آتے ہیں اور عموماً اس کا تذکرہ کرتے ہیں حتیٰ کہ خود حضرت علیؓ فرماتے تھے کہ ''حضرت عثمان نے بہت اچھا کیا اور جو کچھ کیا ہم سب کے مشورہ سے کیا'' انہوں نے پوچھا کہ مسلمانوں میں یہ جھگڑا جو چھڑ گیا ہے کہ ہر ایک اپنی قرأت کو دوسروں کی قرأت سے بہتر قرار دیتا ہے بلکہ دوسرے کی قرأت کو کفر کی حد تک بھی پہنچا دیا جاتا ہے اس کا علاج کیا کیا جائے۔ ہم لوگوں نے پوچھا آپ نے کیا علاج سوچا ہے۔ عثمانؓ نے کہا

اری ان نجمع الناس علیٰ مصحف واحد [۳۰]

میں خیال کرتا ہوں کہ لوگوں کو ایک ہی مصحف پر جمع کر دیا جائے۔

یہی ''جمع الناس علی مصحف واحد'' عہد عثمانی کی قرآنی خدمت کی صحیح تعبیر ہے یعنی مسلمانوں کو ایک ہی مصحف پر آپ نے جمع کر دیا۔ عوام نے ان کے اسی خطاب کو ''جامع القرآن'' [۳۱] کے نام سے مشہور کر دیا جو نہ صرف یہی کہ واقعہ کی صحیح تعبیر نہیں ہے بلکہ سچی بات یہ ہے کہ عام طور پر اس تعبیر سے بڑی غلط فہمی پھیل گئی۔ لوگ سمجھنے لگے کہ حضرت عثمانؓ سے پہلے گویا قرآن جمع کیا ہوا یا لکھا ہوا نہ تھا اور یہ تو خیر ایک تعبیری غلطی ہے۔ بجائے ''جامع

Marfat.com

القرآن'' کے ''جامع الناس علی القرآن'' سے جیسا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہ' نے فرمایا اس کی اصلاح ہوسکتی ہے مگر یہی قصہ یعنی حضرت عثمان کی طرف قرآن کی اسی خدمت کا انتساب اور اس کی شہرت ایک بڑے فتنے کا مقدمہ بن گئی اور اب ہم اسی فتنے کے متعلق جیسا کہ مولانا گیلانی نے لکھا ہے' کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔

ایک بڑے فتنہ کا سد باب

بنی امیہ نے اسلامی حکومت پر قبضہ کر کے جب خلافت کو سلطنت کی شکل میں بدل دیا اور روم و ایران کے حکمرانوں کو نمونہ بنا کر حکومت کرنے لگے تو مسلمانوں میں قدرتاً جیسا کہ چاہیے تھا' بے چینی پیدا ہوئی اور اس نے ایک عام کشمکش کی شکل حکومت اور عوام کے درمیان پیدا کر دی۔ اس کشمکش کے دبانے کے سلسلے میں جو بے پناہ مظالم بنی امیہ کے حکمرانوں کی طرف سے مسلمانوں پر توڑے گئے ان کے لئے صرف ایک حجاج ہی کا نام کافی ہوسکتا ہے جس نے ایک لاکھ سے اوپر مسلمانوں کو صبراً (سامنے باندھ کر) قتل کروایا۔ اسی کشمکش کے سلسلہ میں لعنت و ملامت کا قصہ جب دراز ہوا تو بنی امیہ سے آگے بڑھ کر بعض خفیف العقل گرم مزاج لوگوں کی زبانیں حضرت عثمانؓ پر بھی کھلنے لگیں کیونکہ بنی امیہ والے آپ کے نام اور خاندانی تعلق سے ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے۔ مسلمانوں پر احسان جتاتے تھے کہ ہمارے خاندان ہی نے تمہارے قرآن کو محفوظ کر دیا' ورنہ تمہارے مذہب کی بنیاد ہی ختم ہو جاتی اور اشارہ حضرت عثمانؓ کے عہد حکومت کی اسی قرآنی خدمت کی طرف کیا جاتا۔ عبدالملک ابن مروان برسر منبر مسلمانوں سے کہتا۔

علیکم بمصحف امامکم المظلوم [۳۲]

مسلمانو! اپنے مظلوم امام وخلیفہ (یعنی عثمانؓ) کے مصحف کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہو۔

ظاہر ہے کہ قرآن جو نہ بے چارے حضرت عثمان پر نازل ہوا تھا نہ انہوں نے اس کو ابتداءً لکھوایا تھا حتیٰ کہ ایک جلد میں تمام سورتوں کو مجلد کرانے کا کام بھی ان کی حکومت کی طرف سے نہیں انجام پایا تھا۔ البتہ آخر میں بجائے مختلف لہجوں کے کتابت کی حد تک مسلمانوں کو ایک ہی نسخہ پر جمع کرنے کا انتظام اپنی حکومت کی طرف سے کر دیا تھا محض اس لئے اس قرآن کو جس کو اللہ نے نازل کیا اور محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا امام مظلوم کا مصحف اور قرآن قرار دینا مسلمانوں کو برہم کر دینے کے لئے کافی تھا۔ ردعمل آخر اس کا اس شکل میں ہوا کہ حضرت عثمانؓ کی قرآنی خدمت کی اہمیت ہی کو لوگ گھٹانے لگے اور فریق مخالف میں جو زیادہ تند خو گرم مزاج تھے وہ حضرت عثمان پر الٹ کر طرح طرح کے الزامات بھی تھوپنے لگے اور جو قرآن خالق عالم کی طرف سے آخری پیغمبر محمد رسول اللہ ﷺ پر سارے جہان کے انسانوں کے لئے اترا تھا اس کا نام ہی ان لوگوں نے ''بیاض عثمانی'' العیاذ باللہ رکھ دیا جو ''مصحف امام مظلوم'' کے کلوخ کی پاداش بہ شکل ''سنگ'' تھی۔ سچ پوچھئے تو بنی امیہ کے اسی طرز عمل کی مخالفت میں بعض ناعاقبت اندیش لوگوں نے مسلمانوں میں بعض جعلی بے سروپا روایتیں خود ہی گھڑ گھڑ کر پھیلا دیں اور ان میں جو زیادہ چالاک تھے جانتے تھے کہ جعلی روایتوں کا پردہ بآسانی چاک ہو جائے گا۔ انہوں نے بعض صحیح اور ثابت روایتوں کو غلط مقصد کے لئے استعمال کیا۔ ان لوگوں کی یہ دوسری تدبیر زیادہ کارگر ثابت ہوئی۔ اچھے اچھے لوگ ان مغالطوں کے شکار ہو گئے۔ اس سلسلہ میں مولانا گیلانی نے جو

Marfat.com

کچھ ارقام فرمایا ہے اس کا خلاصہ درج کرتا ہوں۔

سہولت کے لئے روایات کے اس ذخیرہ کو دو حصوں پر تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ ایک حصہ تو ان خود تراشیدہ فرضی روایات کا ہے۔ مولانا نے جن کی تعبیر مضحکات کے لفظ سے کی ہے کیونکہ ان کو سن کر کوئی شخص اپنی ہنسی مشکل ہی سے ضبط کر سکتا ہے اور جن صحیح روایات سے ناجائز نفع اٹھاتے ہوئے مغالطہ دینے کی کوشش کی گئی ان کے لئے ''مغالطات'' کا عنوان قائم کیا جائے گا۔

مضحکات

۱۔ کہا جاتا ہے کہ قرآنی آیت قفوهم انهم مسئولون کے آخر میں عن ولایة علی کے الفاظ تھے جنہیں عہد عثمانی میں قصداً قرآن سے خارج کر دیا گیا یعنی قرآن میں یہ لکھا ہوا تھا کہ میدان حشر میں لوگوں کو کھڑا کر کے علیؓ کی ولایت کے متعلق پوچھا جائے گا۔

۲۔ اسی طرح کوئی صاحب محمد بن جہم الہلالی تھے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کی طرف منسوب کر کے انہوں نے یہ مشہور کیا کہ قرآنی آیت امة هی اربی من امة میں تحریف کی گئی ہے۔ اصلی الفاظ ائمتنا هی ازکی من ائمتکم [۳۳] تھے۔

۳۔ اسی طرح کہتے ہیں کہ قرآن میں قبیلہ قریش کے ستر نام بقید نسب موجود تھے۔ حضرت عثمانؓ نے سب کو ساقط فرما دیا۔

۴۔ اسی طرح '' کفی الله المؤمنین القتال '' کی آیت میں کہتے ہیں کہ علی ابن طالب کے الفاظ بھی تھے۔ [۳۴] اسی قسم کی بیسیوں [۳۵] خرافات اس طبقہ کی طرف سے پھیلائی گئیں۔ اگر مسلمانوں کے پاس روایتوں کے جانچنے کا خاص طریقہ راویوں کی تحقیق کے متعلق نہ ہوتا تو ان جھوٹی قطعاً جعلی روایتوں کے متعلق بے بنیاد اور محض گپ ہونے کا فیصلہ آسان نہ ہوتا۔ ان لوگوں نے حد کر دی کہ الفاظ ہی نہیں بلکہ کہتے ہیں کہ سورہ ولایت کے نام سے ایک مستقل سورت ہی قرآن میں تھی جس میں اہل بیت کے اسماء اور ان کے حقوق وغیرہ کا تفصیلی ذکر تھا۔ حضرت عثمانؓ نے اس پوری سورت ہی کو حذف کر دیا۔ بہر حال اس شیعی عالم نے جس کا پہلے بھی میں نے ذکر کیا ہے یعنی علامہ طبرسی نے ان ساری گپوں پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے۔

الزيادة في القرآن مجمع عليه علىٰ بطلانها واما النقصان فقد روى عن قوم من اصحابنا وعن قوم من حشوية العامة والصحيح خلاف ذلك

قرآن میں (غیر قرآنی عنصر کا) اضافہ یہ مسئلہ تو اجماعی و اتفاقی ہے (شیعوں اور سنیوں دونوں کا) کہ ایسا نہیں ہوا باقی کمی (یعنی قرآن کی کچھ آیتیں حذف ہو گئیں) سو ہمارے یہاں کے بعض لوگ (یعنی بعض شیعی مسلک رکھنے والے) اور عامہ یعنی سنیوں کے بعض حشویہ سے اس کا دعویٰ منقول ہے لیکن صحیح یہی ہے کہ یہ بھی غلط ہے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ ''ان علینا جمعه'' [۳۶] کی ذمہ داری جب خود خدا لے چکا ہے اور بالاتفاق شیعہ و

Marfat.com

سنّی دونوں کے نزدیک یہ قرآن کی آیت ہے تو قرآن سے کسی چیز کے نکل جانے کے دعویٰ کے بعد آدمی مسلمان ہی کب باقی رہتا ہے۔ بقول شیعی عالم علامہ طبرسی تواتر و توارث کی جس راہ سے قرآن مجید منتقل ہوتا ہوا چلا آ رہا ہے' اس کا مقابلہ بھلا یہ خود تراشیدہ افسانے کہاں تک کر سکتے ہیں۔

مغالطات

رہا روایتوں کا دوسرا حصہ جنہیں مولانا گیلانی نے مغالطات کا نام دیا ہے۔ دراصل انہی کی طرف طبرسی نے اشارہ کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ عامہ کے حشویہ یعنی اہل سنت کے محدثین میں بھی نقص کی بعض روایتیں پائی جاتی ہیں یعنی ان سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی بعض آیتیں جو پہلے قرآن میں شریک تھیں بعد کو حذف ہو گئیں لیکن ابھی آپ کو معلوم ہوگا کہ بجائے خود یہ روایتیں غلط نہیں ہیں بلکہ ان سے جو نتیجہ پیدا کیا گیا وہ بدنیتی یا کم از کم غلط فہمی پر ضرور مبنی ہے۔ بقدر ضرورت ان میں جو چیزیں قابل ذکر ہیں ان کا قصہ بھی سن لیجئے۔

اس سلسلہ میں مختلف نوعیت کی روایتیں ہیں۔ مثلاً

(ا) بعض روایتوں میں کسی غیر قرآنی حکم کا ذکر کرتے ہوئے اس قسم کے الفاظ یعنی

فی ماانزل من القرآن

یہ اسی سلسلہ اور راہ کی چیز ہے جس راہ سے قرآن نازل ہوا۔

حدیث رضاعت

جیسے الفاظ راوی نے بڑھا دیئے ہیں اس کی مثال رضاعت والی روایت جو عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے۔ الفاظ جس کے یہ ہیں' یعنی وہ فرماتی تھیں کہ

فیما انزل من القرآن عشر رضاعات معلومات یحرمن ثم ینسخن بخمس معلومات فتوفی صلی الله علیه وسلم وهی فیما یقرء من القرآن.

ان ہی باتوں میں جو اسی راہ سے نازل ہوئی ہیں جس راہ سے قرآن نازل ہوا یہ حکم بھی تھا کہ دس گھونٹ یا دس دفعہ پینا حرام کر دیا ہے۔ پھر منسوخ ہو گیا یہ حکم ''پانچ مقرر گھونٹ سے'' اور وفات پا گئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور یہ حکم ان ہی باتوں میں شریک تھا جن میں قرآنی حکم شریک ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ بجز بخاری کے صحاح ستہ کی عام کتابوں میں یہ روایت پائی جاتی ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ فی ماانزل من القرآن یا فی مایقرء من القرآن کے الفاظ سے یہ کیسے سمجھ لیا گیا کہ یہ قرآن کے اجزاء تھے۔ تفصیل کے لیے تو مولانا گیلانی کی اصل کتاب کا مطالعہ مناسب ہوگا' یہاں اسی کتاب سے اخذ کر کے بقدر ضرورت بحث کی جاتی ہے۔

آخر اتنی بات سے تو ہر پڑھا لکھا مسلمان واقف ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جو احکام و

Marfat.com

قوانین امت کو عطا کیے جاتے تھے' ان میں ایک سلسلہ تو ان احکام کا تھا جن کی تعلیم حق تعالیٰ کی طرف سے جبریل علیہ السلام آنحضرت ﷺ کو دیا کرتے تھے اور دوسرا سلسلہ احکام ہی کا ایسا بھی تھا جن میں پیغمبر خود اپنے اجتہاد سے کام لیتے تھے اگرچہ "ان ھو الا وحی یوحی" کے لحاظ سے ہم دونوں کو وحی ہی سمجھتے ہیں۔ بہرحال ظاہر ہے کہ وحی کا وہ سلسلہ جو جبرائیؑ امین کی راہ سے جاری تھا وہ اپنی الگ نوعیت رکھتا تھا۔ پھر جبریل امین کی راہ سے جو چیزیں آ رہی تھیں ہر ایک جانتا ہے کہ ان کی بھی دو قسمیں تھیں یعنی ایک تو قرآن اور قرآنی آیات کا سلسلہ اور دوسرا سلسلہ جبریلؑ امین ہی کے ذریعہ سے وہ بھی جاری تھا جو قرآن کا جز نہیں بنتا تھا۔ گویا منطقی طور پر یوں کہہ لیجئے کہ قرآن تو وہ ہے جو جبریل کے ذریعہ نازل ہوا لیکن ہر وہ چیز جو جبریل کے ذریعہ سے نازل ہوتی تھی اس کا قرآن ہونا ضروری نہ تھا۔ آخر ایمان' اسلام واحسان کے متعلق سوال وجواب کا جو قصہ بخاری وغیرہ میں ہے اور آنحضرت ﷺ نے جس کے متعلق فرمایا کہ

اتاکم جبرئیل یعلمکم دینکم

تمہارے پاس جبریل آئے تھے' تم کو تمہارا دین سکھانے کے لیے۔

ظاہر ہے کہ جبریل نے اس وقت جو کچھ دین کے متعلق سکھلایا تھا یقیناً وہ قرآن میں شریک نہیں کیا گیا اور یہی ایک روایت کیا اکثر چیزیں اسی قسم کی بتوسط جبریل علیہ السلام آنحضرت ﷺ پر نازل ہوئیں لیکن وہ قرآن میں شریک ہونے کے لیے نازل نہیں ہوئی تھیں اسی لیے قرآن میں شریک نہیں کی گئیں۔

اسی بنیاد پر فی ما انزل فی القرآن سے راوی کا مقصد یہ ہے کہ یہ مسئلہ آنحضرت ﷺ کے اجتہادی مسائل میں سے نہ تھا بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ جس راہ سے قرآن نازل ہوا ہے اسی راستہ سے یہ حکم بھی اللہ تعالیٰ کے رسول تک پہنچا تھا۔ اور یہ کہ قرآن کو جس راہ کی چیز سمجھ کر پڑھا جاتا ہے اسی راہ کی چیز یہ بھی ہے اور یہی معنی ہیں فیما یقرء من القرآن کے۔ یعنی جو کچھ قرآن میں پڑھا جاتا ہے جس راہ سے وہ آیا اسی راہ کی چیز یہ بھی ہے۔

رجم کی روایت

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ دلچسپ وہ روایت ہے جس میں رجم کا ذکر ہے یعنی شادی شدہ آدمی سے زنا کا صدور جب ہو تو سنگساری کا حکم اسلام میں جو دیا گیا ہے اس کے متعلق بخاری شریف میں ایک طویل حدیث اس سلسلہ میں پائی جاتی ہے۔ حاصل جس کا یہ ہے کہ حج کے موسم میں حضرت عمرؓ کو اس کی خبر ملی کہ بعض لوگ ان کی وفات کے بعد خلافت کے متعلق کچھ منصوبے پہلے سے پکا رہے ہیں اور حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب پر کچھ اعتراض بھی کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے پہلے تو چاہا کہ حج ہی کے موقعہ پر ایک تقریر کریں لیکن بعد کو رائے بدل گئی اور مدینہ پہنچ کر آپ نے جمعہ کے خطبہ میں ان ہی باتوں کا ذکر فرمایا جن کا تذکرہ حج کے موقعہ پر کرنا چاہتے تھے۔ یہ بڑی طویل تقریر ہے جس میں بہت سی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ اسی میں ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کا بھی ذکر آپ نے فرمایا اور مسلمانوں کو اس کی وصیت کرتے ہوئے کہ میرا کیا ٹھکانہ ہے آج ہوں کل نہ ہوں اس لیے چند ضروری باتوں کا اظہار ضروری خیال کرتا ہوں۔ اسی سلسلہ میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ رجم کا قانون اگرچہ قرآن میں نہیں پایا جاتا مگر میں گواہی دیتا ہوں کہ

کان مما انزل اللہ

یہ قانون بھی ان ہی باتوں میں سے ہے جنہیں اللہ نے نازل فرمایا۔

پھر یہ بھی فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ سے اس قانون کو ہم نے سیکھا پڑھا اور یاد کیا۔ خود رسول اللہ ﷺ نے اس پر عمل بھی کیا اور آپ کے بعد ہم نے بھی رجم کیا۔ اسی کے بعد آپ نے زور دے کر کہا کہ قرآن میں نہ ہونے کی وجہ سے کسی کو یہ مغالطہ نہ ہو کہ یہ خدا کے نازل فرمودہ قوانین میں نہیں ہے بلکہ یہ خدا ہی کا برحق اور اسی کا واجب کیا ہوا قانون ہے۔ آخر میں فرمایا کہ پس چاہیے کہ مرد ہوں یا عورت، شادی شدہ ہونے کے بعد جو بھی زنا کا ارتکاب کرے اور ثابت ہو جائے تو اس کو رجم (سنگسار) کیا جائے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اسی کے بعد آپ نے یہ بھی فرمایا کہ

انا کنا نقرء فیما نقرء من کتاب اللہ ان لاترغبوا عن ابائکم فانہ کفرلکم ان ترغبوا عن ابائکم

جس راہ کی چیز سمجھ کر کتاب اللہ (قرآن) کو ہم پڑھتے ہیں اسی سلسلے کی چیزوں میں ہم یہ بھی پڑھتے تھے کہ اپنے باپوں سے اعراض نہ کرو، کیونکہ اپنے باپوں سے اعراض تمہارے لیے کفر ہے۔

پھر آپ نے یہ بھی فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے بھی منع فرمایا ہے کہ جیسے عیسائی حضرت عیسیٰ کی تعریف میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں اور حد سے تجاوز کر جاتے ہیں تم بھی میری تعریف میں اس قسم کے اطراء وغلو سے کام نہ لینا۔

میں نے اس دوسری بات کو عجیب بات اس لیے کہا کہ رجم کے متعلق تو صرف مما انزل اللہ حضرت عمرؓ نے کہا تھا مگر یہ کہ باپوں سے اعراض کرنے کے متعلق جو الفاظ آپ نے فرمائے اس میں تو کنا نقرء فیما نقرء من کتاب اللہ [37] کے الفاظ ہیں لیکن ان الفاظ کے متعلق مسلمانوں میں اس کا کسی زمانہ میں کسی نے بھی چرچا نہ کیا جیسا کہ رجم والے الفاظ کے متعلق پھیلا دیا گیا کہ پہلے وہ قرآن میں موجود تھے اور طرفہ تماشا یہ دعویٰ ہے کہ قرآن سے الفاظ تو خارج کر دیئے گئے لیکن قانون کو جیسا کہ سب جانتے ہیں قیامت تک کے لیے باقی رکھا گیا اور بس کرنے والوں نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ الفاظ کا ایک مجموعہ بھی بنا لیا گیا جو مدرسوں میں آج تک مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قرآن میں قانون رجم کے متعلق یہی الفاظ تھے۔ الفاظ کا وہ مجموعہ یہ ہے:

الشیخ و الشیخۃ اذازنیا فارجموھما

کوئی بڈھا اور بڈھی جب زنا کریں تو دونوں کو سنگسار کر دو۔

بعضوں میں ''البتۃ'' کے لفظ کا اضافہ بھی پایا جاتا ہے۔ بہرحال صحیحین (بخاری ومسلم) میں یہ الشیخ والشیخۃ والی روایت نہیں پائی جاتی بلکہ ابوداؤد، ترمذی وغیرہ میں بھی نہیں ہے۔ ماسوا اس کے اس روایت کے راویوں کی حالت کیا ہے اس سے اگر قطع نظر بھی کر لیا جائے پھر بھی بقول مولانا گیلانی اس کو قرآن مجید کا گویا معجزہ ہی خیال کرنا چاہیے کہ روایت کے الفاظ ہی سے اس قانون کی تردید ہو جاتی ہے جس کے لیے بنانے والوں نے ان عجیب وغریب الفاظ کے مجموعہ کو بنایا ہے۔ آپ سن چکے اور دنیا جانتی ہے حضرت عمرؓ کے الفاظ ابھی گذرے ہیں کہ رجم کا قانون شادی شدہ

Marfat.com

مردوں اور عورتوں کے لیے ہی ہے" مگر اب ذرا روایت کے ان الفاظ پر غور کیجیے۔ الشیخ (بڈھا) الشیخۃ (بڈھی) ایسے الفاظ ہیں جن کے لیے ضروری نہیں کہ وہ شادی شدہ ہوں۔ پھر نتیجہ کیا ہوا۔ ایسے بڈھے اور بڈھی عورت جن کی شادی نہیں ہوئی ہو۔ ان الفاظ کی بنیاد پر چاہیے کہ ارتکاب زنا کے جرم میں سنگسار کردیے جائیں اور جوان مرد اور ان عورت شادی شدہ ہی کیوں نہ ہوں چونکہ الشیخ اور الشیخۃ کے الفاظ ان پر صادق نہیں آتے اس لیے رجم کا قانون ان کے لیے باقی نہ رہا اور یہی کیا رجم کا قانون اس روایت کی بنا پر صرف اسی زنا سے متعلق ہوگا جب طرفین بڈھے اور بڈھی ہوں لیکن ایک طرف بڈھا اور دوسری طرف جوان یا بالعکس ہو تو اس پر بھی یہ قانون عائد نہ ہوگا اور سچی بات تو یہ ہے کہ شیخوخت عربی زبان میں عمر کے جس حصہ کی تعبیر ہے' یہ عمر کا وہ زمانہ ہے جس میں عموماً جنسی خواہش کا زور کم کیا بلکہ بسا اوقات مفقود بلکہ حد نفرت کو بھی پہنچ جاتا ہے۔ جوان عورت کے ساتھ تو ممکن ہے کوئی بڈھا مشغول ہوجائے یا بالعکس میں بھی امکان ہے مگر جب دونوں پھوس بوڑھے ہوں یعنی الشیخ والشیخۃ بن چکے ہوں تو زنا کے صدور کا امکان ہی کیا باقی رہتا ہے۔ پس مطلب یہ ہوا کہ سرے سے رجم کا قانون ہی غیر عملی بن کر ان الفاظ کی بنیاد پر رہ جاتا ہے۔ کیا تماشا ہے کہ رجم کے قانون کو ثابت کرنے کے لیے ایسے الفاظ کا انتخاب کیا گیا جس سے اس قانون کی بنیاد ہی منہدم ہوکر رہ گئی۔ کیسی عجیب بات ہے۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت عمرؓ اسی قانون رجم کا ذکر فرماتے ہوئے صاف صاف لفظوں میں فرماتے تھے کہ قرآن میں اس کو داخل کر کے ان ازید فی کتاب اللہ۔ میں اللہ کی کتاب میں اضافہ کرنے کا فعل کروں گا۔

اسی کے ساتھ یہ بھی فرماتے کہ اس کا خطرہ اگر نہ ہوتا تو قانون کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ قرآن کے کم از کم حاشیے پر اس کو لکھ دیا جاتا۔ عمرؓ جس کے متعلق کہہ رہے ہوں کہ قرآن میں اس کے داخل کرنے سے اضافہ ہوگا۔ یعنی جو چیز قرآن کا جزو نہیں ہے وہ قرآن کا جزو بن جائے گی مگر لوگ ہیں کہ یہی کہتے جارہے ہیں کہ قرآن ہی کا جزو رجم کا قانون تھا[۳۸] اور مغالطہ کس سے ہوا؟ صرف کان مما انزل اللہ کے الفاظ سے ہوا۔ مگر آپ دیکھ چکے کہ ان الفاظ کا مطلب یہ قطعاً نہیں ہے۔ آخر اسی روایت میں تو رغبتہ عن الاباء والے حکم کو بھی تو حضرت عمرؓ ہی نے اس سے بھی زیادہ تیز تر الفاظ یعنی "کنا نقرء فیما نقرء من کتاب اللہ" کے ذریعہ اپنے مطلب کو ادا کیا ہے لیکن اس کا چرچا لوگوں میں کیوں نہیں پھیلا۔ بڑے بڑے مولوی بھی شاید اس کا استحضار نہ رکھتے ہوں حالانکہ اس قسم کے الفاظ کا مطلب جو کچھ ہوتا ہے حضرت عمرؓ کے بیان کے اسی حصہ سے چاہیے تھا کہ لوگ سمجھ لیتے مگر سمجھنے کا جب ارادہ ہی نہ کیا جائے تو اس کا کیا علاج ہے۔ یہی روایت کیا بلکہ بیر معونہ میں حفاظ قرآن کی کافی تعداد دھوکہ سے جو شہید ہوئی تھی' حدیثوں میں اس قصہ کا ذکر کرتے ہوئے حضرت انسؓ فرمایا کرتے تھے کہ یہ بیچارے بحالت غربت جو شہید ہوئے تو

فاخبر جبرئیل علیہ السلام النبی صلی اللہ علیہ وسلم انھم لقوا ربھم فرضی عنھم وارضاھم
جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ کو خبر دی کہ حفاظ قرآن کی یہ جماعت اپنے پروردگار سے جا کر مل گئی۔ پس اللہ ان سے راضی ہوا اور ان لوگوں کو خدا نے خوش کردیا۔

روایت کے بعض الفاظ میں ہے کہ خود ان شہید ہونے والے حفاظ نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا قتل ہونے سے

Marfat.com

پہلے کی تھی کہ

اللھم ابلغ منا نبینا انا قد لقیناک فرضینا عنک ورضیت عنا

اے اللہ! ہمارے نبی کو مطلع کر دیجیے کہ آپ سے ہم مل گئے۔ بس ہم آپ سے راضی اور خوش ہوئے اور آپ ہم سے راضی اور خوش ہوئے۔

اس روایت کا ذکر کر کے حضرت انس کہا کرتے تھے کہ ہم ان الفاظ کو یعنی ان شہداء کی دعا کے ان الفاظ کو جس کی خبر جبریل علیہ السلام کے ذریعہ رسول کو ملی تھی کنا نقرء یعنی پڑھا کرتے تھے۔ پس نقرء کے لفظ سے بعضوں کو مغالطہ ہوا کہ شاید یہ بھی قرآن کا جزء تھا' حالانکہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس کی نوعیت بھی وہی "فیما انزل من القرآن" یا کنا نقرء فیما نقرء من کتاب اللہ" کی ہے یعنی جبریل علیہ السلام کے توسط سے رسول اللہ تک یہ پہنچا تھا۔ اور معلوم ہو چکا کہ قرآن کی وحی میں تو جبریل ضرور واسطہ کا کام کرتے تھے لیکن ہر وہ چیز جو جبریل علیہ السلام کے ذریعہ رسول اللہ تک پہنچی تھی اس کا قرآن ہونا ضروری نہ تھا اور یہی صورت حال ان الفاظ کی ہے۔

(۲) مغالطات کے سلسلہ میں میرے نزدیک ایسی روایتیں بھی شامل ہیں جن میں صحابی نے کسی قرآنی آیت کا مضمون اور مطلب اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے قرآن کی طرف اس مطلب کو منسوب کر دیا ہے۔ ہم لوگ یعنی جن کی مادری زبان عربی نہیں ہے اردو میں قرآنی آیتوں کا مطلب بیان کرتے ہیں لیکن صحابہ ظاہر ہے کہ مطلب و معنی کو بھی عربی زبان ہی میں ادا کیا کرتے تھے۔ بعضوں کو اسی سے مغالطہ ہو گیا کہ صحابہ کے بیان کردہ یہ تفسیری و تشریحی الفاظ بھی قرآن کے اجزاء تھے۔ اس کی ایک اچھی مثال یہ روایت ہو سکتی ہے یعنی ایک صحابی نے بیان کیا کہ قرآن میں میں نے پڑھا ہے کہ

لو کان لابن ادم و ادیا من مال لابتغی الیہ ثانیا الحدیث

یعنی آدم کے بچے کے پاس ایک وادی برابر مال ہو تو چاہے گا کہ دوسری وادی بھر بھی مال اس کو مل جائے۔ آخر حدیث تک

اس میں شک نہیں کہ بجنسہٖ یہ الفاظ قرآن میں نہیں ہیں لیکن ان الانسان خلق ھلوعا قطعاً انسان بڑا بے صبرا پیدا کیا گیا ہے۔[۳۹] قرآن کی مشہور آیت ہے اور جاننے والے جانتے ہیں کہ "ھلوع" کا مطلب وہی ہے جسے صحابی نے مذکورہ بالا الفاظ میں ادا کیا۔ پھر اسی مضمون کو انہوں نے قرآن کی طرف منسوب کر کے اگر بیان کیا تو اس سے یہ کیسے سمجھ لیا گیا کہ ان کا خیال یہ تھا کہ بجنسہٖ یہی الفاظ قرآن میں پائے جاتے ہیں۔ آخر روزمرہ کی یہ بات ہے کہ عام گفتگو میں' وعظوں میں' تقریروں میں لوگ مضمون بیان کر کے کہتے ہیں کہ ایسا قرآن میں آیا ہے' لیکن یہ کتنی بڑی حماقت ہو گی اگر سننے والا قرآنی آیت کے حاصل مطلب کے بجنسہٖ ان ہی الفاظ کو قرآن میں تلاش کرنے لگے۔

(۳) مغالطہ کی اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ قرآن سناتے ہوئے بعض دفعہ صحابی بیچ میں تفسیر طلب الفاظ کی تفسیر بھی کرتے چلے جاتے تھے۔ ہندوستانی علماء بھی بکثرت اس کام کو کرتے ہیں لیکن چونکہ ان کے تفسیری الفاظ اردو میں ہوتے ہیں اس لیے سب جانتے ہیں کہ درمیان کے الفاظ قرآنی الفاظ کی تفسیر سے تعلق رکھتے ہیں لیکن جیسا کہ

Marfat.com

میں نے عرض کیا صحابہ کی مادری زبان بھی چونکہ وہی تھی جو قرآن کی زبان ہے' اسی سے بعضوں نے تفسیر کے ان عربی الفاظ سے یہ غلط نفع اٹھانا چاہا اور مشہور کر دیا کہ فلاں سورۃ میں موجودہ الفاظ کے ساتھ فلاں فلاں الفاظ پائے جاتے تھے جواب قرآن سے خارج ہو گئے ہیں۔ حضرت ابی بن کعب صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ یہی صورت پیش آئی یعنی وہ سورہ ''البینۃ'' سنا رہے تھے' جب قرآن کے الفاظ

وما امرو الا لیعبدوا اللہ مخلصین له الدین حنفاء

اور نہیں حکم دیا گیا (ان کو) لیکن صرف اس کا کہ پوجے چلے جائیں اللہ کے دین کو اسی اللہ کے لیے خاص بنا کر بالکلیہ اسی کی طرف جھکتے ہوئے' پر پہنچے تو مخلصین له الدین ''یعنی دین کو اللہ کے لیے خالص بنانے کا مطلب کیا ہے اسی کو سمجھانے لگے جس کا حاصل یہی تھا کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی مبارک اور اس کی خوشنودی کا حاصل کرنا بھی الدین اور مذہب کی خالص روح اور خالص منشاء ہے۔ باقی بعض لوگ جیسے رنگ' نسل' وطن' زبان وغیرہ کو فرقہ واری دھڑا بندیوں کا آلہ بنا لیتے ہیں اسی طرح ایک طریقہ تقسیم کا کبھی دین اور مذہب کو بھی بنا لیا جاتا ہے۔ اس وقت بجائے رضا حق کے جتھا بندی کا محض ایک ذریعہ بن کر مذہب رہ جاتا ہے۔ اس زمانہ میں یہودیت' نصرانیت' مجوسیت وغیرہ مذاہب مرضی حق تک پہنچنے کے نہیں بلکہ قومی عصبیت کے اُبھارنے کے ذرائع بنے ہوئے تھے' اسی توضیحی و تفسیری مطلب کو عربی زبان میں حضرت ابی بن کعب نے ان الفاظ میں ادا کیا کہ

ان الدین عند اللہ الحنیفة المسلمة لاالیهودیة ولا النصرانیة ولا المجوسیة

دین خدا کے نزدیک وہی معتبر ہے جس میں حنفیت (یعنی خدا کی طرف یکسوئی کی گئی ہو جو حنفاء کا مطلب ہے) اور مسلمہ ہو (یعنی اپنے آپ کو بالکلیہ خدا کے سپرد کر دیا جائے) نہ یہودیت نہ نصرانیت نہ مجوسیت (یعنی ان دینی ناموں کو انسانیت کی تقسیم کا ذریعہ بنانا' یہ ان لوگوں کا کام نہیں ہو سکتا جو اپنے دین کو واقعی صرف خدا کے لیے خالص بنانا چاہتے ہیں یا مخلص ہو کر دینی زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔

مسند احمد کے حوالہ سے ''جمع الفوائد'' میں نقل کیا ہے کہ ان الفاظ کے بعد ثم ختم بما بقی من السورۃ پھر ابی نے (ان الفاظ کے) بعد سورہ البینہ کو ختم کیا۔ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ درمیان کے تفسیری الفاظ کو فرمانے کے بعد حضرت ابی بن کعب نے سورہ کو ختم کیا۔ واقعہ کی صورت کل یہی ہے۔ آپ ہی بتائیے کہ مغالطے کے سوا اس کو اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ اگر حضرت ابی کے ان تفسیری الفاظ کے متعلق محض اس لیے کہ وہ عربی زبان کے الفاظ ہیں' یہ وسوسہ دلوں میں کوئی ڈالے کہ ابی بن کعب کے نزدیک قرآن ہی کے اجزاء (العیاذ باللہ) یہ الفاظ تھے' تو واقعہ یہ ہے کہ عربی زبان سے تھوڑا بہت بھی لگاؤ جو رکھتا ہے۔ سننے کے ساتھ ہی سمجھ سکتا ہے کہ زربفت میں یہ ٹاٹ کا پیوند بن جائے گا اور کچھ ان الفاظ کا نہیں بلکہ اور بھی جن جن روایتوں میں ان تفسیری و تشریحی الفاظ کا ذکر کیا گیا ہے بذات خود بتا رہے ہیں کہ قرآنی عبارت کے الفاظ اور ان میں کھلا ہوا فرق ہے مگر اس کے لیے عربی ادب کے ذوق صحیح کی ضرورت ہے۔

(۴) اسی سلسلہ کی بعض غیر مستند تاریخی روایتوں میں تذکرہ کیا گیا ہو کہ

Marfat.com

ان ابن مسعود کان ینکر کون سورة الفاتحة والمعوذتین من القرآن. (تبیان الجزائری۔۹۶)

حضرت ابن مسعود صحابی سورۃ فاتحہ یعنی الحمد اور معوذتین یعنی قل اعوذ برب الناس اور قل اعوذ برب الفلق والی سورتوں کے متعلق کہتے تھے کہ یہ قرآن کے اجزاء نہیں ہیں۔

بالفرض ابن مسعودؓ کی طرح مان لیا جائے کہ یہ انتساب صحیح بھی ہو اور قرآن میں جو تواتر کی قوت پائی جاتی ہے اس کا مقابلہ یہ تاریخی روایت فرض کر لیجیے کہ کر بھی سکتی ہو جب بھی کیا اس کا وہی مطلب ہو جو ظاہر الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے واقعہ یہ ہے کہ سورہ فاتحہ جس کا قرآنی نام السبع المثانی ہے‘ ص ۳۹۔ قرآن میں اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

ولقد اتینک سبعاً من المثانی والقرآن العظیم

ہم نے تم کو (اے پیغمبر) سبع مثانی (یعنی سورہ المثانی والقرآن العظیم فاتحہ دی) اور قرآن عظیم دیا۔

جس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ سورہ فاتحہ کی حقیقت ''القرآن العظیم'' کے مقابلہ میں جدا رنگ رکھتی ہے جس کی وجہ ظاہر بھی ہے کہ سورہ فاتحہ کی حیثیت درخواست کی ہے جو خدا کے دربار کی حاضری کے وقت یعنی نماز میں بندہ کی طرف سے خدا کی بارگاہ میں پیش ہوتی ہے اور ''الم'' سے ''الناس'' تک اسی کا جواب دیا گیا ہے۔[۴۰] ابن مسعود نے بھی اگر اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ فرمادیا ہو کہ سورہ فاتحہ ''القرآن العظیم'' سے الگ حیثیت رکھتی ہے تو اس کا یہ مطلب لینا کیسے صحیح ہوگا کہ سورہ فاتحہ کے الفاظ کی وحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اسی طرح نہیں ہوئی تھی جیسے باقی قرآن کی وحی ہوئی ہے۔ بلکہ واقعہ وہی ہے کہ وحی ہونے میں تو دونوں میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں ہے۔ البتہ سورہ فاتحہ اپنی جداگانہ حیثیت جو رکھتی ہے یعنی بندے حق تعالیٰ کے دربار میں جو معروضہ پیش کریں‘ حق تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے اس معروضہ یا درخواست کی عبارت بھی مرتب کر کے رسول اللہ پر وحی فرمادی۔[۴۱]

انہی روایتوں میں ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ معوذتین کے متعلق کہا کرتے تھے کہ

انما امر النبی ﷺ ان یتعوذ بھما

رسول اللہ ﷺ نے یہ حکم دیا ہے کہ ان دونوں سے تعوذ (پناہ گیری) کا کام لیا جائے۔

مطلب یہ تھا کہ معوذتین (یعنی قل اعوذ برب الناس اور قل اعوذ برب الفلق) ان دونوں سورتوں کا نزول تعوذ (پناہ گیری) کے لیے ہوا ہے اس لیے قرآن کی دوسری سورتوں کے مقابلہ میں ان کی جداگانہ حیثیت ہے۔ میرے نزدیک تو ان الفاظ سے معوذتین کی اہمیت کو ابن مسعود واضح کرنا چاہتے تھے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ کسی قسم کی مصیبت دنیا میں پیش ہو ان دونوں سورتوں کے مضامین پر غور کرنے سے تسلی مل جاتی ہے۔ بہرحال اگر ان روایتوں کے تاریخی ضعف اور اسنادی کمزوریوں سے قطع نظر بھی کر لیا جائے جب بھی ابن مسعودؓ کے اس بیان کا یہ مطلب لینا کہ وہ ان سورتوں کو حق تعالیٰ کے فرمودہ اور نازل کردہ الفاظ نہیں سمجھتے تھے قطعاً ان پر بہتان ہے اور بدترین قسم کی مغالطہ بازی ہے۔ کیا کسی حیثیت سے بھی کسی کی سمجھ میں یہ بات آسکتی ہے کہ کوئی اور سورہ نہیں بلکہ سورہ فاتحہ جیسی سورہ جو نماز کی ہر رکعت میں دن کے پانچ وقتوں میں دہرائی جاتی ہے اسی کو سمجھتے تھے کہ قرآن کا جزو نہیں ہے۔ کچھ اسی قسم کا مغالطہ حضرت

Marfat.com

ابی بن کعب صحابی کی طرف اسی روایت کے متعلق ہوا جس میں یہ ہے کہ ان کے قرآنی نسخہ میں وہ دونوں دعائیں جو قنوت میں عموماً پڑھی جاتی ہیں' لکھی ہوئی تھیں۔ اسی بناء پر یہ غلط فہمی پھیلانے کی بھی بعضوں نے کوشش کی کہ ان دعاؤں کو ابی بن کعب قرآن کے اندر داخل سمجھتے تھے یعنی جیسے دوسری قرآنی سورتیں ہیں اسی طرح دوسورتیں قرآن کی یہ دونوں دعائیں بھی ہیں۔[42]

میں پوچھتا ہوں' آج بھی تو قرآن کے آخر میں مختلف قسم کی دعائیں خصوصاً ختم قرآن کی دعا عموماً لکھی ہوئی رہتی ہے۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ دعائیں قرآن میں شریک ہیں اگر روایت صحیح بھی ہو تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ اہمیت کی وجہ سے ابی بن کعب نے اپنے قرآن کے آخر میں ان دونوں مسنونہ دعاؤں کو لکھ لیا ہوگا اور سچ تو یہ ہے کہ روایت ہی بے سروپا ہے۔ میں نے بھی اس کا ذکر صرف تکمیل مضمون کے لیے کر دیا ورنہ یہ روایت تو اس قابل بھی نہیں تھی کہ سنجیدہ علمی مقالہ میں جگہ دی جائے۔

ایک ذیلی بحث اور خاتمہ

مولانا گیلانی نے اپنی کتاب کو جن مباحث پر ختم کیا ہے اسی کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

مقصد یہ ہے کہ قرآن تو خیر خدا کی کتاب ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانوں کی تصنیف کردہ کتابوں مثلاً سعدی کی ''گلستاں'' ہی کو لیجیے یا اسی جیسی کوئی دوسری کتاب' ان کے پڑھنے والوں کو کبھی نہیں دیکھا کہ پڑھنے سے پہلے وہ اس کی ٹوہ میں لگے ہوں کہ مصنف نے کتاب کے کس باب کو پہلے لکھا اور کس کو بعد میں یا ہر باب کی فصلوں کی عبارتوں میں کس عبارت کی یادداشت پہلے جمع ہوئی اور کون بعد بلکہ عام قاعدہ یہی ہے کہ مصنف کی طرف سے کتاب پڑھنے والوں کے سامنے جس شکل میں پیش ہوتی ہے' اسی آخری شکل کو کتاب کی واقعی شکل قرار دے کر لوگ پڑھنا پڑھانا شروع کر دیتے ہیں۔

اسی عام دستور کے مطابق ظاہر ہے کہ قرآن کی بھی واقعی شکل اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ جس حال میں پیش کرنے والے نے دنیا کے حوالہ قرآن کو کیا بس یہی قرآن کی اصلی شکل ہے۔ یہی سمجھا بھی گیا۔ ابتدا سے اس وقت تک اسی شکل میں قرآن نسلاً بعد نسل سے منتقل ہوتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ یہ ایک واضح کھلی ہوئی بات ہے لیکن کچھ دن سے یورپ کے مستشرقین نے دنیا کو قرآن کے متعلق ایک خاص مسئلہ کی طرف متوجہ کیا یعنی اس کتاب کی ہر سورہ کی ہر ہر عبارت کا ہر فقرہ کب نازل ہوا اس کا پتہ چلانا چاہیے۔ باور کرایا جاتا ہے کہ قرآن کی صحیح مرتب شکل وہی ہو سکتی ہے جو نزولی ترتیب کی روشنی میں قائم کی جائے۔ مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا تصنیفی کاروبار کرنے والوں کا عام قاعدہ ہے کہ اپنی تصنیف کو آخری شکل میں مرتب کرنے سے پہلے متفرق قسم کی یادداشتوں میں مواد کو نوٹ کرتے رہتے ہیں اور بعد کو ان ہی یادداشتوں کی مدد سے آہستہ آہستہ اپنی کتاب کو مکمل کرتے ہیں بلکہ بسا اوقات یہ بھی کیا جاتا ہے کہ کتاب کے جس حصہ کے متعلقہ مواد کو دیکھتے ہیں کہ فراہم ہو چکا ہے تو پہلے اسی حصہ کو لکھ لیتے ہیں۔ یوں ہی سہولتوں کے لحاظ سے بتدریج یہ کام جب پورا ہو جاتا ہے تب آخری شکل میں کتاب کو مرتب کر کے دنیا کے سامنے دستور ہے کہ مصنفین اپنی کتاب پیش

Marfat.com

کردیتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ یہی آخری شکل اس کتاب کی اصلی اور واقعی شکل قرار پاتی ہے اور کسی کے دل میں اس کا خطرہ بھی نہیں ہوتا کہ مصنف کو کن کن مراحل سے اپنی تصنیف کے اس جدوجہد میں گزرنا پڑا۔ اس کا پتہ چلائے اور اس سلسلہ میں مصنف کے پرانے فائلوں اور ان بستوں کو ٹٹولے جن میں اس کی یادداشتیں رکھی جاتی تھیں اور کاغذ سیاہی وغیرہ کی کہنگی اور تازگی کو دیکھ دیکھ کر فیصلہ کرے کہ ان یادداشتوں میں تاریخی طور پر کن کو مقدم اور کن کو مؤخر قرار دیا جائے یا یہ کہ مصنف نے اپنی کتاب کے کس حصے کو پہلے مکمل کیا اور کس حصہ کی تکمیل بعد کو کی۔ بالفرض ''غم نداری بُز بخر'' کی ان غیر ضروری جھنجٹوں میں کوئی خواہ مخواہ مبتلا بھی ہو تو ایک قسم کے غیر ضروری خبط کے سوا اسے اور کیا سمجھا جاسکتا ہے۔ تاہم انسانی تصنیفات کے متعلق سراغ رسانی کی اس غیر ضروری مہم کا ممکن ہے کچھ فائدہ بھی ہو۔

غریب آدمی زندگی کے مختلف ادوار میں مختلف حالات سے گزرتا رہتا ہے۔ کبھی انشراح قلب انبساط ونشاط کی حالت میں رہتا ہے کبھی انقباض وکوفت دماغی میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ یہ اور اسی قسم کے دوسرے نفسیاتی کیفیات کا اثر جیسے زندگی کے تمام شعبوں پر پڑتا ہے' انسان کے تصنیفی کاروبار بھی اس سے متاثر ہوں تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے' اور کچھ نہیں تو یہی کیا کم ہے کہ کتاب کے کس حصہ کو نشاط وانبساط کی حالت میں مصنف نے لکھا ہے اور کن حصوں کی تکمیل انقباض وکوفت دماغی کے زمانہ میں ہوئی' اس ٹٹول سے اسی کا پتہ چل جائے' مگر اللہ میاں کے متعلق تو مزاجی اور دماغی اتار چڑھاؤ کی اس کیفیت کی بھی گنجائش نہیں۔

مگر یہ عجیب بات ہے کہ غیر تو غیر خود مسلمانوں کا ایک طبقہ جو قرآن کو خدا کی کتاب مانتا ہے' ادھر کچھ دنوں سے اسی لایعنی' غیر ضروری مشغلے میں یورپ کے مستشرق نما پادریوں کے اغوائی اشاروں سے الجھ گیا ہے۔ خود بھی اسی میں الجھا ہوا ہے اور چاہتا ہے کہ جس مسئلہ کا مسلمانوں کے دل پر کسی زمانہ میں کبھی کسی قسم کا کوئی خطرہ بھی نہیں گزرا تھا' اسی میں ان کو بھی الجھادے۔ بڑھتے ہوئے بعض تو یہاں تک پہنچ کر کہنے لگے کہ قرآن کا مطلب ہی مسلمانوں کی سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک کہ موجودہ ترتیب کو الٹ پلٹ کر نزولی ترتیب پر قرآن کو مرتب کرکے نہ پڑھا جائے۔ بقول مولانا گیلانی پادریوں کی بات تو کچھ سمجھ میں بھی آتی ہے کیونکہ وہ قرآن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی افکار وخیالات کا العیاذ باللہ مجموعہ سمجھتے ہیں اس لیے نزولی ترتیب کے پتہ چلانے کا فائدہ یہ بتاتے ہیں کہ اس ذریعہ سے ''ہم ایک زبردست دماغ کی ترقی' ایک پاکیزہ روح کی کمزوری وتوانائی اور ایک بڑے انسان کی ناگزیر نیرنگیوں کو دیکھنے لگتے ہیں''[۴۳] لیکن خیال تو کیجیے ایک مسلمان بیچارہ جو قرآن کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نہیں بلکہ خالق کائنات کی براہ راست کتاب یقین کرتا ہے' کیا اس نزولی ترتیب کی تلاش میں پاپڑ بیلنے کے بعد اللہ میاں کی پاکیزہ روح کی ''کمزوریوں اور ناگزیر نیرنگیوں'' کا تماشا دیکھنا چاہتا ہے؟ یا نزولی ترتیب کی جستجو کی دعوت دینے والے کیا اپنے پیدا کرنے والے مالک کی ان ہی مذبوحی حرکات کا تماشا خود بھی اور مسلمانوں کو بھی دکھانا چاہتے ہیں؟

میں نے جیسا کہ عرض کیا انسانی تصنیفوں کے متعلق بھی جب اس قسم کی کریز گیوں کا مالیخولیا دماغوں میں پیدا نہیں ہوتا تو العیاذ باللہ حق سبحانہ تعالیٰ کی کتاب کے متعلق اس سوال کے اٹھانے کے معنی ہی کیا ہوسکتے ہیں؟ اور کوئی چاہے بھی تو میں نہیں سمجھتا کہ کسی انسانی تصنیف کے متعلق بھی ان باتوں کا پتہ چلانا آسان ہے کہ مصنف کو اپنی اس

Marfat.com

کتاب کی ترتیب کے سلسلہ میں کن کن مرحلوں سے گزرنا پڑا' یادداشتوں میں کون سی یادداشت پہلے نوٹ ہوئی اور کون بعد' یا کتاب کا کون سا حصہ پہلے مکمل ہوا' اور کون بعد۔ قرآن کے ساتھ مسلمانوں کی غیر معمولی دلچسپیوں سے جہاں بہت سی عجیب وغریب چیزیں قرآن کے متعلق پیدا ہو گئی ہیں مثلاً اس کتاب کے ایک ایک حرف اور حروف کے اعراب یعنی زیر وزبر پیش سب ہی کو ثواب کا کام سمجھ کر گن لیا گیا ہے اور جو کچھ اس سلسلہ میں تیرہ سو برسوں کی طویل مدت میں مسلمان کرتے چلے آئے ہیں ایک مستقل کتاب کا وہ مضمون ہے۔ غیر معمولی دلچسپیوں کے اسی ذیل میں دنیا کی تمام کتابوں کے مقابلے میں صرف قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جس کے کل تو نہیں لیکن معقول اور معتد بہ حصہ کے متعلق مسلمانوں میں ایسی روایتیں پائی جاتی ہیں جن سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ اس کتاب کی کون سی سورہ کس مقام میں اتری یعنی مکہ میں یا مدینہ میں' اسی طرح ان ہی روایتوں میں اس کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے کہ فلاں آیت یا آیتوں کا مجموعہ فلاں مشہور واقعہ کے وقت اترا۔ شان نزول کی اصطلاح ان ہی معلومات کے متعلق مسلمانوں میں مروج ہے۔[۴۳]

بہر حال اتنی بات درست ہے کہ ان روایتوں کی مدد سے سورتوں کی کافی تعداد کے متعلق اس کا پتہ چلا لیا گیا ہے کہ وہ مکہ میں اتری تھیں یا مدینہ میں اور تھوڑی بہت آیتوں کے متعلق بھی کوئی چاہے تو اس قسم کی معلومات فراہم کر سکتا ہے لیکن ان ساری معلومات کے بعد بھی مسلمانوں نے نہیں بلکہ یورپ کے ان ہی پادریوں نے جو آج کل استشراق کی نقاب چہروں پر ڈال کر یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ بجائے دینی اور مذہبی عصبیت کے ان کے کاروبار کا تعلق صرف علمی تحقیقات سے ہے۔ ان ہی مستشرقین کا یہی طبقہ دو ڈھائی سو سال کی کدوکاوش کے بعد اس نتیجہ تک پہنچا ہے کہ

''صحیح ترتیب نزول کا معلوم کرنا ناممکن ہے۔'' (نیولدکہ)

ہرش فیلڈ جو اسی فیلڈ کا مشہور سپاہی ہے' اس بیچارے کو بھی اسی اعتراف پر مجبور ہونا پڑا کہ

''میں پہلے ہی سے اس کا اقرار کیوں نہ کر لوں کہ اس سلسلہ میں (نزولی ترتیب کی جاسوسی میں)
قابل اعتماد نتائج حاصل کرنے کی بہت ہی کم امید ہے۔''

(یہ فقرے پروفیسر اجمل کی کتاب سے لئے گئے ہیں جو اسی مسئلہ پر انہوں نے لکھی ہے)

اور یہ حال تو اس وقت ہے جب قرآن کی موجودہ متواتر وقطعی مسلمہ ترتیب میں ترمیم کی اجازت ان روایتوں کی بنیاد پر دے دی جائے جو شان نزول کے سلسلہ میں ہماری کتابوں کے اندر پائی جاتی ہیں لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ روایات کا جو ذخیرہ ہمارے یہاں پایا جاتا ہے اس ذخیرے میں سب سے زیادہ کمزور اور حد سے زیادہ ضعف ان روایتوں کی خصوصیت ہے جن کا تعلق قرآن کی تفسیر وغیرہ سے ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ کا تو اس سلسلہ میں یہ مشہور قول ہے کہ ثلاثہ لیس لھا اصل التفسیر و الملاحم والمغازی[۴۴] یعنی روایات کا جو ذخیرہ حدیث کی کتابوں میں پایا جاتا ہے اس میں ایسی روایتیں جن کا تعلق تفسیر یا ملاحم (آئندہ پیش آنے والی جنگوں کی پیش گوئیاں) یا مغازی (عہد نبوت کی جنگی مہموں کے قصے) امام احمد فرماتے تھے کہ ان تینوں قسم کی روایتوں کی کوئی صحیح بنیاد نہیں ہے۔

Marfat.com

سیوطی نے اس قول پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سب کو بے اصل قرار دینا تو مشکل ہے لیکن اسی کے ساتھ اس کا اعتراف خود سیوطی نے بھی کیا ہے کہ قابل اعتماد روایتیں تفسیر کے سلسلہ میں قلیل جدًا اور یہ کہ فی غائتہ القلة[45] محدثین کا اس پر اتفاق ہے۔ تواتر وتوارث کے نیر تاباں کی روشنی میں مذہباً نہ سہی عقلاً ہی سہی میں پوچھتا ہوں کہ جگنو کے دُم کی روشنی سے کیا مغلوب ہوسکتی ہے جن چیزوں کو آفتاب کی روشنی میں ہم دیکھ رہے ہیں اور جو معلومات اس روشنی میں حاصل ہوئی ہیں' کیا ان معلومات میں ترمیم کی جسارت ان چیزوں کی مدد سے کوئی کرسکتا ہے جن پر گھپ اندھیری رات میں جگنو کی دُم کی روشنی میں اتفاقاً کسی کی نظر پڑ گئی۔ یقین کیجئے کہ قرآن کی موجودہ مرتب شکل کے متعلق ہمارے علم کی عقلی کیفیت' نزولی روایات کے مقابلہ میں نہیں بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ ہے۔[46]

نزولی ترتیب کا ایک تاریخی لطیفہ

اسی نزولی ترتیب کے متعلق ایک دلچسپ لطیفہ وہ بھی ہے جسے منسوب کرنے والوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کی طرف منسوب کر کے کچھ اس طرح اسے مشہور کردیا ہے کہ عوام میں گویا یہ مان لیا گیا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہٗ نے نزولی ترتیب پر قرآن کو مرتب کر کے ایک نسخہ واقعہ میں تیار کیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس نزولی ترتیب کا مطلب اگر صرف یہی ہے کہ جلد بندی میں سورتوں کی یعنی ان قرآنی رسالوں کی جو ترتیب اس وقت پائی جاتی ہے یعنی پہلے سورہ فاتحہ پھر البقرہ پھر آل عمران آخر الناس تک۔ حضرت علیؓ کے نسخہ میں سورتوں کی ترتیب یہ نہ تھی تو میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ اس میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ کسی ایک مصنف کی چند کتابوں مثلاً سعدی کی ''گلستاں و بوستاں'' کی جلد بندی میں آپ خواہ ''بوستاں'' کو پہلے رکھوایئے یا ''گلستاں'' کو ان دونوں کتابوں کے مضامین پر کوئی اثر اس کا نہیں پڑتا اور ابھی آپ کو معلوم ہوگا کہ بعض دوسرے صحابہ کے قرآنی نسخوں کے متعلق کتابوں میں لکھا ہے کہ ان میں بھی سورتوں کی ترتیب وہ نہ تھی جو اس وقت پائی جاتی ہے۔

لیکن اس نزولی ترتیب کا مطلب اگر یہ ہے کہ ہر ہر سورہ میں آیتوں کے اندر جو ترتیب اس وقت پائی جاتی ہے' حضرت علیؓ والے مرتبہ نسخے میں بجائے اس ترتیب کے کوئی اور ترتیب آیتوں میں دی گئی تھی تو اس کا مطلب اور نتیجہ کیا ہوسکتا ہے؟ اس کی دلچسپ داستان تو ابھی آپ کو معلوم ہوگی لیکن چونکہ حضرت علیؓ کی طرف اس روایت کو منسوب کر کے مختلف قسم کی غلطیاں پھیلانے والے پھیلا رہے ہیں اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خود اس آیت کی جو واقعی حیثیت اور کیفیت ہے' پہلے اس سے مسلمانوں کو مطلع کردیا جائے۔

بقول مولانا گیلانی واقعہ صرف یہ ہے کہ روایات اور حدیثوں کی موجودہ عام کتابوں مثلاً بخاری ومسلم اور ان کے سوا صحاح کی جو دوسری کتابیں ہیں ان میں سے کسی کتاب میں یہ روایت نہیں پائی جاتی۔ حدیث کی ان کتابوں میں ہی نہیں بلکہ جن کتابوں کو حدیث کی کتابیں کہتے ہیں خواہ سنداً ان کا مقام کتنا ہی گرا ہوا ہو' ان میں بھی یہ روایات نہیں ملتیں۔ چند غیر معروف کتابیں جن کا ذکر سیوطی نے ''اتقان'' میں کیا ہے' ان کے سوا سند کے ساتھ صرف ابن سعد کی کتاب ''طبقات'' میں اس وقت تک مجھے یہ روایت ملی ہے۔ ''کنز العمال'' میں بھی اس روایت کو نقل کر کے صرف ابن

Marfat.com

سعد ہی کا حوالہ دیا ہے جس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ صاحب ''کنز العمال'' بلکہ جلال الدین سیوطی نے رطب و یابس روایتوں کی محیط (انسائیکلو پیڈیا) جب تیار کرنی چاہی تو ان دونوں بزرگوں کو بھی غالباً ابن سعد کے ''طبقات'' کے سوا کسی ایسی کتاب میں یہ اثر نہیں ملا جسے وہ لائق ذکر خیال کرتے۔ بہر حال ابن سعد نے جن الفاظ میں اس روایت کو درج کیا ہے ان کو پڑھ لیجئے جو یہ ہیں۔

عن محمد قال نبئت ان علیا ابطاء عن بیعة ابی بکر فلقیه ابو بکر فقال اکرهت امارتی فقال لا ولکنی الیت بیمین ان لا ارتدی بردائی الا الی الصلوٰة حتی اجمع القران

محمد (بن سیرین) سے یہ روایت ہے وہ کہتے تھے مجھے یہ اطلاع دی گئی ہے کہ حضرت علیؓ کی طرف سے جب حضرت ابو بکرؓ کی بیعت میں کچھ تاخیر ہوئی تب حضرت ابو بکرؓ حضرت علیؓ سے ملے اور پوچھا کہ میری امارت (یعنی خلافت) کو تم نے ناپسند کیا۔ اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا کہ نہیں بلکہ بات یہ ہے کہ میں نے یہ قسم کھائی تھی کہ نماز کے سوا اپنی چادر (جسے اوڑھ کر باہر نکلتے تھے اسے) نہ اوڑھوں گا جب تک کہ قرآن کو جمع نہ کرلوں۔

اصل روایت تو اسی پر ختم ہو جاتی ہے۔ آگے محمد یعنی ابن سیرین نے آخر میں اتنا اضافہ اور کیا کہ

فزعموا انه کتبه علیٰ تنزیله (ابن سعد ج ۲/۲ ص ۱۰۱۔ مطبوعہ یورپ)

لوگ خیال کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے تنزیل پر اس قرآن کو لکھا تھا۔

بس یہ سارا فتنہ قرآن کی نزولی ترتیب کا ابن سیرین کے ان ہی الفاظ کتبه علیٰ تنزیله کو بنیاد بنا کر اُٹھایا گیا۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ بعض روایتوں میں اپنے خود تراشیدہ مطالب بھر کر ان سے لوگوں نے ناجائز نفع اٹھایا ہے۔ ان میں ایک روایت یہ بھی ہے۔ علامہ شہاب محمود آلوسی نیا اپنی تفسیر ''روح المعانی'' کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ اسی روایت کو چنگاری بنا کر فتنے کی آگ جن لوگوں نے پھیلائی ان میں سب سے زیادہ نمایاں شخصیت ابو حیان توحیدی کی ہے۔ (دیکھئے مقدمہ روح المعانی۔ ص ۹ ج ۱)

یہ ابو حیان توحیدی کون تھا اور زندگی بھر کیا کرتا رہا اس کا قصہ تاریخوں میں پڑھیے۔ ؎

بہر حال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سورتوں کی ترتیب کا ذکر اگر اس روایت میں ہے اور روایت کے جو الفاظ ہیں ان میں یقیناً اس کی بھی گنجائش ہے تو اس وقت تو خیر کوئی بات ہی نہیں ہے۔ اب بھی مسلمان بچوں کے پڑھانے کے لئے ''عم'' کے پارے کی سورتوں کی ترتیب بدل دیتے ہیں یعنی پہلے ''والناس'' پھر ''الفلق'' اور آخر میں سورہ عم یتساءلون ان پاروں میں چھاپی جاتی ہے۔ چونکہ ہر سورہ اپنی مستقل الگ حیثیت رکھتی ہے اس لئے ترتیب کی اس تبدیلی کا کوئی اثر معانی و مطالب پر نہیں پڑتا اور مقصد اگر سورتوں کی آیتوں کی اُلٹ پھیر کا ہے' غالباً فتنہ پردازوں کی بری نیت یہی ہے بھی' ورنہ سورتوں کی نزولی ترتیب کے مسئلہ کو اتنی اہمیت کیوں دیتے تو قطع نظر اس سے کہ بجائے سورتوں کے یہ دعویٰ جو کیا جاتا ہے کہ مراد آیتوں کی ترتیب ہے' اس دعوے کا ثبوت دعویٰ کرنے والوں کے ذمہ ہے اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس دعوے کے ثبوت کے لئے وہ کوئی قرینہ پیش نہیں کر سکتے مگر بہر حال مان لیا جائے کہ ان

الفاظ کا وہی مطلب ہے جو خواہ مخواہ بلا وجہ زبردستی ان الفاظ سے نکالنا چاہتے ہیں تو اب آیئے اور دیکھئے کہ سنداً اس روایت کا کیا حال ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ محمد یعنی ابن سیرین روایت کی ابتدا کرتے ہوئے ''نبئت'' کا لفظ بولتے ہیں، یعنی کہتے ہیں کہ مجھے اطلاع دی گئی لیکن کس نے اطلاع دی، اس اطلاع دینے والے کا نام نہیں بتاتے۔ لیجئے راوی مجہول ہوگیا اور ایسی روایت جس کے راوی کا حال تو حال نام تک معلوم نہ ہو، خود سوچئے کہ اس کی قیمت کیا باقی رہی۔ یہ حال تو اصل روایت کا ہے۔ پھر روایت کو ختم کر کے مزید اضافہ آخر میں ابن سیرین نے اپنی طرف سے جو کیا ہے اور اسی اضافہ میں ترتیب کی تبدیلی کا ذکر ہے۔ اس اضافہ کو بھی ''زعموا'' کے لفظ سے ادا کرتے ہیں جس کا عام ترجمہ اردو میں یہ کیا جاسکتا ہے یعنی ''خیال کرتے ہیں۔'' پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ خیال کرنے والے کون لوگ ہیں؟ ابن سیرین یہ بھی نہیں بتاتے جس سے پتہ چل سکتا تھا کہ وہ کس قسم کے لوگ تھے۔ نیز ''زعموا'' کا لفظ عربی زبان کے لفظ ''زعم'' سے بنا ہے۔ ''زعم'' کا یہ لفظ بجائے خود اپنے اندر حد سے زیادہ کمزوری کو چھپائے ہوئے ہے۔ بعض بزرگوں کے متعلق لکھا ہے کہ اپنے لڑکوں سے انہوں نے کہا تھا کہ ''زعموا'' کا لفظ مجھے بخش دو یعنی کبھی استعمال نہ کرنا۔ حدیثوں میں بھی آیا ہے کہ جھوٹ کو چلتا کرنے کے لئے ''زعموا'' کا لفظ بہت اچھی سواری کا کام دیتا ہے۔ جیسے اس زمانے کی اخبار نویسی میں ''سمجھا جاتا ہے'' ''قیاس کیا جاتا ہے'' ''معتبر حلقوں سے یہ یا بات پھیلی ہے'' یہ اسی قسم کے فقرے دراصل جھوٹ کو آگے بڑھانے کی عصری سواریاں ہیں۔ حافظ ابن حجر نے اسی انقطاع کا نقص بتاتے ہوئے اس روایت کو سنداً مسترد کر دیا ہے (دیکھو اتقان۔ ج اص ۸۲) اور خواہ مخواہ مان بھی لیا جائے کہ روایت کلیتاً بے اصل نہیں ہے جب بھی عرض کر چکا ہوں کہ ''نزولی ترتیب'' ایسی ترتیب ہے جس میں سورتوں اور آیتوں دونوں کی ترتیب کا احتمال ہے لیکن مدعا مدعیوں کا جب ہی ثابت ہوسکتا ہے کہ وہ کسی ذریعہ سے یہ ثابت کریں کہ سورتوں کی ترتیب نہیں بلکہ ہر سورہ کی آیتوں کی موجودہ ترتیب کی جگہ نزولی ترتیب حضرت والا نے دی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس احتمال کے معین کرنے کی قطعاً کوئی صورت نہیں ہے۔ علاوہ اس کے علماء نے لکھا ہے کہ بعض روایتوں سے جو معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ و منسوخ آیتوں کو ایک ہی جگہ مرتب کر کے حضرت علیؓ نے ایک کتاب لکھی تھی اور اسی کی طرف یہ اشارہ ہے تو بقول آلوسی پھر یہ قرآن کا نسخہ ہی کب باقی رہا یہ تو ''ناسخ و منسوخ'' کی دوسری کتابوں کی طرح ایک کتاب ہوگئی۔ اور بیسیوں احتمالات ہیں۔ کہنا یہی ہے کہ لے دے کے اسی ایک ٹوٹی پھوٹی شکستہ و برشتہ روایت کو بنیاد بنا کر یقین کی اس قوت کو مضمحل کرنے کی یہ کوشش کرنا جو قرآن کی موجودہ متواتر و متوارث ترتیب کے متعلق انسانی فطرت رکھتی ہے، بجز مغالطہ بازی کے اور کیا ہے۔ [۴۸]

نزولی ترتیب پر قرآن کو مرتب کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا؟

ماسوا اس کے سب سے زیادہ دلچسپ مسئلہ بقول مولانا گیلانی یہ ہے کہ نزولی ترتیب کے ڈھنڈورا پیٹنے والوں نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ خدانخواستہ اسی ترتیب پر ہر سورہ کی آیتوں کو مرتب کرنے کی کوشش میں اگر کوئی کامیاب ہو بھی جائے جس طرح وہ نازل ہوتی رہی ہیں تو آیتوں میں اس تاریخی ترتیب کے پیدا کرنے کی سعی لاحاصل کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس کو سوچنے کے لئے میں آپ کی توجہ پھر ادھر منعطف کرانا چاہتا ہوں جس کا ذکر شروع

Marfat.com

مضمون میں بھی اجمالاً آ چکا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنی سورتوں کی حیثیت کسی واحد بسیط کتاب کی نہیں ہے بلکہ ہر ہر سورہ کا موضوع اور اس کی غرض و غایت دوسری سورہ کے مقابلہ میں مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ علاوہ اس کے کہ تجربہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے' میں تو کہتا ہوں کہ سورتوں کے مضامین کی اسی استقلالی حیثیت کے احساس ہی کا نتیجہ عہد صحابہ میں یہ تھا کہ صرف دو سورتیں یعنی سورہ انفال اور سورہ برأت کے مضامین میں تھوڑا بہت وحدت کا رنگ جو پایا جاتا تھا لیکن پھر بھی دونوں کی حیثیت چونکہ بالکلیہ ایک نہ تھی آپ جانتے ہیں کہ امتیاز کے اسی رنگ کو باقی رکھنے کے لئے کیا کیا گیا؟ یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ ہر سورہ دوسری سورہ سے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کے فقرہ سے جدا کی گئی ہے لیکن ان دونوں سورتوں کے بیچ میں ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' نہیں ہے۔ حضرت عثمانؓ سے جب پوچھا گیا کہ ایسا کیوں کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ

كانت قصتها شبيهته بقصتها فنظنت انها منها فقبض رسول الله صلى الله عليه وسلم ولم يبين لنا انها منها فمن اجل ذلک قرنت بينهما و لم اكتب بينهما بسم الله الرحمن الرحيم

(ابوداؤد و ترمذی از مجمع الفوائد)

یعنی دونوں سورتوں کے مضامین ملتے جلتے تھے اس لئے ہم نے خیال کیا کہ یہ (برأت) بھی اسی میں سے ہے (یعنی انفال ہی میں داخل ہے) اتنے میں رسول اللہ کی وفات ہوگئی مگر آپ سے یہ بات معلوم نہ ہوسکی کہ واقعی برأت انفال میں سے ہے اس لئے دونوں کو ہم نے جوڑ تو دیا لیکن بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ان دونوں کے بیچ میں نہ لکھا۔

آپ دیکھ رہے ہیں سورتوں کے مضامین کے مسئلہ میں صحابہ کے احساس کی اس غیر معمولی نزاکت کو؟ سورتوں کی وحدت اور تعدد کا مدار مضامین کی وحدت و تعدد پر ہے۔ صحابہ کا جو نقطہ نظر اس باب میں تھا کیا اس کے لئے اس سے زیادہ واضح شہادت کی ضرورت ہے۔ بہرحال یہ ایک واقعہ ہے کہ دیکھنے میں قرآن کی سورہ کتنی بھی چھوٹی نظر آتی ہو جیسے ہاتھی کے مقابلے میں چیونٹی لیکن ایک مستقل جسمانی نظام کی بہرحال چیونٹی بھی مالک ہے۔ یہی حال ہر سورہ کا ہے [۴۸] اور کہا جاسکتا ہے جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ موضوع اور غرض و غایت کے لحاظ سے جیسے جغرافیہ کا علم طب سے ہے اور طب کا تاریخ سے' تاریخ کا علم کیمسٹری سے اپنی الگ مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ یہی اور بجنسہ یہی حال قرآن کی ہر سورہ کا دوسری سورہ کے مقابلے میں ہے۔

اب ذرا خیال کیجئے کہ نزولی ترتیب پر ہر ہر سورہ کی آیتوں کو مرتب کرنے کے معنی کیا ہوں گے۔ مذکورہ بالا مختلف علوم و فنون مثلاً طب' جغرافیہ' کیمسٹری' اکانومی وغیرہ کی کتابیں جن کا مصنف فرض کیجئے ایک ہی شخص ہو اور ان ساری کتابوں کو آگے پیچھے شروع کر کے اس نے خاص مدت میں ختم کی ہوں اب اگر اسی مصنف کی ان تمام قدیم یادداشتوں کے تلاش کرنے میں کوئی کامیاب بھی ہو جائے جنہیں مختلف علوم و فنون کی ان کتابوں کی تالیف و تصنیف کے سلسلہ میں وقتاً فوقتاً مصنف جمع کرتا رہا تھا اور ان ہی کی مدد سے ہر کتاب کو اس نے مکمل کیا تھا۔ پھر ان تمام یادداشتوں میں تاریخی ترتیب پیدا کر کے سب کو مرتب کر کے کسی کتاب کی شکل میں کوئی اگر پیش کرے تو صورت اس کتاب کی کیا ہو جائے گی؟ اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے اگر آپ کو اس کتاب کی ابتدائی چند سطروں میں تو طب کے کچھ نسخے

Marfat.com

اور مسائل ملیں اور ان ہی کے بعد کے فقروں میں جغرافیہ کے معلومات' ان کے بعد کیمسٹری کے نظریات علیٰ ہٰذا القیاس چوں چوں کا مربہ' کوئی واقعہ ہو یا نہ ہو لیکن یہ کتاب تو یقیناً چوں چوں ہی کا مربہ یا دیوانی ہنڈیا بن کر رہ جائے گی۔

بہرحال قرآن کی موجودہ ترتیبی شکل تواتر اور توارث کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ ایک ایسی قطعی حقیقت کے متعلق نزولی ترتیب والی ایسی روایتوں کی مدد سے ترمیم پر آمادہ ہو جانا جن کی سند کو حدیثوں کی صحت کے مقررہ معیار پر پورا اترنا آسان نہیں ہے' جنوں نہیں تو اور کیا ہے۔

''اتقان'' میں سیوطی نے طبرانی کے حوالے سے ایک روایت نقل کی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اس کی سند جید ہے۔ حاصل اس کا یہ ہے کسی نے عبداللہ بن مسعودؓ صحابی سے پوچھا کہ ایسے آدمی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے کہ

یقرءا القرآن منکوساً

قرآن کو الٹ کر پڑھتا ہے۔

بظاہر اس کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ سورتوں کی جو عام ترتیب ہے بجائے اس ترتیب کے الٹ کر قرآن کو پڑھتا ہے۔ لکھا ہے کہ جواب میں ابن مسعود نے فرمایا کہ

ذاک منکوس القلب

وہ اوندھے دل کا آدمی ہے

بتایئے کہ اسی زمانہ میں جب اس قسم کے لوگوں کو ''منکوس القلب'' کہا گیا تھا تو آج سورتوں ہی کی ترتیب میں تصرف و ترمیم کی جرأت کیوں کی جائے۔ ہم بے جا جرأت کے ان مجرموں کو کیا سمجھیں یا کیا کہیں۔ حالانکہ میں نے جیسا کہ عرض کیا سورتوں کی ترتیب کا مسئلہ چنداں دشوار بھی نہیں ہے۔ خود بخاری ہی میں ہے کہ ایک عراقی ام المومنین عائشہ صدیقہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا کہ ذرا اپنا قرآن مجھے دکھایئے۔ ام المومنین نے فرمایا کہ کس لئے دکھاؤں۔ اس نے کہا کہ آپ کے قرآن کی جو ترتیب ہے یعنی سورتوں کی جو ترتیب ہے اسی ترتیب سے میں بھی اپنے قرآن کی سورتوں کو مرتب کرنا چاہتا ہوں۔ ام المومنین نے اس وقت جواب میں فرمایا کہ

مایضرک ایہ قرات (بخاری، ج ۲ ص ۷۴۷)

کسی طرح پڑھو تم کو اس سے نقصان نہ پہنچے گا۔

میں نے پہلے بھی کہیں کہا ہے کہ بچوں کے لئے عم کا پارہ سہولت کے لئے آج بھی اس ترتیب پر نہیں چھپتا جس ترتیب پر قرآن میں یہ سورتیں ہیں اور یہ وہی بات ہے کہ ایک ہی مصنف کی چند کتابوں کو آپ جس ترتیب سے چاہیں جلد بندی کرا سکتے ہیں۔ کتاب کے معانی و مطالب پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

پس اصل مسئلہ ہر ہر سورہ کی آیتوں کی ترتیب کا ہے اور اس مسئلہ میں جیسا کہ سیوطی نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کا اول سے آخر تک اس پر اتفاق ہے کہ آیتوں کی ترتیب خود رسول اللہ ﷺ کی جبریل علیہ السلام کے حکم سے دی ہوئی ہے۔ اس ترتیب میں کسی قسم کی ترمیم خود قرآن کی ترمیم ہے۔ سیوطی کے الفاظ یہ ہیں کہ

Marfat.com

ترتیب الأیات فی السور بتوفیفه صلی الله علیه وسلم وامره غیر خلاف فی هذا بین المسلمین (اتقان، نوع ۱۸)

ہر ہر سورہ میں آیتوں کی ترتیب رسول اللہ ﷺ کے بتانے سے اور حکم سے دی گئی ہے' اس میں مسلمانوں کے اندر کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اور میری تو سمجھ میں بھی نہیں آتا کہ ایسی بھی کوئی کتاب کیا کسی مصنف کی ہوسکتی ہے کہ اس کے فقروں کو تو کسی نے بنایا ہو اور ان فقروں کو جوڑ کر عبارت کسی دوسرے نے بنائی ہو۔

ایسا معلوم ہوتا ہے اور میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ عہد صدیقی میں سورتوں کی جلد بندی جس ترتیب سے کردی گئی تھی اس کا پابند دوسروں کو نہیں بنایا گیا تھا بلکہ جیسے کسی مصنف کی چند کتابوں کو جلد بندھوانے والے جس ترتیب کے ساتھ چاہتے ہیں جلد بندھوا دیتے ہیں۔ ابتدا میں اسی قسم کی انفرادی آزادی مسلمانوں کو جو تھی اس کا نتیجہ یہ تھا کہ سورتوں کی ترتیب کے لحاظ سے بعض صحابیوں کے قرآن کی ترتیب دوسرے صحابی کے قرآنی نسخے سے کچھ مختلف بھی ہوتی تھی مثلاً غیر معیاری روایتوں میں ہے کہ ابن مسعودؓ کے مصحف میں نون کی سورہ الذاریات کے بعد' القیامہ کی سورہ عم یتساء لون کے بعد' النازعات کی سورہ الطلاق کے بعد اور الفجر کی سورہ التحریم کے بعد۔ اسی طرح ابی بن کعب صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مصحف میں کہتے ہیں کہ الکہف اور الحجرات کی سورتیں نون کے بعد' تبارک حجرات کے بعد' النازعات الواقعہ کے بعد' الم نشرح قل ہو اللہ کے بعد تھی۔

لیکن عہد عثمانی میں حضرت ابوبکر صدیق کے زمانہ کے مجلد کرائے ہوئے قرآن کی نقلیں حکومت نے مرکزی صوبوں میں تقسیم کر کے یہ حکم مسلمانوں کو جب دیا گیا کہ سورتوں کی ترتیب میں بھی اسی کی پابندی کی جائے اور اس حکم کے بعد دوسری ترتیب سورتوں میں بھی قانوناً ممنوع قرار دے دی گئی تو اس وقت سے یہ اختلاف بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔

باقی یہ سوال کہ ابوبکر صدیقؓ کے عہد حکومت میں جس ترتیب سے سورتوں کی جلد بندی کرائی گئی تھی آیا یہ صحابہ کی رائے سے فیصلہ کیا گیا تھا یا رسول اللہ ﷺ کے حکم سے یہ ترتیب سورتوں میں قائم کی گئی' کوئی واضح روایت اس باب میں نہیں ملتی لیکن امام مالکؒ فرمایا کرتے تھے کہ

انما الف القران علیٰ ما کانوا یسمعون من النبی صلی الله علیه وسلم (اتقان، ص ۸۸)

یعنی اس وقت قرآنی سورتوں میں ترتیب اسی ترتیب کی پیروی میں دی گئی جس ترتیب سے صحابہ قرآن کو رسول اللہ ﷺ سے سنتے تھے۔

امام مالک کی اس تاریخی شہادت کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ جس سال رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی جبریل علیہ السلام کو اس سے پہلے جو رمضان گزرا تھا' دو دفعہ قرآن آپ نے سنایا تھا۔ یہ روایت بخاری وغیرہ تمام صحاح کی کتابوں میں پائی جاتی ہے۔ اس وقت تک بجز چند آیتوں کے قرآن پورا نازل ہو چکا تھا۔ پس جس ترتیب سے رسول اللہ ﷺ نے جبریل کو سنایا تھا کوئی وجہ نہیں ہوسکتی کہ سورتوں کی جلد بندی میں اس طرز عمل کی پیروی نہ کی جاتی۔

Marfat.com

پس سورتوں کی ترتیب کا مسئلہ بھی اس لحاظ سے جبریل امین ہی کا توثیق یافتہ ہے اور خدا کا فضل ہے کہ عہد عثمانی کے اس فرمان کے بعد جس میں عہد صدیقی کے مرتبہ مصحف کی پیروی ہر مسلمان کے لئے لازم کردی گئی' اس وقت تک مسلمان مشرق و مغرب میں اول سے آخر تک اسی کے پابند ہیں البتہ ضرورتاً جیسے بچوں کی تعلیم وغیرہ کی سہولت کے لئے کبھی اس آزادی سے بھی نفع اٹھالیا جاتا ہے جو اس فرمان کے نفاذ سے پیشتر صحابہ میں پائی جاتی تھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ گو قرآن کے پڑھنے پڑھانے کے سلسلے میں تجویدی خدمات اور اس کے سمجھنے سمجھانے میں تفسیری کارناموں کے سوا خود قرآن کے لکھنے لکھانے میں بھی مسلمانوں نے جن اولوالعزمیوں کا بھی ثبوت دیا ہو' عربی غیر عربی ہر قسم کے مسلمانوں کے لئے قرآن کا پڑھنا آسان ہو جائے۔ اس کے لئے انہوں نے جو کچھ بھی کیا ہو۔ حروف میں غیر معمولی محاسن پیدا کئے گئے' اعراب وزیر وزبر پیش جزم تشدید وغیرہ جیسی ایجادیں کی گئیں حتیٰ کہ یہ واقعہ ہے کہ قرآن کو مسلمانوں نے سونے موتی اور مختلف قسم کے جواہر کے سیال محلول سے بھی بکثرت لکھوایا اور کیا کیا بتاؤں کہ اس تیرہ سو سال کے عرصے میں کیا کچھ نہیں کیا۔

لیکن پیغمبر ﷺ کی وفات کے چودہ سال بعد عہد عثمانی میں قرآنی سورتوں کی جس ترتیبی شکل پر اتفاق و اجماع قائم ہوگیا' اس کے متعلق یہ خیال کہ اس میں ردوبدل کا کسی حیثیت سے بھی کچھ امکان ہے' خیال تو خیال حقیقت یہ ہے کہ کبھی کسی زمانہ میں کسی کو کسی قسم کا خطرہ بھی اس وقت تک نہ ہوا تھا جب تک کہ عیسائی پادریوں نے استشراقی کھال اوڑھ کر اغوائی القاء اور وسوسہ اندازیوں کی مہم شروع نہ کی تھی لیکن یابی اللہ الا ان یتم نورہ ولو کرہ الکفرون۔

حواشی

۱۔ اسی سے اندازہ کیجئے کہ عبداللہ بن سلام صحابیؓ جو علماء بنی اسرائیل میں سے تھے' جب رسول اللہؐ کے دست مبارک پر بیعت کی سعادت ان کو حاصل ہوئی تو انہوں نے عرض کیا کہ قرآن کے ساتھ تورات کی تلاوت بھی جاری رکھوں۔ آپ نے فرمایا "اقرء ہذا لیلۃ وہذا لیلۃ" (یعنی ایک رات قرآن پڑھا کرو اور ایک رات تورات) تذکرہ حفاظ ذہبی۔ ص ۲۶ ج ا۔ "طبقات ابن سعد" میں بھی ابوالجلاء الجونی کے تذکرے میں لکھا ہے کہ سات دن میں قرآن اور چھ دن میں تورات ختم کرنے کا عام دستور اپنے لئے انہوں نے مقرر کرلیا تھا اور ختم کے دن لوگوں کو جمع کرتے تھے کہ اس دن رحمت نازل ہوتی ہے۔ ابن سعد۔ ج ا/ ۷ ص ۱۶۱ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ قرآن کی صحیح راہنمائی میں اس قسم کی کتابوں کے پڑھنے سے جہاں تک میرا ذاتی تجربہ ہے خود قرآن کے سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ انجیل و تورات خیر ان تو پوچھنا ہی کیا میں سنسکرت سے واقف نہیں ہوں لیکن اردو میں وید کے بعض حصوں کا ترجمہ ہوگیا ہے۔ اس کا ایک دن مطالعہ کر رہا تھا جو یجروید کا ایک ٹکڑا تھا۔ ایک جگہ مجھے یہ فقرہ اس کتاب میں ملا "یعنی اے اگنی تو خوبصورت بچہ ہے۔" پودوں میں سے نکلا ہوا تاریکی کو دور کرتا ہوا ماؤں سے شور کرتا ہوا پیدا ہوا ہے۔ ادھیا ۴۳/ ۱۱۔ گو کہتے ہوئے کچھ ڈر بھی معلوم ہوتا ہے لیکن جو واقعہ پیش آیا اس کا اظہار کرتا ہوں۔ اس اشلوک نے معاً میرے دماغ کو قرآن کی ان آیتوں کی طرف منتقل کردیا جن میں ارشاد ہوا ہے کہ "تم دیکھتے ہو اس آگ کو جسے تم پیدا کرتے یا نکالتے ہو۔ کیا تم نے اس کے درخت کو اگایا یا ہم ہیں اس کے اگانے والے" (الواقعہ)۔ قریب قریب یہی مضمون سورہ یاسین میں بھی ہے۔ عام مفسیر عرب کے بعض خاص درختوں کا ذکر کرکے لکھ دیتے ہیں کہ ان کی شاخوں کو باہم رگڑ کر عرب آگ پیدا کیا کرتے تھے۔ اس کی طرف اشارہ ہے لیکن یجروید کا یہ طرز تعبیر قرآن کے طرز تعبیر سے اس درجہ ملتا جلتا تھا کہ خیال گزرا کہ کیوں نہیں قرآن میں بھی "درخت"

Marfat.com

کو عام درخت سمجھا جائے اور جیسے وید میں ہے کہ آگ خوبصورت بچہ ہے پودوں سے نکالا ہوا یعنی آگ کا ظہور لکڑی ہی کے جلنے سے ہوتا ہے اور اسی سے شور کرتا ہوا پیدا ہوتا ہے۔ قرآن میں بھی کیا اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ (مناظر احسن گیلانی)

۲۔ حد یہ ہے کہ اس سلسلہ میں کتابوں کے جس مجموعے کو دنیا کا قدیم ترین مجموعہ عموماً سمجھا جاتا ہے یعنی ہمارے ملک کی آکاش بانی وید کے متعلق آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ قرآن مجید جو اس سلسلہ کی آخری کتاب ہے' اس کے پانچ چھ سو سال بعد قلم بند ہوئی۔ البیرونی جو دسویں صدی عیسوی میں ہندوستان آیا تھا' اس کا بیان ہے کہ اس کی آمد سے کچھ ہی دن پہلے ایک کشمیری پنڈت نے وید کو کتابی قالب عطا کیا ورنہ اس سے پہلے پشتہا پشت سے برہمنوں کا خاص طبقہ اس کو زبانی یاد کرتا چلا آرہا تھا۔ (دیکھو کتاب ہندوستان کے ازمنہ وسطی کی معاشرت و اقتصادی حالت از عبداللہ یوسف علی۔ ص ۱۷) ڈاکٹر گپتا نے اپنی کتاب ''ہندی فلسفہ'' میں لکھا ہے کہ عموماً ویدوں کے قلمبند کرنے کو زمانہ تک کفر سمجھا جاتا تھا۔ برہمن اپنے استادوں سے سن کر زبانی یاد کر لیتے تھے اسی لئے اس کا نام سرتی تھا۔ دیکھو ہندی فلسفہ۔ ج ا ص ۱۶ مترجمہ دارالترجمہ حیدرآباد۔

۳۔ تفسیر فتح البیان۔ ج ۹ ص ۲۸ میں دیکھئے ''کتاب مسطور جو رق منشور میں لکھی ہوئی ہے اس سے مراد قرآن ہے۔''

۴۔ قرآن میں بیشی اور کمی یا اضافہ و نقص کے عدم امکان کے اس مسئلہ کو استنباط قرآنی آیتوں ہی سے مولانا گیلانی نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے اور یہ مضمون اسی سے ماخوذ ہے۔

۵۔ پنڈت سندر لال جی اپنی مشہور کتاب ''گیتا اور قرآن'' میں وید کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کی (یعنی ویدوں کی) زبان اتنی پرانی اور عجیب ہے اور ایک ایک منتر کے اتنے اتنے ارتھ لگائے جاسکتے ہیں کہ بے پڑھے لوگوں کے لئے نہیں بلکہ ودوانوں (علماء) کے لئے بھی ہزاروں برس سے وید ایک پہیلی رہا ہے اور ہمیشہ پہیلی ہی رہے گا۔ (ص ۹۹۔ کتاب مذکور اردو ایڈیشن)

۶۔ رق' قرطاس' صحیفہ' صحف ان چاروں الفاظ سے وہ اوراق سمجھ میں آتے ہیں جن پر ایام جاہلیت میں لوگ لکھتے تھے جو جھلی یا باریک کھالوں سے بنائے جاتے تھے۔

۷۔ اسی سلسلہ کا مشہور لطیفہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جو عرب کے مضری قبیلہ سے نسلی تعلق رکھتے تھے جب آپ کے مقابلہ میں مضری قبیلہ کے دوسرے حریف عربی قبیلہ ربیعہ کے ایک آدمی مسیلمہ نے بھی نبوت کا دعوے کا اعلان کر دیا تو لکھا ہے کہ طلحۃ النمری قبیلہ ربیعہ کا ایک سردار مسیلمہ کے پاس آیا۔ گفتگو کے بعد طلحہ نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تُو (مسیلمہ) جھوٹا ہے اور محمد سچے ہیں' مگر اسی کے ساتھ طلحہ نے کہا کہ ربیعہ کا کذاب (جھوٹا) مضر کے صادق (راستباز) سے مجھے زیادہ محبوب ہے۔ اس کے بعد مسیلمہ کے رفقاء میں شریک ہوگیا۔ (ص ۲۴۶۔ طبری ج ۳) مسیلمہ کے دعوے کی بنیاد قومی حمیت و عصبیت پر مبنی تھی۔ اس کا پتہ ان فقروں سے بھی چلتا ہے جو قرآن کے مقابلہ میں شریر بنایا کرتا تھا۔ حضرت ابوبکر کے سامنے سنانے والے نے سنایا تھا کہ مسیلمہ یہ بھی کہتا تھا ''یا ضفدع نقی نقی لا الشارب تمنعین ولا الماء تکدرین لنا نصف الارض ولقریش نصف الارض ولکن قریشاً قوم یعتدون (اے مینڈک کی ٹراٹرا تو نہ پانی پینے والوں کو روکتی ہے اور نہ پانی کو گدلا کرتی ہے' زمین عرب کی آدھی ہماری یعنی ربیعہ والوں کی اور آدھی قریش کی مگر قریش تو زیادتی سے کام لے رہے ہیں۔ (ص ۲۵۳، ج ۳۔ طبری)

۸۔ قرآن ہی میں ایک جگہ رسول اللہ ﷺ کی توصیف کرتے ہوئے یہ جو فرمایا گیا ہے رسول من الله یتلوا صحفاً مطهرةً فیها کتب قیمة اللہ کی طرف سے پیام لاتے ہیں پڑھتے ہیں پاک صحیفوں کو جن میں استوار اور مضبوط لازوال (تعلیم والی) کتابیں ہیں۔ اس میں ''کتب'' کے لفظ کو ''کتاب'' کی جمع قرار دینا قطعاً لغت کی خلاف ورزی نہیں ہے اور مراد ان سے قرآن کی بھی متعدد کتابیں یا رسالے ہوں جنہیں ہم اصطلاحاً قرآن کی سورتیں کہتے ہیں تو انکار کی کیا کوئی معقول وجہ ہو سکتی ہے؟ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ صحف میں کتابوں کے ہونے کی ترکیب میں لوگوں نے جو دشواریاں پیدا کر کے طرح طرح کی دور از کار تاویلیں کی ہیں ان کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی۔ صرف سیدھا ترجمہ یہ ہو جاتا ہے کہ پاک اوراق جن میں استوار اور مستحکم کتابیں یعنی سورتیں

Marfat.com

لکھی ہوئی ہیں۔ مناظر احسن گیلانی

۹۔ اور مسند احمد میں یہ روایت ہے یعنی آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اتانی جبریل فامرنی ان افضع هذه الأيته بهذا الموضع من هذه السورة (جبریل آئے اور مجھے حکم دیا کہ میں اس آیت کو اس سورت کی فلاں جگہ پر رکھوں) اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ سورتوں میں نازل ہونے والی آیتوں کو جبریل علیہ السلام کے حکم سے آپ شریک کرتے تھے (دیکھو مختصر کنز العمال، ص ۴۰ ج ۲) جس کا مطلب یہی ہوا کہ خود رسول اللہ ﷺ نے نہیں بلکہ ہر آیت جس سورہ میں جس مقام پر ہے' یہ کام بھی جبریل ہی کے حکم سے ہوا ہے۔

۱۰۔ دیکھو الکتانی کی ''کتاب التراتیب الاداریہ''۔ ج ا ص ۱۶ مطبوعہ مراکش۔ اسی کتاب میں ان بیالیس کاتبوں کے نام بھی مل جائیں گے۔

۱۱۔ ازالۃ الخفاء۔ ج ۲ صفحہ ۵

۱۲۔ لیکن عام طور پر یہ عجیب بات ہے کہ جن الفاظ میں ان چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کے ترجمہ میں لاپروائی سے لوگوں نے کام لیا جس سے غلط فہمی پھیل گئی۔ میں پوچھتا ہوں کہ کوئی یوں کہے کہ سکولوں میں بچے پتھر کے ٹکڑوں پر لکھتے ہیں یا ہندوستان قدیم میں لکھنے کا جو طریقہ تھا اس کو بیان کرتے ہوئے کہا جائے کہ تاڑ واڑ کے پتوں پر لکھا کرتے تھے۔ کیا یہ واقعہ کی صحیح تعبیر ہوگی؟ کیا سکولوں میں سلیٹ پر لکھنے کا جو رواج ہے پتھر کے ٹکڑے کہنا ان کی صحیح تعبیر ہے۔ اسی طرح ہندوستان قدیم میں تاڑ کے پتوں پر یوں ہی لکھا جاتا تھا۔ جن لوگوں نے خود اپنی آنکھوں سے تاڑ کے پتوں پر لکھی ہوئی کتابوں کو نہیں دیکھا ہے صحیح اندازہ شاید ان کو اب بھی واقعہ کی حقیقی نوعیت کا نہیں ہو سکتا لیکن سچی بات یہ ہے کہ کاغذ کے اوراق سے زیادہ بہتر اور محفوظ طریقہ سے تاڑ کے پتوں پر لکھا جاتا تھا۔ جامعہ عثمانیہ میں مسلم کتب خانہ ہی ان کتابوں کا داخل ہوا ہے جو تاڑ کے پتوں پر لکھی گئی ہیں' دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ بجنسہٖ کچھ اسی قسم کا مغالطہ ان چیزوں کے متعلق بھی عوام میں پھیلا ہوا ہے جن پر قرآنی وحی کی ابتدائی یادداشتوں کو رسول اللہ ﷺ لکھوایا کرتے تھے۔ مشہور ہو گیا ہے کہ کھجور کی شاخوں بلکہ بعض تو کہہ دیتے ہیں کہ کھجور کے پتوں یا پتھروں یا ہڈیوں پر قرآن لکھا ہوا تھا۔ سوچنے کی بات تھی کہ کھجور کے پتوں بلکہ اس کی شاخ میں بھی اتنی گنجائش کہاں ہوتی ہے جس پر سطر دو سطر ہی لکھی جا سکے۔ اسی طرح بن گھڑے پتھر یا گری پڑی ہڈیوں پر لکھنا کیا آسان ہے۔ تفصیل کے لئے تو حضرت الاستاذ مولانا گیلانی کی کتاب پڑھیے۔ خلاصہ یہ ہے کہ حدیثوں میں ادیم' لخاف' کتف' عسیب' اقتاب کے الفاظ آئے ہیں۔ ادیم باریک کھال سے دباغت کے عمل سے تیار ہوتا تھا۔ عرب جو ایک گوشت خور ملک تھا کافی ذخیرہ ادیم کا ان کے یہاں ملتا تھا حتیٰ کہ خیمہ تک صرف ادیم کے چمڑوں سے تیار کیا جاتا تھا۔ لخاف ہر معمولی پتھر کو نہیں کہتے تھے بلکہ بالاتفاق اہل لغت نے لکھا ہے کہ سفید رنگ کی پتلی پتلی چوڑی تختیاں پتھر سے بنائی جاتی تھیں۔ سلیٹ اور ان میں فرق گویا صرف رنگ کا ہوتا تھا۔ اسی طرح اونٹ کے مونڈھے کے پاس کی گول ہڈی طشتری کی طرح بن جاتی ہے۔ اس کو خاص طریقہ سے تراش کر نکالا جاتا تھا۔ کاٹنے کے عمل میں کبھی شگاف وغیرہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ رہ جاتا تھا (دیکھو مسند احمد کی روایت از زید بن ثابت صحابی۔ ص ۱۰۱) اسی لئے ''قطعۃ من الکتف'' بھی اس کو کہتے تھے (مجمع الزوائد۔ ج ا ص ۶۰) عسیب کھجور کی شاخ کو نہیں بلکہ پام قسم کے تمام درختوں کی شاخوں کا وہ حصہ جو تنے سے متصل ہوتا ہے۔ اس میں کافی کشادگی پیدا ہو جاتی ہے۔ تاڑ' ناریل کی شاخوں میں ان کو آپ دیکھ سکتے ہیں۔ عرب کی کھجور کی شاخوں کا یہ حصہ قریب قریب ہندوستان کے ناریل کی شاخوں کے اس حصہ کے برابر ہوتا تھا۔ اس حصہ کو شاخ سے جدا کر لیا جاتا تھا اور ان ہی ٹکڑوں کو خشک کر کے ان پر لکھتے تھے۔ اقتاب' قتب کی جمع ہے' اونٹ کے کجاوہ میں چھوٹی پھٹیاں جو استعمال ہوتی ہیں ان کو کہتے ہیں۔ یہ چوڑے چوڑے پتلے پتلے تختوں کے ٹکڑے ہوتے ہیں۔ تازہ لکڑی کے تختے تازگی کی وجہ سے عموماً کھردرے ہوتے ہیں اور پرانے کجاووں میں امتداد زمانہ سے ان کا کھردرا پن مٹ جاتا تھا۔ لکھنے کے کام کے بآسانی چیرنے سے وہ بن جاتے تھے۔ بتایا جائے کہ ان تفصیلات سے جو ناواقف ہوگا وہ ان عام پھیلے ہوئے الفاظ سے اگر غلط فہمی کا شکار

Marfat.com

ہو جائے تو کیا بعید ہے۔ مولانا گیلانی کی کتاب میں مبسوط بحث ان کتابی مواد پر کی گئی ہے۔ میں نے اسی کا خلاصہ یہاں درج کیا ہے۔

۱۳۔ ابوداؤد وغیرہ صحاح ستہ کی کتابوں میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث اس باب میں جو مروی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورہ برأت کی آخر کی ان آیتوں کے متعلق رسول اللہ ﷺ اپنے صحابیوں سے فرمایا کرتے تھے کہ صبح وشام جو آدمی ان کی تلاوت سات مرتبہ کرے گا اللہ تعالیٰ دنیا اور دین کے مشکلات اس کی برکت سے حل کر دیں گے۔ ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جن آیتوں کی یہ خاصیت بیان کی ہو کون ہوگا جو معلوم ہو جانے کے بعد ان سے مستفید نہ ہوتا ہوگا۔ اس سلسلہ میں بعض عملی تجربات بھی لوگوں کو صحابہ ہی کے زمانہ میں ہوئے تھے۔ محمد بن کعب نے اس فوجی مہم کا ذکر کرتے ہوئے جس نے روم کے علاقہ پر حملہ کیا تھا یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک فوجی سپاہی کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ راستہ میں بے چارے اٹک گئے۔ اتنے میں کسی نے ان کو سورہ برأت کے انہی الفاظ کا وظیفہ بتایا اور کہا کہ اسی کو پڑھ کر ٹوٹے ہوئے مقام کو جھاڑا کرو۔ لکھا ہے کہ عمل سے اس کی تصدیق ہوئی یعنی ٹانگ ان کی درست ہوگئی اور اتنی درست کہ گھوڑے پر سوار ہو کر فوج میں پھر آکر مل گئے۔ (دیکھو درمنثور، ج ۲ ص ۲۹۷)

۱۴۔ لغت کی کتاب ''مجمع البحار'' میں ''رقاع'' کی تحقیق کرتے ہوئے ایک دوسری حدیث بھی نقل کی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن لوگ آئیں گے۔ وعلی رقبته رقاع تخفق پھر اس کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے اراد بالرقاع ماعلیه من الحقوق المکتوبته فی الرقاع جس کا مطلب یہی ہوا کہ دین اور قرض وغیرہ جیسے مطالبات ادا کئے بغیر جو مر جائیں گے قیامت کے دن ان مطالبات کے وثائق کو اپنی اپنی گردنوں میں باندھے نمودار ہوں گے اور مطالبات کے یہ وثائق رقاع میں لکھے ہوں گے۔ جس سے معلوم ہوا کہ رقاع کا یہ لفظ جو رقعہ کی جمع ہے اس کے متعلق یہ بات کہ وثائق اس پر لکھے جاتے تھے۔ عرب کا عام دستور تھا۔ گویا کاغذ کے لفظ کا جو حال اس وقت اردو میں ہے بلکہ ''رقعہ'' کا لفظ اردو میں بھی تو آج تک لکھی ہوئی تحریروں کے لئے بولا جاتا ہے۔ دیکھو مجمع البحار، ج ا ص ۲۷

۱۵۔ یمن میں یہودی اور عیسائی مذہب پھیلا ہوا تھا اور بڑے بڑے چرچ یہاں قائم تھے جن میں ان مذاہب کا لٹریچر اور اس کی بے شمار کتابیں پائی جاتی تھیں۔ نہ صرف گرجوں میں بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ انفرادی طور پر بھی علماء یہود و نصاریٰ کے پاس کتابوں کا کافی ذخیرہ رہتا تھا۔ کعب احبار ہی کا حال ''طبقات ابن سعد'' وغیرہ میں پڑھیے جس سے میرے اس بیان کی توثیق ہوگی۔ اسی طرح شمال عرب میں خیبر یہود کا مرکز تھا جہاں ان کے دین کی کتابیں بکثرت ملتی تھیں' خود مدینہ منورہ کے قریب مقام قف میں یہودیوں کا بیت المدارس یا مدرسہ تھا' جس میں تاریخی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کتابیں بھی تھیں۔

۱۶۔ مستدرک حاکم کی مذکورہ بالا روایت یعنی صحابی کا بیان کنا حد سا عند النبی صلی الله علیه وسلم نولف القران فی الرقاع (ہم لوگ رسول اللہ کے اردگرد بیٹھ کر قرآن کو رقاع میں تالیف کرتے تھے) خود اسی میں تالیف کرنے کا جو ذکر ہے۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف نقل نہیں کرتے تھے بلکہ جن جن سورتوں کی متعلقہ آیتیں اس وقت تک نازل ہو چکی ہوتیں ان کو رسول اللہ ﷺ کے حکم سے ان کی سورتوں کے ان مقامات پر ترتیب دے کر لکھا کرتے تھے جہاں پر ان کو ہونا چاہیے تھا۔ بیہقی نے بھی تالیف کا مطلب یہی لیا ہے۔ لکھا ہے کہ المراد تالیف ما نزل من الأیات المفرددة فی سورها و جمعها (حاشیہ بخاری۔ ج ۲ ص ۷۴۵) مطبوعہ ہند۔) جس کا حاصل وہی ہے جو میں نے عرض کیا۔ اس کثرت سے صحابیوں نے براہ راست قرآن کو رسول اللہ ﷺ کے سامنے لکھا تھا کہ عہد عثمان میں جب حکومت کی طرف سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ جس جس کے پاس پورا قرآن یا اس کی سورتیں ہوں ان کو لے کر حاضر ہوں تو بیان کیا جاتا ہے کہ لوگوں نے لا لا کر جمع کرنا شروع کیا۔ فکان الرجل یجئی بالورقته و لادیم فیه القران (یعنی لوگ ورق اور چمڑے میں لکھے ہوئے قرآن کے ساتھ حاضر ہوئے) اسی میں یہ بھی ہے کہ حتی جمع من ذلک کثرة (یعنی بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا) بہرحال کہنے کی بات یہ ہے جب یہ سارا ذخیرہ جمع ہو گیا تب

Marfat.com

حضرت عثمانؓ تشریف لائے۔ روایت میں ہے۔

فدعا هم رجلا رجلافنا شدهم لسمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم وهوا مله علیک فیقول نعم (کنز العمال، ج ۲ ص ۵۱)

ایک ایک آدمی (یعنی صحابی) کو بلاتے اور قسم دے دے کر فرماتے کہ واقعی تم نے رسول اللہ ﷺ سے براہ راست سن کر لکھا ہے۔ صحابی کہتے کہ ہاں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہی میں قرآنی سورتوں کی ایسی نقلیں کتنی کثرت سے صحابہ میں پھیل چکی تھیں جو براہ راست خود رسول اللہ کی لکھوائی ہوئی تھیں۔ مناظر احسن گیلانی۔

اس تعداد پر تعجب نہ کرنا چاہیے۔ عام تاریخوں مثلاً طبری وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہزار اور کئی سو آدمی مسلمانوں کی فوج کے یمامہ کی اس مہم میں شہید ہوئے تھے' شہداء میں بڑے بڑے لوگ مثلاً سالم مولیٰ' ابی حذیفہ اور حضرت عمر کے حقیقی بھائی زید بالخطابؓ اس جنگ میں کام آئے۔ قرآن کے متعلق حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہ کو خاص خصوصیت صحابہ میں حاصل تھی۔ بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ جن چار صحابیوں سے قرآن پڑھنے کا حکم عام مسلمانوں کو دیا کرتے تھے ان میں ایک سالم بھی تھے۔ طبری وغیرہ سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ سالم کے ساتھ جو فوجی دستہ تھا وہ اہل القرآن کا فوجی دستہ سمجھا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے سالم ہی سے قرآن پڑھا تھا اور استاد کے ساتھ سب ہی شہید ہوئے تھے۔ حضرت سالم کہتے بھی تھے کہ ہم قرآن والے لوگ ہیں پیچھے ہٹ نہیں سکتے اور واقعہ یہ ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ براہ راست لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ صحابی بیان کرتے ہیں کہ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر رسول اللہ ہم لوگوں کو قرآن یاد کراتے تھے۔ خود صحابہ پر بھی قرآن کے سیکھنے پڑھنے اور یاد کرنے کا جو بے پناہ جذبہ مسلط تھا اور اسی کے ساتھ اس کا بھی اگر خیال کیا جائے کہ امامت سے لے کر قبر میں دفن ہونے تک امتیاز اور ترجیح کا واحد معیاد عہد نبوت میں صرف یہ تھا کہ قرآن کس کو زیادہ یاد ہے وہی امام بنایا جاتا تھا اور شہیدوں میں دفن کے وقت اسی کو پہلے دفن کیا جاتا تھا جو قرآن کے یاد کرنے میں زیادہ آگے ہوتا تھا۔ عرب کا دماغ عام مشغلوں سے اس وقت خالی تھا۔ علمی پیاس ان میں جب پیدا ہوئی تو سب سے پہلے تشنگی بجھانے کے لئے ان کو قرآن ہی ملا۔ صحابہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ قرآن ان کے سینوں میں اس طرح جوش مارتا رہتا تھا جیسے کھولتی ہنڈیا جوش مارتی ہے۔ جہاں کہیں ایک جگہ چند صحابی بھی جمع ہو جاتے تھے تو لوگوں کا بیان ہے کہ دوی کدوی النحل (شہد کی مکھی کی بھنبھناہٹ) کی آواز گونجنے لگتی تھی یعنی قرآن کا ورد ہر ایک شروع کر دیتا تھا۔ ان حالات میں اس پر کیوں تعجب کیجئے اگر یمامہ کی لڑائی میں سات سو قرآن کے حفاظ شہید ہو گئے۔ واقعہ کی اہمیت ہی کا تقاضا تو ہوا جو اس عظیم سانحہ کے بعد حضرت عمرؓ نے ابوبکرؓ کو قرآنی سورتوں کی شیرازہ بندی پر اصرار کے ساتھ آمادہ کیا۔ مناظر احسن گیلانی۔

۱۷۔ سیرۃ ابن ہشام میں ہے کہ بہن کے زدوکوب سے فارغ ہونے کے بعد حضرت عمرؓ کی طبیعت میں شرمندگی سی پیدا ہوئی اور بہن سے بولے "اعطنی الصحیفة التی سمعتکم تقرون آنفا" (ص ۲۱۷ ج۔ بر روض) یعنی جو صحیفہ (کتاب) تم لوگوں سے میں نے سنا پڑھتے ہوئے مجھے دو۔ اس پر ان کی بہن نے کہا کہ تم ناپاک ہو ایسی حالت میں اس کو چھو نہیں سکتے۔ "فاغتسل فاعطته الصحیفة" تب حضرت عمرؓ نے غسل کیا اور ان کی بہن نے صحیفہ ان کو دیا۔) صحیفہ دینے کے اس قصہ کا ذکر علاوہ سیرت کی کتابوں کے دار قطنی کی سنن میں بھی ہے۔ البتہ بجائے غسل کے اس میں وضو کرنے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ بہر حال "ثم اخذ الصحیفة" کے الفاظ اس روایت میں بھی ہیں۔ روض الانف میں لکھا ہے کہ اس صحیفہ میں صرف ایک سورہ طٰہٰ ہی نہیں تھی بلکہ طٰہٰ کے سوا کا بھی پتہ چلتا ہے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اذا الشمس کورت کی سورہ بھی اس صحیفہ میں تھی جو حضرت عمرؓ نے اپنی بہن سے مانگ کر پڑھا تھا۔ دیکھو ج اص ۲۱۷۔ روض الانف سہیلی۔

۱۸۔ مثلاً حدیثوں میں ہے کہ ناظرہ دیکھ کر قرآن پڑھنے کا درجہ اسی قدر بلند ہے جتنا کہ فرض نماز کو نفل نماز پر فضیلت حاصل ہے' بعض

روایتوں میں ہے کہ اللہ رسول کو جو دوست رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ قرآن کو مصحف میں پڑھے اور یہ روایتیں تو صحاح کی عام کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔ مگر داری کی وہ تاریخی روایت جس میں ہے کہ رسول اللہ آخری خطبہ میں جب اس مقام پر پہنچے یعنی فرما رہے تھے کہ لوگو! قبل اس کے کہ علم اٹھالیا جاوے اس کو حاصل کرو اس پر ایک اعرابی نے کہا کہ کیا علم اٹھالیا جاوے گا حالانکہ ''المصاحف'' یعنی مکتوبہ قرآن کے نسخے ہمارے درمیان موجود ہیں۔ کیا اس سے زیادہ صریح شہادت اس بات کی مل سکتی ہے کہ عہد نبوت میں گھر گھر قرآن کے نسخے پھیل چکے تھے۔ اس سلسلہ میں چاہا جائے تو اور بھی بہت سی روایتیں پیش ہوسکتی ہیں۔ مناظر احسن گیلانی

۱۹۔ میرا اشارہ بخاری وغیرہ کی اس روایت کی طرف ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں قرآن کو چار آدمیوں نے جمع کیا اور یہ سب انصار سے تھے یعنی ابی بن کعب' معاذ بن جبل' ابوزید اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم عام طور پر جمع کرنے کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ زبانی یاد کیا تھا مگر بیر معونہ میں ستر صحابی جو شہید ہوئے تھے ان کی طرف جمعوا القرآن (یعنی انہوں نے قرآن کو جمع کیا تھا) یہ الفاظ منسوب کئے گئے ہیں۔ ابن شہاب زہری بجائے جمعوا کے دعوہ کا لفظ اس موقع پر استعمال کرتے تھے۔ یعنی زبانی یاد کیا تھا۔ ان لوگوں نے قرآن کو (کنزالعمال) پھر بخاری میں جن چار انصاری صحابیوں کی طرف جمع قرآن کی خدمت کو جو منسوب کیا گیا ہے یقیناً اس کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ جمع قرآن کی اس خدمت کی نوعیت یاد کرنے سے یعنی سینہ میں جمع کرنے سے مختلف تھی اور وہ یہی ہوسکتی ہے کہ بجائے سینوں کے مانا جائے کہ ان چار انصاری بزرگوں نے پورے قرآن کو یعنی اس کی ہر ہر سورہ کو ایک ہی سائز کے اوراق پر لکھنے کی امتیازی خدمت انجام دی تھی جس کی تعبیر جمع کرنے کے لفظ سے کی گئی ہے بلکہ چار صحابیوں کے جمع کرنے کا ذکر جس روایت میں کیا گیا ہے اسی روایت کے دوسرے طریقوں کے جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ جمع قرآن کی یہ خدمت ان ہی چار تک راوی نے جو محدود کی ہے اس کا تعلق انصار سے ہے۔ یعنی تمام سورتوں کو ایک ہی تقطیع کے اوراق پر لکھ کر سب کو ایک جگہ جمع کرنے کا کام انصاری صحابیوں میں سے ان چار نے انجام دیا تھا۔ محمد بن کعب القرظی کے حوالہ سے ''کنزالعمال'' ہی میں جو روایت ہے اس میں یہ الفاظ بھی ہیں ''جمع القرآن فی زمان النبی ﷺ خمسته من الانصار'' یعنی انصار کے پانچ آدمیوں کا یہ حال تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں انہوں نے قرآن جمع کیا تھا' جس سے معلوم ہوا کہ انصار میں بھی جمع کرنے والوں کی تعداد چار سے زیادہ تھی اور یہ بات تو واضح ہی ہوگئی کہ اس قصہ کا تعلق صرف انصار کے طبقہ سے تھا۔ نیز طبرانی کے حوالہ سے ''کنزالعمال'' ہی میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ ''انصار میں سے مجمع بن جاریہ نے بھی قرآن جمع کیا تھا بجز دو یا تین سورتوں کے۔'' اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کسی مصنف کی جیسے کل کتابیں لوگ جمع کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن اکثروں کے پاس کل تصنیفات نہیں ہوتے' عہد نبوت میں عام صحابہ کا قرآنی سورتوں کے متعلق یہی حال تھا۔ ''کنزالعمال'' میں ابن داؤد کی ''کتاب المصاحف'' کے حوالے سے صحابہ کے متعلق یہ الفاظ صراحتاً بھی منقول ہیں یعنی ''کتبوا ذلک فی الصحف و لالواح'' (یعنی صحابہ نے قرآن کو صحیفوں اور تختیوں میں لکھ لیا تھا)۔ ج ۲ ص ۴۵ بر مسند احمد۔ میں لوگوں سے کیا ہوں ''کنزالعمال'' ہی میں اس واقعہ کا تذکرہ جو ملتا ہے کہ قیس بن مروان نامی ایک صاحب کوفہ سے حضرت عمر کے پاس آئے اور آ کر عرض کیا کہ ایک شخص کو کوفہ میں چھوڑ کر آیا ہوں جو قرآن کو زبانی لکھواتا ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ یہ سن کر غصہ سے بے خود ہو گئے اور غصہ میں فرما رہے تھے ارے یہ کون شخص ہے جو ایسی حرکت کرتا ہے۔ قیس نے کہا کہ عبداللہ بن مسعود یہی کرتے ہیں۔ ابن مسعود کا نام سن کر حضرت عمر کچھ ٹھنڈے پڑ گئے اور فرمایا کہ ''خیر قرآن کے جاننے والوں میں میں نہیں جانتا کہ ان سے بھی بڑا عالم کوئی رہ گیا ہے۔'' میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس روایت کے بعد یہ خیال کہ عام طور پر قرآن کو زبانی لکھوانے کی ممانعت تھی اور یہ کہ جو بھی قرآن لکھتا تھا کسی مکتوبہ نسخہ سے نقل کرتا تھا اگر قائم کیا جائے تو اس کے سوا کیا کوئی دوسرا احتمال پیدا ہوتا ہے۔ مناظر احسن گیلانی''

Marfat.com

۲۰۔ امام مالک شہاب زہری سے اور شہاب زہری عبداللہ بن عمر کے صاحبزادے سالم کے حوالے سے یہ روایت نقل کرتے تھے کہ زید بن ثابت نے ''القراطیس'' پر ابوبکرؓ کے حکم سے قرآن کی کل سورتوں کو لکھا تھا۔ غالباً ایک ہی تقطیع کے اوراق جب بنائے جاتے تھے تو ان کو قراطیس کہتے تھے۔ (دیکھو اتقان۔ ص ۸۳ ج ۱) ایک سائز کے اوراق پر لکھے ہونے کی وجہ سے ابوبکر صدیقؓ کی حکومت کے مرتب کردہ اس نسخہ کو اربعہ بھی کہتے تھے (دیکھو اتقان۔ ص ۸۵) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ طول وعرض ان اوراق کا متساوی تھا ربعہ جس کا ترجمہ ''چوکھونٹا'' کیا جاسکتا ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ مناظر احسن گیلانی۔

۲۱۔ واقعہ یہ ہوا تھا کہ ایک بدوی جس کا نام سواء بن قیس المحاربی تھا اس نے رسول اللہ ﷺ سے ایک گھوڑے کی فروخت کا معاملہ کیا مگر بعد کو مکر گیا اور بولا کہ معاملہ کس کے سامنے ہوا۔ واقعہ یہ تھا کہ معاملہ کے وقت کوئی دوسرا موجود نہ تھا۔ خزیمہ انصاری نے کھڑے ہو کر کہا کہ بیشک معاملہ ہوا تھا۔ رسول اللہؐ نے پوچھا کہ تم کب موجود تھے جو گواہی دے رہے ہو۔ خزیمہ نے کہا کہ آپ کی رسالت کو جب ہم حق سمجھتے ہیں تو بھلا گھوڑے کے معاملہ میں آپ کوئی خلاف واقعہ دعویٰ فرما سکتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے اسی موقعہ پر فیصلہ فرمایا کہ خزیمہ جس کی موافقت یا مخالفت میں گواہی دیں ان کی گواہی کافی قرار دی جائے گی۔ (اسد الغابہ۔ ج ۲ ص ۱۶۴)

۲۲۔ ان صحابی کا نام خزیمہ تھا یا ابوخزیمہ بخاری تک کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ راویوں سے کسی راوی کو ان کا نام خزیمہ یاد رہا اور کسی کو ابوخزیمہ' اگرچہ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ خزیمہ نام بتانے والے صحت سے زیادہ قریب ہیں۔ ان روایتوں میں ایک اختلاف یہ بھی پایا جاتا ہے کہ اس واقعہ کا تعلق عہد صدیقی کی قرآنی خدمت سے تھا یا یہ حضرت عثمانؓ کی حکومت نے جو کمیٹی بٹھائی تھی اس وقت یہ واقعہ پیش آیا تھا مگر ظاہر ہے کہ عہد عثمانی میں اس واقعہ کے پیش آنے کی صورت ہی کیا تھی۔ عہد صدیقی میں قرآن کے سارے اجزاء کی شیرازہ بندی ہو چکی تھی۔ عہد عثمانی میں تو صرف عہد صدیقی کے اسی مرتبہ نسخہ کی نقل کی گئی تھی جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن چند آیتوں کے متعلق زید بن ثابت نے مذکورہ بالا بیان دیا تھا روایت کرنے والے خود ان آیتوں کی تعیین میں کچھ مبتلائے اشتباہ ہو گئے تھے۔ بعض تو وہی سورہ توبہ کا نام لیتے تھے اور بعض کہتے تھے کہ سورہ احزاب کی رجال صدقوا ماعاھدوا اللہ الآیہ والی آیت تھی اور غالب قرینہ یہی ہے کہ برأت ہی والی آیت تھی کیونکہ عام طور پر بطور وظیفہ کے ان ہی دو آیتوں کے پڑھنے کا حکم رسول اللہ ﷺ نے دیا تھا اسی لئے ہر خاص و عام کے یاد ہونے کی وجہ سے زیادہ تفتیش وتلاش کی ضرورت بھی نہ تھی بلکہ روایتوں کے مختلف الفاظ پر اگر غور کیا جائے تو ان سے واقعہ کی اصل صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی لکھوائی ہوئی یادداشتوں میں سے صرف یہی ایک ٹکڑا جس میں توبہ کی یہ دونوں آیتیں تھیں' زید کو نہ مل سکا تھا۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ وہ ٹکڑا مفقود تھا۔ فالتمسنا ھا فوجدنا ھا عند خزیمۃ (پھر ہم لوگوں نے اس کو ڈھونڈھنا شروع کیا تو خزیمہ کے پاس وہی گمشدہ رقعہ یا ٹکڑا مل گیا) بجائے مفرد صیغے کے التمسناھا ہم نے ڈھونڈھا) فوجدناھا (پھر ہم نے پایا) جمع کا صیغہ حضرت زید نے جو استعمال کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے صحابی تلاش میں بھی اور اس ٹکڑے کے پانے میں بھی شریک تھے۔ خزیمہ کے پاس یہ رقعہ یا ٹکڑا کیسے پہنچ گیا تھا ممکن ہے کہ نقل کرنے یا کسی دوسری غرض سے رسول اللہ سے خزیمہ مانگ کر لے گئے اور واپسی سے پہلے آنحضرت ﷺ کی وفات ہوگئی یا کسی اور وجہ سے واپس کرنے کا موقع ان کو نہ مل سکا۔

۲۳۔ تبیان فی مباحث القرآن۔ ص ۴۴۔ صالح الجزائری

۲۴۔ زید بن ثابتؓ نوعمری میں مسلمان ہوئے تھے۔ آنحضرت ﷺ خصوصیت کے ساتھ کتابت کا کام ان سے لیا کرتے تھے حتیٰ کہ اس سلسلہ میں یہودیوں کے حروف اور زبان کی تعلیم بھی رسول اللہ ﷺ کے حکم سے انہوں نے حاصل کی تھی۔ یہ ان صحابیوں میں ہیں جنہوں نے تصنیفی یادگار چھوڑی۔ فرائض ومواریث کے متعلق ان کی ایک کتاب کا ذکر مورخین کرتے ہیں۔ مناظر احسن گیلانی

۲۵۔ جس حدیث میں ''سبعہ حرف'' کا ذکر آیا ہے جس کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ سات حرفوں پر قرآن نازل ہوا ہے' اس کی شرح میں

Marfat.com

حدیث کے شرح کرنے والوں نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن ارباب تحقیق کا فیصلہ یہی ہے کہ "سبعہ" یعنی سات کے عدد سے واقعی سات کا عدد مراد نہیں ہے بلکہ اردو میں جیسے بیسیوں کے لفظ سے صرف کثرت مقصود ہوتا ہے یہی حال عربی زبان میں سات کا ہے اور "احرف" یعنی حرفوں سے وہی تلفظ اور لب ولہجہ کا اختلاف مقصود ہے۔ دیکھو طیبی شرح مشکوٰۃ وغیرہ

۲۶۔ اور واقعی اس پر تعجب ہوتا ہے کہ قراء قرآن کے طبقہ اولیٰ ہی میں ہم قالون اور ورش وغیرہ نام رکھنے والے بزرگوں کو پاتے ہیں۔ ورش تو خیر کہتے ہیں کہ ورشان (فاختہ) کے عربی لفظ کا اختصار ہے لیکن قانون کے متعلق تو اس کی تصریح کی گئی ہے کہ یہ یورپین یعنی رومی لفظ ہے۔ لکھا ہے کہ عربی میں پہنچ کر صرف اتنا تصرف ہوا کہ کالون کو قالون یعنی کاف کو قاف سے بدل دیا گیا۔ کہتے ہیں کہ کالون کے معنی جید کے ہیں۔ باقی یوں بھی آپ کو قراء سبعہ جو اس فن کے ائمہ ہیں' ان میں زیادہ تر عجمی النسل اور موالی طبقہ سے تعلق رکھنے والے حضرات ملیں گے۔ مناظر احسن گیلانی

۲۷۔ قبائل عرب کے لب ولہجہ کے اختلاف کے سلسلہ میں جو مثالیں دی گئی ہیں علاوہ دوسری کتابوں کے الجزائری کی "تبیان" میں بھی اس کا کافی مواد مل سکتا ہے' دیکھئے صفحات ۳۲'۴۷ وغیرہ۔ ابن مسعودؓ والی روایت کا ذکر بھی اسی کتاب میں کیا ہے۔

۲۸۔ یعنی بعض بعض کو کافر ٹھہرانے لگے' اس کی تفصیل بھی اور کتابوں کے سوا "تبیان" ہی میں مل سکتی ہے۔

۲۹۔ دیکھو مختصر کنز العمال بر حاشیہ مسند احمد۔ ج ۲ص ۵۰

۳۰۔ یہ عجیب بات ہے کہ مسلمانوں میں یہ غلط فہمی زمانہ سے پھیلی ہوئی ہے۔ تیسری صدی کے مشہور صوفی اور عالم حارث محاسبی کا یہ قول "اتقان" میں سیوطی نے نقل کیا ہے۔" المشهور عند الناس ان جامع القرآن عثمان و ليس كذلك انما حمل عثمان الناس على القراه لوجه واحد" (لوگوں میں مشہور ہے کہ حضرت عثمان جامع القرآن ہیں حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ انہوں نے لوگوں کو قرآن کی ایک ہی قراۃ پر صرف جمع کیا) ص ۸۶۔ "اتقان" ہی میں ابن التین کا قول نقل کیا ہے کہ صرف قریش کے لغت اور لب ولہجہ پر حضرت عثمانؓ نے قرآن لکھوایا۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ "قد وسع فی قراءتہ بلغتہ غیرہم رفعاً للحرج" یعنی صرف کتابت کی حد تک قریش کے لب ولہجہ کی پابندی کی گئی۔ باقی پڑھنے میں حضرت عثمان نے بھی اجازت دے رکھی تھی کہ دوسرے لہجہ و تلفظ میں بھی لوگ پڑھ سکتے ہیں۔ اس سے تنگی اور مشقت کا ازالہ مقصود تھا۔ ص ۸۵

۳۱۔ طبقات ابن سعد۔ ذکر عبدالملک۔

۳۲۔ ہمارے بنی ہاشم کے ائمہ وحکمراں بنی امیہ کے حکمرانوں سے بہتر ہیں۔

۳۳۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ جنگ کے لئے خدا اور علیؓ مسلمانوں کی طرف سے کافی ہوگئے۔

۳۴۔ یہ سارے مضحکات آپ کو تفسیر "روح المعانی" کے مقدمہ ص ۲۳ میں مل سکتے ہیں۔

۳۵۔ یعنی ہم ہی پر ہے قرآن کا جمع کرنا۔

۳۶۔ یعنی ہم پڑھتے تھے اس کو اسی سلسلہ میں جس سلسلہ میں قرآن پڑھتے ہیں۔

۳۷۔ حقیقت یہ ہے کہ جلد (تازیانہ) کی قرآنی سزا جرم زنا کے متعلق قرآن میں نازل ہو چکی تھی اور اسی بناء پر آدمی کنوارا (غیر محصن) ہی کیوں نہ ہو اگر زنا کا مجرم ہوگا تو جلد (تازیانے) کی سزا کا مستحق وہ ہو جاتا ہے مگر قدرتاً یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شادی شدہ یعنی محصن زنا سے بچانے والی چیز یعنی بیوی رکھتے ہوئے بھی اس جرم کا اگر مجرم ہوگا تو جلد (تازیانے) کی سزا کا مستحق وہ ہو جاتا ہے مگر قدرتاً یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شادی شدہ یعنی محصن زنا سے بچانے والی چیز یعنی بیوی رکھتے ہوئے بھی اس جرم کا اگر مجرم ہو تو اس کا جرم اس کنوارے سے یقیناً زیادہ سخت ہے جو اپنی جنسی خواہش کی تکمیل کے ذریعے (بیوی) سے محروم ہے۔ گویا شادی شدہ (محصن) صرف زنا ہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ شرارت کا مرتکب ہے اس لئے صرف زنا کی جو سزا ہے یعنی تازیانے کی سزا سے زیادہ سخت سزا کا طالب خود اس کا جرم ہے۔ زنا کے جرم سے زیادہ شادی شدہ آدمی کے اندر جو شرارت اور بے باکی کی

Marfat.com

کیفیت پائی جاتی ہے اس کا اقتضاء یہ ہوا کہ اس کی سزا میں بھی سختی کا اضافہ کر دیا جائے۔ رجم اس قدرتی اقتضاء کی تکمیل ہے۔ اسی لئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی جیسا کہ بخاری میں ہے فرمایا کرتے تھے کہ "رجمتھا لسنۃ رسول اللہ" (یعنی محصن کی سزا رجم جو میں نے دی تو یہ رسول اللہ ﷺ کی سنت کی بنیاد پر دی) جس کا مطلب یہی ہوا کہ کسی قرآنی قانون پر اس سزا کی بنیاد قائم نہیں ہے۔ رہا یہ کہ قرآن میں خالص زنا ہی کا حکم کیوں اترا اور زنا کے جرم میں احصان کی وجہ سے جو سختی بڑھ جاتی ہے اس حکم کو رسول اللہ ﷺ کی سنت کے سپرد کیوں کر دیا گیا۔ قانونی نزاکتوں سے جو واقف ہیں اس کی مصلحت کو سمجھ سکتے ہیں جس کی تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں ہے۔

۳۸۔ حقیقت یہ ہے کہ "ھلوع" کا عربی لفظ جن مطالب پر مشتمل ہے "بے صبرا" کے لفظ سے وہ صحیح طور پر ادا نہیں ہوتا جب تک سطر دو سطر میں اس کی تشریح نہ کی جائے۔ اس موقع پر ایک لطیفہ کا خیال آیا کہ مولوی خرم علی بلہوری مرحوم کا ایک مشہور شعر ہے کہ: خدا فرما چکا قرآں کے اندر، مرے محتاج ہیں پیر و پیمبر۔ ایک فقیر اسی شعر کو گا گا کر بھیک مانگ رہا تھا جو وہابیوں سے بہت برہم رہتے تھے۔ بولے کہ قرآن میں یہ کہاں ہے۔ میں نے عرض کیا کہ بھائی یایھا الناس انتم الفقراء الی اللہ (اے انسانو! تم سب اللہ کے محتاج ہو) اس کا مطلب یہی تو ہے، مگر وہ یہی کہتے رہے کہ "مرے محتاج ہیں پیر و پیمبر" ان الفاظ کو قرآن میں بتاؤ۔ مناظر احسن گیلانی۔

۳۹۔ سبع کے معنی سات ہیں اور مثانی ایسی چیز کی تعبیر ہے جو دو دو دفعہ دہرائی جائے چونکہ سورہ فاتحہ سات آیتوں پر مشتمل ہے اور اس کی خواندگی کا قانونی دستور یعنی نماز میں پڑھنے کا قاعدہ یہی ہے کہ کم از کم دو دفعہ دربار الٰہی میں دہرائی جائے۔ اسی لئے بیتراء یعنی ایک رکعت کی نماز ممنوع ہے۔ مثانی کہنے کی وجہ یہی ہے۔

۴۰۔ سندی حالت اس روایت کی جو کچھ ہے یہ مسئلہ اور سورہ فاتحہ و معوذتین جن خصوصی حقائق و معارف پر مشتمل ہیں، حضرت الاستاذ گیلانی کی کتاب اور ان کے تفسیری محاضرات میں آپ کو اس کی پوری تفصیل مل سکتی ہے۔

۴۱۔ دنیا کی دفتری حکومتوں میں بھی بسا اوقات یہی کیا جاتا ہے کہ درخواست کی عبارت حکومت خود بنا دیتی ہے۔ اس کو چھاپ کر دفتر میں رکھ دیا جاتا ہے۔ درخواست گزاران مطبوعہ فارم یا تختہ پر دستخط کر کے داخل کر دیا کرتے ہیں۔

۴۲۔ لین پول: خطبات واحادیث رسول۔ ص ۱۰

۴۳۔ اتقان۔ جلد ۲ ص ۵۳۸

۴۴۔ نزولی روایات کی حیثیت اور سنداً ان کا دوسری اسلامی روایات کے مقابلہ میں کیا درجہ ہے ایک مستقل مضمون ہے۔ سب سے پہلا مسئلہ اس سلسلہ کا یہ ہے کہ کسی آیت یا آیتوں کے کسی مجموعہ کے متعلق صحابی یا تابعی جب یہ کہتے ہیں کہ فلاں معاملہ میں نازل ہوئی یعنی نزل فی کذاہ کہتے ہیں تو اس کا واقعی مطلب کیا ہوتا ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ علامہ زرکشی صاحب "البرہان" حضرت شاہ ولی اللہ اور دوسرے اکابر ائمہ اسلام نے تصریح کی ہے کہ جس معاملہ میں یا جس واقعہ پر قرآن کی وہ آیت صادق آتی ہے تو اسی کے متعلق تعبیر کا یہ ایک طریقہ تھا یعنی یہ آیت فلاں چیز پر صادق آتی ہے اسی مفہوم کو نزل فی کذا کے الفاظ سے لوگ ادا کرتے تھے۔ قیامت تک پیش آنے والے واقعات پر قرآنی آیتیں عموماً صادق آتی ہیں اس لئے ہم ہر زمانہ میں کہہ سکتے ہیں کہ یہ آیت فلاں معاملہ یا واقعہ یا مسئلہ کے متعلق نازل ہوئی لیکن اس کا یہ مطلب کہ واقعتاً اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی صحیح نہ ہوگا۔ دیکھو "اتقان" (نوع ۹)۔ شاہ ولی اللہ نے "الفوز الکبیر" میں بھی یہی لکھا ہے۔ ابن تیمیہ اور زرکشی کے اقوال "اتقان" میں ہیں۔ علاوہ اس کے کون نہیں جانتا کہ نزولی روایتوں سے بخاری و مسلم بلکہ صحاح ستہ کی اکثر کتابیں خالی ہیں۔ دوسرے بلکہ زیادہ تر تیسرے درجہ کی کتابوں میں یہ روایتیں ملتی ہیں اور اس پر بھی حال ان روایتوں کا یہ ہے کہ ایک ایک آیت کے متعلق شان نزول کی روایتوں میں متعدد واقعے بیان کئے گئے ہیں۔ ان روایتوں کی کیا حالت ہے ان کا سرسری اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ اور تو اور یہ مسئلہ کہ سب

Marfat.com

سے پہلی نازل ہونے والی آیت تک کے متعلق ایک سے زائد روایتیں پائی جاتی ہیں۔ عام طور پر اقراء کے متعلق مشہور ہے لیکن نزولی روایات کے ذخیرہ میں دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ بعض لوگ سورہ فاتحہ کو بعض لوگ سورہ الفلق کو سب سے پہلی نازل ہونے والی سورہ قرار دیتے ہیں' اسی طرح کہاں نازل ہوئی؟ اس سوال کے جواب میں آپ کو سورہ فاتحہ تک کے متعلق معلوم ہوگا کہ بجائے مکہ کے کہتے ہیں مدینہ میں نازل ہوئی اور یہ تو عام بات ہے کہ ایک ہی آیت کے متعلق پانچ پانچ چھ چھ شان نزول تک مروی ہے۔ ابن قیم نے محدثین کے اس طرز عمل پر کہ ان ہی نزولی روایتوں کی وجہ سے کہہ دیتے ہیں کہ فلاں آیت پانچ دفعہ مثلاً نازل ہوئی' سخت تنقید کی ہے۔ مناظر احسن گیلانی

۴۵۔ ابوحیان توحیدی کے کچھ حالات ''لسان المیزان'' میں حافظ ابن حجر نے بھی بیان کئے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ یہ چوتھی صدی کا آدمی ہے۔ اس عہد کے دو مشہور وزیر صاحب بن عباد اور ابن العمید کے درباریوں میں تھا۔ علم کو دنیا طلبی کا ذریعہ ان ہی وزراء کے دربار میں گھس کر بنانا چاہا جیسا کہ اسی کا بیان ہے۔ اس مقصد میں کامیابی اس کو نہ ہوئی تو بقول اکبر مرحوم: ہوگیا فیل امتحانوں میں۔ اب ارادہ ہے بدمعاشی کا۔ ابوحیان بھی فتنہ انگیزی کے منحوس مشغلہ میں مصروف ہوگیا۔ آدمی قابل تھا اور فلاسفہ کا ادیب اور ادیبوں کا فلسفی تھا۔ ''مقامات حریری'' کے سروجی کا پارٹ ادا کیا کرتا تھا اس لئے بعض لوگوں نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ وہ صوفیوں کا شیخ' فلاسفہ کا ادیب اور ادیبوں کا فلسفی تھا۔ یعنی فلسفہ والوں کے سامنے ادیب بنتا تھا اور ادیبوں کے سامنے فلسفی اور جیسے ابن راوندی کرایہ پر مسلمانوں کے مختلف فرقوں کی طرف سے کتابیں لکھا کرتا تھا بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہی پیشہ تنگ آ کر اس فیلسوف الادبار اور ادیب الفلاسفہ نے اختیار کرلیا تھا۔ جعلی کتابوں کے بنانے میں کمال تھا۔ لکھا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے نام سے ایک طویل خط اس نے تصنیف کیا اور ظاہر یہ کیا کہ حضرت علیؓ نے ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے جب انکار کیا تو دونوں (ابوبکرؓ و عمرؓ) نے مل کر یہ خط حضرت علیؓ کو لکھا تھا۔ اس خط میں کہیں تو خوشامد کی باتیں تھیں اور کہیں دھمکیاں حضرت علیؓ کو دی گئی تھیں۔ الغرض اس جعلی خط کو لکھ کر مسلمانوں میں اس نے پھیلا دیا۔ جب فتنہ زیادہ بڑھا تو بعض لوگوں نے اس سے دریافت کیا۔ ایک دن راز کھول دیا کہ شیعوں کے خلاف خود ہی میں نے یہ جعلی خط بنایا ہے حالانکہ شیعوں سے زیادہ اس میں سنیوں کے خلاف مواد تھا۔ ایسی باتیں ابوبکر و عمر کی طرف منسوب کی گئی تھیں جو کسی معمولی مسلمان کی طرف بھی کاربراری کے سلسلہ میں منسوب نہیں ہوسکتیں۔ اس سلسلہ میں ان حضرت کے اور کارنامے بھی ہیں۔ اسی بناء پر علماء حق نے اس کے متعلق اس فیصلہ کا اپنی کتابوں میں اعلان کیا کہ یہ بڑا جھوٹا' مفتری' دین سے مفلس' علانیہ بیہودہ بکواس کرنے والا اور جن باتوں سے دینی نظام پر زد پڑتی ہو ان کے پھیلانے میں کمال رکھتا تھا۔ حافظ ابن حجر نے ابن مالی کی کتاب ''الفریدہ'' سے یہ الفاظ نقل کئے ہیں۔ ابن جوزی نے بھی لکھا ہے کہ ''ابوحیان زندیق تھا۔ اس کی انہی جسارتوں کی وجہ سے مہلبی وزیر نے اس کو جلاوطن بھی کردیا تھا۔ اصلی نام علی بن محمد تھا۔ لکھا ہے کہ جب مرنے لگا تو اس کے شاگرد جو بستر علالت کے اردگرد جمع تھے اور اس کی زندگی کی خصوصیتوں سے واقف تھے' گھبرا کر بے چاروں نے اللہ اللہ کی تلقین شروع کی اور توبہ استغفار کے لئے اس کو ہدایت کرنے لگے۔ کہتے ہیں کہ ابوحیان نے آنکھیں کھولیں اور سر اٹھا کر بولا کہ کیا میں کسی فوجی سپاہی یا پولیس کے جوان کے پاس جارہا ہوں' پھر کہا ''رب غفور'' کے دربار میں حاضر ہو رہا ہوں۔ اسی آخری فقرے پر دم نکل گیا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوا؟ دراصل اس کے مزاج میں شوخی اور گستاخی تھی۔ ادب سے محروم تھا۔ صاحب بن عباد اور ابن العمید کے دربار میں جب توقعات رکھتا تھا تو لوگوں نے بیان کیا ہے کہ ان کی تعریف میں مبالغہ کرتے ہوئے یہ تک اس نے لکھ مارا کہ یہ دونوں اگر نبوت کا دعویٰ کر بیٹھیں تو ان پر بھی وحی نازل ہونے لگے اور شریعت نئی ہو جائے۔ مسلمانوں کے دینی اختلافات کا خاتمہ ہو جائے۔ متعدد جعلی حدیثوں کے مشہور کرنے میں اس نے خاصی شہرت حاصل کی جن میں حضرت علی والی یہ روایت بھی ہے یعنی قرآن کی نزولی ترتیب کی وجہ سے بیعت سے رکے رہے۔ (دیکھو لسان المیزان، ص ۳۷۲)

Marfat.com

۴۶۔ ''اتقان'' میں سیوطی نے جیسا کہ میں نے عرض کیا بعض غیر مشہور کتابوں کا حوالہ دے کر بھی اس روایت کا ذکر کیا ہے مثلاً ابن الفریس کی کتاب ''الفضائل'' کی طرف منسوب کر کے ابن سیرین ہی کی اس روایت کو درج کرتے ہوئے نئی بات کا اضافہ یہ کیا ہے کہ ابن سیرین سے عکرمہ (مولیٰ ابن عباس) نے اس قصہ کا ذکر کیا تھا اس پر ابن سیرین نے عکرمہ سے دریافت کیا کہ حضرت علی کے قرآن جمع کرنے کا مطلب کیا تھا کہ ''کما انزل الادل فالاول'' یعنی جو پہلے نازل ہوئی اس کو پہلے پھر اس کے بعد جو نازل ہوئی اس کے بعد۔ بالفاظ دیگر ابن سیرین نے یہ سوال کیا کہ حضرت علیؓ نے کیا نزولی ترتیب پر جمع کیا تھا؟ اس روایت میں ہے کہ جواب میں عکرمہ نے کہا کہ جن وانس بھی اکٹھے ہو کر چاہیں کہ قرآن کو اس ترتیب پر مرتب کریں تو یہ ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ عکرمہ کے عربی الفاظ یہ ہیں لو اجتمعت الانس والجن علی ان یولفوہ ذلک التالیف مااستطاعوا۔ اسی طرح ابن اشتہ کی کتاب ''المصاحف'' سے سیوطی نے نقل کیا ہے کہ ابن سیرین کہا کرتے تھے کہ حضرت علی والے مرتبہ قرآن کے متعلق مدینہ کے لوگوں کو لکھا اور بہت تلاش کیا لیکن مجھے نہ مل سکا۔ خود یہ خبر بھی اس روایت کے جعلی ہونے کی دلیل ہے۔ آخر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا یہ نسخہ اور کسی کے پاس نہ سہی خاندان اہل بیت میں اس کے نہ ملنے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے بلکہ بقول ابن حزم حضرت علیؓ کو اپنی خلافت کے زمانہ میں پانچ سال نو مہینے کی مدت ملی، چاہتے تو اپنی حکومت کے ان دنوں میں اپنے مرتبہ نسخہ کو مسلمانوں میں پھیلا دیتے۔

۴۷۔ مثلاً سورہ قل ہو اللہ احد، یا الکوثر یا العصر ہی کو لیجئے۔ تین چار آیتوں سے زیادہ ان میں کوئی سورہ نہیں ہے لیکن جن حقائق اور معانی سے ان میں ہر ایک لبریز ہے اور انسانی زندگی کے جن خاص شعبوں کے متعلق حیرت انگیز انکشافات ان سے ہوتے ہیں، کسی جاننے والے سے پوچھیے۔ کچھ نہیں تو علامہ فراہی کی تفسیر کا اردو میں ترجمہ ہوگیا ہے اسی کا مطالعہ کیا جائے۔

۴۸۔ حال ہی میں میں نے ایک کتاب میں پڑھا کہ نظام الملک طوسی سلجوقی دربار کے مشہور وزیر کے پاس ہدیہ میں ایک عالم جن کا نام عبدالسلام ابو یوسف تھا، قرآن مجید لکھ کر پیش کیا تھا جس میں یہ صنعت رکھی تھی کہ تین رنگ تو انہوں نے جواہرات کو محلول اور سیال کر کے حاصل کئے اور ایک سیال محلول سونے کے نیچے ظاہر کیا تھا جن کی قرأت میں قراء کا اختلاف ہے۔ اسی طرح قرآن کے ایسے الفاظ جن کے معانی عام طور پر لوگوں کو معلوم نہیں ہیں ان کے معانی کو سبز رنگ والے جوہری محلول سے لکھا تھا۔ اسی طرح نیلم کے سیال محلول سے انہوں نے پورے قرآن پر زیر زبر پیش جزم تشدید مد وغیرہ لگائے تھے اور ایسی تمام آیتیں جن سے عہد و پیان کی اہمیت ظاہر ہوتی ہو یا جن آیتوں سے باہمی خط و کتابت، تبریک وتہنیت یا تقرب وتسلی وغیرہ میں کام لیا جاسکتا ہو اسی طرح جن آیتوں میں جنت کی بشارت یا جہنم کی دھمکی دی گئی ہے اس قسم کے تمام مقامات پر سونے کے سیال محلول سے پورے قرآن میں نشانات لگائے تھے۔ دیکھیے الکتانی کی ''کتاب التراتیب الاداریہ'' ج ۱ ص ۱۱۴ مطبوعہ مراکش۔ اس سلسلہ میں مسلمانوں کے غیر معمولی کارناموں کی کوئی چاہے تو ایک ضخیم تاریخ مرتب کرسکتا ہے۔

☆......☆......☆

Marfat.com

سورۂ یوسف کے ایک واقعہ کی تفسیر[1]

عقلی اور ذہنی اعتبار سے اِس قصہ میں جتنی اُلجھنیں پیدا کی گئی تھیں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تبصرہ شیر وانیہ سے ان کا بالکلیہ ازالہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد شاید کسی اضافہ کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی، لیکن چونکہ تفسیر جدید میں بعض قرانی قرائن سے تائید حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ہم چاہتے ہیں کہ اس کا بھی فیصلہ کر دیا جائے اور پھر دکھا دیا جائے کہ نصوصی اشارات بھی واقعہ کی کس شکل کی تائید کرتے ہیں، مندرجہ ذیل ملاحظات میں غور فرمایا جائے۔

(۱)

واقعہ کی جو تصویر تفسیر جدید میں دکھائی گئی ہے، اس کی صحت و سقم کی تحقیق کے لیے ہمارے خیال میں سب سے پہلے اس کی ضرورت ہے کہ اس سوال کی تنقیح کر لی جائے،

> ''آیا زنانِ مصر کو مجلس زلیخا میں شریک ہونے سے پہلے صرف زلیخا کے عشق و محبت کا علم تھا یا اس کے ساتھ وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ یوسفؑ اس سے راضی نہیں ہیں اور اس کے ہتھے نہیں چڑھتے۔''

یقیناً سوال کا پہلا جزء یعنی زلیخا کے عشق و فریفتگی کا علم قرآن حکیم سے ثابت ہے، جیسا کہ قرآن اِن عورتوں کی زبانی ناقل ہے:

وقال نسوة فی المدینة امرة العزیز تراودفتا ھا عن نفسه قد شغفھا حبا انا لنرا ھا فی ضلل مبین

اور شہر کی چند عورتوں نے کہا کہ عزیز کی بیوی اپنے غلام کو چاہتی ہے۔ محبت اس کے دل میں اتر گئی ہے اور میں اس کو کھلی گمراہی میں دیکھتی ہوں (یعنی عزیز کی بیوی ہو کر ایک کنعانی غلام پر مرتی ہے)

زنانِ مصر کے اس مقولہ سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ وہ فقط زلیخا کی الفت و فریفتگی سے مطلع ہو چکی تھیں، لیکن سوال کا دوسرا جزء یعنی یوسف علیہ السلام پر زلیخا قابو پا سکی ہے یا نہیں، کوئی شبہ نہیں کہ قرآن مجید کے کسی لفظ

سے اس کا سراغ نہیں ملتا۔

حالانکہ اس تفسیر کی صحت کا سارا دارومدار اسی جزء کے ثابت ہونے پر ہے۔ ان عورتوں کا یہ طعنہ کہ زلیخا اس لڑکے کو کیوں نہیں پرچالیتی۔ ایک لونڈے کا بہلا لینا کتنی بڑی بات ہے اور پھر انہیں طعنوں سے متاثر ہو کر زلیخا کا بنظر کامیابی ان کو بلانا، اس کے بعد سازشی مشورہ اور مشورہ کے بعد مجلس کی ساری زہد شکن ایمان سوز تدبیر، حتیٰ کہ ہاتھ کاٹ کر یوسفؑ کو سزا کی دھمکی دینی، وغیرہ وغیرہ کیا اس امر پر مبنی نہیں ہیں کہ جہاں زنان مصر کو عشق زلیخا کا علم تھا، اسی کے ساتھ اعراض یوسف سے بھی باخبر ہو چکی تھیں اگر ہم اس جزء کو بین تقریر سے باہر نکال لیتے ہیں تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جدید مفسر کی ساری کی کرائی محنت یکا یک برباد ہو جاتی ہے اور ان شاء اللہ ہم یہی کریں گے۔

آپ قرآن میں غور کیجئے، بادنیٰ تامل واضح ہو سکتا ہے کہ یقیناً عورتوں کو یوسفؑ کے اعراض کا علم اس مجلس سے پہلے کبھی نہیں تھا۔ وہ زلیخا کی لگاوٹوں کو جانتی تھیں لیکن اس کی جانب سے بالکل خالی الذہن تھیں کہ آخر یوسف کا اس کے ساتھ کیا برتاؤ ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ مجلس دعوت میں یوسفؑ کو دیکھ کر جب عورتوں نے

ماھذا البشرا ان ھذا الا ملک کریم

یہ آدمی نہیں ہے، یہ تو ایک شائستہ فرشتہ ہے

کا فیصلہ صادر کیا، تو اس کے بعد زلیخا ان سے یہ کہہ کر کہ یہی وہ ہے، جس پر تم ملامت کرتی تھیں، یہ خبر دیتی ہے،

ولقد راودتہ عن نفسہ فاستعصم

میں نے اس کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا لیکن یہ بچتا رہا۔

صاف ظاہر ہے کہ اگر یوسف علیہ السلام کے اعراض واستعصام کا علم ان عورتوں کو اس سے پہلے ہو چکا تھا اور اسی اعراض وتقویٰ کو توڑنے کے لیے وہ ابھی ابھی ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا کر فارغ ہوئی تھیں تو پھر ان ہی عورتوں کو مخاطب بنا کر زلیخا یہ کیا کہنے بیٹھی ہے کہ ''میں اسے بہت پھسلاتی ہوں لیکن یہ نہیں مانتا۔'' کیا مجلس میں جواب تک کارروائی ہوئی تھی، وہ اسی لیے نہیں ہوئی تھی؟ حقیقت یہ ہے کہ جدید تفسیر کو سامنے رکھنے کے بعد زلیخا کا یہ جملہ بالکل مہمل سا نظر آتا ہے اور یہ سارا قصور اس کا ہے کہ ہمارے مفسرین نے قصہ کی جو ترتیب لکھی ہے، ان سے یہ بے ربطیاں بالکل پیدا نہیں ہوتیں۔

(۲)

زلیخا یہ کہہ کر کہ ''یہ نہیں مانتا'' یوسف علیہ السلام کو دھمکی دیتی ہے،

Marfat.com

وان لم یفعل ما آمره للیسجنن اولیکونا من الصاغرین

اگر اس نے وہ نہیں کیا جس کا میں حکم دیتی ہوں، تو یہ قید کیا جائے گا اور ذلیل لوگوں میں ہو جائے گا۔

یوسفؑ اس دھمکی کو سن کر یکایک چیخ اُٹھے ہیں اور یعقوبؑ کے خدا کو پکارنے لگتے ہیں۔

رب السجن احب الی مما یدعو ننی الیہ و ان تصرف عنی کید ھن اصب الیھن و اکن من الجاھلین

اے میرے پروردگار! قید خانہ مجھے گوارا ہے اس سے جدھر یہ عورتیں مجھے بلاتی ہیں اور اگر آپ نے ان چال کو دور نہیں فرمایا، تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور جاہلوں میں ہو جاؤں گا۔

ذرا دیکھنا! یوسفؑ پر ایک عورت نہیں چند عورتیں اور پھر وہ بھی مصر کی مشاق شاطرہ عورتیں، ہر چہار طرف سے یوسف کو گھیرتی ہیں، خدا جانے کن کن طریقوں سے ان کو اپنی طرف رجھاتی ہیں اور اخیر میں یہ کہ چھری لے لے کر اپنے ہاتھوں کو لہولہان کر لیتی ہیں اور پھر اس واقعی جرم کو بنا کر اب کہتی ہیں کہ "دیکھ مان جا! ورنہ ہم ان زخموں کو دکھا کر تجھے مجرم بنائیں گے، سزا دلائیں گے۔"

اللہ اللہ اس وقت تو یوسفؑ بالکل خاموش ساکت وصامت بنے کھڑے رہتے ہیں، نہ چیختے ہیں، نہ چلاتے ہیں، نہ اپنے خدا کو پکارتے ہیں۔ کچھ نہیں، لیکن جب وہ عورتیں تھک کر بیٹھ جاتی ہیں اور زلیخا ان سے اپنا دکھڑا رونے بیٹھتی ہے اور اسی سلسلہ میں ضمنی طور پر اُن کو بغیر کسی سازشی ثبوت کے یوں ہی دھمکی دیتی ہے کہ میں تجھے قید کر دوں گی یا رسوا کر دوں گی، تو یکایک آپ چیخ اُٹھتے ہیں اور اپنے کو اس درجہ بے قابو پاتے ہیں کہ خدا کو اپنا یہ آخری پیغام پہنچا دیتے ہیں کہ اگر آپ نے مجھے نہیں بچایا تو میں ان کی طرف مائل ہو کر جہالت کی باتیں کر گذروں گا۔

ان کی یہ دعا، کس قدر بے محل اور بے موقعہ معلوم ہوتی ہے؟ اور یہ ساری خرابی اس کی ہے کہ تفسیر جدید میں خواہ مخواہ یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ یوسفؑ کو ان عورتوں نے بھی دھمکیاں دی تھیں، بہر حال یوسفؑ کا زلیخا کی دھمکی کے بعد دعا کرنا اس بات کو چاہتا ہے کہ اس سے پہلے آپ کو اس مجلس میں کسی قسم کی دھمکی وغیرہ نہیں دی گئی اور یہی اقدمین رحمہم اللہ اجمعین کا خیال عالی ہے، ورنہ اس دعا کو بجائے زلیخا کی دھمکی کے زنان مصر کی ہنگامہ آرائیوں کے بعد ہونا چاہیے تھا۔

اب رہی یہ بات کہ حضرت یوسفؑ نے اپنی دعا میں جمع کا صیغہ استعمال فرمایا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کید میں تمام عورتیں شریک تھیں،

بلاشبہ ایسا معلوم ہوتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کید قطع ید وغیرہ اتھا، اس کا بھی کوئی ثبوت ہے؟ ہم کہہ سکتے ہیں جیسا کہ امام رازی کا بھی خیال ہے، اور خود دعا کا زلیخا کی دھمکی کے بعد واقع ہونا اس کو چاہتا ہے کہ جب زلیخا نے حضرت یوسفؑ کو قید اور ذلت کی دھمکی دی، تو زنان مصر جن کو زلیخا کی مجبوریوں پر رحم آ چکا تھا اور جن کی ملامت اب عنایت سے بدل گئی تھی، اسی طرح یوسفؑ کے معصومانہ حسن دلکش، نبوی کشش وجذب نے بھی ان پر اثر کیا، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ یوسف علیہ السلام کو سمجھائیں اور قرینہ چاہتا ہے کہ انہوں نے یوسف علیہ السلام کو کہا ہوگا کہ میاں

لڑکے! دیکھو اپنی ضد سے باز آؤ، اپنے اوپر رحم کرو، ورنہ یہ دیوانی عورت خدا جانے تمہارے ساتھ کیا کچھ کر گذرے، تم اب مجبوریوں کے حکم میں ہو اور حالت مجبوری میں تو ناجائز سے ناجائز چیز بھی انسان کے لیے جائز ہو جاتی ہے۔ جب اس قسم کے خطرہ میں آدمی مبتلا ہو جاتا ہے، تو اس وقت اس کے فعل پر مواخذہ نہیں ہوتا۔ الی غیر ذلک

واقعہ یہ ہے کہ یوسفؑ کی وہ دعا اور خداوند تعالیٰ کو اس یاس انگیز انداز سے پکارنا کہ اگر آپ نے نہیں بچایا تو میں گیا، ناممکن ہے کہ بغیر اس قسم کی کیا دیوں کے وقوع پذیر ہو، تقویٰ و ورع کی قوت جذبات کے ہیجان کو تھام سکتی تھی، اور تھامتی ہے لیکن عقل پر جب حملہ ہو جاتا ہے اور وہ مغلوب ہونے لگتی ہے تو اس وقت انسان کی کوئی قوت اسے نہیں بچا سکتی۔ اس وقت وہ صرف بشریت سے بالاتر قوت کا محتاج ہو جاتا ہے۔

اس سے پہلے یوسف علیہ السلام کے محض جذبات کو مغلوب کرنے کی کوشش زلیخا کی طرف سے عمل میں آ رہی تھی، جیسا کہ قصہ کے اجزاء سابقہ سے معلوم ہوتا ہے، لیکن اب جبکہ زلیخا ان کی قید کا فیصلہ کر چکتی ہے اور ہر طرح کی رسوائی پر آمادہ ہے، پھر یہ عورتیں حضرت یوسفؑ کی بہی خواہ بن کر ان کی عقل سے یہ اپیل کرتی ہیں جس کا حاصل یہ تھا کہ ان کا تدین و اتقاء بھی مغالطہ میں آ جائے اور ان کی عقل بھی درست نہ رہے، یہ وقت تھا کہ اب یوسفؑ اپنے کو بالکل خدا کے سپرد کر دیں اور انہوں نے یہی کیا، ان کا اخیر دعا من الجاهلين کہنا بھی یہی چاہتا ہے کہ اب اپنی علم و عقل کو مغلوب ہوتی ہوئی پا رہے ہیں۔

اس تشریح کے بعد دعا بھی ٹھیک موقع پر آ جاتی ہے۔ اصب ایهن کا مطلب بھی واضح ہو جاتا ہے، یعنی میں ان کی باتوں کی طرف مائل ہو جاؤں گا، کیدهن یدعوننا وغیرہ کی جمعیت کا راز بھی واشگاف ہو جاتا ہے اور نہ صرف یہی بلکہ آئندہ کلام میں حضرت یوسفؑ نے جو بکیدهن علیھم فرمایا اس کی تفسیر بھی معلوم ہو جاتی ہے۔ پھر بادشاہ کے آدمی کا ان عورتوں سے اذراودتـــن بصیغہ جمع کہنے کا بھی مطلب معلوم ہو جاتا ہے کہ جب تم لوگوں نے یوسف علیہ السلام کو پھسلانا چاہا، یہ اس لیے کہ گویا زلیخا کے لیے اب سب پھسلا رہی تھیں، اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ اگر یہ عورتیں اپنے لئے پھسلاتیں، ان کا پھسلانا زلیخا کے لیے نہ ہوتا تو خواہ مخواہ زلیخا کو اس کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ انا راودته عن نفسه گویا وہ بھی یہی بیان کرتی ہے کہ دراصل میں اس کو اپنی طرف مائل کرنا چاہتی تھی، باقی ان عورتوں نے بھی جو مرادوت کی وہ بھی ہمارے لیے تھی۔ رہا قید خانہ سے نکلنے کے وقت حضرت یوسف علیہ السلام نے ان عورتوں کو قطعن ایدهن سے کیوں موصوف کیا اور جدید مفسر صاحب نے اس سے یہ سمجھنا چاہا ہے کہ حضرت یوسفؑ جرم قطع میں قید خانہ گئے تھے، اس لیے وہ اس کی تحقیق کا حکم دیتے ہیں۔ اس کا جواب آگے آتا ہے۔

(۳)

قرآن مجید حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا نقل کرنے کے بعد خبر دیتا ہے۔

Marfat.com

فاستجاب له ربه فصرف عنه کیدھن

پھر یوسفؑ کے پروردگار نے اس کی دعا قبول کی اور ان کے کید کو دور فرمایا۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی وہ دعا مستجاب ہوئی۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر ان عورتوں کی کید یعنی ساختہ زخموں کی بدولت حضرت یوسفؑ کو زندان مصر کا منہ دیکھنا پڑا، تو پھر صرف کید کیا معنی؟ اور دعا مستجاب ہوئی تو کیا ہوئی؟

اس سے قطعاً معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ کا قید خانہ جانا کسی اور وجہ سے واقع ہوا، جس کا پتہ اگرچہ ہم کو نہ ہو، تاہم اس قدر ضرور ہے کہ مفسر جدید کے اختراعی زخم جن کو اُنہوں نے عورتوں کا کید قرار دیا، یہ وجہ تو قطعاً نہ تھی، ورنہ قرآن مجید کی خبر میں صریح کذب کی گنجائش پیدا ہوتی ہے۔

علاوہ اس کے اگر حضرت یوسف پر بھی مقدمہ دائر ہو گیا تھا اور حکام کے سامنے یہ ثابت کر دیا گیا کہ اس، کنعانی غلام نے شرفا و اعیان مصر کی خاتونوں پر ناجائز حملہ اس طرح کیا کہ آخیر میں چھری سے ان کے ہاتھ کاٹ ڈالے، تو میں نہیں سمجھتا کہ حکومت فرعونیہ جو بنی اسرائیل کے معصوم بچوں کو تہ تیغ کرنے میں کبھی نہیں شرمائی، وہ اتنے قوی جرم کی سزا صرف یسجننہ حتی حین دیتی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ میعاد مقررہ تک وہ قید کی سزا بھگتیں، حالانکہ قرائن کا مقتضٰی یہی ہے کہ ایسے غلاموں (جو اپنی جان کے مالک نہیں ہوتے تھے) کو قتل سے فروتر سزا دیتی، خلاف عقل ہے اور پھر اس پر طرہ یہ ہے کہ زخم بنا بنایا تیار تھا، اور مقدمہ بھی عصمت دری کا، اور ایک عورت کا نہیں چند کا، مدعی علیہ بچارا غلام، اس کی مالکہ زلیخا (جس سے پالائش کی امید ہوتی) وہ اس پر دعوے دائر کرتی ہے، لیکن خدا جانے حکام کیا سوچتے ہیں کہ اولاً فیصلہ بھی اپنا ہلکا دیتے ہیں اور ایک زمانے کے بعد دیتے ہیں جیسا کہ ثم بعدما روا الایات میں لفظ ثم کا مقتضی ہے بحالیکہ تراضی کی ظاہرا کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

رہا آیات سے عورتوں کے زخم مراد لینے میں اس کا جواب دوں یا ہنس کر چپ ہو رہوں۔

(۴)

اگر یوسف علیہ السلام کے اس جملہ

ما بال النسوۃ التی قطعن ایدیھن

ان عورتوں کا کیا بیان ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے۔

کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ جن عورتوں کے ہاتھ کاٹنے کے جرم میں مجھے قید خانہ بھیجا گیا ہے، ان کا کیا حال ہے؟ تو بادشاہ کے قاصد کو ان عورتوں سے جا کر یہ پوچھنا چاہیے تھا کہ کیا واقعی یوسف علیہ السلام نے تمہاری عصمت پر حملہ کیا تھا اور اسی بنا پر انہوں نے تمہارے ہاتھ کاٹے تھے؟ اس کے جواب

میں اگر وہ عورتیں اپنے کیے پر پشیمان ہو چکی تھیں تو یہ کہنا چاہیے تھا کہ نہیں یوسف کا کوئی قصور نہیں، ہم نے سازش کر کے خود اپنے زخم بنائے تھے مگر قرآن مجید بجائے اس سلسلہ کے جو بات نقل کرتا ہے وہ یہی کہ قاصد ان سے پوچھتا ہے کہ تم یوسف کو جب پھسلا رہی تھیں، تو اس وقت اس کا کیا حال تھا؟ عورتیں جواب میں کہتی ہیں کہ ہم نے اِس میں کوئی برائی نہیں پائی۔

حالانکہ تفسیر جدید میں یوسف علیہ السلام کے سوال مین جو مطلب پہنایا گیا ہے اس سے ان جوابوں کو کیا تعلق؟

بلکہ ظاہراً اس کا مطلب وہی ہے جو عالمہ مفسرین لکھتے ہیں کہ چونکہ یوسف علیہ السلام کے حُسن کا چرچا پھیلا تو حکام وقت کو خطرہ ہوا کہ کہیں یوسفؑ کی بدولت کوئی فتنہ نہ پھیلے، شریف خاتونیں اسی کنعانی غلام کے ہاتھوں کہیں برباد نہ ہوں اور اسی لیے ان کو جیل سپرد کر دیا حالانکہ یوسفؑ کا کیا قصور تھا؟ مستحق جیل اگر ہو سکتی تھیں تو مصر کی عورتیں مگر بہرحال بدگمان ہو کر لوگوں نے ان کو قید خانہ بھیج دیا تھا، اب جبکہ بادشاہ کی طرف سے آپ کی رہائی کا پیغام آیا تو آپ نے مناسب خیال کیا کہ اس بدگمانی کا ازالہ کر کے جیل سے باہر نکلوں، آپ نے خیال فرمایا کہ پاکبازی کی شہادت ان عورتوں سے بڑھ کر اور کون دے سکتی ہیں جن کے سامنے عزیز مصر کی بیوی نے اقرار کیا ہے کہ

لقد راودة عن نفسه فاستعصم

میں اس کو اپنی طرف مائل کرنا چاہتی ہوں، لیکن یہ بچتا رہا۔

ان عورتوں کو خوب معلوم ہے کہ زلیخا نے مجھے کن کن طریقوں سے گھیرنا چاہا مگر میں راضی نہیں ہوا تھا، نہ صرف زلیخا بلکہ ان عورتوں نے بھی مجھے اس وقت سمجھایا تھا، مگر اس وقت میرے طرز عمل کو ان عورتوں نے خوب دیکھا تھا، بہرحال اس لیے آپ نے ان عورتوں کا پتہ دیا اور اسی لئے قاصد نے بھی ان عورتوں کے ہاتھ کاٹنے کی تحقیق نہیں کی، بلکہ یہ پوچھا کہ جب یوسف کو پھسلایا جا رہا تھا تو تم نے اُن کو کیسا پایا۔ انہوں نے سچا اظہار دیا اور اس کے بعد زلیخا نے بھی کہہ دیا کہ یوسف کا کوئی قصور نہیں، بلکہ

انار اودته عن نفسه و انه لمن الصادقین

میں نے اس کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا، اور یوسف سچوں میں ہے۔

(۵)

جدید تفسیر میں حدیث انکن لصواحب یوسفؑ سے بھی استدلال کیا گیا ہے، اس لئے میں بھی اس کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

بات یہ ہے کہ اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض امہات المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہن کو

یوسف علیہ السلام کی ان عورتوں سے تشبیہ دی ہے، اب سوال وجہ شبہہ میں ہے، ہمارے جدید مفسر صاحب کا خیال ہے کہ ان بے حیا عورتوں نے یوسف علیہ السلام کو اپنے ساتھ بُرے فعل پر مجبور کرنا چاہا تھا اور اسی لئے ہاتھ کاٹ لیا کہ یہ آخری صورت یوسفؑ کے خراب کرنے کی تھی اور العیاذ باللہ اسی بیہودہ اور فحش صفت کو آپ وجہ شبہہ قرار دے کر آیت قطعن یدیھن کا مطلب حسب مدعا نکالنا چاہتے ہیں، میں اس جراٴت و دلیری کے متعلق کچھ عرض نہیں کرتا، والی اللہ المشتکی باقی ہمارے نزدیک تو یہ حدیث خود اس بات کی دلیل ہے کہ جس طرح ان عورتوں نے سمجھا بجھا کر حضرت یوسفؑ کو امرِ حق سے روکنا چاہا تھا، اسی طرح امہات المومنین رضی اللہ عنہن نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو امر حق (یعنی امامت ابی ابکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے باز رکھنا چاہا تھا، آپ نے اس مناسبت سے فرمادیا ''انکن لصواحب یوسف'' اور تشبیہ بالکل صحیح ہے۔

هذا ما عندی والله یقول الحق و هو یهدی السبیل

حواشی:

۱۔ اس مضمون کو پڑھتے وقت مولانا شروانی کے مضمون مندرجہ ''معارف'' بابت ماہ جنوری کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ یہ مضمون گویا اُس کا تکملہ ہے۔

۲۔ ممکن ہے اور جیسا کہ مفسرین لکھتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد یوسف علیہ السلام کے حسن کا چرچا اور پھیلا۔ ان عورتوں نے اپنے چشم دید حالات بیان کرنے شروع کئے، فتنہ کا خوف ہوا۔ پھر زلیخا کی طبیعت میں سکون پیدا کرنا بھی منظور تھا، ساتھ اس کے یہ بھی سمجھا گیا کہ کچھ دنوں کے لیے اگر یوسفؑ امارت سے نکال کر قید خانہ بھیج دیئے جائیں گے، تو ان کے روز افزوں حسن میں گونہ کمی واقع ہوگی وغیرہ۔ یہ دیکھ بھال کر مصریوں نے آپ کو قید خانہ بھیج دیا۔

(در: معارف (اعظم گڑھ)، مئی ۱۹۲۰ء، ص ۳۵۱۔۳۶۰)

☆......☆......☆

Marfat.com

''تاریخ ارض القرآن''
کے متعلق
میرے ذاتی احساسات و تجربات

الفاظ یا ترتیب کے معمولی ردّ و بدل سے پیش رو مصنفین کی کتابوں کو نقل کر کر کے اپنی طرف منسوب کر لینا، شاید دنیا کی عام کتابی زبانوں کا یہ ایک ایسا عارضہ ہے، جو نہ کسی ملک کے ساتھ مخصوص ہے اور نہ کسی فن اور نہ علم کی حد تک یہ قصہ محدود نظر آئے گا، خصوصاً نصابی کتابوں کے ساتھ تجارتی اغراض جب سے وابستہ کر دیئے گئے ہیں، تو اس عارضہ نے وبائی شکل اختیار کر لی ہے۔ شمار کرنے والے ان کتابوں کے لکھنے والوں کو مصنفین اور مولفین ہی کے ذیل میں شمار کرتے چلے آئے ہیں، اور آج بھی اُن لوگوں کو مصنف و مؤلف ہونے کی سند ملتی ہی چلی جا رہی ہے، حالانکہ کسی کے کلام (نظم یا نثر) کو بغیر کسی ردّ و بدل کے کوئی اپنی طرف اگر منسوب کر لے، تو لگانے والے اب بھی اس پر سرقہ اور علمی وزدکاری کا بے محابا الزام عائد کر دیتے ہیں، لیکن سوچا جائے تو پہلے اور دوسرے فریق میں عملاً دحقیقۃً چنداں فرق نہیں ہے۔

لیکن تصنیف و تالیف ہی کے دائرہ میں کچھ ایسی ہستیاں بھی پیدا ہوتی رہتی ہیں جو کسی علم و فن کے کسی موضوع کو اس وقت تک چھوتی بھی نہیں، جب تک کہ اس کے متعلق کوئی نیا پہلو، تازہ زاویہ نگاہ اُن کے سامنے نہ آئے۔ سچ پوچھیے تو صحیح معنوں میں مصنف اور مؤلف قرار پانے کا قدرتی استحقاق ان ہی بزرگوں کو حاصل ہے، ورنہ دوسروں کی باتوں کا دہرانے والا اگر سارق نہیں تو ایک نقل نویسی کاتب کے سوا اور بھی کچھ ہے۔ دنیا میں کتابوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ زیادہ تر انہی وزدانِ علم اور نقل نویسوں ہی کی وجہ سے ہوا ہے۔ درد کی یہ داستان کافی ہے۔ میں کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے سید علامہ مولانا سلیمان الندوی قدس اللہ ضریحہ، جو اردو زبان کے اعظم المصنفین بجا طور پر سمجھے جاتے ہیں اور انہوں نے اپنے بعد ہزار ہا ہزار صفحات کی شکل میں اپنی تالیفی یادگاریں چھوڑی ہیں، آپ اُن کو پڑھ جایئے،

Marfat.com

سب سے بڑی خصوصیت مرحوم کے تصنیفات میں کم از کم اس فقیر کو تو یہی نظر آتی ہے کہ انہوں نے جو کچھ بھی ارقام فرمایا ہے، اس میں نئی بات، نئے معلومات پڑھنے والوں کو ملتے چلے جاتے ہیں، یا کم از کم پہلے جو باتیں مجمل شکل میں تھیں، سید صاحب کی تحقیق و تدقین نے ان ہی باتوں کو زیادہ مفصل اور زیادہ اُجاگر کر دیا ہے۔

مرحوم غفر اللہ دینیات و اسلامیات کے عالم تھے، لیکن اسی کے ساتھ عربی، فارسی، اردو زبانوں کے ادب کا بھی صالح ذوق رکھتے تھے، اسی لیے اُن کے عام علمی کارناموں کا تعلق اگرچہ اسلامیات و دینیات ہی سے ہے، لیکن اسی کے ساتھ ادبیات کے متعلق کبھی کبھی اُن کو کچھ لکھنے کا موقع اگر مل گیا، تو اُس میں بھی انہوں نے ہمیشہ نئی راہیں پیدا کیں، اور ایسے اچھوتے نتائج اُن کی بدولت اس سلسلہ میں بھی دنیا کے سامنے آئے کہ ہر طرف مرحبا و آفرین کے ساتھ اُن کا استقبال کیا گیا۔

قرآن و حدیث، فقہ، کلام و تصوف اور سب سے زیادہ تاریخ اسلامی اور ان سب کے سوا جس جس موضوع پر سید صاحب نے قلم اٹھایا ہے اور اس سلسلہ میں نئے معلومات یا نئے نقاط نظر سے دنیا کو انہوں نے روشناس کیا ہے، بنانے والے اگر اُن کی فہرست بنائیں گے، تو میرا خیال ہے کہ اُن کی تعداد لاکھوں نہیں، تو ہزاروں تک ضرور پہنچ جائے گی۔ یہ اُن کی سوانح نگار کا فرض ہے کہ اس مطمحِ نظر سے اُن کی تصانیف اور شائع کردہ مقالات و مضامین کا جائزہ لے، دنیا کو حیرت ہوگی کہ کتنے قلیل عرصہ میں اس بندۂ خدا نے جدید معلومات اور متعلقہ علوم کے سلسلہ میں کتنے نئے پہلوؤں کا اضافہ فرمایا۔ بڑے بڑے مصنفین کی کتابوں میں بہ مشکل گنی چنی ہی نئی چیزیں ہاتھ آتی ہیں، لیکن سید صاحب کی کتابوں میں قدم قدم پر نئے انکشافات اچھوتے معلومات سے پڑھنے والوں کا دامن تحقیق بھرتا چلا جاتا ہے۔ یہی ان کے تصنیفات کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ ''معارف'' کے سلیمان نمبر نکالنے کا ارادہ جب کیا گیا تو فقیر نے چاہا تھا کہ قرآن کے متعلق سید صاحب کی مشہور کتاب ''تاریخ ارض القرآن'' سے ان چیزوں کو انتخاب کر کے پیش کرے جن کے متعلق اپنا خیال یہی ہے کہ ایک خاص پہلو سے ''قرآن فہمی'' کے معیار میں فکری انقلاب پیدا ہو گیا ہے۔ اعتراف کیا جائے یا نہ کیا جائے لیکن شعوری یا غیر شعوری طور پر عوام ہی نہیں خواص کے فہمیدہ و سنجیدہ طبقات بھی سید صاحب کی اس نئی علمی کوشش اور اس کے نتائج سے اکثر و بیشتر متاثر ہوئے۔ میری خواہش تھی کہ سید صاحب کی اس جدید قرآنی خدمت پر سیر حاصل بحث کروں لیکن ٹھیک ان ہی دنوں میں جب اس مقالہ کی تیاریوں میں مشغول تھا، بیمار ہو گیا اور ایسا بیمار کہ پانچ چھ مہینے گذر چکے ہیں، اس وقت تک لکھنے پڑھنے کی صلاحیت جیسی کہ چاہیے واپس نہیں ہوئی ہے۔ احباب دارالمصنفین کا تقاضا ہوا کہ واقعی شہیدوں میں شریک ہونے کا موقع اگر نہیں ہے تو خون ہی لگا کر شہیدوں میں شامل ہو جاؤں۔ اسی حکم کی تعمیل کر رہا ہوں۔

واللہ ولی الامر والتوفیق

....

سید صاحب مرحوم کی کتاب ''تاریخ ارض القرآن'' اول سے آخر تک ایسے معلومات سے بھری ہوئی ہے جو کم

Marfat.com

از کم علماء کے لیے صرف یہی نہیں کہ نئے ہیں بلکہ ان معلومات کی راہنمائی میں مطالعہ اور تحقیق کے ارباب ذوق کو تجربہ بتائے گا کہ کافی مدد مل سکتی ہے۔عرب کے جغرافیائی معلومات کے مصادر و مآخذ کی طویل فہرست اس کتاب میں درج ہے، جن میں اسرائیلی و یونانی اور رومانی ادبیات اور اکتشافات اثریہ کے سوا سید صاحب نے ادبیاتِ اسلامیہ کے ذیل میں جن مطبوعہ اور غیر مطبوعہ عربی زبان کی کتابوں کا ذکر کیا ہے، یہ ایک ایسی علمی فہرست ہے کہ ہمارے علماء جو انگریزی یا اسی قسم کی جدید عصری زبانوں سے ناواقف ہیں اور وہ بھی ''ادبیات اسلامیہ'' کی ان کتابوں سے کافی طور پر مستفید ہو سکتے ہیں، یہ واقعہ ہے کہ سالہا سال کی کدہ کاوش تحقیق و جستجو کے بعد ہم جن کتابوں تک رسائی حاصل کر سکتے تھے، سید صاحب کی درج کردہ فہرست سے بیک نظر معلومات کا یہ سارا ذخیرہ ہمارے سامنے اس طرح پر آجاتا ہے کہ کتابوں کے مصنف سنین تصنیف مطبوعہ ہے یا غیر مطبوعہ، غیر مطبوعہ شکلوں میں ان کتابوں کے نسخے کہاں پائے جاتے ہیں، عموماً ان امور کے متعلق بھی کافی وشافی اشارے ملتے چلے جاتے ہیں۔

اسی طرح تورات اور عہدِ عتیق و قدیم کا مطالعہ کس طریقہ سے کرنا چاہیے تورات کے سوا کبتم بینیم، ترگوم مدراش اور تالمود نامی کتابوں کی اسرائیلی دین میں کتنی اہمیت ہے اور ان کتابوں کے مضامین کی نوعیت کیا ہے، ''تاریخ ارض القرآن'' کے ابتدائی اوراق ہی میں یہ سارے قیمتی معلومات ایک ہی جگہ میں مل جاتے ہیں۔

عرب اور اس کے جغرافیہ کے ساتھ یورپ کے اربابِ تحقیق نے جن معلومات کو وقف عام کیا ہے اور اُن سے غلط یا صحیح نتائج نکالنے کی سنجیدہ کوششیں کی ہیں، ایک بڑا قیمتی تبصرہ اس سلسلہ میں بھی آپ کو اس کتاب کے شروع ہی میں مل جائے گا، جو دلوں میں اس کا شوق پیدا کرتا ہے کہ غیروں کی دلچسپیوں کا حال عرب کے ساتھ جب یہ ہے تو ہم مسلمانوں کا علمی فرض اس باب میں یقیناً اس سے کہیں زیادہ ہونا چاہیے۔

بہر حال آپ اس کتاب کو پڑھتے چلے جایئے، کتاب پڑھنے سے پہلے آپ کے جو علمی احساسات اور معلومات تھے، میں یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ شعوری اور غیر شعوری طور پر اُن میں پائیں گے کہ ترمیم ہوتی چلی جاتی ہے۔سید صاحب کے پیدا کیے ہوئے نتائج سے اتفاق و اختلاف بجائے خود ایک الگ جداگانہ مسئلہ ہے، لیکن اُن کی کاوش و کوشش کی داد میں بخل میرے خیال میں صرف تنگ دلی ہی نہیں بلکہ گونہ ایک قسم کی عقلی اور طبعی سفاہت ہی کا نتیجہ ہوسکتا ہے۔

دور کیوں جایئے قرآن مجید کے لفظ ''عاد'' ہی کے متعلق میں پوچھتا ہوں، انصاف سے دلوں پر ہاتھ رکھ کر کہیے کہ ہمارے علماء کا عام علمی احساس اُس کے متعلق کیا یہی نہیں تھا کہ عاد کسی غیر معمولی صفات رکھنے والی شخصیت کی تعبیر تھی۔اگرچہ خود قرآن کی یہ تعبیر کہ ''قوم نوح کے بعد عاد والے زمین کے خلیفہ بنائے گئے'' دلوں کے اس عام احساس پر کہ ''عاد'' کسی خاص آدمی کا نام تھا، منطبق نہیں ہو رہی تھی۔

اسی لیے زیادہ وسیع النظری سے کام لینے والے بھی بجائے شخص کے ''عاد'' کو عرب کے کسی ناپید اشدہ مختصر قبیلہ کا عنوان قرار دیتے تھے لیکن سید مرحوم نے جب یہ اعلان کیا کہ

Marfat.com

''عاد صرف کوئی محدود اور مختصر قبیلہ نہ تھا۔ وہ ایک عظیم الشان قوم تھی، جو عرب ہی نہیں بلکہ دنیا کی قدیم ترین تہذیب کی بانی تھی۔''

اور یہ فرماتے ہوئے کہ عادی تہذیب و تمدن عرب ہی کے کسی خاص علاقہ تک محدود نہ تھا، سید صاحب نے ناقابلِ انکار مستحکم تاریخی واثری شہادتوں سے یہ ثابت کیا کہ عاد جو قوم نوح کے بعد زمین کے خلیفہ ہوئے اور یہ کہ

''ایشیا اور افریقہ کا کثیر حصہ اس کے (یعنی عاد کے) زور و قوت کا تماشا گاہ تھا۔''
(ص ۶۵۔ ج۱)

اور صرف ایشیا وافریقہ ہی نہیں، بلکہ سید صاحب نے یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ یورپ ہی کے بعض علاقوں مثلاً یونان و کریٹ تک عربوں کے کسی قدیم تمدن کا جو نشان ملتا ہے، یہ سارے قصے اسی ''عاد'' سے تعلق رکھتے تھے، جو قوم نوح کے بعد زمین کے خلیفہ قرآن کے رو سے قرار پائے تھے۔

انصاف سے کہیے کہ قرآنی آیت جس میں عاد کو خطاب کر کے ارشاد ہوا ہے:

واذ کروا اذا جعلکم خلفاء من بعد قوم نوح. (الاعراف)
اور یاد کرو (اے عاد کی قوم والو!) جب قومِ نوح کے بعد خدا نے تو تم کو (زمین) کی خلافت بخشی

اس کا صحیح وزن سید مرحوم کے بیان و تحقیق کے بعد قلوب میں پیدا جو ہوتا ہے، کیا یہی وزن وہ روایتیں ڈال سکتی ہیں، جن میں زیادہ سے زیادہ اگر کچھ پتہ دیا گیا ہے تو وہ اسی قدر ہے کہ

کانت عاد مابین الیمن الی الشام مثل الذر، (ص ۹۶ ج ۳۔ درمنثور)
یمن سے شام عاد والے چیونٹیوں کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔

ورنہ عام طور پر عاد والوں کے متعلق یہی سمجھا جاتا ہے اور کہا بھی جاتا ہے کہ

فیما بین عمان الیٰ حضرت بالیمن (درمنثور۔ ص ۹۶ ج ۳)
عمان سے یمن کے اس علاقے تک محدود تھے، جسے حضر موت کہتے ہیں۔

میں دوسروں کے متعلق کیا کہوں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ نسلِ انسانی کی تاریخ کو نبوات و رسالات کی تاریخ کی روشنی میں جب ادوار (پیریڈ) پر تقسیم کرنے کی ضرورت جامعہ عثمانیہ کے اسباق کے لیے خود فقیر کو ابتداء میں پیش آئی اور اس سلسلہ میں جیسا کہ میرا دستور تھا، ان پانچ دوروں پر بنی آدم کی تہذیبی و تمدنی الوالعزمیوں کو تقسیم کر کے بیان کیا کرتا تھا، یعنی

(۱) پہلا دور تو از آدم تا قوم نوح کا قرار دیتا تھا۔

(۲) دوسرے دور کا نام اپنی اصطلاح میں مَیں نے دجلیلی تمدن رکھ چھوڑا تھا۔

مقصد یہ تھا کہ ایک خاص علاقہ جو دریائے دجلہ اور دریائے نیل کے درمیان محدود تھا، اسی کے مختلف

Marfat.com

مقامات میں عمران وارتقاء کا ظہور ہوتا رہا، کبھی اس کی ابتداء جنوبی عرب سے ہوئی، کبھی شمالی عرب سے، کبھی ارضِ بابل و نینوہ سے انسانی تہذیب وتمدن نے سر اُٹھایا اور کبھی دریائے نیل کے کنارے سے اس کے ہنگامے برپا ہوتے رہے۔ اسی دور میں عاد وثمود اور اُن کی انبیاء ہود وصالح (علیہما السلام) اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وطن اور نمرودی تمدن، آخر میں موسیٰ علیہ السلام اور فرعونی تہذیب کے مقابلہ پر اس دور کی داستان ختم ہوجاتی تھی۔

(۳) تیسرا دور میرے خیال کے مطابق تاریخ انسانی کا وہ تھا، جب پرانی دنیا کے مشرقی ومغربی، شمالی وجنوبی علاقوں میں بنی آدم کی کافی تعداد آباد نظر آتی ہے اور ہر خطہ کے باشندے اپنے اپنے ماحول اور امکانات کے مطابق اپنی اپنی تہذیب وتمدن کی تعمیر میں اس طور پر مصروف ومشغول ہیں کہ دوسرے علاقوں سے ان کا کوئی قوی رشتہ قائم نہ ہوا تھا۔ چین، ہند، ایران، یونان وردم وغیرہ اقلیموں کی تمدنی تاریخ کا تعلق اسی دور سے تھا۔ اسی زمانہ میں شام وفلسطین میں اسرائیلی تمدن برسرعروج تھا اور عرب کے جنوبی حصہ میں سبائی تبع وحمیر وغیرہ نے اسی عہد میں امتیاز حاصل کیا تھا۔ الغرض یہ تہذیبیں بھی مقامی تھیں اور اُن کی اصلاح وتصحیح کے لیے بھی مقامی مصلحین خدا کی طرف سے جو اُٹھتے رہے، وہ مقامی مصلحین تھے۔

(۴) چوتھا دور انسانیت کی تاریخ کا وہ ہے، جب مختلف سیاسی وذہنی عوامل ومؤثرات کے زیرِ اثر سارے مغربی ممالک میں قیصر نامی قوت کو اور سارے مشرقی علاقے میں کسریٰ نامی طاقت کو مرکزیت کا مقام حاصل ہوگیا۔ قیصر وکسریٰ کے مقبوضات کے درمیان عرب کی سرزمین ایک ایسی سرزمین تھی، جس پر نہ پورا اقتدار قیصری کو حاصل تھا۔ اور نہ کسریٰ کو۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ وسطِ عرب سے

اذا هلك كسرى فلا كسرىٰ بعده و ليهلكن قيصر فلا قيصر بعده

جب کسریٰ ہلاک ہوگا تو پھر کسریٰ نہ ہوگا، اور قریب ہے وہ زمانہ بھی جب قیصر بھی ہلاک ہوجائے گا، پھر اس کے بعد قیصر نہ ہوگا۔

کا پیغمبرانہ نعرہ بلند ہوا جس نے مغرب ومشرق کے سارے قصوں ہی کو ختم کردیا اور اسی کے بعد دنیا پانچویں دور میں داخل ہوگئی۔ اس وقت سے آج تک قدرتی کارفرمائیاں توحید عالم کے نظریہ کو واقعہ کا قالب عطا کرتی چلی جارہی ہیں۔ بے شمار خطوں اور اقلیموں میں بٹی ہوئی دنیا ایک ملک بلکہ شاید ایک شہر ایک بستی کی شکل اختیار کئے چلی جارہی ہے، تاکہ معلوم ہو کہ ساری نسل انسانی ایک ہے، اس کا معبود خدا ایک ہے، اس کی زندگی کا قدرتی آئین بھی ایک ہے، اس کی کتاب بھی ایک ہے، اس کا نبی بھی ایک ہے، اس کا کعبہ بھی ایک ہے، سارے مقامی خصوصیات حذف کردیئے گئے اور وہ حذف ہوتے چلے جارہے ہیں، باہر سے زور لگانے والے اگرچہ ایک انسان ''ایک دنیا'' کو لاکھوں انسانی قسموں اور بیسیوں دنیاؤں میں تقسیم کرنے پر اپنا زور صرف کررہے ہیں[1] لیکن قدرتی مشیتِ قاہرہ والے یہ کام کرسکتے ہیں، صرف انسان کا ارادہ نہیں کرسکتا، تقسیم وتجزیٰ کی آگ والے ہی توحید عالم کے ذرائع فراہم کرتے چلے جارہے ہیں، تخریب والوں ہی سے توحید عالم کی تعمیر کا کام لیا جارہا ہے اور لیا جاتا رہے گا،

حتیٰ یکون الدین کلّه للّٰه

تا آنکہ دین صرف اللہ (خالق عالم) ہی کے ساتھ وابستہ ہو کر رہ جائے۔

باوجود انتہائی اختصار پسندی اور اجمال کے بیچ کا یہ جملہ معترضہ کافی طویل ہو گیا، اقرار یہ کرانا چاہتا تھا کہ انسانی تاریخ کے ان پنجگانہ ادوار کی ترتیب کے سلسلہ میں مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ کم از کم دجلیلی والے دوسرے دور کے متعلقہ معلومات کی فراہمی میں بہت زیادہ مدد مجھے سید مرحوم کی اسی کتاب ''تاریخ ارض القرآن'' ہی سے اس وقت ملی تھی، جب آج سے تیس بتیس سال پہلے دروس عثمانی کو پہلی دفعہ مرتب کرنے کا مرحلہ میرے سامنے پیش آیا تھا۔

خلاصہ یہی کہ نسل انسانی کے مذکورۂ بالا ادوار وقرون میں سے سید مرحوم کی کتاب ''تاریخ ارض القرآن'' میں مجھے دوسرے دور کے متعلق تاریخی اور تاریخی سے زیادہ اثری اکتشافات سے مدد ملی تھی، بلکہ اسی سے یہ سمجھ میں بھی آیا کہ قرآن بذاتِ خود کوئی تاریخی کتاب نہیں ہے اور جن قصص کا تذکرہ اس کتاب میں بھی کیا گیا ہے، اصلی مقصود سب سے موعظت و بصیرت کا درس ہی ہے، تاہم اسی کے ساتھ انسانی تاریخ کے اس حصہ کو جسے لوگ بھول جانے والے تھے، خاص انداز اور طریقہ سے اس حصہ کو قرآن میں محفوظ کر دیا گیا ہے، اور اس کی مصلحت سمجھ میں آئی کہ پہلے اور دوسرے دور کے متعلق قرآن نے نسبتہً زیادہ تفصیل سے کیوں کام لیا، اور کیسی تفصیل؟ کہ قومِ نوحؑ کے متعلق آج کوئی چاہے تو قرآن سے ان تاریخی نتیجوں کو پیدا کر سکتا ہے، مثلاً یہ کہ زراعت و باغبانی ہی نہیں بلکہ آب پاشی کے عام ذرائع خصوصاً دریاؤں کو کاٹ کر نہروں کا نظام بھی قائم کر چکی تھی، ایسے جانور اور مویشی جنہیں عربی میں الانعام کہتے ہیں، یعنی اونٹ، گائے، بیل، بھیڑ، بکریوں کو لوگ پالتو بنا بنا کر ان سے اُن کے مناسب حال کام لینے لگے تھے، بلکہ قرآن کے ایسے الفاظ یعنی ثیاب دوسر کا ترجمہ اگر وہی کیا جائے، جو لغتہً اُن سے سمجھا جاتا ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ جامہ بافی (حیاکت) آہن گری جیسی صنعتوں کا رواج بھی ہیں عہد تک ہو چکا تھا، بلکہ جب تک یہ تسلیم نہ کیا جائے کہ نجاری کا فن عہد نوح تک کافی ارتقائی مراتب طے کر چکا تھا، اس وقت تک سفینۂ نوح اور جن کاریگروں سے اس میں کام لیا گیا، ہم اس کی توجیہ نہیں کر سکتے، اسی طرح چھوت چھات، یا جات چار کی طبقاتی تقسیم کا سراغ بھی قصۂ نوح میں ملتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک اس مسئلہ میں اتنی قوت حاصل ہو چکی تھی کہ حضرت نوحؑ کے انکار کی ایک وجہ اُن کی قوم کی طرف سے یہ بھی پیش کی گئی تھی کہ تمہارا ساتھ اراذل (یا اچھوت نیچ طبقات) نے دے رکھا ہے، یہی نہیں بلکہ اسی سلسلہ میں حضرت نوح علیہ السلام کے دعویٰ نبوت کی تنقیح کرتے ہوئے جو باتیں اس قوم کی طرف سے پیش ہوتی تھیں، ہم ان پر جب غور کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ احتجاج کہیے یا ایڈوکیسی کی مشق میں یہ قوم کہاں تک ترقی کر چکی تھی کہ سورۂ المومنون کے ان الفاظ پر غور کیجیے۔ فرمایا گیا ہے کہ

قال الذين كفرو امن قومه ما هذا الا بشر مثلكم، يريدان يتفضل عليكم ولوشاء الله لا نزل ملائكته ما سمعنا بهذا فی ابائنا الا ولین ان هو الا رجل به جنة فتربصوابه حتّٰی حِین

نوح کا جنہوں نے انکار کیا تھا وہ بولے کہ نہیں ہے یہ ایک آدمی تم ہی جیسا چاہتا ہے کہ تم پر بڑائی حاصل کرے، خدا چاہتا تو فرشتوں کو اُتارتا، ہم نے اپنے گذشتہ باپ دادوں میں یہ بات سنی نہیں ہے مگر ایک آدمی جس پر جنوں کا اثر ہے، پس انتظار کرو کچھ دن کے لیے۔

بجا ایک دلیل کے آپ دیکھ رہے ہیں، پانچ پانچ یا تین تین اپنے انکار کی توجیہ میں اُن کی طرف سے پیش ہو رہی ہیں، یعنی وحی کے ایک جدید علمی ذریعہ کا دعویٰ اس لیے صحیح نہیں ہے کہ نوح ہی جیسا ایک آدمی ہے، احساس و ادراک کی جو قوتیں عام انسانوں میں مشترک ہیں، کوئی وجہ نہیں کہ نیا حاسہ اس میں پیدا ہوا ہو، پھر اس جدید حاسہ کا دعویٰ اُس نے کیوں کیا؟ اس کا جواب دیتے کہ بڑے بننے کی خواہش بھی اندرونی محرک ہے جس نے اس دعویٰ پر اس کو آمادہ کیا۔ باقی یہ خیال کہ خدا نے اپنے بندوں کی اصلاح کے لیے اس شخص کو اس جدید علمی ذریعہ سے سرفراز فرمایا ہے، اس کا جواب دیتے کہ خدا کے لیے اس سے زیادہ آسان یہ تھا کہ اپنے کسی فرشتہ کو ہم میں بھیج دیتا، جسے عوام و خواص بہ آسانی تسلیم کر لیتے۔ آخر میں تاریخی شہادت یہ پیش کرتے کہ ہماری گذشتہ تاریخ میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، یعنی کسی نے وحی و نبوت کا دعویٰ کیا ہوا آخر میں کہتے کہ دماغی توازن اس شخص کا کچھ بگڑ گیا ہے، جو خود بخود رفتار زمانہ کے ساتھ درست ہو جائے گا۔[۳]

اور یہ تو میں نے چند اجمالی اشارے کئے ہیں ورنہ قرآن میں انسانی تاریخ کے دور اوّل یعنی از آدم تا قومِ نوح، اسی طرح دور ثانی یعنی عاد و ثمود ہود و صالح علیہما السلام کی مخاطب قوموں یا ابراہیم و موسیٰ علیہما السلام نے جن لوگوں میں کام کیا، اپنی خاص اصطلاح میں جس تمدن و تہذیب کا نام میں نے ''جبلی تمدن'' رکھ دیا، اس کے بعض پہلوؤں کے متعلق معلومات کا جو ذخیرہ قرآن میں محفوظ کر دیا گیا ہے، شاید ان دونوں ادوار کے متعلق اُن کے معلومات قرآن کے سوا اور کسی ذریعہ سے ہم حاصل نہیں کر سکتے۔ سید مرحوم کو خدا جزائے خیر دے کہ ان قرآن قصص کے متعلق یورپ نے شکوک و شبہات کے جو گرد و غبار اچھالے تھے، خود ان ہی کے طریقہ تحقیق سے اُن کے صاف کرنے کی ایک ایسی راہ کھول دی ہے کہ کام کرنے والے چاہیں تو اس سلسلہ میں بہت کچھ کام کر سکتے ہیں۔ اپنی اثریاتی و حضریاتی جدوجہد سے یورپ و امریکہ والے ایسے نئے نئے انکشافات دنیا کے سامنے لا رہے ہیں، جن سے قرآنی بیانات کی قدر و قیمت روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

بہرحال اپنی تاریخ کے جس حصہ کو یعنی دور اوّل و ثانی جسے لوگ عموماً بھول جانے والے تھے، اسی حصہ کے متعلق قرآن میں نسبتہً جو زیادہ تفصیل پائی جاتی ہے، اور ان کے سوا تیسرے دور جس میں دنیا کے اکثر حصوں میں مقامی تمدنوں کا ظہور ہوا، اس کے متعلق بجز اس قسم کے اجمالی اشاروں کے کہ ''زمین میں چلو پھرو، اُن کے حالات تم پر واضح ہوں گے''، یا قرآن کی پہلی مخاطب قوم عرب کو اجمالی لفظوں میں اطلاع دی گئی ہے کہ دنیا کی تعمیر و ارتقاء کا کام تم سے بہت زیادہ بہتر طریقہ پر دوسری قومیں انجام دے چکی ہیں اور اُن کی اصلاح کے لیے راہ نما اٹھتے رہے، ہر آبادی میں چونکا دینے والے (نذیر) گذرتے رہے، اسی طرح چوتھا دور جس میں دنیا قیصریت و کسرویت کی مغربی و مشرقی قوتوں کے ساتھ بلاواسطہ وابستہ ہو گئی تھی، اس کے متعلق سورۃ الروم کی ابتدائی آیتوں میں حد سے زیادہ اجمالی اشارہ کر کے قرآن جو گذر گیا ہے تو بظاہر اُس کی مصلحت غالباً یہی نظر آتی ہے کہ دونوں پچھلے ادوار سوم و چہارم کی حالت اوّل اور دوم ادوار کی جیسی نہ تھی، بلکہ ہر ملک اور ہر قوم اپنی تاریخ اور اپنی اثری یادگاروں کو اس طور پر قائم کر چکی تھی کہ بآسانی اُن کے متعلق کافی معلومات عام تحقیقاتی ذرائع سے حاصل کئے جا سکتے تھے، اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کا بڑا حصہ آج مرتب شکل میں

Marfat.com

ہمارے سامنے موجود بھی ہے۔

خیر میں بہت دور نکل گیا، کہنا یہ چاہتا تھا کہ سید مرحوم کی ''تاریخ ارض القرآن'' نے قرآنی مطالعہ کے متعلق ایک نئے زاویۂ نظر کو پیش کیا، جس کا اعتراف قرآن کے ہر خادم کو کرنا چاہیے۔ انہوں نے صرف ''عام انسانی تاریخ'' کے سلسلہ میں نئی راہیں آئندہ تلاش و تحقیق کرنے والوں کے لئے نہیں کھولی ہیں، بلکہ قرآن کی بعض جزئی شخصیتوں کے متعلق بعض ایسے اہم انکشافات پیش کیے ہیں، جن کی روشنی میں اُن کی حیثیتوں اور اُن کی قدر و قیمت میں نمایاں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً لقمان نامی ایک شخص کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے اور اُن کی طرف منسوب کر کے بعض قیمتی نصائح اس کتاب میں ملتے ہیں اب ایک طرف سوچئے جو عام طور پر مشہور ہے کہ لقمان کسی عرب کے حبشی غلام تھے اور دوسری طرف سید صاحب مرحوم کی اس تحقیق کو سامنے رکھئے جس کا حاصل یہ ہے کہ قوم عاد کے مادی عروج کے بعد جو زوال ہوا اور اس کے بعد حضرت ہود علیہ السلام پر ایمان لانے کے بعد یہی قوم ہود کی شریعت کے مطابق ''اسلامی تہذیب و تمدن'' کے نظام کے قائم کرنے میں کامیاب ہوئی، اسی عہد کے ایک الوالعزم حکمران لقمان تھے، سید مرحوم نے مختلف تاریخی شہادتوں سے اپنے دعویٰ کو ثابت کرتے ہوئے آخر میں عدن کے قریب حصن غراب نامی مقام کے کھنڈروں سے نکلے ہوئے اس کتبہ کو جسے ایک انگریز افسر ولسڈ نے ۱۸۳۴ء میں برآمد کیا تھا، اسی کتبہ کے اس فقرے سے یعنی

> ''ہم پر وہ بادشاہ حکومت کرتے ہیں، جو کمینہ خیالات سے بہت دور، اور شریروں کو سزا دینے والے تھے، ہود کی شریعت کے مطابق ہمارے واسطے پیدا ہوتے تھے، اچھے فیصلے ایک کتاب میں لکھے جاتے تھے'' (ص ۱۸۲ ج ۱۔ تاریخ ارض القرآن)

انہوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کتاب جس میں فیصلوں کے نقل کرنے کا جو ذکر ہے یہی وہ کتاب ہے جو مجلّہ ''لقمان'' کے نام سے عرب میں عام طور پر مشہور تھی، جس کا مطلب یہی ہوا کہ قرآن نے جیسے تورات و انجیل وغیرہ کی سچائیوں کو اپنے اندر محفوظ کر دیا ہے اسی طرح سورۂ لقمان کی وہ باتیں جن کا لقمانی حکمت کے نام سے قرآن میں تذکرہ کیا گیا ہے، یہ ہودی شریعت کی غیر فانی صداقتوں سے تعلق رکھنے والی باتیں ہیں، گویا قرآنی دعویٰ ''مصدقا لما بین یدیہ'' ہی کی ایک شکل لقمانی حکمت بھی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس سلسلہ میں سید صاحب کے بعض دعاوی دلائل کے لحاظ سے اب بھی محلِ غور و تحقیق ہیں، لیکن کہنے والوں نے جیسا کہ کہا ہے سوال اور جواب علم ان ہی دونوں باتوں کے مجموعہ کی تعبیر ہے، ہر علم اور فن میں سوال اُٹھانے والے علم کے نصف حصہ کے حقدار ہوتے ہیں، خواہ اُن کے پیش کردہ جوابوں سے لوگوں کو اختلاف ہی کیوں نہ ہو۔ یہی بات سید صاحب مرحوم کے متعلق میں کہنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے قرآن کے ایک خاص پہلو کو اپنی اس کتاب میں تلاش و تحقیق کے لیے پیش کیا ہے۔ ان کا دعویٰ یہی ہے۔ فرماتے ہیں کہ

> ''تیرہ سو برس میں ایک کتاب بھی مخصوص اس فن میں نہیں لکھی گئی۔'' (ص ۳ ج ۱)

Marfat.com

اس سلسلہ میں اُن کے جوابوں سے ممکن ہے، اختلاف کیا جائے لیکن سوالات کے پیدا کرنے والے یقیناً وہی قرار پائیں گے۔ انہوں نے علم سے دین کی خدمت کی ایک نئی راہ نکالی۔ اُمید ہے کہ آئندہ اس پر کام کرنے والوں کے اجر میں اُن کا بھی حصہ ہوگا۔

سید صاحب نے جس زمانہ میں اپنی یہ کتاب مرتب کی تھی جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں اُن پر عقلیت پسندی ہی کا زیادہ اثر تھا اور شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ بعض مواقع پر مثلاً حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کی پیدائش کے سلسلے میں چٹان سے نکلنے کے واقعہ کا جو انہوں نے صاف لفظوں میں انکار کیا ہے، غالباً یہ اُن کی عقلیت پسندی کی یادگار ہے، لیکن بااین ہمہ حیرت ہوتی ہے کہ اسی زمانہ میں سورۂ فیل کا تذکرہ کرتے ہوئے سرسید احمد خان کی تفسیر کے متعلق اُن کے قلم سے یہ الفاظ نکل پڑے ہیں کہ

''سرسید نے اس سورہ کی جو تفسیر ''تہذیب الاخلاق'' میں لکھی تھی، اور جس سے اس واقعہ کے اعجوبہ پن کو دور کرنے کی کوشش کی تھی، وہ سرتا پا لغو اور اغلاط سے مملو ہے'' (ص ۳۲۲)

اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصہ میں ہدہد پرندے کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ لکھتے ہوئے کہ

''اس زمانہ کے بعض فطرت پرست کہتے ہیں کہ مُرغ کا بولنا اور اس کی بولی سے مفہوم کا سمجھنا خلافِ عقل ہے۔''

سید مرحوم نے جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

''جانوروں کی عاقلیت کا مسئلہ مسلّم ہوتا جاتا ہے، بندروں کی بولیوں کی ابجد تیار کی جارہی ہے تو ہُدہُد کے بولنے پر تعجب کیوں ہو؟''

اسی کے ذیل میں یہ اضافہ بھی اُن کے قلم نے کیا ہے کہ

''اگر پرندوں کا بولنا اب بھی کھٹکتا ہے تو فرض کرلو کہ نامہ بر کبوتروں کی طرح تربیت یافتہ نامہ بر ہدہد ہوگا۔''

مگر اسی کے ساتھ اسی سلسلہ میں اُن کا یہ فرمانا کہ

''طیر کے معنی فوج لینا جیسا کہ مولوی چراغ علی نے لیا ہے، اسی طرح بے ثبوت ہے جس طرح سرسید کا سورۂ فیل کی تفسیر میں طیر سے فال بد لینا۔ (ص ۲۶۸)

یہی باتیں اُن کی حقیقی دینی فطرت کی غمازی کررہی ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ اسی پر اُن کا خاتمہ بالخیر ہوا۔ والعاقبة للتقویٰ۔

Marfat.com

حواشی

۱۔ ان کی مذبوحی حرکتوں کی یہ انتہا ہے کہ شام جیسے مختصر ملک کو انہوں نے جنگِ عظیم کے بعد لبنانی، اسرائیلی، فلسطین، شرقِ ماردن، سوریہ پانچ پانچ مستقل علاقوں کی شکل میں بانٹ رکھا ہے، حالانکہ اس مختصر سرزمین کے باشندوں میں نہ زبان ہی کا اختلاف تھا، نہ رنگ کا، نہ نسل کا، حتیٰ کہ مذہبی حیثیت سے بھی اکثریت کا دین ایک ہی تھا، لیکن بایں ہمہ انتہائی بے شرمیوں سے کام لے کر اس غریب علاقے کی تکا بوٹی کردی گئی۔

۲۔ سورۂ نوح میں اسی قوم کی طرف واستغشوا ثیابھم کے الفاظ منسوب کئے گئے ہیں، ثیاب ثوب کی جمع ہے جس کے معنی کپڑا ہیں۔ اسی طرح سورہ القمر میں سفینۂ نوح کے متعلق ذات الواح دوسر کے الفاظ پائے جاتے ہیں، دوسر کی تفسیر سماء کے لفظ سے کی گئی ہے، ترجمہ جس کا سیخ آہنی ہے۔

۳۔ میں نے مختصر لفظوں میں قوم نوح کے پیش کردہ نقاط کا ذکر کردیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ غور کرنے سے ہر نقطہ بحث سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی منطقی اور استدلالی قابلیت کافی ترقی یافتہ ہو چکی تھی۔ آج بھی وحی و نبوت کے مخالفین جو باتیں بناتے ہیں، شاید وہ اس قسم کی ہیں۔ اس زمانہ میں قوموں کا ایک دستور یہ بھی ہے کہ اپنی قومی زندگی کی جوہری بنیادوں کا خلاصہ چند الفاظ میں کر لیتے ہیں، مثلاً اخوت و مساوات عدالت۔ پھر ان لفظوں کو معبود بنا کر ساری قوم کو اُن کے آگے جھکنے کا حکم دیتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قوم نوح میں ''اد'' (محبت......) سواع (وقت اور اس کی قدر و قیمت) یغوث (باہمی امداد میں ایک دوسرے کی فریاد رسی) یعوق (دفاعی قوتوں کی تعمیر) نسر (کوئی خاص موسم جب برجِ نسر میں ستارہ آجاتا تھا) ان پانچ دیوتاؤں کی عبادت کا مطلب یہی تھا کہ اپنی قومیت کی صفاتی بنیادوں کو مورتیوں یا اصنام کی شکل میں انہوں نے ڈھال لیا تھا، اور ہر شہر قصبہ گاؤں میں انہی بتوں کو نمایاں مقامات پر گاڑھ کر قوم کو وہ زندگی کا درس دیتے تھے۔ تفصیل کے لیے ''مطولات'' کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

۴۔ دیکھو ارض القرآن۔ ج ۱ ص ۱۹۷

(در: معارف (اعظم گڑھ)، سلیمان نمبر، مئی ۱۹۵۵ء، ص ۲۱۵۔۲۲۸)

☆......☆......☆

Marfat.com

دجّالی فتنہ اور سورۂ کہف

(اس مضمون میں عام ناظرین کی سہولت کے خیال سے کہیں کہیں مولانا رحمتہ اللہ علیہ کے الفاظ میں تقدم وتاخر، تبدیلی یا اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ تصرف صرف لفظی ہے معنوی بالکل نہیں اور اس کو ممتاز کرنے کے لیے اس [ ] علامت کے اندر کر دیا گیا ہے۔ دو چار جگہ توضیحی حواشی لکھے گئے ہیں۔ ان کے آخر میں بھی ''مرتب'' یا ''ع'' لکھ دیا گیا ہے۔ علیٰ ہذا مضمون کی مختلف عنوانات میں تقسیم اور تمام بغلی سرخیاں یہ سب بھی مرتّب کی جانب سے ہے۔ اس میں کوئی سقم نظر آئے تو اس کا ذمہ دار وہی ہے۔)

مقدمہ

مشہور حدیث جو ابوداوٗد، مسلم، ترمذی، نسائی، مسند احمد، بیہقی وغیرہ محدثین کی کتابوں میں پائی جاتی ہے، جس میں بیان کیا گیا ہے کہ دجّال کے فتنے سے جو محفوظ رہنا چاہتا ہو، اس کو چاہیے کہ سورۂ کہف کی ابتدائی یا خاتمے کی آیتوں کی تلاوت کرے۔ بعض روایتوں میں ابتدا یا خاتمہ کا ذکر نہیں ہے، بلکہ فرمایا گیا ہے کہ مطلقاً سورۂ کہف کی دس آیتوں کی تلاوت پڑھنے والوں کو دجّال کے فتنے میں مبتلا ہونے سے بچالیتی ہے۔ حضرت ابوسعید خدری، ابودرداء، ابن عمر، ابن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) صحابیوں سے الفاظ کی کمی وبیشی کے ساتھ مندرجہ بالا کتابوں میں یہ حدیث مروی ہے۔

اسی حدیث کی بنیاد پر سمجھا جاتا ہے کہ سورۂ کہف کے مضامین کا دجّال کے فتنے سے کسی نہ کسی قسم کا تعلق ضرور ہے۔ آیئے نبوت کے اسی اشارہ کی روشنی میں اس سورہ کے مشتملات پر غور کریں۔ مجھ سے پہلے بھی بعض بزرگوں اور عزیزوں نے اس مسئلہ پر قلم اٹھایا ہے، کچھ حرج نہیں کہ افادات سابقہ کے ساتھ جو کچھ اس وقت پیش کیا جا رہا ہے اس کا بھی مطالعہ کر لیا جائے۔ ممکن ہے کہ قرآن کی اس خاص سورہ کو سمجھنے میں تھوڑی بہت مدد ان معروضات سے بھی مل جائے۔ پہلے بطور مقدمہ کے چند تمہیدی باتیں سن لیجیے۔

Marfat.com

موضوع بحث

''المسیح الدجّال'' کی شخصیت اور حقیقت سے بحث نہیں، یہ ایک مستقل جداگانہ مسئلہ ہے، یہاں مقصود صرف ''وہ فتنہ'' ہے جسے ''المسیح الدجال'' کی طرف پیغمبرانہ پیشین گوئیوں میں منسوب کیا گیا ہے۔

دجّال کی علامات

دجّال کے متعلق آپ نے جو کچھ سنا ہوگا، یا کتابوں میں جن چیزوں کا انتساب اس کی طرف کیا گیا ہے سب کو پیش نظر رکھنے کے بعد کلّی تعبیر ان کی یہی ہوسکتی ہے کہ بعض قدرتی قوانین پر غیر معمولی اقتدار اس کو بخشا جائے گا۔ مثلاً مسافت یعنی مکانی فاصلوں کو صفر کے درجہ تک گویا اس کے زمانے میں پہنچا دیا جائے گا۔

تیز رفتاری

اس کی تیز رفتاری کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ جو فرمایا گیا ہے کہ ''جیسے بارش کو تیز آندھی اُڑائے لیے جاتی ہو۔'' کچھ یہی صورت اس کی رفتار کی ہوگی [1] صحیح مسلم کے الفاظ ''كالغيث استدبرته الريح'' کا مطلب یہی ہے اور یہ کہ کرۂ زمین کے ملکوں اور شہروں میں نہیں بلکہ ایشیا، افریقہ، یورپ وامریکہ وغیرہ کے ایک ایک گاؤں تک رسائی اس کی کل چالیس دن میں ہوجائے گی، نواس بن سمعان والی روایت کے الفاظ ''فلا تدع قرية الاهبطتها في اربعين ليلة (مسلم) سے یہی سمجھ میں آتا ہے۔

مشرق سے مغرب تک آواز کی رسائی

اور یہ حال تو اس کی تیز رفتاری کا ہوگا [آواز کی رسائی کا حال سنئے!] حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف ''کنزالعمال'' میں جو خطبہ منسوب کیا گیا ہے، اس میں آئندہ پیش آنے والے حوادث کے سلسلہ میں آپ نے دجّال کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے کہ، یہ بھی فرمایا تھا کہ

ينادي بصورت له ليسمع به مابين الخافقين (خلاصہ کنزالعمال۔ ج ۲ص ۵۳ے برمسند احمد)

پکارے گا دجّال ایک ایسی آواز جسے خافقین (مشرق ومغرب) کے درمیان رہنے والے سنیں گے۔

جس سے معلوم ہوا کہ نہ صرف ''رفتار'' بلکہ ''آواز'' کے سلسلہ میں بھی فاصلہ کا مسئلہ دجّال کے زمانہ میں غیر اہم ہوکر رہ جائے گی۔ اسی کتاب میں ''مستدرک حاکم'' کے حوالہ سے عبداللہ بن عمرو کی ایک روایت دجّال ہی کے متعلق جو پائی جاتی ہے اس میں بھی ہے کہ ''دجّال کی آواز مشرق ومغرب کے باشندے سُنیں گے۔'' (ص ۲۹ ج ۲۔ کنز)

علاج و معالجہ کی ترقی:

اسی طرح روایتوں میں بیان کیا گیا ہے کہ علاج و معالجہ کے طریقے ترقی کر کے اس حد تک پہنچ جائیں گے کہ الاکمہ (مادرزاد اندھوں) الابرص (کوڑھی) تک کو چنگا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔ (کنز۔ص ۴۸، ج ۲)

ہواؤں پر قابو

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ "سخرت له انهار الارض" (یعنی زمین پر بہنے والے دریاؤں اور نہروں پر بھی اس کو قابو عطا کیا جائے گا) جس سے معلوم ہوا کہ سیرابی کے ذرائع میں غیر معمولی ترقیاں رونما ہوں گی۔ اسی کے بعد سے "و آثار ها" یعنی زمین کی پیداواروں پر اس کو قابو بخشا جائے گا، ظاہر ہے کہ سیرابی کے ذرائع پر قابو یافتہ ہونے کا یہ لازمی نتیجہ ہے اور یہی نہیں بلکہ ایسا ہوتا ہے مون سونی (برساتی) ہواؤں سے بھی کام لینے کی تدبیر اس پر منکشف ہو جائے گی، حدیث کے الفاظ ہیں کہ

یا مر السّماء فتمطر و الارض فتبنت (ج ۲، ص ۳۸۔ کنز بر مسند)

بادل کو حکم دے گا تو برسنے لگے گا، اور زمین کو حکم دے گا تو اگانے لگے گی۔

معدنیات پر اقتدار

اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ نباتاتی پیداواروں کے سوا زمین کے پیٹ کے معدنی ذخیروں کو بھی برآمد کرنے میں غیر معمولی کرشموں کا دجّال اظہار کرے گا۔ حدیث کے الفاظ ہیں کہ

ویمر بالحزبه فیقول لها اخرجی کنوزک فتتبعه کنورها (ج ۲ ص ۳۸۔ کنز)

اُجاڑ زمینوں پر گذرے گا اور کہے گا کہ نکال اپنے ذخیروں کو بس یہ ذخیرے اس کے پیچھے ہولیں گے۔

احیاءِ موتیٰ

اور ان ہی روایتوں میں دجّال کی طرف جویُحی الموتیٰ (یعنی وہ مردے کو زندہ کرے گا) کے الفاظ منسوب کیے گئے ہیں، اُن سے تو ثابت ہوتا ہے کہ مردوں کو زندہ کرنے کی بھی قدرت اس میں پیدا ہو جائے گی، یہ بھی ہے کہ مردے کو زندہ کر کے دکھائے گا بھی، صحاح میں ہے کہ ایک زندہ آدمی کو چیر کر رکھ دے گا اور پھر دونوں ٹکڑوں کو جوڑ کر اسی کو زندہ کر دے گا۔

مردوں سے مکالمہ

اور کچھ قصہ اسی نقطہ پر ختم ہوتا ہوا نظر نہیں آتا، بلکہ روایتوں کے اس حصے پر بھی غور کیجیے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ دجّال لوگوں کو ایک کرشمہ یہ بھی دکھائے گا کہ "بعض خبیث روحیں یعنی شیاطین لوگوں کے سامنے نمودار ہو کر کہیں

Marfat.com

گے کہ ہمارا یہ نام ہے۔ اور تمہارے ہم مرے ہوئے باپ، یا مری ہوئی ماں، یا دوسرے عزیز ہیں۔'' الفاظ روایت کے یہ ہیں کہ

ویبعث معهٗ الشیاطین علیٰ صورة من قدمات من الأباء وَ الأمهات و لاخوان والمعارف فیاتی احد هم الیٰ ابیه او اخیه فیقول الست فلانا الست تعرفنی (کنز۔ص ۵)

اور اُٹھائے جائیں گے دجّال کے ساتھ بعض شیاطین ان لوگوں کی شکلوں میں جو مر چکے ہیں۔ یعنی باپ، ماں، بھائی اور جانے پہچانے لوگ۔ پھر کوئی اپنے باپ یا بھائی کے پاس آئے گا، تب وہی پوچھے گا کہ میں فلاں آدمی کیا نہیں ہوں، کیا تم مجھے نہیں پہچانتے؟

بعض روایتوں کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے کہ

''دجّال کے ساتھ کچھ شیاطین ہوں گے جو مُردوں کی سی شکل بنا کر زندوں سے کہیں گے کہ مجھے تم پہچانتے ہو، میں تمہارا بھائی یا تمہارا باپ یا تمہارا فلاں رشتہ دار ہوں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ ہم مر چکے ہیں۔''

الغرض اس کا بھی سراغ ملتا ہے کہ مُردوں کے ساتھ زندوں کا تعلق پیدا کرانے کا دعویٰ بھی اسی طریقہ سے کیا جائے گا جیسے سُنا جاتا ہے کہ یورپ وامریکہ میں آج کل مردوں کو حاضر کرانے اور ان سے مکالمہ کے مواقع ان مُردوں کے زندہ عزیزوں کے لیے اسپریچولزم والوں کی طرف سے مہیا کیے جاتے ہیں۔ حضرت ابوسعید الخذری صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالے سے مسند احمد میں دجال ہی کے متعلق ایک طویل حدیث پائی جاتی ہے۔ جس ایک جزیہ بھی ہے۔

''دجّال کسی دیہاتی سے کہے گا کہ تمہارے ماں باپ کو زندہ کر کے میں کھڑا کر دوں تو تم مجھے اپنا رب مانو گے؟ دیہاتی کہے گا کہ اچھا ایسا کر کے دکھاؤ، تب وہ خبیث روحیں اس دیہاتی کے سامنے اس کے ماں باپ کی شکل اختیار کر کے نمایاں ہوں گی اور دیہاتی سے کہیں گی کہ اے میرے بیٹے! تم دجّال کا ساتھ دو اور اس کی پیروی کرو، یہی تمہارا رب ہے۔'' (ص ۲۰۰ ج ۲ کنز العمال)

بہرحال قدرتی قوانین پر غیر معمولی اقتدار جو دجّال کو عطا کیا جائے گا وہ یہی یا اس قسم کی دوسری باتیں ہیں جن کی تفصیل دجّال کی متعلقہ حدیثوں میں پڑھی جاسکتی ہے۔

دجّال کو دجّال بنانے والی چیز

لیکن جہاں تک میرا خیال ہے دجّال کو دجّال بنانے والا اس کا وہ طرزِ عمل ہوگا جو اپنے اس غیر معمولی اقتدار کے استعمال میں وہ اختیار کرے گا۔

میرا مطلب یہ ہے کہ قوانین قدرت پر غیر معمولی اقتدار بجائے خود ایسی چیز نہیں ہے جو آدمی کو دجالی بنا دے

Marfat.com

بلکہ پرانی تعلیم کی رو سے تو قدرت کے قوانین سے استفادہ نسل انسانی کے مقامِ خلافت کا اقتضا ہے۔ آدم علیہ السلام اسماء کا جو علم بخشا گیا تھا اسی اجمالی علم کی یہ تفسیر ہے، ماسواء اس کے کون نہیں جانتا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کو بھی قسم کا غیر معمولی اقتدار بخشا گیا تھا، علوی اجرام یا سفلی اجسام کی تسخیر کی مثالوں سے ان کی زندگی معمور نظر آتی ہے۔ سمندر کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ضرب سے پھٹ جانا، یا شق القمر کا معجزہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہے، خود قرآن میں ذکر کیا گیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اکمہ وابرص کو چنگا بھی کرتے تھے بلکہ مردوں کو زندہ کر کے بھی دکھاتے تھے۔ بہر حال پیغمبروں کی زندگی میں اس قسم کی چیزوں کی کیا کمی ہے، مگر پیغمبروں کو یہی اقتدار جب بخشا گیا تو اپنے اس اقتدار سے جو کام وہ لیتے تھے، اس سے دنیا واقف ہے یعنی اقتدار بخشنے والے قادر و توانا کے شکر سے ان کے قلوب بھی معمور ہو جاتے تھے اور دوسروں کو بھی اسی خدائے بخشائندہ مہربان کی طرف کھینچتے تھے۔ تسخیری مظاہر کو حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے سامنے پا کر فرمایا کرتے تھے کہ

هذا من فضل ربی لیبلونی أ اشکرام اکفر و من شکر فانما یشکر لنفسہ و
من کفرفان ربی غنی کریم (النمل)

یہ میرے پروردگار کی مہربانی ہے، مجھے وہ جانچتا ہے کہ میں اس کا گن گاتا ہوں یعنی شکر کرتا ہوں، یا ناشکری کرتا ہوں، جو شکر کرتا ہے خود اپنے لیے کرتا ہے اور جو ناشکری کرتا ہے اسے معلوم ہو کہ میرے رب کی ذات سب سے بے پروا اور عظمت والی ہے۔

لیکن بالکل اس کے برعکس جیسا کہ سب جانتے ہیں دجال اپنے اقتداری کرشموں کو اقتدار بخشنے والے خدا سے خود باغی بننے اور دوسروں کو بھی خدا سے بے زار و باغی بنانے میں استعمال کرے گا۔ اس کی یہ خصوصیت اتنی نمایاں ہوگی کہ عوام و خواص ہر ایک پر بشرطیکہ مومن ہو حدیثوں میں آیا ہے کہ پہلی نظر میں اس کے مشن کا یہ امتیازی نصب العین خود بخود واضح ہو جائے گا۔ صحیح بخاری وغیرہ میں یہ مشہور روایت جو دجال ہی کے متعلق پائی جاتی ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

انہ مکتوب بین عینیہ ک ف ر یقرء ہ کل مومن کاتب او غیر کاتب

دجال کی دونوں آنکھوں کے بیچ ک، ف، ر (کفر) لکھا ہوا ہوگا جسے ہر مومن پڑھ لے گا۔ خواہ وہ کاتب ہو یا غیر کاتب۔

کاتب ''یعنی لکھنے پڑھنے والے لوگ'' اور ''غیر کاتب'' یعنی نوشت و خواند کا سلیقہ جن میں نہ ہو کسی سے بھی دجال کی خصوصیت مخفی نہ رہے گی۔ گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ کفر یعنی ''ک، ف، ر'' یہی دجالی تمدن و تہذیب کا امتیازی چھاپ ہو گا۔ ماحول ہی ایسا پیدا ہو جائے گا کہ دنیا بے ایمانی، الحاد، بے دینی کی شکار ہوتی چلی جائے گی۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کا ذکر کرتے ہوئے ایک دن فرمایا کہ ''دجال کے دیکھنے کا موقع جسے مل جائے، اس کو چاہیے کہ اس سے دور ہی دور رہے''۔ اسی کے بعد یہ ارشاد ہوا تھا کہ

فواللہ ان الرجل لیاتیہ و ھو یحسب انہ مومن فیتبعہ ممّا یبعث الشبھات (ابوداؤد وغیرہ)

تو اللہ کی قسم ہے کہ دجال کے پاس آدمی آئے گا یہ خیال کرتے ہوئے کہ وہ مومن ہے مگر (ملنے کے ساتھ ہی) اس کا پیرو بن

Marfat.com

جائے گا، جس کی وجہ وہ شبہے اور شکوک ہوں گے جو دجّال سے ملنے کے ساتھ ہی پیدا ہو جائیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دوسروں کو اپنے خیالات سے متاثر کرنے کی غیر معمولی مہارت اس میں پائی جائے گی۔ اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ مردوں سے آگے بڑھ کر عورتوں کو بھی وہ متاثر کرے گا۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

اٰخر من یخرج الیه النساء حتی ان الرجل لیرجع الیٰ اُمه وابنته واخته و عمته فیوثقها رباطاً

دجّال کے ساتھ آخر میں عورتیں بھی نکل پڑیں گی۔ حالت یہ ہو جائے گی کہ آدمی اپنی ماں، بہن، بیٹی، پھوپھی کو اس اندیشے سے باندھے گا کہ کہیں دجال کے ساتھ نہ نکل پڑیں۔

بہرحال قدرتی قوانین پر غیر معمولی اقتدار کا غلط بلکہ قطعی معکوس استعمال یہی وہ ''فتنہ'' ہے جس میں المسیح الدجّال خود بھی مبتلا ہوگا اور کوشش کرے گا کہ اس کی بھڑکائی ہوئی فتنے کی اس آگ میں دوسرے بھی جھونک دیے جائیں۔

دجّال کی کرشمہ نمائیوں کے ذرائع

باقی یہ مسئلہ کہ اپنی کرشمہ نمائیوں میں وہ کن ذرائع سے کام لے گا؟ ظاہر ہے کہ جب تک ''المسیح الدجّال'' خود دنیا کے سامنے نہ آجائے، اس سوال کا صحیح جواب نہیں دیا جا سکتا۔ کیا سحر و جادو یا اسی قسم کے غیر مادی ذرائع پر اس کو قابو بخشا جائے گا۔

حافظ ابن حزم کا خیال:

یا جیسا کہ حافظ ابن حزم محدث کا خیال ہے۔

انما هو محیل بحیل لجیل معروفة کل من عرفها عمل مثله (الملل والنحل۔ ج ۲ ص ۱۴۱)

دجّال حیلوں سے کام نکالے گا، ایسے حیلے جن کا علم جو بھی حاصل کرے گا وہی سب کچھ کر کے دکھا سکتا ہے جو دجّال دکھائے گا۔

جس کا حاصل یہ ہوا کہ ابن حزم کے نزدیک دجّال ''حیل'' سے کام لے گا، جو ''حیلہ'' کے لفظ کی جمع ہے۔ عام طور پر میکانکی طریقوں کی تعبیر عربی زبان میں ''حیل'' کے لفظ سے کی جاتی ہے۔ مثلاً جرِ ثقیل کے طریقوں کا ذکر ''حیل'' کے ذیل میں کرتے ہیں۔ علم الحیل نام ہی اس علم کا ہے جس میں میکانکی طریقوں سے چیزوں پر قابو حاصل کرنے کی تدبیریں بتائی جاتی ہیں اور یہی ابن حزم کا مقصود بھی ہے۔ انہوں نے دوسری جگہ ''دجّالی کرشموں'' کا تذکرہ کرتے ہوئے بعض مثالوں سے ''دجّالی کرتبوں'' کو سمجھانا چاہا ہے۔ مثلاً لکھا ہے کہ اس کی نوعیت وہی ہوگی جیسے بعض لوگ مرغیوں کو ہڑتال کھلا کر دکھا دیتے ہیں کہ گویا مرغیاں مر گئیں، ان کی حس و حرکت غائب ہو گئی، پھر ان ہی مرغیوں کے حلق میں زیتون کا تیل جب ٹپکاتے ہیں تو پھڑ پھڑا کر اُٹھ بیٹھتی ہیں۔ بھڑوں کے متعلق بھی اپنا ذاتی تجربہ نقل کیا ہے کہ پانی میں ان کو ہم ڈال دیا کرتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب مر گئیں۔ پھر ان ہی مردہ بھڑوں کو دھوپ میں لا کر

تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ دیتے تو وہ زندہ ہو جاتی تھیں۔ اسی سلسلے میں اپنے وطن (اندلس) کے ایک آدمی محمد محرق کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بند کمرے میں یہ تماشہ دکھاتا تھا کہ کوئی دوسرا بولنے والا اس کمرے میں موجود نہیں ہے۔ لیکن بولنے کی آواز اسی کمرے میں گونجتی تھی۔ حافظ کا بیان ہے کہ اس کمرہ کی دیوار کے مخفی شگاف میں نلکی لگی ہوئی تھی جس سے لوگ ناواقف تھے، اسی نلکی کے دوسرے سرے پر کمرے سے باہر بات کرنے والا بات کرتا تھا مگر محرق باور کراتا تھا کہ کسی بولنے والے کے بغیر اس کے سامنے آوازیں آتی ہیں۔ (الملل والنحل۔ جلد ا ص ۹۰)

راہِ صواب

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حدیثوں میں بھی اس کی تصریح نہیں کی گئی ہے کہ ''دجّال'' اس راہ میں کن ذرائع سے کام لے گا۔ نہ اس کی تصریح پائی جاتی ہے کہ سحر و شعبدہ وغیرہ سے وہ کام لے گا اور نہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ قدرتی قوانین کا علم حاصل کر کے ان کو اپنے قابو میں لائے گا۔

اور یہ قصہ کچھ دجّالی کرشموں ہی تک محدود نہیں ہے۔ قیامت سے پہلے آئندہ پیش آنے والے جن واقعات کا حدیثوں میں ذکر کیا گیا ہے، سب ہی کے متعلق یہ مناسب ہے کہ دیکھنے سے پہلے خواہ مخواہ اپنی طرف سے ان کے اسباب و علل کے متعلق فیصلہ نہ کر دیا جائے۔[۲]

ایک عاجلانہ فیصلہ

پچھلے دنوں بعض لوگوں نے عجلت سے کام لے کر یورپ و امریکا کے موجودہ تمدن و تہذیب کو دجّالی تمدن و تہذیب قرار دیتے ہوئے یہ فیصلہ بھی جو کر دیا کہ ''المسیح الدجّال'' جس کی حدیثوں میں پیشین گوئی کی گئی ہے، وہ آ گیا اور اب مسلمانوں کو دجّال کے انتظار کی زحمت نہ کھینچنی چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ فیصلہ بھی زود فکری اور زور بیانی کے عارضہ کا نتیجہ تھا اور اب بھی جن لوگوں کو اس خیال پر اگر اصرار ہو تو سمجھنا چاہیے کہ زود فکری کے مرض سے وہ شفایاب نہیں ہوئے ہیں۔

یورپ و امریکا میں ابھی دجّال کی علامات پوری طرح موجود نہیں ہیں

یہ صحیح ہے کہ قدرتی قوانین پر غیر معمولی اقتدار پچھلی دو ڈھائی صدیوں میں یورپ و امریکہ والوں کا مسلسل قائم ہوتا چلا جا رہا ہے اور اپنے اس اقتدار کو ان ممالک کے باشندے بھی ان ہی ''دجّالی اغراض'' میں جیسا کہ دیکھا جا رہا ہے، استعمال کر رہے ہیں۔ ''ک، ف، ر'' یعنی کفر و الحاد یا خدا سے بیزاری یا انحراف موجودہ مغربی تہذیب کا ایسا عام چھاپ ہے، جسے ہر جاہل و عالم بشرطیکہ ایمان کی کوئی کرن اپنے اندر رکھتا ہو، جانتا اور پہچانتا ہو، خالق کی مرضی کے

Marfat.com

مطابق اس کے بندوں کے آگے زندگی کا جو نظام خدا کے پیغمبروں نے پیش کیا ہے اس نظام زندگی سے پژمردگی اور افسردگی پیدا کرنے میں آج یورپ جن چابکدستیوں سے کام لے رہا ہے، ان کو دیکھتے ہوئے نبوت کی وہ پیشین گوئی سمجھ میں آتی ہے کہ مومن دجال کے پاس جائے گا، لیکن جب واپس لوٹے گا تو طرح طرح کے شکوک وشبہات کی چنگاریاں اپنے اندر بھڑکتی ہوئی پائے گا۔ یہ بھی دیکھا جارہا ہے کہ مردوں سے متجاوز ہوکر عورتوں کو بھی فتنہ کی یہ آگ گھیرتی چلی جا رہی ہے۔ اُس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اسپریچولیزم کے شیطانی تجربات کے دعوے پیش کر کے اس معیار ہی کو یورپ والوں نے چاہا ہے کہ مشتبہ کردیں، جس پر مذاہب و دیانات کے سلسلہ میں حق و باطل کو جانچا جاسکتا تھا۔ اگر واقعی یہ مان لیا جائے کہ جن مخفی روحوں سے مکالمہ کا ادعا اس طبقہ کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے یہ شیاطین نہیں بلکہ گزشتہ مرے ہوئے لوگوں کی واقعی روحیں ہیں تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ مرنے کے بعد والی زندگی کی بھلائی اور برائی، خیر وشر کا تعلق ان امور سے نہیں ہے جن کے ساتھ خیر وشر کے نتائج کو مذاہب وابستہ قرار دیتے ہیں، اور یہ بھی صحیح ہے کہ گو صاف صاف واضح لفظوں میں خدائی کا دعویٰ یورپ کی طرف سے ابھی دنیا کے سامنے نہیں رکھا گیا ہے۔ لیکن جس فطری رفتار کا لوگوں کو اس زمانے میں عادی بنا دیا گیا ہے، اس رفتار کا آخری نتیجہ یہی ہے اور یہی ہوسکتا ہے کہ بجائے خدا کے سب سے آخری اقتداری قوت کائنات کی بنی نوع انسانی ہی کو تسلیم کرلیا جائے، مسئلہ ارتقاء جو مغربی طریقۂ فکر کی تنہا مخصوص راہ ہے۔ وہی اسی نتیجہ تک سوچنے والوں کو پہنچا دیتا ہے، بلکہ انسانوں میں بھی چوں کہ آج ہر قسم کی طاقتوں اور قوتوں کا مرکز یورپ و امریکہ ہی بنا ہوا ہے، اس لیے ''خدا'' کے لفظ کا اطلاق خواہ مغربی تہذیب وتمدن کے نمائندوں پر نہ کیا جائے، لیکن خدا اگر اسی طاقت کا نام ہے جس کے اوپر کوئی طاقت نہیں ہے، تو آج ان دلوں کو چیر کر دیکھئے جو مغربی تمدن کے زیر اثر ہیں، یہی عقیدہ اور احساس باہر نکل آئے گا کہ یورپ و امریکہ والوں سے بڑا کوئی نہیں ہے، ان ہی پر سارے کمالات کی انتہا ہوتی ہے، جو کچھ اس تہذیب وتمدن کے متعلق لکھا پڑھا جاتا ہے اور جس قسم کی گفتگو یورپ کی اس نشاۃ جدیدہ کے متعلق عوام وخواص کی مجلسوں میں کی جاتی ہے۔ رسالوں، اخباروں، سینماؤں اور تھیٹروں میں جو کچھ بنایا اور دکھایا جاتا ہے شعوری وغیر شعوری طور پر یہی اثر ان سے دماغوں اور دلوں میں جاگزیں ہوتا چلا جارہا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ یہ سب کچھ ہورہا ہے۔

مگر بایں ہمہ جیسا کہ میں نے عرض کیا کھلے اور صاف لفظوں میں خدائی کا دعویٰ بھی ابھی نہیں کیا گیا ہے اور قوانین قدرت پر بھی ان کا اقتدار بلندی کے اس نقطہ تک ابھی نہیں پہنچا ہے، جس پر حدیثوں میں بیان کیا گیا ہے [کہ] ''المسیح الدجال'' کی نادرہ نمائیاں پہنچ جائیں گی، اس کی کوشش جیسا کہ سنا جاتا ہے ان ممالک میں ہورہی ہے کہ مردوں کو زندہ کرنے کا راز بھی دریافت کرلیا جائے۔ ایسی خبریں بھی کبھی کبھی آجاتی ہیں کہ بعض حیوانوں بلکہ شاید انسانوں کے متعلق احیاء موتی (مردوں کو زندہ کرنے) کا عمل کامیاب ہوچکا ہے۔ یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ بادلوں پر بھی قریب ہے کہ قابو پالیا جائے مگر انصاف کی بات یہی ہے کہ صحیح کامیابی جیسی کہ چاہیے اس راہ میں مغرب کی جدید تہذیب اور ارتقائی وصنعتی کوششوں کو ابھی نہیں ہوئی ہے اور اس کے سوا بھی ایسے مختلف وجوہ واسباب ہیں جن کو پیش نظر رکھتے ہوئے چاہیے کہ نبوت کی پیشین گوئیوں میں جس ''المسیح الدجال'' کا ذکر جن خصوصیتوں کے ساتھ کیا گیا ہے، اس کے خروج و

Marfat.com

ظہور کا دعویٰ ابھی قبل از وقت ہے۔

ہاں! اتنی بات صحیح ہے کہ مغرب کا جدید تمدن بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ''المسیح الدجال'' کے خروج کی زمین تیار کر رہا ہے، کیونکہ اپنی اقتداری قوتوں سے وہی کام یورپ کی اس نشاۃ جدیدہ میں بھی لیا جا رہا ہے، جس میں ''المسیح الدجال'' اپنی اقتداری قوتوں کو استعمال کرے گا، خدا بےزاری یا خدا کے انکار کو ہر دلعزیز بنانے کی راہ یورپ صاف کر رہا ہے یا کر چکا ہے، لیکن بجائے خدا کے خود اپنی خدائی کے اعلان کی جرأت اس میں ابھی پیدا نہیں ہوئی ہے، ''المسیح الدجال'' اسی قصے کی تکمیل کر دے گا۔

خروج دجال کا دعویٰ تو ابھی قبل از وقت ہے مگر دجالی فتنہ کی ابتداء ہو چکی ہے:

کچھ بھی ہو، صحیح اور صاف جچی تلی ہوئی بات جس میں خواہ مخواہ نبوت کے الفاظ میں کھینچ تان اور رکیک تاویلوں کی ضرورت نہیں ہوتی، یہی ہے کہ ''المسیح الدجال'' کے خروج کا دعویٰ تو قبل از وقت ہے، مگر ''المسیح الدجال'' جس فتنے میں دنیا کو مبتلا کرے گا، اس فتنہ کا ظہور کسی نہ کسی رنگ میں مان لینا چاہیے کہ ہو چکا ہے۔ دوسرے لفظوں میں چاہیے تو کہہ سکتے ہیں کہ دجال آیا ہو یا نہ آیا ہو ''دجالیت'' کی آگ یقیناً بھڑک چکی ہے۔ آخر حدیثوں ہی میں یہ بھی تو آیا ہے کہ ''المسیح الدجال'' سے پہلے ''دجاجلہ'' کا ظہور ہوگا۔ بعض روایتوں میں ان کی تعداد تیس اور بعض میں ستر چھہتر تک بتائی گئی ہے۔ ''دجال'' سے پہلے ان ''دجاجلہ'' کی طرف ''دجالیت'' کا انتساب بلا وجہ نہیں کیا گیا ہے۔ بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ''المسیح الدجال'' جس فتنے کو بیدار کرے گا، کچھ اسی قسم کے فتنوں میں اس سے پہلے پیدا ہونے والے ''دجاجلہ'' دنیا کو مبتلا کریں گے۔

سورۂ کہف ہر دجالی فتنہ کے لیے تریاق ہے

اسی بنیاد پر میرا خیال ہے کہ ''المسیح الدجال'' کے زہر کا علاج جیسے بتایا گیا ہے کہ سورۂ کہف کی آیتوں میں پوشیدہ ہے اسی طرح اگر چاہا جائے تو ہر ''دجالی فتنے'' کے زہر کا ازالہ بھی اس سورہ کی آیتوں اور جن معارف و مضامین پر یہ آیتیں مشتمل ہیں، ان میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

موجودہ دجالی فتنہ اور سورۂ کہف

چونکہ موجودہ مغربی تہذیب و تمدن جس کے زیر اثر دنیا کی اکثریت آ چکی ہے اور آتی چلی جا رہی ہے دجالی جراثیم کا جیسا کہ دنیا دیکھ رہی ہے سرچشمہ بنی ہوئی ہے۔ تقریباً وہی فتنے جن کے ظہور کی خبر ''المسیح الدجال'' کے عہد میں دی گئی ہے، یورپ کی اس تہذیب و تمدن سے اہل رہے ہیں۔

اسی حقیقت کو پیش نظر رکھ کر فقیر نے سورۂ کہف کے مضامین اور مشتملات میں جب غور کیا تو بعض حیرت انگیز نتائج سامنے آئے۔ شاید دوسروں کو بھی اس سے کچھ فائدہ ہو ان کو قلم بند کر لیا گیا۔ آج ان ہی کی اشاعت کی سعادت حاصل کی جاتی ہے۔ واللہ ولی الامر والتوفیق۔

دجالی فتنہ، جسے چاہیں تو آپ ''ہماری'' تہذیب وتمدن بھی کہہ سکتے ہیں، اس فتنے کے نمایاں خط وخال، آثار ولوازم آپ کے سامنے پیش ہو چکے، اگر ان نشانیوں اور علامتوں سے آپ اس فتنے کو پہچاننے میں کسی حد تک کامیاب ہو چکے ہیں تو اس کے بعد میں خیال کرتا ہوں کہ سورۂ کہف کے ان اشاروں سے ان شاء اللہ مستفید ہونے کی صلاحیت آپ میں پیدا ہو چکی ہوگی جو آپ کے سامنے رکھے جاتے ہیں۔

﴿۱﴾

سورۂ کہف کے مضامین کی اجمالی فہرست

سورۂ کہف کے مشتملات اور مضامین کی اجمالی فہرست کا پہلے جائزہ لے لیا جائے تو مناسب ہے۔

۱۔ ابتدائی رکوع اور خاتمہ کی رکوع میں چند کلیاتی اشارے پائے جاتے ہیں، جیسا کہ ان شاء اللہ معلوم ہوگا، دجالی فتنے سے ان اشاروں کا کافی گہرا تعلق ہے۔

۲۔ ان کلیاتی اشاروں کے سوا چند قصص اور حکایتیں ہیں، یعنی (۱) اصحاب کہف کا قصہ، (۲) لدنی (خدا کے حضور سے) علم ورحمت پانے والی ایک شخصیت سے موسیٰ کی ملاقات، (۳) ذوالقرنین کا قصہ (اسی قصہ کے ضمن میں یاجوج وماجوج کا ذکر بھی پایا جاتا ہے) (۴) دو آدمیوں کی مثالی سرگذشت اور مکالمہ جن میں ایک کے قبضے میں قدرتی پیداواروں کے حصول کے بڑے اہم ذرائع ورسائل تھے اور دوسرے کا دامن ان ذرائع ورسائل سے خالی تھا۔ (۵) دنیا کی موجودہ پست زندگی کی ایک تمثیل (۶) آدم اور شیطان کے قصے کا اعادہ بعض جدید اضافوں کے ساتھ۔

ان قصص کی نوعیت اور مقصدِ بیان

ان تمثیلی قصص وحکایات کو بیان کرتے ہوئے، بعضوں کے شروع میں تو صراحۃً یہ کہہ دیا گیا ہے کہ اس کا

Marfat.com

ذکر بطور مثال اور نمونہ کے لوگوں کے سامنے کیجئے۔ مثلاً فرمایا گیا ہے:۔ واضرب لهم مثلا رجلين (اور بیان کر بطور مثال کے دو آدمیوں کا حال) یا دنیا کی اس پست زندگی کی مثال کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا:۔ واضرب لهم مثل الحيوٰة الدنيا (اور بیان کر ان کے لیے اس پست زندگی کی مثال) اور بعضوں میں اس کی تصریح تو نہیں کی گئی ہے، مگر ساق و سیاق، اور قرآن کے شیوۂ بیان کے جو مذاق شناس ہیں، وہ جانتے ہیں کہ محض کسی گذرے ہوئے واقعہ کا دہرانا، یعنی افسانہ گوئی کا انتساب قرآن کی طرف خود اپنی عقل وتمیز کا مضحکہ ہے، اس لیے قرآنی قصص و حکایات کی تاریخی جستجو کم از کم میرے نزدیک ایک غیر ضروری مشغلہ ہے۔

قرآن کا عام دستور

قرآن کا عام دستور ہے کہ بڑے بڑے تاریخی واقعات سے صرف ان ہی اجزاء کا وہ انتخاب کر لیتا ہے جن سے کسی خاص مقصد کے ذہن نشین کرانے اور سلجھانے میں مدد ملتی ہو۔ نہ صرف گذرے ہوئے واقعات و حوادث بلکہ جس زمانے میں قرآن نازل ہو رہا تھا اور ایک عالمگیر تاریخی انقلاب کے متعلقہ حوادثِ مسلسل یکے بعد دیگرے پیش آتے چلے آرہے تھے۔ ان کے ذکر کی بھی ضرورت کہیں اگر پیش آ گئی ہے تو اس وقت بھی حسب دستور ذکر کے لیے ان ہی اجزاء کو اس نے چن لیا ہے جن سے اس خاص مقام میں کسی قسم کا تفہیمی کام وہ لینا چاہتا ہے۔ بدر و احد، فتح مکہ جیسے اہم فیصلہ کن معرکوں کا تذکرہ آپ کو قرآن میں اگر ملے گا بھی تو اسی نوعیت کے ساتھ جو میں نے عرض کیا۔ ورنہ بعض اہم واقعات مثلاً شعب ابی طالب میں نظر بندی، ہجرت حبشہ، فتح خیبر اور از یں قبیل بیسیوں چیزیں اسی سلسلے کی ایسی ہیں کہ اُن کے ذکر سے ہم قرآن کو خالی پاتے ہیں، یا ذکر ملتا بھی ہے تو اتنا مجمل کہ جب تک واقعہ کی تفصیلات کا علم نہ ہو، ان اجمالی اشاروں سے واقعہ کا علم نہیں ہو سکتا، اور اس کی وجہ وہی ہے کہ قرآن نہ قصے کہانی کی کوئی کتاب ہے اور نہ وہ کوئی تاریخی یادداشت یا ریکارڈ ہے، اس کا ایک متعین موضوع ہے، اسی لیے اس کے سارے مباحث اسی ایک موضوع کے گرد گردش کرتے ہیں، اسی موضوع خاص کے لیے جہاں جہاں مناسب تھا بعض گذرے ہوئے واقعات کا بھی اس نے ذکر کیا ہے مگر اسی التزام کے ساتھ، یعنی صرف اسی حد تک اپنے بیان کو محدود رکھتا ہے جس کی اس خاص مقام میں ضرورت ہوتی ہے، اسی لیے آپ پائیں گے کہ ایک ہی قصہ کا اعادہ مختلف مقامات میں مختلف طریقوں سے قرآن میں جو کیا گیا ہے تو کہیں نسبتاً تفصیل و بسط کا رنگ پایا جاتا ہے، اور کہیں اسی قصے کے کسی خاص جز کا ذکر کرتے ہوئے آگے نکل جاتا ہے۔

قرآن کے اس اسلوب کی ایک مثال

مجھے تو اپنے تجربہ کی بنیاد پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ''ہڈی'' جیسے ایک ہی ہوتی ہے، مگر جسدی نظام میں وہی ''ہڈی'' کسی جگہ کافی طویل و عریض نظر آتی ہے، اور دوسری جگہ بھی ہڈی ہی ہوتی ہے مگر ایک انچ ڈیڑھ انچ سے زیادہ

Marfat.com

بڑی نہیں ہوتی۔ کچھ یہی طریقہ قرآنی قصص کے استعمال میں اختیار کیا گیا ہے [یا یوں سمجھیے کہ] ایک ہی لکڑی ہوتی ہے، بڑھئی مختلف پیمانوں پر اسی ایک لکڑی سے ٹکڑے بنا بنا کر اپنی اپنی جگہ پر ان چھوٹے بڑے ٹکڑوں کو فٹ کرتا چلا جاتا ہے۔قرآنی قصص کے متعلق، قرآن پڑھنے والے اس خاص نقطۂ نظر کو اگر سامنے رکھیں گے تو ان پر قرآن کا ایک عجیب و غریب اعجازی نظام واضح ہو گا۔

بہر حال مجھے کہنا یہ ہے کہ سورۂ کہف کی ان قصص و حکایات کی تاریخی تحقیق یعنی کہاں کب یہ واقعات پیش آئے، تاریخی آثار اور کتابوں سے ان کے متعلق کس قسم کے معلومات فراہم ہو سکتے ہیں یا ہو چکے ہیں۔ یہ بالکل ایک جداگانہ بحث ہے، جیسا کہ میں نے عرض کیا جس غرض سے قرآن اتارا گیا ہے اس کے لحاظ سے بحث و تحقیق کے اس جھگڑے میں پڑنا غیر ضروری ہے، یوں علمی نقطۂ نظر سے جیسے دوسرے تاریخی واقعات کی سراغ رسانی علم کی خدمت ہے، [اسی طرح قرآنی قصص سے متعلق] اس خدمت کو بھی کوئی انجام دے تو علمی حلقوں میں یہ خدمت بھی یقیناً قدر و قیمت کی مستحق ہو گی۔ لیکن جس نتیجے تک پہنچانے کے لیے قرآن کی روشنی عام کی گئی ہے اس کے لیے تو صرف قرآن ہی کافی ہے۔

﴿۲﴾

جو براہ راست عربی زبان میں قرآن سے استفادہ نہیں کر سکتے، ان کے سمجھانے کا مرحلہ دشوار ہے۔ پہلے قرآنی الفاظ نقل کروں، پھر ان کا ترجمہ کروں، مطلب بیان کروں، اس کے بعد بتاؤں کہ دجالی فتنے کی سمیت کے ازالہ میں سورۂ کہف کے اس جز سے مدد لینے کی کیا شکل ہے، دماغ میں مختلف تجویزیں آئیں مگر دل کسی پر جما نہیں۔ حق تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کر کے میں کچھ کہنا شروع کرتا ہوں، آپ پڑھتے جائیے، دیکھیے اسی راہ سے فائدے کی صورت خدا چاہے گا تو نکل آئے گی۔

موجودہ دجالی فتنہ کا پہلا سبق

سب سے پہلی بنیادی بات دجالی فتنے سے ماؤف فطرتوں کی آپ جانتے ہیں کیا ہے؟ باور کرایا جاتا ہے کہ جس میں کچھ نہ تھا، یقین کرو کہ سب کچھ اسی سے ملا ہے، سب کچھ تا اینکہ زندگی بھی اسی سے ملی ہے جس میں زندگی نہ تھی، علم اسی سے ملا ہے جس میں علم نہ تھا، الغرض جس میں بینائی نہ تھی اس سے بینائی، جس میں شنوائی نہ تھی اس سے شنوائی، جس میں ارادہ نہ تھا اس سے ارادہ، جس میں اختیار نہ تھا اقتدار نہ تھا، اسی سے اختیار و اقتدار سب کچھ......یہی بنیادی احساس ہے جسے ہر اس دل و دماغ میں آپ آج پائیں گے، جس پر دجالی فتنے کی عفریتی پرچھائیاں پڑ چکی ہیں۔ ان کے تاریک سائے میں آنے کے ساتھ ہی، پانے والے کچھ اسی قسم کا احساس اپنے اندر پاتے ہیں۔

Marfat.com

نظریہ ارتقاء

صرف ایک لفظ ''ارتقاء'' جادو کا کوئی چمچہ ہے جس میں بھر بھر کر وہ سب کچھ پلا دیا جاتا ہے جسے انسان کی فطرت کسی طرح پینے پر آمادہ نہیں ہو سکتی تھی، ہستی ہی سے ہستی کی پیدائش کا سلسلہ جس کے سامنے جاری ہو'' کچھ نہیں'' سے '' کچھ'' بھی پیدا ہو سکتا ہے، جو اس کے تصور سے بھی عاجز ہے، اسی غریب انسان کو ہضم کرا دیا جاتا ہے کہ کمالات و صفات کا یہ بحر بے کراں جو کائنات کے نباتی، حیوانی، انسانی طبقات میں ٹھاٹھیں مار رہا ہے، ابتداءً یہ سب کچھ نیست و نابود تھا، پھر وہی کمالات وصفات جو ''نیست و نابود'' تھے، ارتقائی عمل کی راہ سے ہست و بود کے قالب میں جلوہ گر ہوتے چلے گئے اور چلے جا رہے ہیں۔ گویا جو نہ تھے وہ ہو گئے اور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ یہی منوایا بھی جاتا ہے اور ماننے والے اسی کو مان بھی رہے ہیں۔ جس خیال کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے اسی کے نگلوا دینے میں کامیابی کیسے ہو گئی؟ خصوصاً اس دعوے کے ساتھ کہ عقل و مشاہدے کے سواء دلیل و حجت کی حیثیت سے کوئی تیسری چیز پیش نہیں ہو سکتی، اسی عقل و مشاہدے کے برخلاف یہ کیسے مان لیا گیا کہ جس مادّے میں کچھ نہ تھا اسی سے سب کچھ نکل آیا۔ حالانکہ نہ باور کرنے والوں کے سامنے کی یہ بات ہے اور نہ باور کرانے والوں کے سامنے کی۔ دنیا جب پیدا ہو رہی تھی اُس وقت نہ یہ موجود تھے نہ وہ، مگر جو دعویٰ کرتے ہیں کہ جانے بغیر ہم کسی چیز کو مان نہیں سکتے، وہی ایک ایسے بنیادی مسئلہ میں جانے بغیر ماننے پر خود بھی تیار ہو گئے اور دوسروں کو بھی تیار کرنے کی کوششوں میں منہمک ہیں۔

بہر حال جس میں کچھ نہ تھا اسی سے یہ سب کچھ کیسے نکل آیا، صفر سے عدد کیسے پیدا ہوا۔ نابود نے بود کا، نیستی نے ہستی کا لباس کیسے اختیار کر لیا؟ ان قصوں کو تو جانے دیجئے، زیادہ تفصیل مطلوب ہو تو میری کتاب ''الدین القیم'' کا مطالعہ کیجئے۔ یہاں میں ایک دوسرے نفسیاتی مسئلے کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔[5]

عہد حاضر کے انسان کی نفسیاتی بے چینی اور سورۂ کہف کا پہلا جز

''جس میں کچھ نہ تھا اسی سے سب کچھ نکل آیا'' جس کی فکری تعمیر اس بنیاد پر قائم ہو گی مادّے کی کیچڑ سے اُبل کر باہر آنے والے[6] اِس شخص کے احساسات کیا ہوں گے؟ کائنات کے اس بحرِ مواج کی ہر موج میں صد کام نہنگ کے چھپے ہوئے حلقوں کو توڑتے پھوڑتے ہوئے [وہ] سمجھتا ہے کہ موجودہ زندگی کے پانے میں وہ کامیاب ہوا ہے۔ کس زندگی کے پانے میں؟ جو خود مستقل ''قید غم'' ہے اور ''غم کی اس قید'' پر بھی مسلسل حوادث و آفات کے ہتھوڑے پڑتے چلے جاتے ہیں، تاآنکہ بالآخر غم ہی کی شکل میں جو زندگی ملی تھی، جب تک ساتھ رہی سوزش بن کر ساتھ رہی، جس دن سوزش اس کی ختم ہوئی زندگی بھی ختم ہو گئی۔ الغرض ایک بے سہارے تنکے کی طرح ہستی کے سمندر میں '' کچھ نہیں سے نکل کر'' سب کچھ بن جانے والا یہ انسان تیرتا رہتا ہے۔ جس کا کوئی محافظ کوئی نگراں نہیں، جس کی سعی کا کوئی حاصل اور جس کے وجود یا زندگی کا کوئی انجام نہیں۔

Marfat.com

''دجالیت'' کے اس عہد میں ساری بے قراریاں، جن میں آدمی کا دل تہہ و بالا ہوتا رہتا ہے، سچ پوچھیے تو ان کی ضمانت درحقیقت بے کسی کے اسی احساس میں پوشیدہ ہے، جو زندگی کی اس ارتقائی توجیہ کا لازمی نتیجہ ہے۔

اب ایک طرف دجالی ذہنیت کے اس قدرتی نتیجے اور لازمی احساس کو رکھیے اور سورۂ کہف کی پہلی سطر کے پہلے جز ''الحمدللہ'' پر ٹھہر جائیے۔ میں آپ سے بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ آگے پڑھیے یا نہ پڑھیے، صرف ''الحمدللہ'' سے علم کی جو روشنی پیدا ہوتی ہے، وہ تاریکی کے ان مہیب بادلوں کو چھانٹنے کے لیے کافی ہے۔

الحمدللہ کا مطلب

سمجھا آپ نے ''الحمدللہ'' کا کیا مطلب؟ کھولا گیا ہے [یعنی ''الحمدللہ'' فرما کر انکشاف کیا گیا ہے] کہ ہر وہ کمال یا صفت جو تعریف و توصیف کی مستحق نظر آتی ہے یہ ''اللہ'' یعنی اس ذات کے ساتھ مختص ہے جس کی کارفرمائیوں کی یہ کائنات جلوہ گاہ ہے، جس کا حاصل یہی تو ہوا کہ جس میں کچھ نہ تھا اس سے نہیں! بلکہ جس میں سب کچھ ہے اسی سے ملا ہے جس کسی کو جو کچھ بھی ملا ہے! جس کا سب کچھ ہے اور جس میں سب کچھ ہے، حیات ہے، علم ہے، قدرت ہے، ارادہ ہے، رحم ہے، رافت ہے، جو اس سے پیدا ہوا ہے، خیال تو کیجیے کہ ان مایوسیوں اور وسواسی محرومیوں سے اس کو کیا واسطہ؟

نزول کے بعد ارتقاء

جس کے پاس سب کچھ ہے وہ اگر دستگیری کے لیے ان کی طرف ہاتھ بڑھائے جن کے پاس کچھ نہیں ہے اور یوں وہ بے یاروں کی یاری، غمخواروں کی غمخواری، ناداروں کی دارائی کرے اور ان کی خالی جھولیوں کو پھر سے بھر دے، بھرتا چلا جائے تو سوال یہ ہے کہ (پستی سے نکال کر بلندی کی طرف چڑھانے کے لیے) کچھ نہ رکھنے والوں کی طرف سب کچھ رکھنے والی ہستی کی اپنے مقام رفیع سے یہ نزولی توجہ کیا کسی حیثیت سے کوئی ایسی بات ہو سکتی ہے جس کے تسلیم کرنے میں انسانی فطرت اپنے اندر کسی قسم کی ہچکچاہٹ یا جھنجھلاہٹ محسوس کرے؟

الحمدللہ (یعنی تمام قابل تعریف خوبیوں اور زیبائیوں کے سرچشمہ اور اسی کامل وجود) کو بنیاد بنا کر نزول کے بعد ارتقاء کا یہی وہ قرآنی نظریہ ہے جسے سورۂ کہف کی پہلی سطر میں الحمدللہ کے بعد ان الفاظ میں ہم پاتے ہیں۔ فرمایا گیا ہے:

اَلَّذِیْ اَنْزَلَ الْکِتٰبَ عَلٰی عَبْدِہٖ

جس نے اتاری کتاب اپنے بندے پر۔

ان الفاظ سے یہی علم تو بخشا گیا ہے کہ عبد یا بندہ جس کے پاس اپنا کچھ نہیں ہوتا، اس پر الحمد والے اللہ نے

Marfat.com

(یعنی جس کے پاس سب کچھ ہو) اپنی کتاب اتاری اور یوں جو نیچے تھے ان کو اونچا کرنے کی راہ اس نے کھولی۔

قرآن کے ارتقائی نظریہ کا مقابلہ موجودہ ارتقائی وسوسہ سے

نزول اور اتار کے بعد ارتقاء اور چڑھاؤ کے اس فطری اور طبعی طریقے کا مقابلہ عہد دجالیت کے اس ارتقائی وسوسہ سے کیجئے جس میں ''کچھ نہیں'' سے باور کرایا جاتا ہے کہ ''سب کچھ'' نکل آیا ہے، سمجھایا جاتا ہے کہ مادہ جس میں کچھ نہ تھا، نہ زندگی تھی، نہ علم، نہ ارادہ، وہی ان کمالات وصفات کی تلاش میں اُٹھ کھڑا ہوا، جو اس کے لیے نامعلوم اور مجہول ہی نہیں تھے، بلکہ بذات خود معدوم قطعاً معدوم تھے، جاہل طالب اور مجہول بلکہ مطلق معدوم مطلوب، یہ عجیب و غریب ارتقائی لطیفہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ کتنی پیچ در پیچ الجھنوں میں گتھا ہوا ہے۔ جس میں کچھ نہ تھا اس میں ان مجہول و معدوم کمالات وصفات کی طلب کیسے پیدا ہوئی، اس طلب کے بعد اپنی انتخابی قوت سے کام لے کر ناقص صفات کو چھوڑتے ہوئے، کامل صفات کو چنتے ہوئے وہ آگے آخر کس بل بوتے پر بڑھ رہا ہے، اور اسی بے جان، بے عقل و تمیز طالب کو یہ معدوم مطلق معدوم صفات آخر کیسے مل گئے، کہاں سے مل گئے، جن سے آج مادّے کا وجود آراستہ و پیراستہ نظر آرہا ہے۔

ٹیڑھی راہ اور کجرو طبائع

یہ کتنی ٹیڑھی کبڑی پیچ وخم والی راہ ہے جس پر ''کچھ نہیں سے سب کچھ نکل آنے'' کے فلسفہ یا وسوسہ نے ان کو ڈال دیا۔ جس معمہ کو اس توجیہ سے آج حل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، وہ تفہیم کے اس طریقہ سے، انصاف شرط ہے، سلجھتا ہے، یا اس کی الجھنیں اور زیادہ بڑھ جاتی ہیں؟ اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جن کی فطرت ابھی سلامتی کے نقطۂ نظر سے زیادہ دور نہیں ہوئی ہے۔ ورنہ توڑی اور مروڑی طبیعتوں میں یہی اُلٹی باتیں ''سیدھی'' بن بن کر اُترتی چلی جارہی ہیں [اور اسی بنا پر] وہ سمجھتے ہیں کہ عہد دجالیت کی یہ باتیں سیدھی ہیں......لیکن سرشت بشری کے سب سے بڑے نباض عارف رومی کا فیصلہ تو یہ ہے کہ:

چوں فسونِ دیو در دلہائے کج
می رود چوں کفش کج درپائے کج

[پس] ٹیڑھے پاؤں میں ٹیڑھا جوتا اگرفٹ ہوجائے تو آپ ہی بتایئے اس کے سوا اور ہوتا کیا؟

الکتاب کی پہلی خصوصیت

بہر حال میں تو سمجھتا ہوں کہ سورۂ کہف کے مذکورۂ بالا الفاظ میں الحمدللہ پر بنیاد قائم کر کے نزول کے

بعد ارتقاء کی جو راہ پیش کی گئی ہے اس پر چلانے والی کتاب ''الکتاب'' یا قدرتی دستور العمل اور ہدایت نامے کی پہلی خصوصیت،

''وَلَمْ يَجْعَلْ لَهُ عِوَجاً''

اور نہ رکھی (کتاب کے اتارنے والے اللہ نے) اس میں کسی قسم کی کوئی کجی

جو بیان کی گئی ہے اس کا مطلب جیسا کہ میں سمجھتا ہوں یہی ہے کہ عوج یعنی پیچ وخم، کجی اور ٹیڑھ سے اس کتاب کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ وہ خود سیدھی ہے، سیدھی بات بتاتی ہے، سیدھی راہ پر لے چلتی ہے۔

اس کی اسی خصوصیت نے اس کو موجودہ دماغوں کے لیے ناقابل قبول بنا دیا ہے

فکر ونظر کی مصنوعی ورزشوں اور سوفسطائیت کے مغالطی کرتبوں سے جن کے دل، جن کے دماغ الٹے پلٹے مسلے وسلے نہیں گئے ہیں۔ تجربہ کر کے دیکھ لیجئے۔ ان کے اندر یہ کتاب اتر جائے گی، اُترتی چلی جائے گی، ان کو ایسا معلوم ہوگا کہ وہ اس کتاب کے لیے پیدا کیے گئے ہیں اور یہ کتاب ان کے لیے پیدا کی گئی ہے، مگر دجالی فتنوں کی آنچ سے پگھلائی ہوئی ٹیڑھی ترچھی ذہنیتوں اور ''عصری تقاضوں'' کے مطابق ڈھالے ہوئے کج دماغوں، پھرے ہوئے سروں سے یہ کتاب اُچٹ جاتی ہے، نہ وہ اس کے وزن کو محسوس کر سکتے ہیں اور نہ یہ کتاب اپنے واقعی وزن کو انہیں محسوس کرا سکتی ہے۔

موجودہ دماغوں کی ساخت

ان کے لیے بھینس کے انڈے اور انڈے سے روغن گل، روغنِ گل سے ساری دواؤں کا نکلنا اور نکالنا آسان ہے،[8] جیسا کہ ہم نے عرض کیا تھا، صفر سے عدد کی پیدائش کا تو وہ تصور کر سکتے ہیں، بلکہ اسی کو واقعہ ٹھہرا رہے ہیں، مگر جس تھیلی میں سو (۱۰۰) روپے ہوں اُن کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے دس یا بیس روپے کیسے نکلے؟[9]

کانٹوں کی سیج پر نیند کا منظر

خود جن مسئلوں میں اُلجھنوں کے کانٹوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے، انہیں کانٹوں کی سیج پر انہیں نیند آ گئی ہے اور یقین کیے بیٹھے ہیں کہ زندگی کے سارے اساسی سوالوں کی گرہیں الجھنوں کے ان ہی کانٹوں کی نوک سے کھل چکی ہیں اور آئندہ بھی کھلتی چلی جائیں گی اور یہ سب اسی لیے ہو رہا ہے کہ پاؤں کو ٹیڑھا بنا لینے کے بعد ان کو نظر آ رہا ہے کہ ٹیڑھا جوتا ان کے لیے سیدھا بن گیا ہے۔

Marfat.com

دوسری خصوصیت

مگر ان کی ذہنیت وفکر کی یہ مصنوعی کجی، جو ہر ٹیڑھی بات کو آج سیدھی پا رہی ہے اور سیدھی باتیں ان کو ٹیڑھی نظر آ رہی ہیں، یہ ایک مرض ہے جو باہر سے ان کے اندر آیا ہے، شاید اسی کو بتانے کے لیے اور اسی خارجی سمیّت کو نکالنے کے لیے دوسری خصوصیت اس ''الکتاب'' اور زندگی کے قدرتی دستور العمل کی ایک اور صرف ایک لفظ ''قَیِّماً'' سے ظاہر کی گئی ہے، دیکھنے میں ہے تو بظاہر یہ ایک لفظ جس کا حاصل یا ترجمہ جیسا کہ فقیر کا خیال ہے اور مفسرین کی کافی تعداد اس خیال سے موئد ہے، یہ ہے کہ لازوال، غیر فانی، اَمِٹ اٹل حقائق اور اصول پر یہ کتاب مشتمل ہے، قیام وبقاء کی شدت اور حد سے زیادہ استحکام واستواری پر ''قیم'' کا یہ لفظ دلالت کرتا ہے جس کے سوا کچھ نہ رہے گا، جو ایسا برقرار باقی رہنے والا ہے، اور ہر چیز جو کچھ بھی اس کے سوا ہے سب کے قیام وبقاء کی ضمانت جس کی قدوس وپاک ذات کے ساتھ وابستہ ہے، اس کو ''القیوم'' بھی اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ خود قائم وبرقرار، ٹھہرا ہوا ہے، اور سب کو وہی، اس کا ارادہ قائم وبرقرار رکھے ہوئے، ٹھہرائے ہوئے اور تھامے ہوئے ہے، خیر یہ تو ''قیم'' کے اس قرآنی لفظ کی گویا لفظی تحقیق تھی، اب غور کیجئے اس لفظ کی معنویت کے اس پہلو پر جس کی وجہ سے اس خاص مقام پر وہ داخل اور شریک کیا گیا ہے۔

لفظ ''قیم'' کی معنویت

جیسا کہ میں نے عرض کیا، طبائع میں کجی اور ٹیڑھاپن پیدا کرنے کے بعد ٹیڑھی باتوں کے اُتار دینے میں کامیاب ہو جانا، اس میں شک نہیں کہ تجربہ کی اور سامنے کی بات ہے۔ کامیابی حاصل کرنے والے آج اسی راہ سے کامیابی حاصل کر رہے ہیں، مگر اسی کے ساتھ دوسری بات بھی جس کی طرف میرے خیال میں ''قیم'' کے لفظ سے اشارہ کیا گیا ہے، یہ بھی تو دور کی نہیں بلکہ قریب کی ایسی بات ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، آخر ہم ہوں یا آپ کیا یہ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ وہ سارے اعوجاجی خرافات اور دجّالی نظریات جن کا چرچا دنیا میں آج پھیلا ہوا ہے، تعمیر کے ساتھ ہی خرابی کی صورتیں بھی کتنی سرعت کے ساتھ اس میں مضمر ہوتی چلی جاتی ہیں۔ مشرق میں کسی پرانے ازکار رفتہ مسئلہ کو دقیانوس کی طرف منسوب کر کے کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہ تو دقیانوسی خیال ہے، دقیانوس بے چارا خدا ہی جانتا ہے کہ کتنے ہزار سال پہلے دنیا کا بادشاہ ہوا تھا، مگر آج عصری نظریات کی دقیانوسیت کے لیے کون نہیں جانتا کہ غریب ملکہ وکٹوریہ کے عہد کی طرف منسوب کر کے کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ تو ''وکٹورین ایج'' یعنی عہد وکٹوریہ کی بات ہے، حالانکہ ولادت کے نہ سہی، مگر اس ملکہ کی موت کے زمانے کے پانے والوں کی تعداد کروڑ ہا کروڑ کی تعداد میں ابھی زندہ ہے۔ ''قیم'' کے برعکس بے ثباتی کی اس خصوصیت کے لیے اس سے زیادہ اعترافی شہادت اور کیا ہوسکتی ہے۔ ع ''مردہ زایند از بطون الامہات'' یہی دجّالی عہد کے نظریات کا سب سے بڑا طغرائے امتیاز ہے، کلیات تو کلیات جن کی بنیاد صرف تخمینی ٹٹول۔ یا ان تیروں پر عموماً قائم ہے، جنہیں چلانے والے اندھیرے میں چلاتے رہتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ ایسے دیکھے بھالے جزئیات، مثلاً آدمی کے لباس کا مسئلہ کہ سوچ سمجھ کر آرام وآسائش زیب وزیبائش کے عام پہلوؤں کا لحاظ کر کے

Marfat.com

اس کی وضع وقطع متعین کی جاتی ہے، مگر سنتے ہیں کہ بسا اوقات بازار سے گون یا ٹوپی، یا اسی قسم کی کوئی چیز خریدنے والوں کو دیکھا گیا ہے کہ گھر کی طرف بھاگے یا بھاگی چلے یا چلی جارہی ہے، تا کہ جہاں تک جلد ممکن ہو اس کو استعمال کر لیں، ورنہ گھر پہنچتے تک ممکن ہے کہ اس خاص لباس کا فیشن اور چلن نہ رہے۔

دُھوپ چھاؤں کا فلسفہ

جن سیمابی بے قراریوں پر ''تمدن جدید'' اور ''دانش نو'' کی بنیاد قائم ہے اس کی یہ کتنی دلچسپ مثال ہے۔ ممکن ہے کہ یہ لطیفہ ہو، مگر زود فریبی اور زود لاغری کی اس خصوصیت کے اظہار کی یہ بہت اچھی تمثیل ہے، بعض کارٹونی تصویروں میں اسی لطیفہ کو مصوّر کر کے دکھایا گیا ہے۔ میں نے اس کو دیکھ کر کہا کہ عہدِ دجّالیت کے صرف لباسی جزئیات ہی کا یہ حال نہیں ہے، بلکہ دجّالیت کا سارا فلسفہ، سارا تمدن، دُھوپ چھاؤں کا فلسفہ اور دُھوپ چھاؤں کا تمدن ہے۔ اس کے نیچے پناہ ڈھونڈنے والوں کو نہ دھوپ ہی سے استفادہ کا موقع میسر آ سکتا ہے، اگر وہ دھوپ کھانا چاہتے ہوں اور نہ چھاؤں کے سایہ میں آرام ہی کی امید لگانی چاہیے، اگر اس سایہ کے نیچے کوئی آرام لینا چاہتا ہے۔

ارتقاء کا مطلب

''قیم'' کے مقابلہ میں ''غیر قیم'' ہونا، اس فلسفہ یا تمدن کی یہی خصوصیت اس پیچ و خم یا ٹیڑھ اور کجی کے راز کی غمازی کر رہی ہے جو ''دجّالی'' یا ''ارتقائی تمدن'' کی ہر شاخ اور ہر شعبہ کی رگوں اور ریشوں میں رواں دواں ہے۔ ''ارتقاء'' نام ہی اس کا ہے کہ ہر آنے والے دن میں گذرے ہوئے کل کی مسلمہ مانی ہوئی بات غلط ثابت ہو جائے۔ کل تک جمہوریت کا نظام انسانیت کے ارتقاء کا آخری نقطۂ عروج تھا، لیکن آج سرمایہ داری کے رسوا کن طوق کو گلے میں ٹانگے ہوئے، گلی کوچوں کے بچوں کی تالیوں کا وہ نشانہ بنا ہوا ہے اور اب انسانیت کا ''فردوس گم گشتہ'' باور کرایا جا رہا ہے کہ اشتراکی نظام میں مل جائے گا۔

خیر میں کیا کہنے لگا، عرض کر رہا تھا کہ ''قیم'' کا یہ لفظ جس سے بندے پر نازل ہونے والی ''الکتاب'' کے مشتملات و تعلیمات کی خصوصیت ظاہر کی گئی ہے، [اس کی رو سے یہ کتاب] لازوال، غیر فانی حقائق کا وہ مجموعہ ہے، تاریخ کے نامعلوم عہد سے جس پر انسانیت کی تعمیر و ترقی کی بنیاد قائم کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ نوحؑ نے بھی ان ہی کی طرف بلایا اور ابراہیمؑ نے بھی، موسیٰؑ نے بھی اور عیسیٰؑ نے بھی، سارے ''النبیون'' اور اللہ کے رسولوں نے ہر عہد اور ہر زمانہ میں، ہر بستی کے رہنے والوں کو ان ہی کی طرف پکارا، جس کے پاس کچھ نہیں ہے، مگر سب کچھ کے پانے اور

Marfat.com

حاصل کرنے کی فطری آرزو اپنے اندر وہ رکھتا ہے، چاہیے کہ وہ آگے بڑھے اور جس کے پاس سب کچھ ہے اسی سے جو کچھ پانا چاہتا ہے پاتا چلا جائے، پہلوں کو جو ''الکتاب'' دی گئی اس میں بھی یہی تھا اور اسی ''الکتاب'' کی آخری شکل میں بھی اسی کا صلائے عام دیا گیا ہے۔

الکتاب کی مذکورہ خصوصیات اور موجودہ دجّالی ادبیات

بہر حال ''لَمْ یجعل لہٗ عوِجاً'' (نہ رکھی اس میں کسی قسم کی کجی) کی سلبی یا منفی خصوصیت اور اس کے ساتھ ''قیّماً'' (لازوال، غیرفانی، امٹ اور اٹل) ہونے کی ایجابی ومثبت خصوصیت، قانونِ نزول کے تحت ناقصوں کو ساحلِ کمال تک پہنچانے کے لیے وجوہ کامل یا الحمد والے اللہ کی طرف سے 'الکتاب' یعنی زندگی کا جو دستورِ العمل دیا گیا ہے اسی دستور العمل کی مذکورہ بالا دونوں منفی ومثبت یا سلبی وایجابی ایسی دو خصوصیتیں ہیں کہ ان کی روشنی میں ''دجّالی ادبیات'' کی تاریکیاں خود بخود نمایاں ہو جاتی ہیں۔

دجّالی نقطۂ نظر کے پیچ وخم

آپ جائزہ لیتے چلے جائیے، واضح ہوتا چلا جائے گا کہ ہر سیدھی سادی بات تک عہد دجل میں پیچیدہ ترین راہوں سے پہنچنے اور پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے، دل کا سکون، قلب کی راحت، جو مٹی کے لوٹے میں بھرے ہوئے پانی سے وضو کر لینے اور وضو کے بعد کسی کے قدموں پر سر ڈال دینے سے جس وقت چاہے حاصل ہو سکتی ہے (مگر غم غلط کرنے کے) اسی مقصد کے لیے دیکھئے کروڑ ہا روپے کی سینمائی تصویریں تیار ہو رہی ہیں، اربوں کی لاگت سے ملک کے طول وعرض میں ''تماشا گھروں'' کا جال بچھا دیا گیا ہے، اور ملک نہیں ایک ایک شہر بلکہ اب تو قصبات تک کے باشندوں کی کمائی کا معقول حصہ روزانہ غم غلط کرنے کے اسی قصے میں بھسم ہو رہا ہے۔ اور پھر بھی جو خنکی وضو کے مفت پانی اور بغیر کسی ٹیکس کے لاہوتی دربار کی باریابی سے دلوں کو میسر آ رہی ہے، تجربہ کر کے دیکھ لیجئے کہ خنکی اور ٹھنڈک کی اس کیفیت کو اس سارے جال جنجال سے حاصل کرنے میں آپ قطعاً کامیاب نہیں ہو سکتے۔

امن وامان کے ساتھ زندگی گذارنے کے لیے اخلاقی تصحیح کی ضرورت کا احساس آج بھی کیا جا رہا ہے جیسے پہلے کیا جاتا تھا، لیکن اسی غرض کو حاصل کرنے کے لیے پیچ وخم کی کتنی ٹیڑھی ترچھی راہ اختیار کی گئی ہے، آئندہ دُنیا میں جو نسلیں پیدا ہونے والی ہیں، پیدا ہونے سے پیشتر ان کو [بلکہ] ان کے خیال (صرف خیال) کو دماغوں میں اُبھار اُبھار کر دھمکیاں دی جا رہی ہیں کہ موجودہ نسلوں کی اپنی اخلاقی غلطیوں کا جواب ان ہی آئندہ پیدا ہونے والی نسلوں کو دینا پڑے گا، (اس وقت دینا پڑے گا جب جواب دینے والے دنیا سے ناپید ہو جائیں گے) کبھی تاریخ کے فن کو پیشہ بنانے

Marfat.com

والے یعنی مؤرخین سے ڈرایا جاتا ہے، کہ جب وہ کتابیں لکھیں گے، یا مدرسوں میں سبق پڑھائیں گے تو تمہارا ذکر اچھے لفظوں میں نہیں کریں گے۔ کیسی عجیب بات ہے، امید باندھی جاتی ہے کہ اخلاقی بدکاروں کو ان دھمکیوں کے دباؤ سے دبا لیا جائے گا۔ کامیابی کی یہ راہ ان کو سیدھی راہ نظر آئی اور پیدا ہونے والوں کو اپنے پیدا کرنے والے خالق کے سامنے کھڑا کر کے جواب دہی کی ذمہ داری ان میں جو ابھاری جاتی تھی، یہی راہ ان کو ٹیڑھی دکھائی دے رہی ہے۔ وہم اور صرف وہم سے زیادہ جو اور کچھ نہیں ہو، باور کرایا جارہا ہے کہ وہی واقعہ ہے اور واقعہ ہی کو وہم ٹھہرایا جارہا ہے، بغیر کسی معاوضے کے جس نے وجود بخشا، وجود کے کمالات بخشے، اسی بخشنے والے ارحم الراحمین، "علیٰ کلّ شیئی قدیر" کی رحمتوں اور دستگیریوں پر بھروسہ کرنے والے وہم کے شکار ٹھہرائے گئے، مگر وہم کے ان ہی الزام لگانے والوں کی زبانوں سے جب یہ یا اسی قسم کے فقرات نکلتے ہیں کہ "میں تو فطرتاً رجائی پیدا ہوا ہوں" "پُر امید رہنا اور مستقبل سے مایوس نہ ہونا، یہی ہماری جبلّت ہے"۔ [اور] پوچھا جاتا ہے کہ اس رجاء اور امید کی بنیاد کیا ہے، تو پھر ان کی اعوجاجی ذہنیتوں اور الجھی ہوئی توجیہوں کی گتھیاں اتنی دلچسپ ہوتی ہیں کہ سننے والا مشکل ہی سے اپنی ہنسی کو روک سکتا ہے۔

اور میں کہاں تک گناؤں، مجھے تو دجالی زندگی کے ہر پہلو میں "پیچا پیچ" اور گرہ در گرہ کے سوا اور کچھ نظر ہی نہیں آتا، عدالت ہو یا انصاف، علاج ہو یا معالجہ، تعلیم ہو یا تعلّم یا اسی قبیل کی کوئی اور چیز پہلی نظر میں اس کی سب سے بڑی خصوصیت وہی "عوج" کا گورکھ دھندا سامنے آجاتا ہے۔[1]

فلسفہءِ ارتقاء اور مستقبل کی بے یقینی

اور یہ تو عرض ہی کر چکا ہوں کہ "قانون ارتقاء" کو بنیاد بنا کر زندگی کو جو دستور العمل بھی مرتب کیا جائے گا اس کا مطلب ہی یہ ہوگا کہ آج جو کچھ مان لیا گیا ہے کہ وہی سچ اور صرف سچ ہے، کل تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہی جھوٹ صرف جھوٹ تھا، ورنہ جو کچھ آج مانا جارہا ہے اگر کل بھی وہی مانا گیا تو ارتقاء کا یہ لفظ ہی بے معنی اور بے جان ہو کر رہ جاتا ہے، گویا ارتقائی اصول پر ساحلِ مراد تک پہنچانے کے لیے انسانیت کے آگے نجات کی جو "کشتی" پیش کی جاتی ہے اس کی پیشانی پر یہ لکھا ہوتا ہے کہ ساحل تک پہنچانے کا سوار ہونے والوں کو یقین نہیں دلایا جا سکتا، بلکہ ممکن ہے کہ منجدھار میں پہنچ کر وہی چیز جس کا نام آج نجات کی کشتی ہے (ممکن ہے کہ) کل وہی "گرداب بلا" اور "لطمہ موت" کی شکل اختیار کرلے۔

کامیاب مستقبل کی ضمانت

اور اسی کے مقابلہ میں دوسرا "جہاز" بھی کھڑا ہوا ہے جس میں ضمانت کی جاتی ہے کہ سیدھی راہ سے لے جانے والوں کو لے جائے گا، اور قطعی طور پر ہر ایک کو ڈگمگائے بغیر، ساحل تک پہنچا پا جائے گا۔ اس ضمانت نامے پر تاریخ انسانی کے ہر دور کی برگزیدہ ترین ہستیوں کی تصدیقی مہریں ثبت ہیں۔ نوحؑ کی، ابراہیمؑ کی، موسیٰؑ کی، عیسیٰؑ کی، محمد

Marfat.com

(صلی اللہ علیہ وسلم) الغرض سارے انبیاء اور بنی آدم کے سارے رہ نماؤں کے دستخط روشن حروف میں اس ضمانت نامے پر جگمگا رہے ہیں۔اب آپ کو اختیار ہے کہ ان دونوں سفینوں میں سے اپنی ''نجات'' کے لیے جس کا جی چاہے انتخاب فرما لیجئے۔

سورۂ کہف کی تلاوت اور دجّالی فتنہ سے حفاظت کا ربط

اب سمجھ میں آتا ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ان حدیثوں کا مطلب جن میں فرمایا گیا ہے کہ سورۂ کہف کی ابتدائی آیتوں کے یاد رکھنے والے دجال کے فتنے سے محفوظ رہیں گے۔حالانکہ ابھی آپ کے سامنے کہف کے ابتدائی حصے کی پہلی سطر سے حاصل کیے ہوئے صرف ان ہی نتائج کو پیش کیا گیا ہے جن کے متعلق یہ امید کی جاتی ہے کہ خواص کے ساتھ عوام بھی اگر غور کریں گے تو مستفید ہو سکتے ہیں۔

اسی سطر کے بعض الفاظ سے کچھ اور بھی چیزیں سمجھ میں آ رہی ہیں، خصوصاً عبد کے لفظ کی اضافت بجائے ذاتی یا صفاتی اسم کے ''ہ'' کے ضمیر غائب کی طرف جو کی گئی ہے اپنے خاص مقام کے لحاظ سے یہ مسئلہ بھی خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔مگر اس کی تشریح میں غیر معمولی طوالت بھی ہوگی اور عوام بے چاروں کی رسائی سے اندیشہ ہے کہ کہیں دور نہ ہو جائے۔پس الکہف کی پہلی سطر یا پہلی آیت کے متعلق جو کچھ بھی ادا کر دیا گیا، اسی پر قناعت کر کے آیئے اب آگے بڑھیے۔

دوسری آیت کا آغاز

لِیُنْذِرَ (تا کہ دھمکائے) کے لفظ سے دوسری آیت کا آغاز کیا گیا ہے اور بجائے کنارے اور اشارے کے نسبتاً زیادہ واضح اور صاف لفظوں میں قرآن کا یہ بیان شروع ہوتا ہے۔

تین سوال

جیسا کہ میں نے عرض کیا دھمکی سے اس بیان کی ابتدا کی گئی ہے، قدرتی طور پر تین سوال اس دھمکی کے متعلق پیدا ہو سکتے ہیں، یعنی

۱۔ کس چیز کی دھمکی دجالی فتنے سے تعلق رکھنے والی اس سورہ میں دی گئی ہے؟

۲۔ کیا یہ دھمکی عام ہے یا کسی خاص طبقہ اور خاص قسم کے صفات و احساسات رکھنے والوں کی طرف اس دھمکی کا رُخ ہے؟

۳۔ اگر عام نہیں بلکہ دھمکی کا رُخ کسی خاص طبقہ کی طرف ہے، اور یہی بیان بھی کیا گیا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا

Marfat.com

ہے کہ جن کی طرف دھمکی کا رُخ ہے اُن کے خصوصیات کیا ہیں،......

ان تینوں سوالوں کا جواب بعد کی آیتوں میں دیا گیا ہے، اب میں آپ کے سامنے قرآنی الفاظ کی روشنی میں ان ہی تینوں سوالوں کے جوابوں کو پیش کرتا ہوں۔

(۱)

کس چیز کی دھمکی دی گئی ہے؟ یہی پہلا سوال تھا، دجّالی فتنے کی جن خصوصیتوں کو بیان کر چکا ہوں، ذرا ان کو دماغ میں تازہ کر لیجئے، میں تو سمجھتا ہوں کہ آپ کو بھی حیرت ہو گی کہ تیرہ سو سال پیشتر سرزمینِ عرب کی بیابانی آبادی میں اس پیشین گوئی کا اعلان الہامی امداد کے بغیر کیسے ممکن تھا۔

کلیدی لفظ جس کے سمجھ لینے کے بعد واقعہ خود آپ کے سامنے آ کر کھڑا ہو جائے گا، وہ ''باس'' کا لفظ ہے۔ یوں تو لغت میں مثلاً ''قاموس'' کے فارسی ترجمہ ''منتہی الارب'' میں ''باس'' کے لفظ کو لکھ کر حسب ذیل معانی درج کیے ہیں، یعنی ''بیم و عذاب و سختی و قوت در حرب و دلیری'' مگر سارے معانی جو اس لفظ کے نیچے درج کیے جاتے ہیں، قدر مشترک ان کا اگر نکالا جائے تو یہی ہو سکتا ہے کہ فطرت انسانی میں ناگواری جن حالات و واقعات سے پیدا ہوتی ہے، منجملہ دوسرے الفاظ کے عربی میں اس کی ایک تعبیر ''باس'' بھی ہے، مگر یہ تو ''باس'' کی لغوی تشریح ہے۔ قرآن میں ایک سے زائد مقامات میں اس لفظ کو استعمال کیا گیا ہے، مثلاً عرب کے یہود کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔ ''باسُهم بَيْنَهُمْ شديد'' یا عذابوں کا ذکر کرتے ہوئے کہ کبھی وہ اوپر سے آتے ہیں اور کبھی نیچے سے، اسی طرح عذاب ہی کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ مختلف ٹکڑیوں میں بانٹ کر ''يذيق بعضهم باس بعض'' کا منظر قدرت کی طرف سے قائم کر دیا جاتا ہے، جس کا مطلب یہی ہے کہ ایک کی چوٹ دوسرے کو لگائی جاتی ہے۔ اسی طرح سورۃ البقرہ میں صبر کرنے والوں کی تعریف کرتے ہوئے ''وحين الباس'' بھی فرمایا گیا ہے، الغرض یہ اور اسی قسم کے دوسرے مقامات میں ''باس'' کے لفظ کی جو تفسیر کی گئی ہے، اُس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ حرب و قتال یا جنگ کی وجہ سے جو دُکھ اور تکلیف لڑائی کے ہر فریق کو پہنچتی ہے، قرآن اسی دُکھ اور تکلیف کو ''باس'' کہتا ہے۔ گویا یہ ایک قسم کا قرآنی محاورہ ہے، اس محاورے کو پیش نظر رکھیے، اب سوچئے ان قرآنی الفاظ کو

لينذر باساً شديداً من لدنه

تا کہ دھمکائے باس شدید سے جو لدنی ہے۔

''باس'' کا مفہوم تو متعین ہی ہو چکا، جو جنگ اور جنگ سے پیدا شدہ مصائب اور تکلیفوں کی تعبیر ہے، آگے ''شدید'' کی قید کا اضافہ کیا گیا ہے جس کا مادہ شدت سے ہے، شدت سختی کو کہتے ہیں، معلوم ہوا کہ جنگ اور اس کے لائے ہوئے مصائب جن کی دھمکی دی گئی ہے وہ معمولی نہ ہوں گے، اور بات اسی پر ختم نہیں ہوتی، قرآن

میں شدید کے بعد "من لدنه" کا لفظ ہے۔ "لدنی" اسی کا اردو ترجمہ کیا گیا ہے [جس کا مطلب ہے غیر اسبابی طور پر، براہ راست قدرت کی طرف سے پہنچنے والی چیز۔ یہ اسی طرح کہ علم کی ایک قسم کو "علم لدنی" کہا جاتا ہے] ایک قسم علم کی تو وہ ہوتی ہے جسے تعلیم کے مقررہ طریقوں سے حاصل کیا جاتا ہے، اور دوسری قسم علم ہی کی ایک یہ بھی سمجھی جاتی ہے جو عالم کو اسباب کے توسط کے بغیر براہ راست حق تعالیٰ کے حضور سے عطا کیا جاتا ہے۔ اسی قسم کا نام اردو میں بھی "علم لدنی" مشہور ہو گیا ہے۔ بہ ظاہر یہ محاورہ اسی سورۂ کہف کے دوسرے مقام سے ماخوذ ہے، یعنی موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات جس شخص سے ہوئی تھی، سمجھا جاتا ہے کہ ان کا نام خضر علیہ السلام تھا، ان ہی کی دوسری خصوصیتوں کے ساتھ ایک خصوصیت

اٰتَیْنٰاہ من لَّدُنَّا عَلْماً

دیا تھا میں نے اس کو (یعنی حضرت خضر علیہ السلام کو) اپنے حضور سے علم!

بھی بتائی گئی ہے۔

بہر حال "باس شدید" کے ساتھ "من لدنه" کا اضافہ دھمکی میں جو کیا گیا ہے، بغیر کسی تاویل کے اس کا یہی مطلب سمجھ میں آتا ہے کہ یہ شدید جنگ جس کی دھمکی دی گئی ہے، اسباب و علل سے بالاتر ہوگی اور براہ راست قدرت کی طرف سے ایسے "من لدنی" حالات پیش آئیں گے کہ اسباب کی راہ سے مقابلہ کرنے والوں کے سارے عقلی داؤ پیچ اور فکری تگ و دو، ذہنی اُدھیڑ بُن سب بے کار ہو کر رہ جائے گی، کیونکہ اسباب کی راہ سے تو ان ہی چیزوں کا مقابلہ ممکن ہے جو اسباب ہی کی راہ سے ہو رہی ہوں، لیکن اسباب کا حجاب جب اٹھا دیا جائے، اور من لدنی قانون کے تحت براہ راست جن حالات کو قدرت کا ہاتھ پیدا کرے، اُن کا مقابلہ کس کے بس کی بات ہے۔[11]

(۲)

من لدنّی باس شدید کی دھمکی کا نشانہ

"تا کہ دھمکائے[12] ان لوگوں کو جنہوں نے کہا کہ اللہ نے صاحبزادہ بنا لیا۔"

"نہیں ہے اس کا علم ان کو کچھ بھی نہ اُن کے باپ دادوں کو ہے۔"

"بڑی بات ہے جو ان کے منہ سے نکل رہی ہے۔"

"نہیں بول رہے ہیں وے مگر صرف جھوٹ۔"

تقریباً یہ لفظی ترجمہ ہے قرآن کی [سورۂ کہف کی] ان آیتوں کا، یعنی:

"لِیُنْذِرَ وَالَّذِیْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَداً"

"مَالَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّ لَا لِاٰ بَائِهِمْ"

"كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ"

"اِنْ يَقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا"

اوراب آپ کے سامنے سورۂ کہف کے ان ہی چار فقروں پر بحث کی جائے گی۔

عرض کر چکا ہوں کہ من لدنی باس شدید (خود حضوری سخت جنگ) [کی] جس دھمکی سے اس سورہ کی گویا ابتدا کی گئی ہے اس دھمکی کے متعلق یہ سوال کہ اس کا رُخ آیا ساری انسانیت کی طرف ہے یا بنی آدم کے کسی خاص طبقہ کو اس دھمکی کا قرآن نے نشانہ ٹھہرایا ہے؟ دراصل اسی سوال کا جواب مذکورۂ بالا آیات میں دیا گیا ہے۔[۱۲]

جیسا کہ ظاہر ہے کہ خالقِ عالم کی طرف ولدیت کے عقیدے کا انتساب یہ عیسائیوں کا صرف عقیدہ ہی نہیں، بلکہ اسی "اعتقاد" پر عیسائیت یا کرسچنٹی کی بنیاد قائم ہے۔ عیسائیت کا اول بھی یہی ہے اور آ کر بھی یہی ہے اور آج عیسائیوں کی بڑی اکثریت یورپ و امریکا میں آباد ہے، جس کا حاصل دوسرے لفظوں میں یہی ہوا کہ براہ راست رُخ اس من لدنی باس شدید کا ان ہی ممالک اور ان کے آبادکاروں کی طرف ہے۔

قابلِ غور نکتہ

یہ ہوسکتا تھا کہ کسی مختصر لفظ مثلاً "نصاریٰ" یا اسی قسم کے [دوسرے] الفاظ سے اسی مفہوم کو قرآن ادا کر دیتا مثلاً کہہ دیا جاتا کہ دھمکایا جاتا ہے، نصاریٰ کو یا عیسائیوں کو، مگر باوجود شدید اختصار پسندی کے ان ہی عیسائیوں کی تعبیر مذکورہ بالا الفاظ سے جو کی گئی ہے، اور ساتھ ہی ان کے اس عقیدے کی تنقید میں ایک سے زیادہ فقرے جو قرآن نے اس موقع پر استعمال کیے ہیں۔ کیا صرف یہ زورِ خطبات ہے؟ ایسے الفاظ ہیں کہ ان پر غور کیے بغیر صرف یہ کہتے ہوئے کہ مراد ان الفاظ سے عیسائی ہیں، ہم بھی اسی طرح گذر جائیں، جیسے عموماً لوگ گذر رہے ہیں؟

کسی آدمی کی کتاب کے ساتھ تو اس قسم کا سلوک شاید قابل برداشت بھی ہوسکتا ہے، مگر علام الغیوب، الحکیم الخبیر کے کلام کے ساتھ اس کی جسارت دلوں میں کیسے پیدا ہوتی ہے؟ میں تو اس کو سوچ کر کانپ اُٹھتا ہوں۔ یہ خالق عالم کا کلام ہے، اسی خالق عالم کا کلام ہے جس کا کام عالم کا موجودہ نظام ہے، جب اس کے کام کی سب سے بڑی خصوصیت ہی یہ ہے کہ بظاہر دیکھنے میں خواہ وہ جتنا بھی مختصر اور چھوٹا نظر آئے، آیٹم کے حقیر ذرّات ہی کیوں نہ ہوں؟ لیکن ان ہی ذرّات میں سے کسی ذرّے سے قوت کا طوفان اُبل پڑا، کیسا طوفان؟...... جس کے کام کا یہ حال ہو، انصاف شرط ہے، اسی عجیب وغریب نرالے کام والے کا کلام جب ہمارے سامنے آئے تو کیا اس کے ساتھ انصاف ہوگا کہ جس مطلب کو چار مستقل فقروں میں اس نے ادا کیا ہے اسی مطلب کو ایک لفظ "عیسائیوں" یا "النصاریٰ" یا اسی قسم کے لفظ دو لفظ سے ادا کر کے اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جائیں کہ خدا کے کلام کو ہم نے سمجھ لیا اور اس کے سمجھنے کا جو حق تھا اُسے ادا کر دیا؟ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝

Marfat.com

بہرحال اسی نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے آیئے اور قرآن کی مندجہ بالا ان چار آیتوں اور جن الفاظ پر یہ آیتیں مشتمل ہیں، اُن پر غور کیجئے۔

(۱)

خاص توجہ کا مستحق لفظ

لِیُنْذِرَ الَّذِیْنَ قَالُوْ اتَّخذَ اللّٰہُ وَلَدًا (تا کہ دھمکائے اُن لوگوں کو جنھوں نے کہا کہ اللہ نے وَلَد بنالیا) یہی پہلا فقرہ ہے، جن الفاظ میں عیسائیوں کے بنیادی عقیدے کی تعبیر قرآن نے اس مقام پر کی ہے۔ ان میں سب سے زیادہ توجہ کا مستحق میرے نزدیک وَلَد کا لفظ ہے۔ اردو میں عموماً لڑکا، بیٹا، بچہ وغیرہ الفاظ سے ولد کا ترجمہ کر دیا جاتا ہے۔ شاید کچھ ایسا سمجھا جاتا ہے کہ عربی ہی میں ابن کا جو دوسرا لفظ ہے اس میں اور ولد کے اس لفظ میں معنی کے اعتبار سے کسی قسم کا کوئی فرق نہیں ہے۔ گویا دونوں ہم معنی مرادف الفاظ ہیں۔

مگر بہ ادنیٰ تامل واضح ہو سکتا ہے کہ ولد کا لفظ ولادت سے ماخوذ ہے، فارسی میں زادن اور اردو میں جننا جس کے معنی ہیں۔ جس کا مطلب یہی ہوا کہ وَلَد کسی کا جب کسی کو ہم ٹھہراتے ہیں تو گویا ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ولد اس شخص سے جس کا وہ ولد ٹھہرایا گیا ہے، ولادت اور زائیدگی، یعنی جننے کا تعلق رکھتا ہے۔ اب ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ زادن، یا جننے یعنی ولادت کے اس لفظ کا اطلاق حال کی جس صورت پر کیا جاتا ہے اس کی واقعی حقیقت کیا ہوتی ہے؟

والد اور ولد کے تعلق کی نوعیت

فرض کیجئے کہ زید ولد ہے اور عمرو مثلاً اس کا والد ہے، ان دونوں کے باہمی تعلق کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟

کیا عمرو والد اپنے ولد زید کا خالق ہوتا ہے، یعنی زید کو کتم عدم، اور مطلق نیستی کے پردے سے نکال کر عمرو اس کو وجود عطا کرتا ہے؟ یقیناً واقعہ کی یہ قطعاً غلط تعبیر ہوگی۔ زید حونیہ کی شکل میں والد کے اندر نمودار ہوتا ہے اور عمرو جو والد ہے صرف اسی حونیہ یا نطفہ کو زید کی ماں کے رحم میں منتقل کر دیتا ہے، ولد یعنی زید...... وجود، وجود کے سارے صفات، صفات کے ثمرات ونتائج، ان میں سے کسی چیز کو اپنے والد عمرو سے نہیں پاتا، بلکہ بقول شخصے والد کی حیثیت ولد کے حساب سے صرف ایک گذرگاہ ہوتی ہے جس سے اپنی ہستی کی ایک خاص منزل (یعنی عالم حونیت یا نطفیت) میں ولد کو گذرنا پڑتا ہے۔ ''نیست کو ہست کرنا'' اگر خلق کے یہی معنی ہیں تو اس معنی کی رو سے قطعاً اپنے ولد کا کوئی والد خالق نہیں ہوتا۔ اور خلق کا ترجمہ اگر گھڑنا کیا جائے جیسے سنار سونے چاندی سے زیور گھڑتا ہے، یا پتھر پر تراش خراش کا عمل کر کے بُت تراش مجسمہ یا بُت وغیرہ بناتا ہے تو اس معنی کے رو سے بھی ولد اپنے والد کی مخلوق نہیں ہوتا۔ کیونکہ ولد میں صفات وکمالات کا جو سرمایہ بھی پایا جاتا ہے، اس میں والد کو جیسا کہ سب جانتے ہیں قطعاً دخل نہیں ہوتا۔ والد بیچارہ تو یہ

Marfat.com

بھی نہیں جانتا کہ جس نطفہ کو اس نے منتقل کیا ہے وہ مرد بن کر پیدا ہوگا، یا عورت بن کر، اس کی ظاہری شکل وصورت کیا ہوگی اور باطنی صفات اس کے کیا ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ جن چیزوں کو وہ جانتا ہی نہیں ان ہی کو وہ غریب بنائے گا کیا؟

ولد اپنے والد کا مخلوق نہیں ہوتا

یہ پہلی قابل غور بات ہے جو ولد کے اس خاص لفظ سے سمجھ میں آتی ہے، حاصل جس کا یہی ہوا کہ ولد ٹھہرانے کا مطلب یہ ہے کہ ولد اپنے والد کا مخلوق نہیں ہے، کسی معنی اور کسی حیثیت سے مخلوق نہیں ہے۔

ولد اپنے والد کا ہم جنس ہوتا ہے

اب دوسری بات جو اسی ولد کے لفظ کا قدرتی اقتضاء ہے، اسے بھی سوچئے، آپ جانتے ہیں کہ گھوڑے سے جو چیز قانون ولادت کے تحت پیدا ہوگی وہ گھوڑا ہی ہوگی، اور جیسے گھوڑے سے ہاتھی نہیں بلکہ گھوڑا ہی پیدا ہوتا ہے، یہی حال ہر اس چیز کا ہے جس میں والد و ولد ہونے کا تعلق پایا جاتا ہو۔ آخر بطخ سے چھچھوندر، اور چوہے سے چیل، گدھے سے لومڑی کی ولادت کا تماشا کس نے دیکھا ہے؟

عقیدۂ ولدیت کے لوازم

یہ دونوں مقدمات جو بداہتہً بغیر کسی تاویل وتوجیہ کے لفظ ولد سے سمجھ میں آتے ہیں ان کو سامنے رکھ لیجئے اور اب سوچئے کہ اللہ یا خالق عالم (تعالیٰ عمّا یقولون عُلواً کبیراً) کے لیے ولد ٹھہرانے والوں نے ولدیت کے اس دعوے کو اپنا عقیدہ بنا کر درحقیقت کیا مانا ہے اور اپنے دین وایمان کی بنیاد انہوں نے کس چیز پر قائم رکھی ہے؟ یقیناً یہی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسری ہستی بھی ایسی ہے جو خدا کی مخلوق نہیں ہے، نہ خود خدا کی مخلوق ہے اور نہ اس کے صفات و کمالات خدا کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ یہ تو عقیدۂ ولدیت کا سلبی پہلو ہوا، یعنی ولد، ولد کی ذات، اس کے صفات و کمالات، اللہ تعالیٰ کے عمل تخلیق کے رہین منت نہیں ہیں، یعنی خدا کے وہ مخلوق نہیں ہیں، یہ تو پہلے مقدمہ کا اقتضاء ہوا۔

اور دوسرا مقدمہ، یعنی وہی بات کہ گھوڑے سے گھوڑا، ہاتھی سے ہاتھی، اونٹ سے اونٹ ہی پیدا ہوتا ہے، تو قانون ولادت کے تحت خدا سے (العیاذ باللہ) پیدا ہونے والا ولد بجز خدا کے اور کیا ہوگا؟

''گھوڑے سے گھوڑا ہی پیدا ہوتا ہے۔'' اس کا مطلب جیسے یہ ہے (اور اس کے سوا ہو ہی کیا سکتا ہے) کہ پیدا ہونے والا (ولد) گھوڑے میں گھوڑا اپنے کے ان سارے صفات ولوازم کا ظہور ضروری اور ناگزیر ہے جو اس کے والد گھوڑے میں پائے جاتے ہیں، تو خدا کے لیے ولد [کا عقیدہ رکھنے] کے کیا یہی معنے نہ ہوئے کہ خدائی کے سارے کمالات کے متعلق ہم یہ مان رہے ہیں کہ خدا کے اس ولد میں بھی پائے جاتے ہیں۔

Marfat.com

لفظ ''ولد'' کا فائدہ

یہ ہے وہ مہیب و مدہش شکل اس عقیدے کی جس پر عیسائیت کی بنیاد قائم ہے۔ اس حقیقت سے سچ پوچھئے تو ''ولد'' ہی کا یہ لفظ پردہ ہٹا سکتا تھا، ورنہ ابن کا لفظ جسے عموماً ولد کا مرادف سمجھا جاتا ہے، خود اس لفظ کی ساخت میں ایسی کوئی چیز شریک نہیں ہے جس کے سوراخ سے عیسائیت کی اس بھیانک اور مکروہ ترین شکل کو ہم جھانک سکتے......

ابن اور ولد کا فرق

بلکہ سچی بات تو ہے کہ اپنے والد یعنی زائیدہ اولاد سے محبت اور شفقت وغیرہ کے جس تعلق کو آدمی فطرتاً رکھتا ہے، یہی تعلق کسی ایسی ہستی سے اگر پیدا ہو جائے جو ولد نہ ہو، تو ابن کے لفظ سے اس کو مخاطب کرنے کا عربی میں معلوم ہوتا ہے کہ عام رواج تھا، خود قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ نحن ابناء اللہ (ہم لوگ خدا کے بیٹے ہیں) یہود بھی اس کا دعویٰ کیا کرتے تھے۔ مطلب ان کا یہ ہوتا تھا کہ دوسری نسلوں کے مقابلہ میں اسرائیل کی اولاد یعنی بنی اسرائیل سے خدا اسی قسم کا ربط اور تعلق رکھتا ہے جو کسی بیٹے کے ساتھ باپ کا ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اپنے آپ کو یہودی ''خدازادہ'' یا ولد اللہ (العیاذ باللہ) نہیں سمجھتے تھے، بلکہ ''بارگاہِ رب العزت میں غیر معمولی امتیازی مقام ہم رکھتے ہیں'' وہ اس کے مدعی تھے اور اسی کی تعبیر نحن ابناء اللہ سے کرتے تھے، قرآن میں صرف یہ فرماتے ہوئے کہ:

قُلْ فَلِمَ یُعَذِّبُکُم بِذُنُوبِکُم بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِمَّنْ خَلَقَ.

کہہ دو! کہ پھر تمہارے گناہوں کی وجہ سے خدا تمہیں سزا کیوں دیتا ہے، بلکہ تم آدمی ہو، ان ہی چیزوں میں سے ایک جز ہو جنہیں خدا نے پیدا کیا۔

ان کے اس دعوے پر اور کوئی تنقید نہیں کی ہے۔

آخر ''ابن اللہ'' کا دعویٰ اور ''ولد اللہ'' کا دعویٰ دونوں کا مآل ایک ہی اگر قرار دیا جائے تو پھر عیسائیوں کی اس عقیدے کے ساتھ خصوصیت ہی کیا باقی رہتی ہے۔ ''ابناء اللہ'' ہونے کے مدعی تو قرآن ہی کے رو سے خود یہودی بھی تھے۔

عیسائیوں کے عقیدے میں لفظ ولد کے استعمال سے قرآن کا مقصد

کچھ بھی ہو، ولد کا قرآنی لفظ جس کا بار بار اعادہ تقریباً ہر اس موقع پر کیا گیا ہے جہاں جہاں عیسائیوں کے اس عقیدے کا ذکر اس کتاب میں پایا جاتا ہے، میرے نزدیک براہ راست قرآن کا یہی ایک لفظ سمجھا رہا ہے کہ

Marfat.com

درحقیقت عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ خالق عالم کے سوا ایک اور ہستی بھی ہے جو خدا کی مخلوق بھی نہیں ہے اور سارے خدائی صفات و کمالات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے، اگرچہ عیسائی اس کو اللہ نہیں، بلکہ ولد اللہ کہتے ہیں، مگر ولد اللہ ہونے کا مطلب ہی یہی ہے کہ وہ بھی اللہ ہے۔

شرک کے تمام مذاہب میں توحید خالق کا اعتقاد

اس میں شک نہیں کہ الٰہیات (یا دوسرے الفاظ میں چاہیے تو کہیے کہ حق تعالیٰ سے تعلق رکھنے والے مسائل) میں طرح طرح کے شاخسانے مختلف زمانوں میں نکالے گئے۔ شرک و بت پرستی اور ان کی بے شمار گوناگوں پیچیدہ شکلوں میں قومیں ان ہی شاخسانوں کی راہ سے الجھتی رہی ہیں، مگر تاریخ کی شہادت یہی ہے کہ شرک کی بدترین شکلوں میں بھی اس کا یقین کہ اس عالم کا پیدا کرنے والا صرف ایک ہی ہے، دلوں سے کبھی نہیں نکلا۔ تاریخ مذاہب کا جو طومار آج دنیا میں موجود ہے اس میں صرف ایران کے ایک فرقہ مجوس نامی کے متعلق کچھ اہرمن و یزدان یا نور و ظلمت کے عقیدے کو منسوب کر کے کہنے والے کہتے ہیں کہ بجائے ایک کے دو ہستیاں مجوسیوں کے نزدیک ایسی مانی جاتی ہیں جن میں کوئی ایک دوسرے کا خالق نہیں، بلکہ کائنات کی بعض چیزوں کو کہتے ہیں کہ یزدان نے پیدا کیا ہے اور بعضوں کو اہرمن نے، یا ان میں بعض نور سے پیدا ہوئی ہیں اور بعض ظلمت سے، اگرچہ مجوسیوں کی طرف اس عقیدے کے انتساب کو تحقیق نے افترا قرار دیا ہے، لیکن مان بھی لیا جائے کہ مجوسی کسی زمانے میں اس کے قائل بھی رہے ہوں، تاہم ان کی بات اتنی بودی اور پھسپھسی تھی کہ ہلکی سی ذہنی چوٹ چونکانے کے لیے کافی ہو سکتی تھی۔[۱۳]

[بہرحال] ''شرک'' کی پوری تاریخ ایک سے زائد خالق کے ذکر سے خالی نظر آتی ہے۔ برّ و بحر کے کونے کونے کے لوگوں نے چھان مارا، مگر جہاں کہیں انسانی آبادی ملی وہاں خالق عالم کی توحید کا عقیدہ بھی ملا، اور خالق کے سوا جن چیزوں کو بھی بنی آدم نے مختلف زمانوں میں پوجا یا اپنی امیدوں کا ماویٰ ملجا اور ٹھکانہ ان کو ٹھہرایا تو [اس مغالطہ کی بنا پر] ٹھہرایا کہ باوجود مخلوق ہونے کے زندگی کے مشکلات کے حل میں ان کو دخل ہے۔

مشرکین کے مغالطہ کی بنیاد

مگر اس مغالطہ کی بنیاد بھی صرف ایک لفظ کے نہ سمجھنے پر موقوف ہے، یعنی خود ''مخلوق'' کا لفظ۔

مخلوق کا غیر مخلوق پر قیاس

ایسی ہستی جو مخلوق ہو اس کے تعلق کی نوعیت اپنے خالق کے ساتھ کیا ہوتی ہے؟ یا اس کے تعلق کی نوعیت کیا

Marfat.com

ہونی چاہیے؟ لوگوں نے سامنے کی مثالوں کو دیکھ کر ایک رائے قائم کر لی اور یہی بے بنیاد رائے سارے مغالطوں کی بنیاد بنی ہوئی ہے، یعنی ان کے سامنے یا تو ایسی چیزیں ہیں، جن میں کوئی دوسرے کی مخلوق نہیں ہے، مثلاً زید اور عمر دو آدمی ہیں، ظاہر ہے کہ نہ زید ہی عمر کا مخلوق ہے اور نہ عمرو زید کا۔ ہم اسی قسم کی چیزوں کو دیکھ کر فیصلہ کر لیتے ہیں کہ زید و عمر وان دو ہستیوں کے تعلق کی جو نوعیت ہے، کچھ یہی نوعیت یا اسی قسم کی نوعیت خالق و مخلوق کے تعلق کی بھی ہوگی، یا زیادہ سے زیادہ ہم یہ سوچتے ہیں کہ اسی قسم کی چیزیں جن میں کوئی دوسرے کا خالق تو نہیں ہے، لیکن ان میں صنعتی تعلق کبھی جو پیدا ہو جاتا ہے، مثلاً پتھر کو صنعتی کاریگری سے بُت تراش مجسمہ بنا لیتا ہے، یا اینٹ چونے گچ کو جوڑ کر معمار مکان تیار کر لیتا ہے، لکڑی کے ٹکڑوں کو خراش تراش کے عمل سے بڑھئی کرسی کی شکل میں ڈھال دیتا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ صانع اور مصنوع میں جو تعلق اور رشتہ پایا جاتا ہے سمجھ لیا جاتا ہے کہ خالق و مخلوق کے رشتہ اور تعلق کی نوعیت بھی کچھ یہی ہوگی، حالانکہ پہلی صورت ہو یا دوسری، خالق و مخلوق کے تعلق کو سمجھنے میں جب ان سے مدد لی جائے گی تو درحقیقت نظر کے سامنے سے اوجھل ہو جائے گی اور طرح طرح کی اُلجھنوں میں آدمی مبتلا ہو کر رہ جائے گا۔

جس کی وجہ کھلی ہوئی ہے کہ صانع ہو یا مصنوع، یا صانع و مصنوع کا تعلق نہ ہو، کسی حال میں بھی ایک کا وجود دوسرے سے پیدا نہیں ہوتا۔ جن چیزوں میں صانع و مصنوع کا تعلق نہیں ہے ان کا حال تو ظاہر ہی ہے، باقی خود صانع و مصنوع میں بھی دیکھیے، پتھر یا لکڑی، یا اینٹ چونا وغیرہ جن پر صانع صنعتی عمل کرتا ہے، ان میں کوئی بھی ایسا ہے جسے صانع اور کاریگر وجود اور ہستی عطا کرتا ہو، یعنی نیست سے ہست یا جو چیز معدوم اور نیست مطلق تھی اس کو موجود کیا ہو؟ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان چیزوں میں جو قدرتی صلاحیتیں پہلے سے پائی جاتی ہیں، صانع اور کاریگر ان ہی صلاحیتوں کو صنعتی عمل سے ظاہر کر دیتا ہے۔ پتھر میں بت بننے کی صلاحیت پہلے سے موجود تھی، بُت تراش اسی صلاحیت کو فعلیت کا رنگ عطا کر دیتا ہے، آخر اسی صنعتی عمل سے کیا ہوا کے کسی ٹکڑے سے وہ بت بنا کر دکھا سکتا ہے؟

خالق و مخلوق کی صحیح مثال

خالق و مخلوق کی کوئی مثال چونکہ سامنے کی چیزوں میں نہیں پائی جاتی، اسی لیے غلط مثالوں کا سہارا لے کر شعوری یا غیر شعوری فیصلہ ہر شخص خالق و مخلوق یا خدا اور عالم کے متعلق اپنے اندر رکھتا ہے، حالانکہ مثل نہ سہی، مثال اس کی آدمی کے باہر میں نہ سہی، اندر میں خود پائی جاتی ہے، یعنی خیالی قوت سے بحالت بیداری یا [بحالت] خواب جن خیالی چیزوں کو اپنے اندر آدمی پیدا کرتا رہتا ہے، کچھ ہلکی سی جھلک خالق و مخلوق کے تعلق کی اگر پائی جاتی ہے تو اسی خیالی مثال میں پائی جاتی ہے۔ تخیل کی قوت سے بغیر کسی مادہ کے جس وقت ہم کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتے ہیں تو پیدا کرنے کا ارادہ اس خیالی مخلوق کی پیدائش کے لیے کافی ہوتا ہے۔ بڑی سے بڑی عمارت، پہاڑ، سمندر، آفتاب و ماہتاب کو عالمِ خیال میں آدمی پیدا کرتا رہتا ہے، گو یہ بھی ایک ہلکی سی نامکمل مثال ہے، مگر ذرا سوچیے کہ ان خیالی مخلوقات کا تعلق ان

Marfat.com

کے خالق سے کیا ہوتا ہے۔ اتنی بات تو کھلی ہوئی ہے کہ مخلوق بنا کر ہم جن چیزوں کو اپنے خیال میں پیدا کرتے ہیں، مثلاً دلّی کی جامع مسجد کا خیال کیجیے یعنی اپنے تخیل کی قوت سے اس کو پیدا کیجیے اور دیکھئے آپ کی یہ خیالی مخلوق اپنی ذات، اپنے صفات اور حالات ہر اعتبار سے اپنی پیدائش میں بھی آپ کے تخلیقی ارادے کی محتاج نظر آئے گی اور پیدا ہو جانے کے بعد بھی مسلسل اپنے قیام و بقاء میں اس کی ذات بھی، اس کے صفات بھی، حالات بھی آپ کی تخلیقی توجہ اور التفات کے دست نگر دکھائی دیں گے، جب تک اپنے تخیل کی قوت سے آپ اس کے قیوم بنے ہوئے اور اسے تھامے ہوئے ہیں وہ موجود ہوگی، جوں ہی توجہ والتفات کے اس سہارے سے وہ محروم ہوئی، اسی وقت وہ ناپید ہو کر رہ جائے گی۔

مخلوقیت کی حقیقت

کمزور آدمی کی مخلوق کا حال جب یہی ہے تو اسی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ قادر و مقتدر واقعی جو عالم کا خالقِ حقیقی ہے، اس کے ساتھ اس کے مخلوقات کے احتیاجی تعلق کی نوعیت یقیناً اس سے بھی کہیں زیادہ شدید ہوگی، اس کے مخلوقات میں خود مخلوقات کا کچھ نہیں ہوتا، سب کچھ خالق کا ہوتا ہے، ان کا وجود بھی، ان کی ذات بھی، ان کے صفات بھی، ان کے افعال بھی ہر لمحہ ہر لحظہ مسلسل صرف خالق کے فیضِ توجہ کے ساتھ بندھے پھندے رہتے ہیں۔ ''مخلوقیت'' کا حقیقی ترجمہ یہی احتیاجِ مطلق ہے جس پر ''مخلوقات'' کی یہ حقیقت کھل جاتی ہے۔ وہ ان سے اسی حد تک بے نیازی اپنے اندر پانے لگتا ہے کہ ان سے لین دین کے مراسم تو بڑی بات ہے، ان مخلوقات کے وجود تک میں اس کو شبہ ہونے لگتا ہے اور شبہ کیا بعض تو ایسی یافت کے بعد چیخ اُٹھتے ہیں، کہ

گر او ہست حقا کہ من نیستم [14]

بہر حال باوجود اجمال کے پھر بھی یہ ذیلی گفتگو کچھ زیادہ طویل ہوگئی، ورنہ یہ عرض کر رہا تھا کہ ''مخلوق'' کو ''مخلوق'' مان کر اس کو ''معبود'' بنانے کی غلطی میں آدمی اسی وقت تک شاید مبتلا رہ سکتا ہے جب تک کہ اس پر ''مخلوقیت'' کی اصل حقیقت صحیح معنوں میں واشگاف نہ ہوئی ہو، مگر ''خالق و مخلوق'' کے باہمی تعلق کو سمجھ لینے کے بعد جب اس پر واضح ہو جاتا ہے کہ ''مخلوقیت'' دراصل خالص بے چارگی، اور حد سے گزری ہوئی بے بسی کا نام ہے تو جن مثالی مغالطوں سے پھسل کر شرک کی اندھیری کھائی میں آدمی گر پڑتا ہے، اس سے اچانک باہر نکل آتا ہے۔ آخر ایسے ''معبود'' کو آدمی کب تک پوجتا چلا جائے گا، جس کے متعلق جانتا ہو کہ وہ خود اپنے وجود، اپنی ذات، اپنے صفات، اپنے افعال، سب میں دوسرے کا دست نگر اور دوسرے کے ارادے کے ساتھ جکڑا ہوا ہے۔

عیسائیوں کے شرک کی انفرادیت اور پیچیدگی

اسی لیے شرک اور مشرکیت کے وہ سارے قصے جن میں خالق کے سوا ہر معبود کو مخلوق مان کر معبود بنایا گیا ہے، ان کا مسئلہ چنداں دشوار نہیں ہے، کم از کم اتنا دشوار تو نہیں ہے جتنی دشواری ''شرک'' کی اس عجیب و غریب قسم کی وجہ

Marfat.com

سے پیش آگئی، جس کی بنیاد ''ولدیت'' کے عقیدے پر قائم ہے کہ اس میں خالق کے سوا کسی ایسی ہستی کو معبود بنا لینے کی کوشش کی گئی ہے، جو مخلوق نہیں بلکہ (العیاذ باللہ) خدا کا مولود ہے اور تماشا یہ ہے کہ ''مولود'' مان کر یہ بھی باور کرایا جاتا ہے کہ خدا یعنی خالق عالم کی ذات تو ہمارے ہاں بھی ایک ہی ہے، حالانکہ آپ دیکھ چکے کہ ''ولد اللہ'' اللہ کی مخلوقیت سے بھی باہر ہو جاتا ہے، اور ولدیت کا لازمی اقتضاء یہ ہے کہ اللہ کا ولد بھی ((العیاذ باللہ) اللہ ہی ہو۔

دوسرا شرمناک پہلو

اور قصہ کچھ اسی نقطہ پر ختم نہیں ہو جاتا، اب تک تو اس پر بحث کی گئی کہ ''نظریۂ ولدیت'' کی بنیاد پر ولد کے متعلق ماننے والوں کو کن باتوں کے ماننے پر مجبور ہونا پڑا، مگر دوسرا پہلو یعنی اسی ''نظریۂ ولدیت'' کے لحاظ سے خود والد کی طرف کن ناگفتہ امور کے منسوب کرنے پر اس کے قائل بے بس ہیں، اب اسے [صرف چند لفظوں میں] ملاحظہ فرمائیے۔

ظاہر ہے کہ ولد کا لفظ والد کے ساتھ قدرتاً والدہ کے مسئلہ کو بھی آدمی کے سامنے کر دیتا ہے، جس کے بعد اب آگے میں کیا عرض کروں۔ ہم جن کے ذکر سے۔کیا معنے؟ خیال سے بھی کانپ اُٹھتے ہیں، مگر ولدیت کے اسی حیرت انگیز، بدترین، گھنونے نظریہ کا یہ نتیجہ ہے کہ ماننے والوں نے ولد کے ساتھ والد کو مانا اور والد کے ساتھ والدہ کو اور والدہ کے ساتھ (العیاذ باللہ) والدین کے سارے فرائض کا مسئلہ سامنے آجاتا ہے۔

یہاں تک تو مطلب ہوا، پہلی آیت، یعنی ''لینذر الذین قالو اتخذاللہ ولدا'' کا۔اب آگے چلئے۔

(۲)

ارشاد ہوا ہے:

مَالَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَائِهِمْ.

نہیں ہوا ان کو اس کا کچھ بھی علم، نہ ان کے باپ دادوں کو۔

بلاعلم پے در پے دعوے

سوچئے قرآن کیا کہہ رہا ہے؟ کھلی ہوئی بات ہے کہ کسی چیز کے علم اور جاننے کی دو ہی صورتیں ہیں یعنی براہ راست جاننے والے کو اس کا علم حاصل ہوا ہو، یا براہ راست نہیں، بلکہ بالواسطہ، یعنی براہ راست جاننے والوں سے اس کی خبر پہنچی ہو، بالواسطہ یا بلاواسطہ علم کی یہی دو قسمیں ہیں، اب غور فرمائیے کہ ''نظریۂ ولدیت'' یعنی بجائے

Marfat.com

مخلوق قرار دینے کے کسی شخص کو خالق عالم جل مجدہٗ کا ''مولود'' ٹھہرا لینا اور مولود ٹھہرا لینے کے بعد انسانیت کے اس متفقہ کلی فیصلے کے خلاف کہ خدا کے سوا جو کچھ بھی ہے سب مخلوق ہے......ایک خاص ذات کو خدا کی ''مخلوقیت'' کے دائرے سے خارج کر دینا اور اللہ کے ساتھ ولد اللہ کا اضافہ کر کے درحقیقت ایک اور اللہ کو مان لینا، پھر والد کے ساتھ والدہ بنانے کے لیے انسانی گھرانے کی ایک عورت کے متعلق یہ تسلیم کر لینا کہ والدہ ہونے کے فرائض اسی نے انجام دیئے اور اس سلسلہ میں جن ناگفتہ بہ تصورات سے دل و دماغ کو گذرنا پڑتا ہے، ان کو دینی عقیدے کی حیثیت دینی ایک پورا فلسفہ اسی ولدیت کا بنا لینا، ہزاروں لاکھوں کتابوں کے سوا اسی عقیدے کی خیالی صورتوں کو معابد اور گرجوں کے در و دیوار پر تصویری لباس بھی عطا کرنا اور جہاں جہاں موقع ملتا چلا گیا، وہاں مجسموں اور سنگی و برنجی پیکروں میں بھی ان کو ڈھالنا۔

سوال یہی ہے کہ اس سارے اعتقادی طوفان کے نیچے کسی حیثیت سے کسی جگہ، کسی منزل میں کوئی ایسی بات بھی نظر آتی ہے جس کے متعلق اعتقاد رکھنے والوں کا یہ گروہ اس کا دعویٰ کر سکتا ہو کہ براہ راست اس بات کا علم اسے حاصل ہوا، یا اسے نہیں تو اس کے باپ دادوں میں کوئی ایسا گزرا جسے اس سلسلہ میں کسی قسم کے مشاہدے یا تجربے کا کسی حیثیت سے کبھی موقع میسر آیا تھا۔

کتنے مہیب، کتنے دہشت ناک، کتنے مکروہ اور گھناؤنے، ناگفتہ بہ دعووں پر ''ولدیت'' کا یہ عقیدہ مشتمل ہے، لیکن عقیدہ رکھنے والے انصاف سے بتائیں کہ ان میں سے کُل نہیں کسی ایک ہی جُزء کے جاننے کا بلاواسطہ یا بالواسطہ دعویٰ وہ کر سکتے ہیں؟ انہوں نے اپنے اوپر کتنی بڑی بڑی ذمہ داریاں لادی ہیں، خدا کی مخلوقیت سے ایک شخص کے خارج ہونے کے مدعی ہیں، اللہ کے ساتھ معناً ایک نئے اللہ کا اضافہ کر رہے ہیں۔ الـملک القدوس کی طرف وہ ایسی باتوں کو منسوب کر رہے ہیں، جنہیں صحیح معنوں میں شاید وہ خود بھی سوچ نہیں سکتے، مگر ان ذمہ داریوں کی بنیاد کس چیز پر قائم ہے، آپ دیکھ رہے ہیں ''کچھ نہیں'' کے سوا اور بھی کچھ ہے؟

زیادہ سے زیادہ

زیادہ سے زیادہ کچھ کہنے کی یہ جرأت اگر کر سکتے ہیں تو یہی کہ حضرت مسیح علیہ السلام جب بغیر ''والد'' کے ''والدہ'' (مریم علیہا الصلوٰۃ والسلام) سے پیدا ہوئے تو آخر ان کا والد کس کو ٹھہرایا جائے؟ سوال تو خیر ایک حد تک پیدا ہو سکتا ہے، مگر ابھی سوال سے نہیں، بحث جواب سے ہے، یعنی یہ کہہ دینا کہ جب انسانوں میں ان کا کوئی والد نہ تھا، تو ہم نے اللہ تعالیٰ ہی کو ان کا والد مان لیا۔ اسی جواب کے متعلق میں یہ پوچھتا ہوں کہ اس دعوے کی بنیاد کیا ہے؟ کیا زید کا باپ اگر عمرو نہ ہو تو اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ زید کا باپ بکر ہے، خود سوچئے کہ ایسا دعویٰ علم پر مبنی ہوگا؟ پھر اتنی بات کہ کوئی آدمی حضرت مسیح علیہ السلام کا باپ نہ تھا، محض اس لیے یہ منطقی نتیجہ کیسے نکل آیا کہ آدمی جس کا باپ نہ ہو اس کا باپ یقیناً خدا ہی ہے؟

Marfat.com

(۳)

عقیدۂ ولدیت پر قرآن کی پُر زور تنقید

اور اب اس کے بعد اندازہ کیجئے اس تیسری[۱۵] آیت کے صحیح وزن کا جو مذکورۂ بالا دو آیتوں کے بعد ہے یعنی نظریۂ ''ولدیت'' کے متعلق یہ بتانے کے بعد کہ بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی قسم کے علم پر اس کی بنیاد قائم نہیں ہے۔ قرآن نے

كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ٥

بہت بڑی بات ہے جو ان کے (عیسائیوں) کے منہ سے نکل رہی ہے، نہیں بول رہے ہیں مگر صرف جھوٹ۔

کے پُر زور الفاظ میں جو تنقید کی ہے، کیا یہ واقعہ کی صحیح تعبیر نہیں ہے؟ اس سے بڑی بات خود سوچئے اور کیا ہوگی کہ ایک ایسی پادر ہوا بات جس کی قطعاً کسی قسم کی کوئی علمی بنیاد نہ تھی، اور انسانیت کی ساری تاریخ میں جو کبھی سوچی نہیں گئی تھی اسی کو مان کر الٰہیات کے سارے نظام ہی کو درہم برہم کر کے رکھ دیا گیا۔

یقیناً حق تعالیٰ کے متعلق جتنی غلط سے غلط، مہمل سے مہمل باتیں اب تک منسوب کی گئی ہیں، ان میں سب سے بڑی بات وہ ہے جو نظریۂ ولدیت کے معتقدوں کے منہ سے نکل رہی ہے، اور کمال یہ ہے کہ حقیقت سے ذرّہ برابر بھی لگاؤ ان کے اس ادعائی عقیدے کو نہیں ہے، بالواسطہ یا بلاواسطہ علم کی کسی قسم کی تائید اس خیال کی یہ حاصل نہیں کر سکتے، نہ خود اپنے حواس کی شہادت کو دلیل میں وہ پیش کر سکتے ہیں، اور نہ اپنے باپ دادوں کی شہادت کو اور عقل سے تائید تو خیر بڑی بات ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس طریقے سے بھی سوچا جائے، بجز تردید کے عقل کی راہ میں بھی ان کو اور کچھ نہیں مل سکتا۔

اور یہ تو خیر ''نظریۂ ولدیت'' کی وہ باتیں ہیں جو ولدیت کے اس لفظ سے پیدا ہو رہی ہیں، باقی اس عقیدے سے خود اس عقیدے کے ماننے والوں کی آئندہ تاریخ کو، اور اُن کی وجہ سے دنیا کی قوموں کو جن روح گداز، جاں فرسا، حوادث و واقعات سے گزرنا پڑا اور گزرنا پڑے گا۔ اس کی تفصیل اس اشارے میں ملے گی جو اسی کے بعد والی آیت میں کیا گیا ہے۔

☆......☆......☆

Marfat.com

''عقیدۂ ولدیت'' کے روح فرسا آثار ونتائج

''تو کیا ایسا ہوگا کہ تم اپنی جان کے کھونے والے بن جاؤ گے، ان کے (یعنی عقیدۂ ولدیت کے ماننے والوں کے) آثار پر، اگر نہ ایمان لائے وہ اس بات (قرآن) پر، مارے غم واندوہ کے۔''

سورۂ کہف اٹھالیجئے، آگے آپ کو یہ آیت ملے گی، یعنی

''فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَفْسَکَ عَلٰی آثَارِھِمْ اِنْ لَمْ یُو مِنُو ابِھٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا''

پیشانی کی عبارت اس قرآنی آیت کا حاصل اور ترجمہ ہے۔

پوری سورت کی اہم ترین آیت اور اہم ترین لفظ

یوں تو سورۂ کہف اوّل سے آخر تک عجیب وغریب اشارات پر مشتمل ہے، لیکن کم از کم میرا ذاتی خیال یہی ہے کہ اس سورۂ میں بھی یہ آیت اور آیت میں بھی ''آثار ھم'' کا جزء غیر معمولی توجہ کا مستحق ہے۔

''آثار'' کی لغوی تشریح

آثار کا لفظ اثر کی جمع ہے، جو اردو میں بھی مستعمل ہے، جس [کی وجہ] سے شائد وہ صحیح مفہوم دماغوں میں نہ آئے، جو خالص عربی زبان میں اثر کے اس لفظ سے سمجھا جاتا ہے۔ لغت میں اس کی تشریح فارسی کے ان الفاظ سے کی گئی ہے ''منتہی الارب'' میں ہے

''اثر بقیہ چیزے ونشاں''

آگے بیان کیا ہے کہ نقشِ قدم کو بھی اسی لیے اثر کہتے ہیں، پھر عربی کا ایک محاورہ نقل کیا ہے، کہتے ہیں، ''اثراً بعد عین'' درحق کسے گویند کہ حاصل از دست وادہ وآثار ونشان اوطلب نمائد'' یعنی اپنی چیز کوئی کھو بیٹھا ہو، اور اس کے بعد اس چیز کے آثار اور نشانیوں کو تلاش کرتا ہو۔

حاصل یہی ہے کہ اپنے بعد چیز اپنے جن نتائج اور نشانوں کو چھوڑتی ہے، ان ہی کی تعبیر عربی زبان میں آثار کے لفظ سے کرتے ہیں، یہ لغوی تشریح تو آثار کے لفظ کی ہوئی۔

''باخع'' کی تشریح

دوسرا لفظ آیت میں باخع کا ہے، جس کا مادہ بخع ہے۔ عام طور پر بخع کا ترجمہ ہلاک کرنا کر دیا جاتا ہے، مگر

Marfat.com

عربی زبان کے ایسے محاورے اور زبان زد فقرے مثلاً ''بخع الارض بالزراعۃ'' جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ زمین پر اتنی کاشت کی گئی کہ روئیدگی کی صلاحیت جاتی رہی، اسی طرح ''بخع الرکیۃ'' اس وقت بولتے ہیں جب کھودتے ہوئے زمین کے اس طبقہ تک آدمی پہنچ جائے جہاں سے پانی اُبلنے لگے۔ بہرحال کسی معاملہ میں جدوجہد کو اس کے آخری حدود تک پہنچا دینا، بخع کے عربی لفظ کا صحیح مفہوم یہی ہے۔

لفظ ''اسف'' کی تشریح

تیسرا لفظ اسف کا ہے۔ غم واندوہ اس کا ترجمہ کر دیا جاتا ہے، مگر سچی بات یہ ہے کہ غم واندوہ حزن وملال کی ایک تو عام کیفیت ہوتی ہے، لیکن یہی کیفیت جب آخری شکل اختیار کر لیتی ہے جس کے بعد قلبی کلفت اور بے چینی کا کوئی درجہ سوچا نہیں جا سکتا، تب اسف کے لفظ سے قلب کی اس کیفیت کا اظہار کیا جاتا ہے، اسی لیے ایسی زمین جس میں روئیدگی کی صلاحیت قطعی طور پر نہ پائی جاتی ہو، عربی میں اس کو ارض اَسِفَۃ کہتے ہیں۔

خلاصہ آیت

ان لغوی تشریحات کو سامنے رکھتے ہوئے سیدھے اور سادہ الفاظ میں مندرجۂ بالا آیات کا خلاصہ یہی ہو سکتا ہے کہ قرآن پر ایمان لا کر قرآنی تعلیمات کی روشنی میں اپنے علم وعمل کی تصحیح سے عیسائی قوم اگر محروم رہ گئی، تو خود [اپنے اوپر] نہیں بلکہ عقیدۂ ولدیت رکھنے والی اور اس پر اصرار کرنے والی یہ امّت، اپنے پیچھے جن نتائج وعواقب یا آثار پیدا کو پیدا کر کے دنیا میں چھوڑتی چلی جائے گی، ان پر یا ان کے تصور سے صاحبِ وحی مہبطِ قرآن محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اندر غم والم کرب وقلق کی ایسی غیر معمولی کیفیت کا طوفان برپا تھا کہ اس راہ میں اپنا سب کچھ حتیٰ کہ اپنی زندگی اور جان تک کو قربان کرنے پر آپ آمادہ تھے۔

یہ ہے حاصل اور خلاصہ قرآنی الفاظ کا، اب ظاہر ہے کہ قرآن میں العیاذ باللہ شاعری نہیں کی گئی ہے بلکہ جو حقیقت تھی صحیح صحیح جچے تُلے الفاظ میں اسی کا اظہار کیا گیا ہے، اور اسی سے آگاہی بخشی گئی ہے۔

''آثارھم'' کی تاریخی تفصیل

پس آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یہ نفسیاتی کیفیت اگر واقعہ تھا، اور واقعہ کے سوا کسی دوسرے پہلو کا احتمال ہی کیا ہے، تو سوال یہ ہوتا ہے کہ ''عقیدۂ ولدیت'' کے وہ مہیب رُوح فرسا، جاں گداز آثار ونتائج کیا تھے، جن سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس حد تک متاثر تھے۔ یقیناً وہ چلتی پھرتی کوئی معمولی بات نہیں ہو سکتی۔ اور اسی لیے میں نے عرض کیا کہ اس آیت میں سب سے زیادہ توجہ وتامل کا مستحق ''آثارھم'' کا جزء ہے، اور اب میں اسی ''آثارھم'' کی تھوڑی بہت تفصیل کرنا چاہتا ہوں جس سے معلوم ہوگا کہ آثار، اور ھم ان دو لفظوں میں درحقیقت نسلِ انسانی کے ایک

Marfat.com

خاص طبقہ کی ایک طویل تاریخ کو بند کر دیا ہے۔

عقیدۂ ولدیت کو کیسے منوایا گیا؟

مطلب یہ ہے کہ ''عقیدۂ ولدیت'' یا کسی مخلوق کو خدا کا بیٹا ٹھہرانا، خواہ آدمی کے عقلی اور جذباتی اقتضاؤں کے لیے جس حد تک ناقابل برداشت ہو، دماغ سے بھی ٹکرا کر یہ خیال واپس ہو جاتا ہے اور دل بھی اسے اگل دیتا ہو۔[16]

مگر کیا کیجیے آدمی جب طے ہی کر لیتا ہے کہ ہم کسی چیز کو بہرحال مان ہی کر رہیں گے، تو کوئی نہ کوئی راہ اس کی نکال ہی لیتا ہے۔

مذہب کے متعلق ایک مسلّمہ

مذہب کے متعلق اتنی بات تو بہرحال مسلّم ہے کہ حواس و عقل کے حدود جہاں ختم ہو جاتے ہیں، وہیں سے راہ نمائی کا فرض مذہب ادا کرتا ہے۔ فطرتِ انسانی کے جن بنیادی سوالوں کے جواب عقلی دسترس سے باہر ہیں، ان کے حل کا ذمہ دار مذہب ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے اور مذہب کی ضرورت اُس کے اسی فرض کی بجا آوری میں پوشیدہ ہے۔ اسی واقعہ کی تعبیر میں عموماً کہنے والے اس قسم کی باتیں کہہ دیتے ہیں کہ ''مذہب یا دین وراء طور عقل ہے''۔ یعنی عقل سے بالا تر حدود کے سوالوں کے جواب سے اس کا تعلق ہے، لیکن ظاہر کہ اس کا ہرگز یہ مطلب نہ تھا اور نہ ہے کہ بشری جبلت کی بے چینیوں کی تسکین کا جو سامان اپنے پیش کردہ جوابوں سے مذہب کرتا ہے یہ ایسی باتیں ہوتی ہیں جن کے ماننے کی گنجائش آدمی کی عقل اپنے اندر نہیں پیدا کر سکتی۔

[بلکہ مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ] جن بنیادی سوالوں کو ہم مذہب کی روشنی میں حل کرتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ ان سوالوں کے جوابوں کے علم یا جاننے کا ذریعہ نہ ہم اپنے حواس کو بنا سکتے ہیں اور نہ اپنی عقل کو، لیکن ایمان یعنی ان جوابوں کے ماننے کی صلاحیت ہم میں ہونی چاہیے، ورنہ جن باتوں کے ماننے کی بھی صلاحیت ہم میں نہ ہو گی تو ان ہی پر ایمان لانے یا ان کے ماننے کا مطالبہ مذہب کی طرف سے کیسے پیش ہو سکتا ہے؟ کیا آنکھ کو سننے کا اور کان کو دیکھنے کا مکلّف بنایا جا سکتا ہے؟

مسیحیوں کا نرالا اُصول

مذہب اور مذہبی حقائق و امور کے متعلق مذکورۂ بالا اصول ایک ایسی جانی پہچانی بات ہے کہ مختلف مذاہب کے مقابلہ و موازنہ میں عموماً دنیا اسی اصول سے کام لیتی رہی ہے لیکن اسی یورپ میں [جس نے پچھلے دنوں مذہبی امور کو ماننے کے لیے، عقل و حواس سے ان کو جاننے کی شرط کا فتنہ اٹھایا ہے] اسی مسئلہ کا سہارا لے کر کہ مذہب میں عقل کو دخل ہے یا نہیں، ایک مدت تک نفی کے پہلو کو متعین کر کے یہ باور کرایا جا رہا تھا کہ مذہب کی سچائی کی دلیل یہ ہے کہ اس کی

Marfat.com

تعلیمات کے ماننے کی صلاحیت بھی آدمی کی عقل وفطرت میں نہ ہو۔

کہا جاتا تھا کہ اس معیار پر سب سے بڑی صداقت ''عقیدۂ ولدیت'' ہے۔ اسی کی عام تعبیر یہ تھی کہ ''تین ایک ہے اور ایک تین ہے'' یہی دنیا کی سب سے بڑی سچائی ہے، اس لیے سب سے بڑی سچائی ہے کہ عقل ہو یا فطرت اس کے ہضم کرنے سے قطعاً معذور ہے۔ یوں سب سے بڑے جھوٹ کو سب سے بڑی سچائی کا قالب عطا کر دیا گیا۔

بہر حال اسی کا نتیجہ یہ ہوا اور اس کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا تھا کہ ایسا مسئلہ جو دماغ کے لیے بھی ٹھیس اور دل کے لیے بھی صرف ٹھوکر ہو، وہ ماننے والوں کے ''افواہ'' یا ذہنی دائرے ہی میں گھومتا رہے۔

عقیدۂ ولدیت اور کلیسا

مگر خود یہ مسئلہ تو ''افواہ'' کے چکروں میں گھومتا رہا، لیکن اس سے پھوٹ پھوٹ کر جڑوں، جڑوں کے باریک باریک ریشوں اور رگوں کا ایک طویل سلسلہ اندر ہی اندر ماننے والوں میں بڑھتا اور پھیلتا رہا اور جوں ہی کہ کچھ سازگار حالات میسر آئے ان ہی جڑوں سے شاخیں نکلیں، برگ و بار آئے، آخر میں

''کلیسا''

کے نام سے مذہبی دنیا میں ایک ایسے تناور بلند و بالا گھنے درخت کی شکل اس نے اختیار کر لی جس کی نظیر مذاہب و ادیان کی تاریخ میں نہ پہلے ملتی ہے اور شاید اپنی خصوصیتوں کے لحاظ سے بعد کو بھی اس کی مثال مشکل ہی سے ڈھونڈھی جا سکتی ہے۔

بہ ظاہر عیسائی دنیا کلیسا کی اس چھاؤں کے نیچے سمٹی ہوئی سمجھی جاتی تھی، لیکن درحقیقت وہ ان جڑوں میں جکڑی ہوئی تھی، جو اندر ہی اندر پھوٹتی اور بڑھتی ہوئی زنجیروں، لوہے کی زنجیروں کی طرح سر سے پاؤں تک عیسائیوں کے ظاہر و باطن کے ساتھ چمٹ گئی تھی۔

کلیسائی نظام اور یورپ میں دین صلیبی کے داخلہ کی سرگذشت

''کلیسا'' کا نظام کیسے قائم ہوا، ابتداء اس کی کس شکل میں ہوئی، یہودیوں یا اولادِ اسرائیل کے محدود دائرے سے نکال کر عیسائیت کے پیغام کو یورپ کی غیر مختون غیر اسرائیلی قوموں میں پہنچانے میں تدبیر کرنے والوں نے کن کن گفتہ و ناگفتہ بہ تدبیروں سے کام لیا۔ شاول جس کا نام بعد کو پولس اور آج کل سینٹ پال ہے، یہ شخص کون تھا، ایشیاء کوچک کے صوبہ کلکیہ کے شہر ترسیس (اپنے مولد) سے یہ فلسطین کیسے پہنچا، اور وہاں یہودی علماء کے وفادار شاگرد کی صورت اختیار کر کے مسیح کے ماننے والوں پر مظالم کے پہاڑ پہلے جو اُس نے توڑے، اور آخر میں عیسائیوں کو ستانے کے لیے ہیکل کے یہودی علماء کے تصدیقی خطوط لے کر جب وہ دمشق جا رہا تھا تو اچانک اس کا یہ دعویٰ کہ مسیح علیہ السلام کی

Marfat.com

روح اس پر متجلی ہوئی، اور غیبی آواز آئی۔

''اے شاول اے شاول تو مجھے کیوں ستاتا ہے''

پھر جیسا کہ اس کا بیان ہے اس کے یہ پوچھنے پر اے خداوند تو کون ہے؟ اُسے یہ جواب ملا کہ:

''میں یسوع ہوں، جسے تو ستاتا ہے، مگر اُٹھ شہر میں جا، اور تجھے جو کرنا چاہیے، وہ تجھ سے کہا جائے گا۔'' (اعمال۔ص ۹: ۵-۴)

پھر بجائے دشمن کے مسیحیت کا مبشر اور منادی کرنے والا وہ کیسے بن گیا؟ کہاں کہاں پھرا، اور آخر میں یہ عہد شاہ نیرو رومیوں کے دارالسلطنت رومۃ الکبریٰ میں قیدیوں کی شکل میں وہ کیسے پہنچا، وہیں وہ مارا گیا، دفن ہوا، پھر اس کے تدفن اور اس کے ساتھ حضرت مسیح علیہ السلام کے حواری پطرس [۱۷] کی جعلی قبر کا دعویٰ کر کے رومہ میں عیسائیت کا مرکز کیسے قائم کیا گیا، جس نے آخر میں ''کلیسائے رومہ'' کا نام پایا۔ اور اسی رومی کلیسا کی اجتماعی طاقت کا شخصی مظہر یا اقتدار اعلیٰ پوپ کے نام سے گدی پر کیسے آ گیا۔ پھر ایک کے بعد ایک اسی طرح پوپوں کی جانشینی کا سلسلہ شروع ہوا، رفتہ رفتہ بالآخر کلیسائے روم کے پوپ کا اقتدار مطلق اور اس کے غیر محدود اختیارات عروج کے اس نقطہ تک پہنچ گئے کہ ان کے آگے عوام تو عوام سلاطین اور بادشاہوں کی بھی نہیں چلتی تھی، یورپ کے عیسائیوں کی جان و مال عزت و آبرو کے مالک پوپ اور پوپ کے وہ نمائندے تھے جو اس ملک کے طول و عرض میں گرجے بنا بنا کر کیڑوں کی طرح پھیلے ہوئے تھے، سب کماتے تھے، اور وہ کھاتے تھے۔

یہ سارے سوالات ایسے ہیں جن کے جواب کے لیے ہزار ہا ہزار صفحات کی ضرورت ہے، تفصیل کے لیے تو یورپ کی عام تاریخ اور کلیسائے رومہ کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیے، لیکن بطور نمونہ کے چند تاریخی شواہد کا پیش کر دینا غالباً ان لوگوں کے لیے مناسب ہوگا جنھوں نے ''دین صلیبی'' اور یورپ جس صورت حال سے اس دین کے داخل ہونے کے بعد دو چار ہوا، اس کی تاریخی تفصیلات کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔

کلیسا کا غیر معمولی اقتدار اور عجیب و غریب ہتھکنڈے

مختصر یہ ہے کہ تقریباً تین سو سال تک تو سینٹ پال کا پھیلایا ہوا ''صلیبی دین'' اور نظریۂ ولدیت کے ساتھ کفارہ کا مسئلہ [۱۸]، اندر ہی اندر یورپ کے باشندوں میں پھیلتا رہا۔ بت پرست رومی حکومت نے اس جدید دینی تحریک کی مخالفت میں اپنا آخری زور صرف کر دیا، مگر جتنا اس کو دبایا جاتا تھا اسی قوت کے ساتھ یہ تحریک آگے بڑھتی چلی جاتی تھی۔ تاآنکہ تین سو سال بعد کہتے ہیں کہ بُت پرست رومی بادشاہ قسطنطین نے بالآخر یہی فیصلہ کیا کہ خود اس دین کو وہ قبول کر لے، گویا یوں رومی حکومت بجائے دشمن کے صلیبی دین کی دوست اور پشت پناہ بن گئی۔ حکومت کی اسی پشت پناہی کے زیر اثر رومہ کے کلیسا کا اقتدار غیر معمولی طور پر بڑھنے لگا۔

Marfat.com

جعلی وثیقہ

یورپ کی مستند تاریخ جس کے مصنف گرانٹ صاحب ہیں۔ اپنی کتاب میں انہوں نے چند وثائق کا تذکرہ کیا ہے جن کے متعلق کلیسائے رومہ کا دعویٰ تھا کہ یہ وقتاً فوقتاً رومی حکومت کی طرف سے اسے عطا ہوئے جن میں ایک مشہور قدیم وثیقہ وہی ہے جس کا نام ''عطیۂ قسطنطین'' تھا، گرانٹ صاحب نے اس کا ترجمہ یہ درج کیا ہے:

''شاہنشاہ کانس ٹن ٹائن (قسطنطین) وفادار، رحمدل، قادر و نیک منش بادشاہِ اقوام المانی و سریانی و جرمانی و برطانی و ہونی، پارسا و خوش نصیب فاتح و غازی و ذی شان، مرضِ جذام میں مبتلا تھا، اور بت پرست پجاریوں نے اس کو مشورہ دیا تھا کہ معصوم بچوں کے خون میں نہائے بغیر اسے صحت نہیں ہو سکتی، مگر سینٹ پال اور سینٹ پیٹر کی دعاؤں سے اُسے صحت حاصل ہوئی، اور صحت یابی کے شکریہ میں اس نے حکم دیا کہ کلیسا رومہ کا ''قسیّس اعلیٰ'' تمام دنیا کے قسیسوں کا سردار ہو گا، اور یورپ سلوسٹر ہمارے محلات رومہ اور خود شہر رومہ اور اطالیہ کے تمام اضلاع اور صوبوں اور ممالک غرب (یورپ) پر قابض رہے گا۔''

گرانٹ صاحب نے لکھا ہے، اسی عطیۂ قسطنطین کے آخر میں یہ الفاظ بھی تھے:

''ان احکام میں ختمِ عالم تک کسی قسم کی ترمیم یا تغیر نہ کیا جائے۔''

(دیکھو گرانٹ کی تاریخ یورپ۔ ص ۲۰۲ ترجمہ اردو۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ)

مطلب یہ تھا کہ رومہ جہاں دعویٰ کیا جاتا تھا کہ، حضرت مسیح علیہ السلام کے براہِ راست صحابی یا حواری پطرس جن کا اصلی نام شمعون تھا، اُن کی درگاہ ہے، اور اسی کے ساتھ پولس یعنی سینٹ پال کا مدفن بھی وہیں بتایا جاتا تھا۔ [ان] دونوں درگاہوں کے مجاوروں کی طرف سے بادشاہ کو خوش خبری صحت کی سنائی گئی، صحت کے بعد یہ صلہ شاہی دربار سے ملا...... گرانٹ صاحب نے لکھا ہے کہ:

''پندرہویں صدی عیسوی تک جب تک یورپ میں پھر علوم کا دور دورہ نہ ہوا کسی میں ہمت نہ تھی، کہ اس تحریر کو جعلی قرار دے، یا اس کی صحت میں شک وشبہ کرے'' (ص ۲۵۱ کتاب مذکور)

بعد کو جو کچھ ہوا اس کا قصہ تو آگے آرہا ہے، اتنی بات تو عرض بھی کر چکا ہوں کہ عیسیٰ علیہ السلام کے حواری پطرس کی درگاہ ہی کو اس زمانے میں فرضی قرار دیا گیا ہے۔ لیکن بقول گرانٹ صاحب ۸۶۰ء جس میں مذکورۂ بالا وثیقہ کا اعلان کلیسا کی طرف سے کیا گیا تھا، اس وقت سے ہزار بارہ سو سال تک اس کے متعلق شک کا خیال بھی ارتداد و کفر کے ہم معنی تھا۔

Marfat.com

اقتدار کی انتہا

اور ایک یہی کیا، اسی قسم کے بیسیوں ذرائع مسلسل اختیار کیے گئے تا اینکہ بقول گرانٹ صاحب گیارہویں صدی عیسوی کے مشہور پوپ گری گوری ہفتم کے زمانہ میں کلیسا کی طرف سے یورپ کے حکمرانوں اور سلاطین و امراء عام باشندوں کو خطاب کر کے یہ اعلان شائع کر دیا گیا کہ:

''پاپائے رومہ کا دنیا میں کوئی ثانی نہیں، اس کے افعال پر حرف گیری کرنے والا کوئی نہیں، کلیسائے رومہ کو نہ کبھی دھوکہ ہوا ہے اور نہ ہوگا۔''

اسی میں یہ بھی تھا کہ:

''پوپ کو شہنشاہوں کے معزول کرنے کا اختیار ہے، انسانی نخوت نے بادشاہوں کی قوت پیدا کی، اور خدا کے رحم نے بشپوں کی قوت پیدا کی۔''

آخر میں تھا کہ:

''پوپ شہنشاہوں کا آقا ہے۔'' (کتاب مذکور، ص ۲۶۸)

اور یہ صرف دعویٰ ہی نہ تھا، جنہوں نے یورپ کے قرون متوسطہ کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ یہی واقعہ بھی تھا۔ اس قسم کی تحریریں جیسا کہ گرانٹ ہی نے لکھا ہے، عموماً پوپوں کی طرف سے بادشاہوں کو دھمکانے کے لیے شائع ہوتی رہتی تھیں، کہ:

''خدا نے ہمیں (یعنی پوپ اور پوپ کے چیلے چانٹوں کو) بادشاہوں اور شہنشاہوں کا سرتاج بنایا ہے تا کہ ہم اس کے نام سے جسے چاہیں اُکھاڑ پھینکیں، تباہ کر دیں، اور اگر چاہیں تو تخم ریزی کریں، اور نئی عمارت بنائیں۔''

یہ دعویٰ بھی کیا جاتا تھا، کہ:

''اگر دنیاوی حکومت سے غلطی ہو جائے تو روحانی حکومت اس کی اصلاح کر سکتی ہے، اور اگر روحانی حکومت سے کوئی غلطی سرزد ہو، تو اس کا انصاف کرنے والا خدا ہے۔''

اور یوں یورپ کی ساری دنیاوی حکومتوں کے حکمران، روحانی حکمرانی یعنی پوپ اور پوپ کے نمائندوں کے آہنی پنجوں میں اس طرح دبے ہوئے تھے کہ بلا چون و چرا پوپ کے احکام کی تعمیل کرتے چلے جائیں، اس کے سوا ان کے لیے کوئی چارہ باقی نہ رہا تھا۔

Marfat.com

عام رعایا برایا ان ہی حکمرانوں کے قبضے میں تھی، اس لیے نتیجتاً یورپ کے عام باشندے کلیسا کے احکام سے سرتابی کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔

عوام کو براہ راست قابو میں لانے کے ہتھکنڈے

ماسوا اس کے ''اعتراف گناہ'' کا ایک طریقہ بھی کلیسا کی طرف سے عوام میں جاری کیا گیا تھا، پوپ کے نمائندے ملک کے طول وعرض میں میل دو میل کے فاصلوں سے اپنے تھانے ''چرچ'' بنائے بیٹھے رہتے تھے، ان کا کام یہی تھا کہ توبہ کرنے والوں کے گناہوں کی فہرست کی خلوت میں سماعت کریں اور جو معاوضہ طے ہو جاتا تھا اس کو لے کر مغفرت اور بخشش کا لائسنس توبہ کرنے والوں کو عطا کیا جاتا تھا۔ اس مغفرت نامہ کو تاریخوں میں آج بھی لوگ نقل کرتے ہیں جو مقامی گرجوں سے توبہ کرنے والوں کو عطا کیا جاتا تھا، جو یہ ہوتا تھا، کہ:

''ہمارا رب مسیح تجھ پر رحم کرے، اور جن مقدس تکلیفوں کو اٹھا کر حقوق مسیح کو جو حاصل ہوئے ہیں، ان کے معاوضہ میں تیرے گناہ معاف ہوں۔''

مغفرت نامہ کی پیشانی کی اس عبارت کے بعد آگے یہ ہوتا تھا، کہ:

''پس معلوم ہو کہ مسیح کے رسولوں پطرس و پولس اور جلیل القدر پوپ کی حکومت نے اس خاص علاقے میں جو اقتدار مجھے بخشا ہے کہ تمہارے ان گناہوں کو میں معاف کر دوں، جو تم سے صادر ہو چکے ہیں، یا کلیسا کی طرف سے تم پر عائد ہوتے ہیں، خواہ وہ جیسے کچھ ہوں، اور جو کچھ بھی ہوں، نیز ایسے سارے گناہ جن کے بخشنے اور جن کی بندش سے کھولنے کا اختیار پوپ صاحب کو ہے، وہ سب تیرے بخشے گئے۔ اسی طرح ''کلیسائے رومہ'' کی کنجی جتنی دراز ہے، اسی کی نسبت سے تیرے ایسے گناہ بھی معاف کیے گئے جو آئندہ تجھ سے سرزد ہوں۔ اب میں تجھے کلیسا کے رموز اور اسرار میں شریک کرتا ہوں، اور جس وحدت کو کلیسا نے پیدا کیا ہے، وحدت کے اسی دائرے میں تجھے داخل کرتا ہوں۔''

آخر میں لکھا ہوتا تھا، کہ:

اب جو تو مرے گا، تو عذاب کے دروازوں کو اپنے اوپر بند پائے گا، اور فردوسِ بریں کے دروازوں کو اپنے اوپر کھلا پائے گا۔ بہرحال جس زمانہ میں بھی تو مرے گا تو اس ''مغفرت نامہ'' کی تاثیری قوت سے، ہمیشہ باپ، بیٹے اور روح القدس کے نام سے مستفید ہوتا رہے گا۔''

(آمین)

(منقول از اظہار الحق، عربی۔ ص ۳۷ ج ۲)

Marfat.com

مغفرت ناموں پر باضابطہ فیس کی ابتدا اگرچہ صلیبی لڑائیوں کے زمانہ میں کہتے ہیں کہ ہوئی، لیکن جب رواج پڑ گیا تو اس کی تجارت نے رفتہ رفتہ سارے یورپ میں غیر معمولی فروغ حاصل کیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ سلاطین کے عزل ونصب کے مسئلہ کو قابو میں لانے کے ساتھ ''اعتراف جرم'' کے پردے میں لوگوں کی شخصی زندگی کی کمزوریوں کا علم کلیسا کے پاس ایک ایسا شکنجہ تھا کہ پادری سب کچھ کر رہے تھے، عوام دیکھتے تھے، مگر کچھ بول نہیں سکتے تھے، عوام کا مال، ان کی جان، اور آخر میں عزت وناموس سب پر اطلاقی تصرفات کا اقتدار پادریوں کو حاصل تھا۔

گندی رہبانیت

کلیسائی رہبانیت کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن میں

وکثیرٌ منھم فاسقون

ان راہبوں کی اکثریت فاسق بن گئی

کا جو اعلان کیا گیا ہے، اس قرآنی آیت کی تفسیر سے یورپ کی تاریخیں معمور ہیں۔ موشم نے تاریخ کلیسا میں لکھا ہے کہ:

''متاہل اور شادی شدہ لوگوں پر مانا جاتا تھا، کہ شیطان کا اثر ہے، اس لیے جو لوگ کلیسا میں عہدہ حاصل کرتے تھے، وہ شیطانی اثر سے محفوظ رہنے کے لیے شادی نہ کرتے تھے، اسی طرح عورتیں بھی تجرد کی زندگی اختیار کرتی تھیں۔''

مگر اس ابتداء کی انتہا کیا ہوئی، موشم ہی کا بیان ہے

''لیکن یہ ساری باتیں صرف دکھاوے کی تھیں، مجرد مردوں کے بستر رات کو مجرد عورتوں سے آباد نظر آتے تھے، یہ عورتیں مردوں کی ناجائز خواہشوں کو پورا کرتی تھیں۔''

اسی نے لکھا ہے، کہ:

''ایک عورت معمولاً ایک مرد کے تصرف میں نہیں رہتی تھی، آج ایک عورت آئی تو کل دوسری، اسی طرح در پردہ یہ سلسلہ قائم رہتا، مگر بظاہر یہی کہا جاتا تھا کہ مجرد مرد اور مجرد عورتیں اپنی پارسائی اور عفت کو قائم رکھتی ہیں۔''

''مقدس کلیسا'' کی ان اندرونی غلاظتوں اور گندگیوں کا مشاہدہ اور تجربہ کبھی کبھی بعض نیک دل پادریوں کو بھی بے چین کر دیتا تھا۔ برنردوس نامی اسقف کی ایک نظم اس سلسلہ میں خاص طور پر مشہور ہے، جس کے ایک شعر کا ترجمہ ہے:

''نکاح کے معزز اور پاک آہنی طریقہ کو کلیسا سے خارج کر دیا گیا، جس سے پاک خوابگاہ آدمی کو میسر آتی تھی، اور بجائے اس کے کلیسا کی خوابگاہوں کو عیاشی کا چکلہ بنا دیا گیا ہے،...... جن چکلوں میں مرد اور عورتیں جو ماں اور بہنیں ہیں، ہر قسم کے گندہ حرکات کا ارتکاب کرتے ہیں۔''

ایک پرتگالی پادری القاردس بلاجیوس نامی نے مغربی ممالک کے عام کلیساؤں کی ان ہی اخلاقی زبوں حالیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے، خصوصاً اسپین کے متعلق لکھا ہے، کہ:

''کاش! ایسا ہوتا کہ کنوارے رہنے کا جو عہد کلیسا میں شریک ہونے والوں سے لیا جاتا ہے، یہ عہد نہ لیا جاتا، آج اسی عہد کا نتیجہ یہ ہے کہ اسپین کے عام باشندوں کے بچوں میں زیادہ اکثریت کلیسا کے مذہبی خدام کی ہے۔'' (اظہار الحق۔ ج ۲۔ عربی)

الغرض کلیسا کی ''رہبانیت'' باہر سے جیسی کچھ بھی نظر آتی ہو، لیکن بہ تدریج اندر ہی اندر یہی ''رہبانیت''، فسق کی ''اکثریت''[۱۹] کے قالب میں ڈھل گئی۔ قرآن کا یہ ایک ایسا دعویٰ ہے، جس کی تائید سے کلیسا کی تاریخیں لبریز ہیں۔

پوپ کا فرعونی اقتدار

ان اندرونی گندگیوں، اور غلاظتوں کے ساتھ اسی کلیسا کی قوت کی بدولت باہر میں ''پوپ'' کا لاہوتی اقتدار بڑھتے ہوئے اس نقطہ تک پہنچ گیا تھا کہ کلیسا کی طرف سے فرنسیس زاباولا جو پوپ کی مجلس خاص (ڈیکن) کا کرڈینال[۲۰] تھا، اسی نے یہ اعلان کر دیا تھا، کہ

''پوپ کو حق حاصل ہے کہ جو کچھ اس کے جی میں آئے کرے، تا اینکہ خدا نے جن چیزوں کو حرام ٹھہرایا ہے، پوپ چاہے تو اُن کو حلال قرار دے سکتا ہے۔''

آخر کے الفاظ (العیاذ باللہ) اس ''اعلان عام'' کے یہ تھے، کہ

''پوپ (کا اقتدار) خدا سے بھی بڑھا ہوا ہے۔''[۲۱]

اور آئے دن پوپ اپنے فرعونی اقتدار سے عموماً کام لیا کرتا تھا۔ پروفیسر میکائیل (میخائل) کی عربی کتاب، جو بیروت میں ۱۸۵۲ء میں چھپی ہے، اُس میں آپ کو طویل فہرست ان چیزوں کی ملے گی، جن میں پوپ نے اپنے اقتدار سے ردو بدل کیا تھا۔ میخائل نے لکھا ہے، کہ

Marfat.com

''روپیہ لے کر حرام کو حلال، حلال کو حرام کر دینا یہ پوپ کا عام دستور تھا۔''

کمائی کے طریقے

مغفرت نامہ کی تجارت، یا حرام کو حلال اور حلال کو حرام ٹھہرانے کا مقدس معاوضہ، اور[۲۲] عام نذر و نذور اوقاف وغیرہ وغیرہ کی آمدنی کے بے شمار ذرائع کے سوا' یہ شاعری نہیں واقعہ ہے کہ خدا کی رحمت سیر اور پاؤ کے حساب سے کلیسا اور کلیسا کے نمائندوں کی طرف سے عموماً سے بکتی تھی۔ عام قاعدہ تھا کہ سکرات موت کے وقت علاقہ کے پادری کا مرنے والے کے سرہانے رہنا ضروری تھا۔ کوئی جاگیردار مر رہا ہے۔ پادری صاحب بلائے گئے ہیں۔ مراقبہ میں ان کو محسوس ہوا کہ مرنے والے کی روح کو لینے کے لیے سیاہ سیاہ آتشیں آنکھوں والی خبیث روحیں اُتر رہی ہیں۔ پادری اس حال سے لوگوں کو مطلع کرتا ہے۔ پھر کیا کیا جائے؟ کلیسا کے نام سے جائداد وقف کی جائے، اور منت مانی جائے، یہ کیا جائے وہ کیا جائے! جب سارے مراحل طے ہو جاتے تب پھر پادری سر بہ گریباں ہو جاتا، اور مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ بشارت سناتا کہ خبیث روحیں واپس ہو گئیں، اور مجھے دکھا دیا گیا کہ نورانی ہستیاں پاک روحیں اب اُتر رہی ہیں۔

الغرض گوناگوں نت نئے طریقے کلیسا کی طرف سے اس لیے تراشے جاتے تھے کہ ملک کے باشندوں کی کمائی ہوئی آمدنی کسی نہ کسی طرح کلیسا کے حکام اور خدام کے پیٹ میں اترتی چلی جائے۔

بالکل نرالی اور ابلہ فریبیاں

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ غریب عوام کی مذہبی زود اعتقادیوں سے ناجائز نفع اٹھانے والے دنیا کے اکثر مذاہب داد یان میں پیدا ہوتے رہتے ہیں، اور کسی نہ کسی شکل میں آج تک انبہ فریبیوں کا یہ سلسلہ دنیا میں جاری ہے، لیکن دین صلیبی میں کلیسا اور پوپ کے نام سے جو نظام قائم ہوا تھا اس کی نوعیت ''ابلہ فریبیوں'' کے اس رام قصے سے قطعاً الگ تھلگ تھی، اسی لیے باوجود اہتمام اختصار کے مجھے کچھ تفصیل سے کام لینا پڑا جس سے کلیسا اور پوپ کے غیر معمولی اقتدار کا کچھ اندازہ پڑھنے والوں کو ہو سکتا ہے۔

دوسرے مذاہب داد یان میں زیادہ سے زیادہ یہ دیکھا گیا ہے کہ وقت کے حکمرانوں پر کسی ''مذہبی شخصیت'' کا اثر قائم ہوا، اور اس ''اثر'' سے اچھا یا برا کام اپنے اپنے وقت پر لینے والے لیتے رہے۔ لیکن یورپ کے ''دین صلیبی'' کا کلیسائی نظام شخصی نظام نہ تھا، بلکہ وہ باضابطہ ایک ایسا مستقل نظام تھا کہ ہزار بارہ سو سال تک بقول مسجوک

''شہنشاہی اور پاپائی کی مثال علی الترتیب'' چاند اور سورج سے دی گئی ہے۔''

(کتاب ارتقائے نظم حکومت ص ۲۶۴ ج ۱)

Marfat.com

جس کا مطلب یہ تھا کہ یورپ کے عام سلاطین وملوک ہی نہیں بلکہ شہنشاہی کا اقتدار رکھنے والی ہستیوں کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کی قوت کا نور کلیسائے روم کے پوپ کے نور اقتدار کا عکس ہے۔ جیسے چاند کا نور آفتاب کے نور کے ساتھ وابستہ ہے۔

مسجوک ہی نے لکھا ہے کہ

''سیاسی حکمرانوں کو کلیسا کے مذہبی حکمران کے ماتحت رکھنے کے لیے یہ طے کر دیا گیا تھا کہ اس کا فریضہ نائب عیسیٰ (پوپ) کے ہاتھ میں ہونا چاہیے، کیوں کہ وہی تنہا بادشاہوں اور حکمرانوں سے بالاتر تھا۔''

کہا جاتا تھا کہ پوپ حضرت مسیح کے حواری کا جانشین ہے اور پطرس حضرت مسیح کا جانشین تھا، بقول مسجوک

''اس سے یہ دعویٰ نکلا کہ جو حکمران (اور بادشاہ) مقدس پطرس کے جانشین کے احکام کی خلاف ورزی کرے پوپ اسے معزول کر دے اور اس سے مزید یہ ادعا پیدا ہوا کہ جو صاحب اقتدار معزول کر سکتا ہے وہ نصب اور تقرر سے انکار بھی کر سکتا ہے۔''

یہی ایک ایسی صورت حال ہے جس کی نظیر پوپ کے ''دین صلیبی'' کے سوا اور کسی دین میں نہیں مل سکتی۔

ایک ضرورت جسے پورا کرنے کے بجائے اقتدار کو نفسانی اغراض کا آلۂ کار بنایا گیا:

اگر کلیسا کے اس اقتدار سے کام لینے والے صحیح کام لیتے تو اس میں شک نہیں، جیسا کہ مسجوک نے لکھا ہے کہ

''اس بے لگام خود غرضی (یعنی شاہی اقتدار کے مطلق العنان حکام) کے لیے کسی نہ کسی تدارک کا ہونا ضرور تھا اور اس کا صاف وسہل علاج یہی معلوم ہوتا تھا کہ قسیّسوں (حکام کلیسا) کی طرف سے زجر وتوبیخ ہوتی رہے۔''

مگر آپ دیکھ چکے کہ ''کلیسا'' کی آڑ لے کر صلیبی دین کے ان نمائندوں نے کتنی گھنونی قسم کی بے دینیوں سے یورپ کو بھر دیا۔ جان ومال، عزت وناموس اس ملک کے ہر باشندے کی مذہب کے ان نمائندوں کی حیوانی اور نفسانی خواہشوں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔

اہلِ یورپ کی قدرتی بے چینی لیکن بے بسی کا طویل عرصہ:

سال دو سال نہیں، بلکہ چوتھی صدی عیسوی سے مذہبی غارتگروں کا یہ سلسلہ شروع ہوا اور ہزار سال سے زیادہ مدت تک دن دونی ترقیوں کے ساتھ اس کے ظلم وتعدی کا دائرہ بڑھتا چلا گیا۔ فطرت انسانی قدرتاً ان حالات سے جس

Marfat.com

حد تک بے چین اور مضطرب ہو سکتی ہے اس کا اندازہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے جو انسانی احساسات لے کر پیدا ہوا ہے۔ یورپ کے یہ باشندے جنہوں نے صلیبی دین قبول کر لیا تھا، وہ یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے، دیکھتے رہتے تھے، تڑپتے تھے، تڑپنا چاہتے تھے، لیکن تڑپنے کی بھی گنجائش ان کے لیے باقی نہ چھوڑی گئی تھی۔ ایک طرف سلاطین وملوک کی فوجی قوتوں کا دباؤ ان کو ہلنے نہیں دیتا تھا، جس کی وجہ ظاہر تھی کہ فوج کی قوت ہو، یا پولیس کی قوت، حکمراں اقتدار کے منشاء کی تعمیل کرتی ہے، اور حکمرانی کے اقتدار رکھنے والی طاقتیں چونکہ پوپ یا کلیسا کے غیر مسئول اقتدار کی چٹان کے نیچے ہر جگہ دبی ہوئی تھیں، اس کا لازمی منطقی نتیجہ تھا کہ کلیسا یا پوپ یا پوپی نظام کے تحت کام کرنے والوں کے متعلق لب ہلانے کی جرأت خود اپنے خون اور اپنی جان کے ساتھ بازی گری بن جاتی تھی۔

ایک طرف کلیسا کے ہاتھ میں اس طریقہ سے ملک کی سیاسی باگ آ گئی تھی، اور دوسری طرف ''اعترافِ جرم'' کے قصے کی بدولت ہر پادری انفرادی شخصیتوں کی کمزوریوں، جرائم اور لغزشوں کا محرمِ اسرار بنا ہوا تھا۔ کلیسا کے خلاف کچھ بولنے کا مطلب یہی ہوتا تھا کہ اپنے پوشیدہ جرائم کا راز فاش ہو جائے۔ افراد واشخاص کی گرفت کا یہ ایک ایسا جال تھا، جس میں لوگ اپنے آپ کو جکڑا ہوا پاتے تھے۔ پھر رسم ورواج وعادت اس قسم کے عام قوانین کا اقتضا یہ بھی ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے ہونے دو۔ عمومیت [۲۳] میں اسی نوعیت کے اثرات بتدریج پیدا ہو جاتے ہیں، یوں ہی کلیسا کو اپنی من مانی کارروائیوں کے جاری رکھنے کا موقع قرنہا قرن تک ملتا رہا۔

ردِّعمل کا نشوونما

لیکن آخر ہر چیز کی ایک حد بلکہ یوں سمجھئے کہ عمر ہوتی ہے، قدرت جو تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے نشیب وفراز سے گذارتے ہوئے نسل انسانی کو آگے کی طرف بڑھاتی چلی آ رہی ہے، وہی قدرت ہر عمل کے ردِّعمل کے اسباب ووجوہ کو پیدا کرتی رہتی ہے۔

کلیسا کے بڑھتے ہوئے مذکورۂ بالا غیر معمولی اقتدار کے مقابلہ میں ردِّعمل کا اسباب وعلل کے کن کن قالبوں میں قدرت کی طرف سے نشوونما ہونے لگا، اس کی تفصیل کا تو یہاں موقع نہیں ہے، تاہم اتنی بات کھلی ہوئی ہے کہ مظالم اور چیرہ دستیوں کا جو سلسلہ ڈاکوؤں اور چوروں، رہزنوں اور غارتگروں کی طرف سے نہیں، بلکہ دین اور مذہب کے مدعیوں کی طرف سے شروع ہوا تھا، خود اس کی تعمیر ہی میں خرابی کی صورت مضمر تھی، آدمی چوروں اور ڈاکوؤں سے بھی نفرت کرتا ہے اور ان کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے، لیکن شیطان شیطان کے لباس میں نہیں بلکہ فرشتوں کے جبوں میں جب سامنے آئے اور معلوم ہو جائے کہ ان ملکوتی جبوں کے نیچے ابلیسی روحیں پوشیدہ ہیں تو یہ واقعہ ہے کہ جرم وطغیان کے خلاف انسانی فطرت کی برہمی کا پارہ غیر معمولی طور پر زیادہ بہت زیادہ چڑھ جاتا ہے، جیسے جیسے کلیسا کے بھیس میں شیطان اپنے پروگرام کو آگے بڑھا رہا تھا۔ اندر ہی اندر عمومیت کی فطرت میں آتشیں لاوے تیار ہوتے چلے جاتے تھے، مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا اندر میں تیار ہونے والے ان لاووں کو باہر نکلنے کے لیے کوئی دہانہ نہیں ملتا تھا، سوراخ پیدا

Marfat.com

ہوتے تھے لیکن ان کو فوراً جبر و استبداد کی قوتوں سے بند کر دیا جاتا تھا۔

صلیبی لڑائیوں کا اثر

اسی عرصہ میں کروسیڈ وار یعنی مولدِ مسیح علیہ السلام کو مسلمانوں کے ہاتھ سے چھڑانے کے لیے صلیبی لڑائیوں کا جو سلسلہ کلیسا کی طرف سے چھیڑا گیا اور اس راہ میں کامیابیوں سے زیادہ ناکامیوں ہی سے پرستارانِ صلیب کو عموماً دو چار ہونا پڑا اور کلیسا کے نمائندوں کی طرف سے بعض ایسی مذبوحی حرکتیں بھی سرزد ہوئیں، جس نے عوام کے پیمانۂ صبر کو لبریز کر دیا۔[۲۴] کہتے ہیں کہ ان صلیبی لڑائیوں میں ایک نئے دین اسلام کے نظام کا تجربہ کرنے کا بالواسطہ یا بلاواسطہ موقع یورپ کے کلیسائی باشندوں کو ملا، اسی کے ساتھ یورپ کے بعض قوی پنجہ ذی العزم والا رادہ سلاطین (میں اور) کلیسا اور پوپ میں مزاحمت بھی شروع ہوئی اور یہ مزاحمت آگے بڑھتے ہوئے اپنی آخری شکل تک پہنچ گئی، جس نے کلیسائی نظام کے استحکام کو گونہ متاثر کیا۔[۲۵]

الغرض یہ اور اسی قسم کے گوناگوں پیچیدہ اسباب پے در پے یکے بعد دیگرے مسلسل پیدا ہوتے چلے گئے کہ اندر اندر کلیسا کے خلاف جو آگ عوام کے سینوں میں سلگ رہی تھی اور جو آتشیں لاوے پیدا ہو رہے تھے، ان کو منہ بنانے کا موقع مل گیا۔

پروٹسٹنٹ فرقہ

پروٹسٹ یعنی احتجاج کی طرف منسوب کر کے صلیبی دین کی تاریخ میں پروٹسٹنٹ فرقہ کا جو ذکر آتا ہے، دراصل یہی اندرونی آگ اور لاوے کے ان دہانوں کی تعبیر ہے، جن کی راہ سے کلیسا کی مخالفانہ آگ باہر نکلنے لگی۔

ایک ہی ملک میں نہیں بلکہ یورپ کے مختلف علاقوں میں آگے پیچھے مختلف شخصیتیں جرأت سے کام لے کر کلیسا اور پوپ کے خلاف علانیہ اٹھ کھڑی ہوئیں، جن میں جرمنی کے مارٹن لوتھر، سوئٹزرلینڈ کے زونگ لی، فرانس کے کالون نامی وغیرہ افراد نے غیر معمولی شہرت حاصل کی، جن کے تفصیلی حالات کا مطالعہ یورپ اور کلیسائی کی تاریخوں میں کرنا چاہیے۔

پروٹسٹ کی ابتدائی نوعیت

حاصل ہر ایک کے احتجاج اور پروٹسٹ کا یہی تھا کہ صلیبی دین کی ٹھیکہ داری، یا بائبل (تورات و انجیل وغیرہ) کی تشریح کا استحقاق کلیسا نے اپنے ساتھ جو مختص کر رکھا ہے، یہ صحیح نہیں ہے اور نہ نجات کے لیے کلیسا روم اُس کے پوپ، پوپ کے نمائندوں کو واسطہ بنانے کی ضرورت ہے، یہ ہزار ہا ہزار صفحات کی داستان کا خلاصہ ہے۔

Marfat.com

کلیسا کا ردِّ عمل

واقعہ یہ ہے کہ ابتداءً احتجاج اور پروٹسٹ کے اس قصے کا تعلق صرف کلیسا، پوپ، پوپ کے نمائندوں اور ان لوگوں کے پیش کردہ صلیبی دین کی شکل سے تھا۔ شروع میں یہی غنیمت تھا، مگر کلیسا کے لیے یہ مغتنم احتجاج بھی ظاہر ہے کہ کسی حیثیت سے بھی قابل برداشت کیسے ہوسکتا تھا۔ چاہا گیا کہ ''گربہ کے ساتھ کشتنی'' کے فعل کو پہلے ہی شروع کردیا جائے، ورنہ ''پیل'' (ہاتھی) سے بھی اس سیلاب کو روکنا ممکن نہ ہوگا، جس کی روانی ابھی صرف میل یعنی سلائی سے روکی جاسکتی ہے۔

کشمکش کی ابتداء

کلیسا اور عوام میں کش مکش کی ابتدا ہوگئی۔ یورپ کی تاریخوں میں عدالت ہائے تحقیق مذہب (Inquisition) اور ''لاشامبرارردانت'' یا ''ایوان آتشیں'' وغیرہ کی اصطلاحیں جو ملتی ہیں، درحقیقت ان ہی الفاظ میں اس منحوس کشمکش کی خونیں اور آتشیں داستانیں چھپی ہوئی ہیں۔

کلیسا کے خلاف صراحتہً ہی نہیں بلکہ اشارۃً و کنایۃً تحریراً و تقریراً کسی قسم کا کوئی لفظ زبان سے نکالنا جرم ٹھہرایا گیا۔ کلیسا نے فتویٰ صادر کیا اور سارے سلاطین و امراء جن کی سلطنت و امارت کی بنیاد صرف کلیسا کے رحم و کرم پر منحصر تھی، انہوں نے اس فتویٰ کی تعمیل کے لیے نیاموں سے تلواریں باہر نکال لیں۔ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مجرموں کو نذر آتش کرنے کے لیے مقدس الاؤ جوڑ دیے گئے۔

مخالفان کلیسا کے خون کی ہولی

پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ سال دو سال کا قصہ ہو تو بیان کیا جائے، واقعہ یہ ہے کہ کش مکش کی یہ کیفیت رومن کیتھولک یعنی حامیان کلیسا اور پروٹسٹنٹ مخالفانِ کلیسا ان دونوں فرقوں کے درمیان پانچ چھ صدیوں تک انتہائی قساوت قلبی، سنگدلی کے ساتھ جاری رہی۔ قدرتاً پروٹسٹنٹ خیال کے حامیوں کی تعداد شروع میں کم تھی، ہر علاقہ اور خطہ میں کیتھولک اکثریت غریب پروٹسٹنٹوں کی اقلیت کے ساتھ جو جی میں آیا کرتی رہی۔ عدالتہائے مذہبی، یا مجلس تحقیقات ارتداد میں مقدمہ پیش ہوتا، ہلکی سی رسمی کارروائی کے بعد قتل یا زندہ جلا دینے کا فیصلہ صادر کردیا جاتا اور کیتھولک فرقہ کے عیسائی بڑی دلچسپیوں کے ساتھ خون اور آگ کی ان ہولیوں کا تماشہ دیکھا کرتے تھے۔

طرزِ ستم

لکھا ہے کہ اتحاد یا ارتداد کے فتوے کے بعد دیکھا جاتا تھا کہ مجرم کو پلنگ کے ساتھ باندھا دیا گیا ہے۔

Marfat.com

غریب چت لٹا دیا جاتا، چھت میں باڑھ دار ہتھیار لٹکا دیا جاتا، جو آہستہ آہستہ کئی دن (تک) لیٹے ہوئے مجرم کے سینے پر ضرب لگاتا اور یوں اس غریب کی جان نکالی جاتی یا گھٹ گھٹ کر نکل جاتی۔

اس سلسلے میں کن کن شہروں میں قتل عام کے واقعات کتنی دفعہ پیش آئے اور قتل عام کے ان واقعات میں کتنی جانیں کام آئیں، ان کی فہرست یورپ کی تفصیلی تاریخوں میں مل سکتی ہے۔

ہنگامۂ بار تھیلمی

فرانس کا مشہور ہنگامہ، بار تھیلمی کے ہنگامے کے نام سے جو مشہور ہے، کہتے ہیں کہ (۹) دن تک پروٹسٹنٹ فرقہ کے مردوں اور عورتوں کے قتل عام کا حکم نافذ رہا۔ لکھا ہے کہ حاملہ عورتوں کے پیٹوں کو چاک کر کے کلیسا کی کیتھولک بھیڑیں زندہ بچوں کو نکالتیں اور کتوں کے آگے ڈال کر ان کے پھاڑے اور کھائے جانے کا تماشہ دیکھتیں۔ پیرس کے دریائے سین کا پانی مقتولوں کے خون سے سرخ ہو گیا تھا۔[۲۶]

دس لاکھ کا خونِ ناحق

خلاصہ یہ ہے کہ کش مکش کے اس سلسلہ میں تخمینہ کیا گیا ہے کہ جو مارے گئے، زندہ جلائے گئے دوسرے طریقوں سے ان کو قتل یا ذبح کیا گیا، تخمیناً دس لاکھ افراد تک ان کی تعداد پہنچتی ہے۔

اور یہ سب کس لیے ہوا؟ صرف اس لیے کہ خدا کے بیٹے مسیح اور ان کے حواری پطرس، پطرس کے جانشین پوپ کے ہاتھ میں ان ہی مذہبی ناموں کے وسیلہ سے سیاسی باگ جو آئی تھی، یہ باگ ہاتھ سے نکلنے نہ پائے۔

مظلوم فرقہ پر اس جبر و تعدی کا اثر

پروٹسٹنٹ خیال کے حامیوں کی طرف سے جب پوپ اور پوپ کے نمائندوں پر اعتراض کیا جاتا، تو کہنے والے پطرس کا نام لیتے کہ تم حواریٔ مسیح کے جانشین پر زبان کھولتے ہو۔ جواب میں کہنے والے پطرس ہی پر اعتراض کرتے، بالآخر اسی اعتراض نے تحقیق کی وہ شکل اختیار کی جس کا ذکر پہلے آچکا ہے یعنی ثابت کیا گیا کہ ”پطرس حواری کی قبر یا لاش رومہ میں ہے“، سرے سے یہ دعویٰ ہی غلط اور بے بنیاد جعلی ہے۔

نوبت باینجا رسید

بہرحال پطرس کے تقدس میں، زور پہنچانے والے جب مسیح اور خدا کے بیٹے کے نام سے زور پہنچاتے، تو جو ذرا زیادہ آزاد مزاج تھے انہوں نے خود مسیح کی عظمت و جلالت میں اشتباہ ڈالنا شروع کیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مسیح

Marfat.com

کے وجود تک کو فرضی ثابت کرنے کی کوشش ہونے لگی۔ مسیح کی عظمت کو برقرار رکھنے کے لیے ''خدا'' کا نام لیا جاتا، لیکن جس پوپ، جس کلیسا، جس پطرس اور جس مسیح کے نام لینے والوں کے خونیں کارناموں سے یورپ کا چپہ چپہ رنگین ہو رہا تھا، اُسی مسیح کے خدا پر بھی زبانیں اگر کھلنے لگی ہوں تو اس پر تعجب کیوں کیا جائے؟ اور یہی مطلب ہے ہنری مسجوک کے اس فقرے کا، کہ

''جس وقت نشاۃ جدیدہ کا (یورپ) میں زور شور تھا، جس نے ان مذہبی عقائد ہی کو کمزور کر دیا تھا، جن کے اوپر پاپائیت کا انحصار تھا۔'' (ارتقائے نظم حکومت۔ یورپ ص ۲۶۶)

یہاں تک بات کیوں پہنچی؟

اب سوال یہی ہے کہ ''مذہبی عقائد کی اس کمزوری'' کی بنیاد کیا تھی؟

یورپین مؤرخین کا شاطرانہ انداز اور صاف بیانی سے گریز

افسوس ہے کہ یورپ کی تاریخ لکھنے والوں نے نہ اس سوال ہی کو زیادہ اہمیت دی اور نہ سوال کے جواب ہی میں وہ صاف بیانی سے کام لیتے ہیں۔ وہ کچھ ملی جلی باتیں کرتے ہیں، جن میں کچھ تو وقت، وقت کے سیاسی حکمرانوں کے کارناموں اور حکومت کے متعلق دستوری خیالات کے پیش کرنے والے مصنفین کے نظریات و افکار کا تذکرہ کیا جاتا ہے اور ساتھ ہی کچھ سائنس، کچھ فلسفہ اور ان فنون کی ترقیوں کا اظہار ایسے پیرایہ میں بیان کیا جاتا ہے، کہ ''مذہبی عقائد کی کمزوری'' کے صحیح اسباب سامنے آنے نہیں پاتے اور ان کتابوں کے سطحی مطالعہ کرنے والے اس خبط میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ شائد فلسفہ اور سائنس کے چرچوں نے مذہب کی بنیادوں کو یورپ میں سُست کر دیا۔

اس میں شک نہیں کہ اپنی ان ہی تاریخوں میں وہ کلیسا اور پوپ، ان کے طرز عمل اور اس طرز عمل سے عوام کی ذہنیت بہ تدریج جو متاثر ہوتی چلی جاتی تھی، بیچ بیچ میں اس کے ذکر سے بھی کلّی گریز کی راہ تو اختیار نہیں کرتے اور ایسا وہ کر بھی نہیں سکتے تھے، ورنہ ماضی و حال کے تعلقات کے زنجیرے کی کڑیاں پڑھنے والوں کے سامنے سے اچانک غائب ہو جاتیں۔ لیکن ''تاریخ نویسی'' میں جس صفائی اور بے لاگ بیان کی ضرورت ہے، اس سے ان کی کتابیں خالی ہیں، عموماً وہ باتیں بناتے ہیں۔ جس مذہب کی طرف ان کا ملک یا ان کی قوم منسوب ہے۔ چاہتے ہیں کہ کھلے بندوں اس کے پیدا کئے ہوئے نتائج لوگوں کے سامنے نہ آئیں۔

شائد اسی لیے ممکن ہے کہ جس نظریہ کو اس وقت میں پیش کر رہا ہوں، ان لوگوں کو بھی کچھ اجنبی معلوم ہو، جنہوں نے یورپ کی تاریخ کا کافی اور گہرا مطالعہ کیا ہے، کیونکہ عموماً اس راہ میں وہ ان ہی راہوں پر پڑ گئے ہیں جن پر یورپ کے شاطر مؤرخین ان کو چلانا چاہتے ہیں، تاہم شکر ہے کہ سلسلہ وار نہ سہی، پراگندہ منتشر حالات میں یہ سارے

Marfat.com

معلومات یورپ ہی کی عام تاریخوں میں پائے جاتے ہیں، جن میں تسلسل پیدا کرنے کی کوشش قرآنی لفظ ''آثارہم'' کی تشریح وتفسیر کی گئی ہے۔

یورپ کی اس بے دینی کا بنیادی سبب عقیدۂ ولدیت ہے

واقعہ یہ ہے کہ مذہب اور مذہبی عقائد کی یہ ساری کمزوریاں جو یورپ میں پیدا ہوئیں، براہِ راست نہ سائنس کے جدید انکشافات کی رہین منت ہیں اور نہ سیاسی و دستوری تبدیلیوں سے ان کا براہِ راست تعلق ہے، جن سے گذرتے ہوئے یورپ کی تاریخ موجودہ دور تک پہنچی ہے۔ بلکہ مذہب کی ساری کمزوریاں خود اُس مذہب اور مذہب کی تاریخ سے پیدا ہوتی ہیں جس کی طرف اپنے آپ کو اور اپنی دینی زندگی کو یورپ کے یہ باشندے منسوب کرتے رہے ہیں یا اس وقت تک کر رہے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ وہی ''عقیدۂ ولدیت'' جس کی بدولت سمجھایا جاتا تھا کہ مخلوق کے پیکر میں خالق ہمارے سامنے آ گیا، اسی کے ساتھ غیر معمولی شغف اور انہماک واستغراق نے یورپ کو کلیسائے روم اور کلیسائے روم کے پاپاؤں کا غلام بنایا، پھر کلیسا کے نمائندوں کی حد سے گذری ہوئی چیرہ دستیوں نے عوام کے قلب میں ردعمل کی کیفیت پیدا کی، جو ترقی کرتے ہوئے شروع شروع میں تو پروٹسٹنٹ فرقہ کے قالب میں نمایاں ہوئی اور جب ردعمل کی اس نہ رکنے والی تحریک کا مقابلہ آگ اور تلوار کی دھار سے کلیسا اور کلیسا کے رحم وکرم پر جینے والے حکمرانوں نے کرنا چاہا، تو یہی پروٹسٹنٹی تحریک جس کے بانی لوتھر کی کرخت ترین تنقید یہ تھی جیسا کہ جانسن نے اس کے رسالہ ''اسیریٔ بابل'' نامی کے حوالہ سے نقل کیا ہے، کہ

> ''اس نے (مارٹن لوتھر نے) نہ صرف پوپ کے اقتدار سے انکار کر دیا، بلکہ مقدس ادارۂ کہانت و سندِ روایات پر اور ازمنہ وسطی کے اصول استحالہ[1] وتبدیل لحم پر حملہ کرنے لگا۔''
>
> (یورپ سولھویں صدی میں ص ۱۹۹)

[اور] جیسا کہ جانسن ہی نے لکھا ہے کہ

> ''اس نے (لوتھر نے) گونہایت بے پروائی کے ساتھ کلیسا کے روایات کو ترک کر دیا۔''

مگر اسی کے ساتھ

> ''اس کو کامل اور پختہ یقین تھا کہ حصولِ نجات اور تنظیم کلیسا کے لیے جو کچھ درکار ہے وہ انجیل ہی میں مل سکتا ہے۔'' (یورپ سولہویں صدی میں۔ص ۲۰۰)

بہرحال آخر وقت تک لوتھر خود بھی عیسائی ہی رہا اور اس کے ماننے والے عیسائی بھی انجیل ہی کو ذریعہ نجات

Marfat.com

یقین کرانے والے تھے۔

لیکن ان پروٹسٹنٹ اور احتجاج کرنے والوں کا پیچھا کلیسا کے حامی عیسائیوں یعنی رومن کیتھولک فرقہ کی طرف سے حد سے گذرے ہوئے بہیمانہ تشدد کے ساتھ کیا گیا جس کا ایک ہلکا سا نقشہ آپ کے سامنے گذر چکا۔ خود سوچیئے کہ اس کا منطقی نتیجہ اس کے سوا اور بھی کچھ ہو سکتا تھا جو ہوا۔

میں دوسروں کے متعلق کیا کہوں، خود اپنے متعلق سوچتا ہوں کہ مذہب کے نام سے میرے سامنے بھی وحشت و بربریت کے وہی مہیب دردناک مناظر اگر پیش ہوتے، جو کلیسا اور عیسائیت کے نام سے یورپ میں صدہا سال تک پیش آتے رہے، تو ایسے مذہب کے مقابلہ میں لادینیت اور دین کے مقابلہ میں لادینیت کے قبول کر لینے پر اپنے آپ کو مجبور اور شاید بے بس پاتا۔

پس سچی بات یہی ہے کہ یورپ کی موجودہ لامذہبیت یا بے دینی خود اُس مذہب اور دین کی پیداوار ہے [۲۸] جسے یورپ نے قبول کیا تھا اور یہ مذہب یا دین کیا تھا، وہی ''نظریۂ ولدیت'' تھا جس کی تعبیر قرآن میں

فالوا اتخذ الله ولدا

انہوں نے کہا کہ خدا نے (مسیح) کو بیٹا بنایا۔

آمدم برسرِ مطلب

اور آپ آیئے قرآن میں ''آثارہم'' کا لفظ جو فرمایا گیا ہے اس کا کیا مطلب ہے، اس پر غور کیجئے۔

جیسا کہ ظاہر ہے ''آثار'' اثر کی جمع ہے۔ ''منتہی الارب'' میں جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے اس لفظ اثر کی تشریح فارسی کے ان لفظوں سے کی ہے، یعنی

''بقیہ چیزے، ونشان...... ونشان قدم منہ قطع اللہ اثرہ، یعنی بہ بُرد خدائے نشان قدم اورا۔''

جس کا حاصل یہی ہوا کہ اپنے پیچھے کوئی چیز جن نشانوں کی چھوڑ جائے اُن ہی کو اس چیز کا اثر عربی میں کہتے ہیں۔

یہ تو ''آثار'' کے لفظ کی لغوی شرح ہوئی۔ آگے ''ھم'' کی ضمیر، سو ظاہر ہے کہ اس کا مرجع اور اس سے مراد وہی لوگ ہیں جو ''عقیدۂ ولدیت'' کے قائل تھے۔

اس کے بعد اب ان اجمالی تفصیلات کو اپنے سامنے لایئے جن سے گذرتے ہوئے ''عقیدۂ ولدیت'' موجودہ دور تک پہنچا ہے۔

''آثارھم'' کی تفصیلات حال کے پیرایہ میں

جن لوگوں نے شروع شروع میں خالق عالم کے متعلق ولدیت کے اس عقیدہ کو تراشا وہ تو دنیا سے چلے گئے،

Marfat.com

ان کے بعد کلیسا اور کلیسا سے پوپ، پوپ سے پوپ کی ذریت پادری پیدا ہوئے۔ پھر اس نظام کے تحت جن ناگفتہ بہ حالات سے یورپ کے عوام کو گذرنا پڑا، جس سے احتجاجی ذہنیت پیدا ہوئی اور وہی احتجاجیت آگے بڑھتے ہوئے یہی نہیں کہ صرف پوپ اور کلیسا کے اقتدار کی منکر ہو گئی، بلکہ جوں جوں ایک فریق کا تشدد بڑھتا جاتا تھا، فریق مقابل کی سختیاں اور منہ زوریاں بھی اسی نسبت سے ترقی پذیر ہوتی رہیں، تا اینکہ مسیح کے حواری پطرس کے وجود کا بھی انکار کیا گیا، آخر میں مسیح کا وجود بھی مشکوک ٹھہرایا گیا اور بالآخر اس کی انتہا العیاذ باللہ اس شک پر ہوئی جس کے بعد انسان کے لیے اپنی انسانیت کو باقی رکھنے کے لیے کوئی ٹیک ہی باقی نہیں رہتی۔ یعنی خود مسیح کے باپ کا یا دوسرے لفظوں میں کہئے کہ حضرت حق سبحانہٗ تعالیٰ کے وجود میں شک اندازیوں کی راہیں یورپ مین درست ہونے لگیں اور گو عمومیت کی زبان پر خدا بھی باقی رہا بلکہ خدا کا مسیح بھی، مسیح کی انجیل بھی، لیکن اس طویل و عریض آبادی کے اکابر کے دل میں سچ پوچھئے تو کچھ بھی باقی نہ رہا تھا۔

کمیونسٹ تحریک بھی انہیں آثار میں داخل ہے

دل کی بات دل ہی تک محدود کب تک رہتی، آخر مشرقی یورپ میں شیوعی یا بالشوکی نظام نے سر اٹھایا، جس میں زبانوں سے بھی وہی کہلوایا جاتا ہے اور کہنے پر مجبور کیا جاتا ہے، جسے مغربی یورپ کے باشندے اب تک اپنے دلوں میں چھپائے بیٹھے تھے۔

کمیونزم کے نتیجہ میں انسانیت کی پستی

اور اس کے بعد قدرۃً انسانی نسلوں اور دوسرے حیوانی سلسلوں میں کسی فرق کا باقی رہنا یا رکھنا ناممکن ہو گیا، جیسے ایک مکھی پیدا ہوتی ہے، جان لے کر پیدا ہوتی ہے، احساس لے کر پیدا ہوتی ہے، اور اپنے جیسی ہی چند مکھیوں کو پیدا کر کے ناپید ہو جاتی ہے۔ آدمی کی قدر و قیمت، کوئی وجہ باقی نہ رہی کہ اس سے زیادہ کسی امتیاز خاص کی مستحق قرار دی جائے۔ مکھیوں کی جتنی تعداد بھی مر جائے، مار ڈالی جائے، جیسے یہ کوئی اہم واقعہ نہیں ہے، آج بھی تصور ان لوگوں کے متعلق یہی ہے جو آدمی بن کر دنیا میں پیدا ہوئے ہیں......قرآن کا مسجود ملائکہ ''عقیدۂ ولدیت'' کی چوٹ کھاتے ہوئے آپ دیکھ رہے ہیں کہ ذلت و خواری کسے کتنے تاریک و مہیب خندق میں گر پڑا۔

اور یہ ہے میرے نزدیک قرآنی لفظ ''آثارھم'' کا مطلب جس کے لیے چاہیے تو تھا کہ کئی جلدیں لکھی جائیں، لیکن اس کام کو دوسروں کے لیے چھوڑ[29] کر اپنے ٹوٹے پھوٹے پیش کردہ اشارات پر قناعت کرتے ہوئے میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ جس کی پیغمبرانہ بصیرت کے سامنے ''عقیدۂ ولدیت'' کے ان جاں گداز روح فرسا آثار کا ہر پہلو نمایاں ہو، جس کا کچھ حصہ تو سامنے آچکا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ کیڑوں اور مکوڑوں، مکھیوں اور پتنگوں کی صفوں میں شریک ہونے والے اس انسان پر آئندہ ولدیت کا یہی عقیدہ اور کن آثار کو لانے والا ہے۔ الغرض جو کچھ گذر چکا، یا

گذر رہا ہے اور آئندہ گذرنے والا ہے ان سے آگاہی کے بعد اگر ''انسانیت'' کے سب سے بڑے غم خوار، بہی خواہ پر یہ حال طاری ہو جائے کہ ان ''آثار'' سے بچانے کے لیے وہ اپنا سب کچھ حتیٰ کہ اپنی جان تک کی بازی لگانے کے لیے تیار تھے تو کسی حیثیت سے یہ بات محل تعجب ہو سکتی ہے؟[۳۰]

☆......☆......☆

عقیدۂ ولدیت کے آثار اور دنیا کے لیے ایک مہیب انجام کا خطرہ

۱۔ ہم نے بنایا (اُن ساری چیزوں کو) جو زمین پر ہیں، زمین کے لیے زیب و زینت، تاکہ ہم جانچیں کہ ان میں (انسانوں میں) عملاً سب سے اچھا کون ہے۔

۲۔ اور ہم بنا دینے والے ہیں (اُن ساری چیزوں کو) جو زمین پر ہیں، میدان اُجاڑ۔

الحمدللہ کہ سورۂ کہف کا پہلا عشرہ کہیے یا رکوع کی آخری دو آیتوں پر ہم پہنچ گئے ہیں، [پیشانی کی عبارت میں] ان ہی دو آیتوں کا حاصل اور ترجمہ آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ اصل الفاظ قرآن مجید کے یہ ہیں:

(۱): انا جعلنا ما علی الارض زینة لها، لنبلوهم ایهم احسن عملاً۔

(۲): وانا لجاعلون ما علیها صعیداً جوزا.

پہلی آیت کا مفہوم

ان میں پہلی آیت میں اگرچہ ظاہر تخلیق کائنات کی اسی عام توجیہ کا ذکر ہے جس کا قرآن میں تھوڑے تھوڑے وقفہ سے مختلف الفاظ میں اعادہ کیا گیا ہے، اپنے الفاظ میں جس کا خلاصہ خاکسار نے یہ کر لیا ہے، یعنی:

''یہاں جو کچھ ہے سب انسان کے لیے اور انسان اُس کے لیے ہے جس کا سب کچھ ہے۔''

لیکن تخلیق کائنات کی اس عام توجیہ کی تعبیر جن خاص الفاظ میں یہاں کی گئی ہے اور جو موقع و محل پر ہم اس کو پاتے ہیں، ان دونوں باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے سوچیے۔

''ما علی الارض'' میں انسانی وجود بھی داخل ہے

ظاہر ہے کہ ماعلی الارض یعنی وہ ساری چیزیں جو زمین پر پائی جاتی ہیں، جن سے مٹی اور کیچڑ کے اس

Marfat.com

ڈھیر کو جس کا نام زمین ہے، زینت بخشی گئی ہے۔ ان میں جہاں اُونچے اُونچے پہاڑ، سرسبز وادیوں کے آغوش میں بہنے والی ندیاں، غراٹے بھرنے والے سمندر، لہلہاتے ہوئے پھول، پھلوں سے لدے درخت، ہرے بھرے باغ، گھنے جنگل، کھلے پُر فضا میدان، یہ اور اسی قسم کی بے شمار چیزیں ہیں، ان ہی میں یقیناً گرد و غبار کے اس تودہ کی آرائش و زیبائش کی ضمانت خود انسانی وجود میں بھی مستور ہے۔ وہ خود بھی زمین کی زینت ہے اور اس کے اندر قدرتی سلیقہ اس بات کا جو رکھا گیا ہے کہ معمولی چیزوں کو اپنی ذہانت اور صنعتی چابک دستیوں کی مدد سے حسن و جمال کے بہترین دل آویز سانچوں میں ڈھال کر رکھ دیتا ہے۔ بلاشبہ زمین کی سجاوٹ و بناوٹ وحسن و رعنائی کو انسان کے اس فطری سلیقہ سے غیر معمولی فروغ حاصل ہوا ہے اور ہوتا چلا جا رہا ہے، ہمیں یہ ماننا چاہیے "کما علی الارض" یا پشت زمین کی دوسری چیزوں کے ساتھ خود انسانی وجود کے اس پہلو نے جنت سے نکالے ہوئے یا جنت کے وارث انسان کے رہنے بسنے کے قابل زمین کے اس کُرّے کو بنا دیا، گویا یوں سمجھیے کہ گونہ اشک شوئی کی ایک صورت عارضی مستقر کی اس شکل میں اس آدمی کے لیے نکل آئی، جو بہشت بریں کا باشندہ اور متوطن تھا۔

کچھ بھی ہو 'ما علی الارض' یعنی زمین پر جو کچھ ہے اس کے جھمیلے میں شریک ہو کر آدمی کا وجود بھی زمین کی حسن افزائیوں اور جمال آرائیوں میں کافی حصہ لے رہا ہے، مگر اپنے اس سلیقہ سے جیسا کہ قرآن توجہ دلا رہا ہے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کس چیز کے حسن و جمال میں وہ اضافہ کر رہا ہے، ظاہر ہے کہ وہ خود انسان نہیں بلکہ خاک اور دھول کا یہی مجموعہ زمین ہے۔ [جس کے حسن و جمال میں وہ اضافہ کر رہا ہے] اِنَّا جعلنا علیٰ الارض زینۃً لھا کے الفاظ کا۔

اسی لیے آگے فرمایا گیا ہے کہ محاسن و کمالات کے جو لامحدود ذخیرے زمین میں نہیں بلکہ خود انسانی فطرت کے اندر دبے ہوئے ہیں، ان کو بروئے کار لانے کی تدبیر یہ ہے کہ (الانسان) لامحدود کمالات والے خالق کائنات سے ربط پیدا کرے اور اپنے اعمال کے حسن و قبح، بھلائی برائی کا واحد معیار اسی کی مرضی مبارک کو ٹھہرا لے، اور یہی مطلب ہے لنبلوھم انھم احسن عملا کا، یعنی (تاکہ جانچیں (نمایاں کریں) ہم اس بات کو کہ ان میں (انسانوں) میں عملاً سب سے اچھا کون ہے)۔

ایک خاص اشارہ

بلکہ اگر غور کیا جائے تو مجموعی طور پر آیت کے ان دونوں ٹکڑوں سے ادھر بھی گویا اشارہ مل سکتا ہے کہ الانسان کی طرف منسوب ہو کر اور اس کے لیے وقتی مستقر یا قیام گاہ بننے کی نسبت نے جب زمین کو حسن و جمال سے مالا مال کر دیا اور اس کی بہت سی پوشیدہ صلاحیتیں انسانی وجود کے ساتھ مربوط ہو کر منصۂ شہود و ظہور پر جلوہ گر ہو رہی ہیں، تو اسی سے اندازہ کرنا چاہیے کہ خالق کائنات کے ساتھ وابستگی اور ربط، انسانی وجود کے کن مخفی ذخیروں کو باہر لا سکتا ہے۔

Marfat.com

آیت کا قابلِ غور پہلو

(خیر) اب آیئے اور اس پر غور کیجئے کہ انسانی وجود کے ان دو پہلوؤں یعنی ایک پہلو تو وہ ہے جس سے زمین کے حسن و جمال کے اضافہ اور فروغ میں مدد مل رہی ہے اور دوسرا پہلو جس کے ساتھ خود انسانی وجود کے باطنی محاسن اور معنوی کمالات کے ظہور و بروز کا مسئلہ وابستہ ہے، ان دونوں پہلوؤں کا تذکرہ عقیدۂ ولدیت کے چھوڑے ہوئے آثار کے بعد کیوں کیا گیا ہے۔

عقیدہ ولدیت کے آثار نے ایک پہلو کو دبا کر دوسرے پہلو کو اُبھار دیا ہے

عرض کر چکا ہوں کہ دین سے بے دینی کی پیدائش کا جو حادثہ عیسائی ممالک اور کلیسائی علاقوں میں پیش آیا ہے، کش مکش اور تصادم کے اس قصے میں بڑھتے ہوئے لوگوں کا جذبۂ ضد و عداوت، بغض و نفرت، صرف خدا انکار ذہنیت ہی تک پہنچ کر نہیں ٹھہرا، بلکہ مذہب اور دین کے نام سے لامذہبیت اور بے دینی کی فرعونی حرکتوں اور طاغوتی شرارتوں کی جو جہنم عوام پر بھڑکائی گئی، اس نے لوگوں کو یہ واقعہ ہے کہ بالآخر "خدا بے زاری" کے حدود تک دھکیل کر پہنچا دیا۔ پھر نتیجہ کیا ہوا؟ وہ آپ کے اور ہمارے سب کے سامنے ہے، انسانی وجود کا خدائی پہلو مفلوج و مردہ ہو کر رہ گیا، لے دے کر جو چیز باقی رہ گئی ہے، وہ اب صرف یہی ہے کہ اسی مٹی اور کیچڑ کے تودے کے ساتھ انسانیت لپٹ پڑی ہے اور اس کے سوا اور کوئی دوسرا کام آدمی کا نہیں رہ گیا ہے کہ زمین کی گری پڑی چیزوں کو اٹھا اٹھا کر ان کے حسن میں حسن کا، قیمت میں قیمت کا اضافہ کرتا چلا جائے۔ لامحدود توانائیوں کا جو گراں قدر بیش قیمت ذخیرہ اس کی فطرت میں قدرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے، اس کے استعمال کا اول بھی یہی ہے اور آخر بھی یہی ہے۔ انجام یہ ہے کہ زمینی رعنائیوں کے بڑھانے میں خواہ اڈیسن ہی بن کر کوئی کیوں نہ مرتا ہو لیکن انسانی محاسن و کمال کے لحاظ سے ایک نومولود بچہ کی جو حالت ہوتی ہے وہی حال اس بڈھے کا اس وقت بھی ہوتا ہے جب زندگی کے تمام مرحلوں کو طے کر کے زمین سے وہ رخصت ہوتا ہے۔ گویا اس لحاظ سے اسی حال میں وہ مرتا ہے جس حال میں پیدا ہوا تھا۔ خواہ زمینی حسن و زیبائش اور سج دھج میں کسی قسم کے غیر معمولی کارنامے اس سے کیوں نہ ظاہر ہوئے ہوں۔

مٹی چمک رہی ہے انسان بجھ رہا ہے

عقیدۂ ولدیت کے آثار نے دنیا میں جس حشر کو آج برپا رکھا ہے وہ یہی ہے مٹی بڑھ رہی ہے، بڑھتی چلی جا رہی ہے، چمک رہی ہے، چمکتی چلی جا رہی ہے، اس کے حسن و جمال میں اضافہ پر اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، مگر انسان گر رہا ہے گرتا چلا جا رہا ہے، بجھ رہا ہے بجھتا چلا جا رہا ہے اور میں نے شاید غلط کہا کہ جس حال میں پیدا ہوا تھا اسی حال میں مرتا ہے، بلکہ صحیح یہ ہے کہ پیدائش کے وقت کم از کم معصوم حیوان، یا غیر مضر جانور تو وہ رہتا ہے لیکن اس "خدا بے زار تمدن"

Marfat.com

کے زیر اثر زندگی بسر کرنے والوں میں خدا ہی جانتا ہے کہ کتنے مرنے والے مرنے کے وقت شیطان کی بھی ناک کاٹ کر مرتے ہیں، آج ان ہی شیطانی انسانوں نے اسی ''جنّت نما'' زمین کو اذیت رسانی میں قریب قریب جہنم کے حدود تک پہنچا دیا۔

اس صورت حال کا مہیب انجام

لیکن یہ تو وہ ہے جو ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے، مگر آئندہ یہی صورت حال کس مہیب، ڈراؤنے انجام کو آدمی کے سامنے لانے والی ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے مذکورۂ بالا دو آیتوں میں سے آخری آیت میں شاید اسی کا جواب تلاش کرنے والوں کو مل سکتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ خالق کائنات سے قطعی بے تعلق و بے گانہ ہو کر اپنی خدا بے زار زندگی کے ساتھ جو راضی اور مطمئن ہو چکے ہیں، ان کے اس اطمینان کا نتیجہ یہ ہوا کہ توانائیوں کا وہ سارا سرمایہ صلاحیتوں کا سارا ذخیرہ جو انسانی وجود میں بھرا گیا تھا، خالق تعالیٰ سے ٹوٹ کر کلیۃً زمین ہی کے بناؤ سنگار کی طرف اس کا رُخ مڑ گیا۔ ایک طرف اس یکسوئی یک رُخا پن کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ ارضی بناؤ سنگار آرائش و زیبائش کے نت نئے سامانوں سے دنیا جیسے اس عہد میں بھری اور بھرتی چلی جا رہی ہے، انسانیت کی تاریخ میں کم از کم تاریخ معلوم میں اس کی قطعاً کوئی نظیر نہیں ہے۔ ہر نیا دن نئے انکشافات جدید مصنوعات و ایجادات کو اپنے جلو میں لا رہا ہے، ابھی ایک تماشا ختم بھی نہیں ہو پاتا کہ دوسرا نظارہ دعوتِ نظر دینے لگتا ہے۔

اس سلسلہ میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے ہم بھی دیکھ رہے ہیں اور آپ بھی دیکھ رہے ہیں لیکن زمین کی زیب و زینت کے قصوں میں ڈوب کر خود اپنے اور اپنے محاسن و جمال کو فراموش قطعاً فراموش کر دینے والا انسان ایجادات و اختراعات کی ان ہی راہوں سے زیب و زینت کے ساز و سامان کے ساتھ ساتھ ہی زمین کی ویرانی و بربادی کے سامانوں کو بھی غیب سے گھسیٹ گھسیٹ کر دائرہ ظہور و جود میں جو لا رہا ہے دنیا کی آنکھوں سے کیا وہ اوجھل ہیں، دیکھئے وہ ایٹم بم کے جہنمی ذرات ہیں اور یہ ہائیڈروجن کے ان دیکھے کرامات ہیں۔ یہ ان آتش بداماں ایجادات و اختراعات کے سوا ہیں، جن کا دنیا اب تک تجربہ کر چکی ہے، دیکھئے ان کو اور پڑھئے قرآن میں:

وَ اِنَّا لجاعلونَ ماعلیهَا صعیداً جوزا

اور ہم بنا دینے والے ہیں (ان ساری چیزوں) کو جو زمین پر ہیں، میدان اُجاڑ

خود سمجھ میں آجائے گا کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے۔

الانسان خالق سے ٹوٹ کر صرف زمین کے ساتھ لپٹ کر رہ گیا اور اپنا سب سے بڑا کمال یہی سمجھ بیٹھا کہ زمین کے زیوروں میں ایک زیور، اور اس کے گلے کا ہار بن کر اسی کے سینے پر لوٹ پوٹ کر ختم ہو جائے (اپنے خیال میں ختم ہو جائے) جو خالق کے لیے تھا ''وہ گردن خر'' کا طوق بن کر بھی رہ جاتا تو کہا جا سکتا تھا کہ ایک زندہ جانور کی

گردن کا تو ہار ہے مگر وہ تو اسی خیال سے مست و مسرور ہے کہ کیچڑ اور مٹی کے لیے زیور بن گیا ہوں۔ انفرادی ہستیوں کا حشر اسے نہیں چونکا سکا تھا کہ نسل کے تسلسل کا بھروسہ اس کے سینے کا مرہم جھوٹا مرہم بنا ہوا تھا، لیکن (خالق کا یہ انتباہ کہ)

''ہم بنا دینے والے ہیں (ان چیزوں کو) جو زمین پر ہیں میدان اُجاڑ۔''

کیا طفل تسلی کے اس مرہم کو مجروح سینوں پر دیر تک باقی رہنے دے گا، پس۔ ع ''چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما'' ان شاء اللہ اسی چیست کا جواب آئندہ صفحات میں آپ کے سامنے قرآنی روشنی میں رکھا جائے گا اور اصحاب کہف کا قصہ اور اس کے نتائج اسی وقت آپ کے سامنے آئیں گے۔ واللہ ولی الامر والتوفیق۔

عقیدۂ ولدیت کے آثار کے پیدا کردہ حالات میں

ایمان اور ایمانی زندگی کی حفاظت کی راہ

قصہ اصحاب کہف

اب آپ کے سامنے ''اصحاب کہف'' کا مشہور قصہ قرآن میں آئے گا، جس کی طرف منسوب ہو کر سورۂ کہف کے نام سے یہ سورہ موسوم ہوئی۔

جہاں تک میرا ناچیز خیال ہے ''اصحاب کہف'' کا یہ قصہ اسی سوال کا جواب ہے، جو پہلے رکوع کے ختم کرنے کے بعد دلوں میں پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن اس پر بحث کرنے سے پہلے ایک بات سن لیجئے۔ اب تک جو کچھ آپ کے سامنے گزرا، یاد ہوگا اس میں ''من لدنہ جنگِ شدید'' کی دھمکی کے ساتھ ساتھ ایک بشارت بھی قرآن نے سنائی تھی، فرمایا گیا تھا کہ

وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصَّالِحَاتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْراً حَسَناً مَاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَداً

اور بشارت دیجئے، ان ایمان لانے والوں کو جو اچھے کام کر رہے ہیں (اس بات کی) کہ ان کے لیے اچھا معاوضہ ہے، ٹھہرے رہیں گے اس میں ہمیشہ ہمیش۔

جو ایمان اور علم صالح کی زندگی گذار رہے ہیں، اس آیت میں ان کو تسلی دی گئی ہے کہ ان کو ڈرنے یا گھبرانے کی ضرورت نہیں، کیونکہ جیسے ولدیت کا عقیدہ اپنے آثار و نتائج کو پیدا کرتا چلا جائے گا تا ایں کہ ''صعید جرز'' (اجاڑ میدان) کے مہیب مستقبل کو زمین پر کھینچ کر وہ لے آئے۔ اسی طرح ایمان و عمل صالح کے نتائج ''اجر حسن'' اور اچھے معاوضہ کی صورت میں بھی مسلسل ان لوگوں کے سامنے بے نقاب ہوتے چلے جائیں گے جنہوں نے عمل صالح پیدا کرنے والی ایمانی زندگی کے بسر کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیا ہے ''ما کثین فیہ ابداً'' (یعنی ڈٹے رہیں گے اسی اجر حسن

Marfat.com

اور اچھے معاوضہ کی نشاط آفرینیوں اور نشاط انگیزیوں میں ہمیشہ ہمیش) اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ مسرت ونشاط کی اس کیفیت میں کسی قسم کا خلل واقع نہ ہوگا، خواہ مع علی الارض (زمین پر جو کچھ ہے) اس کے ساتھ جو صورت حال بھی پیش آجائے۔

مژدہ سنانے کو قرآن نے یہ مژدہ سنا تو دیا ہے اور ماحول کے حالات سے بے تعلق ہو کر پڑھنے والے جب خالص ایمانی احساسات کے تحت قرآن میں اس کو پڑھتے ہیں تو دل میں اطمینان کی خنکی بھی پاتے ہیں اور جو مومن ہے چاہیے کہ اس خنکی کو اپنے اندر پائے اور قرآن کے الفاظ چوں کہ مطلق ہیں یعنی اجر حسن کے ظہور کو موجودہ دنیاوی زندگی یا آخرت کی زندگی کسی ایک کے ساتھ قرآن نے چونکہ محدود ومقید نہیں کیا ہے، اس لیے بظاہر الاولیٰ والآخرۃ دونوں پر اس قرآنی ضمانت اور بشارت کو چاہیے کہ وہ حاوی ہو۔

مگر ایمان کے ساتھ عقل ماحولی تقاضوں کے زیر اثر ہو کر جب سوچتی ہے، تو اجر معاوضہ تو بڑی بات ہے، خود ایمان ہی کے قیام وبقا کی طرف سے مایوسی کی کیفیت دل پر چھا جاتی ہے، عقیدۂ ولدیت کے آثار نے حالات ہی ایسے پیدا کر دیے ہیں کہ ایمان کو دل میں رکھنا گویا انگاروں کو مٹھی میں بند کیے رہنا ہے۔

[پس] جہاں تک خاکسار کا ذاتی تاثر ہے، اصحاب کہف کے قصے کی ابتدا کرتے ہوئے قرآن میں جو یہ سوالی فقرہ ہے، یعنی

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحَابَ الْكَهْفِ وَ الرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ آيَاتِنَا عَجَباO

کیا تم سوچتے ہو کہ اصحاب کہف اور رقیم والے ہماری نشانیوں میں کوئی عجیب (نشانی) تھے۔

[جس] میں مخاطب کو تعجب اور حیرانی کا شکار قرار [دینے پر یہ] سوال پیدا ہوتا ہے کہ تعجب کا اظہار کیا کس نے تھا؟ اس کے جواب میں بیرونی[41] روایتوں سے استفادہ کی ضرورت بہ ظاہر نہیں [ہے] بلکہ پہلے رکوع کو یہی تبشیری ضمانت آدمی کو حیرت اور تعجب میں مبتلا کرنے کے لیے کافی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ عقیدۂ ولدیت کے آثار جن حالات کو دنیا میں کھینچ کر لانے والے تھے (جن میں ہم اس وقت مبتلا ہیں) (ان کے پیش نظر) سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس زمانے میں آدمی اپنے ایمان کی اور ایمانی قوت سے عمل صالح کے حدود کی حفاظت میں کیا کامیاب ہو سکتا ہے؟ اسی سوال کے جواب میں قرآن یہ کہنا چاہتا ہے کہ تم عقیدۂ ولدیت کے آثار ہی کو دیکھ دیکھ کر خفقان میں مبتلا ہوتے چلے جا رہے ہو، باہم ایک دوسرے سے گھبرا گھبرا کر پوچھتے ہو کہ آج ایمان کو کیسے بچا لیا جائے؟...... (حالانکہ) ایمان اس قسم کی آزمائشوں سے گزرتا ہی رہا ہے، کہف والے بیچارے جن حالات سے دوچار ہو گئے تھے اور ان ہی حالات میں ایمان وعمل اور اس کے نتائج کے بچا لینے میں وہ کامیاب ہوئے، کیا تم اس کو کوئی ایسا عجیب وغریب اور شاذ واقعہ خیال کرتے ہو جس کسی اصول وقانون کے تحت نہیں بلکہ محض اتفاق سے پیش آ گیا تھا اور یہ ہی ہے میرے نزدیک اصحاب کہف کے قصہ کا اپنے ماقبل کی آیتوں کے مضمون سے تعلق۔ اب اس کے بعد میں اصحاب کہف کا قصہ اور جن الفاظ میں قرآن نے اس قصہ کو بیان کیا نیز جو نتیجے ان الفاظ سے پیدا ہوتے ہیں، پھر یہ کہ ان نتیجوں سے اس تعجب کا

ازالہ کیسے ہوسکتا ہے جس میں ہم اور آپ (جو ایسے ناسازگار ماحول میں ایمان و عمل صالح کی زندگی کو بچا لینے کو عجیب بات سمجھے ہوئے ہیں) مبتلا ہیں، بہرحال اب میں ان ہی باتوں کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔ شارح الصدور سے دعا ہے کہ دلوں کو کھولے اور جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں دوسروں کی سمجھ میں بھی وہ آ جائے۔ وما توفیقی الا باللہ ان ارید الا الاصلاح مااستطعت.

(۱)

قرآن اٹھا لیجئے' عربی سمجھ میں نہ آتی ہو تو کسی ترجمہ کو پڑھ لیجئے' اصحاب کہف کے قصہ میں سب سے پہلی بات آپ کو یہ نظر آئے گی کہ بجائے ایک کے مجمل و مفصل دو مستقل تعبیروں میں قرآن نے اس قصہ کو بیان کیا ہے۔

''جب پناہ لی جوانوں نے کہف (کھوہ) میں تو کہا انہوں نے اے ہمارے پروردگار! عطا کر اپنے پاس سے ہمیں رحمت اور مہیا فرما ہمارے کام کے متعلق ہمیں سوجھ بوجھ۔ تب تھپک دیا ہم نے ان کے کانوں پر کھوہ میں گنتی کے چند سال' پھر اٹھایا ہم نے ان کو تا کہ ہم یہ جانیں کہ دونوں جتھوں میں سے کس نے احصا کیا اس مدت کا جس میں وہ ٹھہرے (اس غار میں)۔''

یہ قریب قریب ترجمہ ہے ان قرآنی الفاظ کا یعنی ''اِذَا اَوَی الفُتیَةُ اِلَی الکَهفِ فَقَالُو رَبَّنَا مِنَ الَّدُنکَ رَحمَةً وَّ هَیِّئی لَنَامِنْ اَمرِنَا رَشَداً فَضَرَبنَا عَلیٰ اذَا نِهِمْ فِی الْکَهْفِ سِنِیْنَ عَدَداً ؕ ثُمَّ بَعَثنَا هُمْ لِنَعْلَمَ اَیُّ الحِزْبَیْنِ اَحْصیٰ لِمَا لَبِثُوْاَمَداً'' قصہ کی یہ پہلی تعبیر ہے جس کا نام میں نے اجمالی تعبیر رکھا ہے گویا کل چار فقروں یا آیتوں پر یہ تعبیر مشتمل ہے، اس کے بعد یہ فرماتے ہوئے کہ ''میں ان کا قصہ حق کے ساتھ تمہیں سناتا ہوں۔'' قصہ کی تفصیلی تعبیر قرآن میں پائی جاتی ہے جو کافی طویل ہے، عام طور پر چھوٹی تقطیع والے قرآن کے ڈیڑھ صفحہ سے زیادہ جگہ اس نے لی ہے۔

تفصیلی اور اجمالی دو تعبیروں کی مصلحت

جاننے والے جانتے ہیں کہ اختصار پسندی قرآن کی ایک بڑی خصوصیت ہے لیکن اس خاص قصہ کے متعلق یہ طریقہ کہ پہلے اجمالی تعبیر میں قصہ کو ادا کیا گیا اور پھر اجمال کے بعد اسی قصہ کو تفصیلی رنگ عطا کیا گیا، بجائے خود ایک نئی بات ہے۔ اجمالی اور تفصیلی تعبیروں کے مشتملات پر غور کرنے سے پہلے سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک ہی قصہ کو اجمالی اور تفصیلی دو تعبیروں میں ادا کرنے کی آخر کیا مصلحت ہے؟ اس مصلحت کا صحیح علم تو خود قرآن کے نازل کرنے والے ہی کے پاس ہوگا۔ خاکسار کی جو کچھ یافت اس سلسلہ میں ہے، اسے پیش کر دیتا ہے۔

تفصیلی تعبیر کی اس آیت سے یعنی

Marfat.com

اِنَّھُمۡ اِنۡ یَّظۡھَرُوۡا عَلَیۡکُمۡ یَرۡجُمُوۡکُمۡ اَوۡ یُعِیۡدُوۡکُمۡ فِیۡ مِلَّتِھِمۡ

اگر (تمہارے دشمن) تم سے واقف ہو جائیں گے تو تم کو سنگ سار کر دیں گے یا اپنے دین سے تم کو مرتد بنا لیں گے۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ایمانی آزمائش اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ یا جان سے ہاتھ دھولیں، یا اپنے دین سے تعلق قطع کر کے مرتد بن جائیں۔ غالباً ایمانی آزمائش کی شدت کا یہ آخری نقطہ ہو سکتا ہے لیکن اس جز کا اضافہ تفصیلی تعبیر میں کیا گیا ہے، برخلاف اس کے اجمالی تعبیر میں صرف اس کا ذکر ہے کہ پناہ لینے کے لیے کہف والے غار میں چلے گئے تھے، لیکن کس چیز سے پناہ لینے کے لیے انہوں نے ایسا کیا تھا۔ اس کا ذکر اجمالی تعبیر میں نہیں ہے صرف ماسبق کے نحوی سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ایمانی آزمائش ہی کا یہ قصہ تھا۔

میرا خیال یہی ہے کہ دنیا میں جیسے عموماً چیزوں کی دو حدیں ہوتی ہیں ایک ابتدائی اور ایک انتہائی۔ اسی طرح ایمانی آزمائش میں دیکھا جاتا ہے کہ انتہائی حد تو اس کی وہی ہے کہ جان دیجئے یا ارتداد اختیار کیجئے اور ابتدائی حال اس کا اس ماحول سے شروع ہوتا ہے جس میں گمراہی، ضلالت کا تسلط اکثریت پر ہو جاتا ہے۔ جان یا مال کا خطرہ تو پیش نہیں آتا، مرتد ہونے پر خواہ مخواہ مجبور تو کسی کو کوئی نہیں کرتا لیکن ملک کی عام سوسائٹی اور مجلسی ماحول سے کنارہ کشی اختیار کیے بغیر دین و ایمان اور ان کے اقتضاؤں کی تکمیل بہ ظاہر ناممکن یا کم از کم سخت ترین قسم کی دشواریوں کی زنجیروں میں جکڑی نظر آتی ہے، سمجھ میں یہی آتا ہے کہ شاید تفصیلی تعبیر میں ایمانی آزمائش کی آخری حد کے مشکلات پیش نظر ہیں اور اسی کے مقابلہ میں ایمانی آزمائش کی ابتدائی کیفیت کی دشواریوں سے نجات یابی کی طرف اجمالی تعبیر میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اب آیئے اس نکتہ کو سامنے رکھتے ہوئے قصہ کی اجمالی تعبیر کے مشتملات اور جو نتائج ان سے پیدا ہوتے ہیں، ان پر غور کریں۔

اجمالی تعبیر کے مشتملات اور نتائج

ظاہر ہے کہ پہلی بات اس تعبیر میں یہی بیان کی گئی ہے کہ ایمانی آزمائش میں مبتلا ہونے والوں نے اپنے علاقے کی عام سوسائٹی سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا اور اسی فیصلہ کے مطابق وہ ''الکہف'' (کھوہ) میں پناہ لینے کے لیے چلے گئے، یعنی ایسے مقام کا انتخاب بود و باش کے لیے کیا جہاں اُس عہد کی عام بے ایمان، ادھرم سوسائٹی کی گندہ لہروں سے محفوظ رہنے کی ان کی توقع ہو سکتی تھی، واقعہ یہ ہے کہ ایمانی آزمائش کے ان حالات میں علیحدگی اور ''کنارہ کشی'' کی یہ تدبیر بذات خود کوئی اہم بات نہیں ہے بلکہ پہلی بات ان حالات میں دل میں اگر آتی ہے تو یہی آتی ہے کہ

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم نشیں کوئی نہ ہو اور ہمزباں کوئی نہ ہو

مگر اس شاعرانہ خیال کی خوش گواری اسی وقت تک باقی رہتی ہے جب تک کہ خیال صرف خیال ہے لیکن خیالی حدود سے نکل کر عمل کی سرحد میں قدم جس وقت رکھا جاتا ہے اس وقت محسوس ہوتا ہے کہ خیال اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ شاعروں نے اس کو مشہور کر رکھا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ انسان فطرۃً اُنس پسند پیدا ہوا ہے۔ تنہا

Marfat.com

کسی ایسی جگہ زیادہ دن تک وہ ٹھہر نہیں سکتا جہاں انس حاصل کرنے کے لیے اسی کے ہم جنس اور ہم مذاق افراد کا ملنا ناممکن ہو جائے۔ ''آدمی فطرۃً مدنی الطبع ہے'' اس کا بھی یہی مطلب ہے اور اس سے بھی زیادہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ عام سوسائٹی سے کنارہ کشی کے بعد معاشی سہولتوں کے بھی دروازے عموماً بند ہو جاتے ہیں حالانکہ سدرمق ہی کی حد تک سہی جس سے جان کا رشتہ بدن کے ساتھ باقی رہے، کم از کم اس کی ضرورت تو ہر اس شخص کو ہوتی ہے جو فرشتہ نہیں بلکہ آدمی بنا کر دنیا میں پیدا کیا گیا ہے، اور تیسری بات تجربہ کی اس سلسلہ میں وہی ہے جس کا مشاہدہ بداوت کی زندگی رکھنے والوں میں ہمیشہ کیا گیا ہے، قرآن میں بھی بداوت کی اسی زندگی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ذہنی پستی اس حد تک زوال پذیر ہوتے ہوئے پہنچ جاتی ہے کہ

اَجْدَرُ اَلَّا یَعْلَمُوْ حُدُوْدَ مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ

زیادہ مستحق ہو جاتے ہیں (بدوی زندگی رکھنے والے) اس امر کے کہ اللہ کی اتاری ہوئی باتوں کی حدود کو نہ پہچانیں۔

ع ''دہ مردوہ مرد را احمق کند'' مشہور بات ہے،

تہذیب و تمدن کے ماحول سے عزت گزینی اسی لیے ایک طرف اگر اس ماحول کے سمّی اثرات اور زہریلے نتائج سے محفوظ رہنے کی ایک کارگر تدبیر ہے تو دوسری طرف اس قسم کی زندگی قدرتاً دماغ کو کند، عقل کو تاریک بناتی بھی چلی جاتی ہے۔

آپ ان باتوں کو اپنے سامنے رکھ لیجئے اور اب غور کیجئے کہ اصحاب کہف کے قصہ کی اجمالی تعبیر کی آیتوں میں سب سے پہلی بات تو آپ کو یہی نظر آئے گی کہ کہفی زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کرنے والوں کو قرآن بجائے فرد واحد کے ''فتیۃ'' (یعنی نوجوانوں[۲] کی ایک ٹولی) قرار دیتا ہے۔ آپ چاہیں تو اس سے یہ نتیجہ پیدا کر سکتے ہیں کہ ایمانی آزمائشوں کے زمانے میں جب محسوس ہو رہا ہے کہ تہذیب و تمدن کے عام ماحول میں رہ کر ایمان و عمل صالح کی زندگی کے اقتضاؤں کی تکمیل میں کامیابی نہیں ہو سکتی اور نجات کی راہ یہی نظر آتی ہو کہ اس ماحول سے رشتہ منقطع کر کے بود و باش کے لیے کسی ایسی جگہ کا انتخاب کیا جائے جو اس قسم کے خبیث شیطانی ماحول سے دور ہو تو قرآن سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اپنے ہم مذاق ہم مشرب افراد کو آمادہ کیا جائے کہ اس کہفی زندگی میں ساتھ دے کر ایک دوسرے کے لیے باعث انس بھی ثابت ہوں اور ضرورت کے باہم ایک دوسرے کی دست گیری و غمگساری بھی کر سکتے ہوں۔ دوسری بات قصہ کی اسی اجمالی تعبیر سے جو سمجھ میں آتی ہے وہ کہفی زندگی کا فیصلہ کرنے والوں کا یہ نقطۂ نظر ہے کہ انہوں نے اس زندگی میں قدم رکھتے ہوئے ہر طرف سے ٹوٹ کر اپنی پرورش کے حقیقی سرچشمہ کے ساتھ لو لگالی تھی۔ فرمایا گیا ہے کہ فقالو اربّنا (انہوں نے کہا کہ اے ہمارے پروردگار!) جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ ربوبیت اور پرورش کے جو جھوٹے یا مجازی مظاہر ہیں ان سے یک لخت بے تعلق ہو کر اس نئی زندگی کی راہ میں اپنے ''رب صادق'' اور ''سچے پروردگار'' کے دامن کو انہوں نے تھام لیا تھا، وہ عام اسباب کی دنیا سے کنارہ کش ہو رہے تھے، لیکن جو اسباب کا محتاج بنا کر پیدا کیا گیا ہے وہ ان سے الگ ہو کر کیسے جی سکتا ہے اسی لیے آپ دیکھ رہے ہیں کہ انہوں نے مجازی اسباب سے تو علیحدگی اختیار کر لی تھی

Marfat.com

لیکن جو مسبب الاسباب اور اسباب کا پیدا کرنے والا ہے اس کو پوری طاقت کے ساتھ پکڑے ہوئے تھے اور اسی کے ساتھ اپنے احتیاجی تعلقات کو وابستہ کر کے دعا کر رہے تھے۔[کہ]

رَبَّنَا اٰتِنَا مِن لَّدُنکَ رَحْمَةً وَّهَيِّئ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا

اے ہمارے پروردگار! عطا فرما! اپنے پاس سے ہمیں ''رحمت'' اور فراہم فرما! ہمارے معاملہ میں ''رشد''۔

الفاظ دعا کی معنویت

''رشد'' عربی زبان کا لفظ ہے جسے قرآن میں بار بار استعمال کیا گیا ہے۔ خصوصاً غیّ کے مقابلہ میں ''رشد'' نے اسی لفظ کو استعمال کر کے قرآن یہی بتا رہا ہے کہ انسان کی فکری ونظری قوت سے اس کا تعلق ہے۔ یہی فکری ونظری قوت جب غلط نتیجہ تک پہنچتی ہے تو اس کا نام غیّ ہے اور ٹھیک اصل حقیقت تک فکر ونظر کی رسائی کی صلاحیت کا نام ''رشد'' ہے۔ بہرحال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دعا کے دوسرے فقرے کا تعلق چونکہ باطنی احساسات اور معنوی رجحانات سے ہے تو مطلب اس کا یہی ہوا کہ سوسائٹی کے گندے اور خبیث رجحانات کے مقابلہ میں جس ایمانی مسلک کی توفیق ان کو میسر آئی تھی جس کی تعبیر امرنا کے لفظ سے دعا میں کی گئی ہے، اپنے اسی ایمانی مسلک کے متعلق حق تعالیٰ سے وہ آرزو کر رہے تھے کہ غیّ اور گمراہی سے بچاتے ہوئے، ان کی فکر ونظر کی قوتوں میں رشد کی روشنی پیدا کی جائے یعنی ایمانی ترقی اور باطنی سلوک کی راہ میں چاہتے تھے کہ جو قدم بھی اٹھے سچا قدم اٹھے، رشد کی یہی معنوی روشنی ان کو آگے بڑھاتے ہوئے چلی جائے۔

اس تشریح کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کی دعاء کے پہلے فقرے میں ''رحمت'' کا لفظ جو پایا جاتا ہے اس کا مطلب بھی متعین ہو جاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ یوں تو رحمت اور وہ بھی رب السماوات والارض کی رحمت قرآناً ہر چیز میں سمائی ہوئی ہے۔ ''وَسِعَتْ رحمتی کُلَّ شیئٍ '' (ہر شے میں میری رحمت پھیلی ہوئی ہے) قرآن ہی کی آیت ہے، مگر یہاں ''رحمت'' کے اس لفظ کا استعمال جب ''رشد'' کی معنوی و باطنی صفت کے مقابلہ میں کیا گیا ہے تو اس قرینہ سے یہی سمجھنا چاہیے کہ معنوی و باطنی ضرورتوں کے مقابلہ میں ان حاجتوں کے متعلق پروردگار عالم کی رحمت کی استدعا وہ کر رہے تھے جن کی تعبیر ہم ظاہری اور معاشی ضرورتوں سے کر سکتے ہیں، حاصل یہی ہوا کہ ملک کی عام سوسائٹی سے علیحدگی کے بعد قدرتاً جیسا کہ عرض کر چکا ہوں یہی دو باتیں سب سے زیادہ اہم ہوتی ہیں یعنی معاشی ضرورتوں کا مسئلہ اور فکری ونظری قوتوں کے انحطاط و زوال کا خطرہ۔ الغرض ظاہر و باطن کی ان ہی دونوں اہم ضرورتوں میں حق تعالیٰ کی غیبی پشت پناہی کی درخواست پر ان کی یہ دعا کم از کم اس خاکسار کو مشتمل نظر آ رہی ہے۔

قدرت کی طرف سے انتظامات

اس کے بعد میرا خیال ہے کہ ''رشد'' کی درخواست دعا کے دوسرے فقرے میں جو ان کی طرح سے پیش

Marfat.com

ہوئی ہے اگر چہ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی اس آرزو کی تکمیل کے لیے قدرت کی طرف سے کہفی زندگی میں کیا کیا انتظامات کیے گئے تھے۔ مگر بہ ظاہر جہاں یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ایمانیوں کی یہ ٹولی ایک دوسرے کے ساتھ حق [۴۳] اور صبر کی تواصی کے فرض کو ادا کر کے جیسا چاہیے ان کے ''رشد'' کی حفاظت کرتی ہوگی وہیں اس پر کیوں تعجب کیا جائے کہ ایمانی راہ کے دوسرے چلنے والے جوان سے پہلے گذر چکے تھے ان کی تعلیمات اور مشوروں سے بھی مستفید ہونے کا موقع ان کی رتی یادگاروں سے ان کو عزلت اور کنارہ کشی کی زندگی میں مل گیا ہو، بالفاظ دگران کے پاس دوسرے انبیاء علیہم السلام کے صحیفوں میں سے کچھ صحائف و مخطوطات اور ان ہی پیغمبروں کے ماننے والوں کی لکھی ہوئی کچھ کتابیں ہوں جن سے ان کی رشدی بصیرت روشنی حاصل کرتی ہو تو اس کے انکار کی بہ ظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی بلکہ یہ جو ''الکھف'' کے ساتھ ''الرقیم'' کے لفظ کی طرف بھی ان کی اضافت کی گئی ہے، تفسیر کی عام کتابوں میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی طرف جن کے متعلق اگرچہ یہ قول بھی منسوب کیا گیا ہے کہ

لا ادری ما الرَّقیم

میں نہیں جانتا کہ ''الرقیم'' کیا چیز ہے

تو ان تفسیروں میں ان ہی کا یہ قول بھی ملتا ہے۔ ''درمنثور'' میں ابن المنذر را اور ابن ابی حاتم کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ

من طریق علی عن ابن عباس قال الرقیم الکتاب (ص۲۱۱ ج۴)

علی کی روایت ابن عباس سے یہ ہے کہ ''الرقیم'' کتاب ہے۔

علی جن کا پورا نام علی بن ابی طلحہ الہاشمی ہے، فرماتے ہیں کہ ابن عباس کے تفسیری اقوال کی روایت میں ان کا کیا مرتبہ ہے، [۴۴] وہ سمجھ سکتے ہیں کہ الکتاب کے ساتھ الرقیم کی تفسیر میں کتنی قوت ہے۔

بہرحال میری غرض یہی ہے کہ ''الرقیم'' سے کیا مراد ہے؟ اگر اس کا متعین کرنا ضروری ہو، تو لغت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کتاب اور لکھی ہوئی چیز کو ''الرقیم'' کہتے تھے اور صحابہ کے اقوال میں بھی مستند ترین قول یہی ہے کہ الرقیم سے مراد الکتاب ہے۔ ایسی صورت میں کیوں نہ سمجھا جائے کہ ان کی دعاء کے دوسرے فقرے یعنی اپنے امر کے متعلق ''رشد'' کی جس روشنی کے مہیا کرنے کی درخواست انہوں نے بارگاہ الٰہی میں پیش کی تھی اسی درخواست کی منظوری ''الرقیم'' کو مہیا کر کے قدرت کی طرف سے ہوئی تھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ کہفی زندگی کی یہ دونوں اہم ضرورتیں یعنی معاشی سہولتیں ان کے لیے من لدنی طور پر فراہم کی جائیں اور باطنی روشنی کی بقا و ارتقا ان دونوں ضرورتوں کا انتظام اپنے ''رب'' کے سپرد کر کے کہفی زندگی میں وہ داخل ہو گئے۔ اس کے بعد قصہ کی اجمالی تعبیر میں دو فقرے اور پائے جاتے ہیں۔ پہلا فقرہ تو یہ ہے کہ

فَضَرَبْنَا عَلىٰٓ اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا

پس تھپک دیا ہم نے ان کے کانوں پر کہف میں چند سال گنتی کے۔

Marfat.com

بہ ظاہر اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ''رشد'' کی معنوی بصیرت ہی کی حفاظت کا یہ سامان بھی قدرت کی طرف سے ان کے لیے کیا گیا تھا، مطلب یہ ہے کہ فاسد اور بگڑی ہوئی سوسائٹی سے جسمانی طور پر علیحدگی عموماً اس وقت تک چنداں مفید ثابت نہیں ہوتی جب تک کہ سوسائٹی کے فساد اور بگاڑ کے اس عہد کے ذکر واذکار گپ شپ جھوٹ خرافات سے بھی اپنے آپ کو بے تعلق نہ کرلیا جائے۔......اوروں کا خیال کچھ ہی ہو لیکن اپنا تجربہ تو یہی ہے کہ ''رشد'' و ''ہدایت'' کی لاہوتی روشنی سے صحیح طور پر استفادہ ان لوگوں کے لیے مشکل ہو جاتا ہے جنہوں نے ''اسی روشنی'' کے ساتھ ان ظلمات اور تاریکیوں کی موجوں کو بھی اپنے اندر گذرنے کے لیے آزادی دے رکھی ہو، جو فاسد سوسائٹی کے دل و دماغ سے نکل نکل کر ماحول کو متاثر کر رہی ہوں۔

کچھ بھی ہو اپنا ذہن تو مذکورۂ بالا آیت جس میں فرمایا گیا ہے کہ چند سال کے لیے ان کے کانوں کو ہم نے تھپک دیا تھا، یعنی فضربنا علیٰ اذا فھم فی الکھف سینن عددا۔ اس سے ادھر منتقل ہوتا ہے کہ ''رشد کی جو روشنی کی فراہمی کی استدعا بارگاہ ربانی میں ان لوگوں نے پیش کی تھی اسی کے سلسلہ میں اور جو قدرتی تائیدیں ان کو میسر آئی ہوں گی ان ہی کے ساتھ شاید یہ بھی کیا گیا کہ اپنے ملک کی سوسائٹی کے جس متعفن اور سڑے ہوئے ماحول سے نکل کر کہفی زندگی کے نیچے انہوں نے پناہ لی تھی، اس سوسائٹی مین گزرنے والے حوادث و واقعات اور اس میں پیدا ہونے والے گندے افکار و خیالات سے بھی ان کے کانوں کا رشتہ توڑ دیا گیا تھا، اور بجائے اس کے اس کہفی زندگی میں ان کے ''رشد'' کی بقاء اور ارتقا کا جو سامان کیا گیا تھا اسی میں وہ مگن تھے۔

☆......☆......☆

ایمان اور عملِ صالح کے نتائج وثمرات

اجمالی تعبیر کا مفاد

اصحاب کہف کے قصہ کی اجمالی تعبیر سے قرآن کی جن آیتوں کا تعلق ہے ان سے صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ ناموافق حالات پر غالب آنے یا ان سے مقابلہ کرنے کا امکان جب محسوس ہو کہ باقی نہیں رہا ہے تو اس وقت ایمان و عمل صالح کی زندگی کے بچالینے کی تدبیر یہ ہے کہ کہفی زندگی اختیار کرلی جائے اور یہ کہفی زندگی میں معاشی دشواریوں کے ساتھ فکری جمود اور ذہنی خمود کا خطرہ قدرتاً جو پیدا ہوتا ہے، توجہ دلائی گئی ہے کہ حق تعالیٰ سے ان دونوں خطروں سے محفوظ رہنے کی دعا کی جائے اور یہ وہی مشورہ ہے جس کی طرف ان صحیح حدیثوں میں اشارہ کیا گیا ہے جن میں آیا ہے کہ ایک ایسا وقت بھی آنے والا ہے جس میں القاعد (بیٹھنے والا) القائم (کھڑا رہنے والے) سے اور الماشی (معمولی چال چلنے والا) الساعی (دوڑنے والا) سے بہتر ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

Marfat.com

حکم دیا ہے کہ اس زمانہ میں بجائے میدان میں آنے کے چاہیے کہ مومن اپنے گھر کا ٹاٹ بن کر پڑ جائے۔ بخاری کی مشہور روایت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

یوشک ان یکون خیر مال المسلم غنم یتبع بھا شغف الجبال و مواقع القطر یفر بدینہ من الفتن
قریب ہے کہ مسلمان کا بہترین مال بکریاں ہوں گی، جن کے پیچھے پیچھے پہاڑوں کی چوٹیوں، اور پانی کے چشموں کی طرف اپنے دین کو فتنوں سے بچانے کے لیے بھاگا پھرے گا۔

[اس] کا مفاد بھی یہی ہے، پیشین گوئی کی گئی ہے کہ مستقبل میں بھی مسلمانوں کو اس قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑے گا، جیسے مکی زندگی کے دور سے نبوت کبریٰ عامہ جب گذر رہی تھی تو قرآن ہی میں اسی عہد کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔

ان الذین اجرموا کانوا من الذین امنوا یضحکون و اذا مرّوا بھم یتغامزون ، واذا انقلبوا الیٰ اھلھم انقلبوا فکھین ، واذا رأوھم قالوا انّ ھٰؤلاء لضالّون ٥ (المطففین)
جو مجرم ہیں وہ ایمان لانے والوں سے ہنستے ہیں اور جب ان پر گذرتے تو ان کے متعلق باہم ایک دوسرے سے چشمک زنی کرتے ہیں، اور جب واپس لوٹتے ہیں اپنے گھر والوں کی طرف تو باتیں بناتے ہیں، اور جب ایمان والوں کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہی لوگ گم کردہ راہ ہیں۔

صحابۂ کرامؓ کے سامنے اس قسم کے واقعات گذر رہے تھے کہ سنگ وخشت سے بنی ہوئی مسلمانوں کی کوئی عبادت گاہ نہیں، بلکہ اسلام کے سارے احترامی عناصر کا تقدس جس ذاتِ گرامی کے احترام وتقدس کے ساتھ وابستہ ہے، یعنی خود سرور کائنات (صلی اللہ علیہ وسلم) سجدے میں ہیں، پشت مبارک پر اونٹنی کی بچہ دانی ڈال دی گئی ہے، اور صحابۂ کرامؓ جیسے تروتازہ ایمان واسلام رکھنے والے حضرات پیغمبرؐ کو اس حال میں دیکھتے ہیں۔ ابنِ مسعودؓ جیسے جلیل القدر صحابی کا بیان امام بخاری ہی نے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حال کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وانا انظر ولا اغنی عنہ لو کانت لی منعة
میں رسول اللہؐ کو اس حال میں دیکھتا اور کچھ کام نہ آسکتا، کاش! میرے پاس مدافعت کی قوت ہوتی۔

تفصیلی تعبیر کے اشارات

بہر حال قصہ کی اجمالی تعبیر سے صرف اتنی بات معلوم ہوئی کہ اپنی دینی زندگی کو چاہا جائے تو ہر حال میں بچا لیا جاسکتا ہے، لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا اصحاب کہف کی [تفصیلی] سرگذشت کا تعلق جہاں تک میرا خیال ہے اُس بشارت سے ہے جس میں اطمینان دلایا گیا ہے کہ ایمان وعمل صالح کی زندگی کے اجر حسن یا نتائج وثمرات سے اہل ایمان ہر حال میں مستفید ومتمتع ہوتے رہتے ہیں۔

Marfat.com

اصحاب کہف کے قصہ کی تفصیلی تعبیر قرآن کے جس بیان کو میں قرار دے رہا ہوں اگر غور کیا جائے تو نظر آتا ہے کہ اسی دعوے کے ثبوت کی گویا یہ ایک تاریخی مثال ہے، بتایا گیا ہے کہ..........

انهم فتیةٌ امنوا بربهم

(یہ کہف والے) چند نوجوان تھے، ایمان لے آئے تھے وہ اپنے رب پر۔

''اپنے رب پر ایمان لانا'' یہی ان نوجوانوں کا اختیاری فعل تھا، چاہتے تو جیسے ان کی قوم کی اکثریت اپنی اس پرورش کرنے والی قوت سے لاپروائی اور بے اعتنائی کا طریقہ اختیار کئے ہوئے زندگی گذار رہی تھی، وہ بھی اسی طریقہ کو اختیار کر لیتے، لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا اور اپنے رب کی یافت کا جو قدرتی طریقہ ایمان کا ہے اس کا رشتہ ''رب'' سے قائم کر کے مومن بن گئے، یہاں تک تو ان کا کام تھا جسے ان نوجوانوں نے انجام دیا، اب سنئے اسی ایمان کا اجر حسن ان کے سامنے کن کن مشکلوں میں مسلسل آتا چلا گیا، اس کے بعد اطلاع دی گئی ہے:

وَزِدْنا هُمْ هُدَىٰ

اور ہم نے ہدیٰ یعنی (راست بینی اور حق یابی) میں ان کو بڑھا دیا۔

باطنی نعمت

سمجھا آپ نے، یہ کیا کہا گیا؟ نوجوانوں نے اپنے رب پر ایمان لانے کے فرض کو پورا کیا تھا، تب اس کا معاوضہ اور اجر حسن ان کو ان کے رب کی طرف سے ایک معنوی دولت، اور باطنی نعمت کی شکل میں عطا کیا گیا، یعنی باہر میں تو بہ ظاہر کسی قسم کی کوئی ایسی چیز ان نوجوانوں کے سامنے نہیں آئی، جسے دیکھنے والے ان کے ایمان کا اجر و معاوضہ قرار دیتے، لیکن اندر ہی اندر ان کی بصیرت کی روشنی میں قدرت کی طرف سے اضافہ شروع ہوا، ایمان سے پہلے جن باتوں کا تصور بھی ان کے لیے دشوار بلکہ شاید ناممکن تھا اب ان ہی کو وہ پا رہے تھے اور قدرت کی پیدا کی ہوئی اس معنوی روشنی میں ان ہی چیزوں کو وہ دیکھ رہے تھے، تا اینکہ باطنی سلوک کی اس راہ میں چلتے ہوئے وہ ایک ایسے مقام تک پہنچ گئے، جس کی خبر قرآن نے اسی کے بعد ان الفاظ میں دی ہے:

وربطنا علیٰ قلوبهم

اور باندھ دیا ہم نے ان کے قلوب یعنی دلوں پر۔

''قلوب'' قلب کی جمع ہے، یہ وجود انسانی کے اس عنصر کی تعبیر ہے، جس کا کام ہی انقلاب یا یہ کہ الٹتا پلٹتا رہے یہی ہے۔ لامحدود اسباب کا یہ گھنا جنگل جس کا نام عالم یا دنیا ہے، اس عالم کے رب سے جب تک انسانی وجود کا یہ چنچل حصہ بیگانہ اور نامانوس رہتا ہے، اس وقت تک [برابر] ایک سبب سے منتقل ہو کر دوسرے سبب اور دوسرے سے تیسرے سبب کی وادی میں سراسیمہ ہو کر بھٹکتا [رہتا] ہے،......

لیکن ایمان کی راہ سے، اپنی پرورش کرنے والی قوت کو جو پالیتے ہیں اور اس ایمان کے معاوضہ میں معنوی بصیرت کی جو روشنی ان کو رب کی طرف سے ارزانی ہوتی ہے اس باطنی روشنی کی شدت جس حد تک بڑھتی جاتی ہے اسی حد تک ان کے آگے اصل حقیقت اور ''ربوبیت'' کا صادق نظارہ بے نقاب ہونے لگتا ہے تا اینکہ وہی ''قلب مضطرب'' یا انسانی وجود کا ''بے چین عنصر'' سکون وقرار کے ایک ایسے خنک برف خانے میں اپنے آپ کو پاتا ہے جس کی صحیح تعبیر یہی ہوسکتی ہے کہ ہر طرف سے توڑ کر اسی قلب کو ''ربوبیت'' کے حقیقی سرچشمہ کے ساتھ گویا باندھ دیا گیا ہے۔

طمانیت وسکون کی اسی کیفیت کو لوگ روپے کے ڈھیروں، بینک کے پاس بکوں اور سرمایہ کی دوسری منقولہ و غیر منقولہ جائدادوں کے اندر ڈھونڈتے ہیں، مگر ان چیزوں کے پالینے کے بعد بھی وہ ڈھونڈتے ہی رہتے ہیں، لیکن قلب کے مربوط ہو جانے کی مذکورۂ بالا باطنی نعمت سے جو سرفراز کیا جاتا ہے اس کے پاس باہر میں خواہ کچھ ہو یا نہ ہو لیکن اپنے باطن کی ہر چیز سے کسا کسایا پاتا ہے۔ دماغ نام رکھئے یا دل، عقل کہیے یا دانش، ڈانواڈول رہنے کی لعنت سے اس کو نجات مل جاتی، اور اسی کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ایسے اقدامات کی جرأت اس میں پیدا ہو جاتی ہے جن کو غیر مربوط قلب والے شاید سوچ بھی نہیں سکتے۔ خود ان ہی ''فِتیۃ'' یعنی نوجوانوں کے متعلق [یہ خبر دے کر] کہ

اِذْ قَامُوا فَقَالُوا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا۟ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا۔

(اور دیکھو) جب وہ کھڑے ہوئے، پھر بولے، ہمارا پالنے والا آسمانوں اور زمین کا پالنے والا ہے، ہرگز نہیں اس کے سوا ہم کسی الٰہ کو پکاریں گے اگر ایسی بات ہم نے کہی تو (حقیقت سے) یہ ہٹی ہوئی بات ہوگی۔

هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَيِّنٍ۝

اس ہماری قوم نے (خالق عالم) کے سوا دوسروں کو اپنا معبود ٹھہرا لیا ہے کیوں نہیں لاتی (اپنے اس دعویٰ) پر کوئی ایسی کھلی ہوئی دلیل جو عقل پر چھا جائے۔

رآن نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا:

وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا۝

اور جب تم لوگ (اے نوجوانو) کنارہ کش ہو گئے ان سے (یعنی اپنی قوم سے) اور ان چیزوں سے جنہیں اللہ (خالق عالم) کے سوا وہ پوجتے ہیں، تو آؤ پناہ لو، کہف (کھوہ) میں، کھول دے گا تمہارے لیے تمہارا پروردگار، اپنی رحمت کو اور مہیا کرے گا تمہارے معاملہ میں سہولتیں۔

جس سے معلوم ہوا کہ اپنی پوری قوم جن میں ان کے اعزہ و رشتہ دار بھی ہوں گے، وہ بھی ہوں گے، جن سے معاشی ضرورتوں کے حل میں ان کو امداد ملتی ہوگی، دوست ہوں گے، احباب ہوں گے، مگر ایمان کی بدولت اسی کا اجر و معاوضہ ان کو اس بلند ہمتی کی شکل میں ملا کہ اپنی تمام ضرورتوں اور دلچسپیوں کے ساز وسامان کو ٹھکرا کر اٹھ کھڑے ہوئے ان کو بھی چھوڑا، اور جن مفروضہ معبودوں کے ساتھ ان کی قوم بلاوجہ الجھی ہوئی تھی ان سے بھی قطعی بے تعلق ہو کر اب ان میں اس

Marfat.com

کی صلاحیت بھی پیدا ہو گئی کہ آبادی کو چھوڑ کر پہاڑ کے کھوہ میں بھی اپنے پالنے والے رب کی پروردگاری کا تماشا دیکھیں، ان کی اسی صلاحیت کو دیکھ کر ایک نے دوسرے کے آگے ''الکھف'' (کھوہ) کی تجویز پیش کی، اور کتنی قوت کتنی طاقت کے ساتھ پیش کی، بغیر کسی جھجک اور تذبذب کے باہم ایک دوسرے کو یقین دلا رہے تھے کہ آبادیوں میں پالنے والے رب کی پروردگاری اور اس کی مہربانیوں کا تجربہ ضرور ضرور وہاں بھی ہم لوگوں کو کرایا جائے گا جہاں عالم اسباب کے چکروں میں پھڑپھڑانے والی عقل ان کا تصور بھی نہیں کر سکتی، گویا وہ کہہ رہے تھے جہاں کچھ نظر نہیں آرہا ہے، وہیں سب کچھ تمہیں میسر آئے گا۔

قصہ کی اجمالی تعبیر میں تو ان کی دعا کا تذکرہ کیا گیا تھا، لیکن یہاں ان کے ایمان کے بعد اس یقین واعتماد کی قرآن خبر دے رہا ہے جس سے اپنے رب پر ایمان لانے کے بعد وہ سرفراز ہوئے تھے۔ سچ پوچھئے تو یہ بھی ایمان ہی کے اجر حسن اور اچھے معاوضہ کا ایک قالب تھا، جو دوسرے معاوضوں کے ساتھ ساتھ قدرت کی طرف سے ان کو عطا ہوا تھا۔ ایمان سے محروم بدبخت بے ایمان شک کے روگی غریب کو اس یقین اس اذعان واطمینان کی ہوا بھی چھو سکتی ہے؟ اور جیسے قصہ کی اجمالی تعبیر میں ان کی دعاء دو جزء پر مشتمل تھی، ایک کا تعلق جیسا کہ خاکسار نے عرض کیا تھا، بہ ظاہر معاشی سہولتوں سے معلوم ہوتا ہے اور دوسرے اجزاء میں استدعا کی گئی تھی کہ رشد یا فکری و ذہنی سوجھ بوجھ کی حفاظت کی جائے۔ اسی طرح قصہ کی تفصیلی تعبیر میں بھی بجائے ایک کے دو چیزوں کی فراہمی کا یقین باہم ایک دوسرے کو دلا رہے ہیں، کوئی وجہ نہیں کہ یہاں بھی ان دونوں اجزاء سے وہی دو باتیں مراد نہ لوں جن کی آرزو اپنی دعا میں انہوں نے کی تھی۔

بہر حال اس وقت تک تو اصحاب کہف کے ایمان کا اجر وصلہ ان کے اندر پیدا ہو کر ان کی تقویت وحفاظت کا ذریعہ بنتا رہا اور اسی کی پشت پناہی میں ایک ایسی جگہ کو چھوڑ کر جو ان کا وطن مالوف تھا، اور جیسا کہ قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ المدینہ یا ایسا شہر تھا جس کے بازاروں میں ''اَذْکٰی طَعَامًا'' (صاف ستھرا کھانا) خریداروں کو مل جاتا تھا اور بیان کرنے والوں کا یہ بیان اگر صحیح ہے کہ یہ ایشاء کوچک کی قدیم حکومت ایونیا کا مشہور پایۂ تخت افسیس [۳۵] تھا، تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ وہاں وہ سب کچھ مل رہا تھا جس کا آدمی اپنی موجودہ زمینی زندگی میں محتاج ہے۔

لیکن سب کچھ چھوڑ کر جہاں کچھ نہ تھا وہیں جانے کے لیے اس یقین کے ساتھ آمادہ ہو گئے کہ سب کچھ وہیں مل جائے گا، وہ بھی جس کے بغیر جسدی نظام قائم نہیں رہ سکتا اور وہ بھی جس کے بغیر آدمی کی روحانی زندگی موت بن جاتی ہے۔

خارجی انعامات

ان کے ایمان نے اس یقین کو تو ان کے اندر پیدا کیا تھا، اور اب ان سے باہر دیکھئے قرآن دکھا رہا ہے:

وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَزَاوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَاِذَا غَرَبَتْ تَقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِى فَجْوَةٍ مِّنْهُ ۝ (الکہف)

اور دیکھتا ہے تو آفتاب کو جب طلوع ہوتا ہے تو کترا کر گزرتا ہے ان کے کہف سے داہنی طرف، اور جب غروب ہوتا ہے تو کاٹتا ہے بائیں طرف، اور وہ لوگ (مقیم ہیں) اسی کہف کے فجوۃ میں۔

Marfat.com

سائنٹفک آرام گاہ

دیکھ رہے ہیں آپ ایمان کے اجرِ حسن کو، جس کوہستانی ٹاپو میں سر چھپانے کا سوال بھی بڑا اہم سوال تھا، وہیں پہنچنے کے بعد قرآن کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بہترین صحت بخش سائنٹفک آرام گاہ ان نوجوانوں کو مل گئی۔

سرسری طور پر اگرچہ قرآن کے مذکورہ بالا بیان کا خلاصہ یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ایک غار میں وہ چلے گئے تھے، جس میں دُھوپ کی گزر نہ تھی [لیکن اس بارے میں زیادہ نہیں] اتنا تو بہرحال لوگوں کو سمجھنا چاہیے تھا کہ کہف بھی عربی ہی زبان کا لفظ ہے اور غار بھی، قرآن نے بجائے غار کے کہف کا لفظ یہاں استعمال کیوں کیا؟

واقعہ یہ ہے کہ کہف کا تعلق بھی اس میں شک نہیں کہ عموماً پہاڑوں ہی سے ہوتا ہے جیسے غار کا لیکن اپنی حقیقت کے لحاظ سے یہ دونوں مختلف چیزیں ہیں۔ حراء یا ثور کے تاریخی غار بلاشبہ غار تھے جن میں بہ مشکل چند آدمیوں کے لیے گنجائش پیدا ہوتی ہے، اسی لیے ثور کے غار کو قرآن نے بھی غار ہی کے نام سے موسوم کیا ہے لیکن ان ہی پہاڑوں کے شکم میں خاص قسم کا خلاء قدرتی عوامل کے تحت پیدا ہو جاتا ہے جس کی وسعت کبھی میلوں کی ہوتی ہے، جنوبی ہند میں ''وجیانگر'' کی راجہ دہانی جن پہاڑوں کے درمیان تھی ان میں [۳۶] بیان کیا گیا ہے کہ ایسے قدرتی طویل تہہ خانے پائے جاتے تھے جن میں ہزار ہزار آدمی غائب ہو جاتے تھے اور مہینوں اُن ہی میں رہتے کھاتے پیتے تھے۔ اس قسم کے کہوف دنیا کے دوسرے پہاڑوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ عربی زبان میں کہف دراصل ان ہی زیرِ زمین طویل وعریض تہ خانوں کو کہتے ہیں۔

قرآن نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اسی کہف میں فجوہ تھا جسے اُن نوجوانوں نے اپنا مسکن بنایا تھا۔ فجوہ کے لغوی معانی کو پیشِ نظر رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ باضابطہ وسیع ہال، یا دالان ہی اُن کو اپنے قیام کے لیے اس جبلی تہ خانے میں مل گیا تھا۔

اس قسم کے زیرِ زمین تہہ خانوں میں سب سے بڑی مصیبت تاریکی، رطوبت، ٹھنڈک اور ان کی وجہ سے پیدا ہونے والی کثافت اور جراثیم کی ہوتی ہے، یہ ان کی ایمان ہی کے اجرِ حسن کا نتیجہ تھا کہ ان سارے مضرت بخش خطرات کے ازالہ کی ضمانت جس چیز میں پوشیدہ ہے، یعنی آفتاب کا آتشیں کرہ، اس کے متعلق قرآن کا بیان ہے کہ ایک خاص قسم کا تعلق قدرتی طور پر اس کو اس کہف سے پیدا ہو گیا تھا۔ طلوع وغروب کے وقت آفتاب اور اس کی شعاعوں کی دو مختلف نسبتیں جیسا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے روزانہ قائم ہوتی تھیں۔ طلوع کے وقت بیان کیا گیا ہے کہ خود کہف کے ساتھ تزاور کی نسبت پیدا ہوتی تھی یعنی اس کہف سے آفتاب کترا جاتا تھا، لیکن چونکہ عن کے ساتھ تزاور کی اس نسبت کو قرآن نے ظاہر کیا ہے اس سے عربی محاورے کے رو سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ تعلق پیدا ہونے کے بعد آفتاب اور اس کی دُھوپ اس کہف سے گزر جاتی تھی۔ میرا خیال یہی ہے کہ جس وقت آفتاب طلوع ہوتا تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہف کے دہانے پر اس کی شعاعیں پڑ کر گزر جاتی تھیں، حاصل یہی ہے کہ دیر تک دھوپ ان کے کہف میں نہیں ٹھہرتی تھی،

Marfat.com

بلکہ رات کی تاریکی کی وجہ سے رطوبت و برودت اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج کو صاف کر کے گزر جاتی تھی، چاہیں تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ طلوع کے وقت کہف کے لیے اور کہف والوں کے لیے آفتاب کی بالائی بنفشی شعاعوں سے استفادہ کا موقع فراہم کیا گیا تھا، برعکس اس کے جس وقت آفتاب غروب ہونے لگتا تھا قرآن نے کہف کے ساتھ نہیں بلکہ اصحاب کہف کے متعلق یہ اطلاع دی ہے کہ آفتاب ان کو کاٹ جاتا تھا۔ یہاں عن کا صلہ نہیں ہے۔ جس کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ کہف والے غروب کے وقت دھوپ سے کلیتاً محفوظ رہتے تھے جس کی وجہ بھی ظاہر ہے کہ غروب سے پہلے دن بھر دنیا دھوپ سے گرماتی رہتی ہے اسی لیے شام کی دھوپ نہ مرغوب ہی ہوتی ہے نہ مفید، تاہم ایک نکتہ یہاں بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ غروب کے وقت دھوپ سے بے تعلقی کو قرآن نے کہف کی طرف نہیں بلکہ براہ راست اصحاب کہف کی طرف منسوب کیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود کہف میں غروب کے وقت بھی کچھ نہ کچھ دھوپ پہنچتی تھی، لیکن جس فجوہ (یا کمرے) میں اصحاب کہف مقیم تھے وہاں تک اس کی رسائی نہ تھی اور اسی سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ کہف دو رخا تھا، ایک رخ اس کا بظاہر سمت جنوب مائل بہ مشرق تھا اور دوسرا سمت شمال مائل بہ مغرب رخ تھا، اگر یہ صورت نہ ہوتی تو شمال و جنوب کے ساتھ غروب و طلوع کے وقت آفتاب کے ساتھ نسبت اور تعلق کو بیان کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی، بلکہ اسی بنیاد پر میں تو یہی خیال کرتا ہوں کہ ہوا کی آمد و رفت کا راستہ کہف میں کھلا ہوا تھا، گویا یوں روزانہ آفتابی شعاعوں اور ہوائی لہروں سے کہف کی صفائی (Disinfect) کا کام قدرت لے رہی تھی۔

خدا ہی جانتا ہے کہ ان غریب نوجوانوں کے گھر شہر کے کس حصہ میں تھے، اور صحت و راحت کے لحاظ سے اس محلّہ کی کیا حالت تھی، لیکن دیکھیے قرآن دکھا رہا ہے کہ ان کے ایمان نے اسی بیابان میں جہاں سر چھپانے کا نظم بھی دشوار تھا، گویا ایک ہائی جینا (صحت بخش) قیام گاہ کا مفت بغیر کسی کرایہ کے انتظام کر دیا، آگے اسی کے بعد فرمایا گیا ہے:

ذَالِکَ مِنْ اٰیَاتِ اللّٰہِ مَنْ یَھْدِ اللّٰہُ فَھُوَ الْمُھْتَدِ وَمَنْ یُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَلَہٗ وَلِیًّا مُّرْشِدًاo

یہ ہے اللہ کی نشانیوں سے، جس کو دکھائے راہ اللہ وہی راہ پانے والا ہو، اور جسے اللہ گمراہ کر دے تو ہرگز نہ پائے گا تو اس کا کوئی پشت پناہ راہ بتانے والا۔

واقعہ سے سبق

جس کا مطلب میری سمجھ میں تو (واللہ اعلم بالصواب) یہی آتا ہے کہ ایات اللہ (اللہ کی نشانیوں) کو پا کر جو اللہ کو پاتا ہے اور خدا کے اُن ہی پتوں کو پڑھ کر خدا پر ایمان لاتا ہے اس کے نزدیک سب کچھ "اللہ" ہی ہوتا ہے۔ جہاں اللہ ہے وہیں یقین رکھتا ہے کہ اللہ اپنی آیتوں کو بھی ظاہر کرے گا، جیسے کہف والوں نے اللہ پر ایمان لا کر دیکھا کہ جہاں سر چھپانے کے سامان کی بھی صورت نہ تھی وہیں ان کے لیے اللہ نے ان کے رہنے سہنے کا معقول نظم کر دیا، مگر یقین کی یہ کیفیت ایمان کے معاوضہ میں ارزانی ہوتی ہے، مومن کو خدا اس کے ایمان کا یہ اجر دیتا ہے کہ ہدایت کی راہ اس پر کھول دیتا ہے لیکن اللہ سے بیگانہ اور بے تعلق ہو کر جو صرف آیت اللہ کی زنجیروں میں الجھے ہوئے ہیں، وہ اپنی بے ایمانی کی یہ سزا بھگتتے رہتے ہیں کہ آیت اللہ سے ان کا ذہن اللہ کی طرف منتقل نہیں ہوتا، وہ آیت اللہ یا اسباب کے جنگلوں میں بھٹکتے

Marfat.com

پھرتے ہیں، ایسوں کو اولاً تو کوئی پشت پناہ (ولی) ہی نہیں ملتا اور پشت پناہی کسی کی مل بھی جائے تو صحیح راہ کی طرف راہ نمائی کرنے والے (مرشد) سے تو وہ ہمیشہ محروم ہی رہتے ہیں، دیکھ لیجئے کہ ایمان کی راہ سے ہٹ کر جو زندگی گزار رہے ہیں، حالانکہ بڑے بڑے مفکرین، ارباب نظر و فلسفہ کی کتابیں وہ پڑھتے ہیں لیکن بجائے پانے کے صحیح راہ سے وہ دور ہی ہوتے چلے جاتے ہیں اور جب تک ''اللہ'' سے توڑ کر'' آیات اللہ'' کا مطالعہ کیا جائے گا، یہ لعنت آدمی پر مسلط رہے گی۔

یہاں تک تو ایمان کے اجر حسن کے ایسے مظاہرے اور اللہ کی ایسی آیتیں اور نشانیاں تھیں جن سے بے ایمانی کے مجرموں کو اللہ کے پانے کی توفیق تو نہیں میسر آتی لیکن بذات خود ان نشانیوں اور آیات کو دیکھنے کا مخاطب ان کو بنایا جا سکتا ہے، کیونکہ یہ ایسی باتیں ہیں جن کی توجیہ بخت و اتفاق سے بھی کرنے والے چاہیں تو اپنی بدبختی سے کر سکتے ہیں کہ ان نوجوانوں کو اس قسم کی سہولتیں اتفاقاً مل گئیں۔

ناقابل قیاس انعامات

لیکن ان کے بعد ایمانی معاوضوں کے جن کرشموں کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے، ان کی حالت تو یہ ہے کہ مومن ہوئے بغیر شاید ان کے سننے پر بھی کوئی مشکل ہی سے آمادہ ہو سکتا ہے۔

مقصد یہ ہے کہ کہف والے کہف میں جس وقت داخل ہوئے تو جیسا کہ قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے اپنے ساتھ ''ورق'' (چاندی) کی کوئی مقدار بھی لائے تھے، غالباً یہ چاندی سکے کی شکل میں تھی، اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن چیزوں کو کہفی زندگی میں ساتھ رکھنے کا امکان تھا اور ان کے رکھنے اور کہف میں ساتھ لے جانے سے خواہ مخواہ احتراز اور پرہیز کا طریقہ انہوں نے اختیار نہیں کیا تھا' [الغرض] عام طور پر اس قصہ کو لوگ جس شکل میں بیان کرتے ہیں اس کی بنیاد پر تو خواہ کچھ کہا جائے لیکن جہاں تک قرآنی آیات کا تعلق ہے ان کی روشنی میں یہ دعویٰ آسانی کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا کہ کہف میں داخل ہونے کے ساتھ ہی وہ سو گئے، بلکہ میرا خیال ہے کہ اپنے ساتھ جو کچھ وہ لائے تھے جس میں کھانے پینے کی خشک اور تر چیزوں کو سب سے پہلے ہونا چاہیے تو جب تک انہیں اس سے مدد ملتی رہی اس وقت تک اس طویل گہری نیند کی ان کو ضرورت ہی نہ تھی جس کا ذکر بعد کو خود قرآن نے کیا ہے۔ ہاں جب لایا ہوا ذخیرہ ختم ہو گیا تو اس ٹاپو میں یہ اہم سوال تھا کہ خورد و نوش کی چیزیں کہاں سے مہیا ہوں گی۔ ایک صورت تو اس کی یہ تھی جیسا کہ بیدار ہونے کے بعد انہوں نے اس پر عمل بھی کیا، چھپ چھپ کر شہر ہی سے کھانے پینے کا سامان منگوا لیں، لیکن جن حالات میں دشمنوں کے پنجوں سے نکل کر نکل جانے میں ہو کامیاب ہوئے تھے شاید ان حالات میں شہر کی طرف رخ کرنا ان کے لیے مناسب نہ تھا۔

عجیب و غریب نیند

پس ان ہی نازک ترین گھڑیوں میں اب ان کا ایمان ان کے آگے اجر اور معاوضہ کی ایک ایسی صورت کو پیش

Marfat.com

کرتا ہے جس کے سننے کی تاب بھی ایمان سے محروم عقل نہیں لاسکتی، قرآنی آیت

وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظاً وَّهُمْ رُقُوْد

اورتم خیال کروگے کہ وہ بیدار ہیں حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں

میں اطلاع دی گئی ہے کہ ان پر نیند طاری ہوئی، عجیب وغریب نیند۔ ایک طرف تو اس کی خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ دیکھنے والوں کو معلوم ہوتا تھا کہ وہ جاگ رہے ہیں اور دوسری طرف اسی نیند کا ایک پہلو بھی قرآن ہی نے اسی کے بعد بیان کیا ہے کہ

نُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَ ذَاتَ الشِّمَال

اور ہم ان کو الٹتے پلٹتے رہے، دائیں اور بائیں پہلو پر

جس کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ ایسی گہری نیند ان پر طاری ہوئی تھی کہ نیند میں بھی تھوڑا بہت احساس یا اختیار کروٹ بدلنے کا آدمی میں جو باقی رہتا ہے، اس احساس اور اختیار سے بھی وہ قطعی طور پر خالی ہو چکے تھے اور کروٹ بدلنے کا انتظام بھی براہ راست قدرت کی طرف سے کیا گیا۔

یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس گہری نیند کی مدت کتنی تھی، قرآن میں قصہ کو ختم کرتے ہوئے خبر دی گئی ہے کہ تین سو سال اور نو سال تک اس کہف میں ان کا قیام رہا، لیکن ظاہر ہے کہ یہ ان کے قیام کی مدت ہے نہ کہ نیند کی، بہرحال اتنی بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ ان پر گہری نیند طاری ہوئی اور اسی نیند کی بدولت جب تک وہ سوتے رہے کھانے پینے کی ضرورت سے بے نیاز رہے۔

حفاظت کا عجیب انتظام

البتہ ایک ایسی جگہ جہاں وہ سوئے تھے، نیند کی حالت میں طرح طرح کے خطرات کا اندیشہ تھا، موذی حشرات الارض، یا درندے، یا چور وغیرہ جیسی چیزوں کا اندیشہ تھا، غالباً ان ہی خطرات سے حفاظت کے لیے یہ کیا گیا کہ دیکھنے والوں کو معلوم ہوتا تھا کہ وہ جاگ رہے ہیں، اسی کے ساتھ جیسا کہ قرآن ہی میں ہے

كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْد٥

کتا اُن کا دونوں ہاتھوں کو پھیلائے در پر (کہف کے) پڑا ہوا تھا۔

اور یہ بھی کتے کے جاگنے کی ہیبت ہے، دیکھنے والوں کو گویا معلوم ہوتا تھا کہ کتا بھی بیٹھا ہوا ہے۔

ان سب کے سوا ان کے ایمان کا اجر حسن ایک یہ بھی تھا جس کی قرآن نے تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے کہ

وَ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَاراً وَّلَمُلِئْتَ لَهُمْ رُعْبا٥

اگر ان کی طرف تو جھانکے تو پیٹھ پھیر کر بھاگے، اور بھر جائے تو رعب سے (ان کو دیکھ کر)۔

اس ''ایمانی اجر'' کی رومی تعبیر۔

ہیبت حق ست ایں از خلق نیست
ہیبت آں مرد صاحب دلق نیست
ہر کہ ترسیداز حق و تقویٰ گزید
ترسد از وے جن و انس ہر کہ دید

واقعہ یہ ہے کہ بے ایمانوں کی عقل ایمانی معاوضوں کے ان تذکروں کوخواہ برداشت کرے یا نہ کرے مگر اس وقت تک کہف والوں کے ایمانی اجر کے جن قوالب ومظاہر کوقرآن نے بیان کیا ہے کسی نہ کسی رنگ میں آج بھی چاہا جائے تو ایمانیوں کی خدمت میں حاضر ہوکر اس کا مشاہدہ اور تجربہ کیا جاسکتا ہے، اگرچہ روز بروز اب ان کی تعداد گھٹ رہی ہے تاہم اب بھی دنیا ان قدسی نفوس سے قطعی طور پر خالی نہیں ہوئی ہے، ڈھونڈنے والے چاہیں تو اب بھی دنیا کے دور دراز گوشوں میں ان کو پاسکتے ہیں۔

البتہ اس کے بعد قرآن نے

وَكَذٰلِكَ بَعَثْنَاهُمْ

اور اسی طرح اٹھایا ہم نے ان کو

کے تمہیدی الفاظ کے ساتھ اصحاب کہف کے ایمانی اجر کے جس رخ کو بے نقاب کیا ہے اور اس تمہید کے بعد جو باتیں بیان کی گئی ہیں، عام آدمی کے لیے تو شاید اس کا سمجھنا بھی دشوار ہو۔

نیند کی غیر معمولی طوالت اور اصحابِ کہف کا احساس

مطلب یہ ہے کہ کہف میں کہف والوں کے قیام کی مدت جو دو تین صدیوں سے بھی متجاوز ہے اولاً عام حالات کے لحاظ سے بجائے خود یہی ایک غیر معمولی حادثہ ہے...... [لیکن] قصہ اسی پر ختم نہیں ہوا ہے، بلکہ بیدار ہونے کے بعد اپنے سونے کی مدت ان کو ایک دن، یا دن کے کچھ حصّہ سے زیادہ محسوس نہیں ہوئی، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، صحیح طور پر قرآن سے یہ ثابت کرنا تو مشکل ہے کہ ان کے سونے کی مدت کتنی تھی، تاہم قرآن میں اسی تمہیدی بیان و کذلک بعثناھم کے بود جو یہ الفاظ ہیں کہ:

لِيَتَسَآءَلُوا بَيْنَهُمْ قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ○

تا کہ باہم ایک دوسرے سے پوچھیں، ایک کہنے والے نے ان میں سے کہا کہ کتنے دن تم ٹھہرے، بولے کہ ٹھہرے ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصّہ۔

[ان سے] معلوم ہوتا ہے کہ نیند کی جو واقعی مدت تھی، جاگنے کے بعد صحیح احساس اس مدت کا ان میں نہیں پایا جاتا تھا، حاصل جس کا یہی ہوا کہ ایک دن یا دن کے کچھ حصہ سے جس وقت کی وہ تعبیر کر رہے تھے، واقع میں وہ وقت اتنا مختصر نہ تھا......

بہرحال زندگی کی غیر معمولی طوالت اور پھر اس طویل مدت کو کہف کے ان نوجوانوں کا حد سے زیادہ مختصر محسوس کرنا یہ دونوں باتیں ان کے ایمان کے اجر و معاوضہ کی ایسی غیر معمولی شکلیں ہیں، جن کی عام حالات میں آدمی توقع نہیں کر سکتا اور جہاں تک میرا خیال ہے یہی بتانا یہاں مقصود بھی ہے کہ ایمان کے اجر و صلہ، یا ثمرات و نتائج کا پیمانہ محدود معلومات و مشاہدات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی عقل کو نہ قرار دینا چاہیے کہ بلکہ سمجھنا چاہیے کہ عقل جن باتوں کو سوچ سکتی ہے ایمان ان آسانیوں کو بھی مومن کے سامنے لاتا ہے اور عام حالات میں جن امور کا تصور بھی دشوار معلوم ہوتا ہے، جس رب پر آدمی کو ایمان لانے کی سعادت حاصل ہوتی ہے۔ وہی رب جب چاہتا ہے تو ان کو بھی پیدا کر کے مومن کی دستگیری فرما سکتا ہے، آپ دیکھ رہے ہیں کہ...... عقل جن باتوں کو سوچ نہیں سکتی، اصحاب کہف کا ایمان ان کو بھی کھینچ کر ان کے سامنے لایا، ان کی زندگی دراز ہوگئی، اور کتنی دراز؟ پھر اس وقت کی درازی سے آدمی کو جو ذہنی تکلیف ہوتی ہے، اس تکلیف سے بھی ان کو ان کے ایمان نے بچالیا، اور باوجود دراز ہونے کے وہی طویل وقت ان کو محسوس ہوا کہ حد سے زیادہ مختصر تھا۔

آب وخور سے بے نیازی

اور اسی کے ساتھ اس کا بھی ان کو تجربہ کرایا گیا کہ اتنے طویل زمانے کو بغیر آب وخور کے انہوں نے گزار دیا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ وہ کتنے دنوں تک سوتے رہے مگر جس وقت بیدار ہوئے تو جیسے رات کو سونے والے صبح بیدار ہو کر کچھ کھانے پینے کی ضرورت یا خواہش عام طور پر محسوس کرتے ہیں، انہوں نے بھی محسوس کی۔ قرآن میں اسی کے بعد جو یہ الفاظ ہیں کہ

قالو اربکم اعلم بما لبثتم فابعثوا احدکم بورقم ھذہ الی المدینة فلینظر ایھا از کی طعاماً فلیاتکم برزق منه (الکھف)

(وقت کے متعلق باہم) بولے تمہارا رب ہی زیادہ جاننے والا ہے کہ تم کتنی دیر ٹھہرے، پھر (انہوں نے کہا) کہ بھیجو تم اپنے میں سے کسی کو شہر کی طرف اس ورق (چاندی) کیساتھ، چاہیے کہ وہ دیکھے صاف ستھرے کھانے کو، اور لائے تمہارے لیے روزی۔

ان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ بھوک کا تقاضا بھی چنداں سخت نہ تھا، ورنہ "از کی طعاماً" (صاف ستھرے لذیذ کھانے) کی تلاش کا حکم وہ نہ دیتے، اور یہ بھی ان کے ایمان کے کرشموں میں سے ایک حیرت انگیز کرشمہ تھا۔

کــــذلک کے لفظ سے ان کے ان ایمانی نتائج کو قرآن نے جو الگ کر دیا ہے، غالباً ان کی اہمیت ہی کی طرف اس میں اشارہ کیا گیا ہے یعنی ایمانی اجر ہونے میں تو سب مساوی ہیں، لیکن غیر معمولی ہونے کی وجہ سے ان کی

نوعیت گزشتہ آثار سے چونکہ مختلف تھی، اس لیے ان کو پہلی فہرست سے قرآن نے جدا کر دیا۔

اسی کے ساتھ ذیلی طور پر ایک سبق تو اس سے یہ ملتا ہے جیسا کہ امام رازیؒ نے بھی لکھا ہے:

وھذہ الاٰیۃ تدل علی ان السعی فی إمساک الزاد امرمھم مشروع وانہ لا یبطل التوکل٥

یہ آیت بتاتی ہے کہ زادِ راہ کا ساتھ رکھنا یہ شریعت کا ایک اہم مسئلہ ہے اور توکل پر اس سے زد نہیں پڑتی۔

نیز "ازکیٰ طعاماً" کی تفسیر اگر یہ کی جائے، امام ہی نے دوسرے اقوال کے ساتھ اس کا تذکرہ بھی بایں الفاظ کیا ہے:

ایھا اطیب والذ (ص۶۶۹ ج۶)

یعنی غرض ان کی یہ تھی کہ کھانوں میں جو صاف ستھرا اور لذیذ کھانا ہو، اس کو حاصل کریں۔

تو اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ "طیباتِ من الرزق" یا ایسی غذا جو آدمی کے ذائقہ کے مناسب اور لذت بخش ہو، خواہ مخواہ اس سے نفرت یا چڑ پیدا کرنے کی مشق دینی راہ کے سلوک میں قطعاً غیر ضروری ہے۔

دشمنوں کی محبت وگرویدگی

اسی کے بعد آگے قرآن کے الفاظ یہ ہیں:

وَلیَتَلَطَّفْ ولاَ یشعِرن بکم احداً. انھم ان یظھر و اعلیکم یرجموکم اویعید و کم فی ملّتھم و لن تفلحوا اذاً ابداo

اور چاہیے (کہ کھانا لانے شہر جو جائے وہ) نرمی سے کام لے، اپنے متعلق کسی کو پتہ چلنے نہ دے، (کیونکہ) اگر وہ تم سے واقف ہو جائیں گے تو سنگسار کر دیں گے تمہیں، یا واپس پلٹا لیں گے اپنے کیش و ملت کی طرف جس کے بعد تم کبھی کامیاب نہ ہو گے۔

اور یہ وہی بات ہے، جس کا ذکر پہلے بھی کر چکا ہوں، یعنی اپنی قوم اور اپنے وطن کو چھوڑ کر کہفی زندگی بسر کرنے کے لیے نوجوانوں کی یہ ٹولی شہر سے جس حال نکلی تھی، قرآن نے ان ہی کی زبانی اس حال کے متعلق ان کے اعترافی الفاظ کو یہاں نقل کیا ہے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی قوم سے ان کی مخالفانہ کشمکش شدت کی اس آخری حد تک پہنچ چکی تھی کہ یا اپنی جان سے ہاتھ دھولیں، یا جس دین کے لیے وہ سب کچھ برداشت کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے (العیاذ باللہ) اسی سے دست بردار ہو جائیں اور اس کا خطرہ کہف میں داخل ہونے کے بعد بھی ان کے دلوں میں باقی رہا۔

لیکن دیکھیے خالص ایمان کے تحت جو جی رہے تھے ان کو تجربہ کرایا جا رہا ہے کہ ان ہی کا ایک حال تو یہ تھا کہ ان کی قوم ان کے خون کی پیاسی اور ان کے دین کی دشمن بنی ہوئی تھی کہ اچانک ایک نیا انقلاب شروع ہوتا ہے، وہی شہر جس کے باشندوں کے خوف سے کہف میں ان نوجوانوں نے پناہ لی تھی، اسی شہر کے رہنے والوں میں ایک نیا جذبہ ابھرتا ہے، آگے کی آیتوں میں اس نئی انقلابی تحریک کا قرآن نے ذکر کیا ہے، جس کا حاصل یہی ہے کہ دشمنوں کی ہی آبادی اور

Marfat.com

اسی شہر میں دیکھا جا رہا تھا کہ انتہائی مظلومیت اور بے کسی کے حال میں ان کے شہر سے نوجوانوں کی یہ ٹولی جو نکلی تھی، ان ہی کے وہ نادیدہ عاشق بنے ہوئے ہیں، صرف یہی نہیں کہ اپنے شہر کے باشندوں کے ظالمانہ طرزِ عمل پر وہ ندامت کا اظہار کر کے پچھتا رہے ہیں، بلکہ مافات کی تلافی کے لیے چاہتے ہیں کہ جن پر ظلم کیا گیا تھا اور صحیح دین کے قبول کرنے کے جرم میں بن باس ہونے پر جنہیں مجبور کیا گیا تھا ان کی کوئی دوامی یادگار قائم کریں۔ اور طرفہ تماشا یہ ہوا کہ ٹھیک جن دنوں میں یہ انقلابی ہلچل اس شہر کے اندر برپا تھی، اچانک یہ عجیب وغریب حادثہ پیش آیا کہ جن سے ملاقات کا لوگوں کو سامان وگمان بھی نہ تھا۔ کہف کے ان ہی نوجوانوں کے متعلق شہر والوں کو یہ خبر ملی کہ وہ تو اس وقت تک اس کہف میں جیتی جاگتی حالت میں پائے جا رہے ہیں۔ یہ صورت کیسے پیش آئی؟ قصوں میں تو عموماً یہ بیان کیا گیا ہے اور مشہور ہے کہ بازار میں جب کھانا لینے کے لیے کہف سے آدمی آیا، اور جو سکہ اس نے نانبائی کے حوالے کیا، وہ دقیانوس نامی بادشاہ کے ٹھپہ کا سکہ تھا جو تین سو سال پیشتر اس شہر میں حکمرانی کرتا تھا۔ نانبائی نے اس نئے سکہ کو دیکھ کر پوچھ گچھ کی، لوگوں میں اس کا چرچا پھیلا، آخر اس آدمی کو اقرار کرنا پڑا کہ ہمارا تعلق نوجوانوں کی اس جماعت سے ہے جو دشمنوں کے خوف سے کہف میں روپوش ہو گئے ہیں۔ اسی ذریعہ سے لوگ کہف میں ڈھونڈتے ہوئے اس مقام پر پہنچ گئے جہاں فجوہ میں یہ لوگ بیٹھے ہوئے کھانے کا انتظار کر رہے تھے۔ اربابِ حکایات وقصص اسی روایت کو کافی رنگ آمیزیوں کے ساتھ کتابوں میں نقل کرتے ہیں، لیکن قرآن میں ہم ان تفصیلات کو نہیں پاتے اور سچ پوچھیے تو اس قسم کی دور از کار تفصیلات سے قرآن کا عام دستور ہے کہ عموماً تعرض نہیں کرتا، وہ تو صرف ایمانی اجر کی مختلف شکلوں کو اس موقع پر پیش کرنا چاہتا ہے چونکہ کہف والوں کے ایمانی اجر ومعاوضہ کی یہ شکل بھی اپنی علیحدہ مستقل نوعیت رکھتی تھی، اس لیے ''وکذلک'' کے لفظ سے شروع کرتے ہوئے (یعنی) یہ بتاتے ہوئے کہ جیسے گزشتہ قالبوں میں ایمانی اجر کہف والوں کے سامنے آیا، اسی طرح ایک نیا مظاہرہ ان کے ایمانی اجر کا اس شکل میں بھی ہوا [فرمایا گیا] کہ

اعثرنا علیھم لیعلموا ان وعداللّٰہ حق و ان الساعۃ لاریب فیھا اذیتنا زعون بینھم امرھم فقالوا ابنوا علیھم بنیانار بھم اعلم بھم، قال الذین غلبوا علیٰ امرھم لنتّخذن علیھم مسجدا (الکھف)

اچانک ان پر (یعنی کہف والوں پر) مطلع کر دیا ہم نے تاکہ وے جائیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے، اور قیامت کی گھڑی آنے والی ہے، قطعاً اس میں کوئی شک نہیں ہوا۔ (اور کہف والوں پر مطلع ہونے کا قصہ اس وقت پیش آیا) جب دیکھو! (شہر والے) باہم جھگڑ رہے تھے ان ہی کہف والوں کے متعلق۔ پس (بعض) بولے کہ بناؤ ان پر کوئی عمارت ان کا رب خوب جانتا تھا ان کو، کہا ان لوگوں نے جو ان کے معاملہ قابو یافتہ تھے کہ ہم بنا کر رہیں گے ان پر مسجد

بہر حال اصحابِ کہف پر اعثار یعنی اچانک ان پر واقف ہونے کی صورت جو پیش آئی اس کی تفصیلی وجہ قرآن نے نہیں بیان کی ہے، بلکہ بجائے عداوت ودشمنی کے اسی شہر کے باشندوں میں کہف والوں کے ساتھ غیر معمولی دلچسپی بلکہ نادیدہ عشق کا انقلابی سانحہ جو پیش آیا اور اسی جذبہ عشق سے سرشار ہو کر لوگ ان کی یادگار کی تعمیر کے متعلق مختلف تجویزیں پیش کر رہے تھے۔ قرآن نے صرف یہ خبر دی ہے کہ عین اسی زمانے میں ان سے واقف ہونے کا حادثہ اچانک

رونما ہوا، اس سلسلہ میں اسی حد تک قرآن نے اپنے بیان کو محدود رکھا ہے، کیونکہ وہ تو صرف یہ بتانا چاہتے ہے کہ ایمان مومن کا ساتھ کہاں تک دیتا ہے، اور یہ کہ ایمانی اجر کے ظہور کی شکلیں صرف ان ہی منطقی حدود تک محدود نہیں ہوتیں جہاں تک سوچنے والوں کی عقل عام معلومات و مشاہدات کی راہ نمائی میں پہنچتی یا پہنچ سکتی ہے، الغرض یہ دعویٰ قرآن میں کیا گیا ہے یا اہل ایمان کے لیے صلائے عام دیا گیا ہے کہ

وبشر المومنين الذين يعملون الصالحات ان لهم اجرا حسنا ماكثين فيه ابدا

اور بشارت دے دو، ایمان والوں کو جو اچھی باتوں پر عمل کرتے ہیں کہ یقیناً ان کے لیے اچھا اجر و معاوضہ ہے جس میں وہ رہیں گے ہمیشہ ہمیش۔

اسی دعویٰ یا اسی صلائے عام کے عملی تجربات کی یہ مثالی شکلیں ہیں جو مختلف رنگوں مین کہف کے ان مومن نوجوانوں کے سامنے مسلسل پیش آتی چلی گئی ہیں۔

حیات جاوید

اتنی دراز مدت جو کہف میں ان پر گزری، چاہیے تو یہ تھا کہ دنیا ان کو بھول جاتی، حافظوں سے لوگوں کے وہ نکل جاتے، مگر آپ دیکھ رہے ہیں، بجائے بھلانے کے قدرت ان کی یاد کے نقوش کو چمکاتی ہی چلی گئی، نہ صرف دلوں اور دماغوں میں بلکہ جس شہر کے باشندوں کے مظالم سے تنگ آکر بیابان اور ٹاپو کی زندگی انہوں نے اختیار کی تھی۔ اسی شہر کے رہنے والے ان کے لیے یادگار قائم کرنے کی کوششوں میں مست ہیں۔

اور صرف یہی نہیں کہ جس شہر سے وہ نکلے تھے اسی کی حد تک یا اسی شہر کے باشندوں کی حد تک اصحاب کہف کے ساتھ دلچسپیوں کے یہ قصے محدود رہے بلکہ قرآن میں اسی کے بعد جو یہ خبر دی گئی ہے کہ

سيقولون ثلاثة رابعهم كلبهم ويقولون خمسة ساد سهم كلبهم رجما بالغيب و يقولون سبعة وثامنهم كلبهم

اور قریب ہے کہ وہ کہیں گے کہ (کہف والے) تین ہیں چوتھا ان کا کتا ہے اور کہیں گے کہ وہ پانچ ہیں، چھٹا ان کا کتا ہے انکل پچو طریقے سے اور کہیں گے سات ہیں اور آٹھواں ان کا کتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے بعد بھی جب اچانک لوگ ان سے واقف ہوئے، کہف کے ان نوجوانوں کو آئندہ نسلوں میں بھی کافی اہمیت کا مقام حاصل رہا، اور کیسی اہمیت؟ کہ خود وہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ جو کتا تھا، تاریخ انسانی کا ایک ایسا کتا بن گیا کہ کہف والوں کی تعداد اس کتے کے بغیر اور کتے کے ساتھ مختلف مکاتب خیال کی بنیاد ہو گئی۔ امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں ایک روایت نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سینکڑوں سال بعد عرب میں بھی

Marfat.com

عیسائیوں کے مختلف فرقوں کے باہمی اختلافات کے سلسلہ میں ایک بڑا اہم ''خلافی مسئلہ'' کتے کے ساتھ اور کتے کے بغیر اصحاب کہف کی تعداد کا مسئلہ تھا۔[۴۸]

اصحاب کہف کے قصہ کی حد تک قرآنی بیان گویا سمجھنا چاہیے کہ ختم ہو چکا ہو، اگرچہ آگے کی آیتوں کا بھی براہ راست ان کی سرگزشت سے خواہ تعلق نہ ہو لیکن کلیتاً اس قصہ سے وہ جدا بھی نہیں ہیں بلکہ اسی قصہ سے پیدا ہونے والے نتائج میں ہم ان کو بھی شمار کر سکتے ہیں۔ ان شاء اللہ اس کا ذکر تو آئندہ کیا جائے گا، سردست اصل قصہ کو ختم کر کے ایک ذیلی مسئلہ کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

کہنا یہ ہے کہ اس وقت تک تو عموماً میں نے اپنے بیان کو قرآنی الفاظ کی حد تک محدود رکھنے کی کوشش کی ہے، ارباب قصص و حکایات نے کہف والوں کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے، میں نے قصداً اس سے تعرض ہی نہیں کیا ہے یا ضرورۃً بعض چیزوں کا ذکر اگر آ گیا ہے تو اس کی حیثیت ایک ذیلی بیان کی ہے۔ اس وقت بھی ایک ذیلی بات ہی کا ذکر مقصود ہے۔

اصحاب کہف کا یہ قصہ کس زمانہ کا ہے؟

اصحاب کہف کے لبث (یا مدت قیام) کو بتاتے ہوئے قرآن نے جو یہ طریقۂ تعبیر اختیار کیا ہے کہ تین سو سال وہ ٹھہرے اور بڑھا دیا۔ انہوں نے ۹ سال امام رازی کی تفسیر [میں ایک قول نقل کیا گیا ہے] کہ شمسی اور قمری سالوں کے تفاوت کی طرف اس پیرایۂ بیان سے اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن خود امام نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ حساب کے رو سے یہ دعویٰ صحیح نہیں معلوم ہوتا، ایسی صورت میں یہ سوال رہ جاتا ہے کہ آخر اس خاص طریقہ بیان کی مصلحت کیا ہے۔ اسی کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

قرآن کے الفاظ سے تو اس کا پتہ نہیں چلتا کہ اصحاب کہف کا یہ قصہ کس زمانے میں پیش آیا، لیکن اسلامی و غیر اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے حواریوں نے جب منادی شروع کی اور دنیا کے مختلف حصوں میں وہ پھیل گئے، تو ایشیاء کوچک کے اس مرکزی شہر افسیس میں بھی بعض لوگ پہنچے اور حضرت عیسیٰ کے پیغام کی وہاں کے باشندوں میں تبلیغ شروع کی، عرض کر چکا ہوں کہ افسیس کے باشندے بت پرست تھے، ان ہی بت پرستوں میں سے چند نوجوان مسیحی پیغام سے متاثر ہوئے، قوم سے جھگڑا شروع ہوا۔ اسی کش مکش سے تنگ آ کر کہف میں پناہ لینے کے لیے وہ داخل ہو گئے۔ اب یہ ایک تاریخی واقعہ ہے، قدیم و جدید ہر قسم کے مورخوں نے اس کا ذکر کیا ہے، حتیٰ کہ مشہور محدث علامہ ابن حزم اندلسی نے (جن کی وفات ۵۴۸ھ میں ہوئی ہے) اپنی کتاب ''ملل و نحل'' میں یہ بیان کرتے ہوئے کہ دین عیسوی کے ماننے والوں پر رومی بت پرستوں نے شروع شروع میں مظالم کے پہاڑ توڑے،

Marfat.com

لکھا ہے کہ

خبقوا علی هذه الحالة لایظهرون البتة ولا لهم مکان یامنون فیه ثلا ثمائة سنة بعد رفع المسیح علیه السلام. (ص۴۔ج۲)

(مظلومیت کے اسی حال میں عیسائی مبتلا رہے) دنیا کے سامنے ظاہر نہیں ہو سکتے تھے، نہ ان بیچاروں کو ایسی جگہ مل سکی جس میں امن کے ساتھ زندگی بسر کریں، (اور یہ صورت حال) عیسیٰ کے اٹھائے جانے کے تین سو سال بعد تک باقی رہی۔

آگے ابن حزم نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کہ تین سو سال گزرنے کے بعد کس طرح قسطنطین شاہ قسطنطنیہ نے عیسائی دین قبول کر لیا، اور اس کے بعد عیسائیوں کو آزادی کے ساتھ رہنے سہنے چلنے پھرنے اور علانیہ تبلیغ کرنے کا موقع ملا بلکہ تبلیغ کے ساتھ ساتھ جبر و زبردستی سے کام لے کر بھی لوگوں کو عیسائی بنانے لگے۔

اب ایک طرف تاریخ کے اس بیان کو رکھیے اور اس کو قرآن کی اس خبر سے ملائیے کہ کہف والوں کے قیام کی مدت کہف میں وہی تین سو سال مزید نو سال کے اضافہ کے ساتھ تھی، اگر اس سے یہ نتیجہ پیدا کیا جائے کہ مظلومیت اور روپوشی کی جو مدت عام عیسائیوں پر گزری اسی زمانے میں کہف والے بھی کہف میں پناہ گزیں رہے، اور ان کے شہر کے باشندوں میں جو مذہبی انقلاب رونما ہوا، تا اینکہ اپنے شہر سے بھاگنے والے ان نوجوانوں کے ساتھ نادیدہ عشق و محبت، عظمت و احترام کا تعلق پیدا ہوا، یہ سارے قصے اسی تین سو سال کے اندر پیش آئے، اس کے بعد اچانک لوگ ان سے جب واقف ہوئے تو ۹ سال کا زمانہ اس واقفیت کے بعد گزرا اور دونوں زمانوں کے اسی اختلاف کی طرف قرآن نے اپنے پیرایۂ بیان سے اشارہ کیا ہے، جہاں تک میرا خیال ہے دوسری توجیہوں سے یہ توجیہہ زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔ سمجھ میں یہ آتا ہے کہ کہف والوں کو ایمان اور ایمانی اجر کا تجربہ کرانا مقصود تھا اسی لیے اتنی طویل زندگی ان کو عطا کی گئی اور جہاں سے بصد بیکسی و بےنوائی وہ نکلے تھے اسی مقام کے باشندوں کی عجیب و غریب گرویدگیوں اور اپنے ساتھ غیر معمولی دلچسپیوں کا تماشا ان کو کرایا گیا، شاید اس کے بعد ۹ سال جینے کا موقع ان کو اور ملا، اور پھر کل نفس ذائقة الموت کے کلی قانون کے تحت ان کی وفات ہو گئی۔ [۳۹] واللہ اعلم۔

[اصحاب کہف کا قصہ ختم ہو چکا، اور یہاں تک کی آیتوں سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ جو کچھ سمجھانا چاہتے تھے وہ خود مولانا ہی کے الفاظ میں آپ کے سامنے آ چکا، مگر سورت کا ابھی خاصا حصہ باقی ہے اور اس بقیہ حصہ کے متعلق بھی مولانا کا خیال ہے کہ اس کی آیتوں کا خواہ اصحاب کہف کی سرگذشت سے براہ راست تعلق نہ ہو۔

''لیکن کلیۃً اس قصہ سے وہ جدا بھی نہیں ہیں، بلکہ اسی قصہ سے پیدا ہونے والے نتائج میں ہم ان کو بھی شمار کر سکتے ہیں۔''

اور اسی خیال کے ماتحت مولانا نے آخری نو (۹) قسطوں میں، اس بقیہ حصہ کے مشتملات سے بحث فرمائی

Marfat.com

ہے، مگر قصہ کے بعد متصلاً جو تین چار آیتیں احکام کی شکل میں ہیں، ان کی توضیح وتشریح سے فارغ ہو کر مولانا رقم طراز ہیں کہ

''بہرحال واقعہ یہ ہے کہ کہفی زندگی کی ضرورت جن حالات میں پیش آتی ہے، ان حالات کو پیدائش کے اسباب، ان کے نتائج وعواقب، پھر خود کہفی زندگی کے لوازم وآثار، اسی زندگی کے فرائض وواجبات یہ اور اسی قسم کے تمام سوالات جن کا کہفی زندگی سے تعلق ہوسکتا تھا، اگر سوچا جائے تو بقدرِ ضرورت ان باتوں کے جوابوں کو ہم ان آیتوں میں پاسکتے ہیں جن پر اب تک بحث ہوچکی ہے، اسی لیے اب تک یہ التزام کیا گیا تھا کہ ایک ایک آیت کے تمام پہلوؤں کو تفصیل کے ساتھ سمجھنے والوں کے آگے پیش کر دیا جائے، اسی التزام کی وجہ سے مضمون میں کافی طوالت پیدا ہوگئی......لیکن اب میں انہیں اس کی خوشخبری سناتا ہوں کہ قرآن کی ایک ایک آیت اور ایک ایک لفظ پر غور وفکر کا باران پر نہ ڈالا جائے گا، کیونکہ مقصد پورا ہو چکا ہے۔''

مولانا کے اصل مضمون کی طوالت اور ''الفرقان'' کے اس نمبر کی محدود ضخامت کے پیش نظر یہ تو ممکن نہیں ہے کہ جس طرح اب تک تقریباً پورا مضمون لفظ بلفظ لیا گیا ہے، بقیہ حصہ میں بھی یہی روش برقرار رکھی جائے۔ اس لیے اب ہم یہاں سے روش بدل کر اولاً اُن تین چار آیتوں سے متعلق مولانا کے افادات کا تو خلاصہ پیش کرتے ہیں، جو قصہ اصحاب کہف کے خاتمہ کے بعد متصلاً آتی ہیں اور جن کی تشریح کے بعد مضمون کا مقصد کہنا چاہیے کہ پورا ہو جاتا ہے، اور اس کے بعد بقیہ حصہ سے متعلق افادات میں سے صرف وہ خاص علمی نکات اور فکر افروز ذہنی انتقالات پیش کیے جائیں گے، جو مولانا مرحوم کی ژرف نگاہی اور دقیقہ رسی کی یادگار کی حیثیت سے محفوظ کر دیے جانے کے قابل ہیں۔ واللہ ولی الامر والتوفیق!]

قصۂ اصحاب کہف سے فراغت کے بعد مولانا فرماتے ہیں۔

''اصحاب کہف کی سرگذشت کو ختم کرنے آگے چند احکام ہیں، آیئے اور ان کا مطلب سمجھئے اور دیکھئے کہ کہف والوں کے قصہ سے ان احکام کا کیا تعلق ہے۔...... پہلا حکم اس سلسلہ کا یہ ہے کہ

وَاتْلُ مَا اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ کِتَابِ رَبِّکَ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمَاتِہٖ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِہٖ مُلْتَحَدًا

اور پڑھتا رہ جو وحی کی گئی تجھ پر تیرے رب کی کتاب سے، نہیں ہے کوئی بدلنے والا اس کی باتوں کا اور ہرگز نہ پائے گا اس کے سوا تو یکسوئی کی کوئی جگہ۔

اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں کہ حرف عطف واؤ سے سلسلۂ کلام کی ابتداء اس بات کی دلیل ہے کہ یہ سلسلۂ

Marfat.com

کلام ماقبل کی آیات کے مضمون سے مربوط ہے۔ اس ربط کو اگر تلاش کیا جائے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اصحاب کہف کے قصہ کی ابتدا میں جو ایک لفظ ''الرقیم'' آیا تھا جس کی تفسیر ''کتاب'' سے کی گئی تھی اور دوسرا لفظ ''فتیۃ'' تھا جس کا ترجمہ ''نوجوانوں کی ٹولی'' سے کیا گیا تھا، اور ان دونوں سے یہ اشارہ حاصل کیا گیا تھا کہ کہفی زندگی میں فکر ونظر کے جمود اور تعطل کا جو خطرہ ہے اس سے حفاظت کی تدبیر یہ ہے کہ اس زندگی کے دور میں اولاً تو کتاب سے شغل رکھا جائے، اور دوسرے تنہائی کے بجائے یہ عرصہ چند رفیقوں کی رفاقت میں گزارا جائے، مگر سوال یہ رہ جاتا ہے کہ مطالعہ میں کتابیں کس قسم کی رکھی جائیں اور رفاقت کے لیے کس قسم کے رفیقوں کا انتخاب کیا جائے؟......اس لیے کہ فتنہ کے جن ایام میں کہفی زندگی کی ضرورت پیش آتی ہے، تجربہ اور مشاہدہ بتا رہا ہے کہ ''خودرائی'' کی عام وبا بھی ان دنوں میں پھوٹ پڑتی ہے اور جن لوگوں میں تھوڑا بہت سلیقہ بھی لکھنے لکھانے کا ہوتا ہے۔ وہ اپنے فتنہ انگیز افکار سے کتابوں کے ڈھیر لگانے لگتے ہیں، پس ان ایام میں اگر مطالعہ کا دائرہ ہر قسم کی کتابوں کے لیے وسیع کر دیا جائے تو ظاہر ہے کہ کہفی زندگی کا مقصد ہی فوت ہو کر رہ جائے گا۔

اس لیے مذکورہ بالا پہلے حکم میں غالباً ''الرقیم'' کے اجمال وابہام ہی کے دور کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے کہ کہفی زندگی میں صرف اپنے پروردگار کی نازل کی ہوئی کتاب سے شغل رکھو جو اٹل اور لازوال سچائیوں پر مشتمل ہے۔ اور اسی بنا پر فکری یکسوئی کی واحد ضامن ہے۔

علیٰ ہٰذا اس کے بعد والے دوسرے حکم کے الفاظ

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ

اور تھامے رکھ اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ جو پکارتے رہتے ہیں اپنے پالنے والے کو صبح وشام اور مراد بنائے ہوئے ہیں اسی کے رخ کو

سے غالباً رفقاء کے انتخاب کے معیار کا مسئلہ حل کرنا اور یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ کہفی زندگی کی رفاقت کے لیے کس قسم کے رفقاء کا انتخاب کیا جائے......اس کی تشریح خود مولانا کے الفاظ میں سنئے۔ فرماتے ہیں۔

''دوسری مہم اس مسئلہ میں رفقاء کے انتخاب کا معیار ہے، یعنی رفاقت کے لیے جن رفقاء کے انتخاب کا قرآن نے حکم دیا ہے ان کو ہم کن نشانیوں اور علامتوں سے پہچانیں، اسی کے جواب کو آپ آگے ان الفاظ میں پا سکتے ہیں۔ فرمایا گیا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ.

جو پکارتے رہتے ہیں اپنے پالنے والے کو صبح وشام مراد بنائے ہوئے ہیں اسی پالنے والے کے رُخ کو

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ اس قسم کے مواقع پر شعوری یا غیر شعوری طور پر قرآنی الفاظ کا کوئی خود ساختہ خلاصہ لوگ نکال کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ مثلاً مذکورۂ بالا الفاظ کا مطلب یہ نکال لیا جاتا ہے کہ رفاقت کے لیے حکم دیا گیا ہے کہ دینداروں کا انتخاب کیا جائے، لیکن کم از کم قرآنی الفاظ کے ساتھ تو اس قسم کی لاپروائیاں بڑی محرومی ہے۔

یہ سچ ہے کہ جن میں یہ صفات پائے جاتے ہیں وہ دیندار ہی ہوتے ہیں، لیکن ہر دیندار میں ان صفات کا پایا جانا جہاں تک میرا خیال ہے یہ ضروری نہیں ہے، دینی زندگی رکھنے والوں کا ایک بڑا طبقہ ہر زمانہ میں پایا گیا ہے جو آئین و قانون کی شکل میں زندگی کی دینی تنظیم ہی کو مذہب کا آخری مطالبہ سمجھتا ہے اور توقع رکھتا ہے کہ بہشتی زندگی بطور طبعی نتیجہ کے اس کے سامنے اسی طرح آ جائے گی، جیسے تریاق کا استعمال صحت کے نتیجے تک مریض کو پہنچا دیتا ہے، ان کی نظر صرف قانون کی اہمیت تک محدود رہتی ہے اور قانون کے مقنن سے بجز قانونی تعلق کے نہ کوئی رشتہ وہ رکھتے ہیں اور نہ رکھنا چاہتے ہیں۔ جیسے مریض صرف طبیب کی بتائی ہوئی دواؤں سے اپنا تعلق رکھتا ہے اور صحت کے لیے جانتا ہے کہ براہ راست طبیب سے تعلق پیدا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اور اسی کے مقابلہ میں دینداروں کا ایک طبقہ وہ بھی ہے جن کی زندگی کی سب سے بڑی خصوصیت وہی ہوتی ہے، جسے نشانی اور علامت ٹھہراتے ہوئے مذکورہ بالا الفاظ میں قرآن نے ان کو روشناس کرایا ہے۔

یدعون ربهم بالغدوٰة و العشی

پکارتے رہتے ہیں اپنے پالنے والے کو صبح و شام

یہ ان لوگوں کی شناخت کی پہلی قرآنی علامت و نشانی ہے، علامہ شوکانی ان الفاظ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

كناية عن الاستمرار علی الدعاء فی جميع الاوقات (ج ۳۔ص ۱۷۱)

سارے اوقات میں دعا کرتے رہنا اسی کی طرف اس میں اشارہ کیا گیا ہے۔

جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں عربی زبان کے محاورے کا اقتضاء بھی یہی ہے، حاصل جس کا یہی ہوا کہ پرورش کرنے والی قوت یعنی رب کے ساتھ اپنے احتیاطی تعلق کے احساس کو ہمہ دم، مسلسل، بغیر کسی انقطاع کے اپنے اندر زندہ اور بیدار رکھنا اور اسی احساس کے زیر اثر چھوٹی بڑی ضرورت میں اسی کی طرف پلٹنا اور اسی کو پکارتے رہنا، یہی ان کی زندگی کا مشغلہ اور یہی ان کا اوڑھنا بچھونا بنا ہوتا ہے اور فقر تام، احتیاج مطلق، فقط سوال، صرف بھیک کی اس پستی میں جو بلندی ان کو حاصل ہوتی چلی جاتی ہے اور اس کمتری سے جو برتری پیدا ہوتی ہے۔

یریدون وجهه

مراد بنائے ہوئے ہیں وہ اسی رب کے رخ کو

کے الفاظ میں اسی کی تصویر پیش کی گئی ہے، جس کا مطلب یہی ہوا کہ......ان کی نگاہ کسی حال میں وجہ اللہ (رب کے رخ کو) سے نہیں ہٹتی، حتیٰ کہ بہشت میں بھی ان کے سامنے جب آئے گی تو وہ بھی رضوان اللہ ہی کا قالب ان کو محسوس ہوگا، وہ محسوس کریں گے کہ وہی اپنی رضامندیوں کے ساتھ ان کے آگے بے نقاب ہو کر آ گیا ہے، الغرض رب کے ساتھ فقر و احتیاج کا دوامی تعلق، اور ہر حال میں ''وجہ اللہ'' ہی کو مراد بنائے ہوئے رہنا، ان ہی دو علامتوں سے ان رفقاء کی قرآن میں شناخت کرائی گئی ہے، جن کی ضرورت کا اشارہ اصحاب کہف کے قصہ میں ''فتیہ'' کے لفظ سے کیا گیا تھا۔

''واقعہ بھی یہی ہے کہ ''کہفی زندگی'' جس کا مشورہ فتنہ کے خاص زمانہ میں دیا گیا ہے۔اس میں ایمانی زندگی کے بچانے میں کچھ امداد اگر مل سکتی ہے تو اسی قسم کے دیندار رفیقوں سے مل سکتی ہے جن کی زندگی کا دین ناگزیر اندرونی اقتضاء بن گیا ہے، ورنہ باہر سے لادے اور عاید کیے ہوئے آئین وقانون کی شکل میں دینی زندگی کو جو نباہ رہے ہوں، فتنہ کے طوفانی دور کے ان تھپیڑوں کی چوٹ کو صحیح معنوں میں وہ مشکل ہی سے برداشت کر سکتے ہیں۔''

یہ حکم اسی مذکورۂ بالا فقرہ پر ختم نہیں ہے بلکہ آگے تین چار فقرے اور ہیں، پہلا فقرہ ہے۔

وَلَاتَعۡدُ عَيۡنَاکَ عَنۡهُمۡ يُرِيۡدُ زِيۡنَةَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا

اور نہ پھریں تیری آنکھیں ان رفیقوں سے چاہتے ہوئے حیات دنیا کی زینت کو۔

اس فقرہ سے مولانا نے رفقاء کے تعلقات کی نوعیت متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔اس سلسلہ میں مولانا کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن ان الفاظ سے یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ اہل دین کو اس کی تو اجازت نہیں ہے کہ وہ زینتِ حیات دنیا کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائیں اور صرف اسی کی جستجو میں اپنی ساری توانائیاں صرف کردیں، البتہ اپنی خاص افتادِ طبع اور شخصی ذوق ورجحانات کے زیر اثر اگر دینی زندگی کی رفاقت میں کوئی رفیق زینت کی مد کی چیزوں کو زندگی کے مختلف شعبوں مثلاً لباس وطعام وغیرہ میں نصب العین بنائے بغیر استعمال کرتا ہو یا استعمال کرنے کا عادی ہو تو اس کے اس طرز عمل کو دینی رفاقت کے رشتہ کے منافی نہیں قرار دینا چاہیے۔اس لیے کہ اس معاملہ میں ذوق وطبائع کا اختلاف ایک حقیقت ہے اور اس کی رعایت اگر نہ کی جائے گی تو رفاقت کے رشتہ کا نبھنا مشکل ہے۔

کوئی شبہ نہیں کہ بات اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے۔مگر ان الفاظ قرآنی کا مقصد یہ سمجھنا ہمارے خیال میں محض مولانا کا انتقال ذہنی ہے، بظاہر اس فقرہ کا مقصد یہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ (جیسا کہ خود مولانا نے بھی آگے چل کر اس پہلو کو لیا ہے) زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ ''عوامی معیار زندگی کی بلندی'' وغیرہ جیسی معصوم اور خوشنما تعبیروں کے پردہ میں حیات دنیا کی زینت کو نصب العین بنالینے کا جو فتنہ جیسا کہ دیکھا جا رہا ہے، دجّالی عہد میں پیدا ہو جاتا ہے، قرآن کے ان الفاظ میں اسی فتنہ سے خبردار کیا گیا ہے، اور اس کے بعد والے فقرے

وَلَاتُطِعۡ مَنۡ اَغۡفَلۡنَا قلبه عَنۡ ذِکۡرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَکَانَ اَمۡرُهٗ فُرُطًا

اور مت مان اس شخص کی بات جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل بنادیا ہے اور وہ پیچھے چل پڑا ہے اپنی ''ہوا'' کے اور ہے کام اس کا غیر متوازن بے ڈھنگا۔

میں جن لوگوں کو اطاعت سے منع کیا گیا ہے، وہ درحقیقت وہی لوگ ہیں جو اپنی زندگی کا نصب العین ''زینة الحیوٰة الدُّنیَا'' کو بنالیں۔اس لیے کہ یہ اوصاف جو مذکورۂ بالا فقرہ میں بیان ہوئے ہیں، انہیں لوگوں کے خصوصی اوصاف ہیں جن کا نصب العین حیات دنیا کی زینت بن جائے......اس اجمال کی تفصیل مولانا کے الفاظ میں پڑھیے، فرماتے ہیں:

''عوامی زندگی کی بلندی وبرتری کا صُور انسانی آبادیوں میں آج جو پھونک رہے ہیں اور اسی کا

شور دنیا میں مچائے ہوئے ہیں اُن کی پیشانی کی یہ قرآنی لکیریں کیا ایسی لکیریں ہیں جن کے لیے کچھ زیادہ غور و تامل کی ضرورت ہے۔ وہ جو بھی ہوں اور جہاں بھی کھڑے ہوں ان کے تمام خصوصیات میں شاید سب سے نمایاں یہی خصوصیتیں ہیں جنہیں ہر دیکھنے والا دیکھ سکتا ہے، اور ان ہی قرآنی الفاظ سے ان کو پہچان سکتا ہے۔

بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ حدیثوں میں جیسے المسیح الدجال کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ ''ک ف ر'' (کفر) اس کی پیشانی کی ایسی نمایاں خصوصیت ہوگی جسے پڑھنے والے اور ان پڑھ دونوں ہی پڑھ لیں گے، کچھ یہی حال ان الفاظ کا نظر آتا ہے جنہیں پڑھنے والے اور اَن پڑھ دونوں ہی اس قول کے قائلین کی پیشانیوں میں چاہیں تو پڑھ سکتے ہیں۔

دیکھئے یہ فقرہ تین اجزاء پر مشتمل ہے اور مجھے تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر پچھلا جز پہلے جز کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے۔

من اغفلنا قلبہ عن ذکرنا

جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل بنا دیا

یہ اس فقرے کا پہلا جز ہے، ارادی طغیانیوں اور اختیار و اقتدار کی بدمستیوں کے عذاب کی یہ عام قرآنی تعبیر ہے، ان مجرموں کو پہلی سزا قدرت کی طرف سے یہی ملتی ہے کہ زندگی کے بنیادی حقائق کی تلاش و جستجو کا جو احساس انسانی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے، وہی احساس بتدریج معطل و مفلوج ہوتے ہوئے تباہی کے ان حدود تک پہنچ جاتا ہے جن کے مختلف مدارج کو قرآن نے ختم و رین، غشاوہ و اضلال و اغفال کے ناموں سے موسوم کیا ہے۔ قرآن میں انسانی نفسیات کے جو مسائل ہیں ان میں ذہنی اور فکری سزاؤں کی ان شکلوں اور ان کے باہمی امتیازات کو خاص اہمیت حاصل ہے جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔

بہرحال سزایابی کی اس نفسیاتی گرفت کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ جینے کا جو دستور بھی ذہنی عذاب کی اس حالت میں بنانے والے بنائیں گے اس کا زندگی کے بنیادی حقوق سے کوئی تعلق نہ ہوگا جیسا کہ معلوم ہے عربی زبان میں اسی قسم کے بے بنیاد، پادر ہوا، من مانی باتوں کو ''ھویٰ'' کہتے ہیں۔ فقرۂ بالا کے دوسرے جز

واتبع ھواہ

اور پیچھے چل پڑا وہ اپنی ''ہوا'' کے

کے الفاظ سے اسی لازمی نتیجہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

تیسرا جزء فقرے کا

وکان امرہ فرطا

اور ہے کام اس کا ''فرط''

Marfat.com

ہے، ہر وہ بات یا چیز جو اپنی قدرتی حد و مقدار سے ہٹ گئی ہے، بالفاظ دگر ہر بے ڈھنگے، غیر متوازن امر کو عربی میں ''فرط'' کہتے ہیں، اور جب بنیاد سے الگ ہو کر ''ہوائی ضابطہ'' کے تحت زندگی گزاری جائے تو یقین مانئے کہ اس کا انجام فرط اور غیر متوازی ہی شکل میں سامنے آئے گا۔ آج دنیا افراط و تفریط کے ان ہی ہچکولوں میں جھول رہی ہے۔

''عوامی زندگی کے برتری'' کی نصب العین والوں ہی کو دیکھئے، سرمایہ داری کے خبط میں فیصلہ کیا گیا کہ ایک کی اسیری کے لیے سارے غرباء کو مرنا پڑے تو ان کو مر جانا چاہیے، اور اشتراکیت کا بھوت جب سے سوار ہوا ہے تو اب دھمکایا جا رہا ہے کہ ایک غریب کے لیے سارے امیروں کو غریب بنا دیا جائے گا اور عدمِ توازن یا فرطیت کی یہ کیفیت زندگی کے کسی ایک شعبہ ہی کے ساتھ مختص نہیں ہے، بلکہ جس راہ میں بھی ان کا جو قدم ''ہوائی دستور'' کے زیر اثر اٹھا ہے وہ قرآن کی بیان کی ہوئی صفت ''فرط'' کی خصوصیتوں ہی کے ساتھ اُٹھا ہے۔''

بہر حال جو لوگ حیات دنیا کی زینت کو مقصود بنا کر زندگی گزاریں، ان کے متعلق ایک تو یہ منفی حکم (اطاعت نہ کرنے کا) دیا گیا ہے جس کا حاصل مولانا کے الفاظ میں یہ ہے کہ

''انہیں کو دیکھ دیکھ کر قدم اُٹھانا اور زندگی کے ہر پہلو میں ان ہی کے عملی نمونوں اور علمی مشوروں کی طرف تاکتے جھانکتے رہنا، اس کی ممانعت فرمائی گئی ہے۔''

اور اس کے مطابق مومن کا فرض ہے کہ ان لوگوں کی جو علامات بیان کی گئی ہیں وہ جن لوگوں میں بھی پائی جاتی ہوں، خواہ ان کی پیروی کی طرف بلانے والے ''شائستہ و متمدن اقوام'' جیسے کتنے ہی خوشنما بدعنوانوں سے انہیں روشناس کرائیں۔ ان کی نافرمانی کے ''ربانی فرمان پر عزم و ارادہ کی پوری قوت کے ساتھ ڈٹ جائے۔''
اور مومن کا فرض ''پرہیز و گریز'' کے منفی عمل ہی پر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ آگے ایک مثبت حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

قُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ

کہہ! جو حق ہے تمہارے پالنے والے کی طرف سے

''جس سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ حالات کیسے ہی گئے گزرے ہوں، اور جو کچھ بھی ہو رہا ہو۔ لیکن بہر حال الحق اور زندگی کی جو حقیقی سچائیاں ہیں، ان کا اعلان بھی کئے چلا ہی جانا چاہیے، تقریر سے ہو یا تحریر سے، یا قول کا جو بھی ذریعہ ہو، مومن مکلّف ہے کہ وہ ان سچائیوں اور صداقتوں کو دوہراتا رہے۔''

فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ

پھر جس کا جی چاہے مانے اور جس کا جی چاہے (نہ مانے) انکار کر دے۔

Marfat.com

یہ تھیں قصہٗ اصحاب کہف کے بعد کی وہ آیتیں جن کے بعد مولانا نے تحریر فرمایا تھا کہ ''مقصد پورا ہو چکا ہے''......لہٰذا اب ہم طوالت سے بچنے کے لیے بقیہ مضمون میں سے مولانا کے صرف اہم اور خصوصی افادات پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔

بقیہ مضمون کے اہم افادات

(۱)

گذشتہ آیات کے بعد صرف دو تین ہی آیتوں کو چھوڑ کر اس سورت میں ''واضرب لهم مثلا الرجلين'' کے الفاظ سے دو آدمیوں کا ایک تمثیلی قصہ شروع ہوا ہے، جن میں سے ایک کے پاس دو سرسبز و شاداب باغ تھے، جن کے بیچ میں ایک نہر بھی جاری تھی، جو ان کی سرسبزی و بارآوری کی بڑی ضمانت تھی۔ ان باغات کے علاوہ بھی کافی مال و دولت اور جاہ و عزت اللہ تعالیٰ نے اس کو بخش رکھی تھی۔ دوسرے کا حال اس سے مختلف تھا، غربت تھی یا نسبتاً قلت، بہرحال اول الذکر جو اپنے تمول اور خوش حالی کے متعلق اس خبط میں مبتلا ہو گیا تھا کہ یہ سب بجائے اس کے خالق و مالک کے فضل و کرم کے، اس کی اپنی دماغی اور جسمانی کاوشوں کا نتیجہ ہے اور جب تک اس کے جسم و دماغ کی قوت باقی ہے یہ سب یوں ہی رہے گا، اس نے ایک موقع پر اپنے باغ پر نظر ڈالتے ہوئے اپنی ذہانت و قوت کے پندار میں ڈوب کر ثانی الذکر کے سامنے ان خیالات کا اظہار کیا۔ دوسرا شخص جسے ایمان و عرفان کی دولت نصیب تھی اس نے اسے اس پندار بے جا پر ٹوکا اور کہا کہ یہ سب اللہ کا فضل سمجھنا چاہیے۔ اصل قدرت اسی کی قدرت ہے، وہ اگر چاہے تو تمہاری ساری حکمت و جدوجہد کے باوجود ان ہرے بھرے باغات کو چٹیل میدان میں تبدیل کر دے اور تم دیکھتے رہ جاؤ۔

آگے فرمایا گیا ہے کہ اس کے ساتھ ایسا ہی ہوا اور پھر بیچارہ نے کفِ افسوس ملتے ہوئے کہا۔

يالیتني لم اشرک بربي احدا

اے کاش! نہ شریک کرتا میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو

ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شرک کی گمراہی میں مبتلا تھا اور اپنی تباہ حالی کو وہ اپنے اس جرم کی سزا سمجھ رہا تھا، مگر قصہ میں جو باتیں اس کی طرف منسوب کی گئی ہیں اُن میں کوئی بات بھی بظاہر مشرکانہ قسم کی نہیں ہے۔ پھر اس شرک کی آخر کیا حقیقت تھی جس پر وہ اس بُری طرح پچھتا رہا تھا؟ یہ ایک سوال ہے جس پر بقول مولانا مرحوم ''مفسرین بھی حیران ہیں''۔

مولانا اس سوال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ اس شخص کا شرک غیر خدائی قوتوں کی پوجا پاٹ والا شرک نہیں تھا۔ بلکہ اس کا شرک یہ تھا، جو قصہ میں پوری طرح مذکور ہے کہ اُس نے کارخانۂ قدرت کے اندر بجائے خالق کائنات

کے اسباب اور انسانی تدابیر کو کارفرما ٹھہرا لیا تھا، چنانچہ وہ اپنے باغات کی سرسبزی و شادابی اور اپنی دولتمندی کو محض اپنی اسبابی تدابیر کا نتیجہ سمجھ رہا تھا اور ان کے بھروسے پر یہاں تک کہنے کی جرأت کر رہا تھا کہ

ماظن ان تبید هذه ابدا

میں نہیں سمجھتا کہ میری محنت و تدبیر کا یہ پھل کبھی برباد ہوگا۔

جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اُس کے خیال میں کاروبارِ دنیا میں مشیت الٰہی کو کوئی دخل ہی نہیں تھا، جو حقیقت میں شرک کی بدترین قسم ہے، کیونکہ پوجا پاٹ والے شرک میں صرف عبادت و دعا میں غیر خدائی قوتوں کو شریک کیا جاتا ہے، باقی اس عالم کے نظام کو اللہ تعالیٰ ہی کے مشیت کے تابع سمجھا جاتا ہے۔

اس عقدہ کو حل کرنے کے بعد مولانا نے اس ذیل میں ایک اور بصیرت افروز بات فرمائی ہے......فرماتے ہیں کہ دیکھیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سورت کا دجالی فتنہ سے جو خاص تعلق بتایا ہے، وہ اس موقع پر کتنا صاف نظر آ رہا ہے۔ ادھر جب سے دجالی فتنہ کی ابتدا ہوئی ہے، پرانے قسم کے پوجا پاٹ والے شرک کا رواج تو گھٹ رہا ہے مگر یہ ماڈرن قسم کی مشرکانہ ذہنیت برابر لوگوں پر مسلط ہوتی جا رہی ہے جس کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اسی سورت میں کیا گیا ہے اور پھر تمثیلی انداز میں اس کا انجام دکھا کر کم از کم اہل ایمان کو متنبہ کر دیا گیا ہے کہ

> ''دنیا ہو یا آخرت، کسی میں [بھی] بہترین نتائج اور بہترین انجام کی ضمانت صرف اس یقین میں پوشیدہ ہے کہ عالم کی ولایت اور کارفرمائی صرف حق تعالیٰ کی ذات پاک کے ساتھ محدود و مختص ہے......یہی مفاد و مطلب ہے قصہ کے آخری فقرہ کا ''هنا لک الولاية لله الحق هو خير ثوابا و خير عقبا.''

(۲)

اس سورت کے مشتملات میں حضرت موسیٰ و خضر علیہا السلام کا مشہور قصہ بھی ہے۔ یہ قصہ تین اجزاء پر مشتمل ہے۔

(۱) حضرت خضر علیہ السلام کا غریب ملاحوں کی کشتی کو ایک ظالم حکمراں کی دستبرد سے بچانے کے لیے اس میں شگاف ڈالنا۔

(۲) ایک بے گناہ لڑکے کو اس اندیشہ سے قتل کرنا کہ یہ اپنے کفر و سرکشی کے حال سے اپنے والدین کو مغلوب نہ کرے۔

(۳) ایک نیک آدمی کے یتیم بچوں کے موروثی خزانے کی حفاظت کے خیال سے ایک شکستہ دیوار کی بلا معاوضہ مرمت کر دینا جس کے نیچے ان کا خزانہ دبا ہوا تھا۔

Marfat.com

مولانا نے قصہ کے ان تینوں اجزاء کو عملی درس کے تین نمونے قرار دے کر قریبی دور کی ایک مثال کے ذریعہ دکھلایا ہے کہ دجالی فتنہ کے عہد میں ان نمونوں کے مطابق عمل کر کے فتنہ کے بعض پہلوؤں کی پیدا کردہ مشکلات کا حل کس طرح کیا جاسکتا ہے۔

یہ مثال واقعات سے مولانا کی نکتہ آفرینی کی خوب ہی مثال ہے۔ فرماتے ہیں:

''جب یورپ و امریکا سے موجودہ دجالی فتنہ کا سیلاب مشرق کی طرف اُمنڈا اور اس کے رُوح کُش، ایمان رُبا تھپیڑوں کی زد میں شاید سب سے پہلے ہمارا ملک ہندوستان ہی آیا اور مسلمانوں کی حکومت اس ملک میں تہہ و بالا ہوگئی۔ چاہنے والوں نے پہلے تو یہی چاہا کہ ظلم ہی کا ازالہ کیا جائے، لیکن تجربے نے بتایا کہ ظالم کے ہٹنے کا وقت ابھی نہیں آیا ہے۔ تب کہفی زندگی کے مذکورۂ بالا مشاغل کے لیے دینی مدارس کا نظام ملک کے مختلف گوشوں میں قائم کیا گیا اور ایسے زمانہ میں قائم کیا گیا، جب اسی ہندوستان میں یورپ کے علوم جدیدہ کی تعلیم کے لیے ملک کے طول و عرض میں اسکولوں اور کالجوں کا جال مختلف یونیورسٹیوں کے تحت بچھایا جارہا تھا، ان جدید جامعات اور کلیات مدارس کے طویل و عریض وفاقوں کے مقابلے میں غریب عربی مدارس کی جو حیثیت تھی وہ تو خیر تھی ہی، ماسوا اس کے عربی کی ان تعلیم گاہوں کے قیام میں نہ اخباروں میں پروپگنڈے سے کام لیا گیا، نہ پریس کی دنیا میں ہلچل پیدا کی گئی۔ دیواروں اور نمایاں مقامات پر نہ لمبے چوڑے پوسٹر آویزاں اور چسپاں کیے گئے۔ نہ شہروں اور قصبوں میں کانفرنسوں اور سالانہ اجتماعات کے سالانہ تماشوں کا نظم کیا گیا، نہ ان کے لیے اپنا کوئی خاص لٹریچر تیار کیا گیا، بلکہ انتہائی کس مپرسی کے حالات میں گمنام قصبوں اور دیہاتوں کی مسجدوں کے گوشوں میں کچھ پڑھنے والے اور پڑھانے والے سمٹ گئے تھے، تعلیمی نصاب نہ صرف نقائص و عیوب سے معمور تھا، نہ عصری تقاضوں کے مطابق علوم وفنون کی کتابیں اس میں شریک تھیں، اور نہ دنیا کی موجودہ علمی زبانوں میں سے کسی زبان کو اس نصاب میں جگہ دی گئی۔ ما اوحی الیک من ربک یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) پر جن علوم کی وحی کی گئی تھی ان کے ساتھ عہد قدیم کے بعض قدیم فرسودہ فنون کی کتابیں اور وہ بھی انتہائی بے دلی کے ساتھ ان عربی مدرسوں میں پڑھائی جارہی تھیں، الغرض ظاہر ہو یا باطن اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ ان مدارس میں شگاف ہی شگاف اور خرق ہی خرق دیکھنے والی آنکھوں کو نظر آرہے تھے، اسی کا نتیجہ یہ تھا اور شاید اب تک ہے کہ یورپ و امریکہ جیسے ترقی یافتہ ممالک و اقالیم تک ہی نہیں، بلکہ یہ واقعہ ہے کہ خود ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ ان سے یا کم از کم ان کی قدر و قیمت سے نا آشنا ہی رہا۔ میں دوسروں کے متعلق کیا کہوں اپنے دینی مدارس کی ان شکستہ حالیوں اور پڑھنے پڑھانے

Marfat.com

والوں کی شکستہ بالیوں، ان کی کس مپرسیوں، ناقدریوں کو دیکھ دیکھ کر خود میرا جی ہمیشہ کڑھتا رہا اور جو عیوب و نقائص ان میں ہیں ان کو میں اب بھی عیوب و نقائص ہی سمجھتا ہوں، لیکن جیسے کھلے دماغ کے ساتھ ان کوتاہیوں کا مجھے اعتراف ہے، اسی کے ساتھ اس واقعہ اور مشاہدہ کا بھی کیسے انکار کروں کہ ہمارے ان مدارس کے جن شگافوں اور کوتاہیوں کو دیکھ دیکھ کر بہی خواہوں کی طرف سے نوحہ خوانیوں اور ماتم سرائیوں کا سلسلہ اس قسم کے الفاظ اور تعبیروں میں جاری تھا۔ کہا جاتا تھا کہ یہاں سے پڑھ پڑھ کر نکلنے والے

نہ سرکار میں کام پانے کے قابل   نہ دربار میں لب ہلانے قابل
نہ بازار میں بوجھ اٹھانے کے قابل   نہ جنگل میں ریوڑ چرانے کے قابل

(حالی)

اسی لیے بعض فیصلہ کرنے والوں نے یہ فیصلہ تک کر دیا تھا کہ ؎

ان سے تو اب تلافیِ مافات ہو چکی
بس لوٹ دو بساط کہ یاں مات ہو چکی

(ڈپٹی نذیر احمد)

جہاں تک میرا خیال ہے، بجائے معاندانہ تعریفوں، رقیبانہ طنز اور طعنوں کے اس قسم کی تنقیدوں کی نوعیت بھی اگر وہی قرار دی جائے جو موسیٰ علیہ السلام کے اس اعتراض کی تھی جب کشتی کے شگاف اور خرق کو دیکھ کر انہوں نے خضر علیہ السلام کو مخاطب بنا کر فرمایا تھا، کہ

اخرقتها لتغرق اهلها القد جئت شيئا امرا

کیا تم نے کشتی میں شگاف اس لیے پیدا کر دیا کہ کشتی والوں کو ڈبو دو، تم نے بڑا نامناسب کام کیا۔

لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ مذکورۂ بالا عیوب و نقائص سے پاک کر کے ان مدارس کو بھی عصری جامعات اور کلیات کے مطابق اگر بنا دیا جاتا اور جن صلاحیتوں کے فقدان کا مرثیہ ان کے متعلق پڑھا جا رہا تھا، اگر ان میں ان صلاحیتوں کے پیدا کرنے کا سامان بھی کر دیا جاتا، تو دینی فتنے کے پچھلے تاریک و تار دنوں میں بچی کھچی نجات کی کچھ کشتیاں ان لوگوں کو جو میسر آتی رہی ہیں، جو ایمان و عمل صالح کی زندگی کے ساتھ قبر کے کناروں تک پہنچنے میں اب تک کامیاب ہوئے ہیں، کیا ہم نجات کی ان کشتیوں کو پا سکتے تھے، یہ ان ہی کس مپرس دینی مدارس کا طفیل ہے کہ اسلامی گھرانوں کے چند ایسے افراد کی دینی تربیت و پرداخت کا موقع مل گیا، جو سرفرازی اور سربلندی کے عصری سامانوں سے اگر لیس ہوتے، تو بجائے پرانے قصبات کی اُجڑی ہوئی مسجدوں، سُونی خانقاہوں کے یقین مانئے کہ لندن کے انڈیا آفس اور پارلیمان میں وہ نظر آتے، یا کم از کم ہندوستان کی اسمبلیوں، کونسلوں، ہائی کورٹوں کی زیب و زینت بن کر وہ ختم ہو جاتے۔

Marfat.com

بلکہ تجربہ یہ بتارہا ہے کہ دین کے جن مدارس میں وقت کے تقاضوں کی رعایت کی گئی، حکومت کی نگاہوں میں وہ چڑھ گئے، پھر ان کے ختم ہی کردینے کا ارادہ کیا گیا، یا ان کو بھی اپنے اغراض ومقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنالیا گیا، چل تو وہ رہے ہیں اب بھی دینی مدارس ہی کے نام سے، لیکن جاننے والے ہی جانتے ہیں کہ ان مدارس سے فارغ ہونے والے کام کس کے آرہے ہیں۔ یہ سامنے کے واقعات اور مشاہدات ہیں، ہر دیکھنے والی آنکھ ان نتائج کو دیکھ رہی ہے، اور اس وقت سمجھ میں آتا ہے کہ کہفی رنگ کے دینی مدارس کے خضر صفت بانیوں نے خرق وشگاف کے ان عیوب و نقائص کو ان میں کن مصلحتوں کے تحت باقی رکھا۔ صرف یہی نہیں، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مسلمان باپوں اور مسلمان ماؤں کے بچوں کو ان کی گودوں سے چھین چھین کر عصری جامعات اور یونیورسٹیوں میں داخل کر کے طغیان وسرکشی، الحاد وارتداد کے کافرانہ جراثیم ان کے دل ودماغ میں ایک طرف جہاں پرورش کر رہے تھے[1]، تو دوسری طرف ان کے مقابلے میں ہمارے یہی کہفی مدارس تھے جنہوں نے مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کے ایک طبقے کو خواہ ان کی تعداد جتنی بھی کم ہو، اعتقادی واخلاقی گندگیوں سے پاک رکھنے کی کامیاب کوشش کی۔ میں کلّی طہارت وزکوٰۃ وپاکیزگی کا مدعی نہیں ہوں، لیکن بایں ہمہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ کہفی سلسلہ کی تعلیم گاہوں میں تعلیم پانے والوں میں ایسے افراد عموماً پیدا ہوتے رہے ہیں جو قرآنی الفاظ ''خیراً منہ زکوٰۃً'' (بہتر ہو، اس سے (اعتقادی اخلاقی) پاکیزگی میں) کے مصداق بن سکتے ہیں، یعنی اعتقادی واخلاقی پاکیزگی جیسے چاہیے اس کے وہ مالک ہوں یا نہ ہوں، لیکن فتنہ زدہ، دجّالی یونیورسٹیوں کے طیلسانیوں کی اکثریت کے مقابلے میں نسبتاً اضافی پاکیزگی کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اور گو معاشی نقطۂ نظر سے جدید تعلیم گاہوں کے پڑھنے والوں کی حالت بظاہر بہتر ہی کیوں نہ نظر آتی ہو، لیکن دین کے متعلق ان کی کافی تعداد نے اپنے طرزِ عمل سے خود یہ ثابت کر کے دکھایا کہ اسلام کے لیے ان کا عدم ان کے وجود سے بہتر تھا، جس قسم کے شکوک وشبہات کی چنگاریاں عام مسلمانوں میں ان کی طرف سے اڑائی گئیں، اسلامی عقائد واعمال کی تحقیر وتوہین کے سلسلہ میں جن ناگفتنیوں اور ناکردنیوں کے وہ مرتکب ہوئے، خود ان ہی نے ان کو اس فیصلہ کا مستحق بنادیا کہ اسلام کے ان کپوت فرزندوں کی نیستی ان کی ہستی سے یقیناً بہتر تھی۔

اسی طرح حضرت خضر علیہ السلام نے اجر ومزد کے خیال سے بالاتر ہوکر تعمیر دیوار کا جو عملی نمونہ اس آبادی میں پیش کیا تھا، جس کے باشندوں نے ان کی تحقیر وتوہین کو آخری حدود تک پہنچادیا تھا، آپ چاہیں تو ان ہی کہفی مدارس میں جو دجّالی فتنہ کے استیلاء وتسلط کے بعد اس ملک میں قائم ہوئے، ان میں اس نمونے اور اس کے سارے پہلوؤں کا کسی نہ کسی شکل میں مشاہدہ کرسکتے ہیں۔

کیسی عجیب بات ہے کہ مسلمانوں ہی کے اسلاف نے معارف وعلوم کا جو متروکہ سرمایہ دنیا میں چھوڑا تھا اور حکومت کی دیوار جس وقت اس ملک میں منہدم ہورہی تھی اس وقت مسلمانوں کا یہ موروثی ترکہ بدترین خطرات سے دوچار ہوگیا تھا، آنے والی نسلیں جدید جامعات اور یونیورسٹیوں میں بھیڑیا دھسان شکل میں دھنستی چلی جارہی تھیں، مسلمانان درگور ومسلمانی درکتاب کا دردناک نظارہ بے نقاب ہوکر دھمکیاں دے رہا تھا کہ کچھ دن اور ابھی غفلت سے اگر کام لیا گیا تو کتابوں والی مسلمانی بھی کیڑوں کے پیٹوں میں دفن ہوجائے گی۔

Marfat.com

لیکن چند خضروش، خضر خصال بزرگوں نے کمر ہمت چست کی اور یہ تو نہ کر سکے کہ جیسے تیرہ سو سال سے جو کتابیں حکومت کے آئین و دستور کی حیثیت سے استعمال ہو رہی تھیں، ان کی اس حیثیت کو باقی رکھیں، لیکن مسلمانوں کے صالح اسلاف کے اس موروثی ترکہ کی حفاظت اور ایک نسل سے دوسری نسلوں تک اس کو مسلسل منتقل کرنے کا ایسا بندوبست بہرحال انہوں نے کر دیا کہ جب کبھی مسلمانوں کی آئندہ نسلوں میں سے کسی نسل کو اپنے پاؤں پر خود کھڑے ہو جانے کا موقع کبھی مل گیا اور ایمانی ہوش دینی حواس پھر ان میں کبھی واپس ہوا تو اس وقت بالکل تروتازہ حالت میں اپنے اس موروثی ترکہ کی ایک ایک چیز ان شاء اللہ تعالیٰ ان کو مل جائے گی۔ جس طرح چاہیں گے ان سے وہ اس وقت مستفید ہو سکتے ہیں اور گو خود مسلمانوں کی طرف سے ان کی عزت و آبرو کی دھجیاں اُڑائی گئیں، ان کا نام مسجد کے ملّا نے، خیرات کی روٹیاں توڑنے والے، قل اعوذ دیئے، ازیں قبیل تنابز بالالقاب کی جو صورتیں بھی ممکن تھیں شاید ہی کوئی صورت ایسی باقی رہ گئی ہے جسے اختیار کرنے والوں نے اس راہ میں اختیار نہ کیا ہو۔

لیکن با ایں ہمہ اجر و معاوضہ کے خیال سے بلند و بالا ہو کر یہ میرا مشاہدہ ہے کہ اس خدمت کو جس کی قیمت دوسری جگہ سینکڑوں اور ہزاروں کی شکل میں مل رہی تھیں، اسی خدمت کو، بخدا اسی خدمت کو اللہ کے یہ وفادار بندے اور رسول علیہ السلام کے سچے راست باز جاں باز خدام بغیر معاوضہ یا قلیل ترین معاوضہ کے [ساتھ] بصد خندہ جبینی انجام دینے میں مشغول رہے۔[۴۲]

(۳)

قصہ موسیٰ و خضر علیہما السلام کے بعد ذوالقرنین کا قصہ آتا ہے۔ جس میں ''یاجوج و ماجوج'' اور دیگر اقوام پر ان کی مفسدانہ کارروائیوں کی روک کے لیے ایک دیوار بنائے جانے کا تذکرہ بھی ہے۔ اس ذیل میں یہ الفاظ آئے ہیں۔

وترکنا بعضھم یومئذ یموج فی بعض

اور چھوڑ دیا ہم نے (ان کو اس حال میں) کہ اس عرصہ میں بعض ان میں سے موج مارتے تھے بعض کے ساتھ۔

یعنی جب دیوار کے قائم ہو جانے کی وجہ سے دوسری قوموں تک ان کی رسائی بند ہو گئی تو اس عرصہ میں ان کا جو حال رہا قرآن اسے ''بعضھم یموج فی بعض'' کے ذریعہ ادا کرتا ہے...... اس تعبیر کا مدعا کیا ہے، آیا وہ غیروں سے مایوس ہو جانے کے بعد باہم دست و گریبان رہنے لگے یا باہم امداد و مواساۃ کی زندگی بسر کرتے تھے؟ مولانا فرماتے ہیں کہ ان دونوں میں سے ہر ایک مفہوم کے لیے عربی زبان میں بیسیوں تعبیریں مل سکتی تھیں۔ لہٰذا

''ان میں سے کسی ایک...... کے ساتھ قرآنی الفاظ اور تعبیر کو محدود کر دینا غالباً صحیح نہ ہوگا۔''

اس کے بعد اس سوال کا کہ ''پھر ان الفاظ کا مطلب کیا سمجھا جائے؟'' جواب دیتے ہیں:

''ظاہر ہے کہ موج کا لفظ اور دریا کی متلاطم سطح اور اس پر ابھرنے والی موجوں کی جس تصویر کو

Marfat.com

بے نقاب کر رہا ہے اسی تصویر کو ہم اپنے سامنے رکھ کر قرآن جو کچھ سمجھانا چاہتا ہے اسے کیوں نہ سمجھیں، کوئی مانے یا نہ مانے لیکن فقیر کا ذہن تو یہی پاتا ہے کہ غیروں سے ہٹ جانے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے اس دور میں یاجوج و ماجوج کی قوم کی زندگی صرف اضطراب و بیقراری، ہنگامہ اور لرزش و جنبش بن کر رہ گئی تھی۔ ایسے مشاغل میں وہ مبتلا تھے جن میں صبح و شام، شب و روز تگ و دو، دوڑ دھوپ، آمد و رفت، چلنے پھرنے، دوڑنے بھاگنے کے ہنگامے ہی برپا رہتے ہیں۔

یہ تو ان کی عام زندگی کا غالباً نقشہ تھا، اور باہم اس قوم کی مختلف ٹولیاں ایک دوسرے کے ساتھ الجھی بھی رہتی تھیں، لیکن اسی کے ساتھ ان میں سے کوئی ٹولی دوسری ٹولی کو کلیتہً ختم کرنے کا بھی فیصلہ اس لیے نہیں کر سکتی تھی کہ اس میں خود اپنے وجود کے اختتام کا خطرہ اس کو محسوس ہوتا تھا، کچھ حالات اس قوم کے ایسے تھے کہ نہ ایک دوسرے سے کلیتہً الگ ہی ہو سکتے تھے ورنہ ان میں سے کوئی دوسرے سے ٹوٹ کر یا جدا ہو کر فنا ہونے ہی کے لیے تیار تھا، گویا ان میں وہی تعلقات قائم تھے جو باہم دریا کی موجوں میں ہوتے ہیں۔ بایں طور کہ باہم ایک دوسرے کو دھکیلتے بھی رہتے ہیں، لیکن اسی کشمکش میں ارادی یا غیر ارادی طور پر ایک کو دوسرے سے آگے بڑھ جانے میں مدد بھی مسلسل ملتی چلی جاتی تھی۔

اسی کے ساتھ میرا دھیان بعضهم يومئذ يموج في بعض کے الفاظ سے کچھ ادھر بھی جاتا ہے کہ تبعیض و تجزّی یعنی باخود یاجوج و ماجوج کی تقسیم بھی محدود نہ تھی، بلکہ موجوں کا جو حال ہوتا ہے کہ ان کو کوئی گنا چاہے تو گن نہیں سکتا، ان میں بڑی موجیں بھی ہوتی ہیں اور چھوٹی بھی، کچھ یہی حال معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے اس دور میں ان کا ہو گیا تھا کہ ان گنت، بے شمار ٹولیوں میں وہ بٹے ہوئے تھے۔

خلاصہ یہ کہ غیروں میں تو فساد اور بگاڑ پیدا کرنا یہی یاجوج و ماجوج والوں کا شیوہ تھا اور خود باہم ایک دوسرے کے ساتھ موجی تعلقات رکھتے تھے۔"

اس کے بعد ان الفاظ میں کے پہلے لفظ "تركنا" پر غور فرماتے ہیں اور یاجوج و ماجوج کے متعلق روایات کے ذخیرہ میں یہ جو روایت پائی جاتی ہے کہ

یاجوج و ماجوج لم يكن فيهم صديق قط ولا يكون ابدا، (درمنثور۔ جلد ۴ صفحہ ۲۵۰)

"یاجوج و ماجوج میں نہ کبھی کوئی "صدیق" ہوا اور نہ کبھی ہوگا۔

اس روایت کی مدد سے یہ نکتہ لاتے ہیں کہ

Marfat.com

''زندگی کے اس دور میں جب وہ [یاجوج و ماجوج] سراپا اضطراب اور ہمہ تن حرکت و گردش بن کر رہ گئے تھے قدرت نے بھی ان کو چھوڑ دیا تھا اور آسمانی راہنمائی نے ان کی دست گیری نہیں کی۔ اسی لیے ان کی تاریخ کا یہ عہد نبوات و رسالات اور ان کے آثار سے بالکل خالی ہو گیا۔

دیوار کی بندش کے ذریعہ غیر قوموں سے یاجوج و ماجوج کا رشتہ منقطع کیے جانے کے بعد دوبارہ ان کو غیر قوموں کی طرف رُخ کرنے کا موقع دیا جائے گا یا نہیں؟ قرآن اس بارے میں کیا کہتا ہے؟

مولانا فرماتے ہیں:

''سورۂ کہف میں تو نہیں، بلکہ سورۂ انبیاء کی مشہور آیت سے، یعنی

حتی اذا فتحت یاجوج و ماجوج و ھم من کل حدب ینسلون

تا اینکہ کھول دیے گئے یاجوج و ماجوج اور وہ ہر حدب سے تیزی کے ساتھ چل نکلے۔

سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر قوموں سے منقطع اور بے تعلق ہو جانے کے بعد پھر ان کو ایک موقع غیر قوموں کی طرف رُخ کرنے کا دیا جائے گا۔

اور متعدد دلائل و شواہد سے اس امر کو واضح فرماتے ہیں کہ یہ موقع قیامت سے کافی پہلے دیا جائے گا، بلکہ بقول مولانا کے ''کوئی کہنا چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ [ان کے] ظہور کے آغاز کی کرن گویا عہد نبوت میں پھوٹ چکی تھی۔''

رہا اس ظہور اور خروج کی تکمیل کا سوال کہ کب جا کر یہ مکمل ہو گا؟ اس بارے میں خود قرآنی الفاظ ''من کل حدب ینسلون'' کی جانب توجہ دلاتے ہوئے ''یوحنا عارف کے مکاشفہ'' کا ذکر فرماتے ہیں جو ایک چھوٹے سے رسالے کی شکل میں ''نیا عہد نامہ'' یعنی انجیل کے نام سے جو مجموعہ اہل کتاب میں موسوم ہے، اس کے آخر میں لگایا ہوا ہے...... لکھتے ہیں:

''کتاب کی ابتدائی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ یوحنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری ہیں اور ان کو کچھ غیبی مکاشفات ہوئے ہیں، جنہیں قلمبند کر کے ساتویں کلیسا کے نام ایک ایک نسخہ روانہ کیا گیا تھا، بہر حال آئندہ پیش آنے والے واقعات ہی سے زیادہ تر ان مکاشفوں کا تعلق ہے، منجملہ دوسرے مکاشفات کے ایک مکاشفات کے الفاظ یہ ہیں کہ:

''پھر میں نے آسمان کو کھلا ہوا دیکھا اور کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سفید گھوڑا ہے اور اُس پر ایک سوار ہے جو سچا اور برحق کہلاتا ہے، اور وہ راستی کے ساتھ انصاف اور لڑائی کرتا ہے، اور اس کی آنکھیں آگ کے شعلے ہیں اور اس کے سر پر بہت سے تاج ہیں اور اس کا ایک نام لکھا ہوا ہے جسے اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا، اور وہ خون کی چھڑکی ہوئی پوشاک پہنے ہوئے ہے اور اس کا نام کلامِ خدا کہلاتا ہے، اور آسمان کی فوجیں سفید گھوڑوں پر سوار اور سفید صاف مہین کتانی کپڑے پہنے اُس کے پیچھے پیچھے ہیں اور قوموں کے مارنے کے لیے اس کے منہ سے ایک تیز تلوار نکلتی ہے اور

وہ لوہے کے عصا سے ان پر حکومت کرے گا اور قادر مطلق خدا کے سخت غضب کی مے کے حوض میں ان کو روندے گا، اور اس کی پوشاک اور ران پر یہ نام لکھا ہوا ہے...... بادشاہوں کا بادشاہ اور خداوندکا خداوند۔(یوحنّا کا مکاشفہ۔۱۹۔۱۱تا۱۲)

نہیں کہا جا سکتا کہ "سچا اور برحق" کن الفاظ کا ترجمہ کیا گیا ہے، مگر "الصادق الامین "(صلی اللہ علیہ وسلم) سے کون واقف نہیں ہے ان سے بھی، ان بادشاہوں سے بھی، جن کے سر کے تاج ان کے نہیں، بلکہ اسی کے مقدس فرق مبارک کے تاج تھے، گھوڑوں پر چڑھے ہوئے فرشتوں کو بھی لوگوں نے بدر کے میدان میں دیکھا تھا جو انصاف کے مستحق تھے، ان کے ساتھ انصاف، اور جنہوں نے لڑنے کا ارادہ کیا ان کے ساتھ لڑائی، اور ان ہی لڑائیوں میں خون کے چھینٹوں کا دامن پر پڑنا، انہیں پہنچنے کے ساتھ ایسی حکومت قائم کرنا کہ شریروں کے حوصلے پست ہو گئے، اور جو مقابلے کے لیے کھڑے ہوئے وہ گرائے گئے، روندے گئے، بادشاہوں کے اس بادشاہ اور خداوندوں کے اس خداوند کو کون نہیں پہچانتا،

صلوات اللّٰہ علیہ و سلامہ

اسی مکاشفہ کے بعد دوسرا طویل مکاشفہ اور ہے، جس میں دکھایا گیا ہے کہ ایک فرشتہ آسمان سے اُترا اور اس نے:

"پرانے سانپ کو جو ابلیس اور شیطان ہے پکڑ کر ہزار برس کے لیے باندھا، اور اسے اتھاہ گڑھے میں ڈال کر بند کر دیا، اور اس پر مہر کر دی تا کہ وہ ہزار برس پورے ہونے تک قوموں کو پھر گمراہ نہ کرے۔" (ب۲۰: ۲۔۳)

آگے اسی کے بعد یہ کہتے ہوئے، کہ

"اس کے بعد ضرور ہے کہ تھوڑے عرصہ کے لیے کھولا جائے۔"

اسی تھوڑے عرصہ کے متعلق جس میں شیطان کا کھلنا بیان کیا ہے کہ ضروری ہے، اسی مکاشفہ میں اسی کی یہ تفصیل بھی پائی جاتی ہے، لکھا ہے کہ

"اور جب ہزار برس پورے ہو چکیں گے تو شیطان قید سے چھوڑ دیا جائے گا۔"

چھوٹ کر کیا کرے گا، مکاشفہ میں ہے:

"ان قوموں کو جو زمین کی چاروں طرف ہوں گی، یعنی یاجوج و ماجوج کو گمراہ کر کے لڑائی کے لیے جمع کرنے کو نکلے گا۔"

قرآن کے رو سے تو "من کل حدب" کے مفہوم کو ادا کرنے والے الفاظ چاہیے تھا کہ یہاں ہوتے۔

واللہ اعلم اصل مکاشفہ کی عبارت کیا تھی، جس کا مترجم نے ''زمین کے چاروں طرف'' کے الفاظ سے ترجمہ کیا ہے۔

اس تفصیل کے بعد فرماتے ہیں:

یر شدون۔ مانیں تا کہ وہ سیدھی راہ پر چل پڑیں۔

اس میں کارروائی کے اسی دو طرفہ پہلو کی طرف راہنمائی فرمائی گئی ہے، حاصل یہی ہے کہ مجھ سے کچھ لینا چاہتے ہو تو جو کچھ تم سے میں چاہتا ہوں اسے تم بھی پیش کرتے رہو۔ ''لعلھم یر شدون'' تا کہ وہ سیدھی راہ پر چڑھ جائیں کا مطلب یہی ہے، راہ یابی کا فطری طریقہ یہی ہے، لیکن جو خود تو سب کچھ لینا چاہتے ہوں مگر خود کسی قسم کی ذمہ داری اپنے اوپر اپنے پیدا کرنے والے کی لینا نہیں چاہتے، ان میں ایک طبقہ تو ان لوگوں کا ہے جنہوں نے خالق عالم اور اپنے درمیان آلہہ یعنی دیوتاؤں اور مخلوق معبودوں کا ایک سلسلہ فرض کر لیا، شعور اس کا ان کو ہو، یا نہ ہو لیکن واقعہ یہی ہے کہ اس تدبیر سے اپنی کاربراریوں کی ایک ایسی راہ اپنے خیال میں انہوں نے نکال لی ہے، جس میں ان کے زعم یا وہم کے مطابق ان کی ضرورتوں کی تکمیل کا تو انتظام ہو جاتا ہے، مگر خود ان پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، لیکن ان درمیانی وسائط اور مخلوق معبودوں کے متعلق ان کا احساس ہوتا یہی ہے کہ نذر و نیاز وغیرہ چڑھاوے کی وقتی پیش کشوں سے خوش ہو کر ہماری حاجتوں کو ہمارے ہی آلہہ یا دیوتا پوری کرا دیتے ہیں، لیکن ان کے معبودوں کی طرف سے کسی قسم کا کوئی آئینی مطالبہ ان پر عائد نہیں ہوتا، اور غرض ان کی ہوتی بھی یہی ہے کہ آئینی ذمہ داری کے بغیر ان کی ضرورت پوری ہوتی رہے، اپنے ان معبودوں کی نذر و نیاز کے سلسلے میں پیش قرار رقوم صرف کر دینا، ان کو اس سے زیادہ آسان معلوم ہوتا ہے کہ اپنے آپ پر اور اپنے نفس کی خواہشوں پر پابندیاں عائد کریں۔ یہ مشاہدہ کی بات ہے کہ مشرکانہ کاروبار کرنے والوں میں کسی قسم کی ایسی اخلاقی اور آئینی ذمہ داری جو ان کے دیوتاؤں کی طرف سے ان پر عائد کی گئی ہو اور اس کا احساس نہیں پایا جاتا۔ خواہ ان معبودوں کی پوجا پاٹ میں ان کا جتنا بھی خرچ ہو جائے، گویا خدا کی ذمہ داریوں کے احساس کو دبانے کی یہ ترکیب اس طبقہ نے تراش لی ہے کہ خدا کے سامنے انہیں آنا ہی نہ پڑے، بلکہ خود تو وہ اپنے خود تراشیدہ معبودوں کے سامنے جا کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ ان معبودوں سے چونکہ خدا راضی ہے اس لیے اللہ میاں سے ان کی ضرورتوں کی تکمیل وہ کرا لیں گے۔

اس طریقہ کے مقابلہ میں ایک دوسری تدبیر یہ بھی ہے کہ خدا کے سامنے سے تو اپنے آپ کو مطلق العنان اور آزاد رکھنے کے لیے وہ بھاگ جاتے ہیں، بھول کر بھی نہ خدا کا نام لینا چاہتے ہیں، اور نہ ان کو وہ یاد ہی آتا ہے، باقی زندگی کی ضرورتوں اور حاجتوں کے لیے مشرکوں کو نادیدہ و خود تراشیدہ اور ان کے خیال کے مطابق خدا رسیدہ معبودوں کی جگہ انہوں نے ہر ضرورت اور ہر حاجت کے لیے فنی حذاق یا ٹیکنیکل اکسپرٹوں کا طبقہ کھڑا کر لیا ہے، جس کی تعلیم و تربیت پر اس سے زیادہ توجہ اور زیادہ خرچ کرتے ہیں، جتنی توجہ اور جتنے مصارف کا بار شرکانہ کاروبار والے اپنے معبودوں کو راضی رکھنے کے لیے برداشت کرتے ہیں اور ہر پیش آنے والی ضرورت کے لیے وہ ان ہی حذاق اکسپرٹوں کی طرف رجوع ہوتے ہیں، ان ہی کی ولائت اور پشت پناہی میں ان کی ساری زندگی بسر ہوتی ہے، کسی ایسی جگہ قیام ان کے لیے دوبھر بلکہ شاید ناقابل تصور ہوتا ہے جہاں اپنے ان اولیاء یا پشت پناہوں کے دستیاب ہونے میں کسی قسم کی دشواری کا

Marfat.com

خطرہ ہو، ان ہی اکسپرٹوں کے ساتھ ساتھ ایک طبقہ ان میں لیڈروں اور قائدوں کا بھی ہوتا ہے، عموماً اجتماعی حاجات میں ان ہی پر بھروسہ کیا جاتا ہے، الغرض خدا کی ذمہ داریوں سے بچتے ہوئے ضرورتوں اور حاجتوں کی بھی تکمیل میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ پیش آئے۔ اس کے لیے انہی مذکورۂ بالا دو طریقوں میں سے کسی ایک یا دونوں کو ساتھ ساتھ اختیار کرنے والوں نے اختیار کر رکھا ہے، قرآن میں مشرکانہ کاروبار والوں کے طرزِ عمل کی تعبیر کے سلسلے میں عموماً اس قسم کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ مثلاً

اتخذ و امن دونه آلهة

انہوں نے میرے سوا معبود بنا لیے ہیں

خلاصہ یہ ہے کہ اپنی ضرورتوں اور حاجتوں میں جن پر مشرکین بھروسہ کیا کرتے تھے اور جس کی طرف اس راہ میں رجوع ہوتے تھے ان کو آپ دیکھیں گے، عموماً ''آلھــــہ'' کے نام سے قرآن کو موسوم کرتا ہے، لیکن سورۂ کہف کی مذکورۂ بالا آیت میں بجائے اس کے ہم ''عبادی من دونی اولیاء'' کے الفاظ پاتے ہیں یعنی یہاں بجائے آلہہ کے اولیاء کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مشرکوں کے عام معبودوں اور آلہہ کے متعلق قرآن مین جتلایا گیا ہے کہ عموماً وہ نام ہی نام ہوتے ہیں لیکن ان ناموں اور اسماء کو مسمّے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، بایں معنی کہ درحقیقت ان ناموں سے جن چیزوں کی تعبیر کرتے ہیں، وہ معدوم اور کچھ نہیں ہوتیں، زیادہ تر مشرکوں کے معبودوں کی عام نوعیت یہی ہوتی ہے کہ وہ صرف مفروضہ اسماء اور نام ہی نام ہوتے ہیں اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ جن کمالات وتصرفات کو ان معبودوں کی طرف اپنے خیال میں مشرکین منسوب کرتے ہیں، ان سے قطعاً ان کو کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، گویا پتھر کا نام جیسے پانی رکھ لیا جائے اور نام رکھ کر توقع دلائی جائے کہ پانی کا کام اس پتھر سے لیا جا سکتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ بھی فرضی نام یا اسم بے مسمی ہی کی ایک شکل ہے اور مشرکوں کے معبودوں پر قرآنی تنقید کے یہ الفاظ یعنی

ان هى الا اسماء سميتموها انتم و اباء كم

نہیں ہیں وہ لیکن صرف چند نام جو رکھ لیے ہیں خود تم نے یا تمہارے باپ دادوں نے

ہر حال میں صادق آتے ہیں۔

لیکن اس کے مقابلے میں حق تعالیٰ کی عائد کی ہوئی آئینی ذمہ داریوں سے بچ نکلنے والوں نے پشت پناہوں اور اولیاء کا جو طبقہ، اکسپرٹس (حذّاق) اور لیڈرس (قوّاد) وغیرہ ناموں سے بنا لیا ہے، ظاہر ہے کہ اس کی نوعیت مشرکوں کے معبودوں سے اس باب میں مختلف ہوتی ہے یعنی حذاق وقواد کا یہ گروہ اسی طرح خدا کے واقعی بندے اور مخلوقات ہیں، جیسے ان پر بھروسہ کرنے والے خدا کے بندوں اور مخلوقات میں شامل ہیں، اور جن ضرورتوں اور حاجتوں میں ان پر اعتماد کیا جاتا ہے ان سے ان کی بے تعلقی کا حال بھی وہ نہیں ہوتا، جو مشرکوں کے معبودوں کا ہے، بلکہ قدرتی قوانین کا علم حاصل کر کے اسی علم کے مطابق عملی نتائج حاصل کرنے کا طریقہ ان فنی ماہرین کو سکھایا جاتا ہے، اور خواہ ہر حال میں ان سے متوقعہ ضرورتیں پوری ہوں یا نہ ہوں لیکن ان ضرورتوں سے مشرکوں کے خود تراشیدہ معبودوں کی طرح

Marfat.com

ان کو قطعاً بے تعلق بھی نہیں قرار دیا جا سکتا۔

بہر حال جہاں تک میرا خیال ہے مذکورۂ بالا آیت میں بجائے ''آلهة من دونی'' کے ''ان یتخذوا عبادی من دونی اولیاء'' (یعنی میرے بندوں کو میرے سوا یا مجھے چھوڑ کر انہوں نے اپنے اولیاء اور پشت پناہ بنا جو رکھا ہے) یہ الفاظ جو پائے جاتے ہیں، ان میں بظاہر حق تعالیٰ کی آئینی ذمہ داری سے آزاد رہنے کی جیسا کہ میرا ناچیز خیال ہے اسی دوسری تدبیر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جس میں بجائے خود تراشیدہ، نام نہاد آلہہ اور معبودوں کے اکسپرٹوں اور لیڈروں کو بنانے والے اپنا پشتیبان اور اولیاء بنا لیتے ہیں اور یوں اپنے پیدا کرنے والے خالق تعالیٰ جل و مجدہ سے بے تعلق و قطعاً بے تعلق رہ کر زندگی بسر کرنے کی ایک راہ انہوں سے نکال لی ہے۔

---

(۵)

آخری آیت جس پر سورۂ کہف ختم ہے، یعنی

قل انما انا بشر مثلکم یوحی الی انما الهکم اله واحد فمن کان یر جوبقاء ربه فلیعمل عملا صالحا ولا یشرک بعبادة ربه احدا

کہہ دو کہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ میں بھی آدمی تم ہی جیسا ہوں، مجھ پر یہ وحی نازل ہوتی ہے کہ تم لوگوں کا الہٰ (معبود) ایک ہے، پھر جو امیدوار ہے اپنے رب کی ملاقات کا تو اسے چاہیے کہ کرے بھلے اور سلجھے ہوئے کام اور ساجھی نہ بنائے اپنے رب کی عبادت میں کسی کو

اس پر مولانا رقمطراز ہیں......اور انہیں سطروں پر افاداتِ عالیہ کا اختتام ہے......کہ

''جو کچھ اس سے پہلے بیان کیا گیا ہے، بظاہر اس آیت کا......اس سے چنداں تعلق نظر نہیں آتا، لیکن غور کیجیے اپنے پیدا کرنے والے کی آئینی ذمہ داریوں سے بچنے کے لیے بجائے مشرکانہ کاروبار کے اکسپرٹوں اور لیڈروں کی ولایت اور پشت پناہی کا نظریہ جو تراشا گیا تھا اور قرآن نے اس پر جو تنقید کی تھی اس تنقید کو پیش نظر رکھتے ہوئے قدرتاً کیا یہ سوال نہیں پیدا ہوتا؟ یا نہیں ہوسکتا کہ دون اللہ (اللہ کے سوا) کسی دوسرے کو اولیاء بنانا اور ان ہی کی پشت پناہی ڈھونڈنی اگر جرم ہے تو اسی جرم کے مجرم وہ بھی تو ہیں جو رسولوں اور پیغمبروں کو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان واسطہ اور ایلچی مانتے ہیں اور ان کی ولایت اور پشت پناہی سے امداد حاصل کرتے ہیں۔ خود قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ

انما ولیکم اللہ و رسولہ

تمہارا ولی (پشت پناہ) اللہ اور اللہ کے رسول ہیں۔

یقیناً یہ ایک شبہ ہے اور چاہیے تھا کہ جو واقعہ ہے اس کو واشگاف کر دیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ بندوں اور ان کے خالق میں واسطہ کا مسئلہ ایسا مسئلہ ہے جس کی واقعیت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہر ایک دیکھ رہا ہے کہ روشنی میں آفتاب کو، دودھ میں مثلاً گائے کو، بھینس کو واسطہ بنایا گیا ہے۔ اس لیے بندوں اور خدا میں واسطہ نہیں، اس کا دعویٰ تو چشم دید یہی واقعہ کا انکار ہوگا، لیکن سوال اس واسطہ کے استعمال میں ہے، مشرکانہ کاروبار والوں کے طریقۂ عمل کی جو خصوصیت ہے اس کی تفصیل گزر چکی، یعنی خدائی ذمہ داریوں سے بھاگنے کی راہ انہوں نے یہ نکالی کہ ضرورتوں اور حاجتوں کے لیے وہ ان ہی درمیانی وسائط کو آگے بڑھا دیتے ہیں، اور خود ہی درمیانی واسطوں کو کچھ لے دے کر، ان ہی کی اپنے خیال کے مطابق منت سماجت کر کے فرض کر لیتے ہیں کہ ان کا کام نکل جائے گا۔

اور ان کے مقابلہ میں ان ہی ذمہ داریوں سے گریز کی دوسری راہ یہ ہے کہ انسانوں ہی کو زندگی کے مختلف شعبوں میں ماہر اور حاذق بنا کر اپنی ساری ضرورتوں میں خدا سے قطعاً بے تعلق رہتے ہوئے ان ہی اکسپرٹوں اور لیڈروں کی ولایت پر بھروسہ کر لیا جاتا ہے۔ چونکہ دونوں صورتیں اپنے پیدا کرنے والے سے باغیانہ انحراف اور اپنے وجود کے نصب العین کی تکمیل سے گریز ہے۔ اس لیے درمیانی وسائط کی ولایت کی ان شکلوں کو قرآن نے مسترد کر دیا ہے اور ولایت کا وہ طریقہ جس میں اپنے خالق اور اس کی مرضی کے پانے کی ضمانت پوشیدہ ہے اور اپنی پیدائش کے قدرتی نصب العین تک جس ذریعہ سے آدمی پہنچ جاتا ہے...... یہ طریقہ موجودہ ہبوطی زندگی کی ایک ایسی ناگزیر ضرورت ہے جس سے الگ ہو کر کامیابی تک انسانی زندگی پہنچ ہی نہیں سکتی۔ زمین کی طرف رخصت کرتے ہوئے انسانِ اول یعنی ہمارے پدرِ اوّل کو اسی لیے وہ وصیت کی گئی تھی [اور اس میں اسی طریقہ کی طرف اشارہ ہے] کہ

فاما یاتینکم منی ھدی فمن تبع ھدای فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون

پھر آتے رہیں گے میری طرف سے تمہارے پاس وہ بتانے والے ان راہ بتانے والوں کے پیچھے پیچھے جو چلیں گے نہ ان کو ڈر ہے اور نہ وہ کبھی کڑھیں گے۔

بہر حال اسی حقیقت کا اظہار جہاں تک میرا خیال ہے، سورۂ کہف کی اس آخری آیت میں کیا گیا ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ صاف صاف کھلے لفظوں میں کہہ دیجئے کہ میں بھی تم ہی جیسا ایک آدمی ہوں...... قدرت نے صرف اپنے اس منشاء کے اظہار اور ترجمانی کے لیے میرا انتخاب فرمایا ہے جس کی جوہری روح اور مرکزی عنصر یہ ہے کہ خالق کائنات ہی کو ساری انسانیت کا الٰہ اور چھوٹی بڑی دینی و دنیاوی ضرورت کا مرجع و ماویٰ بنایا جائے اور وہی سب کا آخری ٹھکانہ بن جائے۔

Marfat.com

یہ تو

انما الٰھکم الہ واحد

کا مطلب اور خلاصہ ہوا، لیکن آخر میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ

فمن کان یرجو لقاء ربہ فلیعمل عملا

صالحا ولا یشرک بعبادۃ ربہ احدا

جہاں تک میرا خیال ہے خالق کائنات کو صحیح معنوں میں اپنا تنہا معبود اور واحد الٰہ بنانے کے عملی طریقہ کی طرف ان الفاظ سے جو توجہ دلائی گئی ہے اس کا حاصل بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ واقعی ذاتِ حق کے ساتھ براہ راست رشتہ پیدا کرنے کی جن دلوں میں اُمنگ و آرزو ہو، ان کو اپنی دینی زندگی میں اس ترتیب کی پابندی پر اصرار کرنا چاہیے کہ ان کی زندگی عمل صالح کی زندگی بن جائے۔ اگرچہ عمل صالح عام لفظ ہے لیکن آگے خالق کی عبادت اور خالق کے ساتھ بندوں کو جو تعلق رکھنا چاہیے اس کا ذکر چونکہ کیا گیا ہے اس لیے مقابلتہً یہی سمجھنا چاہیے کہ [یہاں عمل صالح سے مخلوقات کے ساتھ تعلقات کی دوستی اور استواری مراد ہو۔ اور] مخلوقات کے ساتھ تعلقات کو سلجھاتے ہوئے خالق کی عبادت میں سرگرمی ہی صحیح نتیجہ تک آدمی کو پہنچائے گی۔

گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ خالق کی عبادت (نماز روزہ) وغیرہ میں جو چوکس نظر آتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ مخلوقات کے تعلقات میں لاپروائیوں سے کام لیتے ہیں یا اس کے برعکس مخلوقات یا حقوق العباد کو اہم قرار دیتے ہوئے خالق کے ساتھ صحیح تعلق قائم کرنے کے ذوق سے جو محروم ہیں۔ یہ دونوں ہی طبقے انسانی سلوک کی صحیح فطری راہ سے ہٹے ہوئے ہیں۔ ٹھیک راستہ پر ہی چل رہے ہیں جن کی نگاہوں میں دونوں کی اہمیت ہے۔

هذا والسلام علیٰ من اتبع الهدیٰ

خاکسار مناظر احسن گیلانی

یوم الجمعہ ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۷۱ھ مطابق ۱۱ جنوری ۱۹۵۲ء عند اذان العصر بہ مقام کہف الایمان المشہور بہ ''گمرہ''۔ سورۂ کہف کے متعلق ایک ظلوم وجہول کے واردات و احساسات پورے ہوئے...... ربنا تقبل منا انک و انت السمیع العلیم۔

حواشی:

۱۔ آج لوگوں کے سامنے ہوائی جہاز کی شکل میں جو سواری آچکی ہے، ان کے لیے نبوت کی بیان کی ہوئی اس تشبیہ کے سمجھنے میں شاید کچھ دشواری نہ ہوگی۔ باقی اسی سلسلے میں دجال کے گدھے کا عام چرچا عوام میں جو پھیلا ہوا ہے، اس میں شک نہیں کہ عام شہرت اس گدھے کو ضرور حاصل ہوگئی ہے۔ لیکن صحاح کی کتابوں میں دجال کے متعلق حدیثوں کا جو ذخیرہ پایا جاتا ہے اس کو گدھے کے ذکر سے ہم خالی پاتے ہیں۔ البتہ ابن عساکر وغیرہ کی ایسی کتابیں جن کی روایتوں کا معیار صحت بہت کچھ بحث طلب ہے، ان میں حمار کے لفظ سے ضرور دجال کی سواری کا ذکر آیا ہے۔ مگر آگے جو تشریحی صفات اس حمار گدھے کے بیان کیے گئے ہیں مثلاً یہی کہ اس گدھے کے دونوں کانوں کے بیچ کا فاصلہ اسی (۸۰) ہاتھ ہوگا، یعنی ۴۰ باع ہوگا۔ اور حضرت علیؓ کے خطبہ میں تو اس گدھے

کے ایک ایک کان کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ تیس تیس ہاتھ کے برابر ہوں گے، اور اس سے بھی عجیب تر، اس کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ اس گدھے کی ایک ٹاپ کا فاصلہ دوسرے ٹاپ سے اتنا طویل ہوگا کہ عام حالات میں اس فاصلہ کو لوگ ایک دن اور ایک رات یعنی ۲۴ گھنٹوں میں طے کر سکتے ہیں۔ الفاظ عربی کے یہ ہیں " مابين حافر حماره الى الحافر الآخر مسيرة يوم و ليلة" (ص ۵۳ ج ۲۔ خلاصہ کنز) اسی صورت میں گدھے والی روایتوں کی صحت اگر تسلیم بھی کر لی جائے جب بھی 'حمار' کے لفظ سے جو بات سمجھ میں آتی ہے دجال کے گدھے کی حقیقت یقیناً اس سے مختلف ہے، بہ ظاہر تفہیم کا یہ ایک تمثیلی طریقہ معلوم ہوتا ہے، ورنہ ہمارے سامنے جو گدھے ہیں ان میں یہ خصوصیتیں کہاں مل سکتی ہیں۔ آج مچھلی کی شکل ہوائی جہازوں کی بنائی جاتی ہے۔ اگر کبھی گدھے کی شکل یا قالب ان ہی کو عطا کر دیا جائے تو کیا تعجب ہے۔

۲۔ مثلاً روایتوں میں آتا ہے کہ یاجوج ماجوج کے اچانک مر جانے اور ختم ہو جانے کے بعد جب زمین ان کی گندگیوں سے صاف ہو جائے گی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اہل ایمان کے ساتھ پہاڑ سے اتر کر زمین پر آئیں گے تو بیان کیا گیا ہے کہ نشو ونما کی قوت زمین کی اتنی زیادہ بڑھ جائے گی کہ ایک ایک انار سے بڑی بڑی ٹولیاں سیر ہو جائیں گی، اور انار کا خول دانوں کو نکالنے کے بعد جو رہ جائے گا وہ اتنا بڑا ہوگا۔ یہی بڑی ٹولیاں اس کے سائے میں قیام کریں گی۔ ایک طرف اس خبر کو رکھیے اور دوسری طرف غور کیجیے ان تجربات پر جو جاپان میں ایٹم بم کے چلنے کے بعد کیے گئے۔ کہتے ہیں کہ جس علاقہ میں بم چلایا گیا تھا وہاں کی زمین میں جو چیزیں بعد کو بوئی گئیں تو اپنی مقدار میں حیرت انگیز طور پر دیکھا گیا کہ وہ بڑھی ہوئی شلجم، مولی وغیرہ کی جو جسامت اس سلسلہ میں بیان کی گئی ہے، عام حالات میں اس کا باور کرنا مشکل ہے۔ علیٰ ہٰذا " دخان مبين" یعنی قرآن میں جس کھلے ہوئے دھوئیں کا ذکر ہے اور فرمایا گیا ہے کہ لوگ خدا کے متعلق جب شک میں کھیلنے لگیں گے اور ان کے پاس 'رسول مبین' کھلا ہوا رسول جو آیا تھا اس پر معلّم اور مجنون ہونے کا اتہام لگائیں گے (یعنی [یہ] کہ دوسرے مذاہب کے علماء سے باتیں سیکھ کر بیان کرتا ہے، یا اس کے دماغ میں فتور ہے) ان دونوں جرائم کی سزا میں دھمکی دی گئی ہے کہ تب کھلے ہوئے دھوئیں کا انتظار کیجیو۔ خاکسار نے [اپنے ایک مضمون میں] عرض کیا تھا کہ یورپ ان جرائم کا مجرم بھی ہو۔ اور آپس میں جن آتشیں ہتھیاروں سے لڑ کر تباہ ہو رہا ہے [اگر] غور کیا جائے تو [ان میں] 'دخان' یعنی دھواں مشترک نظر آئے گا، اور ایٹم بم نے تو دھوئیں کو 'مبین' دکھا دیا جس سے دنیا واقف ہے۔

۳۔ حمار عربی میں گدھے کو کہتے ہیں۔ 'المسیح الدجال' کی طرف جس گدھے کا انتساب کیا گیا ہے، روایۃً و درایۃً اس کا حال جو کچھ بھی ہے وہ پہلے عرض کر چکا ہوں، اسی کے ساتھ اگر اس کو بھی سوچا جائے کہ تمدن جدید کے ائمہ اجتہاد کارل مارکس کو سب سے بڑی کارفرما جوہری قوت انسانی جدوجہد میں پیٹ اور پیٹ کے تقاضے جو نظر آئے ہیں، اور اسی کے ساتھ فرائڈ نے 'جنسی میلان' کی نشان دہی'، بنی آدم کی ساری تگ ودو میں جو کی ہے، ان دونوں نظریات کو اگر ملایا جائے تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوا کہ انسانیت جن جذبات کی رو میں تمدن جدید کے ان محققوں کو بہتی نظر آئی ہے، ان کی مثالی صورت کے لیے گدھے کے قالب سے بہتر قالب شاید کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ آخر شکم پروری اور خرنفسی کے سوا غریب گدھا اور بھی کچھ ہے؟ عہد جدید کا انسان جب ان ہی دو کارفرما قوتوں کی سواری پر سوار ہو کر آسمان کے قلابے زمین سے اور زمین کے قلابے آسمان سے ملا رہا ہے، کدو کاوش، جدوجہد کے تمام شعبے چھوٹے پیمانے پر ہوں یا بڑے پیمانے پر، جب ان ہی دو محرکہ قوتوں کے زیر اثر گردش کر رہے ہیں، نسل انسانی کی ساری اچھل پھاند جب ان ہی دونوں جذبات سے زور حاصل کر رہی ہے تو گدھے کی سواری کے سوا 'المسیح الدجال' کی ران کے نیچے آپ ہی بتائیے کہ اور نظر ہی کیا آتا، سوار جب خود کہہ رہا ہو کہ میں گدھے پر سوار ہوں، تو دیکھنے والوں نے کیا غلطی کی جب اُس کو گدھے پر سوار دیکھا۔

۴۔ یعنی جس کی استدعا 'اهدنا الصراط المستقيم' کی دعا میں کی جاتی ہے، وہ سیدھی راہ جس پر چڑھ کر انسانیت قدرت اور اس کے قوانین سے وفاقی تعلق پیدا کر لیتی ہے، قرآنی تعبیر جس کی 'انعام' کے لفظ سے کی گئی ہے۔

Marfat.com

۵۔ اگلے پیراگراف میں ''اسی'' نفسیاتی مسئلہ'' کی تشریح ہے، جو ہمارے خیال میں عام ناظرین کے فہم کے لحاظ سے کچھ مشکل ہے۔ مولانا کا مطلب یہ ہے کہ اس عہد کے انسان میں بے کسی کا جو ایک عام احساس پایا جاتا ہے جس کی بدولت پوری زندگی بے قراری اور بے اطمینانی کی تصویر بنی ہوئی ہے وہ درحقیقت نتیجہ ہے اس نظریہ ارتقاء کا کیونکہ ایک طرف تو یہ حقیقت ہے کہ زندگی ایک مستقل ''قیدغم'' ہے، اور قید بھی پُرسکون نہیں! بلکہ مسلسل حوادث وآفات کا بھی اس میں سامنا ہے، اور دوسری طرف اس نظریہ (ارتقاء حیات) کی رو سے انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ بغیر کسی خالق و پروردگار کے حیات کے مختلف مراحل سے گزرتا اور کش مکش کرتا ہوا اس مرحلہ تک پہنچا ہے۔ پس قدرتی طور پر اس کا یہ احساس ہونا چاہیے کہ اس قیدغم اور بحرالم میں وہ اکیلا اور بے سہارا ہے نہ اس کا کوئی نگراں ہے نہ محافظ۔ اور پھر اس احساس سے لازمی طور پر وہی اندرونی بے اطمینانی اور بے قراری ہونی چاہیے جس میں اس عہد کا انسان مبتلا ہے......اب پڑھیے مولانا کی عبارت!......مرتب

۶۔ نظریہ ارتقاء کی رو سے کائنات کے اندر زندگی کے اولین آثار اس کیچڑ میں نمودار ہوئے تھے جو سطح ارض پر سمندروں کے وجود میں آ جانے کے بعد ان کے کناروں پر پیدا ہوگئی تھی۔ اس کیچڑ میں نمودار ہونے والے زندگی کے ابتدائی آثار کہا جاتا ہے کہ ترقی کرتے کرتے انسانی قالب میں جلوہ گر ہوگئے......مرتب

۷۔ یعنی ''الحمدللہ'' کے ذریعہ جو حقیقت منکشف فرمائی گئی ہے، اسی کو بنیاد بنا کر اگلے الفاظ میں نزول کے بعد ارتقاء کا یہی قرآنی نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ مرتب

۸۔ آخر جس مادے میں کچھ نہ تھا، جب یہ مانا جاتا ہے کہ اس سے سب کچھ نکل آیا تو اس میں اور بھینس کے مذکورہ بالا مشہور لطیفہ میں کیا فرق ہے؟

۹۔ الحمدللہ کو خشت اول قرار دے کر قرآن کائنات کی تعبیر کی جو توجیہ پیش کر رہا ہے وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ لامحدود کمالات والے خدا نے اپنے کمالات کو محدود پیمانوں پر نمایاں کیا ہے۔

۱۰۔ اس موقع پر ایک دلچسپ مثال کا خیال آرہا ہے، حاشا وکلا کسی کی دل شکنی مقصود نہیں ہے بلکہ جو سمجھانا چاہتا ہوں اس کی صرف توضیحی مثال کی حیثیت سے اس واقعہ کا ذکر کر رہا ہوں۔ سرسید مرحوم نے جب علی گڑھ کالج قائم کیا تو انہوں نے اعلان فرمایا کہ
''ہم اس دن خوش ہوں گے جب کہ ہماری قوم نہ خدا کے واسطے نہ اپنے ثواب کے لیے بلکہ اپنی قوم کے لیے کوشش کرے گی، اور کہے گی کہ میں اپنے ہاتھ اپنے پاؤں، اپنی جان، اپنی محنت سے، اپنے روپے کے بدلے نہ خدا کو خریدنا چاہتا ہوں، اور نہ بہشت کو، بلکہ اپنی قوم کو۔'' (تہذیب الاخلاق۔ ص ۵۷۵ وص ۵۷۷)
الغرض یہ سیدھی سادی راہ کہ بغیر کسی معاوضہ کے جس کے دینے کا تجربہ تم کر چکے ہو، اسی کی راہ میں دو، معاوضہ میں جتنا تم دو گے اس سے بہت زیادہ پاؤ گے۔ سید صاحب بیچارے نے اس کا انکار کیا۔ آمدنی مسلمانوں سے جتنی توقع تھی وصول نہ ہوئی تو ان ہی سید صاحب نے جو فرماتے تھے کہ ''اللہ کے لیے، ثواب کے لیے، جنت کے لیے جو دے گا میں اس سے خوش نہ ہوں گا۔'' ان کو دیکھا گیا کہ کالج کی آمدنی کی توقیر کے لیے جیسا مولوی طفیل احمد صاحب نے ''روشن مستقبل'' میں لکھا ہے (سرسید نے) روپیہ حاصل کرنے کے لیے یورپ کے طریقے مثل لاٹری یعنی چٹھی وغیرہ کے اختیار کیے اور اسی پر بس نہیں۔ فرمایا ''بلکہ ایک بار علی گڑھ کی سالانہ نمائش میں قومی تھیٹر کے نام سے ٹکٹ لگا کر ایک قومی مظاہرہ کیا'' یعنی باضابطہ تماشے کا نظم کیا گیا اور خود سرسید اور ان کے شرکاء کار کا جس میں حصہ تھا۔'' (ص ۲۰۸) بڑی بڑی داڑھیوں والے ان بزرگوں نے ایکٹروں کا فرض انجام دیا، مگر سیدھی راہ کو چھوڑ کر اس ٹیڑھی ترچھی راہ میں بھی جیسا کہ طفیل احمد صاحب نے لکھا ہے ''ان تمام طریقوں میں کوئی حسب دلخواہ کامیابی نہ ہوئی۔'' (ص ۲۰۹۔ روشن مستقبل)

۱۱۔ قرآن کے جن الفاظ پر بحث کرتے ہوئے مولانا یہاں تک پہنچے ہیں اُن کے بعد یہ آیت آتی ہے:

Marfat.com

وَ یُبَشِّرَ الْمُؤمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ الصالحَاتِ اَنَّ لَھُمْ اَجْراً حَسَناً مَاکِثِیْنَ فِیْہِ اَبَدا

''اور بشارت دیتا ہے اُن ماننے والوں کو جو بھلے کام کرتے رہتے ہیں۔ بلاشک وشبہ ان کے لیے اَجرِحسن ہے۔ مگن رہیں گے اس میں ہمیشہ ہمیش۔''

اس آیت کا تعلق چونکہ نہ تو دجّالی فتنہ کے علمبرداروں پر تنقید یا ان کے طرزِعمل کی تغلیط اور اُن کے لیے کسی وعید وتحذیر سے ہے نہ اس فتنہ کے ایام میں اہل ایمان کے لیے کسی ہدایت ورہنمائی سے، غرض سورۂ کہف کے جن خاص ارشادات کی طرف متوجہ کرنا اس مضمون کا مقصود ہے اُن سے آیت کا بظاہر کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے طوالت سے بچنے کی خاطر مناسب تو یہی تھا کہ مضمون کے اس حصہ کو حذف کر دیا جاتا۔ مگر آگے ایک موقع پر چونکہ مولانا نے اس حصہ کا حوالہ دیا ہے اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر مولانا نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس کا خلاصہ ذکر کر دیا جائے۔

اس آیت کے ذیل میں مولانا نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ من لدُنّی باس شدید کی دھمکی نہ ماننے والوں کو دینے کے بعد اہل ایمان کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ ان کے لیے اس میں لدُنی عذاب کے دور میں کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے بلکہ اسبابی کاروبار کا قصہ ختم ہو جانے کے بعد چاہیے کہ تم ''خوش ہو جاؤ کہ تمہاری سعی وعمل کا رخ مسبّب'' ہی کی طرف تھا۔ اب اس کی قیمت تمہارے سامنے آئے گی۔'' اور وہ غیر فانی ہوگی۔ مرتّب۔

۱۲۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ گذشتہ صفحات میں مولانا نے تین سوال قائم فرمائے تھے۔ ایک کا جواب تو گزر چکا، باقی سوال نمبر۲ و نمبر۳ چونکہ حقیقت میں ایک ہی سوال کے دو جزو تھے اس لیے مولانا نے اِن دونوں کے جوابات کو ایک ہی ملا دیا ہے۔ مرتّب۔

۱۳۔ ان کی طرف اس عقیدہ کی توجیہ میں بڑی سے بڑی بات جو منسوب کی گئی ہے وہ یہی ہے کہ عالم کا موجودہ نظام خیر وشر یا بھلائیوں اور برائیوں سے بھرا ہوا ہے، پس خدا یا یزدان جو خیر مطلق ہے اس سے یہ کیسے منسوب کیا جائے کہ تمام شرور اور برائیوں کا پیدا کرنے والا بھی وہی ہے۔ کہتے ہیں کہ ان ہی شرور اور برائیوں کی پیدائش کی تصحیح کے لیے اہرمن کے وجود کا یزدان کے ساتھ اضافہ کیا گیا تھا؟ مگر ذرا سوچیے بھلائی اور برائی کے جن صفات کو ہم دنیا کی چیزوں کی طرف منسوب کرتے ہیں، ان کی واقعی حالت کیا ہے، دراصل ایک ہی چیز ہوتی ہے، مثلاً آگ ہے، جب تک ہمارا کھانا پکاتی ہے، ہمیں روشنی بخشتی ہے تو ہم اس کو خیر ٹھہراتے ہیں مگر اسی آگ سے جب ہمیں کبھی نقصان پہنچتا ہے، گھر جل اٹھتے ہیں، جانور یا آدمی بھننے لگتے ہیں تو اسی آگ کو ہم بدترین شر ٹھہرانے لگتے ہیں۔ الغرض استعمال کے اختلاف سے ایک ہی چیز ہوتی ہے جو کبھی خیر، کبھی شر بنتی رہتی ہے، غریب مجوسیوں نے خیال کر لیا کہ شر وخیر کے الفاظ جیسے الگ الگ ہیں۔ اسی طرح واقع میں بھی شر کا وجود خیر سے اور خیر کا وجود شر سے الگ ہو کر عالم میں پایا جاتا ہے، مگر اس لفظی مغالطہ پر متنبہ ہو جانے کے بعد کہ ایک ہی چیز اس عالم کی شر بھی بنتی رہتی ہے، اور خیر بھی ایک مخلوق کے دو خالق کی تلاش کا جذبہ ان میں زندہ رہ سکتا ہے؟

۱۴۔ یہ بڑا تفصیل طلب مسئلہ ہے ''مخلوقیت'' کی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے مسئلہ کے صرف ایک پہلو کا اجمالی تذکرہ یہاں کر دیا گیا۔ زیادہ تفصیل مطلوب ہو تو خاکسار کی کتاب ''الدین القیم'' میں مطالعہ فرمائیے۔

۱۵۔ واضح رہے کہ ان آیات پر بحث شروع کرتے وقت مولانا نے ان کو چار الگ الگ آیتیں قرار دیا تھا مگر یہاں ''تیسری آیت'' وہ فقرہ بھی شامل ہے جس کو وہاں چوتھی آیت قرار دیا تھا۔ مرتب

۱۶۔ ''کلمۃ تخرج من افواھھم'' (بات ہے جو ان کے منہ سے نکل رہی ہے) اس میں ''افواہ'' یعنی منہ کی طرف جو اس کو منسوب کیا گیا ہے، اس میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے کہ اس عقیدہ کا تعلق نہ دل سے ہے اور نہ دماغ سے، بلکہ عقیدہ رکھنے والوں کے منہ سے ایک بات نکلتی ہے، ابتدا بھی اس کی منہ سے ہے اور انتہا بھی منہ سے آگے اس کی نہیں ڈھونڈی جا سکتی۔

۱۷۔ کلیسائے رومہ کی عظمت کا زیادہ تر دارومدار مدت تک پطرس کا مصنوعی مدفن تھا، لیکن حال میں اس خیال کو غلط ٹھہرایا گیا ہے

Marfat.com

سمجھا جاتا ہے کہ پطرس عراق اور ایران کے درمیانی علاقوں میں عیسائیت کا پرچار کرتے ہوئے کہیں مرگیا، سینٹ پال اور پطرس میں اختلافی نقطۂ نظر یہی تھا کہ پال کے نزدیک "صرف مسیح کو خدا کا بیٹا مان لینا" محض یہی نجات کے لیے کافی ہے لیکن پطرس یہودی شریعت کے احکام کی تعمیل ضروری قرار دیتا تھا، جرمنی کے اربابِ تحقیق کچھ دن ہوئے اس نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ سینٹ پال کی ساختہ پرداختہ عیسائیت، حضرت مسیح علیہ السلام کی پیش کردہ عیسائیت سے مختلف تھی، اور یہ اختلاف شروع ہی سے چلا آ رہا تھا۔
(دیکھو تاریخ بائبل۔ بلیکی ترجمہ طالب الدین۔ ص ۵۱۸)

۱۸۔ کہا جاتا تھا کہ ایک گناہ کی دو سزائیں خدا کی طرف سے نہیں مل سکتیں، اپنے ماننے والوں کے گناہ کے سزا میں مسیح جب ایک دفعہ صلیب پا کر سزا جھیل چکا تو ماننے والوں کو ان کے اِن گناہوں کی سزا دوبارہ کیسے دی جا سکتی ہے۔ یہی کفارہ کا مسئلہ ہے...... مسیحی دنیا میں یہ سوال و جواب یعنی "میں کیا کروں کہ نجات پاؤں؟" "تو مسیح یسوع پر ایمان لا تو بچ جائے گا۔" ایک عام زبان زد فقرے کی حیثیت سے مشہور ہے۔ [یہ حاشیہ اس سے پہلے ایک مقام پر کفارے کے متعلق مولانا مرحوم نے تحریر فرمایا تھا۔ وہ مقام حذف کر دیا گیا ہے اور وہاں کے حاشیہ کو مسئلہ کفارہ کی توضیح کے لیے یہاں درج کر دیا گیا ہے۔ ع]

۱۹۔ وکثیرٌ منھم فاسقون۔ ع

۲۰۔ کلیسائی نظام میں مختلف عہدوں کے مختلف نام تھے، اسقف جو یونانی لفظ کا معرب ہے، یہ سب سے بڑا عہدہ تھا، انگریزی میں اسی کو "آرچ بشپ" کہتے ہیں۔ اسقفوں کے بعد قسیس، قسیس کے بعد بشپ اور پریسٹ کا درجہ تھا۔ پوپ کی کونسل اعلیٰ کا نام ڈیکن تھا، جس کے ارکان کی تعداد ستر تھی۔ اس کونسل اعلیٰ کے ہر رکن کو "کارڈینال" کہتے تھے۔

۲۱۔ اظہار الحق۔ عربی، ج ۲ ص ۳۷......

۲۲۔ چرچ کے ساتھ کسی سینٹ (ولی) یا شہیدوں کی قبروں کا جال ملک کے طول و عرض میں پھیلا ہوا تھا اور یہ عجیب بات تھی کہ ہر تازہ مردہ بہ نسبت پرانے مرنے والوں کے عقیدت و نیاز کی مرکزیت میں آگے بڑھ جاتا تھا۔ انگلستان کی تاریخ میں لکھا ہے کہ صلیبی لڑائیوں کے بھگوڑوں نے "خیر سے بدھو گھر کو آئے" اس کی خوشی میں انگلستان کی قربان گاہوں یا درگاہوں اور چلّوں میں جو نذریں چڑھائیں، تو طامس بکٹ اسقف جو تازہ مردہ تھا، اس کی قبر پر تو اسّی ہزار تین سو چھبیس روپے چڑھاوے کی آمدنی ہوئی، لیکن اسی کے مقابلہ میں حضرت مریمؑ کی قربان گاہ کے چڑھاوے کی میزان کل تین سو تیس روپے تھی، اور اس سے بھی طرفہ ماجرا یہ تھا کہ خود خدا کے بیٹے مسیح کی قربان گاہ پر اکتیس روپے کی آمدنی ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیٹے کے باپ کے نام سے ایک پیسہ بھی نہ آیا۔

۲۳۔ عام لوگوں میں۔ ع

۲۴۔ مطلب یہ ہے کہ پوپ اور اس کے جانشین مسیح کے نام پر یوں تو ور غلا ور غلا کر ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں عیسائیوں کو کٹوا ہی رہے تھے۔ اسی سلسلہ میں اسٹیفن نامی گڈریے کے ایک لڑکے نے بعض پادریوں کے مخفی اشاروں سے دعویٰ کیا کہ خدا کا دیدار اس کو نصیب ہوا اور روٹی ملی اور حکم دیا گیا ہے کہ کمسن لڑکوں کی فوج تیار کر کے مولد مسیح کی تطہیر کی کوشش کرے۔ یہ ۱۲۱۲ء کا واقعہ ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یورپ کے ہر ہر علاوہ کے خاندانوں سے لڑکے اور لڑکوں کے ساتھ لڑکیاں بھی چنی گئیں، جن کو مردانہ لباس پہنایا گیا اور جہاد کا اعلان کر کے لڑکوں اور لڑکیوں کی یہ فوج یورپ سے روانہ ہوئی۔ باور کرایا گیا تھا کہ راستہ میں جو سمندر بھی ملے گا، خود بخود خشک ہو جائے گا، بہر حال مارسیلز میں عیسائی سوداگروں نے لڑکوں کی اس فوج کو جہازوں پر لاد دیا اور بے درد تاجروں نے ان غریب بچوں کو مصر میں لے جا کر بیچ دیا۔ دو جہاز نذر طوفان ہوئے۔ لکھا ہے کہ لڑکوں کے ماں باپ روتے تھے، مگر ان کی کوئی کچھ نہیں سنتا تھا۔ اور لڑکوں کی یہ فوج ایک سے زیادہ مرتبہ تیار کی گئی جو راستہ ہی میں تباہ ہوتی رہتی......

۲۵۔ مثلاً جرمنی کے شاہنشاہ فریڈرک، یا انگلستان کے بادشاہ ہنری چہارم اور اسی قسم کے مختلف سلاطین و ملوک کے جن واقعات کا تذکرہ

Marfat.com

تاریخوں میں کیا گیا ہے۔ ہنری چہارم کے متعلق لکھا ہے کہ جب ہلڈی برانڈ نامی پوپ نے ہنری کو ملعون ٹھہرا کر کلیسا بدر ہونے کا حکم دیا تو ہنری نے بھی پوپ صاحب کو لکھا کہ ''تو بہ ظاہر پوپ ہے لیکن درحقیقت ایک بدکردار راہب۔'' (دیکھو گرانٹ کی تاریخ یورپ۔ص ۲۷)

اسی طرح فرانس کے بادشاہ فلپ خوب رونے بانفیس ہشتم نامی پوپ کے اس فرمان کو جلا ڈالا کہ ''پوپ جسے چاہیں اکھاڑے اور جس بادشاہ کو چاہے باقی رہنے دے۔'' (ارتقائے نظم حکومت یورپ۔ص ۲۲۱)

۲۶۔ انگریزی زبان جو نہیں جانتے ہیں وہ علامہ فرید وجدی کی عربی کتاب ''کنز العلوم واللغۃ'' میں ان واقعات کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

۲۷۔ یہ عشاء ربانی کی تقریب کی ایک اصطلاح ہے، جو شراب اور گوشت اس تقریب میں عیسائی استعمال کرتے تھے اس کے متعلق یقین تھا کہ مسیح کا وہ خون اور گوشت ہے۔

۲۸۔ غریب سائنس یا سائنس کی راہ سے پیدا ہونے والے جدید انکشافات مثلاً طیارے، سیارے، فون، انجن یا اسٹیم، برق، پٹرول وغیرہ کی قوتوں کو بدنام کرنا اور سمجھانا کہ ان جدید انکشافات نے مذہب کی بنیادوں کو کمزور کر دیا۔ اس قسم کا دعویٰ وہی کر سکتا جو نہ مذہب کی اساسی بنیادوں سے صحیح واقفیت رکھتا ہے اور نہ یہ جانتا ہے کہ سائنس ہے کس علم کا نام اور اس کے مباحث کا تعلق کن امور سے ہے۔ قطع نظر اس اصولی مسئلہ کے ایک عامی کو یوں بھی تو سوچنا چاہیے کہ ''اگرامو فون جب بجنے لگا تو اب جہنم کا وجود ناممکن ہے، یا ہوائی جہاز پر آدمی جب سفر کرنے لگا تو برزخی عذاب قبر میں مبتلا ہونے کا امکان جاتا رہا، یا ریل جب جاری ہوگئی تو فرشتوں کا وجود اب آدمی کیسے مان سکتا ہے۔'' ذرا سوچیے تو دعویٰ و دلیل کی ان شکلوں میں کسی قسم کا کوئی دُور کا بھی تعلق ہے۔ پھر جدید ایجادات و اکتشافات اسی قسم کی چیزیں تو ہیں۔ ان سے مذہب کے اصول تو اصول، میرے نزدیک تو مذہب کے فروع بھی کسی حیثیت سے متاثر نہیں ہوتے...... والقصة بطولها۔

۲۹۔ خاکسار کی تعلیم جیسا کہ معلوم ہے قدیم طرز کے مدارس میں ہوئی، نیز تاریخ میرا خاص مضمونِ مطالعہ......بھی نہیں رہا، اسی لیے چاہتا ہوں کہ یورپ کی تاریخ کا تفصیلی مطالعہ جن لوگوں نے کیا ہے، کاش! میرے اجمالی اشاروں کو تفصیلی کا قالب عطا کرتے...... وعلى الله اجره

۳۰۔ یہ آخری بات بعض لوگوں کو کچھ تشنہ سی محسوس ہوگی۔ مولانا کہنا یہ چاہتے ہیں کہ عقیدۂ ولدیت کے آثار کی یہی وہ جاں گسل نوعیت تھی جس کے غم سے، زیر بحث آیت (''فلعلک باخع نفسک علی آثارهم'' الخ) کے بیان کے مطابق معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جان گھلائے لے رہے تھے۔ مرتب

۳۱۔ تفسیری روایات جو بقول امام احمد حنبل ''غیر معتبر کمزور روایتوں کا سب سے بڑا انبار ہے'' ان ہی میں آیا ہے کہ قریش نے مدینہ کے احبار یہود کے پاس نضر بن حارث کی سرکردگی میں ایک وفد بھیجا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی جانچ کے لیے کچھ باتیں بتائیں۔ کہتے ہیں کہ ان علماء یہود نے منجملہ دوسرے سوالوں کے ایک سوال یہ بھی دیا تھا کہ کہف والوں کا قصہ محمدؐ سے پوچھنا! وفد نے واپس آکر باتیں پوچھیں۔ جواب میں قرآن نازل ہوا، اسی لیے ابتدا جواب کی اس فقرہ سے کی گئی کہ ''کہف والوں کے قصے کو تم بہت عجیب بات سمجھتے ہو'' وہ تو یہ ہے، میں کیا عرض کروں کہ ''عجبا'' کے لفظ کے لیے یہ روایت کس حد تک مفید ہوسکتی ہے جب کہ دوسرے سوالوں کے جوابات کی نوعیت یہی تھی، ان میں تعجب کا ذکر نہیں کیا گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک عام مشہور قصہ کو نبوت کے جانچنے کا معیار علماء یہود نے کس بنا پر ٹھہرایا تھا اور فرض کیجیے کہ قصہ کا علم نوادر ہی میں ہو پھر بھی کسی گذرے ہوئے واقعہ کا علم نبوت کی دلیل کیسے بن سکتا ہے۔''

۳۲۔ یہ خیال کر کے کہ سن رسیدہ ہونے کے بعد آدمی جس ماحول کا عادی ہو جائے اس سے الگ ہونا اس کے لئے بہت دشوار ہو جاتا ہے بعض حضرات نے فتیۃ (نوجوانوں) کے لفظ سے نکتہ پیدا کیا ہے کہ معمر کہن سال لوگوں کو کہفی زندگی کی رفاقت کے لیے نہ لیا

Marfat.com

چاہیے مگر میرا خیال یہ ہے کہ رفاقت پر اگر کہنہ سال لوگ آمادہ نہ ہوں تو یہ الگ بات ہے۔ لیکن اگر وہ ساتھ دینے پر تیار ہوں تو محض کہنہ سالی کی وجہ سے ان کو چھوڑنا نہ چاہیے، قرآن میں ''فتیۃ'' کا لفظ ضرور آیا ہے لیکن کہف کے رفقاء جب نوجوان ہی تھے تو قرآن ان کی تعبیر اگر فتیۃ کے لفظ سے نہ کرتا اور کس سے کرتا۔ بہر حال میرے نزدیک یہ واقعہ کا اظہار ہے۔ خواہ مخواہ اس سے نکتہ آفرینی کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

۳۳۔ حق اور صبر کی ایک دوسرے کو وصیت و تلقین، اہل ایمان کی قرآنی خصوصیت ہے، سورۂ العصر میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

۳۴۔ اسی سے اندازہ کیجیے کہ امام احمد بن حنبل فرمایا کرتے تھے کہ مصر میں علی ابن ابی طلحہ کی روایت ہے ابن عباس کی تفسیر کا جو نسخہ پایا جاتا ہے، اگر بغداد سے صرف اسی نسخہ کو حاصل کرنے کے لیے مصر کا سفر کوئی کرے تو یہ کوئی بڑی بات نہ ہوگی (اتقان بخاری) نے بھی ابن عباس کے تفسیری اقوال کے نقل کرنے میں اسی طریقہ کو ترجیح دی ہے۔

۳۵۔ عام طور پر اصحاب کہف کے وطن کا نام اسلامی وغیر اسلامی کتابوں میں افسیس یا افسوس بتایا گیا ہے، بلیکی صاحب نے اپنی کتاب ''اے مینویل آف بائبل ہسٹری'' میں لکھا ہے کہ یہ شہر ایونیا کا دار الخلافہ تھا اور تمس دیوی کے مندر نیز اپنے فلسفہ اور بدکاری کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ ان ہی کا بیان ہے کہ اس شہر کی آبادی کچھ تو گریگ کے یوروپین باشندوں پر اور کچھ مشرقی قوموں کے افراد پر مشتمل تھی، اسی لیے یہاں کی بت پرستی میں مغربی و مشرقی دونوں علاقوں کے مشرکانہ رسوم کا اثر تھا۔ ارتمس دیوی یورپ کی مشرک قوموں کی دیوی تھی، اس کا مندر شہر افسیس میں تھا، کہتے ہیں کہ دوسو بیس سال میں اس کی تعمیر مکمل ہوئی تھی، ۱۲۶ سنگی ستونوں پر اس مندر کی چھت قائم تھی، ایک ایک ستون اس مندر کا مختلف بادشاہوں کی طرف سے بطور نذرانہ کے مندر پر چڑھایا گیا تھا، ہر ستون ساٹھ فٹ اونچا تھا۔ خود ارتمس دیوی کی مورتی تو لکڑی کی بنی ہوئی تھی اور عقیدہ تھا کہ آسمان سے نازل ہوئی ہے لیکن بازاروں میں اسی دیوی کا نقرئی مجسمہ بکثرت فروخت ہوتا تھا، تیرتھ میں آنے والے خرید خرید کر اپنے اپنے ملک میں جسے بطور تحفہ لے جاتے تھے۔ فلسفہ کا زور بھی اس شہر میں اس حد تک ترقی کر کے پہنچ گیا تھا کہ آج تک گریگ کا فلسفی ایونیا کی طرف منسوب ہو کر یونانی فلسفہ کے نام سے موسوم ہے۔ سحر اور جادو میں بھی اس شہر کے باشندے مشہور تھے، اسی کے ساتھ عیاشی اور خرنفسی میں بھی یہ اپنی آپ ہی نظیر تھے، اب کھنڈر کی صورت میں دریائے کیسپٹر کے دہانے پر دور تک پھیلا پڑا ہے، ترک مسلمانوں کا ایک گاؤں جوایا سلک ان ہی کھنڈروں کے درمیان اس وقت تک آباد ہے۔ امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ ان کے زمانے میں افسوس کو لوگ طرطوس کہتے ہیں۔

۳۶۔ بیجاپور کی تاریخ میں زبیری نے لکھا ہے ''دراصل شہر'' بیجانگر'' وحوالی آں کوہاستند مشتمل بر رخنہا وغار ہائے عمیق کہ سہ'' فرسخ (۹ میل) چہار فرسخ (۱۲ میل) اندرون رخنہا راہ تواں رفت'' یہ بھی ہے کہ کہیں کہیں اندرونی حصے ان کے بہت وسیع اور روشن ہیں اور کہیں بہت تنگ۔ بیجانگر کا جب سقوط ہوا تو شہر کی آبادی کی بڑی تعداد ان ہی کوہستانی تہہ خانوں میں پناہ گزین ہوگئی تھی، مسلمانوں کو مہینوں کے بعد اس کی خبر ہوئی (ص ۱۱۷) امیر شکیب ارسلان نے بھی اپنے وطن لبنان کے ایک کہف تذکرہ کیا ہے جس میں ایک پوری فوج چھپ گئی تھی۔

۳۷۔ رازی کی تفسیر میں یہ کہنا کہ غیر ذبیحہ یا بتوں پر چڑھائی ہوئی چیزوں سے بچنے کا مشورہ دے رہے تھے، یہ مشورہ اصحاب کہف کی جماعت کے کسی رکن کو بہ ظاہر دینے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی، اتنی باتیں تو ہر معمولی مومن آدمی بھی جانتا ہے۔

۳۸۔ عیسائیوں میں جو فرقہ اس زمانہ میں ''یعقوبیوں'' کے نام سے موسوم تھا، اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے قول کا قائل اور معتقد تھا، کہتا تھا کہ تین تو اصحاب کہف تھے۔ چوتھا ان کا کتا تھا اور ''نسطوریوں'' کے نام سے جو فرقہ ملقب تھا وہ پانچ تو تعداد کہف والوں کی بتاتا تھا اور کتے کو چھٹا قرار دیتا تھا (تفسیر کبیر۔ جلد ۶ ص ۱۰۷)

۳۹۔ مرزائی جماعت کے لاہوری اور قادیانی دونوں گروہوں کی تفسیروں میں اصحاب کہف کی شخصی و انفرادی زندگی کی جگہ تین سو سال

کی اس مدت کو عیسائیوں کی قوم کی طرف منسوب کر کے یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ مدت اشخاص وافراد کی نہیں بلکہ عیسائی اُمت یا قوم کی زندگی کا کہفی دور تھا جو قسطنطنین کے عیسائی ہونے سے پہلے ان پر گزرا، مرزا بشیر صاحب نے عیسوی سن کے موجودہ کلنڈر کی غلطیوں کا ذکر کر کے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ (۹) سال کا تذکرہ قرآن نے خاص طریقہ سے جو کیا ہے اس میں اشارہ کلنڈر کی ان ہی غلطیوں کی طرف ہے جو بالکل ایک اَنمل بے جوڑ سی بات معلوم ہوتی ہے اور اس میں بھی زیادہ تعجب ان کی اس تحریفی جرأت پر ہے، قرآن کے واضح الفاظ سے معلوم ہو رہا ہے کہ کہف میں نوجوانوں کی جو ٹولی پناہ لینے کے لیے داخل ہوئی تھی وہی نیند سے اٹھی، اچانک لوگ ان ہی سے واقف ہوئے۔ ان ہی کی یادگار قائم کرنے پر لوگ اصرار کر رہے تھے، ان ہی کے متعلق آئندہ عددی مکاتب خیال قائم ہوئے اور وہی تین سو نو سال اس کہف میں قیام پذیر رہے۔ مگر معلوم نہیں قرآن کے کس لفظ سے ان انفرادی شخصیتوں کو قادیانی ذہنیت نے قوم اور امت کا رنگ دے دیا۔ شاید اپنی اس تحریفی حرکت سے ان کی غرض یہ ہے کہ شخصی زندگیوں کی اتنی غیر معمولی طوالت کو چونکہ عام عقلیت برداشت نہیں کر سکتی، اس لیے غلط عقلیت کی تصحیح سے زیادہ مناسب ان کو یہ معلوم ہوا کہ قرآن کی غلطی کی تصحیح کر دی جائے، حالانکہ ایمانی اجر کے متعلق جن غیر معمولی توقعات کو قرآن مومن کے دل میں قائم کرنا چاہتا ہے، اس غرض کی تکمیل ہی اس وقت تک نہیں ہو سکتی تھی جب تک کہ ایمانی اجر کی عام شکلوں کے ساتھ ساتھ اسی کے غیر معمولی مظاہر کا تذکرہ نہ کیا جاتا، ان کی سرگزشت سے ایسے عناصر جن کا عام حالات میں تجربہ نہیں ہوتا اگر نکال دیئے جائیں تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ کبوتر کے اسی پر کو گرا دیا گیا جس میں دلبر کا نامہ بندھا ہوا تھا گویا جس مقصد کے پیش نظر ان کے قصے کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے اس کی روح ہی اس تحریفی طریقہ کار سے نکل جاتی ہے، یہی تو بتانا مقصود ہے کہ ناموافق سے ناموافق حالات میں بھی ایمان بہرحال ایک ذریعہ نجات کا ایسا رہ جاتا ہے کہ مومن جس سے ہر حال میں مدد حاصل کر سکتا ہے، ہاں قصہ کو اصحاب کہف کی انفرادی سرگزشت قرار دیتے ہوئے عیسائیوں کے عہد مظلومیت کی طرف بھی گونہ ایما اگر اسے ٹھہرایا جائے تو ''باب الاشارہ'' کے لحاظ سے تھوڑی بہت گنجائش اس کی پیدا ہو سکتی ہے لیکن بجائے جزئی اور شخصی واقعہ کے کسی قوم کے کلی حادثے کی تعبیر قرآنی الفاظ سے نکالنی تحریفی خواب پریشاں کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

۴۰۔ زینۃ الحیوٰۃ الدنیا سے مولانا کے الفاظ میں وہ چیزیں مراد ہیں ''جن کے استعمال پر آدمی مجبور تو نہ ہو مگر التذاذی احساسات کی تسکین وتشفی کا سامان ان سے فراہم ہوتا ہو'' جسے موجودہ معاشی اصطلاح میں (Luxury) کہتے ہیں۔

۴۱۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم ان ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چلاتے رہتے تھے، مسلمانوں کو چونکاتے تھے کہ

الحذر از دستبرد روزگار گیر فرزندان خود در کنار

۴۲۔ مثلاً حضرت الاستاذ مولانا انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہٗ ہی کو میں نے دیکھا ہے، جب دیوبند میں حدیث کا درس بغیر کسی تنخواہ کے وہ برسوں سے دے رہے تھے، اسی زمانہ میں ڈھاکہ یونی ورسٹی کے شعبۂ اسلامیات کی صدارت ہزار روپے ماہوار کی تنخواہ کے ساتھ پیش ہوئی لیکن یہی نہیں کہ خاموشی کے ساتھ انہوں نے اس کو مسترد کر دیا، بلکہ زمانہ تک خود مدرسہ کے اراکین کو بھی اس کی خبر نہ ہوئی۔ حضرت شیخ الہند کے متعلق یہ کون باور کرے گا کہ ماہوار پچھتر روپے ان کے نام سے جو درج تھے ان میں سے کل پچاس روپے لے کر پچیس روپے بمد چندہ مدرسہ کو واپس فرما دیتے تھے، اور اسی پچاس میں مسرت ونشاط کی قابل رشک زندگی تقریباً نصف صدی تک بسر کرتے رہے۔ کوئی چاہے تو طویل فہرست دیوار کے ان معماروں کی تیار کر سکتا ہے جنہوں نے مسلمانوں کے صالح اسلاف کے موروثی ترکہ کو آئندہ نسلوں تک بغیر کسی معاوضہ کے یا قلیل ترین معاوضہ کے ساتھ پہنچانے کا انتظام کیا۔ نور اللہ ضریحھم۔

☆......☆......☆

Marfat.com

قرآن کے صابئین
کیا بدھ مذہب کا ماننے والے تھے؟

یہ ایک سوال ہے جسے اہل علم کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ دنیا کے جانے پہچانے عام مذاہب و ادیان یہودیت، عیسائیت بلکہ مجوسیت یعنی دین زردشتی کے ماننے والوں کے ساتھ ساتھ قرآن میں ایک سے زائد مقامات پر ''الصائبین'' کا بھی تذکرہ پایا جاتا ہے۔

سوال یہی ہے کہ ''الصائبین'' کے اس لفظ سے قرآن نے کن لوگوں کی طرف اشارہ کیا ہے؟ اتنی بات تو کھلی ہوئی ہے کہ مذہبی اقوام اور دینی امتوں ہی کا ذکر جب کیا جا رہا ہے، تو ''الصائبین'' بھی چاہیے تو یہی کہ کسی ''دینی اُمت'' ہی کی تعبیر ہو۔

عرب کے باشندے جنہیں قرآن نے اپنا پہلا مخاطب بنا کر دنیا کی قوموں کی طرف ان ہی کو مبعوث کیا تھا[1] اور جو کام ان عربوں کے سپرد کیا گیا تھا، عزم اور ارادے کی پوری قوت، ممکنہ وفاداری اور راستبازی کے ساتھ اس فرض کو انہوں نے انجام دیا اور ایک صدی بھی نہیں گذری تھی کہ مغرب میں مراکش کی پہاڑیوں اور مشرق میں دیوار چین تک قرآنی دعوت کو اس قوم نے پہنچا دیا، پھیلا دیا۔

گویا اترنے اور نازل ہونے کے چند ہی سال بعد وہی قرآن جو عرب میں اترا تھا، معمورۂ عالم کے آباد اور شایستہ علاقوں کا قرآن بن چکا تھا۔ اس کتاب کو اپنی آسمانی کتاب سامی، آریائی، تورانی، الغرض بنی آدم کی عام نسلوں اور قوموں میں ماننے والے پیدا ہو چکے تھے۔ ان ہی ماننے والوں میں نبوات و کتاب سے بے تعلق ہو کر خود تراشیدہ اوہام میں مبتلا بت پرستوں کے ساتھ جیسے عیسائی تھے، یہودی تھے، مجوسی تھے، اسی طرح جاننے والے جانتے ہیں کہ اُن میں کافی اور معقول تعداد بودھ مَتی کے ماننے والوں کی بھی تھی۔ وسط ایشیا، بخارا، سمرقند، بلخ، سندھ، سرحد، چینی ترکستان بلکہ چین میں بھی قرآن پڑھنے والے آج جو پائے جاتے ہیں، سمجھا یہی جاتا ہے کہ اُن کی اکثریت کا تعلق زیادہ تر

بودھوں ہی سے تھا۔

سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ یہودیوں، عیسائیوں، مجوسیوں کے تذکرہ کے ساتھ قرآن پر ایمان لانے والے ان بودھسٹوں کی طرف بھی اس کتاب میں کیا کوئی اشارہ کیا گیا تھا؟ مذاہب وادیان کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی خاص مذہب کے ماننے والوں کو مختلف ممالک اور قوموں میں مختلف ناموں سے لوگ موسوم کرتے رہے ہیں اور کیوں جائیے، خود مسلمانوں کو ساراسین، موز، ترک، ہوئی ہوئی، اور خدا جانے کن کن ناموں سے کن کن ملکوں میں نہیں پکارا گیا اور آج تک نہیں پکارا جا رہا ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ گو خود بدھ متی کے بانی گوتم بدھ کی جدوجہد کا دائرہ بقول ونسنٹ اے۔ اسمتھ:

''نہات چھوٹے علاقے تک محدود تھا، جس میں تقریباً چار درجے عرض بلد اور اتنے ہی طول بلد شامل تھے یہ علاقہ گیا، الہ آباد اور کوہستان ہمالیہ کے درمیان کا ملک تھا، انہی حدود کے اندر گوتم بدھ پیدا ہوا، زندہ رہا اور بالآخر فوت ہو گیا۔'' (ص ۲۶۷)

لیکن مہاراجہ اشوک کی سرپرستی کے بعد جیسا کہ رائے بہادر مہا مہو پادھیائے گوری شنکر ہیرا چند نے لکھا ہے:

''اشوک کی کوشش سے بودھ دھرم کی اشاعت محض ہندوستان تک محدود نہ رہی، بلکہ ہندوستان کے باہر لنکا اور شمال مغرب کے ملکوں میں اس کا زور اور بڑھ گیا۔ بعد ازاں بودھ سادھوؤں کے مذہبی جوش کی بدولت وہ رفتہ رفتہ تبت، چین، منچوریا، منگولیا، جاپان، کوریا، سیام، برما اور سائبیریا کے کرغیز اور کلموک تک پھیل گیا۔'' (ص ۳، قرونِ وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب)

اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ اے۔ اسمتھ کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ

''اس کی (اشوک) اسی دستگیری نے بودھ مذہب کی قسمت کو پھیرا اور اس قابل کر دیا کہ اس زمانے میں بھی وہ اسلام اور عیسائیت کا بلحاظ تعداد و مقابلہ کرنے، بلکہ اُن سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہا ہے۔'' (ص ۲۶۸) (تاریخ قدیم ہند)

ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ''شمال مغرب'' اور ''لنکا'' جہاں بودھ متی کے پھیل جانے کی اطلاع دی گئی ہے۔ لکھنے والوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ

''ایران و مصر تک بودھ مذہب کا اثر پھیل چکا تھا۔'' (ہندوؤں کے دس اتار۔ ص ۶۲)

یہی نہیں، بلکہ شام اور فلسطین میں بھی بودھ مذہب کے جن آثار کا لوگوں نے پتہ چلایا ہے اُن کی بنیاد پر بقول اے۔ اسمتھ:

Marfat.com

''بہت سے مصنفین ایسے بھی ہیں، جن کا خیال ہے کہ عیسوی مذہب کی بھی بہت سی باتوں میں بدھ تعلیمات کا اثر ملتا ہے۔'' (قدیم تاریخ ہند۔ص ۲۶۷)

بجائے خود اس دعویٰ کی نوعیت خواہ کچھ ہی ہو، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فلسطین وشام تک بودھ مت کا اثر کسی نہ کسی شکل میں ضرور پہنچا ہے، جہاں عرب کے باشندوں کی آمد و رفت جاری تھی، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ تجارتی اغراض سے لنکا اور جزائر شرق الہند جاوا سماٹرا اور چین تک عرب آتے جاتے رہے تھے:

''الغرض بودھ مت والوں سے عرب کی واقفیت کسی وجہ سے محلِ تعجب نہیں ہو سکتی!''

ان اجمالی معلومات کے بعد جن کی تفصیلات سے اربابِ تاریخ واقف ہیں۔اب آیئے اور جو سوال اٹھایا گیا ہے اس پر غور کیجئے۔

اس سے تو خواص ہی نہیں، شاید عوام بھی واقف ہوں گے کہ ''الصابئین'' کا لفظ جو صابی کی جمع ہے، عرب اور مکہ والے صرف اس سے مانوس ہی نہ تھے، بلکہ عام طور پر یہ لفظ اُن میں مستعمل تھا۔انتہا یہ ہے کہ جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں امام رازی نے بھی اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ

كانت العرب يسمون النبي عليه السلام صائباً (ص ۵۴۹)

عرب کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام صابی رکھ دیا تھا۔

بلکہ ''صابی'' کے اسی لفظ سے صیغے بھی بنائے گئے ہیں۔دین اسلام کے قبول کر لینے والوں کو عموماً صبوت (تم صابی ہو گئے) کہا کرتے تھے، لیکن باوجود اس کے جب قرآن کے لفظ ''الصابئین'' کی تفسیر کا مرحلہ پیش آیا، تو مفسرین کی رائیں مختلف ہو گئیں۔تفسیر کی موجودہ کتابوں میں جتنے اقوال پائے جاتے ہیں، اُن کا خلاصہ ہے:

۱۔ حضرت نوح علیہ السلام کے دین کے ماننے والوں کی ''اصابئین'' یادگار ہیں۔(ابوالمسعود ج ا ص ۵۵۰)

۲۔ اہلِ کتاب ہی کا ایک گروہ ہے۔السدّی کا یہ قول ہے۔

۳۔ ایک قوم ہے جو فرشتوں کو پوجتی ہے اور زبور کی تلاوت کرتی ہے۔

۴۔ کسدانیوں (قدیم بابل و نینوا) والوں کی یہ یادگار امت ہے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام اسی امت کی اصلاح کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔

۵۔ وہب بن منبہ جو غیر قوموں کے حالات سے زیادہ واقف تھے، کہا کرتے تھے کہ صابی ان لوگوں کو کہتے ہیں جو اللہ کی توحید کے قائل ہیں، لیکن اُن کے پاس کوئی خاص شریعت نہیں ہے جس پر عمل کیا جائے۔

۶۔ ابوالزناد کا قول ہے کہ عراق کے نواح میں کوثی نامی مقام کی رہنے والی یہ ایک قوم ہے جو سارے انبیاء علیہم السلام کو مانتی ہے۔(درمنثور۔ج ا ص ۷۵)

۷۔ مجاہد کہتے تھے کہ صابی نہ تو یہودی ہیں نہ نصاریٰ بلکہ مشرکوں کی ایک قوم ہے جن کے پاس کوئی کتاب نہیں ہے۔

۸۔ سعید بن جبیر کی طرف ایک لطیفہ یہ بھی منسوب کیا گیا ہے کہ کچھ لوگ تھے جو یہودیوں سے ملے اور پوچھا کہ

تمہارے دین کی نوعیت کیا ہے؟ جواب دیا گیا کہ ہمارے پیغمبر موسیٰ علیہ السلام ہیں، جن کی کتاب تورات ہے، اس کتاب میں فلاں فلاں باتوں کا حکم دیا گیا ہے اور فلاں فلاں چیزوں سے منع کیا گیا ہے۔ جو ہمارا ساتھ دے گا وہی جنت میں داخل ہوگا۔ پھر وہ عیسائیوں کے پاس آئے اور پوچھا، جس کا جواب دیا گیا کہ ہمارے پیغمبر عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور اُن کی کتاب انجیل ہے، جو ہماری پیروی کرے گا وہی جنت میں ہوگا۔ صابیوں نے دونوں قوموں کی ان باتوں کو سُن کر کہا کہ ان جھگڑوں میں کون پڑے، ہم کسی مذہب کو نہیں مانتے۔ (درمنثور۔ص ۷۵)

الغرض یہی یا اسی کے قریب قریب مختلف اقوال مختلف لوگوں کی طرف تفسیر کی کتابوں میں منسوب کیے گئے ہیں۔ حاصل جن کا یہی ہوسکتا ہے کہ حضرت نوح جو گویا اول الانبیاء تھے، اُن کی طرف منسوب کر کے دنیا کی امتوں میں قدیم ترین امت صائبیون کو ٹھہرانے والے جہاں ملتے ہیں، وہیں ان ہی مفسرین میں ایسے حضرات بھی ہیں، جو یہودیوں اور عیسائیوں کے بعد نئی تازہ اُمّت اُن کو قرار دیتے ہیں۔

اس میں شک نہیں جیسا کہ تاریخ کی کتابوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نام کی ایک قوم عراق کے نواح میں پائی جاتی تھی۔ ابوالزناد نے کوثی نامی آبادی میں اُن کا جو پتہ دیا ہے، اس سے وہی مراد ہیں۔ مسعودی نے بھی ''مروج الذہب'' میں لکھا ہے کہ ایک گروہ اسی صائبین کے نام کا عراق کے نواح میں پایا جاتا ہے۔ اس کے اصل الفاظ یہ ہیں:

وديار هم في بلا دواسط والبصره من ارض العراق نحو البطائع والآجام. (مروج کامل۔ ج ۲ ص ۷۴)

ان لوگوں کی بستیاں واسط اور بصرہ میں عراق کے اس حصّہ میں پائی جاتی ہیں جن میں بطائح (دل دل) اور نے کے جنگ ہیں۔

لیکن اسی کے ساتھ المسعودی نے یہ اطلاع بھی دی ہے اور اس کی یہی خبر مستحقِ توجہ ہے یعنی عراق کے صائبیون کا ذکر کر کے اس نے لکھا ہے:

وهذا النوع من الصّائبة مبائتون للحرانيين في نحلتهم (ج ۲ ص ۷۴)

عراق والے صابی اپنے نحلہ و دین دھرم میں حرانی صابیوں سے الگ ہیں۔

المسعودی کے ان الفاظ کا صحیح مطلب کیا ہے؟ اس پر تو آگے بحث کی جائے گی۔ سروست ان سے اجمالی نتیجہ جو پیدا ہوتا ہے، وہ یہی ہے کہ المسعودی کے علم کے مطابق صابیوں کی ایک قوم تو وہ ہے جو عراق کے نواح میں پائی جاتی تھی اور یہ کہ ان عراقی صابیوں کا نحلہ (یعنی کیش یا زندگی کے جس طریقہ کو اپنا دھن انہوں نے بنا لیا تھا) ان کا یہ نحلہ دوسرے صابیوں سے بالکل جدا تھا۔

بظاہر خیال یہی ہوتا ہے کہ ان ہی عراقی صابیوں کے متعلق سُنی سُنائی باتیں ہمارے مفسرین تک پہنچی ہیں، جن کو جو کچھ بھی اس سلسلہ میں معلوم ہوا، اسی کو انہوں نے اپنی کتابوں میں درج کر دیا۔

لیکن جیسا کہ المسعودی نے لکھا ہے عراق کے صابی بھی گو صابی ہی کہلاتے تھے، مگر دوسرے صابیوں اور ان

Marfat.com

میں نام ہی کا صرف اشتراک تھا۔ ایسا کیوں ہوا! کوئی معین قابل اعتماد جواب تو اس کا مشکل ہے، لیکن عراق کے جن حصوں میں وہ آباد تھے، ''یعنی بطائح اور آجام'' جس کی حقیقت گویا وہی ہے جو ہمارے وطن میں بڑے بڑے دریا کے متصلہ کی ہوتی ہے، جن میں عموماً دلدل اور جھاڑیاں پیدا ہو جاتی ہیں، مرطوب اور نمناک ہونے کی وجہ سے ملیریں مقامات بن جاتے ہیں۔

ملیریا بخار کا ترجمہ اسی لیے جدید عربی طب میں ''آجامی بخار'' یا ''حمی آجامیہ'' کیا گیا ہے۔ ایرانی امراء جو عراق پر قابض تھے، انہوں نے معلوم ہوتا ہے غریب صابیوں کو ان ہی علاقوں کی طرف ہنکا دیا تھا اور وہیں بسنے پر اُن کو مجبور کیا تھا۔ انتہائی غربت وافلاس کی زندگی ان ہی بطائح اور آجام میں بسر کرتے تھے۔[1]

ایسی حالت میں ان پر جو بھی گذری، گذرنا ہی چاہئے تھا۔ اپنے موروثی دین، آبائی تہذیب سے اُن کا تعلق ایسی صورت میں اگر باقی نہ رہا، تو خود سوچئے کہ جو افتاد اُن پر پڑی تھی، اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔

خدا ہی جانتا ہے کہ ان غریب صائبیوں کی کتنی پشتیں دجلہ وفرات کے ان ملیریں علاقوں میں گذری تھیں۔

اس میں شک نہیں کہ عراق جب ایرانی امراء کے پنجۂ استبداد سے آزاد ہوا، تو دوسروں کے ساتھ ان صابیوں کو بھی معلوم ہوتا ہے کہ سانس لینے کا کچھ موقع ملا، خصوصاً بغداد کو عباسیوں نے جب اپنا پایۂ تخت بنایا، تو ایک سے زیادہ امراء عباسی دربار کے ایسے نظر آتے ہیں، جن کے نام کے ساتھ صابی کا لفظ لکھا جاتا ہے، جن میں ثابت بن قرہ اور اس کے خاندان کے لوگ خاص طور پر مشہور ہوئے، لیکن عباسیوں کے عہد کے صابی امراء کے خاندان کا بانی بھی ثابت جیسا کہ کتابوں میں لکھا ہے کہ ابتدا میں ایک معمولی صراف تھا، محمد بن موسیٰ منجم اور فلسفی نے اس کو اپنے ساتھ رکھ لیا تھا اور علاوہ عام فلسفہ وحکمت کی کتابوں کے طب کی تعلیم بھی ثابت نے حاصل کی، معتضد باللہ عباسی خلیفہ اس سے بہت زیادہ متاثر ہوا اور اسی نے آگے بڑھنے کے مواقع دیئے، جس کی تفصیل کتابوں میں پڑھنی چاہیے۔

لیکن علم وفضل کے بعد بھی ان صابیوں کو اپنے آبائی دین کے متعلق بس اسی قدر معلوم تھا جتنا دجلہ وفرات کے آجام وبطائح میں رہنے والے جانتے تھے یا جان سکتے تھے، البتہ ثابت کا جو نسب نامہ ہمارے ہاں کی کتابوں میں نقل کیا جاتا ہے، اس میں لکھتے ہیں کہ ادریس پیغمبر علیہ السلام کے ایک صاحبزادے جن کا نام طاط تھا، وہی ''صاب'' کے لقب سے ملقب تھے۔ ابن ابی اصیبعہ میں ہے:

الصابئیون نسبتهم الیٰ صاب و هو طا ط بن النبی ادریس علیه السلام. (جلد ا ص ۲۱۵)

صابی لوگوں کی نسبت صاب کی طرف ہے جو ادریس علیہ السلام کے صاحبزادے طاط کا نام تھا۔

خدا جانے اس کی اصلیت کیا ہے؟ ممکن ہے کہ عباسی دربار میں امتیاز حاصل ہونے کے بعد یہ بات بنائی گئی ہو، لیکن اگر کچھ بھی اس دعویٰ کا واقعہ سے تعلق ہے تو پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ عراق کے صابی مذہباً نہیں بلکہ نسلاً تھے، اور اس لیے ان صائبیون سے وہ الگ تھے، جو دین صابئہ کے ماننے والے تھے، لیکن عراقی صائبیون کا جو حال بیان کیا جاتا ہے اس سے اس احتمال کی تائید مشکل ہی سے ہو سکتی ہے۔ عام طور پر بیان کرنے والے جس طریقہ سے عراقی صابیوں کا

Marfat.com

تذکرہ کرتے ہیں، اس سے تو یہی معلوم ہتا ہے کہ یہ نسلی نہیں بلکہ ایک دینی جتھے کی تعبیر ہے۔

بہر حال مذہب اور مذہبی امتوں کی بوقلمونیوں کے جو قصے کتابوں میں نقل کئے گئے ہیں بلکہ آج بھی اس سلسلہ کے عینی مشاہدات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس پر بالکل تعجب نہیں ہوتا کہ عراق کے صابیوں کی دینی زندگی دوسرے صابیوں سے اس حد تک مختلف ہو چکی تھی کہ نام کے سوا ان دونوں میں کوئی چیز مشترک باقی نہ رہی تھی۔ آخر آج آپ سے کوئی کہے کہ

''ہندوستان میں ایک فرقہ ایسا بھی پایا جاتا تھا، جس کی دینی زندگی اور مذہبی کاروبار کے نمایاں عناصر یہ تھے، کہ جو مر چکے ہیں، ان ہی کے ساتھ تعلقات کو تازہ رکھنا اپنا سب سے بڑا مذہبی فرض خیال کرتے تھے۔ اُن کی ہر آبادی میں ایک مرکزی قبر پائی جاتی تھی، زندگی کے مشکلات اور عام حاجتوں میں آبادی کی اسی قبر یا درگاہ کی طرف رجوع ہونا، خوشی اور غم، ہر موقعہ پر درگاہ کی حاضری، شادی کے موقع پر دولہا اور دولہن کی سواریوں کو درگاہ پر لے جانا، سال بھر میں اسی دن جس دن صاحبِ قبر کی وفات ہوئی، خوشی منانا، ڈھول باجوں کے ساتھ جلوس نکالنا، قبر کو غسل دینے کے لیے خاص اہتمام کے ساتھ ممتاز ہستیوں کا سروں پر پانی لانا، صندل مالی کے بعد پانی کو قبر پر بہا کر اپنے ہاتھوں بلکہ اپنی پیٹھوں سے قبر کو ڈھونا، غسل کے بعد ہر سال اسی مرکزی قبر پر قیمتی سی قیمتی چادر دن کا چڑھانا، عطر اور طرح طرح کی خوشبو میں ان چادروں کا بسانا اور قبر کے سامنے دھونی دینا آبادی کے افراد کا قبر پر اپنی اپنی حیثیت سے نذرین چڑھانا، یہ اور اسی قسم کے قبری کاروبار ہی ان لوگوں کا دین اور دھرم تھا۔

قبری کاروبار کے اسی سلسلہ میں ہر سال ایک غیر معمولی تقریب شہروں اور قصبوں ہی میں نہیں بلکہ اُن کے ہر ہر گاؤں میں اس طرح بھی منائی جاتی تھی کہ بجائے قبر کے دو بزرگوں کو قبروں کا نمونہ کاغذ اور بانس کی ٹھٹھریوں سے بنایا جاتا تھا۔ اور قبر کے اس نمونہ کو بہترین لباس پہنائے جاتے تھے۔ سہرا بھی قبر کے اسی نمونہ کے سر پر باندھا جاتا تھا۔ پھر آبادی کے مقررہ مقام سے مٹی لا کر دو قبریں ایسی بنائی جاتی تھیں، گویا لاشوں کے وہ نمونے ہیں۔ قبر کے نمونوں میں لاشوں کے ان خاکی نمونوں کو دفن کر کے پھر ساری آبادی میں گھوڑوں، ہاتھیوں، اونٹوں وغیرہ کے جلو میں سواری نکالی جاتی تھی۔ نقارے، شہنائیاں، بگل، قرنا، بوق، الغرض دنیا بھر کے باجوں کے ساتھ گشت کراتے ہوئے اسی مقام پر لوگ پہنچتے تھے، جہاں کی مٹی سے لاشوں کے نمونے بنائے گئے تھے اور اسی مقام میں اُن خاکی لاشوں کو دفن کر دیتے تھے۔ اس سلسلہ میں ہر آبادی کے قبری نمونہ کا مقابلہ دوسری آبادی کے قبری نمونہ سے ہوتا تھا۔ دونوں طرف سے مقابلہ میں کافی جوش و خروش کا اظہار کیا جاتا تھا۔ بعض دفعہ خونریزی کی نوبت بھی قبری نمونوں کے مقابلہ میں آ جاتی

Marfat.com

تھی۔ ہر بستی کے باشندے اپنی ضرورتیں کاغذ اور بانس کی ٹھٹھریوں کے ان ہی قبری نمونوں پر پیش کر کے یقین کر لیتے تھے کہ جو کچھ ہمیں مانگنا تھا، مانگ لیا اور ہماری ساری مرادیں سال بھر تک پوری ہوتی رہیں گی۔ جو اولاد سے محروم ہوتے، سمجھتے تھے کہ ان کو اولاد عطا ہو گئی اور جو روزی مانگتے تھے، خیال کر لیتے تھے کہ رزق کی ضمانت اُن کو مل گئی۔ ان قبری نمونوں کے ساتھ تعلق قائم کرنے کے بعد جو بچے پیدا ہوتے تھے، ان کو ہر سال خاص قسم کا لباس پہنایا جاتا تھا، کمر میں اُن کی زنجیر باندھی جاتی تھی، مور کے پر بھی سروں پر لگائے جاتے تھے اور ایک گاؤں کے قبری نمونے کے گرد طواف کر کے دوسرے گاؤں، دوسرے تیسرے گاؤں تک طواف کرنے کے لیے وہی دوڑے پھرتے تھے۔ شربت کی مشکیں بھی ان بچوں پر لادی جاتی تھیں اور تقریب میں شریک ہونے والوں کو وہ شربت پلائے جاتے تھے۔ اس زمانہ میں خاص قسم کے کھانے گھروں میں پکتے تھے، کپڑوں کو بھی خاص قسم کے رنگ میں رنگتے تھے۔

اپنی حکومت کے زوال وانحطاط کے زمانہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت کی دینی زندگی پر جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں، یہی رنگ جو غالب تھا، اس کو دیکھ کر دیکھنے والا مذکورۂ بالا الفاظ میں مسلمانوں کی خصوصیتوں کو اگر بیان کرے تو بتایا جائے کہ غلط بیانی یا جہل کے الزام کو اس کی طرف عائد کرنا کسی حیثیت سے بھی صحیح ہوسکتا ہے۔

پھر جن لوگوں کے سامنے صابیوں کے وہی نمونے پیش ہوئے، جو ایرانیوں کی غلامی کے شکنجے میں جکڑے ہوئے عراق کے بطائح وآجام میں جہل ووحشت کی زندگی گذار رہے تھے، جن غریبوں کی اخلاقی زبوں حالیاں اس حد تک پہنچی ہوئی تھیں کہ عباسیوں کے عہد میں اُن کے صرف لکھنے پڑھنے ہی کے مواقع میسر نہ تھے، بلکہ کتابوں میں پڑھیے، ان میں بڑے بڑے مصنفین، فلاسفہ، مہندسین، اطباء، مسلسل پیدا ہو رہے تھے، ان ہی صابیوں میں بعضوں کا اقتدار اس درجہ تک پہنچ گیا تھا کہ عباسی خلیفہ معتضد باللہ کے متعلق لکھا ہے کہ

كان يجلس بحضرة فى كل وقت وبحادثه طويلاً و يضاحكه و يقبل عليه دون وزرائه دخاصته

(القفطی۔ ص ۸۱)

اس کی مجلس میں وہی صابی شریک رہتا تھا، جو خلیفہ سے باتیں کرتا، ہنستا، بولتا، اور وزراء کے مقابلہ میں خلیفہ اسی کی طرف متوجہ ہوتا۔

مگر باوجود ان تمام باتوں کے خود ایک عراقی صابی کا بیان ہے کہ جس کو میں بجنسہٖ اس کے الفاظ کے ساتھ القفطی کی تاریخ سے نقل کر دیتا ہوں:

ولهو لاء الصّابئة من سوء الا خلاق و معاداة الاهل بعضهم بعضاً مالا يكون عليه احد غير هم حتّٰى لا يرى منهم اثنان متفقين ولا مجتمعين بل يسعىٰ بعضهم فى بعض ويقبح كل واحد على الأ خوبكل مانجد اليه السبيل، (صف ۲۶۰)

اخلاقی خرابیوں اور باہمی بغض وعداوت میں ان صابیوں کا یہ حال ہے کہ ان کے سوا یہ حال کسی دوسرے کا نہیں ہوسکتا، ان میں دو

آدمی بھی کبھی متفق اور میل ملاپ کے ساتھ نہیں رہ سکتے، بلکہ ہر ایک دوسرے کے مقابلہ میں مخالفانہ کوششوں میں سرگرم رہتا ہے اور جہاں تک ممکن ہے ایک دوسرے کی بُرائی اور عیب چینی کے درپے رہتا ہے۔ کوئی دقیقہ اس راہ میں اٹھا نہیں رکھتا۔

یہ بیان اس شخص کا ہے جو صابیوں کے اسی خاندان کا ایک رکن تھا، جسے عباسی عہد میں غیر معمولی عروج و اقبال حاصل ہوا تھا، اس کا نام ابوالفضل تھا، مثلاً اُس نے اپنے حقیقی بھائی ابوالحسن الصابی کے طرزِ عمل کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں ایک مہلک مرض میں مبتلا ہوں۔ بھائی سے میری صفائی نہ تھی۔ نہ وہ مجھ سے ملتے تھے اور نہ میں اُن سے، لیکن اپنے مرض کی تکلیف سے مجبور ہو کر اُن کو خط لکھا اور لجاجت کے ساتھ عرض کیا کہ مجھے آکر دیکھ جائیے اور میرا علاج کیجئے۔ میرے اس خط کو پاکر وہ آتو گئے اور علاج بھی کیا، لیکن جب میری حالت کچھ سنبھلی تو وہ چلے گئے۔ تندرست ہونے کے بعد میں لاٹھی ٹیکتے ہوئے اُن کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ایک دن اُن کے گھر پہنچا۔ ایک دریچے سے اُن کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ پکار کر بولے کہ

"ابوالفضل تم الٹے پاؤں واپس ہو جاؤ، میرا دل تم سے صاف نہیں ہوا ہے اور جیسے تعلقات تم سے منقطع تھے، آیندہ بھی منقطع ہی رہیں گے۔"

یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد ابوالفضل لکھتا ہے کہ اس بے رحم آدمی کے اس برتاؤ کو دیکھ کر میرا دل ٹوٹ گیا اور میں ملے بغیر واپس چلا آیا۔

وما دخل الی ولا دخلت الیه مدة حیاته (قفطی ج ۲ ص ۲۶۰)

پھر نہ زندگی بھر میں ہی اُن کے یہاں گیا، اور نہ وہی میرے یہاں آئے۔

علم و فضل کے بعد جن کا یہ اخلاقی حالت تھی، تو اندازہ کرنا چاہیے کہ جہل و وحشت کے زمانہ میں وہ کیا ہوں گے۔

یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ ہمارے مفسرین بے چارے ان صابیوں کے متعلق کسی خاص نتیجہ تک نہ پہنچ سکے۔ بظاہر خیال گذرتا ہے کہ عراق کے قدیم باشندے کلدانیوں، یا کسدانیوں کی صحبت میں ستارہ پرستی اور آفتاب و ماہتاب کی مورتیوں کی پوجا کا رواج ان میں ہو چکا تھا، پھر جب یہودیوں اور عیسائی مذہب کے راہبوں کی آمد و رفت اسلام سے پہلے عراق میں شروع ہوئی تو عیسوی دین کی بھی کچھ چیزیں ان کی دینی زندگی میں شریک ہو گئیں، مثلاً داؤد علیہ السلام کے زبور کی تلاوت کیا کرتے تھے، جو بظاہر عیسائیوں یا یہودیوں کے میل جول کا نتیجہ تھا اور اہلِ کتاب ہی کی صحبت میں غالباً وہ حضرت نوحؑ، حضرت ادریسؑ اور دوسرے انبیاء کے ناموں سے واقف ہوئے جب اُن سے کوئی پوچھتا تو کبھی اپنے آپ کو حضرت نوحؑ کی اور کبھی حضرت ادریسؑ کی یادگار قرار دیتے۔ اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے بعض نے باضابطہ عیسائی یا اہلِ کتاب کا دین قبول کر لیا تھا۔ آئندہ بھی اس کا ذکر آئے گا۔

بہر حال میرا خیال ہے کہ اربابِ تفسیر تک اُن کے متعلق اسی قسم کی روایتیں مختلف ذرائع سے پہنچتی رہیں اور ان ہی کو وہ کتابوں میں درج کرتے چلے گئے۔

مگر سوچنے کی بات یہ تھی کہ عراق کے صابی جن کی حیثیت ایک مقامی فرقے سے زیادہ نہ تھی، اُن کی تعداد

Marfat.com

جیسا کہ بعضوں نے لکھا ہے کہ ترکوں کے زمانہ تک چند لاکھ سے آگے نہ بڑھ سکتی تھی۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے عراق میں جس زمانہ میں اُن کو پایا ہوگا، شاید چند ہزار سے زیادہ نہ رہے ہوں گے اور قرآن جس وقت نازل ہو رہا تھا، اس وقت اُن کی تعداد اور بھی کم اور نا قابلِ لحاظ ہی رہی ہوگی۔ ایسی حالت میں کسی صورت میں بھی دنیا کی عالمگیر دینی اُمتوں یا غیر معمولی شہرت رکھنے والی مذہبی قوموں یعنی یہود و نصاریٰ اور مجوس کے ساتھ ایسے حقیر فرقے یعنی صابیوں کے قرآن میں تذکرہ کی جو عراق کے سیستانوں میں غربت و افلاس، وحشت و بربریت کی زندگی گذار رہا تھا، آخر کیا وجہ ہو سکتی تھی اور اگر قرآن بڑے چھوٹے ہر قسم کے دینی فرقوں ہی کا ذکر کرنا چاہتا تھا، تو دنیا کے ہر حصہ میں بے شمار دینی فرقے اور مذہبی جتھے پائے جاتے تھے۔

ان سب سے قطع نظر کر کے صرف عراق کے اس مجہول اور غیر معروف فرقہ کے انتخاب کی کوئی وجہ تو ہو سکتی تھی۔ اس قسم کی مقامی مذہبی ٹولیوں سے تو دنیا بھری ہوئی تھی، اس لیے اگر ان عراقی صابیوں کو قرآن کے صابئین کا مصداق نہ قرار دیا جائے تو وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر قرآن کے ان ''الصابئین'' کو ہم کہاں ڈھونڈھیں۔

آیئے، جو مواد اور معلومات اس سلسلہ میں اب تک فراہم ہوئے ہیں، اسے پیش کئے دیتا ہوں۔ ممکن ہے اس سے کسی نتیجہ تک پہنچنے میں کچھ مدد ملے۔

اس سلسلہ میں پہلی اطلاع اسی المسعودی کی ہے، جس نے لکھا ہے کہ عراق کے صابیوں کا نحلہ (دین، دھرم) دوسرے صابیوں سے مختلف ہے۔ اپنی کتاب ''مروج الذہب'' میں ایک مقام پر اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

> ''ہندوستان اور چین کے اکثر باشندوں کا خیال تھا کہ خالق کائنات خود بھی ایک جسمانی وجود ہے اور فرشتے (ملائکہ) بھی جسمانی ہیکل رکھنے والی ہستیاں ہیں، خدا اور اُس کے فرشتے پر اُن کا اعتقاد تھا کہ آسمانوں میں چھپے ہوئے ہیں، اسی اعتقاد اور خیال نے اُن کو اس پر آمادہ کیا کہ خدا خالق کائنات اور اس کے فرشتوں کی مورتیاں تراشیں۔ انہوں نے خدا کی بھی مورت ڈھالی اور فرشتوں کی بھی۔ ان کی مورتیاں مختلف شکل وصورت اور قد کی بنائی گئی تھیں، جن میں بعضوں کی صورت تو انسانوں کی اور بعضوں کی شکلیں غیر انسانی تھیں۔ ان مورتیوں کے لیے قربانیوں کے مختلف طریقے اختیار کئے گئے اور خاص خاص قسم کی نذریں ان کے لیے مقرر کی گئیں۔''

اس کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ ان مورتیوں کے بعد آفتاب، ماہتاب، ستاروں اور سیاروں کی پرستش کا رواج بھی ان میں ہوا اور اُن کی بھی مورتیاں بنائی گئیں اور ہر مورتی کے لیے خاص خاص قسم کے ہیکل یعنی مندر اور دیول تعمیر کئے گئے، جن کا نام ان ہی ستاروں کے نام پر رکھا گیا۔ یہ اور اسی قسم کی تفصیلات کے بعد المسعودی نے جو بیان کیا ہے، اسی کا پیش کرنا مقصود ہے۔

فلم یزالوا علیٰ ذٰلک حتّٰی ظھر بوداسف بارض الھند، وکان ھندیًا. (مروج۔ جلد ۵ ص ۴۲ بر کال)
ہندوستان و چین کے باشندے ان ہی حالات میں تھے کہ سرزمین ہند میں ایک شخص بوداسف نامی ظاہر ہوا، جو خود ہندوستانی تھا۔

Marfat.com

اس کے بعد یہ لکھ کر کہ ہندوستان کے سوا بوداسف کا اثر سندھ، سیستان، ازبکستان، کرمان وغیرہ وغیرہ تک کیسے پہنچا، یہ بھی اطلاع دیتا ہے کہ

وزعم انه رسول الله وانه واسطة بين الله و بين خلقه. (مروج جلد ۵ ص ۴ برکامل)

بوذاسف نے دعویٰ کیا کہ وہ اللہ کا رسول ہے، خدا اور اس کے بندوں کے درمیان وہ واسطہ ہے۔

پھر اس قسم کی باتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان کا یہ بوذاسف ایرانی بادشاہ طہمورث کے زمانہ میں پیدا ہوا اور بعض کہتے ہیں کہ جمشید کے عہد میں ظاہر ہوا۔ آخر میں اس واقعہ کا انکشاف کرتا ہے کہ

وهواول من اظهر مذهب الصائبة (مروج جلد ۵ ص ۴ برکامل)

بوذاسف ہی پہلا آدمی ہے جس نے پہلی دفعہ صابئہ کے دین کو ظاہر کیا۔

بوذاسف کے دین کی اصل روح المسعودی نے ان الفاظ میں درج کی ہے۔

كان بوذاسف امر الناس بالزهدفی هذا العالم والاشنفال بماعلا من العوالم اذكان من هنالک بدء النفوس و اليها يقع الصدر من هذالعالم. (مروج برکامل۔ ج ۵ ص ۴)

بوذاسف لوگوں کو زہد (یعنی دنیا سے بقدرِ ضرورت استفادہ) کا حکم دیتا تھا اور یہ کہ اپنی توجہ کو لوگ برتر و بالا جہانوں کی طرف مرکوز رکھیں، کیونکہ عالمِ بالا ہی سے جانوں کا آغاز ہوا اور پھر پلٹ کر اسی عالمِ بالا کی طرف لوگ جائیں گے۔

وہ لوگ جو اس سے واقف ہیں کہ بوذاسف بودھا کے لفظ کا عربی تلفظ ہے۔ عربی کتابوں میں بودھا کا ذکر بوذاسف ہی کی شکل میں کیا جاتا ہے۔ وہ المسعودی کی اس اطلاع کا مطلب بھی سمجھ سکتے ہیں اور یہی ان کو سمجھنا چاہیے کہ بودھا جس نے جس دین اور دھرم کی دعوت دی تھی، اسی دین کے ماننے والوں کو صابئہ کہتے تھے۔

چونکہ المسعودی نے براہِ راست ہندوستان کی سیر کی ہے۔ اپنی اسی کتاب ''مروج الذہب'' میں متعدد مقامات پر اُس نے اس کا تذکرہ بھی کیا ہے، مثلاً ایک موقعہ پر اُس نے لکھا ہے کہ

ولقد حضرت ببلا د صيمورمن بلادالهند...... و ذالک فی سنة اربع وثلثماية (ج ۳ ص ۵۶)

میں ہندوستان کے علاقہ صیمور میں ۳۰۴ میں حاضر ہوا۔

اس کو اس ملک کے عوام وخواص بلکہ حکمرانوں سے بھی ملنے جلنے کے کافی مواقع حاصل ہوئے ہیں، اس لیے بودھا کی صحیح تعلیم کو درج کر کے اس نے انقلابات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، جن کا بودھ مذہب بعد کو شکار ہوتا رہا۔

میرا مطلب یہ ہے کہ بوذاسف یعنی مہاتما بدھ کے بعد بدھ متی کے ماننے والوں کے متعلق کتابوں میں اس قسم کی خبریں جو دی گئی ہیں کہ

''مہاتما بدھ کو معبود مان کر اُن کی عبادت کی تعلیم دی جانے لگی اور مورتیاں بننے لگیں، پھر

Marfat.com

۲۴ ماضی، اور ۲۴ مستقبل کے بعد بدھوں کی تخلیق کی گئی۔ اتنا ہی نہیں، بودھی ستووں اور بے شمار دیویوں کو بھی وجود میں لایا گیا اور سیاہی کی مورتیں بننے لگیں۔''

(قرونِ وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب)

بدھ مَتی کے ان انقلابی اور تحریفی پہلوؤں سے بھی المسعودی واقف نہیں ہے۔ اس نے لکھا ہے:

''مورتیوں کی پوجا کا طریقہ بھی ان میں جاری ہوا۔ اس سلسلہ میں مختلف حیلوں اور مخفی تدبیروں سے کام لیا گیا۔'' (ص ۴)

(۲)

بدھ مَتی پر بعد کو جو کچھ گذری وہ میری بحث کا موضوع نہیں ہے، بلکہ کہنا یہ ہے کہ بودھا یا بوذاسف کے ماننے والوں کو صابئہ کہتے تھے۔ اس کا ذکر المسعودی نے علاوہ مذکورۂ بالا مقام کے اسی کتاب میں دوسری جگہ ان الفاظ میں کیا ہے:

ابو ذاسف احدث مذاهب الصائبة، (مروج۔ص ۴، جلد ۲ بر کامل)

صابئہ کے مذاہب یعنی دینی خیالات کو ابوذاسف ہی نے پیدا کیا۔

اور المسعودی تو خیر ہندوستان کا صرف سیاح ہے، یہاں کی علمی زبانوں یعنی سنسکرت یا پالی وغیرہ سے بھی آشنا تھا، مجھے اس کا علم نہیں ہے، لیکن ابوریحان بیرونی کو کون نہیں جانتا کہ ہندی زبانوں اور ہندی علوم و معارف کا اپنے وقت ہی میں نہیں، بلکہ شاید آج تک مستند ترین ماہر مانا جاتا ہے، اپنی مشہور کتاب ''الآثار الباقیہ'' میں اُس نے جو کچھ لکھا ہے، مَیں بجنسہٖ اس کے الفاظ نقل کر دیتا ہوں:

بوذاسف قد ظهر عند مضی سنة من ملک طهمورث بارض الهند واتی بالکتابة الفارسية ودعا الیٰ ملة الصائبين فاتبعه خلق كثير وبقايا هم الآن بالهند والصين التفر غزو يسميهم اهل خراسان شيمنان و آثارهم و بهارات صنامهم و فرخاراتهم ظاهرة فی الثغور خراسان المتصلة بالهند.

(مطبوعہ جرمنی۔ص ۲۰۶)

بوذاسف (یعنی بودھا) شاہ طہمورث ایرانی کے ایک سال بعد سرزمینِ ہند میں ظاہر ہوا اور فارسی حروف کو اس نے رواج دیا، اسی نے الصائبین کی ملت کی طرف لوگوں کو دعوت دی، بہت بڑی خلقت اس کی پیرو ہوگئی، جن کے بقایا (نام لیوا) آج تک ہندوستان اور چین، تغرغز (ترکی قبائل) میں پائے جاتے ہیں، اور خراسان کے لوگ ان کو ''شمنان'' کہتے ہیں، بوذاسف کے ان ماننے والوں کے آثار اور اُن کی مورتیوں اور فرخارات (یعنی پیکروں) کے بھارات خراسان کے ان حصوں میں جو ہندوستان سے متصل ہیں، عام طور پر پائے جاتے ہیں۔

Marfat.com

البیرونی نے جس تفصیل سے کام لیا ہے اُس کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم قطعی طور پر اسی نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ الصائبین کی ملت کا داعی البیرونی کے نزدیک بھی بوذاسف یعنی بدھا تھا۔ بھارت کا لفظ بہار کے لفظ کی جمع ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ بودھ مذہب کے دینی مراکز کی تعبیر بہار سے کی جاتی تھی۔ بہار کے صوبہ میں بودھ مذہب کے دینی مرکزوں کی کثرت تھی، اس لیے اس صوبہ کا نام ہی بہار ہو گیا، بلکہ جاننے والے جانتے ہیں کہ وسط ایشیا کا شہر بخارا دراصل بہار ہی کے لفظ کی ایک شکل ہے۔ ایک زمانہ میں خراسان کا یہی شہر بودھوں کا مرکز تھا۔ بلخ کا نو بہار مسلمانوں کی آمد تک موجود تھا۔ عباسی دربار کے برمکی وزراء کا نسبی تعلق بلخ ہی کے اسی نو بہار کے پرمکھوں سے تھا، پرمکھ کا لفظ عربی میں برمک بن گیا۔

اصنام کے ساتھ فرخارات کا لفظ ظاہر ہے کہ فارسی کے ''لفظ پیکر'' کی عربی شکل ہے، باقی البیرونی کی یہ اطلاع کہ بوذاسف نے فارسی کتابت کے طریقہ کو اختیار کیا، چونکہ قدیم ایرانی حروف سے بھی میں ناواقف ہوں اور پالی زبان کے حروف سے بھی ناآشنا ہوں، اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ البیرونی کا صحیح مطلب کیا ہے۔[۵]

عام طور پر ہماری کلامی کتابوں میں ''سمنیہ'' کا لفظ مستعمل ہے، جس کے متعلق یہ سمجھا دیا جاتا ہے کہ وہ ہندوستانی مفکرین کے کسی خاص گروہ کی تعبیر ہے، لیکن البیرونی کے اس بیان سے کہ خراسان میں بودھسٹوں کو یعنی بوذاسف کے پیرووں کو ''شمنان'' کہتے تھے۔ اب یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ''سمنیہ'' اسی ''شمنان'' کی نسبت سے بنا لیا گیا تھا، جس سے مراد بدھ متی کے لوگ تھے، اور بھی بہت سے جدید اکتشافات بیرونی کی اس اطلاع سے حاصل ہوتے ہیں، جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے، میری غرض صرف یہ ہے کہ ''الصائبین'' بودھا کے ماننے والوں کا نام ہے۔ المسعودی کے سوا ابوریحان بیرونی جیسے ماہر ہندیات کی علمی شہادت بھی یہی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے مؤرخین کی یہ تاریخی تحقیق کہ ''الصابئہ'' جن کا قرآن میں یہود و نصاریٰ جیسی عالمگیر امتوں کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، یہ مہاتما بدھ کے ماننے والے بدھسٹوں کی تعبیر ہے جو دینی علوم کی خدمت کرنے والے علماء اور مفسرین تک شاید نہ پہنچ سکی۔ اور عراق کے آجام و بطائح میں جو صابی پائے جاتے تھے، انہی کے متعلق جو تھوڑے بہت معلومات ان تک مختلف ذرائع سے پہنچتے رہے، ان ہی پر ہمارے بزرگوں نے قناعت کر لی، لیکن دینی علماء کے سواء ہمارے یہاں تعلیم یافتہ مفکرین کا جو طبقہ تھا، وہ اسلامی مورخین کی مذکورۂ بالا تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ واقف تھا اور مسلمانوں مین فلسفہ کی جو شاخ اشراقی فلسفہ کے نام سے موسوم ہے، اسی فلسفہ کی کتاب ''شرح حکمۃ الاشراق'' میں بوذاسف یعنی بودھا کے متعلق لکھا ہے کہ

هو الذی شرع دین الصابئة. (شرح حکمۃ الاشراق۔ ص ۴۷۹)

بوذاسف وہی ہے جس نے صابئہ کے دین کو جاری کیا۔

اگرچہ اسی کے ساتھ ایک ایسا قول بھی اسی کتاب میں درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عراقی صابئیوں کو دیکھ کر بعض لوگ بوذاسف یعنی بودھا کے متعلق اس مغالطہ میں مبتلا ہو گئے کہ وہ ہندوستان کا نہیں بلکہ کالڈیا کا رہنے والا تھا اور کالڈیا والے جو کسدانیوں کے نام سے بھی موسوم تھے، ان کی ستارہ پرستی وغیرہ کے طریقہ کا موجد وہی تھا، اسی نے

تاریخ کے سنین متعین کیئے اور دنیا کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا۔[6]

غرض جس طرح عراقی صابیوں کی وجہ سے ہمارے مفسرین ''الصائبین'' سے بوذاسف کے رشتہ کا پتہ نہ چلا سکے، اسی طرح عراق کے ان ہی صابیوں کو دیکھ کر اور یہ معلوم کر کے کہ ''الصائبین'' بوذاسف کے پیرودوں کا نام ہے، ہمارے اربابِ فکر ونظر کا ایک گروہ اس مغالطہ کا شکار ہو گیا کہ بودھا ہندوستان میں نہیں بلکہ عراق ہی میں پیدا ہوا تھا، اور وہیں اپنے دین کو اس نے جاری کیا، اور اسی قسم کے دوسرے مسائل بھی عراقی صابیوں کے خاص حالات نے پیدا کر دیئے تھے، جن کی تفصیل کی اس مختصر مقالہ میں گنجائش نہیں ہے۔[7] ہاں، آخر میں قابل ذکر اور لائقِ توجہ یہ سوال رہ جاتا کہ الصائبین اگر مہاتما بدھ کے ماننے والوں کی تعبیر ہے تو یہ سوال ہو سکتا ہے کہ بودھا کے ماننے والوں کے ''الصائبین'' کے نام سے موسوم ہونے کی وجہ کیا تھا، اور عرب واطرافِ عرب میں اس نام سے وہ کیوں مشہور ہوئے اور یہ کہ اہلِ مکہ ''اسلامی دین'' کے قبول کرنے والوں، بلکہ خود داعی اسلام علیہ السلام پر یہودی عیسائی یا مجوسی ہو جانے کے صابی ہو جانے کا الزام کیوں لگاتے تھے۔

برسوں سے اس مسئلہ پر غور وفکر کرنے کے باوجود میں کسی اطمینان بخش نتیجے تک نہیں پہنچ سکا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اہلِ کتاب یعنی یہود ونصاری جن سے عرب اچھی طرح واقف تھے، اور جن کی کافی تعداد عرب میں پائی جاتی تھی، اسلام جو اس کا مدعی ہے کہ سارے مذاہب وادیان جو خدا کی طرف سے بنی آدم کو عطا ہوئے، قرآن ان خدائی قانونوں اور قدرتی آئین کی آخری شکل ہے، ان ساری آسمانی کتابوں کا آخری اڈیشن ہے، اسی لیے مطالبہ کیا گیا ہے کہ جس کسی کے پاس بھی دین یا مذہب جس شکل میں بھی اپنے باپ دادوں سے پہنچا ہو، اس کا فرض ہے کہ آسمانی کتاب کے اسی آخری اڈیشن سے اس کی تصحیح کر لے۔

ان مذاہب وادیان کے جن عناصر واجزاء پر قرآن نے توثیقی وتصدیقی مہر ثبت کر دی، سمجھنا چاہیے کہ بنی آدم کے قدرتی آئین کے وہی صحیح اجزاء ہیں، اُن کے سوا جو کچھ بھی جس دین میں ملے، اسے قلم زد کر دینا چاہیے۔

اس لحاظ سے سب سے زیادہ تصدیقی تعلق قرآن کا اہلِ کتاب یعنی یہود ونصاری ہی کے دین سے تھا، اس لیے سوال یہ ہوتا ہے کہ اپنے انکار وکفر کی توجیہ اور عذر تراشی کے لیے عربوں کے لیے یہ زیادہ آسان تھا کہ وہ قرآن تعلیمات پر یہ الزام لگا دیتے کہ وہ اہل کتاب یعنی یہود نصاری کے دین سے ماخوذ ہیں، جیسا کہ آج تک یہ جھوٹا الزام یورپ کے منکروں کی بڑی تعداد کی پناہ گاہ بنا ہوا ہے۔

لیکن اس کے بجائے اسلامی دین کے قبول کرنے والوں، بلکہ خود داعی اسلام علیہ السلام پر صابی ہو جانے کا الزام قریشِ مکہ کیوں لگاتے تھے، جیسا کہ یورپ کے بعض مستشرقین مثلاً ڈوزی نے لکھا ہے کہ

> ''ہندوستان سے بدھ مَتی کے مبلغوں کی ایک جماعت جہاں سیلون، برہما، چین گئی، اسی طرح ایران اور مشرق قریب میں بھی اس مذہب کے منادی تبلیغی جدوجہد اسلام سے پہلے مشغول تھے۔
>
> (ڈوزی کے مقالات کا عربی ترجمہ)

Marfat.com

اگر اس کو مان لیا جائے تو ظہورِ اسلام سے پہلے مشرق قریب جس میں عرب بھی شریک رہے، بدھ متی کے مبلغوں کی تبلیغی جدوجہد کا دعویٰ ڈوزی صاحب کی کوئی دماغی اختراع ہے، یا واقعی تاریخی وثائق کی روشنی میں وہ اس نتیجہ تک پہنچے ہیں۔

کچھ بھی ہو، اگر ہم ان کے اس تاریخی اکتشاف کو تسلیم بھی کر لیں اور جیسا کہ عام طور پر اس زمانہ میں کہا جاتا ہے کہ بودھ مذہب کے لٹریچر کی تلاش و تحقیق سے لوگ اس نتیجے سے پہنچے ہیں کہ مہاتما بدھ کا دعوی تھا کہ جس دھرم کو وہ پیش کر رہے ہیں۔

''یہ وسطی (درمیانی) راستہ ہے یعنی نہ تو عیش و عشرت میں رہنا چاہیے اور نہ فاقہ کشی شب بیداری اور دشوار عملیات سے روح کو ایذا پہنچانا چاہیے[8] بلکہ ان دونوں کے بیچ میں رہنا لازم ہے۔

(قرون وسطی میں ہندوستانی تہذیب)

اسی طرح پتہ چلایا گیا کہ بدھ کی تلقین یہ تھی کہ

''دنیا اور اس کی سب ہی چیزیں فانی اور غم انگیز ہیں۔ (قرون وسطی میں ہندوستانی تہذیب۔ ص۴)

پس ایسی زندگی کو جو فانی نہیں، بلکہ باقی ہو اور غم و اندوہ کی آلائشوں سے پاک ہو کر صاف سکھ ہی سکھ بن جائے، جو حاصل کرنا چاہتا ہے، اس کو ''نروان'' کے شرائط کی تکمیل کرنا چاہیے، کرنل اسکاٹ نے تھیا سوفیکل سوسائٹی میں جو لکچر ''بدھ دھرم'' پر ۱۸۷۷ء میں دیا تھا، اس میں اس کا اقرار کیا تھا کہ

''بودھ دھرم مردہ ہو چکا تھا۔'' (ص ۲۵)

مگر اسی مردہ دھرم کی دفن شدہ ہڈیوں کو الٹنے پلٹنے کے بعد ان پر ثابت ہوا تھا کہ منجملہ دوسری باتوں کے ''نروان'' کے لیے مہاتما بدھ کی طرف سے یہ مطالبہ پیش ہوا تھا کہ

''قتل مت کرو، چوری مت کرو، ممنوعہ لذات سے پرہیز کرو، جھوٹ مت بولو، منشی یا مست کرنے والے عرق یا اشیاء کا استعمال مت کرو۔[9] (ص ۳۸)

اگر فلسفیانہ موشگافیوں اور منطقیانہ احتمال آفرینیوں کے انبار کے نیچے سے ڈھونڈنے والوں کو بدھ دھرم میں درحقیقت یہ چیزیں ملی ہیں، تو اسلام کی تصدیقی و توثیقی فہرست میں بدھ مذہب کے بھی بعض اجزاء شریک ہو جاتے ہیں اور دونوں میں مشابہت و مناسبت کا مسئلہ چنداں بعید از قیاس باقی نہیں رہتا۔

بلکہ ہمارے بعض علماء کے اس دعویٰ کا کہ ''تناسخ'' کا عقیدہ جن مختلف مذاہب میں پایا جاتا ہے، ان میں ایک بوذاسف الہندی کا دین بھی ہے، واقعی مطلب یہ تھا کہ

Marfat.com

عرضهم هو اثبات المعاد الجسمانی فی النشاۃ الأخرۃ علی وجاهه مفصل
(تعلیقات شرح حکمۃ الاشراق۔ص ۴۷۹)

آخرت کی دوسری زندگی میں جسمانی طور پر واپسی ہوگی، اسی عقیدے کی تفصیل کا نام تناسخ ہے۔

اس سے ان لوگوں کا مطلب یہ ہے کہ مذاہب وادیان کی باتوں میں فلسفہ کا رنگ بھر کر روحانی حشر ونشر کا جو عقیدہ پھیلا دیا گیا تھا اور جس کا کوئی صحیح مطلب ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتا، جو جسم اور بدن کے بغیر سکھ یا دکھ کے احساس کا تخیل بھی نہیں کر سکتے تھے، اسی لیے ''روحانی معاد'' کا مجہول نظریہ عموماً انکار آخرت کے ہم معنی بن جاتا تھا، اس خیال کی تردید اور اسی مغالطہ کے ازالہ کے لیے یہ سمجھایا گیا تھا کہ آئندہ زندگی میں جسمانی قالب ہی کے ساتھ لوگ اٹھیں گے، نیک کرداروں کو حسین وجمیل جسمانی قالب عطا ہوگا اور بدکرداروں کو اُن کے بُرے اعمال کے مطابق بری صورتوں اور مسخ شدہ قالب میں زندہ کیا جائے گا۔

بہرحال ''تناسخ'' کے جس عقیدہ کو مہاتما بدھ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، اس کا مطلب یہی ہے کہ دوسری زندگی بھی جسمانی قالب میں نمایاں ہوگی اور ''پتر جنم'' یا آواگون کا دھرم چکر بدھ مذہب کے فلسفی مزاج طبائع کی اپج ہے، جس کا اضافہ بعد کو اس مذہب کے عقائد میں ہوا۔ واقعہ کی نوعیت اگر یہی ہے تو آخرت کے اس عقیدے اور اسلام کے اخروی زندگی کے عقیدہ میں فرق ہی کیا رہ جاتا ہے اور جیسا کہ حدیثوں میں آیا ہے کہ جنت میں لوگ جرد مرد یعنی صاف ستھرے چہروں کے ساتھ داخل ہوں گے اور جہنم میں ایک ابوجہل ہی ایسے طویل وعریض بدن کے ساتھ داخل ہو گا کہ اس کا ایک ایک دانت احد پہاڑ کے برابر ہوگا، اُن کا مطلب یہی تو ہے کہ ایک اچھے قالب میں اچھے لوگ اور بُرے قالب میں بُرے لوگ آئندہ زندگی میں اٹھیں گے۔

کچھ بھی ہو فلسفیانہ نکتہ نوازیوں اور خرافاتی توجیہوں، تحریفی تاویلوں کے نیچے دفن شدہ بودھ دھرم میں کریدنے والوں کو آج جو کچھ بھی مل رہا ہے، مگر ہم جب یہ جانتے ہیں کہ بدھ کے مرنے کے چند صدیوں بعد ہی بودھ کی صحیح تعلیم مختلف فرقوں کی من مانی تشریحات کا شکار ہو کر نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی، اسی مضمون میں گذر چکا ہے کہ بدھ متی میں مورتی پوجا کا رواج ہو گیا تھا اور کیسا رواج؟ کہ ہندوستان کا چپہ چپہ بدھ مورتیوں سے گویا پٹا ہوا تھا، اور تو اور خود غریب بدھ ہی کی مورتی بنا بنا کر لوگ پوجنے لگے تھے، کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ فارسی کے لفظ بُت کی اصل بدھ ہی تھے۔ دال۔ت سے بدل گئی۔ چینی سیاح اتسنگ نے لکھا ہے کہ جب وہ ہندوستان آیا تھا، اس زمانے تک

''بودھ دھرم میں اٹھارہ فرقے ہو چکے تھے۔'' (قرون وسطی۔ص ۴)

ان میں دو فرقوں میں ''ہین یان'' ''مہایان'' کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ مشرق قریب میں بدھ مت کی اشاعت کا ڈوزی کا دعویٰ صحیح تاریخی شہادتوں پر مبنی ہے تو ہو سکتا ہے کہ بدھ مت مذہب کے داعی بت متی کے نام سے جس دین کو پیش کر رہے تھے، وہ مہاتما بدھ کی تعلیمات کے صحیح اجزاء کا ترجمان رہا ہو اور اسی کو دیکھ کر مکہ والوں نے مسلمانوں کو صابی کہنا شروع کیا تھا، مگر بظاہر جو واقعات ہم

Marfat.com

تک پہنچے ہیں، ان سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ ہمارے یہاں کی روایتوں میں صرف ایک روایت جو مشہور تابعی قتادہ کی طرف منسوب کی گئی ہے، اور جس کی رو سے ''صائبین'' کی دوسری خصوصیتوں میں ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ

یصلون الی الشمس کل یوم خمس صلوٰت (رازی۔ ج۲ص ۵۱۹)

وہ آفتاب کی طرف رُخ کرکے دن بھر میں پانچ دفعہ نمازیں ادا کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں بس یہی ایک روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں جیسے پانچ وقتوں میں نمازیں پڑھی جاتی ہیں، اسی طرح صابیوں کے یہاں بھی پانچ ہی اوقات عبادت کے تھے، لیکن اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ صابی آفتاب کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھتے تھے، ایسی صورت میں محض عبادت کے پانچ اوقات کا اشتراک اہلِ مکہ کے مسلمانوں کو صابی کہنے کے لیے کافی نہیں ہوسکتا، سچ تو ہے کہ بدھ بیچارے کی طرف اس زمانہ میں یہ عقیدہ تک منسوب کیا جارہا ہے کہ وہ سرے سے خدا ہی کا قائل نہ تھا، یا قائل بھی تھا تو اس کے نزدیک خدا اور انسانی روح بلکہ کیڑوں مکوڑوں کی جان میں کسی قسم کا فرق نہ تھا۔ ونسنٹ صاحب اپنی ''تاریخ قدیم ہند'' میں لکھتے ہیں کہ بدھ کا عقیدہ تھا کہ

''وہ ہستی جو اس وقت آسمان میں دیوتا کی حیثیت رکھتی ہے، ممکن ہے مرور ایام کے دوران میں بالآخر ایک کیڑے مکوڑے کی شکل میں دنیا میں نمودار ہو اور بجنسہٖ اسی طرح ایک کیڑے کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ بتدریج دیوتا کا درجہ حاصل کرلے۔'' (ص ۲۴۷)

جہاں دین کو فلسفہ کی ان بھول بھلیوں میں داخل کرکے معاد جسمانی یا تناسخ کے چکر میں اتنی وسعت پیدا کر دی گئی ہے کہ آسمانوں والا دیوتا یا خدا بھی اس چکر سے (العیاذ باللہ) آزاد نہیں ہے، تو ایسا دین دین ہی کب باقی رہتا ہے اور اسلام جیسے سیدھے سادے دین کے ساتھ اس کی مشابہت و مناسبت کی صورت ہی کیا رہ جاتی ہے، اسی لیے میں نے عرض کیا تھا کہ مسلمانوں کو مکہ والوں کو یہودی یا عیسائی کہنے کی بجائے صابی کہنے کی کوئی صحیح توجیہات تک میری سمجھ میں نہیں آئی ہے۔

اسی طرح اس کا جواب بھی مشکل ہے کہ عرب اور اس کے علاقوں میں بدھ مذہب کے پیروؤں کو لوگ ''صائبین'' یا ''صائبہ'' کیوں کہنے لگے تھے؟ ممکن ہے اس علاقے میں بدھ متی جن لوگوں کے ذریعہ پہنچا ہو، ان میں سے کسی شخص یا فرقہ کے نام کی طرف منسوب ہوکر یہ لفظ بنا ہو،

لیکن بقول ونسنٹ صاحب جب حال یہ ہے کہ

''بدقسمتی سے بدھ مذہب کو ان تبلیغی مشنوں کا حال محفوظ نہیں جو ایشیا، افریقہ اور یورپ کی یونانی سلطنتوں میں بھیجے گئے اور ان مبلغوں کے نام ہی ہم کو معلوم ہیں۔ (تاریخ قدیم ہند۔ ص ۲۶۷)

تو اس احتمال کو بھی پیدا کرکے ہم کسی صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ یہ صحیح ہے جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جاچکا

ہے کہ خود ہم مسلمانوں کو مختلف ملکوں علاقوں میں مختلف ناموں سے لوگ موسوم کرتے رہے ہیں، یورپ والے ہمیں سارا سین یا مور کہتے ہیں، ہندوستان پہنچ کر ہم ترک کے نام سے یاد کئے گئے، چین میں سنتے ہیں کہ مسلمانوں کو 'ہوئی ہوئی' کہتے ہیں، ممکن ہے کہ کچھ اسی قسم کی صورت بدھ مذہب کے ماننے والوں کے ساتھ بھی پیش آئی ہو۔ ابوریحان بیرونی کا بیان آپ پڑھ چکے کہ خراسان میں لوگ ان کو شمنان کہتے تھے، مگر ان الفاظ کی تو کچھ نہ کچھ توجیہ[10] ہم کر سکتے ہیں، مگر ''صابی صائبین'' یا ''صائبہ'' کے نام سے بدھ کے ماننے والوں کو موسوم کرنے کی ایسی توجیہ جو دلنشین ہو، اب تک سمجھ میں نہیں آئی۔ یوں کہنے کے لیے تو مختلف احتمالات پیش کیے جا سکتے ہیں مثلاً خود مہاتما بدھ کا اصلی نام کہا جاتا ہے کہ سدھارتھ تھا، بدھ مذہب کے فقیروں کو بھی سادھو کہتے تھے، بدھ متی والوں میں بعد میں جن مورتیوں کی پوجا کا رواج ہوا، ان کو بھی ''بودھی ستوون'' کے نام سے موسوم کرتے تھے، سادھی بدھ مذہب والوں کے مذہبی استغراق کی تعبیر تھی، سو بھدرا مہاتما بدھ کے چیلوں میں ایک مشہور شخصیت کا نام تھا، ان سارے الفاظ کے شروع میں س کا حرف پایا جاتا ہے، جو بآسانی عربی کے ص کا تلفظ اختیار کر سکتا ہے۔

اسی طرح ہندی کے ''دھ'' کا تلفظ جو لوگ ادا نہیں کر سکتے، ان کی زبان میں مختلف شکلیں اختیار کر سکتا ہے، اور ایک زبان کے الفاظ کے دوسری زبان میں منتقل ہونے میں اس قسم کی تبدیلی کوئی عجیب نہیں ہے اور برابر ہوتی رہتی ہے۔

آخر بودھا کا لفظ جب ''بوذاسف'' بن سکتا ہے تو کیوں نہ سمجھا جائے کہ صابی کا لفظ بھی کچھ اسی قسم کے الٹ پھیر رد و بدل کے قصوں سے متاثر ہوا۔ طبقات الاطباء میں عراقی صابیوں کی اصل بتاتے ہوئے ابن ابی اصیبعہ نے جو کچھ لکھا اس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے یعنی جن کو لوگ صاب کہتے تھے، وہ حضرت ادریسؑ کے صاحبزادے طاط کی نسل میں ہیں۔ (ج ۲ ص ۲۰۵۔ طبقات الاطباء)

اگر یہ مان لیا جائے کہ طاط کو ادریس علیہ السلام کا صاحبزادہ قرار دینا کسی غلط فہمی یا اسمی اشتباہ پر مبنی ہے[11]، تو دھیان کچھ ادھر جاتا ہے کہ مشرق قریب یا عرب اور اس کے نواح میں شاید صاب صابی مذہب کے داعی کی تعبیر تھی، یعنی پہلا آدمی اس علاقہ میں جو پہنچا ممکن ہے اس کا اصلی نام طاط یا ٹاٹ ہو، اور صاب اس کا دینی لقب[12] ہو اور اسی کی طرف منسوب ہو کر اس کے ماننے والے ''صائبین'' کے نام سے موسوم ہوئے ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حواشی

۱۔ دوسرے علما سے بھی خاکسار نے سنا ہے اور مرشد تھانوی حکیم الامت رحمتہ اللہ علیہ کے ملفوظات میں بھی ہے کہ عرب کے لوگ کہتے ہیں ''قرآن عرب میں نازل ہوا، مصر میں پڑھا گیا، ترکی میں لکھا گیا اور ہندوستان میں سمجھا گیا۔'' یہ واقعہ بھی ہے کہ مصریوں سے بہتر قاری کہیں نہیں پائے جاتے، خط نسخ اور قرآنی کتابت میں ترکوں کا کام بے نظیر ہے، باقی ہندوستان میں سمجھا گیا، ہندوستانی ہو کر اس دعویٰ کی تشریح کیسے کروں۔

۲۔ شاہ ولی اللہ نے اپنی کتاب ''ازالۃ الخفاء'' میں لکھا ہے کہ ایران و روم کے امراء زمین کے مالکوں پر مسلط تھے، حالانکہ زمین کے نہ یہ امراء مالک تھے، نہ اس کو آباد کرتے تھے اور نہ اپنے باپ دادوں سے وراثت میں اُن کو زمین ملی تھی۔ مسلمانوں نے درحقیقت ان پر زبردستی قبضہ جمانے والے جاگیرداروں سے جنگ کی اور اُن کو مار بھگایا اور واقعی جو زمین کے مالک تھے، اور اس کو آباد

Marfat.com

کرتے تھے، اُن کے حوالہ کر کے خراج کے معاملہ میں صلح کر لی گئی تھی۔ (تفصیل کے لیے دیکھو ازالۃ الخلفاء۔ ج ۲ ص ۱۲۹)

۳۔ ایک عراقی فاضل نے ''الصابئہ'' کے نام سے ایک مقالہ لکھا تھا جو کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ اپنی ذاتی معلومات کی روشنی میں عراقی صابیوں پر انہوں نے بحث کی ہے، افسوس ہے کہ اس وقت یہ کتاب میرے پاس موجود نہیں ہے، اسی کتاب میں یاد آتا ہے کہ ترکوں کے زمانہ میں عراقی صابیوں کی تعداد چند لاکھ سے زیادہ نہیں بتائی گئی تھی، بہرحال ہزار بارہ سو سال بعد عراق کے ایک غیر مشہور فرقہ کی شکل میں ان کا رہ جانا یہ خود دلیل ہے کہ اتنے طویل عرصہ میں بھی اُن کو بڑھنے پھلنے پھولنے کا موقع نہ مل سکا، اس مقالہ میں بھی قرآن کے الصائبین ان ہی عراقی صابیوں کو قرار دیا گیا ہے۔

۴۔ اس وقت المسعودی کا جو مطبوعہ نسخہ میرے پیش نظر ہے وہ فاحش اغلاط سے معمور ہے، عموماً قرینہ اور قیاس ہی سے صحیح الفاظ سمجھ میں آتے ہیں، اس موقع پر بھی عبارت کچھ اس طرح چھپ گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے مہاتما بدھ جس نے توحید کی تعلیم دی تھی، خود اسی نے مورتی پوجا کے طریقہ کو بھی جاری کیا، علاوہ تناقض کے واقعہ کی یہ صحیح تعبیر بھی نہیں ہے مطبوعہ نسخہ میں ہے کہ جدو بوذاسف عندالناس عبادۃ الاصنام ، بظاہر جدو کی جگہ بعد کا لفظ چاہیے تو یہی کہ اصل کتاب میں ہو، یعنی بوذاسف کے بعد بدھ متی کے ماننے والوں کو عبادۃ الاصنام (مورتی پوجا) کی طرف مائل کیا گیا۔

''معارف: ''مروج الذہب'' کے پیرس کے مطبوعہ نسخہ میں بھی جس کی تصحیح پروفیسر بینارڈ اور پروفیسر کورنل نے کی ہے، بعینہٖ یہی عبارت ہے، اس لیے اس کو طباعت کی غلطی پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ مسعودی کا خیال یہی رہا ہوگا اور اس بارہ میں اس کو یہی معلومات پہنچے ہوں گے۔

۵۔ مولانا عنایت رسول چریاکوٹی مرحوم کا حال ان کی کتاب (بشریٰ نامی) کے شروع میں جو درج ہے۔ اس میں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ فارسی کا قدیم رسم خط بائیں طرف سے لکھا جاتا ہے، جس زبان میں ژند اور اوستا (زرتشتی دین کی کتابیں) ص ۲۶ پر بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ سنسکرت کے رسم خط کی جگہ مہاتما بدھ نے غالباً سہولت کی وجہ سے انہی قدیم ایرانی حروف کے رسم خط کو اختیار کر لیا تھا، وہی پالی کے نام سے مشہور ہوا، ہندوستان میں ''پالی'' جاننے والے علماء پیدا ہو چکے ہیں، وہی بتا سکتے ہیں کہ اصل واقعہ کیا ہے،

۶۔ دیکھئے شرح حکمۃ الاشراق۔ ص ۴۷۹ مطبوعہ ایران۔ دلچسپ بات اسی سلسلہ کی یہ ہے کہ نوح علیہ السلام اور اُن کے مشہور طوفان سے پہلے تسلیم کر لیا گیا تھا کہ بودھا قدیم بابل میں پیدا ہو چکا تھا، اور یہ کہ اپنے نجومی حساب سے اس نے طوفان کی پیشین گوئی بھی کی تھی۔ اپنے ماننے والوں کو پہلے ہی سے ہشیار کر دیا تھا۔

۷۔ مثلاً معلوم ہوتا ہے کہ ان عراقی صابیوں یا شام کے صحرائی علاقوں حران وغیرہ میں جو صابی پائے جاتے تھے ان میں بعضوں نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا، مگر باوجود اس کے یہ صابی بھی کہلاتے تھے، امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہم کی طرف یہ فتویٰ منسوب کیا گیا ہے کہ اہلِ کتاب کا دین جن صائبیوں نے اختیار کر لیا ہے، اُن کے ساتھ اہل کتاب کا برتاؤ کرنا چاہیے، یعنی اُن کی عورتوں سے ازدواجی رشتہ بھی مسلمان قائم کر سکتے ہیں، اور ان کا ذبیحہ بھی کھا سکتے ہیں۔ (دیکھو تفسیر جصاص اور فقہ کی دوسری کتابیں)

۸۔ واقعہ یہ ہے جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں کہ ساکیہ منی مہاتما بدھ کے زمانہ میں اور اس سے پہلے ہمارے ملک ہندوستان میں مقاصد و اغراض کو حاصل کرنے کے لیے ''وردان'' کا طریقہ عام طور پر مقبول تھا، یعنی دیوتا اور معبود کے سامنے اپنے آپ کو دکھ پہنچایا جائے، جیسے وہ فقیر جو کوڑے مار کر اور اپنے بدن سے خون نکال کر بھیک دینے پر لوگوں کو مجبور کرتے ہیں، اس راہ میں لوگ اپنے بدن کا گوشت تک کاٹ کر ہون کرتے تھے۔ راون کا قصہ مشہور ہے کہ دس سروں میں سے اپنے نو سر کاٹ کاٹ کر آگ میں جھونکتا رہا، جس کے بعد ''وردان'' اس کو ملا وردان کی قوت سے بالآخر وہ فرعون بن گیا۔ عام طور پر ہندی قصص ''وردان'' کے ذکر سے معمور ہیں۔ آج کل عوام اسی کو ''بردان'' کہتے ہیں، اسی کا نتیجہ تھا کہ لوگ پہاڑوں سے اپنے آپ کو گراتے تھے، آہنی سیخوں پر گر کر سارے بدن کو لہولہان کرتے تھے، ہندوستان کے جنگل ''وردان'' کے طالبوں سے کسی زمانہ میں بھرے رہتے تھے، جس دکھ

اور مصیبت کی زندگی وہ گذارتے تھے، آج ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے، کہتے ہیں کہ ساکیہ منی مہاتما بدھ بھی کچھ دن تک اسی ''وردان'' کے چکر میں گھومتے پھرے اور بالآخران پر بجائے ''وردان'' کے ''نروان'' کا اصول واضح ہوا، جس میں نجات کے لیے خواہ مخواہ کی غیر فطری مصیبتوں کی برداشت کرنے کا انکار کیا گیا اور مذہبی مطالبات پاکیزہ اخلاق زندگی کو نروان یعنی نجات کے لیے کافی قرار دیا گیا۔

۹۔ کرنل اسکاٹ نے یہ بھی لکھا ہے کہ بدھ متی کے تمام فرقوں کا ان باتوں پر اتفاق تھا اور برہما چین، جاپان اور چٹاگانگ میں کرنل صاحب کے زمانہ میں بدھ متی جو مستند علماء تھے، ان کے دستخط بھی ان اتفاقی امور پر حاصل کیے گئے تھے (دیکھوان کا لکچر۔ص ۳۸،۳۹)

۱۰۔ یورپ والے کہتے ہیں کہ ساراسین کی اصل صحرانشین یا سارقین (چور) ہے لیکن درحقیقت یہ لفظ ساراقین تھا، عرب والے اسماعیل ابن ابراہیم علیہ السلام کی اولاد شمار ہوتے تھے، یہود کا دعویٰ تھا کہ اسماعیل علیہ السلام کی والدہ ہاجرہ ابراہیم علیہ السلام کی دوسری بیوی سارہ کی لونڈی تھیں، اس لیے سارے عرب کو وہ ساراقین (سارہ کے غلام) کہتے تھے حالانکہ حضرت ہاجرہ شاہ مصر کی صاحب زادی تھیں۔ مسلمانوں کو ہندوستان میں ترک اس وجہ سے کہنے لگے کہ زیادہ تر اسلام اس ملک میں ترکی فاتحین کے ساتھ ہی پہنچا تھا۔ مور کا لفظ ممکن ہے مراکش وغیرہ کی طرف منسوب ہو۔ ''ہوئی ہوئی'' کی توجیہ بھی کسی نے کی تھی، جواب یاد نہ رہی۔ باقی بدھسٹوں کو شمنان کہنے کی بظاہر وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ سومنات کی طرف خراسان والے ان کو منسوب کرتے تھے۔

۱۱۔ اسی سے اندازہ کیجئے کہ ملتان جب تک مسلمان پہنچے تو وہاں کی سب سے بڑی مورتی کے متعلق ان میں یہ خیال پھیل گیا کہ ان صنمہ ھُو ایوب النبی علیہ السلام (ص ۱۲۰۹۔ کامل ابن ایثر) یعنی یہ مورتی ایوب علیہ السلام پیغمبر کی ہے، بظاہر یہ خیال گذرتا ہے کہ ملتان پر ہلاد کا مشہور مندر تھا اور جو افسانہ اس سلسلہ میں اب تک بیان کیا جاتا ہے، اس میں پر ہلاد کے باپ کا نام کش یپو بتایا گیا ہے، کش یپو ہی کا لفظ ممکن ہے، عربوں کے کان میں یا ان کی زبان پر ''ایوب'' بن گیا ہو، ورنہ ملتان سے حضرت ایوب علیہ السلام کا بھلا کیا تعلق۔ تاریخ میں اس قسم کے عجائبات کی کمی نہیں ہے۔

۱۲۔ راہ صواب پر چلنے والا یا راہ صواب بتانے والا، اس مفہوم کی گنجائش صاب کے لقب میں پیدا ہوتی ہے، ممکن ہے کہ واقعہ کی کچھ صورت یہی ہو۔

(معارف، فروری ۱۹۵۳ء، ص ۸۵۔۱۰۱' مارچ ۱۹۵۳ء)

☆......☆......☆

Marfat.com

حدیث

تدوینِ حدیث

[مولانا نے یہ مقالہ نائب امیر جامعہ عثمانیہ کی فرمائش پر بطور توسیعی لیکچر کے پڑھا تھا، جو مجموعۂ تحقیقاتِ علمیہ جامعۂ عثمانیہ'' میں چھپ چکا ہے۔

احادیث نبوی صلعم کی صحت و استناد پر آج کل جو شکوک و شبہات کئے جاتے ہیں، اس کے جواب میں ''معارف'' میں کئی مضمون نکل چکے ہیں، مولانا کا یہ مضمون تحقیق و افادہ کے اعتبار سے اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔]

الحمد للّٰہ و کفٰی والصلوٰۃ والسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفٰی

علم حدیث پر بحث کرنے کے لیے ہمیں اپنے سامنے ان چند سوالات کو رکھ لینا چاہیے:

۱۔ حدیث کی حقیقت کیا ہے؟

۲۔ اس علم کی تدوین کب، کس طریقہ سے کس زمانہ میں شروع ہوئی اور ان طریقوں کا اس علم کے وثوق و اعتماد پر کیا اثر مرتب ہوا یا ہو سکتا ہے؟

۳۔ ابتدا سے اس وقت تک اس فن کی ممتاز خدمتیں جن بزرگوں نے انجام دیں، خود ان کی اور ان کے کارناموں کی تفصیل۔

۴۔ اس فن کے متعلق کیا جدید تکمیلی کوششوں کی ضرورت باقی ہے؟

۵۔ حدیث کے بعد فنِ حدیث کے دوسرے متعلقات یعنی فن اسماء الرجال اور اصول حدیث کی حقیقت، ان کی تاریخ، موجود حیثیت ان میں آئندہ ترقیوں کے امکانات۔

حدیث کی حقیقت

سب سے پہلے میں پہلے سوال کو لیتا ہوں، یعنی حدیث کی حقیقت کیا ہے؟ بات یہ ہے کہ عموماً دنیا میں دو طرح کی قومیں پائی جاتی ہیں، بعض بلکہ شاید زیادہ تر قومیں ایسی ہیں، جنہوں نے اپنے حال کو ماضی سے وابستہ رکھنے کی

Marfat.com

کوشش نہیں کی، اگرچہ واقعہ تو یہی ہے کہ کسی قوم کا کوئی حال ماضی سے الگ ہو کر تعمیر پذیر نہیں ہوسکتا، لیکن باوجود اس واقعہ کے جیسے جیسے وہ آئندہ کی طرف بڑھتی رہیں، اپنے ماضی کو بھلاتی چلی آئیں۔ ان کے پاس اپنے موجودہ حالات پر غور وفکر کرنے کے لیے گذشتہ حالات و واقعات، تجربات و مشاہدات کا کوئی سرمایہ نہیں ہے، گویا جس طرح جنگل کی زندگی گذاری جاتی ہے، یہ بھی گذارتے ہیں۔ آخر ریچھوں اور بندروں کو کیا معلوم کہ ان کے جداعلیٰ کون تھے، کن کن جنگلوں اور وادیوں پہاڑوں سے چھلانگیں مارتے ہوئے ان کے آباؤ اجداد موجودہ مقام تک پہنچے، کن کن حالات سے ان کو دوچار ہونا پڑا۔

لیکن ان کے مقابلہ میں انسانوں ہی کا ایک طبقہ ان قوموں کا بھی ہے جنہوں نے حتی الوسع اس کی کوشش کی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو حال کی تعمیر میں ماضی کے تجربات و واقعات سے نفع اٹھایا جائے اور اس کے لیے ان کو ضرورت محسوس ہوئی کہ گذرے ہوئے واقعات کو کسی نہ کسی طرح محفوظ کرلیا جائے۔ انسانیت کے اس گروہ کی اسی کوشش کا نام ''تاریخ'' ہے، ابتداء میں تاریخ کی حفاظت و بقا کا شوق قوموں میں کم رہا ہے، لیکن اب تو یہ ایک ایسی ناگزیر ضرورت بن گئی ہے کہ اپنی توانائیوں کا ایک بڑا حصہ ہر قوم اس پر خرچ کر رہی ہے جس سے ہم اور آپ سب واقف ہیں۔ جنگل کی زندگی بسر کرنے والے بھی اب اپنے اجداد و اسلاف کے کارناموں کی جستجو گڑی ہوئی ہڈیوں اور پرانے مقبروں اور مرگھٹوں میں کر رہے ہیں، کونہ کونہ سے قدیم سکے برآمد کیے جا رہے ہیں، کہنہ قبروں کی کتابوں کے حروف کے پڑھنے کی کوشش کی جارہی ہے، پرانے کھنڈروں کی ایک ایک ٹھیکری چنی جارہی ہے، ان ہی پر واقعی کہیے یا خیالی بلند و بالا عمارتیں تعمیر ہو رہی ہیں، گویا اس علم کی ناگزیر ضرورت کو دنیا کی اکثر قوموں نے اب تسلیم کرلیا ہے اور بجز چند ارتیابی الطبع شکی مزاج خشک دماغ فلسفیوں کے عام دنیا کا شدید رجحان بھی ان چیزوں کے جاننے کی طرف ہے۔

تاریخ اور فنِ حدیث

دنیا کی اسی تاریخ کے ایک عظیم الشان حیرت انگیز انقلابی حصہ کا نام سچ پوچھیے تو حدیث ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جن انقلابات و حوادث سے گذر کر نسل انسانی موجودہ حالت تک پہنچی ہے، ان میں ایک ایسا واقعہ جس نے کسی خاص شعبۂ حیات ہی میں نہیں بلکہ مذہبی، سیاسی، معاشرتی، اخلاقی تمام شعبوں میں انسانیت کا رخ پلٹ دیا، جس سے زمین کا کوئی خاص حصہ نہیں، بلکہ بلا مبالغہ مشرق و مغرب دونوں متاثر ہوئے، ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے، ماضی کے اسی مدہش حیرت انگیز واقعہ کی تاریخ یا تفصیلی بیان کا نام حدیث ہے، اگرچہ عام طور پر مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ سے حدیث کا تعلق قرار دیا جاتا ہے، لیکن جہاں تک واقعات و حالات کا تعلق ہے میں ''حدیث'' کو ''انسانیت'' کی تاریخ کا ایک حصہ اور ایسا حصہ قرار دیتا ہوں جس کی صرف یہی خصوصیت نہیں ہے کہ ایک بے نظیر عدیم المثال عالمگیر انقلابی عہد سے اس کا تعلق ہے، بلکہ سچ پوچھیے تو آج جس کسی کے پاس یا جس قوم و امت کے ہاتھ میں ماضی بلکہ حال کی تاریخ کا بھی جو حصہ ہے، وہ وثوق واعتماد میں تاریخ کے اس ''محفوظ حصہ'' یعنی حدیث کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

Marfat.com

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ میں ان آزردہ فطرت شکیوں میں نہیں ہوں، جو تاریخ کو جھوٹ کا جنگل قرار دے کر ماضی کا انکار کرتے ہیں اور جو کچھ محسوس ہو رہا ہے، یہ نہیں محسوس ہو رہا ہے، اس سوفسطائی نظریہ پر زور دے کر حال کے وجود کو بھی شک کے دانتوں سے چبا کر ختم کرنا چاہتے ہیں، بلکہ تاریخ کے مقررہ معیار پر ماضی کے جن واقعات کی اب تصحیح ہو چکی ہے، ان کی قدر کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ آئندہ کی راہ درست کرنے کے لیے ہمیں ہمیشہ ماضی کی روشنی سے نفع اُٹھانا چاہیے۔

فاقصص القصص لعلهم يتفكرون

لوگوں سے پچھلے قصے بیان کیا کرو تا کہ وہ سوچیں۔ (قرآن مجید)

لیکن اگر یہ صحیح ہے جیسا کہ ایک بڑے مشہور مسلم الثبوت مؤرخ کا بیان ہے "کسی زمانہ کے حالات...... جب قلمبند کیے جاتے ہیں تو یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ ہر قسم کی بازاری افواہیں قلمبند کر لی جاتی ہیں جن کے راویوں کا نام و نشان تک معلوم نہیں ہوتا، ان افواہوں سے وہ واقعات انتخاب کر لئے جاتے ہیں، جو قرائن و قیاسات کے مطابق ہوتے ہیں، تھوڑے زمانہ کے بعد (یعنی کتابی شکل اختیار کرنے کے بعد) یہی ایک دلچسپ تاریخی کتاب بن جاتی ہے، یورپ کی اکثر تصنیفیں اسی اصول پر لکھی گئی ہیں اور اس وقت ہمارے پاس ماضی کی تاریخوں کا جو ذخیرہ ہے خواہ وہ روم ہو یا یونان، چین ہو یا ایران، ان قدیم اقوام کی تاریخ جن ذرائع سے مرتب ہوئی ہے اگر ان کے اساسی سرچشموں کی جانچ کی جائے گی تو جو کچھ اس فاضل مؤرخ نے بیان کیا ہے بہت کچھ اس کی توثیق کرنی پڑے گی، مشکل ہی سے انسانوں کے پاس اس وقت کوئی ایسی تاریخی یادداشت مل سکتی ہے جسے واقعہ کے عینی شاہدوں نے خود مرتب کیا ہو، یا ان کے براہ راست بیانوں کو خواہ انہی سے سن کر کتابوں میں درج کیا گیا ہو، اتفاقاً اگر کوئی ایسی چیز مل بھی جائے تو اس کا پتہ چلانا قطعاً دشوار بلکہ شاید ناممکن ہے کہ ضبط و اتقان سیرت و کیرکٹر کے لحاظ سے ان کا کیا درجہ تھا۔ معتبر سے معتبر ترین کسی تاریخی ذخیرہ کے وثوق کے متعلق اگر کوئی بات پیش کی جا سکتی ہے، تو یہی ہے کہ جس زمانہ میں واقعہ گذرا ہے مورخ خود ہی اس زمانہ میں موجود تھا۔ اتفاق سے کسی واقعہ کے متعلق اگر ایسی شہادت میسر آ جاتی ہے تو تاریخ کا یہ حصہ زریں شاہکاروں میں شریک کر دیا جاتا ہے، لیکن خود اس معاصرت کا یہ حال ہے کہ قدیم ماضی کے تاریک زمانہ کو تو جانے دیجئے، آج جب کہ جدید صناعات و ایجادات نے زمین کی طنابیں کھینچ کر ایک ملک کو دوسرے ملک سے ملا دیا ہے، تعلیم عام ہو چکی ہے، کم از کم یورپ کے مکتبوں اور اسکولوں میں روئے زمین کے اطلسوں کا مطالعہ ہر ایک کو کرا دیا جاتا ہے لیکن ایک واقعہ نہیں آئے دن ایسی ایسی جہالتوں اور غلط فہمیوں کے شکار غریب جاہل مشرقی ہی نہیں بلکہ فرزانہ و دانا فرنگ کے ارباب خبر و علم ہوتے رہتے ہیں کہ بعض دفعہ آدمی کو حیرت ہو جاتی ہے اور تاریخ جھوٹ کا جنگل ہے، دماغ سوچنے لگتا ہے کہ کیا اس دعوی میں کچھ واقعہ کا عنصر بھی شریک ہے؟ بہت پرانے زمانہ کی بات نہیں ہے کہ ۱۹۰۵ء میں کانگڑہ (پنجاب) کا مشہور زلزلہ ہندوستان میں آیا تھا۔ ایک نہیں، بلکہ متعدد انگریزی اخباروں میں اس زلزلہ کے متعلق یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ "کانگڑہ جو بمبئی کے قریب ایک جزیرہ ہے، وہاں ایک سخت زلزلہ آیا" اور بیچارے اخبار والے تو شہر

Marfat.com

خبروں کی جماعت ہے' عام طور پر گپ نویسی میں یہ بدنام ہے لیکن مشہور رفرنس بک ہنرل کی اینویل جو مشہور کتاب ہے اور ہر قسم کے حوالجات کے لیے ایک مستند کتاب سمجھی جاتی ہے' اس میں اسی زلزلے کے متعلق یہ عبارت اس وقت تک موجود ہے:

''ایک سخت زلزلے نے ایک وسیع ضلع میں جو آگرہ اور شملہ کے درمیان واقع ہے، عام تباہی اور سخت نقصان برپا کیا۔''

نقصان کی تفصیل بتاتے ہوئے صرف اسی مؤرخ نے نہیں بلکہ دوسروں نے بھی یہ ارقام فرمایا ہے۔

اس سے کئی سو آدمی ہلاک ہوئے

حالانکہ پنجاب گورنمنٹ کی رپورٹ کے مطابق اس زلزلہ میں بیس ہزار سے کم آدمی ہلاک نہیں ہوئے تھے۔ معاصر مؤرخین کی کتابوں میں اگر اس قسم کی طرفگیوں اور بوالعجبیوں کو تلاش کیا جائے تو ایک اچھی خاصی کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ سیاحوں کی یادداشتوں کو بھی تاریخی وقائع کے ثبوت میں بہت اہمیت دی جاتی ہے اور اس سے بے پروا ہو کر دی جاتی ہے کہ خود اس سیاح کا اپنے ذاتی رجحانات، سمجھ بوجھ، سچائی، راستبازی میں کیا حال تھا، لیکن ان سیاحوں کی بدولت واقعات کی صورت کبھی کبھی کتنی مسخ ہو جاتی ہے، اس کا ایک سرسری اندازہ ہمارے موجودہ میر شعبۂ دینیات (نواب ناظر یار جنگ جسٹس حیدر آباد ہائی کورٹ) کے ڈرائنگ روم کی ایک تصویر سے ہو سکتا ہے، جو انگلستان کے ایک معتبر اخبار سے الگ کر کے محفوظ کی گئی ہے۔ یہ ہندوستان کے ایک موقع کی تصویر ہے، اور اس کے نیچے چوب خط حروف میں یہ لکھا ہوا ہے کہ بودھ مذہب کے لوگ اپنی ایک مشہور مذہبی رسم جو اڈیا کے نام سے موسوم ہے' ادا کر رہے ہیں۔ میں نے اس تصویر کے نیچے جب اس فقرہ کو پڑھا، تو بار بار حیرت ہوتی تھی کہ آخر یہ کیا ہے۔ تصویر سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی ایک جماعت نماز پڑھ رہی ہے۔ ان کی شکل وصورت، لباس، وضع قطع، طریقہ نشست ہر چیز ہندی مسلمانوں کی تھی، لیکن معتبر سیاح نے جس وقت یہ فوٹو لیا تھا، اس کے نیچے اس نے یہی عبارت درج کی تھی۔ آخر جب میر شعبہ صاحب باہر تشریف لائے، ان سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ آپ نے قصداً اس تصویر کو اسی لیے محفوظ کیا ہے، تا کہ یورپین سیاحوں کی تاریخی شہادت کی ایک گواہی مہیا ہو۔ آپ نے فرمایا کہ یہ دہلی میں نماز عید کے موقع کی تصویر ہے۔ ایک مغربی سیاح نے اس عید کو اڈیا بنایا، اور اڈیا کو خدا جانے کس طرح اس نے بودھ مذہب والوں کی رسم قرار دے کر اخبار میں اپنے جدید اکتشاف کا اعلان کیا۔

ان چند مثالوں کو پیش کرنے سے میری یہ غرض نہیں ہے کہ واقعی میں دنیا کے موجودہ تاریخی ذخیروں کو بالکلیہ غیر معتبر اور ناقابلِ لحاظ قرار دینا چاہتا ہوں، بلکہ مقصد صرف اس قدر ہے کہ ان احتمالات وشکوک کی کمزوریوں کے باوجود بھی آج جب علمی دنیا میں ''فنِ تاریخ'' ہر قسم کے احترام واعزاز کا مستحق ہے تو حدیث جو صرف مسلمانوں ہی کی تاریخ نہیں ہے بلکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا تمام دنیا کی انسانیت کے ایک عظیم انقلابی عہد آفرین کا ایک ایسا مکمل تاریخی مرقع ہے، جسے ٹھیک حقیقی اور اصلی شکل وصورت بلکہ ہر خط وخال کی حفاظت میں لاکھوں ہی نہیں بلکہ کروڑوں

Marfat.com

انسانوں کی وہ ساری کوششیں اور تدبیریں صرف ہوئی ہیں جو کسی واقعہ کی حفاظت کے متعلق آدمی کا دماغ سوچ سکتا ہے، بلکہ اس کی حفاظت وصیانت میں بعض ایسے قدرتی عوامل نے بھی وہ کام کیا ہے جیسا کہ ابھی آپ کو معلوم ہوگا، جو دنیا کے کسی تاریخی واقعہ کو نہ اس وقت تک میسر آئے اور نہ آئندہ آسکتے ہیں۔

لیکن قبل اس کے کہ میں کچھ اور کہوں اس پر بھی متنبہ کر دینا چاہتا ہوں کہ حدیث جس کے متعلق نہ جاننے والوں کا تو صرف یہ خیال ہے کہ وہ دینیاتی طرز کی کوئی چیز ہو اور دینیات کے لفظ کے ساتھ ہی ان کا دماغ فوراً دور وحشت کے ان قدیم خرافات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، جسے بدقسمتی سے اس زمانہ میں مذہب یا مذہب کی ایک قسم خیال کیا جاتا ہے، گویا دینیات کے معنی چند وہمی رسوم وعادات یا چند رٹے ہوئے الفاظ منتر جنتر جادو ٹوٹکے وغیرہ کے ہیں، جن میں صحرائی باشندے کسی زمانہ میں کیا اب تک مبتلا ہیں، مذہب کے متعلق جن کے دماغوں میں اس قسم کے خیالات میں حدیث جو مسلمانوں کے مذہبی علوم کا ایک جزء ہے، اس کے متعلق میرے ان دعووں کو سن کر ممکن ہے کہ حیرت ہو ان کی حیرت تو چنداں محلِ تعجب نہیں ہے اس لیے کہ ''جہل'' ان مسکینوں کے لیے بڑا عذر ہے۔

حدیث کی مدرسی تعریف

لیکن جاننے والوں کو بھی شاید شبہ ہوتا ہوگا کہ مدرسہ میں جس فن کی یہ تعریف کی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (یعنی مسلمانوں کے پیشوا) کے اقوال وافعال اور ایسے واقعات جو ان کے سامنے پیش آئے، لیکن ان میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ہے، جسے اصطلاحاً تقریر کہتے ہیں، غرض پیغمبر کے اقوال وافعال وتقریر کا نام حدیث ہے۔ بعضوں نے اس کو آگے بڑھا کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اور بعضوں نے صحابہ کے شاگردوں یعنی تابعین کے اقوال وافعال کو بھی اس فن کے ذیل میں شریک کر لیا ہے۔

کہاں حدیث کی یہ مدرسی اور مذہبی تعبیر اور کہاں میرا یہ دعویٰ کہ حدیث مسلمانوں ہی کی نہیں بلکہ انسانیت کے اہم ترین انقلابی عہد کی تاریخ کا معتبر ترین ذخیرہ ہے، ان دونوں میں کیا نسبت ہے، شاید یہ خیال کیا جاتا ہو کہ زمانہ کے حالات سے متاثر ہو کر میں نے اپنی تعبیر بدلی ہے، لیکن یہ واقعہ نہیں ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر چیز کے سمجھانے کے لیے اسی زبان میں گفتگو کی جاتی ہے، جسے مخاطب سمجھ سکتے ہوں۔ مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ میں نے اس فن کی تعریف کرتے ہوئے کچھ الفاظ ضرور بدلے ہیں لیکن الفاظ کے بدلنے سے واقعات نہیں بدلتے۔ جو نہیں جانتے ہیں انہیں تو آئندہ بتایا جائے گا، لیکن جو جانتے ہیں کہ حدیث کا تعلق جس ذاتِ گرامی (ﷺ) سے ہے کیا وہ اس کا انکار کر سکتے ہیں کہ جن الفاظ میں اس فن کی میں نے تعبیر پیش کی ہے کیا یہی اصل واقعہ نہیں ہے۔ اسلامی تحریک نے اپنے زمانہ آغاز سے اس وقت تک مشرق ومغرب کے باشندوں کے مذہبی، سیاسی، معاشرتی، اخلاقی پہلوؤں کے انقلاب میں جو کام کیا ہے اور کر رہی ہے، ان کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد مسلمان ہی نہیں کوئی نامسلمان بھی حدیث کی اس تاریخی تعبیر کا انکار کر سکتا ہے، جسے میں نے پیش کیا ہے، ماسوا اس کے سچ یہ ہے کہ بالکلیہ یہ میری تعبیر ہے بھی نہیں، فن حدیث کے

Marfat.com

سب سے بڑے امام امام الائمۃ حضرت امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب کا جو نام رکھا ہے، اگر اسی پر غور کر لیا جائے تو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ میں نے جو کچھ کہا ہے، یہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ سمجھنے والوں نے ہمیشہ اس فن کو اسی نگاہ سے دیکھا ہے۔ امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ کی کتاب آج تو صرف بخاری شریف کے نام سے مشہور ہے لیکن یہ اس کتاب کا اصلی نام نہیں ہے بلکہ خود حضرت امامؒ نے اپنی کتاب کا نام

الجامع الصحیح للسند المختصر من "امور" رسول اللہ ﷺ و "ایامہ"

رکھا ہے۔ اس میں ''امور'' اور ''ایام'' کے الفاظ قابلِ غور ہیں، جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی صحیح تعریف امام بخاری کے نزدیک ان تمام امور کو حاوی ہے جن کا کسی نہ کسی حیثیت سے آنحضرت ﷺ سے تعلق ہو۔ آگے ایام کے الفاظ نے تو اس کی تعریف کو اور بھی وسیع کر دیا، یعنی وہی بات جو میں نے عرض کی تھی کہ فنِ حدیث دراصل اس عہد اور ایام کی تاریخ کی تعبیر ہے، جس میں محمد رسول اللہ ﷺ کی جیسی ہمہ گیر، عالم پر اثر انداز ہونے والی ہستی انسانیت کو قدرت کی جانب سے عطا ہوئی، بہر کیف اگر اصطلاحی جھگڑوں سے الگ ہو کر پھل سے درخت کے پہچاننے کے اصول کو مدنظر رکھا جائے تو حدیث کے موجودہ ذخیرہ پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد بھی ایک معمولی آدمی اس کا اندازہ کر سکتا ہے کہ حدیث کی صحیح حقیقت اور اس کی واقعی تعریف وہی ہو سکتی ہے جس کی طرف حضرت امام بخاری نے اپنی کتاب کے نام میں اشارہ فرمایا ہے اور میں نے جس کی تشریح کی ہے۔

غالباً ''حدیث'' کی حقیقت یا تعریف کے لیے میرا یہ مختصر بیان کافی ہو سکتا ہے، درسی کتابوں میں جیسا کہ ہر تعریف کے قیود و شرائط پر بحث کر کے بات کو بتنگڑ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، میں ان دور از کار لفظی گورکھ دھندوں میں آپ لوگوں کو الجھا کر وقت نہیں ضائع کرنا چاہتا، اس لیے اس بحث کو اسی نقطہ پر ختم کر کے اب میں دوسرے ضروری سوالات کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ ہمارے سامنے دوسرا سوال یہ تھا کہ تاریخ کے اس حصہ کی تدوین کس طرح اور کس زمانہ میں عمل میں آئی۔ اسی سوال کے جواب میں آپ کے سامنے وہ امتیازات اور خصوصیات بھی آ جائیں گے جو تاریخ کے اس حصہ کو دنیا کے دوسرے تاریخی ذخیروں سے ممتاز کرتے ہیں۔

اس تاریخ کے ابتدائی مؤرخین و رواۃ کے خصوصیات

اتنا تو کم از کم ہر لکھا پڑھا آدمی جانتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی زندگی پاک، یا بالفاظ امام بخاری ''امور رسول اللہ ﷺ و ایامہ'' کے پہلے رواۃ یا ابتدائی مورخین وہی حضرات ہیں، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شرف صحبت سے فیضیاب تھے، یعنی صحابۂ کرام لیکن ان بزرگوں نے تاریخ کے اس حصہ کی روایت کیا انہی اسباب کے تحت کی جن کے زیر اثر دنیا کی دوسری تاریخیں مدون ہوئی ہیں۔

میرا مقصد یہ ہے کہ دنیا کے عام تاریخی سرمایوں کی تدوین میں جس طرح عموماً حال کو ماضی سے مربوط رکھنے کا جذبہ یا پچھلوں کی مجلسوں کو پہلوں کی داستانوں سے گرم رکھنے کا ذوق کارفرما رہا ہے، کیا حدیث کی تدوین بھی اسی

Marfat.com

جذبہ کے تحت ہوئی؟ میرا خیال ہے کہ حدیث کی تدوین کی بحث چھیڑنے سے پہلے سخت ضرورت تھی کہ پہلے ان اسباب یا جیسا کہ میں نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے کہ ان قدرتی عوامل کو سامنے لانے کی حاجت ہے، جو دنیا کی عام تاریخ سے اس خاص حصہ یعنی حدیث کو بالکل جدا کر دیتے ہیں، ممکن ہے کہ اس بحث میں آپ کا کچھ زیادہ وقت میں لوں، لیکن بات چونکہ بالکل نئی ہے، اس لیے اجمال سے کام لینے میں اندیشہ ہے کہ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، وہ شاید پورے طور سے ذہن نشین نہ ہوسکے۔ میں ان امتیازی اسباب وعوامل کو الگ کر کے بیان کرتا ہوں۔

عام تاریخی ذخیروں سے حدیث کے امتیازات

(۱)

عام تاریخوں سے تاریخ کے اس حصہ کو جو پہلا امتیاز حاصل ہے، وہ اس امر کی بساطت ہے، جس سے اس کا تعلق ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے پاس اس وقت تاریخ کے جو عام ذخیرے ہیں، عموماً ان کا تعلق کسی قوم کی حکومت، کسی عظیم الشان جنگ، الغرض اسی قسم کی منتشر اور پراگندہ گوناگوں چیزوں سے ہے، جن کا احاطہ آسان نہیں ہے، بخلاف اس کے حدیث اس تاریخ کا نام ہے جس کا تعلق براہ راست ایک خاص شخصی وجود یعنی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے ہے۔ ایک قوم، ایک ملک، ایک حکومت، ایک جنگ کے تمام اطراف وجوانب کو صحیح طور پر سمیٹ کر بیان کرنا ایک طرف ہے اور دوسری طرف ملک نہیں، ملک کی کوئی خاص قوم نہیں، کسی قوم کا کوئی قبیلہ نہیں، کسی قبیلہ کا کوئی خانوادا نہیں، بلکہ صرف ایک واحد بسیط شخص کی زندگی کے واقعات کا بیان کرنا ہے۔ خود اندازہ کیجیے کہ احاطہ و تدوین کے اعتبار سے دونوں کی آسانی و دشواری میں کوئی نسبت ہے۔ پہلی صورت میں کوتاہیوں، غلط فہمیوں، غلطیوں کے جتنے قوی اندیشے ہیں، یقیناً اسی نسبت سے دوسری صورت میں صحت وواقعیت کی اسی قدر عقلاً توقع کی جاسکتی ہے۔

(۲)

دوسرا امتیاز پہلے امتیاز سے بہت زیادہ اہم ہے، وہ محمد رسول اللہ ﷺ اور ان کے مورخوں یعنی صحابۂ کرام کا باہمی تعلق ہے۔ بلاشبہ اس وقت ہمارے سامنے مختلف اقوام وممالک، سلاطین اور حکومتوں کی تاریخیں ہیں، لیکن جن مورخوں کے ذریعہ سے یہ تاریخیں ہم تک پہنچی ہیں، کیا ان میں کسی تاریخ کا اپنے مورخ یا مورخین سے وہ تعلق تھا، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابۂ کرام کے ساتھ تھا؟ سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ مشکل ہی سے آج کوئی ایسا تاریخی حصہ ہمارے پاس نکل سکتا ہے، جس کے مورخین خود ان واقعات کے عینی شاہد ہوں، بلکہ جیسا کہ پہلے بھی میں نے ذکر کیا ہے کہ عموماً ان تاریخوں کی تدوین ہی ہوئی ہے کہ ابتداء میں مبہم مجہول الحال افواہوں کی صورت میں واقعات اِدھر

Marfat.com

اُدھر بکھرے رہے، پھر ان میں سے جب کسی کو شوق ہوا تو اس نے ان ہی افواہوں کو قلمبند کرنا شروع کیا، پھر خود اس مورخ ہی نے یا اس کے بعد والوں نے قرائن و قیاسات سے جہاں تک ممکن ہوا، جس حصہ کو چاہا باقی رکھا، جسے چاہا قلم زد کر دیا۔ یہ تو شروع میں ہوا۔ بعد کو جوں جوں ان قلم بند شدہ واقعات پر زمانہ گذرتا گیا اوراق میں زیادہ بوسیدگی پیدا ہوئی، کیڑوں کی خوراک سے بچ کر جو حصہ باقی رہا، پچھلی نسلوں کے لیے وہ تاریخی وثیقہ بن گیا۔ آج اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ مطبوعہ کتابوں سے زیادہ بھروسہ قلمی کتابوں پر اور قلمی کتابوں میں بھی سب سے زیادہ قیمتی وہ مسودات ہیں جو بوسیدہ اور کرم خوردہ ہو چکے ہیں۔ اور سنگی، برنجی یا آہنی تختیوں کا کوئی ذخیرہ اگر کسی مورخ کو مل گیا تو وہی چیز جو ہمارے ہی جیسے انسانوں نے کسی زمانہ میں لکھ کر زمین میں گاڑ دی تھی...... بلکہ ہم تو اپنے معاصرین کو ایک حد تک جانتے بھی ہیں، لیکن ان کے لکھنے والوں کو تو کچھ پتہ نہیں ہوتا، لیکن کیا کیجئے کہ بایں ہمہ وہ معصوم فرشتوں کے بیان کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔

لیکن اسی کے ساتھ مجھے اس کا بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ گذشتہ بالا کلیہ سے تاریخ کے بعض حصے مستثنیٰ بھی ہیں، خصوصاً اسلامی دور میں مسلمان بادشاہوں کے حکم سے جب تاریخوں کی تدوین کا سلسلہ شروع ہوا اور باضابطہ شاہی وسائل و ذرائع کے ذریعہ سے مورخوں کو واقعات کے فراہم کرنے میں امداد دی گئی، یقیناً ان کتابوں کی نوعیت قدیم تاریخوں سے بالکل جداگانہ ہے۔ اسی طرح مسلمان مورخوں کی بنائی ہوئی راہوں پر اس زمانہ میں خصوصاً مغربی قومیں نسبتہً زیادہ حزم و احتیاط سے کام لے رہی ہیں، لیکن کچھ بھی ہو، کسی زمانہ کی تاریخ ہو، ان کے مورخوں کو ان واقعات سے یا صاحبِ واقعات سے قطعاً وہ تعلق نہ تھا اور نہ ہو سکتا ہے جو صحابہ کرام کو ذاتِ قدسی صفات سے تھا۔ یہی نہیں کہ ان بزرگوں نے حضورؐ کے ہاتھ پر ایمان و اسلام کی بیعت کی تھی، آپؐ کی نبوت پر وہ ایمان لائے تھے، آپؐ سے ان کو وہ تعلق تھا جو ایک امتی کو اپنے پیغمبر سے ہونا چاہئے، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر جیسا کہ واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ، بیوی بچوں، بلکہ اپنی جانوں سے بھی زیادہ حضور ﷺ اور آپ کی زندگی کو عزیز رکھتے تھے، وہ سب کچھ حضورؐ پر قربان کرنے کے لیے تیار تھے، گویا ایک قسم کے عشق و سرمستی کے نشہ میں مخمور تھے۔ یقیناً یہ ایسا امتیاز ہے جو کسی تاریخی واقعہ کو اپنے مورخین کے ساتھ حاصل نہیں۔ آخر دنیا کی ایسی کونسی تاریخ ہے جس کے بیان کرنے والے مورخین اس تاریخ سے ایسا والہانہ تعلق رکھتے ہوں کہ بیان کرتے جاتے ہیں اور روتے جاتے ہیں، کانپتے جاتے ہیں، عبداللہ بن مسعود کے متعلق ان کے دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب کر کے بہت کم حدیثیں بیان کرتے تھے، لیکن اگر کبھی زبان پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آ گیا راوی کا بیان ہے کہ اس کے بعد ارتعد وارتعدت ثیابہ تنفخ اوداجہ مغرور قة عیناہ (کانپنے لگتے اور ان کے کپڑوں میں تھرتھری پیدا ہو جاتی، گردن کی رگیں پھول جاتی تھیں، آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں، (مستدرک حاکم)۔ ایک عبداللہؓ بن مسعود ہی نہیں بلکہ ان اصحاب کی ایک فہرست تیار ہو سکتی ہے جن پر آنحضرت ﷺ کے ذکر مبارک کے وقت ایک خاص قسم کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ حضرت ابوذرؓ کبھی کبھی کوئی حدیث بیان کرنا چاہتے مگر منہ سے اوصانی حبی ابو القاسم اوصانی خلیلی ﷺ، الفاظ نکلتے اور چیخ مار کر بیہوش ہو جاتے تھے۔ اسی قسم کے واقعات حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ذکر میں بھی ملتے ہیں،

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس تاریخ کو اس کے مؤرخوں میں محبوبیت کا یہ مقامِ عالی حاصل ہو، قدرتی طور پر ان کے دل و دماغ ان کے حافظے اس سے کس حد تک متاثر ہو سکتے ہیں۔

(۳)

تیسری خصوصیت اس تاریخ اور اس کے راویوں کی یہ ہے کہ علاوہ مذکورۂ بالا تعلقات کے ان براہ راست مورخوں یا چشم دید راویوں اور گواہوں نے آنحضرت ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت ہی اس بات پر کی تھی کہ تاریخ کے اس عجیب وغریب واقعہ کے ہر ہر جز' ایک ایک خط وخال کے زندہ نقوش اپنے اندر پیدا کریں گے۔ انہوں نے جس قرآن کو خدا کی شریعت اور قدرت کا قانون یقین کر کے مانا تھا، اس میں بار بار مطالبہ کیا گیا تھا کہ تم میں ہر ایک کی زندگی کا نصب العین صرف یہی ہونا چاہئے کہ جو کچھ محمد رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں، انہیں سنو، سن کر یاد رکھو اور ان پر ایمان لاؤ اور یقین کرو، محمد رسول اللہ ﷺ جو کچھ کرتے ہیں اس کی ہر ہر ادا پر نگاہ رکھو اور ٹھیک من وعن جس طرح ان کو جو کچھ کرتے ہوئے دیکھتے ہو، تم بھی اس کام کو اسی طرح انجام دینے کی کوشش کرو۔

(۱) ما اتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتہوا

رسول نے جو کچھ تمہیں دیا ہے، اسے پکڑے رہے ہو اور جس سے انہوں نے روکا ہے اس سے رُک جاؤ۔

(۲) وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ

ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا، لیکن صرف اسی لیے کہ اس کی پیروی اور اطاعت خدا کے حکم سے کی جائے۔

(۳) قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ

کہہ دو اگر تم اللہ کو چاہتے ہو، تو میری پیروی کرو، اللہ بھی تمہیں چاہنے لگے گا۔

(۴) لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ

تمہارے لئے اللہ کے رسول میں اچھا نمونہ ہے۔

سمع وطاعت، اطاعت واتباع کے ان پُر جلال مطالبوں سے قرآن گونج رہا تھا اور ان لوگوں کے سامنے گونج رہا تھا، جو ہر چیز سے دست بردار ہو کر صرف اس کی آواز میں گم ہونے کا آخری اور قطعی فیصلہ کر چکے تھے۔

ان کا یہ فیصلہ غلط تھا یا صحیح' مجھے اس وقت اس سے بحث نہیں، لیکن حضراتِ صحابۂ کرام کے اس ''فیصلہ'' کا علم مسلم اور غیر مسلم ہر طبقہ کو ہے۔ بتایا جائے کہ دنیا کے کس تاریخی واقعہ سے اس کے مؤرخین اور راویوں کا یہ تعلق ہے۔ عجیب بات ہے کہ جن بزرگوں سے کسی زمانہ میں انسانوں کے کسی گروہ کو اگر یہ تعلق پیدا بھی ہوا تھا تو ان کی تاریخ ہی آج ناپید ہے اور تاریخ کا جو سرمایہ آج ہمارے پاس ہے اس کے مؤرخوں کو ان تعلقات کی ہوا بھی نہ لگی تھی۔

کہاں پچھلوں کی مجلسوں کی گرم بازاری کے لیے مؤرخین کے بیانات اور کہاں ان سوختہ سامانوں کی تاریخی شہادتیں۔

Marfat.com

(۴)

اسی کے ساتھ ہمیں اس کا بھی اضافہ کرنا چاہیے کہ آنحضرت ﷺ کے اقوال و اعمال کی اطاعت و اتباع ہی ان بزرگوں کے لیے ضروری نہ تھی، بلکہ جس قرآن اور جس فرمان نے ان پر یہ فریضہ عائد کیا تھا، اسی نے ان کو اس کا بھی ذمہ دار بنایا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ کہتے ہوئے انہوں نے سنا ہے اور جو کچھ کرتے ہوئے انہوں نے دیکھا ہے وہ دوسروں تک مسلسل پہنچاتے چلے جائیں، ہر حاضر غائب کو اور ہر پہلا پچھلوں کو ان کی طرف بلاتا جائے، قرآنی آیتوں

(۱) کنتم خیر امۃٍ اخرجت للناس تأمرون بالمعروف و تنهون عن المنکر (۳:۱۱۰)
تم ایک بہترین امت ہو، انسانوں کی (بہی خواہی) کے لیے تم ظاہر کیے گئے ہو تا کہ اچھی باتوں کا لوگوں کو حکم دو اور بری باتوں سے ان کو روکو۔

(۲) ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف وینهون عن المنکر (۳:۱۰۴)
چاہیے کہ تم میں ایک گروہ ہو، جو نیکی اور بھلائی کی طرف لوگوں کو بلائے، اچھی باتوں کا حکم دے اور بری باتوں سے روکے۔

ہی کی یہ تفسیر تھی، جو مختلف پیرایوں میں صحابۂ کرام کو مخاطب کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمایا کرتے۔ منیٰ کا میدان ہے، خیف کی مسجد ہے، ایک لاکھ سے اوپر آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے والوں کا مجمع ہے، سب کو مخاطب کر کے فرمایا جاتا ہے:

(۱). نضر اللّٰہ عبداً سمع مقالتی فوعا ها ثم اداها الی من لم یسمعها. (صحاح)
تروتازہ رکھے اللہ اس بندے کو جس نے میری بات سنی، پھر اسے یاد رکھا۔ اور جس نے نہیں سنا ہے اس تک اسے پہنچا دیا۔

یہی منیٰ کا میدان ہے، حجۃ الوداع کے مشہور تاریخی خطبہ میں اعلان فرمایا جاتا ہے۔

(۲) ترکت فیکم شیئین لن تضلوا بعد هما کتاب اللّٰہ و سنتی و لن یتفر قاحتیٰ یر دا علی الحوض. (صحاح)
میں تم میں دو چیزیں چھوڑتا ہوں جن کے بعد تم پھر گمراہ نہیں ہو سکتے (ایک تو) اللہ کی کتاب (اور دوسری) میری سنت، یہ دونوں باہم ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے، جب تک کہ حوض (کوثر) پر پھر میرے سامنے آجائیں۔

مجمع سے دریافت فرمانے کے بعد کہ کیا میں نے پہنچا دیا، آسمان کی طرف انگلیاں اٹھا کر اللّٰھم هل بلغت اللّٰھم هل بلغت اللّٰھم هل بلغت کے ارشاد فرمانے کے بعد آخری رخصت کے اس خطبہ کو اس مشہور متواتر فقرہ پر ختم فرمایا جاتا ہے،

الا فلیبلغ الشاهد الغائب۔ (صحاح)
چاہیے کہ جو حاضر ہے وہ غائب کو پہنچاتا جائے،

Marfat.com

جس دردناک اور اثر انگیز ماحول میں اس خاتمہ کا اعلان ہوا ہے، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جن جذبات و ہیجانات سے مخاطب مجمع بھرا ہوا تھا، اس پر کیا اثر ہوگا۔ اسی اثر کا آپ کو یقین تھا کہ صحابہ کی جماعت کو خطاب کر کے بطور پیشین گوئی آپ فرماتے:

تسمعون و یسمع منکم و یسمع من الذین یسمعون منکم ۔(ابوداؤد)......(مستدرک)
تم مجھ سے سن رہے ہو، تم سے بھی سنا جائے گا، اور جن لوگوں نے تم سے سنا ہے ان سے بھی لوگ سنیں گے۔

نہ صرف عام مجامع میں یہ اعلان کیا جاتا تھا بلکہ ملک کے مختلف اطراف سے وقتاً فوقتاً وفود کے جو سلسلے دربار نبوت میں حاضر ہوا کرتے تھے، عموماً ان کو ایسی جگہ ٹھہرایا جاتا تھا، جہاں سے اس واقعہ کے معائنہ اور مشاہدہ کا ان کو کافی موقع مل سکتا ہو، جس کے وہ مورخ بنائے جاتے تھے، پھر جو کچھ سنانا اور دکھانا مقصود ہوتا وہ سنایا اور دکھایا جاتا تھا۔ آخر میں رخصت کرتے ہوئے حکم دیا جاتا جیسا کہ بخاری میں ہے،

احفظو ھن و اخبر و ھن من ورائکم
اب باتوں کو یاد رکھو، اور جو لوگ تمہارے پیچھے ہیں، انہیں ان سے مطلع کرتے رہنا۔

حافظ ابن حجر اس فقرہ کی شرح میں لکھتے ہیں:

یشمل من جاؤ امن عندھم و ھذاباعتبار المکان یا یشمل من یحدث لھم من الا و لاد و غیر ھم وھٰذباعتبار الزمان. (فتح الباری)
یہ ان لوگوں کو بھی شامل ہے جن کے پاس سے یہ لوگ آئے تھے، اور یہ بات مکان کے لحاظ سے ہے اور ان آئندہ نسلوں کو بھی شامل ہے جو بعد کو پیدا ہونے والی ہیں اور یہ بات زمانہ کے حساب سے ہوگی۔

اور یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ اسلام کے دائرہ میں جو قبائل داخل ہوتے جاتے تھے، دربار رسالت سے ان کی تعلیم و تلقین کے لیے ذمہ دار اصحاب کو بھیجا جاتا تھا۔ حکم دیا جاتا تھا کہ جو کچھ تم نے ہم سے سیکھا ہے وہ انہیں بھی جا کر سکھاؤ، صرف استحبابی احکام ہی نہیں، بلکہ قرآن کی آیت:

ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینات و الھدی من بعد ما بیناہ للناس فی الکتاب اولئک یلعنھم اللاعنون
جو لوگ چھپاتے ہیں اس چیز کو جسے ہم نے اتارا ہے اور جو کھلی کھلی باتوں اور سوجھ بوجھ (ہدایت) کی باتوں پر مشتمل ہو اور اس کے بعد چھپاتے ہیں، جب انسانوں کے لیے کتاب میں ہم نے اسے بیان کر دیا ہے۔ یہی لوگ ہیں جن پر خدا بھی لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں۔

کی بنیاد پر صحابۂ کرام جس تاریخ کی نشر و اشاعت کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے تھے، اس کا چھپانا گناہ خیال کرتے تھے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث بھی روایت کرتے تھے:

من سئل عن علم ثم کتمہ الجم یوم القیامۃ بلجام من نار. (ابوداؤد و ترمذی)
جو کوئی پوچھا جائے کسی علم کی بات سے اور اسے وہ چھپائے تو قیامت کے دن آگ کی لگام اسے پہنائی جائے گی۔

اور اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ سکرات میں مبتلا ہیں، لیکن بعض صحابہ سے یہ مروی ہے کہ اس وقت بھی محض اس خیال سے کہ علم کے چھپانے کا الزام ان پر نہ رہ جائے حدیث بیان کرتے جاتے تھے۔

(بخاری ومسلم وعام صحاح)

(۵)

ان تمام امور کے ساتھ اس کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ جس ذاتِ گرامی کے ہر قول کو وہ خدا کی بات اور خدا کا حکم سمجھتے تھے۔ اسی نے بار بار بکثرت ان کی فطرت میں مشہور حدیث[ے] من كذب على متعمداً فليتبوء مقعده من النار کے تہدیدی خوف کو اس طرح راسخ کرنے کی کوشش کی تھی کہ جتنے صحابیوں سے یہ حدیث مروی ہے۔ مشکل ہی سے چند حدیثیں اس کی ہم پایہ ہوسکتی ہیں اور نیز قرآن کی رو سے یہ اتنی بدیہی بات تھی کہ جس قسم کے ایمان ویقین کی دولت سے یہ لوگ سرفراز تھے، اس فعل کی جرأت کس کو ہوسکتی تھی۔ جس اعلیٰ کردار کے وہ مالک تھے، یوں بھی ان سے غلط بیانی کی توقع کون کرسکتا ہے، ماسوا اس کے جب وہ جانتے تھے کہ آنحضرت ﷺ کی طرف کسی امر کا انتساب دراصل اس چیز کو خدا کی طرف منسوب کرنا ہے اور ایک جگہ نہیں بے شمار آیتوں میں قرآن نے مفتری علی اللہ (خدا پر جھوٹ باندھنے والے) کو سب سے بڑا ظالم قرار دیا ہے۔ کیا قرآن پر تازہ ایمان رکھنے والوں کے لیے اس کے بعد اس کی کوئی گنجائش ہوسکتی تھی۔ کہ وہ قصداً العیاذ باللہ اپنے محبوب رسول پر جھوٹ باندھیں؟ یہی وجہ ہے کہ بعض صحابہ تو جس وقت ''حدیث'' بیان کرنے کے لیے بیٹھتے، قبل کچھ بیان کرنے کے من كذب على متعمداً والی حدیث کو ضرور پڑھ لیتے تھے، تاکہ ان میں اپنی نازک تاریخی ذمہ داری کا احساس بیدار اور تازہ ہو جائے۔ امام احمد بن حنبل اپنی مسند میں راوی ہیں کہ خصوصیت کے ساتھ ذخیرۂ حدیث کے سب سے بڑے راوی یعنی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ دوامی قاعدہ تھا کہ

يبتدء حديثه بان يقول قال رسول الله الصادق المصدوق ابوالقاسم صلى الله عليه و سلم من كذب على متعمداً فليتبوء مقعده من النار۔ (اصابہ۔ جلد۴)

اپنی حدیث جس وقت بیان شروع کرتے تو کہتے، فرمایا رسول اللہ صادق ومصدوق ابوالقاسم ﷺ نے جس نے مجھ پر قصداً جھوٹ باندھا، چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ آگ میں تیار کرلے۔

اس کے بعد جو کچھ بیان کرنا چاہتے تھے، بیان فرماتے۔

(۶)

اسی کے ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ آنحضرت ﷺ جو کچھ صحابہ کو سناتے تھے یا کر کے دکھاتے تھے،

Marfat.com

اس کے متعلق صرف یہ حکم دے کر کہ تم بھی اس کو یاد رکھنا یا کرنا محض اس پر کفایت نہیں فرماتے تھے، بلکہ اس کی باضابطہ نگرانی فرماتے تھے کہ اس حکم کی کس حد تک تعمیل کی جاتی ہے۔ مہماتِ شریعت اور اساسی امور کے متعلق آنحضرت ﷺ کی نگرانی کا کیا حال تھا، اس کا اندازہ آپ کو اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک معمولی بات یعنی ایک صحابی کو یہ بتاتے ہوئے کہ جب سونے لگو، تو یہ دعا پڑھ کر سویا کرو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتانے کے بعد فرمایا کہ اچھا میں نے کیا کہا؟ اسے دہراؤ۔ صحابی نے آخری فقرہ اٰمنت[4] بکتابک الذی انزلت و نبیک الذی ارسلت میں نبیک کے لفظ کو رسولک کے لفظ سے بدل دیا، جو تقریباً ہم معنی الفاظ ہیں، یعنی بجائے نبی کے ''رسول'' کا لفظ استعمال کیا، لیکن آنحضرت ﷺ نے اپنی زبانِ مبارک سے چونکہ نبیک کا لفظ ادا فرمایا تھا، حکم ہوا کہ میں نے یہ نہیں کہا، وہی کہو جو میں نے بتایا۔ ظاہر ہے کہ قانونی طور پر سونے کی دعا کی حیثیت ان شرعی حقائق کی نہیں ہے، جنہیں فرض و واجب کے ذیل میں شمار کیا جاتا ہے لیکن باوجود اس کے ایک ایک لفظ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی سخت نگرانی تھی، بخاری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عام گفتگو کے متعلق یہ دوامی عادت بیان کی جاتی ہے کہ انہٗ کان اذا الکلم بکلمۃٍ اعادھا ثلثا[5]، غالباً اس میں بھی زیادہ تر دخل اسی مقصد کو تھا۔ فعل کے متعلق مشہور حدیث ہے کہ ایک صاحب حضور ﷺ کے سامنے نماز پڑھ رہے تھے، حالانکہ نماز کے تمام ارکان یعنی قیام و رکوع و سجود میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی، صرف ذرا عجلت اور جلد بازی سے کام لے رہے تھے، نماز سے جب وہ فارغ ہوئے تو وہ یہ سن رہے تھے کہ آنحضرت ﷺ ''صل فانک لم تصل''، پھر نماز پڑھو تم نے نماز نہیں پڑھی، ارشاد فرما رہے ہیں، انہوں نے پھر نماز دہرائی، لیکن اب بھی اس میں وہ وقار اور طمانیت نہیں پیدا ہوئی تھی، جس سے صلوا کمارا یتمونی اصلی (ٹھیک اسی طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو) کے حکم کی تعمیل ہوتی۔ الغرض تیسرے بار سمجھانے کے بعد انہوں نے اپنی نماز جیسی کہ چاہیے ادا کی، نماز میں سکینت و اطمینان کی حیثیت اکثر فقہائے امصار کے نزدیک فرض و واجب کی نہیں ہے، لیکن جن لوگوں کو آنحضرت ﷺ اپنی پوری زندگی اس کے ہر پہلو' ظاہر و باطن' اندر اور باہر کا مؤرخ بنانا چاہتے تھے، ان پر آپ ان معاملات کے متعلق بھی پوری نگرانی رکھتے تھے۔ کیا دنیا میں کوئی ایسی تاریخ بھی موجود ہے، جس نے اپنے مؤرخین کی اور راویوں کے بیان وادا کی خود نگرانی کی ہو، اور ایسی سخت کڑی نگرانی!

تدوینِ حدیث کے سلسلہ میں جن امور کی تعبیر میں نے غیر معمولی خاص قدرتی عوامل سی کی ہے اور عام تاریخی سرمایہ سے تاریخ کے اس حصہ کے متعلق جن بنیادوں پر میں امتیاز کا مدعی ہوں، اس کے ٹھوس اور خصوصی اسباب تو یہ تھے،

لیکن خصوصیتوں کا یہ قصہ ان ہی پر ختم نہیں ہو جاتا۔ جن بزرگوں کے ہاتھوں علم کے اس حیرت انگیز ایوان کی تعمیر ہوئی، ابھی ان کی اور بھی چند باتیں قابل لحاظ ہیں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ ان تمام ذمہ داریوں کے ساتھ جن کا ذکر آپ سن چکے، قرآن اور آنحضرت ﷺ کی پیغمبرانہ دعوت جو شاعرانہ زبان میں نہیں، بلکہ فی الحقیقت مولانا حالی مرحوم کی اس بلیغ تعبیر کی صحیح تصویر تھی،

Marfat.com

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی — عرب کی زمین جس نے ساری ہلا دی
اک آواز میں سوتی بستی جگا دی — نئی اک لگن سب کے دل میں لگا دی

اس نے صحابۂ کرام کی ذہنی قوتوں اور عملی توانائیوں میں نئی زندگی کی روح بھر کران میں ایسی ہل چل پیدا کر دی تھی کہ بقول گاڈفری ہنکس ''عیسائی اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمد ﷺ کے پیغام نے وہ نشہ آپ کے پیروؤں میں پیدا کر دیا تھا، جس کو عیسیٰ کے ابتدائی پیروؤں میں تلاش کرنا بے سود ہے۔''

اور میں تو کہتا ہوں کہ عیسائی ہی نہیں بلکہ دنیا کو چاہیے کہ یہ یاد رکھے کہ اس نشہ کی نظیر نہ اس کے پہلے دیکھی گئی اور نہ اس کے بعد دیکھی جا سکتی ہے۔ عروہ بن مسعود ثقفی نے جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، صلح حدیبیہ کے موقع پر قریش کو صحابہ کرام کے اس نشہ کی خبر کتنے صحیح الفاظ میں دی تھی،

ای قوم واللّٰہ لقد و فدّت علی الملوک و فدّت قیصر و کسری و النجاشی واللّٰہ ان رأیت ملکاً قط یعظمه اصحابه مایعظم اصحاب محمدٍ محمداً واللّٰہ ان تنخم نخامة الا وقعت فی کف رجل منهم فدلک بهارجهه وجلده واذاامرهم ابتدر وامره و اذا توضاء کا دوایقتتلون علیٰ وضؤه واذا تکلم خفضوا اصواتهم عنده و ما یحدقون الیه النظر تعظیماله

لوگو! خدا کی قسم مجھے بادشاہوں کے دربار میں باریابی کا موقعہ ملا ہے، قیصر (روم) کسریٰ (ایران) نجاشی (ابی سینیا) کے سامنے حاضر ہوا ہوں۔ قسم خدا کی میں نے کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا، جس کی لوگ اتنی عظمت کرتے ہوں، جتنی عظمت محمدؐ کے ساتھی محمدؐ کی کرتے ہیں، قسم خدا کی جب وہ بلغم تھوکتے ہیں تو نہیں گرتا ہے وہ لیکن ان کے ساتھیوں میں سے کسی آدمی کے ہاتھ میں، پھر وہ اپنے چہرہ اور اپنے بدن پر اسے مل لیتا ہے (محمدؐ) جب کسی بات کا انہیں حکم دیتے ہیں، اس کی تعمیل کی طرف وہ جھپٹ پڑتے ہیں، جب محمدؐ وضو کرتے ہیں، تو اس وقت ان کے وضو کے پانی پر آپس میں اُلجھ پڑتے ہیں، جب محمد ﷺ بات کرتے ہیں، تو ان کی آوازیں پست ہو جاتی ہیں، محمدؐ کو نگاہ بھر کر ان کی عظمت کی وجہ سے وہ نہیں دیکھ سکتے۔

یہ دوست کی نہیں، بلکہ ایک دانا دشمن کی شہادت ہے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس جماعت کے نشہ کا یہ حال ہو، جو احکام و اوامر تو بڑی چیزیں ہیں، تھوک اور وضو کے غسالہ تک کو اپنے اندر پیوست کرتے تھے اور ایک دوسرے پر سبقت کرنے میں گویا باہم الجھ پڑتے تھے، ایک ایک موئے مبارک کے متعلق یہ حال تھا کہ بخاری میں ہے کہ حضرت عبیدہ تابعی جنہیں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ خادم رسول ﷺ کے ذریعہ سے حضور ﷺ کا ایک موئے مبارک ہاتھ آ گیا تھا، فرماتے

لان تکون عندی شعرة منها احب الیّ من الدنیا و ما فیها

میرے پاس کسی بال کا ہونا، اس سے زیادہ محبوب ہے کہ دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے، وہ سب کچھ میرے یہاں ہو۔

جن لوگوں کا تعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قسم کا ہو، انہوں نے آنحضرت ﷺ کی ''زندگی'' جس کے خدا کی طرف سے بھی وہ محافظ اور مبلغ قرار دیئے گئے تھے، سوچنا چاہیے کہ انہی لوگوں نے اس ''زندگی'' کی نگہداشت میں کس اہتمام کس انہماک اور توجہ سے کام لیا ہوگا، ایک ایک موئے مبارک بھی جن کے نزدیک دنیا و مافیہا

Marfat.com

سے زیادہ محبوب تھا، انہی کے نزدیک آنحضرت ﷺ کے اقوال و افعال کی غور کرنا چاہیے کہ کیا قیمت تھی۔ اب ایک طرف حضرات صحابۂ کرام کے ان جذباتی طوفانوں کو اپنے سامنے رکھئے اور اسی کے ساتھ اس پر بھی غور کیجئے کہ جس عہد میں اس تاریخ کی حفاظت و اشاعت کی ذمہ داری قدرت کی جانب سے انہیں سپرد ہوئی تھی، اس زمانہ میں ان کے پاس کسی قسم کا کوئی دماغی مشغلہ قرآن مجید کے سوا موجود نہ تھا۔ عرب جاہلیت کی تاریخ ہم سب کے سامنے ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اس حیرت انگیز مدہش اچانک دماغی بیداری کے زمانہ سے پہلے وہ اور ان کا ملک تقریباً ان عام علمی اور ذہنی مشغلوں سے مفلس تھا، جن کا چرچا عموماً حضارت و تمدن کے ساتھ وابستہ ہے، اگرچہ میں اس کا تو قائل نہیں جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ عرب کے ایامِ جاہلیت کا یہ مطلب ہے کہ ان کی حالت ہندوستانی بھیلوں اور گونڈوں کی تھی۔ نہ صرف قریش بلکہ اور بھی دوسرے قبائل کے صحیح حالات سے جو واقف ہیں، وہ ایک سیکنڈ کیلئے یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے، بلکہ جیسا کہ عنقریب آپ کے سامنے اس کی تفصیل آئے گی کہ ''جاہلیت'' کا یہ ترجمہ کہ وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، عربی زبان اور قرآن مجید جس میں یہ لفظ غالباً پہلی دفعہ استعمال ہوا، اس کے عام محاوروں کے خلاف ہے۔ عربوں کی جہالت کا جو یہ مطلب سمجھتا ہے وہ دراصل واقعات سے جاہل ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ لکھنے پڑھنے کے سلسلہ میں عرب کا بھی اس زمانہ میں تقریباً وہی حال تھا، جو عموماً اس زمانہ میں اگر کامل متمدن ممالک نہیں، تو نیم متمدن ممالک کا تھا، یعنی جس طرح قدیم زمانہ میں تقریباً ہر ملک اور قوم میں لکھنے پڑھنے والوں کا ایک خاص پیشہ ور طبقہ ہوتا تھا اور عام پبلک کو اس سے چنداں تعلق نہیں تھا، نہ اس کی اتنی اہمیت تھی۔ کسی ملک میں پادریوں، کسی میں موبدوں، کسی میں برہمنوں الغرض اسی قسم کے لوگوں کے ساتھ یہ کام مخصوص تھا، اگر بالکل یہ نہیں تو قریب قریب عرب کا بھی یہی حال تھا۔ آئندہ یہ بتایا جائے گا کہ عرب میں بھی ایک خاصی تعداد خواندوں اور نویسندوں کی تھی۔ نہ صرف مرد بلکہ ایامِ جاہلیت میں بھی بعض لکھی پڑھی عورتیں پائی جاتی تھی، شرفا ہی نہیں بلکہ غلاموں میں بھی ایسے افراد موجود تھے۔ میں اپنے اس دعویٰ کی تھوڑی بہت تفصیل آگے بھی کروں گا، لیکن بااین ہمہ اسی کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ معمولی نوشت و خواند جو چند گنے چنے لوگوں تک محدود تھی، اس سے آگے عربوں کی ذہنی اور دماغی قوتوں کے لیے اس زمانہ میں کوئی خاص اہم خوراک موجود نہ تھی اور تھوڑی بہت اگر کچھ تھی بھی تو وہ بہت ادنیٰ درجہ کی تھی۔ ان کا سب سے بڑا دماغی مشغلہ شعر و شاعری کا تھا، یا باہم ایک دوسرے پر تفاخر کے لیے یا توہین کے لیے وہ انساب کے علم سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ اور بھی ابتدائی نوعیت کی کچھ فنی چیزیں معدودے چند افراد کے پاس تھیں، لیکن اسلام نے شریفانہ کردار کا جو معیار مقرر کیا تھا، اس میں گانے بجانے، رقص و سرور، مے نوشی مفاخرت یا مشاجرت وغیرہ کی کوئی گنجائش نہیں رکھی تھی۔ ان کی خمری و فخری فحش و مبالغہ والی شاعری کی بھی اس نے کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ ایک طرف عربوں کی ذہنی اور علمی بھوک کی وہ شدت اور دوسرے طرف یونہی ان کے ملک کا دماغی مشغلوں سے خالی ہونا چند بچی کھچی ادنیٰ درجہ کی کچھ غذائیں ان کے پاس جو موجود تھیں، ان کا بھی ان کے سامنے سے ہٹ جانا، اور سب کو ہٹا کر اس شدید دماغی تشنگی کے وقت میں ان کے سامنے صرف قرآن اور مبلغ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا علم اور فن کے رنگ میں پیش ہونا اسی کی کمی بیشی پر سوسائٹی میں افراد کے مدارج کا قدرۃً مقرر ہو جانا، غور کرنے کی بات ہے کہ ایسے ماحول میں ہر چیز سے ٹوٹ کر ہمہ تن ان ہی دو

چیزوں میں اگر وہ ڈوب گئے تھے، تو آپ ہی اندازہ کیجئے کہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ ایسی حالت میں یقیناً یہی ہو سکتا تھا اور یہی ہو کر رہا بلکہ اسی کے ساتھ ہم جب اس واقعہ کو بھی ملا لیتے ہیں کہ فاقہ کش، غریب اور مفلس عرب جو اپنے ملک کے خاص حالات کے لحاظ سے ایامِ جاہلیت میں معاشی حیثیت سے انتہائی سخت کوشیوں کا شکار بنا ہوا تھا، تعیش و رفاہیت کی زندگی کا تو کیا ذکر ہے، ضروری معاشی رسد کی تکمیل میں بھی ان کو آسمان و زمین کے قلابے ملانے پڑتے تھے۔ ساری عمر عرب کے چٹیل ریگستانی اور سنگستانی صحراؤں میں بیچارے صرف اس لیے گھومتے رہتے تھے تاکہ دو وقت کی خشک روٹی خواہ کسی شکل میں ہو مل جائے اور وہ بھی بہ مشکل میسر آتی تھی، لیکن اسلام نے ایک طرف ان کے باطنی قویٰ اور ذہنی طلب میں یہ طوفان برپا کیا اور دوسری طرف پندرہ بیس سال کی مدت میں جسمانی اور معاشی مطالبوں کے لیے رسد کا ایک ایسا بے اتھاہ سمندر ان کے اس غیر آباد قلیل التعداد ملک میں ٹھاٹھیں مارنے لگا' سچ یہ ہے کہ اس کی نظیر بھی عرب کے آسمانوں نے نہ اس سے پہلے دیکھی تھی اور نہ آج تک پھر وہ تماشا دیکھنا اسے نصیب ہوا۔ اُن خزائن اور دفائن، غنائم اور نفل کے سوا جو قرنہا قرن سے کسریٰ ایران کے خزانے میں جمع ہو رہے تھے، یا وہ دولت جو زمینِ فرعون (مصر) سے یا ارضِ شام سے آئی تھی، ستون فی ستین (یعنی ساٹھ گز لمبا ساٹھ گز چوڑا) والا جواہر نگار بہار نامی ایرانی غالیچہ جس کے تمام نقش و نگار جن کا تعلق مختلف مناظر اور موسموں سے تھا، انمول جواہرات کے ذریعہ سے کاڑھے گئے تھے، کسریٰ کا وہ مرصع تاج جو اپنے قیمتی اور وزنی پتھروں کی وجہ سے بجائے سر پر رکھنے کے سونے کی زنجیر سے لٹکا دیا جاتا تھا اور کج کلاہ ایران اسی میں اپنا سر داخل کر دیتا تھا، کھجوروں کے تنہ پر مدینہ میں جو مسجد کھڑی تھی، اس میں یکے بعد دیگرے یہ سب کچھ ہر طرف سے چلا آ رہا تھا۔ خوارک کی رسد کا یہ حال تھا کہ عام رمادہ کے قحط میں حضرت عمرؓ نے مصر کے والی عمرو بن عاص کو غلہ کے لیے جب لکھا تو انہوں نے جواب دیا کہ اونٹوں کی ایسی قطار غلہ سے لاد کر پایہ تخت خلافت میں بھیجتا ہوں جس کا پہلا اونٹ مدینہ میں ہوگا اور آخری اونٹ کی دم میرے ہاتھ میں ہوگی۔ یہ سب تو وقتی دولت تھی، اصل چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ دس پندرہ سال کے عرصہ میں حجاز، یمن، یمامہ، بحرین، عراق، ایران، شام، مصر کے لاکھوں مربع میل کے جو علاقے فتح ہوئے، جن میں بجز حجاز کے تقریباً اکثر حصہ ثروت و دولت کا بے پناہ سرچشمہ تھا، مصر سے پہلا خط عمرو بن العاصؓ کا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام آیا تھا کہ ایک ایسی زمین پر خدا نے قبضہ دلایا ہے جو اچانک موتی کی طرح سفید اور پھر عنبر کی مانند سیاہ اور اسی کے بعد ہیرے کی مانند سرسبز ہو جاتی ہے۔ ان سارے علاقوں کا ایک بڑا حصہ اصحاب رسول اللہ ﷺ کی جاگیروں پر تقسیم کر دیا گیا تھا۔ کون اندازہ کر سکتا ہے کہ اموال غنیمت کے حصوں کے ساتھ ساتھ ہر صحابی کے گھر میں سالانہ کتنی دولت ان جاگیروں سے آتی تھی۔ تاریخوں میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ ذہبی نے لکھا ہے کہ عہدِ فاروقی تک پہنچتے پہنچتے مدینہ کے بازار کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ عہدِ نبوت میں گدھے کی قیمت پندرہ درہم تھی، اب وہ پندرہ سو میں ملتا تھا۔ بخاری کی مشہور روایت ہے کہ حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غابہ کی زمین جو مدینہ کے پاس ہے، کل ایک لاکھ ستر ہزار درہم میں مول لی تھی، لیکن ان کے بیٹے حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے جب فروخت فرمایا تو اس کی قیمت سولہ لاکھ ملی تھی۔ حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو اپنی داد و دہش کی وجہ سے مرنے کے وقت ایک پیسہ نہ چھوڑ سکے لیکن مکانات اور زمین کی شکل میں جو ان کی جائداد تھی،

Marfat.com

اس کی قیمت جیسا کہ بخاری میں ہے پچاس کروڑ دو لاکھ لگائی گئی تھی۔ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے انتقال کے وقت جو ترکہ چھوڑا اس کا حساب تو بہت طویل ہے لیکن فراخی وفراغبالی کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اپنے ثلث مال سے انہوں نے وصیت کی تھی کہ ہر بدری صحابی (جن کی تعداد اس وقت تقریباً ایک سو کے قریب رہ گئی تھی) چار چار سو دینار دیے جائیں۔ صحابہ اور صحابہ کی اولاد جو وہی عرب تھے، جن کے پاس ہزار کے اوپر عدد کے لیے کوئی لفظ ہی نہ تھا، لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں ایک ایک وقت میں صرف خیرات کرتی تھی، یا اپنے ملنے جلنے والے احباب و اعزہ کو دے ڈالتی تھی۔ عام تاریخی کتابوں میں بکثرت ان کی داد و دہش کے واقعات کا ذکر ہے، بخوف طوالت ان کی تفصیل ترک کی جاتی ہے۔

بہرحال مجھے حدیث کے ابتدائی رواۃ یا اس تاریخ کے ابتدائی مورخین کی دولت اور آمدنی کی تفصیل مقصود نہیں ہے، بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ گذشتۂ بالا حالات کے ساتھ جب ان کی معاشی فراغبالی کو بھی پیش نظر رکھا جائے اور پھر سوچا جائے کہ علم کی پیاس کی جو آگ اُن کے دل میں لگائی گئی تھی، اس کی تسکین کے لیے ان کے پاس کتنے وسیع مواقع قدرت نے مہیا کر دیے تھے، ہوسکتا تھا اور تھوڑے دنوں بعد ہو بھی گیا کہ مال و دولت کی اس فراوانی نے انہی صحابیوں کی دوسری اور تیسری پشت میں ان امیرانہ مشاغل کو پیدا کر دیا تھا، جو اس کے لازمی نتائج ہیں، لیکن ہم جن لوگوں سے بحث کر رہے ہیں، ان میں ایک ایسا روحانی اور اخلاقی انقلاب پیدا ہو چکا تھا کہ وہ اتنی آسانی کے ساتھ کردار کے اس بلند اسلامی معیار کو نہیں چھوڑ سکتے تھے جو آنحضرت ﷺ کی صحبت نے ان میں پیدا کر دیا تھا اور اس کی شہادت ان کی زندگی سے ملتی ہے، بجائے رنگ رلیوں کے ان کے مصارف وہی تھے، جو اسلام نے ان کے لیے مقرر کیا تھا، ہر ایک نیکی کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت کرتا تھا، وہی عبدالرحمن بن عوفؓ جن کا ذکر ابھی گذرا مشہور بات ہے کہ اپنے ذاتی روپے سے خرید خرید کر انہوں نے تقریباً تیس ہزار غلاموں کو آزاد کیا تھا اور ازیں قبیل سب ہی کا یہی حال تھا، صرف یہی نہیں بلکہ ان میں اکثر خصوصاً جن کا زیادہ میلان تعلیم قرآن اور تدوینِ حدیث کی طرف تھا، ان کی تمام جائدادوں اور مالی ذرائع کی نگرانی بھی قہرمانوں اور قیمون کے سپرد تھی، وہی وصول کرتے تھے اور وہی اس کا حساب کتاب رکھتے تھے، ان بزرگوں کو اپنے کام کے سوا اور کسی بات سے کوئی سروکار نہ تھا، حضرت ابن عباسؓ جو ''ترجمان القرآن'' ''حبرالامۃ'' وغیرہ عالمانہ القاب سے ملقب ہیں اور تدوینِ حدیث میں ان کا بھی بڑا حصہ ہے، ان کے ایک بھائی عبیداللہؓ کی طبیعت کا میلان تو جود وسخا کی طرف تھا۔ کہا جاتا ہے کہ معمولی معمولی باتوں پر ہزاروں روپے لوگوں کو دے دیے تھے، ایک شخص نے ان سے آ کر کہا کہ تم پر میرا حق ہے، بولے کیا۔ اس نے کہا تم چاہ زمزم پر پانی پی رہے تھے، چہرہ پر دھوپ پڑ رہی تھی، میں نے اپنی چادر سے سایہ کر دیا تھا۔ بولے ہاں تیرا احسان یاد ہے۔ قیم (داروغہ) کو آواز دی۔ پوچھا تیری تحویل میں اس وقت کتنی رقم ہے؟ دس ہزار درہم نقرئی اور دو سو طلائی دینار ہیں۔ اُس نے جواب دیا۔ حضرت عبیداللہؓ نے حکم دیا سب اس شخص کو دیدو اور یہ ان کا عام حال تھا لیکن وہی دولت جسے عبیداللہ اس طریقہ سے خرچ کرتے تھے، ان کے بڑے بھائی حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ علم کی نشر و اشاعت پر صرف فرماتے تھے۔ بخاری میں ان کے مشہور شاگرد ابو جمرہ سے مروی ہے کہ صرف اس لیے تا کہ ابن عباسؓ کی آواز دوسروں تک وہ پہنچایا

Marfat.com

کریں گے، حضرت نے اپنی آمدنی کا ایک حصہ ابو جمرہ کے لیے مخصوص فرما دیا تھا، اور یہ حال تو اس وقت کا ہے جب مسند درس پر جلوہ فرما ہو چکے تھے، لیکن یہی ابن عباسؓ باوجود اس ثروت و دولت کے اپنے طلبِ حدیث کے دنوں کو یاد کر کے فرماتے۔

کنت لاتی الرجل فی الحدیث یبلغنی انه سمعه من رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم فاجده قائلا فاتوشد ردائی علی بابه تسفی الریح التراب علیٰ وجهی حتیٰ یخرج فاذا خرج قال یا بن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم مالک فاقول بلغنی حدیث عنک انک تحدثه عن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم فاجبت ان اسمعه منک فیقول هلا بعثت الی حتی آتیک فاقول انا احق الیک (دارمی)

حدیث کے طلب میں میں کسی ایسے آدمی کے پاس آتا جن کے متعلق مجھے خبر ملتی کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے کچھ سنا ہے اور پاتا کہ وہ دوپہر میں آرام کر رہے ہیں، تو اپنی چادر کو تکیہ بنا کر ان کے دروازے پر پڑ جاتا، ہوا میں دھول اُڑا اُڑا کر میرے چہرے پر ڈالتیں اور میں اسی حال میں پڑا رہتا، تاآنکہ خود وہ آدمی باہر نکل آتے۔ باہر نکل کر (جب مجھے دیکھتے) تو کہتے تو رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے آپ کہاں تشریف لائے ہیں، میں کہتا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ حضور ﷺ سے تم کوئی حدیث روایت کرتے ہو، میں نے چاہا کہ اس حدیث کو تم سے سنوں، جواب میں وہ صاحب کہتے، آپ کسی کو بھیج دیے ہوتے، میں خود حاضر ہو جاتا، میں کہتا کہ تمہارے پاس حاضر ہونے کا مستحق میں ہوں۔

صحابۂ کرام اور ان کے تلامذہ تابعین تبع تابعین نیز دوسرے آئمہ اور بزرگوں نے اس فن کی تدوین میں کیا کیا مشقتیں برداشت کی ہیں، ان کا تفصیلی ذکر آگے آرہا ہے، اس مثال کے پیش کرنے کی غرض اس وقت صرف یہ تھی کہ دولت و امارت نے ان کو امیرانہ چونچلوں میں الجھا نہیں دیا تھا، بلکہ ان میں کتنے ایسے تھے جن کی آمدنی کا اکثر حصہ اسی علم کی خدمت میں صرف ہوتا تھا۔ مردوں ہی نہیں بلکہ عورتوں میں بھی اس علمی ولولہ کی یہ کیفیت تھی کہ معمولی معمولی عورتیں محض اس لیے کہ ان کا بچہ فنِ حدیث کا عالم ہو جائے، ہزار ہا روپے خرچ کر ڈالتی تھیں۔ اس موقع پر عہدِ صحابہ کا قصہ یاد آیا کہ فروخ نامی ایک معمولی آدمی تھے، آزاد شدہ غلاموں کے طبقہ سے ان کا تعلق تھا، غالباً فوج میں ملازم تھے، لیکن اس وقت مدینہ کی دولت کا یہ حال تھا کہ ادنیٰ ادنیٰ غلام سپاہی بھی تیس تیس چالیس چالیس ہزار دینار طلائی سکہ پس انداز کر سکتا تھا، تقریباً سیر کی اکثر کتابوں میں یہ واقع درج ہے کہ اپنا سارا اندوختہ بیوی کو سپرد کر کے وہ کسی نوکری پر طویل مدت کے لیے باہر چلے گئے۔ پندرہ بیس سال کے بعد واپسی ہوئی۔ جس وقت جا رہے تھے، ان کی بیوی حاملہ تھیں۔ عقب میں لڑکا پیدا ہوا۔ نام ربیعہ رکھا گیا۔ اس نیک دل خاتون کے علمی ذوق کا حال سنئے کہ انہوں نے شوہر کے سارے اندوختہ کو بچے کی تعلیم و تربیت پر ختم کر دیا اور اس زمانہ کی تعلیم کیا تھی، یہی قرآن و حدیث کی خدمت۔ فروخ جب گھر واپس آئے، تو لڑکا جوان ہو کر نہ صرف عالم بلکہ مسجد نبوی کے حلقہائے درس کے ایک ممتاز ترین معلم کی حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ امام مالک، امام اوزاعی، سفیان ثوری جیسے لوگ جنہیں بعد کو امت میں امامت کا منصب عطا ہوا، وہ ان کے شاگردوں میں شریک تھے۔ فروخ باہر سے بھی چار پانچ ہزار روپیہ کما کر لائے تھے۔ دو تین دن کے بعد بیوی سے اپنے گذشتہ پس انداز کا حساب دریافت کیا۔ بولیں کہ سب کو میں نے گاڑ رکھا ہے، کچھ دم لے لو تو انہیں نکالوں لیکن

Marfat.com

ذرا کل تم صبح کی نماز کے بعد مسجد نبوی کے حلقہ ہائے درس میں گشت تو لگانا، دوسرے دن انہوں نے یہی کیا، ایک حلقہ میں پہنچے تو خدا کی قدرت نظر آئی کہ ان کے لڑکے کو چاروں طرف سے شاگردوں کا حلقہ گھیرے ہوئے ہے۔ خوشی کے مارے پھولے نہ سمائے۔ گھر پہنچے اور بیوی سے حال بیان کیا۔ بیوی نے کہا کہو روپیہ لینا چاہتے ہو یا ایسا عالم لڑکا۔ میں نے تمہارے روپیے اسی کی تعلیم پر خرچ کر دیے۔ فروخ نے اپنی بیوی کی تحسین کی۔

علم حدیث کی تفصیل و تدوین اشاعت و نشر میں عہدِ صحابہ اور اس کے بعد لوگوں نے کتنی حیرت انگیز مالی قربانیاں کی ہیں، اس کے لیے ایک مستقل مقالہ کی ضرورت ہے۔ میں اس وقت صرف دماغوں کو ادھر متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ منجملہ دیگر اسباب کے عہدِ صحابہ کی معاشی فراغبالی کو بھی دنیا کی تاریخ کے اس عجیب حصہ کی حفاظت میں غیر معمولی داخل ہے اور یہ سچ بھی ہے کہ جو کام۔

دو یار زیرک و زبادۂ کہن دومنے　　فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے

کے ماحول میں انجام پا سکتا ہے، ''چہ خورد بامداد فرزندم'' کے سوال کے ہتھوڑوں سے چور دلوں میں بجز خاص استثنائی صورتوں کے عموماً ایسے پراگندہ روزوں سے پراگندہ دماغی ہی کی توقع کی جا سکتی ہے؟

خصوصاً جو واقعہ خاص اس علم کے ساتھ پیش آیا ہے، اُس کے لیے تو یہ ہونا زیادہ ضروری تھا کہ چند گنے گنائے آدمیوں سے اس کا تعلق نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو استثنائی قانون کا ممکن تھا کہ ظہور ہوتا لیکن آپ کو آئندہ معلوم ہوگا کہ تاریخ کے اس بسیط اور مختصر حصہ کے بیان کرنے والوں کی تعداد لاکھوں سے متجاوز ہے، میرا مقصد یہ ہے کہ اب تک حدیث کے ابتدائی راویوں یعنی صحابۂ کرام کے کیفی حالات و خصوصیات سے میں بحث کر رہا تھا، لیکن اس تاریخ کو مورخوں کا جو مقداری امتیاز ہے، میرے خیال میں تدوینِ حدیث کے ''قدرتی عوامل'' میں غور و فکر کے لیے ان کو بھی کچھ کم اہمیت حاصل نہیں ہے، بلکہ ایک لحاظ سے تو یہ اس فن کی ایک ایسی امتیازی شان ہے جس کی نظیر فن تاریخ ہی میں نہیں دوسرے علوم میں بھی بہ مشکل مل سکتی ہے۔ ڈاکٹر اسپرنگر کا یہ مشہور فقرہ کہ ''کوئی قوم دنیا میں نہ ایسی گذری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا سا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو، جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے''۔

اسماء الرجال اور اس کی ضرورت کی تفصیل تو آگے آئے گی۔ میں اس وقت آپ کی توجہ اس ''تاریخ'' کے اساسی مورخوں کی تعداد اور ان کی مختلف نوعیتوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

حدیث کے ابتدائی راویوں کی تعداد

غور کیجئے! انصاف سے کہنا چاہئے کہ علمی دنیا کے ہاتھ میں آج تاریخ کا جتنا کچھ بھی سرمایہ ہے، وہی جس کی تعلیم و تعلم پر جامعات اور یونیورسٹیوں میں اور نشر و اشاعت، تدوین و ترتیب پر، تصنیف گاہوں اور مطابع و اشاعتی اداروں میں حکومتوں اور عام پبلک کی جانب سے بلا مبالغہ ہر سال کروڑ ہا کروڑ روپے صرف ہو رہے ہیں، اور ان تمام مصارف کا شمار بہترین علمی خدمتوں میں ہے، اور بلاشبہ یہ بہت بڑی علمی خدمت ہے لیکن تھوڑی دیر کے لیے اپنے اس

Marfat.com

علمی وفنی سرمایہ کا جائزہ لیجئے۔ قدیم ہو یا جدید، تاریخ کے کسی حصہ پر اس حیثیت سے نظر ڈالیے کہ ابتداء میں ان واقعات کے بیان کرنے والوں، یا ان کو ریکارڈ کرنے والوں کی تعداد کیا تھی؟ قطع نظر اس سے جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا کہ واقعات کے عینی شاہدوں کا ان تاریخوں میں بجائے خود ایک پیچیدہ ترین سوال ہے اور بالفرض اگر خوش قسمتی سے تاریخ کا کوئی حصہ ایسا مل بھی جائے جسے ہم خود چشم دید گواہوں کا بیان قرار دے سکتے ہوں اور اسی کے ساتھ یہ بھی مان لیا جائے کہ ہمیں ان کی دماغی اور اخلاقی منزلت کا بھی کسی نہ کسی ذریعہ سے علم حاصل ہو گیا ہو، اگرچہ جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ کوئی آسان مرحلہ نہیں ہے، تاہم مان لیجئے کہ اس میں کامیابی ہو بھی جائے پھر بھی جہاں تک میرے معلومات ہیں اور میرا اندازہ ہے ان تاریخوں کے ابتدائی راویوں کی تعداد بہ مشکل ایک دو سے آگے متجاوز ہو سکتی ہے۔ آخر ہماری تاریخوں کی آج جو کچھ بھی بنیاد ہے وہ کوئی پرانے زمانہ کی کسی پرانے مصنف کی کوئی یادگار، پرانی قبروں کا کوئی کتابہ، پرانے سکوں کے ٹھپے، پرانے کھنڈروں کی کوئی سنگی یا برنجی تختی یا ازیں قبیل کوئی اور چیز، یقینی سے یقینی تر چیز، کسی شخص کی ذاتی خودنوشت سوانح عمری ہو سکتی ہے، اس احتمال کے سوا کہ اس قسم کی بیوگرافیاں کیا موجودہ زمانہ کے مینو فسٹی بیانات نہیں ہو سکتیں اور مان لیا جائے کہ ان میں گفتنی کے ساتھ تمام ناگفتنیوں کے اندراج کا بھی التزام کیا گیا ہو، یا یوں کہئے کہ صاحبِ شعر و دیوان ہونے کی حیثیت کے ساتھ محلّہ والوں [۵] کے معلومات بھی اس میں بیان کئے گئے ہوں اور جن کے کردار و سیرت کے متعلق ہمارے پاس کوئی شہادت موجود نہ ہو، ہر قسم کے وسوسے ان کے متعلق پیدا ہو سکتے ہیں، لیکن ان سب سے بھی اگر قطعِ نظر کر لیا جائے تو جب بھی اسی یقینی ترین تاریخی سرمایہ و خودنوشت سوانح عمری کی حیثیت ایک شخصی بیان ہی کی ہو سکتی ہے، اخلاقی اطمینان کے باوجود ایک شخصی دماغ پر نسیان و ذہول، بھول چوک کی راہیں جتنی کھلی ہوئی ہیں، ظاہر ہے۔

لیکن اب آیئے تاریخ کے اس نادرۂ روزگار حصہ پر نظر ڈالئے جس کا نام ''حدیث'' ہے۔ جن چشم دید گواہوں اور عینی شاہدوں کے بیانات سے یہ ''واقعات'' حاصل کئے گئے ہیں، ان کی تعداد کیا تھی۔ ابھی سلسلۂ روایت کے بعد کی کڑیوں سے بحث نہیں، بلکہ آپ کے سامنے اس کا صرف پہلا حلقہ یعنی ان لوگوں کا سوال ہے، جو خود اس واقعہ میں شریک تھے۔ انہوں نے اس کو دیکھا اور اس نظر سے دیکھا جس سے ہر معمولی واقعہ نہیں دیکھا جاتا، بلکہ ایک امتی جس نظر سے اپنے پیغمبر کو یا ایک مرید اپنے پیر کو یا صاف لفظوں میں کہئے، محمد رسول اللہ ﷺ کے عجیب و غریب صحابیوں نے محمد رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ دیکھنے کے بھی وہ ذمہ دار تھے اور بیان کرنے کے بھی ذمہ دار تھے۔ جانتے ہیں کہ ان کی تعداد کیا تھی۔ علی بن ابی زرعہ جو فنِ رجال کے بڑے مشہور ائمہ میں ہیں، سے یہی سوال پوچھا گیا، جواب میں انہوں نے فرمایا،

تو فی النبی صلی اللہ علیہ و سلم و من رأہ و سمع منہ زیادۃ علیٰ مائۃ الف انسان من رجلٍ و امرأۃٍ کلھم قد روی عنہ سما عادرویۃ. (اصابہ۔ص۳ جلد۱)

آنحضرت ﷺ کی وفات جس وقت ہوئی، اس وقت ان لوگوں کی تعداد جنہوں نے حضور ﷺ کو دیکھا اور آپ سے سنا تھا، ایک لاکھ سے زیادہ تھی، ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی، سب حضور ﷺ سے سُن کر اور دیکھ کر روایت کرتے تھے۔

Marfat.com

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ابنِ ابی زرعہ نے یہ صحابیوں کی تعداد نہیں بتائی ہے، بلکہ ان خاص اصحاب کی تعداد ہے، جنہوں نے حضور ﷺ کو دیکھا اور دیکھنے کے بعد آپ کے متعلق کوئی نہ کوئی بات روایت کی ہے۔ ''حدیث'' تاریخ کے جس حصہ کی تعبیر ہے، اس کے ابتدائی رواۃ کی یہ تعداد کیا کوئی معمولی بات ہے؟ عموماً اس کو سُن لیا جاتا ہے اور لوگ گذر جاتے ہیں لیکن مقابلہ سے بات سمجھ میں آتی ہے۔ ایک طرف آپ کے سامنے تاریخ کا وہ ذخیرہ ہے جس کے ابتدائی راویوں کا حال اگر معلوم بھی ہوسکتا ہے تو ان کی تعداد دو تین سے آگے بہ مشکل متجاوز ہوسکتی ہے اور بیچاری ایک تاریخ کیا بڑے بڑے مذہبی مستندات جن کے بھروسہ میں آج کروڑ ہا کروڑ انسان ایمانی زندگی بسر کر رہے ہیں، زیادہ تر ان کا بھی یہی حال ہے۔ خیال تو کیجئے کہ کہاں ایک لوقا[9] ایک مرقس یا ایک سنجے گاڑیبان کا بیان، اور کہاں یہ ایک لاکھ سے اوپر چشم دید گواہوں کی شہادتیں۔ پھر یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ عام تاریخی واقعات جیسا کہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں پراگندہ اور منتشر کثرتوں کا مجموعہ ہیں، لیکن ان میں بکھری ہوئی کثرتوں کے سمیٹنے والے ایک دو، ادھر ایک شخصی ذات محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے، جن کی سچی اور ہو بہو جیسے کہ وہ تھے، ان کی تصویر اتارنے کے لیے اردگرد لاکھوں زندہ آنکھوں کے کیمرے قدرت کی جانب سے کھڑے کئے گئے ہیں،

چہ نسبت خاک را باعالمِ پاک

راویوں کی تعدادی مقدار کے روایت پر کیا کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں؟ بادنیٰ تامل ہم اسے سمجھ سکتے ہیں۔

کثرتِ تعداد کا روایتوں کی وثاقت پر اثر

سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ ایک یا دو آدمی سے ظاہر ہے کہ اتنے واقعات کا احاطہ یقیناً ناممکن ہے جو مشاہدہ کرنے والوں کی کثرت کی صورت میں ممکن ہے، پھر اسی کے ساتھ جب اس کو بھی ملا لیتے ہیں کہ ان راویوں میں صرف مرد ہی نہیں بلکہ عورتوں کی ایک بڑی جماعت شریک ہے، تو احاطہ کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو جاتا ہے۔ اگر آنحضرت ﷺ کی زندگی کے مؤرخین صرف مرد ہوتے تو اس کا یہ مطلب ہوتا کہ ہم تک حضور ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے محض وہی واقعات پہنچے ہیں جن کا تعلق گھر کے باہر کی زندگی سے ہے، لیکن بجائے جلوت کے خلوت یا گھریلو زندگی کے حالات پر یقیناً پردہ پڑا رہتا اور ایسے بہت سے مسائل جن کا خصوصی تعلق صرف عورتوں سے ہے، ان کے متعلق کوئی واضح ہدایت نامہ ہمارے پاس نہ ہوتا، لیکن کون نہیں جانتا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا ہر پہلو جلوت کا ہو یا خلوت کا کسی کو راز میں نہیں رکھا گیا، راویوں کی کثرت اور ان کی مختلف نوعیتوں ہی کا نتیجہ ہے کہ دوست ہی نہیں آج دشمن بھی اس کے اعتراف پر مجبور ہیں کہ

''یہاں پورے دن کی روشنی ہے جو ہر چیز پر پڑ رہی ہے اور ہر ایک تک وہ پہنچ سکتی ہے۔''

یہ باسورتھ اسمتھ کی شہادت ہے، جس کا اظہار اس نے آنحضرت ﷺ کی سیرت (ص ۱۰۸) میں کیا ہے اور اسی کے ساتھ یہ نکتہ بھی اگر ملحوظ رکھا جائے کہ باہر میں ہو یا اندر میں قدرت نے ایسے اسباب فراہم کر دیے تھے کہ

Marfat.com

صحرائے عرب کے ایک دور افتادہ نخلستانی قصبہ میں تقریباً دنیا کے بڑے بڑے قابلِ ذکر مذاہب یعنی بت پرستی، یہودیت، عیسائیت، مجوسیت کے ماننے والوں کو مسلمان کر کے حق تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کی صحبتِ مبارک میں پہنچا دیا تھا۔ آنحضرت ﷺ کی اصلاحی و تکمیلی زد یں دنیا کے تمام مذاہب پر جو پڑ رہی تھیں، اس کے سمجھنے کے لیے خود ان مذاہب کے جاننے والوں کی ضرورت تھی، اور قدرت نے اس کا بھی سامان کر دیا تھا، باہر میں بھی اور اندر میں بھی، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے اور عام طور پر لوگ اس سے واقف بھی ہیں۔ عملی طور پر ان عینی شاہدوں کی کثرت کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ قطع نظر اس سے کہ ایک واقعہ کے جب بہت سے دیکھنے والے ہوتے ہیں، تو ہر ایک دوسرے کی تکذیب کے خیال سے عموماً غلط بیانی کرنے میں ہچکچاتا ہے، اگرچہ صحابۂ کرام کے جن خصوصیات کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے اور یوں بھی ان سے قصداً کسی غلط بیانی کی کون توقع کر سکتا ہے، لیکن جیسا کہ قرآن نے قانون شہادت کے ذکر کے سلسلہ میں بیان کیا ہے کہ ایک گواہ کے سمجھنے یا یاد رکھنے میں اگر کوئی غلطی ہوئی ہو، تو دوسرا اس کی اصلاح کر سکتا ہے۔ حدیث کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ ایک موقع پر نہیں بلکہ متعدد مواقع اس قسم کے پیش آئے ہیں، جہاں راویوں کی کثرتِ تعداد کی وجہ سے غلط فہمیوں کی اصلاح ہوئی ہے۔ میرا مضمون بہت طویل ہو جائے گا، ورنہ ان کے نظائر جن سے معمولی طلبہ تک واقف ہیں، یہاں پیش کرتا۔

ماسوا اس کے صحابی راویوں کی جو تعداد ابن ابی زرعہ کے حوالے سے میں نے اوپر نقل کی ہے، ظاہر ہے کہ صحبتِ مبارک میں ان سب کا اجتماع ایک وقت میں نہیں ہوا اور نہ یہ ممکن تھا کہ ہر لمحہ ہر جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ یہ سارا مجمع رہتا، اگرچہ الوداع کے موقع پر تقریباً لاکھ سے اوپر صحابیوں کا مجمع جمع ہو گیا تھا، لیکن یہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے ورنہ عموماً مدینہ منورہ میں جو تعداد صحابہ کی رہتی تھی، یا غزوات و اسفار میں جو لوگ آپ کے ساتھ ہوتے تھے ان کی ظاہر ہے کہ اتنی تعداد کبھی اکٹھی نہیں ہوئی۔ بیس ہزار، دس ہزار، پانچ ہزار، تین ہزار، چار ہزار یا اس سے نیچے کی تعداد فوجی مہموں میں حضرت ﷺ کے ساتھ عموماً رہی ہے، اگرچہ مدینہ منورہ میں ابتداً انصار کے ساتھ مہاجرین کا ایک مختصر گروہ آپ کے ساتھ تھا، لیکن جس وقت غزوۂ تبوک کا واقعہ پیش آیا ہے، کعب بن مالک جو اس سفر میں رفاقت سے محروم رہے تھے اور اس کا ایک دلچسپ واقعہ بخاری میں انہی کی زبانی منقول ہے' اس میں مدینہ کے اصحاب کا ذکر فرماتے ہوئے آپ نے یہ جملہ فرمایا تھا،

والناس کثیر لا یحصیه دیوان

لوگ بکثرت تھے، کسی دفتر میں ان کی تعداد منضبط نہ تھی۔

بہر حال مدینہ منورہ میں بالآخر اچھی خاصی جماعت باہر کے مہاجرین کی بھی جمع ہو گئی لیکن ظاہر ہے کہ ان سب کو ہر وقت اپنے مختلف مشاغل کی وجہ سے مجلسِ مبارک میں حاضری میسر نہیں آتی تھی۔ کسی وقت کوئی رہتا تھا، کسی وقت کوئی۔ اب اگر راویوں کی تعداد دو چار پر ختم ہو جاتی، تو کیا وہ ذخیرہ جمع ہو سکتا تھا، جو آج جمع ہوا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ گرد و پیش میں ان ہزاروں مردوں اور عورتوں کے رہنے آنے جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ایک کو حضور ﷺ کی زندگی کے کسی نہ کسی واقعہ یا کسی قول کے محفوظ کرنے کا موقع ملا اور اپنی مذکورۂ بالا ذمہ داریوں کی بنیاد پر بعض لوگوں نے تو یہ

Marfat.com

عام قاعدہ مقرر کرلیا تھا کہ اپنی حاضری کے دنوں میں اس عجیب وغریب شخصی تاریخ کے متعلق جن واقعات کا علم حاصل ہوتا تھا، دوسرے دن اپنے غائب رفیق کو من وعن سنا دیا کرتے تھے۔ بخاری میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

كنت انا وجارلي من الانصار في بني امية بن زيد وهي من عوالي المدينة و كنا نتنا وب النزول على رسول الله ﷺ ينزل يوما و انزل يوما فاذاانزلت جئة بخبر ذلك اليوم من الوحي وغيره واذا نزل فعل مثل ذلك

میں اور میرا ایک انصاری پڑوسی، ہم دونوں امیہ بن زید والوں کی بستی میں رہتے تھے، اور مدینہ کے عوالی کی یہ بھی ایک بستی ہے، اور ہم دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں باری باری سے حاضر ہوتے تھے، ایک دن وہ حاضر ہوتے، ایک دن میں حاضری دیتا، میں جس دن حاضر ہوتا اس دن کے حالات اور خبریں وحی وغیرہ کی ان کو سناتا اور جب وہ حاضر ہوتے تو یہی کرتے۔

ابتدائے اسلام میں محدود معاشی ذرائع ہونے کا یہ لازمی نتیجہ تھا، مہاجرین بیچاروں کو اپنے اپنے اہل وعیال کی پرورش کے لیے عموماً بیوپار یا صنعتی کاروبار میں مشغول ہونا پڑتا تھا، جس کا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ذکر کیا۔ یہاں آپ کی نگرانی میں کپڑے بُننے کی کارگاہیں تھیں۔ سخ نامی گاؤں میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کارخانہ تھا، انصار عموماً اپنے باغوں اور کھیتوں پر کام کرتے تھے، لیکن بااِیں ہمہ ایک جماعت ان لوگوں کی بھی تھی جو اپنے اور گھر سے جدا ہو کر نومسلموں کے لیے آنحضرت ﷺ نے مسجد نبوی میں صفہ نامی جو مدرسہ قائم فرمایا تھا، اس میں داخل ہو جاتے تھے، ان کے قیام وطعام کا نظم خود آنحضرت ﷺ یا مدینہ کے خوش باش لوگ کیا کرتے تھے، اس لیے معاشی افکار سے الگ ہو کر ان کا زیادہ کام یہی تھا کہ قرآن سیکھیں اور آنحضرت ﷺ کے اقوال وسنن کو یاد کریں۔ اسی جماعت کے سرکردہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، جو ذخیرۂ حدیث کے سب سے بڑے راوی ہیں، لوگوں کو ان کی کثرتِ روایت پر کبھی تعجب ہوتا تو خود ہی فرماتے

انكم تزعمون ان ابا هريرة يكثر الحديث عن رسول الله ﷺ و الله الموعداني كنت امرءً مسكيناً اصحب رسول الله ﷺ علىٰ ملاء بطني و كان المهاجرون يشغلهم الصفق بالا سواق و كانت الا انصار يشغلهم القيام على اموالهم. (بخاری)

تم لوگ خیال کرتے ہو کہ ابوہریرہ رسول اللہ ﷺ سے زیادہ حدیثیں بیان کیا کرتا ہے اور قسم ہے خدا کی کہ میں ایک غریب مسکین آدمی تھا، رسول اللہ ﷺ کے پاس صرف پیٹ پر پڑا رہتا تھا اور مہاجرین بازاروں کے کاروبار میں مشغول رہتے اور انصار اپنے اموال (باغ اور کھیت) میں اُلجھے رہتے۔

ایک دوسرے موقع پر یہ بیان کرتے ہوئے کہ اس سلسلہ میں وہ کیا کرتے تھے، خود تفصیل فرماتے ہیں۔

قدمت على رسول الله ﷺ بخيبر و انا يومئذٍ قدزدت على الثلثين فاقمت معه حتىّٰ مات و ادور معه بيوت نسائه و اخدمه اغز و معه و احجّ۔ (ابن سعد)

میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بہ مقام خیبر حاضر ہوا اس وقت میری عمر تیس سال سے اوپر ہو چکی تھی، پھر میں نے حضور ﷺ

Marfat.com

کے پاس قیام کرلیا، یہاں تک کہ آپ کی وفات ہوگئی، میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ آپ کی عورتوں کے گھروں میں گھوما کرتا اور آپ کی خدمت کرتا، حضور ﷺ کے ساتھ جہاد کرتا، حج کرتا رہا۔

طالب العلمی کے ان دنوں میں ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر کیا کیا گذری بعد کو مزے لے لے کر بیان کرتے۔ کبھی کہتے جیسا کہ امام بخاری راوی ہیں،

واللہ الذی لا الہ الا ھو ان کنت لا عتمد علی الارض بکبدی من الجوع واشدّ الحجر علیٰ بطنی

اسی خدا کی قسم جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے کہ بھوک کی وجہ سے میں جگر تھام کر زمین پر ٹیک لگالیتا اور اپنے پیٹ پر پتھر باندھتا۔
کبھی فرماتے:

رائیتنی اصرع بین منبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم و حجرۃ عائشۃ فیقال مجنون و ما بی جنون ان ھی الا الجوع. (صحاح)

آنحضرت ﷺ کے منبر اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حجرہ کے درمیان میں چکرا کر گر پڑتا، خیال کیا جاتا کہ میں پاگل ہوں، حالانکہ مجھے جنون سے کیا تعلق۔ وہ تو صرف بھوک کا اثر تھا۔

مگر یہ سب کچھ گذر رہا تھا، دوسرے ساتھیوں کو یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ کاروبار کر کے آرام اٹھا رہے ہیں، لیکن تیس بتیس سال کا یہ دوسی یمنی نوجوان

موجِ خون سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا

کہہ کر بیٹھ گیا تھا اور اس وقت تک بیٹھا رہا جب تک کہ حتی توفی رسول اللہ ﷺ اور اس قسم کے یہ ایک آدمی نہیں ہیں، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جن کا خطاب ہی صحابہ کی جماعت میں صاحب ﷺ النعلین و السواک والوساوہ تھا، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ ہم جب یمن سے آئے تو ابن مسعودؓ کے متعلق مدت تک ہم سمجھتے رہے کہ

انہ رجل من اھل بیت رسول رسول اللہ ﷺ لمانری من دخولہ و دخول امہ علی النبی ﷺ. (اصابہ)

وہ رسول اللہ ﷺ کے گھر کے کوئی آدمی ہیں، جس کی وجہ ان کی اور ان کی ماں کی آمد و رفت تھی جو آنحضرت ﷺ کے پاس آتی رہتی تھی۔

ان کو دربار رسالت سے یہ حکم ملا ہوا تھا کہ

علی ترفع الحجاب و تسمع سوادی

تم ابن مسعود! پردہ کو اُٹھا کر میرے حجرہ میں آسکتے ہو، اور تنہائی کی گفتگو سن سکتے ہو۔

اسی طرح حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جو ۹ سال تک مسلسل آنحضرت ﷺ کی خانگی خدمت میں رہے اور ان کے سوا بھی حضور ﷺ کے موالی مثلاً رفع بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں، جو بہت کم مجلسِ رسالت کی حاضری

Marfat.com

سے محروم رہتے تھے، یہ تو مردوں میں اور عورتوں میں یہی حال امہات المومنین کا تھا، جن میں کوئی نہ کوئی خلوت کی زندگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتی تھیں، ان ہی باتوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ صحابہ میں جن لوگوں کو آنحضرت ﷺ کے متعلق جن امور کا علم براہِ راست حاصل نہ ہوتا تھا وہ ان کو اپنے دوسرے بھائیوں اور ساتھیوں کے ذریعہ سے معلوم کر لیا کرتے تھے، اور اس میں بڑے اور چھوٹے کی بحث نہیں تھی، خود حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ

كانوا يعرفون لزومى فيسا لونى عن حديثه منهم عمر و عثمان و على و طلحة والزبير. (ابنِ سعد)

آنحضرت ﷺ کے ساتھ میری وابستگی کا حال لوگوں کو چونکہ معلوم تھا اس لیے حضور ﷺ کی حدیثیں مجھ سے پوچھا کرتے، ان پوچھنے والوں میں عمر بھی ہیں، اور عثمان بھی، علی بھی، طلحہ بھی، زبیر بھی۔

حدیث کی کتابوں میں اس کا ایک ذخیرہ موجود ہے، جس میں خلفائے راشدین اور دوسرے جلیل القدر اصحاب نے باہم ایک دوسرے سے آنحضرت ﷺ کی حدیث پوچھی ہے۔ مردوں میں اگر پتہ نہیں چلتا، تو امہات المومنین کے پاس آدمی بھیجا جاتا کہ ان کو اگر کوئی علم ہو تو بیان کریں۔ ایک دن حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کا ابھی ذکر گذرا، حالانکہ ۹ سال تک صحبتِ نبوی میں ان کو ہمہ وقتی رفاقت کا موقع ملا ہے لیکن ایک حدیث بیان کر رہے تھے کہ حلقہ کے لوگوں میں سے کسی نے پوچھا۔

انت سمعته من رسول اللّٰه ﷺ

کیا آپ نے اس حدیث کو آنحضرت ﷺ سے سنا ہے؟

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب میں فرمایا:

ماكل مانحدثكم به سمعناه من رسول اللّٰه ﷺ و لكن كان يحدث بعضنا بعضا. (مستدرک حاکم)

ہم تم سے آنحضرت ﷺ کی جو باتیں بیان کیا کرتے ہیں، سب خود حضور ﷺ ہی سے ہم نے نہیں سنا ہے، بلکہ ہم میں بعضوں نے بعض سے سُنا ہے، (یعنی ایک صحابی نے دوسرے صحابی سے سنا ہے)

اور یہ بھی تھا بہت بڑا عظیم نفع حضرات صحابہ کی کثرتِ تعداد کا ہر ایک اپنی کمی دوسرے کے علم سے پوری کرتا تھا۔ اپنے علم کی تکمیل کے شوق ہی کا نتیجہ یہ تھا کہ تابعین یا اصاغر صحابہ ہی کے زمانہ میں نہیں، بلکہ خود باہم ایک صحابی نے دوسرے صحابی سے اپنے علمی نقص کی تکمیل کے لیے کبھی کبھی لمبے لمبے سفر کیے ہیں اور قرآن نے جس اسوۂ حسنہ کی کامل اتباع اور پیروی کا ان سے جو مطالبہ کیا تھا، اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا بھی چاہیے تھا۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کا گھر مدینہ ہی میں تھا اور خاص طور پر حدیث کے مشہور سرمایہ داروں میں ان کا شمار ہے جیسا کہ آگے بیان ہوگا، خود بیان کرتے ہیں کہ

بلغنى حديث عن رجل من اصحاب النبى ﷺ فابتعت بعيراً فشد دت عليه دخلى ثم سرت اليه شهراً حتى قدمت الشام فاذا عبداللّٰه بن انيس الا نصارى فاتيت منزله و ارسلت اليه ان جابراً على الباب فرجع الى الرسول فقال جابر بن عبداللّٰه فقلت نعم فخرج الى واعتنقته و اعتنقنى قال قلت

Marfat.com

حدیث بلغنی عنک انک سمعته من رسول اللہ ﷺ فی المظالم لم اسمعه انا منه قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول الحدیث. (جامع بیان العلم ابن عبدالبر، ص ۹۳)

آنحضرت ﷺ کے صحابیوں میں سے ایک صاحب کے واسطے سے مجھے حضور ﷺ کی ایک حدیث پہنچی، میں نے اسی وقت ایک اونٹ خریدا اور اس پر اپنا کجاوا کس کر ایک ماہ تک چلتا رہا، یہاں تک کہ شام پہنچا، اور عبداللہ بن انیسؓ انصاری (جن سے حدیث پہنچی تھی) ان کے گھر پہنچا۔ اندر آدمی بھیجا کہ دروازہ پر جابر کھڑا ہوا ہے، آدمی نے واپس ہو کر پوچھا کہ کیا جابر بن عبداللہ ہیں؟ میں نے کہا، ہاں۔ عبداللہ بن انیسؓ باہر نکل پڑے، دونوں ایک دوسرے کے گلے سے لپٹ گئے پھر اس نے پوچھا کہ مجھے آپ کے ذریعہ سے ایک حدیث پہنچی ہے، جسے آنحضرت ﷺ سے ''مظالم'' کے متعلق آپ نے سنی ہے، اور میں نہیں سن سکا ہوں، عبداللہ بن انیس نے جواب میں فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ فرماتے تھے (پھر عبداللہ نے پوری حدیث سنائی)

اس سے بھی زیادہ دلچسپ واقعہ مشہور صحابی حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدفون قسطنطنیہ[1] کا ہے کہ ایک حدیث انہوں نے آنحضرت ﷺ سے براہِ راست خود سنی تھی، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کچھ شک پیدا ہوا، آپ کے ساتھ اس حدیث کے سننے کے وقت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابی بھی دربارِ رسالت میں موجود تھے، لیکن وہ مصر میں قیام پذیر ہو گئے تھے، سن کر حیرت ہوگی کہ صرف ایک حدیث میں معمولی شک مٹانے کے لیے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ منورہ سے مصر روانہ ہوتے ہیں، اور حضرت عقبہ بن عامرؓ کے پاس حاضر ہو کر فرماتے ہیں،

حدثنا ماسمعته من رسول اللہ ﷺ فی ستر المسلم یبق احد سمعه غیری و غیرک

مجھ سے اس حدیث کو بیان کرو، جسے تم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمانوں کی عیب پوشی کے متعلق سنا ہے، اب اس حدیث کے سننے والوں میں میرے اور تمہارے سوا کوئی باقی نہ رہا۔

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے اس حدیث کو دہراتے ہیں، حدیث یہ تھی، من ستره مسلما علی خزیة ستره اللہ یوم القیامه وہ سنتے ہیں، اس کے بعد کیا ہوتا ہے وہ اس سے بھی عجیب تر ہے کہ

فاتی ابو ایوب راحلة فوکبها وانصرف الیٰ المدینة و ما حل رحله۔ (۹۴۔ جامع)

حضرت ابوایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی سواری کے پاس آتے ہیں، اور سوار ہوتے ہیں، مدینہ منورہ روانہ ہو جاتے ہیں، آپ نے مصر میں اپنا کجاوہ بھی نہ کھولا،

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کے نام نامی سے حدیث کا ابتدائی طالب علم بھی واقف ہے، ان کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ ''ان ابا سعید رحل فی حرف'' یعنی حدیث کے ایک حرف کی تصحیح کے لیے ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے باضابطہ کوچ کیا۔ دارمی میں ایک اور صحابی کے متعلق ہے۔

ان رجلاً من اصحاب النبی صلی اللہ علیه و سلم رحل الی فضالة بن عبد اللہ و هو بمصرِ فقدم علیه و هو یمد لناقة له فقال مرحبا قال اما انی لم آتک زائراً ولکن سمعت انا و انت حدیثاً من

Marfat.com

رسول اللہ ﷺ رجوت ان یکون عندک منه علم. (دارمی)

کہ آنحضرت ﷺ کے صحابیوں میں سے ایک صاحب فضالہ بن عبداللہ کے پاس مصر روانہ ہوئے اور وہ اپنی اونٹنی کا چارہ تیار کر رہے تھے۔ فضالہ نے صحابی کو دیکھ کر مرحبا کہا، صحابی نے جواب میں فرمایا کہ میں تمہاری ملاقات کو نہیں آیا ہوں لیکن ہم نے اور تم نے رسول اللہ ﷺ سے ایک حدیث سنی ہے، میں یہ امید لے کر آیا ہوں، کہ تم کو اس کا کچھ علم ہوگا،

یہ تو بڑے بڑے صحابیوں کا حال تھا، باقی ایسے کمسن اصحاب جو رسول اللہ ﷺ کی صحبتِ مبارک سے اتنا فائدہ نہ اٹھا سکے تھے، یا ان کے معاصر اور تلانده جنہیں تابعین کہتے ہیں، اس باب میں تو ان کے کارناموں کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں ہے۔ میں نے ذکر کیا تھا کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما باوجود قرابت رسول اللہ ﷺ کی عظمت کے صحابہ کے دروازوں پر تلاش حدیث میں گرد کھاتے پھرتے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ نے صحابہ کی کثرتِ تعداد کے اس فائدے کو محسوس کر لیا تھا کہ ان کے ذریعہ سے اپنی تاریخ کے تمام خط و خال کی تکمیل میں پوری مدد مل سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں اپنے ایامِ طلب کے قصے بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے ایک رفیق سے کہا کہ

هلم فلنسأل اصحاب النبی صلی اللّٰه علیه و سلم فانهم الیوم کثیر

چلو بھائی! ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں سے چل کر دریافت کریں، کیونکہ ابھی ان کی بڑی تعداد موجود ہے۔

لیکن ان کے رفیق بخت کے چھوٹے تھے، بولے،

یا ابن عباس اتری الناس یحتاجون الیک و فی الناس یحتا جون الیک و فی الناس من اصحاب النبی صلی اللّٰه علیه و سلم. (دارمی)

ابنِ عباس! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ لوگ تمہارے بھی محتاج ہوں گے، حالانکہ ابھی تو لوگوں میں رسول اللہ ﷺ کے بہت سے صحابی موجود ہیں۔

لیکن اس بیچارے کو کیا معلوم تھا کہ یوں ہی چھوٹے بڑوں کے گذرنے کے بعد بڑے بنتے ہیں، بعد کو اپنے علمی سرمایہ کی بدولت جب ابن عباسؓ مرجع انام بن گئے تو وہ بیچارے پچھتاتے تھے اور کہتے تھے کان هذا الفتیٰ اعقل منی (یہ نوجوان مجھ سے زیادہ دانشمند تھا)۔

تابعین میں سعید بن المسیب مسروق وغیرہ جن کے حالات آگے آرہے ہیں، ان کے بیانوں میں اس قسم کے واقعات بہ کثرت ملتے ہیں۔ حضرت سعید بن المسیب سے امام مالک راوی ہیں۔

انی کنت لا سیر اللیالی و الا یام فی طلب الحدیث۔ (الجامع)

حدیث کی تلاش میں کئی کئی دن اور کئی کئی راتیں مسلسل چلتا رہا ہوں۔

حضرت مسروق کے متعلق بھی بیان کیا جاتا ہے کہ رحل فی حرف (یعنی صرف ایک لفظ کے لیے کوچ کیا) ان تابعیوں کی نزاکتِ ذوق کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ بسا اوقات کوئی حدیث ان کو ایسے آدمی سے پہنچتی جو شرفِ صحبت سے فیض یاب نہ ہوتے، حالانکہ اس حدیث کا علم ان کو حاصل ہو چکا ہوتا لیکن اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ جس صحابی

Marfat.com

سے یہ روایت بیان کی جاتی ہے، وہ زندہ ہیں، تو خواہ وہ کسی مقام پر ہوتے، ان تک پہنچ کر کوشش کرتے کہ براہِ راست بھی اس روایت کو صحابی سے خود سن لیں۔ دارمی نے ابوالعالیہ سے یہ روایت درج کی ہے،

کنا نسمع الرّواية بالبصرة عن اصحاب رسول الله ﷺ فلم نرض حتی رکبنا الی المدينة فسمعنا ها من افواههم۔ (دارمی)

ہم لوگ بصرہ میں ایک روایت آنحضرت ﷺ کے صحابیوں سے سنے ہوئے سے سنتے، مگر ہم صرف اسی پر قناعت نہیں کر لیتے تھے، جب تک سوار ہو کر مدینہ پہنچ کر خود ان صحابیوں کی زبانی بھی اس روایت کو نہ سن لیتے۔

یہ کسی خاص شخص کا حال نہیں ہے، بلکہ عام تابعین کے طرزِ عمل کا بیان ہے۔

طلب حدیث کے لیے رحلت کا ایسا عام مذاق پھیل گیا تھا کہ بطور امورِ عامہ کے بعض بعض تابعین کی زبان پر یہ لطیفہ جاری ہو گیا، یعنی شاگردوں سے حدیث بیان کرتے اور آخر میں انہیں مخاطب کر کے بطور طیبت کے فرماتے،

خذها بغير شيءٍ قد كان الرجل يرحل فيما دونها الی المدينة۔ (ابن سعد)

بغیر کسی معاوضہ کے (مفت) یہ حدیث لے لو، اور نہ حال یہ تھا کہ اس سے بھی کم چیز کے لیے لوگ مدینہ تک سفر کرتے تھے۔

یہ حضرت شعبی کا قول ہے جو کوفہ میں اپنے طلبہ سے مزاحاً کبھی کبھی کہا کرتے تھے۔

مذکورۂ بالا عوامل و مؤثرات سچ پوچھئے تو بجائے خود ان میں ہر ایک حدیث یعنی تاریخ کے اس عجیب و غریب سرمایہ کی حفاظت کی کافی ضمانت ہے، لیکن جہاں یہ سارے اسباب اکٹھے ہو گئے ہوں اور اب اسی کے ساتھ آپ اس عام تاریخی دعویٰ کو بھی اپنے سامنے رکھ لیجئے، کہ

مذهب العرب انهم كانوا مطبوعين علی الحفظ مخصوصين بذلک۔ (جامع)

عرب کا عام طریقہ تھا کہ زبانی یاد رکھنے کی کچھ ان کی فطری عادت سی تھی، اس بات میں ان کو خاص خصوصیت حاصل تھی۔

عرب کا بدو کتابوں کے طومار کو دیکھ کر مذاق اڑاتا تھا۔ بدوؤں کا یہ عام چلتا ہوا فقرہ تھا، حرف فی تامورک خير من عشرة في كتبک (دل میں ایک حرف کا محفوظ رہنا کتابوں کی دس باتوں سے بہتر ہے)

عرب کا مشہور شاعر کہتا ہے ؎

لیس بعلم ما حوی القمطرا ما العلم الا ما حوی الصدرا
علم وہ نہیں ہے جو کتابوں میں درج ہے نہیں ہے علم لیکن صرف وہی جو سینہ میں محفوظ ہو

دوسرا کہتا ہے: ؎

استودع العلم قرطاسا فضيعه وبئس مستودع العلم القراطيس
جس نے علم کو کاغذ کے سپرد کیا، اس نے اسے ضائع کیا علم کے بدترین مدفن کاغذ ہیں

تیسرے کا شعر ہے: ؎

علمي معي حيث ما يممت احمله بطني وعاء له لا بطن صندوق

Marfat.com

میرا علم میرے ساتھ جہاں جاتا ہوں اسے اٹھائے لیے جاتا ہوں — میرا اندر اس علم کا برتن ہے کہ شکم صندوق

ان کنت فی البیت کان العلم فیہ معی — اذا کنت فی السوق کان العلم فی السوق

اگر گھر میں رہتا ہوں تو علم میرے ساتھ رہتا ہے — جب بازار میں ہوتا ہوں تو میرا علم بھی بازار میں ہوتا ہے

کم از کم ان اشعار سے اس قوم کے خاص رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ لکھنے اور کتابت کے متعلق شاید ہی کسی زبان میں اس قسم کے اشعار مل سکتے ہیں۔ سوسائٹی کے اس خاص مذاق کا یہ نتیجہ تھا کہ قدرتی طور پر ان کو اپنے حافظہ پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا۔ قاعدہ ہے کہ انسان اپنی جس قوت کو زیادہ استعمال کرتا ہے اسی میں جلا پیدا ہو جاتی ہے، مختلف اقوام کی مختلف چیزوں کے ساتھ خاص مناسبت کی یہی وجہ ہے، اسی لیے یہ مسلم ہے کہ ان العرب قد خصت بالحفظ (عرب حافظہ کی قوت میں خصوصیت رکھتے تھے) ان کے حافظہ کی قوت کے جو واقعات کتابوں میں درج ہیں، کتابی قوموں کے لیے حقیقت یہ ہے کہ ان کا باور کرنا دشوار ہے۔ حافظ عمر بن عبدالبر لکھتے ہیں،

کان احدھم یحفظا اشعار — ان میں بعض لوگ صرف ایک دفعہ سن کر

بعض فی سمعة واحدة — لوگوں کے اشعار یاد کر لیا کرتے تھے۔

ابن عباسؓ کے متعلق مشہور ہے کہ ان کے سامنے عمر بن ابی ربیعہ شاعر آیا اور ستّر شعر کا ایک طویل قصیدہ پڑھ گیا۔ شاعر کے جانے کے بعد ایک شعر کے متعلق کچھ گفتگو چلی۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ مصرعہ اس نے یوں پڑھا تھا۔ جو مخاطب تھا، اس نے پوچھا کہ تم کو پہلی دفعہ میں کیا پورا مصرعہ یاد رہ گیا، بولے کہو تو پورے ستّر شعر سنا دوں اور سنا دیا۔ حدیث کے مشہور راوی امام زہری کا بیان لوگ نقل کرتے ہیں کہ

انی لا مر بالبقیع فاسد آذا نی مخافة ان یدخل فیھا شیئی من الخنا فو اللہ ما دخل اذنی شی قط فنسیة۔ (ابن عبدالبر)

میں ''بقیع'' کی طرف گذرتا ہوں اور اپنے کانوں کو بند کر لیتا ہوں اس اندیشہ سے کہ اس میں کوئی بُری خراب بات نہ داخل ہو جائے، کیونکہ قسم خدا کی میرے کان میں کوئی بات اب تک ایسی داخل نہیں ہوئی ہے، جسے میں بھول گیا ہوں۔

شعبی بھی یہی کہتے تھے:

ما کتبت سوداء فی بیضاء و ما استعدت حدیثا من النسیان۔ (ابن سعد)

میں نے کبھی سیاہی سے سفیدی پر کچھ نہیں لکھا اور نہ کسی شخص کی گفتگو میں نے کبھی بھولنے کے باعث دہرائی۔

غیروں پر تو حجت نہیں ہو سکتی، لیکن علمائے اسلام کا خیال ہے کہ علاوہ اس کے کہ عرب کا حافظہ کچھ قدرتی طور پر غیر معمولی تھا، یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ قرآن مجید کے متعلق جس نے ''انا له لحافظون'' کا اعلان کیا تھا، اسی قوت نے قرآن کی عملی شکل یعنی رسول اللہ ﷺ کی زندگی کی حفاظت جن کے سپرد کی تھی، ان کے حافظوں کو غیبی تائیدوں کے ذریعہ سے بھی کچھ غیر معمولی طور پر قوی تر کر دیا تھا، اور یہ تو بخاری میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے

Marfat.com

دربارِ رسالت میں نسیان کی جب شکایت کی تو آنحضرت ﷺ نے اپنی خاص توجہ اور دعا کے ذریعہ سے ان کے حافظہ کو ایسا بنا دیا تھا کہ پھر وہ کوئی چیز بھول نہیں سکتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ روایت تمام صحاح کی کتابوں میں مروی ہے، تقریباً شہرت کی انتہائی درجہ پر پہنچی ہوئی ہے۔

حدیث کے زندہ نسخے

بہرحال صحابہ کا ذوق اتباع، اتباع میں حتی الوسع ممکنہ حد تک اپنے کو بھی آنحضرت ﷺ سے قریب تر کرنے کی کوشش اور اسی رنگ میں دوسروں کو رنگنے کا ان میں بے پناہ جذبہ، ان تمام خصوصیات کے ساتھ جن کا میں نے ذکر کیا، اگر اس کے بعد میں یہ دعویٰ کروں کہ جن واقعات و حالات اور جن اقوال و ملفوظات کا ظہور آنحضرت ﷺ سے ہوا تھا، صحابۂ کرام اپنے اپنے علم کی حد تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زندہ مثنّی بنے ہوئے تھے اور اس طرح تاریخ کی وہ کتاب یعنی حضور ﷺ کی زندگی عہد صحابہ میں بجائے ایک نسخہ کے ہزاروں نسخوں کی صورت میں موجود ہو چکی تھی، تو کیا میرے اس دعویٰ کو کوئی غلط ثابت کر سکتا ہے۔ پس تدوینِ حدیث کی پہلی صورت۔ تو خود صحابۂ کرام کی زندگی تھی، اور یہ تھی حفاظتِ حدیث یا اس تاریخ کے محفوظ کرنے اور ہونے کی پہلی صورت میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ ہر صحابی اپنی زندگی میں بالکلیہ آنحضرت ﷺ کے ہو بہو نقل تھے، اگرچہ خلفائے راشدین ہی نہیں بلکہ درجہ میں ان سے بھی جو فروتر اصحاب ہیں، ہم کتابوں میں یہ الفاظ ان کے متعلق پاتے ہیں، عبدالرحمٰن بن زید سے ترمذی میں مروی ہے کہ میں نے حضرت حذیفہ صحابی رسول اللہ ﷺ سے پوچھا:

حد ثنا باقرب الناس من رسول اللّٰہ ﷺ هديا و دلا نلقاه فنا خذ عنه و تسمع منه

مجھے بتائیے کہ آنحضرت ﷺ سے طرز و روش چال ڈھال میں جو آدمی سب سے زیادہ قریب ہو وہ کون ہے، تا کہ میں ان سے ملوں اور ان سے علم حاصل کروں اور حدیثیں سنوں۔

ایک معاصر[1] دوسرے معاصر کے متعلق یہ شہادت ادا کرتا ہے، یعنی حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

اقرب الناس هدياً و دلاً و سمتاً برسول اللّٰہ ﷺ ابن مسعود

آنحضرت ﷺ سے طرز و روش، چال ڈھال، وضع و انداز میں سب سے زیادہ قریب ترین آدمی ابن مسعود ہیں۔

صرف ان ہی باتوں میں نہیں جن کا تعلق شریعت و قانون سے ہے بلکہ بعض صحابہ تو آنحضرت ﷺ کی زندگی کی ہو بہو تصویر اتارنے کے لیے یہاں تک کرتے تھے کہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق عام طور سے مشہور ہے:

كان يتبع آثاره فی كل مسجدٍ صلی فيه و كان يعترض براحلته فی طريق رای رسول اللّٰہ ﷺ عرض ناقته۔ (اصابہ)

جن جن مقامات پر حضور ﷺ نے (استون) میں نماز پڑھی تھیں، ابن عمران مقامات کو تلاش کرتے تھے (اور نمازیں پڑھتے تھے)

راہ میں جہاں کہیں حضور ﷺ نے اپنی اونٹنی کا رخ پھیرا تھا، ابن عمر بھی قصداً اس مقام پر یہی کام کرتے تھے۔

یہاں تک بیان کیا گیا ہے کہ سفر کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اگر استنجا کے لیے اونٹ سے کہیں اتر کر بیٹھتے، تو باوجود عدم ضرورت کے استنجا کرنے والوں کی شکل بنا کر ابن عمرؓ اونٹ سے اتر کر وہاں بیٹھا کرتے۔ اسی سلسلہ میں ان کی یہ عام عادت بیان کی جاتی ہے:

یسئال من حضر اذاغاب عن قوله و فعله (اصابہ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جس قول وفعل سے یہ غائب رہتے، تو جو لوگ اس وقت حاضر ہوتے، ان سے پوچھ لیتے۔

امام مالک سے ان کی شاگرد یحییٰ نے ایک دن پوچھا کہ

اسمعت المشائخ یقولون من اخذ بقول ابن عمر لم یدع الا ستقصاء قال نعم (اصابہ)

کیا آپ نے بزرگوں سے یہ سنا ہے کہ ان کا خیال تھا جس نے ابن عمر کے قول کو اختیار کیا، اس نے (آنحضرت ﷺ کے اتباع کی تکمیل میں) کوئی چیز نہیں چھوڑی؟ بولے ہاں!

بہر حال یہی ''استقصا'' یا سیرت طیبہ کی کامل ''تصویر کشی'' یا ''ہو بہو نقل'' اتارنی نصب العین تو سب ہی کا تھا، لیکن ہر شخص کے لیے اس کا میسر آنا آسان نہیں ہے، تاہم اسی کے ساتھ جتنے بھی صحابی تھے، ان کی زندگی کا بڑا حصہ محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے قالب میں ڈھلا ہوا تھا اور اسی بنیاد پر میں ہر صحابی کو دراصل حدیث کا ایک نسخہ یا موجودہ اصطلاح میں اجازت دیجئے، تو اڈیشن قرار دیتا ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں بعض اڈیشن بہت زیادہ کامل اور حاوی تھے اور بعض میں وہ کاملیت نہیں پائی جاتی تھی اور اگر صحابہ کی جو تعداد اوپر بیان کی گئی ہے، صحیح ہے تو ایمان و اسلام اور جوش عمل کی ان میں جو سینہ زوریاں تھیں، ان کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا یقیناً مبالغہ نہ ہوگا کہ عہدِ نبوت میں ہی ہماری وہ تاریخ جس کا نام حدیث ہے، اس کے کامل و ناقص زندہ نسخوں اور اڈیشنوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی تھی۔ کیا دنیا میں کوئی تاریخ یا کسی تاریخ کا کوئی حصہ ایسا موجود ہے جس کے عینی شاہد اتنی تعداد میں خود اس واقعہ کے مجسم آئینے بن کر دنیا کے سامنے پیش ہوئے ہوں؟ اور کیا آئندہ ان نسخوں کی تعداد میں کوئی کمی ہوئی؟ کاملیت کے اعتبار سے جتنی بھی کمی ہوئی ہو، لیکن کمیت اور مقدار کے لحاظ سے ہر شخص جانتا ہے کہ اس تیرہ ساڑھے تیرہ سو کی صدیوں میں ہر سال اس کی تعداد میں اضعافاً مضاعفۃً اضافہ ہی ہوتا رہا اور ہو رہا ہے۔ ہر مسلمان خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں آباد ہو، آج اس کی زندگی میں جتنے صحیح مذہبی اور اخلاقی عناصر شریک ہیں، کیا یہ اسی تاریخ کے کسی حصہ میں آباد ہو، آج اس کی زندگی میں جتنے صحیح مذہبی اور اخلاقی عناصر شریک ہیں، کیا یہ اسی تاریخ کے کسی حصہ کا عکس نہیں ہے؟ آج بھی جو مسلمان ہندوستان کے کسی کوردہ دیہات میں جو نمازیں پڑھتا ہے، قسم کھا کر کہہ سکتا ہے اور یقیناً وہ اپنی اس قسم میں سچا ہے کہ وہ اسی طرح ہاتھ اٹھاتا ہے، جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اٹھاتے تھے، وہی کہتا ہے جو حضورؐ کہتے تھے، وہی پڑھتا ہے جو حضور پڑھتے تھے، اسی طرح وہ جھکتا ہے، جس طرح حضورؐ جھکتے تھے، اسی طرح زمین پر سر رکھتا ہے، جس طرح حضور ﷺ رکھتے تھے۔ اسی پر مسلمانوں کے دوسرے مذہبی اور دینی اعمال وعقائد کو قیاس کر لیجیے، کچھ نہیں تو کم از کم اس

Marfat.com

تاریخ کی کوئی ایک آدھ ہی بات کلمہ شہادت ہی سہی، اس تاریخ کا یہ جز، تو ہر ایک مسلمان کے اندر اب تک محفوظ ہے۔

حدیث کا بہت بڑا حصہ متواتر ہے

اور اسی بنیاد پر کل کے متعلق تو نہیں، لیکن تاریخ کے اس عظیم الشان ذخیرے کے ایک بڑے حصہ کو میں متواتر خیال کرتا ہوں، یعنی بغیر کسی انقطاع کے نسلاً بعد نسلٍ لاکھوں اور لاکھوں کے بعد کروڑ ہا کروڑ انسانوں کے ذریعہ سے مشرق و مغرب میں یہ حصہ منتقل ہوتا ہوا دنیا کے موجودہ دور تک پہنچا ہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ قیامت تک پہنچتا رہے گا۔ ان کی مقدار کیا ہوگی؟ اس کے لیے صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ امت اسلامیہ کے تمام فرقے جن مسائل پر متفق ہیں، تقریباً سب کا یہی حال ہے۔ عقائد و ایمانیات کے سوا طہارت، غسل و وضو، عبادات، نماز روزہ، حج زکوٰۃ، معاملات، عقوبات، سیاسیات، مباحات و محظورات وغیرہ وغیرہ مختلف ابواب سے ان اتفاقی مسائل کا اگر انتخاب کیا جائے، جو عہد نبوت سے اس وقت تک ہر ملک اور ہر فرقہ کے مسلمانوں میں طبقۃً بعد طبقۃٍ سلفاً عن خلفٍ تواتر کے ساتھ اس حیثیت سے مسلم ہیں کہ یہی آنحضرت ﷺ کا حکم اور طرزِ عمل تھا تو کون کہہ سکتا ہے کہ ان کی تعداد ہزاروں سے متجاوز نہ ہوگی اور ان کا شمار کرنا زیادہ دشوار بھی نہیں ہے۔

گویا قرآن کے بعد ہم جس چیز کو بغیر کسی تذبذب و دغدغہ کے آنحضرت ﷺ کی ذاتِ مبارک کے ساتھ منسوب کر سکتے ہیں وہ حضور ﷺ کے اقوال و افعال و تقریرات کا یہی حصہ ہے جو ہم تک تعامل و توارث کے ذریعہ سے پہنچا ہے، لیکن اس مسئلہ میں صرف اسی پر قناعت نہیں کی گئی ہے بلکہ اسی کے ساتھ ان معلومات کے ہر ہر جز کو مسلسل روایت کے ذریعہ سے فن حدیث میں محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یوں باہم ایک کی دوسرے سے توثیق ہوتی ہے۔ اب روایتوں کے ذریعہ سے یہ چیزیں جس طرح مروی ہیں، ان کو اور مسلمانوں نے تعامل کے ذریعہ سے ان چیزوں کو جس طرح ایک نسل سے دوسرے نسل کو منتقل کیا ہے، دونوں کو سامنے رکھئے، ہر ایک کی تصدیق دوسرے سے ہوگی، البتہ آنحضرت ﷺ کی زندگی کا وہ حصہ جس کی منتقلی اس اتفاقی تعامل کے ذریعہ سے عمل میں نہیں آئی ہے، ان کے لیے سب سے پہلے تو ہمارے پاس وہی روایت کا ذریعہ ہے۔ روایت کے اس سلسلہ کی آئندہ کڑیوں پر تو آگے بحث آئے گی، عہدِ صحابہ میں جس حزم و احتیاط کے ساتھ ان چیزوں کو اپنی اصلی حالت پر محفوظ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے اس کی داستان آپ سن چکے۔ خود آنحضرت ﷺ کی ہر ہر لفظ اور ہر ہر فعل کی نگرانی صحابۂ کرام کا ایک ایک لفظ کے شک مٹانے کے لیے سینکڑوں میل کا سفر طے کرنا، اس کا ذکر بھی آپ سن چکے ہیں، لیکن بات اسی پر ختم نہیں ہوگئی، بلکہ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں خود صحابہ بھی ایک دوسرے سے اس معاملہ میں پوچھ گچھ کا سلسلہ جاری رکھتے تھے۔ ہر ایک اپنے علم کو دوسرے کے علم پر پیش کرتا تھا۔ ان کے ساتھ طرزِ عمل ہی سے روایت کی قوت بڑھتی چلی جاتی تھی۔

Marfat.com

متابعات اور شواہد

اسی کے ساتھ صحابہ سے روایت کرنے والے حتی الوسع اس کی کوشش کرتے تھے کہ ایک ہی روایت کو جن جن صحابیوں سے سننا ممکن ہو، اس میں کمی نہ کی جائے۔ اصطلاح حدیث میں روایت کے اس طریق عمل کا نام ''متابعت'' تھا اور جو روایتیں اس طریقہ سے حاصل کی جاتی تھیں، یعنی ایک ہی واقعہ کو تصدیق و توثیق کے لیے شاگرد اپنے استاذ کے رفیقوں اور ہم عصروں سے بھی جو روایت کرتا تھا، تو ان کا نام اصطلاحاً متابعات و شواہد ہے۔ جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا، محدثین میں توابع وشواہد کے جمع کرنے کا شوق زیادہ شدت پذیر ہوتا رہا۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ صرف ایک مشہور حدیث انما الاعمال بالنیات سات سو طریقوں سے مروی ہے، یعنی حدیث ایک ہے، لیکن اس کی سندیں سات سو ہیں اور یہ عدد بھی ایک خاص نقطۂ نظر سے ہے ورنہ اس حدیث کے طرق دراصل اس سے بھی زیادہ ہیں۔ روایتوں میں قوت پیدا کرنے کا یہ بہترین طریقہ تھا۔ محدثین نے اس پر بہت زیادہ زور دیا ہے، جس کا قصہ ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ آئے گا۔ حدیث کی مشہور کتاب صحیح مسلم میں امام مسلم کا نقطۂ نظر زیادہ تر اسی عمل پر مرکوز رہا ہے، خیر یہ تو بعد کو ہوا لیکن عہدِ صحابہ میں بھی جہاں تک ممکن ہوا ہے، اس طریقہ کے برتنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ غیر متواتر حدیثوں کا بھی جو ذخیرہ آج ہمارے پاس ہے، زیادہ تر اس میں ایک ایک حدیث کے راوی آٹھ آٹھ دس دس صحابی ہیں۔ مشہور محدث امام ترمذی نے اپنی کتاب میں جہاں اور بہت سی مفید باتیں اضافہ کی ہیں، اس کا بھی التزام کیا ہے کہ ہر حدیث کو بیان کر کے آخر میں بتاتے ہیں کہ کن کن صحابیوں سے یہ حدیث مروی ہے اور یہ تو واقعہ کی عینی شاہدوں یا ہمعصروں کی تعداد ہے، بعد کو یعنی صحابہ کے شاگردوں اور ان کے شاگردوں کی شاگردوں کی تعداد میں جو اضافہ ہوتا چلا گیا، ان کا تو شمار کرنا مشکل ہے، لیکن ہمارے پاس بحمد للہ ایسی ایک نہیں متعدد کتابیں موجود ہیں، جن میں ہر حدیث کے تمام اسناد ایک جگہ جمع کر دیئے گئے ہیں، آج دنیا میں کون ہے جو گذرے ہوئے واقعات میں سے کسی ایک واقعہ کے متعلق بھی وثوق و اعتماد کے ان آہنی ذرائع کو پیش کر سکتا ہے۔ باسورتھ اسمتھ حدیث کی اسی تاریخی وثاقت کو دیکھ کر یہ لکھنے پر مجبور ہوا ہے:

> ''کوئی شخص یہاں سیرۃ نبوی کے متعلق نہ خود کو دھوکہ دے سکتا ہے اور نہ دوسرے کو دے سکتا ہے، کہ یہاں دن کی پوری روشنی ہے۔'' (محمد اینڈ محمڈنزم از باسورتھ اسمتھ۔ ص ۱۰۸، منقول از سیرۃ النبی ﷺ جلد ششم۔)

لیکن ابھی بات پوری نہیں ہوئی۔ ایک اہم نقطہ بحث کا ابھی باقی ہے، قبل اس کے کہ میں ادھر توجہ کروں، ایک عام غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے چلوں۔ عموماً لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ''حدیث'' کی ابتدائی نوعیت کسی علم کی نہیں تھی، متفرق طور پر متفرق صحابیوں نے آنحضرت ﷺ کو کچھ سنایا کچھ کرتے ہوئے دیکھا تھا، پھر یا تو بہ ضرورت انہوں نے کبھی اس کا اظہار کر دیا، یا بعض تو یہاں تک خیال کرتے ہیں کہ جیسے گھر کے پرانے بڑے بوڑھے اپنی ریٹائرڈ زندگی

Marfat.com

میں نوجوانوں کے درمیان بیٹھ کر اپنے عہدِ نوجوانی کے قصے دل بہلانے اور گرمی بزم کے لیے بیان کرتے ہیں، یونہی العیاذ باللہ حدیث کی ابتداء ہوئی، بعد کو پھر بہ تدریج لوگوں نے اس کو ایک علم بنالیا؟

آنحضرت ﷺ کے اسوۂ حسنہ اور سیرۃ طیبہ کو جو تعلق قرآن اور خود حضور ﷺ کے اقوال کی بنیاد پر مسلمانوں کی اخلاقی و مذہبی زندگی سے تھا، آپ اس کا حال سن چکے، کیا اس کے بعد کوئی ایک سیکنڈ کے لیے بھی سوچ سکتا ہے کہ خدانخواستہ کسی زمانہ میں بھی آپ کے اقوال و اعمال خصوصاً عہدِ صحابہ میں اتنے غیر اہم ہو سکتے تھے جیسا کہ اس شیطانی وسوسہ کا اقتضا ہے، بلکہ خود رسول اللہ ﷺ خدا کی طرف سے اس کے ذمہ دار تھے کہ قرآن کی تعلیمی شکل اور اس کے تشریحی مطلب کو خود اپنی زندگی کے نمونوں سے مسلمانوں کو بتائیں، اور مسلمان بھی اس کے ذمہ دار قرار دیئے گئے ہیں کہ ان کو اپنی زندگی کا جز بنائیں اور دوسروں کو بھی اسی راہ پر چلانے کی کوشش کریں۔ ایسی صورت میں دیوانوں کے سوا اس قسم کے اوہام کو بھی اسی راہ پر چلانے کی کوشش کریں، ایسی صورت میں دیوانوں کے سوا اس قسم کے اوہام میں اور کون مبتلا ہوسکتا ہے، ماسوا اس کے خود عہدِ نبوت میں جیسا کہہ چکا ہوں کہ قرآن اور سنن و سیرت کے سیکھنے سکھانے کے لیے ایک باضابطہ تعلیم گاہ صفہ کے نام سے قائم تھی، جس میں طلبہ کی تعداد ایک ایک وقت میں اسّی اسّی تک ہوتی تھی۔ اس مدرسہ میں تعلیم دینے کا کام ابوہریرہ ابن مسعود، زید بن ثابت، اُبی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہم وغیرہم عہد صحابہ میں انجام دیتے تھے۔ مسلمان ہو ہو کر باہر سے لوگ آتے تھے اور حسبِ ضرورت اس مدرسہ میں قیام کر کے اپنے گھر جاتے تھے۔ خود قرآن میں اس کا حکم بھی دیا گیا تھا، جیسا کہ ارشاد ہے،

فلو لا نفر من كل فوقة منهم طائفة ليتفقهو افي الدين و لينذرواقومهم اذا رجعوا اليهم لعلهم يحذرون. (توبہ)

پھر ایسا کیوں نہ ہو کہ ہر فرقہ سے ایک گروہ روانہ ہوتا کہ دین کی سمجھ حاصل کرے اور اپنے لوگوں کو ڈرائے جب ان کی طرف واپس ہو، ہوسکتا ہے کہ لوگ (اس کے بعد) پارسائی اختیار کریں۔

اس مدرسہ میں انہیں کن کن باتوں کی باضابطہ تعلیم دی جاتی تھی، حدیثوں میں اس کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔

فروہ بن مسیک جو یمن سے مدینہ منورہ آئے تھے اور بعد کو حضور ﷺ کی طرف سے یمن کے قبائل مراد و زبید ندحج کے گورنر بنا کر بھیجے گئے، ان کے ذکر میں بیان کیا جاتا ہے،

جاء من اليمن و تعلم القرآن و فرائض الاسلام و شرائعه۔ (ابن سعد)

یمن سے آئے اور قرآن اور اسلام کے فرائض و قوانین کی تعلیم حاصل کی۔

اور یہ تو ان لوگوں کی تعلیم کا طریقہ تھا، جو خود مدینہ چلے آتے تھے لیکن جو نہیں آسکتے تھے، ان کے لیے آستانہ نبوت سے باضابطہ معلمین بھیجے جاتے تھے۔ اسی سلسلہ میں بیر معونہ اور رجیع کے معلموں کا مشہور واقعہ ہے، جن میں ان بیچارے معلموں کو دھوکہ دے کر شہید کر دیا گیا تھا۔ ان کے سوا حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت علی کرم اللہ وجہہ منجملہ اور اغراض کے تعلیمی غرض سے بھی یمن بھیجے گئے تھے۔ حضرت معاذؓ کو جو حکم دیا گیا تھا اس کا ذکر پہلے آچکا ہے، حضرت ابو

Marfat.com

یمامہ باہلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔

بعثنی رسول اللہ ﷺ الیٰ قومی ادعو ھم الی اللہ تبارک تعالیٰ و اعرض علیھم شرائع الاسلام (مستدرک)

مجھے رسول اللہ ﷺ نے اپنی قوم کی طرف اس لیے بھیجا کہ ان کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف بلاؤں اور ان پر اسلامی قوانین پیش کروں۔

الغرض قرآن کے ساتھ ساتھ شرائع اسلام یعنی قرآن کے احکام کی تعمیلی شکل جو صحابہ کو حضور ﷺ خود کرکے بتایا کرتے تھے، عہدِ نبوت ہی میں ان دونوں ہی کی حیثیت مستقل علم کی ہو چکی تھی۔ حدیث کا وہ ذخیرہ جس میں تعلیم تعلم پر آنحضرت ﷺ نے مختلف پیرایوں میں اُبھارا ہے۔ آج کل کی لیڈرانہ تقریروں میں تو اُس کے تحت داغ اور امیر کی شاعری اور شیکسپیئر، کالی داس کے ڈراموں تک کو داخل کر دیا جاتا ہے، لیکن سچ یہ ہے کہ زیادہ تر ان سے مراد انہی چیزوں کی تعلیم تھی۔ پھر حضور ﷺ کے بعد جیسا کہ ہونا چاہئے تھا نہ صرف مدینہ منورہ بلکہ ان تمام مرکزی شہروں میں جہاں جہاں اسلام کی حکومت پہنچ چکی تھی اور حضرات صحابۂ کرام کی مختلف جماعتیں وہاں جا کر توطن پذیر ہوگئی تھیں، جن میں خود مدینہ منورہ، مکہ معظمہ، یمن، یمامہ، بحرین، دمشق، کوفہ، بصرہ، مصر کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ جلیل القدر اصحاب رسول اللہ ﷺ نے ان شہروں کے جوامع میں قرآن کے ساتھ ساتھ روایتِ حدیث کے باضابطہ حلقے قائم کر دیے تھے مدینہ منورہ میں مردوں میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عورتوں میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمات اس سلسلہ میں سب سے زیادہ نمایاں تھے۔ اسی طرح دمشق میں حضرت ابودرداءؓ، کوفہ میں عبداللہ بن مسعودؓ بصرہ میں عمرانؓ بن حصین، ازیں قبیل ہر مرکزی شہر میں ان اغراض سے تعلیمی حلقے جاری ہو چکے تھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کا ذوقِ روایت تو اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ جمعہ کے دن بھی چونکہ مسجد میں عام مسلمانوں کا بڑا مجمع جمع ہو جاتا تھا، اس مجمع کو غنیمت خیال کر کے تقریباً ہر جمعہ میں قبل اس کے کہ امام خطبہ کے لیے منبر پر آئے، آپ کا یہ عام قاعدہ تھا، جیسا کہ حاکم کی مستدرک میں روایت ہے کہ

کان ابوھریرۃ یقوم یوم الجمعۃ الی جانب المنبر......ثم یقبض علی رمانۃ المنبر یقول قال ابو القاسم ﷺ قال محمد ﷺ قال رسول اللہ ﷺ قال الصادق المصدوق ﷺ...... فاذاسمع باب المقصودۃ بخرج الا مام جلس۔

جمعہ کے دن حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ منبر کے ایک کنارے کھڑے ہو جاتے، پھر منبر کا گولا تھام کر فرماتے، فرمایا ابوالقاسم ﷺ نے، فرمایا محمد ﷺ، فرمایا رسول اللہ ﷺ نے، فرمایا الصادق المصدوق ﷺ نے، پھر جب انہیں محسوس ہوتا کہ ''مقصورہ[13]'' کے دروازہ سے امام نکل رہا تو بیٹھ جاتے۔

ابن سعد کی ایک تابعی سے روایت ہے:

دخل مسجد حمص فاذابحلقۃ فیھم رجل جمیل وضاح الثنایاً و فی القوم من ھواسن منہ و ھم

Marfat.com

يقبلون عليه يستمعون كلامه فسالته من انت فقال انا معاذ بن جبل. (ابن سعد)
کہ وہ شام کے مشہور شہر حمص میں داخل ہوئے، کیا دیکھتے ہیں کہ ایک خوبصورت آدمی جن کے دانت الگ الگ تھے، وہ لوگوں کے مجمع میں بیٹھے ہوئے ہیں، مجمع میں ایسے آدمی بھی ہیں، جو اس حسین آدمی سے عمر میں بڑے ہیں اور اس پر جھکے ہوئے اس کی باتیں سن رہے ہیں، میں نے پوچھا تم کون ہو، بولے میں معاذ جبل ہوں۔

بصرہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک دوسرے صاحب کا بیان ہے:

آتيت البصرة قد خلت المسجد فاذا انابشيخ ابيض الراس واللحية مستند الىٰ اصطوانة فى حلقة يحدثهم. (ابن سعد)
میں بصرہ پہنچا، اور مسجد میں داخل ہوا، کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بوڑھے آدمی جن کے سر کے بال سپید تھے، مسجد کے ستون سے پیٹھ لگا کر ایک حلقہ میں بیٹھے ہوئے حدیثیں بیان کر رہے ہیں۔

ہشام بن عروہ کہتے ہیں کہ

كان لجابر بن عبدالله حلقة فى المسجد النبوى يو خذ عنه العلم. (اصابہ۔جلد ۱، ص ۴۳)
مسجد نبوی میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک حلقہ درس تھا جس میں لوگ ان سے علم حاصل کرتے تھے۔

اور یہ سب کے سب رسول اللہ ﷺ کے جلیل القدر اکابر اصحاب میں ہیں، اس کے بعد پھر کون کہہ سکتا ہے کہ ''فنِ حدیث'' کی حیثیت عہدِ نبوت یا عہدِ صحابہ میں باضابطہ علم کی نہیں، بلکہ افواہی قصوں کی تھی۔

حدیث کی کتابی تدوین

بہر حال یہاں تک تو ''فنِ حدیث'' کے وثوق اعتماد کے صرف دو ذریعوں پر بحث ہوئی، یعنی ایک تعامل، دوسری روایت، لیکن آخر میں ایک سوال رہ جاتا ہے اور دنیا کے اس کاغذی دور میں عموماً گدگدی اسی کی اٹھتی ہے، دل ہی دل میں لوگ سوال کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ سہی لیکن کتابی شکل میں آخر تاریخ کا یہ حصہ کب آیا، گویا اسی زمانہ کو تدوین حدیث کا آغاز قرار دینا چاہتی ہیں، اگرچہ واقعہ تو یہی ہے کہ گذشتہ بالا ساز وسامانوں کے ہوتے ہوئے شاید اس کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی، بلکہ کتابت کے متعلق جو عربی مذاق تھا، اس کو دیکھتے ہوئے تو اس کی اور بھی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ فقہ وحدیث کے مشہور امام اوزاعی تو فرمایا کرتے تھے:

كان هذا العلم شيئاً شريفاً اذاكان من افواه الرجال يتلا قونه ويتذاكرونه فلما صارفى الكتب ذهب نوره وصارالى غير اهله۔ (جامع بیان العلم۔ج ۱، ص ۹۸)
حدیث کا علم بہت ہی قیمتی اور شریف اس وقت تک تھا، جب لوگوں کے منہ سے حاصل کیا جاتا تھا، لوگ باہم ملتے جلتے رہتے تھے، اور آپس میں اسی کا مذاکرہ کرتے رہتے تھے، لیکن جب سے حدیثیں کتابوں میں درج ہوگئیں اُس کا نور اور اُس کی رونق جاتی رہی اور ایسے لوگوں میں پہنچ گیا، جو اس کے اہل نہیں ہیں۔

Marfat.com

اور اسی لیے تاریخ حدیث کے بیان کرنے والوں نے حدیث کی کتابی تدوین کا آغاز کب سے ہوا، اس کی طرف بہت کم توجہ کی لیکن آج اس کا نتیجہ ہے کہ جو نہیں جانتے ہیں ان مسکینوں کو تو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی اس حدیث کا کیا اعتبار جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو سو برس بعد مدون ہوئی۔ اچھے پڑھے لکھے لوگ اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں بیچارے امام بخاری اور مسلم کے سنِ وفات کو پیش کر رہے ہیں، گویا ان کے نزدیک سب سے پہلے حدیثوں کو جس نے قلمبند کیا وہ یہی حضرات تھے، اور یہ تو خیر جاہلوں کی باتیں ہیں لیکن بعض محدثین کے بیانات سے عموماً اربابِ واقفیت بھی اس مغالطہ میں مبتلا ہیں کہ سب سے پہلے جس نے حدیث مدون کی، وہ ابن شہاب زہری ہیں، جن کا زمانہ پہلی صدی کے اختتام کا ہے، گویا یہ لوگ ایک سو برس پیچھے ہٹ کر کتابتِ حدیث کی تاریخ کو لے جاتے ہیں۔ اس زمانہ کے مطالبوں سے پریشان ہو کر بعض بزرگوں نے جب زیادہ کدوکاوش، کَدّ وکاؤ سے کام لیا تو انہوں نے اعلان فرمایا کہ زیادہ تو نہیں لیکن حدیثوں کا تھوڑا بہت حصہ عہدِ صحابہ بلکہ عہدِ نبوت میں بھی قیدِ تحریر میں آ گیا تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس میں پوری تحقیق سے کام نہیں لیا گیا۔ ان لوگوں کو اپنی تائید میں یہ مغالطہ بھی مل جاتا ہے کہ عہدِ نبوت وصحابہ میں تحریری ساز وسامان ہی کہاں تھا، تھوڑا بہت جو تھا اسی حیثیت سے کچھ چیزیں قیدِ تحریر میں آ گئی ہوں گی۔ کتابت وتحریر کے سامانوں کی اس زمانہ میں عرب کے اندر کیا حالت تھی، یہ ایک مستقل مضمون ہے۔ شروع میں بھی اس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے اور اس وقت اگر تفصیل سے کام لیتا ہوں تو بات بہت طول ہو جائے گی، اس کے لیے مستقل مقالہ کی ضرورت ہے لیکن کم از کم جو قرآن پڑھتا ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ وہ عرب جو قرآن کا ماحول ہے اس کے متعلق تحریری سامانوں کے اس افلاس کا کس طرح یقین کر سکتا ہے۔ بھلا جس کتاب کا نام ہی قرآن (پڑھی جانے والی چیز) ہو فاتحہ کے بعد جس کی پہلی سورۃ کی پہلی آیت کا دوسرا لفظ کتاب ہو اور مسلسل کتاب زبر اسفار قراطیس لوح کا ذکر تقریباً ہر بڑی سورہ میں بار بار آتا ہو، پہلی آیت جو پیغمبر پر نازل ہوئی، اس میں پڑھنے لکھنے قلم تک کا ذکر موجود ہو، روشنائی (مداد) دوات، سفرہ، کاتبین، سجل کا ذکر جس کتاب میں پایا جاتا ہو، کون خیال کر سکتا ہے کہ یہ کتاب ایسے لوگوں میں اتری جو نوشت وخواند سے ایسے عاری تھے، جیسے جنگل کے بھیل اور گونڈ ہیں۔ سردست[14] صرف اسی ایک قرآن کے اندرونی اشارہ پر اکتفا کر کے میں اب اپنے دعویٰ کا اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ عملی تواتر اور روایت ان دو ذریعوں کے سوا حدیث کی کوئی معمولی مقدار نہیں بلکہ اس وقت ہمارے پاس اس تاریخ کا جو ذخیرہ موجود ہے، اس کا غالب ترین حصہ کم از کم نمبر اوّل کی صحیح حدیثوں کی جو تعداد ہے، خود اس کے عینی شاہدوں کے زمانہ میں زیادہ تر ان ہی کے ہاتھوں سے قیدِ تحریر میں آ چکا تھا اور اس کے بعد اس دعویٰ پر یہ اور اضافہ کرتا ہوں کہ ان واقعات کا ایک بڑا جز جس طرح تواتر کے ساتھ مسلمانوں میں منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے اور روایت کے متابعاتی وشواہدی طریقوں سے جس طرح یہ موجودہ شکل میں آیا ہے، ٹھیک اسی طرح اپنے چشم دید گواہوں کے زمانہ سے قیدِ تحریر میں آ کر مسلسل اسی طرح کتابی شکل میں باقی رہا اور اب تک باقی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ ممکن ہے کہ ابتدا میں بعض لوگوں نے حدیث کے بعض ذخیروں کو لکھ لیا ہو، لیکن بعد کو وہ کتابی ذخیرے ضائع ہو گئے اور درمیان میں پھر زبانی روایت پر اس کا دار ومدار رہ گیا ہو اور آخر میں لوگوں نے اسے پھر قلمبند کیا۔ ایسا سمجھنا بھی قطعاً واقعات کے خلاف ہے، بلکہ جس طرح ''گلستاں''

جب سے سعدی نے لکھی اور اب تک درمیان میں غائب ہوئے بغیر اسی کتابی شکل میں منتقل ہوتی چلی آ رہی ہے یعنی اس کتاب پر ایسا کوئی زمانہ نہیں گذرا کہ دنیا سے بالکلیہ ناپید ہوگئی ہو اور پھر لوگوں نے اپنے حافظوں کے ذریعہ سے اسے دوبارہ تحریری شکل عطا کی جیسا کہ توراۃ وغیرہ کے متعلق ایک دفعہ نہیں بار بار یہ واقعہ پیش آتا رہا ہے کہ تین تین سو چار چار سو سال کے لیے اس کا تحریری سرمایہ ناپید ہو گیا اور پھر سینوں سے اس کو سفینوں میں لانے کی کوشش کی گئی۔[15] حدیث کے اس کتابی ذخیرہ پر بحمد اللہ یہ حادثہ کبھی نہیں گذرا۔

بہر حال یہ تو میرا دعویٰ ہے، اس دعوی کے ثبوت کے جو ذرائع میرے پاس ہیں، اب انہیں پیش کرتا ہوں، لیکن قبل اس کے کہ اور باتیں بیان کی جائیں پہلے یہ سن لینا چاہیے کہ اس وقت امت کے ہاتھ میں حدیثوں کا جو معتبر اور قابلِ اعتماد ذخیرہ موجود ہے اس کی مقدار اور ان حدیثوں کی تعداد کیا ہے۔ یوں تو عام طور سے جہاں حدیث کے حفاظ کا ذکر کیا جاتا ہے ان کی تعداد بہت زیادہ بتائی جاتی ہے، مثلاً کہا جاتا ہے کہ امام احمد بن حنبل کو نامعتبر یا ردشدہ حدیثوں کے سوا جو قابل اعتماد حصہ محفوظ تھا، اس کی تعداد سات لاکھ کے اوپر تھی۔ اسی طرح امام ابوزرعہ جو حفاظ حدیث میں خاص امتیاز رکھتے ہیں، ان کی حدیثوں کی تعداد بھی سات لاکھ بتائی جاتی ہے۔ امام بخاری کے متعلق عام طور سے لکھتے ہیں کہ انہیں دو لاکھ کے قریب تو غیر صحیح اور ایک لاکھ صحیح حدیثیں زبانی یاد تھیں۔ امام مسلم سے لوگوں نے ان کا یہ دعویٰ نقل کیا ہے کہ اپنی کتاب صحیح کے متعلق خود فرمایا کرتے تھے کہ اپنے کان سے سنی ہوئی تین لاکھ حدیثوں سے میں نے یہ مجموعہ منتخب کیا ہے۔ اسی طرح مختلف لوگوں کی طرف بڑے بڑے اعداد منسوب ہیں، لیکن ان بیانوں سے عوام جو سمجھتے ہیں کیا اس کا مقصود بھی وہی ہے؟ بات یہ ہے کہ لوگ محدثین کی ایک اصطلاح سے چونکہ ناواقف ہیں، اس لیے انہیں حیرت ہوتی ہے بلکہ یہ بھی وسوسہ ہوتا ہے کہ مثلاً امام بخاری کو اگر اتنی صحیح حدیثیں زبانی یاد تھیں تو پھر انہوں نے اپنی کتاب میں سب کو کیوں درج نہیں کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ حدیث کی حفاظت و بیان کا جو روایتی طریقہ ہے، پہلے بھی میں بتا چکا ہوں کہ اس طریقہ کو مستحکم و مضبوط بنانے کے لیے ابتدا سے متابعات و شواہد کی کثرت کا جو طریقہ مروج ہو گیا تھا یعنی ایک ایک حدیث کو جن جن سندوں اور طریقوں سے روایت کرنا ممکن تھا، محدثین ان تمام طرق کو جمع کرنے کی کوشش کرتے تھے، اور ان کی اصطلاح تھی کہ ایک ہی حدیث کو ان کے مختلف طریقوں کے اعتبار سے بجائے ایک کے طریقوں کے حساب سے شمار کرتے تھے، مثلاً انما الاعمال بالنیات کی حدیث جیسا کہ بیان کر آیا ہوں، واقع کے لحاظ سے ایک حدیث ہے، لیکن محدثین چونکہ سات سو طریقوں سے اسے روایت کرتے ہیں، اس لیے بجائے ایک کے صرف اسی ایک حدیث کی تعداد سات سو ہو جاتی ہے اور یہ کسی ایک حدیث کا نہیں بلکہ حدیث کے بیشتر حصہ کا یہی حال ہے۔ حدیثوں کے ان عجیب و غریب اعداد کی بنیاد ایک تو یہ ہے۔ دوسرے پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ گو ابتدا میں حدیث جس کے لفظی و لغوی معنی بات کے ہیں، اس کا اطلاق محض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ملفوظاتِ طیبہ پر کیا جاتا تھا۔ پھر اس میں وسعت پیدا ہوئی اور آپ کے افعال و تقریرات کو بھی اس کے نیچے درج کیا گیا۔ اس طرح رفتہ رفتہ اطلاق میں اور کشادگی پیدا ہوئی اور صحابہ کے اقوال و فتاوی، فیصلوں، بلکہ تابعین و تبع تابعین تک کی چیزوں کو بعض لوگوں نے ''حدیث'' کے نیچے داخل کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ سے قدرۃً حدیثوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے، لیکن عامی خیال کرتے ہیں کہ یہ براہِ راست

رسول اللہ ﷺ کی حدیثوں کی تعداد ہے، صاحب ''توجیہ النظر'' لکھتے ہیں:

ان کثیراً من المتقد مین کانوا یطلقون اسم الحدیث علیٰ مایشمل آثار الصحابة و التابعین و تابعیهم و فتناولهم و یعدون الحدیث المروی باسنادین حدیثین (ص ۹۳)

متقدمین کی بڑی جماعت عموماً حدیث کے لفظ کا اطلاق ایسے عام مفہوم پر کرتی تھی، جس میں صحابہ تابعین تبع تابعین کے آثار و فتاوی سب ہی داخل ہیں، نیز ایک ہی حدیث جو دو سندوں سے مروی ہوتی، اسے دو حدیث قرار دیتے تھے۔

اور یہی مراد ہے، ابن جوزی کے اس فقرے سے جو حدیثوں کے ان اعداد کو درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ان المراد بهذا العدد الطرق لا المتون (تلقیح، ص ۱۸۴) یعنی ان اعداد سے مقصد حدیثوں کے متن کی مقدار نہیں ہے، بلکہ ان کے طریقے اور اسناد مراد ہیں۔

یہ حدیث کے ان بڑے بڑے اعداد کا حال ہے لیکن واقعی وہ حدیثیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک سے براہ راست تعلق رکھتی ہیں، آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ کہاں لاکھ دو لاکھ چار لاکھ کی باتیں تھیں، اور اب سنئے کہ امام بخاری کی صحیح سند کے ساتھ جو حدیثیں مروی ہیں، ان کی تعداد لے دے کے بہ مشکل دو ہزار چھ سو دو ہے، اور امام مسلم کی حدیثوں کی تعداد کل چار ہزار ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مسلم میں بخاری کے سوا چار ہزار حدیثیں ہیں بلکہ زیادہ تر دونوں کی روایتیں مشترک ہیں اور یہ تو ان دو بڑی کتابوں کی حدیثوں کا حال ہے، موطا امام مالک جسے بعض لوگ صحیح بخاری پر بھی ترجیح دیتے ہیں، اس کی کل حدیثوں کی تعداد صرف چھ سو ستانوے ہے۔ بہرحال شمار کرنے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ صحیح، حسن، ضعیف ہر قسم کی تمام حدیثیں جو اس وقت صحاح ستہ، مسند احمد اور دوسری کتابوں میں موجود ہیں، ان کی تعداد پچاس ہزار بھی نہیں ہے اور یہ ہر رطب و یابس کے مجموعہ کی تعداد ہے۔ تمام کتابوں سے چھان بین کر ابن جوزی نے نہیں جن کی تنقید کا معیار بہت سخت ہے، بلکہ حاکم جو نرمی اور مسامحت میں مشہور ہیں، ان کا بیان ہے کہ اول درجہ کی صحیح حدیثوں کی تعداد دس ہزار تک بھی نہیں پہنچ سکتی۔ اب حاکم کی اس رپورٹ کو اپنے سامنے رکھئے اور اس کے بعد میں بتانا چاہتا ہوں کہ ان خطوط اور معاہدوں، امان ناموں، جاگیر و قطائع وغیرہ کے فرامین کے سوا جن کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھوایا ہے اور جن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے، اور حدیث کی جو تعریف ہے ان پر وہ بھی صادق آتی ہے، حدیث کے اس کتابی ذخیرہ کے سوا عہدِ نبوت و قرونِ صحابہ میں حدیث کا کتنا سرمایہ کتابی شکل اختیار کر چکا تھا، دنیا کو یہ سن کر حیرت ہوگی لیکن کیا کیا جائے واقعہ یہی ہے کہ دس ہزار ہی نہیں بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ تعداد میں حدیثیں عہد نبوت و عہدِ صحابہ میں کتابی شکل اختیار کر چکی تھیں۔ آخر آپ خود جوڑ لیجئے، محدثین لکھتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیثوں اور مرویات کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوہتر ہے اور ایک ذریعہ سے نہیں مختلف ذرائع سے یہ ثابت ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود اپنی یادداشت کے لیے بھی اپنی روایت کردہ حدیثوں کو کتابی شکل میں لے آئے تھے۔ حافظ ابن عبدالبر نے ''جامع'' میں ان کی اس کتاب کے واقعہ کو اس طرح درج کیا ہے کہ مشہور صحابی عمرو بن امیہ ضمیری جن کو ''طلسم ہوش ربا'' اور ''داستان امیر حمزہ'' نے عمرو عیار کے نام سے بہت

Marfat.com

مشہور کر دیا ہے، ان کے صاحبزادے حسن بیان کرتے ہیں۔

تحدثت عندابی هریرة بحدیث فانکره فقلت انی قد سمعته منک فقال ان کنت سمعته منی فهو مکتوب عندی فاخذ بیدی الیٰ بیته فارانا کتباً کثیرة من حدیث رسول الله صلی الله علیه و سلم فوجد ذلک الحدیث فقال قد اخبر تک انی کنت حدثتک به فهو مکتوب عندی

میں نے ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے ایک حدیث بیان کی، انہوں نے اس کا انکار کیا، میں نے عرض کیا کہ اس حدیث کو میں نے آپ ہی سے سنا ہے تو بولے اگر تم نے مجھ سے یہ حدیث سنی ہے تو پھر وہ میرے پاس لکھی ہوئی ہوگی، پھر انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے کمرہ میں لے گئے، مجھے انہوں نے آنحضرت ﷺ کی حدیثوں کی بہت سی کتابیں دکھائیں، اسی (ذخیرہ) میں وہ حدیث بھی پائی گئی، حضرت ابو ہریرہؓ نے اس کے بعد فرمایا، میں نے تمہیں خبر دی تھی کہ میں نے جو حدیث تم سے بیان کی تھی، وہ میرے پاس لکھی ہوئی ہے، بیان کی تھی، وہ میرے پاس لکھی ہوئی ہے۔

حافظ ابن حجر نے بھی دوسری سند سے ''فتح الباری'' میں اس روایت کو درج کیا ہے، اس سے صرف یہی نہیں معلوم ہوتا ہے کہ ابو ہریرہؓ کے پاس صرف چند حدیثیں لکھی تھیں، بلکہ جو کچھ وہ روایت کرتے تھے، کتابی شکل میں ان کے پاس وہ موجود تھی۔ جب یہ معلوم ہے کہ ان کی مرویات کی تعداد پانچ ہزار سے اوپر ہے، اس کے بعد اگر کہا جائے کہ پانچ ہزار سے اوپر حدیثیں اس وقت لکھی ہوئی تھیں، تو کیا اس روایت سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی، اور صرف ایک نسخہ نہیں، ''دارمی'' جو حدیث کی مستند کتاب ہے اور اس کا درجہ صحاح ستہ کی اکثر کتابوں سے بلند ہے، اس میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مشہور شاگرد بشیر بن نہیک نے ایک نسخہ ان کی حدیثوں کا تیار کر کے خود ان کو پڑھ کر سنایا تھا۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

عن بشیر بن نهیک قال کنت اکتب ما اسمع ابی هریرة فلما اردت ان افارقه اتیته بکتابه فقرئته علیه و قلت له هذا ما سمعت منک قال نعم

حضرت بشیر بن نہیک سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو حدیثیں میں سنا کرتا تھا انہیں لکھ لیا کرتا تھا۔ جب میرا ارادہ ان سے الگ ہونے کا ہوا، تو ان کی حدیثوں کی جو کتاب تھی اسے لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا، پھر ان حدیثوں کو ان کے سامنے پڑھ گیا اور آخر میں کہا کہ یہ وہ حدیثیں ہیں، جو آپ سے میں نے سنی ہیں، بولے ہاں۔

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دوسرے شاگرد ہمام بن منبہ ہیں جو یمن کے امراء میں تھے۔ ایک زمانہ تک ان کی خدمت میں رہے اور ان کی حدیثوں کو جمع کیا جو ''صحیفہ ہمام'' کے نام سے مشہور ہے۔ امام احمد بن حنبل نے اس کتاب کا ایک بہت بڑا حصہ اپنی مسند میں داخل کر دیا ہے گویا اس کے معنی یہ ہوئے کہ اسی زمانہ میں حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیثوں کے یہ تین نسخے تیار ہو چکے تھے اور ان کا تو پتہ چلا ہے ورنہ ابو ہریرہؓ جن کے شاگردوں کی تعداد امام بخاری نے آٹھ سو کے قریب بتائی ہے کون کہہ سکتا ہے کہ کتنوں نے اس کام کو کیا ہوگا۔ خود حضرت ابو ہریرہؓ نے اپنے لئے جب نسخہ تیار کیا تھا، تو کیا وجہ ہو سکتی تھی کہ ان کے شاگرد ایسا نہ کرتے اور اس سے بھی میں اور آگے بڑھتا ہوں، صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک یہ بیان درج ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے،

Marfat.com

ما من اصحاب النبی ﷺ احد اکثر حدیثاً عنه منی الا ما کان من عبداللہ بن عمرو

آنحضرت ﷺ کے صحابیوں میں حضور کی حدیثوں کا بیان کرنے والا مجھ سے زیادہ کوئی نہیں ہے، البتہ عبداللہ ابن عمرو بن العاص اس سے مستثنیٰ ہیں، (یعنی ان کی حدیثوں کی تعداد مجھ سے بھی زیادہ ہے)

جس کے یہ معنی ہوئے کہ عبداللہ بن عمرو کی مرویات کی تعداد خود حضرت ابو ہریرہؓ کے ذاتی اعتراف کی بنیاد پر ان کی حدیثوں سے زیادہ تھی۔ جب ان کی حدیثیں پانچ ہزار سے زائد ہیں تو اس کا کھلا ہوا نتیجہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے روایات کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوہتر سے یقیناً زائد ہونی چاہئے۔ بخاری کے صریح الفاظ کا یہ تقاضا ہے۔ اب سنئے کہ عبداللہ بن عمروؓ بن العاص کی حدیثوں کا کیا حال ہے۔ بخاری کی اسی حدیث میں ابو ہریرہؓ ہی کا یہ بیان درج ہے کہ وہ لکھا کرتے تھے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مجموعہ کے متعلق تو صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں انہوں نے اسے جمع کیا تھا یا وفات کے بعد، لیکن عبداللہ عمروؓ بن العاص جن کی حدیثوں کی تعداد حضرت ابو ہریرہؓ ہی کے بیان کے مطابق ان کی حدیثوں سے زیادہ اور کثیر ہے، ان کے متعلق تو سب کو معلوم ہے کہ خود براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے وہ آپ کی حدیثیں لکھا کرتے تھے۔ ان کا اپنا بیان ہے جس کا حافظ ابن عبدالبر ابن سعد بلکہ ابوداؤد وغیرہ سب نے ذکر کیا ہے۔ میں حافظ ابن عبدالبر کی روایت درج کرتا ہوں، خود حضرت عبداللہ بن عمروؓ فرماتے ہیں۔

قلت یا رسول اللہ اکتب کل ما اسمع منک ؟ قال نعم قلت فی الرضاء والغضب؟ قال نعم فانی لا اقول فی ذلک کله الاحقا

میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا وہ سب کچھ جو آپ سے سنتا ہوں لکھ لیا کروں، حضور ﷺ نے فرمایا، ہاں، میں نے عرض کیا کہ خوشی اور غصہ دونوں حالتوں کی باتوں کو لکھ سکتا ہوں، آپ نے فرمایا، ہاں، کیونکہ ان سب حالات میں میں نہیں کہتا، لیکن صرف ''حق''۔

اس روایت میں الکتب کل ما اسمع وہ سب کچھ جو آپ سے سنتا ہوں لکھ لیا کروں، قابلِ غور ہے۔ جس کے یہی معنی ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ آنحضرت ﷺ کی ہر بات خواہ رضا یا غضب کے حال کی ہو، لکھ لیا کرتے تھے۔ محدثین میں ان کی یہ کتاب ''صحیفہ صادقہ'' کے نام سے مشہور ہے اور اکثر کتابوں میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ وہ خود بھی اپنی اس کتاب کو اسی نام سے یاد رکھتے تھے۔

ابھی مجھے بہت کچھ کہنا ہے لیکن صرف اسی حد تک میں ٹھہر جاؤں تو گذشتہ بالا وثائق کے بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ اول درجہ کی صحیح روایتوں کی جو تعداد حاکم نے بیان کی ہے یعنی انہوں نے یہ نہیں لکھا ہے کہ صحیح حدیثوں کی تعداد دس ہزار ہے، بلکہ ان کے الفاظ یہ ہیں۔

الاحادیث التی فی الدرجة الا ولی لا تبلغ عشرة الآف. (توجیہ النظر۔ ص۹۳)

اعلیٰ درجہ کی حدیثوں کی تعداد دس ہزار تک نہیں پہنچ پاتی۔

جس کا یہی مطلب ہوا کہ دس ہزار سے کم ہی ہیں اور معلوم ہو چکا کہ عہد نبوت ہی میں آنحضرت ﷺ کے حکم سے جو مجموعہ جمع ہوا، اس کی روایتوں کو پانچ ہزار تین سو چوہتر سے تو یقیناً زیادہ ہونا چاہئے اور ایسے موقع پر ہمیں اس کا بھی

خیال کرنا چاہیے کہ عام محاوروں میں ''اکثر'' کا لفظ جب استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے محض ریاضیاتی زیادتی مراد نہیں ہوتی، یعنی صرف دو تین عدد کی زیادتی کبھی مقصود نہیں ہوسکتی، بلکہ اکثریت معقول تعداد کی زیادتی کو چاہتی ہے۔ گویا حاکم نے صحیح حدیثوں کی جو تعداد بیان کی ہے، قریب قریب یہ باور کرنا چاہیے کہ عہدِ نبوت ہی میں آنحضرت ﷺ کی حدیثوں کی اتنی مقدار خود آنحضرت ﷺ کے حکم سے حضرت عبداللہؓ بن عمرو قلم بند کر چکے تھے اور ان کے لکھنے پڑھنے کا جو حال تھا، اس کے حساب سے ان کے لیے یہ کام کچھ دشوار بھی نہ تھا، آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد بھی جب شام و مصر میں ان کو عیسائیوں اور یہودیوں وغیرہ کی کتابیں ملیں تو ان سے منتخب کر کے انہوں نے ایک بڑا دفتر تیار کر تھا اور اس کا نام انہوں نے ''صحیفہ یرموکیہ'' رکھا تھا۔ کسی موقع پر ان کی اس کتاب کا ذکر آئے گا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تالیف وتصنیف سے انہیں فطری لگاؤ تھا، بہرحال پھر بھی ابھی تک میرے نتیجہ کی حیثیت فی الجملہ قیاسی نتیجہ کی ہے، لیکن اب آگے سنئے جن صحابیوں کا شمار ان لوگوں میں ہے، جن سے بکثرت حدیثیں مروی ہیں، ان کی فہرست میں آنحضرت ﷺ کے خادم خاص اور صحابہ میں معمر ترین بزرگ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ہیں۔ ان کی حدیثوں کی تعداد ایک ہزار دو سو چھیاسی ہے۔ ''دارمی'' میں ان سے یہ روایت منقول ہے کہ وہ اپنی اولاد سے جن کی ایک بڑی تعداد تھی، فرمایا کرتے:

یأبنی قید واھذا العلم

میرے بچو! اس علم (حدیث) کو قلم بند کرلیا کرو۔

اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی حدیثوں کا مجموعہ یقیناً لکھا جا چکا ہوگا، صرف اسی قدر نہیں، ''دارمی'' ہی میں منقول ہے کہ

رائیت ابان یکتب عند انس

میں نے ابان کو دیکھا کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بیٹھے لکھ رہے ہیں۔

اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز روایت مستدرک میں سعید بن بلال کا بیان ہے:

کنّا اذااکثر نا علی انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فاخرج الینا محالا عندہ فقال ھذہ سمعتھا من النبی صلی اللہ علیہ و سلم فکتبتھا و عرضتھا علیہ (مستدرک حاکم)

ہم جب حضرت انسؓ سے زیادہ پوچھ گچھ لگاتے، تو وہ اپنے پاس سے ایک چونگا نکالتے، اور فرماتے یہ ہیں وہ حدیثیں جو آنحضرت ﷺ سے میں نے سنی ہیں، اور ان کو لکھا، لکھ کر حضور ﷺ پر پیش کر چکا ہوں۔

تھوڑے رد و بدل سے یہ الفاظ حدیث کی دوسری کتابوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اگر یہ روایت صحیح ہے اور حضرت انسؓ کے متعلق کتابتِ حدیث کی جن دلچسپیوں کا تذکرہ ''دارمی'' سے میں نے پہلے نقل کیا ہے، ان کو دیکھتے ہوئے صحت میں شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے تو عہد نبوت میں علاوہ صادقہ کے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیثوں کے قلم بند ہونے کا بھی ثبوت ملتا ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ پر پیش کر کے انہوں نے ان روایتوں کی توثیق بھی کرالی تھی، کیا اب بھی صحیح حدیثوں کی جو تعداد ہے، عہدِ صحابہ میں بلکہ عہدِ نبوت ہی میں ان کے

Marfat.com

قلم بند ہو جانے پر کوئی شک کر سکتا ہے؟ مگر یہ داستان اسی پر ختم نہیں ہو جاتی ہے۔ حضرت انسؓ ہی کی طرح دوسرے مکثر صحابی حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، ان کی تعداد جیسا کہ ابن جوزی نے ''تلقیح'' میں لکھا ہے ایک ہزار پانچ سو چھ ہے۔ یہ تو پہلے گذر چکا کہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مسجد نبوی میں درس کا ایک حلقہ تھا، اب ان کی روایتوں کے بھی قلمبند ہونے کا حال سنئے۔

صحیح مسلم میں ان کے متعلق یہ روایت درج ہے کہ حج کے متعلق انہوں نے ایک کتاب جمع کی تھی اور حافظ ابن حجر نے ''تہذیب'' میں یہ روایت نقل کی ہے کہ ان کے شاگرد وہب بن منبہ جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شاگرد ہمام (جن کے ''صحیفہ ہمام'' کا ذکر گذر چکا) کے بھائی تھے۔ اپنے استاذ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن سے وہ براہ راست حدیث روایت کرتے ہیں، انہوں نے بھی ان کی حدیثوں کو قلمبند کیا تھا۔ اسی طرح سلمان بن قیس یشکری نے بھی حضرت جابرؓ کی حدیثوں کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا اور بڑے بڑے بزرگوں مثلاً شعبی سفیان وغیرہ نے قیس سے اس کو سنا بھی تھا۔ خود استاد نے کتاب لکھی تھی، تو شاگرد اس کی اتباع کیوں نہ کرتے۔

عورتوں میں سب سے بڑی تعداد حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیثوں کی ہے۔ محدثین نے ان کی حدیثوں کی تعداد دو ہزار دس بتائی ہے۔ خود حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متعلق تو ثابت نہیں کہ انہوں نے اپنی حدیث جمع کی تھی، اگرچہ ان کے علم و فضل کا یہ حال تھا کہ فرائض جن کے مسائل کا حل بغیر حسابی قاعدوں کے ناممکن ہے، بآسانی حل فرماتی تھیں۔ بڑے بڑے صحابہ ان سے فرائض کے پیچیدہ مسائل پوچھوا بھیجتے تھے، ایک ایک دفعہ میں کسی شاعر کے قصیدہ کے ساٹھ ساٹھ بلکہ سو سو شعر برجستہ سنا دیتی تھیں۔ حدیث کی اشاعت کا شوق ان کا بے نظیر ہے، مگر خود ان کی حدیثوں کے جمع کرنے کا حال معلوم نہیں ہوا، لیکن ان کے براہ راست شاگرد اور حقیقی بہن کے لڑکے عروہ بن زبیر جن کا شمار ان لوگوں میں ہے جو حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایتوں کے سب سے زیادہ جاننے والے تھے، ان کے متعلق عام طور سے مشہور ہے شروع میں انہوں نے بھی اپنے علم کو ایک کتاب میں قلمبند کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس میں حضرت عائشہؓ کی حدیثوں کا ہونا بھی ضرور ہے کہ سب سے بڑا سرمایہ ان کا یہی تھا، لیکن افسوس ہے کہ واقعہ حرہ جس میں مدینہ لوٹا اور برباد کیا گیا تھا، غلط فہمی کی وجہ سے انہوں نے قصداً اپنی کتاب ضائع کر دی۔ بعد کو پچھتاتے تھے اور کہتے تھے۔

لوددت انی کنت فدیتھا باھلی و مالی. (تہذیب۔۱۸۳ج ۷)

میری تمنا ہے کہ اپنے اہل وعیال اور اپنے مال کو اس کتاب پر فدا کر دیتا۔

بہر حال اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ عہد صحابہ ہی میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مجموعہ بھی جمع ہو گیا تھا، اگرچہ عروہ کی راہ سے یہ مجموعہ ضائع ہو گیا، لیکن حضرت عائشہؓ کی دوسری مشہور خاتون شاگرد جن کا نام عمرہ بنت عبدالرحمٰن ہے، جنہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی گود میں پرورش پائی تھی اور حدیث عائشہؓ کے باب میں ان کا شمار عروہ کے برابر برابر تھا، انہی عمرہ بنت عبدالرحمٰن کے علم کو ان کی بہن کے لڑکے ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے مشہور فرمان کی بنیاد پر جس کا ذکر بخاری وغیرہ میں بھی ہے، جمع کر لیا تھا۔ حافظ ابن حجر

ہیں کہ ابوبکر کے نام حضرت کا فرمان آیا تھا:

ان یکتب له من العلم من عند عمرة بنت عبدالرحمٰن و القاسم محمد

عمرہ بنت عبدالرحمٰن اور قاسم بن محمد کے علم (حدیثوں) کو وہ ان کے لیے لکھ کر تیار کریں۔

اور قاسم کے پاس بھی وہی حضرت صدیقہؓ ہی کی حدیثوں کا زیادہ سرمایہ تھا کہ آپ کے والد محمد بن ابی بکر ان کے ایام طفلی ہی میں مشہور فتنہ میں شہید ہو چکے تھے، اس لیے یتیم بھتیجے کی پرورش حضرت عائشہؓ ہی نے فرمائی۔ ان ہی کے تربیت یافتہ تھے، سب کچھ انہی سے سیکھا تھا، بہرحال حضرت عائشہؓ کی حدیثیں انہی دونوں کے ذریعہ سے ابوبکر بن محمد نے جمع کیں اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ نے ان کی نقلیں تمام ممالک اسلامیہ کے مرکزی شہروں میں بھیجیں، جس کے معنی یہ ہوئے کہ گو حضرت عروہ کی کتاب جل گئی، لیکن عمرہ بنت عبدالرحمٰن کی راہ سے حضرت عائشہؓ کا جو علم قلم بند ہوا تھا، وہ باقی رہا۔

مکثرین (یعنی جن کی حدیثوں کی تعداد ہزار سے اوپر ہے) ان میں اکثروں کے حدیثی سرمایہ کے متعلق عہد نبوت وصحابہ ہی میں قلم بند ہونے کا حال معلوم ہو چکا، اب صرف دو تین اور رہ جاتے ہیں، جن میں سے سب سے زیادہ نمبر حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایتوں کا ہے، یعنی دو ہزار چھ سو ساٹھ حدیثیں ان کی طرف منسوب ہیں۔ پہلے تو خود ان کے متعلق ابن سعد میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام رافع سے یہ حضرت ﷺ کے کارنامے لکھا کرتے تھے، ان کے مشہور آزاد کردہ غلام عکرمہ سے امام ترمذی نے اپنی ''کتاب العلل'' میں یہ روایت نقل کی ہے:

ان نفرا قد مواعلی ابن عباس من اهل الطائف بکتب من کتبه فجعل یقرء علیهم

حضرت ابن عباسؓ کے پاس طائف کے کچھ لوگ ان کی کتابوں کو لے کر حاضر ہوئے، اور ان کے سامنے ان کی کتابیں پڑھنے لگے۔

جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی زندگی ہی میں ان کی حدیثوں کا مجموعہ قلم بند ہو چکا تھا۔ لفظ ''کتب'' جو جمع کا صیغہ ہے، قابل غور ہے۔ ایک کتاب نہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے چند کتابیں تیار کی تھیں اور ان کے متعلق تو صحیح مسلم تک میں یہ روایت موجود ہے کہ حضرت علیؓ کے فیصلوں اور فتاوی کا ایک بڑا حصہ لکھا ہوا ان کے پاس لایا گیا۔ ابن سعد ہی میں روایت یہ بھی ہے کہ ابن عباسؓ کی وفات کے بعد جو علم انہوں نے چھوڑا وہ ایک بار ''شتر'' تھا، کوئی وجہ نہیں ہوسکتی کہ اس ''بارشتر'' کے کتابی مجموعہ میں ابن عباسؓ کی حدیثوں کا ذخیرہ نہ تھا۔ خود ابن عباسؓ کے ممتاز ترین رشید شاگرد سعید بن جبیر سے دارمی، طبقات ابن سعد وغیرہ میں یہ بیان منقول ہے کہ وہ ان کی حدیثوں کو لکھا کرتے تھے، کاغذ ختم ہو جاتا تو جو چیز ملتی تھی کہ ہاتھ تک پر لکھ لیتے، بعد کو گھر جا کر کاغذ پر اتارتے۔ سعید بن جبیر جو ان کے علم کے سب سے بڑے راوی ہیں، جب وہ لکھا کرتے تھے تو اس کے بھی یہی معنی ہیں کہ ابن عباسؓ کی شاید ہی کوئی حدیث لکھنے سے رہ گئی ہو۔

ان کے بعد حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیثوں کا نمبر ہے۔ ان کی حدیثوں کی تعداد ایک ہزار چھ سو تیس ہے۔ اب تک مجھے کوئی تحریری ثبوت اس کا تو نہیں ملا کہ خود ابن عمرؓ نے اپنی حدیثوں کا مجموعہ تیار کیا تھا، لیکن

Marfat.com

''دارمی'' ہی کی روایت ہے بلکہ ''طبقات ابن سعد'' میں بھی یہ روایت موجود ہے کہ سلمان بن موسیٰ کا یہ بیان ہے:

انه رای نافعا مولیٰ ابن عمر علی عمله و یکتب بین یدیه

کہ ابن عمر کے مولیٰ نافع کو دیکھا کہ لوگ ان کے سامنے بیٹھ کر لکھ رہے تھے۔

نافع کے متعلق سب جانتے ہیں کہ یہ حضرت ابن عمرؓ کے چہیتے آزاد کردہ غلام تھے۔ تیس سال تک ان کی خدمت میں رہے۔ امام مالک کی انہی روایتوں کو جو نافع، ابن عمرؓ کے ذریعہ سے وہ روایت کرتے ہیں، بعض لوگ سلسلۃ الذہب (سنہری زنجیر) قرار دیتے ہیں۔ اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ ابن عمرؓ کا علم خود ان کے براہ راست شاگرد کے ذریعہ سے یقیناً قلم بند ہو چکا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ ابن عباسؓ وابن عمرؓ کے زمانہ تک بنی امیہ کی حکومت قائم ہو چکی تھی، جس میں تصنیف وتالیف بلکہ ترجمہ تک کا چرچا مسلمانوں میں عام طور پر ہو چکا تھا۔ ان بزرگوں کی حدیثوں کا نہ قلمبند ہونا البتہ محل تعجب ہے۔ پھر جب دلائل موجود ہیں تو انکار کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

اور یہ حال تو ان بزرگوں کی حدیثوں کا ہے جو مکثرین کے طبقہ میں شمار کئے جاتے ہیں، ان کے سوا دوسرے اصحاب رسول اللہ ﷺ جن کا شمار اس طبقہ میں نہیں ہے۔ ان میں ایک نہیں متعدد صحابیوں کے متعلق ثابت ہے کہ صرف ایک دو حدیث نہیں بلکہ ان کے اچھے خاصے مجموعے لکھے ہوئے موجود تھے، جن میں بعض تو خود رسول اللہ ﷺ کے لکھوائے ہوئے تھے، مثلاً وائل بن حجرؓ صحابی جو حضر موت کے شاہزادوں میں تھے، مدینہ آ کر مسلمان ہوئے اور کچھ دن قیام فرما کر جب واپس جانے لگے تو ''طبرانی صغیر'' میں مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ایک صحیفہ لکھوا کر ان کے حوالے کیا، جس میں نماز روزہ شراب سود وغیرہ کے احکام تھے۔

دوسری طویل چیز جو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی لکھوائی ہوئی ہے، اس کا تو ذکر بخاری تک میں ہے۔ آپ میں کون نہیں جانتا کہ حجۃ الوداع میں حضور ﷺ نے جو خطبہ دیا تھا، اس میں ہر فقرہ بجائے خود اسلام کا ایک اصول تھا اور اچھا خاصہ طویل ہے، ابو شاہ یمنیؓ صحابی کی درخواست پر حضور ﷺ نے یہ خطبہ ان کو لکھوا کر دیا۔ بخاری کی روایت سے شاید شبہ ہو سکتا ہے کہ پورے خطبہ کی نقل کا شاید حکم نہیں دیا گیا۔ امام اوزاعی جو سیر کے امام ہیں، ان سے یہ پوچھا گیا کہ کیا پورا خطبہ لکھوایا گیا تھا، بولے ہاں،

هذه الخطبة التي سمعها من النبي ﷺ ۔ (عینی۔ نمبر۲۔ ۵۷ ج)

یعنی وہی خطبہ جسے انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا تھا (لکھوا کر دیا گیا)

''دارمی'' ہی کی ایک اور روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یمن والوں کو حضور ﷺ نے مختلف قسم کے احکام ایک رسالہ کی شکل میں لکھوا کر بھیجے تھے۔ ''دارمی'' کے الفاظ یہ ہیں:

ان رسول الله صلى الله عليه و سلم كتب الیٰ اليمن ان لا يمس القرآن الا طاهر ولا طلاق قبل املاك ولا عتاق حتى يتباع. (ص۲۹۳)

آنحضرت ﷺ نے یمن والوں کو یہ لکھوا کر بھیجا کہ قرآن کو پاک آدمی کے سوا کوئی نہ چھوئے، اور قبل مالک ہونے (یعنی نکاح

Marfat.com

کے) طلاق نہیں ہے، اور جب تک غلام خریدا نہ جائے اس کے آزاد کرنے کے کوئی معنی نہیں۔

اس کتاب میں جب اتنے تفصیلی مسائل تھے تو اسلام کے عام فرائض و واجبات کا ہونا تو زیادہ اغلب ہے۔ اسی طرح ''کنز العمال'' میں ایک روایت ہے کہ عمرو بن حزم کو جب آنحضرت ﷺ نے یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو ایک تحریر بھی لکھوا کر ان کے حوالہ فرمائی گئی، جس میں فرائض، صدقات، دیات (یعنی قتل کے خون بہا کا قانون) وغیرہ کے متعلق بہت سی ہدایتیں تھیں۔ اسی طرح حافظ ابن حجر نے ''تہذیب'' میں حضرت سمرہؓ بن جندب مشہور صحابی کے بیٹے سلیمان بن سمرہ کے متعلق لکھا ہے کہ

روی عن ابیه نسخة کبیرة (تہذیب۔ص ۱۹۸ جلد ۴)

اپنے والد سے وہ ایک بڑا نسخہ روایت کیا کرتے تھے۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سمرہؓ کی حدیثیں بھی جمع ہو چکی تھی، خصوصاً ''کبیرة'' کے لفظ سے اس کی زیادہ تائید ہوتی ہے، ورنہ چند حدیثوں کے متعلق ظاہر ہے کہ ''نسخہ کبیرة'' کا اطلاق صحیح نہیں ہو سکتا۔ ترمذی نے کتاب الاحکام میں ایک روایت ''باب الیمین مع الشاہد'' کے سلسلہ میں جو درج کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قبیلۂ خزرج کے مشہور سردار حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بھی ایک صحیفہ تھا، جس کے حوالہ سے ان کے صاحبزادے بعض روایتیں بیان کیا کرتے تھے، اور اس میں کوئی تعجب بھی نہیں ہے، اس لیے کہ قبل الاسلام کتاب یعنی لکھنے میں جن لوگوں کو مہارت حاصل تھی، ان میں ایک حضرت سعد بن عبادہؓ بھی تھے۔ بخاری کی ایک روایت سے جو ''کتاب الجہاد و باب الصبر علی القتال'' میں مروی ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے، حضرت عبداللہ ابن ابی اوفی صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اپنی حدیث لکھا کرتے تھے، اسی طرح بخاری، ترمذی اور صحاح کی دوسری کتابوں میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ایک صحیفہ کا ذکر پایا جاتا ہے، جسے وہ اپنی تلوار کے نیام میں رکھا کرتے تھے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس صحیفہ میں ''شریعت'' کے بعض اہم مسائل تھے۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بیان فرمائے تھے۔ تلاش اور تتبع سے اگر اور کام لیا جائے تو اس قسم کے کتابی ذخیروں میں اور اضافہ ہو سکتا ہے، لیکن بالفعل اپنے بیان کی پہلی قسط کو اسی پر ختم کرتا ہوں اور مقالہ کے دوسرے مباحث کا تذکرہ ان شاء اللہ آئندہ قسطوں میں کیا جائے گا، جس میں سب سے پہلے یہ بیان کیا جائے گا کہ جب حدیث کے کتابی ذخیرہ کا اتنا بڑا سرمایہ عہد نبوت و صحابہ میں جمع ہو چکا تھا اور حدیث کی عام کتابوں میں اس کا ذکر موجود تھا، پھر باوجود اس کے لوگوں کو یہ مغالطہ کس بنیاد پر ہوا کہ سب سے پہلے حدیث کی کتابی تدوین ابن شہاب زہری نے پہلی صدی کے اختتام میں عمر ابن عبدالعزیز خلیفہ کے فرمان سے شروع کی؟ اس مغالطہ کے ازالہ کے بعد جن حقائق کا انکشاف ہوگا، ان کے نتائج پر بحث کرنے کے بعد ''تدوین حدیث'' کے دوسرے مباحث کا تذکرہ کیا جائے گا۔

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت و الیہ الیب

Marfat.com

حواشی

۱۔ بلکہ اگر بعض ثقہ راویوں کا یہ بیان صحیح ہے کہ ہندوستان کی بعض قوموں کے علمی مرکزوں میں قدیم ہند کے لیے تاریخی مواد فراہم کرنے کی ایک صورت یہ بھی نکالی گئی ہے کہ آہنی اور برنجی پتروں یا تختیوں پر پرانی زبانوں پرانے حروف میں اپنے مطلب کے موافق عبارتیں کندہ کر لی جاتی ہیں اور کسی مشہور آثاری کھنڈر میں انہی کو دفن کر دیا جاتا ہے، پھر کچھ دنوں کے بعد انہی کو نکال کر علمی ذخیرہ میں جدید اکتشاف کی حیثیت سے ان کا اور ان سے جو نتائج نکلتے ہیں، اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو علم پر جاہلوں کا یہ کتنا بڑا ظلم ہے اور اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہم جن قدیم کتبوں پر اندھادھند ایمان لا رہے ہیں ان میں بھی اشتباہ کی کس حد تک گنجائش ہے، بلکہ سکندر کی لانبی مدفونہ زرہوں کا افسانہ اگر صحیح ہے تو صرف کتابی ہی نہیں، بلکہ ان کھنڈروں سے جو چیزیں نکل رہی ہیں اور ان سے جو نتائج نکالے جا رہے ہیں، محلِ غور وفکر بن جاتے ہیں۔

۲۔ یعنی اے اللہ کیا میں نے پہنچا دیا، کیا میں نے پہنچا دیا، تین دفعہ ارشاد فرمایا۔

۳۔ جو مجھ پر قصداً جھوٹ باندھے گا، چاہیے کہ اپنا ٹھکانا آگ میں تیار کر لے۔

۴۔ ایمان لایا میں اس کتاب پر جو تو نے اتاری اور اس نبی پر جسے تو نے بھیجا۔

۵۔ حضرت ﷺ کوئی بات کو تین بار دہراتے تھے۔

۶۔ قاضی ابو یوسف نے ''کتاب الخراج'' میں روایت کی ہے کہ فارس کے غنائم جن میں الجوہر واللولو والذہب والفضہ کی کثیر مقدار تھی، حضرت عمرؓ کے سامنے جب ان کا ڈھیر لگایا گیا، تو رونے لگے اور فرمایا کہ جس قوم کو یہ چیزیں ملیں بالآخر ان میں بغض و عداوت کا پیدا ہونا ضروری ہے۔

۷۔ بعضوں کا خیال یہ بھی ہے کہ ابو جمرہ چونکہ فارسی جانتے تھے، اس لیے حضرت ابن عباسؓ کی باتوں کا ترجمہ عربی نہ جاننے والوں کو سنا دیا کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ دونوں کام کرتے ہوں۔

۸۔ یہ اکبر مرحوم کے مشہور شعر ؎

اکبر کی حقیقت کو تم کچھ پوچھو محلے والوں سے
ہاں شعر تو اچھا کہتے ہیں، دیوان تو ان کا دیکھا ہے

کی طرف تلمیح ہے۔

۹۔ مختلف انجیلوں کے مختلف ابتدائی راویوں کے نام ہیں اور سنجے اس گاڑ بیان کا نام ہے جو ہندوؤں کی مشہور کتاب ''گیتا'' کا سری کرشن سے تنہا راوی ہے، محض اسی کی روایت کی بنیاد پر ہندو ''گیتا'' کو گویا ایک قسم کی آسمانی کتاب سمجھتے ہیں۔

۱۰۔ آنحضرت ﷺ کی جوتیاں مسواک اور گدے کی نگرانی ان ہی کے ذمہ تھی، اس لیے انہیں یہ خطاب دیا گیا تھا۔

۱۱۔ قسطنطنیہ میں آپ کے دفن کا واقعہ بڑا عبرت انگیز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مسلمان قسطنطنیہ کا محاصرہ کیے پڑے تھے جس میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے۔ اتفاق سے بیمار ہوئے اور یقین ہو گیا کہ آخری وقت ہے۔ وصیت فرمائی کہ میری وفات کے بعد جنازہ کو لے کر مسلمان حملہ کریں اور دشمن کی زمین میں جہاں تک گھس سکتے ہوں گھستے چلے جائیں۔ آخری نقطہ جہاں تک تمہاری رسائی ہو، اسی میں مجھے دفن کر دینا۔ جنازہ لے کر مسلمانوں نے حملہ کیا اور غنیم کو پسپا کرتے ہوئے فصیل کی دیوار تک پہنچ گئے، وہیں قبر کھودی اور حضرت کو دفن کر دیا گیا۔ محمد فاتح نے جب صدیوں بعد قسطنطنیہ فتح کیا، تو خواب میں آپ نے اپنی قبر کا نشان دیا، اسی پر جامع ابی ایوب تیار ہوئی۔

۱۲۔ فن تنقید رجال میں انسانی فطرت کی اس کمزوری کا خیال کیا گیا ہے، جس کی تعبیر ''المعاصرۃ اصل المنافرۃ'' ہم عصری باہمی نفرت

Marfat.com

کی بنیاد ہے'' کے مشہور فقرہ سے کی گئی ہے، اسی لیے معاصر کی معاصر کے متعلق تعریف بہت اہم سمجھی جاتی ہے۔

۱۳۔ خلفاء پر جب اچانک حملے ہونے لگے، تو مسجد میں ایک کمرہ خاص بنا دیا جاتا تھا، جس میں خلیفہ سنتیں وغیرہ پڑھتے اور اس سے باہر ہو کر منبر پر آتے۔ اسی کو مقصورہ کہتے تھے۔

۱۴۔ میں نے اب تک اس موضوع پر کوئی مستقل مقالہ تو نہیں لکھا ہے لیکن ''جاہلیت اولیٰ و جاہلیت اخریٰ'' کے عنوان سے جو میرا مضمون شائع ہو چکا ہے، اس میں پیش نظر مواد کا ایک حصہ آ گیا ہے۔ خدا نے چاہا تو ان شاء اللہ اپنے معلومات کو کسی مستقل کتاب کی شکل میں مرتب کر دوں گا۔

۱۵۔ منجملہ دیگر عام مصادر کے میری کتاب ''النبی الخاتم'' توراۃ وانجیل وغیرہ کے متعلق اس سلسلہ کے کافی معلومات مل سکتے ہیں۔

۱۶۔ ہمارے فاضل وعزیز دوست ڈاکٹر مولانا حمید اللہ صاحب ڈی فل ڈی لٹ پروفیسر جامعہ عثمانیہ نے ان کو ایک خاص فاضلانہ ترتیب کے ساتھ جمع بھی کر دیا ہے اور اب ان کی یہ کتاب مصر میں ''الوثائق السیاسیہ'' کے نام سے طبع ہو رہی ہے۔ اب تک ڈاکٹر صاحب ممدوح کو عہد نبوی کے (۲۷۷) کتابی وثائق مل چکے ہیں۔

(در: معارف (اعظم گڑھ)، اپریل ۱۹۴۱ء، ص ۲۴۵۔۲۶۴،
مئی ۱۹۴۱ء، ص ۳۲۵۔۳۵۹، جون ۱۹۴۱ء، ص ۴۰۵۔۴۳۵)

☆......☆......☆

فقہ

امام ابو حنیفہؒ کا سیاسی مسلک

پہلا اقدام

سب سے پہلی بات اس سلسلہ میں ہمیں ان کی زندگی کے اندر جو نظر آتی ہے اس کی تعبیر چاہیے تو حکومت ظالمہ سے مقاطعہ یا ''ترک موالات'' کے الفاظ سے بھی کر سکتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ حکومت کے خزانے سے جس کی آس اور امید نہیں ٹوٹی ہے۔ حکومت والوں سے ترک تعلق کی آرزو یقیناً اس شخص کی جھوٹی ہے۔ آدمی فرشتہ زادہ نہیں آدم زادہ ہے۔ طبعی ضرورتوں کا محتاج بنا کر پیدا کیا گیا ہے۔ انسانیت کی اسی طبعی کمزوری سے ہر عہد کے جبابرہ نے فائدہ اُٹھایا ہے، امام صاحب کے عہد میں بھی اُٹھا رہے تھے۔ شیروں کے گلوں کا طوق اور پاؤں کی زنجیر ہی روبہ مزاجیاں ہیں جنہیں احتیاج پیدا کرتی ہے۔ امام صاحب کے سامنے ایسے کتنے شیر تھے جنہیں بنی امیہ اور بنی عباس کے سلاطین ان ہی بیڑیوں اور زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ چالیس چوروں کا وہ گروہ جس نے بادشاہِ وقت کو ہر قسم کی ذمہ داریوں سے بری قرار دینے کی شہادت پیش کی تھی جہاں تک میں سمجھتا ہوں اسی مار کے وہ ڈسے ہوئے تھے۔ دین بیچ کر وہ دنیا خرید رہے تھے۔

قاضی شریک کی ملازمت

قاضی شریک جن کا پہلے بھی ذکر آچکا ہے اور شائد آئندہ بھی آئے، عباسیوں کے عہدۂ قضا کو انہوں نے جب قبول کر لیا۔ کیسے قبول کر لیا، یہ تو خیر الگ قصہ ہے، لیکن جب قبول کر کے تنخواہ کے مستحق ہوئے تو مشہور مؤرخ المسعودی نے لکھا ہے کہ

ولقد کتب بارزاقه الی الجهبذ[1] فضا یقه فی النقص فقال له الجهبذانک لم تبع بزا

قاضی شریک کی تنخواہ کے لیے جھبذ کے نام (چک) لکھ دیا گیا تو جھبذ ان کو کچھ کم دینے لگا۔ قاضی شریک جھگڑنے لگے تو اس نے کہا کہ معاوضہ تم کو کس چیز کا دیا جائے۔ کیا تم نے کپڑا بیچا ہے؟

اس کا جواب میں جھبذ سے جو بات قاضی شریک نے کہی خواہ بطور طیب اور مذاق ہی کے کہی ہو لیکن کچھ نہ کچھ حقیقت کی جھلک بھی اس میں نظر آتی ہے یعنی قاضی شریک نے جھبذ سے کہا:

Marfat.com

بلی واللہ لقد بعت اکبر من البز لقدبعت دینی (ص ۱۹۸۔المسعودی برحاشیہ کامل)
خدا کی قسم میں نے تو کپڑے سے بھی زیادہ قیمتی چیز فروخت کی ہے۔ میں نے اپنا دین بیچا ہے (اس کی قیمت لے رہا ہوں)۔

قاضی صاحب جیسے متدین ومتقی وثقہ بزرگ نے واقعۃً اپنا دین بیچ دیا تھا۔ اس کی تو خیر ان کی ذات سے کیا توقع ہوسکتی ہے، ان کی جلالت قدر کا اسی سے اندازہ کیجئے کہ بخاری اور مسلم کے راویوں میں ہیں، لیکن حکومت کی منت پذیری کے بعد بہرحال آدمی میں وہ جرأت اور دلیری باقی نہیں رہتی جس کی توقع بے نیازی اور استغنا میں کی جاسکتی ہے[1] اور غالباً اسی کمزوری کی تعبیر قاضی صاحب دین فروشی سے فرمارہے تھے۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ سفیان ثوری جو حضرت امام کے معاصرین میں ہیں، ابتداءً حکومت کے بعض والیوں کی پیش کش کو انہوں نے قبول کرلیا تھا، لیکن لے لینے کے بعد اپنے اندر جس انقلاب کو انہوں نے پایا اس کے بعد طے کرلیا کہ پھر حکومت والوں سے کبھی کچھ نہ لوں گا، ابن سعد نے لکھا ہے:

ثم ترک ذلک فلم یقبل من احد شیئا (ص ۲۵۸۔ج ۶)
پھر انہوں نے قطعی طور پر اس رویہ کو ترک کردیا اور کسی سے پھر کچھ نہ لیا۔

بقدر ضرورت آپ نے بھی تجارت کا کاروبار اختیار فرمالیا تھا جس کی صورت یہ تھی کہ اپنے چند خاص قابلِ اعتماد تاجر معتقدوں کو سرمایہ دے دیتے۔ یہی لوگ کاروبار کر کے جو نفع بچتا، وہ ان کے حوالہ کردیتے، لیکن دستور تھا کہ دو سو دینار ہمیشہ اپنے پاس بھی رکھتے۔ پوچھنے پر لوگوں سے آپ نے مشہور فقرہ فرمایا۔

لو لا ھذہ لتمند لنی ھولاء
اگر میرے پاس یہ نہ ہوں تو یہ لوگ (یعنی ارباب حکومت) مجھے اپنے منہ پوچھنے کا رومال بنالیں[2]

دہن دوزی کا نسخہ

حکومت والے بھی ''زر برسرِ سنگ نہی نرم شوذ'' کے راز سے خوب واقف تھے۔ دینی اور اخلاقی ذمہ داریوں کی ساری طاقت اسی زرطلبی کی راہ میں وہ خود کھو چکے تھے۔ دوسروں کو اپنے آپ پر قیاس کرتے تھے اور عام حالات میں ان کا قیاس زیادہ غلط بھی ثابت نہیں ہوتا تھا۔ اسی سلسلہ میں دہن دوزی کے گُر کو بھی ان کے یہاں خاص اہمیت حاصل تھی۔ لوگوں نے توجہ نہ کی ورنہ تاریخ کی شہادتیں شاید یہ ثابت کرسکتی ہیں کہ بنی امیہ اور بنی عباس دونوں حکومتوں میں ''دہن دوزی'' کے اس اکسیری نسخہ کا استعمال عام طور پر مروج تھا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ترلقموں سے لوگوں کی زبانوں کے بند کرنے کا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے یہاں خاص نظام مقرر تھا۔ شائد اس میں بھی ذاتی تجربات ہی کو دخل تھا۔ آپ تاریخ کی کتابیں اُٹھا کر پڑھیے، نہ صرف سلاطین بلکہ ولاۃ (گورنرس) اور ان کے نواب تک کے دسترخوانوں کی وسعت ودرازی کے قصے کثرت سے ملیں گے۔[3] کیا اس سے امراء کا یہ مقصود تھا غرباء تک ان چیزوں کو پہنچایا جائے جن تک اپنی محدود آمدنی کی وجہ سے ان کی رسائی نہیں ہوسکتی تھی؟

Marfat.com

اور قصوں کو تو تاریخوں میں پڑھیے، بعض چیزوں کا ذکر میں نے بھی حاشیہ میں کر دیا ہے۔ اس وقت آپ کے سامنے قاضی شریک ہی کے واقعہ کو پیش کر دیتا ہوں جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مطلب ان لوگوں کا کیا ہوتا تھا۔ یہ تو عرض کر چکا ہوں کہ قاضی شریک نے بالآخر حکومت سے ''موالات'' کا تعلق قائم کر لیا۔ گو اپنے نزدیک اس کو وہ ''دین فروشی'' بھی سمجھتے رہے لیکن یہ بات کہ انہوں نے قضاء یا شاہزادوں کی تعلیم کی خدمت کیوں قبول کر لی؟ المسعودی نے اسی سلسلہ میں لکھا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ عباسیوں کا تیسرا حکمراں مہدی جو ابوجعفر منصور کا بیٹا تھا اور ہادی و ہارون کا باپ، اسی نے ایک دن قاضی شریک کو بلوایا اور اصرار کے ساتھ اس نے ان کے سامنے تین باتیں پیش کیں۔ اسی کے ساتھ اس سے بھی اس نے مطلع کر دیا کہ ان تین میں سے کسی ایک کو بہر حال قبول کرنا ہی پڑے گا۔ تین باتیں یہ تھیں: قضاء کی خدمت میری حکومت میں قبول کر و یا میرے بچوں کو حدیث پڑھانے اور تعلیم دینے کی ذمہ داری لو، اور یہ دونوں باتیں تمہیں منظور نہ ہوں تو صرف ایک دفعہ ہمارے ہاں کا پکا ہوا کھانا کھا لو۔ نوکری سے تو قاضی صاحب بے زار ہی تھے۔ آخری بات ان کو سب سے زیادہ آسان نظر آئی۔ خیال کیا کہ وقتی کام ہے، دوامی تعلق تو اس سے پیدا نہیں ہوتا اس لیے کھانا کھانے پر راضی ہو گئے۔ مہدی نے اپنے باورچی خانہ میں کہلا بھیجا۔ خاص طور پر فرمائش کی کہ مختلف کھانوں کے ساتھ انڈے کی زردی کا حلوا طبرزد کی شکر اور شہد میں تیار کر کے قاضی شریک کے لیے حاضر کیا جائے۔ کھانا اور حلوا تیار ہو کر آ گیا۔ قاضی صاحب کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ المسعودی نے لکھا ہے کہ کھانے سے جب قاضی صاحب فارغ ہوئے اور غالباً مہدی سے رخصت ہو کر روانہ ہوئے تو مہدی کے باورچی خانہ کا قیم (داروغہ) حاضر ہوا۔ سنا گیا کہ مہدی سے کہہ رہا تھا۔

یا امیر المومنین لیس یفلح الشیخ بعد هذه الا کله (ص ۹۷ ج ۸۔ المسعودی بر کامل بن اثیر)

امیر المومنین اس لقمہ کے بعد شیخ (یعنی قاضی شریک) اپنے مقصد میں یعنی حکومت سے ترک موالات کے نباہنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

فضل بن ربیع جو اس قصہ کا راوی ہے، اس کا بیان ہے کہ واقعہ آخر میں یہی پیش بھی آیا یعنی

فحدثهم واللّٰه شریک بعد ذلک وعلم اولاد هم دولی القجاء لهم. (ص ۹۷۔ ج ۸)

قاضی شریک نے خدا کی قسم ان لوگوں کے بچوں کو حدیث بھی پڑھائی تعلیم بھی دی اور قضاء کی خدمت بھی قبول کی۔

واللہ اعلم بالصواب فضل کا یہ خیال کہاں تک صحیح ہے یعنی اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ قاضی صاحب نے آخر عمر میں اپنی سپر ڈال دی تھی اور یہ سارے خدمات حکومت کے انہوں نے انجام دیئے۔ لیکن یہ بات کہ یہ نتیجہ اسی ''الاکلہ'' (لقمہ) کا تھا جس کے متعلق مہدی کے داروغہ نے پیشین گوئی کی تھی۔ یا دوسرے اسباب پیش آئے، بہ ظاہر قاضی شریک جیسی بلند ہستی کا صرف ''الاکلہ'' سے متاثر ہو کر اپنی عمر بھر کی آن کو توڑ دینے پر آمادہ ہو جانا بعید از قیاس ہے بلکہ زیادہ تر یہی خیال گذرتا ہے کہ آخر میں اس قسم کے کلی ترک موالات کے متعلق ان کا خیال بدل گیا۔ یا ہو سکتا ہے کہ اس شیر بیشہ آزادی و حریت کو روبہ مزاجی پر اسی نے مجبور کیا ہو، جس نے خدا جانے انسانی تاریخ کے کتنے شیروں کو لومڑی

Marfat.com

کر چھوڑ دیا۔ بہر حال اصل واقعہ کچھ ہی ہو، لیکن ان حکمرانوں کے خیال کا تو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے کھلانے پلانے داد و دہش کے پیچھے درحقیقت کون سی چیزیں کارفرما تھیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ مہدی نے تعلیم حدیث یا عہدۂ قضاء جیسی ان میل بے جوڑ بات جو پیش کی تھی اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ''دہن دوزی'' کے اس نسخہ پر ان کو کتنا اعتماد تھا۔ اور یہی میں کہنا چاہتا تھا کہ حضرت امام رحمۃ اللہ دیکھ رہے تھے کہ حکومت لوگوں کو اپنے جال میں پھنسانے کے لیے کن کن ترکیبوں سے کام لے رہی ہے۔ جب تک پوری بے نیازی اور استغنا کا انتظام نہ کر لیا جائے ان کو نظر آ رہا تھا کہ بڑے بڑوں کے پاؤں پھسل رہے ہیں۔ قاضی شریک جیسے بزرگوں کی ضد ختم ہو جاتی ہے، عزم ٹوٹ جاتا ہے، ایسی صورت میں صرف حکومت سے ترک موالات کا ارادہ کر لینا قطعاً ناکافی تھا، اور حکومت سے اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھنے میں قناعت یا جفاکشی وغیرہ کے مشقتوں سے آدمی اگر کامیاب بھی ہو جائے لیکن صرف اتنی بات حکومت سے مقابلہ کرنے کے لیے یقیناً کافی نہیں ہو سکتی۔

میں نے جیسا کہ عرض کیا خود امام صاحب کا کوئی واضح بیان، ان کے لائحہ عمل کے متعلق نہیں ملا ہے نہ ان ہی کا ملا ہے اور نہ کسی اور کا اور جو کچھ ملا ہے اس کا ذکر کر دیا جائے گا لیکن جو کام انہوں نے کیا اس وقت اسی کو دکھانا چاہتا ہوں۔

حضرت امام کا وسیع پیمانے پر تجارت کا کاروبار

لکھنے کی حد تک یوں تو عام مورخین صرف اس قدر لکھ کر گزر جاتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تجارت کرتے تھے۔ بعضوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ خز کی[1] تجارت کرتے تھے۔ یہ ایک قسم کا کپڑا تھا، جس کا رواج اسلام کی ابتدائی صدیوں میں بکثرت نظر آتا ہے۔ لیکن امام کی تجارت کس پیمانے پر تھی، لوگوں نے اس کی طرف کم توجہ کی۔ واقعہ یہ ہے کہ اولاً خز کی تجارت ہی کوئی معمولی تجارت نہ تھی۔ اس زمانہ میں جب عام سوتی کپڑوں کی ارزانی کا یہ حال تھا جس کا اندازہ ''طبقات ابن سعد'' کی اس روایت سے ہو سکتا ہے، ابوالعالیہ الریاحی جن کا زمانہ امام صاحب نے بھی پایا تھا یعنی جس وقت ابوالعالیہ کی وفات بصرہ میں ہوئی حضرت امام کی عمر دس سال کی تھی۔ بہر حال ان ہی ابوالعالیہ کے ترجمہ میں ابن سعد نے لکھا ہے کہ ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ابوالعالیہ نے اپنے شاگردوں سے بیان کیا کہ اس وقت میرے جسم پر کل پندرہ درم کا لباس تھا جس میں قمیض عمامہ چادر سب ہی چیزیں شریک تھیں۔ پندرہ درم کا مطلب آپ نے سمجھا؟ بہ مشکل چار سوا چار روپیہ ہوتے ہیں۔ مشین کے زمانہ میں بھی جب یہ قیمت قابلِ تعجب ہے تو لوگوں کو اس زمانہ میں اگر تعجب ہو، اس پر حیرت کرنی چاہیے، یعنی ان کے شاگردوں نے پوچھا کہ آخر آپ کرتے کیا تھے؟ جواب میں انہوں نے جو بات کہی تھی۔ اسی کا پیش کرنا مقصود ہے۔ ابوالعالیہ نے بیان کیا۔

كنت اشترى كر باسة رازية باثنى عشر درهما فاجعل منها قميصا و عمامة و كان يجزينى ازاد ثلثة

(دراهم البسه تحت القميص۔ ص ۸۲ طبقات ج ۷)

Marfat.com

میں بارہ درم میں ایک تھا۔ ان رازی[۵] کرباس کا خرید لیا کرتا تھا۔ اسی سے ایک قمیض اور عمامہ بنا لیتا اور تین درم کی لنگی مجھے کافی ہو جاتی تھی، قمیض کے نیچے اس لنگی کو پہنتا تھا۔

اس سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ کی قمیض موجودہ زمانہ کی چھوٹی قمیضوں جیسی نہیں ہوتی تھی، بلکہ اتنی لمبی ہوتی تھی کہ لنگی اس کے نیچے آجاتی تھی۔ بہرحال کپڑے کی ارزانی کے ان ہی دنوں میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کا بیان کتابوں میں یہ نقل کیا جاتا ہے کہ خز کے دو تھانوں کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ

بعت احد هما بعشرين ديناراً۔ (مناقب موفق۔ ص ۲۱۹ ج)

جن میں سے ایک تھان کو میں نے بیس اشرفیوں میں فروخت کیا۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیس بیس اشرفی تک عام طور پر خز کا ایک ایک تھان بکتا تھا بلکہ متصل سند کے ساتھ ابوالفضل بن خشام کی جس روایت کو ارباب ''مناقب'' نے نقل کیا ہے یعنی مدینہ کے ایک آدمی کے ہاتھ امام صاحب کی غیر موجودگی میں ایک شخص نے خز ہی کا ایک تھان ایک ہزار درم میں بیچ دیا تھا۔ معلوم ہونے پر شاگرد بے چارا عتاب میں ان کے اس لئے مبتلا ہو گیا تھا کہ تھان کی اصلی قیمت چار سو درم تھی (دیکھو مناقب موفق، ص ۱۹۹ ج ا)۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایک تھان خز کا لوگ ایک ایک ہزار درم تک میں خرید لیتے تھے۔ گویا یہ کوئی ایسی بات نہیں سمجھی جاتی تھی جس کا رواج نہ ہو۔

تجارت کی تفصیلات

خیر یہ تو خز کی اہمیت کا حال تھا لیکن امام اس قیمتی کپڑے کی تجارت کس پیمانے پر کر رہے تھے؟ جہاں تک کتابوں سے معلوم ہوتا ہے۔ چار چیزیں اس باب میں معلوم ہوتی ہیں (ا) پہلی بات تو یہی ہے کہ امام صرف خز کے تاجر ہی نہیں تھے بلکہ خز بافی کا کوئی بڑا کارخانہ کوفہ میں ان کا جاری تھا۔ (۲) کوئی حانوت خاص (شاپ) بھی کوفہ میں خز کی تھی جس سے مال کی فروخت کا سلسلہ جاری تھا۔ (۳) غلاموں سے بھی مال کی پھیری کراتے تھے۔ (۴) کوفہ سے دساور دور دراز علاقوں مثلاً بغداد، نیشاپور، مرو وغیرہ مال بھیجتے تھے اور وہاں سے منگواتے تھے۔

خز کی دُکان

خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ

كان ابو حنيفه خز ازاو دكانه معروف فى دار عمرو بن حريث (ص ۳۲۵ ج ۱۳)

امام ابوحنیفہ خز کپڑے کے تاجر تھے۔ ان کی دکان عمرو بن حریث کی کوٹھی میں عام طور پر مشہور معروف تھی۔

اولاً لفظ ''معروف'' ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مشہور دکان تھی، لیکن آگے عمرو بن حریث کے دار کا جو پتہ دیا گیا ہے پہلے تو خود دار کے لفظ سے اگر وہی مفہوم سمجھا جائے جو اردو میں گھر سے سمجھا جاتا ہے تو عربی کی اصطلاح سے یہ ناواقفیت کا نتیجہ ہوگا۔ ابن ہمام نے ''فتح القدیر'' میں لکھا ہے۔

الدار اسم للساحة ادیر علیها الحد ود تشتمل علی بیوت و اصطبل و صحن غیر مسقف و علو

(ص۳۰۲ ج۵)

دار اس میدان کو کہتے ہیں جس کے چاروں طرف احاطہ ہوتا ہے۔ اسی احاطہ میں مکانات اصطبل صحن جس پر چھت نہ ہو اور دوسری منزل وغیرہ والی عمارت ہوتی ہے۔

یعنی دراصل الدار اس پورے احاطہ کی تعبیر ہوتی ہے جسے اس زمانہ میں لوگ کمپونڈ وال کہتے ہیں۔ بعض ریاستوں مثلاً ٹونک اور رام پور وغیرہ میں ''گھیر'' کا لفظ الدار کا مرادف ہے۔ بیسیوں ایکڑ کی زمین کو یہ ''گھیر'' حاوی ہوتا ہے۔ فلاں امیر کا گھیران ریاستوں میں اسی دار کے مفہوم کو ادا کرتا ہے۔ ماسوا اس اصطلاحی مسئلہ کے عمرو بن حریث کے اس ''دار'' کا اس کے طول وعرض اور غیر معمولی وسعت کی وجہ سے مورخین نے خصوصیت کے ساتھ تذکرہ بھی کیا ہے۔ ابن سعد میں ہے کہ:

نزل عمر و بن حریث الکوفه وا بتنی بها داراً الی جانب المسجد و هی کبیرة مشهورة

(ص۱۴ ج۴۔ طبقات)

عمرو بن حریث صحابی کوفہ پہنچے اور مسجد کے پہلو میں ایک حویلی تیار کی جو بہت بڑی تھی اور مشہور ہے۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوفہ کا یہ معمولی دار نہ تھا اور نہ دار کے بعد ''کبیرہ'' اور ''مشہور'' کے الفاظ کے بڑھانے کی ضرورت نہ تھی اور اس عبارت سے حضرت امام کی اس دکان کے محل وقوع کا بھی تعین ہو جاتا ہے یعنی کوفہ کی ''المسجد'' کے متصل یہ دکان تھی۔ میرا خیال ہے کہ عمرو بن حریث کے اس کبیرہ مشہور دار میں امام صاحب کی ''دکان'' کی حیثیت ان دکانوں جیسی نہ تھی۔ جیسا کہ اس زمانہ میں ''دکان'' کے لفظ سے سمجھا جاتا ہے، یعنی کسی کمرے میں جس کے سامنے برآمدہ ہو، اس میں تاجر کپڑے رکھ کر بیچتے ہیں بلکہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عمرو بن حریث کے اس پورے ''گھیر'' میں خزبافی کا بھی کاروبار ہوتا تھا، جس کی وجہ یہ ہے کہ ابن سعد نے مذکورہ بالا الفاظ کے بعد لکھا ہے کہ

فیها اصحاب الخز الیوم

اس دار میں خزباف اس وقت تک رہتے ہیں۔

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ''خز'' والوں کی ایک آبادی اس گھیر میں رہتی تھی۔ ممکن ہے کہ امام صاحب کی طرف سے بطور مزدوروں کے یہ لوگ اس ''گھیر'' میں ''خزبافی'' کا کام کرتے ہوں ایسی صورت میں گویا سمجھنا چاہئے کہ حضرت امام نے یہاں خزبافی کا کوئی کارخانہ ہی کھول رکھا تھا۔ یا ہو سکتا ہے کہ انفرادی طور پر خز بنانے والے اس گھیر میں آباد ہوں اور ان ہی سے خرید خرید کر امام صاحب ان کے مصنوعات کو فروخت کرتے ہوں۔ احتمال

دونوں کا ہے۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ امام کی دوکان پر باہر سے بھی خز باف اپنا مال فروخت کے لیے لایا کرتے تھے اور ایک ایک دفعہ میں کبھی کبھی آٹھ آٹھ ہزار درم کے کپڑے صرف ایک آدمی سے خریدے جاتے تھے (دیکھو مناقب موفق، ص ۳۲۰ ج ۱) بلکہ میں تو خیال کرتا ہوں کہ ''جامع المسانید'' میں ابوبکر بن عیاش کے حوالہ سے یہ قصہ جو نقل کیا گیا ہے کہ امام صاحب رحمتہ اللہ علیہ کو حکومت کی طرف سے سزا اس لیے دی گئی کہ

ان يكون عريفا على الخزازين۔ (ص ۵۵ ج ۱)

ان سے خواہش کی گئی تھی کہ خز بافوں کے عریف (نمبرداری) کا عہدہ قبول کریں اور انہوں نے اس عہدے کو قبول کرنے سے انکار کیا تھا۔

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ خزازوں کا ایک بڑا گروہ حضرت امام سے تعلق رکھتا تھا، خواہ یہ تعلق رکھتا ہو کہ آپ کے کارخانہ میں کام کرتا ہو یا کپڑے تیار کر کے آپ کی دکان میں فروخت کے لیے لاتا ہو۔ کیونکہ کسی جماعت کی عرافت (نمائندگی) اسی شخص کو عموماً ملتی ہے جو اس کی تابع ہو۔ ان معلومات کے بعد الیافعی کی تاریخ میں تو ایسے واضح الفاظ ہی مل گئے جن میں صراحتاً وہی بیان کیا گیا ہے جس نتیجہ تک ہم مختلف قرائن کی روشنی میں پہنچے تھے یعنی الیافعی نے لکھا ہے:

له دار كبيرة فعل الخز و عنده صناع الخز (ص ۳۱۰ ج ۱)

امام کی ایک بڑی کوٹھی تھی جس میں خز بنایا جاتا تھا اور امام کے پاس خز باف تھے۔

جس سے ثابت ہوا کہ امام کے پاس خز بافی کا بہت بڑا کارخانہ بھی تھا اور اس کارخانے میں خز باف مزدور کام کرتے تھے۔

خز کی کوفہ کی سب سے بڑی دکان

بہرحال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امام کا یہ کاروبار قطعاً وسیع اور عظیم کاروبار تھا۔ عام طور پر یہ بات اس زمانہ میں تسلیم کی جاتی کہ کوفہ جیسے غدار شہر میں جس کی آبادی امام رحمتہ اللہ علیہ کے زمانہ میں لاکھوں سے کم نہ ہوگی۔ سب سے بڑی دکان خز کی امام ہی کی دکان تھی۔ خز کی بڑھیا سے بڑھیا قسم جو سارے شہر میں میسر نہیں آسکتی تھی، وہ حضرت امام کی دکان پر مل جاتی تھی۔ ابن خشنام کی جس روایت کا پہلے بھی ذکر آیا ہے اس کے ان الفاظ کا یعنی امام کا حال بیان کرتے ہوئے کہا گیا کہ

كان خزازاو كان في بيعه و شرائه يستقصي و يدق النظر فيه

امام خز کے تاجر تھے اور خز کے خرید و فروخت میں انتہائی تلاش و جستجو و دقت شناسی سے کام لیتے تھے۔

میرے نزدیک تو اس کا یہی مطلب ہے کہ خز کی بہترین قسموں کے مہیا کرنے میں پوری دقت نظری اور انتہائی تلاش و جستجو سے کام لیتے تھے کیونکہ اسی کے بعد قصہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک آدمی مدینہ منورہ سے مختلف قسم کی

Marfat.com

چیزوں کے خریدنے کے لیے آیا تھا۔ اسی سلسلہ میں خاص قسم کے خز کی بھی اسے تلاش تھی۔ لوگوں سے اپنی ضرورت کا جب اس نے اظہار کیا تو اسے اطلاع دی گئی

لا تجد مثل هذالثوب الاعند فقيه ها هنا خزاز يقال له ابو حنيفه (ص ۱۹۸)

تم اس قسم کا خز کہیں نہیں پا سکتے ہو مگر ایک فقیہ کے پاس جو یہاں خز کی تجارت کرتا ہے جسے لوگ ابوحنیفہ کہتے ہیں۔

بلکہ اسی کے بعد امام رحمتہ اللہ علیہ کی دکان میں بکری کا جو خاص طریقہ تھا اس کا اظہار بھی اسی مدنی مسافر سے کوفہ والوں نے ان الفاظ میں کیا۔

اذا اتيت حانوته و اخرج اليک ما طلبت فخذ منه ما يساوک وزن له المقدارا الذى يساو مک به

جب اس کے حانوت (شاپ) میں تم جاؤ اور مطلوبہ شے کو نکلواؤ تو جو بھاؤ اس کا بتایا جائے اسی قیمت پر اس کو خرید لینا اور جو قیمت تمہیں بتائی جائے اسے ادا کر دینا۔

جس سے معلوم ہوتا ہے۔ آج کل بڑی بڑی کمپنیوں اور شاپوں کا جو دستور ہے کہ بھاؤ چکانے میں وقت ضائع نہیں کیا جاتا بلکہ ہر چیز کا دام مقرر کر دیا جاتا ہے۔ خریدار بغیر کسی لیت ولعل رگڑے جھگڑے کے چیزیں لے لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں گاہک اور سوداگر دونوں کا وقت بچتا ہے۔ عموماً یہ وہیں کیا جاتا ہے جہاں کام زیادہ ہو۔ ورنہ ٹٹ پونجیے تاجر جن کی دکان کم چلتی ہے۔ چند ہی چیزوں پر لڑ جھگڑ کر چاہتے ہیں کہ نفع کما لیں حالانکہ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب کی دکان پر علاوہ امام کے خود ان کے صاحبزادے حماد اور تلامذہ بھی فروخت کا کام انجام دیتے تھے (دیکھو مناقب موفق، ص ۱۹۴۔ ۱۹۹ ج ۱) لیکن کام کی کثرت کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے دوکان کی ہر چیز کی قیمت متعین کر دی تھی تا کہ لین دین میں خواہ مخواہ وقت ضائع نہ ہو۔ ان ہی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ علاوہ اس مال کے جو امام صاحب کی حانوت (شاپ) میں رہتا تھا۔ آپ لوگوں سے آرڈر بھی لیا کرتے تھے اور حسب وعدہ چاہنے والے کی خواہش کے مطابق خز مہیا کر دیتے تھے۔ مال کی دوکان پر معلوم ہوتا ہے کہ اتنی آمد تھی کہ فرمائش کی تعمیل میں زیادہ دیر نہ لگتی تھی (دیکھو مناقب موفق، ص ۲۱۸ ج ۱)

کچھ بھی ہو محمد بن سعید کاتب الواقدی جن کی وفات ۲۳۰ھ میں ہوئی، ان کا اسی عمرو بن حریث صحابی کے دار کے ذکر میں بیان کہ:

فيها اصحاب الخز اليوم

اس میں خز والے لوگ اس وقت تک رہتے ہیں۔

اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت امام رحمتہ اللہ علیہ کی وفات سے نصف صدی بعد تک عمرو بن حریث کا یہ دار خز بافوں اور خز فروشوں کا ملجا و ماوی بنا ہوا تھا اور اس سے بھی حضرت امام کے کاروبار کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے کہ جس کام کو انہوں نے اسی مکان میں شروع کیا تھا، اس کو اس مقام سے اتنی مناسبت ہوگئی تھی کہ برسوں بعد تک اس کام کی کرنے والی جماعت اس مکان میں موجود تھی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

غلاموں کے ذریعہ مال کی پھیری

جیسا کہ اس زمانہ کا دستور تھا غلاموں کو لوگ ماذون التجارۃ کر کے کاروبار کے لئے اطراف ملک میں بھیج دیا کرتے تھے۔ غلاموں کے ذریعہ سے کاروبار کرنے کا یہ عام طریقہ مروج تھا۔ فقہا کو اسی لیے "ماذون التجارۃ" غلاموں کے متعلق قانونی دفعات بنانے پڑے، جن سے اہل علم واقف ہیں۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام نے اپنے تجارتی کاروبار میں اس طریقہ کو بھی اختیار فرمایا تھا۔ امام الائمہ ابوبکر زنجری کے حوالہ سے ایک قصہ کو نقل کرتے ہوئے موفق نے لکھا ہے کہ

فجاء غلمانه بسبعين الف درهم (ص۲۰۳ ج۱)

امام کے غلام ستر ہزار درم لے کر واپس ہوئے۔

غلاموں کے ذریعہ سے امام کے تجارتی منافع کی نوعیت کیا تھی اس کا اندازہ اس سے بھی ہوسکتا ہے کہ ابوسعید سمعانی نے حافظ بن عبدہ کی سند سے یہ روایت بیان کی ہے کہ

كان لابی حنيفة عبد يتجر و كان دفع اليه مالا كثيراً يتجرفر بح ثلاثين الف درهم

(ص۲۰۳، مناقب موفق، ج۱)

امام ابوحنیفہ کا ایک غلام تھا، جو تجارت کرتا تھا۔ امام نے مال کی کثیر مقدار اس کے سپرد کردی تھی جس کی وہ تجارت کرتا تھا۔ تیس ہزار درم اس میں اس نے نفع حاصل کیا۔

جب ایک ایک غلام تیس تیس ہزار نفع کما کر امام کی خدمت میں پیش کرتا تھا تو اسی سے سمجھنا چاہیے کہ مجموعی طور پر امام کے ماذون التجارہ "غلمان" کتنا کماتے ہوں گے۔ میرے خیال میں اس ذریعہ سے امام کو کافی آمدنی حاصل ہوتی تھی، گویا آمدنی کا یہ ایک مستقل ذریعہ تھا اور علاوہ دوسرے ذرائع کے صرف اسی ذریعہ سے تعجب نہیں کہ سالانہ لاکھوں لاکھ روپیہ کی آمدنی ہوتی ہو۔

درآمد برآمد کا کاروبار

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا لوگوں نے امام کی زندگی کے اس پہلو کے متعلق خصوصی معلومات کے جمع کرنے کا اہتمام نہیں کیا ہے لیکن دوسرے واقعات کے تذکروں میں ضمناً اس قسم کی چیزیں مل جاتی ہیں۔ جہاں تک اس نقطۂ نظر سے میں نے امام کے متعلقہ روایات کا مطالعہ کیا ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام رحمۃ اللہ علیہ کوفہ میں بیرونی علاقوں سے بھی مال منگوایا کرتے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خلافتِ عباسیہ کے مشرقی علاقہ کے مرکزی شہروں میں حضرت امام کے مختلف نمائندے یا ایجنٹ رہتے تھے۔ کوفہ سے امام صاحب ان ہی لوگوں کے پاس تجارتی سامان بھیجا کرتے اور امام کے پاس کوفہ اپنے

Marfat.com

اپنے علاقہ کی چیزیں ان کے یہ نمائندے روانہ کیا کرتے تھے۔

امام صاحب کے شریکِ نجات

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ نمایاں نام حفص بن عبدالرحمٰن کا ہے۔ الخطیب نے بغداد کی تاریخ میں علی بن حفص بزاز کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ

كان حفص بن عبدالرحمن شريک ابی حنيفة و كان يجهز اليه (ص ۳۵۸ ج ۱۳)

حفص بن عبدالرحمٰن تجارتی کاروبار میں امام ابوحنیفہ کے شریک تھے اور باہر سے مال ان کے پاس بھیجا کرتے تھے۔

بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ امام کے سرمایہ سے وہ کام کرتے تھے۔ گویا محنت ان کی ہوتی تھی اور سامان امام کا ہوتا تھا۔ ''الموفق'' نے بھی ایک موقعہ پر لکھا ہے۔

كان حفص بن عبدالرحمن شريک ابی حنيفة و كان ابو حنيفة يجهزا عليه فبعث فی رفقة بمتاع (ص ۱۹۳، ج ۱)

حفص بن عبدالرحمٰن تجارتی کاروبار میں امام ابوحنیفہ کے شریک تھے اور باہر سے ان کے پاس مال بھیجتے تھے ایک دفعہ چند رفقاء کے ساتھ سامان روانہ کیا۔

آگے ''موفق'' نے دوسرا قصہ بیان کیا ہے۔

بہرحال اس کی تصریح مختلف مورخین نے بھی کی ہے کہ امام صاحب کے ساتھ حفص بن عبدالرحمٰن نے تجارتی کاروبار تیس سال تک کیا تھا۔ ''موفق'' نے حفص کا تذکرہ درج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

حفص هذا هو شريكه فی التجارة صحبه ثلاثين سنة

حفص تجارتی کاروبار میں امام کے شریک تھے۔ تیس سال تک ان کے ساتھ رہے۔

و كان من نيسا بور روی عنه الحديث والفقه و كان رجلاً صالحاً (ص ۳۰۰)

حفص نیشاپور کے رہنے والے تھے، امام ابوحنیفہ سے حدیث وفقہ بھی روایت کرتے تھے۔ صالح اور نیک آدمی تھے۔

خود حفص سے براہ راست حامد بن آدم نے یہ قول نقل کیا ہے کہ

كنت شريک ابی حنيفه ثلاثين سنة (ص ۲۴۳، ج ۱۔ موفق)

میں تیس سال تک امام ابوحنیفہ کی شرکت میں کام کرتا رہا (یا تیس سال تک ان کا شریک رہا)

لیکن صحیح طور پر اس کا پتہ نہیں چلا کہ امام صاحب ان کے پاس مال کہاں بھیجا کرتے تھے۔ چونکہ بالاتفاق علما نے لکھا ہے کہ وہ نیشاپور کے تھے، خود نیشاپور کے قضاء کا عہدہ اختیار کر لیا تھا، لیکن آخر میں پچھتائے اور مستعفی ہو کر گوشہ گزیں ہو گئے۔ و اقبل على العبادة (یعنی عبادت ریاضت میں مشغول ہو گئے) آخر میں ان کی بزرگی کا یہ حال تھا

Marfat.com

کہ ابن المبارک جیسے محدث جلیل جب نیشا پور تشریف لاتے تو حفص کی زیارت کے بغیر نیشا پور سے روانہ ہوتے۔ (ص ۲۲۱ ج ا جواہر)

واللہ اعلم یہ وہی امام حنیفہ کے شریک فی التجارہ حفص ہیں جن کے پاس امام مال بھیجا کرتے تھے یا کوئی دوسرے صاحب ہیں۔ الحاکم نے تو اپنی تاریخ میں یہ بھی لکھا ہے کہ ابوداؤد اور النسائی ان سے روایت کرتے ہیں بہرحال میرا خیال ہے کہ حفص نیشا پور ہی میں امام کا مال منگوایا کرتے تھے۔

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پایہ تخت خلافت عباسیہ دارالسلام بغداد جو اس وقت دنیا کی سب سے بڑی منڈی بن گئی تھی، یہاں بھی امام کا کوئی تجارتی ایجنٹ رہتا تھا۔ الخطیب نے ''تاریخ بغداد'' میں لکھا ہے کہ حسن بن ربیع کہتے تھے کہ

کان قیس بن الربیع یحدثنی عن ابی حنیفة انه کان یبعث بالبضائع الی بغد ادفیشتری بها الا متعة و یحملها الی الکوفه (ص ۳۶۰ ج ۱۳)

قیس بن ربیع ہم سے امام ابوحنیفہ کے متعلق یہ روایت بیان کرتے تھے کہ ابوحنیفہ بغداد سرمایہ بھیجتے تھے اور وہاں کی چیز اس سرمایہ سے خریدی جاتی تھی وہی کوفہ لاد کر روانہ ہوتی تھیں۔

لیکن بغداد میں امام صاحب کا نمائندہ کون تھا؟ ممکن ہے کہ مختلف تاجروں کے ساتھ کاروبار ہو۔ خطیب کی مذکورہ بالا عبارت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوفہ سے دوسرے شہروں میں امام صاحب کا مال جاتا تھا۔ اسی طرح دوسرے شہروں کا مال کوفہ بھی امام صاحب منگواتے تھے۔

علاوہ نیشا پور اور بغداد کے اور جن شہروں میں امام کے تجارتی نمائندوں کا پتہ چلتا ہے، اس میں ایک مرو بھی ہے۔ موفق نے اپنے ''مناقب'' میں ابوغانم یونس کو ان الفاظ سے روشناس کراتے ہوئے کہ هو من ائمة مرو (یعنی مرو کے ائمہ میں ان کا شمار ہے) شمس الائمہ الکروری نے ابوغانم کے متعلق لکھا ہے کہ

من کبار ائمة مرو ادرک عمر بن عبدالعزیز و وهب بن منبه (ص ۲۳۷ ج ۲)

مرو کے بڑے ائمہ میں سے ہیں اور عمر بن عبدالعزیز اور وہب بن منبہ کی صحبت سے فیض یاب ہونے کا موقعہ بھی ان کو ملا تھا۔

مشہور امام عبداللہ بن المبارک کے یہ استاد ہیں۔ حافظ ابن حجر نے تو خود ابن المبارک سے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

هو اول من اختلفت الیه (ص ۴۴۹، تہذیب، ج ۱۱)

ابوغانم پہلے آدمی ہیں جن کے پاس (تحصیل علم کے سلسلہ میں) پہلی دفعہ میری آمد و رفت شروع ہوئی۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ عبداللہ بن المبارک کے سب سے پہلے استاد یہی ابوغانم ہیں۔ حافظ کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرو کے یہ قاضی بھی تھے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں۔

یونس بن نافع الخراسانی ابو غانم المروزی القاضی (ص ۴۴۹، تہذیب، ج ۱۱)

ان کا نام یونس بن نافع خراسانی ابوغانم المروزی تھا اور یہ قاضی تھے۔

سن وفات ان کی حافظ نے ۱۵۹ھ قرار دی ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ حضرت امام رحمتہ اللہ سے ۹ سال بعد ان کی وفات ہوئی۔ بہر حال کہنا یہ ہے کہ متعدد مورخین نے ان ہی قاضی ابوغانم کے متعلق نقل کیا ہے کہ موفق کے "مناقب" میں بھی ہے۔

هو من شركاء ابى حنيفة (ص۲۰۲ ج۱)

یہ امام ابوحنیفہ کے شرکاء میں ہیں۔

بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مرو میں امام صاحب کی تجارت کی نمائندگی کرتے تھے امام صاحب سے حدیث بھی روایت کرتے تھے اور اس سے امام صاحب کی تجارتی کاروبار کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے گویا کوفہ سے ہزار ہا ہزار میل دور جو شہر تھے وہاں بھی ان کا مال پہنچتا تھا اور ان مقامات سے آپ کے پاس مال آتا تھا۔ "معجم المصنفین" میں "تبیض الصحیفہ" کے حوالہ سے یہ فقرہ نقل کیا ہے کہ

قل تواتر عنه رحمة الله عليه ان كان يتجر فى الخز مسعودًا ماهراً فيه وله و كان فى الكوفة و شركاء يسا فرون له فى شراء ذلك و بيعه (ص۱۷۵ ج۲، معجم، مطبوعہ بیروت)

امام ابوحنیفہ کے متعلق بہ تواتر یہ بات منقول ہے کہ وہ خز کے ایک بڑے کامیاب تاجر تھے اور اس میں ان کو خاص مہارت حاصل تھی، کوفہ میں ان کی دوکان بھی تھی اور تجارتی کاروبار میں ان کے بہت سے شرکاء تھے جو خز کی خرید و فروخت کے لیے سفر کرتے رہتے تھے۔

حضرت امام کے اساتذہ کی تعداد

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب کے نمائندے اور ایجنٹ ملک کے مختلف اطراف میں گشت کر کے ان کے لیے مال بھی خریدتے تھے اور بیچتے بھی تھے اور میرا خیال تو ہے کہ لوگوں نے جو یہ لکھا ہے کہ

اشتهر واستفاض ان ابا حنيفة رحمة الله تلمذ عنه اربعة الاف من شيوخ ائمة التابعين و تفقه عنه اربعة الاف (ص۵۵، معجم، ج۲)

یہ بات عام طور پر مشہور اور ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے کہ امام ابوحنیفہ نے چار ہزار استادوں سے استفادہ کیا جن میں تابعین کے بڑے بڑے ائمہ و شیوخ تھے۔ اسی طرح امام صاحب نے فقہ کی تعلیم بھی جن لوگوں سے پائی ان کی تعداد چار ہزار ہی تھی۔

حضرت امام کے شاگردوں کی تعداد

اگر اس کو مبالغہ بھی سمجھا جائے جب بھی ان لوگوں کو تلمذ کا انکار تو کسی طرح نہیں کیا جا سکتا جن کا نام بنام حنفی مؤرخین نے اپنی کتابوں میں تذکرہ کیا ہے۔ شمس الائمہ اکروری نے امام کے تلامذہ کی اسی مفصل فہرست کو پیش کرنے کے بعد لکھا ہے کہ

فهو لاء سبعمائة و ثلاثون رجلاً من مشائخ البلدان اخذ داعن الامام

یہ سات سو تیس آدمی ہیں جو مختلف شہروں کے اکابر شمار ہوتے ہیں جنہوں نے امام سے علم حاصل کیا۔

صاحب ''معجم'' نے اس پر اتنا اور اضافہ کیا ہے کہ

فاذازدت عليه ماذكرنا من الخوارزمی و هم زهاء ماته و خمسين فالمجموع زهاء ثمانين و ثمانمائة من اصحاب الامام (ص ۱۱٦ ج ۲)

خوارزمی نے جو تعداد بتائی ہے اس پر میرے اضافہ کردہ ناموں کو بھی اگر شریک کر لو گے تو قریب قریب امام کے شاگردوں کی تعداد آٹھ سو اسّی ثابت ہوتی ہے۔

جس کا مطلب یہی ہے کہ نام ونسب وطن کی قید کے ساتھ جن تلامذہ کا علم لوگوں کو ہوا ہے، ان کی تعداد آٹھ سو اسّی ہوتی ہے۔

کن کن شہروں میں امام صاحب کے شاگرد تھے؟

اسی کے ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ تلامذہ کی یہ تعداد کسی خاص شہر یا کوفہ کے قریب چند محدود شہروں ہی کی نہیں ہے بلکہ عباسی حکومت کے اکثر مرکزی مقامات کے لوگ ہیں، یعنی علاوہ کوفہ، بصرہ، بغداد، واسط، موصل، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، دمشق وغیرہ کے جو کوفہ سے قربت کی نسبت رکھتے ہیں یا جہاں مسلمانوں کے تعلیمی مراکز قائم تھے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک طرف خلافتِ عباسی کے مغربی بلاد مثلاً مصر، رملہ، یمن، یمامہ، بحرین، رقہ وغیرہ کے لوگ بھی امام کے حلقہ میں موجود ہیں اور مشرقی علاقوں کا تو حال یہ ہے کہ شاید ہی کوئی بڑا شہر اس سمت کا ایسا ہوگا جہاں امام کے شاگرد نہ پائے جاتے ہوں۔ خیال تو کیجئے کوفہ کہاں تھا اور وہاں جرجان، طبرستان، دامغان، قومس، رے، نہاوند، ہمدان، استرآباد، حلوان، اصفہان، کرمان، مرو، بخارا، نسا، سمرقند، سرخس، کس، صغانیاں، ترمذ، بلخ، ہرات، قہستان، سجستان، رم، خوارزم وغیرہ وغیرہ ہر شہر کے لوگ امام سے استفادہ کے لیے پہنچتے تھے اور علم حاصل کر کر کے اپنے اپنے علاقوں میں واپس جا رہے تھے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا گو مشرق کے علاقوں کے ساتھ مورخین نے امام کے تلامذہ میں خلافت کے مغربی شہروں کے باشندوں کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن اس فہرست پر نظر ڈالنے کے بعد یعنی ان شہروں میں سے کس کس شہر کے کتنے طلبہ امام کے پاس آئے، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بہ نسبت مغربی علاقوں کے امام کی طرف مشرقی ممالک ہی کے لوگوں کا رجحان زیادہ تھا۔ کوفہ اور بصرہ جو گویا امام کے وطن کی حیثیت رکھتے تھے، ان کے سوا حجاز میں امام کو بنی امیہ کے آخری ایام میں مسلسل دو ڈھائی سال[۵] قیام کرنے کا موقع اس وقت مل گیا تھا جب بنی امیہ کے گورنر ابن ہبیرہ کے مظالم سے تنگ آ کر آپ نے حرم محترم میں پناہ لی تھی اور یوں بھی ان دونوں پاک شہروں میں آپ کی آمد و رفت کا سلسلہ آخر عمر تک جاری تھا۔ ''اربابِ مناقب'' نے بالاتفاق یہ روایت نقل کی ہے کہ

Marfat.com

حج خمسا و خمسين حجة

امام نے پچپن حج کیے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چودہ پندرہ سال کی عمر کے بعد بلا ناغہ شائد حج کرتے تھے، ورنہ ظاہر ہے کہ ستر سال کی عمر میں پچپن حج کے میسر آنے کی صورت ہی کیا ہوسکتی ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے اور آئندہ بھی معلوم ہوگا کہ حجاز کے قیام کا زمانہ امام نے افادہ اور استفادہ میں گذارا تھا، اسی لیے حجاز کے دونوں مقدس شہروں میں آپ کے تلامذہ کی کافی تعداد نظر آتی ہے۔[9]

لیکن ان کے سوا یہ واقعہ ہے کہ زیادہ تر آپ سے استفادہ کرنے والوں اور شاگردوں کی بڑی تعداد خلافتِ عباسیہ کے مشرقی شہروں ہی کی ہے خصوصاً بخارا، سمرقند، بلخ، ہرات وغیرہ میں۔ تفصیل کے لیے امام کے شاگردوں کی فہرست دیکھیے ممکن ہے کہ مشرق والوں کے اس رجحان عام میں امام رحمتہ اللہ علیہ کے عجمی ہونے کو بھی دخل ہو خصوصاً جب ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ عربی جو امام کی مادری زبان تھی اس کے سوا آپ فارسی زبان سے بھی واقف تھے۔ لوگوں سے اس زبان میں گفتگو بھی فرماتے تھے۔[10] بہرحال میں یہ کہنا چاہتا ہوں جیسا کہ پہلے کہیں ذکر آیا بھی ہے کہ امام کی کوفہ کی حانوت (شاپ) میں جیسے آپ کے صاحبزادے حماد اور آپ کے تلامذہ بھی تجارتی کاروبار میں ہاتھ بٹاتے تھے کیا تعجب ہے کہ ان مشرقی ممالک میں امام کے بھی تلامذہ مال کی درآمد برآمد میں بھی واسطہ کا کام دیتے ہوں۔ آخر حفص بن عبدالرحمٰن اور ابو غانم یونس جو امام کے شریک فی التجارۃ تھے۔ یہ بھی تو امام کے تلامذہ ہی میں تھے۔ پھر کیا تعجب ہے کہ ان کے سوا بھی بخارا، سمرقند، بلخ و ہرات وغیرہ میں آپ کے شاگردوں کی جو ایک بڑی تعداد پھیلی ہوئی تھی ان میں کچھ لوگ تجارتی کام میں بھی حصہ لیتے ہوں۔ حضرت امام کے متعلق تاریخ کی کتابوں میں ایک بحث جو یہ پائی جاتی ہے کہ آپ کے والد کا اصلی وطن کہاں تھا؟ الخطیب نے مختلف مشرقی شہروں مثلاً نساء، ترمذ، انبار کے نام نقل کرتے ہوئے کابل کے متعلق زیادہ اقوال نقل کیے ہیں۔[11]

میرا ذہن تو ادھر جاتا ہے کہ شاید ان شہروں سے امام کے خاص تعلقات ہوں اور ان ہی تعلقات خصوصی کی بنیاد پر لوگوں نے یہ مشہور کر دیا کہ آپ کا آبائی وطن وہیں تھا۔ ہوسکتا ہے کہ ان شہروں میں امام صاحب کی رشتہ داریاں ہوں یا یہاں کے لوگوں سے خاص تجارتی تعلقات ہوں۔

بہرحال امام کی تجارت کی جن وسعتوں کا تذکرہ تاریخ کی کتابوں میں کیا گیا ہے جہاں تک قرائن کا تعلق ہے ان کے انکار کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

امام صاحب کے غیر معمولی سرمایۂ تجارت کے متعلق تفصیل

البتہ یہاں ایک دلچسپ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنے بڑے کاروبار کے لیے ظاہر ہے کہ کافی سرمایہ کی ضرورت ہے۔ امام صاحب بے چارے عجمی النسل آدمی تھے۔ امارت وثروت زیادہ تر اس زمانہ میں عربی نژاد خاندانوں

Marfat.com

کے ساتھ مختص تھی۔ پھر امام کو اتنا بڑا سرمایہ کہاں سے مل گیا، جس سے وہ مرو اور نیشا پور، بغداد اور اسی قسم سے دوسرے شہروں تک اپنے لین دین کے معاملات کو پھیلا سکے۔ قطع نظر عجمی ہونے کے اگر ''ارباب مناقب'' کی اس روایت کو صحیح تسلیم کر لیا جائے۔ یعنی ابو جعفر منصور کے سامنے قضا سے انکار کرتے ہوئے امام کی طرف جہاں مختلف دوسرے جواب منسوب کئے گئے ہیں ان ہی میں کہا جاتا ہے حضرت امام نے ایک دفعہ منصور کو یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ

كان ابى خبازا و اهل الكوفه لا يرضون ان يكون القاضى ابن خباز (ص۱۶۲ ج۱، موفق)

میرے والد نان بائی تھے اور کوفہ والے اس کو پسند نہیں کریں گے کہ ایک نان بائی کے لڑکے کو ان کا قاضی بنا دیا جائے۔

اگر چہ اسی کے ساتھ حضرت امام کے دادا کے متعلق یہ روایت بھی نقل کی جاتی ہے:

اهدى لعلى بن ابى طالبؓ الفالوزج فى يوم النيروز فقال نوروز نا كل يو مرد قيل كان فى مهر جان فقال مهر جو نا كل يوم. (الخطیب۔ص۳۶۲ ج۱۳)

نوروز کے دن امام ابو حنیفہ کے دادا نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں فالودہ بطور ہدیہ کے پیش کیا تھا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میرے لئے ہر روز نوروز ہے، بعض کہتے ہیں کہ مہرجان کے تہوار میں ہدیہ پیش کیا گیا تھا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میرے لیے تو ہر دن مہرجون ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس روایت سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام کے دادا کچھ امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ آخر خلیفہ وقت تک رسائی کچھ نہ کچھ امتیاز کو غالباً چاہتی ہے لیکن امتیاز کے لیے دولت مند ہونا ضروری نہیں۔ اسی طرح فالودہ جیسی عام اور معمولی چیز کا پیش کرنا یہ بھی ان کی دولت مندی کی دلیل نہیں ہو سکتی اور اگر وہ بیچارے اتنے ہی دولت مند ہوتے جس پر امام کی تجارت کی بنیاد قائم کی جائے تو ان کے صاحبزادے ''ثابت'' کو بقول امام ''خبازی'' کے پیشے کے اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہوتی۔ بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ امام صاحب کو اپنے والد سے دس ہزار درم ترکے میں ملے تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ کوئی بڑی رقم نہ تھی۔ دو ڈھائی ہزار روپے ہوئے، اس سے امام کے اس عظیم سرمایہ اور کاروبار کی توجیہ نہیں ہو سکتی جس کا ذکر ابھی آپ سنیں گے۔

امانتیں

ہاں امام کی زندگی میں ہم ایک اور خاص چیز کو پاتے ہیں۔ چاہا جائے تو اسی سے اس معمہ کو حل کیا جا سکتا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ایک جگہ نہیں متعدد مقامات میں امام کے سوانح نگاروں نے اس کا تذکرہ کیا ہے کہ لوگ امام کے پاس ''ودائع''، یعنی امانتیں رکھوایا کرتے تھے۔ حضرت زید بن علی نے بنی امیہ کے مقابلہ میں خروج کا جب ارادہ کیا جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ آئندہ آ رہا ہے اور حضرت زید نے امام کو بھی اس جہاد میں شرکت کی دعوت دی تھی تو آپ نے اس کے جواب میں بیش قرار رقمی امداد کے ساتھ چند باتیں بطور عذر جو کہلا بھیجی تھیں ان میں ایک وجہ یہ تھی کہ

Marfat.com

حسبتنی ودائع الناس (الکروری۔ص ۲۵۵)
لوگوں کی امانتوں نے مجھے روک رکھا ہے۔

سچ پوچھئے تو اسی فقرے نے میرے دل میں اس سوال کو ابتداءً اٹھایا۔ خیال یہ گذرا کہ ایک ایسی شدید دینی مہم میں شرکت کے لیے امام کو دعوت دی جاتی ہے۔ دعوت دینے والی ہستی وہ ہے کہ خود حضرت امام کا قول تھا:

خروجه يضاهي خروج رسول الله ﷺ يوم بدر (ص ۲۶۰، موفق)
آنحضرت ﷺ کا بدر کی مہم کے لیے نکلنا اسی کے مشابہ زید بن علی کی یہ مہم ہے جس کے لیے اس وقت وہ نکلتے ہیں۔ اسی روایت میں ہے کہ حضرت زید کی جب شہادت اسی راستہ میں ہوئی جس کی تفصیل ان شاءاللہ آگے آتی ہے تو ایک دو دفعہ نہیں بلکہ امام کے دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ

يبكي كلماذ كر مقتله[۱۲] (ص ۲۹۱)
جب کبھی زید کی شہادت کا تذکرہ ہوتا تو امام رونے لگتے۔

ان ہی روایتوں میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ پہلی قسط حضرت زید کی خدمت میں امام نے جو پیش کی تھی، وہ دس ہزار کی رقم تھی۔ سوال یہی ہوتا تھا کہ امانت و ودیعت کا قصہ عموماً اتفاقی طور پر پیش آتا ہے مثلاً سفر حج یا کسی دوسرے سفر میں کوئی جانے لگتا ہے تو کسی معتبر آدمی کے پاس بطور امانت کے تھوڑی بہت چیز رکھوا دی جاتی ہے۔ امام کے پاس بھی اسی قسم کی کچھ امانتیں ہوں گی لیکن اس قسم کی معمولی امانتوں کی حفاظت کے لیے ایسی عظیم دینی مہم کی شرکت سے اپنے آپ کو محروم کر لینے کی معقول وجہ نہیں ہو سکتی۔ فرض کیجئے جیسا کہ اسی روایت میں ہے کہ امام نے فرمایا کہ قاضی ابن ابی لیلی پر میں نے اصرار کیا کہ ان امانتوں کو اپنے ذمہ میں لے لیں لیکن انہوں نے قبول نہیں کیا۔ لیکن کوفہ جیسے شہر میں اور بھی بیسیوں معتبر ہستیاں مل سکتی تھیں جن کے ہاں ان امانتوں کو محفوظ کرا کے امام رحمۃ اللہ علیہ اس جہاد فی سبیل الحق میں شریک ہونے کی سعادت حاصل کر سکتے تھے۔ اسی قسم کے سوالات جب دل میں آئے تو میں نے ان ودیعتوں کے متعلق تحقیق شروع کی کہ "کماً و کیفاً" ان کی نوعیت کیا تھی؟ تاریخی یادداشتوں نے جس مواد کو اس سلسلہ میں میرے سامنے پیش کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ دیکھ کر حیران ہو گیا۔ ان ہی کے مطالعہ نے میرے دماغ کو ایک خاص خیال کی طرف منتقل کر دیا یعنی حضرت امام کے لیے اتنے بڑے پیمانے پر تجارت کی تنظیم کا امکان کیسے پیدا ہوا؟ اس سوال کے جواب کی ایک ممکنہ صورت میرے سامنے آ گئی۔

امانتوں کی مقدار

میرا مطلب یہ ہے کہ لکھنے والے گو عام طور پر صرف اتنا لکھ کر چلے جاتے ہیں کہ امام کے پاس بعض لوگ اپنی امانتیں اور ودائع رکھوایا کرتے تھے لیکن ان امانتوں کی مقدار کیا تھی اور امام کے پاس یہ کس حیثیت سے رکھے جاتے تھے؟ خصوصی توجہ سے یہ سوالات عموماً محروم رہے۔ لیکن سنئے پہلا سوال یعنی امام کے پاس امانت کے ان رقوم کی تعداد

Marfat.com

کہاں تک پہنچ جاتی تھی۔ بالاتفاق امام کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ

مات ابو حنیفه و فی بیته للناس ودائع خمسین الف الف (ص ۲۳۰ ج ۱، موفق)

امام ابوحنیفہ کی جس وقت وفات ہوئی اس وقت ان کے گھر میں پچاس ملین (یا پانچ کروڑ) کی امانتیں لوگوں کی تھیں۔

جس کے معنی یہی ہوئے کہ وفات کے بعد امام کے گھر سے امانت کی مد کے رقوم جو نکلے ان کی تعداد (۵۰۰۰۰۰۰۰) یعنی پانچ کروڑ تھی۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مذکورہ بالا رقم وفات کے بعد آپ کے گھر سے نکلی ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ امام کی وفات جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے، ستر کی عمر میں ہوئی ہے۔

امام جیسے محتاط آدمی کے متعلق اگر یہ خیال کیا جائے کہ اپنی پیرانہ سالی کا خیال کر کے انہوں نے کوشش کی ہوگی کہ زندگی ہی میں حتی الوسع لوگوں تک ان کی امانتیں پہنچا دی جائیں تو یہ بے بنیاد خیال نہیں ہوسکتا ہے۔ بڑھاپے میں عام معمولی کردار و سیرت رکھنے والی ہستیاں جب یہی کرتی ہیں تو امام کے متعلق اس قسم کی توقع بے جا توقع نہیں ہوسکتی۔ اسی بنیاد پر میرا خیال ہے کہ یہ پانچ کروڑ کی رقم امام کے پاس دینے دلانے کے بعد رہ گئی ہوگی۔ اور بالفرض اگر یہ نہ بھی ہو جب بھی اس زمانے کے لحاظ سے شہر کے ایک خوش باش شہری کے پاس پانچ پانچ کروڑ کی امانتوں کا رہنا کیا معمولی بات ہے؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ ہمارے زمانہ میں بھی جب روپیہ کی قیمت بہت گر گئی ہے، مشکل ہی سے افراد کے پاس سے بدِ امانت اتنی رقم مرنے کے بعد نکل سکتی ہے۔

بہرحال میرا خیال تو یہی ہے کہ امام کے پاس اس سے زیادہ رقوم بطور امانت کے رکھے جاتے تھے اور یہ رقم مرنے کے بعد صرف ان لوگوں کی رہ گئی تھی جن تک کسی وجہ سے اپنی زندگی ہی میں امام ان کی امانتوں کو واپس نہ فرما سکے تھے۔ جن کی امانتیں ہوں گی وہ کوفہ سے باہر ہوں گے یا ایسے نابالغ بچوں کی امانتیں رہ گئی ہوں جو ابھی سنِ رُشد کو نہ پہنچے ہوں۔ آخر خیال تو کیجئے بیان کرنے والے جب یہ بیان کرتے ہیں کہ

ان رجلا دهاناً اودع عند ابی حنیفة صائة الف و سبعین الف درهم (ص ۲۲۳ ج ۱، موفق)

ایک تیلی نے امام ابوحنیفہ کے پاس ایک لاکھ ستر ہزار درم بدِ امانت جمع کی تھی۔

جب ایک تیلی ایک لاکھ ستر ہزار کی رقم امام کے پاس محفوظ کرا سکتا تھا تو اسی سے اندازہ کیجئے کہ دوسرے صاحبان حیثیت کے امانتی کھاتوں کا کیا حال ہوگا؟ افسوس ہے کہ مورخین نے اس مسئلہ کو مقصود بالذات بنا کر واقعات کے درج کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ذیلی اور ضمنی طور پر کسی دوسرے واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے اتفاقاً ان اعداد کا ذکر بھی لوگوں نے کر دیا ہے۔ اس قسم کے ضمنی بیانات اور بھی ملتے ہیں لیکن میرا جو مقصد ہے اس کے لیے مذکورہ بالا بیانات اور شہادتیں کافی ہیں۔ یعنی حضرت امام کے پاس ''امانت'' اور ''ودیعت'' کی راہ سے لاکھوں ہی نہیں بلکہ کروڑوں کا سرمایہ جمع ہو گیا تھا اور جمع ہوتا رہتا تھا۔ مشہور امام فقہ وحدیث وکیع بن الجراح کے صاحبزادے سفیان سے جو یہ منقول ہے کہ ان کے والد وکیع کہتے تھے۔

Marfat.com

كان ابو حنيفة عظيم الامنة (ص۲۲۰،موفق)

امام ابوحنیفہ بہت بڑے تھے امانت میں۔

اگر اس کا یہ مطلب بھی لیا جائے کہ بکثرت لوگوں کی امانتیں اور ودائع آپ کے ہاں جمع ہوتے تھے، واقعات سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔

عوام کے اعتماد کی وجہ

حقیقت تو یہ ہے کہ عام مورخین نے امام کے جو حالات بیان کئے ہیں، ان کا عام مخلوق کے ساتھ جو برتاؤ تھا۔ اگر یہ واقعات صحیح ہیں اور نہ صحیح ہونے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی بلکہ کہا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ تواتر نہیں تو شہرت کی حدود تک اس قسم کی روایتیں پہنچی ہوئی ہیں مثلاً بطور کلیہ کے امام کی یہ عام عادت بیان کی جاتی ہے۔ قاضی ابو یوسف کی روایت ہے کہ

كان ابو حنيفة لا يكاد يسأل حاجة الاقضا ها (ص۲۵۷،موفق)

امام ابوحنیفہ کا حال یہ تھا کہ کوئی حاجت جو ان پر پیش کرنے والے پیش کرتے مشکل ہی سے ایسی کوئی حاجت ہوگی جسے وہ پوری نہ کر دیتے ہوں۔

خیال کرنے کی بات ہے کہ جس کا حال یہ ہو لوگوں میں ہر دل عزیزی اور اعتماد کی کیفیت جس حد تک اس کے متعلق قائم ہو، کم ہے۔ اسی طرح امام کی اس عام عادت اور فطرت کا بھی ذکر کیا جائے کہ ان کے حلقہ میں کوئی ایسا آدمی اگر بیٹھ جاتا جو عموماً آپ کے حلقہ کا آدمی نہ ہوتا تو لکھا ہے۔

فاذا قام سال عنه فان كانت به فاقة وصله وان مرض عاده (ص۲۵۷،موفق، ج۱)

جب وہ اٹھ کھڑا ہوتا تو اس سے دریافت کرتے، اگر اس کی کوئی ضرورت ہوتی تو اسے پوری فرماتے۔ کسی کی بیماری کا حال اس سے معلوم ہوتا تو عیادت کرتے۔

اور یہ حال تو اجنبی لوگوں کے ساتھ تھا۔

حضرت امام صاحب کے حسنِ سلوک کا ایک واقعہ

بعض قصے اس سلسلہ میں تو ایسے بیان کئے جاتے ہیں کہ ان پر "افسانہ" ہونے کا دھوکہ ہوتا ہے لیکن ان کے تقریباً اکثر سوانح نگاروں نے اس کا ذکر کیا ہے۔ قصہ تو طویل ہے۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ کوفہ میں ایک صاحب پہلے خوش حال تھے، لیکن زمانہ کی گردش میں مبتلا ہوئے، آدمی غیرت و حمیت والے تھے، جس طرح گذر رہی تھی گذار رہے تھے۔ ایک دن ان کی چھوٹی بچی تازہ تازہ ککڑیوں کو دیکھ کر چلاتی ہوئی گھر آئی۔ ماں سے ککڑی لینے کے لیے پیسے مانگے لیکن افلاس اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ ان ککڑیوں کے لیے بھی ماں پیسے نہ دے سکی۔ لڑکی کا باپ بیٹھا ہوا اس تماشے کو

Marfat.com

دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور طے کیا کہ کسی سے امداد حاصل کرنی چاہیے مؤرخین نے اس موقعہ پر لکھا ہے کہ

وقصد مجلس البرکة و هو مجلس ابی حنیفة

''مجلس البرکۃ'' کا اس نے ارادہ کیا اور ''مجلس البرکۃ'' امام ابوحنیفہ کی مجلس کا نام تھا۔

بہ ظاہر اس کا یہی مطلب معلوم ہوتا ہے کہ امام کی مجلس کوفہ میں ''برکت کی مجلس'' کے نام سے مشہور تھی جہاں سے کچھ نہ کچھ لے کر ہی آدمی اٹھتا تھا۔ دینی یا دنیوی، مادی یا رُوحانی نفع کچھ ہی ہو۔ بہرحال آنے کی حد تک تو بے چارا کسی طرح ''مجلس برکت'' تک وہ آ گیا لیکن جس نے کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگا تھا، اس کی زبان کھل نہ سکی۔ بار بار کہنے کا ارادہ کرتا، لیکن طبعی شرم و حیا زبان کو روک دیتی۔ آخر یوں ہی اٹھ کر چلا گیا، لیکن امام کی نگاہ سے اس کے دل کی کیفیت کیسے چھپ سکتی تھی۔ لکھا ہے کہ اس کے چہرے سے امام نے تاڑ لیا کہ یہ بے چارا کوئی حاجت مند ہے۔ شرافت کی وجہ سے اپنی حاجت کہہ نہ سکا۔ جب اٹھ کر جانے لگا تو امام صاحب بھی پیچھے پیچھے اس کے روانہ ہوئے۔ جس گھر میں داخل ہوا تھا اس کو خوب پہچان لیا۔ جب رات بھیگ گئی تب امام صاحب اپنی آستین میں روپے کی ایک تھیلی جس میں کہا جاتا ہے کہ پانچ سو درم تھے، لے کر روانہ ہوئے اور اس کے دروازے پر پہنچ کر کنڈی کھٹکھٹائی۔ اندھیرا کافی تھا، بے چارا باہر نکلا۔ کہتے ہیں کہ امام صاحب اس کی دہلیز پر تھیلی پر رکھ کر الٹے پاؤں یہ کہتے ہوئے واپس آئے۔

''دیکھو تمہارے دروازے پر تھیلی پڑی ہوئی ہے، یہ تمہارے ہی لیے ہے۔''

تھیلی تو اس نے اٹھا لی لیکن پتہ نہ چلا کہ کون تھا جو اس طرح دے کر چلا گیا۔ بیوی کے پاس گیا۔ تھیلی کھولی گئی۔ پانسو درم کے ساتھ ایک پرزہ ملا کہ

هذا المقدار جاء ابو حنیفة الیک من وجه حلال فلیفرغ بالک [13] (ص ۲۶۳۔ موفق)

ابوحنیفہ اس رقم کو لے کر تیرے پاس آیا تھا۔ یہ حلال ذریعہ سے حاصل کی گئی ہے۔ چاہیے کہ اس سے اپنے قلب کی فراغت میں کام لو۔

قاضی ابو یوسف امام کی اس عام عادت کا بھی تذکرہ کیا کرتے تھے۔

کان ابو حنیفة ثدید البر لکل من عرف و کان یهب للرجل خمسین دینا راً و اکثر فاذا شکره بحضرة قوم غمه ذلک (ص ۲۶۳)

اپنے جاننے والوں کے ساتھ امام ابوحنیفہ حسن سلوک کے عادی تھے۔ لوگوں کو پچاس پچاس اشرفی یا اس سے زیادہ دیتے لیکن دوسروں کے سامنے اگر وہ امام کا شکریہ ادا کرتا تو ان کو تکلیف ہوتی تھی۔

یہ بھی فرماتے کہ ''میاں اللہ تعالیٰ نے یہ روزی تم تک پہنچائی ہے'' کہتے کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث تم نے نہیں سنی۔

انما انا خازن اضع حیث امرت

میں تو صرف خزانچی ہوں، جہاں حکم دیا جاتا ہے وہاں رکھ دیتا ہوں۔

Marfat.com

تحائف

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں میں تحفے تحائف کے بانٹنے کا بھی امام کو بہت شوق تھا۔ سفیان بن عینیہ کا براہ راست قول لوگ نقل کرتے ہیں کہ

لقد وجه الی بهدایا استوحشت من کثرتها

اس قدر تحفوں اور ہدیوں کی بھرمار۔ ابوحنیفہ کی طرف سے میرے پاس ہوئی کہ اس کی کثرت سے میں گھبرا اٹھا۔

ماکان یدع احدا من المحدثین الابره براً واسعا (ص۲۲۴)

سیر چشمی کے ساتھ حسن سلوک کیے بغیر امام ابوحنیفہ کسی محدث کو نہ چھوڑتے۔

ایک عام قاعدہ ان کا یہ بھی تھا کہ کوئی ہدیہ یا تحفہ ان کے پاس بھیجتا تو جواب میں کہیں زیادہ بہتر قیمتی چیز اس کو بھیجتے۔ ایک شخص نے تین درم کی کوئی چیز تحفۃً پیش کی۔ اس کو پچاس درم کا ایک ٹکڑا خز کا آپ نے بھیجا۔

مشائخ، علماء اور محدثین کی خدمت

امام کے سوانح نگاروں نے اس سلسلہ میں بھی کافی واقعات کتابوں میں درج کیے ہیں۔ حتیٰ کہ لکھا ہے کہ ان کی عام عادت تھی کہ

ہر سال مخصوص رقم کا سامان کوفہ سے بغداد بھیجتے اور بغداد سے چیزیں منگوا کر کوفہ میں فروخت کراتے۔ اس لین دین سے جو آمدنی ہوتی۔ اس سے پہلے تو کوفہ کے محدثین کے کھانے پینے اور پہننے کا سامان خرید کر ان لوگوں کے پاس بھیجتے۔ اس کے بعد سرمایہ اور منافع کی جو رقم باقی بچ جاتی، اسے بھی ان ہی لوگوں میں یہ کہتے ہوئے تقسیم فرما دیتے کہ

انفقوا فی حوائجکم ولا تحمد والا الله فانی ما اعطیتکم من مالی شیئا و لکن من فضل الله علی فیکم وهذا ارباح بضائعکم (ص۲۶۲، موفق)

اپنی ضرورتوں میں خرچ کیجیے اور شکر و تعریف خدا کے سوا اور کسی کی نہ کیجیے کیونکہ اپنے مال سے میں نے کچھ نہیں دیا بلکہ آپ لوگوں کے متعلق مجھ پر خدا کا فضل ہوا اور آپ ہی لوگوں کے (نام زدہ) سرمایہ کے یہ منافع ہیں۔

بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کی رقم جو نکلتی تھی ممکن ہے کہ اسی کو سرمایہ بنا کر زکوٰۃ نکالنے سے پہلے اس غرض سے کہ زیادہ بڑھ جائے، یہ ترکیب امام نے اختیار کی تھی۔ شائد اسی لیے کہتے تھے کہ تمہارے سرمایہ کے یہ منافع ہیں۔ میرا کچھ نہیں ہے اور یہ برتاؤ کچھ محدثین ہی کے ساتھ مختص نہ تھا۔ مسعر بن کدام جو کوفہ کے صفِ اوّل کے علماء میں شمار کیے جاتے ہیں، امام کے معاصرین میں ہیں۔ ابوجعفر منصور عباسی خلیفہ کے دربار میں امام صاحب کے ساتھ یہ بھی عہدہ قضا کے لیے بلائے گئے تھے جن کا ذکر آ رہا ہے، ان کا بیان ہے کہ

"امام ابوحنیفہ کا یہ عام دستور تھا کہ اپنے بال بچوں کے لیے جب کوئی چیز خریدتے تو مشائخ وعلماء کے لیے بھی وہی چیز ضرور خریدتے خود اپنے لیے جب کپڑا بنواتے تو علماء کے لیے بھی جوڑے تیار کراتے اسی طرح جس قسم کے فواکہ اور پھلوں کا موسم آتا، ناممکن تھا کہ اپنے لیے اور اپنے گھر والوں کے لیے خریدتے اور علماء کو بھی وہی پھل خرید کر نہ بھیجتے۔
بلکہ خواجہ مسعر کبھی فرماتے کہ
علما یا دوسروں کے لیے امام جو چیزیں خریدتے ان میں ہمیشہ اس کا لحاظ فرماتے کہ اچھی سے اچھی قسم کی ہوں لیکن خود اپنے یا اپنے عیال کی خریداری میں عموماً لاپروائی اور تساہل سے کام لیتے۔"
(ص ۲۶۱)

فقراء اور محتاجوں کے ساتھ حسنِ سلوک

علاوہ علما و محدثین کے عام گداگر فقیروں اور محتاجوں کے ساتھ ان کا حسنِ سلوک عام تھا۔ اپنے بیٹے حماد کو حکم دے رکھا تھا کہ دس درم کی روٹیاں خرید کر غرباء میں روزانہ تقسیم کی جائیں۔ یہ بھی امام کی عادت بیان کی جاتی ہے کہ کھانے پر جب بیٹھتے تو روٹی اور جو سالن ہوتا، اس کو روٹی پر رکھ کر فقیروں کو بھیج دیتے۔

شاگردوں کے ساتھ برتاؤ

رہے تلامذہ اور ان کے اصحاب سو ان کے ساتھ سلوک کی کیا نوعیت تھی۔ آج دنیا میں اساتذہ اور تلامذہ کے جو تعلقات میں ان کو دیکھتے ہوئے تو ان واقعات کا باور کرنا بھی مشکل ہے لوگوں نے ان کی کلی عادت لکھی ہے۔

"ہر طالب العلم سے پوشیدہ طور پر اس کے حالات دریافت کرتے۔ کوئی ضرورت ہوتی تو اس کی تکمیل فرما دیتے۔ جو ان میں بیمار ہوتا یا طالب العلموں کے اقربا (ماں باپ وغیرہ) بیمار ہوتے تو ان کی عیادت کرتے۔ جن کا انتقال ہو جاتا ان کے جنازے میں حاضر ہوتے۔ کسی پر کوئی مصیبت آن پڑتی تو امداد کے لیے کھڑے ہو جاتے۔" (ص ۲۵۷)

خود ان کے تلامذہ نے امام کے حسنِ سلوک کے متعلق جو تذکرے کیے ہیں، پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ امام کے مشہور بصری شاگرد یوسف بن خالد السمتی ہیں، ایک لطیفہ وہی بیان کرتے تھے کہ کسی حاجی نے امام کی خدمت ایک ہزار پاپوش بطور تحفے کے پیش کیے۔ یوسف کہتے ہیں کہ ایک دن یا دو دن اس پر گذرے ہوں گے کہ میں نے امام کو دیکھا کہ اپنے صاحبزادے کے لیے بازار میں نعلین خرید رہے ہیں۔ میں نے تعجب سے عرض کیا کہ ابھی تو آپ کے پاس ہزار جوڑے تحفے میں آئے تھے اور آج بچے کے لیے جوتا خرید رہے ہیں۔ فرمایا کہ

Marfat.com

''میرا قاعدہ ان تحفوں کے متعلق یہی ہے کہ اپنے شاگردوں اور متوسلین پر تقسیم کر دیتا ہوں۔''
(ص ۲۵۸)

ان ہی یوسف بن خالد سمتی کا بیان ہے کہ امام اپنے طلبہ کے لیے ہر جمعہ دعوت فرمایا کرتے تھے۔ طریقہ یہ تھا کہ

یطبخ لهم الوان الطعام و كان لا يا كل معنا و يقول انفرد بنفسی لئلا تجشموا (ص ۸۹ ج ۲)

طرح طرح کے کھانے (جمعہ) کے دن پکواتے لیکن کھانے میں طلبہ کے ساتھ شریک نہ ہوتے، کہتے کہ میں اپنے آپ کو اس لیے الگ کر لیتا ہوں کہ تم لوگوں کی بے تکلفی جاتی رہے گی۔

علاوہ جمعہ کی دعوت کے بیان کیا جاتا ہے کہ اپنے ان ہی طلبہ کے ساتھ۔

یبرهم فی الاعياد و يرسل الى كل واحد منهم على قدر منفرلته (ص ۲۶۹ ج ۱)

تہواروں کے موقعہ پر سب کے ساتھ حسن سلوک اور ہر ایک کے رتبہ کے مطابق ان کے پاس چیزیں بھیجتے۔

انتہا یہ ہے کہ جیسا کہ لوگوں کا بیان ہے

''طلباء میں جن لوگوں کو ضرورت ہوتی ان کی شادی بھی امام کرا دیتے اور شادی کے مصارف خود ادا کرتے۔'' (ص ۲۵۹ ج ۱)

ان عام باتوں کے سوا طلبہ کے نام ماہوار وظائف بھی امام کے یہاں سے جاری تھے۔ لکھا ہے کہ

قد اجرى على جماعة اصحابه كل شهر جراية سوى ما كان يواسيهم (ص ۲۶۰)

ہر جماعت کے شاگردوں کو ماہوار وظیفے بھی امام کے ہاں سے ملتے تھے۔ یہ عام حسن سلوک کے سوا تھا۔

انفرادی طور پر جن طالب العلموں کے ساتھ جو سلوک امام نے کیا ہے اور بعد کو ان لوگوں نے بیان کیا ہے، ان کی فہرست تو طویل ہے، اسی سے اندازہ کیجئے کہ قاضی ابو یوسف کہتے تھے۔

و كان يعولنی و عيالی عشرين سنة. (ص ۱۷۱۔ مجمم۔ ج ۲)

بیس سال تک میری اور میرے اہل و عیال کی کفالت امام ابوحنیفہ نے کی۔

حسن بن زیاد جو امام کے ممتاز تلامذہ میں ہیں، کہتے ہیں کہ

''میں امام صاحب کے پاس پڑھا کرتا تھا۔ میرے والد ایک دن امام صاحب کے پاس آئے اور عرض کرنے لگے کہ حضور! میری چند لڑکیاں ہیں۔ لڑکوں میں حسن کے سوا کوئی نہیں ہے۔ آپ ہی اس کو سمجھائیے کہ کوئی ایسا دھندا اختیار کرے جس سے مجھے کچھ سہولت میسر آئے۔''

حسن کا بیان ہے کہ جب میں حاضر ہوا تو امام نے فرمایا کہ

''میاں حسن! آج تمہارے والد آئے تھے اور یہ یہ باتیں مجھ سے کہہ کر گئے ہیں''۔

Marfat.com

اس کے بعد حسن سے امام نے فرمایا کہ

''میاں تم تو پڑھنے میں لگے رہو میں نے کسی عالم کو بھوک مرتے نہیں دیکھا ہے۔''

حسن کا بیان ہے کہ امام نے اس دن سے میرے لیے کچھ ماہوار اس وقت تک مقرر کر دیا جب تک میں روزگار نہ لگ گیا۔ (ص ۲۶۴، موفق، ج ۱)

واقعہ یہ ہے کہ ہر دل عزیزی کہیے یا محبوبیت عامہ کے حصول کے لیے جود و سخا بذل و کرم سے زیادہ کارگر بے خطا نسخہ دنیا میں نہیں پایا گیا ہے۔ اس قسم کے نفوس سے ان ہی لوگوں کو محبت و اخلاص نہیں ہوتا جنہیں ان سے کچھ نفع پہنچا ہو۔ بلکہ تجربہ تصدیق کرتا ہے اور مشاہدہ بتاتا ہے کہ ان کی ''محبوبیت'' عام ہوتی ہے، نفع اٹھانے والوں کی محبت کی وجہ تو ظاہر ہے کہ آدمی فطرۃً احسان کا بندہ ہے۔ لیکن ذاتی طور پر مستفید ہونے کا اتفاق جنہیں موقعہ نہیں ملتا، ان کی محبت کی نفسیاتی وجہ ممکن ہے لوگوں کی غیر شعوری امید اور توقع ہو، سمجھا یہ جاتا ہے کہ ضرورت اگر پڑی تو سخی کی اس صفت سے میں بھی نفع اٹھا سکتا ہوں اور یہی توقع قلوب کو ان لوگوں کی طرف مائل کر دیتی ہے۔

حضرت امام کے جود و سخا کے متعلق شقیق بلخی کی ایک روایت

سینکڑوں واقعات میں سے بطور نمونے کے حضرت امام کے جود و کرم کے چند نمونے جو اوپر پیش کیے گئے ہیں، ان کو پیش نظر رکھنے کے بعد اس کا سمجھ لینا بالکل آسان ہے کہ خلق اللہ کے غیر معمولی اعتماد کے حاصل کرنے میں حضرت امام کو کامیابی کیوں حاصل ہوئی تھی۔ جس قسم کے واقعات تاریخوں میں امام کے متعلق درج کیے گئے ہیں میں تو پڑھ کر حیران ہو جاتا ہوں، سوچتا ہوں کہ اعتماد اور بھروسہ کے سوا اس قسم کے آدمی کے ساتھ آخر لوگ کوئی دوسرا تعلق قائم ہی کیسے کر سکتے تھے۔ خیال تو کیجیے کسی معمولی آدمی کی نہیں بلکہ مشہور شیخ الصوفیہ حضرت شقیق بلخی کی یہ چشم دید روایت نقل کی جاتی ہے۔ کہتے تھے کہ میں ایک دن ابوحنیفہ کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ اتنے میں دور سے آتا ہوا ایک آدمی ایسا معلوم ہوا کہ ہماری طرف آ رہا تھا، لیکن ہم لوگوں کو دیکھ کر ایک دوسری گلی میں مڑ گیا۔ شقیق فرماتے ہیں کہ میں نے اس کی طرف توجہ نہیں کی، لیکن امام ابوحنیفہ کو دیکھا کہ اسی کو خطاب کر کے پکار رہے ہیں۔

''جس راستہ پر تم آ رہے تھے اسی پر چلے آؤ۔ دوسری راہ تم نے کیوں اختیار کی۔''

سننے کے ساتھ راہ گیر ٹھہر گیا۔ اتنے میں ہم لوگ اس کے قریب پہنچ گئے۔ دیکھا کہ کچھ شرمیلا شرمایا سا کھڑا ہوا ہے اور میں نے دیکھا کہ امام اس سے کہہ رہے ہیں کہ تم نے اپنی راہ بدلی کیوں؟ جواب میں اس نے کہا دس ہزار کی رقم آپ کی مجھ پر باقی ہے، ادا کرنے میں غیر معمولی تاخیر مجھ سے ہوگئی ہے اور اس وقت تک مجھ میں ادا کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہے۔

آپ کو دیکھ کر مجھے سخت ندامت ہوئی۔ نظر برابر کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا تھا اس لیے دوسری گلی کی

Marfat.com

طرف مڑ گیا تھا۔ شقیق کہتے ہیں کہ ادھر وہ بیچارا تو اپنا عذر پیش کر رہا تھا اور امام کو دیکھتا ہوں کہ اس سے فرما رہے ہیں۔

''سبحان اللہ بس اتنی سی بات کے لیے تم نے مجھے دیکھ کر راستہ بدل دیا اور مجھ سے چھپنے کی کوشش کی۔''

خیر یہاں تک تو کوئی بات نہیں ہے۔ آگے سنیے۔ شقیق ہی راوی ہیں کہ میں نے اس کے بعد سنا کہ امام دس ہزار کے اسی قرض دار کو کہہ رہے ہیں۔

قد وهبتهٔ منی کله (ص۲۶۰ ج ۱)

میں نے اپنی طرف سے جاؤ یہ رقم تمہیں ہبہ کر دی۔

کیا مطلب؟ دس بیس روپیہ نہیں دس دس ہزار کے قرض کو بغیر کسی دغدغہ سوچ بچار کے ایک قلم معاف فرما دیا گیا اور قرض ہی کی معافی کی حد تک بات ختم نہیں ہوگئی۔ حضرت شقیق ہی کا بیان ہے کہ اس کے بعد امام صاحب خود ہی ان الفاظ میں اس قرضدار سے معافی چاہ رہے تھے کہ

''بھائی! مجھے دیکھ کر تمہارے دل میں ندامت یا دہشت کی جو کیفیت پیدا ہوئی، خدا کے لیے اس کو معاف کر دو۔''

وہی نہیں جس کے ساتھ امام نے بالکل خلاف توقع برتاؤ فرمایا بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس زمانہ میں جس کسی نے اس قصے کو سنا ہوگا، اضطراراً امام کی طرف سے اس کے دل میں جو کیفیت پیدا ہوئی ہوگی اس کا اندازہ اسی سے کیجیے کہ آج بھی میں نہیں سمجھتا کہ اس واقعہ کو سن کر سننے والے میں سنسنی نہ پیدا ہو جاتی ہو۔ میں دوسروں کی تو نہیں کہتا خود میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

اب آپ ہی بتائیے کہ اپنی امانتوں کو محفوظ کرانے کے لیے لوگوں کو امام سے زیادہ بہتر آدمی اور کون مل سکتا تھا اور کچھ اس قسم کا سلوک ان کا کسی خاص طبقہ کے ساتھ محدود نہیں تھا۔ فاسق ہو، فاجر ہو، حتیٰ کہ عقیدے کے اتحاد کی بھی امام کے حسن سلوک کے لیے شرط نہ تھی۔ کون نہیں جانتا کہ امام ایک پختہ اعتقاد سنی تھے، لیکن کچھ دیر پہلے گذر چکا کہ ایک شیعہ کو حضرت امام فارسی میں فرماتے ''تو بہ! نہ بد مرد ست ایں۔''

حلم

امام کی یہی ہر دل عزیزیاں جو ان کے ان قدرتی کمالات کے لازمی نتائج تھے، بعضوں کا ان کو محسود بھی بنا دیا تھا۔ حاسدوں کا گروہ شہر کے غنڈوں شہدوں کو آمادہ کر کے کبھی کبھی امام کو بری بھلی باتیں بھی سنوایا کرتا، لیکن ایسی کوئی روایت نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ کبھی امام نے ان لوگوں کے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا ہو۔ سوانح نگاروں نے معتبر ذرائع سے اس قسم کے بیسیوں واقعات کا تذکرہ کیا ہے۔ بعض واقعات اس سلسلہ میں عجیب اور دلچسپ ہیں۔ لکھا ہے کہ ان ہی

Marfat.com

غنڈوں میں سے ایک شخص نے امام کو برسرِ راہ سخت سست کہتے ہوئے پیچھا کیا۔ چاہتا تھا کہ امام بھی اس کی یاوہ گوئیوں کے جواب میں کچھ کہیں، لیکن بجائے اس کے سر جھکائے امام صاحب گھر ہی کی طرف بڑھتے رہے حتیٰ کہ گھر میں گھس گئے۔ غنڈا امام کی اس حرکت پر کچھ کھسیانا سا ہو کر کہنے لگا کہ

''کیا مجھے کوئی کتا فرض کرلیا ہے کہ بھونک رہا ہوں اور جواب بھی نہیں دیتے ہو۔''

کہتے ہیں کہ اس کے کہنے پر ہلکی سی آواز اندر سے آئی کہ اور کیا سمجھوں؟ اسی قسم کے ایک واقعہ میں بیان کیا گیا ہے کہ امام جب اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ گئے، تب خطاب کر کے اس سے فرمانے لگے۔

''لو بھائی! اب میری حویلی آ گئی۔ اندر چلا جاؤں، جی اگر نہ بھرا ہو تو میں شہر جاتا ہوں، اپنی بھڑاس اچھی طرح نکال لو۔''

ظاہر ہے کہ اس قسم کے جوابوں کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے وہ امام کے سامنے بھی پیش آتا تھا یعنی بسا اوقات اس قسم کے لوگ اپنے کیے پر نادم ہو کر تائب ہو گئے۔

پڑوسیوں کے ساتھ حُسنِ سلوک

اسی قسم کے ایک شرابی کا قصہ عام طور پر مشہور بھی ہے۔ موچی تھا، امام کے پڑوس میں رہتا تھا۔ دن بھر بازار میں کام کرتا، لوٹتے ہوئے پینے پلانے کا سامان لے کر گھر آتا۔ رات بھر نشہ کی حالت میں بکواس لگایا کرتا۔ مشہور ہے کہ اس شعر کو بکثرت نشہ کی حالت میں پڑھتا۔

اضاعونی وائی فتی اضاعوا　　　لیوم کریھة و سداد ثغر

یعنی لوگوں نے مجھے ضائع کر دیا اور کیسے گبرو جوان کو ضائع کیا۔ کٹھن دنوں میں اور ملک کی سرحدوں کی حفاظت میں جو کام آ سکتا تھا۔

محلہ والے ان کی ان ہنگامہ آرائیوں سے تنگ تھے۔ آخر پولیس ایک دن اس موچی کو پکڑ کر لے گئی اور بے چارا جیل چلا گیا۔ رات جب ہوئی تو امام کے کانوں میں اس کی آواز حسبِ دستور نہ آئی۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ قید ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ اپنے اس فاسق و فاجر پڑوسی کی اس مصیبت سے امام اس درجہ متاثر ہوئے کہ خلافِ دستور اپنے بلند مقام کا خیال کیے بغیر سیدھے کچہری پہنچے۔ کچہری میں کھلبلی مچ گئی کہ امام ابوحنیفہ آج یہاں کیسے آ گئے ہیں۔ حاکم کو اطلاع ہوئی۔ اجلاس چھوڑ کر باہر نکل آیا اور جیسا کہ چاہیے بڑی تعظیم و توقیر کے ساتھ اندر لے گیا۔ امام سے اس نے پڑھا بھی تھا۔ بہر حال تعجب سے اس نے پوچھا کہ حضرت کے قدم رنجہ فرمانے کی وجہ کیا ہوئی۔ سن کر بے چارے کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب امام نے فرمایا کہ میرے محلہ کا ایک موچی جو میرا پڑوسی ہے پولیس والوں نے اس کو گرفتار کر کے جیل بھجوا دیا ہے۔ میں حاضر ہوا ہوں کہ میری ذمہ داری پر اسے اب کی رہا کر دیا جائے۔ بھلا اس میں عذر کی گنجائش ہی کیا ہو سکتی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ موچی جب جیل سے باہر آیا تو دیکھا گیا کہ امام اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہیں اور

Marfat.com

فرماتے جاتے ہیں۔

''کیوں بھائی! میں نے تو تمہیں ضائع ہونے نہیں دیا۔''

موچی بے چارہ آنکھیں جھکائے کہہ رہا تھا۔

لا یا سیدی و مولای لا ترانی بعد الیوم افعل شیئاً تتاذی به

نہیں میرے سردار! میرے آقا! آج کے دن سے آپ مجھے ایسی حرکتوں میں مبتلا نہ پائیں گے جن سے آپ کو اذیت ہوتی تھی۔

کہتے ہیں کہ توبہ میں وہ سچا ثابت ہوا۔ امام صاحب کے حلقہ میں آنے لگا۔

الی ان صارمن فقهاء الکوفة (ص ۲۲۵ ج ۱)

تا ایں کہ کوفہ کے فقہا میں شمار ہونے لگا۔

ذمیوں کے ساتھ حسنِ سلوک

اور یہ موچی تو خیر بہر حال مسلمان تھا، ہم تو دیکھتے ہیں کہ حضرت امام کے ابرِ کرم وحسن سلوک کی بارش کے لیے اسلام کی شرط بھی نہ تھی۔ ابن بشکوال کے حوالہ سے صاحبِ ''معجم'' نے نقل کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے

شفع لذمی عند المنصور خمس مرات فی یوم واحد اربع مرات برسوله والخامسة بنفسه حتی قضیت مصلحة. (ص ۱۶۸، معجم، ج ۲)

ایک ذمی (یعنی غیر مسلم کی) جو اسلامی حکومت کا باشندہ تھا اس کی ابوجعفر منصور عباسی خلیفہ کے پاس ایک دن میں پانچ دفعہ سفارش کی چار دفعہ تو امام نے اپنے قاصد کو بھیج کر سفارش کی۔ پانچویں دفعہ خود گئے اور سفارش کی، تا ایں کہ اس کا کام ہوگیا۔

ذمی کی سفارش اور وہ اپنے اعدی عدو ابوجعفر منصور کے دربار میں حقیقت یہ ہے کہ یہ امام ہی کا کام ہوسکتا ہے۔ نفسیاتی اصول پر سوچنا چاہیے کہ اس قسم کی شخصیت کے ساتھ عوام میں نیاز وعقیدت کے جذبات جس حد تک بھی پیدا ہوں، کیا ان پر تعجب کرنا چاہیے۔

عفوو درگذر

خدا جانے اس زمانہ میں لوگ ان باتوں پر اعتماد کرنے کے لیے تیار بھی ہوں یا نہ ہوں۔ مگر ایسے روات مثلاً امام الائمہ ابوبکر زنجری کے حوالہ سے امام کے سوانح نگاروں نے یہ روایت نقل کی ہے کہ

''ایک صاحب نے امام صاحب سے آ کر کہا کہ حضرت مجھے ایک ضرورت پیش آ گئی تھی۔ معاف کیجئے گا میں نے آپ کی طرف سے آپ پر اعتماد کرتے ہوئے فلاں تاجر کے نام رقعہ لکھا کہ تیس اشرفیاں بطور قرض کے بھیج دو۔ اس نے بھیج دیں میں نے اس کو لے لیا ہے۔''

کہتے ہیں کہ امام نے ان صاحب کی یہ بات سن کر بجائے بگڑنے اور خفا ہونے کے کہا تو یہ کہا کہ

''بھائی! میں نہیں سمجھتا کہ کسی سے نفع اٹھانے کا یہ طریقہ بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن اگر آپ کو اس سے نفع پہنچا ہے تو مبارک ہو۔''

اسی قسم کی ایک روایت امام ابوالمحاسن مرغینانی کے حوالہ سے بھی مورخین نے درج کی ہے حاصل جس کا یہ ہے کہ

''جرجان کے گورنر کے نام امام صاحب کے کسی ملنے والے نے ایک خط امام صاحب کی طرف سے لکھا جس میں چار ہزار درم کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ خط پاتے ہی گورنر نے اسی وقت چار ہزار کی رقم روانہ کردی۔'' (ص ۴۶۵ ج ۲)

اس کی خبر بھی جب امام کو دی گئی تو وہی فرمایا جو پہلے شخص سے کہا تھا اور میں تو کہتا ہوں کہ قطع نظر اس فراخ دلی کے ثبوت کے جو ان واقعات کا لازمی نتیجہ ہے۔ ان ہی واقعات سے اس ''اعتماد'' کا حال بھی معلوم ہوتا ہے جو ادنیٰ اور اعلیٰ طبقات میں آپ کو حاصل تھا۔ آخر خیال کرنے کی بات ہے کہ محض ایک رقعہ پر تیس تیس اشرفیاں اور ان سے بھی زیادہ ایک صوبہ کے والی کا چار ہزار کی خطیر رقم کا حوالہ کردینا کیا معمولی اعتماد کی شہادتیں ہیں۔

حُسنِ معاملہ

میں نے کچھ دیر پہلے امام صاحب کی تجارت کی یہ خصوصیت بیان کی تھی کہ چیزوں کی قیمت ان کے پاس مقرر تھی۔ اسی سلسلہ میں لوگوں نے بیان کیا ہے کہ ایک دن اتفاق سے امام صاحب اپنی دکان میں موجود نہ تھے۔ تلامذہ جو آپ کی دکان میں کام کرتے تھے، ان میں کسی صاحب نے ایک گاہک کو مقررہ دام سے زیادہ میں ایک کپڑا دے دیا۔ امام صاحب جب آئے اور فروخت کے حساب کو جب دیکھا تو اس کپڑے کی مقررہ قیمت سے معلوم ہوا کہ دام زیادہ لے لئے گئے ہیں۔ طالب علم کی طرف آپ نے غیظ کی نگاہ سے دیکھا۔ سننے والوں کا بیان ہے کہ غصہ میں فرمار ہے تھے۔

تغرالناس وانت معی فی دکانی (ص ۱۹۹ ج ۱)

تم لوگوں کو دھوکہ دیتے ہو، حالانکہ دکان میں میرے ساتھ رہتے ہو۔

کہتے ہیں کہ خریدار مدینہ منورہ کا باشندہ تھا۔ کپڑا خرید کر وہ مدینہ جاچکا تھا۔ امام کو یہ خیال رہا تھا کہ دھوکے سے یہ دام اس سے وصول کئے گئے ہیں۔ یعنی اس نے تو اس اعتماد پر کہ امام کی دوکان میں ہر چیز کی مقررہ قیمت ہوتی ہے۔ جو کچھ اس سے مانگا گیا اس نے دے دیا، اگر اس کو یہ اعتماد نہ دلایا جاتا تو یقیناً کچھ کم کرانے کی کوشش کرتا۔ بہر حال قصہ کہاں تک صحیح ہے راویوں کا بیان ہے کہ امام نے خاص کر کے مدینہ کا سفر اختیار کیا اور معاملہ کہ اس سے صاف کیا (یہ واقعہ آپ کے مناقب کی عام کتابوں میں پایا جاتا ہے)۔

Marfat.com

اور یہ تو خیر ایک اصول کی پابندی کا اقتضا تھا۔ ان ہی کتابوں میں لکھا ہے کہ بسا اوقات لوگ اپنا مال امام کی دکان پر بیچنے آتے۔ بیچنے والا اپنے نزدیک نفع وغیرہ رکھ کر ایک دام بتاتا، لیکن خود امام صاحب کے نزدیک چیز زیادہ دام کی اگر ہوتی تو بیچنے والے سے فرماتے کہ نہیں تمہارا مال زیادہ قیمت کا ہے اور اصرار کر کے اپنی مشخصہ قیمت کے لینے پر اس کو مجبور کرتے۔[۱۴۱]

بہر حال امام کی زندگی کے ان واقعات کے دہرانے سے میرا مقصد یہ ہے کہ امانتوں اور ودیعتوں کے سلسلہ میں مورخین نے جن بڑی بڑی رقموں کا ذکر کیا ہے۔ بہ ظاہر ان پر تعجب ہوتا ہے کہ ایک عام خوش باش شہری پر لوگوں کو اتنا اعتماد کیسے تھا جو اتنی بڑی بڑی رقمیں ان کے پاس رکھواتے تھے۔

لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ جن واقعات کا ذکر آپ کے سامنے کیا گیا ہے ان کو پیش نظر رکھنے کے بعد ان شاء اللہ تعجب باقی نہیں رہے گا۔ جس شخص کے معاملات کی صفائی عام ہمدردی، سیر چشمی کا یہ حال ہو، اگر دنیا اس کی حفاظت وضمانت میں اپنے مال کو جمع کراتی تھی تو اس کے سوا ان حالات میں اور ہو ہی کیا سکتا تھا۔

اور یہ تو خیر اعتماد واطمینان کے اخلاقی وجوہ ہو سکتے ہیں، مختلف قرائن وشواہد کی روشنی میں ایک بات میری سمجھ میں جو آتی ہے، اگر وہ صحیح ہے تو علاوہ اخلاقی اعتماد کے ایک بڑی اہم وجہ قانونی اعتماد کی بھی نکل آتی ہے اور اسی سے یہ بھی سمجھ میں آجائے گا کہ ان ودیعتوں کی نوعیت کیا تھی؟ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کے عرض کرنے سے پہلے فقہ حنفی کے ایک قانون کو سمجھ لینا چاہیے۔

امانتوں کے متعلق ایک شرعی توضیح

اتنا تو شاید لوگ جانتے ہوں گے کہ علاوہ فصلِ خصومات اور عدل وانصاف کے مسلمانوں کے قاضیوں کے متعلق چند دوسرے کام بھی اسلامی عہد میں سپرد کئے جاتے تھے، جن میں ایک کام یہ بھی تھا کہ اپنے اپنے علاقہ کے یتیموں کی جائداد کو قاضی اپنی نگرانی میں حکومت کی طرف سے لے لیا کرتا تھا۔ اس سلسلہ میں دفعات کا ایک طویل سلسلہ ہے جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں مل سکتی ہے۔ مجھے اس وقت اسی سلسلہ کے ایک مسئلہ سے غرض ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ یتیموں کا جو مال قاضی کی امانت میں رکھا جاتا ہے اس مال کی حفاظت کی ایک صورت یہ بھی بتائی گئی ہے کہ

یقرض القاضی اموال الیتامی (قدوری وہدایہ وغیرہ)

قاضی یتیموں کے مال کو قرض پر لگا دیا کرے۔

وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ صرف بمدِ امانت اگر مال رکھا جائے گا تو نقصان ہو جانے کی صورت میں مثلاً چور چرا کر لے بھاگے یا اس قسم کے حادثوں کا شکار ہو جائے تو قانوناً اس چیز کا ضامن نہیں قرار دیا گیا ہے۔ یعنی نقصان ہو جانے کی صورت میں امین سے معاوضہ یا تاوان وصول نہیں کیا جا سکتا، لیکن بجائے امانت کے وہی مال بطور قرض کسی کو دے دیا جائے تو قرض لینے والا بہر حال اس مال کا ضامن بن جاتا ہے، اسی لیے یتیموں کے حقوق کو اتفاقی

آفات وحوادث سے محفوظ کرنے کی یہ صورت نکالی گئی ہے کہ وصولی کے متعلق ممکنہ حد تک اپنے آپ کو مطمئن کر لینے کے بعد یتیموں کے اس مال کو جو قاضی کے پاس بمدِ امانت رکھا جاتا ہے، قرض پر لگا دیا کرے۔ اصلی فائدہ تو اس طریقہ کار کے اختیار کرنے میں یتیموں ہی کا مقصود ہے، لیکن ضمناً عام مسلمانوں کے لیے بغیر سودی قرض کی ایک صورت محکمۂ قضاء میں نکل آتی تھی۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا اس مسئلہ کے مختلف دقیق پہلوؤں کے متعلق فقہ کی کتابوں میں مسائل لکھے گئے ہیں، لیکن میرے لئے مسئلہ کا صرف اتنا جز کافی ہے۔ یعنی حاصل اس مسئلہ کا یہی نکلتا ہے کہ امانتوں کو حوادث وآفات سے بچانے کی صورت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے یہ نکالی تھی کہ بجائے امانت کے ان کو قرض کی شکل عطا کر دی جائے۔ ایسی صورت میں وہ شخص جس کے پاس امانت رکھوائی جاتی ہے۔ غیر ضامن امین نہیں بلکہ ضامن قرض دار بن جاتا ہے۔ یعنی نقصان ہو جانے کی صورت میں ایک ایک پیسے کے ادا کرنے کا وہ ذمہ دار ہے۔

خیال یہی گذرتا ہے کہ جب امام نے یتیموں کی حفاظت کا یہ قانونی طریقہ پیدا کیا تھا، تو عام مسلمانوں کو جو امانتیں امام کے پاس رکھوائی جاتی تھیں، ان امانتوں کے متعلق بھی اگر حفاظت کے اسی طریقہ کو امام نے اختیار فرمالیا ہو تو جہاں تک عقل کا اقتضا ہے، یہی ہونا بھی چاہیے۔

میرا مطلب یہ ہے کہ امانت رکھنے والوں سے صرف اتنی بات کہہ دینی کہ کسی کاروبار میں اگر اس رقم کو لگاؤں تو مجھے اس کی اجازت ہونی چاہیے۔ گویا ایسی اجازت کو مال کی حفاظت کا صلہ قرار دیا جائے تو یہ کہنے کے ساتھ ہی امانت بجائے امانت کے فوراً قرض کی صورت اختیار کرلے گی۔ خواہ لفظ قرض کا استعمال کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ حتیٰ کہ یہ مسئلہ ہے کہ مضاربت (یعنی محنت ایک کی اور سرمایہ دوسرے کا، اسی معاملہ کو مضاربت اور قراض کہتے ہیں) کا لفظ بول کر اگر سرمایہ والا کہہ دے کہ مجھے نفع سے بحث نہیں، صرف میرا اصل سرمایہ واپس ہونا چاہیے۔ یعنی مسئلہ کی صورت یہ ہو کہ

شرط رب المال للمضارب کل الربح کان المال قرضاً

(خلاصہ اشباء اتحاف البصائر۔ ص ۲۷۶)

سرمایہ دار اپنے سرمایہ کے کل منافع کو محنت والے (مضارب) کے لیے اگر مختص کر دے یعنی اسی شرط پر مضاربت کا معاملہ طے پائے تو یہ سرمایہ مضارب کے ذمہ قرض قرار پا جائے گا۔

جہاں تک میرا خیال ہے زیادہ تر امام صاحب کی ودیعتوں اور امانتوں کی یہی نوعیت معلوم ہوتی ہے اور بہ ظاہر امام صاحب کی اس وسیع تجارت کا راز یہی تھا۔ اس غیر معمولی اعتماد کی بدولت جو خلق اللہ میں ان کو حاصل تھا۔ بکثرت لوگ آپ کی حفاظت میں اپنے سرمائے کو دے دیتے تھے، یہ خیال کر کے کہ صرف مدِ امانت میں رکھنے کی وجہ سے حفاظت کی ضمانت کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ امام کاروبار کرنے کی اجازت عموماً امانت رکھانے والوں سے لے کر اس ضمانت کو پیدا کر کے ایک طرف ان کے مال کی حفاظت کی انتہائی اطمینان بخش صورت پیدا کر لیتے تھے اور دوسری طرف ان کو وسیع سے وسیع پیمانے پر تجارت کرنے کے لیے اس راہ سے بے تھاہ سرمایہ مل جاتا تھا۔

Marfat.com

حضرت امام قاضی ابن ابی لیلیٰ کی عدالت میں

شاید امام کے اسی طریقہ کو دیکھ کر ان کے ہم عصر رقیب عالم ابن ابی لیلیٰ جن کا تفصیلی حال آگے آرہا ہے، وہ جہاں امام پر الزام عائد کرانے کی مختلف ترکیبیں اختیار کرتے تھے، جن میں بعض تو ناگفتہ بہ ہیں، ان ہی ترکیبوں میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک دفعہ کسی شخص سے امانت امام کے یہاں رکھوائی گئی اور یہ امانت قاضی بن ابی لیلیٰ ہی کے توسط سے سپرد کی گئی۔ لکھا ہے کہ توڑے پر قاضی صاحب نے اپنی مہر وغیرہ بھی لگائی اور یہ شرط لگا دی گئی کہ اس کو امانت ہی کی مد میں رکھا جائے۔ قاضی صاحب کی یا امانت رکھوانے والے کی یہ بدگمانی تھی کہ باوجود اس شرط کے حسبِ عادت امام اس سے ضرور استفادہ کریں گے اور یہی گرفت کو موقعہ ہوگا کہ صاحبِ امانت کی اجازت کے بغیر اس سے استفادے کا تم کو کیا حق تھا۔ اس کے بعد جیسا کہ کتابوں میں لکھا ہے کہ کارروائی یہ کی گئی کہ ابن ابی لیلیٰ جو اس زمانہ میں کوفہ کے قاضی تھے۔ ان کے اجلاس میں ایک صاحب نے یہ دعویٰ دائر کر دیا۔ فلاں بن فلاں کی جو امانت ابو حنیفہ کے پاس رکھوائی گئی تھی۔

دفع الى ابنه يتجر

امام نے اپنے صاحبزادے کے حوالہ امانت کی۔ یہ رقم تجارت کرنے کے لیے کردی ہے۔

قاضی صاحب تو فکر ہی میں تھے۔ فوراً امام کے نام وارنٹ طلبی کا جاری ہوا۔ امام حاضر ہوئے۔ دعویٰ سنایا گیا۔ ظاہر ہے کہ امام جیسی محتاط ہستی اس امانت میں کیسے تصرف کر سکتی تھی۔ آپ نے صاف انکار کیا اور کہا کہ اپنا آدمی بھیج کر دیکھ لیجیے۔ آپ ہی کی تو مہر توڑے پر لگی ہوئی ہے۔ اگر تصرف اس امانت میں ہوتا، تو مہر کا ٹوٹ جانا یقینی تھا۔ قاضی ابن ابی لیلیٰ سے امام نے کہا کہ اپنا آدمی میرے ساتھ کیجیے۔ چل کر دیکھ لے کہ مہر آپ کی لگی ہوئی ہے یا نہیں۔ آدمی بھیجا گیا۔ اس کا بیان ہے کہ اس مکان میں جہاں امانت کے رقوم تھے، بے شمار تھیلیاں بھری ہوئی تھیں۔ آخر امام نے تلاش کر کے وہ توڑا نکالا۔ دیکھنے والے کا بیان ہے

فاذا هى مختومة بهنيتها (ص ٢١٩)

بجنسہ اپنی مہر کے ساتھ توڑا رکھا ہوا تھا۔

واپس لوٹ کر قاضی ابن ابی لیلیٰ کے اجلاس میں اس نے جو رپورٹ پیش کی اس کے الفاظ یہ تھے۔

نقد رأيت الوديعة بعينهامختومة

میں نے دیکھا کہ جس امانت کے متعلق تصرف بیجا کا اتہام امام پر لگایا گیا ہے، وہ بجنسہ مہر توڑے کے ساتھ موجود ہے۔

خیر یہ تو اس کی شہادت اس خاص امانت کے متعلق تھی جس کے معائنہ کے لیے عدالت نے اس کو مقرر کیا تھا لیکن اسی کے ساتھ اپنی رپورٹ کے آخر میں امام کی برأت کے لیے اپنے جس مشاہدہ کو اس نے پیش کیا، وہ خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ یعنی آخر میں اسی رپورٹ کے یہ بھی تھا کہ

Marfat.com

وعنده من الاموال والودائع مالا یحتاج الی هذه (ص ۲۱۹)
امام ابوحنیفہ کے ہاں تو مالوں کی اور امانتوں کی اتنی کثرت ہے کہ ان کو اس معمولی رقم میں تصرف کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

گو اس کا مقصود تو ان الفاظ کے اضافہ سے یہ تھا کہ جس کے پاس کاروبار میں لگانے کے لیے اتنا بڑا عظیم سرمایہ موجود ہو، جسے دیکھ کر وہ امام کے خزانہ میں آیا تھا، ایسے آدمی کو اس کی کیا ضرورت ہو گی کہ خواہ مخواہ خیانت سے کام لے کر اپنے بیٹے کو اسی کاروبار کے لیے ایسی چیز دے جس کے دینے کی نہ شرعاً اسے اجازت تھی اور نہ قانوناً، لیکن ہمارے لیے سچ پوچھیے تو یہ بھی ایک قسم کا اس دعویٰ کے ثبوت کا گویا وثیقہ ہے کہ عام ودائع اور امانتیں جو امام کے پاس لوگ رکھتے تھے، ان کے متعلق تصرف کرنے اور اپنے کاروبار میں لگانے کی اجازت امانت رکھوانے والوں سے حضرت امام لے لیا کرتے تھے۔ اگر واقعہ کی یہ صورت نہ تھی۔ ''الاموال'' کے ساتھ ''الودائع'' کے لفظ کا وہ ہرگز اضافہ نہ کرتا لیکن چونکہ اس سے واقف تھا کہ امام کے یہاں کی عام ودیعتوں اور امانتوں کی نوعیت یہی ہوتی ہے، اسی لیے اس نے بیان کیا کہ کاروبار میں لگانے کے لیے جس کے پاس امانتوں اور ودیعتوں کا اتنا بڑا عظیم ذخیرہ ہو، اسے قطعاً اس کی ضرورت نہ تھی کہ اس امانت میں دخل اندازی کرے جس کے متعلق اس کی اجازت امانت دار نے نہیں دی تھی۔

بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ امام پر یہ دعویٰ جو دائر کیا گیا تھا کہ اس ''مختومہ امانت'' کو بھی تجارت میں لگانے کے لیے اپنے صاحبزادے کے حوالہ امام نے کی ہے۔ یہ دعویٰ بھی اسی کی دلیل ہے کہ لوگوں کو عام طور پر یہ معلوم تھا کہ امانتوں اور ودیعتوں کو تجارتی کاروبار میں لگانے کے چونکہ امام عادی ہیں اس لئے حسب عادت انہوں نے اس امانت کے ساتھ بھی یہی برتاؤ کیا ہو گا، لیکن بے وقوفوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ حضرت امام جیسا محتاط آدمی امانتوں کی مختلف نوعیتوں میں فرق کئے بغیر حسب دستور سب کے ساتھ ایک ہی سلوک کیسے کر سکتا تھا۔ اور سوچا جائے تو رپورٹ کے آخری الفاظ سے ایک تاریخی شہادت اس بات کی بھی مل جاتی ہے کہ حضرت امام کے پاس ایسے اموال و ودائع کا بہت بڑا ذخیرہ رہتا تھا جن سے اپنے تجارتی کاروبار میں وہ مستفید ہوتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ائمہ احناف میں امانتوں کے متعلق حفاظت وضمانت کے اس طریقے کے اختیار کرنے کا عام رواج تھا۔ الخطیب نے ''تاریخ بغداد'' میں اگرچہ اپنی عادت کے مطابق ابو یوسف کے مثالب اور ان کی مذمت میں یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک صاحب نے قاضی ابو یوسف پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ اس شخص سے حدیث کی روایت اس لئے جائز نہیں ہے۔

انه کان یعطی اموال الیتامی مضاربة ویجعل الربح لنفسه (ص ۲۸۲ ج ۱۴)
یتیموں کا مال مضاربت پر لوگوں کو دیتا ہے اور نفع اس کا خود لیتا ہے۔

سچ کہا ہے کہ کسی نے کہ ''بداندیشی'' ہمیشہ ''ہنر'' کو ''عیب'' کی شکل دے دیتی ہے۔ اگر یہ واقعہ ہے اور واقعہ ہونے میں اس کے شبہ بھی نہ کرنا چاہیے کیونکہ خطیب نے اس روایت کو یزید بن ہارون جیسے محدث جلیل وثقہ کی طرف منسوب کیا ہے۔ اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے خواہ مخواہ ایک غلط بات قاضی صاحب کی طرف منسوب نہ کی ہو گی۔ مگر یہ بات کہ ان کا یہ فعل یتیموں کے حق میں مفید تھا یا مضر، افسوس ہے کہ عدم تفقہ کی وجہ سے وہ یہ نہ سمجھ سکے۔ بلکہ جیسے ایک عام آدمی اس کو سن کر قاضی صاحب کے متعلق بدگمانی میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ باوجود بڑے آدمی ہونے کے

یزید بن ہارون بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ صرف ''امانت'' کی شکل میں اگر یتیموں کے مال کو رکھا جائے تو ضائع ہو جانے کی صورت میں تلافی کی کوئی قانونی شکل باقی نہیں رہتی، بجز اس کے کہ رو دھو کر آدمی بیٹھ جائے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اگر یتیموں کے ان اموال کو بطورِ مضاربت کے کسی کے حوالہ کر دیا جائے۔ یعنی محنت اس کی ہو اور نفع میں محنت کرنے والا اور یتامیٰ جن کا روپیہ ہے، دونوں شریک رہیں۔ بلاشبہ نفع کی صورت میں تو یتیموں کا اس میں فائدہ ہے، لیکن تجارت بہرحال تجارت ہے۔

ع: فان الربح والنقصان فی التجر

مشہور بات ہے، ہو سکتا ہے کہ تجارت میں خسارہ بھی ہو اور نفع بھی، لیکن خسارے کی صورت میں نفع تو نفع کبھی اصل سرمایہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں بیچارے یتامیٰ پر یہ کتنا بڑا ظلم ہو جائے گا۔ یقیناً اس سے یہ بہتر ہے کہ ان کے اصل سرمایہ کو اس طور پر محفوظ کر لیا جائے کہ کم از کم اصل سرمایہ بہرحال ان کو مل جائے۔ بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ قاضی ابو یوسف یہی کرتے تھے۔ یعنی بجائے ''امانت'' کے اس کو ''قرض'' کی نوعیت دے کر کاروبار کرنے والوں کو بطورِ مضاربت کے دے دیا کرتے ہوں گے۔ یعنی خود اپنے آپ کو قرض دار قرار دے کر مضارب کے حوالہ اس رقم کو کرتے تھے۔ ایسی صورت میں اگر نقصان بھی ہو جاتا ہوگا تو امانت نہیں بلکہ قرض ہونے کی وجہ سے یتیموں تک ان کا اصل سرمایہ کو بہرحال پہنچانا قاضی صاحب کے لیے ناگزیر تھا یعنی خود اپنے مال سے اس کی پابجائی شرعاً ان پر واجب تھی اور کھلی ہوئی بات ہے کہ نقصان کا جو ذمہ دار ہوگا، نفع کا مستحق بھی اسی کو ہونا چاہیے ورنہ نفع کا مستحق قرار دیتے ہوئے نقصان کی جو ذمہ داری سے علیحدہ ہو جانا ظاہر ہے کہ یہ تو صراحتاً سود اور ربا کی شکل تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یزید بن ہارون یا ان جیسے حضرات آخر چاہتے کیا تھے۔ کیا یہ چاہتے تھے کہ یتامیٰ کے مال کو ایسی حالت میں چھوڑ دینا زیادہ بہتر ہوتا کہ کسی وجہ سے ضائع ہو جانے کی صورت میں ان کی تلافی کی کوئی شکل نہ نکلتی یا ان کا یہ خیال تھا کہ مسلمان یتیموں کو قاضی ابو یوسف سود خوار بنا دیتے۔ بعد کو میں نے دیکھا کہ حافظ ابن حجر نے ''لسان المیزان'' میں یزید بن ہارون کے قول کو نقل کرنے کے بعد اس کی تصریح بھی کر دی ہے کہ

انه کان یقرضها علی ذمته

یعنی ابو یوسف یتیموں کے اموال کو خود اپنے ذمہ قرض لے کر لوگوں کو مضاربت پر دے دیا کرتے تھے۔

دیکھا آپ نے کیا یہ وہی بات نہیں ہے جسے حقیر نے عرض کیا، مگر کیا کیجیے کہ یتیموں کے اموال کی حفاظت کا ذریعہ جس طریقۂ کار کو قاضی ابو یوسف نے بنایا تھا، لوگوں نے یتیموں کے حق میں اس کو ظلم قرار دینا چاہا۔

پیداوار پر پیمانہ کبیر کا امکان

حقیقت تو یہ ہے کہ لوگوں نے حضرت امام کی زندگی کے اس پہلو کی طرف کبھی خصوصی توجہ ہیں ڈالی۔ ورنہ نظر آ سکتا تھا کہ سود اور ربا کے بغیر حضرت امام نے بڑے سے بڑے کبیر پیمانہ پر کاروبار کے جاری کرنے کا ایک اچھا

Marfat.com

امکان اپنے عمل کے نمونہ سے پیدا کر دیا تھا کہ ایک طرف ان لوگوں کے لیے جن کے پاس مصارف کے بعد پس ماندہ سرمایہ رہ جاتا ہے، ان کے لیے اپنے سرمایہ کے حفاظت وصیانت کی ایسی مستحکم قانونی ضمانت کی شکل پیدا کر دی تھی کہ چور چکار اور اسی قسم کے آفات کے کھٹکوں سے ان کا سرمایہ محفوظ ہو جاتا ہے اور دوسری طرف جیسا کہ میں نے عرض کیا بڑے سے بڑے کاروبار کے لیے سرمایہ کے مہیا ہونے کی بھی صورت نکل آتی ہے۔[15]

بنک کا نظام امام نے قائم کر دیا تھا

بلکہ ان اعداد و شمار کو جو حضرت امام کے ودائع اور امانتوں کے متعلق مورخین نے لکھے ہیں۔ جب ان کو سوچتا ہوں اور حضرت امام کی جو ساکھ قدرتاً ملک میں قائم ہو گئی تھی جب اس کو سامنے رکھتا ہوں تو یہ تصور کرنے میں مجھے کچھ مضائقہ محسوس نہیں ہوتا کہ امام کی تجارتی کوٹھی موجودہ زمانے کے بڑے سے بڑے بنک کی قائم مقامی کرتی تھی۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ جن اعداد کا مورخین نے ذکر کیا ہے، یہ ان امانتوں کی تعداد تھی جو امام کی وفات کے بعد ان کے گھر سے نکلی۔ ایک ایسا آدمی جو ستر سال کی عمر تک پہنچ گیا ہو، اور ہو وہ حضرت امام جیسا محتاط۔ یقیناً اس کے متعلق یہی باور کرنا چاہئے کہ اپنی عمر کے اس آخری زمانہ میں حتی الوسع ذمہ داریوں سے سبک دوش ہونے میں کوشش کا دقیقہ فروگذاشت نہ کیا ہوگا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کاروبار اتنا پھیلا ہوا تھا کہ سمیٹتے سمیٹتے بھی آخر چار پانچ کروڑ کی امانتیں ایسی رہ گئی تھیں جو ادا نہ ہو سکیں، لیکن ان کے ادا کرنے کا سامان امام کر چکے تھے۔ پس اگر یہ صحیح ہے کہ وفات پانے کے بعد امام کے ہاں سے پانچ کروڑ کی امانتیں برآمد ہوئیں تو یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ عام دنوں میں ان امانتوں کی تعداد مذکورہ بالا رقم سے اضعافاً مضاعفہ کہیں زیادہ ہوگی۔ امام کی تجارتی کوٹھی جس احاطہ میں تھی، اس کا حال گذر چکا کہ کوفہ کا وہ دار کبیرہ تھا۔ خصوصیت کے ساتھ مختلف تاریخی واقعات کے ذکر میں اس امکان کا ذکر کیا جاتا ہے۔[16]

بہرحال اتنا یقینی ہے کہ امام کی تجارت کوئی معمولی تجارت نہ تھی اور نہ معمولی سرمایہ سے وہ جاری تھی، جس کا علاوہ مذکورہ بالا باتوں کے ایک بڑا ثبوت خود امام کے خیراتی یا دوسرے مصارف ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امام نے اتنے وسیع پیمانے کے کاروبار کو جو اختیار فرمایا تھا، اس کے اندرونی محرکات کیا تھے؟

اربابِ حکومت کی امداد سے بے نیازی

یہ سچ ہے کہ وہ حکومت کی امداد سے بے نیاز رہنا چاہتے تھے اور اس کا اظہار مختلف طریقوں سے وہ خود بھی کیا کرتے تھے۔ سوانح نگاروں نے لکھا ہے، الخطیب تک نے نقل کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ بکثرت ان دو شعروں کو پڑھا کرتے۔ (ص ۳۵۹ ج ۱۳)

عطاء ذی العرش خیر من عطائکم　　　وسیبه واسع یرجی وینتظر

عرش والے کی داد، تمہاری داد و دہش سے بہتر ہے

اس کا ابر کرم فراخ ہے جس سے امیدیں وابستہ ہیں اور جس کا انتظار کیا جاتا ہے

انتم یکدر ما تعطون منکم

تم لوگ (حکومت والے) جو کچھ دیتے ہو، اس کو گدلا کر دیتے ہو

واللہ یعطی بلا من ولا کدر

اور حق تعالیٰ دیتے ہیں، جس میں نہ احسان جتلانے کی اذیت ہوتی ہے اور نہ کسی قسم کی کدورت اس میں ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ "کم" تم لوگ سے مراد ان اشعار میں اس زمانہ کے اربابِ حکومت ہی ہیں وہی لوگ جن کی طرف اشارہ کر کے امام صاحب فرمایا کرتے تھے۔

لو لا انی اخاف ان التجی الی ھؤلاء ما امسکت درھماً واحداً

(مناقب ملا علی قاری۔ ص ۴۹۶۔ ذیل جواہر المضیۂ)

دوسروں نے بھی بیان کی ہے کہ

کان ابو حنیفة ازھد الناس فی درھم یا خذہ من السلطان (ص ۲۱۳، موفق، ج ۱)

ابو حنیفہ حکومت سے ایک ایک درم تک کے لینے میں سب سے زیادہ محتاط تھے۔

ان کے دیکھنے والوں نے اس کی شہادت دی ہے کہ

لم یا خذابو حنیفة من سلطان قط در ھما ولا دیناراً (ص ۲۱۳)

امام ابو حنیفہ نے حکومت والوں سے نہ کبھی ایک درم ہی لیا اور نہ اشرفی

لیکن اسلامی علماء (محدثین وفقہاء) کی تاریخ کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ حضرت امام امراء جور سے ترک موالات کے اس مسلک میں متفرد نہ تھے۔ جس زمانہ سے "ملوک عضوض" کا دور شروع ہوا، تقریباً ہر قرن میں ایک کافی تعداد اہل علم وتقویٰ کے گروہ میں ان لوگوں کی پائی جاتی ہے جنہوں نے حکومت اور اس کے خزانے کی طرف نگاہِ غلط انداز ڈالنی بھی کبھی پسند نہیں فرمائی۔ گذشتہ اوراق میں سفیان ثوری اور مسعر بن کدام رحمتہ اللہ علیہما کا ذکر آ چکا ہے جو امام کے ہم وطن وہم عصر تھے۔ یہی مشرب ان دونوں کا تھا اور زندگی بھر اسی مسلک کے یہ حضرات پابند رہے۔

سوال یہ ہے کہ صرف اتنی بات کے لیے یعنی حکومت کی امداد کے لینے پر مجبور نہ ہونا پڑے اس کے لیے امام کو اتنے بڑے طول وطویل کاروبار کے پھیلانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس قسم کے حضرات نے ہمیشہ اس مسئلہ کو "اجملوا فی الطلب" یعنی دنیا کے طلب کرنے میں اجمال مختصر گیری سے کام لو۔ پر عمل کر کے حل کیا ہے۔ ان ہی مسعر بن کدام کا ایک دلچسپ فقرہ تاریخوں میں نقل کیا جاتا ہے۔ فرمایا کرتے تھے۔

من صبر علی الخل والبقل لم یستعبد. (ص ۱۷۸ ج ۱۔ تذکرۃ الحفاظ)

جس نے سرکہ اور بھاجی پر صبر کرنے کا عادی اپنے آپ کو بنالیا، وہ کبھی غلام نہیں بنایا جاسکتا۔

جن لوگوں پر ''آزادی'' و ''حریت'' کا یہ راز واضح ہو چکا تھا وہ حاجتوں میں مختصر ہو جانے یا ہر چہ گیرید مختصر گیرید کے فلسفہ کو چھوڑ کر خواہ مخواہ اس جال جنجال کی جھنجٹوں میں اپنے آپ کو کیوں مبتلا کرتے۔ خصوصاً امام کی اس عقل دور اندیش کے ساتھ جس کے چرچوں سے مسلمانوں کی عملی تاریخ کی کتابیں معمور ہیں، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مادی لذات کھانے پینے وغیرہ کے تکلفات کی خواہش بھی امام میں نہیں پائی جاتی تھی۔[17]

امام صاحب کے مجاہدات وریاضات اور خانگی زندگی

بہرحال کسی دنی جذبہ کا اقتضاء امام کے اس وسیع کاروبار کو قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ سچ تو یہ ہے کہ امام کے جن مجاہدات وریاضات کا تذکرہ کتابوں میں کیا جاتا ہے، ان کو دیکھتے ہوئے تو یہی کہنا پڑتا ہے جیسا کہ پہلے کہا بھی گیا ہے کہ

کان جهاده كله الی قبر (بحوالہ مکی بن ابراہیم، معجم، ص ۱۶۵)

ان کی ساری کدو کاوش کا رخ قبر ہی کی جانب تھا

الذہبی جو امام سے اقتداء کا تعلق نہیں رکھتے، ان کو بھی لکھنا پڑا کہ

''امام کی تہجد اور شب بیداری کے واقعات اتنی کثرت سے بیان کئے گئے ہیں کہ وہ حدِ تواتر کو پہنچے ہیں۔''

انہوں نے لکھا ہے کہ

من ثم یسمی الوتد[18] من کثرة قیامه باللیل (ص ۱۶۵، معجم)

شب بیداری اور اس کے قیام ہی کی وجہ سے امام ابوحنیفہ کو لوگ وتد میخ بھی کہتے تھے۔

یہ مشہور امام ابو عاصم نبیل کا فقرہ ہے۔ الذہبی نے امام کے ختم قرآن کے عجیب وغریب واقعات کی طرف اشارے کئے ہیں جو آدمی کی سمجھ میں نہیں آتے۔ اس حکایت کا کہ جس مقام پر امام کی وفات ہوئی وہاں پر انہوں نے سات ہزار دفعہ قرآن ختم کیا تھا، الذہبی نے بھی تذکرہ کیا ہے۔ بہرحال ممکن ہے کہ بعض واقعات میں مبالغہ ہو، عام قاعدہ یہی ہے کہ اس قسم کے قصوں میں مبالغہ سے کام عموماً لیتے ہیں۔ کچھ بھی ہو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ امام کے متعلق یہ خیال کسی حد تک صحیح نہیں ہوسکتا کہ مالی جدوجہد تجارتی کاروبار کے سلسلے میں وہ جو کچھ کر رہے تھے، جذبۂ دنیا طلبی کی تسکین کے لیے کر رہے تھے۔ اگر دنیا طلبی ان کے پیش نظر ہوتی تو دنیا امویہ اور عباسیہ دونوں حکومتوں کے زمانہ میں منہ پھاڑے ان کے سامنے بار بار آئی لیکن امام نے استغناء کی ٹھوکروں کے سوا اس کا کوئی جواب نہیں دیا جس کے تفصیلات

Marfat.com

عنقریب ان شاء اللہ آ ہی رہے ہیں اور عام طور پر تواتر اور استفاضہ کی شکل میں امام کے یہ استغنائی قصے مشہور و معروف ہیں۔ یوں بھی مؤرخین کا وہی گروہ جوان کی تجارت اور دولت کے یہ قصے سناتا ہے۔ ان ہی کی زبانی ہم یہ بھی تو سنتے ہیں کہ بعض مواقع پر امام اپنے ذاتی صرفہ ماہوار کو بتاتے ہوئے خود فرماتے تھے کہ

انما قوتی فی الشهر درهمان فمرة[19] السويق و هرة الخبز (ص ۱۶۸، مجم)

میری ذاتی خوراک مہینے میں درم سے زیادہ نہیں ہے کبھی ستو، کبھی روٹی۔

ارزانی کے اس زمانہ میں ان لوگوں کے لیے جنھوں نے بقل (بھاجی) اور خل (سرکہ) پر صبر کیا شائد چنداں محل تعجب بھی نہیں ہے۔[20] یہی حال ان کے گھر کے ساز و سامان کا بھی بیان کیا جاتا ہے۔ سہل بن مزاحم کے حوالہ سے ارباب مناقب نے نقل کیا ہے کہ

كنا ند خل على ابى حنيفة فلا نرى فى بيته الاالبوارى (ص ۲۱۴، موفق)

ہم امام ابوحنیفہ کے پاس حاضر ہوتے تو ان کے گھر میں چٹائیوں کے سوا اور کچھ نہ پاتے۔

اور یوں بھی دیکھا جائے تو امام پر کسی بڑے خاندان کا بار بھی نہ تھا۔ ان کی اولاد میں حماد بن ابی حنیفہ رحمتہ اللہ علیہما کے سوا اور کسی لڑکے یا لڑکی کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ جہاں تک واقعات سے معلوم ہوتا ہے اپنی پوری زندگی انہوں نے ان ہی حماد کی والدہ یعنی ایک ہی بیوی کے ساتھ گذار دی۔ بیان کرنے والوں نے تو یہاں تک بیان کیا ہے کہ عباسی خلیفہ منصور سے جب تک تعلقات زیادہ خراب نہیں ہوئے تھے اور منصور بھی امام سے بالکل مایوس نہیں ہوا تھا، تو ایک دفعہ امام کے پاس ہزار درم نقد کے ساتھ ایک جوان جاریہ (شرعی لونڈی) بھی بطور تحفے کے بھیجی۔ روپیہ کو جیسے مختلف حیلوں سے امام نے پہلے واپس کیا تھا، اب کی بھی واپس فرما دیا اور لونڈی کو واپس کرتے ہوئے آپ نے کہلا بھیجا۔

انی قل صنعفت عن النساء و كبرت فلا استحل ان اقبل جارية لا اصل اليها و لا اجترئ ان ابيع جارية خرجت من ملك امير المومنين (ص ۱۲۱۶، موفق)

میں عورتوں کے معاملہ میں کمزور ہو چکا ہوں، بڈھا ہو گیا ہوں۔ ایسی صورت میں جائز نہ ہوگا کہ میں اس جاریہ کو قبول کرلوں جس کے کام میں نہیں رہ گیا ہوں۔ اسی کے ساتھ اس کی بھی جسارت نہیں کرسکتا کہ امیر المومنین کے ملک سے جو جاریہ نکلی ہے اسے میں فروخت کر ڈالوں۔

جیسا کہ معلوم ہے امام حیلوں میں بھی غلط بیانی سے کام نہیں لیتے تھے۔ اس لیے یقین کرنا چاہیے کہ اپنے جس خال کا تذکرہ اس بیان میں عورتوں کے متعلق فرمایا ہے وہ ایک واقعہ کا اظہار تھا۔

امام کے تجارتی مساعی کے محرکات

بہر حال بات بہت طویل ہوتی جا رہی ہے اور جو کہنا چاہتا ہوں اب تک اس کے کہنے کا موقعہ ہی نہیں آ رہا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ امام کی اس تجارتی جدوجہد کی تہ میں جہاں تک میرا خیال ہے درحقیقت وہی جذبہ پوشیدہ تھا،[21] جس

Marfat.com

کا ذکر ان کے ایک پرانے صحبت یافتہ بلخی تلمیذ یعنی سلم بن سالم نے کیا ہے۔ امام موفق نے مسلم کے متعلق یہ ذکر کرتے ہوئے کہ

''اہل بلخ کے یہ امام ہیں، ابوحنیفہ کی صحبت میں زمانہ تک رہے اور بہت سے مسائل امام کے ان سے مروی ہیں۔ امام کے بلخی تلامذہ ابو مطیع اور مقاتل بن سلیمان کے اصحاب و تلامذہ میں ہیں۔''

بہرحال ان ہی سلم بن سالم نے بڑے پتہ کی بات بیان کی ہے کہ

لقیت من لقیت المشائخ الکبار فلم اجل اشدحرمة محمد ﷺ من ابی حنیفة (ص ۲۴۸، موفق)

میں نے بڑے بڑے علماء سے ملاقاتیں کیں، لیکن رسول اللہ ﷺ کی امت کے احترام کا جذبہ جتنا شدید امام ابوحنیفہ میں پایا اس کی نظیر کہیں نظر نہیں آئی۔

اہلِ حق مظلومین کے ساتھ امام کی ہمدردیاں

حضرت امام کی یہی جبلت اور ان کی فطرت کا یہی اقتضاء تھا جس نے ان سے وہ سب کچھ کرایا ہم جس کا ذکر آگے کرنے والے ہیں۔ محمد ﷺ کی امت کا درد اس پر امراء ''جور'' کی طرف سے جو مظالم ہو رہے تھے یہی چیز تھی جو انہیں بے چین رکھتی تھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ امتِ محمدیہ کی اس مصیبت کے ازالہ میں امام سے پہلے جن جن لوگوں نے کام کیا تھا اور ''امراء جور'' نے حکومت کے فولادی پنجے سے ان بیچاروں کے گلے گھونٹ کر رکھ دیئے تھے۔ بیان کرنے والوں نے بیان کیا ہے کہ حضرت امام جب ان مظلوموں کا ذکر کرتے تو بے اختیار ہو کر رونے لگتے۔ ان شہیدانِ راہِ وفا کا تفصیلی ذکر تو ان شاء اللہ آئندہ کیا جائے گا، لیکن ان کے ذکر پر امام کا کیا حال ہوتا تھا۔ تاریخ کی شہادتیں سن لیجئے ان کے سامنے پہلی قربانی اس راہ کی حضرت امام زین العابدین کے صاحبزادے زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پیش کی، لیکن بنی امیہ کی قاہرہ فوج نے ان کا خاتمہ کر دیا۔ راوی کا بیان ہے۔ میں نے پہلے بھی اس کو نقل کیا ہے۔

کان یبکی کلماذکر مقتله (موفق، ص ۲۶۱ ج ۱)

زید بن علی کی شہادت کا جب امام ابوحنیفہ ذکر کرتے تو رونے لگتے۔

زید کے بعد اپنے نانا کی امت کی خبر گیری کے لیے اہل بیت ہی کے خاندان سے حضرت امام حسن کے پوتے محمد بن عبداللہ جو ''نفس زکیہ'' کے نام سے مشہور ہیں، مدینہ میں کھڑے ہوئے عباسی خلیفہ منصور کے بھائی عیسیٰ کے ہاتھوں وہ بھی ختم کر دیئے گئے۔ عبداللہ بن زبیر کے صاحبزادے حسن کا بیان ہے کہ

رایت ابا حنیفه و ذکر محمد بن عبدالله بن حسن بعد ما اصیب و عیناه قد معان (ص ۸۴ ج ۲، موفق)

میں نے ابوحنیفہ کو دیکھا، وہ محمد بن عبداللہ بن حسن کا تذکرہ ان کی شہادت کے واقعہ کے بعد کہہ رہے تھے اور ان کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

Marfat.com

ان ہی محمد النفس الزکیہ کے برادرِ حقیقی ابراہیم بن عبداللہ نے بصرہ سے جب عباسیوں کے خلاف علم بلند کیا۔ اس وقت بھی امام نے جو کچھ کیا وہ تو ان کی زندگی کا خاص واقعہ ہے جیسا کہ عنقریب اس کی تفصیل آرہی ہے۔

پھر اسی راہ میں ان کے ایک دوست اور جیسا کہ بعضوں کا بیان ہے کہ ان کے شاگرد ابراہیم بن میمون الصائغ عباسیوں کے طاغیہ ابومسلم کے حکم سے جب شہید ہوئے تو ابوبکر الجصاص نے حضرت عبداللہ بن المبارک کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ

لما بلغ ابا حنيفة قتل ابراهيم الصائغ بكى حتى ظننا انه سيموت (ص۳۳ ج۲، احکام القرآن)

ابوحنیفہ کو جب ابراہیم صائغ کی شہادت کی خبر ملی تو رونے لگے اور اس قدر روئے کہ ہم لوگوں کو خیال ہونے لگا کہ عنقریب یہ مر جائیں گے۔

صاحب ''معجم'' نے ''تبیض الصحیفہ'' کے حوالہ سے یہ واقعہ درج کیا ہے کہ ایک دن امام ابوحنیفہ اور ابن المعتمر[۲۲] کو دیکھا گیا کہ چپ چاپ کچھ باتیں کر رہے ہیں اور باتیں کرتے کرتے دونوں ابل پڑتے ہیں روتے ہیں پھر باتیں کرتے ہیں۔ جب ان کی گفتگو ختم ہوگئی تو امام کے لوگوں میں سے ایک صاحب نے پوچھا کہ آپ دونوں حضرات کس بات پر رو رہے تھے۔ جواب میں امام نے فرمایا۔

ذكرنا الزمان و غلبة اهل الباطل على اهل الخير فكثر ذلك بكاء نا (ص۱۶۵، معجم)

بہرحال ان تاریخی یادداشتوں کی روشنی میں حضرت امام کے فطری رجحانات کا بآسانی پتہ چلایا جاسکتا ہے اور میرے نزدیک تو حضرت امام کی زندگی کے سارے واقعات کی توجیہ و تاویل ان کے قلب کے ان ہی کیفیات سے ہوسکتی ہے۔ اب آپ اپنے سامنے ایک طرف تو سلم بن سالم کے گذشتہ مشاہدہ اور تجربہ کو رکھ لیجیے یعنی دنیائے اسلام کے جن جن علماء کبار سے وہ ملے کسی میں امت محمدیہ کے احترام کا جذبہ ابوحنیفہ کے مانند ان کو کہیں نظر نہ آیا اور یہی سلم بن سالم جنہوں نے امام کے ساتھ اپنی زندگی کا کافی زمانہ گذارا ہے وہ اپنا ایک دوسرا تجربہ امام ہی کے متعلق یہ نقل کرتے تھے کہ

ولم اداحد ايوافق قوله فعلم الا ابو حنفية (ص۲۴۸ ج۱، موفق)

یعنی ان بڑے بڑے بزرگوں میں جن سے میری ملاقات ہوئی کسی ایسے آدمی کو نہ پایا جس کا قول اس کے فعل سے اتنا مطابق اور موافق ہو جتنا ابوحنیفہ کا قول ان کے فعل کے مطابق تھا۔

اب اسی سے اندازہ کیجئے کہ جس شخص کے دل میں محمد رسول اللہ ﷺ کی امت مرحومہ کا اتنا درد اور اتنا احترام ہو کہ اس کے ہم عصروں میں مشکل ہی سے اس کی نظیر مل سکتی تھی اور پھر اس کا قول بھی عمل سے اتنا مطابق ہو کہ اس باب میں بھی کم از کم سلم کے تجربہ میں کوئی دوسرا آدمی اس زمانہ میں نہیں تھا۔

حضرت امام کے حلم و وقار کا ایک واقعہ

اور اسی کے ساتھ اس کو سوچئے کہ جو مظالم ملوک جور اور امراء عضوض سے محمد رسول اللہ ﷺ کی امت پر ہو

Marfat.com

رہے تھے۔ ان مظالم کی یاد جس کے دل کو تڑپا دیتی ہو کہ باوجود اس حلم وقار کے جس کے قصے ہم کتابوں میں امام کے متعلق پڑھتے ہیں۔ مثلاً مشہور صوفی حضرت شقیق بلخی سے لوگ یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ

''ہم امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ مسجد میں تھے۔ مسجد لوگوں سے بھری ہوئی تھی کہ اچانک امام ابوحنیفہ جہاں پر بیٹھے تھے ٹھیک ان کے سر کے سامنے ایک سانپ نمودار ہوا۔ مسجد والوں نے بے اختیار ہو کر سانپ سانپ چیخنا شروع کیا اور کوئی اِدھر بھاگا، کوئی اُدھر بھاگا۔ خود بھی بھاگنے والوں ہی میں تھا۔ لیکن امام ابوحنیفہ اپنی جگہ سے ہلے بھی نہیں اور نہ ان کے چہرے پر تغیر کے کچھ آثار تھے۔'' (موفق وغیرہ، ص ۲۶۷ ج ۱)

بلکہ یہی قصہ عبداللہ بن المبارک سے جو منقول ہے، یعنی اس واقعہ کے وقت وہ بھی تھے ان کا بیان تھا کہ

''سانپ امام کی گود میں گرا، لیکن اس پر بھی اس بندہ خدا نے نہ دائیں دیکھا نہ بائیں، کیا تو صرف یہ کیا کہ دامن جھٹک دیا اور سانپ دور جا پڑا۔''

لوگوں نے ابنِ مبارک سے پوچھا کہ کیا بھاگنے والوں میں آپ بھی تھے، انہوں نے کہا، ہاں! بھائی میں سب سے زیادہ دور بھاگا البتہ میں پہلی صف میں نہ تھا۔[۲۳]

الغرض یہ اور اسی قسم کے دوسرے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام ان لوگوں میں بھی نہ تھے جو ہر واقعہ سے بہت جلد اثر پذیر ہو کر اضطرابی کیفیات کو اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں، بلکہ حد سے زیادہ ضابط اور بھاری بھرکم آدمی کی جو شان ہوتی ہے۔ امام کی زندگی کے سارے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی قسم کے شخص تھے، لیکن باوجود اس کے حکومت کے ان ستم زدوں کے ذکر پر ان کا بلبلا کر رو پڑنا اور اتنا رونا کہ ابن مبارک جیسے محتاط محدث تک یہ کہتے ہوں۔

''کہ گویا روتے روتے مر جائیں گے۔''

دراصل ان واقعات سے حضرت امام کی اندرونی کیفیت کا پتہ چلتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں ان کے تاثرات کتنے عمیق اور گہرے تھے۔

امام کے فطری میلانات کے ظہور کی ابتداء

اس میں شک نہیں کہ حضرت امام جس شہر میں پیدا ہوئے یعنی کوفہ وہاں امام سے پہلے بھی اور خود امام کی کمسنی کے دنوں میں بھی امتِ محمدیہ پر مظالم توڑے جا رہے تھے۔ ان مظالم سے یہ شہر تاریک ہو رہا تھا۔ حجاج بنی امیہ کا طاغیہ جب مرا ہے تو اس وقت امام کی عمر پندرہ سال کی تھی۔ حجاج کے واقعات آج بھی جب ہر اس شخص میں جو رسول اللہ ﷺ کی اُمت سے تھوڑا بہت بھی تعلق رکھتا ہے، غیظ و غضب کے جذبات میں حرکت پیدا کرتے ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ خواہ کم

Marfat.com

سنی ہی کے دنوں میں سہی لیکن امام جس فطرت کو لے کر پیدا ہوئے تھے کوئی وجہ نہیں ہوسکتی کہ ان واقعات سے ان کا قلب شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر نہ ہوا ہوگا، خصوصاً اس نے جو کچھ کیا تھا زیادہ تر اس کا تعلق کوفہ ہی سے تھا تاہم جہاں تک مؤرخین کے بیانات میں دیکھا جاتا ہے۔ امام کی زندگی کے ابتدائی دنوں میں ''سیاسی میلانات'' کے ثبوت کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ زیادہ سے زیادہ جو چیز اس سلسلہ میں پیش ہوسکتی ہے وہ وہی ہے جس کا ذکر شائد پہلے بھی آچکا ہے یعنی ابتدائی زندگی میں بجائے فقہ کے حضرت امام پر علم کلام کا جب غلبہ تھا اور ان لوگوں سے جو اسلام کے اعتقادی مسلمات میں رخنہ اندازیاں کرتے تھے۔ ان سے مقابلہ کے لیے آپ بار بار کوفہ سے بصرہ[۲۴] تشریف لے جاتے تھے۔ بعض بعض دفعہ اسی سلسلہ میں سال سال بھر یا اس سے کچھ زیادہ دن بھی امام کو بصرے میں رہنا پڑا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ تجارتی بندرگاہ ہونے کی وجہ سے حضرت امام تجارتی کاروبار بھی بصرے میں کرتے ہوں لیکن تجارت کے ساتھ ساتھ اعدادِ اسلام کے مقابلہ میں لسانی جہاد بھی اس زمانہ میں آپ کا دلچسپ مشغلہ تھا۔

لیکن علمِ کلام سے دل چسپی جب آپ کی کم ہوئی اور اپنے استاد حماد بن ابی سلیمان کی صحبت میں فقہ سیکھنی شروع کی تو اس عرصہ میں کوئی واقعہ ایسا نہیں ملتا جس میں آپ کے سیاسی رجحان کی جھلک پائی جاتی ہو، لیکن ٹھیک جس سال حماد بن ابی سلیمان امام صاحب کے استاد کی وفات ہوئی ہے۔ یعنی ۱۲۲ ہجری جس کے معنی یہ ہوئے کہ امام کی عمر اس وقت (۴۲) سال کی ہونی چاہیے، اسی کے بعد بنی امیہ کے دور حکومت میں ایک ''سیاسی انقلاب'' کا واقعہ پیش آتا ہے اور ہم امام رحمتہ اللہ علیہ کو پہلی دفعہ اس واقعہ سے متعلق پاتے ہیں، لیکن اس واقعہ کی تفصیل سے پہلے کچھ اجمالی تذکرہ اس زمانہ کے سیاسی ماحول کا بھی سن لینا چاہیے۔

کوفہ کے گورنر خالد کے بے پناہ مظالم

یہ واقعہ اس وقت پیش آیا ہے جب بنی امیہ کی فرماں روائی کی باگ ہشام بن عبدالمالک کے ہاتھ میں تھی۔ کوفہ کا گورنر ہشام کی طرف سے پندرہ سال تک مسلسل اموی تاریخ کی مشہور شخصیت تھی، جسے عام طور پر لوگ ابن النصرانیہ کہتے تھے اور اصلی نام اس کا خالد بن عبداللہ القسری تھا۔ ۱۰۵ھ سے ۱۲۰ھ تک یہ کوفہ کا گورنر رہا۔ جس کے معنی یہی ہوئے کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے پچیس سال کی عمر سے چالیس سال کی عمر تک کا زمانہ اسی ابن النصرانیہ کی ولایت کے عہد میں گذارا تھا۔ ابن النصرانیہ کیا تھا۔ تفصیلی حالات تو اس کے تاریخ میں پڑھیے۔ حاصل یہ ہے کہ باپ تو اس کا عربی قبیلہ بجیلہ سے تعلق رکھتا تھا، لیکن اس کی ماں ایک ''رومیہ نصرانیہ'' تھی یعنی یورپین عیسائیہ عورت تھی۔ یہ بھی لکھا ہے کہ ماں اس کی مرتے دم تک اپنے آبائی مذہب (عیسائیت) پر قائم رہی۔ خود خالد تو بظاہر مسلمان تھا لیکن اگر یہ واقعات صحیح ہیں جیسا کہ مورخین نے لکھا ہے کہ اس کے زمانہ میں سارا وہ علاقہ جو اس کی زیر ولایت ونگرانی تھا، وہاں غیر مسلموں کی حکومت قائم ہوگئی تھی، ''کامل'' میں ہے:

كان الاسلام ذليلا و الحكم فيه لا هل الذمة (ص۸۲)

اہل اسلام اس زمانہ میں ذلیل تھے اور حکومت اہل ذمہ (غیر مسلم رعایا) کے ہاتھ میں تھی۔

Marfat.com

خالد کی معزولی کے بعد یوسف بن عمر جب کوفہ کا گورنر ہو کر آیا تو یحییٰ بن نوفل شاعر نے ایک قصیدہ لکھا تھا جس کا ایک شعر یہ بھی تھا کہ

اتانا واھل الشرک اھل زکاتنا و حکامنا فیم نسر و نجھر

یوسف بن عمر ایسے زمانہ میں آیا ہے جب ارباب شرک ہم سے ٹیکس وصول کرتے تھے اور کھلی ڈھکی بات میں وہی ہمارے حکام تھے۔

یہ قصہ بھی اسی کا بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے مسلمانوں کی مسجدوں کے میناروں کے منہدم کرنے کا حکم دیا تھا وجہ یہ بتائی کہ ان پر چڑھ کر مؤذن لوگوں کو بہو بیٹیوں کو جھانکتے ہیں [۲۵] ادھر مؤذنوں پر یہ الزام قائم کر کے کوفہ کی مسجدوں کے مینارے ڈھائے جا رہے تھے اور دوسری طرف ستم ظرفی اسی ابن النصرانیہ کی یہ تھی کہ اپنی نصرانیہ ماں کے نام سے ایک عظیم الشان گرجا بھی اس نے کوفہ میں تعمیر کرایا۔ مسلمانوں میں اس کے اس طرز عمل سے جب بے چینی پیدا ہوئی حتیٰ کہ مشہور رند مشرب شاعر فرزدق سے بھی ضبط نہ ہو سکا اور ایک طویل قصیدہ میں اسلام اور مسلمانوں کی اسی بے کسی کا رونا روتے ہوئے اس نے کہا

نبی بیعة فیھا النصاری لامه	ویھد م من کفر منارا مساجد
اپنی ماں کے لیے تو کوفہ میں اس نے گرجا بنایا	اور مسجدوں کے میناروں کو ڈھا رہا ہے اپنے کفر کی وجہ سے

کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی اس شکایت کو سن کر اس نے عذر بھی جو پیش کیا تو منجملہ دوسری باتوں کے اس کا یہ تاریخی فقرہ اب تک کتابوں میں نقل کیا جاتا ہے یعنی اس نے کہا:

لعن اللہ دینھم ان کان شرا من دینکم (ص۱۰۳ ج ۵، کامل ابن اثیر)

خدا کی لعنت ہو ان کے (عیسائیوں) کے دین پر اگر ان کا دین تمہارے دین سے بدتر ہے۔

بیان کرنے والے ایک طرف تو یہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت مرتضیٰ علیہ السلام کی شان اقدس میں اپنے آقاؤں (بنی امیہ) کو خوش کرنے کے لیے صلواتیں سنایا کرتا تھا، لیکن ایک لطیفہ ''کامل'' وغیرہ میں بھی یہ نقل کیا ہے کہ بنی امیہ ہی کے خاندان کے ایک صاحب نے ابن النصرانیہ سے کچھ امداد چاہی، لیکن بیچارے کو صاف جواب دیا گیا۔ چونکہ داد و دہش میں خالد کا ہاتھ کھلا ہوا تھا، یہ بھی کہتے ہیں کہ بنی ہاشم والوں کے ساتھ بھی وہ حسن سلوک کیا کرتا تھا اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اس قسم کے لوگوں کا قاعدہ ہے کہ اپنے عیوب کی پردہ پوشی کے لیے ''دہن دوزی'' کے نسخہ پر عموماً عمل کرتے ہیں، بہرحال جہاں سب ہی کو دیتا دلاتا تھا ممکن ہے کہ بنی ہاشم کے بعض افراد کو اس نے کچھ دیا ہو، اموی سائل نے اسی واقعہ کو پیشِ نظر رکھ کر یعنی بنی ہاشم کی خالد مدد کرتا ہے کہا، کہ

لین دین کا تعلق تو خالد ہاشمیوں سے رکھتا ہے اور ہمارے لیے اس کے پاس صرف علی کی صلواتیں رہ گئی ہیں۔ (ص ۵۲ ج ۵۔ کامل ابن اثیر)

لطیفہ یہ ہے کہ خالد تک جب اس اموی کی یہ شکایت پہنچی تو بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔

لئن احب فلنا عثمان بشیئی (کامل، ص۸۲ ج ۵)
اس کا اگر جی چاہے تو کچھ عثمان کو بھی سنا دوں۔

اسی لیے لوگوں کا خیال ہے کہ درحقیقت اس کو نہ حضرت علی ہی سے تعلق تھا اور نہ عثمان سے بلکہ صرف دنیا سازی کے لیے

کان خالد یبالغ فی سب علی فقیل کان ذلک نفیا للتہمۃ تقر با الی القوم (ص۸۲ ج ۵)
حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی مذمت کرنے میں مبالغہ سے کام لیتا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اہل بیت کے ساتھ میل جول میں جو وہ متہم اور بدنام تھا۔ اسی بدنامی کا ازالہ حضرت علی کو گالیاں دے کر کیا کرتا تھا۔

اور بات بھی کچھ یہی معلوم ہوتی ہے۔ کہاں تو ہشام کے ساتھ عقیدت کے اظہار میں غلو کو یہ ابن النصرانیہ اس حد تک پہنچا دیتا تھا کہ سننے والوں کا بیان ہے۔ نقل کفر کفر نہ باشد، وہ کبھی کبھی کہتا کہ

اپنے اہل وعیال اور گھر والوں پر کسی کو اگر کوئی اپنا خلیفہ اور نمائندہ مقرر کرے کیا ان خلیفہ کے برابر وہ ہوسکتا ہے جسے اس شخص نے بطور ایلچی اور قاصد (رسول) کسی کے پاس بھیجا ہو۔

ابن اثیر نے لکھا ہے کہ (العیاذ باللہ) اشارہ اس کا ادھر ہوتا تھا کہ

ان الخلیفۃ ھشا ما افضل من رسول اللہ۔ (ص۱۰۳ ج ۵)
خلیفہ ہشام (العیاذ باللہ) رسول اللہ ﷺ سے بھی افضل ہے۔

مگر ابن اثیر ہی نے یہ قصہ بھی نقل کیا ہے ہشام خلیفہ نے خالد کے نام بصیغہ راز یہ فرمان بھیجا کہ

''جب تک امیر المومنین یعنی (ہشام) کا غلہ فروخت نہ ہو جائے اس وقت تک کسی دوسرے کو غلہ کے بیچنے کی اجازت نہ دی جائے۔''

خالد نے اسی کے مطابق تمام جگہ احکام نافذ کر دیے۔ نتیجہ ظاہر تھا کہ علاقہ میں غیر معمولی گرانی پھوٹ پڑی۔ لکھا ہے کہ کوفہ کے بازار میں

کیلجتھا بذرھم
ایک کیلجہ (چھوٹا پیمانہ غلہ کا) ایک درم میں بکنے لگا

خلقِ خدا کی اس گرانی سے چیخ اُٹھی۔ عوام کا الزام خالد پر تھا کہ اسی نے کاشت کاروں کو غلہ فروخت کرنے سے روک دیا ہے۔ خالد سخت دماغی کوفت میں مبتلا تھا۔ ہشام کے راز کو بھی ظاہر نہیں کرسکتا تھا اور صبح و شام لوگوں کی گالیاں، لعنت و ملامت بھی اس کے لیے ناقابل برداشت بنتی چلی جا رہی تھی۔ آخر ایک دن اس نے برسر منبر دل کا بخار ان الفاظ میں نکالنا شروع کیا۔

زعمتم انی افلی اسعار کم فعلی من یغلیها لعنة اللّٰہ (ص ۸۱)

تم لوگوں کا خیال ہے کہ اناج کو میں نے گراں کر رکھا ہے۔ لو میں تمہارے سامنے کہتا ہوں کہ جس کی وجہ سے یہ گرانی ہے اس پر خدا کی لعنت۔

یعنی اشارہ ہشام کی طرف کر رہا تھا کہ میرا کیا قصور ہے۔ خود تمہارے امیر المومنین کا حکم ہی یہ ہے کہ پہلے سرکاری غلے کا ایک ایک دانہ (من مانی قیمتوں پر) فروخت ہوئے، تب بازار میں دوسرے بیچنے والوں کو مال لانے کی اجازت دی جائے اور اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ جس ہشام کو کبھی وہ رسولوں پر بھی فضیلت دیتا تھا، اسی کو آج وہ برسر منبر گالیاں سنا رہا تھا۔ لوگوں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اپنی پرائیویٹ مجلسوں میں ہشام بے چارے کا نام ہی خالد نے ''ابن الحمقی[۲۶]'' رکھ چھوڑا تھا۔ جب اس کا نام لیتا تھا تو کہتا کہ ابن الحمقی کا حکم آیا ہے۔ ابن الحمقی نے اب یہ نیا شوشہ چھوڑا ہے اور گوگورنری کی مدت ابن النصرانیہ کی کل پندرہ سال ہے، لیکن اسی پندرہ سال میں اس نے جو کچھ لوٹا اور لٹایا اس کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ معزولی کا وقت اس کی آیا ہے تو اس نے خود اقرار کیا کہ حکومت کے خزانے کا بقایا میرے ذمہ پچاس کروڑ رہ گیا ہے۔ تنخواہ میں حالانکہ کل بیس ہزار سالانہ کی جاگیر اس کو ملی تھی، لیکن مسلمانوں کے بیت المال کے روپے سے اس نے اپنی جاگیر میں نہروں کا جال بچھا دیا۔ اب تک اس کی متعدد نہروں مثلاً نہر خالد، نہر باجرا، نہر تارمانا، نہر مبارک، نہر جامع، کورہ سالور کی نہر، نہر صلح کے نام تاریخوں میں درج ہیں۔ ان ہی نہروں کی بدولت بیس ہزار کی آمدنی کی جاگیر پندرہ سال میں ایک کروڑ تیس لاکھ سالانہ کی آمدنی دینے لگی۔ ان ہی حالات نے اس کے دماغ کو بے قابو کر دیا تھا۔ کہتے یہ ہیں کہ جوش میں آ کر اپنے بیٹے کو کہتا کہ ہشام کے بیٹے مسلمہ سے تو آخر کس بات میں کم ہے۔ کبھی کہتا

''بیٹا! وہ کیا مزے کا زمانہ ہوگا جب ہشام بھی تیرا محتاج بن کر رہے گا۔''

آخر میں تو سارے عراق کو وہ اپنی موروثی جائداد قرار دینے لگا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر الزام لگاتا تھا کہ میری قوم بجیلہ سے انہوں نے چھین کر زبردستی مسلمانوں کے حوالہ کر دیا۔[۲۷]

اسی لیے کہتا

اننی مظلوم ماتحت قدمی شیئی الا ھو لی (کامل۔ص ۸۰ ج ۵)

میں مظلوم ہوں یعنی میرے پاؤں کے نیچے کا کوئی حصہ بھی ایسا نہیں ہے جو میرا نہ ہو۔

کوفہ میں خالد اور خالد کے گرد و پیش میں رہنے والوں کا روز روزِ عید اور شب شبِ برات کا اندازہ اسی سے کیجئے کہ اس کے ملازم طارق نے اپنے بچے کی ختنہ کی اس تقریب میں اور تو کچھ خرچ کیا سو کیا، صرف اپنے آقا ابن النصرانیہ کے سامنے تقریب کے سلسلہ میں جو تحفے اس نے پیش کئے تھے، ان میں علاوہ قیمتی تھانوں اور دوسری چیزوں کے ایک ہزار غلام اور ایک ہزار لونڈیاں بھی تھیں (ص ۱۸۰)۔ الیافعی نے لکھا ہے کہ خالد کا بھائی اسد جسے اس نے اپنے علاقے کے خراسانی حصہ میں اپنا نائب مقرر کیا تھا، جس زمانہ میں وہ بلخ میں تھا مجوسیوں کی عید مہرجان ان ہی دنوں میں واقع ہوئی۔ ہرات کے دہقان نے جو مجوسی تھا،[۲۸] اسد کے پاس عید کی عیدی جو پیش کی تھی، ابن عساکر نے ''تاریخ

دمشق' میں اس کی تفصیل دی ہے کہ لکھا ہے:

''ایک قصر سونے کا اور ایک قصر چاندی (شاید کاسکٹ کی شکل کے ہوں گے) ان کے پیچھے چند طلائی لوٹے اور چند نقرئی لوٹے تھے۔ ان کے بعد سیم وزر کے بڑے بڑے بادیئے اور رکابیاں تھیں اور ان سب کے بعد مروزی تو ہی ہروی وغیرہ وغیرہ کپڑوں کے تھان کے تھان تھے۔ ان ہی تحفوں میں وہ (قاآن) اپنے ساتھ سونے کے چند گُرّے (گیند) بھی لایا تھا۔''

الغرض یہ تھا وہ تماشا بنی امیہ کی حکومت کا جو امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے سامنے خاص ان کے وطن اور مستقر کوفہ میں دکھایا جا رہا تھا۔ مسلمانوں پر گورنر نے کافروں کو مسلط کر رکھا ہے، مسلمانوں کی مسجدوں کے مینارے ڈھائے جا رہی ہیں اور عیسائیوں کے گرجے کی تعمیر مسلمانوں ہی کے پیسوں سے ہو رہی ہے۔ مسلمانوں کے رسول پر خلیفہ کو ترجیح دی جا رہی ہے، علی پر لعنت بھیجی جا رہی ہے۔ عثمان کو بھی بخشا نہیں جا رہا ہے۔ مسلمانوں کے دین کے ساتھ تمسخر کیا جا رہا ہے۔ یہ تو گورنر کر رہا ہے، خود خلیفہ اس فکر میں ہے کہ خواہ رعایا پر کچھ بھی گذر جائے لیکن اس کا مال بھلے اچھے داموں میں بک کر روپیہ کی شکل میں اس کے پاس پہنچ جائے۔ عام مسلمانوں کے گھر میں فاقہ ہے اور مسلمانوں کے امیر کا نوکر ایک ایک بچے کے ختنہ میں وہ وہ اولوالعزمیاں دکھا رہا ہے کہ شاید بادشاہوں کے لڑکوں کے ختنہ میں بھی اتنی زرمستیاں نہ دکھائی جاتی ہوں مگر ساری دنیا چپ ہے۔ بنی امیہ کی بے پناہ تلوار نے کون کی جوندیاں بہائی ہیں اور ظلم کے جو آتش کدے جوڑ رکھے تھے، ان کو دیکھ کر بھلا کس کا گردہ اور کس کا جگر تھا کہ آہِ نیم شی کے سوا کچھ اور بھی کرنے کے لیے تیار ہو۔ مسلسل دیکھا جا رہا تھا کہ زبان سے بات نکلی نہیں کہ سر تن سے جدا ہو گیا۔

لیکن اپنی آمدنی بڑھا بڑھا کر خالد دراصل اپنی قبر آپ کھود رہا تھا۔ جس چیز کے عشق میں ہشام مبتلا تھا، اسی کا سودا اس کے سر میں بھی سمایا۔ ہشام کی بھی جاگیر خالد کی جاگیروں کے قریب تھی۔ شاہی جاگیر کے داروغہ نے بادشاہ کو اطلاع دی تھی کہ

''شاہی جاگیروں کی زمین کے بند کو خالد توڑ رہا ہے۔''

کہتے ہیں کہ یہیں سے بات کی ابتدا ہوئی جس کی انتہا خالد کی معزولی پر ہوئی۔ اس زمانے میں یمن کا گورنر یوسف بن عمر تھا۔ راز میں ہشام نے اس کو لکھا کہ فوراً عراق پہنچ کر خالد کو گرفتار کر لے اور سرکاری مطالبے وصول کرے۔ یوسف پہنچا، خالد گرفتار ہو گیا اور مطالبے کا تقاضا یوسف نے شروع کیا۔ ہشام کا حکم تھا کہ قتل کرنے کے سوا مطالبے کے لیے جتنی اذیت تم دے سکتے ہو خالد کو دو۔ یوسف نے بھی اذیت پہنچانے میں کوئی کمی نہیں کی۔ روزانہ نئی سزائیں تجویز ہوتی تھیں۔ پوچھا جاتا تھا کہ یہ پچاس کروڑ سرکاری خزانہ کا مال تو نے کہاں رکھا ہے۔ یہ قصہ تو یوں ہی جاری رہا۔ کوفے کے مسلمانوں کو اس کی خوشی ہوئی کہ ابن النصرانیہ سے ان کو نجات ملی۔ کہتے ہیں کہ یوسف نماز روزے کا بڑا پابند تھا۔ ''کامل'' کے الفاظ ہیں کہ

Marfat.com

''دیر دیر تک نمازیں پڑھتا۔ مسجد میں زیادہ وقت گذارتا تھا۔ اپنے گرد وپیش والوں اور گھر کے لوگوں کو عوام پر ظلم و زیادتی کرنے سے روکے ہوئے رہتا۔ نرم کلام، منکسر المزاج آدمی تھا، مصیبتوں میں دعا والحاح کا عادی تھا۔ اس کی عادت تھی کہ صبح کی نماز کے بعد کسی سے گفتگو نہ کرتا۔ جب تک کہ چاشت کی نماز نہیں پڑھ لیتا تھا۔ قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول رہتا تھا اور خدا کے سامنے گریہ وزاری کرتا۔'' (ص ۸۳ ج ۵)

اسی لیے کوفہ کے شاعر یحییٰ بن نوفل نے شعر لکھا

فلما اتانا یوسف الخیرا شرقت

لہ الارض حتی کل وادٍ منور

جب بھلائی والا یوسف آیا کہ زمین چمک اُٹھی گویا ہر وادی جگمگا رہی ہے۔

لیکن بنی امیہ کا گورنر بہر حال بنی امیہ کا گورنر تھا۔ چند ہی دن کے بعد معلوم ہوا کہ یوسف کو جنون ہے اور نماز روزہ کا سارا قصہ یہ بھی جنون ہی کے ظہور کی ایک شکل ہے۔ جنون کے جو واقعات لوگوں میں مشہور ہوئے ان کی فہرست تو طویل ہے۔ نمونے کے لیے یہ چند مثالیں کافی ہوسکتی ہیں۔

''چار خانے بنے ہوئے کپڑے جلاہوں سے بُنواتا۔ بے چارا جلاہا بنا کر لاتا۔ اپنے سیکرٹری سے پوچھتا کیوں بے کیسا ہے؟ سیکرٹری کہتا کہ خانے کچھ چھوٹے ہیں۔ تب جولاہے سے کہتا، سچ تو کہا ہے، ابے الخناء کا بچہ، سیکرٹری جو جولاہا سے کہتا حضور اس فن سے میں زیادہ واقف ہوں، تب سیکرٹری سے کہتا، سچ تو کہتا ہے، ابے الخناء کے بچے، سیکرٹری جو جولاہے سے کہتا ہے کہ اس جولاہے کو سال میں ایک دو تھان بنانے کی نوبت آتی ہوگی اور میرے ہاتھ سے سیکڑوں تھان سالانہ گذرتے ہیں۔ جولاہا میری ان خوبیوں کو کیا جانے۔ تب جولاہے سے یوسف کہتا سچ تو کہتا ہے ابے الخناء کے بچے۔ الغرض یوں ہی اس کی بھی تصدیق کرتا اور اس کی بھی پھر اسے بھی جھٹلاتا اور اُسے بھی۔ اسی طرح مزاج میں سختی اتنی تھی کہ فرمائش سے ذرہ برابر بھی کسی چیز میں نقص رہ جاتا تو بنانے والے پر سیکڑوں کوڑے پڑ جاتے۔ ایک دفعہ اپنی لونڈیوں کو بلا کر اس وقت جب سفر میں جا رہا تھا پوچھا کہ کون کون میرے ساتھ چلے گی، ایک بولی کہ سرکار میں جاؤں گی۔ بس بگڑ بیٹھتا اور فحش باتیں کہتا۔ حکم غلام کو دیتا کہ لگا اس کے سر پر کوڑے، دوسری یہ دیکھ کر کہتی کہ سرکار میں گھر پر رہوں گی تب کہتا کہ مجھ سے چڑتی ہے، غلام! لگا اسے کوڑے۔ اب تیسری سے پوچھتا کہ بتا تو کیا چاہتی ہے۔ دونوں کے حشر کو دیکھ کر کہتی کہ میں کیا بتاؤں، جو بات بھی کہوں گی اس کی سزا دیکھ چکی ہوں، تب کہتا کیوں ری میری بات میں بیخ نکالتی ہے اور باتیں بناتی ہے، غلام! لگا اسے بھی کوڑے۔''

ظاہر ہے کہ جنون کے سوا اور ان حرکات کی دوسری توجیہ کیا ہو سکتی ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ یوسف بہت پستہ قد تھا لیکن داڑھی بڑی لمبی تھی۔ کپڑے سلوانے کے لیے درزی کو بلاتا۔ اگر درزی کہہ دیتا کہ جو کپڑا دیا گیا ہے اس میں فاضل بچے گا تو بگڑ بیٹھتا اور فوراً کوڑے مارنے کا حکم دیتا، لیکن جاننے والا درزی ہوتا تو کہتا کہ اتنا کپڑا سرکار کے بھاری بھرکم بدن کے لیے کافی نہیں ہو سکتا تو خوشی سے پھول جاتا اس ذریعہ سے درزی خوب کپڑے وصول کرتے تھے۔ یہ سارے واقعات ابنِ اثیر وغیرہ سے منقول ہیں۔

مسلمان اس کے حال کو دیکھ کر مایوس ہوئے۔ یحییٰ بن نوفل شاعر کو پھر لکھنا پڑا۔

اداناوالخليفة اذرمات

مع الاخلاص بالرجل الجديد

كاهل النار حين دعوا اغيثوا

جميعا بالحميم و بالصديد

جس کا مطلب یہ ہے کہ خلیفہ نے گو اخلاص سے نئے آدمی سے ہم لوگوں کو مشرف فرمایا، لیکن واقعہ یہ ہوا کہ جہنمی جب جہنم میں فریاد کریں گے اور مانگیں گے تو ان کی فریاد رسی گرم پانی اور پیپ سے کی جائے گی۔ یہی حال ہمارا ہوا کہ فریاد تو سنی گئی، لیکن یوسف کو بھیج کر گویا گرم پانی اور ریم کے ذریعہ فریاد رسی کی گئی ہے۔

خیر یہ قصہ تو طویل ہے۔ اس کے نقل کرنے سے میری غرض یہ ہے کہ جب ان واقعات سے عام لوگ متاثر ہو رہے تھے تو اس سے اندازہ کرنا چاہیے کہ اس شخص کے دل پر کیا گذر رہی ہوگی جس کے متعلق سلم بن سالم کی شہادت گذر چکی ہے کہ

''میں نے بڑے بڑے لوگوں سے ملاقات کی لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی امت کا احترام اور اس امت کی ہمدردی ابو حنیفہ کے دل میں جتنی پائی، اس کی نظیر دیکھنے میں نہیں آئی۔''

فرزدق جیسا لاابالی شاعر بھی جن واقعات پر تڑپ اٹھتا ہو تو ابو حنیفہ اور ان جیسے اکابر اسلام کے قلوب کی کیفیت کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ بس سمجھنا چاہیے کہ اندر ہی اندر آگ سلگ رہی ہوگی۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس اندرونی آگ کو خالد سے زیادہ سمجھنے والا اور کون ہو سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کے دماغ میں ایک چال آئی۔

خالد کی ایک عجیب چال

کہا یہ جاتا ہے کہ یوسف خالد پر سرکاری مطالبات کی پابجائی کے لیے جیسے روزانہ تشدد کیا کرتا تھا، ایک دن جیل سے بلا کر طرح طرح کی سزائیں دے کر دریافت کر رہا تھا کہ آخر بتا تو نے مال کن لوگوں کے پاس چھپایا ہے۔ خدا جانے خالد پہلے سے سوچ کر آیا تھا یا اسی وقت اسے یہ سوجھی۔ اس نے کہنا شروع کیا کہ سچ سچ پوچھتے ہو تو اس عرصہ میں جو کچھ میں نے دولت جمع کی، اس کا بڑا حصہ میں نے مدینہ منورہ میں تین آدمیوں کے پاس محفوظ کرا دیا ہے۔ یوسف نے

Marfat.com

چونک کر پوچھا مدینہ میں! بولا ہاں ہاں اور اس کے بعد اس نے ان لوگوں کے نام بتاتے ہوئے جن کے پاس مدینہ میں اس نے مال محفوظ کرانے کا دعویٰ کیا تھا۔ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے صاحبزادے حضرت زید علی الشہید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بھی نام لیا۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی بیان کیا کہ خالد کے متعلق بنی امیہ والوں کو اس کی شکایت بھی تھی کہ ہاشمیوں کے ساتھ سلوک کرتا ہے اور اس نے ہشام کو اس بات کی خبر دی، ہشام نے اسی وقت ان لوگوں کے متعلق کوفہ پہنچنے کا انتظام کرا دیا اور یہ لوگ کوفہ پہنچ گئے، جن میں حضرت زید بن علی الشہید بھی تھے۔ یوسف نے خالد کے سامنے ان لوگوں کا اظہار لینا شروع کیا۔ خالد کو دیکھ کر حضرت زید نے فرمایا کہ بھلا یہ ہمارے پاس مال کیوں جمع کرانے لگا۔ صبح وشام برسر منبر میرے جد امجد حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کو گالیاں سناتا ہے، پھر خالد سے پوچھا کہ آخر تجھے کیا سوجھی۔ اس نے جو جواب دیا، اسی کا ذکر مقصود ہے۔ اس نے کہا:

مثل و علی العذاب فادعیت ذلک و املت ان یاتی اللّٰہ بفرج قبل قدومکم (ص ۸۴۰)

میری سزا سختیوں میں بہت شدید ہوگئی، اس لیے میں نے یہ دعویٰ کر دیا کہ آپ لوگوں کے پاس مال میں نے جمع کرایا ہے، غرض میری یہ تھی کہ شائد خدا اسی کو میری مصیبت کے ازالہ کا سبب بنا دے یعنی آپ لوگوں کی تشریف آوری سے میری مشکل حل ہو جائے۔

ظاہر ہے کہ خالد جیسے آزاد آدمی کے متعلق یہ فرض کرنا کہ ان بزرگوں کے قدوم میمنت لزوم کی برکت اور غیبی لاہوتی امداد کی وہ توقع کیے ہوئے تھا، صحیح نہ ہوگا۔ بلکہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اسے بڑی دور کی اور پتہ کی سوجھی۔ خالد کے اس فقرے کا جو مطلب ہے، اس کو پیش کرنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ حضرت زید بن علی کے مختصر حالات درج کرلوں کہ اسی سے اس فقرے کا مطلب سمجھ میں آسکتا ہے۔

حضرت زید بن علی کے کچھ اجمالی حالات

واقعہ یہ ہے کہ دشتِ کربلا کی مصیبت اور اس کے بعد مسلسل بنی امیہ کے فولادی پنجوں کی آہنی گرفتوں نے عام مسلمانوں پر اوس ڈال دی تھی۔ باطل کے مقابلہ میں اٹھنے کی تاب مسلمانوں میں عموماً باقی نہ رہی اور سب سے زیادہ خصوصیت کے ساتھ جو دنیا میں پیسے گئے، وہ فاطمہ اور علی کی اولاد تھی (رضی اللہ تعالیٰ عنہا وعنہ) جب حال یہ ہوگیا ہو جیسا کہ امام زین العابدین سے منقول ہے کہ بیمار ہونے کی وجہ سے لوگوں نے ان کو قتل کرنے سے چھوڑ دیا۔ فرماتے ہیں کہ ان میں سے ایک آدمی مجھے چھپا کر اپنے گھر لے گیا اور میری خاطر مدارات کرتا۔ جب گھر آتا یا گھر سے جاتا تو میرے حال پر ترس کھا کھا کر روتا۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ اس سے زیادہ وفادار آدمی اب کون ہوسکتا ہے۔ حضرت کے الفاظ یہ ہیں۔

ان یکن عندا حد من الناس خیر و وفاء فعند ھذا. (طبقات، ۱۵۷ ج ۵)

اگر بھلائی اور وفاداری کسی کے پاس ہوسکتی ہے تو اس شخص کے پاس ضرور ہوگی۔

Marfat.com

مگر فرماتے ہیں، چند روز بھی گذرنے نہ پائے تھے ابن زیاد نے عام اعلان کیا کہ علی بن حسینؓ (یعنی امام زین العابدین) کا جو پتہ دے گا اور لا کر حاضر کر دے گا، تین سو درم اسے انعام میں دیئے جائیں گے۔ یہ سننے کے ساتھ میرے لیے ہر وقت رونے والا وہی آدمی جس نے مجھے پناہ دی تھی، دیکھتا کیا ہوں کہ رسی لئے ہوئے آ رہا ہے اور میرے ہاتھ باندھ کر ان کو گردن سے باندھ رہا ہے۔ روتا جاتا ہے اور باندھتا جاتا ہے۔ یہ بھی کہتا جاتا ہے کہ اخاف (مجھے ڈر لگتا ہے) اور اسی طرح باندھے باندھے اس نے اطمینان سے مجھے ابنِ زیاد کے پاس لا کر کھڑا کر دیا اور تین سو درم لے کر روانہ ہو گیا۔ ابنِ زیاد کی نظر جوں ہی کہ مجھ پر پڑی، چند باتوں کے بعد اس نے حکم دیا کہ اس کی گردن اڑا دی جائے۔ یہ سنتے ہی میری پھوپھی زینب بنت علی چیخ اٹھیں۔

یا ابن زیاد حسبک من دمائنا اسئلک باللہ ان قتلته الا قتلتنی. (طبقات، ج ۵ ص ۱۵۷)

ہمارے گھرانے سے جتنا خوان لیا گیا ہے ابن زیاد وہ بہت کافی ہے میں خدا کا واسطہ دے کر کہتی ہوں اس بچے کو اگر قتل ہی کرنا چاہتا ہے تو پہلے مجھے قتل کر لے۔

ان کی اس چیخ سے ابن زیاد متاثر ہو گیا اور میری جان بچ گئی (دیکھو طبقات ابن سعد) اسی لیے حضرت نے ان لوگوں سے جو اہلِ بیت سے محبت کے دعوے کر کے ان حرکات کا ارتکاب کیا کرتے تھے فرماتے کہ

احبو نا حب الاسلام فما هرج بنا حبکم حتی صار علینا عاراً (طبقات، ص ۱۵۸)

بس اسلام کی اخوت کے تعلق سے لوگو مجھ سے محبت کرو۔ تم لوگوں کی محبت تو ہمارے لیے باعث ننگ و عار بن گئی ہے۔

کبھی فرماتے کہ

"تم لوگوں کی اسی محبت نے دنیا کو ہم لوگوں کا دشمن بنا دیا ہے۔"

یہ بھی فرماتے کہ

"معروف (شرعی نیکیوں) کے کرنے اور منکر (غیر شرعی امور) سے بچنے کے حکم سے اعراض کرنا خدا کی کتاب کو پس پشت ڈالنا ہے۔"

مگر جن حالات میں وہ گرفتار تھے، ان کی طرف اشارہ کر کے فرماتے الا ان تتقوا منهم تقا (یعنی بداندیشوں سے بچنے کے لیے کوئی تدبیر کی جائے)

پوچھا جاتا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ جواب دیتے کہ

یخاف جباراً عنیداً یخاف ان یفرط علیه اویطعی

زبردستی کرنے والے کینہ پروروں سے آدمی ڈرے اس بات سے کہ وہ ظلم اور زیادتی کریں گے۔

اس اندیشے سے اپنے آپ کو ان کے مظالم سے بچانے کے لیے ایسی تدبیر اختیار کی جائے جو ظلم سے اس کو محفوظ رکھے۔

Marfat.com

اہل بیت کو اتنا کچل دیا گیا کہ مدینہ میں جب حرہ کا واقعہ پیش آیا۔ حالانکہ زیادہ تر اس واقعہ کے پیش آنے میں بڑا سبب حضرت امام حسین علیہ السلام کی کربلا میں شہادت ہی تھی لیکن ''طبقات'' میں لکھا ہے، خود حضرت سید زین العابدین کا بیان ہے کہ

ماخرج فیھا احد من ال ابی طالب ولا خرج من فیھا من بنی عبد المطلب لزموا بیوتھم (ص۱۶۹)
ابوطالب کے خاندان میں سے بھی کوئی آدمی اس ہنگامے میں شریک ہونے کے لیے نہ نکلا اور نہ عبدالمطلب کے گھرانے والے نکلے۔سب کے سب اپنے گھروں میں پڑے رہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حادثہ کربلا کے بعد اہلِ بیت نبوت والوں نے سیاسی قضیوں سے اپنے آپ کو الگ تھلگ کرلیا تھا۔خود امام زین العابدین علیہ السلام نے اپنی پوری زندگی عبادت و ریاضت ومجاہدے میں گذاری۔ مدینہ منورہ کے پاس عقیل نامی ندی کے کنارے جو محلّہ تھا، وہیں آپ نے مکان بنوالیا اور اپنے بال بچوں خاندان والوں کے ساتھ صبر وشکر کے ساتھ زندگی کے دن پورے کررہے تھے۔ اگرچہ ریحانۃ النبی سیدنا حسین علیہ السلام کی اولاد ذکور میں آپ تنہا باقی رہ گئے تھے، لیکن خدا نے آپ کی اولاد میں برکت دی۔ اپنے بعد کو ذکور روانات کی شکل میں اپنی اولاد کی کافی تعداد آپ نے چھوڑی جن میں سب سے زیادہ شہرت امام باقر محمد بن علی بن حسین نے حاصل کی۔ آپ کی والدہ امام حسن علیہ السلام کی چونکہ صاحبزادی تھیں اس لیے دونوں بھائیوں کی نمائندگی آپ کا وجود باجود کرتا تھا۔ گوآپ کے ایک حقیقی بھائی عبداللہ بن علی بھی تھے لیکن عظمت و احترام کا جو مقام عالی امام باقر کو حاصل ہوا، یہ کچھ ان ہی کی خصوصیت تھی۔ سیدنا زین العابدین کے دوسرے صاحبزادے دوسری عورتوں سے تھے جن میں ایک زید بن علی الشہید رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ہیں۔

ہندوستان اور خاندانِ نبوت

لکھنے والوں نے تو خود حضرت امام زین العابدین تک کے متعلق اگرچہ یہ لکھ دیا ہے کہ

قیل ان ام زین العابدین یقال لھا غزالہ و قیل سلامہ من بلاد السند (ص۱۹۱، الیافعی، ۱۶)
کہا گیا ہے کہ امام زین العابدین کی والدہ جن کا نام غزالہ یا بعض سلامہ بتاتے ہیں سندھ کی رہنے والی تھیں۔

گویا اس عام اور مشہور روایت کے خلاف ہے کہ آپ کی والدہ محترمہ یزدجرد کی شاہزادی تھیں جن کا ایرانی نام شہر بانو اور عربی نام سلافہ رکھا گیا تھا۔ الیافعی نے یہ بھی لکھا ہے کہ

وامہ[29] سلافہ بنت یزد گرد اخر ملوک فارس.[30]
حضرت زین العابدین کی والدہ کا نام سلافہ تھا یزگرد ایران کے آخری بادشاہ کی صاحبزادی تھیں۔ (ص۱۹۰، ج۱).

Marfat.com

حضرت زیدؒ

بہرحال امام زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رگوں میں ہندوستانی خون تھا یا نہ تھا، لیکن ان کے صاحبزادے زید کے متعلق مورخین کا اتفاق ہے کہ ان کی والدہ ہندیہ تھیں۔ طبری نے حضرت زید اور ان کے چچازاد بھائی عبداللہ بن حسن سے جس گفتگو کو نقل کیا ہے، اس میں عبداللہ بن حسن نے صاف لفظوں میں زید کو کہا کہ

یا ابن الھند کیه

اے ہندوستانی عورت کا بچہ (دیکھو ص ۳۵)

میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر یہ صحیح ہے یعنی حضرت زید کی والدہ تو "ہندکیہ" تھیں اور جیسا کہ کہتے ہیں کہ ان کی دادی شہر بانو ایرانیہ خاتون بلکہ شاہزادی تھیں تو اس کا مطلب گویا یہی ہوا کہ ان میں عربی قریشی، ہاشمی، فاطمی، علوی خصوصیات کے ساتھ ساتھ ایرانی اور ہندوستانی صفات بھی موروثی طور پر منتقل ہوئے۔ شاید ہی اس زمانہ میں اس قسم کے موروثی خصوصیات کسی شخص واحد میں جمع ہوئے ہوں۔

شکل وصورت

اسی لیے لکھا ہے کہ حضرت زید غیر معمولی طور پر حسین وجمیل تھے۔ شیخ ابومحمد یحییٰ الشافعی کے حوالہ سے "الروض الکبیر" میں جو زیدی فقہ کی کتاب ہے، اس کے مقدمہ میں نقل کیا ہے کہ

کان ابیض اللون اعین مقرون الحاجبین تام الخلق طویل القامة کث اللحیه عریض الصدر اقنی الانف اسود الراس واللحیه الا انه خالطه الشیب فی عارضیه (ص ۴۹، مقدمہ الروض النظیر)

رنگ حضرت زید کا گورا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی ابرو دواں ملے ہوئے۔ جسم کی بناوٹ مکمل تھی۔ قد دراز تھا، داڑھی گھنی، سینہ فراخ و کشادہ، بلند بینی، داڑھی اور سر کے بال سیاہ۔ تھوڑی سی آمیزش سفید بالوں کی دونوں رخساروں کے اطراف میں ہو چکی تھی۔

شاید حضرت زید کی ان صوری خصوصیتوں میں ان تمام چیزوں کی جھلک پائی جاتی ہے جنہیں نسبتاً ان میں ہونا چاہیے تھا۔ اسی طرح ان کے باطنی صفات میں بھی بین طور پر موروثی آثار کے جلوے نظر آتے ہیں۔ غیر معمولی ذہین و فطین، علم دوست، معارف پرور ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے بہادر اور نڈر تھے۔

حضرت زیدؒ کے متعلق امام کی شہادت

دوسری شہادتوں کے ساتھ خود حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی بھی شہادت اس باب میں نقل کی گئی ہے۔ یعنی حضرت امام فرماتے تھے۔

Marfat.com

شاهدت زید بن علی کما شاهدت اهله فمارأیت فی زمانه افقه منه ولا اعلم ولا اسرع جواباً ولا ابین قولا

میں نے زید بن علی کو دیکھا تھا جیسے ان کے خاندان کے دوسرے حضرات کے مشاہدے کا موقعہ مجھے ملا ہے میں نے ان کے زمانے میں ان سے زیادہ فقیہ آدمی کسی کو نہیں پایا اور ان جیسا حاضر جواب اور واضح صاف گفتگو کرنے والا آدمی اس عہد میں مجھے کوئی نہ ملا۔

اخیر میں امام صاحب کا بیان اس لفظ پر ختم ہوا ہے

لقد کان منقطع القرین (ص۵۰، روض)

درحقیقت ان کے جوڑ کا آدمی اس زمانہ میں نہ تھا۔

اور امام ہی کیا، اس عہد کے بڑوں میں مشکل ہی سے کوئی آدمی نظر آتا ہے جس سے حضرت شہید کے متعلق اسی قسم کے الفاظ منقول نہیں ہیں۔ الشعبی سے روایت کرنے والوں نے یہاں تک روایت کیا ہے کہ

"زید بن علی سے بہتر بچہ شائد کسی عورت نے پیدا کیا ہو۔ ایسا فقیہ، اتنا بہادر اور قانع عابد و زاہد مجھے کوئی دوسرا نظر نہ آیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علمی اور دینی فہم و فراست کے ساتھ حضرت شہید کی دنیاوی سوجھ بوجھ غیر معمولی طور پر بہتر تھی۔"

امام جعفر صادق سے مروی ہے کہ شہید کی شہادت کی خبر جب معلوم ہوئی تو فرمایا

"واللہ میرے چچا ہم لوگوں میں سب سے زیادہ قرآن کے پڑھنے والے، سب سے زیادہ اللہ کے دین میں سمجھ رکھنے والے اور رشتہ کا خیال کرنے والے تھے۔"

اور آخر میں فرمایا

واللہ ما ترک فینا لدینا ول للاخرۃ مثلہ (روض۔ص۵۰)

خدا کی قسم دنیا اور آخرت دونوں کے لیے یعنی دونوں کے متعلقہ مسائل کے لیے انہوں نے ہمارے خاندان میں اپنا جیسا آدمی نہیں چھوڑا۔

گویا حضرت زید کی اس جامعیت کا حضرت صادق کی طرف سے یہ اعتراف تھا جو ان کے موروثی صفات کے منطقی نتیجہ ہونے کی حیثیت رکھتی تھی۔ بہرحال یہ تو ان کے فطری صفات کی طرف کچھ اشارے تھے۔ ان جبلی صفات کے ساتھ جن اکتسابی کمالات کو حضرت زید نے اپنے اندر جمع کیا تھا، اس کا اندازہ ان کی طالب علمانہ زندگی سے ہوتا ہے۔ میرے سامنے اس وقت ان کی مفصل سوانح عمری نہیں ہے، تاہم اجمالاً کچھ ان کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔

بات یہ ہے جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا کہ دشت کربلا کے زہرہ گداز مناظر نے اہل بیت کے افراد کو عموماً اور حضرت سیدنا امام زین العابدین کو خصوصاً اتنا دل شکستہ بنا دیا تھا کہ زیادہ تر ان بزرگوں پر یک سوئی اور عزلت

گزینی کے جذبات غالب آ گئے تھے۔ خصوصیت کے ساتھ سیاسی مسائل اور الجھنوں کے متعلق ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ قطعی طور پر یہ طے کرلیا گیا تھا کہ کچھ بھی گذر جائے، لیکن ان کانٹوں میں نہ الجھا جائے گا۔ ''طبقات ابن سعد'' میں حضرت امام زین العابدین کے متعلق یہ روایت بھی نقل کی گئی۔

ان علی بن حسین کان ینھی عن القتال و ان قوماً من اھل خراسان لقوہ فشکوا الیہ ماتلقون من ظلم وقال انی اقول کما قال عیسی بن مریم علیہ السلام ان تعذ بھم فانھم عبادک و ان تغفر لھم فانک و انت العزیز الحکیم (ص١٦٠ ج ۵)

علی بن حسین یعنی حضرت امام زین العابدین لوگوں کو جنگ وجدل سے منع کیا کرتے تھے۔ خراسان کے کچھ لوگ آپ سے آ کر ملے اور بنی امیہ کے حکمرانوں کے جن مظالم میں گرفتار تھے ان کا شکوہ حضرت سے کیا تو حضرت والا نے ان کو صبر کی تلقین کی اور لڑائی جھگڑے سے بچے رہنے کی تاکید کی اور فرمایا کہ ان میں بھی ان ظالموں کے متعلق وہی کہتا ہوں جو عیسیٰ بن مریم علیہ السلام فرمایا کرتے تھے یعنی قرآن میں جو دعا حضرت عیسیٰ کی منقول کہ ان تعذبھم فانھم عبادک وان تغفرلھم فانک انت العزیز الحکیم ۔ اگر آپ ان کو سزا دیتے ہیں تو آپ کے یہ بندے ہیں، اور اگر ان کو بخش دیتے ہیں تو آپ کی ذات سب پر غالب ہے اور آپ ہی حکمت والے ہیں۔ [۱۳۱]

آخری فقرہ حضرت کا یعنی امت محمدیہ کے لیے اسی دعا کو استعمال کرنا جو حضرت مسیح علیہ السلام عیسائیوں کے لیے فرمائیں گے، اس سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اپنے نانا کی امت کے ان حالات کو دیکھ کر ان بزرگوں پر کیا گذر رہی تھی۔ ایمان واسلام کے دعوی کے بعد جس قسم کے حرکات بنی امیہ کی حکومت کی سرپرستی میں مسلمانوں سے سرزد ہو رہے تھے، بہ ظاہر ان کے ازالہ کی امید سے مایوس ہو کر بجائے سختی کے ان کے رجحانات کچھ نرمی کی طرف مائل ہو رہے تھے بلکہ ''ارجا'' جو فرقہ مرجیہ کا مسلک سمجھا جاتا ہے جس کا عام مطلب کتابوں میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایمان لے آنے کے بعد نجات کے لیے عمل صالح کی ضرورت کا یہ فرقہ انکار کرتا تھا۔ یعنی اپنے آپ کو مومن قرار دینے کے بعد جس کے جو جی میں آئے کرتا چلا جائے۔ بہر حال وہ جنتی ہے اور دوزخ کی آگ ان پر حرام ہو جاتی ہے اگر چہ یہ بدترین قسم کی ارجائیت ہے۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے ابتدا اس کی ان ہی رجحانات سے ہوئی جس کی جھلک اہلِ بیت ہی کے بزرگوں میں ابتداءً پائی جاتی ہے۔ لکھنے والوں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے فرزند محمدؒ بن الحنفیہ کے صاحبزادے حسنؒ بن محمد پہلے آدمی ہیں۔

من تکلم فی الارجاء (طبقات۔ص ١٤١ ج ۵)
جنہوں نے ''ارجاء'' کے مسلک پر گفتگو شروع کی۔

حضرت حسن بن محمد کی ایک کتاب

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حسن بن محمد نے اپنے اس مسلک کی تائید میں کتاب بھی لکھی تھی اور مسلمانوں میں

Marfat.com

عام طور سے اس کتاب کو تقسیم کرانے کا بھی انہوں نے نظم کیا تھا۔ بہ ظاہر اس کے اسباب وہی معلوم ہوتے ہیں جو میں نے عرض کیا۔ آخر کیا سوچا جاتا۔ کیا یہ طے کر لیا جاتا کہ ایمان لانے کے بعد رسول اللہ ﷺ کی امت کی اکثریت پھر کفر کی طرف واپس ہو کر مرتد ہو گئی ہے۔ افسوس ہے کہ دنیا سے حسن بن محمد کی یہ کتاب غائب ہو گئی ہے۔ یوں بھی خاص تاریخی چیز ہوتی اگر مل جاتی کیونکہ پہلی صدی ہجری کا یہ خاص تالیفی کارنامہ ہے۔ اب تک یا تو قرآن لکھا جاتا تھا یا رسول اللہ ﷺ کی حدیثوں کو لوگوں نے جمع کیا تھا، لیکن قرآنی آیات واحادیث کو پیش نظر رکھ کر کسی خاص نظریہ کو پیدا کر کے اس پر کتاب لکھنا غالباً حسن بن محمد کا یہ پہلا کام تھا۔ اسی سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ جس ارجا کو وہ پیش کر رہے تھے وہ کونسا ارجا تھا۔[۴۲] بہرحال بجائے نفع کے چونکہ اس کتاب سے لوگوں میں دلیری پیدا ہو گئی، اس لیے لوگوں نے بیان کیا ہے کہ آخر میں حسن بن محمد کہتے تھے کہ

لو دوت انی کنت مت و لم اکتبه (ص ۱۴۹)

میری یہ آرزو ہے کہ کاش! میں مر جاتا اور اس کتاب کو نہ لکھے ہوتا۔

کچھ بھی ہو، مقابلہ اور تصادم کا خیال اہلِ بیت کے قلوب میں مضمحل ہو گیا تھا۔ اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ قدرتاً سیاسی دلچسپیوں سے الگ ہونے کے بعد زندگی کے دوسرے مشغلوں کی طرف مائل ہو جانا ضروری تھا جن میں عبادات وریاضات ومجاہدات کا جو سلسلہ تھا وہ تو خیر تھا ہی چوبیس گھنٹوں میں روزانہ ایک ایک ہزار رکعتوں کے ادا کرنے کا التزام کر لینا اور آخر وقت تک اس التزام کو نباہنا کیا معمولی بات ہے، لیکن اس کے علاوہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ خانوادہ نبوت سے تعلق رکھنے کے باوجود علم کے طلب اور حصول میں بھی ان حضرات کا شغف غیر معمولی طور پر بڑھا ہوا تھا۔ ان فطری اور قدرتی بلندیوں کے ساتھ جو آپ کو موروثی طور پر ملی ہوئی تھی، لوگوں کو حیرت ہوتی تھی کہ حضرت امام زین العباد[۴۳] موالی اور غلاموں کے تعلیمی اور افادی حلقوں میں شریک ہوتے ہیں۔ حضرت عمر کے آزاد کردہ غلام سالم جن کا علم میں اس زمانہ میں ممتاز مرتبہ تھا، لوگوں نے امام کو ان کے حلقہ میں پا کر تعجب سے پوچھا کہ تدع قریشیا و تجالس عبد بنی عدی (قریش کے علماء کو چھوڑ کر بنی عدی کے غلام کے پاس بیٹھتے ہیں، جواب میں فرمایا۔

انما یجلس الرجل حیث منتفع (طبقات۔ص ۱۶۱)

آدمی وہیں بیٹھتا ہے جہاں سے نفع اٹھا سکتا ہے۔

حضرت زید کا علم وفضل

اور اسی کا اثر ہم حضرت امام کے صاحبزادوں خصوصاً حضرت زید بن علی میں پاتے ہیں۔ یعنی اس زمانہ میں جن جن چیزوں کو علم سمجھا جاتا تھا اور ان کے ماہرین جہاں کہیں پائے جاتے تھے، حضرت زید کے سوانح حیات سے معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے ان تمام علوم میں ان کے ماہرین سے دست گاہ حاصل کرنے کی کوشش کی تھی کہ بیان کرنے والوں نے یہاں تک لکھا ہے کہ واصل[۴۴] بن عطا جو اپنے بعض اعتزالی عقائد کی وجہ سے بدنام بھی تھا، آپ

Marfat.com

اس سے بھی استفادہ کرنے میں نہ جھجکے اور اسی چیز نے اس زمانہ کے مروجہ علوم (قرآن، حدیث، فقہ و کلام) میں آپ کے پایہ کو اتنا بلند کر دیا تھا کہ گویا ان تمام علوم میں بذات خود وہ اجتہاد کا مقام رکھتے تھے۔ آج بھی فرقہ زیدیہ کا خیال ہے کہ وہ ان ہی کے اجتہاد کے مقلد ہیں۔ حضرت کی طرف متعدد کتابیں اس فرقہ میں منسوب ہیں۔ جن میں بعض طبع بھی ہوگئی ہیں۔

قرآن سے تعلق

خیر فرقہ زیدیہ اور ان کے خیالات سے اس وقت بحث نہیں لیکن اتنا مسلم ہے کہ خانوادہ نبوت سے حضرت زید نے طلبِ علم میں جتنی کوشش کی، اس خاندان میں اس کوشش کی نظیر نہیں ملتی۔ خصوصاً قرآن کے ساتھ آپ کا جو تعلق تھا، اس کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے جو خود آپ سے منقول ہے۔

خلوت بالقرآن ثلاث عشر سنة (ص ۵۰، روض)

تیرہ سال تک قرآن کے مطالعہ کے لیے میں نے خلوت اختیار کی۔

تیرہ سال تک ہر چیز سے الگ ہو کر قرآن میں آپ کا یہ استغراق کس لیے تھا؟ جہاں تک قرائن سے معلوم ہوتا ہے بات وہی تھی کہ امتِ اسلامیہ میں مختلف ملل و ادیان کے لوگ فوج در فوج جو داخل ہوئے اور ہر ایک اپنے ساتھ کچھ اپنے موروثی عقائد و خیالات کے جراثیم بھی لایا۔ مسلمان ہونے کے بعد شعوری اور زیادہ تر غیر شعوری طور پر ان میں بعضوں نے یہ کوشش کی کہ اسلامی عقائد و مسلمات اور اپنے موروثی عقائد و خیالات میں مصالحت و موافقت کی شکل پیدا کریں۔ اور سچ پوچھیے تو پہلی صدی ہجری میں بیسیوں فرقوں کی اسلام میں جو بھرمار ہوگئی، تو اس کی ایک بڑی وجہ یہ واقعہ بھی تھا۔ دوسری طرف حکومت قائمہ کے ساتھ مسلمانوں کو کیا تعلق رکھنا چاہیے، اس باب میں جیسا کہ گذر چکا طرح طرح کے خیالات لوگوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ چالیس چوروں کی جماعت مشائخ کی تھی۔ اس نے تو سلاطین وقت کو ہر قسم کی مصلحت سے آزادی ہی بخش دی تھی۔ ان ہی کے بالمقابل خوارج اور ان کے بوقلموں خیالات رکھنے والے فرقے تھے جو بات بات پر مسلمانوں کی گردنیں اڑا دینا، ان کے جان و مال کو حلال سمجھ لینا، عورتوں اور بچوں کو لونڈی اور غلام بنا لینا اسی کو بطور پیشہ کے اختیار کیے ہوئے تھے جن کی جرأتیں اس حد تک پہنچی ہوئی تھیں کہ حضرت مرتضٰی علیہ السلام تک سے توبہ کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے کہتے کہ تب کماتبنا (تم بھی اس طرح توبہ کرو جس طرح ہم نے توبہ کیا ہے) اسی طرح آپ دیکھ چکے کہ خود اہل بیت کے اراکین سیاسی معاملات سے یک سوئی اور قطعی علیحدگی کا طریقہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ الغرض یہی سوال کہ پراگندگی اور انتشار کے اس حال میں ''حق'' کیا ہے، جہاں تک میں سمجھتا ہوں، تیرہ سال تک قرآن کے استغراق میں اسی سوال کا شائد جواب حضرت زید تلاش کر رہے تھے۔ پھر اس کا جواب ان کو کیا ملا میری بحث کے دائرے سے اس کی تفصیل خارج ہے۔

Marfat.com

حضرت زید کی ایک تقریر

اجمالاً ان کی اس تقریر کا تذکرہ کر سکتا ہوں جو اس زمانہ کے مختلف اعتقادی فرقوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا جاتا ہے حضرت شہید نے فرمایا تھا کہ میں ان لوگوں سے بھی بری ہوں جو حق تعالیٰ کو اس کے مخلوقات جیسی ہستی خیال کرتے ہیں۔[۳۵] اور ان جبریوں سے بھی بری ہوں جنہوں نے اپنی ساری شرارتوں اور بداعمالیوں کی گٹھری خدا پر لاد دی ہے (یعنی ہم کچھ نہیں کرتے سب خدا کرتا اور کراتا ہے) اور میں ان لوگوں سے بھی بری ہوں جنہوں نے بدکاروں اور شریروں کے دل میں یہ توقع پیدا کر دی ہے کہ خدا ان کو یوں ہی چھوڑ دے گا (یعنی صرف ایمان کا دعویٰ کافی ہے نجات کے لیے عمل صالح کی ضرورت نہیں جو مرجیہ کا عقیدہ ہے) اور میں ان دین باختوں سے بھی بری ہوں جو حضرت علیؓ کو کافر کہتے ہیں اور ان رافضیوں سے بھی جدا ہوں جو ابوبکر وعمر کی تکفیر کرتے ہیں۔ مگر خیر ان باتوں کا تعلق تو دینی اور مذہبی عقائد و خیالات سے تھا، حکومت مسلطہ جن ناکردنیوں کا ارتکاب کر رہی تھی اور اس کے حکام جن ناگفتنیوں پر مسلمانوں کے حق میں جری ہو گئے تھے ان کے مقابلہ میں کیا طریقہ عمل اختیار کر لیا جائے یقیناً اس خلوت بالقرآن کے تیرہ سالوں میں یہ سوال بھی ان کے سامنے تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ اسی سوال کا جواب تھا جو کوفہ کی گلیوں میں آپ کے خون سے لکھا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اپنی شکست کا جب آپ کو یقین ہو گیا تو اس وقت فرمایا کہ

"شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے اپنے دین کو حد کمال تک پہنچانے کا اس وقت موقعہ عطا فرمایا۔"

اس کے بعد فرمایا اور یہی فقرہ خاص طور پر قابل توجہ ہے، یعنی فرمایا:

"جب کہ میں رسول اللہ ﷺ آدمی وہیں بیٹھتا ہے جہاں سے نفع اٹھا سکتا ہے۔ سے سخت شرمندہ تھا کہ ان کی امت کو معروف کا حکم میں نے کیوں نہیں دیا اور منکر سے کیوں نہیں روکا۔"

دوسری روایت کے الفاظ اسی کے قریب قریب ہیں یعنی آپ نے فرمایا۔

"خدا کی قسم مجھے یہ چیز سخت ناگوار تھی کہ میں محمد رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کروں اور اس حال میں ملاقات کروں کہ ان کی امت کو نہ معروف کا میں حکم دیئے ہوتا اور نہ منکر سے منع کیے ہوتا۔"

اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ:

"خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت کو جب میں نے درست کر لیا تو اس کے بعد مجھے اس کی قطعاً پرواہ نہیں ہے کہ میرے لیے آگ جلائی جائے اور مجھے اس میں جھونک دیا جائے۔" (مقدمہ روض النظیر)

Marfat.com

میرے خیال میں تو شائد ان کا یہی جذبہ تھا جس کی چنگاری ان کے اندر سلگتی اور بھڑکتی رہتی تھی۔ مشہور محدث ابوعوانہ نے حضرت شہید کے متعلق جولکھا ہے کہ

کان زید بن علی یری الحیاة غراماً و کان صنجراً بالحیاة (ص ۵۵، مقدمہ روض النظیر)
زید بن علی کے لیے زندگی ایک بوجھ بن گئی تھی۔ زندگی سے وہ تنگ آ چکے تھے۔

یہی خیال کہ اپنے نانا محمد رسول اللہ ﷺ کو کیا منہ دکھاؤں گا، اسی چیز سے شاید ان کی زندگی کو ان پر دوبھر کر دیا تھا۔ حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ اندر تھا وہ باہر کیسے آئے۔ اسی فکر میں زندگی کے ایک بڑے حصہ میں وہ سرگرداں اور پریشان تھے کہ اچانک ابن النصرانیہ کو بات سوجھی یا سجھائی گئی۔ وہ حضرت کے پاس مال کے رکھوانے کا دعویٰ کرتا ہے اور ہشام کے لیے ''مال'' کی آواز سے زیادہ دلچسپ آواز کوئی نہ تھی۔ المسعودی نے اس کی خصوصیت ہی یہ لکھی ہے کہ کان یجمع الاموال (یعنی مال جمع کرنے کا اس کو بہت ڈھب تھا) حتیٰ کہ اسی کا بیان ہے کہ

''ہشام کے عہد میں لوگ اسی کی روش پر چلنے لگے۔ جس کے پاس جو کچھ تھا اس کے دبا لینے کی فکر میں ڈوب گیا۔ حسن سلوک کے راستے مسدود ہو گئے اور مہمان نوازی کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔'' (المسعودی برحاشیہ کامل، ص ۱۴۴ ج ۷)

بھلا جس بادشاہ کا حال یہ ہو کہ رعایا پر خواہ کچھ ہی گذر جائے، لیکن اپنے غلہ کی فروخت کی فکر دوسروں کے غلوں کی بکری سے پہلے ہو، یہ بادشاہ ہوا یا کوئی اور......

بہرحال ہوا یہی جیسا کہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ سننے کے ساتھ ہشام نے اسی وقت مدینہ کے والی کے نام فرمان روانہ کیا کہ زید اور جن جن لوگوں کا نام خالد نے اس سلسلہ میں لیا ہے، ان کو میرے پاس دمشق بھیج دو۔ فرمان مدینہ آتا ہے۔ والی ان سب کو واقعہ سے مطلع کرتا ہے۔ حضرت زید حیرت میں رہ جاتے ہیں کہ کہاں خالد اور کہاں اس کا مال۔ والی نے بھی سن کر یہی کہا کہ آپ لوگ سچ کہتے ہیں مگر میں مجبور ہوں۔ دمشق جانا پڑے گا۔ دلے برندش روانہ ہوئے۔ دمشق پہنچے۔ ہشام نے پہلے خود پوچھ گچھ کی۔ طبری نے لکھا ہے کہ بیان سننے اور کافی جرح وسوال کے بعد ہشام کو حالانکہ اطمینان بھی ہو گیا، خود اس نے اعتراف کیا کہ

انتما عندی اصدق من ابن النصرانیه (ص ۲۶۱)
نصرانیہ کے لڑکے (خالد) سے آپ لوگ میرے نزدیک زیادہ سچے ہیں۔

حضرت زید کوفے میں

چاہیے تھا کہ اب ان حضرات کو مدینہ منورہ واپس کر دیتا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مال کی محبت میں اسے وسوسہ ہوا کہ شاید برسرِ زمین خالد کے روبرو ہونے کے بعد کوئی ایسی بات معلوم ہو جس سے مال کا پتہ چلے.. اس نے

Marfat.com

دونوں کو حکم دیا کہ:

> ''آپ دونوں یوسف (گورنر کوفہ) کے پاس جائیے تا کہ یوسف خالد سے آپ کے سامنے معاملہ دریافت کرے اور منہ پر اس کے دعوے کو جھٹلائے۔'' (ص ۲۶۱، کامل)

اور یوں خود ہشام نے کوفہ پہنچنے کا حضرت زید کے لیے ایک ذریعہ پیدا کر دیا۔ تقدیر اسی کا نام ہے۔ امراء بنی امیہ ہمیشہ اس کی نگرانی رکھتے تھے کہ اہل بیت کا کوئی آدمی کوفہ پہنچنے نہ پائے یا پہنچے بھی تو اس کی باضابطہ نگرانی رکھی جاتی تھی، لیکن مال کی محبت میں ہشام کچھ ایسا اندھا ہو رہا تھا کہ خود ہی قدغن کر کے باصرار تمام حضرت شہید اور ان کے ساتھ عبداللہ بن عباس کے پوتے داود بن علی کو زبردستی کوفہ پہنچا دیا۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں خالد اور حضرت زید کی دوبدو گفتگو جب ہوئی تو خود خالد نے اعلان کیا کہ میں نے مال ان حضرات کے پاس نہیں رکھوایا ہے اور حضرت زید کے یہ دریافت کرنے پر کہ پھر تو نے ہمارا نام کیوں لیا اس نے جو بات جواب میں کہی تھی کہ آپ کے آنے سے مجھے توقع ہے کہ شائد نجات کی کوئی راہ نکل آئے، وہی بات سامنے آ گئی۔

کوفہ جہاں گذشتہ دنوں میں جو کچھ گذر چکا تھا، وہ تو گذر ہی چکا تھا لیکن مسلمانوں کی مسجدوں کے مینارے جو ڈھائے گئے تھے اور ان کے مقابلہ میں عیسائیوں کے لیے گرجا بنایا گیا تھا۔ ایمان والوں پر شرک و کفر کا تسلط قائم کیا گیا تھا، بادشاہ کی آمدنی میں تا کہ کمی نہ ہو، رعایا کو بھوکوں مرنے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ خالد کے ہٹنے کے بعد جو دوسرے صاحب گورنر بن کر آئے وہ بھی سگِ زرد کے بھائی شغال ہی نکلے۔ صدق ابن اللخناء جس کا تکیہ کلام تھا۔ سچ بھی ان کے نزدیک جھوٹ تھا، جھوٹ بھی جھوٹ تھا، دن کو رات کہنا بھی جرم تھا اور دن کہنا بھی گناہ۔ یہ اور اسی قسم کے بیسیوں ہرے زخم تھے جن میں کوفہ والے تڑپ رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ ظلم و ستم کی ان ہی تاریکیوں میں اچانک خانوادۂ نبوت کے ایک چشم و چراغ کا ان تمام ظاہری و باطنی کمالات کے ساتھ ان لوگوں میں آ جانا جن کی ہر مومن قلب کو تلاش رہتی ہے، رحمت کے ایک فرشتہ ہی کا آ جانا تھا۔ نہ صرف عوام بلکہ کوفہ میں خواص کا جو طبقہ تھا اس میں بھی ایک ہل چل پیدا ہو گئی۔ اتفاق کی بات دیکھئے کہ احمق یوسف نے بجائے کوفہ کے ایسے خطرناک دنوں میں حیرہ کو اپنا مستقر بنا لیا۔ حضرت زید چونکہ خود خلیفہ کی طرف سے کوفہ تشریف لائے تھے، اس لیے اہلِ بیت کی آمد و رفت پر جو نگرانی حکومت کی رہتی تھی۔ اس نگرانی میں بھی قدرتاً نگرانوں نے تساہل سے کام لیا۔

کوفہ میں حضرت زید کے معتقدین

بہرحال نتیجہ ان باتوں کا جو کچھ ہو سکتا تھا، وہی سامنے پیش آیا۔ عوام کو تو جانے دیجئے جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ خواص کے طبقات میں بھی یہ بات محسوس ہونے لگی کہ حضرت زید کا اتفاقی طور پر کوفہ آ جانا ایک مغتنم موقعہ ہے۔ خواص سے میری مراد اہل علم و تقویٰ کا گروہ ہے جن کی کوفہ میں ایک بہت بڑی تعداد تھی۔ پھر ان میں بعض جو زیادہ جوشیلے تھے، انہوں نے تو علانیہ حضرت زید کی طرف سے لوگوں سے بیعت تک لینی شروع کر دی۔ اس طبقہ کے سرگروہ

Marfat.com

وہی منصور بن المعتمر تھے جن کے متعلق کچھ دیر پہلے یہ تذکرہ کیا گیا تھا کہ حضرت امام ابوحنیفہ اور ابن معتمر خلوت میں مل مل کر باتیں کرتے اور روتے تھے۔ لکھا ہے کہ

كان منصور بن المعتمر يد ور على الناس يا خذ البيعة لزيد بن علي (ص ۵۵، روض)

منصور بن معتمر گشت کر کر کے لوگوں سے حضرت زید بن علی کے لیے بیعت لیتے تھے۔

بہ ظاہر ابن معتمر اور ان ہی جیسے بزرگوں کی کوششوں کا نتیجہ جیسا کہ تاریخوں میں بیان کیا جاتا ہے کہ چالیس ہزار انسانوں نے حضرت زید کے ساتھ مل کر بنی امیہ کی حکومت سے مقابلہ کرنے کا عہد کیا اور حضرت کے ہاتھ پر بیعت کی۔

اسی کے مقابلہ میں خواص ہی کا ایک دور اندیش طبقہ تھا جس کے سامنے کوفہ کی گذشتہ تاریخ کے اوراق کھلے ہوئے تھے۔ کوفہ والوں نے ان ہی زید کے دادا حضرت امام حسین اور امام حسن بلکہ خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ جو کچھ کیا تھا، وہ سب ان کے سامنے تھا۔ اس طبقہ کے سرخیل مشہور محدث سلمہ بن کہیل تھے۔[۳۶] انہوں نے صحابہ کی بھی آنکھیں دیکھی تھیں اور اہل بیت کے ساتھ خاص تعلق رکھنے کی وجہ سے کچھ تشیع میں بدنام بھی تھے۔ انہوں نے حضرت زید کو بہت سمجھایا۔ پچھلے تاریخی واقعات یاد دلائے، لیکن سلمہ گفتگو کامیابی اور ناکامی کے نتائج کو پیش نظر رکھ کر کر رہے تھے اور شہید کے سامنے صرف ایک بات تھی۔ حضرت کی زبان مبارک پر چند اشعار بھی اس زمانہ میں جاری تھے۔ ایک مصرعہ یہ بھی تھا،

انی امرءٌ ساموت ان لم اقتل

میں ایک شخص ہوں بہر حال مروں گا اگر قتل نہ ہو سکا۔

کہتے ہیں کہ سلمہ بن کہیل نے جب دیکھا کہ حضرت اپنے ارادہ پر مستقل ہیں تو عرض کیا کہ مجھے کوفہ سے باہر نکلنے کی اجازت دیجئے شاید کوئی ایسا حادثہ پیش آ جائے جو مجھ سے دیکھا نہیں جا سکے (کامل۔ ص ۸۷ ج ۷) اور واقعی کوفہ سے نکل کر یمامہ چلے گئے، لیکن جیسا کہ ''طبقات'' میں ہے۔

''سلمہ بن کہیل کا ۱۲۲ھ میں انتقال اسی زمانہ میں ہوا، جس زمانہ میں حضرت زید بن علی کوفہ میں شہید ہوئے۔'' (ص ۲۲۱)

اور حضرت شہید کی وہی بات۔

انی امرءٌ ساموت ان لم اقتل

میں ایک شخص ہوں، بہر حال مروں گا اگر قتل نہ ہو سکا۔

پوری ہوئی۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ موت کے معمہ کا حل ''شہادت'' کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

جاں بجاناں دہ وگرنہ از تو بستاند اجل
خود تو منصف باش اے دل ایں بکن یا آں بکن

Marfat.com

مگر ظاہر ہے کہ یہ دونوں طبقہ مخلصین ہی کا تھا[۳۷] یعنی جو کچھ بھی یہ لوگ کہہ رہے تھے، اخلاص وصداقت وفاداری ہی کے تحت کہہ اور کر رہے تھے۔ پھر ان ہی مخلصین میں ایک اور طبقہ نظر آتا ہے، جو ایک طرف کوفہ والوں کی تاریخی بے وفائیوں کو دیکھتے ہوئے کھل کر مقابلہ کا مشورہ دیتا ہے اور چونکہ بنی امیہ کے مظالم کا پانی لوگوں کے سر سے اُونچا ہو چکا تھا، اس لیے اس مغتنم موقعہ کے ضائع ہو جانے پر اپنے آپ کو اس نے راضی نہیں پایا۔ اس گروہ کے سرخیل جہاں تک میرا خیال ہے کوفہ کے محدث جلیل اور امام نبیل الاعمش ہیں تاریخوں میں ان کا قول نقل کیا جاتا ہے کہ ایک طرف وہ یہ بھی کہتے جاتے تھے کہ

والله ليخذ لنه والله لسلمنه كما فعلوا بجده و عمه

خدا کی قسم یہ لوگ زید کو چھوڑ دیں گے دشمنوں کے سپرد کر دیں گے جیسے ان کے دادا اور چچا کے ساتھ بھی ان ہی کوفہ والوں نے یہی سلوک کیا۔

لیکن اسی کے ساتھ بے چارے یہ بھی کہیے کہ:

والله لو لا ضرارة لی لخرجت معد (مقدمہ روض)

خدا کی قسم اگر (آنکھ میں) میرے ہرج نہ ہوتا تو ان کے ساتھ میں بھی نکل کھڑا ہوتا۔

یہ اعمش کے شاگرد رشید امیر المومنین فی الحدیث شعبہ[۳۸] کی روایت ہے۔ کچھ یہی حال کوفہ کے دوسرے امام سفیان ثوری کا معلوم ہوتا ہے یعنی حضرت کے ساتھ جنگ میں بھی شریک نظر نہیں آتے، لیکن اسی کے ساتھ ابوعوانہ کی روایت ہے کہ

اذاذ كر زيد بن علی يقول بذل مهجته لربه و قام بالحق لخالقه والحق بالشهداء المرز و قين من ابائه

(ص ۵۵، مقدمہ روض)

جب سفیان ثوری حضرت زید کا ذکر کرتے تو کہتے اپنی جان اللہ کی راہ میں نثار کر دی اور اپنے خالق کی مرضی کی پابندی میں حق کو لے کر کھڑے ہوئے اور اپنے ان گذشتہ آباؤ اجداد میں شریک ہو گئے جنہیں خدا نے شہادت روزی کی تھی۔

امام کی حضرت زید سے عقیدت

مخلصین کے اسی طبقہ میں مجھے حضرت امام ابوحنیفہ بھی نظر آتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ امام کے متعلق بعض خصوصی واقعات بھی اسی سلسلے میں بیان کیے جاتے ہیں، جن میں سب سے بڑی بات تو یہ نظر آتی ہے کہ امام ابوحنیفہ کو خود حضرت شہید رحمتہ اللہ علیہ نے یاد فرمایا۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو امام کے سوا اکابر کوفہ کے ساتھ جہاں تک روایات کا تعلق ہے، حضرت شہید نے غالباً اختیار نہیں فرمائی۔ خود فضیل بن زبیر کا بیان ہے۔

كنت رسول زيد بن علی الی ابی حنيفة (ص ۵۵ روض)

میں امام ابوحنیفہ کے پاس حضرت زید کا قاصد بن کر گیا تھا۔

فضیل کا بیان ہے کہ امام ابو حنیفہ نے سب سے پہلے سوال اس سلسلہ میں مجھ سے جو کیا تھا وہ یہ تھا کہ

"فقہا (جو اس زمانہ میں طبقۂ اہلِ علم کی تعبیر تھی) ان لوگوں میں سے حضرت زید کے پاس کن کن لوگوں کی آمد و رفت ہے۔ فضیل نے چند ممتاز ہستیوں کے نام گنوائے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ امام ابو حنیفہ کی غرض اس سوال سے کیا تھی؟ بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان لوگوں کے ذریعہ سے تحریک کے انجام کے متعلق کچھ رائے قائم کرنا چاہتے تھے۔"

حضرت زید کی حمایت میں حضرت امام کا ایک تاریخی بیان

اور غالباً فضیل کے اسی جواب کے بعد امام نے اپنا وہ تاریخی بیان دیا جو چند معمولی الفاظ کے رد و بدل کے ساتھ حضرت امام کے سوانح عمریوں میں نقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ مختلف مواقع پر اس بیان کے بعض اجزاء کا ضمنی ذکر میں نے پہلے بھی کیا ہے، لیکن وقت آ گیا ہے کہ حضرت امام کے اس "بیان" پر اب ذرا تفصیلی نظر ڈالی جائے۔ اس بیان کے چند اجزاء ہیں۔

پہلا جز تو یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ نے یہ فتویٰ دیا کہ

خروجه يضاهي خروج رسول الله ﷺ بدر (ص ۲۶۰)

حضرت زید کا اس وقت اُٹھ کھڑا ہونا رسول اللہ ﷺ کی بدر میں تشریف بری کے مشابہ ہے۔

بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ فضیل بن زبیر کو ایلچی بنا کر حضرت شہید نے امام کے پاس جو بھیجا تھا تو گو لکھنے والوں نے صرف یہی لکھا ہے کہ

ارسل اعلى ابى حنيفة يدعوه الى نفسه (ص ۲۶۰)

حضرت زید نے فضیل کو ابو حنیفہ کے پاس اس لیے بھیجا تھا کہ اپنی ذات کی طرف امام ابو حنیفہ کو دعوت دینا چاہتے تھے (یعنی میرے ہاتھ پر بیعت کرو)

لیکن جہاں تک میرا خیال ہے ممکن ہے کہ اسی کے ساتھ امام سے اس باب میں حضرت شہید نے اگر یہ شرعی مشورہ بھی حاصل کیا ہو کہ موجودہ حالات میں بنی امیہ کی حکومت کے مقابلہ میں کھڑا ہونا شرعاً آپ کے نزدیک کس قسم کی بات ہے؟ تو اس کی بھی گنجائش ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسی کا جواب امام نے ان الفاظ میں دیا یعنی قریش کے مقابلہ میں آنحضرت ﷺ کا صف آرا ہو جانا جیسے ایک غیر مشتبہ فیصلہ تھا۔ اسی طرح گو اس وقت مقابلہ میں بجائے کافروں کے وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، لیکن اپنے طریقۂ عمل سے بنی امیہ کی حکومت جن نتائج تک پہنچ چکی ہے ان کو دیکھتے ہوئے اس حکومت کے الٹ دینے کی کوشش قطعاً ایمان و اسلام کا اقتضاء ہے۔ گویا امام نے ان الفاظ میں حضرت زید کے خروج کی شرعی تصحیح فرمائی ہے جیسا کہ آئندہ معلوم بھی ہوگا کہ اس قسم کے مواقع میں حضرت امام کا جو مسلک تھا اسی مسلک کا اظہار ایک خاص قسم کی تعبیر کے ذریعہ فرمایا ہے بلکہ اگر اسے خوش اعتقادی نہ قرار دیا جائے تو ایک طرح

سے ان ہی الفاظ سے حضرت امام نے اس انجام کی پیش گوئی بھی کردی تھی جو آخر حضرت شہید کے سامنے آیا۔ مطلب یہ ہے کہ جس وقت فضیل حضرت شہید کا پیغام لے کر امام ابوحنیفہ کے پاس آئے تھے۔

حضرت زید کی دعوتِ جہاد

جیسا کہ کتابوں سے معلوم ہوتا ہے، بجز ''الرافضہ'' کے قریب قریب سارے اہل کوفہ امام کے ساتھ ہوکر حکومت سے مقابلہ اور مقاتلہ کے لیے تیاری کا وعدہ کر چکے تھے، بلکہ لکھا ہے کہ چالیس ہزار آدمیوں نے تو حضرت شہید کے ہاتھ پر اس معاہدے کے متعلق باضابطہ بیعت بھی کی تھی جو حضرت شہید لوگوں سے لے رہے تھے یعنی حضرت زید فرماتے تھے۔

> ''ہم تم لوگوں کو اللہ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کی طرف دعوت دیتے ہیں اور تمہیں بلاتے ہیں کہ آؤ اور ظالموں سے جہاد کرو، جو کمزور ہو گئے ہیں ان کو ظلم سے بچاؤ، اپنے حقوق سے جو محروم کیے گئے ہیں ان کے حقوق ان تک پہنچاؤ اور مسلمانوں کا یہ مال جو بیت المال میں جمع ہوتا ہے اس کو مساوی طور پر مسلمانوں میں تقسیم کرایا جائے۔ لوگ جواب میں جب نعم (ہاں) کہتے تب آپ ہر بیعت کرنے والے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر پھر فرماتے کہ یہ خدا اور اس کے رسول کے ساتھ معاہدہ ہے کہ تم میرے ساتھ وفادار ہوگے اور میرے دشمن سے لڑو گے، اور ظاہر و باطن، خلوت و جلوت میں میری بہی خواہی کرو گے۔''

جب اس کے جواب میں بھی نعم (ہاں) کی آواز آتی تب آپ ہاتھ پر ہاتھ کو پھیر کر فرماتے

اللھم اشھد

اے اللہ گواہ رہ

بعضوں نے اگرچہ لکھا ہے کہ اس طریقہ سے باضابطہ بیعت پندرہ ہزار آدمیوں نے کی تھی، لیکن عام روایت چالیس ہزار ہی کی ہے۔ خود سلمہ بن کہیل کے مکالمہ میں یہ دریافت کرنے پر کہ اب تک کتنے آدمی آپ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں، حضرت شہید نے اربعون [۳۹] الفا فرمایا تھا۔ مگر جیسا کہ آخر میں ثابت ہوا کہ لڑنے کے لیے حضرت شہید جب باہر نکلے تو آپ کے ساتھ قریب قریب وہی تعداد رہ گئی تھی جو بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھی۔ یعنی بعض روایتوں میں تو آپ کے ساتھ کل دوسو اٹھارہ [۴۰] آدمی رہ گئے تھے اور بعضوں میں بجائے دوسو کے تین سو کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ بدر کی تشبیہ سے امام ابوحنیفہ نے اس پیش آنے والے انجام کی طرف اشارہ نہ کیا تھا۔

دوسرا جزء امام کے بیان کا جوان کی طرف منسوب کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ یعنی حضرت شہید کے پیامی سے امام ابوحنیفہ نے کہا

Marfat.com

لو علمت ان الناس لا یخذ لونه و یقومون معه قیام صدق لکنت اتبعه و اجا هد معه من خالفه (ص ۲۶۰)

اگر میں جانتا کہ لوگ آپ کو وقت پر چھوڑ نہ دیں گے اور واقعی راست بازی اور سچے عزم کے ساتھ ان کی رفاقت میں کھڑے ہوں گے تو میں ضرور ان کی پیروی کرتا اور ان کے مخالفوں سے جہاد کرتا۔

اس سے بھی وہی بات معلوم ہوتی ہے کہ امام کے نزدیک جہاں یہ فیصلہ غیر مشتبہ تھا کہ حضرت زید کا اقدام صحیح اور شرعی اقدام ہے، اسی کے ساتھ کوفہ والے خصوصاً حضرت شہید کے گردوپیش میں جو لوگ تھے ان کے کردار و حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے امام کو اندازہ ہو چکا تھا کہ جو صورت پہلے پیش آئی وہی پیش آ کر رہے گی، گویا اس حد تک امام ابوحنیفہ بھی مخلصین کے اس گروہ کے ساتھ تھے جس کے سرگروہ سلمہ بن کہیل تھے، لیکن سلمہ بن کہیل نے اسی انجام کا اندازہ کر کے حضرت زید کو مقابلہ سے جو روکنا چاہا تھا ہم دیکھتے ہیں کہ امام اس طریقہ کو اختیار نہیں فرماتے یعنی جو مشورہ سلمہ حضرت شہید کو دے رہے تھے کسی روایت سے ثابت نہیں کہ امام ابوحنیفہ نے بھی اس مشورہ کو پیش کیا ہو، بلکہ ہوسکتا ہے کہ بدر والی تشبیہ سے امام کا اشارہ اس کے خلاف ہو یعنی بدر میں بھی اقلیت قلیلہ کو ساتھ لے کر رسول اللہ ﷺ اس جماعت سے ٹکرا گئے تھے جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں کے لحاظ سے بہت بڑی اکثریت تھی ایک اور تین کی نسبت تھی اگر یہاں بھی حضرت زید کے ساتھ یہی صورت پیش آ جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ پیغمبر کی سنت سامنے موجود تھی اور اس باب میں تو خود قرآن کا نص بھی۔

کم من فئة قلیلة غلبت فئة کثیرة باذن الله والله مع الصابرین

کتنے چھوٹے گروہ بڑے گروہ پر اللہ کے حکم سے غالب آئے ہیں اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

موجود تھا۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف حضرت زید کو اس اقدام سے روکتے بھی نہیں اور اس اندیشہ سے کہ لوگ آپ کو چھوڑ دیں گے ساتھ بھی نہیں دیتے۔ پوچھیے تو اسی سوال کا جواب حضرت امام ابوحنیفہ کا صحیح سیاسی مسلک ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ اب اس پر بحث کی جائے۔

حضرت امام کے سیاسی مسلک کی توضیح

قانونی اور فقہی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ کی تعبیر ''الامر بالمعروف'' اور ''نہی عن المنکر'' کے الفاظ سے کی جاتی ہے یعنی دوسرے واجبات کے ساتھ مسلمانوں پر ایک فرض یہ جو عائد کیا گیا ہے کہ ''المعروف'' کا دنیا کو حکم دیں اور ''المنکر'' سے لوگوں کو روکیں جس کا حاصل یہ ہے کہ اسلامی زندگی پر لوگوں کو قائم رکھنا اور اسی کی طرف دعوت دینا مسلمانوں کے ان فرائض میں ہے جن کا بار بار مطالبہ قرآن میں مختلف حیثیتوں سے کیا گیا ہے، لیکن اسی کے ساتھ قرآن کی مشہور آیت یہ بھی ہے

Marfat.com

يا ايها الذين آمنوا عليكم انفسكم لا يضر كم من ضل اذا هتد يتم

اے ایمان والو! تم پر اپنے ذات کی نگرانی واجب ہے۔ جو گمراہ ہوا تمہیں ضرر نہیں پہنچا تا جب تم سیدھی راہ پر چلے۔

جس کا حاصل یہی ہے کہ لوگوں کو اپنی اپنی ذاتی ذمہ داریوں ہی کا خیال کرنا چاہیے۔ دوسرے اگر گمراہ ہو رہے ہوں تو ان کی گمراہی کا اثر ان لوگوں پر نہیں پڑے گا جو اپنی ذاتی ذمہ داریوں کی تکمیل میں اپنی استطاعت کی حد تک مشغول ہیں۔

جب حکومت جابرہ اور ملک عضوض کا دور شروع ہوا تو جن لوگوں کا یہ خیال تھا کہ ان ظالم سلاطین کے مقابلہ میں خاموشی اختیار کرنی چاہیے۔ ان کا استدلال اسی آیت سے تھا۔ تائید میں آثار کا بھی ایک ذخیرہ پیش کیا جاتا تھا جس کی تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں ہے، لیکن سوال یہی پیدا ہوتا تھا کہ اگر اسی آیت کو اصل قرار دے دیا جائے تو معنی اس کے یہی ہوں گے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا جو فرض مسلمانوں پر عائد کیا گیا تھا گویا وہ منسوخ ہو گیا۔ حالانکہ اس کا بھی کوئی مدعی نہیں ہے۔ جواب دینے والوں میں ایک گروہ تو ان لوگوں کا ہے، جو اسی آیت کے آخری لفظ اذا اھتدیتم پر توجہ دلاتا ہے، یعنی ان کا مطلب یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے جو یہ فرمایا ہے کہ دوسروں کی گمراہی سے تمہیں ضرر نہیں پہنچے گا۔ یہ ایک شرط کے ساتھ مشروط ہے اور وہ شرط یہی ہے کہ تم اگر سیدھی راہ پر ہو جو اذا اھتدیتم کا ترجمہ ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ اپنے متعلقہ فرائض صحیح طور پر اگر تم ادا کر رہے ہو جب دوسروں کی گمراہیوں سے تمہیں ضرر نہیں پہنچے گا اور ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے متعلقہ فرائض میں جب المعروف کا امر اور المنکر کی نہی بھی ہے تو اس فرض کا تارک ہدایت یافتہ ہی کب ہوا۔ مقصد ان بزرگوں کا یہ ہے کہ اس فرض سے سبک دوشی کے بعد بھی اگر گمراہیوں سے کوئی باز نہیں آتا تو اس وقت اس کی گمراہی دوسروں کے لیے ضرر رساں نہیں ہے اسی لیے کسی حال میں بھی لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے سکوت اختیار کرنے کو جائز نہیں سمجھتے۔ حدیثوں میں اس فرض کی ادائیگی کے متعلق چند مدارج جو مقرر کئے گئے ہیں یعنی آنحضرت ﷺ کا مشہور ارشاد ہے کہ منکر اور غیر اسلامی چیز کو دیکھ کر چاہیے کہ آدمی ہاتھ سے اس کو روک دے۔ اگر اس کی سکت نہ ہو تو زبان سے روکے اور اس کی گنجائش نہ ہو تو دل سے بُرا جانے۔ فرمایا گیا کہ ایمان کا یہ ضعیف ترین درجہ ہے۔ نصِ قرآنی کی اسی نبوی تشریح کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان لوگوں کا فیصلہ ہے کہ ان مدارج میں سے کسی درجہ کی حد تک حکم کی تعمیل فرض سے سبک دوشی کے لیے اور ہدایت یافتہ ہونے کی شرط کی تکمیل کے لیے کافی ہے۔ اگرچہ بڑا درجہ اسی کا ہے جس کی ایمانی قوت ہاتھ سے بدل دینے کی جرأت پر اس کو آمادہ کرے۔ گویا ان حضرات کے نزدیک الامر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض میں اس فرض کی تعمیل ہی کامیابی ہے۔

حضرت امام کے نقطۂ نظر سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی توضیح

لیکن حضرت امام ابوحنیفہ کے مختلف اقوال و اعمال سے بعد کو لوگوں نے جو نتیجہ نکالا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ امام صاحب نہ تو ان لوگوں کے ساتھ ہیں جنہوں نے علیکم انفسکم والی آیت کو سامنے رکھتے ہوئے سکوت

Marfat.com

مطلق یا اعراض مطلق کے مسلک کو اختیار کر لیا تھا جس کا مآل شاید یہی ہو سکتا ہے کہ معروف کے امر اور منکر کی نہی کا فرض قرآنی گویا منسوخ حکم کی حیثیت اسلام میں رکھتا ہے، خصوصاً ''جابرہ'' اور حکومت جابرہ کے مقابلہ میں ان لوگوں نے اسی مسلک کو اختیار کر لیا تھا اور ان لوگوں پر معترض ہوتے تھے جو ان ظالم سلاطین کو معروف کا حکم یا منکر سے روکنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ محدثین کا ایک بڑا طبقہ اسی خیال کا قائل تھا حتی کہ الذہبی جو اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں، انہوں نے ہشام کے مقابلہ میں حضرت زید شہید کے مقابلہ کے قصے کو بیان کرتے لکھا ہے۔

خرج علی هشام فلیته لم یخرج (روض، ص ۴۷)

ہشام کے مقابلہ میں زید نکل کھڑے ہوئے کاش نہ کھڑے ہوتے۔

لیکن اسی کے ساتھ امام کا خیال یہ بھی تھا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم محض اس لیے نہیں دیا گیا ہے کہ حالات کا اندازہ کئے بغیر صرف اس کی تعمیل ہی کو فرض قرار دے دیا جائے بلکہ قرآن کی دوسری آیتوں، آنحضرت ﷺ کی حدیثوں، صحابہ کے طرز عمل کو پیش نظر رکھ کر اس مجموعہ سے نتیجہ پیدا کرنا چاہیے، آخر قرآن ہی میں یہ بھی تو ہے

فذکر ان نفعت الذکری

لوگوں کو نصیحت کرو، اگر نصیحت فائدہ پہنچا رہی ہو

پھر قرآن ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر حال میں ہاتھ سے منکر کو بدلنا فرض نہیں ہے ورنہ آخر اس قسم کی آیتوں کا کیا مطلب ہوگا جن میں ہے۔

فذکر انما انت مذکر لست علیهم بمصیطر

تم لوگوں کو نصیحت نہ کرو، تم صرف نصیحت کرنے والے ہو تم کو ان پر داروغہ نہیں مقرر کیا گیا ہے۔

نیز حضرت ابوثعلبۃ الخشنی کی یہ روایت جو ہے کہ قرآن کی اسی آیت کے متعلق یعنی

یا ایها الذین امنوا علیکم انفسکم لا یضر کم من ضل اذا اهتدیتم

ایمان والو تم پر اپنی ذات کی نگرانی واجب ہے جو گمراہ ہو تمہیں ضرر نہیں پہنچا تا اگر تم سیدھی راہ پر چلے۔

کے متعلق خود رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا تھا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ معروف (یعنی اچھی باتیں) کرتے رہنا اور منکر (بری باتوں سے) بچتے رہنا۔ پھر جب دیکھو کہ لوگ اپنی حرص و ہوا کے بندے بن گئے اور اپنی خواہشوں کی پیروی میں لگ گئے، دنیا کو انہوں نے اختیار کر لیا اور ہر شخص اپنی اپنی رائے پر ناز کرنے لگے تو یہی وہ وقت ہے جس میں تمہیں صرف اپنی ذات کی خبر لینی چاہیے اور یہی کیا بکثرت ایسی روایتیں صحاح میں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا وقت بھی آئے گا جس میں رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ اپنے اپنے گھروں کے ٹاٹ بن کر رہ جائیں۔ فرمایا گیا کہ بیٹھنے والا ان دنوں میں کھڑے ہونے والوں سے بہتر ہوگا اور کھڑا ہونے والا، چلنے والوں سے، چلنے والا دوڑنے والوں سے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا قرآنی آیات اور پیغمبر کے روایات سے بھی قطع نظر نہیں کیا جا

Marfat.com

سکتا۔ نیز جلیل القدر صحابہ کا ایک طبقہ بنی امیہ کی حکومت جابرہ کے زمانہ میں موجود تھا۔ خود ان کا طرزِ عمل بھی الامر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے قانون کے سمجھنے اور اس قانون کے استعمال کرنے میں راہ نمائی کر رہا تھا۔

مشہور حنفی امام ابو جعفر طحاوی نے اسی بنیاد پر تمام روایتوں کو جمع کرنے کے بعد حنفی نقطۂ نظر کو ان الفاظ سے پیش کیا ہے:

ففیما ذکرنا توکیدا لامر بالمعروف والنهی عن المنکر یکون الزمان الذی ینقطع ذلک فیه هو الزمان الذی و صفه رسول الله صلی الله علیه و سلم فی حدیث ابی ثعلبة الخشنی الذی لا منفعة فیه بامر معروف ولا نبهی منکر والا قوة مع من ینکره علی العام بالواجب فی ذلک فسقط الفرض عنه ورجع امره فیه الی خاصة نفسه فلایضره ذلک من ضل . (مشکل الآثار، ص ۶۶ ج ۱)

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تاکیدوں کے متعلق جو باتیں میں نے بیان کیں (معلوم ہوا) کہ ایک زمانہ آئے گا جس میں اس کی تاکید کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا اور یہ وہی زمانہ ہوگا جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ خصوصیتیں بیان کی ہیں جن کا ذکر ابو ثعلبہ خشنی کی روایت میں کیا گیا ہے یعنی وہی زمانہ جس میں معروف کے امر اور منکر کی نہی کا کوئی فائدہ نہ ہوگا اور جن لوگوں کو روکنے کی ضرورت ہوگی ان سے مقابلہ کی طاقت روکنے والے میں نہ ہوگی، پس یہی وہ وقت ہوتا ہے جب فرض ساقط ہو جاتا ہے اور بات صرف اپنی اپنی ذات کی حد تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ اسی زمانہ کے متعلق کہا گیا ہے کہ گمراہوں کی گمراہی ان لوگوں کو جو اپنی ذاتی ذمہ داریوں کے پوری کرنے میں کمی نہ کریں گے، ضرر نہ کرے گی۔

مطلب طحاوی کا وہی ہے کہ جیسے دوسرے فرائض صوم وصلوٰۃ حج وغیرہ کی حالت ہے کہ فرض ہونے میں ان کو کون شک کرتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ وہی روزہ جسے قرآن نے فرض کیا ہے حالت مرض وسفر میں اس کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے۔ استطاعت سبیل نہ ہو تو حج جیسا فرض باقی نہیں رہتا۔ کچھ یہی حال امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی فرضیت کا ہے اور قرآن کی ان دونوں آیتوں یعنی جن میں اس فرض کا مطالبہ کیا گیا ہے ان میں اور اس آیت میں جس میں ہر شخص کو اس کی شخصی ذمہ داری کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اعلان کیا گیا ہے کہ دوسروں کی گمراہی سے تم کو ضرر نہیں پہنچے گا، ان دونوں احکام میں تطبیق کی یہی شکل ہے کہ ہر حکم کو ایک خاص زمانے کے ساتھ محدود قرار دیا جائے۔ باقی رہی یہ بات کہ ان دونوں زمانوں کے پہچاننے کا کیا معیار ہے۔ طحاوی نے اسی کی طرف اشارہ کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ابو ثعلبہ کی روایت میں اس کو خود ہی متعین فرما دیا ہے جس کا حاصل یہی ہے کہ جس غرض کے لیے امر و نہی کا یہ کام مسلمانوں پر فرض کیا گیا ہے۔ جب دیکھا جا رہا ہو کہ وہ غرض حاصل نہیں ہو رہی ہے یعنی قبول کرنے کے لیے لوگ تیار بھی نہیں ہوں اور کہنے والا بیچارا اپنے اندر ان سے مقابلہ کی قوت بھی نہ پاتا ہو تو پہچان لینا چاہیے کہ علیکم انفسکم (تم پر صرف تمہاری ذمہ داری ہے) کے قانون پر عمل کرنے کا وقت آ گیا ہے اور معروف کے امر منکر کی نہی کی فرضیت ساقط ہو گئی۔

ابراہیم الصائغ والا قصہ جس کا کچھ ذکر اجمالاً پہلے بھی آیا ہے اور تفصیل ان شاء اللہ تھوڑی دیر بعد کی جائے گی اس قصہ کو بیان کرتے ہوئے عبداللہ بن المبارک نے امام ابو حنیفہ سے براہ راست یہ نقل کیا ہے کہ ابراہیم کو فہمائش کرتے ہوئے امام نے فرمایا کہ ایسے لوگ جن کے متعلق معلوم ہو چکا کہ ہماری نہیں سنیں گے اور مقابلہ کی طاقت چونکہ امر بالمعروف

Marfat.com

کرنے والے میں نہ تھی، اس لیے وہ بے چارہ جباروں کے ہاتھ

قتل و لم یصلح للناس امر (ص۱۳۳ج۲، احکام القرآن)

مارا گیا اور عام لوگوں کے لیے کوئی اصلاحی کام بھی ان سے بن نہ پڑا۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ ایسوں کی جان بھی جاتی ہے اور مسلمانوں کو ان کی اس قربانی کا کوئی نفع بھی نہیں پہنچتا بلکہ بجائے نفع کے بعض حالات میں جیسا کہ امام نے اسی کے بعد بعض دوسری باتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ

واذاقتل الرجل لم یحتبری غیرہ ان یعرض نفسه

اور جب امر بالمعروف کرنے والا قتل ہو جاتا ہے تو دوسروں میں بھی آگے بڑھنے کی جرأت باقی نہیں رہتی۔

یعنی اس کو قتل ہوتا ہوا دیکھ کر دوسروں کی ہمت بھی چھوٹ جاتی ہے اور دوسرے لوگ اس قصے سے ہی اپنے آپ کو الگ کر لیتے ہیں۔ امام نے فرمایا کہ بلاشبہ ایسی صورت میں کہ

ان وجد علیه اعوانا صالحین ورجلاً یر أس علیهم ماموناً علی دین الله لا یحول

ہاں! ایسے آدمی کو صالح رفقاء میسر آ جائیں اور ایک آدمی ان کی سرداری کرے۔ یہ ایسا آدمی ہو جو اللہ کے دین میں قابلِ اعتماد ہو اور اپنے مسلک سے نہ پلٹے۔

تب اس وقت اس آدمی کے ساتھ مقابلہ کے لیے کھڑا ہو جانا چاہیے۔ امام نے آگے وضاحت کی

ھٰذہ فریضة لیست کسائر الفرائض لان سائر الفرائض یقوم بها الرجل وحدہ

امر بالمعروف نہی عن المنکر کا شمار ان فرائض میں نہیں ہے، جن کی تعمیل میں تنہا ہر شخص کی ذات کافی ہے۔

مطلب آپ کا یہ تھا کہ یہ اجتماعی فرائض میں ہے اور اپنے ساتھ کچھ شروط رکھتا ہے۔ جب تک ان پر تحقق نہ ہوگا فرض بھی عائد نہ ہوگا۔

لیکن یہ گفتگو تو صرف فرضیت تک تھی، یعنی خود نصِ قرآنی اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ خاص حالات میں یہ فرض ساقط بھی ہو جاتا ہے۔ مگر فرضیت کے ساقط ہونے کے باوجود سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی اس فرض کی بجا آوری پر آمادہ ہی ہو جائے تو پھر اس باب میں امام کا کیا خیال تھا۔ علامہ بدرالدین عینی نے اپنی ''شرح ہدایہ'' میں اس سوال کو اٹھاتے ہوئے حنفی نقطۂ نظر سے اس کا جواب یہ دیا ہے۔

لو علم انه یصبر علی من ضر بهم و لم یشک الی احد فلا باس به و هو مجاهد (عینی، جلد۳)

اگر سمجھتا ہے کہ مخالفین کی مار دھاڑ پر صبر کر سکے گا اور کسی کے آگے اس کا گلہ شکوہ نہ کرے گا، تو پھر امر بالمعروف نہی عن المنکر کرنے میں ایسے آدمی کے لیے مضائقہ نہیں ہے بلکہ اس کو مجاہد قرار دیا جائے گا۔

فقہاء حنفیہ اس کی تائید میں علاوہ ان مشہور حدیثوں کے مثلاً ابوداؤد اور ترمذی وغیرہ میں ہے

ان من اعظم الجهاد کلمة عدل عنه سلطان جائر (ص۱۵۱)

سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ ظالم بادشاہ کے سامنے انصاف کا اظہار کیا جائے۔

Marfat.com

اس حدیث کو بھی پیش کرتے ہیں جسے خود امام ابوحنیفہ اپنی سند سے ایک خاص طریقہ سے روایت کرتے تھے اور اسی بنیاد پر اصول حدیث اور رجال کی کتابوں میں ان کی طرف بعض خاص مسائل غالباً منسوب کیے گئے ہیں یعنی

انا حدثت ابراهیم الصائغ عن عکرمة عن ابن عباس قال النبی ﷺ سید الشهداء حمزة بن عبدالمطلب ورجل قام الی امام جائر فامره و نهاه فقتله (احکام القرآن جصاص، ص ۳۴ ج ۲)

میں نے ابراہیم صائغ سے عکرمہ کے حوالہ سے یہ روایت بیان کی تھی کہ ابن عباس سے عکرمہ روایت کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ شہداء کے سید (سردار) حمزہ بن عبدالمطلب ہیں۔ اور وہ شخص ہے جو ظالم امام یعنی حاکم کے سامنے کھڑا ہوا اور معروف کا حکم دیا (یا منکر سے منع کیا پھر اس امام نے اس کو قتل کر دیا۔

جس کا حاصل یہی معلوم ہوتا ہے کہ الامر بالمعروف نہی عن المنکر کی بنیاد صرف افادہ ہی پر نہیں ہے بلکہ ابتلا بھی ایک بڑا مقصد اس قانون کا ہے یعنی محض یہی غرض نہیں ہے کہ حکم کر کے لوگوں کو معروف اور اچھی باتوں کا پابند بنایا جائے اور منکر (بری باتوں) سے روکا جائے۔ بالفاظ دیگر غیروں کو صرف فائدہ پہنچانے ہی کے لیے حق تعالیٰ نے بندوں پر یہ فرض نہیں عائد کیا ہے بلکہ جن پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے خود ان کا بھی امتحان اور ان کے ایمان کی جانچ بھی مقصود ہے۔

لیکن فرضیت قانون کی جب ساقط ہی ہو چکی تھی، تو جہاں تک میں سمجھتا ہوں حضرت امام کے نزدیک فوراً ابتلائی نصب العین کی تعمیل پر آمادہ ہو جانا ضروری نہیں تھا۔ ورنہ فرضیت کے سقوط کے معنی ہی کیا ہوں گے بلکہ لوگوں کے سننے اور ماننے سے مایوسی کے بعد بھی مسلمانوں کو معروف پر قائم رکھنے اور منکر سے دور رکھنے کے امکانات اگر نظر آتے ہوں تو امام کے نزدیک ابتلائی نصب العین کی تکمیل پر آمادہ ہو کر اپنے آپ کو قتل کرا دینے یا اسی قسم کے نقصان میں مبتلا کر لینے سے یہ بہتر ہے کہ ان امکانات سے نفع اٹھانے کی حتی الوسع کوشش کی جائے جن کی طرف عقل راہ نمائی کرتی ہو، یہی مطلب ہے ان کے اس فقرے کا۔

"امر بالمعروف نہی عن المنکر کا کرنے والا ایسی صورت میں اگر قتل ہو گیا تو عام لوگوں (یعنی مسلمانوں) کے لیے تو کوئی فائدہ بخش بات یہ نہ ہو گی۔"

بلکہ قتل ہونے والے کا ذاتی فائدہ ہو گا، گو بجائے خود یہ بھی ایک بڑا فائدہ ہے اور اس سے بڑا فائدہ بھلا کیا ہو سکتا ہے کہ "شہداء" کی جماعت کی سیادت اور سرداری اسے حاصل ہوتی ہے، لیکن کچھ بھی ہو، ہے یہ ذاتی ہی فائدہ۔ عام مسلمانوں کے لیے اس میں کوئی حصہ نہیں ہے بلکہ جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ امام صاحب کا خیال یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض مواقع میں دوسروں کی ہمت شکنی اور حوصلہ گسلی کی وجہ یہ ابتلائی تعمیل بن جاتی ہے۔ بہر حال فرضیت کے سقوط کے بعد ابتلائی نصب العین کی تعمیل پر آمادگی امام صاحب کے نقطۂ نظر سے بہ ظاہر اقدام کی آخری شکل معلوم ہوتی ہے۔ اور اسی کو میں امام ابوحنیفہ کا سیاسی مسلک قرار دیتا ہوں۔

حضرت امام کے حضرت زید کے ساتھ جہاد میں نہ شریک ہونے کی وجوہ

لیکن اب سوال حضرت زید شہید کے مسئلہ میں پیدا ہوتا ہے یعنی امام کے نزدیک اقدام کے لیے جو یہ شرط تھی کہ صالح اور اچھے لوگ امداد پر اگر آمادہ ہو جائیں اور ان کی سرداری کے لیے ایسی ہستی مل جائے جس پر اللہ کے دین کے لحاظ سے بھروسہ کیا جا سکتا ہو اور توقع ہو کہ دین کے حدود سے وہ تجاوز نہ کرے گا تو اس وقت امام صاحب کا بھی فتوی تھا کہ اس وقت فرض کی تعمیل کے لیے کھڑا ہو جانا چاہیے مگر باوجود اس فتوی کے امام ان کے ساتھ اربابِ ظلم سے مقابلہ کرنے کے لیے میدان میں کیوں نہیں اترے؟ دراصل اسی سوال کا وہ جواب تھا جو امام نے ان الفاظ میں دیا تھا، یعنی

> ''اگر میں یہ جانتا کہ لوگ حضرت کو چھوڑ نہ دیں گے اور یہ کہ حضرت کے ساتھ واقعی سچائی کے ساتھ لوگ کھڑے ہوں گے تو میں ضرور آپ کی ہم رکابی اختیار کرتا اور آپ کے مخالفین کے ساتھ جہاد کرتا کیونکہ امام برحق ہیں۔''

چالیس سال امام صاحب کے کوفہ میں گذر چکے تھے۔ ان سے بڑھ کر وہاں کے باشندوں کے حالات سے کون واقف ہو سکتا تھا۔ جیسا کہ میں نقل کر چکا ہوں فضیل بن زبیر حضرت شہید کے پیام لانے والے سے امام نے جو یہ پوچھا تھا کہ حضرت کے پاس بڑے لوگوں میں (جن کی تعبیر امام نے فقہا سے کی تھی) کن کن لوگوں کی آمد و رفت ہے، اس سے کچھ غرض اسی کا پتہ چلانا تھا۔ انہوں نے اندازہ کر لیا تھا کہ جو لوگ کھڑے ہوتے ہیں وقت پڑنے پر قطعاً بیٹھ جائیں گے اور حضرت کا ساتھ چھوڑ دیں گے اور یہ خیال کچھ امام ہی کا نہیں تھا۔ ابھی گذر چکا کہ کوفہ کے مسلم عندالکل امام اعمش تو قسم کھا کر کہتے تھے کہ

> ''خدا کی قسم لوگ حضرت شہید کو قطعاً ضرور چھوڑ دیں گے۔ خدا کی قسم لوگ ان کو دشمنوں کے سپرد قطعاً ضرور کر دیں گے۔''

سلمہ بن کہیل جیسے وفادار تجربہ کار مخلص سرد و گرم چشیدہ آدمی نے بھی یہی پیش گوئی کی تھی۔ خود حضرت زید کے ساتھ اسی خالد ابن النصرانیہ کے قصہ میں عبداللہ بن عباس کے پوتے داؤد بن علی نے بھی حضرت شہید سے انتہائی لجاجت و سماجت سے عرض کیا تھا کہ

> ''میرے چچا کے بیٹے (یا ابن عم) یہ کوفے والے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ آپ سے بھی زیادہ جن کا مقام بلند تھا۔ یعنی آپ کے دادا علی بن ابی طالب کو ان لوگوں نے چھوڑ دیا حتیٰ کہ حضرت والا شہید ہو گئے اور (امام) حسن علیہ السلام کے ساتھ بھی ان لوگوں نے یہی کیا۔ پہلے بیعت کی پھر ان ہی پر چڑھ دوڑے۔ ان کی چادر چھین لی، ان کو زخمی کیا اور کیا یہ واقعہ نہیں ہے آپ کے جد امجد (امام) حسین علیہ السلام کو یزید کے مقابلہ میں ان ہی لوگوں

Marfat.com

نے کھڑا کیا، ان کے سامنے حلف اٹھایا مگر ان کو ان ہی لوگوں نے چھوڑ دیا اور دشمنوں کے سپرد کر دیا، حتیٰ کہ اس پر بھی انہوں نے بس نہیں کیا۔ لیکن بالآخر آپ کو بھی ان لوگوں نے قتل ہی کر دیا۔'' (ص ۸۶)

اور سب سے بڑا وثیقہ اس سلسلہ میں خود خانوادۂ نبوت کے ایک بڑے رکن رکین عبداللہ بن حسن بن الحسن کا تاریخوں میں پایا جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ کو جب زید شہید کے ارادے اور کوفہ کی تیاریوں کا حال معلوم ہوا تو بڑے جوش کے ساتھ ایک بلیغ خط حضرت زید کے نام انہوں نے لکھا جس کا ترجمہ یہ ہے:

''اما بعد کوفہ والے بظاہر بہت پھولے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، لیکن اندر سے یہ بالکل کھوکھلے ہیں، جب امن اور ارزانی واطمینان کا زمانہ ہوتا ہے تو اس وقت یہ شورش پسند ہیں، لیکن جب مقابلہ کی گھڑی آ جاتی ہے تو اس وقت یہ گھبرا اُٹھتے ہیں، چیختے چلّانے لگتے ہیں، ان کی زبانیں آگے آگے چلتی ہیں، لیکن ان کے قلوب زبانوں کا ساتھ نہیں دیتے۔''

انہوں نے لکھا تھا:

میرے پاس پیہم اور مسلسل خطوط آتے رہے جن میں مجھے بھی یہ کوفہ بلاتے رہے لیکن ان کی پکار سے میں نے اپنے آپ کو بہرا بنا لیا ہے۔ میں نے اپنے دل پر ان لوگوں کی یاد اور ان کے خیال سے پردہ ڈال دیا ہے۔ میں نے ان لوگوں سے قطع نظر کر لیا ہے، ان کا حال وہی ہے جو علی بن ابی طالب (کرم اللہ وجہہ) فرمایا کرتے تھے۔ یہ اگر چھوڑ دے جائیں تو گھس پڑتے ہیں اور لڑائے جائیں تو سست بن کر بیٹھ جاتے ہیں، کسی ایک امام پر لوگ جمع ہو جائیں تو اس پر فوراً اعتراض لے کر کھڑے ہو جائیں اور کسی محنت ومشقت کے کام کی طرف ان کو بلایا جائے تو اپنی ایڑیوں پر پلٹ جاتے ہیں۔''[۴۰]

بجنسہٖ یہی رائے امام کی تھی، بلکہ قرب ونزدیکی، ذاتی تجربات پھر جس فہم وفراست کے قدرتاً وہ مالک تھے اس کے زیادہ مستحق تھے کہ جو واقعہ بعد کو پیش آیا، اس کی پیش قیاسی وہ پہلے ہی سے کر لیتے۔ اگرچہ بعض لکھنے والوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ امام نے کچھ عذر بھی پیش کیا۔
یعنی کہا۔

بسط عذری عنده (موفق، ص ۲۶۰)

حضرت زید کے سامنے میرے عذر کو بیان کرنا

لیکن یہ عذر کیا تھا، موفق نے ایک دوسری روایت کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ

Marfat.com

اعتذر بمرض يعتريه في الايام حتى تخلف عنه (ص ٢٦٠)

آپ نے اپنی ایک بیماری کا عذر کیا، جس کا دورہ وقتاً فوقتاً پڑ جاتا ہے۔ اسی وجہ سے حضرت زید کا ساتھ نہ دے سکے۔

واللہ اعلم امام پر کس مرض کا دورہ پڑتا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ وجہ بھی ہو یا ممکن ہے کہ جہاد کے شرائط میں والدین کی اجازت جو شرط ہے اور خود رسول اللہ ﷺ نے ایک صاحب سے یہ دریافت کرنے کے بعد کہ تمہارے والدین زندہ ہیں، اثبات میں جواب پانے کے بعد ارشاد ہوا تھا کہ

ففيهما فجاهد

جاؤ تو ان ہی دونوں (ماں باپ کی خدمت میں) جا کر جہاد کرو۔

شاید امام کے لیے ان کی والدہ بھی عذر ہوں۔ جیسا کہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام کو اپنی ان والدہ کا خیال اتنا رہتا تھا کہ ابن ہبیرہ نے جب تازیانے سے حضرت کو پٹوایا، تو اپنی تکلیف سے زیادہ فرمایا کرتے تھے۔

كان غم والدتي اشد علي من الضرب (ص۲ ج ۸)

مار کی تکلیف سے زیادہ مجھے اپنی والدہ کے غم کا خیال زیادہ تکلیف دہ تھا۔

بعض روایتوں میں ہے کہ

"امام کے سر خصوصاً چہرے پر جب کوڑے پڑے تو امام رو پڑے۔ پوچھا گیا تو فرمایا میری ماں مجھے یاد آئیں۔ خیال گذرا کہ وہ بے چاری میرے چہرے کے ان نشانوں کو جب دیکھیں گی تو ان کو کتنا دُکھ ہوگا۔"

اور آخر میں فرمایا:

"ان تمام مصائب سے سب سے سخت ترین مصیبت میرے لیے میری والدہ کا غم اور دُکھ ہے۔"[۴۲]

بہر حال ممکن ہے کہ یہ باتیں بھی کہی ہوں، لیکن حقیقی وجہ وہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ فرہی نہیں بلکہ ورم ہے کوفیوں کی شکل میں حضرت شہید کے ارد گرد جمع ہوگیا ہے۔ اس یقین کے بعد ظاہر ہے کہ فرضیت تو ساقط ہی ہو چکی تھی چاہتے تو جیسے اسی طبقہ کے دوسرے بزرگوں یعنی اعمش، سفیان ثوری وغیرہ نے جو طرز عمل اختیار کیا تھا وہی آپ بھی اختیار کر لیتے۔ یعنی نہ منع کرتے اور نہ شریک ہوتے اور حضرت شہید کے متعلق وہی خیال کر لیتے کہ ابتلائی نصب العین کی تکمیل کر کے شہدا کی سیادت کا مقام اپنے اجداد کی طرح حاصل کیا جیسا کہ سفیان ثوری کہا بھی کرتے تھے۔

لیکن اب یہ امام کی دقت نظری کہیے یا اسے جو کچھ قرار دیجیے کہ انجام اور باطن کے لحاظ سے کوفہ کا یہ مجمع کچھ ہی ہو مگر بظاہر وہ ایک ایسی ہستی پر سمٹ کر جمع ہوگیا تھا کہ بقول حضرت اعمش

Marfat.com

لو وفی له من بائعه لا قامهم علی المنهسج الواضح (روض بحوالہ مقریزی، ص ۵۰)
اگر ساتھ دینے والے حضرت زید کے ساتھ وفادار رہتے تو ان کو سیدھی راہ پر لا کر وہ کھڑا کر دیتے۔

جہاد کے لیے امام کی حضرت زید کو مالی امداد

میں تو سمجھتا ہوں کہ اسی ظاہر کے اقتضا کی رعایت کا نتیجہ تھا کہ سب کچھ کہنے کہلانے کے بعد آخر میں حضرت امام نے دس بیس روپے نہیں بلکہ ان ابتدائی دنوں میں جب بظاہر ان کے کاروبار کا آغاز ہی ہوگا کیونکہ اس وقت تک زیادہ وقت ان کا حماد بن ابی سلیمان اپنے استاد کے پاس حصول علم ہی میں گذرتا تھا، ہزار ہزار روپے کی دس تھیلیاں گھر سے لا کر فضیل بن زبیر کے حوالہ کیں اور فرمایا

اعینه بما لی فیتقوی به علی من خالفه (ص ۲۶۰ ج ۱، موفق)
میں حضرت کی خدمت اس مال سے کرتا ہوں، حضرت سے عرض کرتا کہ اپنے مخالفوں کے مقابلہ میں اس سے بھی فائدہ حاصل کریں۔

اور سمجھا جائے تو حضرت امام کے تجارتی کاروبار کے سلسلہ میں یہ سوال جو اٹھایا گیا تھا کہ اتنے وسیع پیمانے پر اپنے اس کاروبار کو وہ کیوں پھیلا رہے تھے۔ اس کا جواب امام کے اس طرز عمل سے نکالا جا سکتا ہے۔ مطلب میرا یہ ہے کہ امر بالمعروف نہی عن المنکر کی فرضیت کے سقوط کے بعد ابتدائی نصب العین کی تعمیل پر آمادہ ہونے سے پہلے اسی معروف ومنکر کے متعلق امکانات سے حتی الوسع نفع اٹھانے کی کوشش کرنا کہ ممکنہ حد تک عام مسلمانوں تک فائدہ پہنچنے کی کوئی صورت اگر نکل سکتی ہو تو نکالی جائے۔ یہ جو امام صاحب کا مسلک اس باب میں منقح ہوا تھا، اسی کی ایک تفصیلی شکل یہ تھی۔

بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی پیش قیاسی پر کامل اعتماد کے بعد بھی امام کے دل میں یہ خیال ضرور گذرتا ہوگا کہ جو انجام ابھی سامنے نہیں ہے، صرف قرائن وقیاسات کی بنیاد پر اس کے متعلق قطعی فیصلہ کر لینا بھی شائد احتیاط کا اقتضا نہ ہو۔ شاید یہی کچھ سوچ کر گو جانی شرکت پر آمادہ نہ ہوئے لیکن بالکلیہ شرکت سے محرومی بھی ان کے لیے غالباً ناقابل برداشت تھی اور اس وقت کی مالی استطاعت کے لحاظ سے بڑی سے بڑی مالی قربانی جو وہ پیش کر سکتے تھے، اسے پیش کر دی۔ بلکہ اسی سلسلہ میں خود حضرت شہید کے صاحبزادے محمد بن زید بن علی سے جو یہ روایت ہے کہ مالی امداد پیش کرتے ہوئے امام ابوحنیفہ نے عرض کیا تھا کہ

استعن به علی حرمک ومالانت فیه و اعن به ضعفاء اصحابک (موفق، ص ۸۳ ج ۲)
اپنے گھر کے لوگوں کی خبر گیری میں اس سے کام لیجئے اور آپ کے رفقاء میں جو ضعیف لوگ ہیں۔ ان کی اس سے امداد فرمایئے۔
اس کا آخری فقرہ یعنی

"آپ کے ساتھیوں میں جو کمزور ہیں (بہ ظاہر مالی کمزور کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ یعنی

Marfat.com

سامان حرب ہتھیار گھوڑے وغیرہ کا سامان جو نہیں کر سکتے) ان کی اس مال سے مدد فرمائی۔''

اس میں یہی نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ ان ضعفا کی مالی امداد کر کے امام صاحب نے بھی اپنے آپ کو گویا اس جہادی مہم میں شریک کرا دیا شاید انہوں نے حج وغیرہ فرائض پر اس کو کچھ قیاس کیا جس میں بصورت عجز نیابت جسے حج بدل کہتے ہیں، جاری ہوتی ہے۔ گویا بجائے حج بدل کے امام صاحب نے ''جہاد بدل'' کا طریقہ اختیار کر کے جیسے حج بدل کرانے والے کو حج کا ثواب بھی مل جاتا ہے اور حج کی فرضیت بھی ساقط ہو جاتی ہے۔ اسی طرح شاید انہوں نے خیال کیا کہ اگر میری پیش قیاسی غلط نکلی تو جہاد بدل کے طور پر تو شرکت کی سعادت سے محروم نہیں رہوں گا اور میں تو سمجھتا ہوں کہ ابو جعفر سے کتابوں میں یہ جو نقل کیا جاتا ہے کہ امام ابو حنیفہ کو انہوں نے یہ کہتے سنا کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ

استغفر الله من ترکی الامر بالمعروف و النهی عن المنکر (ص۸۳ ج۲)

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے باب میں اپنی کوتاہیوں پر میں حق تعالیٰ سے مغفرت چاہتا رہتا ہوں۔

کیا تعجب ہے کہ اس ترک میں حضرت شہید کی رفاقت جسمانی کے ترک کا خیال بھی امام کے سامنے ہو، کیونکہ مسئلہ بہرحال اجتہادی تھا۔ آخر یہ طے کرنا کہ الامر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض کے سقوط کا جو واقعی وقت ہے وہ درحقیقت آ گیا کچھ آسان نہیں ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جو حضرت شہید کے ساتھ پیش آ گئی تھی کہ لوگ بھی امداد پر آمادہ ہیں اور قیادت و ریاست کے لیے بہتر سے بہتر ہستی اس وقت جو مل سکتی تھی، وہ مل گئی تھی۔ باوجود اس کے محض اپنے ذاتی معلومات اور احساسات کی بنیاد پر جسمانی شرکت سے تقاعد کا فیصلہ کیا آسان تھا؟

حقیقت یہ ہے کہ امام کے لیے یہ بڑی کش مکش اور ایمانی قوت کی آزمائش کی گھڑی تھی۔ ایک طرف وہ اس ساز و سامان کو دیکھ رہے تھے جس کے صرف ظاہر پر اگر نظر رکھی جاتی تو شرکت سے یک سوئی کی کوئی وجہ ہی نہیں ہو سکتی تھی، لیکن دوسری طرف آپ کے چالیس سالہ تجربات و معلومات ان تاریخی وثائق کے ساتھ جو کوفہ اور کوفہ والوں کے متعلق حد تواتر تک پہنچے ہوئے تھے بلکہ گویا چشم دید واقعات کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان بیانات کی بنیاد پر امام کو انجام کا بھی یقین تھا اور اس کا بھی کہ اگر علانیہ ذاتی طور پر اس مہم میں شریک ہو جاتا ہوں تو جو انجام ہونے والا ہے اس کے بعد بنی امیہ کے جباران سارے امکانات کو ختم کر دیں گے جو اسی سلسلہ میں سقوطِ فرضیت کے بعد عام مسلمانوں کے متعلق امام اپنے دماغ میں رکھتے تھے۔ بعض مؤرخین نے جو یہ نقل کیا ہے کہ

کان ابو حنیفه یفتی سرا لوجوب نصرة زید و حمل المال الیه (ص۴۶، مقدمہ روض)

امام ابو حنیفہ پوشیدہ طور پر حضرت زید کی امداد کے فرض ہونے کا فتویٰ دیتے تھے اور ان کے پاس پوشیدہ طور پر مالی امداد بھی بھیجتے تھے۔

اس کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ساری امداد کو امام سراً یعنی پوشیدہ طور پر پیش کر رہے تھے، اس کی مصلحت مجھے تو یہی نظر آتی ہے کہ جس انجام کا اس ''زیدی جہاد'' کے متعلق ان کو یقین تھا اور اس انجام کے بعد جن نتائج کے خطرات ان کے سامنے تھے، ان ہی کے سد باب کے لیے امام نے بطور پیش بندی اس سری طریقے کو اختیار فرمایا لیکن جیسا کہ کہا گیا ہے۔ ع

Marfat.com

''نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا''

امام صاحب کے سیاسی رجحانات حکومت کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہ سکے اور گو حضرت شہید کا قتل بنی امیہ کی حکومت کے ''مرگ'' کا پیغام بن چکا تھا اور سال کے ایک ہفتہ کے اندر اندر اس حکومت کا مشرق میں خاتمہ ہوگیا،[۴۳] لیکن اس مختصر مدت میں بھی حضرت امام کو اپنے قابو میں لانے کے لیے حکومت سے جو کچھ ممکن ہوسکا، اس میں اس نے کمی نہیں کی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دمشق تک یہ خبر پہنچی اور وہاں کے نہ صرف ارباب سیاست بلکہ اہل علم کی محفلوں میں بھی امام ابوحنیفہ کے اس مسلک پر تنقیدیں کی گئیں۔ ابوبکر الجصاص نے شام کے مشہور محدث وفقیہہ مجتہد امام اوزاعی کا جو یہ قول نقل کیا ہے۔

احتملنا ابا حنیفة علی کل شیئی حتی فما جانا بالسیف یعنی قتال الظلمة نحتمله . (ص ۸ ج ۱)

ابوحنیفہ کی ساری باتیں ہم برداشت کرتے رہے تا اینکہ بالآخر یہ شخص تلوار لے کر آ گیا۔ (یعنی ظالم حکمرانوں کے خلاف تلوار اٹھا لینے کا فتویٰ اس نے دے دیا) ہم نے اس کی بات کو برداشت کیا۔

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو اس زمانہ میں اہل السنّت والجماعت میں سمجھا جاتا تھا۔ ان کے ایک مستند فقیہہ و عالم کی طرف سے بنی امیہ کی حکومت کے مقابلہ میں امام ابوحنیفہ کا اقدام تعجب اور انکار کی نظروں سے دیکھا گیا۔[۴۴]

اور صورت حال بھی کچھ یہی رہی کہ حضرت زید شہید کی مہم میں خفیہ مالی شرکت کے بعد اس باب میں امام کا قدم بجائے پیچھے ہٹنے کے آگے ہی کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ چالیس سال کی عمر سے ستر سال کی عمر تک یعنی کامل تیس سال امام ہمام رحمتہ اللہ علیہ کے بالواسطہ اور آخر میں بلا واسطہ ان ہی قصوں میں گذرے حتیٰ کہ بالآخر اسی راہ میں اس منزل سے بھی ان کو گذرنا پڑا، جس سے گذرنے کی تیاری تو وہ سالہا سال سے کر رہے تھے، بلکہ جہاں تک میرا خیال ہے اترے تھے تو اس میدان میں اسی نیت سے لیکن جب تک دوسرے امکانات سے نفع اٹھانے کا موقعہ ان کو ملتا رہا ان سے استفادے میں بھی انہوں نے کوئی کمی نہیں کی اور آخر میں انسانی زندگی کے سب سے بڑے مشکل سوال کا جو آسان ترین حل ہے، اسی حل سے وہ بھی اپنی اس مشکل کے حل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ بالفاظ دیگر سلطان جابر کے سامنے کلمۂ حق کا اظہار کر کے شہادت یا قریب قریب شہادت کے جام کو نوش کر کے موت جیسے مشکل سوال کو انہوں نے اپنے لیے آسان بنا دیا اور اب آپ کے سامنے اسی اجمال کے تفصیلات پیش ہوں گے۔

کوفہ کے ظالم گورنر کے سامنے پہلی مرتبہ حضرت امام کا احقاقِ حق

جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ حضرت زید شہید کی مہم سے پہلے کسی ایسے واقعہ کا پتہ نہیں چلتا جس سے امام کے سیاسی رجحان کا سراغ مل سکتا ہو، الا یہ کہ تاریخوں میں ایک واقعہ کا سرسری طور پر لوگوں نے ذکر کیا ہے۔ یعنی کہا

جاتا ہے کہ جن دنوں کوفہ میں ابن النصرانیہ خالد بن عبداللقسری کی حکومت تھی، جمعہ کی نماز جسے اس زمانہ کے دستور کے مطابق گورنر ہی پڑھایا کرتا تھا، [45] خالد خطبے کے لیے منبر پر چڑھنے کو تو چڑھ گیا لیکن منبر پر چڑھ چکنے کے بعد حکومت کے مراسلات کے پڑھنے میں کچھ اس طرح مشغول ہوا کہ

کا دید خل وقت العصر (ص۲۷۱ج،موفق)

قریب تھا کہ عصر کا وقت داخل ہو جائے۔

بیان کرنے والے کہتے ہیں کہ مجھے یاد نہیں یہ بھی الفاظ راوی نے کہے تھے یا کہا تھا کہ

دخل وقت العصر

عصر کا وقت داخل ہو چکا تھا۔

بہر حال روایت کے راوی جن کا نام ابوالمیلح ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں اسی جمعہ کے دن کوفہ پہنچا تھا، وہاں کے لوگوں سے واقف بھی نہیں تھا۔ دیکھا کہ ساری مسجد خاموش ہے۔ اچانک ان میں سے ایک آدمی کھڑا ہوا اور

الصلوة الصلوة خرج الوقت ودخل وقت آخر

نماز جمعہ کا وقت نکل گیا اور عصر کا وقت داخل ہو گیا۔

ابوالمیلح کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ فوراً ایک شخص کے گرفتاری کا حکم دیا گیا اور وہ گرفتار ہو گیا۔ میں نے ان لوگوں سے جو میرے قریب تھے، پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ تب کسی نے کہا نعمان ابوحنیفہ۔ ان ہی ابوالمیلح سے بعض راویوں نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ کنکریاں ہاتھ میں لئے اسی شخص نے منبر کی طرف پھینکنا شروع کیں جو نماز نماز کا لفظ پکار رہا تھا۔ اس کے بعد نماز تو خالد نے پڑھ لی، پھر اس نے حکم دیا کہ نعمان کو پکڑ لو۔ وہ پکڑ لئے گئے اور خالد کے سامنے حاضر کئے گئے۔ خالد نے پوچھا کہ اس حرکت پر جو تم سے ابھی سرزد ہوئی، سچ سچ بتاؤ کس چیز نے آمادہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ جواب میں وہ کہہ رہا تھا۔

''نماز کسی کا انتظار نہیں کرتی، اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے اور تم زیادہ مستحق ہو کہ قرآن کی پیروی کرو۔ پھر انہوں نے یہ آیت پڑھی یعنی اضاعوا الصلوة واتبعو الشھوات، انہوں نے نمازیں ضائع کر دیں اور اپنی خواہشوں کے پیچھے لگ گئے۔''

خالد نے یہ بیان سن کر پھر اصرار سے پوچھا کہ خدا کی قسم کھا کر کہتے ہو کہ نماز کے سوا اور کوئی دوسری چیز تمہارے پیش نظر نہ تھی۔ انہوں نے کہا ہاں (یعنی نماز کے سوا اور کوئی دوسرا محرک اس فعل کا میرے دل میں نہ تھا) خالد نے یہ سن کر ان کو چھوڑ دیا۔ [46]

بہر حال لے دے کر حضرت زید شہید کے واقعہ سے پہلے یہی ایک موقعہ ہے جس میں ہم امام کو حکومت کے ایک افسر پر اعتراض کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ خالد کا معمولی سوال و جواب کے بعد چھوڑ دینا یہ خود اس بات کی دلیل

Marfat.com

ہے کہ امام کے اندرونی رجحانات کا اظہار اس وقت تک لوگوں پر نہیں ہوا تھا۔ ایک اچھے عالم اور اچھے مال دار تاجر سے زیادہ اس وقت تک شاید وہ اور کچھ نہیں سمجھے جاتے تھے۔ مگر حضرت زید شہید کے واقعہ میں شرکت کے بعد خواہ خفیۃً شرکت کیوں نہ تھی، لیکن حکومت کی نگاہوں میں آپ چڑھ گئے۔

بنی امیہ کی حکومت اور حضرت امام کے تعلقات کی نوعیت اس کے بعد کیا رہی، افسوس ہے کہ تفصیلات کا تذکرہ تاریخوں میں بہت کم کیا گیا ہے، لیکن حجاج بن ثقیف جس قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا، اسی قبیلہ کے ایک آدمی جن کا نام حکم ابن ہشام ثقفی تھا ان سے مجمل الفاظ میں ایک روایت کتابوں میں پائی جاتی ہے۔ الفاظ اگرچہ مختصر ہیں، لیکن اسی اجمال سے تفصیل کا پتہ چلایا جاسکتا ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ حکم بن ہشام کے متعلق ایک طرف تو لوگوں نے یہ لکھا ہے جیسا کہ ابن عساکر میں ہے۔

کان صدیقا لابی حنیفة (ج۴)

امام ابوحنیفہ کے دوست تھے۔

اور شاید اسی وجہ سے محدثین حسب دستور کچھ اس بیچارے سے زیادہ خوش نظر نہیں آتے یعنی باوجود یہ کہ ابوزرعہ یحیٰی بن معین ولید بن مسلم وغیرہ ناقدین رجال نے حکم کی توثیق کی ہے، لیکن پھر بھی ابوحاتم رازی سے یہ الفاظ نقل کئے جاتے ہیں۔

یکتب حدیثه و لا یحتج به

حکم بن ہشام کی حدیث لکھ لی جائے لیکن اس کو دلیل میں پیش کرنا صحیح نہ ہوگا۔

بہرحال کچھ بھی ہو امام صاحب سے ان کے تعلقات گہرے معلوم ہوتے ہیں۔ لکھا ہے کہ ان کا پیشہ بھی تجارت ہی تھا۔

کان یتجر الی الشام

شام کے علاقے کی طرف تجارتی کاروبار کرتے تھے۔

جس سے ہم پیشگی بھی امام صاحب سے ثابت ہوتی ہے، لیکن اسی کے ساتھ بنی امیہ کی حکومت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حکم بن ہشام کے اچھے تعلقات تھے۔ ابن عساکر ہی کا بیان ہے۔

یتردد الی الشام یاخذ عطائه ممن هناک

شام جایا کرتے تھے اور وہیں سے اپنی تنخواہ وصول کرتے تھے۔

کچھ خیالات بھی ان کے ایسے تھے کہ بنی امیہ والوں کو ان سے خوش ہی رہنا چاہیے تھا۔[۴۷]

اگرچہ جو بنی امیہ کے مخالف تھے، ان کو بھی ناراض رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ بہرحال ان ہی حکم بن ہشام سے کہتے ہیں کہ ایک شخص نے امام ابوحنیفہ کا حال دریافت کیا۔ جواب میں اس مشہور فقرے کو دہراتے ہوئے یعنی

علی الخبیر سقطت

جاننے والے کے پاس تم آ کر گرے ہو یعنی جاننے والے سے تم نے پوچھا ہے۔

انہوں نے امام ابوحنیفہ اور بنی امیہ کی حکومت جسے وہ اپنی حکومت کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے، ان دونوں کے تعلقات کو بیان کرتے ہوئے امام صاحب کی عام اخلاق و عادات کی تعریف کرنے کے بعد پتہ کی جو بات کہی، وہ یہ تھی کہ

ارادہ سلطاننا علی ان یتولی مفاتیح خزائنہ اویضرب ظھرہ فاختار عذابھم علی عذاب اللہ عزو جل

ہماری حکومت نے چاہا کہ اپنے خزانے کی کنجیاں ان کے حوالہ کرے یعنی اس خدمت کو وہ قبول کریں یا اپنی پیٹھ کر کوڑے سے پٹوائیں یا اس شخص نے یعنی ابوحنیفہ نے حکمرانوں کے عذاب کو اختیار کر لیا، اللہ تعالیٰ کے عذاب پر۔

حکم سے ان الفاظ کو سننے کے بعد پوچھنے والے نے کہا کہ

''آپ نے تو ابوحنیفہ کے متعلق ایسی بات بیان کی جو کسی دوسرے سے میں نے نہیں سنی۔''

حکم نے اس پر کہا

ھو کما قلت لک

بات وہی ہے جو میں نے تم سے کہی

دیکھنے میں تو حکم کا یہ بیان چند لفظوں سے زیادہ نہیں ہے، لیکن جہاں تک میں خیال کرتا ہوں اگر حکم کے اس بیان پر اعتماد کیا جائے اور نہ اعتماد کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ نیز اس بیان کو اتنی ہی اہمیت دی جائے جتنی اہمیت کہ خود حکم نے اپنے بیان کو دی ہے اور سننے والے نے بھی سن کر جو کچھ کہا اگر ان ساری باتوں کو سامنے رکھ لیا جائے اور سمجھا جائے کہ امام کے سوانح نگاروں نے بنی امیہ کے گورنر ابن ہبیرہ کی طرف جن واقعات کو منسوب کیا ہے، درحقیقت یہ ابن ہبیرہ کا نہیں بلکہ حکم کے ''سلطاننا'' یعنی براہ راست بنی امیہ کی حکومت کی پالیسی تھی۔ البتہ اظہار اس پالیسی کا ابن ہبیرہ کے ذریعہ سے ہوا تو حکم کے بیان سے یہ باتیں ثابت ہوتی ہیں جس کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ شروع شروع میں جیسا کہ حکومتوں کا قاعدہ ہے، امام کے سامنے مال اور مال کے ساتھ جاہ کی رشوت پیش کی گئی اور کیسی رشوت؟ حکومت کے خزائن کی کنجیاں امام کے سپرد کر دی جائیں، اس کا تک فیصلہ کیا گیا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ فیصلہ صرف عراق و خراسان کے خزانہ تک محدود تھا، یعنی کوفہ کے بیت المال کی افسری تک۔ بات محدود تھی یا طے کیا گیا تھا کہ امام اگر راضی ہوں تو پایہ تخت (دمشق) کے مرکزی خزانہ کی کنجیاں ان کے حوالہ کر دی جائیں۔ گویا مرکز کے وزیر فنانس بنا دیے جائیں۔ آئندہ جو تفصیلات پیش ہوں گے ان سے تو کوفہ ہی کی حد تک یہ تجویز محدود معلوم ہوتی ہے، لیکن حکم کا بیان چونکہ عام ہے اس لیے کچھ تعجب نہیں کہ بات وہاں تک پہنچی ہو مگر جیسا کہ واقعات نے ثابت کیا اور آئندہ ان کی تفصیل آتی ہے۔ جب امام اس پر راضی نہیں ہوئے تو پھر رغبت کے طریقہ کو چھوڑ کر رہبت، دھمکی اور دباؤ سے کام لیا گیا۔ مجھے کہنا یہ ہے کہ یہ ہو یا وہ ہو یعنی رغبت ہو یا رہبت کی کارروائیاں اگرچہ بہ ظاہر بنی امیہ کے عہد میں ابن ہبیرہ ہی کی طرف منسوب کی گئی ہیں، لیکن حکم کے بیان سے یہ راز واضح ہوتا ہے کہ یہ جو کچھ بھی ہوا مرکزی حکومت کے اشارے سے ہوا۔

Marfat.com

حواشی

۱۔ مالیات کا نظام اس زمانہ میں جو قائم کیا گیا تھا اس کی صورت یہ تھی کہ شہر کے بڑے بڑے سرمایہ دار جن میں یہودی زیادہ ہوتے تھے، وہ حکومت کے مصارف کی تکمیل کی ذمہ داری لے کر جتنی رقم کی ذمہ داری لیتے تھے اتنی آمدنی کے علاقے ان کے سپرد کر دیئے جاتے تھے، یعنی اس علاقہ سے مال گذاری جو وصول ہوتی تھی وہ ان ہی کے یہاں داخل ہوتی تھی، حکومت کی طرف سے چک ان ہی سرمایہ داروں کے نام جاری کیے جاتے تھے، چک لانے والوں کو وہ رقم ادا کر دیتے تھے جو اس میں لکھی ہوتی گویا ان سرمایہ داروں کی کوٹھیاں ٹھیک اسی کام کو انجام دیتی تھیں جو آج کل بنک انجام دیتے ہیں، اس کاروبار میں ان کو کمیشن کی کافی آمدنی تھی۔ جھبذ ان ہی سرمایہ داروں کو کہتے تھے، حساب وکتاب میں چونکہ یہ بڑے ماہر ہو گئے تھے بلکہ یہودی جہابذہ تو بیسوں زبانوں سے بھی واقف ہوتے تھے، اس لیے بعد کو جھبذ کا اطلاق ماہرین علماء پر بھی ہونے لگا۔

۲۔ غالب کا مشہور شعر: غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں۔ اس میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا۔

۳۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تاریخ اسلامی کا یہ ایک دلچسپ اور اہم باب ہے۔ یہ تو مسلم ہے کہ ''دسترخوان'' کی اہمیت کی تاریخ کے آغاز کا تعلق امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد سے حضرت ابو ہریرہ کا مشہور فقرہ **سماط معاویة دسم و الصلوة خلف علی افضل** (الیافعی، ص۱۲۰ ج۱) میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یعنی خانہ جنگی کے زمانہ میں حضرت ابو ہریرہ نے غیر جانب داری کا مسلک اختیار کر رکھا تھا اور طریقۂ عمل ان کا یہ تھا کہ نماز تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پیچھے پڑھتے اور کھانا امیر معاویہ کے دسترخوان پر کھاتے۔ وجہ پوچھی جاتی تو فقرہ بالا دہراتے یعنی معاویہ کا دسترخوان زیادہ مرغن ہے اور نماز علی کے پیچھے بہتر ہوتی ہے۔ تاریخوں میں امیر معاویہ کے متعلق اس قسم کے لطائف کا ایک ذخیرہ درج ہو گیا ہے۔ شاہی توشک خانوں میں گذشتہ امراء وسلاطین کے لباس کو بھی محفوظ کر دیا جاتا تھا۔ امیر معاویہ کے لباس کی علامت ہی یہ تھی کہ آستین روغن سے بھری ہوتی۔ امیر معاویہ کے بعد اس سلسلہ میں سلیمان بن عبدالملک نے شہرت حاصل کی۔ جس کھانے کو عام آدمی شاید دس دن میں بھی یہ مشکل کھا سکتے تھے وہ ایک دن میں کھا جاتا تھا۔ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ اس کی روز کی غذا سو رطل شائی تھی، مختلف لطیفے سلیمان کی پُرخوری کے مشہور ہیں۔ اموی ولاۃ میں ابن ہبیرہ جس نے حضرت امام کو جیل اور تازیانے کی سزا دی تھی، اس راہ میں اس نے بھی خاصا نام پیدا کیا ہے۔ الیافعی نے لکھا ہے ''دودھ کا ایک بڑا پیالہ جس میں شہد ڈال کر اوپر سے دودھ نچوڑا جاتا تھا، ابن ہبیرہ کے سامنے نماز صبح کے بعد پیش کیا جاتا، اُس کو چڑھا جانے کے بعد ناشتہ آتا جس میں دو بھنی ہوئی مرغیاں، دو بھنے ہوئے کبوتر کے پٹھے، نصف حلوان کے سوا اور بھی مختلف قسم کے گوشت ہوتے، ناشتہ سے فارغ ہو کر ابن ہبیرہ کام میں نصف النہار تک مشغول رہتا۔ اس کے بعد دوپہر کا کھانا آتا۔ بڑے بڑے لقمے اٹھاتا اور پے در پے منہ میں ڈالتا جاتا تھا، ظہر کی نماز پڑھ کر جب کام میں مشغول ہوتا، عصر کی نماز کے بعد تخت بچھایا جاتا جس پر خود بیٹھتا اور دوسروں کے لیے کرسیاں اسی کے اردگرد بچھا دی جاتیں۔ پھر گلاسوں میں بھر بھر کر دودھ اور شہد اور مختلف قسم کے شربت کا دور چلتا، اتنے میں پھر دسترخوان بچھ جاتا۔ عام لوگ تو دسترخوان پر کھاتے اور خود ابن ہبیرہ اور اس کے خاص اصحاب کے لیے چھوٹے چھوٹے پاؤں کے تپیل بچھائے جاتے تھے جن پر کھانے چُنے جاتے تھے۔ مغرب تک کھانے کا یہ قصہ جاری رہتا۔ بنی امیہ کے عہد کے ان قصوں کو اگر جمع کیا جائے تو ایک مختصر سا رسالہ ہی مرتب ہو سکتا ہے۔ عباسی جب آئے تو اس خاندان کے پہلے حکمراں سفاح کی نشاط وانبساط کا بہترین وقت دسترخوان ہی کا وقت تھا، لوگوں کا قاعدہ تھا کہ جب کوئی کام اس سے نکلنا چاہتے تو دسترخوان کے وقت کا انتظار کرتے۔ کھانا جب شروع ہوتا تب اپنی ضرورت پیش کرتے۔ ابراہیم بن مخرمہ ایک صاحب تھے جو تاک کر ٹھیک اسی وقت اس کے سامنے اپنی ضرورتوں کو پیش کرتے۔ اس نے ایک دن کہا بھی کہ خاص کر اسی وقت تم ایسا کیوں کرتے ہو، انہوں نے کہا آپ کے انبساط وانشراح کا یہی وقت ہوتا ہے۔ ہنس کر

Marfat.com

بولا کہ تم نے خوب تاڑا۔ (ص ۴۴، مسعودی، ج ۳) اور منصور جو سفاح کے بعد گدی پر آیا، اس کے متعلق تو پہلے ہی سے لوگ پیشین گوئی کرتے تھے۔ لا یموت واللہ ابو جعفر ابدً الا بالبطن (یعنی ابو جعفر نہیں مرے گا مگر پیٹ کے عارضہ میں، طبری، ص ۳۱۳ ج ۹)۔ ایک ہندوستانی طبیب نے پھکی بنا کر اس کو دی تھی، اس کے بل بوتے پر بہت زیادہ کھانا کھا جاتا تھا۔ دلچسپ لطیفہ المسعودی نے منصور ہی کے متعلق یہ نقل کیا ہے کہ محمد نفس زکیہ کے بھائی ابراہیم سے جب اس کا مقابلہ ہو رہا تھا تو ہڈیوں کے مغز کا حلوا اسی زمانہ میں باورچی نے تیار کر کے پیش کیا۔ منصور کو یہ حلوا بہت پسند آیا اور کہنے لگا اراد ابراھیم یحرامنی ھذا و اشباھہ (ابراہیم چاہتا ہے کہ اس حلوے سے اور اسی قسم کی چیزوں سے مجھے محروم کر دے۔ ص ۸۳ ج ۸) ان ہی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان حکمرانوں کا بڑا مقصد حصول سلطنت سے کیا تھا۔ چونکہ خود اسی قسم کی آلائشوں کے دباؤ کے نیچے یہ خود دبے ہوئے تھے سمجھتے تھے کہ دوسروں کو بھی اسی سے دبایا جا سکتا ہے۔ گو واضح الفاظ میں مجھے اس کی تصریح تو نہیں ملی ہے، لیکن واقعات کے ذیل میں مورخین جن چیزوں کو نقل کرتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کھانے کھلانے کی راہ سے ''دہن دوزی'' کا ایک مستقل نظام ہی بنی امیہ اور بنی عباس دونوں کے زمانہ میں قائم تھا، اور شاید بعد میں بھی جاری رہا۔ ابن القریہ جو بداوت سے امارت تک پہنچا تھا، اس کے حالات میں لکھا ہے کہ حجاج کے عامل کے پاس آیا، دروازے پر کھڑا تھا۔ الیافعی نے لکھا ہے کہ کان عامل الحجاج یغدی کل یوم و یعشی (لوگوں کا دن اور شام کا کھانا اپنے ساتھ کھلاتا تھا) ابن قریہ نے پوچھا کہ یوم یصنع الامیر ما اری (کیا امیر روزانہ یہی کرتا ہے) لوگوں نے کہا ہاں! آگے دوسرا قصہ ہے۔ (دیکھو الیافعی ص ۱۷۱ ج ۱) الیافعی ہی نے مشہور جرنیل قتیبہ کے حال میں لکھا ہے طلب سماطین طول اربعین فراسخ فی نظام واحد (اس نے دو دسترخوان بنانے کا حکم دیا تھا جن کی لمبائی چالیس فرسخ یعنی ایک سو بیس میل کی ہو) آگے خود الیافعی نے اس کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے یعنی طلب تحصیل نسیجن مما یمد علیہ السماط الاکل العسا کر الممد و د علیہ یعنی قتیبہ نے حکم دیا تھا کہ ایسے وہ کپڑے بنے جائیں جن پر فوجیوں کے لیے کھانا چنا جا سکے (ص ۱۸۰ واللہ اعلم)۔ اس کا کیا مطلب ہے بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ساری چھاؤنی یا فوج کو ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھلانے کے لیے ایک سو بیس میل لمبے اس نے دو دسترخوان تیار کرانے کا حکم دیا تھا۔ بہرحال میں نے چند متفرق اشارات جمع کر دیے ہیں۔ کوئی صاحب چاہیں تو اس موضوع پر کام کر سکتے ہیں۔ گویا اسلامی سلاطین کے منجملہ دوسری تدبیروں کے عام پبلک کو اپنے قابو میں رکھنے کے لیے لقمہ سے دہن دوزی کی ٹک ٹک بھی تھی۔ تاریخوں میں مسلمان بادشاہوں کے باورچی خانوں کی تفصیل کرتے ہوئے عموماً جو یہ لکھا جاتا ہے کہ اتنے ہزار بکرے اتنے مینڈھے، بیل گائے، مرغ وغیرہ ذبح ہوتے تھے تو غرض اس سے یہی تھی ورنہ بے چارے بادشاہ اور اس کے گنے چنے گھر کے لوگوں کے لیے بھلا اتنی تیاریوں کی کیا ضرورت تھی۔

۴۔ جہاں تک کتابوں سے معلوم ہوتا ہے یہ ایک قسم کا خاص کپڑا تھا جس کے بانے میں مختلف چیزیں مثلاً اون یا کتان روئی وغیرہ کے دھاگے استعمال کیے جاتے تھے اور تانے میں ریشم کا سوت لگایا جاتا تھا۔ دیکھو طبقات ابن سعد ترجمہ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ۔ ہمارے یہاں کی بعض فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ خز کسی سمندری جانور کے بال سے تیار ہوتا تھا۔ یا بعضوں نے لکھا ہے کہ سڑے ہوئے ریشم سے خز بنتا تھا۔ ان بیانات میں بھی وہی بات ہے یعنی بانا (لحمہ) مختلف چیزوں کا استعمال ہوتا تھا، لیکن سدی (تانا) ریشم کا ہوتا تھا۔ بعض زیادہ متقی حضرات خصوصیت کے ساتھ بانے میں بھی ریشم کے استعمال کو پسند نہیں کرتے تھے، لیکن صحابہ اور تابعین میں جیسا کہ میں نے عرض کیا مشکل ہی سے بجز چند بزرگوں کے کوئی ایسی ہستی تھی جو خز نہ استعمال کرتی ہو۔ بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ گرمیوں میں غیر اونی اور جاڑوں میں اونی خز لوگ استعمال کرتے تھے۔ رنگ بھی اس کپڑے کے مختلف ہوتے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ریشم کی شرکت کی وجہ سے کپڑے میں مضبوطی پیدا ہو جاتی تھی۔ شریعت میں ریشم کا استعمال مردوں پر حرام کر دیا گیا تھا، لیکن اس کے جائز استعمال کی یہ مخلوط صورت نکالی گئی تھی۔ شاید ہندوستان میں اسی کو ''بافتہ'' کہتے تھے۔

۵۔ رازی سے مراد وہ کپڑا ہوتا تھا جو شہر رے میں بنتا تھا۔ طہران کے پاس آج کل جس کے کھنڈر ہیں۔ سب سے سستا ہرات کا کپڑا

تھا جسے کرباس ہروی کہتے تھے۔ابو جعفر منصور عباسی خلیفہ دوم بخالت کی وجہ سے ہروی کرباس کے کُرتے پہنتا تھا اور اس میں پیوند بھی بخالت کی وجہ سے لگاتا تھا۔امام جعفر سے کسی نے اس قصہ کو بیان کیا تو فرمایا یہ خدا کی مہربانی ہے کہ اپنی بادشاہت میں اپنی فقیری کا اس میں احساس ہے۔(کامل،ص ۸،جلد ۶)

۶۔ مرو ہی چونکہ عبداللہ بن المبارک کا وطن تھا اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے زانوئے تلمذ انہوں نے ابو غانم ہی کے آگے تہ کیا۔باقی اس زمانہ میں لوگوں کا علمی اور دینی مشغلوں کے ساتھ تجارتی کاروبار یہ عام بات تھی،خود عبداللہ بن المبارک کا کیا حال تھا۔مورخین نے لکھا ہے کہ سال کو انہوں نے تین حصوں میں تقسیم کر دیا تھا،چار مہینے تجارت میں،چار مہینے تحصیلِ علم خصوصاً فقہ و حدیث میں اور چار مہینے جہاد میں گذارا کرتے تھے۔آخر وقت تک اپنے اس التزام کو نباہتے رہے۔

۷۔ بہ ظاہر کا لفظ میں نے احتیاطاً اس لیے لکھ دیا ہے کہ کبھی کبھی ''شرکاء'' کے لفظ سے درس کے شرکاء بھی مراد ہوتی ہے،ہوسکتا ہے کہ ابو غانم کی شرکت شائد درسی شرکت ہی کی حد تک محدود ہو۔

۸۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ابن ہبیرہ کے زمانہ میں امام صاحب حجاز ۱۳۰ ہجری میں تشریف لے گئے اور عباسیوں کی حکومت جب تک قائم نہ ہو چکی،کوفہ واپس تشریف نہ لائے۔ظاہر ہے کہ بنی امیہ کا آخری فرماں روا مروان ۱۳۲ھ میں قتل ہو گیا اور اسی کے بعد سفاح پہلا عباسی خلیفہ تخت نشین ہوا۔امام سے سفاح کی کوفہ میں ملاقات بھی ہوئی ہے جس کا ذکر ان شاء اللہ آئندہ آئے گا۔ اس مسئلہ پر تھوڑی بحث آئندہ بھی آئے گی۔

۹۔ کوفہ میں جب صحابہ کی اتنی بڑی تعداد آکر آباد ہو گئی تھی کہ صرف اصحابُ الشجرہ کے تین سو اور بدری اصحاب میں ستر حضرات تھے، ماسوا ان کے ابن مسعود اور حضرت علی کے صحبت یافتہ بزرگوں سے مسلمانوں کی یہ چھاؤنی بھری ہوئی تھی۔اسی کے ساتھ اس کا خیال کیجیے کہ پچپن حج امام نے کئے اور مسلسل دو ڈھائی سال حجاز میں رہے اور اہل علم میں رہے،لیکن بایں ہمہ ناسمجھوں کا ایک گروہ ہے جو اب تک اس لطیفے کو رٹتا جاتا ہے کہ امام کو آنحضرت ﷺ کی کل ۱۷ حدیثیں معلوم تھیں۔حقیقت ہے کہ عقل سے دست بردار ہو جانے کے بعد آدمی سب کچھ کہہ سکتا ہے۔

۱۰۔ توبہ بن سعد مرو کے باشندوں میں امام کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتے تھے۔ان کا بیان ہے کہ کان له بصر بالفارسیه (یعنی فارسی زبان میں امام کو اچھا درک تھا) ایک شیعہ جو امام صاحب کے پاس آتا جاتا تھا توبہ کہتے ہیں کہ ایک دن اس کے سامنے امام صاحب نے فرمایا ''توبہ بدمروست ایں'' (ص ۱۵۶،موفق،ج ۲) یعنی فارسی کا یہ فقرہ بولے۔

۱۱۔ اگرچہ بعضوں نے امام کو عربی النسل ثابت کرنے کی خواہ مخواہ کوشش کی ہے۔ملا علی قاری نے نقل کیا ہے کہ بعض لوگ امام کو انصار کی طرف نسباً منسوب کرتے ہیں۔ابو اسحاق شیرازی نے ''طبقات الفقہاء'' کے حاشیہ میں بعضوں کا قول نقل کی ہے کہ بنی شیبان کے سلاطین سے امام کا نسبی تعلق تھا،بعضوں نے تو امام کا نسب نامہ کیقباد و کیخسرو اور بعضوں نے فریدوں سے ملا دیا ہے۔بعض ہود نبی کی اولاد میں آپ کو کہتے ہیں۔لیکن یہ یقینی ہے کہ امام نسلاً عربی نہیں بلکہ عجمی تھے۔یہ بے جا طرف داری ہو گی کہ آپ کو عربی نژاد ثابت کیا جائے۔باقی بیرون عرب آپ کا نسلی تعلق کس علاقہ کے باشندے سے تھا جیسا کہ میں نے عرض کیا ممکن ہے کہ امام کے رشتہ داران تمام عجمی شہروں میں رہتے ہوں جن کا نام لیا جاتا ہے۔البتہ کابل کے متعلق زیادہ روایتیں ملتی ہیں اس لیے اصل آبائی وطن میرے خیال میں امام کا کابل ہی معلوم ہوتا ہے۔بلکہ امام صاحب کے دادا کا نام زوطی جو بتایا جاتا ہے اور لوگوں نے تصریح کی ہے کہ تلفظ اس کا ز کے فتحہ کے ساتھ صحیح ہے۔ملا علی نے لکھا ہے کہ بفتح الزاء اور ہم جانتے ہیں کہ من رجال الزط کا لفظ جو حدیثوں میں آیا ہے بعضوں نے لکھا ہے کہ جاٹ کے لفظ کا یہ عربی تلفظ ہے۔کون کہہ سکتا ہے کہ زوطی امام کے دادا کا نام نہ ہو بلکہ قوم زط کی طرف نسبت ہے وہ مشہور ہوں۔بہر حال کابل سے پنجاب قریب ہے اور زط یعنی جاٹ قوم کا مسکن اس وقت تک پنجاب اور اس کے بالائی علاقہ میں پایا جاتا ہے۔ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ دعویٰ کہ امام کا آبائی وطن درحقیقت ہندوستان ہی تھا اور ہندوستان سے کابل اور کابل سے دوسرے خراسانی شہروں میں منتقل ہوتے ہوئے بالآخر کوفہ پہنچا اسی لیے ان تمام شہروں

Marfat.com

سے امام کے خاندان کا تعلق ہے، میں تو نہیں سمجھتا کہ بالکل بے بنیاد دعویٰ ہوگا۔ اس قسم کا بے بنیاد جیسے عربی النسل یا کے قباد و فریدوں وغیرہ کی نسل کی طرف خواہ مخواہ آپ کو منسوب کیا جاتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۱۲۔ حضرت زید کے شہید ہو جانے اور وہ بھی اس بے کسی کے ساتھ شہید ہو جانے کا خیال امام کو جب آتا تو رو دیتے تھے۔ ان لوگوں کے لیے جو حضرت زید کے جد امجد امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے متعلق ایسی کیفیت کو اپنے اندر رکھتے ہیں یعنی واقعہ کربلا جب یاد آجاتا ہے تو بے اختیار ان پر گریہ طاری ہو جاتا ہے، کیا امام ابوحنیفہ کی یہ حالت ان کے لیے نمونہ بن سکتی ہے؟ واقعہ تو یہ ہے کہ کرہاً و جبراً بلکہ بعض اشک آور عرقیات کو استعمال کر کے رونا یا رونے والوں کی صورت بنانا یقیناً قابل اعتراض ہے، لیکن واقعات کربلا سے اضطراراً تاثر پیغمبر اور پیغمبر کے اہل بیت سے قلبی تعلق کی دلیل ہے۔ خود امام کے رجحانات کا بھی اس سلسلہ میں کچھ پتہ چلتا ہے۔

۱۳۔ لکھنے والوں نے اس کی توجیہ میں کہ جب امام صاحب اپنے آپ کو ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے تو یہ پرزہ تھیلی میں کیوں ڈالا، بہت سی باتیں کہی ہیں، لیکن بات تو کھلی ہوئی ہے۔ اس قسم کے مال میں بیسویں احتمالات ہو سکتے تھے اور ان احتمالات کی وجہ سے بے چارا ممکن تھا کہ خرچ ہی کرنے سے ہچکچاتا یا خرچ کرنے کے بعد دل میں اس کے طرح طرح کے وسوسے آتے رہتے کہ کون دے گیا تھا، کیوں دے گیا، کیا کوئی دھوکہ دینا چاہتا ہے۔ یا کسی الزام میں گرفتار کرانا چاہتا ہے؟ اس پرزے کے بعد یقیناً اس کو اطمینان ہو گیا ہوگا یا آئندہ کے لیے اس کو بتلانا مقصود تھا کہ تم حاجت لے کر آؤ گے تو نقدی کیسی ملے گی۔

۱۴۔ صحابہ میں یہ حال حضرت جریر بن عبداللہ البجلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان کیا جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ سے وہ یہ حدیث روایت کرتے یعنی فرماتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد مسلمان ہونے کے مجھ سے ایک دفعہ اور بیعت اس بات کی لی کہ ہر مسلمان کی بہی خواہی کروں گا (النصح لکلِ مسلم) اسی عہد کے ایفاء کی ایک شکل یہ بھی تھی کہ کسی مسلمان سے کوئی چیز اگر خریدتے اور دام وہ اتنے بتاتا جو ان کے نزدیک چیز کی خوبیوں کے لحاظ سے کم ہوتے تو اس کو ہدایت کرتے کہ اتنے دام کم ہیں۔ میرے نزدیک صحیح قیمت اس کی یہ ہے۔ بعض بعض دفعہ ایک ایک ہزار کی چیز کئی کئی ہزار تک اسی رد و قدح میں پہنچ گئی۔ مگر دنیا اب ان روایتوں کو افسانہ سے شاید زیادہ خیال نہ کرے۔ عام قاعدہ تو یہی ہے کہ خریدار قیمت کو کم کرانے کی کوشش کرتا ہے لیکن جن لوگوں نے اپنی کوشش کا محور صرف اپنے پیغمبر کی ہدایتوں کی تعمیل قرار دے رکھا تھا وہ اس عام دستور کی پابندی نہ کرتے تھے۔ للناس فیما یعشقون مذاہب امام رحمتہ اللہ علیہ کا مذکورہ بالا طرز عمل مسلمانوں کے اسی بہی خواہی پر مبنی تھا۔

۱۵۔ واقعہ یہ ہے کہ سود خوری کے اس طوفانی زمانہ میں پس ماندہ سرمایوں کی حفاظت کا مسئلہ ظاہر ہے کہ اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ علاوہ حفاظت کی ضمانت کے موجودہ بنکوں میں ان سرمایہ داروں کو مزید براں کافی آمدنی سود کی ہوتی ہے۔ مگر بنکوں کا موجودہ نظام جس زمانہ میں نہ تھا اس وقت اس پس ماندہ سرمایہ کی حفاظت کا مسئلہ کافی اہمیت رکھتا تھا بلکہ بنک کی تاریخ بتاتی ہے کہ حفاظت ہی کی اہمیت نے بتدریج بنک کی موجودہ صورت پیدا کی، لیکن افسوس ہے کہ انفرادی سود خوار چوروں سے تو بنکوں نے لوگوں کو مطمئن کر دیا مگر ۔

چوں از چنگال گرگم در ربودی
ندانم عاقبت خود گرگ بودی

خود بنک کے نظام نے ایک بہت بڑا خطرناک اجتماعی ڈاکوؤں کی شکل اختیار کر لی ہے۔ یاد پڑتا ہے کہ آج سے چند سال پہلے لندن میں سرمایہ دشمن اشتراکیوں نے اپنا ایک جلوس نکالا تھا۔ اخباروں میں خبر آئی تھی۔ جلوس والے ایک فقرے کو دہراتے تھے۔ کہتے کہ چیتھڑے سے کاغذ، کاغذ سے نوٹ، نوٹ سے بنک، بنک سے افلاس، افلاس سے چیتھڑا، چیتھڑے سے چیتھڑا پیدا ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج ان ہی بنکوں کی وجہ سے امکان پیدا ہو گیا ہے کہ ہر شخص سود خوری کی انجمن میں شریک ہو کر سود خوار بن سکتا ہے، خواہ دنیا میں وہ کوئی پیشہ کرتا ہو۔ حالانکہ انفرادی سود خواری کے زمانہ میں سود خواری کے سوا سود خواروں کا گروہ دوسرا کام مشکل ہی سے کر سکتا تھا۔ بہر حال یہ ایک الگ مسئلہ ہے، جس کی بحث کا یہاں مقام نہیں ہے۔

Marfat.com

۱۶۔ طبری میں دیکھئے زید بن علی کا مقابلہ جب بنی امیہ کے گورنر یوسف بن عمرو سے ہوا تو جہاں جہاں کوفہ کے محلوں میں لڑائی ہوئی۔ ایک مقام کا ذکر دارِ عمرو بن حریث سے بھی کیا گیا ہے۔اس سے بھی اس مکان کی اہمیت ظاہر ہے۔

۱۷۔ زیادہ سے زیادہ کسی شوق کا انتساب امام کی طرف اگر کیا جا سکتا ہے تو وہ لباس کا شوق ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ امام کے لباس کی قیمت کبھی کبھی ہزار ہزار اور پانچ پانچ سو درہم سے زیادہ تخمینہ کی گئی ہے۔(دیکھو مناقب موفق۔ص ۳۹ ج ا) لیکن اس کا راز کیا تھا، لوگوں نے اس کے مختلف وجوہ بیان کیے ہیں، مگر ہوسکتا ہے کہ علاوہ ان وجوہ کے یعنی خدا کے دربار میں جانے کے لیے امام صاحب کا خیال تھا۔ جیسا کہ ان ہی سے نقل کیا گیا ہے کہ سلاطین کے دربار سے زیادہ تکلف کرنا چاہیے۔ بعضوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ دوسروں کو بھی حکم دیتے کہ خدا کی نعمتوں کو چاہیے کہ جنہیں بخشی جائیں انہیں ظاہر کرے۔ حدیث میں بھی اس کا حکم آیا ہے۔ پھٹے پرانے حال میں ایک شخص امام صاحب کے پاس آیا تو آپ نے اس کا حال پوچھا۔ بولا کہ میں مال دار خوش حال آدمی ہوں۔ اس وقت بھی امام نے اس حدیث کی تعمیل کی طرف اس کو توجہ دلائی۔ لباس کے تکلف سے ان کا ایک مقصد شائد یہ بھی ہو، لیکن اگر یہ سمجھا جائے کہ ارباب حکومت کے سامنے یہ ظاہر کرنا چاہتے کہ تمہاری امداد سے بے نیاز ہو کر بھی آدمی اچھے حال میں رہ سکتا ہے۔ قاضی ابو یوسف کی سواری کے تکلفات کو دیکھ کر کسی نے اعتراض کیا۔ انہوں نے بھی یہی جواب دیا کہ میں دکھانا چاہتا ہوں کہ علم دنیا میں بھی آدمی کو کتنی بلندی و رفعت عطا کرتا ہے۔

۱۸۔ اس سلسلہ میں ایک لطیفہ کتابوں میں یہ نقل کیا جاتا ہے کہ امام کے پڑوس میں ایک صاحب کا مکان تھا۔ امام صاحب کا جب انتقال ہو گیا تو اسی پڑوسی کے چھوٹے بچے نے اپنے باپ سے پوچھا ابا! سامنے کی چھت پر ایک ستون نظر آتا تھا وہ کیا ہو گیا، نظر نہیں آتا۔ باپ نے کہا بیٹا! وہ امام ابوحنیفہ تھے۔ رات بھر کھڑے ہو کر وہی نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ وہ ستون گر گیا۔ امام صاحب کی وفات ہوگئی۔(ص ۲۵۵ موفق۔)

۱۹۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ امام بے چھنے آٹے کی روٹی عموماً کھاتے تھے۔(موفق، ص ۲۴۵ ج ا)

۲۰۔ جہاں تک میرا خیال ہے دو درم ماہوار والی روایت کا بظاہر کسی خاص زمانہ سے تعلق معلوم ہوتا ہے، یہ کہنا بہت سی دوسری روایتوں کی تکذیب ہوگی کہ ان کے دوامی خوراک کا ماہواری موازنہ ہمیشہ دو درم سے زیادہ نہ تھا۔

۲۱۔ اس قسم کے واقعات جو بیان کیے جاتے ہیں کہ معمولی معمولی شبہ پر تیس تیس ہزار بلکہ ایک دفعہ تو ستر ہزار کی رقم امام نے فوراً خیرات کر دی کہ شرعی قانون کی رو سے ان کے تجارتی نمائندے نے معاملہ صحیح نہیں کیا تھا۔ کیا ایسے آدمی کو دنیا کا طالب قرار دینا بجز مجنونوں کے اور کسی کا کام ہو سکتا ہے۔ ان کی تمام سوانح عمریوں میں آپ کو یہ واقعات مل سکتے ہیں۔ دیکھئے موفق کی مناقب۔ ص ۲۰۳ ج ا اور ص ۱۹۴ ج ا)

۲۲۔ کوفہ کے مشہور بزرگوں میں ان کا شمار ہے۔ حضرت امام کے معاصرین میں ہیں۔ نام ان کا منصور اور کنیت ابو عتاب تھی۔ امام صاحب سے آٹھ سال پہلے ۱۳۲ ہجری میں وفات پائی۔ ان کے حالات میں بھی لکھا ہے کہ بنی امیہ کے اسی گورنر ابن ہبیرہ نے جس نے حضرت امام کو تازیانے کی سزا حکومت کے عہدہ کے نہ قبول کرنے کی وجہ سے دی تھی۔ اسی نے ابن المعتمر کو بھی قضا پر مجبور کیا۔ مجبور کرنے کی وجہ سے عدالت کے کمرے میں بیٹھنے کو تو بیٹھ گئے، مقدمہ پیش ہوا، فریقین کا بیان سن کر کہتے تم لوگوں کی باتیں سمجھ میں آ گئیں، لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اب میں کیا کروں۔ ابن ہبیرہ سے یہ حال سن کر چھوڑ دیا (صفوۃ الصفوہ، ص ۶۳) ابن جوزی نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ ان کی والدہ کو جب معلوم ہوا کہ کوفہ کا والی ان کے بیٹے کو قاضی بنانا چاہتا ہے لیکن وہ انکار کرتا ہے تو بہت بگڑیں، لیکن انہوں نے جواب فرمایا۔

''اماں جس بات کو میں جانتا ہوں۔ آپ نہیں جانتی ہیں۔'' (صفوۃ، ص ۶۳ ج ۲)

ابن سعید نے لکھا ہے کہ ابن معتمر کہتے تھے بھئی! میں نے (یہ واقعہ ہے) کہ علم کو کسی اچھی نیت سے حاصل نہیں کیا تھا، لیکن علم نے میری نیت کو درست کر دیا......(ابن سعد، ج ۲)

Marfat.com

بہر حال واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مسلک بھی امام ہی کا مسلک تھا اسی لیے حکومت سے ان کی کشمکش بھی جاری تھی۔

۲۳۔ اسی قسم کا ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ ایک صاحب جن کا نام ابوقطن عمر بن الہیثم تھا اور اسماء الرجال کے امام شعبہ بن الحجاج جنہیں لوگ امیر المومنین فی الحدیث بھی کہتے ہیں، کسی ضرورت سے ان کا سفارشی خط واسطہ سے لے کر کوفہ امام کے پاس آئے تھے۔ امام کی مہمان نوازیوں اور ان کی غیر معمولی شب بیداریوں کا حال بیان کرتے ہوئے ایک واقعہ سانپ کے گرنے کا وہ بھی بیان کرتے ہیں۔ یہ صبح کا وقت تھا۔ ان کا بیان ہے کہ دیر تک امام سانپ کی منڈی کو اپنے پاؤں سے دبائے رہے۔ تا ایں کہ جب لوگ آئے تب آپ نے لوگوں سے کہا کہ اسے مار ڈالو۔

۲۴۔ بندرگاہ ہونے کی وجہ سے غیر ممالک کے لوگ بصرہ بکثرت آتے تھے اور اپنے ساتھ اپنے عقائد و خیالات لاتے تھے۔ ہندوستان سے اس بندرگاہ کا تعلق جس حد تک تھا اس کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ بصرہ کے آباد ہونے سے پہلے اس علاقہ کو ارض الہند (ہندوستان کی زمین) ہی کہتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی عہد میں اپنے خیالات وعقائد کے اظہار کی آزادی ہر شخص کو حاصل تھی جس کی وجہ سے عوام میں طرح طرح کے اوہام و وسواس پھیل جاتے تھے۔ ابو الہذیل العلاف کے تذکرہ میں الخطیب نے لکھا ہے کہ بصرے میں ایک یہودی آیا و کان ینقض الاسلام (یعنی اسلامی اصول پر اعتراض کرتا تھا) ابو الہذیل اس کے مقابلہ پر اسلام کی طرف سے کھڑا ہوا۔ مناظرے میں جب یہودی غالب نہ آسکا تو اس نے ابو الہذیل کو گالیاں دینی شروع کیں۔ مطلب اس کا یہ تھا کہ مسلمان اس کی اس حرکت پر مغلوب الغضب ہو کر چڑھ دوڑیں اور مجھے اس کا حیلہ مل جائے کہ دلائل کے لحاظ سے میں ہی غالب تھا، لیکن مسلمانوں نے جسمانی قوت سے کام لے کر مجھے مغلوب کر دیا، لیکن ابو الہذیل نے مسلمانوں کو شدت سے روکا اور کہا کہ کسی نے اس پر اگر حملہ کیا تو اس کی مراد پوری ہوگی۔ اس پر یہودی کھسیانا سا ہو کر رہ گیا۔ (دیکھو الخطیب، ص ۳۶۶ ج ۳) اگرچہ یہ ایک جزئی واقعہ ہے لیکن اس سے اس زمانہ کی مذہبی آزادی کا اور بصرے کے ماحول کا پتہ چلتا ہے۔

۲۵۔ خدا جانے خالد نے خود ہی شعر بنائے تھے یا واقعی کسی مسخرے شاعر کو جیسے بیسیوں بے بنیاد باتیں سوجھتی ہیں ان ہی میں ایک خیال یہ بھی آگیا اور شعر کی صورت اس نے اختیار کر لی۔

لیتنی فی المؤذنین حیاتی

انهم یبصرون من فی السطوح

فیشیرون اور تشیر الیهم

بالهوى كل ذل ملیح

یعنی کاش مؤذنوں کے ساتھ میری بھی زندگی گذرتی۔ یہ لوگ چھتوں پر رہنے والیوں کو دیکھتے ہیں پھر خود یہ موذن اشارے کرتے ہیں۔ یا ہر ناز و غمزے والی ملیح عورت محبت کا پیغام مؤذنوں کو دیتی ہے۔ کامل ابن اثیر۔ (ص ۱۰۳ ج ۵) (کہتے ہیں، مناروں کے انہدام کی وجہ ان ہی اشعار کو اس نے قرار دیا تھا۔

۲۶۔ یہ ایک واقعہ کی طرف اشارہ تھا یعنی ہشام کی ماں جس کا نام عائشہ تھا اور ہشام بن اسماعیل بن ہشام بن الولید بن المغیرۃ المخزومی کی بیٹی تھی، یعنی ابوجہل کے بھائی کے خاندان کی لڑکی تھی۔ لکھا ہے کہ حد سے زیادہ یہ عورت احمق تھی۔ اس لیے تنگ آکر آخر میں ہشام کے باپ عبدالملک نے اس کو طلاق بھی دے دی تھی۔ لوگ اسی وجہ سے ہشام کے پس پشت عموماً اسے ابن الحمقیٰ ہی کہا کرتے تھے اور خالد بھی اسی لفظ کو استعمال کرتا تھا۔ بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع شروع میں یہ خطاب اپنے آقا کو اسی نمک حلال نوکر ابن النصرانیہ نے دیا تھا۔ بعد کو دوسرے بھی کہنے لگے۔

۲۷۔ عراق جسے السواد بھی اسلامی تاریخ میں کہتے ہیں، جب فتح ہوا اور فتح کرنے والی فوج میں زیادہ تعداد بجیلہ قبیلہ والوں کی تھی یعنی وہی قبیلہ جس کی طرف مشہور صحابی حضرت جریر بن عبداللہ البجلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ منسوب ہیں۔ ابتدا میں فتوحات کے متعلق جب تک یہ بات طے نہیں ہوئی تھی کہ اس کو فتح کرنے والی فوج میں تقسیم کر دیا جائے یا مسلمانوں کے بیت المال کے نام ان کو روک لیا

Marfat.com

جائے اس لیے کچھ دن کے لیے سواد کے ربع چوتھائی علاقے پر بجیلہ والوں کا قبضہ تھا لیکن جب صحابہ کے مشورہ سے تمام مفتوحہ زمینوں کو حکومت کے قبضہ میں داخل کر کے تمام مسلمانوں کی مشترکہ جائداد کی حیثیت ان کو دے دی گئی تو بجیلہ والوں سے بھی یہ زمین واپس لے لی گئی۔ اسی کی طرف اشارہ خالد کر رہا تھا۔

۲۸۔ اسد کے متعلق لوگوں نے لکھا ہے کہ ایک حد تک وہ دیندار آدمی تھا۔ سب سے بڑی صفت اس کی سخاوت تھی۔ ابنِ عساکر نے لکھا ہے کہ دہقان ہرات کے ان سارے تحفوں کو مجلس سے اٹھنے سے پہلے اسد نے بانٹ دیا۔ آدمی بڑا بہادر تھا۔ کافر ترکوں اور ان کے خاقان کی بڑی بڑی فوجوں کو اس نے شکست دی۔ آخر میں ہرات ہی میں ایک سرطانی زخم سے جو اس کے پیٹ میں تھا، بلخ ہی میں مر گیا اور اسی کے بعد خالد پر بھی آفت آئی۔ پندرہ سال کا سارا خواب ختم ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ یہی خالد جیسا کہ آئندہ آ رہا ہے معزول ہونے کے بعد شکنجے میں کسا گیا۔ پہلے پاؤں میں شکنجہ کیا گیا اور ہڈیاں تڑاتڑ ٹوٹ گئیں۔ یوں ہی آہستہ آہستہ شکنجے کو اوپر سرکاتے جاتے اور اس کی ہڈیاں توڑی جاتیں تا آنکہ دم نکل گیا، لیکن بڑا سخت جان تھا۔ منہ سے اُف بھی نہ نکالی۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

۲۹۔ الیافعی نے اسی سلسلہ میں الزمخشری کے حوالہ سے یہ عبارت نقل کی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ایران کے قیدی جب مدینہ لائے گئے تو یہ معلوم کر کے کہ ان قیدیوں میں شاہی خاندان کی چند شاہزادیاں بھی ہیں، حضرت علی نے حضرت عمر کو یہ مشورہ دیا کہ شاہی خاندان کی شاہزادیوں کے ساتھ عوام کا معاملہ کرنا درست نہ ہوگا۔ آخر حضرت علی نے ان تینوں شاہزادیوں کو بیت المال میں قیمت ادا کر کے لے لیا اور آپ ہی نے ان میں سے ایک کو حضرت عمر کے صاحبزادے عبداللہ اور دوسری کو حضرت ابو بکر کے صاحبزادے محمد اور تیسری کو امام حسین علیہ السلام کو عطا فرما دیا۔ امام زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان ہی شاہزادی کے بطن سے پیدا ہوئے۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر کے گھر میں جو شاہزادی داخل ہوئیں ان سے سالم اور محمد بن ابی بکر والی شاہزادی سے قاسم بن محمد پیدا ہوئے۔ تینوں اپنے وقت کے امام تھے۔ علم و فضل، تقویٰ و طہارت، ریاضت و مجاہدہ میں ان تینوں کے برابر مشکل ہی سے کوئی آدمی مدینہ منورہ میں اس زمانہ میں تھا۔ لکھا ہے کہ ان تینوں صاحبزادوں کو دیکھ کر عربوں کا یہ خیال بدل گیا کہ عجمی عورتوں سے بچے نہ پیدا کرانا چاہیے، لیکن ان کو دیکھ کر کثرت سے لوگ عجمی خواتین کو اپنے بچوں کی مائیں بنانے لگے۔ دیکھو الیافعی۔ ص ۱۹۱ ج ا۔

۳۰۔ دراصل ایک زمین کے قصے میں دونوں میں کچھ جھگڑا ہوا تھا۔ عبداللہ بن حسن نے اس موقعہ پر یہ کہتے ہوئے کہ اس زمین پر تم کیسے قبضہ رکھ سکتے ہو حالانکہ تم تو ایک ہندوستانی عورت کے بطن سے ہو، بعض روایتوں میں ہے کہ عبداللہ نے کہا کہ **اقطمع ان تنالها و انت لامة سندية** (کیا تم اس زمین کی خواہش کرتے ہو حالانکہ تم ایک سندھی عورت کے بطن سے ہو۔ ص ۲۶۲ ج ۸، طبری) بہر حال اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً آپ کی والدہ سندھ کی تھیں۔ ہند کا لفظ چونکہ سندھ کو بھی شامل تھا اس لئے کبھی سندیہ اور کبھی ان کی والدہ کو ہندیہ کہہ دیا ہو۔ واللہ عالم بالصواب۔ اتنا یقینی ہے کہ وہ ہند بمعنی الاعم کی ضرور تھیں۔ اب خواہ سندھ کی ہوں یا ہندوستان کے کسی دوسرے مقام کی۔ زیادہ قرینہ سندھ ہی سے ہونے کا ہے۔ طبری نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس عار دلانے پر بجائے خفا ہونے کے **تضاحک زید** (حضرت زید ہنس پڑے) اور ایک فقرہ استعمال کیا یعنی اپنی ہندوستانی ماں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ **فواللہ لقد عبرت بعد وفات سیدها فما تعبت بالها اذا لم یصبر غیر ها** جس کا حاصل یہ ہے کہ میری ماں نے اپنی شوہر کے انتقال کے بعد صبر کیا اور کسی دوسرے آدمی سے شادی نہیں کی حالانکہ اس کے مقابلہ میں دوسری عورت نے تو صبر سے کام نہیں لیا۔ کہتے ہیں کہ یہ اشارہ عبداللہ بن حسن کی والدہ کی طرف تھا۔ بعد کو زید اپنے اس قول سے پشیمان بھی ہوئے کہ میں نے ایسا کیوں کہا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زید کی والدہ نے ہندوستانی دستور عقد بیوگاں کے مسئلہ میں جو تھا اس کو عرب میں بھی نباہا۔ دیکھو طبری ص ۲۶۳ ج ۸ مطبوعہ مصر۔ بہر حال اگر یہ صحیح ہے کہ حضرت زید شہید کی نانہال ہندوستان تھی تو اس ملک میں جو آج کل زیدی سادات آباد ہیں وہ بھی اس کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ واقعہ بھی کچھ عجیب ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ مختلف قرون و ادوار میں سادات کی مختلف شاخیں ہندوستان میں آ کر آباد ہوئیں، لیکن جو امتیاز اس ملک میں زیدی سادات نے

Marfat.com

حاصل کیا مشکل ہی سے دوسری شاخوں میں اس کی نظیر مل سکتی ہے۔ بارسر کے سادات بلگرام کے سادات کا ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں جو حصہ ہے اس سے کون ناواقف ہے، جاننے والے جانتے ہیں کہ زیدی سادات ہی سے دونوں کا تعلق تھا۔ انگریزی عہد میں بھی سر سید علی امام، سید حسن امام وغیرہ نے جو اقتدار حاصل کیا اس کا کون انکار کر سکتا ہے۔ ان لوگوں کا تعلق بھی زیدی سادات ہی سے تھا۔

بہار میں ایک ممتاز گاؤں زیدی سادات کا آباد ہے جنہیں جاجیری سادات کہتے ہیں۔ زندگی کے ہر شعبہ میں ان کو نمایاں دیکھا جاتا ہے۔ کیا اس میں ہندوستان کے ساتھ اس کے اس نسلی تعلق کو بھی دخل ہے؟ واللہ اعلم بالصواب۔

۳۱۔ بجائے غفور الرحیم کے اللہ تعالیٰ کی صفت، عزت وغلبہ اور حکمت و دانائی کا حوالہ اپنی اس سفارشی دعا میں حضرت مسیح علیہ السلام نے کیوں دیا ہے، بڑا دلچسپ سوال ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ گناہ پر سزا دینے کا قانون اللہ تعالیٰ ہی کا بنایا ہوا ہے۔ اپنے قانون کو وہ اگر اٹھالیں تو ان سے بڑا کون ہے جو پوچھے گا۔ اور حکیم کے لفظ سے اشارہ اس سے بھی زیادہ گہری حقیقت کی طرف کیا گیا ہے۔

۳۲۔ ارجاء کا ایک مطلب تو وہ ہے جو قرآنی آیت لھا ما کسبت و علیھا ما اکتسبت (یعنی ہر شخص کو اپنے اچھے کیے ہوئے کام کا نفع ملتا ہے اور بُرے کام کا وبال بھی بھگتنا پڑتا ہے) سے صراحۃً متصادم ہے عمل کا کوئی اثر ہی ان کے نزدیک نہیں ہے لیکن ایک ارجاء معتزلہ وخوارج کے مقابلہ میں اہل سنت کا تھا کہ گنہ گاروں کو چاہے خدا عذاب دے چاہے بخش دے، پھر اپنے گناہوں کی سزا پانے کے بعد بالآخر مومن کے لیے نجات ہے۔ اہل سنت کا یہ متفقہ عقیدہ ہے۔ ارباب اعتزال اس کو بھی ارجاء کہہ دیتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک گناہ کبیرہ کے ارتکاب کے بعد آدمی مسلمان باقی نہیں رہتا، نجات سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتا ہے اور خوارج کبیرہ ہی نہیں صغیرہ گناہوں کے مرتکب کا یہی انجام قرار دیتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کی طرف بعضوں نے ارجا کو جو منسوب کیا ہے، ثانی الذکر اہل سنت والا ارجاء ہو سکتا ہے بشرطیکہ انتساب صحیح ہو۔

۳۳۔ حضرت امام زین العابدین کی عبادت ومجاہدے کے حالات کتابوں میں پڑھیے۔ الیافعی نے بھی اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے کہ گھر میں حضرت کے آگ لگ گئی۔ آپ سجدے میں تھے۔ لوگ چلا رہے تھے، لیکن آپ نے سجدے سے سر نہ اُٹھایا۔ جب پوچھا گیا تو فرمایا جو آگ آنے والی ہے اس کی یاد نے اس آگ کی طرف متوجہ ہونے نہ دیا۔ فرزدق کا مشہور قصیدہ کتابوں میں حضرت کی شان میں جو لکھا گیا ہے نقل کیا جاتا ہے جس کا ایک شعر ہے۔

هـذا ابـن خير عبـادالـلـه كـلـهـم هـد التـقـی الـنـقـی الـطـاهـرا العلم

هـنذا الـذی تـعـرف البطحاء وطانة والبيـت بـعـرفـه والـحـل والـحـرام

لیکن ہمارے محدثین اہل السنّت کو اس شخص پر جس نے حضرت زید کے اجتہادات وسائل کو جمع کر کے دنیا میں پیش کیا، اعتماد نہیں ہے۔ اس شخص کا نام ابوخالد عمرو بن خالد الوسطی تھا۔ اسماء الرجال کی کتابوں میں اس شخص پر جرح کی گئی ہے۔ سب سے بڑا الزام اس پر یہ ہے کہ عطاروں کی دکان سے ردی کے کاغذ خرید لیتا اور جو حدیثیں ان کاغذوں مین ملتیں ان کو اپنی طرف منسوب کر کے روایت کرتا تھا۔ تفصیل کے لیے "میزان" ذہبی اور "لسان المیزان" ابن حجر وغیرہ دیکھئے۔

۳۴۔ بصرہ کا نور باف (غزال) تھا۔ عقلیت کا عارضہ جس فرقہ سے اسلام میں شروع ہوا یعنی معتزلہ کے قدیم سربرآوردہ لوگوں میں سمجھا جاتا ہے، گناہ کبیرہ کا ارتکاب مسلمان کو مسلمان باقی نہیں رکھتا لیکن وہ کافر بھی نہیں ہوتا۔ یہ درمیانی منزل اسی کی تراشی ہوئی ہے۔ جمل کے دونوں فریق میں سے ایک کو برسر غلطی سمجھتا تھا، لیکن کون غلطی پر تھا اس کو متعین کرنے سے پرہیز کرتا تھا۔ حضرت عائشہ حضرت طلحہ حضرت زبیر صحابیوں کے متعلق بدبخت کہتا تھا کہ ایک دستہ بھی تھا۔ پر شہادت بھی ان لوگوں کی قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ لطیفہ یہ تھا کہ را کا حرف اس کی زبان سے ادا نہیں ہوتا تھا لیکن الفاظ کا اتنا بڑا عظیم سرمایہ اس کے پاس تھا کہ ساری عمر لمبے لمبے خطبے دیتا رہا۔ سب میں ایسے الفاظ استعمال کرتا تھا جن میں ر نہیں ہوتی تھی مثلاً بر (گیہوں) کو قمح، مطر بارش کو غیث کہتا۔ واصل خواجہ حسن بصری کے حلقہ میں بھی بیٹھا تھا۔ اگر خدا کی توفیق رفیق ہوئی تو کسی مستقل کتاب میں اس قصے کی تفصیل کی جائے گی۔ اتنی

Marfat.com

بات اس وقت بھی لوگوں کے گوش گذار کر دیتا ہوں کہ سب سے پہلا فرقہ اسلام میں قدریوں کا پیدا ہوا۔ صحیح مسلم وغیرہ سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ معبد بن خالد جہنی نے اس مسئلہ کو چھیڑ کر فرقہ بندی کی ابتدا کی، مقریزی نے لکھا ہے کہ معبد نے اساورہ کے ایک آدمی جس نے اپنی کنیت ابو یونس رکھ لی تھی، اس مسئلہ کو اخذ کیا تھا۔ اسی لیے ابو یونس الاسواری کہلاتا تھا۔ اساورہ کون تھے ان کے تفصیلی حالات البلاذری وغیرہ میں ملیں گے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایران کے شاہی باڈی گارڈ یا شاہی جیش کا نام اساورہ تھا۔ ایرانی حکومت کی شکست کے بعد اس پوری ایرانی فوج نے حضرت سعد فاتح ایران سے خواہش کی کہ مسلمانوں کو جو رعائتیں حاصل ہیں اگر ہمیں عطا ہوں تو ہم مسلمان ہو کر اسلامی آبادیوں میں آباد ہو جاتے ہیں۔ ان کی شرط منظور کر لی گئی اور بصرہ پھر کوفہ وغیرہ میں یہ آباد ہوئے۔ بلاذری نے تفصیل کے ساتھ ان کے حالات لکھے ہیں۔ اسلام سیاسی منافع کے لیے انہوں نے قبول کیا تھا۔

۳۵۔ اشارہ ان لوگوں کی طرف تھا جو خداوند تعالیٰ کے لیے آدمی کی طرح آنکھ کان ہاتھ وغیرہ ثابت کرتے بلکہ بعض ان میں کہتے کہ بجز داڑھی اور شرم گاہ کے خدا میں وہ سارے اجزا پائے جاتے ہیں جو آدمی کے جسد میں ہیں۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ عرش کی جسامت اللہ میاں کی جسامت سے چار انگل زیادہ ہے کیونکہ عرش کی صفت قرآن میں عظیم آئی ہے۔ کم از کم چار انگل تو اس تخت کو بڑا ہونا چاہیے جس پر خدا بیٹھا ہے۔ (العیاذ باللہ)

۳۶۔ منصور ابن المعتمر اور سلمہ بن کہیل کا مقام کوفہ میں کیا تھا۔ اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ عبدالرحمن بن مہدی مشہور ناقد و محدث کا قول تھا، لم یکن بالکوفة اثبت من اربعة منصور و عمرو بن معره و سامه و ابو حصنین (تہذیب) یعنی منصور اور سلمہ عمرو بن مرہ اور ابو حصین سے حدیث میں استوار ترین محدث کوئی دوسرا کوفہ میں نہ تھا۔

۳۷۔ میں نے مخلص کا لفظ اس لیے لکھا ہے ان ہی کوفہ والوں میں ایک اور گروہ بھی تھا جو اہل بیت کے محبت کے دعوے میں سب سے آگے تھا۔ حضرت کے ارادے سے مطلع ہونے کے بعد ان کی خدمت میں حاضر ہو کر دریافت کیا کہ آپ کس چیز کی دعوت دیتے ہیں۔ جواب میں فرمایا ''اللہ کی کتاب کی طرف اور اللہ کے رسول کی سنت کو زندہ کیا جائے اس کی طرف تم لوگوں کو بلاتا ہوں اور یہ کہ دین میں جو نئی باتیں پیدا ہو گئی ہیں ان کا ازالہ کیا جائے۔ اگر میری بات سنتے ہو تو سعادت حاصل کرو گے اور انکار کرتے ہو تو میں تم پر داروغہ مقرر نہیں کیا گیا ہوں،'' کہتے ہیں کہ اس پر ان لوگوں نے سوال اٹھایا کہ ''ابو بکر و عمر کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟'' جواب میں ارشاد فرمایا کہ ''اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کی صحبت و رفاقت میں ان حضرات نے زندگی گذاری اور صحبت و رفاقت کا حق ادا کر دیا۔ دونوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ کوشش کی جتنی کوشش کی ممکن تھی اور میں نے اپنے گھر کے لوگوں میں کسی سے نہیں سنا کہ ان دونوں سے تبرا اور جدائی انہوں نے اختیار کی بلکہ جس کسی سے سنا ہمیشہ خیر اور بھلائی کے سوا کچھ نہ سنا،'' تب ان لوگوں نے کہا کہ پھر تم اپنے خاندان کے خون کا اور ظلم کا بدلہ لینا نہیں چاہتے۔ ابو بکر و عمر نے تمہارے خاندان کی حکومت پر قبضہ جما لیا اور دنیا کو تم لوگوں کی پیٹھ پر سوار کر دیا جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے کہ لوگ تم لوگوں کو قتل کر رہے ہیں مار رہے ہیں۔ حضرت زید نے تن کر فرمایا بلاشبہ ان لوگوں کے وہ حکم ہوئے اور ہم لوگوں کے بھی لیکن کتاب اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی سنت اور طریقے پر عمل کرنے میں ان لوگوں نے قطعاً کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی۔ تب ان لوگوں نے کہا کہ اگر ابو بکر و عمر نے تم لوگوں پر ظلم نہیں کیا تو پھر بنی امیہ بھی ظلم نہیں کر رہے ہیں اور جب واقعہ یہی ہے تو بنی امیہ سے مقابلہ کرنے کی دعوت ہم لوگوں کو کیوں دیتے ہو کیونکہ ایسی صورت میں تو وہ بھی ظالم نہیں ہیں کیونکہ بنی امیہ والے تو ابو بکر و عمر ہی کے طریقے کی پیروی کر رہے ہیں۔ اس پر حضرت زید نے فرمایا کہ بنی امیہ والے قطعاً ابو بکر و عمر جیسے نہیں ہیں، بنی امیہ والے تو تم پر بھی ظلم کر رہے ہیں اور خود اپنے آپ پر ظلم کر رہے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے گھرانے والوں پر ظلم کر رہے ہیں، یہی موقعہ تھا جس پر ان لوگوں نے مشہور لفظ استعمال کیا۔ یعنی بولے کہ ان برمت منهما والا رفضناک (یا تو ابو بکر و عمر سے بیزاری کا تم اعلان کرو ورنہ ہم تمہارا ساتھ چھوڑ دیں گے) یہ سننے کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ حضرت زید نے زور سے اللہ اکبر کی صدا بلند کرتے ہوئے فرمایا کہ میرے والد فرماتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی سے کہا تھا کہ ایک قوم ہوگی جو ہم لوگوں (اہل بیت) سے محبت

کرے گی، لیکن ان کا ایک لقب ہوگا، اسی سے وہ پہچانی جائے گی جاؤ تم لوگ ''الرافضۃ'' ہو (مقدمہ روض بحوالہ مقریزی وغیرہ) کہتے ہیں کہ یہی پہلا دن تھا جس دن سے ''رافضہ'' کا لفظ دنیا میں چل پڑا۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت زید سے ان لوگوں نے یہ بھی کہا کہ تم ہمارے امام نہیں ہو، انہوں نے پوچھا کہ پھر کون تمہارے امام ہیں۔ بولے کہ تمہارے چچازاد بھائی جعفر ہمارے امام ہیں۔ حضرت زید نے کہا کہ بے شک اگر جعفر اس کا دعویٰ کریں کہ وہی امام ہیں تو وہ سچ کہیں گے۔ خط لکھ کر ان لوگوں نے کہا کہ راستہ مدینہ منورہ کا آج کل بند ہے۔ کوئی قاصد چالیس اشرفی سے کم میں خط لے جانے پر آمادہ ہی نہیں ہوتا۔ حضرت نے چالیس اشرفیاں اسی وقت حوالہ کیں اور فرمایا، قاصد روانہ کرو، لیکن صبح کو آ کر ان لوگوں نے کہا کہ جعفر تمہاری خاطر کرتے ہیں۔ مدارات سے کام لیتے ہیں۔ اس پر زید نے فرمایا افسوس تم لوگوں پر کیا امام سخن سازی سے کام لیتا ہے یا حق کو چھپاتا ہے۔ اس پر وہ لوگ چلے گئے۔

۳۸۔ الاعمش اور شعبہ حدیث و رجال کے ائمہ میں ان کے حالات کی تفصیل موجب تطویل ہوگی۔ اہل علم سے ان کے حالات پوشیدہ نہیں ہیں۔

۳۹۔ سلمہ بن کہیل نے حضرت کو مقابلہ کے اسا وے سے روکنے کے لیے جو مکالمہ کیا تھا اسی کی طرف اشارہ ہے۔ لکھا ہے کہ سلمہ نے حضرت شہید سے پوچھا۔ آپ کے ہاتھ پر اس وقت تک کتنے آدمی بیعت کر چکے ہیں؟

شہید: چالیس ہزار۔

سلمہ: اور آپ کے دادا حسین کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں کی کتنی تعداد تھی؟

شہید: اسی ہزار۔

سلمہ: لیکن وقت پر حسینؑ کے ساتھ کتنے رہ گئے تھے۔

شہید: تین سو۔

سلمہ: خدا کا حوالہ دے کر عرض کرتا ہوں کہ آپ بہتر ہیں یا آپ سے زیادہ بہتر آپ کے دادا تھے؟

شہید: میرے دادا بہتر تھے۔

سلمہ: موجودہ دور کے لوگ زیادہ بہتر اور اچھے ہیں یا آپ کے دادا کے زمانے کے لوگ زیادہ اچھے تھے؟

شہید: دادا کے زمانہ کے لوگ زیادہ بہتر تھے۔

سلمہ: پھر جب آپ کے دادا کے ساتھ لوگوں نے وفاداری نہ کی تو کیسے خیال کرتے ہیں کہ یہ لوگ وفادار رہیں گے۔

اس کے جواب میں حضرت شہید نے جو بات کہی اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ باوجود سب کچھ جاننے کے وہ کچھ طے کیے ہوئے تھے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ آپ نے بیعت کا عذر کیا یعنی لوگوں سے بیعت لے کر میں بھی گویا معاہدہ کا پابند ہو چکا ہوں، اب تو بہر حال اس کو نباہنا پڑے گا۔ بعض روایتوں میں اسی سوال کے جواب میں ایک دلچسپ بات حضرت شہید سے یہ منقول ہے کہ میرے دادا حسین علیہ السلام نے یزید سے اس وقت مقابلہ کیا جب بنی امیہ آگے کی طرف بڑھ رہے تھے اور میں ان کے مقابلہ میں اس وقت اترا ہوں جب یہ گر رہے ہیں۔

۴۰۔ قصہ تو طویل ہے۔ تفصیل عام تاریخی کتابوں میں پڑھیے۔ حاصل یہ ہے کہ یوسف بن عمرو جو اس وقت کوفہ سے باہر حیرہ میں تھا، کوتوال شہر کے نام اس نے حکم بھیجا کہ لوگ صبح کی نماز میں جب مسجدوں میں داخل ہوں تو فوراً مسجدوں کے دروازے بند کر کے ان کا محاصرہ کر لیا جائے اور کسی کو مسجدوں سے نکلنے کا موقعہ نہ دیا جائے۔ اسی طرح ہر ہر محلہ کے دروازے بھی بند کر دیے جائیں۔ صبح کو حضرت زید اپنے ساتھیوں کے ساتھ جب معرکہ آرائی کے لیے نکلے تو اس تھوڑی تعداد کو دیکھ کر فرمایا کہ لوگ کہاں گئے؟ جواب دیا گیا کہ مسجدوں میں بند کر دیے ہیں۔

حضرت نے فرمایا قد جعلوها حسينية (لوگوں نے اس واقعہ کو بھی حسینی واقعہ بنا لیا) لیکن آپ نے ہمت نہیں ہاری۔ اتنے ہی

Marfat.com

آدمیوں کے ساتھ جنگ کرتے رہے۔ یہ سارے واقعات کامل، ابن اثیر، طبری وغیرہ سے ماخوذ ہیں۔

۴۱۔ یہ سارے وثائق طبری، کامل وغیرہ میں موجود ہیں۔

۴۲۔ حضرت امام کو اپنی والدہ کا کتنا خیال تھا اس کا ایک دلچسپ لطیفہ بھی کتابوں میں بیان کیا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ زرعہ نامی کوفہ میں ایک واعظ تھے۔ امام صاحب کی والدہ ان کے مواعظ میں معلوم ہوتا ہے کہ بہت شریک ہوتی تھیں اسی لیے "زرعہ" کی خاص معتقد تھیں۔ کسی مسئلہ میں ایک دفعہ ان کو پوچھنے کی ضرورت ہوئی۔ پہلے تو اپنے بیٹے ابوحنیفہ ہی سے پوچھا۔ امام صاحب نے جب مسئلہ کا جو جواب تھا بتا دیا، لیکن ان کو اطمینان نہیں ہوا اور بولیں زرعہ واعظ جب تک توثیق نہ کرے گا مجھے اطمینان نہ ہوگا۔ امام صاحب اپنی والدہ کو لے کر زرعہ واعظ کے پاس پہنچے۔ بیچارا حیران ہوا۔ امام نے کہا کہ یہ میری ماں ہیں۔ تمہاری معتقد ہیں۔ تم سے مسئلہ پوچھنے آئی ہیں۔ بیچارہ واعظ مسئلہ کیا جانے۔ اس نے کہا کہ بھلا میں کیا مسئلہ بتاؤں۔ آپ ہی بتائیے کہ کیا ہے۔ امام نے کہا کہ بھائی میں نے تو یہ جواب دیا تھا۔ زرعہ نے تب امام صاحب کی والدہ سے کہا جی ہاں مسئلہ وہی ہے جو آپ کے صاحبزادے نے بتایا۔ اس پر بڑی بی کو اطمینان ہوگیا اور گھر آگئیں۔ ص ۳۰ جلد ۲، موفق وغیرہ۔

۴۳۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اشخاص کے لیے جو حیثیت ایک دن کی ہوتی ہے حکومتوں کے لحاظ سے ایک سال کو ایک دن ہی کے مساوی سمجھنا چاہیے۔ اس اعتبار سے اگر دیکھئے تو حضرت شہید کی شہادت کے بعد کل سات سال کے اندر اندر بنی امیہ کی حکومت جس کا پایہ تخت دمشق تھا، ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہوگا۔ اس عرصہ میں ہشام ولید یزید، ابراہیم مروان پانچ بادشاہ یکے بعد دیگرے بنی امیہ کی گدی پر بیٹھے ہیں۔ بعض کو چند مہینے سے زیادہ حکومت کرنے کا موقعہ نہ ملا، گویا فی بادشاہ ایک سال کچھ مہینے کا اوسط پڑتا ہے۔ اور یہ سب کچھ جو ہوا، جہاں تک میرا خیال ہے اسی ابن الحمقاء ہشام بن عبدالملک کی حماقتوں کا نتیجہ تھا۔ ایک مدت سے اہل بیت کے لوگوں کو سلاطین بنی امیہ نے مدینہ منورہ میں گویا نظر بندوں کی حیثیت سے محصور رکھا تھا، لیکن محض ابن النصرانیہ خالد کے ایک بے بنیاد دعویٰ سے متاثر ہو کر تھوڑے سے روپیہ کے لیے شیر کو ہشام نے پنجرے سے باہر نکلنے کا خود ہی موقعہ دیا اور خود ہی اس کو اپنے جنگل میں پہنچا دیا۔ ابن النصرانیہ جانتا تھا کہ کوفہ پہنچنے کے بعد حضرت زید یوں ہی واپس نہیں چلے جائیں گے اور یہی ہوا۔ لیکن اس حمقاء کے لڑکے ہشام نے اسی پر بس نہیں کیا۔ کوفہ والوں کے عادتی عذر کی وجہ سے حضرت زید شہید ہوگئے۔ بنی امیہ کی شتر کینگی کا خیال کر کے لوگوں نے راتوں رات حضرت شہید کی لاش مبارک کو بہتے ہوئے پانی کے ایک راج باہے میں دفن کر کے اس پر آبی نباتات کے بیلیں چڑھا دیں، لیکن اپنے آقا ہشام کی خدمت میں محمد رسول اللہ ﷺ کے نواسہ کا سر تحفہ بھیجنے کے شوق میں یوسف گورنر کوفہ نے حضرت کی لاش کا بڑی جدوجہد کے بعد پتہ چلا لیا اور سر کاٹ کر دمشق بھیجا گیا۔ ابن الحمقاء نے ایک طرف دمشق کے دروازے پر اس سر کو لٹکانے کا حکم دیا اور واپسی ڈاک سے یوسف کو لکھا کہ کسی نمایاں مقام پر عریاں کر کے حضرت زید کی لاش لٹکا دی جائے۔ چودہ مہینے تک یہ لاش بمقام کناسہ کوفہ میں بحالت عریانی لٹکی رہی۔ اس عرصہ میں ہشام تو خیر مر گیا لیکن اس کے جانشین ولید کے عہد میں حضرت زید کے صاحبزادے بھی یحییٰ بن زید بلخ کے قریب جوزجان ضلع کے ایک گاؤں ارعونہ نامی میں شہید ہوئے اور جوزجان شہر میں ان کی لاش اسی طرح لٹکا دی گئی جیسے ان کے والد کی کوفہ میں لٹکی ہوئی تھی۔ گویا خراسان عراق شام تک مسلسل ایک تماشا کھڑا کیا گیا تھا۔ حکومت کی جباریت سے لوگ خواہ کچھ نہ بول سکتے ہوں لیکن نفسیاتی طور پر محمد رسول اللہ ﷺ کی امت پر اس دردناک دوامی منظر کا جو اثر پڑ سکتا تھا حکومت کے نشہ میں وہ بنی امیہ والوں کی سمجھ میں نہ آیا اور میرا خیال ہے کہ خراسان میں عباسیوں کے داعی ابو مسلم کو جو کامیابی ہوئی اس کامیابی میں بہت زیادہ دخل اسی عجیب وغریب تماشے کو تھا۔ اسی سے خراسانی مسلمانوں کے تاثر کا اندازہ کیجئے کہ جب عباسیوں کا اقتدار خراسان میں قائم ہوا تو پہلا کام یہی کیا گیا کہ جوزجان میں حضرت یحییٰ کی لاش سولی سے اتاری گئی۔ نماز جنازہ پڑھی گئی اور سات دن تک خراسان کے ہر ہر گاؤں میں ماتم منایا گیا۔ یہی نہیں بلکہ اکثر مؤرخین نے لکھا ہے کہ ولم یولد فی تلک السنة بخراسان مولود الا وسمی بیحیی او بزید (اس سال خراسان میں جہاں کہیں جو بچے بھی پیدا ہوئے ان کا نام یحییٰ یا زید رکھا گیا۔ المسعودی، ص ۱۵۴) چودہ ماہ

Marfat.com

بعد حضرت زید کی ننگی لاش کو اتروا کر ولید نے جلا کر دریا برد کرنے کا حکم دیا تھا۔ اسی کے انتقام میں اقتدار حاصل کرنے کے بعد عباسیوں کے ولاۃ وحکام نے تلاش کر کے بنی امیہ کے تمام حکمرانوں کی لاشیں (باستثنا عمر بن عبدالعزیز) قبر سے نکال کر جلائیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ صرف ہشام کی لاش چھ سات سال کے بعد بالکل صحیح وسالم حالت میں نکلی اور کچھ توجیہ اس کی نہ ہو سکی کہ ایک سیاہ دھاری طولاً اس کی قبر میں پائی گئی۔ یوسف بن عمر کا انجام یہ ہوا کہ اس کی داڑھی نوچی گئی اور تڑپا تڑپا کر مارا گیا۔ اس کے جسم کا ایک حصہ دمشق کے مختلف مقامات میں لٹکایا گیا۔ بنی امیہ کے اسی شہزادوں کو باندھ کر ان پر فرش بچھا کر لوگوں نے کھانا کھایا اور پھر ایک ایک کی گردن مار مار کر گھوروں پر ان کی لاش پھینک دی گئی۔ آخری حکمران بنی امیہ مروان مصر میں جب مارا گیا اور اس کی گھر کی عورتوں نے جو شور وبکا کیا ہے تاریخ میں یہ مقامات پڑھے نہیں جاتے۔ ایک دلچسپ لطیفہ اس سلسلہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ مروان کو جب اپنی موت کا یقین ہو گیا تو آنحضرت ﷺ کے چند تبرکات (رداء مبارک اور عصا مبارک وغیرہ) کو اس نے بالو میں گاڑ دیا تھا تا کہ عباسیوں کو رسول اللہ ﷺ کی یہ میراث ہاتھ نہ لگ سکے، لیکن اس کے ایک غلام نے بعد کو بتا دیا۔ بہر حال میرا خیال یہی ہے کہ یوں تو تقدیر میں جو لکھا تھا وہ پورا ہوا، لیکن عالم اسباب میں اسی ابن الحمقاء ہشام بن عبدالملک کی مرض اور حماقت کی شکار امویوں کی دولت قاہرہ ہوئی۔ ہشام کی لاش کے ساتھ عباسیوں نے تو کئی سال بعد وہ ناگفتہ بہ حرکتیں کیں، لیکن اس کے مرنے کے ساتھ ہی خود اس کے بھائی بندوں نے جو کچھ کیا، وہ کیا کم حیرت انگیز ہے۔ افاقۃ الموت کے طور پر مرنے سے کچھ پہلے ہوش آیا۔ ہشام نے کوئی چیز مانگی لیکن ولید کے نمائندے آچکے تھے جو اس کے بعد خلیفہ ہوا تھا۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ اس پر یہ آخری الفاظ انا للہ کنا خز اناً للولید (انا للہ کہا ہم صرف ولید کے خزانچی تھے) کہتے ہوئے مر گیا۔ لکھا ہے کہ لکڑی کا برادہ غسل کے پانی گرم کرنے کے لیے مانگا گیا۔ نہ ملا، کفن کے لیے کپڑے بھی اس کے غلام غالب نے دیئے اور انیس سال نو مہینے تک جو صرف مال جمع کرنے کی دھن میں مشغول رہا تھا، انجام آخری اس کا یہی ہوا۔ اس سلسلہ میں ایک بات تاریخ کی عجیب ہے کہ حضرت زید کے صاحبزادے یحییٰ اور ان کے بعد ابراہیم جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ تینوں حضرات کی وفات اچانک تیر کے لگنے سے ہوئی۔ حضرت زید کی پیشانی میں، حضرت یحییٰ کی کنپٹی میں، حضرت ابراہیم کی پیشانی میں تیر اچانک آ کر لگے۔ اس سے سب کی وفات ہوئی ورنہ ہزاروں ہزار کی فوج بھی ان حضرات کے قریب آنے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی۔ اگر بے سان وگمان یہ تیر ان حضرات کو نہ لگتے تو ان پر قابو پانا بلکہ شکست دینا آسان نہ تھا۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ خدا کی مشیت بھی یہ تھی کہ ظاہری ناپاک سیاست والی حکومت خاندانِ نبوت کے لوگوں کو نہ مل سکی۔

۴۴۔ میں نے اس سلسلہ میں جستہ جستہ طور پر مختلف مقامات میں اس مسئلہ کا ذکر کیا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ بجائے خود اسلام کے سیاسی شعبہ کا یہ بڑا اہم مسئلہ ہے۔ محض اشاروں اور کنایوں سے اس کی تفصیلات سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ خدا کرے کہ اسلامی سیاسیات پر ایک مستقل کتاب لکھنے کا جو ارادہ کر رہا ہوں، اس ارادے کی تکمیل کا موقعہ اگر دیا گیا تو اس پر تفصیل سے گفتگو ہو سکتی ہے۔ یہاں پر مجملاً اتنا اور کہہ دیتا ہوں، ابن حزم نے ''کتاب ملل والنحل'' میں لکھا ہے کہ اس پر متفق ہو جانے کے بعد کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض ہے آگے اس مسئلہ میں کہ فرض کی نوعیت کیا ہے۔ اہل سنت میں امام احمد بن حنبل کا مذہب یہ ہے کہ دل سے برا جاننا اس حد تک فرض ہے اور زبان سے بھی قدرت ہو لیکن حکومت کے مقابلہ میں خواہ ظالم ہی کیوں نہ ہو، ہاتھ اٹھانا یا تلوار کھینچ لینا جائز نہیں ہے۔ ابن حزم کا بیان ہے کہ بالاتفاق شیعوں کا بھی یہی مذہب ہے یعنی جب تک امام مہدی جن کے وہ منتظر ہیں، نہ نکل لیں تلوار اٹھانا ان کے ہاں ممنوع ہے خواہ دنیا کے تمام شیعہ قتل ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ ابن حزم نے لکھا ہے کہ دوسرا طبقہ جس میں اہل السنۃ کا بھی ایک گروہ شریک ہے اور تمام معتزلہ اور خارجی فرقہ کے لوگ نیز زیدیہ سب کا یہی مذہب ہے کہ جب ظلم اور ستم و جور کے ازالہ کی شکل تلوار نکالنے کے سوا اور کچھ باقی نہ رہے تو اس وقت تلوار کھینچ لینا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے فرض ہو جاتا ہے بشرطیکہ باطل کے مقابلہ میں کامیابی کا غالب گمان ہو، لیکن ضعف کی وجہ سے کامیابی سے اگر مایوسی ہو تو اس وقت فرضیت تلوار نکالنے کی ساقط ہو جاتی ہے۔ ابن حزم کا بیان ہے کہ امام ابوحنیفہ، مالک، شافعی، داؤد ظاہری سب کا یہی مذہب ہے۔ پھر

Marfat.com

دونوں فرقوں کے دلائل کا تفصیلی ذکر کر کے آخری مسلک کو ابن حزم نے ترجیح دی ہے۔ الجصاص نے بھی لکھا ہے کہ جس کا میں نے شاید پہلے بھی کہیں تذکرہ کیا ہے۔ ان کے بیانات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ محدثین کی ایک جماعت حکومت کے مقابلہ میں تلوار اٹھانے کی کسی حال میں اجازت نہیں دیتی تھی، خواہ وہ کچھ بھی کر رہی ہو۔ بلکہ ہاتھ یا زبان سے امر بالمعروف نہی عن المنکر کا حکم صرف عوام سے متعلق ہے۔ بظاہر امام اوزاعی بھی ان ہی لوگوں میں معلوم ہوتے ہیں اور اہل السنۃ میں فقہی طور پر اس مسئلہ کو منقح امام ابوحنیفہ نے شروع شروع میں کیا۔ اسی لیے ان پر محدثین کی طرف سے اظہار تعجب بھی کیا گیا اور لعن طعن بھی، لیکن بقول الجصاص کہ ان ہی کمزوریوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ فساق و فجار کے ہاتھوں میں حکومت چلی گئی اور پھر کفار نے حکومت چھین لی۔ مسلمانوں کی سرحدیں کمزور ہو گئیں۔ خربت البلاد و ذهب الدين والدنيا وظهرت الزندقة والغلو مذاهب الثنوية الخزمية المزدكيه (ص ۳۴۷ ج ۲، احکام) (یعنی مسلمانوں کی آبادیاں کھنڈر بن گئیں کہ دین بھی رخصت ہو گیا اور دنیا بھی ختم ہو گئی......زندقہ الحاد بے دینی، خیالات میں انتہا پسندی نیز مجوسیوں کے عقائد رکھنے والے بابک خرمی کے ماننے والے مزدک مشہور اشتراکی کے ہم نوا دنیا پر چھا گئے۔

۴۵۔ اور یہ مسئلہ بہ ظاہر کسی نیک نیتی پر مبنی نہ تھا بلکہ جہاں تک میرا خیال ہے محدثین بیچارے جو یہ روایت بیان کرتے تھے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ ارشاد فرمایا تھا کہ تمہارے بہترین حکمراں وہ لوگ ہوں گے جو تمہارے بھی محبوب ہوں اور تم بھی ان کی نگاہوں میں محبوب رہو گے۔ تم ان سے محبت کرو گے اور وہ تم سے محبت کریں گے اور بدترین حکمراں تمہارے وہ ہوں گے جن سے تم کو بغض ہو گا وہ تم سے بغض رکھیں گے۔ تم ان پر لعنت کرو گے اور وہ تم پر لعنت کریں گے۔ صحابہ کہتے ہیں کہ ہم لوگوں نے دریافت کیا یا رسول اللہ ﷺ! کیا ایسے حکمرانوں کو ہم الگ نہ کر دیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں جب تک تم میں وہ نماز قائم کرتے رہیں نہیں جب تک وہ تم میں نماز قائم کرتے رہیں نہیں جب تک وہ تم میں نماز قیام کرتے رہیں۔ الغرض لا ما اقاموا فيكم الصلواة کے فقرہ کو تین بار دہرا دہرا کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ یہ روایت صحاح کی کتاب صحیح مسلم میں بھی پائی جاتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ نماز پر ان کا قبضہ اسی لئے تھا۔ واللہ اعلم الصواب۔

۴۶۔ دیکھو موفق کے مناقب۔ ص ۲۷۱ ج ۱

۴۷۔ یعنی ان سے پوچھا گیا کہ حضرت عثمان کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے تو بڑے لقلقہ سے تقریر کی۔ کہا کہ كان والله خيار الخيره امير البرره قتيل الفجر منصو والنصره مخذول الخذله اما خاذله فقد خذله الله اما قاتله فقد قتله الله۔ پوچھا گیا کہ حضرت علی اچھے تھے یا معاویہ تو بیچارے سے حق چھپایا نہ گیا۔ کہا کہ اچھے تو معاویہ سے علی ہی تھے۔ تب دریافت کیا گیا کہ خلافت کا حق دار دونوں میں کون زیادہ تھا۔ حکم نے جواب میں کہا کہ خدا نے جس کو خلیفہ بنا دیا اسی کو زیادہ حق دار سمجھنا چاہیے۔ اس سے بھی ان کی طبیعت کا رنگ معلوم ہوتا ہے یعنی ہر دو جانب کو خوش رکھتے ہوئے زندگی بسر کرنا چاہتے تھے، اسی لیے دونوں سے ان کے تعلقات تھے۔

☆......☆......☆

Marfat.com

ضمیمہ

صابئین......ایک عمومی جائزہ

محمد اکرام چغتائی

[مولانا مناظر احسن گیلانی نے اس موضوع پر ایک مختصر مضمون بعنوان ''صابئین اور بودھ مت'' لکھا (مطبوعہ در: صدق (لکھنؤ)، ۷ مارچ ۱۹۴۷ء) جس میں انہوں نے زیادہ تر البیرونی کی ''آثار الباقیہ'' کی معلومات سے استفادہ کیا۔ مولانا کا جو تفصیلی مقالہ زیرِ نظر مجموعہ میں شامل ہے، اس کے بعد اسی موضوع پر مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور قاری محمد عادل خان نے تفصیلی مقالات سپردِ قلم کیے (رک: فکر و نظر (علی گڑھ)، نومبر ۱۹۸۱ء، ص ۲۶۔۴۱، دسمبر ۱۹۸۱ء، ص ۸۔۳۶ و ایضاً، مارچ ۱۹۸۱ء، ص ۷۔۳۷) لیکن ان میں مولانا گیلانی کے مقالے کے استفہامیہ عنوان کو زیرِ بحث نہیں لایا گیا، البتہ بعض اصحاب نے مولانا سے اختلاف بھی کیا ہے مثلاً عبدالرحمٰن (کیا صابئین بدھ مت کے پیرو تھے، استدراک، در: معارف، جولائی ۱۹۵۳ء)، سید فضل اللہ (گوتم بدھ اور صابیون، در: معارف، اگست ۱۹۵۳ء) اور حبیب اصغر قدوائی (ملت صابئہ اور بدھ مت، در: معارف، جنوری ۱۹۵۴ء)۔ مولانا نے ان مضمون نگاروں کے دلائل کے رد میں بھی مضامین لکھے۔ (در معارف، ستمبر ۱۹۵۳ء و صدق جدید (لکھنؤ) ۶ نومبر ۱۹۵۳ء)

کچھ سال قبل معروف مؤرخ رشید الدین فضل اللہ کی ''تاریخ ہند'' کا عکسی ایڈیشن ''سنٹرل ایشین جرنل'' کے مدیر اور ویانا یونیورسٹی کے پروفیسر کارل یان (Karl Jahn) نے ویانا سے شائع کرایا تھا اور اس کا انگریزی ترجمہ جو انہوں نے خود کیا تھا، ہالینڈ سے بھی طبع ہوا۔ اس تاریخ میں مرقوم ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ نے خانۂ کعبہ کو بتوں سے پاک کیا، تو ان میں گوتم بدھ کے بت بھی موجود تھے۔ یہ حوالہ مولانا گیلانی کے اُٹھائے ہوئے سوال کے مثبت جواب کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

مفسرین، مؤرخین اور مستشرقین نے صابئین کے بارے میں جن مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے، اُن کے پیشِ نظر راقم کا درج ذیل مضمون ملاحظہ فرمائیے......مدیر]

....

قرآن مجید، کلام خداوندی، جو وحی کی صورت میں نبی آخر الزمان حضور اکرم ﷺ کی زبانِ اطہر سے ادا ہوا اور پھر قیامت تک امتِ مسلمہ کی ایمانیات کے لئے مصدرِ اول قرار پایا۔ یہ آخری الہامی صحیفۂ آسمانی اپنے نزول سے اب تک تمام علومِ اسلامیہ کا محور و مرکز رہا ہے اور مسلمانوں کی فکر و دانش کے سبھی دھارے کلی طور پر یہیں سے پھوٹے

Marfat.com

ہیں۔ یہ چشمہ رشد و ہدایت اس کائنات کے آخر تک یونہی رواں دواں رہے گا اور اپنے فیوض و برکات سے اہلِ ایمان کے قلوب و اذہان کو سیراب کرتا رہے گا۔

بغور دیکھا جائے تو نزولِ قرآن کے ساتھ ہی مطالعۂ قرآن کا بھی آغاز ہوتا ہے اور اس کا محرک وہ قرآنی آیات ثابت ہوئیں، جن میں تواتر کے ساتھ فکر و تدبر پر زور دیا گیا ہے۔ مطالب و مفاہیم قرآنی پر غور و خوض اور عمیق مطالعے کی روایت صدیوں پر محیط ہے۔ محدود ذہن انسانی نے اس بیکراں کلامِ ربانی کی تفہیم میں مقدور بھر کوششیں کیں اور اس کے لئے ہر دور کے علوم متداولہ سے بھی استفادہ کیا گیا، لیکن اس کے باوصف قرآنی الفاظ و آیات کے معانی کی مختلف پرتیں کھلتی چلی جاتی ہیں اور نت نئے حقائق و معارف کے منکشف ہونے سے عقلِ انسانی ورطۂ حیرت میں پڑ جاتی ہے۔ مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ ذہن انسانی ترقی کی منازل بہ سرعت ترقی کی منازل طے کرتا جا رہا ہے اور نتیجتاً جدید سے جدید ترین علوم مفیدہ متعارف ہوتے جا رہے ہیں۔ فکر و دانش کی اس ارتقاء پذیری سے کلام اللہ کی آفاقیت، حقانیت، افادیت اور ہدایت پر مہر تصدیق ثبت ہوتی جا رہی ہے اور متشابہات، محکمات کی صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ آیات قرآنی کی تفسیر اور تشریح و توضیح کا یہ عمل غیر مختتم ہے اور انسانی فہم و فراست کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کتاب اللہ کی تفہیم کے نئے سے نئے در وا ہوتے جائیں گے۔

مفسرین کی رائے میں مطالعہ قرآنی کا ایک رخ تاریخی نوعیت کا بھی ہے، جس کے تحت اشخاص، اماکن، اقوام و ملل، مذاہب وغیرہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ان موضوعات پر ہر انداز کے مطالعات بکثرت موجود ہیں اور ان کے استناد میں کسی کو شک و شبہ یا ابہام کی گنجائش نہیں رہی، لیکن ان میں ابھی بعض ایسے موضوعات ہیں جو قدیم و جدید مفسرینِ قرآن کی نظر میں قدرے مشکل قرار دیئے گئے ہیں۔ ان پر علوم قرآنیہ کے ماہرین، محققین اور مؤرخین نے بالتفصیل لکھا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ ان کے متعلق متفق الرائے نہیں اور ان کی تحریروں میں اشکال کا عنصر بھی غالب ہے۔ ایسے ہی کٹھن موضوعات میں ایک موضوع صابئین بھی ہے، جن کا ذکر قرآن میں معروف تین اہل کتاب گروپوں یعنی (یہود، نصاریٰ اور مجوس) کے ساتھ کیا گیا ہے۔ متعلقہ آیات کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے:

> ''بے شک جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابئین۔ جو ایمان لایا (ان میں سے) اللہ پر اور روز قیامت پر اور کام کئے نیک تو ان کے لئے ہے ان کا ثواب ان کے رب کے پاس اور نہیں۔ ان پر کچھ خوف اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔'' (۲ (البقرۃ): ۶۲)

> ''بے شک جو مسلمان ہیں اور جو یہودی ہیں اور فرقۂ صابی اور نصاریٰ جو کوئی ایمان لائے اللہ پر اور روزِ قیامت پر اور عمل کرے نیک نہ ان پر ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔'' (۵ (المائدۃ): ۶۹)

> ''جو لوگ مسلمان ہیں اور جو یہود ہیں اور صابئین اور نصاریٰ اور مجوس اور جو شرک کرتے، مقرر اللہ فیصلہ کرے گا ان میں قیامت کے دن، اللہ کے سامنے ہے ہر چیز۔'' (۲۲ (الحج): ۱۷)

ان مذکورہ بالا تینوں آیات میں قبل از اسلام کے جن چار مذاہب کے متبعین کا ذکر کیا گیا ہے، یعنی یہودی، نصاریٰ، مجوس اور صابئین ان میں اول الذکر تینوں مذاہب کی اصل، بنیادی عقائد اور آغاز اسلام میں ان کے ساتھ مختلف النوع روابط کی تفصیلات بآسانی دستیاب ہیں۔ ان کے عدم وجود اور معتقدات میں بھی کوئی اختلافِ رائے نہیں پایا جاتا۔ ان کے برعکس مؤخر الذکر گروہ یعنی صابئین کی اصل اور ان کے اعتقادات کے متعلق اب تک اس قدر مختلف اور ایک دوسرے سے قدرے متضاد و متصادم نظریات پیش کئے جا چکے ہیں کہ ابھی تک پورے وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ لوگ کون تھے، اگر دیگر اہل کتاب کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے تو وہ کونسی الہامی کتاب تھی جس کے احکام کی وہ پیروی کرتے تھے اور پھر وہ کون سے پیغمبر تھے، جن پر یہ کتاب نازل ہوئی۔ یہ اور اس نوعیت کے متعدد استفسارات جو تفصیلاً یا اجمالاً جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ نہ صرف مفسرین بلکہ معروف لغت نویسوں و تاریخ دانوں، جانی پہچانی کتبِ فِرق کے مؤلفوں اور تقابل ادیان کے متخصصین نے اپنے اپنے مخصوص زاویہ نظر سے صابیوں کی شناخت اور ان کے دینی عقائد پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ مزید برآں درج بالا تین آیات کے نفسِ مطلب میں بظاہر جو اشکال محسوس کیا جاتا ہے (یعنی سورۃ بقرہ کی آیت میں "پہلے چار طبقات مومن، یہودی، نصرانی اور صابی کا ذکر علی الترتیب" "اِنَّ" کے اسم کی حیثیت سے کیا گیا اور پھر بطور خبر یہ ارشاد فرمایا گیا کہ "ان چاروں طبقات کے لوگوں میں سے جو شخص بھی اللہ اور یوم آخر پر ایمان لے آئے گا اور عمل صالح کرے گا اس کے لئے اللہ کے پاس اس کا اجر ہوگا، اس کے لئے کوئی خوف نہیں ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوگا۔") اس کو محکم دلائل و براہین سے دور کیا گیا ہے (مولانا سعید احمد اکبر آبادی)۔ قرآن کی لاتعداد تفاسیر یا تراجم کے حواشی میں صابئین کا ذکر موجود ہے اور ان سب کا احاطہ کرنا ممکن بھی نہیں۔ پھر ان میں نقل در نقل اور تکرار کا عنصر نمایاں ہے، اس لئے سطور ذیل میں صرف انہی مفسرین کا بالاختصار حوالہ دیا گیا ہے، جنہوں نے اس طبقے کے متعلق مروجہ تصورات ہی پر بھروسہ نہیں کیا، بلکہ ان سے ہٹ کر اپنا نقطۂ نظر بھی بیان کیا ہے اور دورِ جدید تک کے بیشتر مفسرین نے انہی کی آراء سے استفادہ کیا ہے۔

ابو جعفر محمد بن جریر الطبری سورۃ البقرۃ کی متذکرہ صدر آیت کے ذیل میں صابئین کا تفصیلی ذکر کرتے ہیں (جامع البیان، قاہرہ ۱۳۷۴ھ، جلد دوم، ص ۱۴۵۔۱۴۷)۔ مجموعی طور پر ان کی فراہم کردہ معلومات اشتقاقی اور حوالہ جاتی نوعیت کی ہیں۔ اس لفظ کو صابی کی جمع بتایا گیا ہے اور ہر اس شخص کے لئے استعمال کیا جاتا تھا، جو اپنا دین چھوڑ کر کوئی اور دین اختیار کرلے (ص ۱۴۵)۔ اس گروہ کے بارے میں بعض "اہل تاویل" کی آراء بھی پیش کی گئی ہیں مثلاً مفسر مجاہد کے مطابق صابئون، یہود ہیں نہ نصاریٰ بلکہ بے دین لوگ ہیں۔ یہ یہود اور مجوس کے درمیان کا ایک طبقہ ہے۔ (بین المجوسی والیہودی)۔ ان کا ذبیحہ حرام ہے اور ان کی عورتوں سے نکاح بھی جائز نہیں (ص ۱۴۶)۔ ابن زید سے مروی ہے کہ جزیرۃ الموصل کے شمالی علاقہ میں ایسے لوگ آباد تھے جو کسی دین کے پیروکار تھے۔ اللہ پر ایمان رکھتے تھے۔ کسی پیغمبر یا الہامی کتاب کے منکر اور عمل سے بے نیاز تھے۔ کچھ مفسرین کی یہ رائے ہے کہ وہ پنجگانہ نماز ادا کرتے تھے (یصلون الخمسۃ) اور زبور کی تلاوت بھی کیا کرتے تھے (ص ۱۴۷)۔ ابو العالیہ کی رائے میں یہ لوگ اہل کتاب تھے۔ ابو جعفر الرازی اور سدی بھی ان کے ہم خیال ہیں۔

Marfat.com

ابو جعفر محمد بن الحسن الطّوسی بھی صابئون کو صابی کی جمع گردانتے ہیں اور اس کو مرتد کا مترادف قرار دیتے ہیں۔ (البیان فی تفسیر القرآن، مطبوعہ نجف، جلد اول، ص ۲۸۲۔۲۸۳)۔ متعدد احادیث اور طبری کی بیشتر آراء منقول ہیں لیکن ان میں یہ اضافہ کرتے ہیں کہ صابئون ''دینِ نوح'' کے ماننے والے تھے۔ ان کے عقائد نصاریٰ جیسے ہیں اور ان کا قبلہ اس جانب ہے جہاں سے دوپہر کے وقت شمالی رخ پر ہوا چلتی ہے (ص ۲۸۳)۔ یہ بھی مرقوم ہے کہ کفارِ مکہ حضور اکرم ﷺ کو بھی اسی نام سے موسوم کرتے تھے، کیونکہ ان کے خیال میں وہ آبائی دین سے منحرف ہوگئے تھے۔ بعض سابق مفسرین سے اختلاف کرتے ہوئے وہ صابئون کو اہل کتاب میں شامل نہیں کرتے۔

محمود بن عمر الزمخشری نے بھی صابئون کو اپنے مذہب سے منحرفین کا گروہ ثابت کیا ہے۔ یہ ایک ایسا طبقہ ہے جو یہودیت اور نصرانیت کو ترک کر دیتا ہے اور فرشتوں کی عبادت کرتا ہے۔ (الکشاف، مطبوعہ بیروت، جلد اول، ص ۱۴۶)

ابوالفتوح رازی نے بھی زیادہ تر اپنے پیشرو مفسرین کا اتباع کیا ہے۔ اشتقاقی مباحث میں بھی کوئی نیا پن نہیں۔ مختلف احادیث کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ صابئون کا اہل کتاب سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کے مذہبی رسوم و اعتقادات سے یہ نتیجہ برآمد کیا ہے کہ انہوں نے تقریباً ہر مذہب سے خوشہ چینی کی ہے۔ انہوں نے صابئون کے سر کے بال منڈوانے اور ختنہ کرانے کا بھی ذکر کیا ہے۔ (تفسیر روح الجنان، مطبوعہ تہران، جلد اول، ص ۲۱۰)

ابوالفرج ابن الجوزی نے سورہ بقرہ کی متعلقہ آیت کے تحت صابئون کا تفصیلی ذکر کیا ہے اور ان کی اصلیت کے حوالے سے چھ آراء پیش کی ہیں اور یہ سب ان سے پہلے کے مفسرین تحریر کر چکے ہیں۔ ان کی معلومات پر متذکرہ مفسر ابوالفتوح الرازی کا اثر غالب دکھائی دیتا ہے۔ (زاد المسیر فی علم التفسیر، مطبوعہ بیروت، جلد اول، ص ۹۲)

محمد بن عمر فخر الدین الرازی نے لفظ صابئون کی مختلف صورتوں پر بحث کی ہے۔ دیگر مفسرین کے تتبع میں وہ بھی انہیں مرتد کا مترادف سمجھتے ہیں۔ وہ فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں۔ ہر روز پانچ نمازیں ادا کرتے ہیں لیکن ان کے اوقات سورج کے طلوع و غروب کے درمیان ہیں۔ وہ پانچ مذاہب کا ذکر کرتے ہیں جن میں چار کا تعلق شیطان اور ایک کا تعلق رحمٰن سے ہے۔ اول الذکر شیطانی مذاہب میں یہودیت، نصرانیت اور مجوسیت کے ساتھ صابئیت کو بھی شامل کیا ہے۔ غالباً وہ پہلے مفسر ہیں جنہوں نے صابئون کی ستارہ پرستی کا ذکر کیا ہے۔ خالقِ کائنات اور اجرامِ فلکی کے تعلق، ان روشن ستاروں کی تخلیق اور انسانی زندگی پر ان کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان کے خیال پر صابیوں کی تعلیمات پر کلدانیوں کی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ یہ کلدانی وہی لوگ ہیں جن کی ہدایت کے لیے حضرت ابراہیمؑ مبعوث ہوئے تھے۔ (تفسیر الکبیر، مطبوعہ قاہرہ، جلد سوئم، ص ۱۰۵)

اسمٰعیل بن عمر ابن کثیر نے بھی دیگر مفسرین کی آراء ہی کو دہرایا ہے۔ صابیوں سے متعلق تمام احادیث کو بھی یکجا کر دیا ہے اور ان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا کی وحدانیت کو تسلیم کرتے تھے۔ وہ عراق کے ایک سرحدی علاقے میں آباد ہیں۔ تمام انبیاء کو مانتے ہیں۔ سال میں ایک بار تیس روزے رکھتے ہیں اور جنوب کی سمت کھڑے ہوکر پانچ نمازیں پڑھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ابن کثیر صابئون کو ایک گروہ بتاتے ہیں جو ستارہ پرست ہے اور انسانوں پر ان کے اثرات کو بھی درست مانتے ہیں۔ وہ عباسی خلیفہ قادر باللہ کے ایک فتویٰ کا بھی حوالہ دیتے ہیں جس میں انہیں کفار

Marfat.com

میں شامل کیا گیا ہے۔ وہ اس بات کی صراحت کرتے ہیں کہ یہود، نصاریٰ اور مجوس سے بالکل الگ ہیں اور وہ صرف دینِ فطرت کا اتباع کرتے ہیں۔ نیز صابئون ایسے لوگ ہیں، جن تک پیغمبری دعوت نہیں پہنچ سکی۔ (تفسیر القرآن العظیم، مطبوعہ قاہرہ، جلد اول، ص ۱۰۴)

فتح اللہ کاشانی نے زیادہ تر سابق مفسرین کی معلومات کو نقل کر دیا ہے۔ ان کے مطابق صابئون نے ہر مذہب کی کچھ تعلیمات کو اپنے بنیادی عقائد کا حصہ بنا لیا ہے اور وہ الطوسی کی پیروی میں انہیں دینِ نوح کے پیروکار مانتے ہیں۔ (منہاج الصادقین، مطبوعہ تہران، جلد سوئم۔ ص ۲۸۳)

محمد رشید رضا نے صابیوں کو اہلِ کتاب کے زمرے میں شامل کیا ہے اور وہ ان کے اعتقادات کو مسیحیت کے بہت قریب سمجھتے ہیں۔ مثلاً اغتسال، اعتراف اور سبت ان دونوں میں مشترک ہیں۔ وہ ستاروں کی پرستش کرتے ہیں اور ان میں کئی بدعات بھی رائج ہیں۔ وہ انہیں ''ملتِ مستقلہ'' قرار دیتے ہیں، جو تمام معروف انبیاء پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ حنفاء سے بہت مماثل ہیں، لیکن ''احکام'' اور رسمی اعمال (''تقالید'') میں ان سے مختلف نظر آتے ہیں۔ (تفسیر القرآن الحکیم، مطبوعہ بیروت، جلد اول، ص ۳۳۴)

قرآن کی کم وبیش سبھی تفاسیر میں درج بالا حنفی اور شیعی مسالک کی تفسیروں میں تحریر کردہ تفاصیل متعلقہ صابئون ہی کی جھلک واضح طور پر دکھائی دیتی ہے، حتیٰ کہ اردو کی معتبر تفسیریں بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ صرف سید مناظر احسن گیلانی نے اس عام ڈگر سے ہٹ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ صابئون، گوتم بدھ کے پیروکار تھے۔ (دیکھئے ان کے مضامین، مطبوعہ، معارف، فروری و مارچ ۱۹۵۳ء) ان کے اس نظریہ کی بنیاد الشہرستانی اور البیرونی کی تحریریں تھیں۔ رشید الدین فضل اللہ کی ''جامع التواریخ'' کا جو حصہ تاریخ ہند سے متعلق ہے اور جس کا فارسی متن اور انگریزی ترجمہ کارل یان (Karl Jahn) کی مساعی سے آسٹریا اور ہالینڈ سے طبع ہو چکا ہے اس میں مرقوم ہے کہ جب خانۂ کعبہ کو بتوں سے پاک کیا گیا تو ان میں ایک بت گوتم بدھ کا بھی تھا۔

تفاسیر میں صابی کے لفظ پر اشتقاقی بحث کی گئی ہے لیکن اس پہلو پر عربی لغت نویسوں نے زیادہ تفصیل سے لکھا ہے۔ اس لفظ کے مادہ (ص ب أ) کے مشتقات ''صبا'' اور ''یصبا'' کا اصل مفہوم نکلنے اور ظاہر ہونے یا ایک دین سے نکل کر کسی اور دین میں داخل ہونے کے ہیں۔ اس معنی میں ''صبات النجوم'' (ستارے نکل آئے) کی ترکیب مستعمل ہے۔ ان حرفی مباحث کے علاوہ ان ماہرین لغت نے صابیوں کی اصل پر بھی بحث کی ہے اور قریب قریب انہی باتوں کو دہرایا ہے جو محولہ بالا تفاسیر میں مرقوم ہیں یعنی وہ دین نوح کے پیروکار، اہل کتاب، دوپہر کو شمالی قبلہ کی جانب نماز پڑھنے والے، مسیحیوں سے مماثل (قبلہ بطرف جنوب) اور حضرت نوح کے بھائی صابی بن لامک کے نام سے موسوم۔ (دیکھئے الزبیدی، تاج العروس، جلد اول ص ۳۰۷۔ ابن منظور، لسان العرب جلد اول ص ۱۰۷، بعد۔ لین لیکسی کون ص ۱۶۴۰۔ نیز ابن فارس، محیط اور مفردات القرآن)۔

تفاسیر اور لغات کے علاوہ بعض مؤرخین نے بھی صابئون کو موضوع بحث بنایا ہے۔ ان کے بیانات پر سرسری نظر ڈالی جائے تو وہ مفسرین سے قدرے مختلف ہیں لیکن ان میں بھی اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ دراصل آغازِ اسلام

Marfat.com

میں تو وہی مذاہب مدِمقابل تھے، جو جزیرۃ العرب میں عرصۂ دراز سے موجود تھے لیکن جب اسلام نے ان حدود کو عبور کیا تو اس کا مختلف مذہبوں، قوموں اور تہذیبوں سے واسطہ پڑا۔ لاکھوں کی تعداد میں لوگ اسلامی تعلیمات سے متاثر ہوکر (لغوی اعتبار سے) صابی ہونے لگے۔ یعنی اپنا دین ترک کر کے دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ فاتحین اور مفتوحین کے مابین باہمی تعلقات کی نئی جہات اور نئے مسائل سامنے آئے اور ان سے عہدہ براء ہونے کے لیے لائحہ عمل تجویز کیے گئے۔ اسلام کی روزافزوں جغرافیائی وسعتوں اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حالات وواقعات نے مؤرخین کو بھی اپنی جانب متوجہ کیا اور اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب بشمول صابئیت کے کوائف کو بھی زیر بحث لائے۔ ایسی تاریخی کتب میں دسویں صدی عیسوی کے واخر سے صابئون کا ذکر بھی جا بجا نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم مؤرخ البیرونی (م ۱۰۴۸ء) ہے جو ''آثار الباقیہ'' میں رقم طراز ہے کہ صابیوں کے نام کا اطلاق بابل کے ان محصور یہودیوں پر ہوتا ہے، جنہیں بخت نصر یروشلم سے اس ملک میں لایا تھا۔ انہیں یہاں کی آب وہوا راس آ گئی کہ انہوں نے شام کو مراجعت کے بجائے یہیں ٹھہرنے کو ترجیح دی۔ وہ راسخ العقیدہ لوگ تھے، لیکن مجوسیت میں دلچسپی رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مذہب میں یہودیت کے علاوہ مجوسیت کے اثرات کا بھی سراغ ملتا ہے۔ ان کی اکثریت ''سواد العراق'' میں آباد ہے اور یہی حقیقی صابی ہیں۔ وہ مستحکم مذہبی عقائد کے خواہاں ہیں۔ نسبی طور پر وہ اپنا ناطہ آدم کے پوتے اخنوخ سے جوڑتے ہیں۔ اصل صابیوں کا حرانیوں سے کوئی تعلق نہیں۔ چند امور کے علاوہ وہ حرانیوں سے شدید اختلاف رکھتے ہیں۔ (آثار الباقیہ، انگریزی ترجمہ از زخاؤ، مطبوعہ لندن، ص ۳۱۴)

سطور بالا میں مختصراً اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ بعض مصنفین نے صابئون کو بدھ مت کے متبعین قرار دیا ہے۔ البیرونی ان ابتدائی مؤرخین میں سے ہے جس نے گوتم بدھ اور اس کے پیروکاروں کو صابئین ثابت کیا ہے۔ اس نے ''مدعیان نبوت'' کے زیرعنوان سب سے پہلے بوذاسف کا ذکر کیا ہے جو شاہ طھمورث کے سالِ اول کے بعد ہندوستان وارد ہوا۔ اس نے فارسی طرزِ تحریر کو متعارف کرایا اور لوگوں کو صابئین کے دین کی دعوت دی جسے بہت سے لوگوں نے قبول کرلیا۔ (ایضاً، ص ۱۸۶)

البیرونی صابیوں کے عقائد کا ان الفاظ میں ذکر کرتا ہے:

> ''مگر ہم تو ان کی بابت یہی جانتے ہیں کہ یہ لوگ اللہ کی توحید کے قائل ہیں۔ ان کو قبائح سے منزہ مانتے ہیں اور ان کے ہاں جتنی صفات باری ہیں، وہ سلبی ہیں، ایجابی نہیں، مثلاً وہ کہتے ہیں کہ اللہ کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ وہ نظر نہیں آسکتا، وہ ظلم نہیں کرتا اور نہ اس پر کوئی ظلم کرسکتا ہے۔ یہ لوگ باری تعالیٰ کے لئے اسماء حسنیٰ ثابت کرتے ہیں مگر مجازاً، کیونکہ ان کے نزدیک باری تعالیٰ کے لئے حقیقت کوئی صفت نہیں ہے۔ عالم میں جو کچھ تغیرات وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں، یہ لوگ ان کو آسمان اور اجرام فلکی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ جامع دمشق میں مقصورہ کے قریب محراب کے اوپر جو گنبد بنا ہوا ہے، وہ انہی کے آثار میں سے ہے۔'' (ایضا، ص ۲۰۵)

البیرونی کے علاوہ چند اور تاریخ دانوں نے بھی صابیوں کا تعلق بدھ مت سے جوڑا ہے۔ مثلاً مسعودی کا کہنا

Marfat.com

ہے کہ طہمورث کے عہد حکومت کے شروع میں بوذاسف نامی شخص ہندوستان میں ظاہر ہوا۔ وہ نبوت کا مدعی تھا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے صابیہ مسلک کی بنیاد رکھی۔ وہ حرانی صابیوں کے مختلف ہیاکل کا بھی ذکر کرتا ہے جو مختلف اجرام علویہ کے ناموں سے موسوم کیے جاتے تھے۔ ابوبکر محمد بن زکریا رازی نے ان صابیوں پر ایک مستقل کتاب لکھی تھی جس میں ایسی باتیں لکھی گئی تھیں جو نا قابل بیان ہیں۔ (مروج الذہب، مطبوعہ قاہرہ، جلد دوم، ص ۲۴۷ بعد)

اس طرح بارہویں صدی عیسوی کے ایک ایرانی النسل فاضل شہرستانی نے ''کتاب الملل والنحل'' میں صابیوں کی اصل اور ان کے مسلک کا تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ وہ غالباً پہلا شخص ہے، جس نے صابیوں کو مختلف ہندی الاصل مذاہب سے منسوب کیا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ کس طرح صابیوں نے اپنے اعمال وعقائد کی ابتداء آذمون (اغثوذمون) اور ہرمس (ادریس) سے منسوب کی۔ وہ انہیں تین فرقوں یعنی اصحاب الروحانیات، عبدۃ الکواکب اور عبدۃ الاصنام میں تقسیم کرتا ہے۔ ''آراء الہند'' کے تحت وہ گیارہ مذہبی طبقوں کا ذکر کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اہل ہند میں کچھ لوگ ملت ابراہیمی کے قائل ہیں اور ان میں اکثر مذہب صابیہ رکھتے ہیں۔ (کتاب الملل والنحل، جرمن ترجمہ مطبوعہ ہالے، ۱۸۵۰ء، جلد دوم ص ۳ ببعد)

ابن الندیم نے ''الفہرست'' (سال تالیف ۹۸۷ء) میں ایک ایسے مذہبی گروہ کا ذکر کیا ہے، جو دریائے فرات کے نشیب میں واقع دلدلی علاقے میں آباد تھا۔ عربوں نے اسے مغتسلہ کا نام دیا ہے۔ ابن الندیم نے اس طبقے کو ''صابئۃ البطائح'' کا نام دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ''یہ لوگ یعنی مغتسلہ دلدلی علاقوں میں کثرت سے آباد ہیں۔ یہ انہی دلدلوں کے صابئین ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ لوگوں کو ہر چیز دھو کر استعمال کرنی چاہئے اور خود بھی صاف ستھرا رہنا چاہئے۔ ان کے دو عقیدے مذہب مانوی سے ملتے ہیں۔ ان میں سے کچھ اب تک ستارہ پرست ہیں۔ (الفہرست، انگریزی ترجمہ، مطبوعہ نیویارک، جلد دوم، ص ۷۷۳، ۷۷۴، ۸۱۱)

ان قدیم مستند تاریخی مصادر میں درج معلومات متعلقہ صابئیت ہی ملل وفرق کے دیگر مصنفین اور مؤرخین نے معمولی لفظی تغیر وتبدل کے ساتھ دہرائی ہیں حتیٰ کہ بیسویں صدی کا معروف مؤرخ اپنی اہم تاریخ ''بلوغ الأرب'' میں بھی کسی نئی بات کا اضافہ نہیں کرسکا۔ اس کتاب کے متعلقہ اقتباسات درج ذیل ہیں:

> ''یہ لوگ حران میں تھے اور یہ مقام صابئہ کا مرکز تھا۔ ان میں دو گروہ تھے۔ ایک حنفا کا اور دوسرا مشرکین کا۔ ان میں جو مشرک تھے وہ سبعۂ سیارہ اور ان کے بروج کی پرستش کرتے تھے اور ان کا ہیکل بنا کر رکھتے تھے......ان ستاروں کی عبادت کرنے کے طریقے مختلف تھے۔ ان کے بت بھی بنا کر رکھتے، ان کے نام کی قربانی کرتے اور مسلمانوں کی طرح پانچ وقت کی نماز بھی پڑھتے۔ ان میں کچھ گروہ تھے جو ماہ رمضان کے روزے بھی رکھتے۔ کعبہ کی تعظیم کرتے اور حج کے بھی قائل تھے۔ ان کے ہاں کھانے پینے کی چیزوں میں اور نکاح کے معاملہ میں حلال وحرام کے احکام وہی تھے جو مسلمانوں کے ہاں ہیں۔
>
> ......یہ لوگ حضرت ابراہیمؑ کی قوم اور آپ کے اہل دعوت تھے......غرضیکہ صابئہ کے بہت سے

Marfat.com

فرقے اور گروہ ہیں۔ایک فرقہ حنفا کا اور دوسرا مشرکوں کا، تیسرا فلاسفہ کا اور ایک فرقہ بالکل آزاد لوگوں کا۔ یہ سب لوگ عجیب معجون مرکب ہیں۔ان میں کوئی نبوت کا قائل ہے اور کوئی منکر۔کوئی توحید کو مانتا ہے اور کوئی مشرک ہے۔'' (بلوغ الأرب، اردو ترجمہ پیر محمد حسن، مطبوعہ لاہور، جلد دوم)

تفسیر، لغت، تاریخ اور مذاہب غیر اسلامیہ کے متخصصین نے قرآن میں مذکورہ صابئین کی اصل اور ان کے معتقدات کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا، ان کو اختصار کے ساتھ سطورِ بالا میں پیش کیا گیا ہے۔ بغور دیکھا جائے تو ان آراء میں اس قدر اختلاف اور تضاد پایا جاتا ہے کہ وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے کہ صابئون کون تھے۔ دورِ حاضر میں عالم اسلام کے کسی فاضل نے ان روایات قدیم کی بنا پر صابیوں کو اپنا موضوع تحقیق نہیں بنایا اور ابھی تک ایسی کوئی جامع تالیف منظر عام پر نہیں آئی جس میں تفتیش و تفحص کے عمل ساتھ اعلیٰ تحقیقی معیارات کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہو۔ عربی میں عبدالرزاق الحسنی کی کتاب ''الصابئون فی حاضرھم و ماضیھم'' (مطبوعہ بیروت ۱۹۰۸ء، صفحات ۱۲۸) دستیاب ہے لیکن اسے بلند پایہ علمی معیار کی تالیف نہیں کہا جا سکتا، البتہ بعض دینی مجلات میں کچھ ایسے مقالات طبع ہوئے ہیں جو اس کمی کو کسی حد تک پورا کرتے ہیں۔ ایسے مقالہ نگاروں میں مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے اسمائے گرامی پیش کئے جا سکتے ہیں۔

یہ حقیقت تلخ تو ضرور ہے لیکن طوعاً و کرہاً اسے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ زیر نظر موضوع یعنی صابئون پر جو علمی تالیفات دستیاب ہیں وہ مستشرقین کی تحریر کردہ ہیں۔ چونکہ جن تین قرآنی آیات میں صابئین کا ذکر کیا گیا ہے ان سے قبل یہود و نصاریٰ کے نام بھی آئے ہیں، اس لئے ان مذاہب کے عالموں نے بھی اس مذہبی طبقہ کا کھوج لگانے میں روایت و درایت کے اصولوں کی پیروی کی اور اپنے مخصوص محققانہ طرزِ عمل سے اعلیٰ معیار کی تالیفات سپرد قلم کیں۔ ایسے کچھ خاور شناسوں کے مطالعات کا مختصر جائزہ درج ذیل سطور میں پیش کیا جاتا ہے۔

مغرب میں صابیہ کی شناخت کے پیچیدہ مسئلہ پر انیسویں صدی عیسوی کے نصف اول میں علمی کام کا آغاز ہوا۔ موجودہ معلومات کے مطابق جرمن بولنے والے علاقوں میں تاریخ استشراق کے جدِ اعلیٰ ہامر پور گشتال نے ابن الندیم کی ''الفہرست'' کے اقتباسات متعلقہ صابئون کا فرانسیسی ترجمہ مع حواشی شائع کرایا (در: ژورنال آسیاتیک، ۱۸۴۱ء، ص ۲۴۶-۲۷۲)۔ اس کے بعد ریناں (E. Renan) نے اپنے مختصر فرانسیسی مضمون میں صابیوں کا تعلق الکسائیوں کے فرقہ سے جوڑنے کی کوشش کی۔ یہ مضمون فرانس کے معروف علمی مجلہ ''ژورنال آسیاتیک'' (۱۸۵۵ء) میں شائع ہوا۔ (ص ۲۹۲-۲۹۴)، لیکن اس موضوع پر جس مغربی عالم نے مبسوط اور جامع انداز سے اپنے نتائج تحقیق کو پیش کیا، وہ ڈانیل خوالسن (Daniel A. Chwolson) تھا۔ اس نے صابی اور صابئیت پر دو جلدوں پر مشتمل جرمن کتاب شائع کرائی (سینٹ پیٹرس برگ، ۱۸۵۶ء، طبع نو، لندن، ۱۹۶۵ء) جس میں مسلمان مؤرخین اور مصنفین کی تحریروں سے بھی استفادہ کیا گیا۔ ان کی متعلقہ عبارتوں کا جرمن ترجمہ اور پھر ان پر ناقدانہ تبصرہ کیا گیا۔ اس کی رائے میں قرآنی صابئون وہی لوگ ہیں جو واسط اور بصرہ کے درمیان ترائی میدانوں میں آباد ہیں جنہیں مندیا (Mandaeans) کہا جاتا ہے اور عرب مؤرخین نے جنہیں مغتسلہ لکھا ہے۔ اس نے اپنے مؤقف کی تائید میں ان

Marfat.com

کی مذہبی رسوم اور معتقدات کے مماثل پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی ہے اور بظاہر اپنے نظریے کو اتنے ٹھوس دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے کہ برسوں مغربی علماء اسی کو درست مانتے رہے۔ حیرت ہے کہ اس کتاب کی اشاعت سے قبل اس کے مندرجات پر کیونک (E. Kunik) نے مفصل تعارفی تجزیہ قلمبند کیا جو سینٹ پیٹرز برگ کی اکیڈمی برائے سائنسی علوم کے بلیٹن میں طبع ہوا۔ (۱۸۵۲ء، ص ۲۲۵۔۲۲۹ اور ۱۸۵۵ء، ص ۱۹۳۔۲۴۹)۔ خوالسن نے اپنی اس کتاب میں جو نتائج مرتب کئے ان کو شدید تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا، لیکن اس کے باوجود یہ کتاب صابیوں پر مزید تحقیق کی تحریک کا باعث رہی، بالخصوص یہ ان جرمن عالموں مثلاً R. Macuch اور K.Rudolph کا اساسی ماخذ ثابت ہوئی، جنہوں نے مندیا پر تحقیقات کو آگے بڑھایا۔ اس ضمن میں انگریز خاتون اسکالر ڈرووَر (E.S.Drower) کے مندیا پر مطالعات قابل ذکر ہیں جس نے برسوں ان کے درمیان گزارے اور پھر اپنے مشاہدات و نجی تجربات کو عالمانہ انداز میں پیش کیا۔ (دیکھئے عراق اور ایران کے مندیا پر اس کی انگریزی کتاب، مطبوعہ لائیڈن، ۱۹۶۲ء)۔ وہ بھی خوالسن کی ہم خیال ہے، یعنی صابیوں کو مندیا ہی قرار دیتی ہے، لیکن وہ ثانی الذکر طبقہ کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے، یعنی مبلغین جو نصرانی کہلاتے ہیں اور عامۃ الناس جو خود کو مندیا کا نام دیتے ہیں۔ اس خاتون کی تحقیق کی بنیاد پر چند سال قبل شنسی گندوز نے ایک کتاب لکھی (مطبوعہ لائیڈن، ۱۹۹۴ء) جس میں مندیا کے آغاز اور ابتدائی تاریخ، نیز صابیوں اور حرانیوں سے ان کے تعلقات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ یہ کتاب آٹھ ابوب پر مشتمل ہے جن میں مندیا اور حرانیوں کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے۔ عرب مصنفین نے اپنی کتب میں حرانیوں کا جہاں جہاں ذکر کیا ہے، ان عبارتوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں تین نقشے بھی دیئے گئے ہیں۔ پہلے نقشے میں ان علاقوں کی نشاندہی کی گئی ہے جہاں خلیفہ المامون کے عہد حکومت سے پہلے حرانی آباد تھے (بحوالہ عرب مؤرخین)۔ دوسرے نقشے میں اس دور کے بعد کے علاقوں کو نشان زدہ کیا گیا ہے اور تیسرے نقشے میں مندیا کی نقل مکانی کے ممکنہ راستے دکھائے گئے ہیں۔ یہ مصنف مندیا اور حرانی صابیوں کے تعلق کی تردید کرتا ہے اور قرآنی صابیوں کو مندیا ہی سے منسلک کرتا ہے۔ ظاہر ہے، عہد حاضر کے معتبر مسلمان علماء اس کو درست تسلیم نہیں کرتے، چنانچہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی اپنے مذکورہ بالا مقالے میں لکھتے ہیں کہ

> ''ہماری رائے میں ''فتوح البلدان'' میں جن کو معمودیہ کہا گیا ہے وہ یہی منڈیس تھے اور چونکہ حضرت عمر نے ان کو اہل کتاب تسلیم نہیں کیا، اس لئے ثابت ہوا کہ یہ لوگ قرآن کے صابئہ نہیں تھے۔ امام ابوحنیفہ سے البتہ ایک روایت ہے کہ صابئہ اہل کتاب ہیں اور ان کے ساتھ وہی معاملہ ہونا چاہئے، لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ منڈیس جن کو مسلمانوں نے فتوحات کے زمانہ میں اہل کتاب تسلیم نہیں کیا اور اس کی وجہ سے ان کو پریشانی اٹھانی پڑی تھی، انہی لوگوں نے بعد میں مسلمانوں کا اعتماد حاصل کرنے کی غرض سے اپنے آپ کو صابی کہنا شروع کر دیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مؤرخین اور فقہا دونوں انہی لوگوں کو قرآن کا صابئہ سمجھ بیٹھے، حالانکہ واقعہ اس کے خلاف تھا۔''

حال ہی میں ڈی بلوا (F.C.de Blois) نے بھی صابیوں کو دین مانی ہی کا متبع قرار دیا ہے لیکن اس نے اپنے مؤقف کو قدرے مختلف ثابت کیا ہے اور ''صابیون، قبل از اسلام عرب میں'' کے زیر عنوان اپنے مقالہ (مطبوعہ اکتا

Marfat.com

اور بنتالیا، ۱۹۹۵ء، ص ۳۹۔۶۱) میں اس نے ''الفہرست'' کا مع حواشی ترجمہ کیا ہے۔ وہ ثابت کرتا ہے کہ صابیوں سے وہ لوگ مراد ہیں جو اپنا دین ترک کر چکے ہیں۔ ''انسائیکلو پیڈیا آف قرآن'' (مطبوعہ، لائیڈن، جلد ۴، ۲۰۰۴ء بذیل مادہ) میں بھی اس نے اپنے اسی موقف کا اعادہ کیا ہے۔) کفارِ مکہ نے پیغمبر اسلام ﷺ اور مفسرین اور مسلمان مؤرخین نے حرانیوں کی کواکب پرستی کا تفصیلی ذکر کیا ہے اور ان کی خوشنودی اور استعانت و استمداد کے لئے ہیکل سازی کی تفصیلات رقم کی ہیں۔ ابن الندیم انہی کو صابیہ سمجھتے ہیں۔ مغرب کے بعض مؤرخینِ مذاہبِ عالم بھی اسی کو قرین قیاس مانتے ہیں لیکن انہوں نے حرانیوں کی ستارہ شناسی اور ان کے اعتقادات و روزمرہ معمولات پر ''ہیاکل علویہ'' کے اثرات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ بایارڈ ڈوج (Bayard Dodge) نے حران کے ان صابیوں پر مقالہ لکھا جو امریکن یونیورسٹی، بیروت کے یادگار شمارہ (۱۹۶۷ء) میں شائع ہوا۔ انہوں نے ''الفہرست'' میں مرقوم اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ انہوں نے مامون الرشید کے دور میں کتنی چابکدستی سے ادیانِ معروفہ سے خود کو صابئین کے زمرے میں شامل کرلیا۔ ڈرو ور نے حرانی صابیوں اور مندیا کی مذہبی اشرافیہ یعنی نصرانیوں کے مابین تعلق کی جانب توجہ مبذول کرائی، اس کو ڈوج لائق توجہ سمجھتا ہے لیکن اس کے لئے مزید شہادتوں کی ضرورت بھی محسوس کرتا ہے۔ بعد میں جب اسی عالم نے ''الفہرست'' کا انگریزی ترجمہ (دو جلد) شائع کیا تو اس کے متعلقہ باب کے حواشی میں اس موضوع کے بارے میں کچھ نئی معلومات بھی فراہم کیں۔ ڈوج کے بعد حرانی صابیوں پر ایک مستقل کتاب بزبان فرانسیسی یان جیر پہ نے لکھی (مطبوعہ اُپسالہ، ۱۹۷۲ء) جس میں صابیوں سے متعلق تقریباً سبھی عربی تحریروں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا۔ خوالسن کے مباحث کو ملخص صورت میں پیش کیا اور اپنے مؤقف کو درست ثابت کرنے کے لیے مختلف شواہد پیش کئے۔ اس حوالے سے تمارا گرین (Tamara M. Green) کی انگریزی کتاب ''حران کے مذہبی افکار'' (مطبوعہ لائیڈن، ۱۹۹۲ء) بھی اہم ہے جس میں موصوفہ نے ''الفہرست'' میں منقول المامون کی حرانیوں سے ملاقات (۸۳۲ء) کو زیادہ اہمیت کا حامل قرار نہیں دیا۔ اس نے حرانیوں اور اہل تشیع کے تعلقات پر زیادہ زور دیا ہے کیونکہ اس کی نظر میں اول الذکر کے ثنوی عقائد نے یہودیت کے علاوہ مشرقِ وسطیٰ کے تقریباً تمام مذاہب پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔

علمائے مغرب کا ایک طبقہ صابئون کو دینِ مانی کا پیروکار بتاتا ہے۔ دیگر غیر اسلامی مذہب کی مانند عرب مصنفین بالخصوص ابن الندیم نے مانویت پر بھی تفصیل سے لکھا ہے۔ (دیکھئے مانی و دین او، مطبوعہ تہران اور ''الفہرست'' کے متعلقہ حصے کا جرمن ترجمہ، بصورت کتاب)۔ ''الفہرست'' میں مرقوم ہے کہ دسویں صدی عیسوی میں اس مذہب کے ماننے والوں نے اپنی جان و مال کی حفاظت کی غرض سے سمرقند میں پناہ لے لی۔ جب خراسان کے حاکم نے ان کو قتل کرنے کی دھمکی دی تو قریبی علاقہ کوچو میں اویغوروں کے مانوی حکمران نے اپنے زیرِ نگیں علاقے میں مقیم مسلمانوں کو جواباً قتل کرنے کا حکم دیا۔ البیرونی ''آثار الباقیہ'' میں لکھتے ہیں (ص ۱۹۱) کہ 'مانی کے پیروکار اب بھی موجود ہیں اور وہ ایک جگہ نہیں بلکہ اسلامی سلطنت میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ان میں جو لوگ سمرقند میں آباد ہیں، وہ صابئین کے نام سے موسوم ہیں۔'' جیمز بلمی (Jams A. Bellamy) کا مؤقف ہے کہ صابئون اور صابئین کے دونوں الفاظ 'صبون' اور 'صبین' سے مشتق ہیں اور یہ 'منون' اور 'منین' کی تبدیل شدہ صورتیں ہیں۔ اس تبدیلی کا ذمہ دار کوئی نقل نویس ہے اور

Marfat.com

ان دونوں الفاظ کا مفہوم دینِ مانی کے پیروکار ہیں۔ ان کا مزید یہ کہنا ہے کہ عربی کتب میں مانویت کے لئے مانی، منانی اور "ونی" کے الفاظ استعمال کیئے گئے ہیں۔ قدیم عربی تحریروں میں 'ص' کو 'ا' سے تبدیل کرنے کی امثال بکثرت پائی جاتی ہیں اس لئے ان الفاظ میں بھی یہ تبدیلی رونما ہوئی۔ علاوہ ازیں ورودِ اسلام کے وقت دین مانی شمالی افریقہ، جنوبی یورپ اور ایران کی مشرقی سرحدوں تک پھیل چکا تھا۔ مانی کی لکھی ہوئی کتب اس مذہب کی تعلیمات کی بنیاد تھیں۔ چھٹی صدی عیسوی کے عرب علاقوں حتیٰ کہ مدینہ تک ایرانی اثرات پائے جاتے تھے اور قبیلہ قریش کے افراد بھی اس مذہب کے زیر اثر تھے۔ مانویت میں اسلام کی طرح صوم وصلوٰۃ اور زکوٰۃ پر زور دیا جاتا تھا، اس لئے یہ ممکن ہے کہ ان دونوں مذاہب میں تمیز نہ کرنے کے باعث کفارِ مکہ مسلمانوں کو بھی مانوی ہی سمجھتے ہوں۔ حال ہی میں ڈی بلوا نے بھی صابیوں کو دین مانی ہی کا متبع قرار دیا ہے لیکن اس نے اپنے مؤقف میں قدرے مختلف دلائل سے ثابت کیا ہے کہ "صابیون، قبل از اسلام عرب میں" کے زیرعنوان اپنے محولہ بالا مقالہ میں اس نے "الفہرست" کا مع حواشی ترجمہ سمیت یہ وضاحت بھی کرتا ہے کہ صابیوں سے وہ لوگ مراد ہیں جو اپنا دین ترک کر چکے ہیں۔ کفارِ مکہ نے پیغمبر اسلام ﷺ اور صحابہ کرام کے لیے یہ لفظ اسی مفہوم میں استعمال کیا۔

یوہان فیوک کا کہنا ہے کہ زندیق، پہلوی زبان کے لفظ "زندق" (بمعنی عارف) سے مشتق ہے۔ اس سے مراد دینِ مانی کا پیروکار ہے۔ (خوارزمی: مفاتیح العلوم، ص ۳۷) اور "مرتد" کا مفہوم ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ ابتدائے اسلام سے دوسری صدی ہجری تک "مرتد" اور بالخصوص دینِ مانی کے پیروکار کے لئے لفظ زندیق (جمع زنادقہ) مستعمل رہا، اس لئے ان دونوں الفاظ یعنی صابی اور مانوی میں معنوی یکسانیت کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ صابیوں سے مراد مانیوں سے ہے۔ اسی ضمن میں وہ خلیفہ الولید کا ذکر کرتا ہے، جو زندیق تھا اور مانی کا اتباع کرتا تھا۔ (کتاب الأغانی، ۶: ۱۳۵-۱۳۶)۔ وہ عباسی خلیفہ المہدی کا یہ واقعہ بھی بیان کرتا ہے کہ ایک زندیق کو اس کے روبرو پیش کیا گیا اور اسے مانویت سے تائب ہونے کا حکم دیا گیا۔ اس کے انکار پر اسے تہ تیغ کر دیا گیا اور ساتھ ہی اپنے ولی عہد الہادی کو ان "اصحاب الاثنین" کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرنے کی تلقین کی۔ (الطبری: تاریخ، ۳: ۵۸۸) نیز دیکھئے Melhem Chokr کی فرانسیسی کتاب "اسلام میں زندیق اور زنادقہ" مطبوعہ دمشق ۱۹۹۳ء۔ اس دور میں بصرہ میں ایک علمی مجلس قائم تھی جس کے اراکین زیادہ تر مانویت سے تعلق رکھتے تھے اور دینی امور کو زیر بحث لایا کرتے تھے۔ (دیکھیے کتاب الأغانی ۳: ۱۴۶-۱۴۷۔ ابن حجر: اسد الغابہ ۴: ۵۱) تاریخی شواہد امیہ اور عباسیہ ادوار سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن کوئی ایسی معتبر شہادت نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہوسکے کہ اسلام سے قبل یا نزول قرآن کے زمانے میں دینِ مانی کے ماننے والے عرب میں موجود تھے۔ مزید برآں اس دین کی بنیادی کتابیں الہامی نہیں، بلکہ مانی کی تحریر کردہ تھیں اور ساتویں صدی عیسوی کے اوائل میں وسطی عرب میں ان کا کوئی سراغ نہیں ملتا اور اس علاقے میں کسی ایسے مذہب نے لوگوں پر اپنے گہرے اثرات نہیں چھوڑے، جس کی ابتداء بازنطین، ایران یا وسط ایشیا سے ہوئی۔

تاریخ مذاہب کے ایک متخصص فاہد (T.Fahd) کے مطابق قرآن میں مذکور صابیوں کا تعلق ان افراد سے ہے، جن کو اپی فانیوس (Epiphanius) نے "آرکونٹکس" (Archontics) کے نام سے یاد کیا ہے۔ ان کو

Marfat.com

Stratiotic بھی کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ ''سماوی گروہوں'' پر ایمان رکھتے ہیں، باطنی نوعیت کا ایک فرقہ ہے جو یہود و نصاریٰ سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔ اس کا آغاز فلسطین سے ہوا لیکن جلد ہی یہ مصر اور عرب تک پھیل گیا۔ قرآن میں مستعمل یہ لفظ بھی عبرانی ''صبا'' (بمعنی فوج) سے اخذ کردہ ہے۔ اس اشتقاقی مماثلت سے صابیوں کا اصل یہود و نصاریٰ ہی کے کسی گروہ سے ہوسکتا ہے۔ اس مصنف کے خیال میں وہ طبقہ الکسائیوں کا ہے جنہیں عرب مصنفین نے مغتسلہ کہا ہے۔ (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، طبع جدید، ۸ (۱۹۹۵ء): ۶۷۸)

صائبوں کے متعلق درج بالا آراء کے برعکس بعض مستشرقین ان کی اصل دینِ حنیف اور اس کے پیروکار بتاتے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ دس بار واحد اور دو بار جمع (حنفاء) کی حیثیت سے استعمال ہوا۔ صابئین کی طرح یہ لفظ بھی مفسرین، مؤرخین اور مصنفین کے مابین مختلف الرائے چلا آ رہا ہے اور اب تک اس کا اطلاق مختلف مذہبی طبقوں پر ہو چکا ہے۔ ان میں ابن الندیم اور البیرونی نے حنفاء کو حران کے صابی قرار دیا ہے جبکہ المسعودی کہتا ہے کہ رومی حکمران مسیحیت قبول کرنے سے پہلے حنفاء تھے۔ وہ صائبیت کا اتباع کرتے تھے، جس کا دوسرا نام حنفیت ہے۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ جولیان نامی فرمانروا نے مسیحیت سے کنارہ کشی اختیار کر کے دین حنیف اپنا لیا اور اس سے منحرف ہونے والوں کو ہلاک کرنے کا فرمان جاری کر دیا۔ اپنی کتاب ''التنبیہ والاشراف'' (مرتبہ دخویہ، ص ۹۰) میں وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ زرتشت سے قبل ایرانیوں نے اس دین حنیف کو اپنا لیا تھا اور یوں وہ بھی صائبوں میں شامل ہیں۔ بعض علمائے دین المسعودی کے صابئیت اور حنیفیت کو ہم معنی قرار دینے پر سخت معترض ہیں۔ اس سے ان کی جانب جو مشرکانہ اعمال اور عقائد منسوب کیے ہیں، وہ ان آیات قرآنی کے بالکل خلاف ہیں جن میں حنفاء کے شرک کی نفی کی گئی ہے۔

انہی مسلمان مؤرخین کی تحریروں کی بنیاد پر مستشرقین نے لفظ ''حنیف'' کی مختلف توجیہات پیش کی ہیں۔ ان شرق شناسوں میں ڈاکٹر الوس اشپرنگر پہلا شخص ہے جس نے اپنی ''سیرت رسول'' (بزبان جرمنی، تین جلد، ۱۸۶۵ء) میں حنفاء پر تفصیلی اظہار خیال کیا۔ اس کے خیال میں یہ لوگ شریعت ثابتہ پر قائم تھے اور ایک مستقل فرقہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس کے بعد تقریباً ایک صدی میں مختلف مغربی علماء نے حنفاء کے تعین اور ان کے اعمال و عقائد کو اپنا موضوع بحث بنایا۔ ان میں مرجلیوث (۱۹۰۳ء)، لائل (۱۹۰۳ء)، ہورووٹس (۱۹۲۶ء)، آرتھر جفری (۱۹۳۸ء)، فارس (۱۹۳۹ء)، ریپن (۱۹۹۱ء) اور روبن (۱۹۹۹ء) کے نام قابل ذکر ہیں، لیکن جس مستشرق نے حنفاء کا تعلق صابیوں سے جوڑا ہے، وہ جان پیڈرسن تھا، جس کا صابیوں پر مقالہ اس ارمغانِ علمی میں شامل ہے جو معروف ایران شناس ای۔ جی۔ براؤن کو پیش کی گئی (۱۹۲۲ء، ص ۳۸۳۔۳۹۱)۔ اس نے خوالسن کے متذکرہ بالا مؤقف کی پُرزور انداز سے تردید کی اور مختلف شواہد سے یہ ثابت کیا کہ مندیا کا قرآن کے صابئین سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں اور اگر ان کا کسی قبل از اسلام کے مذہبی گروہ سے تعلق ہوسکتا ہے تو وہ حنفاء ہیں، جو خدا کی وحدانیت کے قائل تھے، یہود و نصاریٰ سے علیحدہ شناخت رکھتے تھے، ایمان والوں کے بہت قریب تھے اور حضرت ابراہیمؑ کا بھی انہیں سے تعلق تھا۔ المسعودی کے بیانات کی روشنی میں وہ حنیف اور طبقہ عرفا کو مماثل سمجھتے ہیں۔ وہ مندیا اور اہل حران کو بھی حنفا کے زمرے میں شامل کرتے ہیں، کیونکہ یہ دونوں گروہ بھی اہل معرفت میں شمار ہوتے ہیں۔ پیڈرسن کے مطابق یہ دونوں مذہبی طبقے یعنی

Marfat.com

مندیا اور حرانی بھی صابئین ہی ہیں۔

برصغیر کے جید عالم دین مولانا سعید احمد اکبر آبادی بھی صابئین کو دینِ حنیف کے پیروکار مانتے ہیں، چنانچہ ان کے سابقہ مقالہ کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں جن سے ان کے دلائل کی صحت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:

''صابیہ اور حنفا دونوں مترادف الفاظ ہیں اور قرآن جن کو صابیہ کہتا ہے، وہ حجاز میں کم از کم حنفا کے نام سے معروف تھے...... یہ حنفا کون تھے؟ اصل یہ ہے کہ جو صورتحال صابیہ کے معاملہ میں پیش آئی، وہی حنفا کے سلسلہ میں پیش آئی یعنی درحقیقت حنفا وہی لوگ تھے جو حضرت ابراہیم کے دین کے متبع اور اس کے پیرو تھے اور توحید پر ایمان رکھتے تھے لیکن جب عرب میں عمر بن لحی الخزاعی نے بت پرستی اور شرک کی ترویج کی تو بہت سے لوگ جو حنفا کہلاتے تھے، وہ بھی صراط مستقیم سے ہٹ کر بت پرستی میں مبتلا ہو گئے...... چنانچہ جب حنیفیت کی اصل شکل مفقود ہو گئی تو بعثت محمدی کے قریبی عہد میں عرب میں ایک طبقہ پیدا ہوا جو بت پرستی اور مشرکانہ اعمال سے سخت بیزار اور متنفر ہو کر اصل حنیفیت یعنی دین ابراہیمی کی تلاش میں نکل پڑا۔ یہ طبقۂ حنفا تھا۔ جو شخص بت پرستی سے...... بیزار ہو کر توحید کا قائل ہوتا، وہ دین ابراہیمی کے گمشدہ راستہ پر چلنے کی کوشش کرنے لگتا تھا۔ قریش اس کے متعلق ''صا فلان'' کے لفظ کہتے تھے اور چونکہ خود آنحضرت ﷺ اس دین ابراہیمی کے داعی اور مجدد تھے، اس بنا پر قریش حضور ﷺ کی نسبت بھی یہ جملہ بولتے تھے...... چونکہ دین حنیف اصلاً حضرت ابراہیم کی ہی طرف منسوب تھا اس لئے حنیفیت کی مسخ شدہ صورت کے جس پہلو کا جو گروہ حامل تھا اس نے حضرت ابراہیم کی طرف بھی اس کا انتساب شروع کر دیا، چنانچہ جو لوگ مشرک تھے، وہ شرک کو، جو یہودی اور نصرانی تھے انہوں نے یہودیت اور نصرانیت کو اور جو نو افلاطونیت سے متاثر تھے وہ نو افلاطونی عقائد و افکار کو حضرت ابراہیم کی طرف منسوب کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں بڑی شدت، تکرار و تاکید کے ساتھ ان تمام خیالات و افکار بالا کی تردید کر کے ان سب چیزوں سے حضرت ابراہیم کی برات کی گئی ہے...... جب قرآن میں صابیہ سے مراد ہی حنفا ہیں تو پھر اس کی وجہ کیا ہے کہ ان لوگوں کو زیر بحث آیات میں صابیہ کے نام سے پکارا گیا ہے اور ان کو حنفا نہیں کہا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ عہد نبوت سے ذرا قبل یہ حنفا اچھی خاصی تعداد میں تھے لیکن ان کی حیثیت جو کچھ بھی تھی، انفرادی اور شخصی تھی اور انہوں نے کسی مذہبی فرقہ کی شکل اختیار نہیں کی تھی...... پس جب حنفا مستقل فرقہ کی کوئی شکل نہیں رکھتے تھے تو جہاں قرآن مجید یہود، نصاریٰ اور مجوس ایسے مستقل مذہبی فرقوں کا ذکر کر رہا تھا وہاں بلاغت کلام کا تقاضا یہی تھا کہ ان کو اس نام سے پکارا جائے جو ان کا دیرینہ فرقہ وارانہ نام (یعنی صابیہ) تھا اور یہ بلاشبہ جیسا کہ قرآن سے ظاہر ہوتا ہے حضرت ابراہیم کے اصل دین حنیف کے قائل ہونے کے باعث موحد اور اہل کتاب تھے۔''

یورپ کے ماہرینِ علوم اسلامیہ میں کچھ نام ایسے بھی ہیں، جو جرمنی اور فرانس سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی بیشتر اہم تحریریں انگریزی سمیت کسی بھی زبان میں منتقل نہیں ہوئیں۔ ان میں بعض نے زیر نظر موضوع یعنی صابئون کو

اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے اور دستیاب معلومات میں اضافہ کیا ہے یا ان کی تشریح و توضیح میں نئے در وا کئے ہیں۔ مطالعۂ قرآن کے ضمن میں جرمن مستشرقین کا ایک مخصوص اور نمایاں انداز ہے جو نیولدکہ کی کلاسیکی تالیف ''تاریخ قرآن'' (طبع عکسی، ۱۹۶۱ء) میں واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ اسی صفِ اول میں رودی پاریٹ بھی کھڑے ہیں جو تقریباً نصف صدی قرآنیات پر کام کرتے رہے ہے۔ ان کے ترجمۂ قرآن کی دوسری جلد تفسیر کے جدید اصولوں کے تحت مرتب کی گئی (مطبوعہ ۱۹۷۱ء)۔ ایسے جرمن مطالعات میں صابیوں سے متعلق مروجہ روایات اور نظریات کا خلاصہ دیا گیا ہے اور پھر مستند مصادر کی بناء پر اپنا مؤقف پیش کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں شہرستانی کی ''کتاب الملل'' کا جرمن ترجمہ شائع ہوا (مطبوعہ ہالے۔ ۱۸۵۰ء، طبع عکس ۱۹۶۹ء)۔ اس میں صابیوں سے متعلقہ صفحات پر جو حواشی دیئے گئے ہیں، وہ اہم ہیں اور صابیوں سے متعلق مغربی تحقیق کے ابتدائی نقوش کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح قرآن کے فرانسیسی مترجمین اور شارحین نے بھی صابئوں کے متعلق مفید معلومات فراہم کی ہیں۔ اس سلسلے میں بلاشبہ (R.Blachere) کا نام قابل ذکر ہے۔ مذاہب عالم کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے بعض فرانسیسی علماء نے اس موضوع پر تفصیلی مقالات سپرد قلم کئے ہیں۔ مثلاً تاردو (Michel Tardieū) ''قرآنی اور حرانی صابئین'' کے زیرعنوان مقالہ خاصی اہمیت کا حامل ہے (در: ژورنال آساتیک، ۱۹۸۶ء، ص ۱۔۴۴)۔ اس کا کہنا ہے کہ خوالسن کے نظریے پر مرجلیوث، پیڈرسن وغیرہ نے جو تنقید کی ہے، اس سے مسئلہ کے حل میں کوئی مدد نہیں ملتی، بلکہ یہ مزید الجھ جاتا ہے۔ وہ حرانیوں کا افلاطونیوں سے ناطہ جوڑتا ہے اور ابن ابی اصیبعہ اور الکندی کے علاوہ مسعودی کی فراہم کردہ معلومات سے استفادہ کرتا ہے۔ مؤخر الذکر پہلا مسلمان مؤرخ ہے جس نے حران کی سیاحت کی، جہاں کی افلاطونی اکادمی کے دروازے پر شامی حروف میں تحریر کردہ کتبہ کو پڑھا۔ یہ اکادمی ان لوگوں کی آماجگاہ تھی، جو خسرو انوشیروان اور جسٹینین کے درمیان ہونے والے معاہدے کے بعد ایتھنز سے ہجرت کر کے وہاں آئے تھے۔ صابئین اس نام کی عربی صورت ہے جو فلسطینی یہودیوں نے اہل معرفت کو دے رکھا تھا۔ فرانس ہی کے ایک اور مستشرق مونو (Guy Monnot) ہیں جس نے دو جلدوں میں شہرستانی کی ''کتاب الملل'' کا فرانسیسی ترجمہ مع تفصیلی حواشی شائع کیا ہے۔ اس نے جلد دوم میں صابئوں سے متعلق حصہ کے ترجمہ (ص ۹۷۔۱۷۲) کے ساتھ شہرستانی اور صابئین پر علیحدہ باب بھی قلمبند کیا ہے (ص ۳۔۱۳) اور ان کے بارے میں جدید تحقیقات کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ اس سے چند سال قبل مونو کے فرانسیسی مقالات کا ایک مجموعہ بعنوان ''اسلام اور مذاہب'' منظر عام پر آیا ہے، جس میں نواں مقالہ ''صابئین اور بت پرست بحوالہ عبدالجبار'' بھی شامل ہے، جو ۱۹۷۴ء میں ایک مصری مجلّہ میں طبع ہوا تھا۔ علاوہ ازیں مارکوئے (Yves Marquet) اور ہانری کربیں (Henry Corbin) کے مقالات زیر عنوان ''صابئین اور اخوان الصفا'' (۱۹۶۶ء) اور ''صابئینی اور اسماعیلی مذہبی رسوم'' (۱۹۵۱ء) بھی اہم معلومات فراہم کرتے ہیں اور ان کے مطالعہ سے صابیوں کے مذہبی عقائد کا بنظر غائر مطالعہ کیا گیا ہے۔

گذشتہ تقریباً ڈیڑھ سو سال میں قرآنی صابیوں کی اصل اور عقائد پر مشرق و مغرب کے فاضل اشخاص نے جو مختلف نظریات پیش کئے، ان کا درج بالا سطور میں ایک عمومی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کا ایک مقصد یہ تھا کہ تاریخی اعتبار سے مطالعۂ قرآن میں کس قدر وسعتِ نظر کی ضرورت ہے اور دوسرے اس حقیقت کو اجاگر کرنا مقصود تھا کہ قرآن میں

Marfat.com

مذکور صابیوں جیسے مذاہب وغیرہ کے تعین میں صرف قدیم اسلامی مصادر ہی پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ مغرب کی علمی دنیا میں ہونے والی جدید تحقیقات کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔ایسے موضوعات کے لئے مشرق ومغرب کا علمی اتصال ضروری ہے اور یہ طرزِ عمل آئندہ چل کر نئے علمی اکتشافات کی روشنی میں قرآن فہمی کے لیے مدومعاون ثابت ہوگا۔

اب آخر میں دونجی باتوں کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ برسوں پہلے جب صابئین سے میری دلچسپی ابھی ابتدائی مراحل میں تھی، مروجہ اردو تفاسیر میں درج توضیحات وتوجیہات نظر سے گزر چکی تھیں اور ان تفاصیل میں یکسانیت یا تکرار نے مزید معلومات کی جمع آوری کے شوق کو تیز کر دیا تھا۔ان دنوں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم بقید حیات تھے، لیکن ان کی شدید علالت کی خبریں اکثر چھپ رہی تھیں۔ میری دلی خواہش تھی کہ اس مسئلہ کی وضاحت کے لیے ان سے رابطہ قائم کیا جائے۔ میری براہ راست ان سے شناسائی نہیں تھی اور پھر بیماری کے باعث وہ بہت کم لوگوں سے ملتے تھے۔ بالآخر میں نے انہیں ایک خط تحریر کیا، جس میں صابیوں کے بارے میں صراحت کی درخواست کی گئی تھی۔ میرے ایک جواں سال قریبی عزیز نے کسی ذریعے سے یہ خط مولانا کی خدمت میں پہنچا دیا۔ چندروز بعد ان کا مختصر سا جواب موصول ہوا، لیکن یہ اُن کا خود نوشتہ نہ تھا بلکہ یہ کسی اور صاحب سے لکھوایا گیا تھا اور آخر میں مولانا نے دستخط کر دیے تھے۔ یہ ان کی عالمانہ وسعت قلبی کا ثبوت ہے کہ اپنی شدید علالت کے باوجود انہوں نے مجھ جیسے نو آموز کے طالب علمانہ استفسار کو لائقِ توجہ سمجھا۔مولانا کے اس مکتوب میں بعض لفظی تبدیلیوں کے ساتھ صابیوں کے بارے میں وہی باتیں مرقوم ہیں جو وہ ''تفہیم القرآن'' کی جلد سوئم میں لکھ چکے تھے۔انہوں نے ابتدائی دو آیات (۲: ۶۲، ۵: ۶۹) کے بجائے تیسری آیت (۲۲: ۱۷) کے تحت ان کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

> ''صابئی کے نام سے قدیم زمانے میں دو گروہ مشہور تھے۔ایک حضرت یحییٰ علیہ السلام کے پیرو جو بالائی عراق کے علاقے میں اچھی خاصی تعداد میں پائے جاتے تھے اور حضرت یحییٰ کی پیروی میں اصطباغ کے طریقے پر عمل کرتے تھے۔ دوسرے ستارہ پرست لوگ جو اپنے دین کو حضرت شیث اور حضرت ادریس علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے تھے اور عناصر پر سیاروں کی اور سیاروں پر فرشتوں کی فرمانروائی کے قائل تھے۔ ان کا مرکز حران تھا اور عراق کے مختلف حصوں میں ان کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ دوسرا گروہ اپنے فلسفۂ سائنس اور فن طب کے کمالات کی وجہ سے زیادہ مشہور ہوا ہے، لیکن اغلب یہ ہے کہ یہاں پہلا گروہ مراد ہے کیونکہ دوسرا گروہ غالباً نزولِ قرآن کے زمانے میں اس نام سے موسوم نہ تھا'' (ص ۲۱۰، تحتی نوٹ۔ ۲۵)

کچھ عرصہ قبل اپنے دورۂ امریکہ میں ''حضرت مولانا'' (قونیہ) کی خدمت اقدس میں ہدیۂ عقیدت پیش کرتا ہوا ایک لمبے سفر پر روانہ ہوا اور ازمیر، ادنہ وغیرہ سے ہوتا ہوا غازیان تیپ جا پہنچا۔ یہ زیادہ بڑا شہر نہیں اور اس سے تقریباً سوا سو کلومیٹر کے فاصلے پر اس قدیم شہر کے آثار موجود ہیں جس کو عرب جغرافیہ دانوں نے ''اُرفا'' کا نام دیا ہے، لیکن اب اسے ''شانلی اُرفا'' کے نئے نام میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔اس کے ساتھ دریائے فرات بہتا ہے اور یہاں سے چند کلومیٹر جنوب میں ملک شام کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔حکومت ترکیہ نے ارفا شہر کی قدامت کو قائم رکھا ہے اور اس

Marfat.com

کے بالکل قریب ہی ایک چھوٹا سا نیا شہر آباد کر دیا ہے جس میں جدید دور کی تمام سہولتیں میسر ہیں۔ قدیم ارفا شہر کے گردونواح میں سنگلاخ پہاڑ ہیں اور یہ اپنی قدوقامت کے اعتبار سے مکّی پہاڑوں سے خاصی مشابہت رکھتے ہیں۔ عرب مؤرخین (مسعودی وغیرہ) اور مذاہب عالم کے متخصصین کا یہی خیال ہے کہ ارفا کا یہ حصہ اس قدیم شہر کی باقیات میں سے ہے، جسے حران کہا جاتا تھا اور یہاں وہی ستارہ پرست لوگ آباد تھے جنہیں حرانی صابئین کہا جاتا ہے اور پھر مختلف دلائل سے ان کا تعلق قرآنی صابئین سے قائم کیا جاتا ہے۔

ارفا کے اس پرانے حصہ کو حضرت ابراہیمؑ کا پیدائشی شہر کہا جاتا ہے۔ یہاں عام لوگ بھی حضرت ابراہیمؑ کو صرف ''خلیل اللہ'' کے نام سے یاد کرتے ہیں، چنانچہ پرانے آثار کے قریب ہی یہاں جو مسجد تعمیر کی گئی ہے اس کو عرف عام میں ''مسجد خلیل اللہ'' ہی کہا جاتا ہے۔ اس مسجد سے قدرے متصل وہ غار بھی موجود ہے، جس میں ایک روایت کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کی ولادت ہوئی تھی۔ یہ غار کچھ زیادہ بڑی نہیں۔ اس کا نصف حصہ پانی سے بھرا ہوا ہے اور اس کے چھوٹے سے دروازے سے جھک کر اس غار میں داخل ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی پانی کی سطح سے ذرا بلند بیٹھنے یا نفل ادا کرنے کے لیے جگہ بنادی گئی ہے۔ یہ غار زیادہ بڑی نہیں اور درمیانی قدوقامت کا شخص بھی اس میں بمشکل سیدھا کھڑا ہوسکتا ہے۔ انہی قدیم آثار میں بیس پچیس فٹ اونچا ایک ستون سا کھڑا ہے، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ نمرود نے حضرت ابراہیمؑ کو یہیں سے آگ میں پھینکا تھا اور اس کے بالکل نیچے ایک چھوٹی سی دیوار کے اوپر یہ قرآنی آیت درج ہے ''یا نار کونی برداو سلام علیٰ ابراھیم.'' مسجد خلیل اللہ اور اس ستون کے وسط میں ایک چھوٹا سا تالاب ہے جو زیادہ گہرا نہیں اور اس کا پانی اتنا صاف ہے کہ اس میں سینکڑوں مچھلیاں تیرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان مچھلیوں کی جسامت اور رنگت ایک جیسی ہے۔ یہاں کی لوک روایت کے مطابق یہ تالاب دراصل آگ کا وہ الاؤ تھا جسے نمرود نے حضرت ابراہیمؑ کے لئے تیار کرایا تھا۔ حکمِ خداوندی سے آگ ٹھنڈی ہوگئی اور الاؤ نے جتنی جگہ گھیر رکھی تھی وہ تالاب کی اور لکڑیوں نے مچھلیوں کی شکل اختیار کر لی۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے لوگ اور زائرین اس تالاب میں ایسی چیزیں پھینکتے ہیں جو ان مچھلیوں کو بہت مرغوب ہیں۔ ان آثار قدیمہ سے کچھ فاصلے پر خاصا بڑا قبرستان ہے جس میں بہت سی برگزیدہ اور مقدس ہستیاں ابدی نیند سو رہی ہیں۔

مسعودی (م۔ ۳۲۶) واحد مؤرخ ہے جس نے حران کے اس علاقہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور پھر اپنے مشاہدات اور تاثرات کو ''کتاب التنبیہ والاشراف'' میں تفصیل سے بیان کر دیا۔ اس نے یہاں کے لوگوں کو صابئین کا نام دیا اور پھر صابئیت اور حنیفیت کو ہم معنی الفاظ قرار دیا۔ اب تو اس کو فوت ہوئے ہزار سال سے اوپر ہوگئے اور ترکیہ کے اس شکر یعنی شمالی ارفا میں دور دور تک وہ آثار، معابد یا اجرام علویہ کے مشاہدے کے لیے تعمیر کردہ رصدگاہیں نظر نہیں آتیں جن کا بالعموم ذکر کیا جاتا ہے۔ امتدادِ زمانہ کے سبب حرانیوں کے مراکز علم و دانش تو صفحۂ ہستی سے مٹ گئے لیکن موجودہ آثار اس حقیقت کے غماز ہیں کہ اس علاقے کا حضرت ابراہیمؑ سے آبائی تعلق اور ان کے دینِ حنیف سے گہرا رابطہ ہے۔

☆......☆......☆

Marfat.com

مولانا مناظر احسن گیلانی

عالمِ بے بدل

(سید مناظر احسن گیلانی کے سوانح اور مقالات متعلقہ قرآن، حدیث اور فقہ)

مرتب محمد اکرام چغتائی

Marfat.com